توحید

پیغمبروں کی آمد کا مقصد

حقوق کی بنیاد اور سرچشمہ

مستحسن اختلاف مذموم اختلاف

طبری کا علمی و ثقافتی تعارف

عورت اسلام اور دیگر مکاتب فکر کی نظر میں



سورۂ آل عمران آیت ۱۰۳

جلد ۱ شمارہ ۱

جمادی الاول جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ

دسمبر ۱۹۹۵ء جنوری ۱۹۹۶ء

اسلامی، علمی، فکری، دوماہی رسالہ

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

○ قرآن و سیرت و سنت پر مبنی دعوت سے بحث اور علمی و عملی موضوعات کی تلاش۔

○ علمی سطح پر علما، و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

○ اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

○ فلسفہ مشرق و مغرب سے فلسفہ اسلام کا امتیاز۔

○ عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

سالانہ بدل اشتراک

[illegible]	[illegible]
[illegible]	۱۰۰ [illegible]
پاکستان	۵۰ روپے
ہندوستان	۵۰ روپے
بنگلہ دیش	۵۰ ٹکہ
[illegible]	۵۰ [illegible]
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۳ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۳۷ ڈالر

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ ادارہ۔

خطاطی و ڈیزائن : صادق علی فقی، سکردو

توحید

جلد ۷ شمارہ ۱

ترتیب

جمادی الاول۔ جمادی الثانی ۱۴۱۰ھ۔ دسمبر ۱۹۸۹ء۔ جنوری ۱۹۹۰ء

فکر و نظر

تاریخ و سیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

- ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔
- مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شذرہ

انسانیت ساز وجود

آج اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی معاشرہ کے زوال و ارتقاء میں عورت ایک کلیدی حیثیت کی مالک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رحمانی و اہریمنی دونوں طاقتیں عورت کو اپنے اپنے منصوبوں میں مخصوص جگہ دیتی ہیں۔ اگر شیطانی طاقتیں معاشرہ کو تباہ و برباد کرانے اور اسے رشد و ہدایت کی راہ سے ہٹانے کی غرض سے عورت کو استعمال کرتی ہیں تو الٰہی طاقتیں بھی انسان کو اس کے مقصد تخلیق کی طرف متوجہ کرنے کے لئے عورت کی انسانیت ساز صلاحیتوں سے استفادہ کرتی ہیں۔

تاریخ میں رونما ہونے والے انقلابات پر ایک نظر ڈالئے، ان میں عورت کا کردار نمایاں نظر آئے گا انقلاب حضرت موسیٰ میں آپ کی والدہ اور آسیہ۔ انقلاب حضرت ابراہیم میں ہاجرہ۔ عصر حضرت عیسیٰ میں مریم، حضرت ختمی مرتبت کے دور میں خدیجہ و فاطمہ اور تاریخ کے بے نظیر حسینی انقلاب میں حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

عورت کی اسی اکسیری خاصیت کے پیش نظر، انسانیت کے نئے اور پرانے دشمنوں نے عورت کو معاشرہ کی تربیت میں اساسی کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کی چولا بدل بدل کر ہمیشہ مذموم کوششیں کی اور کر رہے ہیں، کل کا جاہلی دور اور آج کا نام نہاد ترقی یافتہ نیا زمانہ ان انسانیت سوز حرکتوں میں برابر کا شریک ہے۔ فرق

صرف طرزِ عمل اور طریقہ کار کا ہے۔
اسلام چونکہ ایک فطری اور خالص الٰہی دین ہونے کی وجہ سے، عورت کو اس کا جائز حق عطا کرتا ہے اور اسے تعمیرِ انسانیت کا ایک ضروری رکن قرار دیتے ہوئے اپنے فطری راستہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے لہٰذا انسانیت کے دشمنوں نے عورت کو اس حیات آفریں دین سے دور رکھنے کے لئے اس کے اردگرد اوہام و خرافات کے سیکڑوں جال بُن ڈالے ہیں اور اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ " اسلام عورت کو جانور سے بھی بدتر سمجھتا ہے " " اسلام عورتوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مردوں کا خدمت گزار اور اس کی شہوت کی آگ بجھانے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے "۔ اسی طرح کی اور سیکڑوں تہمتیں ــــ جن کے وہ خود مستحق تھے ــــ انہوں نے اسلام پر لگائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو جو منزلت دی ہے اسے دیگر مکاتبِ فکر سوچ بھی نہیں سکتے۔ امام خمینی قدس سرہ کے بقول :۔
اسلام نے عورتوں پر مردوں سے زیادہ توجہ دی ہے۔ اس تحریک میں، عورتیں مردوں سے زیادہ حق رکھتی ہیں۔ عورتیں اپنے دامن میں بہادر و دلیر مردوں کی تربیت کرتی ہیں۔ قرآن کریم انسان ساز ہے عورتیں بھی انسان ساز ہیں، اگر شجاع و انسان ساز عورتیں کسی قوم سے چھین لی جائیں تو وہ قوم شکست و زوال سے دوچار ہو جائے گی۔
اسلام ان لوگوں کے برخلاف جو عورت کو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے اور اسے سامانِ تجارت سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے ــــ عورت کو مرد ہی جیسا انسان سمجھتا ہے، دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں ہے، امتیاز و فضیلت کا سبب فقط اور فقط تقویٰ ہے۔ جس کا تقویٰ زیادہ ہوگا وہی فضیلت کا بھی مالک ہوگا، وہ چاہے مرد ہو یا عورت۔
اسلام کی نظر میں مرد و عورت، دونوں کا مقصدِ تخلیق علمی و معنوی کمالات کا حصول اور انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہونا ہے اور دونوں اس مقابلہ میں شریک ہیں۔ کبھی مرد آگے نکل جاتا ہے اور کبھی عورت۔ اس مقابلہ میں ان کے مرد یا عورت ہونے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ آپ کو کتنے ہی ایسے مرد ملیں گے جو زندگی کے صحیح آئین کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے تباہی و بربادی کی گہری کھائیوں میں گر گئے ہیں لیکن عورتیں عقل و خرد کے اصول کی رعایت کر کے انسانیت کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچ گئی ہیں اور کبھی معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ قرآن میں جہاں نوحؑ و لوطؑ کی بُری بیویوں کے بُرے انجام کا

تذکرہ ہے وہیں آسیہ و مریم کے اعلیٰ مدارج اور ان کی نیک سیرت کا بھی ذکر ہے ۔

اسلام ، یہود و نصاریٰ کی تحریف شدہ کتابوں کے مانند نہیں ہے جو یہ کہتی ہیں :- ایک ہزار مردوں میں سے ایک شخص ایسا مل جائے گا جو خدا کا محبوب ہو ، لیکن پوری دنیا کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہ ملے گی جو خدا کی نگاہ میں محبوب ہو ۔

اسلام کا نظریہ اس کے برعکس ہے ، اسلام اولیاء خدا کو مردوں میں منحصر نہیں سمجھتا ، اسلام ایسی نمونہ عورتوں کو پیش کرتا ہے جو محبت الٰہی میں کسی مرد سے پیچھے نہیں ہیں ، فرعون کی مومنہ بیوی آسیہ عیسیٰ کی پاکدامن ماں مریمؑ ، مرسل اعظم کی عظیم بیٹی فاطمہؑ اور آپ کی جاں نثار بیوی خدیجہؑ اور امیرالمومنینؑ کی شیردل بیٹی زینبؑ خدا کی نظر میں محبوب عورتوں کا بہترین نمونہ ہیں ۔

قرآن مجید میں ایسی بے شمار آیتیں ہیں جو میدان عمل و ثواب میں عورت و مرد کو برابر کا درجہ دیتی ہیں ، عزت و تکریم میں مساوی سمجھتی ہیں ۔ ان کی جسمانی ساخت کو فضیلت و برتری کے میدان میں آگے بڑھنے سے مانع نہیں سمجھتیں ۔

عصر جاہلیت میں لڑکی باعث ننگ و عار تھی اس کی پیدائش بدبختی کی علامت اور عذاب الٰہی کی دلیل ہوتی تھی ، جب انھیں لڑکی کی ولادت کی خبر دی جاتی تھی تو غصہ سے ان کا چہرہ سیاہ ہو جاتا تھا اور اپنے کو دوسروں کی نظروں سے چھپا لیتے اور یہ سوچنے لگتے کہ لڑکی کو زندہ رکھ کر ذلت و خواری کی زندگی گزاریں یا اسے زندہ دفن کر دیں ۔

آج کے [illegible] دور میں بھی کم و بیش اس طرح کے افکار پائے جاتے ہیں ، حتیٰ افسوس بعض مسلم معاشروں میں بھی ـــــ غیر مسلموں کے تلقینات کے باعث ـــــ لڑکی کی پیدائش کی خبر سن کر چہرہ اتر جاتا ہے لیکن اسلام نے اپنے پیروؤں کو اس بیہودہ فکر سے دور رہنے کا بڑی سختی سے حکم دیا ہے ، اسلام کا اعلان ہے کہ " لڑکی کی پیدائش خیر و برکت کی نشانی اور خاندان کی سعادت کی علامت ہے " " جس گھر میں لڑکی موجود ہو اس گھر والوں پر ہر روز رحمت و برکت کا نزول ہوتا ہے " " لڑکیاں نیکی ہیں اور لڑکے نعمت ، نعمت کے بارے میں بازپرس ہوگی لیکن نیکی کے بارے میں ثواب ملے گا "

مرسل اعظمؐ فرماتے ہیں : ساووا بین اولادکم فی العطیة فلو کنت مفضلاً

لفضلت النساء ۔ ہدیہ و تحفہ دیتے وقت اپنے بچوں کو ایک نگاہ سے دیکھو ، اگر میں کسی کو ترجیح و برتری دینا چاہتا تو لڑکیوں کو ترجیح دیتا " ایک دوسرے مقام پر حضرتؐ فرماتے ہیں " جس کے پاس لڑکی ہو اور وہ اس کی اہانت نہ کرے اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہ دے ، خدا اسے بہشت میں جگہ دے گا ۔

اسلام نے نہ صرف یہ کہ اپنے احکام و تعلیمات کے ذریعہ لڑکیوں کے متعلق جاہلی نظریات پر پابندی لگائی بلکہ اسے فضیلت و برتری کے بام عروج پر پہنچا دیا ہے ۔

عورت صرف بیوی اور بیٹی ہی کے روپ میں مظلوم نہ تھی بلکہ ماں جیسے مقدس درجہ میں بھی اپنے ہی جگر گوشوں کی طرف سے توہین و تحقیر کا نشانہ بنتی تھی ۔ بچے ، باپ کے مرنے کے بعد اپنی ماں کے مالک و مختار ہوتے تھے اور جس طرح چاہتے انھیں استعمال کر سکتے تھے ۔ لیکن اسلام نے عورتوں کو بالعموم عظمت و احترام دینے کے علاوہ " ماں " کو ایک عظیم رتبہ و منزلت سے نوازا ہے ۔ ایک طرف سے ماں کی قدر و قیمت اس کی عظمت و مرتبت کا اپنے اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ احساس دلایا ہے اور دوسری طرح سے والدین کی ناراضگی اور ان کے لئے لفظ " اُف " استعمال کرنے سے بھی منع کیا ہے اور انھیں ناخوش کرنے والوں پر جنت حرام کر دی ہے ۔ یہاں تک کہ جنت ماؤں کے قدموں تلے قرار دی ہے : " الجنۃ تحت اقدام الامھات " ۔

ایک دن پیغمبر اسلام کی رضاعی بہن آپ کی خدمت میں آئیں ، حضورؐ نے انھیں دیکھتے ہی خوش ہو کر اپنی عبا ان کے لئے بچھا دی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے گفتگو فرمائی ، ان کے جانے کے بعد حضورؐ کے رضاعی بھائی آئے ، آپؐ نے بہن کی جتنی عزت فرمائی تھی اتنی بھائی کی عزت افزائی نہیں کی ، اصحاب نے آپؐ سے اس امتیاز کی وجہ دریافت کی آپؐ نے فرمایا :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری بہن اپنی ماں کا زیادہ خیال رکھتی ہے ۔

جناب مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ نساء آیت ۱۳ - ۱۹

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا
خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٤﴾

ترجمہ

یہ اللہ کی سرحدیں ہیں ۔ اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی فرماں
برداری کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جہاں

نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے اور
یہ بڑی کامیابی ہے (۱۳) اور جو اللہ اور اس کے رسول کا
حکم نہ مانے گا اور اس کی سرحدوں سے آگے بڑھے گا۔ اللہ اسے
دوزخ میں ڈال دے گا وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا اور اس
کے لئے رسواکن عذاب ہے (۱۴)

تفسیر

۱۳۔ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ ۔۔۔۔

حدود : (حد) سرحد۔ آخری لائن ۔ وہ خط جو دو چیزوں، دو زمینوں، دو دائروں کو الگ اور متمائز کرے ۔ (حُدُودُ اللّٰهِ) وہ آخری لائنیں جن کے اندر دین اور اہل اسلام رہتے ہیں اور ان خطوط و سرحدات سے بڑھنے کا مطلب دین و دیانت کی سرحد سے نکلنا ہے۔ اللہ کے حتمی فیصلے اور آخری قوانین بھی حدود اللہ ہیں اسلامی قانون کی روح، عقیدہ حاکمیتِ الٰہیہ ہے ۔ ان قوانین کا نفاذ ہر شخص کی ذمہ داری ہے ۔ قوانین میراث اسی قسم کے حدود ہیں ۔ ان قوانین کی پابندی اور نفاذ و عمل کا مطلب ہے اللہ و رسول کی حاکمیت دل و جان سے ماننا ۔ اسلام کے معنے بھی یہی ہیں ۔ جو فرد یا معاشرہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سرگرم رہے، اللہ اسے اپنی نعمتوں سے نوازے گا اور اپنی رضا عطا کرے گا۔ مومن کا اصل مقصود و مطلوب یہی ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے

۱۴۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ ۔۔۔۔۔

جو شخص اللہ و رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ اللہ کی قائم کردہ سرحد کو عبور کرتا ہے ۔ ایسا شخص سزا کا مستحق ہے اور اس کی سزا دوامی قیدِ دوزخ اور ذلیل کن عذاب ہے۔

دونوں آیتوں میں اللہ کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے ساتھ وابستہ کر کے آنحضرت صلعم کی حاکمیت مطلقہ پر روشنی ڈالی ہے یعنی بے اطاعتِ رسول، خدا کی اطاعت کا خیال غلط ہے۔

آج کے قانون ساز اداروں کو ضروری تنبیہ

سیاسی ضرورتوں کے پیشِ نظر اور ذاتی اغراض کی خاطر نام نہاد قومی مفاد کا نام لے کر جہاں جہاں میراث کے خدائی قوانین کے خلاف حکم یا قانون یا عمل رائج کیا جاتا ہے وہاں کے مسلمان جہنم کی سزا اور قرآن کی اصطلاح میں "حدودِ الٰہی" سے تجاوز کے مجرم ہیں ٹیکس ہو یا قومی تحویل میں ترکہ لینے کی بات (بیٹے بیٹی کے ہوتے ہوئے پوتے نواسے کی میراث ہو، یا لڑکی کی ترکے سے محروم کرنے کی رسم، اور بیوی کو زمین کی میراث دینے کا قانون سب اللہ کی سرحدوں کو پار کرنا ہے۔ جو کلمہ گو اور معتقدِ قرآن کے لئے جائز نہیں۔ بلکہ اس سے حذر کرنا واجب ہے۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا
عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ
فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ
سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ
تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ

اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کریں۔ تم ان کے خلاف اپنوں میں سے چار کی گواہی طلب کرو تو اگر وہ گواہی دے دیں، تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو۔ یہاں تک کہ موت انہیں پورا پورا لے لے یا اللہ عزّ اسمہٗ ان کے لئے کوئی راہ بنا دے (۱۵) اور تم میں جو دو شخص بدکاری کریں تو ان دونوں کو سزا دو۔ پھر اگر وہ

دونوں توبہ اور اصلاحِ حال کریں تو ان سے درگزر کرو۔ بے شک
اللہ جلّ جلالہٗ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے (۱۶)

تفسیر

۱۵ ـــــ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ - - - - - - -

اسلام کی نظر میں جان اور عصمت بے بہا چیزیں ہیں ان کو ضائع کرنا بہت بڑا جرم ہے اسلامی معاشرے میں زنا اور اس جیسے جنسی عمل ناقابلِ برداشت گناہ ہیں، جب مسلمان عورت پر یہ الزام لگایا جائے اور چار عینی گواہوں کی شرعی گواہی اسے مجرم ثابت کردے تو عدالت اسے عمر قید کی سزا دے ۔ وہ گھر میں مرتے دم تک بند رکھی جائے گی۔ یا اسی حالت میں مرجائے یا اللہ کی طرف سے کوئی اور حکم آئے ۔ جیسے رجم۔

۱۶ ـــــ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا - - - - - -

غیر شادی شدہ زانی و زانیہ۔ معاشرے میں خطرناک ناسور پیدا کرنے والے افراد ہیں انھیں سخت اور اذیت ناک سزا دی جائے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں، اس کے بعد ان سے توبہ و اصلاحِ حال و اخلاق کی امید کی جائے ۔ توبہ و اصلاح کے بعد ان لوگوں کو نظر انداز کردیا جائے ۔ کیونکہ قانونِ اسلام میں اللہ کی رحمت اور قبول توبہ کی ضمانت۔ فلسفہ قانونِ جزا و سزا کے رو سے نفسیاتی آسودگی کا سبب ہے ۔ اس سے آدمی کا ضمیر مطمئن ہوجاتا ہے۔

عرب معاشرے سے زنا کے طوفان پر بند باندھنے کا یہ پہلا مرحلہ تھا اس کے بعد سورۂ نور میں کوڑوں اور سنگساری کا حکم آیا جو اس سے بھی سخت تھا۔ اس طرح اس جرم کی مضبوط روک تھام عمل میں آئی۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ

يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ
إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ
أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ●

ترجمہ

اللہ عزاسمہٗ کی بارگاہ میں توبہ کا حق ان کو ہے جو نادانستہ طور پر برائی کر گزرتے ہیں اور فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ایسے ہی لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اور اللہ جاننے والا حکیم ہے (۱۷) اور ان لوگوں کی توبہ۔ توبہ ہی نہیں جو (زندگی بھر) بُرے کام کرتے رہے، آخر کار جب کسی ایک کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا۔ میں اب توبہ کرتا ہوں۔ نہ توبہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر کی حالت میں مر گئے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۱۸)

تفسیر

۱۷ ــــــــ إِنَّمَا التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

انسان اپنی نفسیاتی کمزوری یا دوسرے کے بھڑکانے سے اور کبھی غفلت کے ہاتھوں گناہ کر بیٹھتا ہے۔ نافرمانی کے بعد کبھی وہ شرمندہ ہوتا اور فوراً ندامت محسوس کرتا ہے یہ شخص فطرتِ سلیم و راہِ مستقیم پر ہے اس کی توبہ صحیح توبہ اور رجوع الی اللہ ہے۔ اس کی رحم کی درخواست منظور ہوگی۔

۱۸ ــــــــ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

فطرتِ سلیم و راہِ مستقیم سے منحرف، عادی مجرم اور حسن نیک و بد سے محروم لوگ، جو ظلم کرنا اپنا حق، اور حق کو نہ ماننا دانشمندی سمجھتے ہیں ایسے لوگ جب موت کے شکنجے میں میں آتے ہیں تو اللہ کو پکارتے توبہ کرتے اور ان کے وارث بھی بڑی خیر خیرات اور دعا

مغفرت کرتے اور کرواتے ہیں ۔ اس آیت میں ایسے کافروں کی معافی سے انکار اور سخت ترین سزا کی تنبیہ حقیقی ہے ۔

توبہ

توبہ وانابت دراصل وہی ہے جو احساس غلط کاری وندامت ضمیر سے پیدا ہو امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا ہے :

اللھم ان یکن الندم توبۃ الیک فانا اول النادمین
وان یکن الترک لمعصیتک انابۃ فانا اول المنیبین...

یا اللہ . اگر ندامت " توبہ " ہے تو میں سب سے بڑا نادم اور اگر ترک نافرمانی " انابت " ہے تو میں میں پہلا " منیب " وانابت گزار ہوں ۔ یعنی توبہ ندامت پر اور انابت ترک نافرمانی کی بنیاد پر قائم ہے

اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے ۔ جب بھی کوئی توبہ کرے وہ قبول کرتا ہے ۔ بشرطیکہ توبہ کرنے والا اللہ کو حاکم ، رسول اللہ ؐ کو آقا مانتا ہو ، ائمہ ؑ کو ہادی ورہنما جانتا ہو ، مسلمان ہو ، مومن ہو ، محتاط ہو ، خوف خدا رکھتا ہو ۔ کافر چونکہ منکرِ حاکیت الہٰیہ ہے اس لئے وہ ان فوائد سے محروم ہے ۔

[redacted]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

ترجمہ

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ! تمہارے لئے جائز نہیں کہ عورتوں

پر جبر کر کے ان کے وارث ہو ۔ نہ ان پر دباؤ ڈالو کہ جو انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ ہتھیالو ۔ مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بدکاری کریں ۔ اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو ۔ اور اگر تم ان کو ناپسند کرو (تو ضروری نہیں کہ وہ بری ہی ہوں) کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ جسے تم ناپسند کرتے ہو ۔ اللہ عز اسمہٗ اسی میں تمہارے لئے بہت خوبی قرار دے ۔ (۱۹)

تفسیر

۱۹ ــــــــ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الایۃ ۔ ۔ ۔ ۔

اسلام نے مختلف معاشروں میں خواتین کی توہین ، حق تلفی اور بے مائیگی کے خلاف قانون بنائے ، ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا ۔ جس میں عورت کا وجود محترم سمجھا جائے ۔ اسے بیٹی کی حیثیت سے معزز بنایا ۔ اسے حق ملکیت دیا ، اسے شوہر کے انتخاب کا حق دیا ۔ لیکن بن بیاہی بیٹیوں کی نگہبانی و ولایت باپ کو دی تاکہ وہ زندگی کے پہلے خطرناک تجربے میں اپنے سب سے بڑے حامی اور چاہنے والے کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں ۔ اس کے بعد اجازت پدر کی پابندی نہیں رہتی اسی طرح بیٹی اپنے حق مہر و ہدایا کی مالک قرار دی گئی ۔ عورت بحیثیت بیوی کے ایک باعزت و احترام شریک حیات بنائی گئی وہ شوہر کی ماما یا لونڈی نہیں ہے اس کے علاوہ بیٹی ہو یا بیوی میراث پدر و شوہر میں وارث اور اپنے حصے کی مالک قرار دی۔

شان نزول

امام محمد باقر ؑ نے فرمایا کہ آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ لوگ اپنی بیویوں سے شریک حیات کا سلوک نہیں کرتے تھے ۔ وہ ان کو سختی اور تنگی میں رکھ کر ان کی موت کا انتظار کرتے تھے کہ وہ ذہنی اور جسمانی اذیتوں کی تاب نہ لا کر مر جائیں اور یہ ظالم ان کے مال متاع پر قبضہ کر لیں ۔ (نمونہ بینات در شان نزول آیات از ڈاکٹر محمد باقر محقق)

آیت خود بھی حالات اور پس منظر واضح کرتی ہے کہ:

(۱) عورتوں کا زبردستی ترکہ حاصل کرنا ایک ظلم تھا قرآن کریم نے اسے ناجائز کردیا یہ ترکہ دو طرح کا تھا ۔ ایک صورت یہ تھی کہ بیوہ کو اس کے شوہر کی موت پر میت کے بھائی اور کبھی سوتیلے بیٹے اپنے قبضے میں کر لیتے اور یا خود نکاح کرتے کہ اس کی املاک پر قابض ہوں ۔ کبھی اپنی پسند کے آدمی سے بیاہ دیتے کہ اس کے عوض مال یا مہر وصول کریں۔ اسلام نے ان جیسے معاملات کو حرام کردیا

(۲) یہ دستور بھی اسلام نے ختم کردیا کہ عورت کو خود ہی بڑی رقم مہر میں دینے کے بعد اس کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنی ملکیتی رقم و مال مہر سے اس شوہر کو کچھ دے اور شوہر اس پر سختی کر کے اپنا دیا ہوا کچھ مال اس سے واپس لے۔

البتہ ، اگر عورت کوئی علانیہ بدکاری و بری بات کرے تو بطور سزا (مگر واقعی ثبوت جرم کے بعد) جرمانہ وغیرہ کیا جاسکتا ہے ۔ دیکھیں کتب فقہ ۔

(۳) نکاح و طلاق ، کھیل نہیں ہے کہ جب عورت پسند آئی بیوی بنالی اور جب ناپسند ہوئی اسے چھوڑ دیا ۔ قرآن مجید نے اس رشتے کو محترم قرار دیا اور کہا کہ نوجہ سے حسن معاشرت اور اچھا رویہ رکھو ۔ اس کے بعد بھی اگر تم اس سے کراہیت محسوس کرو تو صبر و تحمل سے کام لو ، جذبات کا شکار نہ بنو ۔ سوچو ، اور یقین رکھو کہ بہت سے معاملات اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں تم برا سمجھتے ہو مگر مستقبل میں وہی چیزیں اچھی اور کارآمد ثابت ہوتی ہیں ۔ نکاح ، ایک مقدس پیمان ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس کے بہانے خیر و برکت دیتا ہے ۔ اس لئے یہی بظاہر ناپسند بیوی ، اللہ کی رحمت سے خیر کثیر ہو سکتی ہے ۔ برکت اور بہتری کا سبب بن سکتی ہے ۔ جذبات کے بجائے ہمت و استقلال سے کام لے کر دیکھو ، آخر برے کو اچھا بنانا کیوں ناممکن سمجھو ۔ عائلی زندگی کو جو شخص خوشگوار نہ بنا سکے وہ بیرونی معاشرہ کو کیسے بہتر بنا سکے گا ۔ ہمت مرداں مدد خدا۔

***

اسلامی معارف

پیغمبروں کی آمد کا مقصد

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ : جناب سید احتشام عباس زیدی

نبوت کی بحث میں چند اور بنیادی موضوعات باقی رہ گئے تھے جنہیں ہم علی الترتیب اشارۃً ذکر کرتے ہیں ۔ یہاں ہم اپنی گفتگو کے دوران قرآن کی روشنی میں انبیاء کے آنے کا مقصد بیان کریں گے اگرچہ یہ بات پورے طور سے روشن ہے کہ انبیاء الٰہی خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے دین لائے ہیں ، لیکن درحقیقت دین کی روح اور اس کی بنیاد کیا ہے ؟

توحید

سورۂ انبیاء آیت : ۲۵ میں ارشاد ہے :-

" وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ اِلَّا نُوحِیٓ اِلَیْہِ
اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "

" ہم نے تم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اسے وحی کردی کہ سوائے میرے کوئی خدا نہیں ہے ۔ پس میری عبادت کرو "

یہ واضح سی بات ہے کہ توحید یا خدائے واحد کی پرستش ہی تمام آسمانی ادیان کی بنیاد ہے کیونکہ اصولی طور پر دین خدا کی طرف سے آتا ہے ۔ اور اگر خدا کا عقیدہ نہ ہو تو اس کے احکام و

قوانین کی پابندی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ توحید کا عقیدہ ہر طرح کے شرک اور غلط عقائد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اور انسانوں میں مساوات و اخوت کی بنیاد قائم کرتا ہے چاپلوسی، غلامی اور خود پرستی سے مقابلہ کرتا ہے اور صفا و محبت، عزت و شرافت نیز بلند نظری پیدا کرتا ہے۔ ظالموں اور ستمگروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے اور دوسروں کے منافع سے کھیلنے والوں کے پیروں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ عقیدہ توحید کے ان تمام معاشرتی، فکری اور اخلاقی آثار کو وجود بخشتا ہے جن کا ذکر ہم توحید کی بحث میں کر آئے ہیں۔

عدل

خداوند عالم سورہ شوریٰ، آیت: ۱۵ میں پیغمبر اسلام حضرت محمد (ص) سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

"اے رسول کہہ دو « وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ »

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدالت برقرار کروں"۔

اسی طرح سورہ حدید میں انبیاءؑ کی رسالت، کتاب کے نزول، اللہ کی نشانیوں اور معجزات کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگ معاشرہ میں عدالت قائم کریں۔ مجموعی طور سے عدل کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر برقرار رہے۔ چنانچہ اگر کوئی دولت غصب کر لی جائے یا کوئی شخص کسی منصب یا عہدہ پر زبردستی قبضہ کر لے۔ یا کسی کی جان، مال، آبرو پر حملہ کیا جائے حتیٰ اگر کسی عدالت کے چھوٹے سے چھوٹے فیصلہ میں کسی حقدار کا حق مارا جائے تو گویا ان تمام صورتوں میں حق اپنے محور سے الگ ہو گیا ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اور ہر معاملہ میں دقیق توازن، میانہ روی اور حد اعتدال کو قائم رکھا جائے اور افراط و تفریط سے پرہیز کیا جائے چنانچہ عدل اپنے وسیع معنی کے اعتبار سے عدل اجتماعی، عدل اقتصادی، عدل حقوقی اور عدل قضائی وغیرہ کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ دنیا میں آنے والے انقلابات، تحریکوں اور مبارزوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی حقوق حاصل کئے جائیں۔

ہر طرح کے ظلم و ستم اور زیادتیوں سے مقابلہ کا مقصد ہی یہ ہے کہ آزادی و استقلال،

اختیار و حاکمیت اور دوسرے بہت سے عادلانہ مقاصد حاصل کئے جائیں۔ دنیا میں سب سے پہلے عدل و انصاف کی آواز انبیاءؑ نے بلند کی اور اس راہ میں مسلسل جد و جہد اور قربانیاں پیش کی ہیں۔ ان ہی نے عدالت کے اصول سے انسانوں کو آگاہ کیا ہے اور آج تمام انسانی اصولوں اور انسانی حقوق سے متعلق عالمی منشوروں کی بنیادیں آسمانی کتابوں، اور خصوصیت سے وسیع پیمانہ پر ہر طرح کی تحریف سے خالی صاف و صریح انداز میں قرآن کریم میں مشاہدہ کی جا سکتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ وسیع پیمانہ پر ہمہ جہت عدل و انصاف قائم کرنا انبیاء کرامؑ کے عظیم ترین مقاصد میں شامل رہا ہے۔

قوانین کا مجموعہ

سورۂ حدید آیت : ۲۵ میں ارشاد ہے :-

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ"

"ہم نے انبیاءؑ کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور حق و باطل کی میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں۔"

کتاب سے مراد ایسا مجموعہ ہے جس میں قوانین و احکام یکجا جمع اور مدون و مرتب کئے گئے ہوں۔ یعنی وہ انبیاء کرام جن پر تبلیغ و ہدایت کی اس قدر اہم ذمہ داریاں ہیں خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے ساتھ قوانین و احکام بھی لائے ہیں، وہ درحقیقت ایک اصول اور ایک نظام رکھتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ انبیاء کرام لوگوں کو خدا کی طرف متوجہ کرنے، خدا پرستی کو رواج بخشنے اور معاشرہ میں عدالت قائم کرنے کے لئے تشریف لائے اور ان دو عظیم مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے ہمراہ جامع اور مکمل قوانین و احکام لائے ہیں۔

***

میزان

سورۂ حدید کی مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوا کہ عالم بشریت کو پیغمبروں کی جانب سے عطا کیا جانے والا ایک بہترین تحفہ میزان ہے ۔ یہی میزان حق و باطل کے پرکھنے کا معیار اور نیک و بد نیز سعادت و شقاوت کی تشخیص کا ذریعہ ہے ۔ ہم اپنی زبان میں نیک و بد، خوش بختی و بدبختی اچھائی اور برائی جیسے الفاظ اکثر و بیشتر دہرایا کرتے ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ بھی جائیں خوش بختی کسے کہتے ہیں ۔ اچھائی کیا ہے ؛ حق کن چیزوں کا نام ہے ؟ ہر ماحول کے لوگ اپنے آداب و رسوم اور عادات و اطوار کو خوب اور بہتر کہتے ہیں ۔ اسی طرح ہر مسلک اور ہر آئین اپنے اصول کو محترم جانتا اور انہیں حق سمجھتا ہے ۔ درحقیقت تمام آراء و نظریات اور مختلف افکار و تصورات کے لئے ایک مستقل معیار ہونا چاہیئے ۔ ایک کسوٹی بہر حال لازم ہے جس سے نیک و بد یا حق و باطل سمجھ میں آسکے ۔

اس تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ بنی نوع انسان کے لئے ہر چیز کی حقیقت و واقعیت کو آئینہ کی طرح روشن کرنے کی غرض سے خدا کی طرف سے "میزان" لے کر آئے ہیں ان کے اصول اور نظام حقائق و واقعیات کے لئے روشن چراغ اور حق و باطل کا معیار و میزان ہیں ۔

ہم عرض کر چکے ہیں انسان کی عقل اور اس کی فکری قوت خدا کا عطا کردہ بیش قیمت سرمایہ ہے ۔ یہی عقل خیر و شر اور مفید و مضر کو پرکھنے کی زمین ہموار کرتی ہے ۔ لیکن صرف یہ کافی نہیں ہے ، اس کے ساتھ انبیائے کرامؑ کی رہنمائی اور ہدایت بھی ضروری ہے تاکہ انسان آفات و گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو ۔ اور جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قومیں اور ملتیں طرح طرح کے جنسی تعلقات ، شراب ، جوا ، سود خوری ، اپنی حد سے تجاوز اور دوسروں کی زمینوں پر ظالمانہ قبضے کو اچھا سمجھتی ہیں اور ان تمام کاموں کو نیک ، مفید اور بھلائی کا رنگ دیتی ہیں ۔ تقریباً تمام قوموں اور ملتوں میں اس انداز فکر کی اور بھی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں ۔ یا پھر یہ کہ تمام چیزوں اور تمام اعمال کی حقیقت ایک ہی ہے ۔ جسے پہچاننے کی ضرورت

ہے اور اس کے لئے ایک معیار و میزان تلاش کرنا چاہیئے اور وہی میزان انبیاء لیکر آئے ہیں ۔

یہاں اس نکتہ کی یاد دہانی ضروری ہے کہ آج بھی یہ اصول و معیار اسلامی منابع (یعنی قرآن واحادیث) میں موجود ہیں ۔ لیکن افسوس یہ کہ عمل کے اعتبار سے ان کی وضاحت و تشخیص میں خود مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی نہیں پائی جاتی یا دربیت سے اجتماعی ۔ فکری اور اخلاقی مسائل مثلاً تقیہ ۔ توکل ۔ صبر اور زہد وغیرہ کی اصل حقیقت اور معیار واضح نہیں ہے ۔ یعنی حقیقتاً اسلامی میزان و معیار کی واضح اور صحیح طور سے تحقیق نہیں ہو ئی ہے اور نہ تمام لوگ اس سے واقف ہو سکے ہیں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی منابع اس اعتبار سے غنی ہیں اور ان میں انسان کے لئے سب کچھ موجود ہے ۔ ان اصولوں کو بخوبی حاصل کیا اور سمجھا جاسکتا ہے شرط یہ ہے کہ غیر جانبداری سے وسیع پیمانہ پر ان کی تحقیق اور چھان بین کی جائے ۔

رفع اختلاف

سورہ بقرہ آیت : ۲۱۳ میں ارشاد ہے کہ انبیاء کی آمد کا مقصد لوگوں کے درمیان پیدا شدہ اختلافات کو دور کرنا ہے ۔ اسی طرح سورہ نساء آیت : ۱۰۲ اور سورہ نحل ، آیت : ۶۴ میں پیغمبر اکرمؐ کی آمد کا مقصد بھی رفع اختلاف بیان کیا گیا ہے ۔ سورہ بقرہ ، آیت : ۲۱۳ کی ابتدا میں تمام انسانوں کے اتحاد و یگانگت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اور شاید یہ وہی فطری اتحاد و ہم آہنگی ہے جس کے تحت انسان بنیادی طور پر حق و عدالت اور کمال کا متمنی رہتا ہے ۔ وہ عقل و فکر رکھتا ہے اور اس کا پاکیزہ وجدان اور صاف باطن اسے فطری طور سے نیکی اور بھلائی کی طرف کھینچتا ہے لیکن بعد میں اس کی منفعت طلبی خود خواہی اور دوسروں سے فائدہ اٹھانے کی خواہش اسے گمراہیوں میں مبتلا کر دیتی ہے ۔ نتیجہ میں جھوٹ ، فریب ، افترا پردازی ، لوگوں کو سرگرم رکھنے والے غلط عادات و رسوم ، نشہ کی لت اور گمراہیاں ان میں پیدا ہو گئیں ۔

انبیاء کرامؑ اس پر مامور کئے گئے تھے کہ وہ انسانوں میں خود خواہی اور خود غرضی کی بنا پر پیدا ہونے والے مصنوعی اور جھوٹے اختلافات دور کریں اور انہیں ان کی پاکیزہ فطرتوں

کی طرف مائل کردیں ۔

انبیاءؑ کی مخالفت کرنے والے

نبوت کی بحثوں میں ایک اہم ترین بحث یہ ہے کہ انبیاءؑ کے مخالفین اور ان کے مقاصد کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں پر روشنی ڈالی جائے کہ یہ لوگ کس قسم کے افراد تھے ۔ چنانچہ قرآن کی رہنمائی میں ان گروہوں کو حسب ذیل ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے ۔

۱۔ شیاطین (وسوسہ پیدا کرنے والے اور گمراہ کرنے والے)

سورۂ انعام، آیت : ۱۱۲ میں ارشاد ہے کہ :۔

" وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا "

" اور یوں ہی ہم نے ہر پیغمبر کے لئے انسانوں اور جنوں میں سے ان کے دشمن شیاطین قرار دیئے ہیں، جو اپنی میٹھی میٹھی پرفریب اور گمراہ کن باتیں ایک دوسرے تک پہنچایا کرتے ہیں ۔

مجموعی طور سے شیاطین کی خاصیت ہی فریب کاری اور وسوسہ پیدا کرنا ہے ۔ تمام باطل گروہ اور ان کے لیڈر یا غلط مکتب فکر کے طرفدار افراد اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ کے لئے فریبکاری اور حیلہ سازی سے کام لیتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ظاہراً خوشنما اور حقیقتاً مسموم پروپیگنڈوں سے لوگوں کو گمراہ کریں چنانچہ وہ تمام لوگ جن کا گمراہ کن اور زہریلے افکار پھیلانے میں کسی طرح کا بھی حصہ ہوتا ہے انبیاء کرامؑ سے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی صالح و نیک دعوت کی راہ میں ہر طرح سے روڑے اٹکاتے رہتے ہیں ۔

ان کے وسوسوں اور شبہوں کی مختلف مثالیں قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں منجملہ ان کے خود نیک و صالح بلکہ انبیاء کی مخالفت کرنا ٹکراؤ کے یہ نمونے بہت سے پیغمبروں کی زندگی میں نظر آتے ہیں یہ لوگ معاشرہ میں خلل اندازی اور تفرقہ پردازی یا اسی طرح کے دوسرے اتہام و الزام ـــــ بھی

پیغمبروں پر لگاتے رہے ہیں۔

مذاہب کے گڑھنے والے خرافات پھیلانے والے۔ دوسروں کے سطحی کمالات پر فریفتہ اور گم ہوجانے والے یہ سب کے سب انہی شیطانوں میں شامل ہیں کیونکہ یہ سب اپنے اپنے اعتبار سے وسوسہ پھیلاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف انبیاء کے زمانہ میں ان کے اور ان کی تبلیغات اور دین و آئین کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ انبیاء کے بعد ان کی پیروی کرنے والوں اور خادموں کے ذریعہ دین کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کے بھی مخالف ہیں۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس صف میں شامل ہیں جو اسلام سے پہلے کے ادیان میں داخل شدہ خرافات کی تشہیر و تبلیغ کرتے ہیں۔ اور اسلام سے مخاصمت اور دشمنی رکھتے ہیں۔

۲۔ مجرمین اور گناہ گار

سورۂ فرقان کی آیت: ۳۱ میں ارشاد ہے :۔

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَكَفٰى
بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا "

"اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لئے گناہگاروں اور خطاکاروں کے
درمیان دشمن قرار دیئے ہیں اور تمہارے لئے تمہارا خدا ہی کافی ہے
جو راہنمائی اور نصرت کرنے والا ہے۔

اس گروہ کی حالت بھی واضح و روشن ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عیاشی و ہوس پرستی کے ذریعہ اپنے دامن کو آلودہ کرتے ہیں ہر طرح کے کریہہ اور برے اعمال بلا جھجک کر گزرتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ یوں ہی بے لگام زندگی بسر کریں اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ انبیاء کرام کی تبلیغات ایسے لوگوں کے مزاج پر گراں گزرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ پہلے گروہ کے مانند نہیں ہیں، جو خود ایک مستقل راہ و روش پر قائم ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی نفسانی خواہشات اور ہوس کی پیاس جس طرح بھی ہو بجھائیں شراب، جوا، زنا اور دوسرے گناہوں میں بلا روک ٹوک مشغول رہیں۔ دینی تبلیغات چونکہ انھیں روکتی ٹوکتی ہے اور ان کی ہوس پرستی کی راہ میں حائل

ہوتی ہے لہٰذا وہ اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔

۳۔ مترفین (آرام طلب)

یہ گروہ عموماً دوسرے گروہوں سے زیادہ خطرناک اور ڈھیٹ ہوتا ہے۔ سورۂ سبا آیت نمبر ۳۴ میں ارشاد ہے:-

"وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ"

"ہم نے کسی بھی سرزمین پر کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ جو لوگ دولت کے غرور اور عیش و نوش میں غرق تھے ان کی مخالفت کو اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے جو دین تم لائے ہو ہم اس کے کافر (منکر) ہیں۔"

انبیاء کرامؑ کے مخالفین میں ہمیشہ سب سے آگے وہی افراد دکھائی دیئے جو مختلف ذرائع سے زمینوں کو ہڑپ کرنے اور ان کے مالکوں کو تاراج و غارت کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ انسانوں کو اپنا مزدور و غلام بنا کر خود تمام مال و دولت کے مالک بن بیٹھتے پھر اسی دولت کے ذریعے پورے معاشرہ پر حاکمانہ تسلط جما لیتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر ان ہی انسانوں سے اکھٹا کی ہوئی دولت کے بل بوتے پر ان ہی کے سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے تھے۔ اور ان پر مکر و فریب اور ظلم و ستم کے سنگین پہاڑ توڑتے تھے تاکہ ان کے عیش و عشرت، شان و شوکت اور قوت و قدرت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ یہ لوگ انسانی معاشرہ کے لئے ہمیشہ سب سے بڑی بلا رہے ہیں اور اصلاحی اقدامات کی راہ میں روڑا ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ عدالت، برابری اور حق و انصاف کا بول بالا، ان کی انسانوں کو اسیر کرنے اور قید و بند میں جکڑے رکھنے کی روش کا ہمیشہ سے مخالف ہے۔ تاریخ میں ہمیں انبیاء کرامؑ کے ایسے مخالفین بے شمار نظر آئیں گے۔

چنانچہ انبیاءؑ، تین محاذوں پر نبرد آزما رہے اور اپنی تبلیغ کی راہ میں تین گروہوں سے لوہا لیتے رہے۔ ایک گمراہ کرنے والوں کا گروہ ــ دوسرا گناہ گاروں کا گروہ ــ تیسرا منفعت پرستوں کا گروہ۔

اَب ہم دیکھیں کہ ان سرکشوں کے مقابلے میں انبیاء کرامؑ کی تبلیغی روش کیا تھی۔

انبیاءؑ کی تبلیغ کا انداز

بہتر ہے کہ اس بحث کے ایک حصہ کے لئے سورۂ نحل کی حسب ذیل دو آیتوں ۱۲۵-۱۲۶ کو بنیاد قرار دیا جائے :-

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ......" تا آخر

"لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر محکم اور منطقی استدلال، وعظ و نصیحت اور جدال و مباحثہ کی بہترین روش کے ذریعہ بلاؤ"۔

اس آیت کریمہ سے انبیاء کرامؑ کی دعوت کی تین روشیں ظاہر ہوتی ہیں :-

۱ـــــ عقلی اور استدلالی روش

حکمت، وہی بنیادی و مستحکم تصور کائنات ہے جو روشن فکری اور عقل و منطق کے پایوں پر استوار ہو اور یہ دعوت اسلام کی وہ سب سے پہلی روش ہے جس میں دلیل و برہان اور غور و فکر کے ذریعہ تبلیغ کا آغاز کیا جاتا ہے۔ یہ آسمانی ادیان کا سب سے بڑا امتیاز ہے کہ ان میں تبلیغ کی بنیاد، حقیقت شناسی اور حقیقت بینی پر رکھی گئی ہے یہ ادیان اپنی حقیقت بیانی پر اس قدر مطمئن ہیں کہ اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے لوگوں کو تعقل اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے افکار جس قدر روشن ہوں گے اور جس قدر وہ اپنی عقل کو بروئے کار لائے گا اور استدلالات کی راہ اپنائے گا اسی قدر حقیقتیں اس پر واضح ہوتی جائیں گی اور وہ انبیاءؑ کی دعوت کی صحت پر ایمان لاتا چلا جائے گا۔

۲ـــــ وعظ و نصیحت

پہلی روش میں انسان کی عقل کام کرتی ہے اور اس دوسری روش میں اس کے جذبات و

احساسات متأثر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ محکم دلیلوں سے قانع و مطمئن تو ہو جاتے ہیں لیکن اس مدلل بات کو قبول نہیں کرتے۔ یا زبان سے تو اعتراف کرتے ہیں لیکن اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

موعظہ روح کو متأثر کرتا ہے۔ اسے لطیف اور پاک بناتا ہے۔ ہوا و ہوس، خود سری و خود غرضی کے پردوں کو چاک کر کے انسان کے جذبات و احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ ان میں تحرک پیدا کرتا ہے اور اس کے بعد تفکروں کو مہمیز کرتا ہے۔ کتنے ایسے افراد ہیں جو نصیحت کے چند جملوں سے متأثر ہو کر اچانک آپے میں آجاتے ہیں اور اپنی غلط کاریوں سے توبہ کر لیتے ہیں ان ہی کے مقابل ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے ہزاروں دلیلیں دے ڈالتے ہیں لیکن اس کے باوجود نہ خدا ان کی روح پر اثر انداز ہے نہ قلب میں اس کی کوئی جگہ ہوتی ہے اور نہ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

انبیاء کرامؑ کی بشارت۔ انذار۔ تذکر اور ارشاد کو اسی آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ قرآن میں ہمیں بہت سی جگہوں پر نظر آتا ہے کہ انبیاء "مبشر" و "نذیر" ہیں۔ یعنی روشن و درخشاں اور مطمئن مستقبل کی بشارت دیتے ہیں اور بدبختی و عذاب ابدی سے ڈراتے ہیں۔

اس کے علاوہ انبیاء "مُذَکِّر" ہیں۔ یعنی لوگوں کو ان کی پاکیزہ فطرتوں کی طرف بلاتے ہیں۔ کثافتوں اور آلودگیوں کے پردوں کو چاک کر کے انھیں فراموش شدہ حقائق یاد دلاتے رہتے ہیں۔

۳۔ بہترین مجادلہ

بعض لوگ ہر حال میں اپنے حریف کو بحث و مباحثہ کے ذریعہ نیچا دکھانا اور ساکت کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ محکم و مدلل استدلال اور وعظ و نصیحت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ہمیشہ ہیر پھیر کر مختلف راہیں اختیار کرتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوالیں اور حریف و مقابل کو زیر کر دیں۔

ایسے لوگوں کے مقابلہ میں کبھی خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ کیونکہ ممکن ہے ان کی

بے ربط بحث اور نفظی بکواس دوسروں کی گمراہی کا سبب بن جائے لہذا ان لوگوں پہلے ہی کے حربوں کا استعمال کرنا چاہیئے یعنی پے در پے ان کی باتوں کو کاٹنے اور رد کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جس بات کو وہ تسلیم کریں، جس نکتے کا سہارا لیں اسی کے ذریعہ ان پر وار کرنا چاہیئے۔

لیکن چونکہ اس طرح کی بحثیں اور مجادلے معمولاً حق کشی گرما گرمی اور فحش و نازیبا باتوں پر تمام ہوتے ہیں لہذا قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی بحثوں کے لئے مجادلہ کی بہترین روش کا انتخاب کرو اور ہر طرح کی کج روی، آزار اور ناروا گفتگو سے پرہیز کرو لیکن کبھی کبھی کاٹ کرنے اور خاموش کر دینے والی روش کو بھی اپنانا چاہیئے تاکہ دعوت الہٰی کند نہ پڑنے پائے۔

۴ـــــ جیسے کو تیسا

سورۂ نحل، آیت: ۱۲۶ میں ارشاد ہے :ـ

"وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ"

"یعنی اگر تم انہیں سزا دینا چاہتے ہو تو ویسی ہی سزا دو جیسی انہوں نے تمہیں اذیت و سزا دی تھی ....."

یہ اشارہ اس صورت حال کی طرف ہے کہ جس میں اکثر انبیاء کرامؑ اپنی منطقی باتوں اور نصیحتوں کے بدلے میں مخالفوں کے ظلم و ستم اور اذیتوں کا شکار ہوتے تھے۔ دشمن ان کے استدلالات اور حق باتوں کے جواب میں انھیں تکلیفوں اور اذیتوں میں مبتلا کرتے تھے۔ اگر کہیں ایسی صورت حال پیدا ہو تو اپنی بات پر استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنا چاہیئے باز نہیں آنا چاہیئے اور نہ تبلیغ سے دستبردار ہونا چاہیئے۔ اور اگر اپنا دفاع کرنے کی نوبت آئے تو ہوشیار رہنا چاہیئے کہ اپنا دفاع کرتے کرتے کہیں نوبت ظلم و زیادتی تک نہ پہنچ جائے۔

اپنی گذشتہ بحثوں کی تکمیل کے لئے ہم سورۂ حدید کی آیت: ۲۵ کو پیش کرتے ہیں :ـ

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ

بَأْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔"

"درحقیقت ہم نے اپنے پیغمبروں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب و میزان نازل کی تاکہ وہ لوگوں کو عدل و انصاف پر قائم و استوار کریں۔ اور ہم نے لوگوں کے لئے لوہا نازل کیا جس میں سختی اور بے انتہا قوت موجود ہے اور لوگوں کے لئے بے شمار فائدے ہیں تاکہ خدا جان لے کہ کون لوگ خدا اور اس کے رسولؐ کی غائبانہ نصرت و مدد کرتے ہیں۔ بے شک خدا قوی و عزیز ہے۔"

اس آیت کی ابتدا میں کتاب اور عدل و انصاف کی بات کہی گئی ہے اور ہم اس سلسلہ میں بحث کر چکے ہیں۔ انبیاء کرامؑ ایک طرف تو انسانوں کے لئے علم، تہذیب و ادب، کتاب اور قانون لائے اور دوسری طرف عدل و میزان بھی پیش کیا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک ضروری چیز اور بھی ہے اور وہ ہے قومی و دفاعی طاقت۔ یعنی تمدن و عدالت، قانون و برادری کو رائج کرنے کے لئے اگرچہ منطقی و تبلیغاتی روش بہت ضروری اور مفید ہے لیکن یہ روش ہمیشہ کافی نہیں ہوتی۔ حق و عدالت کے اجراء کے لئے قوت و طاقت بھی لازم ہے ورنہ قانون و عدالت کے مخالف جو اپنے نفع کی تلاش میں رہتے ہیں اور سمجھانے بجھانے کی روش سے کبھی عدل و انصاف کو تسلیم نہیں کرتے انہیں قہر و غضب اور طاقت کے ذریعہ رام کرنا چاہیئے۔ اور ان کی غلط کاریوں کی راہ مسدود کردینا چاہیئے۔

ساتھ ہی عادلانہ ماحول اور قانونی فضا ہمیشہ ان ظالم اور منفعت پرست افراد سے محفوظ نہیں رہتی لہٰذا اس کی تقویت و حفاظت کے لئے مؤثر دفاعی طاقت کا انتظام بھی ضروری ہے تاکہ ایسے خطرات کا مقابلہ کیا جاسکے۔

حیلہ سازی اور دھوکہ دھڑی سے پرہیز

سورۂ آل عمران کی آیت: ۱۶۱ میں ارشاد ہے:۔

"مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

کسی بھی پیغمبر نے حیلہ گری یا دھوکہ دھڑی سے کام نہیں لیا ہے۔ اور جو شخص بھی حیلہ، دھوکہ یا فریب سے کام لے گا روز قیامت وہی مکر و فریب اپنے ساتھ لائے گا اور اسی میں گرفتار ہوگا۔

معمولاً قوت و طاقت کے ٹکراؤ میں حیلہ بازی اور مکر و فریب کو نمایاں دخل رہتا ہے۔ اور شاید بنیادی طور پر اسی کو مصلحت اندیشی کا رنگ دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس سے ہمارا مقصد ایک مقام و منزلت حاصل کرنا ہے تاکہ اس کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح و خدمت کی جائے لہٰذا ضروری ہے کہ ہر ممکن ذرائع سے اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔

لیکن انبیاء کرامؑ نے نہ صرف اپنے شخصی مفاد کی راہ میں ان ذرائع کو نہیں اپنایا بلکہ اپنے مقدس مقاصد کی راہ میں بھی ایسی ناپسندیدہ روشوں سے استفادہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ یہ حضرات خود جھوٹ مکر و فریب حیلہ و تزویر جیسی لعنتوں کا خاتمہ کرنے آئے تھے ان کو اپنانے یا انھیں بڑھاوا دینے نہیں آئے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ میں ہمیں برابر ایسی تصویریں نظر آتی ہیں کہ آپ نے حیلہ و سازش سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ آپ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ ایک سال آپ ہمارے بتوں کی پرستش کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے یا ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی آپ کا جانشین منتخب ہو۔ یا یہ مشورہ کہ نماز میں امیروں اور غریبوں کی صفیں الگ الگ ہونا چاہیئے۔ یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ... آپ نے سختی سے ان سب کو رد کردیا۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ وقتی طور پر کوئی ایک بات مان کر اپنی قوت کو بڑھا لیا جاتا پھر ان سے کام لیتے ہوئے اپنی قوت و طاقت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے بعد مختلف بہانوں سے ان باتوں سے انکار کردیا جاتا۔ لیکن آپ نے ایسا نہ کیا اور بالکل واضح انداز میں اپنی سچی و سیدھی راہ پر ڈٹے رہے ان تمام وقتی منافعوں سے دوری اختیار کی جو غلط اور آلودہ تھے۔ اور ہم نے دیکھا کہ آخر کار وسیع و عظیم کامیابیوں نے آپ کے قدم چومے یہی صورت حال ہمیں حضرت علیؑ کی حکومت میں معاویہ سے ساز باز نہ کرنے کی شکل میں نظر آتی ہے

معلوم ہوا کہ انبیاء کرامؑ اور اولیاء الٰہیؑ نے اپنی ہدایت کی راہ میں کبھی خیانت۔ حیلہ سازی

جھوٹ یا مکروفریب سے کام نہیں لیا ۔
آخر میں ہم انبیاء کرامؑ کی دو تین بنیادی روشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

استقامت و پائداری

سورہ شوریٰ آیت : ۱۵ میں ارشاد ہے کہ :-

" فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ "

" اے نبیؐ! اس سلسلہ میں ، دوسروں کو راہِ حق کی طرف بلایئے اور جس امر پر آپ مامور کئے گئے ہیں اس پر استقامت و پائداری سے جمے رہیئے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے ۔

اس سے قطع نظر کر مجموعی طور پر ہمیں انبیاء کرامؑ کی تاریخ میں سب سے زیادہ استقامت و پائداری نظر آتی ہے دراصل ان کی زندگیاں ہر طرح کی رکاوٹوں ، سختیوں اور رنج و آزار کی راہ میں پورے طور سے متحمل و بردبار نظر آتی ہیں ۔ بڑی سے بڑی رکاوٹوں اور سختیوں کے درمیان سے راستہ بنا کر اپنے مقصد کی جانب قدم بڑھانا ان ہی کا کارنامہ ہے ۔ اس کے علاوہ قرآن میں بھی مذکورہ آیت کی مانند ایسی آیتیں ملتی ہیں جو انبیاء کرامؑ پر خاص طور سے یہ فرض عائد کرتی ہیں ۔

بہترین روش

سورۂ فصلت ، آیت : ۳۴ میں ارشاد ہے :-

" اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۔

" بہترین راہ و روش کے ذریعہ بُرائی کو روکو ، تم دیکھو گے کہ جو تمہارے اور اس کے درمیان دشمن تھا تمہارا دوست اور ہوا خواہ ہو گیا ہے ۔

قرآن کے اس حکم میں پیغمبر اسلام ہر ممکن بہترین وسائل کے ذریعہ برائیوں کو روکنے اور دفع کرنے پر مامور کئے گئے ہیں ۔ مختلف حالات اور گوناگوں اوقات میں بہترین روش کا انتخاب

فرق رکھتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کہاں عفو و درگذر۔ کہاں سختی اور قوت و طاقت۔ کن حالات میں شیریں گفتاری اور محبت و مہربانی اور کیسے مواقع پر طاقت کا استعمال۔ گمراہ، ظالم اور جابر افراد کی ہدایت کے لئے کامیاب ہو سکتا ہے۔

ایمان میں جبر نہیں

- اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱)

"کیا تم، لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے ہو"؟

ایمان ایک ایسا امر ہے جو قلبی ہے، وہ روح اور احساس سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی ایمان ہدف و مقصد سے لگاؤ اور چاہت کے ساتھ ایک مستحکم رابطہ ہے۔ یہ رابطہ اور قلبی لگاؤ کسی طاقت یا زور زبردستی سے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ دل زبردستی یا اسلحہ کی حکومت کو قبول نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ زبان کسی سختی کے تحت کچھ کہہ دے یا ہاتھ کسی کام کو انجام دے دیں لیکن کوئی سختی یا کوئی اسلحہ قلب، افکار اور ایمان کی فضا کو بدل نہیں سکتا۔

انبیاء کرامؑ نے کبھی لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ کلیسائی طاقتوں کے ہاتھوں انسانوں کے دلدوز قتل عام یا گذشتہ ادیان کے ماننے والوں کے ذریعہ ہونے والی غیر انسانی قتل و غارت گری کا انبیاء کرامؑ کی اصل دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انبیاء کرامؑ دعوت حق، نصیحت، موعظہ۔ استدلال، خدمت، مشکل کشائی اور بے پناہ و محروم افراد کی نصرت اور نجات کے ذریعہ دلوں کو فتح کرتے اور ان میں ایمان کی فضا قائم کرتے تھے۔ ہم اسے دوسری جگہ پر ذکر کریں گے کہ اس راہ میں جو جنگیں پیش آئی ہیں وہ یا دینی معاشرہ و مرکز کے دفاع کے لئے لڑی گئیں یا ظالم خائن اور ستمگر افراد کی سرکوبی کے لئے تاکہ ماحول کو ان کے شر سے پاک کیا جائے، انسان ان جباروں کے ظلم کے پنجوں سے آزاد ہوں اور پوری آزادی کے ساتھ حق اور خوش بختی کی راہ پر آئیں اور اسے دل و جان سے قبول کریں۔

۱۔ سورۂ یونس آیت ۹۹

انبیاء کرامؑ کی دعوت کا انجام

سورہ یونس آیت: ۱۰۳ میں ارشاد ہے

"ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ"

"سرانجام ہم انبیاء کرام اور مومنین کو نجات بخشیں گے۔"

ہم قرآن کی بہت سی آیتوں میں یہ مفہوم دیکھتے ہیں کہ آخر کار انبیاء کرامؑ، مومنین اور صالح افراد کامیاب ہوں گے اور انھیں روئے زمین پر قدرت و حاکمیت حاصل ہوگی (سورہ آل عمران آیت: ۱۳۹ - سورہ انعام آیت: ۱۳۵ - سورہ انبیاء آیت: ۱۰۵ - سورہ حج آیت: ۴۰ - سورہ نور آیت: ۵۵) اس طرح کی آیتوں کے بیان سے متعلق یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ صاحبان ایمان کی یہ فتح و کامرانی اور ان کی حاکمیت کا تعلق آخرت سے نہیں ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے ان آیتوں کے مطلق ہونے کے ساتھ ساتھ بعض آیتوں میں ان کی دنیاوی کامیابیوں کا صراحت کے ساتھ ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا جانا غلط نہ ہوگا کہ اُن کے ماحول و علاقہ کے اعتبار سے انہیں ایک محدود پیمانہ پر یہ کامیابیاں حاصل بھی ہوئی ہیں۔

کیونکہ ہمیں تمام انبیاءؑ کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اور بدخواہوں کی جانب سے کیئے جانے والے اقدامات کے باوجود انبیاءؑ اور ان کے باایمان اصحاب و انصار اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے رہے اور ماحول ان کے حق میں سازگار ہوتا رہا۔

ہم آیات کے دامن کو اس سے بھی زیادہ وسیع پاتے ہیں اور یہ آیتیں ــــــ انبیاء کرامؑ کے مکتب و مقصد کو کامل اور وسیع کامیابی کی شکل میں اسی دنیا میں واضح کرتی ہیں۔ البتہ اکثر یہ آیتیں تاریخی پیشین گوئی کا پہلو بھی رکھتی ہیں اور انسانیت کا مستقبل اس حقیقت کی تائید کرے گا کہ ایسا زمانہ آنے والا ہے۔ خصوصاً ہم اسلامی روایات میں اسلام کے لئے ایسے مستقبل کو امام زمانہؑ کے ظہور کے آئینہ میں دیکھتے ہیں ۔ یہ وہ زمانہ ہوگا جب انبیاء کرامؑ

کا مکتب و مقصد پورے طور سے پروان چڑھے گا اور حق سارے عالم میں کامیابی سے ہم کنار ہو گا اور کہیں سماج و معاشرہ کی قطعی و اٹل سنّت کا ذکر ہے جسے خدا نے معین کر رکھا ہے یعنی ایمان، عمل صالح، تقویٰ، پرہیز گاری اور شائستگی بہر حال ارتقاء و کامیابی کا سبب ہے۔

اگر لوگ ان انسانی اصولوں پر جنہیں اعلیٰ سطح پر سنن الٰہیہ کہا جاتا ہے ایمان رکھیں یعنی پوری سچائی سے ان اصولوں کو قائم کرنے کی کوشش کریں، ان پر اعتماد کریں پورے طور سے باہمی اتحاد و اتفاق برقرار کریں، اپنے وظائف بخوبی انجام دیں اور ہر حال میں نیک اعمال بجا لائیں تو کامیابیاں ان کے قدم ضرور چومیں گی۔

ہم جانتے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح بڑی وسعت و گہرائی رکھتے ہیں۔ خاص طور سے ایمان کی جو وضاحت توحید کی بحث میں گزر چکی ہے اس آئینہ میں اسے معاشرہ اور سماج کی ارتقا و پیشرفت کے لئے اعلیٰ و ارفع پاکیزہ اصولوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

عمل صالح، بہترین روش کے تحت بہترین امور کی انجام دہی کا نام ہے۔ عمل، تدبیر و دور اندیشی اور مطلوبہ تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ پیہم باہمی تعاون نیز ہر عیب و نقص سے پاک، سستی و کاہلی سے دور، تجربہ اور مسلسل جد و جہد کے ذریعہ خوب و بہتر انجام پاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا ایمان اور ایسا عمل بہترین نتائج بھی فراہم کرے گا۔ سورۂ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں تفصیل کے ساتھ یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ایمان اور عمل صالح ـــــ انجام دینے والوں سے حکومت و طاقت، ہر دلعزیزی، دین کی ترقی، امن و امان اور ہر طرح کے شرک و خرافات کے خاتمہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا یوں ہے:۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"...

"خدا نے تمہارے درمیان ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، وعدہ کیا ہے ... (مائدہ/۹)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وعدہ ان لوگوں سے نہیں کیا گیا ہے جو صرف اسلامی معاشرہ میں زندگی گزارتے ہیں اور نام کے مسلمان ہیں۔ بلکہ ان کی کامیابیاں ایمان و عمل صالح کا نتیجہ ہیں۔ یہ "مِنْكُمْ" کی تعبیر اس آیت کے شاہکار میں سے ہے۔ چنانچہ یہ

ارتقاء بشریت اور یہ درخشاں مستقبل حقائق و واقعیات کا نتیجہ ہیں صرف نام و عنوان کے اپنانے سے حاصل نہیں ہوتے۔

ان آیات کی ایک دوسرے رخ سے بھی وضاحت کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ انسانی معاشرہ مجموعی طور پر کمال کی جانب بڑھ رہا ہے یعنی انسان فکر، تمدن اور صنعت وغیرہ کے لحاظ سے محسوس طور پر ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ البتہ یہ فیصلہ بشریت کے لئے مجموعی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ ممکن ہے کہ کوئی مخصوص معاشرہ اپنی زندگی کے کسی دور میں زوال و انحطاط کی طرف مائل اور ترقی کے بجائے تنزلی کی منزلیں طے کر رہا ہو، یا مثلاً کسی زمانہ میں مشینی تہذیب تو ارتقاء کی راہیں طے کر رہی ہو لیکن اخلاق معیارات و اقدار کچلے جا رہے ہوں۔ یا پھر حق کشی جنگ و جدال، فتنہ و فساد اور انقلابات کا بازار گرم ہو، اس کے باوجود انسانی معاشرہ ترقی کی راہیں طے کرتا نظر آئے۔ یہ ارتقائی و تکاملی سفر جو پورے عالم خلقت کے اندر نظر آتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں بھی جاری و ساری ہے۔

امامت و رہبری

امامت
قرآن کی روشنی میں

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

اس سے قبل ہم نے آیت "الیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الاِسْلَامَ دِیْنًا (۱) کے سلسلہ میں بحث کی تھی اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ خود آیت کے اندر موجود قرائن اور ان کے علاوہ اس سے متعلق دوسرے آثار و شواہد، یعنی آیت کی شان نزول کے تحت شیعہ و سنی ذرائع سے وارد ہونے والی روایات بھی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت واقعہ غدیر خم سے تعلق رکھتی ہے۔

چونکہ اس موضوع کے ذیل میں قرآن کی آیتیں ہماری بحث کا محور ہیں یعنی وہ آیتیں جن سے شیعہ اس باب میں استدلال کرتے ہیں لہٰذا ہم مزید دو تین آیتیں جنہیں علمائے شیعہ استدلال میں پیش کرتے ہیں یہاں ذکر کر رہے ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ استدلال کا طریقہ کیا ہے؟

ان آیات میں سے ایک اسی "سورہ مائدہ" کی آیت ہے جو مذکورہ بالا آیت سے تقریباً ساٹھ آیتوں کے بعد ذکر ہوئی ہے اور وہ یہ ہے: یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ

۱۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۳

مِنْ رَبِّكَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ/۶۷) اے پیغمبر جو کچھ آپ کے پروردگار کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو رسالت کی تبلیغ نہیں کی اور اپنا فریضہ ادا نہیں کیا۔ خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے مقدمہ کے طور پر کچھ باتیں ذکر کرنا ضروری ہیں تاکہ اس آیت کے مفاد کی وضاحت ہو جائے نیز یہ مقدمہ گذشتہ آیت کے تحت بیان کئے گئے مطالب کے لئے بھی معاون و مددگار ثابت ہو گا۔

اہل بیتؑ سے متعلق آیات کا خاص انداز

یہ بات واقعاً ایک اسرار کی حیثیت رکھتی ہے کہ مجموعی طور پر قرآن میں اہل بیتؑ سے متعلق آیتیں اور خصوصاً وہ آیتیں جو کم از کم ہم شیعوں کے نقطۂ نظر سے امیرالمومنینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ایک خاص وضع و کیفیت کی حامل ہیں۔ اور وہ یہ کہ خود اس آیت کے اندر مطلب کی حکایت کرنے والی دلیلیں اور قرائن تو پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کوشش بھی نظر آتی ہے کہ اس بات کو دوسرے مطالب کے درمیان یا دوسری باتوں کے ضمن میں بیان کرتے ہوئے گزر جایا جائے۔ اس پہلو کو جناب محمد تقی شریعتی نے اپنی کتاب "ولایت و خلافت" کی ابتدائی بحثوں میں نسبتاً اچھے انداز سے بیان کیا ہے اگرچہ دوسروں نے بھی اس نکتہ کو بیان کیا ہے لیکن فارسی میں شاید پہلی بار انہوں نے ہی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ان لوگوں کا جواب بھی ہو جائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تھا کہ علی (ع)، پیغمبر (ص) کے جانشین ہوں، تو پھر قرآن میں صاف صاف ان کے نام کا ذکر کیوں نہیں ہے۔

آیت تطہیر

مثال کے طور پر آیت تطہیر کو لے لیں "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" (احزاب/۳۳) اس آیت کے بارے میں دریافت کیا

جائے تو ہم کہیں گے کہ اس کا مفہوم و مطلب بالکل واضح ہے۔ اللہ نے یہ ارادہ کیا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ (اہل بیتؑ) تم سے کثافتوں کو دور کرے، تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا اور تمہیں مخصوص نوعیت اور خاص انداز میں تطہیر و پاکیزہ رکھے یا کرے۔ ظاہر ہے کہ جس تطہیر کا ذکر خدا کر رہا ہے وہ عرفی یا طبی تطہیر نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا تم سے بیماریوں کو دور کرنا چاہتا ہے یا (معاذ اللہ) تمہارے بدن کے امراض کے جراثیم کو زائل کر رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ تطہیر کا مصداق نہیں ہے۔ لیکن مسلم طور پر جس تطہیر کو خدا اس آیت میں بیان فرما رہا ہے اس سے مراد پہلی منزل میں وہ تمام چیزیں ہیں جنہیں خود قرآن رجس کا نام دیتا ہے۔ قرآن کے بیان کردہ رجس در رجز وغیرہ یعنی وہ تمام چیزیں جن سے قرآن منع کرتا اور روکتا ہے اور جنہیں گناہ شمار کیا جاتا ہے چاہے وہ اعتقادی گناہ ہو، اخلاقی گناہ ہو یا عملی گناہ۔ یہ سب رجس و کثافت ہیں۔ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ اس آیت سے مراد عصمت اہل بیتؑ ہے یعنی ان کا ہر طرح کی کثافت اور آلودگیوں سے پاک و پاکیزہ ہونا۔

فرض کیجئے کہ نہ ہم شیعہ ہیں نہ سنی، بلکہ ایک عیسائی مستشرق ہیں، عیسائی دنیا سے نکل کر آئے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی کتاب (قرآن) کیا کہنا چاہتی ہے ہماری نظر قرآن کے اسی جملہ پر پڑتی ہے پھر ہم اس سے متعلق مسلمانوں کی تاریخ اور سنن و احادیث کا جائزہ لیتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف وہ فرقہ جسے شیعہ کہتے ہیں اور جو اہل بیت (ع) کا طرفدار ہے بلکہ وہ فرقے بھی جو اہل بیتؑ کے کوئی خصوصی طرفدار نہیں ہیں اپنی معتبر ترین کتابوں میں جب اس آیت کی شان نزول بیان کرتے ہیں تو اسے اہل بیتؑ پیغمبرؐ کی فضیلت قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس واقعہ کے تحت یہ آیت نازل ہوئی اس میں حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ اور خود حضرت رسول اکرمؐ موجود تھے اور اہل سنت کی احادیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو زوجۂ رسول اکرم ام سلمہ (۱) آنحضرتؐ کی خدمت میں آئیں اور عرض کی یا رسول اللہ (ص) "اہل بیتؑ" میں

۱۔ یہ معظمہ شیعوں کے نزدیک بہت محترم ہیں۔ اور خدیجہؑ کے بعد پیغمبر اکرم (ص) کی سب

میرا بھی شمار ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا تم خیر پر ہو لیکن ان میں شامل نہیں ہو۔ عرض کر چکا ہوں کہ اہل سنت کی روایات میں اس واقعہ کے حوالے ایک دو نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں یہی آیت ہمیں اپنے مفہوم سے مختلف دوسری آیات کے درمیان نظر آتی ہے۔ اس سے قبل و بعد کی آیتیں ازواج پیغمبرؐ سے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے کی آیت یہ ہے "یَا نِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ"[1] اے ازواج پیغمبرؐ! تم دوسری عورتوں جیسی نہیں ہو تم میں اور دوسری عورتوں میں فرق ہے۔ (یقیناً قرآن یہ نہیں کہنا چاہتا کہ تم دوسروں پر امتیاز رکھتی ہو)، تمہارا گناہ دگنا اور دُہرا ہے کیونکہ اگر تم گناہ کروگی تو ایک گناہ تو یہ ہے کہ تم نے وہ عمل بدانجام دیا اور دوسرے یہ کہ اپنے شوہر کی رسوائی کی مرتکب ہوئیں۔ اس طرح دوگناہ تم سے سرزد ہوئے۔ یوں ہی تمہارے نیک اعمال بھی دوہرا اجر رکھتے ہیں کیونکہ تمہارا ہر عمل خیر دو عمل کے برابر ہے۔ بالکل یوں ہی جیسے کہا جاتا ہے کہ سادات کرام کے کار خیر کا ثواب اور بُرے عمل کا گناہ دُوہرا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا ایک گناہ سنگین ہو جاتا ہے اور فرق رکھتا ہے۔ بلکہ ان کا ایک گناہ دوگناہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سید (معاذ اللہ) شراب پیے۔ تو وہ شراب پینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے عمل کا بھی مرتکب ہوا ہے، اور وہ یہ کہ چونکہ وہ پیغمبرؐ اور آل پیغمبرؐ سے منسوب ہے لہٰذا اپنی شراب نوشی کے ذریعہ پیغمبر (ص) کی ہتک و رسوائی کا مرتکب بھی ہوا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ پیغمبرؐ کی اولاد اس قدر کھلم کھلا ان کے حکم کے خلاف عمل کر رہی ہے تو اس کی روح پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوگا۔

ان آیات میں تمام ضمیریں مؤنث کی استعمال ہوئی ہیں "لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ" صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد ازواج پیغمبر اکرمؐ ہیں۔ دو

سے زیادہ جلیل المرتبت زوجہ ہیں۔ اہل سنت کے یہاں بھی بہت محترم ہیں اور ان کی نگاہ میں خدیجہؑ و عائشہ کے بعد امّ سلمہؑ ہی معظم و محترم خاتون ہیں۔

1۔ سورۂ احزاب آیت ۳۲

تین فقروں کے بعد یک بیک ضمیر مذکر ہو جاتی ہے اور ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں،
"اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡھِبَ عَنۡکُمُ (عَنۡکُنَّ نہیں ہے) الرِّجۡسَ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَھِّرَکُمۡ تَطۡھِیۡرًا" اس کے بعد دوبارہ مؤنث کی ضمیریں استعمال ہونے لگتی ہیں
قرآن کا کوئی لفظ عبث اور غلط نہیں ہے۔ اولاً یہاں کلمہ "اہل البیت" استعمال ہوا ہے۔
اور اس کے پہلے ازواج رسول کا تذکرہ ہے "یَانِسَآءَ النَّبِیِّ" یعنی "نساء النبی" کا عنوان "اہل البیت" میں تبدیل ہو گیا اور دوسرے مؤنث کی ضمیر مذکر میں تبدیل ہو گئی یہ سب لغو اور عبث نہیں ہے۔ ضرور کوئی دوسری چیز ہے۔ یعنی قرآن گذشتہ آیات سے الگ کوئی دوسری بات کہنا چاہتا ہے۔ آیت تطہیر سے قبل و بعد کی آیتوں میں ازواج پیغمبر اکرم (ص) کے لئے حکم، دھمکی اور خوف و رجاء کا انداز پایا جاتا ہے، "وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاھِلِیَّۃِ" "اپنے گھروں میں رہو اور زمانہ جاہلیت کے مانند اپنے بناؤ سنگھار کو دکھاتی نہ پھرو۔ گویا ایک کے بعد ایک حکم اور تہدید و دھمکی ہے۔ ساتھ ہی خوف و رجاء بھی ہے کہ اگر نیک اعمال بجالاؤ گی تو ایسا ہو گا اور اگر برے اعمال کرو گی تو ویسا ہو گا۔

یہ آیت یعنی (آیت تطہیر) صحیح سے بالاتر ایک بات ہے قرآن اس میں اہل بیت کی گناہ و معصیت سے پاکیزگی اور طہارت کے مسئلہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ اس آیت کا مفہوم اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں کے مفہوم و مطلب سے یکدم الگ ہے۔ یہاں اہل بیت سے خطاب ہو رہا ہے اور وہاں ازواج رسول سے۔ یہاں مذکر کی ضمیر ہے اور وہاں مؤنث کی۔ لیکن یہی آیت (تطہیر) جس کا مفہوم و مطلب پہلے اور بعد کی آیتوں سے اس قدر مختلف ہے، ان آیات کے درمیان میں قرار دی گئی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو اپنی گفتگو کے دوران الگ سے ایک بات کہہ کر گفتگو کے سلسلہ کو پھر جوڑ دیتا ہے۔ اور اپنی بات جاری رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی روایات میں بڑی تاکید سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ممکن ہے قرآنی آیات کی ابتدا میں کوئی ایک مطلب بیان ہوا ہو۔ درمیان میں کوئی دوسرا مطلب اور آخر میں کوئی تیسری بات کہی گئی ہو۔ اور قرآن کی تفسیر کے مسئلہ کو ان

حضرات نے جو اتنی اہمیت دی ہے اس کا سبب بھی یہی ہے۔
یہ بات صرف ہماری روایات اور ائمہؑ کے ارشادات میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اہل سنت حضرات نے بھی ان تمام مطالب کو نقل کیا ہے کہ "اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ . . . ." اپنے پہلے اور بعد کی آیتوں سے فرق رکھتی ہے۔ اس آیت کا مضمون اور اس کے مخاطب بھی الگ ہیں۔ یہ آیت ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو اس واقعہ (کساء) میں شامل ہیں۔

دوسرا نمونہ

آیت "اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ" میں بھی ہمیں یہی بات نظر آتی ہے۔ بلکہ یہاں مذکورہ بالا آیت تطہیر سے زیادہ عجیب انداز نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے کی آیت میں بہت ہی سادے اور معمولی مسائل ذکر کئے گئے ہیں "اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ" (۱) چوپایوں کا گوشت تمہارے لئے حلال ہے۔ ان کا تزکیہ یوں کرو اور اور اگر مردار ہو تو حرام ہے۔ وہ جانور جنہیں تم دم گھونٹ کر مار ڈالتے ہو (مُنۡخَنِقَۃ) حرام ہیں اور وہ جانور جو ایک دوسرے کے سینگ مارنے سے مر جاتے ہیں ان کا گوشت حرام ہے اور . . . پھر یک بیک ارشاد ہوتا ہے "اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَاخۡشَوۡنِ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا" اس کے بعد دوبارہ مسائل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جو پہلے بیان ہو رہے تھے۔ مذکورہ آیت کے یہ جملے اپنے پہلے اور بعد کی آیتوں سے سرے سے میل نہیں کھاتے۔ یعنی یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ یہ وہ بات ہے جو دوسرے مطالب کے درمیان الگ سے سرسری طور پر بیان کردی گئی ہے اور پھر اسے ذکر کرکے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس وقت ہم جس آیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں (آیت بَلِّغۡ) اس کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی وہ

۱۔ سورۂ مائدہ، آیت نمبر ۱

بھی ایسی آیت ہے کہ اگر ہم اسے اس سے پہلے اور بعد کی آیات کے درمیان سے نکال دیں تو بھی اُن آیتوں کا ربط کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتا۔ جیسے کہ آیت "الیَومَ اَکمَلتُ" کو اس کی جگہ سے ہٹا دیں تو اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا یوں ہی زیر بحث آیت میں دوسری آیات کے درمیان ایک ایسی آیت ہے کہ نہ اسے ماقبل کی آیتوں سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور نہ مابعد کی آیتوں کا مقدمہ، بلکہ اس میں ایک دم الگ سے بات کہی گئی ہے ــــ یہاں بھی خود آیت میں موجود قرائن اور شیعہ و سنی روایات اسی مطلب کی حکایت کرتی نظر آتی ہیں، لیکن اس آیت کو بھی قرآن نے ایسے مطالب کے درمیان رکھا ہے جو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے اس میں ضرور کوئی راز ہوگا، آخر اس کا راز کیا ہے؟

اس مسئلہ کا راز: اس میں جو راز پوشیدہ ہے، خود قرآن کی آیت کے اشارے سے بھی ظاہر ہے اور ہمارے ائمہ (ع) کی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و دستورات میں آلِ پیغمبر ص کا مسئلہ یعنی امیر المؤمنین کی امامت اور خاندان پیغمبر کی خصوصیت ہی ایسا مسئلہ اور ایسا حکم تھا جس پر بدقسمتی سے سب سے کم عمل ہو سکا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ اہل عرب اپنی روح کی گہرائیوں میں تعصبات رکھتے تھے جس کے سبب ان میں اس مطلب کے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی آمادگی بہت ہی کم نظر آتی تھی اگرچہ پیغمبر اکرم ص کی خدمت میں امیر المومنین ع سے متعلق حکم پہنچتے تھے لیکن حضرت ص ہمیشہ اس تردد میں رہتے تھے کہ اگر میں حکم بیان کر دوں تو وہ منافقین جن کا ذکر قرآن برابر کرتا رہا ہے کہنے لگیں گے کہ دیکھو! پیغمبر ص کنبہ نوازی سے کام لے رہے ہیں۔ جبکہ پوری زندگی پیغمبر اکرم (ص) کا یہ شیوہ رہا کہ کسی مسئلہ میں اپنے لئے کسی خصوصیت کے قائل نہ ہوئے۔ ایک تو آپ کا اخلاق ایسا تھا، دوسرے اسلام کا حکم ہونے کی بنا پر بھی آپ اس بات سے غیر معمولی طور پر گریز کرتے تھے کہ اپنے اور دوسروں کے درمیان کوئی امتیاز برتیں اور یہی پہلو پیغمبر اسلام (ص) کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

12.2.7.9.1 ... 9.2

یہ مسئلہ (یعنی اس حکم کی تبلیغ کہ علی میرے جانشین ہیں) خدا کا حکم تھا۔ لیکن پیغمبرؐ جانتے تھے کہ اگر اسے بیان کر دیں تو ضعیف الایمان افراد کا گروہ جو ہمیشہ رہا ہے، کہنے لگے گا کہ دیکھو! پیغمبرؐ اپنے لئے عظمت و امتیاز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آیت "الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" میں ہم نے دیکھا کہ اس سے قبل کی آیت "الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ" تھی۔ جس میں قرآن فرماتا ہے کہ اب کافروں کی امیدیں تمہارے دین سے منقطع ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کے خلاف اب تک جو جد و جہد کر رہے تھے کہ اس دین پر کامیاب ہو جائیں گے ان کی یہ امیدیں اب ٹوٹ چکی ہیں اور وہ مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ یہ سمجھ گئے ہیں کہ اب ان کے بگاڑے کچھ بگڑ نہیں سکتا۔ "فَلَا تَخْشَوْهُمْ" لہٰذا اب کافروں کی جانب سے کسی طرح کا خوف و خطر نہ رکھو" وَاخْشَوْنِ" لیکن مجھ سے ڈرتے رہو۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا مطلب ہے اس بات سے ڈرتے رہو کہ اگر تم میں خود اندرونی طور پر خرابیاں پیدا ہوئیں تو میں اپنی سنت اور قانون کے مطابق یعنی جب بھی کوئی قوم (فساد اور برائی میں پڑ کر) اپنی راہ بدلتی ہے میں بھی ان سے اپنی نعمت سلب کر لیتا ہوں۔ (نعمت اسلام کو تم سے سلب کروں گا) یہاں "وَاخْشَوْنِ" کنایہ ہے۔ مجھ سے ڈرو کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ سے ڈرو یعنی اب خطرہ اسلامی معاشرہ کے اندر سے ہے باہر سے کوئی خطر نہیں رہ گیا ہے۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے اور سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والا آخری سورہ ہے۔ یعنی یہ آیت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے دو تین ماہ پہلے نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہے جب اسلام طاقت و اقتدار کے اعتبار سے وسعت پا چکا تھا۔

جو آیت ہماری بحث کا محور ہے اور جسے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ اس میں بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ خطرہ داخلی طور پر ہے خارجی طور پر کسی طرح کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ ارشاد ہے: "يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" ہمیں قرآن میں اس آیت کے علاوہ کوئی اور آیت نظر نہیں آتی جو پیغمبر اکرمؐ کو (کسی عمل کی انجام دہی کے لئے) آمادہ کرے

اور شوق دلائے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آپ کسی کو کسی کام کے لئے تشویق کیجیے اور وہ اس کے لئے ایک قدم آگے بڑھے پھر ایک قدم پیچھے ہٹ جائے جیسے وہ خطر یا تذبذب کا شکار ہے۔ یہ آیت بھی پیغمبرؐ کو تبلیغ کی دعوت دیتی ہے اور اس تبلیغ کے سلسلہ میں ایک طرف دھمکی دیتی ہے اور دوسری طرف شوق پیدا کراتی اور تسلی دیتی ہے۔ دھمکی یہ ہے کہ اگر اس امر کی تبلیغ تم نے نہیں کی تو تمہاری رسالت کی تمام خدمت اکارت اور بے کار ہے اور تسلی یوں دی جاتی ہے کہ ڈرو نہیں! خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"، آیت "اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ" میں فرمایا آپ کافروں سے خوف زدہ نہ ہو۔ درحقیقت پہلی منزل میں پیغمبر کو کافروں سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ لیکن آیت "يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ ...." سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ بیمناک اور فکرمند تھے۔ پس ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کا یہ تردد و فکرمندی مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے افراد سے ہے۔ مجھے فی الحال اس سے سروکار نہیں ہے کہ مسلمانوں میں وہ لوگ (جو اس تبلیغ یعنی علیؑ کی جانشینی قبول کرنے پر تیار نہیں تھے) باطنی طور پر کافر تھے یا نہیں تھے۔ بہرحال یہ مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ وہ لوگ اس کے لئے آمادہ اور اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔

تاریخی مثالیں

اتفاق سے تاریخی واقعات اور اسلامی معاشرہ کے مطالعہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے چنانچہ عمر نے کہا کہ: ہم نے جو علیؑ کو خلافت کے لئے منتخب نہیں کیا وہ "حِيْطَةً عَلَى الْاِسْلَامِ" تھا، یعنی ہم نے اسلام کے حق میں احتیاط سے کام لیا کیونکہ لوگ ان کی اطاعت نہیں کرتے اور انہیں (خلیفہ) نہیں مانتے!! یا ایک دوسری جگہ ابن عباس سے گفتگو کے دوران ان سے کہا، قریش کی نگاہ میں یہ عمل صحیح نہیں تھا کہ امامت بھی اسی خاندان میں رہے جس خاندان میں نبوت تھی۔ مطلب یہ تھا کہ نبوت جب خاندان بنی ہاشم میں ظاہر ہوئی تو فطری طور پر یہ اس خاندان کے لئے امتیاز بن گئی

لہٰذا قریش نے سوچا کہ اگر خلافت بھی اسی خاندان میں ہوگی تو سارے امتیازات بنی ہاشم کو حاصل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش کو یہ مسئلہ (خلافت امیر المؤمنین) ناگوار تھا اور وہ اسے درست نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عباس نے بھی ان کو شبے ہی محکم جواب دیئے اور اس سلسلہ میں قرآن کی وہ آیتیں پیش کیں جو ان افکار و خیالات کا مدلل جواب ہیں۔

بہر حال اسلامی معاشرہ میں ایک ایسی وضع و کیفیت پائی جاتی تھی جسے مختلف عبارتوں اور مختلف زبانوں میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن اُسے ایک صورت اور ایک انداز سے بیان کرتا ہے اور عمر اسی کو دوسری صورت سے بیان کرتے ہیں یا مثال کے طور پر لوگ یہ کہتے تھے کہ چونکہ علیؑ نے اسلامی جنگوں میں عرب کے بہت سے افراد اور سرداروں کو قتل کیا تھا اور اہل عرب فطرتاً کینہ جو ہوتے ہیں لہٰذا مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں علیؑ سے متعلق پدر کشی اور برادر کشی کا کینہ موجود تھا (لہٰذا علیؑ خلافت کے لئے مناسب نہیں ہیں) بعض اہل سنت بھی اسی پہلو کو بطور عذر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ اس منصب کے لئے علیؑ کی فضیلت سب پر نمایاں اور ظاہر تھی لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی تھا کہ ان کے دشمن بہت تھے۔

بنا برایں اس حکم سے سرتابی کے لئے ایک طرح کے تکلم و تردد کی فضا عہد پیغمبر میں ہی موجود تھی اور شاید قرآن کا ان آیات کو قرآئن و دلائل کے ساتھ ذکر کرنے کا راز یہ ہے کہ ہر صاف دل اور بے غرض انسان حقیقی مطلب کو سمجھ جائے لیکن ساتھ ہی قرآن یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس مطلب کو اس طرح بیان کرے کہ اس سے انکار و روگردانی کرنے والوں کا انحراف قرآن اور اسلام سے انحراف و انکار کی شکل میں ظاہر ہو۔ یعنی قرآن یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ بہر حال اس مطلب سے سرتابی کرتے ہیں ان کا یہ انحراف قرآن سے کھلم کھلا انحراف و انکار کی شکل میں ظاہر نہ ہو بلکہ کم از کم ایک ہلکا سا پردہ پڑا رہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ آیت تطہیر کو ان آیات کے درمیان میں قرار دیا گیا ہے لیکن ہر سمجھدار، عقلمند اور مدبر انسان بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ یہ ان سے الگ ایک دوسری ہی بات ہے۔ اسی طرح قرآن نے آیت "الیوم اکملت" اور آیت "یا ایھا الرسول بلغ" کو بھی اسی انداز میں دوسری آیتوں کے درمیان ذکر کیا

آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ

اس سلسلہ میں بعض ایسی آیتیں بھی ہیں جو انسان کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ یہاں ضرور کوئی خاص بات ذکر کی گئی ہے اور بعد میں متواتر احادیث و روایت سے بات ثابت ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آیت: "اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ" (مائدہ/۵۵) عجیب تعبیر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ "تمہارا ولی خدا ہے اور ان کا رسول اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ حالت رکوع میں زکوٰۃ دینا کوئی معمولی عمل نہیں ہے جسے ایک اصل کلی کے طور پر ذکر کیا جائے بلکہ یہ مطلب و مفہوم کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہاں اس کی تصریح و وضاحت بھی نہیں کی گئی ہے کہ اس سے سرتابی دوست و دشمن کے نزدیک براہِ راست قرآن سے روگردانی شمار کی جائے۔ لیکن ساتھ ہی کمال فصاحت کے ساتھ اسے اس انداز سے بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ ہر صاف دل اور منصف مزاج انسان سمجھ جائے کہ یہاں کوئی خاص چیز بیان کی گئی ہے اور کسی اہم قضیہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ۔ وہ لوگ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں" یہ کوئی عام سی بات نہیں ہے بلکہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو وجود میں آ گیا ـــــ آخر یہ کون سا واقعہ تھا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بلا استثنا تمام شیعہ و سنی روایات کہتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

عرفا کی باتیں

دوسری آیتیں بھی ہیں جن پر گہرائی کے ساتھ غور و فکر سے مطلب واضح اور حقیقت روشن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرفا ایک زمانہ سے اس سلسلہ میں اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں۔ دراصل یہ شیعی نقطۂ نظر ہے لیکن عرفا نے اسے بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ امامت و ولایت کا مسئلہ باطن شریعت سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی وہی اس تک رسائی

حاصل کرسکتا ہے جو کسی حد تک شریعت اور اسلام کی گہرائیوں سے آشنا ہو یعنی اس نے پوست اور چھلکے سے گزر کر اس کے مغز و جوہر تک رسائی حاصل کرلی ہو اور بنیادی طور پر اسلام میں امامت و ولایت کا مسئلہ لبّی اور اصل مسئلہ رہا ہے یعنی بہت مدبرانہ فکر عمیق رکھنے والے افراد ہی اسے درک اور سمجھ سکے ہیں۔ دوسروں کو بھی اس گہرائی کے ساتھ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس مفہوم تک پہنچتے ہیں اور کچھ نہیں پہنچ پاتے۔

اب ہم اس سے متعلق بعض دیگر آیات پر توجہ دیتے ہیں ہمارا مقصود یہ ہے کہ شیعہ جو دلائل پیش کرتے ہیں ہم ان سے آگاہ ہوں اور ان کی منطق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

امامت شیعوں کے یہاں نبوّت سے ملتا جلتا مفہوم

قرآن میں ایک آیت ہے جو ان ہی مذکورہ آیات کے سلسلہ کا ایک حصّہ بھی ہے اور بظاہر عجیب آیت ہے۔ البتہ یہ خود امیرالمؤمنینؑ کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ مسئلۂ امامت سے متعلق ہے، ان ہی معنیٰ میں ہے جسے ہم ذکر کرچکے ہیں اور یہاں اشارتاً اسے دوبارہ ذکر کرتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عہدِ قدیم سے ہی اسلامی متکلّمین کے درمیان ایک بہت بڑا اشتباہ موجود رہا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس مسئلہ کو اس انداز میں اٹھایا ہے کہ: امامت کے شرائط کیا ہیں؟ انہوں نے مسئلہ کو یوں فرض کیا کہ امامت کو ہم بھی قبول کرتے ہیں اور اہل سنت بھی لیکن اس کے شرائط کے سلسلہ میں ہم دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ ہم کہتے ہیں شرائط امام یہ ہیں کہ وہ معصوم ہو اور منصوص ہو یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے معیّن و مقرر کیا گیا ہو۔ اور وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے جبکہ شیعہ جس امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں، اہل سنّت سرے سے اس کے معتقد نہیں ہیں اہل سنت امامت کے عنوان سے جس چیز کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ امامت کی دنیوی حیثیت ہے جو مجموعی طور سے امامت کا ایک پہلو ہے جیسے نبوت کے سلسلہ میں ہے

پیغمبر اکرمؐ کی ایک شان یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے حاکم تھے لیکن نبوت خود حکومت کے مساوی اور ہم پلہ نہیں ہے۔ نبوت خود ایک ایسی حقیقت اور ایسا منصب ہے جس کے ہزاروں پہلو اور ہزاروں معانی و مطالب ہیں۔ پیغمبر کی شان یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی اور مسلمانوں کا حاکم نہیں ہو سکتا۔ وہ نبیؐ ہونے کے ساتھ مسلمانوں کا حاکم بھی ہے، اہل سنت کہتے ہیں کہ امامت کا مطلب حکومت ہے اور امام وہی ہے جو مسلمانوں کے درمیان حاکم ہو۔ یعنی مسلمانوں میں کی ایک فرد جسے حکومت کے لئے انتخاب کیا جائے گویا یہ لوگ امامت کے سلسلہ میں حکومت کے مفہوم سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن یہی امامت شیعوں کے یہاں ایک ایسا مسئلہ ہے جو بالکل نبوت کے ہی قائم مقام قدم بقدم ہے بلکہ نبوت کے بعض درجات سے بھی بالاتر ہے یعنی انبیاء اولو العزم وہی ہیں جو امام بھی ہیں۔ بہت سے انبیاء امام تھے ہی نہیں۔ انبیاء اولو العزم اپنے آخری مدارج میں منصب امامت پر سرفراز ہوئے ہیں۔

غرض یہ کہ جب ہم نے اس حقیقت کو مان لیا کہ جب تک پیغمبر موجود ہے کسی اور کے حاکم بننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کیونکہ وہ بشریت سے مافوق ایک پہلو کا حامل ہے، یوں ہی جب تک امام موجود ہے حکومت کے لئے کسی اور کی بات ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جب وہ نہ ہو (چاہے یہ کہیں کہ بالکل سے موجود ہی نہیں ہے یا ہمارے زمانہ کی طرح نگاہوں سے غائب ہے) اس وقت حکومت کا سوال اٹھتا ہے کہ حاکم کون ہے؟ ہمیں مسئلہ امامت کو مسئلہ حکومت میں مخلوط نہیں کرنا چاہیئے کہ بعد میں یہ کہنے کی نوبت آئے کہ اہل سنت کیا کہتے ہیں اور ہم کیا کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ شیعہ کے یہاں امامت بالکل نبوت سے ملتا جلتا ایک مفہوم ہے اور وہ بھی نبوت کے عالی ترین درجات سے۔ چنانچہ ہم شیعہ امامت کے قائل ہیں اور دوسرے سرے سے اس کے قائل نہیں ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ قائل تو ہیں مگر امام کے لئے کچھ دوسرے شرائط تسلیم کرتے ہیں۔

امامت ابراہیمؑ کی ذریت میں

یہاں ہم جس آیت کی تلاوت کرنا چاہتے ہیں وہ امامت کے اسی مفہوم کو ظاہر کرتی ہے جسے شیعہ پیش کرتے ہیں۔ شیعہ کہتے ہیں، اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامت ایک الگ ہی

حقیقت ہے، جو نہ صرف پیغمبر اسلام کے بعد بلکہ انبیاء ما سلف کے زمانے میں بھی موجود رہی ہے اور یہ منصب حضرت ابراہیم کی ذریت میں تا صبح قیامت باقی ہے وہ آیت یہ ہے: " وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظَّالِمِيْنَ " (۱) جب خداوند عالم نے چند امور و احکام کے ذریعہ ابراہیم کو آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں پورے اترے تو (خدا نے) فرمایا میں بلا شبہ تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ (ابراہیمؑ نے) کہا: اور میری ذریت سے: فرمایا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہونچے گا۔

ابراہیم معرض آزمائش میں

حجاز کی جانب ہجرت کا حکم

خود قرآن حکیم نے جناب ابراہیمؑ کی آزمائشوں سے متعلق بہت سے مطالب ذکر کئے ہیں۔ نمرود اور نمرودیوں کے مقابلہ میں ان کی استقامت و پائداری کہ نار نمرودی میں جلنے سے نہ ہچکچائے اور ان لوگوں نے انہیں آگ میں ڈال بھی دیا اور اس کے بعد پیش آنے والے دوسرے واقعات ـــ ان ہی آزمائشوں میں خداوند عالم کا ایک عجیب و غریب حکم یہ بھی تھا جسے بجا لانا سوائے اس شخص کے جو خدا کے حکم کے سامنے مطلق تعبد و بندگی کا جذبہ رکھتا ہو اور بے چون و چرا سر تسلیم خم کردے کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک بوڑھا جس کے کوئی اولاد نہ ہو اور ستر اسّی سال کے سن میں پہلی مرتبہ اس کی زوجہ ہاجرہ صاحب اولاد ہوتی ہے اور ایسے میں اسے حکم ملتا ہے کہ شام سے ہجرت کر جاؤ اور حجاز کے علاقہ میں اس مقام پر جہاں اس وقت خانہ کعبہ ہے، اپنی اس بیوی اور بچہ کو چھوڑ دو اور خود وہاں سے واپس چلے آؤ۔ یہ حکم سوائے مطلق طور پر تسلیم رضا کی منطق کے کہ چونکہ یہ حکم خدا ہے لہٰذا میں اسکی اطاعت کرتا

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴

ہوں (جیسے حضرت ابراہیم نے محسوس کیا تھا کیونکہ آپ پر وحی ہوتی تھی) کسی اور منطق سے یہاں نہیں کھاتا۔

"رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ "(۱) پروردگارا! میں نے اپنی ذریت کو اس بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے نزدیک ٹھہرا دیا تاکہ یہ لوگ نماز ادا کریں البتہ آپ خود وحی الٰہی کے ذریعہ یہ جانتے تھے کہ انجام کار کیا ہے؟ لیکن منزل امتحان سے بخوبی گزر گئے۔

بیٹے کو ذبح کر دو

ان سب سے بالاتر بیٹے کو ذبح کرنے کا مرحلہ ہے۔ آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو منیٰ میں ذبح کر دو۔ وہیں جہاں آج ہم جناب ابراہیمؑ کی اس بے مثال اطاعت و بندگی اور تسلیم و رضا کی یاد میں جانوروں کی قربانی کرتے ہیں (چونکہ خدا نے حکم دیا ہے لہٰذا انجام دیتے ہیں۔ یہاں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے) دو تین مرتبہ جب خواب کے عالم میں آپ پر وحی ہوتی ہے اور آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ وحی پروردگار ہے تو اپنے بیٹے کے سامنے یہ بات رکھتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ بیٹا بھی بلا کسی حیل و حجت اور بہانے کے کہتا ہے: "يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" اے پدر بزرگوار جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجا لایئے "سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ "(۲) آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ قرآن کیسا عجیب اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے: "فَلَمَّا أَسْلَمَا" جب یہ دونوں تسلیم ہو گئے یعنی جب انہوں نے ہمارے حکم کے آگے مکمل طور پر اطاعت و بندگی کا اظہار کیا: "وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ" اور ابراہیمؑ نے اپنے فرزند کو پیشانی کے بل لٹا دیا (یعنی اس آخری مرحلہ پر پہنچ گئے جہاں نہ ابراہیم کو بیٹے کے ذبح کرنے میں شک رہا اور نہ اسماعیل کو ذبح ہو جانے میں کوئی شبہ باقی رہا باپ بھی اطمینان کامل کی منزل پر اور بیٹا بھی یقین کامل کے درجہ پر) "وَنَادَيْنَاهُ أَنْ

۱۔ سورۂ ابراہیم آیت ۳۷ ۲۔ سورۂ صافات آیت ۱۰۳۔۱۰۲

یا اِبرَاهِیمُ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّؤۡیَا "(۱) تو ہم نے ندا دی اور وحی کی کہ اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یعنی ہمارا مقصد فرزند کو ذبح کرنا نہیں تھا۔ ہم نے نہیں چاہا تھا کہ اسماعیلؑ ذبح کر دیئے جائیں، یہ نہیں فرمایا کہ اس حکم کو عملی طور پر انجام دینا لازمی نہیں ہے بلکہ فرمایا تم نے انجام دے دیا، کام ختم ہوگیا، کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسماعیل کو ذبح کر دیا جائے بلکہ ہمارا مقصد اسلام و تسلیم کی نمود اور تم دونوں باپ بیٹوں کی تسلیم و رضا کا اظہار تھا جو انجام پگیا۔

قرآن کے مطابق خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو عالم پیری میں نعمت اولاد سے نوازا۔ قرآن حکایت کرتا ہے کہ جب فرشتوں نے آکر ان کو یہ خبر دی کہ خداوند عالم آپ کو فرزند عطا کرے گا تو ان کی زوجہ نے فرمایا: ءَ اَلِدُ وَ اَنَا عَجُوزٌ وَّ هٰذَا بَعۡلِی شَیۡخًا....: میں بوڑھی عورت صاحب اولاد ہوں گی جب کہ یہ میرا شوہر بھی، بوڑھا ہے؟ "قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ" (۲) فرشتوں نے ان سے کہا، کیا آپ کو امر خدا پر تعجب ہے؟۔ اے اہل بیت آپ پر خدا کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہیں۔ بنا برایں خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو بوڑھاپے میں اولاد عطا کی یعنی جب تک جوان تھے صاحب اولاد نہیں تھے۔ آپ اس وقت صاحب اولاد ہوئے جب منصب پیغمبری پر فائز ہو چکے تھے۔ کیونکہ جناب ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن کے اندر بہت سی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کے پیغمبر ہونے کے سالہا سال کے بعد زندگی کے آخری ایام یعنی ستر اسی سال کے سن میں خداوند عالم انہیں نعمت اولاد سے نوازتا ہے اور آپ اس کے دس بیس سال بعد تک زندہ بھی رہتے ہیں یہاں تک کہ جناب اسماعیلؑ و جناب اسحٰقؑ بڑے ہو جاتے ہیں اور جناب اسماعیلؑ تو ان کی حیات میں اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر میں اپنے پدر بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے ہیں

آیت: "وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ "(۳) بتاتی

۱۔ سورۂ صٰفٰت آیت ۱۰۴ ۲۔ سورۂ ہود آیت نمبر ۷۲-۷۳

۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴

ہے کہ خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو آزمائش میں مبتلا کیا۔ آپ نے ان آزمائشوں کو پورا کر دکھایا اور ان میں کھرے اترے اس کے بعد خداوند عالم نے فرمایا : میں تمہیں لوگوں کا امام قرار دیتا ہوں جناب ابراہیمؑ نے دریافت کیا ، کیا میری ذریت سے بھی یہ منصب متعلق رہے گا ؟ جواب ملا ، میرا عہد (ان میں سے) ظالموں تک نہیں پہنچے گا ۔ یہ آیتیں کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں ؟ کیا جناب ابراہیمؑ کے اوائل زندگی سے ؟ مسلم طور پر نبوت سے پہلے کی نہیں ہیں ۔ کیونکہ ان آیتوں میں وحی کی بات کہی گئی ہے ۔ بہرحال دونوں نبوت سے تعلق رکھتی ہیں ۔ کیا یہ زمانہ نبوت کا ابتدائی زمانہ ہے ؟ نہیں ۔ بلکہ نبوت کا آخری زمانہ ہے ۔ اس کی دو دلیلیں ہیں ۔ ایک یہ کہ آیت کہتی ہے کہ یہ منصب آزمائشوں کے بعد ملا اور جناب ابراہیمؑ کی تمام آزمائشیں آپ کی نبوت کے پورے دور میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے اہم ترین آزمائش آپ کے اواخر عمر سے متعلق رہی ہے اور دوسرے یہ کہ اسی آیت میں آپ کی ذریت اور اولاد کا تذکرہ بھی ہے ۔ جیسا کہ ابراہیمؑ نے خود فرمایا " وَمِنْ ذُرِّيَّتِي " جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ آپ صاحب اولاد تھے ۔

یہ آیت جناب ابراہیمؑ سے جو نبی بھی تھے اور رسول بھی ، اب آخر عمر میں یہ کہتی ہے کہ ہم تمہیں ایک نیا عہدہ اور ایک دوسرا منصب دینا چاہتے ہیں ۔ " إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا " میں تمہیں لوگوں کا امام بنانا چاہتا ہوں ۔ " معلوم ہوا کہ ابراہیمؑ پیغمبر تھے ۔ رسول تھے ان مراحل کو طے کر چکے تھے ، لیکن ابھی ایک مرحلہ اور تھا جس تک ابھی رسائی حاصل نہیں کر پائے تھے اور نہیں پہنچے جب تک تمام آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں گئے ۔ کیا یہ بات یہ ظاہر نہیں کرتی کہ قرآن کی منطق میں منصب امامت ایک دوسری ہی حقیقت کا نام ہے ؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ امامت کے معنی کیا ہے ؟

امامت خدا کا عہد

امامت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس منزل پر فائز ہو کہ اصطلاحی زبان میں اُسے انسان کامل کہا جائے کہ یہ انسان کامل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسروں کی رہبری

وہدایت کا فریضہ انجام دے سکے۔ جناب ابراہیمؑ کو فوراً اپنی ذریت اور اولاد یاد آتی ہے خدایا کیا میری ذریت اور میری نسل کو بھی یہ منصب نصیب ہوگا؟ جواب دیا جاتا ہے: "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یہاں امامت کو خدا کا عہد کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ہم جس امامت کی بات کرتے ہیں وہ خدا کی جانب سے ہے۔ چنانچہ قرآن بھی یہی فرماتا ہے "عَهْدِي" یعنی میرا عہد، نہ کہ عوام کا عہد۔ جب ہم یہ سمجھ لیں گے کہ امامت کا مسئلہ حکومت کے مسئلہ سے جدا ہے۔ تو اس پر تعجب نہ ہوگا کہ یہ عہد یعنی امامت خدا سے متعلق کیوں ہے؟ سوال یہ اٹھتا ہے کہ حکومت و حاکمیت خدا سے متعلق ہے یا انسانوں سے؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکومت جسے ہم حکومت کہتے ہیں امامت سے الگ ایک چیز ہے۔ امامت میرا عہد ہے اور میرا عہد تمہاری ظالم اور ستم گر اولاد تک نہیں پہنچے گا۔ ابراہیمؑ کے سوال کا نہ کلی طور سے انکار کیا اور نہ کلی طور سے اقرار فرمایا۔ جب قرآن نے ابراہیمؑ کی اولاد کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ظالم اور ستم گر افراد کو الگ کر دیا تو ان میں وہ افراد رہ جاتے ہیں جو ظالم و ستم گر نہیں ہیں۔ اور اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسل ابراہیمؑ میں اجمالی طور سے امامت پائی جاتی ہے۔

دوسری آیت

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک اور آیت: وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ (۱) بھی جناب ابراہیمؑ سے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: خداوند عالم نے اسے (یعنی امامت کو) ایک باقی اور قائم رہنے والی حقیقت کی صورت میں ابراہیمؑ کی نسل میں باقی رکھا۔

ظالم سے کیا مراد ہے؟

یہاں "ظالمین" کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ ظالمین سے

۱۔ سورہ زخرف آیت ۲۸

متعلق اس آیت سے استدلال کیا ہے ۔ ظالم سے مراد کیا ہے ؟ قرآن کی نگاہ میں ہر وہ شخص جو خود اپنی ذات پر یا دوسروں پر ظلم کرے ، ظالم ہے ۔ عرفِ عام میں ہمیشہ ہم ظالم اسے کہتے ہیں جو دوسروں پر ظلم کرے یعنی جو لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے بہاسے ظالم کہتے ہیں ، لیکن قرآن کی نظر میں ظالم عمومیت رکھتا ہے چاہے وہ دوسرے کے ساتھ ظلم کرے یا خود پر کرے جو شخص دوسروں پر ظلم کرتا ہے وہ بھی اپنے آپ پر ہی ظلم کرتا ہے ۔ قرآن میں اپنی ذات یا اپنے نفس پر ظلم کو بیان کرنے والی بہت سی آیتیں موجود ہیں ۔

علامہ طباطبائیؒ اپنے ایک استاد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے متعلق خداوندعالم سے جو سوال کیا ہے ، اس سلسلہ میں نسل وذریت ابراہیمؑ کے نیک و بد ہونے کی تفسیر کچھ اس طرح ہوتی ہے ۔ ایک یہ کہ ہم فرض کریں کہ حضرت کی اولاد میں کچھ ایسے افراد تھے جو ابتدا سے آخر عمر تک ہمیشہ ظالم تھے ۔ دوسرے یہ کہ بعض ایسے افراد تھے جو ابتدائے عمر میں ظالم تھے لیکن آخر عمر میں نیک اور صالح ہو گئے ۔ تیسرے کچھ افراد وہ تھے جو ابتدائے عمر میں نیک تھے اور بعد میں ظالم ہو گئے ۔ اور چوتھے یہ کہ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو کبھی ظالم نہ تھے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ جناب ابراہیمؑ منصب امامت کی عظمت و جلالت کو سمجھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ منصب اتنا اہم ہے جو نبوت و رسالت کے بعد آپ کو عطا کیا گیا ہے ، لہٰذا محال ہے کہ ایسے منصب کی درخواست خداوندعالم سے آپ نے اپنی ان اولاد کے لئے کی ہو جو ابتدا سے آخر عمر تک ظالم اور بدکار تھے ۔ یوں ہی یہ بھی محال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ تقاضا اپنے ان فرزندوں کے لئے ہو جو ابتدائے عمر میں تو نیک تھے لیکن جب انہیں منصب دیا جانے والا ہو تو ظالم ہوں ۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے یہ تقاضا اپنی صالح اور نیک اولاد کے لئے کیا ہے ۔ اب ان نیک اور صالح افراد کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ جو ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک ہمیشہ نیک رہے اور ایک وہ جو پہلے ظالم اور بُرے تھے اب نیک اور صالح ہو گئے ۔ جب یہ طے ہو گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کا تقاضا ان دو طرح کے افراد کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا ، تو اب ممکن ہے کہ یہ منصب ان افراد کو نصیب ہو جو اگرچہ اس وقت ظالم و ستمگر نہیں ہیں لیکن ان کی گذشتہ زندگی آلودہ اور ظالمانہ تھی ۔ یعنی ان

کی زندگی کا پچھلا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ (لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ) قرآن صاف طور سے فرماتا ہے "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" جو لوگ ظلم سے سابقہ رکھتے ہیں اس منصب کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ہمارا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلم طور پر وہ شخص جو اس وقت ظالم ہے یا ہمیشہ ظالم رہا ہے یا پہلے ظالم نہیں تھا لیکن اس وقت ظالم ہے، ان میں سے کوئی ایک حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کا مصداق نہیں ہے۔ اس بنا پر قرآن صاف طور پر اس کی نفی کرتا ہے کہ امامت اس شخص تک پہنچے جس کی پچھلی زندگی ظالمانہ رہی ہو۔

یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر شیعہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ امامت ان لوگوں تک بھی پہنچے جو اپنی زندگی کے کسی دور میں مشرک رہے ہوں۔

مَعَاد

روح اور مادیوں کا اشتباہ

از: جناب شیخ حسین نوری
ترجمہ: سید ولی الحسن رضوی

گذشتہ مقالہ میں ہم کہہ چکے ہیں کہ معاد کی حقیقت سے واقفیت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جس موضوع پر خصوصی توجہ لازم ہے 'روح' سے متعلق بحث ہے چنانچہ اس موضوع کے ذیل میں کہ انسان ایک مجرد و مستقل روح کا حامل ہے اور اس کی شخصیت روح پر انحصار کرتی ہے۔ جسم تو محض روح کے لئے ایک قالب اور وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی اپنی صورت یونہی باقی رہتی ہے۔ ان تمام مسائل پر گذشتہ بحثوں میں ہم عقل و نقل کی بنیاد پر دلائل و براہین پیش کر چکے ہیں اس مقالہ میں بھی ہم اس موضوع پر کچھ مزید روشنی ڈالیں گے۔

استاد بزرگوار علامہ طباطبائی اپنا عظیم الشان تفسیر المیزان میں، جو ایک گرانبہا اسلامی شاہکار ہے، سورۂ بقرہ کی ۱۵۴ ویں آیت:

"وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔"

جو لوگ راہ خدا میں قتل کر دیئے جاتے ہیں انھیں ہرگز مردہ نہ کہنا بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم متوجہ نہیں ہو۔

اس کی تفسیر کرنے کے بعد قرآن مجید کی دیگر آیات سے مثالیں پیش کرتے ہیں اور انسان کی "برزخی زندگی" کے سلسلہ میں ان کی دلالت روشن و واضح کرتے ہیں ۔ اس کے بعد تجرد نفس کے عنوان سے ایک اور باب کھولتے ہوئے فرماتے ہیں کہ : یہ آیت اور دوسری آیتیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے (۱) ایک دوسری حقیقت پر بھی دلالت کرتی ہیں اور وہ روح کے مجرد ہونے کا مسئلہ ہے ان معنوں میں کہ روح بدن سے جدا ایک مستقل چیز ہے ۔ اس کے احکام ، بدن کے احکام نیز تمام تر مادی ترکیبات سے الگ ہیں ، روح اور بدن کے درمیان اگرچہ ایک طرح کا اتحاد اور تال میل پایا جاتا ہے ، روح بدن پر اپنا کنٹرول رکھتی ہے اور تمام جسمانی قوتیں اسی کے ارادہ و اختیار میں رہتی ہیں لیکن قرآنی آیات سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کی شخصیت بدن سے وابستہ نہیں ہے اور موت کے ساتھ انسان کی شخصیت نہیں مرتی بدن کے فنا ہونے اور سڑ گل کر خاک میں مل جانے سے روح فنا نہیں ہوتی اس کا رشتۂ حیات کبھی نہیں ٹوٹتا یہ بدن کے فنا ہونے اور خاک کی نذر ہو جانے کے بعد بھی اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور اپنی حیات کا سلسلہ نعمت و سعادت کے پرتو یا عذاب و مشقت کے سایہ میں جاری رکھتی ہے ۔ البتہ یہ سعادت و بھلائی اور عذاب و سختی ان اعمال کی بنیاد پر ہوتی ہے ، جو انسان اپنی زندگی کے دوران انجام دیتا ہے اور ان اخلاقی ملکات کا نتیجہ ہوتی ہے جن سے اس نے خود کو دنیوی زندگی میں آراستہ کیا ہے

علامہ طباطبائی اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ان ہی میں سے ایک آیت جو واضح طور سے روح کے وجود پر دلالت کرتی ہے سورۂ سجدہ کی وہ آیتیں ہیں جن میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے :۔

"اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

۱۔ یہ آیتیں چونکہ عالم برزخ سے بھی ارتباط رکھتی ہیں لہٰذا اس موضوع کے تحت ہم ان کا پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں

وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیْلاً مَا تَشْکُرُوْنَ (آیت ۷ تا ۹)

"خداوند عالم نے ہر شے کو بہترین خلق کیا، انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی اور پھر نوعِ انسانیت کی آفرینش پانی کے بے مقدار قطروں میں مقدر کر دی۔ پھر اس کے بعد نطفہ کو ایک صورت دے کر مکمل کر دیا اور اپنی روح (کہ جو الہی قدرت وحکمت سے وجود میں آئی ہے) اس پیکر میں داخل کر دیا اور تمہارے لئے سماعت، بصارت، اور قلب ودل قرار دیا لیکن ان تمام نعمتوں کے باوجود تم لوگ خدا کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔"

ان آیات میں "وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُوْحِہٖ" (یعنی اپنی روح اس میں پھونکی) کی تعبیر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو مقام آفرینش میں ایک مخصوص روح کا حامل ہونے کی وجہ سے اہمیت وافتخار عطا کیا ہے۔ (۱)

من جملہ ان آیات کے جو واضح طور سے روح کے وجود پر دلالت کرتی ہیں وہ آیتیں بھی ہیں جن میں مستکبرین میں سے ایک شخص کا انجام بیان کیا گیا ہے چنانچہ قرآن میں جہاں فرعون کی داستان کا ذکر ہے فرعون اور فرعونیوں سے متعلق اعلان ہوتا ہے:

"وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۔" (۲)

"سخت عذاب نے آلِ فرعون کو گھیر لیا۔ اب وہ (عالم برزخ میں) صبح وشام آگ میں گزارے جاتے ہیں۔ اور جب روز

۱۔ تفسیر المیزان ج ۱ ص ۳۵۵، ۳۵۶

۲۔ سورۂ مومن آیت نمبر ۴۵۔۴۶

قیامت آئے گی تو خطاب ہوگا کہ فرعونیوں کو سخت ترین عذاب کے
ساتھ جہنم میں ڈال دو"۔

یہ آیتیں بخوبی دلالت کرتی ہیں کہ فرعون کا خاندان (البتہ اس میں خود فرعون بھی شامل ہے) موت کے بعد عالم برزخ میں سخت عذاب الٰہی میں گرفتار ہیں، لیکن آخرت میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔

دوسری جگہ خود فرعون کے لئے بھی قرآن اعلان کرتا ہے:-

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً
وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ (۱)

آج ہم تیرا بدن لوگوں اور تیرے بعد آنے والوں کی عبرت کے لئے ساحل تک پہنچائے دیتے ہیں اور غرق ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں اگرچہ لوگوں میں بہت سے ایسے ہیں جو ہماری قدرت وحکمت کی نشانیوں سے غافل رہتے ہیں۔

یہ آیت جیسا کہ آپ خود ملاحظہ فرمارہے ہیں، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ فرعون جس کو موت کے وقت سے ہی عذاب الٰہی میں گرفتار کیا جاچکا ہے۔ اپنے بدن سے الگ ایک حقیقت ہے، کیونکہ خداوند عالم نے اس کے بدن کو غرق ہونے سے نجات دے دی ہے جبکہ اس کو خود عذاب میں گرفتار کردیا ہے۔

بنابرایں، وہ چیز جو عذاب میں گرفتار ہوئی ہے فرعون کی روح ہے نہ کہ بدن اور یہ بات روح کے مجرد و مستقل ہونے کو کامل طور سے ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ اس حقیقت کی روشنی میں ثابت ہے کہ فرعون تمام انسانوں کی مانند روح اور بدن دو چیزوں سے مرکب ہے اور وہ چیز جس پر جواب دہی عائد ہوتی ہے اور جو اپنے اعمال کے نتیجہ میں عذاب وسزا سے گزرتی ہے روح ہے نہ کہ بدن۔

۱۔ سورۂ یونس آیت ۹۲

علامہ طباطبائی اپنی کتاب "المیزان" میں بھی روح کے اثبات سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد کہتے ہیں یہ وہی روح ہے جس کو خداوند عالم اس آیت کے مطابق :-

"اللہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا" (۱)

"ہنگام مرگ قبض کر لیتا ہے"

اور کہیں قبض روح کی نسبت ملک الموت کی طرف دیتے ہوئے اعلان کرتا ہے :-

"قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ" (۲)

"(اے رسول) کہہ دیجئے کہ موت کا فرشتہ جو تم پر خدا کی جانب سے مقرر ہے تمہارے روحوں کو قبض کرتا ہے"

اور یہ روح اس حقیقت کا نام ہے جو آدمی کو شخصیت و انسانیت عطا کرتی ہے اور انسان "دیں" کہہ کر اس کے وجود کا پتہ دیتا ہے۔ یہی انسان کے تمام احساسات و ارادے کا مصدر و منبع ہے یہ ظاہری جسم اپنے تمام تر قوی اور اعضاء و جوارح کے ساتھ روح کے لئے ایک آلہ اور وسیلہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اور چونکہ روح و بدن کے درمیان ایک اتحاد اور وابستگی پائی جاتی ہے اس لئے لس شخص کے جسم و بدن کو بھی اسی کا نام دے دیا جاتا ہے مثلاً جب ہم "زید" کی نشاندھی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے بدن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "وہ زید ہے" جبکہ حقیقت میں افراد کے نام ان کی روحوں سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ جسموں سے اور اس کے ثبوت میں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ انسان کے جسم میں جیسا کہ ہم دن رات دیکھتے ہیں، عمر کے ساتھ تغییر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے اور کئی کئی مرتبہ جسم بالکل بدل جاتا ہے لیکن وہ شخص اپنے پہلے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ اب اگر لفظ "زید" اس بدن کے لئے تھا جو ماں کے بطن سے متولد ہوا تھا تو کچھ مدت کے بعد (تقریباً ۷-۸ سال کی عمر میں) جب جسم میں تبدیلی پیدا ہو جائے اس نام کا اس پر اطلاق نہیں ہونا چاہیے

---

۱ سورہ زمر آیت ۴۲ ۲ سورہ سجدہ آیت ۱۱

کیونکہ ستر یا اسّی سالہ زید کا بدن اس بدن سے قطعی مختلف ہے جو ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور جس کا نام زید رکھا گیا تھا۔

بنابراین۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ اس مسئلہ پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ افراد کے نام درحقیقت ان کی روحوں کے نام ہوتے ہیں ظاہری بدن سے ان کا تعلق نہیں ہے۔

اس کے بعد علامہ طباطبائی فرماتے ہیں کہ اگر انسان کی شخصیت کی تشکیل میں اس کے بدن کا دخل ہوتا تو ایک انسان جوانی کے دوران جس جرم کا مرتکب ہوا ہے بڑھاپے میں اسے اس کی سزا نہیں ملنا چاہیئے ،اسی طرح جس نے جوانی میں کوئی نیک کام انجام دیا ہے بڑھاپے میں اس کی جزا اس کو ملنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں ارتکاب جرم کرنے والا سزا پانے والے سے مختلف ہے۔ اس لئے کردہ بدن ختم ہو کر ایک دوسری شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس طرح نیک کام انجام دینے والا بھی اس شخص سے الگ ہے جو جزا کا مستحق قرار پایا ہے کیونکہ انسان کا بدن۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہر چند سال کے بعد ایک مرتبہ بالکل بدل جاتا ہے یہ محض روح ہے جو آغاز عمر سے انتہائے عمر تک بلکہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ (۱)

اور آخر میں علامہ طباطبائی "روح" کی بحث کا اختتام کرتے ہوتے لکھتے ہیں: جب ہم مادیوں کے اقوال پر نظر کرتے ہیں جنہوں نے روح کے وجود سے انکار کیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے خیال کے مطابق ناقابل انکار دلیلیں قائم کی ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت روح کے عدم وجود پر کوئی محکم دلیل قائم نہیں کر سکے ہیں بلکہ ان کی تمام باتیں اسی نکتہ کے گرد گھومتی ہیں کہ ہم روح کا وجود اپنے احساس اور تجربے میں نہیں لا سکے ہیں۔ اس جگہ ان کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے قول کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آپ کے احساس اور آپ کے حسی تجربے نے روح کے

---

(۱) تفسیر المیزان ج ۱۰ ص ۱۲۱

وجود پر آپ کی رہنمائی نہیں کی ہے اور اس راہ سے آپ اس کو نہیں پاسکے ہیں۔ لیکن آپ کو توجہ کرنا چاہیئے کہ روح کوئی محسوس کی جانے والی اور دیکھی جانے والی شے نہیں ہے کہ آپ اسے حسی راہوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی گفتگو کا ماتحصل یہ ہے کہ:

"ہم روح کا پتہ نہیں چلا سکے" لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیئے "عدم وجدان عدم وجود کی دلیل نہیں ہے" یعنی کسی چیز کا پتہ نہ لگاسکنا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور آپ کا اشتباہ یہی ہے کہ آپ نے عدم وجدان کو عدم وجود کی دلیل قرار دے لیا ہے۔ اور آپ (مادیون) نے یہ غلطی نہ صرف اس مسئلہ میں بلکہ دوسرے مسائل میں بھی کی ہے اور حقیقت سے دور چلے گئے ہیں۔(۱)

---

(۱) تفسیر المیزان جلد ۱ ص ۳۷۴

جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قَال رَسُوْل الله (ص)

فَاطِمَة بَضْعَة مِنّی فمَنْ اَغضَبَهَا اَغضَبَنِی

فاطمہؑ میرا ٹکرا ہے۔ جس نے اسے غضبناک کیا مجھے غضبناک کیا

صحیح بخاری ج ۴ ص ۲۱۰ و ۲۱۹

مطبوعہ دار الفکر۔ ترکیہ

حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای دامظلہ
ترجمہ: سید محمد عسکری

عورت

اسلام اور دیگر مکاتب فکر کی نظر میں

عورت عالم کون و مکان کا اہم ترین جزو اور بقاء کائنات کا ضروری ترین رکن ہے اور بقول شاعر مشرق " وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ " لیکن یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہی ہے کہ انبیاء الٰہیؑ کے ہدایات کے باوجود نظام تخلیق کا یہ اہم عنصر ناشناختہ گیا اور ہر شخص نے اس سے متعلق اپنے اپنے مفادات و نظریات کے تحت مختلف تعبیریں پیش کیں۔

سازمان تبلیغات اسلامی نے وقت کی اس اہم ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ۱۹۸۷ء میں حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت کے موقع پر " اسلام اور عورت " کے موضوع کے تحت ایک کانفرنس کا انعقاد کیا، جس کا افتتاح قائد انقلاب اسلامی آیۃ اللہ خامنہ ای نے فرمایا تھا ہم یہاں اپنے اردو قارئین کے لئے آپ کی افتتاحی تقریر کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

رسولؐ خدا کی عظیم بیٹی سیدہ عالمیہ کے یوم ولادت کے موقع پر ـــ جسے بجا طور پر جمہوری اسلامی نے " یوم خواتین " قرار دیا ہے ـــــــ اپنی قوم، حاضرین کرام خاص طور سے بہنوں کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتا ہوں۔

اگر " یوم خواتین " کا مقصد عورتوں کو فکر و تدبر کی دعوت دینا اور ان کے لئے اسوہ و نمونۂ عمل فراہم کرنا

ہو تو اس کے لئے حضرت فاطمہ (ع) کے یوم ولادت سے بہتر کوئی دن ہے اور نہ ہو سکتا ہے یہ کانفرنس جو سازمان
تبلیغات اسلامی سے وابستہ عزیز بھائیوں کے عزم و ہمت سے منعقد ہوئی ہے بہت ہی ضروری اور مناسب اقدام
ہے ـ کیونکہ آج جمہوری اسلامی چند مسئلوں میں ـــــ جن میں سے ایک عورت، اس کی شخصیت، اس کے فرائض
شامل عورت، زن و مرد کے آپس تعلقات اور پردہ کا مسئلہ بھی ہے ـــــ دنیا میں رائج افکار و نظریات سے گہرا
اختلاف رکھتی ہے اور اس اختلاف نظر کا حل ہونا بھی ضروری ہے۔ دنیا پر یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ جمہوری اسلامی
اس مسئلہ کے متعلق اسلامی تعلیمات کے پرتو میں جو نظریہ رکھتی ہے وہ کیا ہے اور وہ کیا کہنا چاہتی ہے ـ ؟
دنیا میں دعوے تو بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے خیال میں ـــــ اور یقیناً یہی صحیح بھی ہے ـــــ آج
جن لوگوں نے دنیا میں عورت کے مسئلہ کو غلط طریقہ سے پیش کر کے صنف نسواں کی توہین کی ہے، انہوں نے دنیا
کی ایک پیچیدہ ترین مشکل کو جنم دیا ہے ـ ان لوگوں نے ابتدا میں یہ کام عورت کے دفاع کے نام پر شروع کیا ـ
اس مسئلہ کی نوعیت نیز اس سلسلہ میں اسلام اور آج کی دنیا یا عالمی ثقافتوں میں رائج نظریات کے درمیان پایا جانے
اختلاف واضح و آشکار ہونا چاہیئے۔ بعض اوقات جمہوری اسلامی نظام میں انسان کسی مسئلہ کو بیان کرتے وقت ایک
قسم کے رعب کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ دنیا بڑے شد و مد سے ایک بات کہتی چلی آ رہی ہے اب جمہوری اسلامی اسے
غلط قرار دینا چاہتی ہے تو وہ شک و تردید میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ کہے یا نہ کہے؟ اپنے خیالات کا اظہار کرے یا نہ کرے
اتنے عظیم مقاصد کے حامل اس عظیم انقلاب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات کو واضح و صریح
لفظوں میں بیان کرے اور دنیا کے سامنے اپنے استدلالات پیش کرے ـ لہٰذا عورت کے مسئلہ میں بھی ان تمام خصوصیات
کے ساتھ جن کی طرف اشارہ ہو چکا ہے یعنی: عورت کی شخصیت، عورت کے فرائض، عورت کے وسائل و امکانات
عورت کی صلاحیتیں، عورت اور مرد کے آپسی تعلقات، عورت کے پردے اور عورت کے مشاغل وغیرہ کے بارے
میں دلائل و براہین کے ساتھ پوری متانت و سنجیدگی سے اپنے نظریات پیش کرنے چاہیئے۔ اسی لئے جمہوریت
اسلامی میں اس قسم کی کانفرنس اور سیمیناروں کی جگہ واقعاً اب تک خالی نظر آتی تھی چونکہ آج کی دنیا میں یہ مسئلہ
موجودہ مغربی اور یورپی تہذیب و ثقافت کی اہم ترین خطاؤں میں شمار ہوتا ہے لہٰذا اس موضوع کے متعلق
دشمن کے پروپیگنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جہاں تک ہو سکے اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر گفتگو کی جائے
یعنی اپنے ذاتی ذوق اور غیر اسلامی نظریات پیش کرنے سے سختی سے اجتناب کیا جائے ـ صرف اور صرف
اسلامی متون بیان ہوں اور مطمئن رہیئے کہ کھلے اور روشن ذہن انہیں تسلیم کریں گے جیسا کہ ہم خود اپنے معاشرہ

میں اس کے نمونے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ آج ہمارے معاشرہ میں کتنی ہی اہم تعلیم یافتہ، دانشور و مفکر ذہین خواتین ہیں جنہوں نے اسلامی نظریات کو اچھی طرح سمجھ کر دل و جان سے اسے قبول کیا ہے اور اسے عورت کے لئے باعث شرف و افتخار سمجھتی ہیں لہٰذا دنیا کے سامنے اس مسئلہ کو واضح کرنا اور اسے طرح کرنا ضروری ہے تاکہ اس کو اپنا مقام حاصل ہو سکے البتہ یہ کام بڑا ہی پیچیدہ ہے کیونکہ چند استثنائی موارد کے سوا جن کا ہم بعد میں ذکر کریں گے ، پوری تاریخ میں معمولاً دو پہلوؤں سے عورتوں پر ظلم ہوا ہے۔ ایک تو مرد کے طاقتور ہونے کے اعتبار سے، کیونکہ مرد تاریخ کے مختلف ادوار میں جسمانی ساخت کے لحاظ سے عورتوں سے طاقتور رہے ہیں اور یہ کسی ایک معاشرہ سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جاہل و تعلیم یافتہ، اعلیٰ و ادنیٰ سبھی طبقوں میں مرد کی جسمانی طاقت عورتوں سے زیادہ رہی ہے اور عورتوں کو مردوں کے ظلم و استبداد کا نشانہ بننا پڑا ہے۔ جن استثنائی مقامات کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ ان معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں معاشرہ کی باگ دوڑ کچھ عظیم عورتوں کے ہاتھ میں رہی ہے ابتدائی بدوی معاشروں میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔ ایک اور استثنائی صورت بعض ان عورتوں کے سلسلہ میں نظر آتی ہے جو حکومت و اقتدار کی مالک ہوئی ہیں۔ بعض خاندانوں اور بعض معاشروں میں کچھ عورتیں ایسے امتیازات کی حامل رہی ہیں جن کی وجہ سے ان پر زور زبردستی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن یہ تمام موارد، استثنائی ہیں ورنہ عام طور سے معمول یہی تھا کہ مرد عورتوں پر ظلم کرے اس میں مشرقیت و مغربیت کو بھی دخل نہیں مغربی دنیا میں بھی تمام ادوار میں یہی حالت تھی شاید صرف ان آخری ایام میں آکر ہی عورت کے حقوق و مسائل سے متعلق یورپ میں شور و غل کے بعد وہاں عورت کے کچھ حقوق تسلیم کئے گئے ہیں اور عورتوں کو مالکیت وغیرہ کا حق دیا گیا ہے۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ افسوس! یورپ، عورت کے بارے میں تقریباً بیسویں صدی تک اسی قسم کی کج فہمی کا شکار تھا یہاں تک کہ بہت سے مغربی معاشروں میں عورت مالکیت کے حق سے بھی محروم تھی چنانچہ اس بیسویں صدی کے اوائل اور ان آخری دہائیوں سے پہلے تک مغرب کی بھی یہی حالت تھی۔ اسی یورپ میں جو آج عورتوں کی حمایت اور ان کے حقوق کے دفاع کا اس قدر ڈھنکا پیٹ رہا ہے کتنی ہی ایسی عورتیں تھیں جو اپنے گھروں میں اپنے شوہروں کے ہاتھوں پٹا کرتی تھیں کتنی ہی ایسی عورتیں تھیں جن کے کاندھوں پر خاندان کا سارا سخت اور مشکل کام ڈال دیا جاتا تھا۔ دنیا کے مشہور ملکوں

کے بڑے بڑے شہروں میں کتنی عورتیں اپنے اس مال کو بھی صرف کرنے سے محروم تھیں جو انھیں میراث میں ملا کرتا تھا۔ کتنی ہی عورتیں اپنے شوہر، باپ یا بڑے بھائی کے حکم سے گھر میں برسوں قید رہا کرتی تھیں اور انھیں گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی اس قسم کے مظالم جو مردوں نے طاقتور ہونے کی حیثیت سے عورت پر کمزور ہونے کی وجہ سے کئے ہیں کم نہیں ہیں۔ خود ہمارے اپنے معاشرہ اور دیگر اسلامی معاشروں کا بھی یہی حال تھا۔ صرف صدر اسلام کا دور اس سے مستثنیٰ ہے جو ایک جداگانہ بحث ہے۔ اسلام سے پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ کتنی ہی لڑکیوں کو زندہ زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ کتنی ہی عورتیں زندہ زندہ جلا کر راکھ کر دی جاتی تھیں یا مار ڈالی جاتی تھیں جن عورتوں کے شوہر مر جاتے تھے انھیں ان کی رسم و رواج کے مطابق شوہر کے ساتھ دفن (یا ستی) کر دیا جاتا تھا اس پوری تاریخ میں انسانی خاندان کی ایک ضعیف و ناتوان فرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی اگرچہ مغربی معاشروں میں ان کے لمبے چوڑے دعوؤں اور بعض قوانین کی وجہ سے ان مظالم میں کچھ کمی ضرور آگئی ہے، لیکن یہ مظالم ان میں ابھی بھی موجود ہیں بالکل سے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ آج کے یورپ میں بھی ایسی عورتوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے شوہروں کے ہاتھوں پٹا کرتی ہیں اور ان کے ظلم و ستم، توہین و اہانت کا نشانہ بنا کرتی ہیں۔ یورپ میں اس قسم کے مظالم کمیاب یا استثنائی نہیں ہیں۔ صرف مرد کی آواز ذرا بھاری اور اس کے بازوؤں میں ذرا طاقت زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے تشددی کا حق حاصل ہے بالکل ان درندوں کی طرح جو ایک علاقہ میں ایک ساتھ رہتے ہیں جس کی طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنی اسی طاقت کے بل بوتے دوسروں پر ظلم و تعدی کرتا ہے یہی حالت آج بھی باقی ہے یعنی جس وقت سے تاریخ کا آغاز ہوا ہے صورت حال یہی تھی اور عورتوں کے خلاف طاقت کا استعمال ہوتا رہا ہے۔

عورت پر دوسرا ظلم ذرا تاجرانہ اور کچھ پیچیدہ ہے ظلم کی اس نوعیت کا تعلق بھی آغاز تاریخ سے ہے اور آج بھی یہ اپنی بدترین اور شدید ترین شکل میں رائج ہے۔ اور وہ ظلم یہ ہے کہ عورت کو زندہ و شوہر پر مشتمل دور کنی خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت دینے کے بجائے اسے مرد کی لطف اندوزی کا وسیلہ سمجھا گیا ہے۔ بلکہ عورت کو سامان تجارت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جس طرح انسانوں کی لالچ اور ان کی حرص و طمع کے باعث ہمیشہ جن چیزوں سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا جن چیزوں کی بھی تجارت کی جا سکتی ہے اور ان سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے ظالم و طاقتور افراد انہیں نہیں چھوڑتے

تھے اور ان سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے، عورتوں کو بھی اسی طرح استعمال کیا گیا اور اسے ایسی وادی میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ مرد کی شہوت رانی و لطف اندوزی کا وسیلہ بن کر رہ گئی۔

البتہ یہ بہت ہی واضح سی بات ہے کہ یہ چیز عمومیت نہیں رکھتی نہ ہی تمام مرد ایسا کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی تمام عورتیں اس قسم کے ظلم کا نشانہ بنی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر صنف نازک پر مردوں کی طرف سے اس قسم کا ظلم ہوتا رہا ہے۔ تاریخ میں ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے جنھوں نے عورت کو صرف اپنی جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ سمجھا ہے! اور چونکہ وہ طاقت، اقتدار یا سیاست کے مالک تھے اور اپنا کام نکالنا خوب جانتے تھے لہٰذا ان سے جہاں تک ہو سکا اس وادی میں آگے بڑھتے گئے۔ تاریخ کے اکثر طاقتور اور اونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اسی قماش کے تھے آپ کو تاریخ میں وہ طاقتور اور حکمران طبقہ کہاں ملے گا جو جنسی بدکاریوں میں ڈوبا ہوا نہ ہو۔ اس جنسی بے راہ روی کے اسباب وہ کس طرح فراہم کرتے تھے؟ چند عورتوں ہی کے ذریعہ نا؟ یہ عورتیں کہاں سے آتی تھیں؟ بہر صورت، حالت یہی تھی کہ کچھ افراد اپنی شہوت رانی اور جنسی بھوک مٹانے اور ذرا سی لذت اندوزی کی خاطر تمام عقلی، فکری، اخلاقی حدوں سے گزر کر جس حد تک ان کی خواہش ہوئی اور جتنا ان کا بس چلا اس وادی میں آگے بڑھے اور عورت کو اپنی لطف اندوزی کا ذریعہ بنائے رہے۔

یہ ایسی حقیقت ہے جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے ہاں جن لوگوں کی قوت و طاقت جتنی زیادہ تھی انہوں نے اتنا ہی زیادہ وسیع پیمانہ پر یہ عمل انجام دیا ہے۔ جن کے پاس طاقت کم تھی جیسے معاشرہ کے عام اور معمولی افراد انہوں نے بھی اسی طرح کی حرکتیں کی ہیں اور انہوں نے بھی ان عورتوں سے لطف لیا ہے جن سے قانونی طور پر ان کا کوئی ربط اور رشتہ نہیں تھا۔ بس فرق یہ ہے کہ ان کے عمل کا دائرہ محدود تھا۔ ان کی حرکتیں معاشرہ میں پائی جانے والی آوارگی کی حد تک تھیں اور یہ آوارگی بھی تقریباً سبھی معاشروں میں کم و بیش موجود رہی ہے، تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ہر معاشرہ میں کچھ ایسی عورتیں موجود رہی ہیں جنھیں مرد ناجائز طور پر استعمال کرتے رہے ہیں یہ بھی ایک بہت بڑا ظلم ہے، یہ ظلم مرد پر نہیں ہوا ہے مرد اس طرح کی توہین و تحقیر کا نشانہ کبھی نہیں بنا ہے۔ یہ ان تاریخی اہانتوں میں سے ہے جو عورت کے حق میں روا رکھی گئی ہے۔

اگر ماضی میں اس پہلے قسم کے ظلم کا ظلم کے طور پر کسی حد تک تذکرہ کیا بھی گیا ہو ــــــ اگرچہ

اسے بھی بیان نہیں کیا گیا ہے۔ تو اس دوسرے قسم کے ظلم کو نہ صرف یہ کہ بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوا ہے افسوس! آج بھی ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ عورتوں کے حقوق کے دفاع کے سلسلہ میں اتنے زیادہ شور و غل کے باوجود، دنیا میں روز بروز اس ظلم میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ میں عورتوں کی آزادی کے سلسلہ میں جو نعرہ لگایا گیا اور اس کے لئے کچھ قوانین بنائے گئے ان کے محرکات و مقاصد اقتصادی اسباب و وجوہات تھے یعنی وہ اس طرح سے عورتوں کو کارخانوں میں کھینچنا اور مزدوری کے سلسلہ میں ان کے کم مطالبات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ عورت کی آزادی کے نام پر بلند ہونے والے نعروں کی جڑیں شہوانی و اخلاقی مسائل تھے۔ جس چیز کا تعلق دوسرے قسم کے ظلم سے ہے اور آج بھی موجود ہے وہ یہ ہے کہ عورت کو آزادی دیتے ہیں اسے آزاد چھوڑ دیتے ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ اپنی نمائش کر کے مرد کی ناجائز لطف اندوزی کے لئے زیادہ سے زیادہ میدان ہموار کرے، یہ کیسی آزادی ہے؟! ۔ وہ عورت کو اس لئے آزادی نہیں دیتے کہ وہ اپنی ان پوشیدہ انسانی صلاحیتوں کو آشکار کرے جو اسے کمال و ارتقا سے ہم کنار کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں یا پھر اسے دوسرے درجے کی اہمیت دیتے ہیں، دراصل عورت کو میدان میں لانے کا مقصد عورت کی تخلیق کے اس مخصوص نسوانی پہلو سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے جو قدرت کا ایک اہم راز اور عورت کی جانب مرد کی کشش کا وسیلہ ہے اور جس سے کچھ خاص اصول و قوانین کے تحت ہی استفادہ کرنا چاہئے اور اگر یہ مخصوص پہلو نہ ہوتا تو بنی نوع انسان کی بقا ناممکن تھی۔ یہ وہ ظلم ہے جو تاریخ کے تمام ادوار میں موجود رہا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام نے جس وقت عورت کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے اور اس کے متعلق اپنی تعلیمات بیان کیں اسے دونوں قسم کے مظالم سے نجات عطا کی اور اسے اس بوجھ سے چھٹکارا دلایا۔ مرد کو عورت پر ظلم کرنے سے روکا۔ اس اقدام نے لوگوں کو تعجب میں ڈال دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد کو اپنے گھر میں اپنی بیوی، اپنی بیٹی اور اپنی بہن سے تند کلامی کرنے اور ان سے اپنی خدمت لینے کی اجازت نہ ہو؟ اسلام نے پورے اعتماد و استحکام کے ساتھ ان بے جا توقعات کا مقابلہ کیا اور عام طور پر رائج اس رسم و رواج کو توڑا جو عورت کو یکطرفہ طور پر مرد کی خدمت اور اس کی آسائش کا وسیلہ بنا کر پیش کرتی تھی۔ اس ضمن میں ہمارے اسلامی اصول و قوانین نہایت صریح اور واضح ہیں یہ صرف زن و شوہر ہی تک محدود نہیں ہے باپ اور بھائی کو بھی اپنی

بیٹی یا بہن پر ظلم کرنے کا حق نہیں ہے زن و شوہر ایک کنبہ کے دو شریک ہیں۔ اور ایک دوسرے پر برابر کا حق رکھتے ہیں، ان دونوں کو مل جل کر زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ اگر مرد عورت پر کچھ حق رکھتا ہے تو عورت بھی مرد پر کچھ حق رکھتی ہے۔ بہت سے بھاری کاموں کی بجا آوری اور خدمت گاری عورت کے فرائض میں شامل نہیں ہے جبکہ مرد کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔ گھر کے مخارج پورا کرنا مرد کی ذمہ داری ہے عورت کی نہیں حتیٰ امور خانہ داری بھی عورت پر واجب نہیں ہیں، البتہ فطری طور سے محبت اور تفاہم و تعاون کا تقاضا ہے کہ عورت اپنے گھریلو مسائل کو خود ہی سنبھال لیتی ہے اور اسلام بھی اسے مستحسن نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن اسے واجب نہیں سمجھتا۔ اسلام نے صنف قوی یعنی مرد کے ظلم و استبداد کی راہیں مسدود کردی ہیں ـــــ یہ صنف قوی، صرف جسمانی و ظاہری ساخت کے لحاظ سے ہے ورنہ بعض دوسرے اعتبارات سے عورتیں نہ صرف یہ کہ ضعیف نہیں ہیں بلکہ شاید مردوں سے قوی تر ہوں۔

دوسری قسم کے ظلم کے سلسلے میں بھی اسلام نے کچھ اصول و قوانین وضع کرکے اور مرد و عورت کی معاشرت کو محدود کرکے اس ظلم کی بھی روک تھام کی ہے۔ ہمارے آج کے حالات میں مرد و عورت کا اصلی مسئلہ یہی آپسی تعلقات کا مسئلہ ہے۔ معاشرہ میں اور آپس میں مرد و عورت کے درمیان کس قسم کا رابطہ ہونا چاہیئے؟ پردہ کا مسئلہ بھی اسی سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اصل بات یہی ہے آج اس مسئلہ میں دنیا اور اسلام کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اسلامی نظریہ قطعی، واضح آشکار اور بھرپور دلائل و براہین پر استوار ہے۔ اسلام نے اسی روز آکر اس ظلم پر پابندی لگائی لیکن یہ ظلم آج بھی اس دنیا میں موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اب یہ ظلم دنیا سے ختم ہوچکا ہو۔ آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جب تک عورت اور مرد کی صنف میں یہ فطری خصوصیات باقی رہیں گے اس قسم کے ظلم کا امکان بھی باقی رہے گا اور پوری طاقت کے ساتھ اسے روکنا چاہیئے۔ اور یہی اسلام کا حکم ہے اس مسئلہ کا تعلق صرف عورت پر ہونے والے مظالم کو ختم کرنے سے ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہم عورت کے حقوق سے بحث کرتے وقت کہتے ہیں کہ عورت پر ہونے والے اس ظلم کی روک تھام ضروری ہے ورنہ اگر اسے معاشرہ کے عام حقوق کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ مسئلہ کچھ دوسرے پہلو بھی رکھتا ہے یہ فسق و فجور اور آوارگی وغیرہ کی روک تھام بھی ہے۔ وہی چیز جو آج بصد افسوس مغربی دنیا میں بہت ہی بری اور مکروہ شکل میں رائج ہے۔

اسلام کے اس نظریہ کو واضح اور عام کیا جانا چاہیئے ۔ ہم نے ابتدائے انقلاب سے اس مسئلہ پر کوئی زیادہ کام نہیں کیا ہے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ہم نے اس مسئلہ پر کام ہی نہیں کیا ہے ۔ اگر کچھ بحثیں ہوئی بھی ہیں تو وہ متفرق و پراگندہ بحثیں ہیں ۔ اسلام میں عورت کی عظمت و منزلت کے سلسلہ میں صرف تقریر کردینا ہی کافی نہیں ہے ۔ ہمیں یہ واضح کرنا چاہیئے کہ عورت اور مرد کے فرائض کے حدود کیا ہیں ؟ ان کا دائرۂ کار ایک دوسرے کے تئیں یا خاندان ، اور یا ایک بڑے خاندان یعنی معاشرہ کے سلسلہ میں کیا ہونا چاہیئے اس کا واضح ہونا ضروری ہے ۔ البتہ اس الزام سے بچنے کے لئے کہ اسلام عورت کو حقارت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے یا اسلام نے مرد و عورت کے تعلقات میں محدودیت اور پردہ کا جو حکم دیا ہے اس کی غلط تفسیر نہ کی جا سکے عورت کی شان اور اس کی عظمت و منزلت کو اس کے عورت ہونے کی حیثیت سے نہ کہ اس کے ماں وغیرہ ہونے کے لحاظ سے ، بیان کیا جانا بھی ضروری ہے لیکن اصل مسئلہ ہی معاشرہ میں مرد و زن کے تعلقات و ارتباطات کا مسئلہ ہے اس کا واضح ہونا انتہائی ضروری ہے ۔ اور اس مسئلہ میں ہمیں دنیا کے سامنے شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی بلکہ ہمارا سر فخر سے اونچا نظر آئے گا ۔ آج عورت کے مسائل کے متعلق دنیا کے پاس کوئی منطق نہیں ہے ۔ دنیا اور مغربی تہذیب ــــ جو بصد افسوس ! آج پوری دنیا میں رائج ہے ۔ اس کا کوئی جواب نہیں رکھتی کہ آخر عورت اپنے آپ کو سجا بنا کر دوسروں کے سامنے کیوں پیش کرے ؟ مرد کے نگاہوں کے سامنے عریاں ، برہنہ ہو کر کیوں آئے ؟ دنیا نہیں جانتی کہ عورت یہ سب کام کیوں کرے ؟ اور یہ کس کے حق میں ہے ؟ آج مغربی ثقافت میں جس چیز کا چرچا ہے وہ یہی ہے اور وہ اس کا دفاع کرنے سے عاجز ہے ۔ ہمارا کہنا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کی ایک حد ہے اور ان حدود کی رعایت ضروری ہے اور اس نقطۂ نظر کی حقانیت کے لئے عورت و مرد کی طبیعت و فطرت پر ایک نظر ہی کافی ہے ان حدود کو فراموش کرنے کی وجہ سے جو برائیاں معاشرہ میں پیدا ہوئی ہیں انھیں بیان کیا جائے یہ حدود بھی دیگر حدود و قوانین کے مانند ہیں ! ہر جگہ پر قانونی پابندیاں کچھ حدبندیاں وجود میں لاتی ہیں کہ اگر ان پابندیوں کو ہٹا دیا جائے تو ممکن ہے کہ کچھ افراد کو خوشی و مسرت ہو کیونکہ وہ ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں گے اور پابندیوں سے رہائی مل جائے گی ۔ لیکن آخرکار معاشرہ کو اس سے نقصان پہنچے گا یہاں بھی یہی حال ہے ۔ یہاں بھی کچھ پابندیاں ہیں مردوں کے لئے بھی پابندیاں ہیں اور عورتوں کے لئے بھی اگر یہ پابندیاں ہٹ جائیں تو کچھ افراد کی خوشحالی کا باعث ہوگی لیکن نتیجتاً معاشرہ کی

بربادی کا سبب ہوگی۔ عورت اور مرد دونوں کے لئے کچھ محدودیتیں ہیں اور ممکن ہے بعض افراد ان پابندیوں سے خوش بھی نہ ہوں۔ لیکن یہ محدودیتیں معاشرہ کے حق میں ہیں ان حدود کو بیان ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ جناب جنتی نے فرمایا ابتدائے انقلاب سے یہ مسئلہ پیش رہا ہے چونکہ ملک میں اسلامی انقلاب آیا ہے لہٰذا معاشرہ کے افراد بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ اسلامی احکام نافذ کئے جائیں۔ عورت کا پردہ اور مرد و زن کے آپسی تعلقات کی محدودیت ایک قرآنی حکم ہے یہ چند حدیثوں اور خبر واحد کی دین نہیں ہے جس کے بارے میں شک و شبہہ پیدا کرنے کی گنجائش ہو جب قرآن پر عمل کرنا طے پا گیا تو پردہ کی رعایت بھی ضروری ہے یہ صحیح ہے کہ اسلامی دنیا میں بھی ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے اکثر کچھ باتیں کہی ہیں اور نعرے لگائے ہیں خود ہمارے اپنے ملک میں بھی بعض ایسے افراد تھے جنھوں نے غلطاً کچھ باتیں کہی ہیں وہ مسلمان بھی رہنا چاہتے ہیں اور قرآن کے ایک صریح و واضح حکم کو پامال بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ قرآن کے حکم پر بہر صورت عمل ہونا چاہیئے۔ عوام کو توقع تھی اور ان کی توقع حق بجانب بھی ہے۔ مرد و زن کا اسلامی فریضہ دراصل ایک اعلیٰ فکر تھی اس کام کو انجام پانا چاہیئے تھا۔

میں نے اس کانفرنس کے منتظم بہن بھائیوں کے سامنے کچھ عرصہ قبل یہ تجویز پیش کی تھی کہ ٹھیک ہے یہ کانفرنس ضروری ہے ـــــ پہلے طے یہ تھا کہ یہ کانفرنس صرف پردہ کے موضوع پر ہو لیکن اب یہ بطور مطلق عورت کے بارے میں منعقد ہوئی ہے اور یہ بہت ہی اچھی چیز اور نہایت ضروری اقدام ہے اور مجھے خوشی ہے کہ یہ اہم کام انجام پایا ـــــ لیکن ایک دوسرا کام بھی ہے جس کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے اور اس کانفرنس کے مقدمہ و تمہید کی حیثیت رکھتا ہے میں نے اس کانفرنس کے منتظم بھائی بہنوں کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا اور طے یہ پایا کہ یہ لوگ اس کے لئے بھی اقدام کریں۔ اب نہیں معلوم یہ کام انجام پائے گا یا نہیں؟

وہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ ہم لوگوں نے عورت کے فرائض اور اس کی شخصیت کے سلسلہ میں کوئی ثقافتی کام انجام نہیں دیا ہے لہٰذا کچھ صاحبِ فکر و نظر افراد ایک جگہ اکٹھا ہو کر بحث و گفتگو کریں کہ عورت کے بارے میں اسلامی نظریات کس طرح بیان کریں اور اس کے لئے کون سے اقدامات عمل میں آنے چاہئیں؟ اس ثقافتی مہم کو کیسے سر کیا جا سکتا ہے؟ کوئی بھی ثقافتی کام کیا جا سکتا ہے۔ یہی کانفرنس ایک ثقافتی اقدام ہے لیکن سارا کام اس میں منحصر نہیں ہے عورت کی سعادت و ارتقا

کے دشمن مغربی تہذیب و ثقافت کے نظریہ پردازوں کے خفیہ ہاتھ بڑی پیچیدگی کے ساتھ کام کرتے ہیں، وہ تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر اقدام کرتے ہیں مختلف طریقوں سے اقدام کرتے ہیں، آپ آج یورپ پر نظر ڈالیں وہ اس میدان میں روز بروز آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی ایسا دن نہیں ہے جب وہ کوئی نیا منصوبہ نہ بناتے ہوں، بعض ملکوں خاص طور سے شمالی یورپ اور اسکینڈینیوی ممالک میں عورتوں اور مردوں کی جنسی بے راہ روی کو بڑھاوا دینے کے سلسلہ میں نئے نئے ہتھکنڈوں اور منصوبوں کی بہتات نے ایک ہنگامہ مچا رکھا ہے جنھیں بیان کرنا اور جن کا سننا مردوں اور عورتوں کے لئے باعث شرم ہے۔ یعنی اگر کوئی وہاں کے حالات بیان کرے تو ہمیں سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اگر کہیں لکھا ہوا ہو تو ہمیں اسے پڑھتے ہوئے حیا آتی ہے۔ دنیا اس طرح پستی و بدکاری کی طرف آگے بڑھ رہی ہے ان لوگوں نے بشریت کے خلاف بڑی بڑی سازش تیار کی ہے۔ بے پناہ دولت صرف کر رہے ہیں۔ ماہرین نفسیات، سیاست کار، جاسوسی ادارے اور مختلف منصوبہ ساز ذہن پس پردہ پوری دنیا کے لئے منصوبہ بنانے میں مشغول ہیں تاکہ عورتوں اور مردوں کی آتش شہوت کو زیادہ سے زیادہ بھڑکائیں یہ کام آج استکباری دنیا اور عالمی طاقتوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے وہ اس کے محتاج ہیں بڑے سرمایہ داروں کو اس کی سخت ضرورت ہے وہ اس کے بغیر نہیں جی سکتے اب اس کے مقابلہ میں ہم یہاں صرف ایک کانفرنس منعقد کر دیں یہ کافی نہیں ہے اگرچہ یہ بھی ضروری ہے ہمیں کیا کیا کرنا ہے اس کا ہر جہت سے جائزہ لینا چاہیئے۔ ہم ان مسائل کے مقابلہ میں خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے ہم خاموش بیٹھے نہیں دیکھ سکتے کہ یہ انسانیت دشمن ابھی اسی وقت فلسفیوں، کائنات شناسوں اور ماہرین نفسیات کے بھیس میں نظریہ پردازی کرتے رہیں۔ یہ لوگ روز بروز مسئلہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بناتے جا رہے ہیں۔ شاید اس کے لئے کچھ زیادہ ہی کام کی ضرورت ہے، شاید اس کے لئے ٹی وی پروگرام کی ضرورت ہو شاید اس کے لئے فنون لطیفہ کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہو شاید اس کی ضرورت ہو کہ ہمارے فنکار سر جوڑ کر بیٹھیں دسیوں پروگرام تیار کریں۔ اسے پردۂ فلم پر لائیں اور عوام کے سامنے پیش کریں اور ہم پروگرام میں اس جنسی بے راہ روی اور اس کے خطرناک نتائج کا ایک ایک گوشہ دکھائیں اور پھر ان پروگراموں کو مسلم ملکوں نیز ایشیائی اور تیسری دنیا کے ممالک میں نشر کیا جائے تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ یہ کیا ہے اور اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے؟

آج بعد افسوس! جیسا کہ میں نے عرض کیا ۔۔۔ مسلسل پروپیگنڈے اور بار بار کہنے کی وجہ سے لوگوں کا عام نظریہ بھی بن چکا ہے اور لوگ اسے باور کر چکے ہیں۔ افریقہ کے ایک پسماندہ ملک میں نامہ نگاروں کو مجھ سے انٹرویو لینا تھا ایک خاتون نامہ نگار جب مجھ سے انٹرویو لینے کے لئے آرہی تھیں تو شاید ان سے یہ کہا گیا تھا کہ تمہیں سر پر اسکارف باندھنا ہوگا اور اس سلسلہ میں انہیں کچھ دیر کے لئے معطل کیا گیا تھا اور ذرا سختی کی گئی تھی ۔ یہ خاتون اندر آئیں اور جب مجھ سے سوالات کا آغاز ہوا تو مجھ سے عورتوں کے بارے میں سوالات کئے گئے اس وقت خاتون نے کھڑے ہوکر مجھ سے دو سوال کیا اور اس کے بعد رونے لگیں ان کے جذبات کو اتنی سخت ٹھیس پہنچی تھی اور ان کے احساسات ان پر اتنا زیادہ غالب آگئے تھے کہ کہنے لگیں: مجھے اسکارف باندھنے کے لئے کیوں کہا گیا؟ وہ اسے اپنی توہین تصور کر رہی تھیں یہ ہے آج کے دنیا میں رائج ثقافت! وہ دھوکا نہیں دینا چاہتی تھیں، پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں ایک جوان عورت تھیں وہ واقعی خیال کر رہی تھیں کہ ان کی توہین کی گئی ہے ۔ اگر ان کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا جاتا جو واقعاً عورت پر ظلم ہے اور یقیناً عورت کی توہین ہے چاہے جس قسم کا بھی برتاؤ کیا جاتا اس میں وہ اپنی اتنی زیادہ توہین محسوس نہ کرتیں بہرحال یہ ایک غلط ثقافت ہے جو لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہو چکی ہے اور لوگ اس کے عادی بن چکے ہیں، تمام امکانات و وسائل بروئے کار لاکر اس انحراف کے لئے برسوں محنت کی گئی ہے اس کا مقابلہ کیا جانا ضروری ہے لیکن کس طرح سے؟ خود ہمارے اپنے عوام کے لئے بھی۔ کم از کم کچھ افراد کے لئے یہ مسئلہ اب بھی حل نہیں ہوا ہے ۔ بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو دیندار ہیں مسلمان ہیں انقلاب کی طرفدار بھی ہیں لیکن پردہ کا مسئلہ ان کے لئے واضح نہیں ہے ۔ وہ پردہ کرنے سے گریزاں بھی نہیں ہیں ۔ پردہ کرتی بھی ہیں لیکن ان کے ذہنوں میں پردہ سے متعلق بہت سے شکوک و شبہات ہیں ان کو مطمئن کرنا بے حد ضروری ہے ۔ پردہ ہماری نظر میں مبہم نہیں ہے ہمارے سامنے مسئلہ بالکل واضح و روشن ہے اور بہت سے دوسرے افراد بھی اس سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اسے دوسروں کے لئے واضح و آشکار کرنا چاہئے اس کی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہیئے تاکہ ہر شخص اس سے واقف ہو جائے، یہ بہت ضروری کام ہے ۔ یہ بھی ایک ثقافتی عمل ہے جس پر مجھے بہت اصرار تھا اور ہے۔ نماز جمعہ میں بھی اس پر روشنی ڈال چکا ہوں ۔ سازمان تبلیغات

اسلامی کے عزیز ذمہ داروں اور جناب جنتی صاحب سے بھی اس موضوع پر بارہا گفتگو ہو چکی ہے
______ اور بحمد اللہ انہوں نے بہت سے کام لیتے ہوئے اس بہترین اجتماع کو تشکیل دیا، لیکن یہ
ابتدائے کار ہے ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔

معصومۂ عالم (ع) فرماتی ہیں :

پردہ عورت کا بہترین زیور ہے

اسلامی علوم کا تعارف ۔ کلام

کلامی فرقے

(۶)

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترجمہ: جناب ابوجواد

اشاعرہ

گذشتہ دروس سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ وہ افکار و نظریات جو معتزلی دبستان کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے ہیں، پہلی صدی ہجری کے نصف دوم میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معتزلہ روش کا نچوڑ یہ تھا کہ اصول دین کے سمجھنے میں ایک قسم کی منطق و استدلال سے کام لیا جائے لہٰذا ظاہر ہے کہ اس قسم کی روش میں پہلی شرط یہ ہوگی کہ استقلال اور اس کی آزادی و محبت پر کامل یقین رکھا جائے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عوام، جنہیں تعقل و تفکر، تجزیہ و تحلیل سے سروکار نہیں ہوتا، ہمیشہ "تدین" کو "تعبد" کے مساوی سمجھتے ہیں اور آیات و احادیث، خاص طور سے حدیثوں کے ظواہر کے سامنے اپنے افکار کا سر خم کر دینا ضروری اور ہر قسم کے تفکر و اجتہاد کو دین کی نافرمانی و مخالفت تصور کرتے ہیں۔ خصوصاً اگر سیاست وقت اپنے مفادات کی خاطر اس عوامی نظریہ کی حمایت بھی کر رہی ہو اور خاص طور سے اگر بعض علماء دین اس طرز فکر کی تبلیغ بھی کر رہے ہوں اس کی مزید اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب یہ علماء خود بھی اس ظاہر پرستی پر واقعاً ایمان رکھتے ہوں اور عملی میدان میں اپنے ان عقائد میں تعصب اور شدت بھی برتتے ہوں

چنانچہ اسلامی دنیا میں اصولیوں اور مجتہدوں پر اخباریوں نیز فلسفیوں پر بعض فقہاء و محدثین کے حملوں کا یہی سبب ہے۔

معتزلہ کو اسلام سمجھنے، اسے دنیا میں پھیلانے اور دہریوں، یہودیوں، عیسائیوں، آتش پرستوں، ستارہ پرستوں اور مانویوں کے مقابلہ میں اسلام کا دفاع کرنے کا بڑا خیال تھا یہاں تک کہ وہ اس مہم کے لئے مبلغ تربیت کرکے اطراف واکناف میں اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ اور ان ہی حالات میں اسلامی مرکز کے اندر خود "اہل حدیث" و "اہل سنت" کہلانے والے ظاہر پرستوں کے حملوں کا نشانہ بھی بنتے رہے اور آخر کار ان ہی بغلی گھونسوں کے نتیجہ میں کمزور ہو کر رفتہ رفتہ اپنا وجود ہی کھو بیٹھے۔

ابتدا میں ـــــ یعنی تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کی ابتدا تک ـــــ معتزلہ کے مقابلہ میں کوئی باقاعدہ کلامی دبستان ـــــ جیسا کہ بعد میں وجود میں آیا ـــــ موجود نہ تھا۔ اس دور میں معتزلہ کی مخالفت، صرف اس عنوان سے ہوتی تھی کہ ان کے افکار، حدیث و سنت کے ظواہر کے خلاف ہیں۔

اہل حدیث مالک بن انس اور احمد بن حنبل جیسے سرکردہ افراد ایمانی و اعتقادی مسائل میں استدلالی بحثوں اور چون و چرا کو سرے سے حرام جانتے تھے۔ پس نہ صرف یہ کہ معتزلہ کے مقابلہ میں "اہل سنت" کا اپنا کوئی کلامی دبستان نہ تھا بلکہ وہ کلام و تکلم کے مخالف بھی تھے۔

لیکن تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک نیا حادثہ ہوا، ایک اہم اور مفکر شخص جس نے ابوعلی جبائی معتزلی کے سامنے برسوں زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور ان سے اعتزالی دبستان کی تعلیم لی تھی نیز اس دبستان میں مجتہد و صاحب نظر ہو چکا تھا اس سے روگرداں ہو کر مذہب اہل سنت کی طرف مائل ہو گیا چونکہ یہ شخص غیر معمولی صلاحیت کا مالک اور معتزلی دبستان کا ماہر بھی تھا لہٰذا اس نے اہل سنت کے تمام اصولوں کو کچھ مخصوص استدلالی بنیادوں پر استوار کرکے انہیں ایک حد تک دقیق اور فکری دبستان کی شکل دے دی اس

اہم شخص کا نام اَبوالحَسَن اَشعَری ہے۔ اس نے ۳۳۰ھ میں وفات پائی ہے۔

ابوالحسن اشعری نے اولاً ۔۔۔ احمد بن حنبل جیسے قدیم علماء اہل حدیث کی روش کے خلاف ۔۔۔ اصول دین میں استدلال اور منطق کے استعمال کو جائز قرار دیا اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں قرآن وحدیث سے دلیلیں بھی پیش کیں، موصوف نے "رسالۃ فی استحسان الخوض فی علم الکلام" (۱) نامی کتاب بھی تحریر کی ہے۔

یہی وہ منزل تھی جہاں اہل حدیث، اشاعرہ اور حنابلہ نامی دو فرقوں میں بٹ گئے اشاعرہ، یعنی ابوالحسن اشعری کے پیرو جو کلام اور بحث وگفتگو کو جائز سمجھتے ہیں اور حنابلہ یعنی احمد بن حنبل کے ماننے والے اسے حرام جانتے ہیں۔ ہم منطق سے متعلق دروس میں یہ بتا چکے ہیں کہ ابن تیمیہ حنبلی نے منطق وکلام کی حرمت کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ (۲)

عوام کی نگاہوں میں معتزلہ کے لائق نفرت ہونے کا ایک دوسرا سبب "عصر محنت" کا بلوہ ہے۔ کیونکہ یہ معتزلہ ہی تھے جو خلیفہ مامون کی پیروی کے زور پر، قرآن کے حادث ہونے کے اپنے عقیدہ کو عوام سے زبردستی منوانا چاہتے تھے جس کے نتیجہ میں قتل وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ قیدخانے قیدیوں سے بھر گئے، شکنجہ وتشدد عام ہوگیا، نہ جانے کتنے گھر اجڑ گئے اور پورا اسلامی معاشرہ ان حالات سے تنگ آگیا۔ عام طور سے لوگ ان تمام حوادث کا ذمہ دار معتزلہ کو ہی سمجھتے تھے۔ اسی لئے عوام کی اکثریت معتزلی دبستان سے بیزار ومتنفر ہوگئی۔

۱۔ یہ کتابچہ موصوف کی "اللمع" نامی کتاب کے ذیل میں طبع ہوا ہے اور عبدالرحمٰن بدوی نے اس پورے کتابچہ کو "مذاہب الاسلامیین" کی جلد اول ص ۱۵۔۲۶ پر نقل کیا ہے۔ ۲۔ محمد ابوزہرہ کی کتاب "ابن تیمیہ" ملاحظہ فرمائیں۔

ان ہی دو وجوہات کے سبب ، عوام نے اشعری دبستان کی پیدائش کا استقبال کیا اور اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہو گئی ۔ ابوالحسن اشعری کے بعد بھی اس دبستان میں کچھ اور اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اس کی بنیادوں کو مستحکم بنا دیا ۔ ان شخصیتوں میں شیخ مفید کے معاصر ، قاضی ابو بکر باقلانی (وفات ۴۰۳ھ) ، ابواسحاق اسفرائنی ، جو باقلانی اور سید مرتضیٰ کے بعد کے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں ــــــ غزالی کے استاد امام الحرمین جوینی ، خود امام محمد غزالی ــــ صاحب کتاب "احیاء علوم الدین" وفات ۵۰۵ھ ــــ اور امام فخر الدین رازی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے

البتہ اشعری دبستان میں رفتہ رفتہ کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں خاص طور سے جب اسکی زمام غزالی کے ہاتھوں میں آئی تو اس کے کلامی رنگ پر عرفانی رنگ غالب آگیا اور امام فخر الدین رازی نے اسے فلسفہ سے قریب کر دیا ۔ بعد میں جب خواجہ نصیر الدین طوسی کا دور آیا اور انہوں نے "تجرید الاعتقاد" نامی کتاب تحریر فرمائی تو کلام نے نوّے فی صد فلسفی رنگ اختیار کر لیا ۔ تجرید کے بعد تمام متکلموں نے ــــ چاہے وہ معتزلی ہوں یا اشعری ــــ وہی راستہ اپنایا جو اس عظیم شیعہ ، فلسفی و متکلم نے طے کیا تھا ۔ مثلاً "مواقف" و "مقاصد" نامی کتابیں اور ان کی شرحیں تجرید ہی کے انداز پر لکھی گئی ہیں ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اشاعرہ اپنے پیشوا ابوالحسن اشعری سے دور ہوتے گئے ہیں اور ان کے نظریات کو اعتزال یا فلسفہ سے نزدیک کرتے گئے ہیں ۔

اب ہم یہاں ابوالحسن اشعری ــــ جنہوں نے "اہل سنت" کے اصول کا دفاع کیا ہے یا کسی نوعیت سے اہل سنّت کے عقیدہ کی توجیہ و تاویل کی ہے ــــ کے نظریات کی ایک فہرست پیش کر رہے ہیں :

الف ــ فلاسفہ اور معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف ، ذات اور صفات میں وحدت نہیں ہے

ب ــ تمام حوادث میں ، ارادہ اور قضا و قدر الٰہی کو عمومیت حاصل ہے (یہ نظریہ بھی معتزلہ کے خلاف ہے لیکن فلاسفہ کی رائے کے موافق ہے) ۔

ج ــ خیر کی طرح شر بھی خدا ہی کی جانب سے ہے (البتہ اشعری کے خیال میں

یہ نظریہ مذکورہ بالا نظریہ کا لازمہ ہے)۔

د ۔ انسان مختار نہیں ہے اس کے تمام اعمال وافعال خدا کی مخلوق ہیں (اشعری کے عقیدہ کے مطابق یہ نظریہ بھی ارادہ کی عمومیت کے متعلق نظریہ کا لازمہ ہے)۔

ھ ۔ افعال کا حسن و قبح ذاتی نہیں ہے بلکہ شرعی ہے، اسی طرح سے عدل بھی شرعی ہے نہ کہ عقلی (معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف)۔

و ۔ خدا پر "لطف" اور "اصلح" کی رعایت واجب نہیں ہے (معتزلہ کے نظریہ کے خلاف)۔

ز ۔ فعل پر انسان کی قدرت، فعل کے ہمراہ ہے اس سے پہلے نہیں ہے (فلاسفہ اور معتزلہ کے نظریہ کے برعکس)۔

ح ۔ تنزیہ مطلق، یعنی خدا اور غیر خدا کے درمیان کسی قسم کی مشابہت و مماثلت نہیں پائی جاتی (معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف)۔

ط ۔ انسان اپنے افعال واعمال کا خالق نہیں ہے بلکہ وہ انہیں صرف کسب کرتا ہے (خلق اعمال سے متعلق اہل سنت کے نظریہ کی توجیہ)۔

ی ۔ خدا قیامت کے دن ان ہی آنکھوں سے نظر آئے گا (فلاسفہ اور معتزلہ کے نظریہ کے برعکس)۔

ک ۔ فاسق، مومن ہے (خوارج و معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف، خوارج کا دعویٰ تھا کہ "فاسق" کافر ہے۔ جبکہ معتزلہ "منزلت بین المنزلتین" کے قائل تھے)۔

ل ۔ اگر خدا کسی بندے کو توبہ کے بغیر بخش دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اسی طرح وہ بے گناہ و مومن بندے پر عذاب بھی نازل کرسکتا ہے۔ (معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف)۔

م ۔ شفاعت میں کوئی حرج نہیں (معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف)۔

ن ۔ کذب بیانی اور وعدہ خلافی خدا کے لئے جائز نہیں ہے۔

س ۔ عالم حادثِ زمانی ہے (فلاسفہ کے نظریہ کے برخلاف)۔

ع ۔ کلامِ خدا قدیم ہے، لیکن یہ کلامِ نفسی ہے نہ کہ کلامِ لفظی (اہلِ سنت کے نظریہ کی توجیہ)۔

ف ۔ خدا کے افعال کی کوئی غرض و غایت نہیں ہے (فلاسفہ اور معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف)

ص ۔ تکلیف مالایطاق میں کوئی مضائقہ نہیں (فلاسفہ و معتزلہ کے نظریہ کے برخلاف)

ابوالحسن اشعری کے تالیفات بہت زیادہ ہیں، کہتے ہیں انہوں نے دو سو سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں" تذکروں میں تقریباً سو کتابوں کا نام ملتا ہے لیکن بظاہر ان کی اکثر کتابیں ضائع ہو چکی ہیں۔ ان کی مشہور ترین کتاب "مقالات الاسلامیین" ہے جو چھپ چکی ہے۔ لیکن کافی حد تک غیر منظم ہے۔ ان کی "اللمع" نامی ایک اور کتاب بھی چھپی ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ دوسری کتابیں بھی زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہوں۔

ابوالحسن اشعری، ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے افکار نے اسلامی دنیا پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اور یہ باعث افسوس ہے۔ البتہ بعد میں، ان کے افکار و نظریات پر معتزلیوں اور فلسفیوں نے بڑے پیمانہ پر اعتراضات کئے ہیں۔ ابوعلی سینا نے اپنی کتاب "شفاء" میں ابوالحسن اشعری کا نام لئے بغیر ان کے بہت سے عقائد و نظریات کو بیان کیا اور انہیں رد کیا ہے۔ یہاں تک کہ قاضی ابوبکر باقلانی اور امام الحرمین جوینی جیسے اشعریوں نے بھی "خلق اعمال" سے متعلق اشعری کے جبری نظریہ پر نظرثانی کی ہے۔

امام محمد غزالی، اگرچہ اشعری مذہب ہیں اور انہوں نے کافی حد تک اشاعرہ کے اصول کو استحکام عطا کیا ہے۔ لیکن موصوف نے اشعری اصولوں کے لئے کچھ نئی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں۔ غزالی نے کلام کو عرفان و تصوف سے نزدیک کردیا ہے۔ مثنوی کے خالق، مولانا محمد رومی بھی اشعری ہیں لیکن ان کے گہرے عرفان نے ہر چیز کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ فخرالدین رازی، جو فلسفیوں کے افکار سے آشنا تھے انہوں نے بھی اشعری کلام میں کچھ تبدیلیاں پیدا کرکے اسے قوت و توانائی

بخشی۔

اشعری دبستان کی کامیابی، اسلامی دنیا کو بہت مہنگی پڑی، یہ کامیابی، فکر و نظر کی حریت و آزادی پر جمود و تحجر کی کامیابی تھی۔ اگرچہ اعتزال و اشعریت کی جنگ سنی دنیا سے تعلق رکھتی تھی تاہم اشعریت کی جمود پسندی کے بعض آثار سے، شیعہ دنیا بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔ اس کامیابی کے لیے کچھ مخصوص سیاسی و سماجی اسباب و علل ہیں۔ بعض سیاسی حوادث نے بھی اس کامیابی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مامون نے ـــ جو خود بھی دانشور و روشن خیال شخص تھا ـــ معتزلہ کی حمایت کا بیڑہ اٹھایا تھا، معتصم اور واثق نے بھی مامون کا اتباع کیا، لیکن جب زمام حکومت متوکل کے ہاتھوں میں آئی تو اس نے مذہب اہل سنت ـــ جسے ایک صدی کے بعد ابوالحسن اشعری نے کلامی بنیاد عطا کی ـــ کی کامیابی میں اساسی کردار ادا کیا۔ اگر متوکل نے بھی مامون ہی کا اتباع کیا ہوتا تو یقیناً معتزلی دبستان کی یہ درگت نہ بنتی۔

ایران میں سلجوقی ترکوں کا غلبہ بھی اشعری افکار و نظریات کی کامیابی اور اس کی نشر و اشاعت کا ایک اہم اور مؤثر سبب رہا ہے۔

سلجوقی، آزاد فکر و نظر کے حامل نہ تھے جبکہ آلِ بویہ ان کے برعکس تھے۔ خود ان کی بعض شخصیتیں علم و ادب کے اعلیٰ مدارج پر فائز تھیں۔ آلِ بویہ کے دربار میں شیعہ اور معتزلی دبستانوں نے ترقی پائی۔ آلِ بویہ کے دو دانشور وزیر ابن العمید اور صاحب بن عباد اشعریت کے سخت مخالف تھے۔

ہم معتزلہ کی حمایت نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے بہت سے نظریات کے بودے پن کو ہم بعد میں بیان کریں گے۔ لیکن معتزلہ کے یہاں جو بات قابل تعریف ہے اور ان کی موت جس کی نابودی کا باعث بنی ہے وہ ان کی عقلی روش ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام جیسے غنی اور ٹھوس دین کو ایک ایسے کلام کی ضرورت ہے جو عقل کی حریت و آزادی پر راسخ ایمان و اعتقاد رکھتا ہو۔

⑦

شیعہ - ۱

معتزلی اور اشعری کلام کی وضاحت کے بعد اب ہم شیعی کلام کا بطور اختصار جائزہ لیتے ہیں۔

کلام - جس سے مراد اسلام کے اعتقادی اصول کے بارے میں عقلی و منطقی استدلال ہے ــ مذہب شیعہ میں ایک مخصوص و ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔

شیعی کلام کا سرچشمہ ایک تو شیعہ احادیث ہیں اور دوسرے وہ شیعہ فلسفہ سے پورے طور پر مخلوط ہے۔ گذشتہ دروس میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اہلسنت وجماعت کے کلام کو حدیث و سنت کی مخالف تحریک کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن شیعی کلام نہ صرف یہ کہ حدیث و سنت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس نے حدیث وسنت ہی کے دامن میں پرورش پائی ہے۔

حدیثی نقطۂ نظر سے اس امتیاز کا راز یہ ہے کہ اہل تسنن کی احادیث کے برخلاف شیعہ حدیثوں میں کچھ ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن میں سماجیات یا ماورائے طبیعت کے عمیق مسائل کا منطقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ اہل تسنن کی احادیث میں اس قسم کے موضوعات کے متعلق تجزیہ و تحلیل نظر نہیں آتی، مثلاً اگر ان کی حدیثوں میں "قضا و قدر" "خداوند عالم کے وسیع و عام ارادے" "باری تعالیٰ کے اسماء و صفات" "روح اور انسان" "موت کے بعد کی دنیا" "حساب وکتاب" "صراط و میزان" "امامت و خلافت" اور اسی طرح کے دیگر موضوعات کا ذکر ہوا ہے تو ان کے بارے میں کسی قسم کی وضاحت نہیں کی گئی ہے نہ دلیل و استدلال ہی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن شیعہ احادیث میں ان تمام مسائل کا عمیق جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے بارے میں استدلال بھی کیا گیا ہے۔ صحاح ستہ کی حدیثوں کے ابواب اور کلینیؒ کی "کافی" کی حدیثوں کے ابواب کے درمیان ایک

مختصر سا موازنہ ہی ، بات کو پورے طور پر واضح کردے گا ۔

چنانچہ خود شیعہ حدیثوں میں بھی " تکلّم " یعنی عقلی ، فکر و نظر اور ذہنی تجزیہ و تحلیل کا عمل انجام پایا ہے ۔ اسی لئے شیعہ اہل تسنن کی طرح " اہلحدیث " اور " اہل کلام " نامی دو فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے جیسا کہ ہم نے گذشتہ درس میں اہل تسنن کے مصادر کی روشنی میں یہ عرض کیا تھا کہ وہ پہلا مسئلہ جو مسلمانوں کے درمیان اعتقادی اصول کے عنوان سے موضوع بحث بنا " فاسق کے کفر " کا مسئلہ تھا ، جسے خوارج نے پہلی صدی کے نصف اول میں اٹھایا تھا ۔

اس کے بعد اختیار و آزادی کا مسئلہ اُٹھا جسے " معبد جہنی " اور " غیلان دمشقی " نے پیش کیا اور اس کا دفاع کیا ، یہ نظریہ اس نظریہ کے خلاف تھا جسے اموی حکمراں پروان چڑھا رہے تھے ۔ اس کے بعد دوسری صدی کے نصفِ اوّل میں ، " ذات وصفات کی وحدت " کا مسئلہ " جہم بن صفوان " نے اٹھایا اور پھر " واصل بن عطاء " اور " عمرو بن عبید " نے معتزلی دبستان کے پہلے مؤسسین کی حیثیت سے ، آزادی و اختیار کے مسئلہ کو " معبد " اور " غیلان " سے ذات وصفات کی وحدت کے مسئلہ کو " جہم بن صفوان " سے لیا اور فاسق کے کفر و ایمان کے سلسلہ میں " منزلت بین المنزلتین " کے نظریہ کو خود ایجاد کیا اور کچھ دوسرے مسائل میں بحث و گفتگو میں مشغول ہوگئے ۔ اس طرح اسلامی کلام کی بنیاد رکھی گئی ۔ مشرقی و مغربی اسلام شناسوں اور مستشرقین کی نگاہ میں اسلامی ، دینی اور عقلی بحثوں کے وجود میں آنے کی یہی توجیہ و تفسیر ہے ۔ یہ لوگ عمداً یا سہواً ان عمیق عقلی اور استدلالی بحثوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ جنہیں پہلی مرتبہ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام نے پیش فرمایا ہے ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی معارف و تعلیمات میں عمیق عقلی بحثیں پہلی مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کے خطبوں ، دعاؤں اور گفتگوؤں میں نظر آئی ہیں ، یہ حضرت علیؑ ہی کی ذات تھی جس نے پہلی مرتبہ ، خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات ، حدوث و

دقدم، بساطت وترکیب اور وحدت وکثرت وغیرہ کے سلسلہ میں انتہائی عمیق بحثیں پیش کی ہیں جو آج بھی نہج البلاغہ اور شیعوں کی دوسری مستند حدیثوں میں موجود ہیں ان بحثوں میں جو رنگ اور جو روح پائی جاتی ہے وہ معتزلہ اور اشاعرہ کی کلامی روش حتیٰ کہ ان بعض شیعہ علماء کے کلام سے بھی بالکل مختلف ہے جو اپنے زمانہ کے کلام سے متأثر تھے۔

ہم نے اپنی کتاب "سیری در نہج البلاغہ" اور "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کی پانچویں جلد کے مقدمہ میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

سنی مؤرخوں کو یہ اعتراف ہے کہ شیعی عقل، قدیم الایام سے فلسفی عقل رہی ہے یعنی شیعی طرزِ فکر شروع ہی سے استدلالی و تعقلی طرزِ فکر رہا ہے۔ شیعی تعقل و تفکر صرف حنبلی طرزِ فکر ــــ جو مذہبی عقائد میں دلیل و استدلال کی، سرے سے منکر ہے ــــ اور اشعری تفکر ــــ جو عقل سے اس کی اصالت کو چھین کر اُسے ظواہر الفاظ کا پابند بناتا ہے ــــ ہی کا مخالف نہیں ہے بلکہ وہ معتزلی طرزِ فکر کا بھی، اس کی تمام عقل نوازی کے باوجود، مخالف ہے۔ کیونکہ معتزلی طرزِ فکر اگرچہ عقلی ہے لیکن اس کی اساس جدل پر ہے، برہان پر نہیں ہے۔

ہم کلیاتِ فلسفہ سے مربوط دروس میں حکمتِ مشائی و حکمتِ اشراقی اور حکمتِ ذوقی و حکمت جدلی "معتزلی و اشعری" کا فرق بیان کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً سب ہی اسلامی فلسفہ شیعہ تھے۔ اسلامی فلسفہ کی حفاظت صرف شیعوں نے کی ہے۔ اور شیعوں نے یہ جذبہ اپنے پیشواؤں خاص طور سے اپنے پہلے امام امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے حاصل کیا ہے۔

شیعہ فلسفیوں نے فلسفہ کو کلام کی شکل میں ڈھالے بغیر اور اس کی برہانی حکمت کی شکل بگاڑ کر جدلی حکمت کی صورت عطا کئے بغیر وحی قرآن اور دینی رہنماؤں کے فیوضات وارشادات کے سہارے اسلامی اصول و عقائد کی بنیادوں کو مستحکم بنایا ہے۔ لہٰذا اب اگر ہم شیعہ متکلمین کی فہرست پیش کرنا چاہیں اور

ہمارا مقصد ان تمام افراد کو ذکر کرنا ہو جو شیعہ اسلامی عقائد کے سلسلہ میں عقلی طرز فکر رکھتے تھے تو پھر ہمیں راویانِ حدیث کی ایک جماعت اور فلسفیوں کے ایک گروہ کو بھی متکلین کی فہرست میں شامل کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں شیعہ حدیث اور شیعہ فلسفہ دونوں نے علم کلام کے فریضہ کو خود علم کلام سے بھی بہتر طور پر انجام دیا ہے۔

لیکن اگر متکلین سے ہماری مراد صرف وہ جماعت ہو جو معتزلی و اشعری متکلموں سے متأثر ہو کر جدلی حکمت سے آراستہ تھی تو پھر ہمیں صرف ایک مخصوص گروہ ہی کو مدّ نظر رکھنا ہوگا۔ لیکن ہمارے سامنے کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم صرف اس مخصوص گروہ ہی کو مرکز توجہ قرار دیں۔

عقائد کے بارے میں ائمہ علیہم السلام کے ارشادات سے قطع نظر، جو اُن بزرگواروں نے خطبہ، روایت اور دعا کی شکل میں بیان فرمائے ہیں، شیعہ مؤلفوں میں وہ پہلے شخص جس نے عقائد کے بارے میں کتاب تالیف کی ہے علی بن اسماعیل بن میثم تمار ہیں۔

میثم تمار خود بھی خطیب و سخنور تھے اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے محرمِ اسرار مانے جاتے تھے۔ علی بن اسماعیل اسی جلیل القدر شخص کے پوتے ہیں، موصوف دوسری صدی کے نصف اوّل کے مشہور و معروف متکلموں اور معتزلی کلام کے اولین مؤسسوں، عمرو بن عبید اور ابوالہذیل علاف کے ہمعصر ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب میں کچھ افراد ہیں جنہیں خود امام صادق علیہ السلام نے "متکلم" کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ جیسے ہشام بن الحکم، ہشام بن سالم، حمران بن اعین، ابو جعفر احول ـــــ جو مومن طاق کے نام سے مشہور ہیں ـــــ اور قیس بن ماصر وغیرہ۔

کتاب کافی میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ ان لوگوں نے امام صادق (ع) کے حضور میں ایک مخالف سے مناظرہ کیا اور یہ مناظرہ امام علیہ السلام کی خوشی و

مسرت کا باعث بنا۔

یہ لوگ بھی دوسری صدی ہجری کے نصف اول سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے امام صادق علیہ السّلام کی درسگاہ میں پرورش پائی تھی، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ علیہم السلام نہ صرف یہ کہ خود، کلامی مسائل کا تجزیہ و تحلیل کرتے اور اس کے بارے میں بحث و گفتگو فرماتے تھے بلکہ اپنے حلقۂ درس میں کچھ لوگوں کو اعتقادی بحثوں کے لئے تربیت بھی دیتے تھے۔ ہشام بن حکم کا سارا جوہر و کمال، علم کلام ہی میں تھا۔ فقہ یا حدیث و تفسیر میں اتنی دسترس نہ رکھتے تھے۔

امام صادق علیہ السلام، ہشام بن حکم کو جو اس وقت نوجوان ہی تھے اپنے تمام اصحاب سے زیادہ عزت دیتے، اور انھیں سب سے اوپر بٹھاتے تھے۔ امام صادق کے اس عمل کی تفسیر کے سلسلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ اتنی تکریم و تعظیم کا واحد سبب ہشام بن حکم کا متکلّم ہونا تھا۔

امام صادق علیہ السلام، علم کلام کے حامل ہشام کو ارباب فقہ و حدیث پر ترجیح دے کر درحقیقت، اعتقادی بحثوں کی قدر و قیمت کو بڑھانا اور علم کلام کو فقہ و حدیث سے برتر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ظاہری بات ہے کہ ائمۂ اطہار علیہم السلام کے اس قسم کے اعمال نے علم کلام کی ترویج اور شیعی عقل و فکر شروع ہی سے فلسفی و کلامی بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام مختلف مذاہب کے متکلموں پر مشتمل، مامون کی جانب سے منعقد مناظرے کی محفلوں میں بہ نفس نفیس شرکت فرماتے اور مناظرہ کرتے تھے، ان مناظروں کی روداد شیعہ کتابوں میں محفوظ ہے۔

مغربی و مشرقی اسلام شناس اور مستشرقین۔ جس طرح امیرالمؤمنین علیؑ کے کارناموں کو چھپاتے رہے ہیں اسی طرح دینی و اعتقادی مسائل سے متعلق، عقلی بحثوں کے احیاء کے سلسلہ میں ائمۂ اطہارؑ کے ان تمام کارناموں کو بھی نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ اور یہ بڑی تعجب خیز بات ہے۔

فضل بن شاذان نیشاپوری ـــــ جو امام رضا (ع)، امام محمد تقی (ع) اور امام علی نقی (ع) کے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی قبر نیشاپور میں ہے۔ فقیہ و محدّث ہونے کے ساتھ ساتھ متکلم بھی تھے انہیں بہت سی کتابوں کا مصنف بتایا جاتا ہے

نوبختی خاندان، جن کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، وہ عام طور سے متکلم تھے۔ فضل بن ابی سہیل بن نوبخت سے ـــــ جو ہارون کے زمانہ میں بیت الحکمۃ نامی مشہور و معروف کتب خانہ میں تھے، اور فارسی سے عربی کے مشہور ترجموں میں شمار ہوتے تھے نیز اسحٰق بن ابی سہیل بن نوبخت اور ان کے بیٹے اسماعیل بن اسحٰق بن ابی سہیل بن نوبخت اور ان کے دوسرے بیٹے علی بن اسحاق اور ان کے پوتے ابو سہل اسماعیل بن علی بن اسحاق بن ابی سہل بن بخت ـــــ جنہیں شیعوں کے شیخ المتکلمین کا لقب دیا گیا ہے ـــــ اور اسماعیل بن علی کے بھانجے حسن بن موسیٰ نوبختی نیز اس خاندان کے کچھ دوسرے افراد تک، یہ سب کے سب شیعہ متکلمین میں شمار ہوتے ہیں۔

ابن قبہ رازی، تیسری صدی میں اور مشہور و معروف اسلامی حکیم و طبیب نیز "طہارۃ الاعراق" نامی کتاب کے مصنف ابو علی بن مسکویہ، پانچویں صدی کی ابتداء کے شیعہ متکلموں میں شمار ہوتے ہیں۔

شیعہ متکلمین کی فہرست خاصی طویل ہے، مشہور فلسفی و ریاضی داں، "تجرید الاعتقاد" کے مصنف خواجہ نصیر الدین طوسی اور تجرید الاعتقاد کے شارح، نامور فقیہ علامہ حلی، ساتویں صدی کے مشہور متکلموں میں شمار ہوتے ہیں۔

خواجہ نصیر الدین طوسی نے جو عظیم المرتبت فلسفی بھی ہیں، "تجرید الاعتقاد" تحریر کر کے علم کلام کی بہترین کتاب تخلیق فرمائی ہے۔

تجرید الاعتقاد کے بعد کے تمام شیعہ و سنی متکلموں نے اس کتاب کو مرکز توجہ قرار دیا ہے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے علم کلام کو جدلی حکمت کے اسلوب سے کافی حد تک دور کر کے برہانی حکمت کے اسلوب سے قریب کیا۔ لیکن بعد کے ادوار میں علم

کلام تقریباً مکمل طور پر جدلی اسلوب سے عاری ہوگیا۔ تمام متکلمین برہانی حکمت کے پیرو ہو گئے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ فلسفہ کے مقابلہ میں اپنے استدلالی کلام سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی کے بعد شیعہ فلسفیوں نے علم کلام کے ضروری مسائل کو فلسفہ میں بیان کیا اور فلسفی اسلوب سے ان کا تجزیہ وتحلیل کی ہے۔ یہ فلاسفہ اس سلسلہ میں متکلموں سے کہیں زیادہ کامیاب رہے ہیں جو پرانے اسلوب سے مسائل کی چھان بین کرتے تھے۔ مثال کے طور پر صدر المتألہین ۔یا حاجی سبزواری اگرچہ متکلمین کی صف میں شمار نہیں ہوتے لیکن کلامی مسائل میں مؤثر واقع ہونے کے لحاظ سے وہ متکلموں سے کہیں زیادہ اثرانداز ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اسلام کے اصلی مآخذ و مصادر یعنی قرآن، نہج البلاغہ، اور اہل بیت (ع) سے منقول روایتوں اور دعاؤں کا مطالعہ کریں تو ہمیں کلامی اسلوب کے بہ نسبت یہ فلسفی اسلوب ائمہ (ع) دین کے طرز فکر سے زیادہ قریب نظر آئے گا۔ ہم یہاں مجبوراً اسی قدر اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

۸

شیعہ ۔۔۔ ۲

اس سبق میں، ان کلامی مسائل کے بارے میں شیعہ نظریات کو بطور اجمال بیان کردینا ضروری ہے جو اسلامی متکلموں کے درمیان رائج ہیں۔

ہم نے گذشتہ درس میں معتزلی دبستان کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ معتزلہ، توحید، عدل، وعدووعید، منزلت بین المنزلتین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر مشتمل پانچ اصولوں کو اپنے مکتب فکر کی اساس و بنیاد قرار دیتے ہیں اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ ان پانچ اصولوں کو معتزلہ کے دیگر اصولوں پر جو امتیاز

اور برتری حاصل ہے وہ یہ ہے کہ یہ اصول، معتزلی دبستان کی خصوصیت ہیں اور اسے دوسرے مخالف دبستان سے جدا کرتے ہیں۔ البتہ یہ گمان نہ ہو کہ یہ پانچ اصول معتزلہ کی نگاہ میں اصول دین ہیں اور بقیہ فروع دین۔

شیعہ علماء ــ نہ کہ شیعہ ائمہ ــ نے بھی قدیم الایام سے پانچ اصولوں کو شیعیت کے اصول خمسہ کے عنوان سے پیش کیا ہے اور وہ اصول یہ ہیں:

توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت۔

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پانچ اصول، اصول دین ہیں اور بقیہ فروع دین ہیں۔ یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصول دین سے مُراد یہ ہے کہ ان پر ایمان و اعتقاد رکھنا مسلمان ہونے کی شرط ہے تو اصول دین، دو اصل سے زیادہ نہ ہوں گے۔ یعنی توحید و نبوت، کلمۂ شہادتین کا مفہوم صرف اتنا ہی (توحید و نبوت) ہے، علاوہ براین شہادت کا دوسرا حصہ (نبوت) صرف نبوت خاصہ یعنی حضرت خاتم النبیین (ص) کی نبوّت سے مربوط ہے۔ نبوت عامّہ، یعنی انبیاءِ ما سلف کی نبوت شہادتین کے مفہوم سے خارج ہے، حالانکہ جو چیز اصولِ دین کا جزء ہے اور اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے وہ تمام انبیاء کی نبوّت ہے۔

اور اگر اصولِ دین سے مُراد وہ اصول ہوں جو اسلامی نقطۂ نظر سے ایمان و عقیدہ کا جزو ہیں، عملی امور سے مربوط نہیں ہیں تو کچھ دوسرے امور بھی ہیں جو ایمانی مسائل کا جزو ہیں (مگر انھیں اصول دین میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔) جیسے ملائکہ۔ قرآن مجید میں صراحتاً یہ کہا گیا ہے کہ ملائکہ کے وجود پر ایمان رکھنا ضروری ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ (۱)

رسولؐ جو کچھ ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لے آئے اور مومنین میں، سب کے سب خدا اور

۱۔ سورہ بقرہ ۲۸۵

اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

اس کے علاوہ صفت عدل میں کونسی ایسی خصوصیت تھی جو خداوند عالم کے تمام صفات میں سے صرف اسی ایک صفت کو دائرۂ ایمان میں شامل کیا گیا ہے؟ اور باری تعالیٰ کے دیگر صفات جیسے علم، حیات، قدرت، سمعیت اور بصیریت وغیرہ کو دائرۂ ایمان سے خارج رکھا گیا ہے، اگر خدا کے صفات پر ایمان رکھنا لازم ہے تو اس کے تمام صفات پر ایمان رکھنا چاہیئے۔ اور اگر ضروری نہیں ہے تو پھر کسی صفت پر بھی ایمان رکھنا ضروری نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اصول پنجگانہ کو اس حیثیت سے پیش کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصول ایک طرف ان اصولوں کی نشاندہی کریں جن پر اسلامی نقطۂ نظر سے ایمان و عقیدہ رکھنا واجب ہے اور دوسری طرف مذہب شیعہ کے تشخص و امتیاز کو بھی پہچنوائیں۔ توحید، نبوّت اور معاد یہ تین ایسے اصول ہیں جن پر ایمان و عقیدہ رکھنا اسلامی نقطۂ نظر سے ہر مسلمان پر واجب ہے۔ یعنی ان پر ایمان لانا، اسلام کے اہداف و مقاصد کا جزو ہے۔ جبکہ عدل مذہب شیعہ کی خاص علامت ہے۔

اصل عدل، اگرچہ اسلام کے ایمانی و اعتقادی مقاصد میں شامل نہیں ہے یعنی باری تعالیٰ کے علم و حیات و قدرت جیسے دیگر صفات اور اس صفت عدل میں کوئی فرق نہیں ہے تاہم یہ ان اصولوں کا جزو ہے جو اسلام کے بارے میں مذہب شیعہ کے مخصوص نقطۂ نظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اصل امامت، شیعی نقطہ نظر سے دونوں پہلوؤں کی حامل ہے یعنی ایمانیات کے دائرہ میں بھی شامل ہیں اور مذہب کا تشخص و علامت بھی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ملائکہ پر ایمان، جس کے ضروری ہونے پر خود قرآنی نص گواہ ہے اسے ایک چھٹی اصل کے طور پر کیوں نہیں پیش کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ ایمانی اصول (توحید، نبوّت، معاد) اسلام کے اہداف و مقاصد کا حصہ ہیں۔ یعنی پیغمبر اکرمؐ نے لوگوں کو ان پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے، یعنی پیغمبر کی رسالت ان ہی ایمانوں کا مقدمہ ہے۔ لیکن ملائکہ پر ایمان اور اسی طرح نماز و روزہ جیسے دیگر ضروریات

دین پر ایمان، مقصدِ رسالت کا جزو نہیں ہے بلکہ رسالت کا لازمہ ہے دوسرے لفظوں میں یہ سب، نبوت پر ایمان کے لوازم میں سے ہیں، نبوت کے اہداف و مقاصد میں سے نہیں ہیں۔

مسئلۂ امامت کو اگر سیاسی و اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھیں یعنی حکومت و قیادت کے لحاظ سے اُسے موردِ نظر قرار دیں تو یہ مسئلہ "عدل" جیسی حیثیت رکھتا ہے، یعنی ایمانی امور کے دائرہ میں نہیں آتا۔ لیکن اگر اُسے معنوی اعتبار سے دیکھیں، یعنی اس لحاظ سے کہ امام ـــ حدیث کی اصطلاح میں ـــ "حجت خدا" اور "خلیفۃ اللہ" ہے اور مسلمانوں کی ہر فرد اور ہر دور کے انسانِ کامل کے درمیان ایک معنوی رابطہ قائم ہونا ضروری ہے تو مسئلۂ امامت، ایمانی مسائل کا جزو ہے۔

اب ہم شیعوں کے مخصوص کلامی عقائد کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں چاہے وہ مذکورہ اصولِ پنجگانہ میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔

الف ـــ توحید

توحید، معتزلہ کے اصولِ پنجگانہ میں بھی شامل تھی اور اشاعرہ بھی اسے اپنے اصول کا جزو بتاتے ہیں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ جو توحید معتزلہ پیش کرتے ہیں اور ان کی دبستان کی علامت مانی جاتی ہے وہ صفاتی توحید ہے اور اشاعرہ اس کے منکر ہیں، اور اشاعرہ کی توحید جو ان کے دبستان کی علامت شمار ہوتی ہے افعالی توحید ہے جس کے معتزلہ منکر ہیں۔

ہم پہلے بھی یہ بتا چکے ہیں کہ چونکہ ذاتی و عبادتی توحید پر سب متفق ہیں اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ شیعہ جس توحید کے قائل ہیں وہ کیسی توحید ہے؟

شیعہ جس توحید کے قائل ہیں اس میں ـــ ذاتی و عبادتی توحید کے ساتھ ہی ساتھ ـــ صفاتی توحید بھی شامل ہے اور افعالی توحید بھی، یعنی شیعہ، صفات کی بحث میں صفاتی توحید کے قائل ہیں اور افعال کی بحث میں افعالی توحید کے، لیکن

شیعوں کی صفاتی توحید معتزلیوں کی صفاتی توحید سے مختلف ہے اسی طرح ان کی افعالی توحید بھی اشاعرہ کی افعالی توحید سے فرق رکھتا ہے۔

معتزلہ کی صفاتی توحید کا مطلب یہ ہے کہ ذات ہر صفت سے خالی ہے دوسرے لفظوں میں ذات، فاقد صفت ہے لیکن شیعوں کی صفاتی توحید کا مطلب یہ ہے کہ صفات عین ذات ہیں۔ (۱) اس سلسلہ میں تفصیلی معلومات شیعوں کی فلسفی و کلامی کتابوں میں تلاش کرنی چاہیئے۔

شیعوں کی افعالی توحید بھی اشاعرہ کی افعالی توحید سے مختلف ہے۔ اشاعرہ کی افعالی توحید کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے کسی قسم کا اثر نہیں رکھتی، یہ سارے آثار براہ راست خدا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا بندوں کے افعال کا بھی براہ راست خالق خدا ہے، خود بندہ اپنے افعال و اعمال کا خالق نہیں ہے۔ اس قسم کا عقیدہ، "جبر محض" ہے۔ جیسے متعدد دلائل و براہین کے ذریعہ باطل ثابت کیا جا چکا ہے لیکن شیعوں کی افعالی توحید کا مطلب یہ ہے کہ اسباب و مسببات کا نظام ایک ٹھوس حقیقت ہے اور ہر "اثر" اپنے نزدیک ترین سبب سے وابستہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ذات حق تعالیٰ سے بھی وابستہ ہے اور یہ دونوں تعلقات ایک دوسرے کے طول میں ہیں۔ نہ کہ ایک دوسرے کے عرض میں۔

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لئے "انسان و سرنوشت" نامی کتاب کا مطالعہ کیجئے۔

---

(۱) صفات کے بارے میں معتزلہ سے جو بات منسوب کی جاتی ہے وہ یہی ہے جسے میں نے بیان کیا ہے چنانچہ حاجی سبزواری فرماتے ہیں:

الاشعری بازدیاد قائله   وَقالَ بالنِّیابَة المعتَزلَه

لیکن ابو الہذیل جیسے بعض معتزلیوں سے جو تعبیرات نقل کئے گئے ہیں ان سے بعینہ وہی بات ثابت ہوئی ہے جس کے شیعہ قائل ہیں۔

ب ــــ عدل

عدل کے سلسلہ میں شیعہ و معتزلہ متفق ہیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے فیض و رحمت اور اسی طرح بلا و نعمت کو ذاتی اور پہلے سے موجود استحقاق کی بنا پر نازل کرتا ہے اور خداوند عالم کی سزا و جزا، بلا و نعمت اور فیض و رحمت کے لحاظ سے نظام تخلیق میں ایک مخصوص نظم و قانون برقرار ہے۔

اشاعرہ، عدل اور اس قسم کے نظام کے منکر ہیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کے نظام پر مشتمل عدل کے عقیدہ کا لازمہ ذات حق تعالیٰ کی مقہوریت و محکومیت ہے اور یہ ذات حق تعالیٰ کی "قاہریت مطلقہ" کے سراسر خلاف ہے۔ خود عدل کے بھی بہت سے فروعات ہیں جن کی طرف ہم دیگر اصول کی وضاحت کے ضمن میں اشارہ کریں گے۔

ج ــــ اختیار و آزادی

مذہب شیعہ میں اختیار و آزادی کا اصول، کسی حد تک معتزلہ کے عقیدہ سے مشابہت رکھتا ہے تاہم شیعہ جس اختیار و آزادی کے قائل ہیں وہ معتزلہ کے نظریات سے فرق رکھتی ہے۔

معتزلہ کا اختیار و آزادی "تفویض" یعنی انسان کو خود اس کے حال پر چھوڑ دیا جانا اور خدا کو اثر و تاثیر میں اپنی مشیت و ارادہ سے معزول کر دینا ہے اور یقیناً یہ ــــ جیسا کہ اس سے مربوط بحثوں میں ثابت کیا جا چکا ہے ــــ محال ہے۔

لیکن شیعہ جس اختیار و آزادی کے قائل ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندوں کو مختار و آزاد خلق کیا گیا ہے لیکن بندے دوسرے تمام مخلوقات کے مانند اپنے وجود اور اپنے وجود کے تمام امور میں جس میں ان کی فاعلیت بھی شامل ہے، ذات حق تعالیٰ سے وابستہ ہیں اور یہ سب کچھ اسی کی عنایت و مشیت کا پرتو ہے۔

اسی لئے شیعہ مذہب میں اختیار و آزادی کا اصول، اشعری "جبر" اور معتزلی

"تفویض" کے درمیان ایک حدِ وسط ہے اور ائمۂ اطہار (ع) سے منقول اس مشہور جملہ:

لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيضَ بَلْ أَمْرٌ بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ

کا یہی مطلب ہے ۔ اختیار و آزادی کا اصول ، عقیدۂ عدل کی فرع ہے ۔

د ـــ ذاتی حُسن و قُبح

معتزلہ کا کہنا ہے کہ افعال ، فی نفسہ " حسن " یا " قبح " کے حامل ہیں۔ مثلاً عدل فی نفسہ اچھی چیز ہے اور ظلم بذاتِ خود بُری چیز ہے ۔ صاحبِ حکمت اچھے کاموں کو اپناتا ہے اور بُرے کاموں سے گریز کرتا ہے اور چونکہ خداوند متعال حکیم ہے لہٰذا اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اچھے کام بجالائے اور بُرے کاموں سے اجتناب کرے ۔ پس اشیاء کے ذاتی حسن و قبح اور خدا کے حکیم ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ بعض کام خدا پر " واجب " اور بعض امور اس کے لئے " حرام " و ناروا ہے ۔

اشاعرہ اس عقیدہ کے سختی سے مخالف ہیں ، وہ نہ تو اشیاء کے ذاتی حسن و قبح کے قائل ہیں اور نہ ہی خدا پر کسی کام کے واجب و حرام ہونے کا حکم لگانے کو صحیح مانتے ہیں شیعوں میں سے بعض وہ افراد جو معتزلی کلام سے متاثر تھے انہوں نے اس مسئلہ میں معتزلیوں کے نظریہ کو بعینہٖ تسلیم کر لیا ۔ لیکن کچھ دوسرے افراد جنھوں نے اس مسئلہ کا زیادہ گہرائی سے زیادہ جائزہ لیا ہے ذاتی حسن و قبح کے تو قائل ہیں لیکن عالمِ ربوبیت میں ان احکام کو نافذ نہیں مانتے (۱)

ھ ـــ لُطف اور اَصلح کا انتخاب

اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان ایک بحث یہ بھی ہے کہ نظامِ کائنات پر لطف " یعنی بندوں کے فائدہ کے لئے اصلح کا انتخاب ، حکم فرما ہے یا نہیں ؟

---

(۱) "عدلِ الٰہی" کا مطالعہ فرمائیے ۔

معتزلہ قانونِ لطف کو خداوند عالم پر ایک "تکلیف" اور "فریضہ" کی حیثیت سے واجب ولازم جانتے ہیں لیکن اشاعرہ قانونِ لطف اور انتخابِ اصلح کے منکر ہیں۔

البتہ قانونِ لطف، عدل اور عقلی حسن و قبح کے فروعات میں سے ہے۔ بعض شیعہ متکلموں نے قانون لطف کو اسی معتزلی شکل میں تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن جو افراد خداوند عالم کے سلسلہ میں "تکلیف" اور "فریضہ" کے مسئلہ کو غلط محض سمجھتے ہیں انہوں نے انتخابِ اصلح کے قانون کا ایک دوسرا ہی تصور پیش کیا ہے۔ جس کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

و ـــ عقل کی حجیت

عقل کی حجیت، اور اس کی مستقل حقیقت وواقعیت معتزلہ سے زیادہ شیعہ مذہب میں ثابت کی گئی ہے۔

معصومین علیہم السلام کے حکم کے مطابق، شیعہ عقل کو باطنی و درونی پیغمبر تصور کرتے ہیں جس طرح کہ پیغمبر اکرم ظاہری و بیرونی عقل ہیں۔ شیعہ فقہ میں عقل کو چار دلیلوں میں سے ایک مستقل دلیل مانا جاتا ہے۔

ز ـــ حق تعالیٰ کے فعل میں غرض ومقصد

اشاعرہ اس اصول کے منکر ہیں کہ خداوند عالم کے افعال کسی ایک یا چند اغراض ومقاصد کے تحت ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غرض ومقصد رکھنا انسان یا اسی جیسے مخلوقات کا خاصہ ہے اور خداوند عالم اس قسم کی چیزوں سے منزّہ ومبرّا ہے کیونکہ کسی فاعل کے غرض ومقصد رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ غرض ومقصد اس فاعل پر جبراً حاکم ومسلط ہے اور خداوند عالم ہر قسم کی محکومیت ومحدودیت سے منزّہ ہے۔ چاہے وہ غرض ومقصد رکھنے ہی کی محدودیت کیوں نہ ہو۔

افعال کی غرض وغایت کے سلسلہ میں، شیعہ، معتزلہ کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ فعل کے مقصد اور فاعل کے مقصد میں فرق ہے۔ جو چیز محال ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے افعال میں خود اپنے لئے کوئی مقصد رکھتا ہو، لیکن اگر اس غرض و مقصد کا تعلق مخلوق سے ہو تو یہ خداوند عالم کے ذاتی استغناء اور اس کی ذات کے علو و کمال سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔

ح ___ حق تعالیٰ کے فعل میں بدا ممکن ہے

جس طرح خدا کے احکام میں نسخ جائز ہے اسی طرح بدا بھی جائز ہے بدا کی بحث کو "اسفار" جیسی فلسفہ کی کتابوں میں دیکھنا چاہیئے۔

ط ___ خدا کا دیدار

معتزلہ، بڑی سختی کے ساتھ خدا کے دیکھے جانے کے منکر ہیں، ان کا خیال ہے کہ خدا پر صرف ایمان ہی لایا جا سکتا ہے (اسے دیکھا نہیں جا سکتا) ایمان و عقیدہ کا تعلق فکر و ذہن سے ہے یعنی اپنے ذہن و فکر میں خدا کے وجود پر یقین رکھا جا سکتا ہے اور یہی ایمان کی اعلیٰ ترین حد ہے۔ خدا کو کسی بھی صورت میں دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کی قرآنی دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ
هُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۔ انعام / ۱۰۳

آنکھیں اسے نہیں دیکھتیں مگر وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ وہ لطیف (ناقابل رویت) اور آگاہ ہے (نگاہوں وغیرہ سے باخبر ہے)

لیکن اشاعرہ بڑے شد و مد سے یہ کہتے ہیں کہ خدا کو ان ہی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن صرف قیامت میں۔ اشاعرہ نے بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کچھ حدیثیں اور آیتیں پیش کی ہیں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ قیامۃ ۲۲، ۲۳

اس دن کچھ چہرے خرم و شاداب اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے

شیعوں کا نظریہ ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے ہرگز نہیں دیکھا جا سکتا نہ دنیا میں نہ آخرت میں تاہم ایمان کی اعلیٰ ترین حد، فکری و ذہنی یقین بھی نہیں ہے۔ فکری یقین علم الیقین ہوتا ہے اور فکری یقین سے بھی بالاتر قلبی یقین ہے جو عین الیقین ہے۔ عین الیقین یعنی خداوند عالم کا مشاہدہ دل کی آنکھوں سے نہ کہ ان ظاہری آنکھوں سے۔

پس خدا کو ان ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہاں دل کی آنکھوں سے اس کی زیارت ممکن ہے۔ حضرت علی (ع) سے کسی نے دریافت کیا: آپ (ع) نے خدا کو دیکھا ہے؟ حضرت (ع) نے فرمایا:

میں نے جس خدا کو نہ دیکھا ہو اس کی عبادت نہیں کی ہے۔ آنکھیں
تو اسے نہیں دیکھ سکتیں لیکن دل اسے دیکھ سکتے ہیں۔

ائمہ (ع) سے بھی سوال کیا گیا ہے کہ آیا پیغمبر اسلام (ص) نے معراج کے موقع پر خدا کا دیدار کیا ہے؟ اس کا جواب ائمہ (ع) نے یہ دیا کہ ان ظاہری آنکھوں سے تو نہیں لیکن دل کی آنکھوں سے ہاں۔ اس مسئلہ میں صرف عرفا ہیں جو شیعوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ی۔ فاسق کا ایمان

اس مسئلہ میں جیسے ہم بارہا بیان کر چکے ہیں، شیعہ اشاعرہ کے ہم خیال ہیں۔ انہوں نے نہ خوارج کے نظریہ کو مانا ہے جو فاسق کو کافر جانتے ہیں اور نہ ہی معتزلہ کی رائے سے متفق ہیں جو "منزلت بین المنزلتین" کے قائل ہیں (یعنی فاسق نہ کافر ہے نہ مومن)

ک۔ انبیاء و اولیاء کی عصمت

شیعوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ائمہ و انبیاء علیہم السلام کو ہر

قسم کے صغیرہ و کبیرہ گناہ سے معصوم مانتے ہیں۔

ل ــــ مغفرت و شفاعت

اس مسئلہ میں بھی شیعہ، معتزلہ کے اس خشک عقیدہ کے مخالف ہیں کہ جو شخص توبہ کئے بغیر اس دنیا سے اُٹھ جائے اس کی مغفرت و شفاعت ناممکن ہے۔ البتہ شیعہ، مغفرت و شفاعت کے اصول سے متعلق اشاعرہ کے انتہا پسندانہ و خرافاتی عقیدہ سے بھی متفق نہیں ہیں۔(۱)

۱۔ کتاب عدلِ الٰہی۔ بحث شفاعت کا مطالعہ فرمائیں۔

قرآن
اور راہ ھدایت

مستحسن اختلاف

مذموم اختلاف

از: جناب شیخ جوادی آملی
ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

گذشتہ بحث میں آٹھواں اعتراض اور اس کا جواب ذکر کیا گیا۔ مذکورہ اعتراض میں یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ: اگر فلسفہ حق ہے تو فلسفیوں کے درمیان اس قدر اختلاف کیوں پائے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: اختلاف بہت سے علوم میں پایا جاتا ہے اور اتفاق سے علم کلام میں پائے جانے والے اختلافات اگر فلسفہ میں موجود اختلافات سے زیادہ نہیں ہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ جو اختلافات اشاعرہ، معتزلہ، امامیہ اور مسلمانوں کے دیگر فرقوں میں پائے جاتے ہیں سب علم کلام کی بحثوں سے مربوط ہیں، فلسفہ کی بحثوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید یہ کہ وہی اختلاف مذموم اور ناپسندیدہ ہے جو دراصل جاہ طلبی کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہو ورنہ ہر اختلاف مذموم اور ناپسندیدہ نہیں ہوتا۔

اختلاف کی قسمیں

انسانوں کے درمیان دو طرح کے اختلاف پائے جاتے ہیں:

۱______ مذموم اور ناپسندیدہ اختلاف

۲______ مستحسن اور پسندیدہ اختلاف

مستحسن اور پسندیدہ اختلاف وہ اختلاف ہے جو ارتقاء و کمال کا سبب بنے، کیونکہ اگر تمام مفکرین اور دانشور ایک ہی انداز میں ایک ہی ڈھرے پر سوچتے اور غور کرتے تو علم ہرگز ترقی کی منزلیں نہ طے کرتا۔ اگر کوئی بات کسی شخص کے ذہن میں آئے، چاہے وہ شخص کتنا ہی بڑا مفکر و دانشور کیوں نہ ہو بغیر چھان بین اور نقد و تبصرہ کے اسے تسلیم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آنکھیں بند کر کے بات مان لینے سے علم کامل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حق معلوم ہو جائے تو اس کے بعد اختلاف روا اور جائز نہیں ہے۔

صاحبان فکر و نظر کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ ترازو کے دو پلوں کے مانند ہوتا ہے کہ اگر وزن تولی جانے والی چیز کے برابر نہ ہو تو دونوں پلے برابر نہیں ہوں گے۔ اور اگر دونوں پلے برابر ہو جائیں تو یہ ظلم ہے کیونکہ دونوں کے وزن میں فرق موجود ہے۔ لہٰذا اس ظلم کو برطرف کرنے اور وزن اور تولی جانے والی شے کے درمیان توازن پیدا کرنے کے سلسلہ میں اختلاف وجود میں آتا ہے۔

اہل فکر و نظر ایک متوازن نقطہ تک پہنچنے سے پہلے تک شک و تردید سے دوچار رہتے ہیں اور بحث و مباحثہ میں اختلافات کے ذریعہ ان کی پوری کوشش یہی رہتی ہے کہ حق واضح ہو جائے اب اگر حق معلوم ہونے کے بعد اختلاف کریں تو یہی اختلاف مذموم اور ناپسندیدہ ہے پس معلوم ہوا کہ مستحسن اور پسندیدہ اختلاف وہ ہے جو آگاہی سے پہلے ہو اور مذموم و ناپسندیدہ اختلاف آگاہی اور حق کو جان لینے کے بعد والا اختلاف ہے۔

اگر قرآن کریم یہ اشارہ فرماتا ہے کہ یہودی اور عیسائی علماء نے دین کے آنے اور حقائق کے روشن ہو جانے کے بعد اختلاف کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ وحی میں اختلاف ہے بلکہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس راہ کو طے کرنے والوں میں بہت سے لوگ چونکہ شیطان کے مطیع و فرماں بردار تھے لہٰذا وہ امانت کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔

اختلافات کی مثالیں قرآن میں

قرآن میں ان پسندیدہ اور ناپسند اختلافات کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ میں آیا ہے

ابتدا میں ارشاد ہوتا ہے

" كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً "

" تمام انسان ایک امت تھے "

حضرت آدمؑ کے زمانہ سے حضرت نوحؑ کے زمانہ تک جبکہ کوئی معین و مشخص شریعت موجود نہ تھی، انسان ایک ہی انداز میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے درمیان کسی گروہی، صنفی یا عقیدتی اختلاف کے مانند کوئی اختلاف نظر نہیں آتا تھا۔

" فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ "

" خداوند عالم نے ایسے پیغمبروں کو مبعوث کیا جو بشارت دینے والے بھی تھے اور ڈرانے والے بھی۔ تاکہ عدالت و ظلم کے وسیع ترین معنی کے اعتبار سے تمام اعتقادی، اخلاقی اور عملی مراحل میں مظلوموں کو بشارت دیں۔ اور ظالموں کو ڈرائیں"۔

" وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ "

" اور اللہ نے انبیاء کرام کے ہمراہ ایسی کتاب نازل کی جو حق کے ساتھ تھی۔ تاکہ یہ کتاب (یا وہ خدا جس نے یہ کتاب نازل کی ہے) لوگوں کے درمیان حکم رہے اور جس چیز میں اختلاف کرتے ہوں اس کا فیصلہ کرے۔

یہ اختلاف وہی مستحسن اور پسندیدہ اختلاف ہے جو مختلف آراء و افکار کے درمیان لوگوں کے آپسی ٹکراؤ کے بغیر یا خود غرضی و جاہ طلبی کی بنیاد پر لوگوں میں پیدا کئے جانے والے اختلافات سے الگ وجود میں آتا ہے۔ اور اس آسمانی کتاب کا فریضہ یہی ہے کہ وہ طریقہ کار اور طرز فکر کے اختلافات کو ختم کرکے اور حق کو روشن و واضح کردے۔ لیکن حق واضح و روشن ہو جانے کے بعد اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس کے بعد پیدا ہونے والا اختلاف جاہ طلبی، انانیت اور نفس پرستی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس آیت سے یہ بات مشخص ہوجاتی ہے کہ: اگرچہ بنی نوع انسان حضرت آدمؑ کے زمانہ سے حضرت نوحؑ کے عہد میں شریعت کے آنے تک ایک امت تھے اور توحیدی فطرت کی بنیاد پر باہمی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے باوجود حق و باطل کی تشخیص میں اختلاف رکھتے تھے اور نفی و اثبات کے درمیان سرگرداں و متردد رہا کرتے تھے۔ یعنی ان میں اتحاد ہونے کے باوجود اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایسا اختلاف تھا جو وحدت و اتحاد سے پوری ہم آہنگی رکھتا تھا۔ بالکل اس ترازو کے مانند جو اپنی جگہ خود ایک واقعیت ہے لیکن اس کے دونوں پلّے برابر نہیں ہوتے۔ شک و تردید میں مبتلا انسان بھی دو مختلف حقیقتیں نہیں بلکہ ایک ایسی واقعیت ہے جس کے باطن میں نفی و اثبات کی دلیلیں باہم دست و گریباں ہیں تاکہ حق اس پر روشن ہوجائے حضرت نوحؑ سے پہلے کا انسانی معاشرہ بھی ایسا ہی تھا۔ یہ لوگ باہم متحد ہونے کے باوجود ایک دانشور کی فکر میں پائے جانے والے مثبت و منفی اختلاف کی طرح مستحسن و پسندیدہ اختلاف رکھتے تھے۔

علم کے بعد کا اختلاف

"وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ" بقرہ/۲۱۳

"اور اس کتاب میں سوائے ان لوگوں کے کسی نے اختلاف نہیں کیا جو اس کتاب کو پانے، حق کے واضح ہونے اور روشن دلیلیں دیکھ لینے کے بعد آپسی ظلم (جاہ طلبی، خودسری و انانیت) کے زیر اثر اختلاف میں مبتلا ہوئے۔"

سچ ہے! حق کے آشکار ہوجانے کے بعد ایک گروہ نے نفس پرستی اور پست اغراض و مقاصد کے زیر اثر حق کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے ٹکرانے پر آمادہ ہوگئے اور دوسرے گروہ نے حق سے سرکشی نہیں کی بلکہ اس کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں تو خداوند عالم نے انھیں اپنی ولایت کے سایہ میں لے لیا، انھیں منزل تک پہنچا دیا اور ہدایت فرمادی۔

"فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ

بِاِذْنِهٖ" بقرہ/۲۱۳

ہدایت بعنوان جزا

درحقیقت یہ ہدایت بطورِ جزا ہے جو خداوند عالم نے حق کی تلاش میں رہنے والے افراد کو عطا فرمائی ہے، ورنہ ابتدائی ہدایت تو خداوند عالم نے تمام انسانوں کو فرمائی ہے، چاہے وہ طالبانِ حق ہوں یا سرکش اور اپنے آپ پر ظلم کرنے والے افراد۔ کیونکہ ہدایت کے معنی ہیں راہ دکھانا اور خداوند عالم نے کتابوں اور پیغمبروں کو بھیج کر سب کو اچھی اور بُری راہ بتادیں۔

"اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا"(۱)

"ہم نے انسان کے سامنے راستہ کی نشاندہی کردی اب چاہے وہ شکر بجالائے اور ہدایت قبول کرے یا کفران کرے اور گمراہی میں پڑا رہے"

لیکن وہ لوگ جنہوں نے سرکشی کی اور حق کے آگے تسلیم نہیں ہوئے بلکہ اس سے ٹکرانے پر آمادہ ہوئے، حق نے انہیں خاک میں ملادیا۔

"من صارع الحق صرعه"

"جو حق سے ٹکرایا، حق نے اُسے زمین پر دے مارا"

اور جو لوگ اختلافی مسائل میں حق کے مطیع فرمانبردار ہوگئے، خداوند عالم نے انہیں ایسی ہدایت عطا فرمائی کہ وہ راہ راست کو بخوبی تشخیص دے کر منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔

"وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"(۲)

"اور اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے"

یہ بات جو سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ میں بیان کی گئی ہے سورہ آل عمران کی ۹ ادیں آیت

۱۔ سورۂ دہر آیت نمبر ۳ — ۲۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۱۳

میں بھی ذکر ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیں:

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ"

"بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ لیکن وہ لوگ جن تک (اللہ کی کتاب پہنچی اور انہوں نے علم حاصل ہونے (اور حق کے واضح ہونے) کے بعد اختلاف کیا اور جس شخص نے اللہ کی آیتوں سے انکار کیا (کفر اختیار کیا) وہ یہ جان لے کہ اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے، اور جلد ہی ان کا حساب پاک کر دے گا"

سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں خداوند عالم کا حکم یہ ہے کہ ہمیں وحی کو حق کے پرکھنے کا آلہ اور ترازو قرار دینا چاہیئے اور اختلاف نہیں کرنا چاہیئے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے بغض وعناد اور دشمنی کی بنا پر اختلاف پیدا کر دیا۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے

"شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرَاھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ۚ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ ۚ اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ"

"خداوند عالم نے وہی دین اور وہی قانون تمہارے لئے معین و مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوح سے کی تھی اور (اے پیغمبرؐ) جس کی وحی ہم نے آپ پر کی ہے اور جس کی سفارش ہم نے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے کی تھی کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ و اختلاف نہ کرو۔ مشرکین کے لئے وہ بات

بڑی سخت اور دشوار لگتی ہے جس کی آپ انھیں دعوت دیتے ہیں اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف بلا لیتا ہے منتخب کر لیتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف تضرع وزاری اور دعا کے ساتھ بڑھتا ہے، خدا اس کی ہدایت فرماتا ہے۔ البتہ یہ ہدایت وہی جزا کے عنوان سے ہے ابتدائی اور عمومی ہدایت نہیں ہے۔ اسی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"وَمَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ" (۱)

"اور جب حق ان پر روشن و واضح ہو گیا تو ان میں سے بعض نے سرکشی اور جاہ طلبی کی بنیاد پر آپس میں اختلاف پیدا کر دیا۔

سورہ جاثیہ میں بھی یہی مطلب بیان کیا گیا ہے۔ اس سورہ کی آیت نمبر ۱۷ میں ارشاد ہوتا ہے

"وَاٰتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ"

"ہم نے دین کے سلسلہ میں روشن اور واضح آیتیں ان کے سامنے پیش کیں، لیکن انہوں نے جاہ طلبی اور سرکشی کی بنا پر حقیقت روشن ہو جانے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اختلاف کیا۔ بے شک تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان کے درمیان اور ان میں پیدا ہونے والے اختلافات کے سلسلہ میں فیصلہ فرمائے گا۔"

باطل مذاہب کی پیدائش

"تمام اقوام و ملل اور علماء دین میں جو اختلاف ہے نزولِ وحی کی بنا پر ہے"۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ خود وحی اختلاف کا سبب ہوئی ہے بلکہ دین کی راہ طے کرنے والے اگر شیطان کے تحت تسلط ہوں تو وحی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور اسے اپنی جاہ طلبی کی دستاویز بنا لیتے ہیں۔

یہ تمام اختلافات جو پیدا ہوئے ہیں اور ان چار سوروں میں صاف طور سے جن کی مذمت کی گئی ہے

۱۔ شوریٰ/۱۴

اور جن سے سوکا گیا ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ دین سے اپنی خواہشات کے مطابق فائدہ اٹھایا گیا اور وحی کو اپنے طور سے معنی پہنائے گئے۔ جس کا نتیجہ نہ صرف ایک مذہب میں اختلافات کی شکل میں ظاہر ہوا بلکہ بہت سے مذاہب اور باطل عقائد کے وجود میں آنے کا سبب بنا۔ لیکن جیسا کہ سورۂ حج کی چوتھی آیت سے معلوم ہوتا ہے، انسان شروع سے ہی مذہب ساز نہیں تھا، بلکہ اپنے ہم فکر افراد کے ساتھ جزئی بحث و مباحثہ اور حق تک پہنچنے کے بعد بھی اسے قبول نہ کرنے سے اس کا آغاز ہوا، اور اپنی بات پر ہٹ دھرمی سے جمے رہنے اور اسے ثابت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قسم کے مذاہب اور احکام و قوانین وجود میں آگئے۔ حتیٰ اکثر ایسے افراد یہ بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے ایک عمر شیطان کی ولایت و سرپرستی میں گزاری ہے۔

"كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ"

"یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جس شخص نے شیطان کی سرپرستی قبول کی شیطان آتش جہنم کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔" (سورۂ حج آیت ۴)

سچ ہے! اگر کسی میں یہ جرأت پائی جاتی ہو کہ بحث و مباحثہ کے دوران جب بھی حق سامنے آجائے اسے تسلیم کرلے اور مان لے تو اس نے خود کو صرف سکون و اطمینان ہی عطا نہیں کیا ہے بلکہ شیطان کی سرپرستی اور تسلط سے بھی اپنے آپ کو دور کرلیا ہے۔ نتیجہ میں اس کی یہ ہدایت بطور جزا ہوگی۔

نتیجۂ بحث

مذکورہ بحث سے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ: اختلاف، کسی شعبہ یا کسی علم کے باطل ہونے کی دلیل ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تک پہنچنے سے پہلے کا اختلاف علم کے کمال کی طرف پیشرفت کا ذریعہ ہے، اور یہی وہ پسندیدہ اختلاف ہے جو نظریوں کے اختلاف کے تحت پیش آتا ہے، لیکن مذموم اور ناپسندیدہ اختلاف وہ اختلاف ہے جو بات کو سمجھ لینے اور حقیقت تک پہنچ جانے کے بعد جاہ طلبی اور ہٹ دھرمی کے زیر اثر نیز قرآنی تعبیر میں، بغاوت و سرکشی کے تحت پیدا ہوتا ہے کہ یہ اختلاف نہ صرف انسان کو گمراہ کرتا ہے بلکہ بہت سے باطل مذاہب اور گمراہ کن قوانین و احکام کی پیدائش کا سبب بھی بنتا ہے اور بہت سے لوگوں کو گمراہی و ہلاکت کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

جناب سید محمد تقی مصباح
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

حقوق کی بنیاد اور سرچشمہ

آخری قسط

مصلحت کسے کہتے ہیں؟

یہ مطالب جو، اختصار کے پیش نظر، کوزہ میں سمندر بھرنے کے عنوان سے پیش کئے گئے ہیں، ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ حقوقی اصول و قواعد کو حقیقی و واقعی مصلحتوں اور مفسدوں کے ساتھ ان کی ہم آہنگی و یکسوئی کی بنیاد پر پرکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں: کہا جا سکتا ہے کہ حقوقی اصول و قواعد حق و عدالت پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ انسانی خواہشات اور افراد یا جماعت کے افکار و خیالات کے تابع اصول و قوانین چنانچہ قرآن میں اعلان ہوتا ہے:

"وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ [۱]"

اور اگر کہیں حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو سارے آسمان و زمین اور جو کچھ اس میں ہے تباہ و برباد ہو جاتے۔

۱۔ سورۂ مومنون آیت نمبر ۷۱

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ حقوق و اقدار سے متعلق مفاہیم، انسانوں کے سماجی روابط اور اختیاری افعال کے دائرہ میں انجام پانے والے جملہ تاثیر و تاثرات کو نتیجہ بخش بنانے کے لئے ایک معیار و نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور حقوق کے ہدف اقداری نظام کے آخری نشانے کی طرف پیش رفت کے رُخ اور جہت معین کرتے ہیں۔

اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قانون بنانے والے کا اصل فریضہ یہ ہے کہ انسانی افعال کے درمیان پائے جانے والے مختلف قسم کے پیچیدہ روابط کو حقوقی مقاصد بلکہ تمام تر اخلاقی و دینی مقاصد کے ساتھ بھی رکھ کر پرکھے اور ہر طرح کے امور کو جو کسی بھی صورت میں ان مقاصد تک پہنچنے کی راہ میں پیش آتے ہیں حقوق و اقدار سے متعلق مفاہیم کے قالب میں ڈھلا ہوا ہونا ضروری قرار دے اور ہر وہ کام جو کسی بھی طرح ان مقاصد کے خلاف نظر آئے ان کو رد کردے۔

لیکن ان سب کے باوجود، سوال یہ اٹھتا ہے کہ مصلحت و مفسدہ سے مراد کیا ہے؟ اور کیا آخر کار اس کی بازگشت عوام کے مفاد و ضرر اور احتیاج و عدم احتیاج پر نہیں ہوتی؟ اور کیا بنیادی طور پر حقوق کا مقصد، خود کسی اقدار کا حامل نہیں ہے جو یہ لوگوں کی ضرورت و خواہش کے مطابق معین ہوتا ہے؟ اور پھر سوال یہ ہے کہ آیا اجتماعی طرز و رفتار اپنی ضرورت کے پیش نظر اور مطلوبہ مقصد و ہدف تک پہنچنے کے لئے وسیلہ و ذریعہ کے عنوان سے جائز اور قانونی صورت اختیار کرسکتی ہے؟

اس صورت میں جبکہ ان سوالوں کا جواب مثبت میں ہو یہ ماننا پڑے گا کہ حقوق بلکہ تمام تر اقداری نظام اور اسی طرح حق و عدالت کے مانند مفاہیم لوگوں کی خواہش اور ذاتی رجحانات سے کوئی مستقل تعلق نہیں رکھتے!

اصل میں ان سوالات کا مکمل و اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقدار کی ماہیت، اقدار کا واقعیت کے ساتھ ربط و تعلق، حقوق کے اہداف و مقاصد کا تعین اور افراد و معاشرہ کے نفع و نقصان کے ساتھ ان کا رابطہ نیز منفعت و مصلحت کے درمیان فرق ـــــ جیسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے

ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ لیا جائے لیکن تفصیل کے ساتھ ان تمام موضوعات پر کوئی بحث کرنا اس مختصر سے مقالہ میں ممکن نہیں ہے۔ بہر حال بحث کے دوران جہاں احتیاج محسوس ہوئی بقدرِ ضرورت ہم ان کی طرف اشارہ کریں گے جیسا کہ گذشتہ مباحث کے ذیل میں ہمارا طریقۂ کار رہا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ خود قدریں یکساں نہیں ہوتیں۔ امورِ اختیاری کا با اقدار ہونا ان کے اہداف و مقاصد کے با اقدار ہونے سے فرق کرتا ہے، چنانچہ اخلاق و حقوق کے باب میں ذکر ہونے والے امور کا بااقدار ہونا صرف وسیلہ و ذریعہ کی مطلوبیت کے معنیٰ میں ہے جبکہ اہداف و مقاصد کے با اقدار ہونے کا مطلب جنس اصلی و ذاتی کی مطلوبیت ہے۔ نیز یہ کہ پسندیدہ اور مصلحت آمیز امور کی انجام دہی سے متعلق جس ضرورت کی بات کی جاتی ہے وہ ایک ضرورت بالقیاس ہے اور نتیجہ حاصل کرنے کے لئے مقدمہ اور سبب کی حیثیت سے بیان ہوتی ہے اور یہ اس ضرورت سے مختلف ہے جس کی نسبت خود ہدف، خصوصاً ہدف نہائی یعنی حقیقی کمال و سعادت کی طرف دی جاتی ہے اور جو اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ اپنے لئے سعادت و کمال کی طلب ہر انسان میں ذاتی طور پر پائی جاتی ہے اور یہی ذاتی مطلوبیت تمام اختیاری امور کی انجام دہی کا اصل جذبہ بیدار کرتی ہے اس کے بغیر کوئی بھی اختیاری فعل انجام نہیں پا سکتا۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ سعادت و کمال کا مفہوم زیادہ سے زیادہ اعلیٰ ترین و پائدار ترین لذتوں سے بہرہ مند ہونے پر منتہی ہو جاتا ہے۔ اور لذت سے بہرہ مند ہونے اور کمال تک پہنچنے میں خود بخود کوئی تلازم نہیں پایا جاتا۔ لیکن الٰہی دستِ حکمت نے لذتوں کی طرف میلان و رجحان خود انسان کے اندر ودیعت کیا ہے جو اسے اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور ضرورتوں کی تکمیل نہ صرف افراد بلکہ نوع انسان کی حیات اور بقا نیز وسائلِ کمال کے حصول کے لئے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ کمال تک رسائی حاصل کرنا بنیادی طور پر انسان کی روحانی

ضرورتوں میں سے شمار ہوتا ہے ۔ لہٰذا فطری خواہشات کی طرف میلانات ورجحانات اصل میں وہ روحانی جذبے ہیں جو انسانی حیات کی حفاظت اور اس کے تکامل وارتقا کا ذریعہ ہیں اور اس اعتبار سے آخری کمال تک رسائی کامل ترین لذت (یعنی حقیقی سعادت) کے حصول کے ساتھ جڑی ہوئی ہے :-

"لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (فرقان/١٦) وہاں (جنت میں) وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ خواہش کریں گے" وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (زخرف/۷۱) اور وہاں (جنت میں) جس چیز کو جی چاہے اور جس چیز سے آنکھیں لطف اندوز ہوں (سب کچھ موجود ہے)

اور قرآن کریم کی نظر میں سعادت اس کے لئے ہے جو ابدی دنیا میں سرائے رحمت الٰہی یعنی بہشت جاودانی میں داخل ہوجاتا ہے :-

"وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا ..."
اور جو لوگ سعید و نیکبخت ہیں وہ بہشت میں ہونگے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے ...... (ہود/۱۰۸)

پتہ چلا کہ واقعی سعادت اور حقیقی کمال دونوں کا مصداق ایک ہے چاہے ان دونوں میں کوئی وحدت یا تلازم کا مفہوم نہ بھی پایا جاتا ہو۔

تیسرا نکتہ : سعادت اور حقیقی کمال کے مصداق کی تعیین اور اس تک پہنچنے کے لئے راہوں کی تشخیص میں اختلاف کی کئی وجوہات ہیں ان ہی میں سے ایک حیات ابدی کی طرف سے غفلت نیز لوگوں کی عقل و استعداد کے بلوغ و کمال میں پایا جانے والا تفاوت بھی ہے ۔ ظاہر ہے یہاں ان سے متعلق کوئی تحقیقی بحث نہیں کی جا سکتی ۔ پھر بھی بہر صورت بعض لذتوں کے سلسلہ میں لوگوں کی پسند اور دلچسپیوں میں پایا جانے والا اختلاف یا لوگوں کا بعض لذتوں کو بعض دوسری لذتوں پر ترجیح دینا کسی بھی طرح اس بات کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کمال خود اپنی جگہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا یا بعض خواہشات میں واقعی رجحان قلب نہیں پایا جاتا بلکہ ـــــ کمال ایک

فلسفیانہ مفہوم ہے جو اصطلاح میں شدت وجود پر منتہی ہوتا ہے اور اس تک پہنچنا فرحت و سکون اور رضائے خاطر کا سبب بنتا ہے اور تمام کے تمام اعمال و رفتار جو انسان کو اگرچہ کئی کئی واسطوں اور مرحلوں سے گزرنے کے بعد حقیقی کمال اور ابدی سعادت تک پہنچاتے ہیں، بلاشبہ مصلحت اور واقعی اقدار کے حامل ہوں گے۔ چنانچہ یہی اعمال و رفتار جب اجتماعی روابط کے دائرے میں داخل ہو جائیں، اجتماعی مصلحت کے حامل قرار پاکر اجتماعی سعادت کے موجب بن جائیں گے۔ اور یہی حقوق کے قریب ترین مقاصد تشکیل دیتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح حقیقی سعادت و کمال اپنی جگہ فی نفسہ ایک امر واقعی ہے اور یہ گروہوں اور شخصیتوں کے خواہشات و ہوس سے الگ مستقل ایک چیز ہے، یوں ہی مصالح و مفاسد بھی جو کہ اس آخری ہدف تک رسائی اور حصول کے وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں، فی نفسہ حقیقت و واقعیت کے حامل امور ہوں گے لوگوں کی خواہش و پسند اور طریقۂ فکر سے آزاد یہ مستقل حیثیت کے حامل ہوں گے۔

فرد اور معاشرہ کی مصلحت

انسان طرح طرح کی ضرورتیں رکھتا ہے اور اس مادی دنیا میں جہاں لوگوں کی پسند اور خواہشات میں تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے اس کی تمام ضرورتوں کی بھرپور تکمیل میسر نہیں ہے اور ایسے بہت سے موارد پیش آتے ہیں جہاں بعض ضرورتوں کو بعض دوسری ضرورتوں پر قربان کر دینا ضروری ہوتا ہے ـــــ یہی وہ منزل ہے جہاں انتخاب، ضرورتوں کے دائرے میں قدم رکھتا ہے، عقل اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ پست ضرورتوں کو اعلیٰ ضرورتوں پر قربان کر دیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تمام انسان اس ترتیب اور عقلی تقاضے کی رعایت نہیں کرتے یا قوت تمیز و تشخیص کی کمی و کمزوری یا بعض لذتوں کے تئیں عادت و پسند کی مجبوری کے زیر اثر پست ضرورتوں کی تکمیل کو ترجیح دینے لگتے ہیں اور دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی مصلحت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں۔

پس مصلحت آمیز روش سے مراد وہ روش ہے جو اہم ترین ضرورتوں

کی تکمیل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ کمالات کے حصول کا ذریعہ قرار پائے دوسرے لفظوں میں: انتخاب صحیح و سالم عقل کے فیصلہ کی بنیاد پر ہو۔

اس قسم کی بات شخصی مصلحتوں اور اجتماعی مصلحتوں کے درمیان تضاد و تزاحم کی صورت میں بھی جاری ہے یعنی اجتماعی زندگی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ بعض انفرادی و شخصی فوائد معاشرہ کے فوائد پر قربان کر دیئے جائیں اور معاشرتی زندگی میں ہر شخص اپنی کچھ ذاتی و شخصی خواہشوں اور منفعتوں کی طرف سے صرف نظر کرتے ہوئے اجتماعی فوائد اور مصالح مہیا کرے۔

انفرادی و اجتماعی مصلحتوں کے درمیان ٹکراؤ کی دو صورتیں ہیں:۔

پہلی صورت: یہ کہ شخصی فوائد و مصالح، اجتماعی فوائد و مصالح پر اس طرح قربان ہوں کہ معاشرہ کے تمام افراد برابر سے بہرہ ور ہوں اور سبھی کی خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل ہو، منجملہ ان سب کے وہ شخص بھی جس نے اپنے بعض شخصی فوائد سے چشم پوشی کر لی تھی، ہاتھ سے جانے والے فائدہ کے برابر یا اس سے بیشتر فائدہ حاصل کرے تو اس صورت میں عقل اس شخص سے متقاضی ہوتی ہے کہ وہ یہ قربانی دینے پر تیار ہو جائے دوسرے لفظوں میں خود اس کی مصلحت اس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس قربانی کو قبول کرے۔

دوسری صورت: یہ ہے کہ شخصی منفعت سے صرف نظر کرنے والے شخص کے لئے ہاتھ آنے والی منفعت اس کے برابر یا اس سے بیشتر فائدے سے بہرہ ور ہونے کا سبب نہ بنے یا اسے کوئی فائدہ ہی حاصل نہ ہو یا فائدہ تو حاصل ہو مگر ہاتھ سے جانے والی منفعت سے کم ہو آیا اس صورت میں بھی اس کی عقل اس بات کی اجازت دے گی کہ وہ اپنی شخصی منفعت سے صرف اس لئے چشم پوشی کر لے کہ اس میں دوسروں کے لئے منفعت و مصلحت پائی جاتی ہے؟

ماننا پڑے گا کہ مادی نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب ہرگز مثبت میں نہیں دیا جا سکتا اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو سود جوئی کی منطق کو توجیہ کا پیرایہ عطا

کرتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ہر شخص اس فکر میں رہتا ہے کہ جس قدر ہو سکے معاشرے سے فائدہ اُٹھائے اور جتنا بھی ممکن ہو دوسروں کو نقصان پہنچائے ایسا انسان اپنے کسی فائدے سے صرف اس صورت میں دستبردار ہونے پر تیار ہوتا ہے جب اُسے معلوم ہو کہ ایسا نہ کرنا اس کے لئے مزید محرومیت کا سبب بن جائے گا اور وہ اس سے زیادہ فائدہ معاشرے سے حاصل نہ کر سکے گا۔

اصل میں جو لوگ مادی نقطۂ نظر کے ساتھ اجتماعی مصالح کا دم بھرتے ہیں یا دوسروں کے فوائد کی طرفداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی باتیں فریب و ریاکاری کے علاوہ کچھ نہیں ہوتیں۔ ان کا منشا و ہدف شخصی فوائد کی تکمیل کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ فکر ہے جو موجودہ دنیا کے اکثر و بیشتر معاشروں پر حکم فرما ہے، حق و عدالت اور حقوق انسانی کی طرفداری کا دعویٰ بڑی طاقتوں اور ان کے قدم بقدم چلنے والوں کی طرف سے محض جھوٹے، دکھاوے اور فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

دوسری طرف بعض حقوق داں معاشرے کی بنیادی حیثیت کے قائل ہوئے ہیں اور انہوں نے انفرادی حقوق کو محض معاشرتی و اجتماعی حقوق کے ایک جزو کی حیثیت سے قبول کیا ہے چنانچہ شخصی مصلحت اور اجتماعی مصلحت کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک شخصی حقوق کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی لیکن یہ نظریہ اپنی فلسفیانہ بنیادی کمزوریوں سے قطع نظر، کیونکہ اس میں فرد کے مستقل اور حقیقی وجود سے ہی انکار کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اگر ہم اس حقیقت سے بھی صرف نظر کرلیں کہ وہ مختلف جماعتیں جو خود کو اس نظریہ کا حامی و طرفدار اعلان کرتی ہیں عملی طور پر دوسروں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں سوشلسٹ طرز فکر کی حامل حکومتوں کا حال نظر آرہا ہے ان سب کے باوجود اصل سوال یہ ہے کہ کس منطق کے تحت افراد کو اس بات پر قانع کیا جائے گا کہ وہ از روئے عقل اپنی شخصی منفعت سے، سوچے سمجھے بغیر چشم پوشی اختیار کرلے کہ اس کے بعد معاشرہ اسے اس کے برابر یا اس سے بیشتر فائدہ دے گا یا نہیں؟

ہمیں معلوم ہے کہ تبلیغات کے ذریعہ یا جذبات واحساسات کو ابھار کر بعض افراد کو ایثار و قربانی پر تیار کیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ قومی، نسلی یا اسی کے مثل دوسرے افکار پیدا کر کے ان کو میدان جنگ تک کھینچا جا سکتا ہے لیکن بحث عوام کو دھوکے میں مبتلا کر کے مطلب نکال لینے کی نہیں ہے۔ بلکہ بات اس مسئلہ کا کوئی عقلی حل تلاش کرنے کی ہے۔

ہاں الٰہی طرز فکر کی بنیاد پر مذکورہ مسئلہ کا واضح و مثبت جواب دیا جا سکتا ہے کیونکہ

اوّلاً: حکمت الٰہی کا تقاضہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد بشر زیادہ سے زیادہ کمالات کا خود کو حامل قرار دیں اور اسکے لئے کائنات کی تمام تر نعمتیں اعلیٰ ترین منزل کمال تک پہنچنے کے وسیلہ کے طور پر ان کے اختیار میں دے دی گئی ہیں، لہٰذا ان نعمتوں سے سب کو اسطرح بہرہ ور ہونا چاہیئے کہ تخلیق کا مقصد تمام افرادِ انسانی پورا کر سکیں۔

ثانیاً: یہ کہ ایثار و قربانی مادّی اعتبار سے چاہے کسی قدر نقصان و محرومی کا سبب ہی کیوں نہ بنے اسکے بدلے میں ایک شخص کے اندر روحانی و معنوی کمالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا حصول کائنات اور انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔

ثالثاً: یہ کہ ہر وہ محرومی جو اس دنیا میں رضائے حق کے پیش نظر تخلیق انسانی کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے انسان برداشت کرتا ہے دوسری دنیا میں اس سے بہتر اور کامل تر صورت میں اس کی تلافی کر دی جاتی ہے۔

لہٰذا: ایک شخص کے لئے اپنے ذاتی و شخصی فوائد سے جبکہ وہ عوامی و اجتماعی فوائد اور مصالح سے ٹکراتے ہوں لازمی طور پر اپنے حق سے دستبردار ہو کر ایثار سے کام لینے کی دلیل یہ ہے کہ حکمتِ الٰہی نیز اس کی تخلیق کا مقصد خود اس ایثار کا متقاضی ہے چنانچہ لوگوں کو اس طرح کی قربانی پر قانع کرنے کا راستہ یہ ہے کہ انہیں سمجھایا جائے یہ ایثار و قربانی ایک طرف تو ان کے نفس اور روح کے تکامل وارتقاء کا باعث ہوگی جس کے نتیجہ میں ان کے وجدان کو نشاط اور روحانی لذت حاصل ہوگی اور دوسری طرف یہ اُن کے لئے ابدی و جاودانی سعادت فراہم

کرنے کا ذریعہ ہے اور ان کو تقرب الٰہی کے عظیم درجہ پر فائز کر کے بہشت کی تمام نہ ہونے والی نعمتوں سے فیضیاب کرے گی۔ ایسی نعمتیں جو اپنی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے دنیا کی مادّی نعمتوں کے ساتھ کسی طرح بھی قابل موازنہ نہیں ہیں۔

اور اس طرح الٰہی حقوقی نظام کا اخلاقی نظام کے ساتھ نیز الٰہی تصورِ کائنات کے ساتھ ملحق ہونا بالکل واضح و روشن ہو جاتا ہے۔

حقوق و مصلحت کے درمیان رابطہ

گذشتہ مباحث سے مصلحت و مفسدہ کے معنیٰ اور شخصی و اجتماعی مصلحتوں کے ساتھ قانونی مطابقت کا لازمی ہونا واضح ہو گیا۔ اور اب ایک آخری سوال کی منزل آ پہنچی ہے کہ حق و مصلحت کے درمیان کیا رابطہ پایا جاتا ہے؟

ہم نے مقالہ کے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ لفظِ حق مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے جس کے فرق کو پوری توجہ کے ساتھ ملحوظِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ کسی طرح کی غلط فہمی اور اشتباہ نہ پیدا ہو۔

حق کے معانی میں سے ایک معنیٰ جس کا ہماری بحث سے تعلق ہے، یہ ہے کہ انسان کا عمل صحیح ہدف و مقصد کا حامل ہو یعنی وہ کام ہو جو زیادہ حصولِ کمال کا باعث ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل اس فعل کو کہتے ہیں جو اس طرح کے مقصد سے عاری ہو مثال کے طور پر کوئی لغو اور بیہودہ کام۔

اس اصطلاح کے مطابق جو عمل مصلحت کا حامل ہو 'حق' اور جو عمل مصلحت سے عاری ہو 'باطل' ہے۔ اسی طرح جو قانون پہلی قسم کی روش و رفتار کا مطالبہ کرے اپنے متعلقات کے لحاظ سے حق اور جو قانون دوسری قسم کے طرز و عمل اپنانے پر مجبور کرے باطل قرار پائے گا۔ اور اس طرح حق و مصلحت کا فیصلہ مطابقت و مصداق کے مورد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے گا ــــــ گویا ــــــ دونوں مفہوم اعتباری مفاہیم کے حامل ہیں اور فلسفہ کے معقولات ثانیہ سے تعبیر ہوں گے

جو عمل اور اس سے مرتب ہونے والے نتیجہ کے درمیان رابطہ کو پیش نظر رکھ کر نکالے جاتے ہیں۔

لیکن حقوق دانوں کی اصطلاح میں "حق" وہ قانونی امتیاز اور رعایت ہے جو کسی معاشرہ یا افراد کو حاصل ہوتی ہے جس میں دو طرفہ "مَنْ لَہُ الْحَق" اور "مَنْ عَلَیْہِ الْحَق" کی نسبت پائی جاتی ہے اور جس سے لازمی طور پر طرف مقابل پر کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک اعتباری مفہوم ہے جو ملکیت کے مفہوم سے قریبی رشتہ رکھتا ہے البتہ ایک بنیادی فرق کے ساتھ اور وہ یہ کہ ملکیت کے مفہوم میں مذکورہ دو طرفہ نسبتیں ملحوظ نہیں رکھی گئی ہیں۔ بلکہ صرف مملوک (یعنی ملکیت) اور مالک کے درمیان اضافی نسبت پیش نظر رکھی گئی ہے۔

حق کے مفہوم کو اگر اس کے وسیع تر دائرے میں دیکھیں اور اجتماعی روابط کی حد تک محصور نہ کریں تو اس میں اخلاقی حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں اور خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ کے موارد پر بھی یہ صادق آتا ہے۔ لیکن بہر صورت، حق سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا کسی نہ کسی عنوان سے اختیاری امر کے ساتھ ارتباط ضروری ہے اور اگر ہم استفادہ کی منزل میں کسی وجود کے دوسرے وجود کے مقابل محض تکوینی و تخلیقی امتیاز کو پیش نظر رکھیں بغیر اس کے کہ یہ صاحب امتیاز وجود نہ تو اپنے اختیار سے اس سلسلہ میں کوئی کام انجام دے اور نہ ہی اپنے اختیار سے دیگر مخلوقات کے ساتھ کوئی ارتباط پیدا کرے تو ایسی منزل میں حق و ملک یا اسی قسم کے دیگر مفاہیم کے لئے کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر؛ اگر صرف درخت اور نور خورشید یا آب باراں کے باہمی رابطہ پر نظر ڈالیں اور اس سلسلہ میں انسانی ہاتھوں سے مرتب ہونے والے منفی یا مثبت اثرات کو فرض نہ کریں تو نور و آب کی نسبت درخت کے حق کا تصور و اعتبار فضول اور لغو ہو کر رہ جائے گا، لیکن جب ان کے ساتھ انسانی رابطہ کا بھی اضافہ کر دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں: درخت حق رکھتا ہے کہ سورج کی روشنی اور بارش کے پانی سے استفادہ کرے یعنی انسان کو درخت تک نور و آب پہنچنے میں رکاوٹ

نہیں پیدا کرنا چاہیئے ۔ اور جب صاحبان حق (جن کا حق ہے اور جس پر حق ہے) دونوں فاعل مختار ہوں تو یہ مفہوم بطریقہ اولیٰ روشن و ثابت ہے مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں تمام انسان سورج کی روشنی سے استفادہ کا حق رکھتے ہیں لہٰذا اس خداداد نعمت سے مستفید ہونے کے سلسلہ میں کسی کو دوسروں کے لئے رکاوٹ کھڑی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہاں حق کے طرفین (مَنْ لَهُ الْحَق وَ مَنْ عَلَيْهِ الْحَق) دونوں کے دونوں انسان ہیں اور حق جس شئے سے تعلق رکھتا ہے نور خورشید ہے ۔

حاصل کلام یہ کہ : لفظ حق حقوقی و اخلاقی معنوں میں وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی فاعل مختار سے اختیاری تصرف کا امکان ملحوظ ہو کیونکہ حقوق و اخلاق کا موضوع اختیاری اعمال اور ان کے متعلقات سے مربوط ہے اور جو چیز فعل اختیاری سے ارتباط نہ رکھتی ہو اخلاقی و حقوقی مباحث سے بالکل خارج ہوگی ۔

لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ایسے موارد میں جہاں حقوق اور ذمہ داری کا استعمال درست اور معتبر ہے وہ کون سا امر ہے جو اسکو معتبر قرار دیتا ہے اور کن بنیادوں پر حقوق اور ذمہ داریاں معین ہوتی ہیں ؟

اس سوال کے جواب میں چند دلیلیں اور وجوہات متصور ہیں جن میں سے اہم ترین دلیلوں کا ہم یہاں ایک جائزہ پیش کرتے ہیں ۔

پہلی دلیل : حقوق اور ذمہ داریاں طبیعت و سرشت کی معین کردہ ہیں یعنی یہ قدرت کی سرشت ہے جس نے اس کو سورج کی روشنی ، پانی اور ہوا وغیرہ سے استفادہ کا حق دیا ہے ، اور یہ حیوان کی سرشت ہے جو اس کو پیڑ پودوں سے استفادہ کا حق دیتی ہے اسی طرح یہ انسان کی طبیعت و فطرت ہے جو اسکو نباتات و حیوانات سے مستفید ہونے کا حق دیتی ہے چنانچہ یونہی معاشرہ کی بھی طبیعت و فطرت ہے جو افراد کے حقوق اور ذمہ داریوں کو معین کرتی ہے

لیکن : اس سے قطع نظر کہ طبیعت کوئی عینی وجود نہیں رکھتی اور خاص طور

پر معاشرہ کے لئے طبیعت کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال: جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں لفظ حق کا استعمال کسی ایسی شئے اور شخص کے لئے ہی درست ہو سکتا ہے جہاں اس کے ذریعہ ایک فاعلِ مختار پر کسی ذمہ داری کا عائد ہونا لازم آئے۔ مثلاً درخت کے سلسلے میں آب و نور و ہوا سے استفادہ کا حق اس صورت میں ثابت کیا جانا صحیح ہے جب انسان پر اس کے حق کی رعایت کرنے اور اس کے استفادہ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی نہ کرنے کی ذمہ داری لازم کر دی جائے اور وہی ذات جو کسی شخص یا چیز کو کوئی حق دیتی ہے دراصل ایک فاعل مختار کو اس حق کی رعایت کرنے کی ذمہ داری بھی سپرد کرتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے درخت کی طبیعت انسان پر کون سی حاکمیت رکھتی ہے کہ اس پر اس طرح کی ذمہ داری عائد کرے؟ اور اس کے بالمقابل انسان کے لئے کون سا لزوم ہے جو وہ طبیعت کی اطاعت کو قبول کرے؟!

دوسرا سوال:۔

یہ کہ جس وقت کوئی چیز دو موجودات کے درمیان موردِ نزاع بن جائے اور دونوں اس شئے سے فائدہ اٹھانے کے خواہشمند ہوں تو ان دونوں کے حق اور ذمہ داری کا تعین کس طرح ہوگا؟ مثلاً جب انسان کی حیات، سلامتی اور رشد وارتقاء اسی پانی کے پینے پر موقوف ہو جسکو ایک جانور پینا چاہتا ہے، آیا ایسے میں انسان کے حق کو ترجیح دی جائے گی یا حیوان کے حق کو اولویت حاصل ہوگی؟ اور کون اس طرح کے حق کی حد بندی کرے گا؟

اس سوال کے جواب میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ کل کائنات کی فطرت، جو انسان اور حیوان نیز دیگر مخلوقات کی فطرتوں کو اپنے ایک جزء کے طور پر وجود عطا کرنے والی ہے اس نے قوی تر مخلوق کو زیادہ حق ودیعت کیا ہے۔ اس اعتبار سے انسان کا حق حیوان کے حق پر مقدم کیا جائے گا۔

لیکن : اولاً تو کائنات کے لئے کسی کلی طبیعت کا وجود ثابت نہیں ہے ثانیاً یہ کہ یہ جواب پلٹ کر پھر اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے اور حق کی بنیاد کم از کم ٹکراؤ کی صورت میں وہی طاقت و قدرت قرار پاتی ہے۔ ظاہر ہے اسی طرح جب دو انسانوں کے حقوق میں باہمی ٹکراؤ ہوگا تو ان میں طاقتور انسانوں کے حقوق کو کمزور انسانوں کے حقوق پر فوقیت حاصل ہوگی ۔ یہ چیز جنگل کے قانون کی بنیاد تو ہو سکتی ہے انسانی قانون اور اخلاق کی اساس نہیں بن سکتی ۔

دوسری دلیل

حقوق و ذمہ داری کا تعین اغراض و مقاصد کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ مثلاً درخت ایک خاص مقصد و غایت ، یعنی اپنے وہی رشد و کمال کے آخری مرحلے کی طرف پیش رفت کرتا ہے ، لہٰذا اسے اس تکامل کے وسائل سے بہرہ مند ہونے کا حق ہے اسی طرح انسانی تکامل کی طرف پیشرفت کی بھی غرض و غایت ہے جو اس کے حقوق کی تعیین کرتی ہے اور انسانوں کے باہمی ٹکراؤ کی صورت میں ان کے حقوق اور ذمہ داریاں اس طور پر وضع ہونا چاہیئے کہ معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ افراد اپنے مقاصد کمالیہ تک پہنچ سکیں ۔

لیکن : یہ جواب بھی کسی طرح قانع کنندہ نہیں ہے کیونکہ اپنے مقصد و کمال تک پہنچنے کے سلسلے میں ہر چیز کا دوسری چیزوں کے استفادہ پر موقوف ہونا، ایک انسان کے لئے اپنے فوائد و مطالبات سے حتمی طور پر دستبردار ہو جانے کی ہرگز کوئی معقول دلیل نہیں بن سکتا ۔ اور نہ ہی اس بنیاد پر کسی ایک انسان کی کسی دوسرے انسان پر کوئی ذمہ داری واجب کی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ ہر ایک حرکت و سفر میں ہے اور اپنی آخری منزل و غایت تک پہنچنے کے لئے کوشاں اور بے چین ہے ۔ اب کس دلیل سے ایک انسان کو روکا جائے گا کہ وہ ایک حد اور دائرہ میں رہتے ہوئے وسائل سفر سے استفادہ کرے ؟

تیسری دلیل

ہر مخلوق کے حقوق اسکی ضرورت کی بنیاد پر معین ہوتے ہیں اور معاشرہ میں بھی ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ اپنی ضرورت بھر معاشرے سے فائدہ اٹھائے۔

یہ دلیل بھی پچھلی دلیل سے ہی ملتی جلتی ہے اور وہی اعتراضات اس دلیل پر بھی وارد ہیں اس کے علاوہ "ضرورت" اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت ہی وسیع و عریض اور اعتبارات کے لحاظ سے بہت ہی مختلف و غیر متوازن ہے اور اس کے لئے کوئی دقیق حد بندی قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔

چوتھی دلیل

چونکہ حقوق و ذمہ داریاں دونوں ساتھ ساتھ اور باہم وابستہ ہیں یعنی ہر ایک کا حق اس کی ذمہ داریوں کی بنیاد پر معین ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں ہر شخص اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے معاشرہ کو جتنا فائدہ پہنچا رہا ہے اسی اعتبار سے معاشرہ سے بھی فائدہ حاصل کرے۔ افراد کے ایک دوسرے کے تئیں حقوق اور ذمہ داریوں کے اسی تعادل و توازن کا نام عدالت ہے۔

یہ بات وہاں تو قابل قبول ہو سکتی ہے جہاں حقوق معاہدوں کی بنیاد پر طے ہوں یا جہاں حقوق انسان کی اپنی مرضی اور اختیار سے قبول کردہ ذمہ داریوں کے عوض طے پائے ہوں لیکن ابتدائی حقوق اور ذمہ داریوں کی منزل میں مثال کے طور پر ماں باپ کے اوپر نومولود بچہ کے حقوق اور اسکے تئیں ماں باپ کی ذمہ داریاں یا اسی طرح معاشرہ پر معلول و اپاہج اور ناقص الخلقت افراد کے حقوق اور ان کے متعلق معاشرہ کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں یہ چیز راہ گشا نہیں بن سکتی۔

پانچویں دلیل

ہر شخص کا حق اور ذمہ داری انفرادی و اجتماعی مصلحتوں میں کسر و انکسار (یعنی

ایک دوسرے پر اثر ڈالنے اور اثر قبول کرنے) کی بنیاد پر معین ہوتی ہے ۔ یہ دلیل دوسری دلیلوں کی بہ نسبت زیادہ مناسب اور قابل قبول ہے ۔ اور دوسری تمام دلیلوں سے زیادہ حق و مصلحت کے درمیان رابطہ کو روشن و واضح کرتی ہے ۔ لیکن اس بات پر توجہ ضروری ہے کہ اولاً انسانی مصلحتیں مادی و دنیوی مصلحتوں میں منحصر نہیں ہیں ۔ اور ان کی اہمیت کا حساب اور قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے وقت معنوی و ابدی مصلحتوں کو بھی ان میں شامل کرنا ضروری ہے ۔ ثانیاً یہ کہ مختلف مصلحتوں کی اہمیت کا حساب و اندازہ لگانا اور ان کے درمیان وجہ ترجیح تلاش کرنا یا ان کی قدر و قیمت معین کرنا نہایت ہی مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور در حقیقت تمام انسانوں کے بس سے باہر کی بات ہے اور یہیں سے وحی الٰہی کی رہنمائی کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور قرآن کریم کا یہ اعلان روشن و واضح ہو جاتا ہے :-

"وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (۱)

اور ہم نے ان (رسولوں) کے ساتھ کتاب (ہدایت) اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں ۔

پھر بھی اس مقام پر ایک اہم اور دقیق نکتہ باقی رہ جاتا ہے جس کی گذشتہ بیانات میں وضاحت نہیں کی گئی ہے اور وہ اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے ماوراء چاہے وہ جمادات ہوں یا نباتات ، عام حیوان ہوں یا اس کی جنس سے تعلق رکھنے والے دیگر انسان پر اگر حق تصرف رکھتا ہے تو اس کی اساس و بنیاد کیا ہے ؟ نیز یہ کہ آپسی معاہدوں اور اختیاری قرار دادوں سے قطع نظر ، کس بنیاد پر دیگر مخلوقات کے تئیں اس کو جواب دہ قرار دیا جا سکتا ہے لہٰذا وہ کون سی چیز ہے جس کے تحت ان کی ذمہ داری اس کے سر پر عائد ہوتی ہے ؟ بلکہ خود اپنے ہی اعضاء و جوارح پر حق تصرف اس

۱۔ سورۂ حدید آیت ۲۵

کو کس نے عطا کر دیا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا کوئی منطقی اور واضح جواب، دینی و اعتقادی اصول و افکار کو پیش نظر رکھے بغیر محض مادی نقطۂ نظر سے نہیں دیا جا سکتا ــــ البتہ الٰہی نقطۂ نظر کی بنیاد پر بڑے اطمینان کے ساتھ ان کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے۔

جب انسان اپنے اختیاری اعمال و رفتار کے سلسلہ میں حقوق و ذمہ داری جیسے اعتباری مفاہیم کی ضرورت کا احساس کرتا ہے تو سب سے پہلے اسے چاہئے کہ موجودات عالم کے درمیان پائے جانے والے روابط پر نظر کرے۔ اور حقائق کی بنیاد پر ہی اپنے اعتبارات کا قلعہ تعمیر کرے ــــــ چنانچہ اصل ترین اور حقیقی ترین رابطہ خالق و مخلوق کے درمیان ہی پایا جاتا ہے جسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی اپنی تمام مخلوقات پر خداوند متعال کی حقیقی مالکیت کا رابطہ ہے لہٰذا سب سے پہلے اپنی مخلوقات پر خالق کا حق تصرف ثابت ہے اور کائنات کی تمام موجودات کے لئے ہر طرح کا حق تصرف خداوند عالم کی اجازت پر ہی منتہی ہوگا۔

اگر خداوند عالم انسان کو خود اس کے اعضاء و جوارح پر تصرف کی اجازت نہ دیتا تو اسکو اپنے اعضاء و جوارح کے استعمال کا بھی حق نہ ہوتا چہ جائیکہ اسے دیگر موجودات عالم پر کسی طرح کا حق تصرف حاصل ہو۔ کیونکہ یہ سب کی سب اپنے پیدا کرنے والے کی مطلقاً بلا شرکت غیرے ملکیت ہیں۔ نیز انسان کی اوّلین ذمہ داری خداوند عالم کی حقیقی مالکیت و حاکمیت سے نشأت پاتی ہے اور کوئی بھی ذمہ داری اس پر تقدم و برتری نہیں رکھتی چنانچہ یہی حق اور یہی ذمہ داری تمام کے تمام حقوق اور ذمہ داریوں کی اصل بنیاد و محافظ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ خداوند عالم اور اس کی حقیقی مالکیت کی طرف سے غفلت کے نتیجہ میں انسان اپنے اعضاء و جوارح پر اپنے اختیار و تسلط کو اپنا پیدائشی و تکوینی حق سمجھ کر اسی کو اپنے حق تصرف کی بنیاد و اساس قرار دے لیتا ہے۔ لیکن بعد میں جہاں وہ خداوند متعال کے تئیں اپنی مملوکیت کی طرف متوجہ ہوا یہ سمجھ

لے گا کر اپنے اعضاء جوارح کی نسبت اس کی مالکیت ۔ تمام بندگان خدا کے تئیں خداوند عالم کی مالکیت کے دائرے میں ہی آتی ہے ۔ ہمیں تسلیم ہے کہ انسان جہاں زندگی گزارتا ہے اپنے ارد گرد اور ماحول میں موجود تمام نعمتوں میں اپنے حق تصرف کو آزاد اور بلا مانع خیال کرتا ہے اور محض دوسروں کی طرف سے رکاوٹ پیدا ہونے کی صورت میں ہی حق و ذمہ داری جیسے مفاہیم کی ضرورت کا احساس کرتا ہے اور قبضہ و تسلط میں تقدم احتیاج کی شدت یا اسی قسم کے دیگر حقوق و امتیازات اور اولویت و برتری کے معیاروں کو مورد اعتبار قرار دے لیتا ہے اور پھر ان ہی بنیادوں پر فرائض اور ذمہ داریوں کو بھی قبول کر لیتا ہے ۔ دراصل ان معیاروں اور اصولوں کا مقصد ایک آرام دہ اور آسودہ حال اجتماعی زندگی کی ضرورت ہے جو ان اصولوں پہ چلے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ۔ لیکن جب یہی انسان اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرتا ہے اور مبداء و معاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ خود اپنے آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر مادی و خارجی دنیا میں ہمارا ایک معمولی سا کام اس سلسلہ میں ہمارا حق ثابت کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے تو خود ہماری اور اس پوری کائنات کی تخلیق ہم پر اور اس پوری کائنات پر خداوند عالم کے حق کو ثابت کرنے کے لئے کیوں کافی نہ ہوگی ؟ اور جب اجتماعی زندگی کی آسائشیں اس کو اپنے حقوق و تصرفات میں حد و اعتدال رکھنے اور معاشرہ کے تئیں ذمہ داریاں قبول کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں تو کس بنیاد پر یہ سوچا جائے کہ وہ معنوی کمالات اور ابدی سعادت و انعامات سے بہرہ ور ہونے کے فطری جذبہ کو مورد توجہ قرار نہ دے گا اور ان کے حصول کے سلسلہ میں کسی طرح کی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہ ہوگا ۔

البتہ وہ حقوق اور ذمہ داریاں جو اجتماعی روابط کے دائرہ میں نہیں آتیں ان کے حقوق و مفاہیم سے بالاتر ہیں ۔ لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ حقوقی نظام اقدار کے کلی نظام کا ہی ایک حصہ ہیں ان کو ایک دوسرے سے کلی طور پر جدا تصور نہیں کرنا چاہیئے جیسا کہ اقداری نظام کو اعتقادی نظام سے بے تعلق نہیں خیال کرنا چاہیئے ۔

حاصل بحث یہ کہ الٰہی نقطہ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے : اپنے اعضاء و جوارح نیز خداوند عالم کی دی ہوئی تمام تر نعمتوں کے سلسلے میں انسان کا ابتدائی و پیدائشی حق موجودات عالم کو تکاملی منزلوں سے گزار کر ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجۂ کمال تک پہنچانے کے الٰہی ارادہ اور فیصلے کا نتیجہ ہے اور جب خدا کی مختلف مخلوقات کے مابین اس راہ تکامل میں ٹکراؤ اور تزاحم پیدا ہو تو اسی قانون کے تحت ناقص تر مخلوقات کو اپنے سے کامل تر مخلوق پر فدا و قربان ہو جانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر، نباتات و حیوانات سے مختلف طور پر انسان کو اسلئے فائدہ اٹھانے کا حق ہے کہ وہ قوت و فعل دونوں اعتبار سے ان کے مقابلہ میں زیادہ کمالات کا حامل ہے۔ اسی منطق کے تحت اگر معاشرہ کے تمام افراد کے لئے کمالات کا محقق ہونا کچھ لوگوں کی قربانی اور فداکاری پر موقوف ہو تو یہ کام ضرور انجام پانا چاہیئے۔ اور یقیناً خداوند عالم اس طرح کی قربانی کو رائگاں نہیں جانے دے گا اور اس قربانی کے عوض ابدی دنیا میں بہترین جزا عطا کرے گا۔ گویا تمام حقوق اور ذمہ داریوں کی بازگشت چاہے یہ اخلاقی ہوں یا حقوقی، خدائے عادل کے حکیمانہ ارادہ اور فیصلے کی طرف ہوتی ہے اب جہاں الٰہی حکمت کے تقاضوں کو ہماری عقل درک کر لے وحی کی ضرورت اور احتیاج نہیں ہے لیکن اکثر موارد میں، منطقی گتھیوں اور اصولوں کی پیچیدگی اور ان کے زیر اثر پیدا ہونے والے تغیرات و تاثیرات کے سلسلہ کو درک کرنے میں ایک عام اور عادی عقل کی عاجزی نیز ایک دوسرے پر وجہ ترجیح کی دقیق طور پر پیمانہ بندی، وحی و نبوت کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خداوند حکیم نے اپنی بے پایاں رحمتوں اور حکمت و مصلحت کے تقاضوں کے تحت پیمبروں کو مبعوث فرمایا اور آسمانی شریعتیں نازل کیں تاکہ انسان اپنے کمال وارتقاء کی راہ کو سمجھ سکے اور موجودات عالم کی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لئے ایک دقیق پیمانہ اس کے پاس موجود ہو

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ

اس نے آسمان بلند کیا اور (انصاف کی) ترازو قائم کی تاکہ تم لوگ میزان میں تجاوز سے کام نہ لو۔ (رحمٰن : ۷ و ۸)

اور اسی سے تکوین و تشریع کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی بھی روشن و واضح ہو جاتی ہے۔

والحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

نہج البلاغہ
کے
سیاسی تعلیمات

سیاسی رھنماؤں کے خصوصیات

جناب محمد تقی رھبر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

حاکمان بے تخت و تاج

گذشتہ مباحث میں ہم اسلام میں دینی و سیاسی رہبر کے خصوصیات و صفات سے متعلق کچھ باتیں اشارۃً عرض کر چکے ہیں لیکن اس بنیادی اور زندہ مسئلہ کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس مقالہ میں حضرت علیؑ کے اقوال کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیتے ہیں۔

چونکہ انسانی معاشرہ کی سرپرستی و رہبری دنیا کا سب سے اہم اور گراں قدر عہدہ ہے جس پر ایک انسان سرفراز ہوتا ہے لہٰذا اس ذمہ داری کے عہدہ دار افراد کو علم، تقویٰ اخلاق حسنہ، بصیرت اور دیگر انسانی فضائل کے علاوہ سیاست و حسن نظم، شجاعت و شہامت اور دوسرے صفات عالیہ سے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ برتر اور با فضل ہونا چاہیئے۔ طبیعی طور پر سب سے پہلے اس عظیم ذمہ داری کے عہدہ دار انبیاء کرامؑ ہیں ان کے بعد ائمہ اطہارؑ اور ان کے بعد ان ہی کے نقش قدم پر چلنے والے اللہ کے نیک اور صالح بندے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دنیا اور یہ سیاسی روش موجودہ دنیا کی سیاسی روش سے ایک دم جدا ہے۔ کیونکہ دیگر عالمی سیاستیں

رذیل ترین افراد کو بھی مسند حکومت پر بٹھا دیا کرتی ہیں ۔
حاکمیت کی ان دو جدا جدا سیاسی روشوں کا تاریخی جائزہ لینے کے لئے صرف قرآن حکیم کی سیاسی تاریخ کا قوموں ملتوں اور شخصیتوں کی داستانوں میں گہری نظر سے مطالعہ کافی ہے ۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ کے خطبہ "قاصعہ" میں بھی ان دو جداگانہ روشوں کو صاف اور واضح طور سے دیکھا اور مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔ حضرتؑ نے اپنے اس خطبہ کے ایک حصہ میں انبیاء کرام کے حالات کا ذکر فرمایا ہے جو انسانی معاشرہ کے سب سے پہلے شرعی و قانونی نگراں اور حاکم رہے ہیں ۔ چنانچہ حضرت نے جناب موسیٰؑ و ہارونؑ کے ذکر کے دوران جو پشمینہ کا بہت سستا اور غریبوں جیسا لباس زیب تن کئے تھے فرعون جیسے طاغوتِ وقت کے جابرانہ دربار میں آنے اور اسے دعوت حق دینے اور اللہ کی اطاعت کی طرف بلانے کا ذکر فرمایا ہے ۔ ساتھ ہی فرعون نے ان دونوں بزرگواروں کو جو جواب دیا اور زر و جواہر کو شخصیت کا معیار بنا کر ان کی جو تحقیر کی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

" وَلَوْ اَرَادَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ لِاَنْبِيَائِہٖ حَيْثُ بَعَثَهُمْ اَنْ يَفْتَحَ لَهُمْ كُنُوْزَ الذِّهْبَانِ وَمَعَادِنَ الْعِقْيَانِ وَمَغَارِسَ الْجِنَانِ وَاَنْ يَحْشُرَ مَعَهُمْ طُيُوْرَ السَّمَاءِ وَوُحُوْشَ الْاَرَضِيْنَ لَفَعَلَ وَلَوْ فَعَلَ لَسَقَطَ الْبَلَاءُ وَبَطَلَ الْجَزَاءُ وَاضْمَحَلَّتِ الْاَنْبَاءُ وَلَمَا وَجَبَ لِلْقَابِلِيْنَ اُجُوْرُ الْمُبْتَلِيْنَ وَلَا اسْتَحَقَّ الْمُؤْمِنُوْنَ ثَوَابَ الْمُحْسِنِيْنَ وَلَا لَزِمَتِ الْاَسْمَاءُ مَعَانِيَهَا ۔ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ جَعَلَ رُسُلَہٗ اُوْلِیْ قُوَّةٍ فِیْ عَزَائِمِهِمْ وَضَعَفَةً فِيْمَا تَرَى الْاَعْيُنُ مِنْ حَالَاتِهِمْ ۔ مَعَ قَنَاعَةٍ تَمْلَاُ الْقُلُوْبَ

وَالْعُيُونُ غِنىً وَخَصَاصَةٌ تَمْلَأُ الْاَبْصَارَ وَالْاَسْمَاعَ اَذىً "(۱)

" اگر خدائے سبحانہ زر و جواہر کے خزانوں اور سر سبز باغات کو انبیاء کرام کے زیر نگیں کرنا چاہتا اور آسمان کے پرندوں اور زمین کے درندوں کو ان کا مطیع و منقاد بنانا چاہتا تو سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن ایسی صورت میں آزمائش ساقط ہو جاتی۔ جزاء و سزا کا سوال ہی نہ اٹھتا اور آسمانی خبریں رائگاں ہو جاتیں۔ دعوت قبول کرنے والوں کو آزمائش سے گزرنے والوں کا اجر دینا لازم نہ ہوتا اور مومنین، نیکو کاروں کے ثواب کے مستحق نہ قرار پاتے اور الفاظ کے مفاہیم بے معنی ہو کر رہ جاتے لیکن (ایسا نہیں ہے۔ بلکہ) خداوند عالم نے پیغمبروں کو ارادہ اور فیصلہ میں صاحبان قوت و قدرت قرار دیا جبکہ ان کے (ظاہری) حالات ان کے ضعف و کمزوری کا اظہار کرتے ہیں، نیز انھیں قناعت عطا کی ہے جس سے ایسی بے نیازی اور عزت ظاہر ہوتی ہے جو دلوں اور نگاہوں کو پُر کر دے اور انہیں ایسی عسرت و رنج کا نمونہ بنایا ہے جو آنکھوں اور کانوں کو لبریز کر دیتی ہے۔"

انبیاء کرامؑ ایسے بے تخت و تاج حکام تھے، جو کمزور اور غریب خاندانوں سے بلند ہوئے۔ مستضعفین کے ہمدرد و ہمدم بنے رہے، کمزوروں اور بے کسوں کے خدا کے آگے سجدہ ریز رہے اور تاریخ کے مستکبروں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ان کے نخوت و جبروت کے محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خلفاء الٰہی کو کبر و غرور و نخوت سے کیا سروکار۔ یہ تو مستکبروں کی پہچان ہے۔ ان کی زندگی میں اسراف، فضول خرچی

۱۔ خطبہ ۱۹۲ ۔ نہج البلاغہ

شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ، اور تن آسانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ

حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبہ میں روئے زمین پر انسانوں کے واقعی اور حقیقی حاکم ورہبر یعنی انبیاء کرامؑ کی سیرتوں کا جائزہ لیا ہے اور اس میں جناب موسیٰ کلیم اللہؑ کے زہد کے سلسلہ میں یوں فرماتے ہیں :۔

"وَاِنْ شِئْتَ ثَنَّيْتُ بِمُوسٰى كَلِيْمِ اللّٰهِ ـ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ يَقُوْلُ : « رَبِّ اِنِّيْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ » وَاللّٰهِ مَا سَاَلَهُ اِلَّا خُبْزًا يَاْكُلُهُ ، لِاَنَّهُ كَانَ يَاْكُلُ بَقْلَةَ الْاَرْضِ وَلَقَدْ كَانَتْ خُضْرَةُ الْبَقْلِ تُرٰى مِنْ شَفِيْفِ صِفَاقِ بَطْنِهِ لِهُزَالِهِ وَتَشَذُّبِ لَحْمِهِ" خطبہ/۱۶۰

"اگر جناب موسیٰ کو دوبارہ دیکھنا چاہتے ہو، جو فرماتے تھے کہ (اے میرے پروردگار! مجھ پر جو کچھ تو نے نازل فرمادیا میں اس کا سخت محتاج ہوں) خدا کی قسم انہوں نے اللہ سے ایک روٹی ــــ جو ان کی بھوک مٹا سکے ــــ کے علاوہ کسی اور چیز کی آرزو نہیں کی کیونکہ وہ تو زمین پر آزاد روئیدہ ہونے والی سبزیوں سے بھی اپنا شکم پُر کرتے تھے جن کا رنگ ان کی کمزوری وناتوانی اور جسم کی لاغری کے سبب شکم کی جلد سے ظاہر ہوتا تھا۔

حضرت داؤد

امامؑ، حضرت داؤدؑ کے زہد وورع کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

"وَاِنْ شِئْتَ ثَلَّثْتُ بِدَاوُدَ ـــ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَاحِبِ الْمَزَامِيْرِ وَقَارِئِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَلَقَدْ كَانَ يَعْمَلُ سَفَائِفَ

الْخُوصِ بِيَدِهِ وَيَقُولُ لِجُلَسَائِهِ: أَيُّكُمْ يَكْفِينِي بَيْعَهَا! وَيَأْكُلُ قُرْصَ الشَّعِيرِ مِنْ ثَمَنِهَا" خطبہ/۱۶۰

"اور جناب داؤد جو ملکوتی لحن کے مالک اور قاریان اہل جنّت میں سے تھے ان کے بارے میں غور کرو، کہ اپنے ہاتھوں سے لیف خرما سے زنبیل تیار کرتے تھے اور اپنے ہم نشین رفقا اور دوستوں سے فرماتے تھے: تم میں کون ہے جو اسے بازار میں فروخت کر آئے؟ اسی پیسہ سے اپنے لئے جو کی ایک روٹی مہیا کرتے تھے"

حضرت عیسیٰ (ع)

امامؑ، حضرت عیسیٰ کی زاہدانہ زندگی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"وَإِنْ شِئْتَ قُلْتُ فِي عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ـ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَلَقَدْ كَانَ يَتَوَسَّدُ الْحَجَرَ وَيَلْبَسُ الْخَشِنَ وَيَأْكُلُ الْجَشِبَ، وَكَانَ إِدَامُهُ الْجُوعَ وَسِرَاجُهُ بِاللَّيْلِ الْقَمَرَ وَظِلَالُهُ فِي الشِّتَاءِ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا وَفَاكِهَتُهُ وَرَيْحَانُهُ مَا تُنْبِتُ الْأَرْضُ لِلْبَهَائِمِ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ زَوْجَةٌ تَفْتِنُهُ، وَلَا وَلَدٌ يَحْزُنُهُ وَلَا مَالٌ يَلْفِتُهُ وَلَا طَمَعٌ يُذِلُّهُ. دَابَّتُهُ رِجْلَاهُ وَخَادِمُهُ يَدَاهُ" خطبہ/۱۶۰

اگر تم جناب عیسیٰؑ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو کہ وہ پتھر کو اپنا تکیہ بناتے تھے۔ موٹا اور کھردرا لباس زیب تن کرتے تھے اور ناخوش گوار غذا تناول فرماتے تھے۔ آپ کی غذا فاقہ اور بھوک تھی۔ شب میں ماہتاب آپ کا چراغ ہوتا تھا اور سردیوں میں آپ کا سائبان زمین کے مشرق و مغرب

ہوا کرتے تھے۔ آپ کے گل و ریحان وہ سبزے تھے جو زمین سے جانوروں کے لئے روئیدہ ہوتے تھے۔ آپ کی کوئی بیوی نہ تھی جس پر فریفتہ ہوتے نہ اولاد تھی جس کے لئے مضطرب ہوتے نہ مال تھا جو آپ کو مشغول رکھتا۔ نہ حرص و ہوس کی عادت تھی جو ذلیل و خوار بنا لے۔ آپ کی سواری آپ کے دونوں پاؤں تھے اور خدمت گذار آپ کے دونوں ہاتھ"۔

پیغمبر اسلام کا زہد و ورع

اس کے بعد امام نے پیغمبر اکرمؐ کی سیرت طیبہ کی پیروی کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَقَدْ كَانَ رَسُولُ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ - يَأْكُلُ عَلَى الْأَرْضِ، وَيَجْلِسُ جِلْسَةَ الْعَبْدِ وَيَخْصِفُ بِيَدِهِ نَعْلَهُ وَيَرْقَعُ بِيَدِهِ ثَوْبَهُ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ الْعَارِيَ وَيُرْدِفُ خَلْفَهُ"

"پیغمبر اسلام فرشِ زمین پر بیٹھ کر غذا نوش فرماتے تھے، غلاموں کے انداز میں بیٹھتے تھے اپنی جوتیوں کو اپنے ہاتھ سے سلتے اور لباس میں اپنے دست مبارک سے پیوند لگاتے تھے۔ گدھے کی کھری پیٹھ پر سوار ہوتے تھے اور اس کے پیچھے دوسرے کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے"

حضرت علیؑ کا زہد و تقویٰ

پھر آپ نے تفصیل کے ساتھ پیغمبر اسلام (ص) کے زہد اور دنیا سے ان کی بے نیازی اور بے توجہی پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں پیغمبرؐ اسلام کی اطاعت و پیروی

پر فخر و مباہات کرتے ہوئے اپنے زہد و تقویٰ کا ذکر یوں فرمایا ہے :

وَاللّٰہِ لَقَدْ رَقَّعْتُ مِدْرَعَتِی ھٰذِہٖ حَتّٰی اسْتَحْیَیْتُ مِنْ رَاقِعِھَا۔ وَلَقَدْ قَالَ لِی قَائِلٌ : اَلَا تَنْبِذُھَا عَنْکَ ؟ فَقُلْتُ : اُغْرُبْ عَنِّی ! فَعِنْدَ الصَّبَاحِ یَحْمَدُ الْقَوْمُ السُّرٰی "(۱)

"خدا کی قسم یہ کپڑا جو میں پہنے ہوئے ہوں اس میں میں نے اس قدر پیوند لگائے ہیں کہ اب پیوند لگانے والے سے مجھے شرم آتی ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا : اب آپ اسے اتار کیوں نہیں دیتے ؟ میں نے جواب دیا : میری نظروں سے دور ہو جاؤ : کیونکہ رات کے چلنے والوں کی ہی صبح کے وقت تعریف کی جاتی ہے۔"

یہ انبیاء کرام ہیں جن کی شان و شوکت اور عظمت و جلالت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے ، جبکہ ان کے مقابلہ میں وقت کی بڑی بڑی حکومتیں اور مصر و روم و ایران نیز دنیا کے دوسرے علاقوں کے طاقتور سیاست مدار ، فرعونوں ، قیصروں ، خسروں ، شاہوں اور شاہزادوں یہاں تک کہ معاویہ نما اشخاص کے بھیس میں آئے جو قوموں اور ملتوں کے خون اور گوشت سے شراب و کباب درست کرتے اور غریبوں اور بے کسوں کے سروں پر کبر و نخوت کے بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے۔ اہرام مصر سے لے کر ایوان مدائن اور شام کے افسانوی قصروں و محلوں تک تاریخ کے صفحات ان کے ظلم و ستم کی زندہ مثالیں ہیں ۔ یہ بالکل فطری امر تھا کہ ان حکام و سلاطین کی اسراف پسند ، مستکبرانہ اور شیطانی فریب والی روش کے مقابلہ میں انبیاء کرام ایک دوسری راہ کا انتخاب کرتے ، وہی راہ جس کا ذکر حضرت علیؑ نے نہ صرف

۱۔ خطبہ ۱۶۰ نہج البلاغہ

اپنے خطبہ میں فرمایا ہے بلکہ اسی پر گامزن رہے ہیں ۔ یہ انبیائے کرام عالم بشریت کو آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کس طرح کرنی چاہیئے اور لوگوں کی فلاح اور محروموں کی نجات کی سیاست کا راز کس چیز میں مضمر ہے ۔

لیکن افسوس کہ ابھی پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کو آدھی صدی بھی نہ گزری تھی کہ اسلامی معاشرہ کی سیاست کا رخ ایک دم پلٹ گیا ۔ ذلتیں اور بدعتیں عزت و سرفرازی میں بدل گئیں ، شام اور بغداد کے سبز و سرخ الف لیلوی قصر و محل ، حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ کے معمولی اور مستضعفانہ حجروں کی جگہ لے چکے تھے ۔ قیصروں ، خسروں اور عرب و عجم کے بادشاہوں نے خود کو خلیفہ کہلانا شروع کر دیا ۔ اور اپنی جابرانہ وظالمانہ سیرت و سیاست کے ذریعہ ہر میدان میں فرعونوں ، قیصروں اور خسروں کے دفتروں کو دھو کر پاک کر ڈالا اور آج بھی دنیا پر حاکم سیاست مدار حتیٰ عالم اسلام پر آمرانہ حکومت کرنے والے اپنے اسلاف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں ۔ چاہے وہ حضرت عیسیٰؑ کے پیرو اور حضرت موسیٰؑ کے ماننے والے ہوں یا امتِ حضرت محمدؐ میں اپنا شمار کرانے والے ۔

آج ظلم و ستم ، جہالت و بربریت کی صدیوں طویل اس رات کی تاریکی کو چیر کر شہاب کی مانند درخشندگی اور روشنی بکھیرنے والا ایک اکیلا اسلامی انقلاب ہے جو سرزمین ایران یعنی محمدؐ و علیؑ اور اہل بیتؑ کے حقیقی گھر سے رونما ہوا ہے اور روئے زمین پر بسنے والے تمام مستضعفین کے لئے امید کی کرن بنا ہوا ہے ۔

ضرورت ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام مستضعف اور کمزور افراد اس اسلامی اسوہ اور اسلامی سیرت کو اپنا شعار بنا کر دنیا بھر کی غیر قانونی سیاستوں ، حکومتوں اور تمام جرائم پیشہ حکام کے مقابلہ پر کھڑے ہو جائیں اور ان پیدائشی خونخواروں سے ان کے سارے اختیارات چھین لیں کیونکہ قرآن کے مطابق اس زمین کی وراثت مستضعف مومنین کو عطا کی گئی ہے ۔ یہ ظالم اسے آسانی کے ساتھ چھوڑنے والے نہیں ہیں بلکہ اس کے لئے جہاد و فداکاری اور ایثار و قربانی ضروری ہے اور یہ بھی ایک ناقابل تبدیل سنت

البتہ ہے۔

سیاسی زہد

ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی حضرت علیؑ کی نگاہ میں ایک اسلامی حاکم کے کیا خصوصیات ہیں۔

خطبۂ شقشقیہ میں آپ نے حکومت قبول کرنے کے سلسلہ میں اپنا مقصد مظلوموں کا دفاع اور ستم پیشہ افراد کی سرکوبی بتاتے ہوئے اپنے زہد و تقویٰ کا ذکر یوں فرمایا ہے:

"لَاَلْفَیْتُمْ دُنْیَاکُمْ ھٰذِہٖ اَزْھَدَ عِنْدِیْ مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ" (۱)

"تم سب نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ تمہاری دنیا کی قدر و قیمت میری نظر میں بکری کے بچے کی ناک سے بہنے والے پانی سے بھی کمتر اور بے حقیقت ہے۔"

اور یہ حقیقت نہ صرف حضرت علیؑ کے اقوال میں نظر آتی ہیں بلکہ آپ کے کردار و عمل میں بھی پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے۔ دوست و دشمن کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے، اور اسلام کی راہ پر چلنے والوں خصوصاً حکام اور ذمہ دار افراد کو یہی روش اختیار کرنی چاہیئے۔

دنیا اور حکومت سے متعلق یہ زاہدانہ موقف دراصل حیاتِ دنیا، مبدأ اور معاد سے متعلق پائے جانے والے تصورِ کائنات اور اس نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے جو ہماری آسمانی تہذیب و ثقافت میں موجود ہے۔

اور حضرت علیؑ جو بذاتِ خود اس مکتبِ فکر کے ایک عظیم ترین معلم ہیں اپنے ایک خطبہ میں معاویہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ خطبہ ۳۔ نہج البلاغہ

"أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ قَدْ جَعَلَ الدُّنْيَا لِمَا بَعْدَهَا، وَابْتَلَى فِيهَا أَهْلَهَا، لِيَعْلَمَ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً. وَلَسْنَا لِلدُّنْيَا خُلِقْنَا وَلَا بِالسَّعْيِ فِيهَا أُمِرْنَا. وَإِنَّمَا وُضِعْنَا فِيهَا لِنُبْتَلَى بِهَا وَقَدِ ابْتَلَانِي اللهُ بِكَ وَابْتَلَاكَ بِي فَجَعَلَ أَحَدَنَا حُجَّةً عَلَى الْآخَرِ .... فَاتَّقِ اللهَ فِي نَفْسِكَ وَنَازِعِ الشَّيْطَانَ قِيَادَكَ وَاصْرِفْ إِلَى الْآخِرَةِ وَجْهَكَ فَهِيَ طَرِيقُنَا وَطَرِيقُكَ" (1)

".... خداوند عالم نے دنیا کو آخرت کے لئے راستہ قرار دیا ہے اور اس میں انسان کو آزمائش میں مبتلا کیا ہے تاکہ جان لے کہ ان میں کون بہترین عمل انجام دینے والا ہے۔ ہم دنیا کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں اور نہ دنیا کے امور میں ہی الجھے رہنے پر مامور کئے گئے ہیں بلکہ ہم دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ آزمائے جائیں اور حقیقتاً خدا نے مجھے تیرے ذریعہ اور تجھے میرے ذریعہ آزمائش میں مبتلا کیا ہے اور ہم میں سے ایک کو دوسرے پر حجت قرار دیا ہے (گویا علیؑ کی روش معاویہ اور معاویہ جیسے لوگوں پر حجت ہے کہ وہ اس ذریعہ سے قیادت و سیاست کے طور طریقے سمجھیں اور معاویہ جیسے لوگ رہبران حق کی راہ میں جو مشکلات پیدا کرتے ہیں اور حق کی راہ پر چلنے والے خدا کے بندوں کو ان سے جو رنج پہنچتے ہیں ان کے لئے آزمائشیں ہیں

---

(1) خطوط ۵۵ - نہج البلاغہ

کہ وہ انہیں برداشت کرتے ہوئے صبر و استقامت کے ساتھ
اپنے فرائض انجام دیتے رہیں) . . . پس اے معاویہ!۔
خدا سے ڈرتے رہو اور اپنی مہار شیطان کے پنجہ سے کھینچ
لو اور آخرت کا رُخ کرو کہ ہماری اور تمہاری راہ اسی سمت ہے"

امامؑ نے مالک اشتر کے نام ایک خط میں جس میں حضرت نے ان کو سیاست و حکومت کے آئین تعلیم دیئے ہیں ، بار بار سیاسی روش کے تحت تقوی و زہد ، خدا ترسی اور پرہیزگاری کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں :

"أَمَرَهُ بِتَقْوَى اللهِ وَإِيثَارِ طَاعَتِهِ وَاتِّبَاعِ مَا أَمَرَ بِهِ فِي كِتَابِهِ مِنْ فَرَائِضِهِ وَسُنَنِهِ الَّتِي لَا يَسْعَدُ أَحَدٌ إِلَّا بِاتِّبَاعِهَا وَلَا يَشْقَى إِلَّا مَعَ جُحُودِهَا وَإِضَاعَتِهَا وَأَنْ يَنْصُرَ اللهَ سُبْحَانَهُ بِقَلْبِهِ وَيَدِهِ وَلِسَانِهِ فَإِنَّهُ جَلَّ اسْمُهُ قَدْ تَكَفَّلَ بِنَصْرِ مَنْ نَصَرَهُ وَإِعْزَازِ مَنْ أَعَزَّهُ . وَأَمَرَهُ أَنْ يَكْسِرَ نَفْسَهُ مِنَ الشَّهَوَاتِ وَيَزَعَهَا عِنْدَ الْجَمَحَاتِ ، فَإِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ اللهُ" خط/۵۳

امامؑ ، مالک اشتر کو اس خط (عہد نامہ) کے ذریعہ حکم دیتے ہیں کہ ہر حال میں تقوائے پروردگار اور اس کی اطاعت و پیروی کو اپنا شعار بنائے رہو اور جو کچھ اس نے اپنی کتاب یعنی قرآن حکیم میں واجبات یا سنت کی شکل میں حکم دیا ہے اس پر عمل کرتے رہو کیونکہ کوئی بھی انھیں اپنائے بغیر سعادت مند اور خوش بخت اور ان سے انکار یا انھیں ضائع کئے بغیر بدبخت نہیں ہوتا۔
خدا کی نصرت قلب و زبان اور ہاتھ سب سے کی جانی چاہیئے کیونکہ خدائے ذوالجلال اسی کی نصرت کرتا ہے جو اس کی نصرت

کرے اور اسی کو بزرگی و عظمت عطا کرتا ہے جو خدا کو عزیز و بزرگ جانے ۔ نفسانی شہوتوں سے جنگ کے لئے ہمیشہ تیار رہو ــــــ اور اس کی سرکشی کو قابو میں کئے رہو ۔ کیونکہ نفس برائیوں کی طرف بہت زیادہ بلانے والا ہے اور اس سے بس وہی شخص محفوظ ہے جس پر خدا کا رحم و کرم ہو "

یہ امام کی وہ تاکیدی فرمائشات ہیں جنہیں آپ نے عہد نامہ کی ابتدا میں ہی ذکر فرمایا ہے، کیونکہ تقوائے پروردگار اور اطاعتِ خدا ایسی چیز ہے جو آئین حکومت میں سب سے اہم اور مرکزی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہی جذبہ نہ صرف خدا اس کے دین اور اس کے بندوں کی نصرت و مدد کے لئے آمادہ کرتا ہے بلکہ نفس کو سرکشی سے باز رکھنے اور اس فرس بے لگام کو جو اپنے سوار کو ضلالت و گمراہی کی گہری کھائی میں پھینک دیتا ہے، قابو میں رکھنے کی قوت عطا کرتا ہے ۔

امام (ع) اسی عہد نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

" ... فَامْلِكْ هَوَاكَ وَشُحَّ بِنَفْسِكَ عَمَّا لَا يَحِلُّ لَكَ ، فَإِنَّ الشُّحَّ بِالنَّفْسِ الْإِنْصَافُ مِنْهَا فِيمَا أَحَبَّتْ أَوْكَرِهَتْ "

" پس ہوائے نفس کی مہار اپنے ہاتھ میں رکھو اور جو کچھ تمہارے لئے حلال نہیں ہے اس کے لئے اپنے نفس کے حق میں بخیل اور سخت گیر بن جاؤ کیونکہ نفس جس چیز کو پسند یا ناپسند کرتا ہے دونوں صورتوں میں اپنے نفس کو بخیل بنا دینا عین انصاف ہے ۔ "

قومی طاقت کے حصول اور اپنے ظاہری و خارجی دشمن پر تسلط حاصل کرنا، غرض کہ وہ تمام چیزیں جن کی ایک حاکم کو ضرورت ہوتی ہے، ان سب سے زیادہ اہم خود اپنے نفس پر تسلط حاصل کرنا اور اس کی سرکشی کو قابو میں کرنا ہے

یہ اقدام خود بخود ظاہری دشمن پر قابو پانے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ کیونکہ جو شخص خود اپنے نفس پر حاکم ہوگا وہ دوسروں پر بھی حاکم ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص اپنے نفس کے ہاتھوں ہار جائے لامحالہ اپنے دشمن سے بھی بری طرح شکست کھا جائے گا۔

ایک اور مقام پر تحریر فرمایا ہے:-

"وَلَا تَنْصِبَنَّ نَفْسَكَ لِحَرْبِ اللّٰهِ فَإِنَّهُ لَا يَدَ لَكَ بِنِقْمَتِهِ وَلَا غِنَىٰ بِكَ عَنْ عَفْوِهِ وَرَحْمَتِهِ"

"خدا سے جنگ اور محاذ آرائی مت اختیار کرو اور اس سے مقابلہ کی ہمت نہ کرو کیونکہ تم میں اس کے انتقام کو دفع کرنے اور اس سے مقابلہ کرنے کا یارا نہیں ہے تم کسی بھی حال میں اس کے عفو اور اس کی رحمت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

"وَلَا تَنْدَمَنَّ عَلَىٰ عَفْوٍ وَلَا تَبْجَحَنَّ بِعُقُوبَةٍ وَلَا تُسْرِعَنَّ إِلَىٰ بَادِرَةٍ وَجَدْتَ مِنْهَا مَنْدُوحَةً"

"عفو و درگذر پر پشیمان مت ہو اور نہ عقوبت و سزا دینے پر خوش ہو۔ ایسی سزا دینے میں جلدی نہ کرو جو راہ حل رکھتی ہو"

"وَلَا تَقُولَنَّ إِنِّي مُؤَمَّرٌ آمُرُ فَأُطَاعُ. فَإِنَّ ذٰلِكَ إِدْغَالٌ فِي الْقَلْبِ وَمَنْهَكَةٌ لِلدِّينِ وَتَقَرُّبٌ مِنَ الْغِيَرِ"

"یہ مت کہو کہ میں حاکم و فرماں روا ہوں اور جو کہتا ہوں اس پر بے چون و چرا عمل کیا جائے۔ کیونکہ یہ احساس قلب کو تباہ و برباد اور دین کو کمزور بنا دیتا ہے اور انسان کو خدا سے موڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔"

"وَإِذَا أَحْدَثَ لَكَ مَا أَنْتَ فِيهِ مِنْ سُلْطَانِكَ أُبَّهَةً أَوْ مَخِيلَةً فَانْظُرْ إِلَىٰ عِظَمِ مُلْكِ اللّٰهِ فَوْقَكَ وَقُدْرَتِهِ مِنْكَ عَلَىٰ مَا لَا تَقْدِرُ عَلَيْهِ مِنْ نَفْسِكَ، فَإِنَّ ذٰلِكَ

يُطَامِنُ إِلَيْكَ مِنْ طِمَاحِكَ وَيَكُفُّ عَنْكَ مِنْ غَرْبِكَ وَيَفِيءُ إِلَيْكَ بِمَا عَزَبَ عَنْكَ مِنْ عَقْلِكَ "

"جب بھی حکومت تمہارے سر میں کبر و غرور کا سودا پیدا کرے تو خدا کے ملک کی عظمت اور اس کی بالادستی کو پیش نظر رکھو اور اس پر غور کرو کہ وہ تمہارے اوپر بھی قدرت و اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ تمام امور جن کی ادائیگی میں تم اپنے آپ کو معذور اور عاجز پاتے ہو انہیں پیش نظر رکھو، یہ عمل تمہاری خودسری اور غرور کو کم کر دے گا۔ تمہاری تند مزاجی کو زائل کر دے گا اور تمہاری زائل شدہ عقل و ہوش کو صحیح راہ پر لگا دے گا۔"

"إِيَّاكَ وَمُسَامَاتَ اللّٰهِ فِي عَظَمَتِهِ وَالتَّشَبُّهَ بِهِ فِي جَبَرُوتِهِ فَإِنَّ اللّٰهَ يُذِلُّ كُلَّ جَبَّارٍ وَيُهِينُ كُلَّ مُخْتَالٍ"

"دیکھو خبردار اپنے آپ کو بڑا تصور نہ کرنا اور خود کو خدا کی بزرگی و عظمت کے مقابل نہ لانا اور نہ جبروت و جلال میں خود کو اس کا شبیہ خیال کرنا کیوں کہ خداوندِ عالم ہر جبار و متکبر کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دے گا۔"

اسی عہدنامہ میں ایک جگہ تحریر ہے :-

"وَلَيْسَ يَخْرُجُ الْوَالِي مِنْ حَقِيقَةِ مَا أَلْزَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْاِهْتِمَامِ وَالْاِسْتِعَانَةِ بِاللّٰهِ وَتَوْطِينِ نَفْسِهِ عَلَى لُزُومِ الْحَقِّ وَالصَّبْرِ عَلَيْهِ فِيمَا خَفَّ أَوْ ثَقُلَ"

حاکم و فرمانروا ، الٰہی فرائض کی انجام دہی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے عزم و ارادہ میں استحکام نہ ہو ، اور نصرت خدا اس کے شامل حال نہ ہو۔ اسے چاہیئے

کہ ہر حال میں خود کو حق پر ثابت و برقرار رکھے اور اس پر صبر کرے چاہے وہ اس کے لئے آسان ہو یا دشوار "۔

امام ؑ ایک دوسرے خطبہ میں حکومتوں کے قابل مذمت صفات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" وَإِنَّ مِنْ أَسْخَفِ حَالَاتِ الْوُلَاةِ عِنْدَ صَالِحِ النَّاسِ أَنْ يُظَنَّ بِهِمْ حُبُّ الْفَخْرِ، وَيُوضَعَ أَمْرُهُمْ عَلَى الْكِبْرِ. وَقَدْ كَرِهْتُ أَنْ يَكُونَ جَالَ فِي ظَنِّكُمْ أَنِّي أُحِبُّ الْإِطْرَاءَ وَاسْتِمَاعَ الثَّنَاءِ، وَلَسْتُ بِحَمْدِ اللهِ كَذٰلِكَ. وَلَوْ كُنْتُ أُحِبُّ أَنْ يُقَالَ ذٰلِكَ لَتَرَكْتُهُ انْحِطَاطاً لِلّٰهِ سُبْحَانَهُ عَنْ تَنَاوُلِ مَا هُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنَ الْعَظَمَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ " (۱)

" حکام کے پست ترین اور رسواکن حالات میں سے ایک کیفیت یہ بھی ہے کہ ان کے لئے گمان کیا جائے کہ وہ غرور و فخر کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے کام تکبر و خودسری پر محمول کئے جائیں ، اور میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تمہارے ذہنوں میں یہ بات خطور بھی کرے کہ میں مدح و ثنا اور خوشامد و چاپلوسی کو اچھی نگاہوں سے دیکھتا ہوں ۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں ۔ اور اگر میں ان چیزوں کو پسند بھی کرتا تو خدائے بزرگ و برتر کے مقابلہ میں اپنی بے مائیگی اور عاجزی کا احساس کر کے اسے کب کا چھوڑ چکا ہوتا ۔ کیونکہ خدا ہی عظمت و کبریائی کا سب سے زیادہ حقدار ہے ۔ "

۱۔ خطبہ ۲۱۶ ۔ نہج البلاغہ

بلند پروازی اور خود پسندی انسان کی خصلتوں میں شامل ہے ۔ خاص طور سے جب وہ حکومت و اقتدار کا مالک ہو تو اس حالت میں اس کی نشو و نما کا اندازہ ہی اور ہوتا ہے۔ اس خصلت نے وہ غضب ڈھائے ہیں کہ ہمیشہ تاریخ کے صفحات کو اپنے کارناموں سے سیاہ اور داغدار بنایا ہے ۔ صاحبان اقتدار اور تسلط پسند حکام ہمیشہ یہ چاہا کئے کہ خوشامدی اور چاپلوس افراد ان کی مدح سرائی اور خوشامدیں کرتے رہیں اور ان کے مکروہ چہروں کو کاذبانہ طور پر خوبصورت اور بداعمالیوں کو خوش کرداری ثابت کریں۔ یہ لوگ خود اپنے عیوب پر نگاہ نہیں کرتے اور ان پر توجہ دینا بھی نہیں چاہتے ۔ اور مثل مشہور ہے کہ : "جو عیب بھی سلطان کو پسند آئے ہنر ہے" یہ ایک ایسا تصور ہے گویا اہلِ زور و زر اکسیر کی مانند ساری برائیوں کو اچھائیوں میں اور تمام عیوب کو ہنر میں تبدیل کر دیتے ہیں ! حضرت علیؑ نے اپنے اس خطبہ کے مندرجہ بالا اقتباس میں چند حسب ذیل بنیادی چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے :-

۱ــــــ اللہ کے نیک بندوں کی نگاہ میں حکام کی سب سے بُری عادت و خصلت یہ ہے کہ ان میں غرور و نخوت پائی جاتی ہو، اپنی مدح و ستائش بہت زیادہ عزیز ہو، وہ خوشامد و چاپلوسی کو پسند کرتے ہوں ۔ لہٰذا ایک صالح حاکم اور اسلامی سیاست مدار پر لازم ہے کہ ان عیوب سے پرہیز کرے ۔

۲ــــــ حضرت علیؑ جو خود مکتبِ وحی کے تربیت یافتہ اور الٰہی سیاست و حاکمیت کے سب سے نمایاں نمونہ و معیار ہیں اپنے آپ کو نہ صرف ان ناپسندیدہ عادات و خصائل سے دور رکھتے ہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی نفرت کرتے ہیں کہ کسی کے خیال میں یہ بات آئے کہ علیؑ کو تعریف اور خوشامد پسند ہے ۔

۳ــــــ ایک حاکم کے لئے ضروری ہے کہ خداوند عالم کی عظمت و کبریائی کو ہمیشہ

پیش نظر رکھے تاکہ اس شیطانی دیوار کو منہدم کرسکے جو انسان اور حقیقت وواقعیت کے درمیان حجاب کا کام کرتی ہے وہ خدا کی عظمت و جلالت کے مقابل اپنے آپ کو ہمیشہ حقیر و ذلیل سمجھے اور اسی کو اپنا نصب العین بنا لے تاکہ اس حقیقت کو درک کرسکے کہ حکومت خدمت کے لئے ہے نہ کہ فوقیت اور عظمت کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے۔

امام نمونۂ عمل

حاکمیت اور رہبری کے شرائط و خصوصیات میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ خود بھی ان قوانین کا عملی طور سے پابند اور وفادار ہو جو ملک اور قوم و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ امام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"یَا اَیُّهَا النَّاسُ! اِنِّي وَاللهِ مَا اَحُثُّکُمْ عَلٰی طَاعَةٍ اِلَّا وَاَسْبِقُکُمْ اِلَیْهَا وَلَا اَنْهَاکُمْ عَنْ مَعْصِیَةٍ اِلَّا وَاَتَنَاهیٰ قَبْلَکُمْ عَنْهَا" (۱)

"اے لوگو! خدا کی قسم میں اس وقت تک تمہیں کسی نیک عمل کی تشویق و ترغیب نہیں دلاتا جب تک میں پہلے اس پر عمل نہ کرلوں اور کسی گناہ سے نہیں روکتا مگر یہ کہ میں پہلے اس سے خود کو محفوظ رکھوں۔"

سیاست میں اخلاق کے جلوے

اخلاق اور انسانیت کے عالی ترین صفات کی تربیت کرنا اور انہیں اپنانا نیز ان تمام بدخلقیوں اور بُرے صفات سے پرہیز کرنا، جو دشمن سے مقابلہ آرائی کے دوران انسان کو بُرے اور نامناسب اقدامات پر مجبور کرتے ہیں، یہ ایسے امور ہیں جن کا امام ہمیشہ خیال

۱۔ خطبہ/۱۷۵ نہج البلاغہ

رکھتے تھے یہاں تک کہ جنگ کے حساس ترین لمحات میں بھی جب انتقام کی آگ آدمی کو ہر طرح کے اقدام پر آمادہ کر دیتی ہے امام نے وہاں بھی ان باتوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ صفین کے ایک واقعہ کو لے لیجئے کہ جب معاویہ اور اس کے شامی فوجیوں نے علی اور ان کے لشکر پر پانی بند کر دیا تو امامؑ نے حکم دیا کہ گھاٹ سے دشمنوں کا قبضہ ہٹا دیا جائے چاہے اس راہ میں قتل کر دیا قتل کئے جاؤ کیونکہ وہ زندگی حق کی فتح میں مضمر ہے چاہے شہادت سے ہم کنار ہونا پڑے اور موت شکست اور ذلت قبول کرنے میں ہے چاہے انسان زندہ ہی کیوں نہ رہے"۔

اس فرمان کے ملتے ہی دشمن سے اس کی نقل و حرکت سلب کر لی گئی۔ علیؑ اور ان کے جانباز ساتھی گھاٹ پر قابض ہو گئے۔ بعض اصحاب نے رائے پیش کی کہ معاویہ اور اس کے فریب خوردہ فوجیوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے اور انہیں بھی پانی سے محروم کر دیا جائے۔ امامؑ نے اس رائے کو صاف طور سے رد کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مَا الْمُجَاهِدُ الشَّهِيدُ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَعْظَمَ أَجْراً مِمَّنْ قَدَرَ فَعَفَّ - لَكَادَ الْعَفِيفُ أَنْ يَكُونَ مَلَكاً مِنَ الْمَلَائِكَةِ" (۱)

"جو شخص انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے ضبط نفس اور عفو و بخشش سے کام لیتا ہے وہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والے مجاہد سے کہیں زیادہ اجر و ثواب رکھتا ہے اور عجب نہیں کہ شخص عفیف خدا کے مقرب فرشتوں میں سے ایک فرشتہ بن جائے۔

اس کے علاوہ اسی جنگ صفین کا واقعہ ہے کہ جب امام نے سنا کہ آپ کے سپاہیوں میں سے کچھ لوگ شام کے لوگوں کو برا بھلا کہہ رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا:

"إِنِّي أَكْرَهُ لَكُمْ أَنْ تَكُونُوا سَبَّابِينَ، وَلَكِنَّكُمْ لَوْ وَصَفْتُمْ

۱۔ پند و نصیحت، نمبر ۲۶۶ از نہج البلاغہ۔

أَعْمَالَهُمْ وَذَكَرْتُمْ حَالَهُمْ كَانَ أَصْوَبَ فِي الْقَوْلِ وَأَبْلَغَ فِي الْعُذْرِ، وَقُلْتُمْ مَكَانَ سَبِّكُمْ إِيَّاهُمْ: اللَّهُمَّ احْقِنْ دِمَاءَنَا وَدِمَاءَهُمْ وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَبَيْنِهِمْ وَاهْدِهِمْ مِنْ ضَلَالَتِهِمْ حَتَّى يَعْرِفَ الْحَقَّ مَنْ جَهِلَهُ وَيَرْعَوِيَ عَنِ الْغَيِّ وَالْعُدْوَانِ مَنْ لَهِجَ بِهِ۔ (۱)

"میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تم گالیاں دینے والے اور برا بھلا کہنے والے بن جاؤ۔ اگر تم ان کے اعمال و کردار پر اعتراض کرتے اور انہیں ان کی بداعمالیوں کی طرف متوجہ کرتے تو بھلائی اور صواب سے زیادہ نزدیک ہوتے اور تمہارا اعتراض بھی بجا ہوتا۔ تم لوگ بجائے انہیں گالیاں دینے کے یہ کہتے:

"خداوندا! ہماری اور ان کی جانوں کی حفاظت فرما اور ہمارے اور ان کے درمیان صلح و صفا برقرار کر، انہیں گمراہی سے نکال کر ہدایت کی راہ پر گامزن کر دے تاکہ جو حق کو نہیں پہچانتے، پہچان لیں اور عداوت و گمراہی سے باز آجائیں"۔

کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا سیاسی رہنما اور سپہ سالار بھی دیکھا یا سنا گیا ہے جو اپنے پست اور ذلیل دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے؟ دشمن سے انتقام لینے اور اسے نقصان پہنچانے کا جذبہ ایسی چیز ہے جو ارباب اقتدار کے نظریہ کے مطابق خصوصاً میدان جنگ میں ہلکی سی نرمی کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ کائنات میں صرف علیؑ ہی جیسی شخصیتیں ان حالات میں بھی اخلاقی اصول کی پابند رہ سکتی ہیں۔

سیاست اور اخلاق ؟! جنگ اور اخلاق ؟! ان کا باور کرنا کس قدر مشکل ہے!، لیکن جہاں ایمان حاکم ہوتا ہے اور اقتدار کی باگ ڈور مومن کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہاں

۱۔ باب خطب/کلام ۲۰۶۔ نہج البلاغہ

یہ سب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے ۔

اس سیاسی روش کا انتخاب اور اس پر عمل ممکن ہے خسارہوں سے دوچار کرے اور اس راہ میں نقصانات اٹھانا پڑیں ، یا یہ طرز دشمن کو اور زیادہ جری وجسور بنا دے ۔ لیکن ایک دیرپا اثر اور ایک مستقل مکتب فکر کے اعتبار سے جس چیز پر خصوصیت سے تکیہ کرنا چاہیئے ، وہ انسان کی با فضیلت زندگی اور بہترین انسانی صفات کی تیاہی ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ انسان کے وجود اور اس کی حیات کا فلسفہ بھی اسی پر منحصر ہے نیز موت وحیات کا انحصار بھی اسی فلسفہ پر ہے (خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) (۱) اس نے موت وحیات کو پیدا کیا تاکہ آزمائے کہ تم میں بہترین عمل کرنے والا کون ہے ۔

آج اسلامی جمہوریہ کا نظام اسی سیاسی اور فوجی منطق پر عمل پیرا ہے اور تمام جہات میں اپنے دشمنوں کے ساتھ یہی روش اپنائے ہوئے ہے ۔ خاص طور پر بڑی طاقتوں کی طرف سے تھوپی گئی جنگ کے دوران محاذ پر جنگی اسیروں اور مجروح دشمنوں کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ دیکھنے میں آتا ہے ۔ اور یہ بذات خود ہمارے اسلامی انقلاب کی ثقافت وتمدن کا ایک خاص حصہ ہے کہ اس میں قدروں کو ظاہری تسلط وغلبہ اور مکر وفریب سے الگ ہٹ کر انسانی معیاروں کی بنیاد پر پرکھا گیا ہے ۔

سیاسی آگاہی

کلمۂ سیاست کے حقیقی مفہوم کے مطابق سیاسی مسائل میں بصیرت وآگاہی حاصل کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ : حاکم ، اسلامی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوئے اسلامی معاشرہ کے مصالح ومنافع کے پیش نظر دشمن کے مدمقابل ایسا رویہ اختیار کرے جو شریعت کی بنیادی حدود سے خارج نہ ہو ، ساتھ ہی دین کی بقا اور امت کی فلاح وبہبود کا ضامن بھی ہو ۔

---

۱ ـ سورہ ملک آیت ۲

یہ سیاسی بصیرت، دوسرے سوداگرانہ مادی سیاسی افکار سے بہت بڑا فرق رکھتی ہے۔ حضرت علیؑ نے اپنے ارشادات میں بار بار اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو روش میں نے اختیار کی ہے وہ بصیرت کی اور واقعیت کی بنیاد پر استوار ہے، اشتباہ، دھوکہ اور مکر و فریب کا نتیجہ نہیں ہے۔

ایک مقام پر آپ نے طلحہ و زبیر کے بیعت کرنے اور پھر ان کے بیعت توڑنے اور روگردانی اختیار کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّ مَعِي لَبَصِيرَتِي مَا لَبَسْتُ وَلَا لُبِسَ عَلَيَّ. وَإِنَّهَا لَلْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ فِيهَا الْحَمَا وَالْحُمَةُ وَالشُّبْهَةُ الْمُغْدِفَةُ وَإِنَّ الْأَمْرَ لَوَاضِحٌ وَقَدْ زَاحَ الْبَاطِلُ عَنْ نِصَابِهِ وَانْقَطَعَ لِسَانُهُ عَنْ شَغْبِهِ."[۱]

"درحقیقت میرے ساتھ میری بصیرت کی روشنی ہے۔ نہ میں نے خود کبھی دھوکہ دیا ہے اور نہ مجھے کسی معاملہ میں دھوکہ ہوا ہے۔ بلاشبہ یہی وہ باغی گروہ ہے جس میں ایک ہمارا اپنا ہے جو بچھو کے ڈنک کے ہمراہ ہے ساتھ ہی حق پر پردہ ڈالنے والے شبہوں کے سیاہ پردے ہیں اور گمراہ کرنے والے ہیں جنہوں نے "قتل عثمان کا بہانہ" ڈھونڈ لیا ہے۔ حالانکہ بات کھل چکی ہے، باطل کی جڑیں اکھڑ چکی ہیں اور اب اس میں شر انگیزی کے لئے زبان درازی کی طاقت و ہمت نہیں رہی"۔

ساتھ ہی امامؑ اپنی سیاست سے معاویہ کی سیاست کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ/۱۳۷

"وَاللّٰهِ مَا مُعَاوِيَةُ بِأَدْهىٰ مِنِّي وَلٰكِنَّهُ يَغْدِرُ وَ يَفْجُرُ وَلَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ أَدْهىٰ النَّاسِ وَلٰكِنْ كُلُّ غُدَرَةٍ فُجَرَةٌ، وَكُلُّ فُجَرَةٍ كُفَرَةٌ، وَلِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يُعْرَفُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللّٰهِ مَا أُسْتَغْفَلُ بِالْمَكِيدَةِ وَلَا أُسْتَغْمَزُ بِالشَّدِيدَةِ" (۱)

"خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیادہ باہوش اور عقلمند نہیں ہے لیکن اصل میں وہ چال بازی، مکروفریب اور فسق و فجور سے کام لیتا ہے اور اگر مجھے مکر و زور اور گناہ سے نفرت نہ ہوتی تو میں دنیا کا سب سے زیادہ چالاک انسان ہوتا۔ لیکن درحقیقت ہر طرح کی چال بازی، فسق و فجور اور تباہی و بربادی کا سامان نتیجہ ہے اور ہر چالبازی گناہ کفر ہے اور قیامت کے دن، ہر چالباز و فریب کار کے ہاتھ میں ایک پرچم ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا خدا کی قسم مجھے مکروفریب سے کبھی غافل نہیں کیا جا سکتا، اور نہ پے در پے حملوں سے جھکایا جا سکتا ہے۔ (۲)

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ/۲۰۰

۲۔ یہاں اسلامی سیاسی آگاہی و بصیرت سے متعلق ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف تو ان رہبروں کو جو لوگوں پر حاکم ہیں سیاسی طور پر آگاہ و بصیر ہونا چاہیئے اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے، دوسری طرف عوام کو بھی ضروری حد تک فکری طور سے پختہ اور اس سیاست سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ امام نے ان دونوں پہلوؤں پر رہنمائی فرمائی ہے چنانچہ اس بحث کی تکمیل کے لئے قارئین کرام "عوام اور حکومت" کے عنوان سے آئندہ باب کو ضرور پیش نظر رکھیں

از: علامہ طباطبائی
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

رسولِ اسلامؐ

روایات کی روشنی میں

ملازمین کے ساتھ برتاؤ

مکارم الاخلاق میں انس سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے نو سال تک پیغمبر اسلامؐ کی خدمت کی لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس درمیان حضورؐ نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے سوال کیا ہو کہ تم نے فلاں کام کیوں نہیں انجام دیا؟ یا کبھی میرے کسی کام میں عیب ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو۔ مجھے ہرگز یاد نہیں ہے۔ (مکارم الاخلاق ص ۱۹)

ان ہی انس سے "احیاء العلوم" میں غزالی نے روایت کی ہے، انس کہتے ہیں: اس خدا کی قسم جس نے رسولِ خدا کو حق پر مبعوث کیا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اگر میرا کیا ہوا کوئی کام رسول اسلامؐ کو پسند نہ آیا ہو تو آپ نے اس پر مجھے کچھ سخت و سست کہا ہو کہ ایسا کیوں کیا، نہ صرف یہ کہ آپ نے مجھے مورد عتاب قرار نہیں دیا بلکہ اگر حضرت کی ازواج میں سے کسی نے میری ملامت کی تو آپ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اسے کچھ نہ کہو یہ کام یوں ہی مقدر تھا۔ (مکارم الاخلاق ص ۱۶)

اسی کتاب میں انس سے ہی روایت ہے: کسی بھی صحابی یا دوسرے شخص نے آپ کو نہیں پکارا مگر یہ کہ آپ نے جواب میں فرمایا "لبیک"۔ (یعنی آپ پکارنے والے کا ضرور جواب دیتے تھے)

غزالی نے انس سے ہی روایت کی ہے کہ حضور (ص) اپنے اصحاب کو ان کے احترام کے سبب اور ان کا دل جیتنے کے لئے ہمیشہ ان کی کنیتوں سے پکارتے تھے اور اگر کسی شخص کی کنیت نہ ہوتی تو آپ

خود ہی اس کی کنیت رکھ دیتے اور تمام لوگ اس کو اسی کنیت سے پکارتے جو حضرت نے رکھی ہے۔
یہی صورت عورتوں کے ساتھ بھی تھی چاہے وہ صاحب اولاد ہوں یا نہ ہوں حتیٰ آپ بچوں کی بھی کنیت رکھ دیا کرتے تھے اور اس طرح آپ ان کے دل ہاتھ میں لے لیا کرتے تھے (احیاء العلوم جلد ۷ ص ۱۱۵)
اسی کتاب میں رسولِ اسلام کا یہ طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو کوئی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ اپنی تو شک اس کے لئے پھیلا دیتے اور اگر آنے والا شخص اس کو قبول کرنا نہ چاہتا تو اصرار کرتے کہ وہ اس کو قبول کر لے۔ (احیاء العلوم جلد ۷ ص ۱۱۴)

داد و دہش

کافی میں عجلان سے روایت ہے کہ میں امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا کہ ایک سائل آپ کے دروازہ پر آیا حضرت اُٹھے اور اس برتن سے جس میں خرما رکھا ہوا تھا اپنے دونوں ہاتھوں کو پُر کیا اور سائل کے حوالے کر دیا تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا سائل آیا اور آپ نے مٹھی بھر کر خرما اسے بھی دے دیا اس کے بعد تیسرا سائل آیا اٹھے اور اس کو بھی مٹھی بھر کر خرما دے دیا۔ ابھی دیر نہ گزری تھی کہ چوتھا سائل آیا اس مرتبہ حضرت اٹھے اور اس سائل سے فرمایا: خداوند عالم ہم کو اور تم کو روزی عطا کرے۔ اس وقت آپ نے مجھ سے فرمایا: رسول خدا (ص) کا یہی حال تھا کہ اگر کسی نے مال دنیا سے کچھ طلب نہیں کیا کہ آپ نے اس کو عطا کر دیا۔ ایک دن کسی عورت نے اپنے لڑکے کو آنحضرت کے پاس روانہ کیا اور کہا رسول خدا (ص) سے جا کر کچھ طلب کرو۔ اگر وہ جواب میں فرمائیں کہ کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے تو کہنا کہ اپنا کرتہ مجھے عنایت فرمائیے۔ امام صادق فرماتے ہیں: رسول خدا صلعم نے اپنا کرتہ اتارا اور اس بچے کے سامنے رکھ دیا (دوسرے نسخہ میں ہے کہ اپنا کرتہ اسے دے دیا) خداوند عالم نے آیت: لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (کافی جلد ۴ ص ۵۵ حدیث ۸) [نہ اپنا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا (دوسروں کے لئے تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ ہی بالکل کھلا چھوڑ دو (یعنی سب کچھ دے ڈالو) کہ بعد میں ملامت اور تہی دستی کا سامنا کرنا پڑے] کے ذریعہ آنحضرت کو انفاق میں اعتدال سے کام لینے کی دعوت دی ہے۔
اور اسی کتاب میں جابر سے اور انہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

رسولِ اکرمؐ ہدیہ قبول کر لیا کرتے تھے مگر صدقہ نہیں کھاتے تھے (۱)

کافی میں ہی موسیٰ ابن عمران ابن بزیع سے نقل ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے امام رضا(ع) سے عرض کی: میں آپ پر قربان جاؤں لوگ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا (ص) جب کبھی کسی مقصد سے نکلتے تھے تو جس راہ سے جاتے تھے اسی راہ سے نہیں پلٹتے تھے بلکہ دوسری راہ سے آتے تھے آیا یہ روایت صحیح ہے اور رسول اللہ ص ایسا ہی کرتے تھے؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: ہاں، میں بھی بیشتر اوقات میں ایسا ہی کرتا ہوں، تم بھی یہی کیا کرو اس کے بعد آپ نے مجھ سے فرمایا: یاد رکھو! یہ عمل رزق تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے۔ (۲)

کتاب "اقبال" میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ آفتاب طلوع ہونے کے بعد گھر سے باہر آتے تھے۔

کافی میں عبداللہ ابن مغیرہ سے روایت ہے کہ کسی نے اس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی گھر میں داخل ہوتے تو داخلے کے در سے قریب ترین جگہ پر ہی بیٹھ جاتے تھے۔ (۳)

اس روایت کو سبط طبرسی نے بھی کتاب "المشکوۃ" میں "محاسن" اور دوسری کتابوں سے نقل کیا ہے (۴)

نظافت و پاکیزگی

صاحب مکارم الاخلاق کی روایت کے مطابق آنحضرت (ص) جس وقت اپنی ڈاڑھی اور سر کے بال دھونا چاہتے تو سدر (بیر کے پتوں) سے دھوتے تھے۔ (۵)

اور "جعفریات" میں خود امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آبائے طاہرینؑ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: رسول خدا (ص) ہمیشہ اپنے بالوں کو کنگھی کرتے تھے اور زیادہ تر صرف پانی سے کنگھی فرماتے اور کہتے تھے کہ: پانی مومن کی خوشبو کے لئے کافی ہے۔ (۶)

صاحب من لایحضرہ الفقیہ، فرماتے ہیں کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا: مجوسی اپنی ڈاڑھی مونڈتے اور مونچھیں بڑھاتے ہیں جبکہ ہم اپنی مونچھیں چھوٹی کرتے اور ڈاڑھی بڑھاتے ہیں۔ (۷)

۱۔ کافی ج ۵ ص ۱۴۳ حدیث ۸ ۲۔ کافی ج ۵ ص ۳۱۴ حدیث ۴۱ ۳۔ کافی ج ۲ ص ۶۶۲ حدیث ۶
۴۔ مشکوۃ الانوار ص ۲۰۴ فصل ۶ باب چہارم مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ قم و بحارالانوار ج ۱۶ ص ۲۴۰
۵۔ مکارم الاخلاق ص ۳۲ ۶۔ جعفریات ص ۱۵۶ ۷۔ من لایحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۷۶

کافی میں خود امام جعفر صادق (ع) سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا: (رسولوں کی) سنتوں میں ایک ناخنوں کا کاٹنا بھی ہے۔ اسی طرح "من لایحضرہ الفقیہ" میں روایت ہے کہ ناخن، بال اور خون کا دفن کرنا آنحضرتؐ کی سنت ہے۔ (۱)

اسی کتاب میں محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ انہوں نے امام صادق ؑ سے خضاب کے بارے میں سوال کیا تو حضرتؑ نے فرمایا: رسولؐ خدا ہمیشہ خضاب کرتے تھے اور اب بھی حضورؐ کا خضاب شدہ بال ہمارے گھر میں موجود ہے۔ (۲)

کتاب مکارم الاخلاق میں ہے کہ رسول خدا (ص) برابر اپنے بدن پر تیل کی مالش کرتے تھے۔ (۳)

صاحب من لایحضرہ الفقیہ امیر المومنینؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: بغل کے بالوں کو صاف کرنا انسان کے بدن کی بدبو زائل کر دیتا ہے اس سے قطع نظر کہ یہ پاکیزگی کا باعث اور ان پاکیزہ سنتوں میں سے ہے جس کا رسولؐ خدا نے حکم فرمایا ہے۔ (۴)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ رسول خدا (ص) کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے وہ ہر رات اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے۔ آپ پتھر کا سرمہ استعمال فرماتے تھے۔ (۵)

دانتوں کی صفائی

کافی میں ابی اسامہ سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا: رسولوں کی سنتوں میں سے ایک مسواک کرنا بھی ہے۔ (۶)

کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے اپنی حدیث "اربعمأۃ" میں فرمایا کہ: مسواک کرنا رضائے خدا کا باعث اور رسول اسلامؐ کی سنت ہے ساتھ ہی دہن کی صفائی اور خوشبو کا بھی سبب ہے۔ (۷) اس کے علاوہ بھی شیعہ و سنی طریقوں سے بہت سی حدیثوں میں مسواک کرنا رسول خداؐ کی عادت اور اس کو آپ کی سنت قرار دیا گیا ہے۔

کتاب مذکور میں ہی امام صادق (ع) سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: چار چیزیں انبیاء علیہم السلام کے اخلاق میں سے ہیں ۱ عطر لگانا ۲ استرے سے بال صاف کرنا ۳ نورہ لگانا ۴ ازواج کے ساتھ زیادہ ہم بستر ہونا۔ (۸)

۱۔ من لایحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۴۷، ص ۹۶ حدیث ۹۴-۱۶۹ ۲۔ من لایحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۶۹ حدیث ۵۳۔
۳۔ مکارم اخلاق ص ۳۵ ۴۔ من لایحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۶۸ حدیث ۲۰۴ ۵۔ مکارم اخلاق ص ۴۴
۶۔ کافی ج ۳ ص ۲۳ حدیث ۲ ۷۔ من لایحضرہ الفقیہ، وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۳۵۱ حدیث ۳۳ ۸۔ من لایحضرہ الفقیہ ج ۱

طبری

کا علمی و ثقافتی تعارف

از: جناب رسول جعفریان
ترجمہ: سید ولی الحسن رضوی

طبری کی زندگی

ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید طبری آملی (۱) سنہ ۲۲۴ یا ۲۲۵ ہجری میں پیدا ہوئے، ایسا لگتا ہے کہ طبری کو خود بھی اپنی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہ تھا (۲) اور شوال سنہ ۳۱۰ھ میں دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ وہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے مشہور علماء میں سے تھے اور اپنے زمانے کے اکثر علوم خصوصاً حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ اور لغت میں بڑی ہی کم نظیر مہارت و گیرائی رکھتے تھے۔

اپنے زمانے میں طبری کے مقام کو واضح کرنے کے سلسلے میں ہم نے ان تفصیلات سے احتراز برتا ہے جو ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ بغداد میں، اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ یاقوت حموی نے "معجم الادباء" میں نقل کی ہیں بلکہ وہ تمام روایات جو طبری کے شاگردوں مثلاً ابن کامل وغیرہ سے نقل ہوئی ہیں، ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم نے اس مقالہ کو طبری کی فکری

۱۔ ابن ندیم کی کتاب الفہرست ص ۲۹۱ از ابوالفرج المعافی، ملاحظہ فرمائیں، یاقوت حموی نے ان کا نسب محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب کے عنوان سے لکھا ہے۔ ۲۔ یاقوت حموی ــــ معجم الادباء ج ۱۸ ص ۴۸

زندگی، جوانی کی حیات کا اہم ترین حصہ ہے تک محدود رکھا ہے ۔

دیگر تمام علوم کی بہ نسبت فقہ کے میدان میں طبری کو سب سے زیادہ شہرت ملی ہے، کیونکہ ابن ندیم نے ان کو بھی مالک، شافعی اور داود بن علی جیسے فقہاء کی فہرست میں رکھا ہے (۱) جبکہ تاریخ سے متعلق حصہ میں ان کا نام بھی ذکر نہیں کیا ہے ۔

طبری نے اپنی عمر کے سات برس پورے کرنے کے بعد قرآن پڑھنا شروع کیا اور اپنے باپ کی کوششوں سے تحصیل علم کا آغاز کیا (۲) ۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر آمل میں حاصل کی اس کے بعد رَے، بصرہ، کوفہ، واسط، مصر اور شام کا سفر اختیار کیا اور یہاں کے بزرگ علماء و مشائخ سے کسب علوم کیا۔ کافی تعداد میں حدیثیں سنیں نیز مالکی و شافعی فقہ ان مذاہب کے صاحبان علم سے پڑھی (۳)

تکمیل علم کے بعد بغداد واپس ہوئے اور پھر دو مرتبہ اپنے شہر آمل جانے کے علاوہ (۴) عمر بھر بغداد میں ہی تألیف و تدریس میں مشغول رہے ۔

طبری کے تألیفات میں اہم ترین اس کی "تفسیر" و "تاریخ" کی کتابیں ہیں جو حدیثیں جمع کرنے کے سلسلہ میں اس کی وسیع کوششوں کی نشاندہی کرتی ہیں یہ حدیثیں انہوں نے اپنی طولانی مسافرتوں کے دوران جمع کیں اور اپنے قوی حافظہ میں محفوظ رکھیں اور پھر بے پناہ کتابوں اور صحیفوں میں ثبت کردیں۔ طبری کے علمی آثار میں سے ایک "تہذیب الآثار" ہے جس میں طبری نے روایات جمع کرنے کے ساتھ ہی ان سے متعلق بحث و نظر سے بھی کام لیا ہے اور بڑی حد تک فقہ کے میدان میں اپنی مستقل رائے اور حیثیت کا ثبوت فراہم کیا ہے اس طور پر کہ بعض موارد میں شیعی نقطہ نظر سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں، اور اسی سے ان پر رافضی ہونے کا الزام بھی لگایا گیا ہے ۔

طبری نے اپنے تالیفات کے سلسلہ میں اپنے دور کے مورد بحث علمی مسائل کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے چنانچہ جب سن لیا کہ بعض لوگوں نے حدیث غدیر کا انکار کیا ہے تو حدیث غدیر کتنے طریقوں سے نقل کی گئی ہے اس پر انہوں نے ایک عظیم کتاب تألیف کر ڈالی یہ کتاب ابن کثیر نے

۱۔ الفہرست ص ۲۹۱ ط طہران ۱۳۹۳ھ
۲۔ طبری بحوالہ سابق، یاقوت معجم الادباء ج ۱۸ ص ۵۰
۳۔ طبری ج ۱۵ ص ۱۲۸۶۸۰۷ ط لیدن
۴۔ یاقوت ج ۱۸ ص ۵۶

اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کو ایک ضخیم کتاب بنایا ہے ۔ (۱)
طبری نے فقہ میں اگرچہ ایک زمانے تک شافعی فقہ کی ترویج کی ہے (۲) اور بعد میں بھی بعض شافعی حضرات نے ان کو شافعیوں کے سلسلے سے منسلک بتانے کی کوشش کی ہے (۳) لیکن طبری نے اپنے علمی عروج کے زمانے میں خود اجتہاد سے کام لیا اور ایک نئے فقہی مکتب کی بنیاد رکھی حتی بہت سے علماء و محدثین ان ہی کے فقہی نظریے اور مذہب کو قبول کرتے تھے اور انہوں نے کتابیں بھی تالیف کی ہیں (۴)

طبری کا عہد

یہ عہد جس میں طبری نے زندگی بسر کی ، وہ دور تھا کہ اسلامی تمدن تاریخ بشری میں اپنی قوت و توانائی کے مظاہرے کیلئے ضروری آمادگی حاصل کر چکا تھا ۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں اسلامی مفکرین حکومت اسلامی کے زیر اقتدار مختلف گوشہ و کنار میں مختلف علوم و فنون کی تحصیل ، تتبع اور تحقیق میں مشغول تھے ۔ دراصل یہ دور اپنے بعد اسلامی تمدن کے ایک پرشکوہ عصر کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوا ۔
مروجہ علوم میں " علم حدیث " سب سے زیادہ توجہ اور دلچسپی کا موضوع بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس نے آپ علم فقہ ، تفسیر ، رجال حتی تاریخ کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم ہوگیا ، اور یہ علوم دینی علوم کے محور شمار ہونے لگے ۔ بغداد ، کوفہ ، بصرہ ، شام ، مصر ، رے ، نیشاپور نیز دوسرے بہت سے مقامات پر پھیلے ہوئے علمی دینی مراکز ایسے محدثین سے مملو نظر آتے تھے جو اسلام و مسلمین کی فکری میراث اور دینی ثقافت کے محافظ بنے ہوئے تھے ، اور ہمیشہ مزید حدیث اور جامع تر معلومات کی دریافت کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کیا کرتے

---

۱ ۔ ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۴۷ کے علاوہ داودی کی طبقات المفسرین ج ۲ ص ۱۱۳ اور یاقوت کی " معجم البلدان " جلد ۱۸ ص ۵۴ ملاحظہ فرمائیں ۔

۲ ۔ طبری جلد ۱۵ ص xxxx ۱۷ ۔

۳ ۔ نووی ۔ تہذیب الأسماء واللغات ج ۱ ص ۷۹ مطبوعہ دار الکتب علمیہ بیروت ۔

۴ ۔ الفہرست ص ۲۹۲ و ۲۹۳ ، شذرات الذہب ، جلد ۲ ص ۲۶۰ ، ابن خلکان کی وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۳۲ الشیرازی کی طبقات الفقہاء ص ۹۳ یاقوت کی معجم الأدباء جلد ۱۸ ص ۵۴ و ۹۳ ۔

تھے ۔(۱)

اس زمانہ میں مختلف فقہی و تفسیری مکاتب جو زیادہ تر جغرافیائی علاقوں کے اعتبار سے اپنے علاقوں کے گزشتہ فقہاء سے متأثر ہو کر پیدا ہو گئے تھے ۔ اپنے عقائد و نظریات کی توسیع و ترویج کی فکر میں لگے ہوئے تھے انہوں نے اپنے فقہی و حدیثی مبانی اور بنیادوں کی تبلیغ کے لئے بڑی تعداد میں کتابیں اور رسالے تحریر کئے ہیں دسیوں مُسند، مُصنّف، سنن اور صحیح وغیرہ لکھی گئیں ۔ ہر ایک فقہی مکتب کی یہی کوشش تھی کہ وہ اس راہ میں دوسروں پر سبقت لے جائے اور زیادہ سے زیادہ حدیثیں جمع کرے اپنے اسلاف کی ترویج کرے اور اپنے مخصوص عقائد کو ثابت کرے (۲)

ایسی صورت میں مختلف مذاہب و مکاتب کے درمیان فقہ و عقائد کے میدان میں بحث و مباحثہ اور علمی جدال لوگوں کے علمی و فکری کاموں میں بڑا اہم رول ادا کرتا تھا اور فکروں میں محدودیت پیدا کر کے مختلف فقہی و اعتقادی موضوعات اٹھا کر مفکرین کو تحقیق و تتبع کے ایک مخصوص اور طے شدہ انداز فکر کا پابند بنا دیتا تھا۔

تیسری صدی ہجری میں جو کتابیں "الرد علی ... " کے عنوان سے (مختلف عقائد و نظریات کے جواب میں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد ان کے نام کے ساتھ ابن ندیم نے اپنی کتاب "فہرست" میں ایک سو تیس بتائی ہے اگرچہ اس نے اپنی پیش کردہ فہرست میں کچھ کتابیں دوسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل کی بھی شامل کردی ہیں ۔ (۳)

یہاں طبری کا مقام واضح کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اس زمانے کے خاص خاص عقائد و نظریات کا بھی ذکر کر دیا جائے ۔

تاریخی اعتبار سے اصولاً اسلام کی ابتدائی صدیوں میں صرف چند ہی مخصوص رجحانات و نظریات پائے جاتے تھے ۔ ایک نظریہ " تشیع " تھا جو حضرت علیؑ سے علاقہ محبت رکھتا تھا جس میں اہل فکر

---

۱ ۔ خطیب بغدادی کی کتاب " الرحلۃ فی طلب الحدیث " ملاحظہ فرمائیں ۔
۲ ۔ اسلامی تمدن کے عروج اور اس کے نشو و نما کے سلسلہ میں آدم متز کی کتاب " چوتھی صدی ہجری میں اسلامی تمدن " کا مطالعہ کریں
۳ ۔ الفہرست (کتابوں کی فہرست سے متعلق باب) ص ۱۱ و ۲۴ ۔

بھی شامل تھے یہ لوگ، "زیدیہ" "امامیہ" اور "اسماعیلیہ" پر مشتمل تھے
دوسرا گروہ خوارج کا تھا جو جنگ صفین کے اختتام اور جنگ نہروان کے درمیان تشکیل پایا۔
تیسرا گروہ "مرجئہ" کا تھا جن میں سے زیادہ تر پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ظاہر ہوئے یہ لوگ حضرت علیؑ اور عثمان کے درمیان تعلقات سے متعلق بعض موضوعات کے بارے میں نیز گناہانِ کبیرہ کے مرتکبین سے متعلق مخصوص نظریات پیش کرتے تھے۔

ایک اور مذہبی رجحان کا حامل گروہ جو بعد میں "اہل سنت" کے نام سے مشہور ہوا۔ مذہب "عثمانیہ" یا "اموریہ" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ گروہ اپنے مخصوص عقائد کی روشنی میں معاویہ کی مشینری اور اموی دربار سے وابستہ علما مثلاً "زہری" اور "ابوزناد" (۱) وغیرہ کے ذریعہ ترویج پا رہا تھا۔

یہ وہی مذہب ہے جس کا جاحظ نے العثمانیہ کے عنوان سے کتاب لکھ کر دفاع کیا ہے۔ اگرچہ خود جاحظ مختلف مذاہب و عقائد کی سیر کرتا رہا اور کسی بھی نظریہ کا سنجیدگی کے ساتھ پابند نہ تھا، اس کتاب میں بیان شدہ مطالب کا مقصد جیسا کہ علامہ سید مہدی روحانی نے تحریر فرمایا ہے عثمان کا دفاع کرنا نہیں ہے، کیونکہ اس میں صرف دو مقامات پر ان کا نام لیا گیا ہے، بلکہ اس کتاب میں مذہب عثمانیہ کے عقائد و افکار کا دفاع کیا گیا ہے جو دور اموی میں عامہ کا مذہب رہا ہے۔ (۲)

ان کے بنیادی ترین عقائد میں سے، خلفا کو ان کی ترتیب کے اعتبار سے ایک دوسرے پر ترجیح دینا، امیر المومنین علیہ السلام کو خلیفہ کی حیثیت سے قبول نہ کرنا اور نصب خلافت کا نظریہ تھا۔

۱۔ تتمہ طبقات الکبریٰ ص ۱۵۷۔ ۳۱۸ مطبوعہ حجاز (زہری، ابوزناد اور اموی دربار سے وابستہ دیگر علماء کے رول کے بارے میں زیاد محمد منصور کی تحقیق)
۲۔ اس سلسلہ میں ہم نے استاد موصوف کی ڈائری اور اس موضوع سے متعلق پیش کردہ زبانی رائے سے ـــــ

ان اعتقادات کے مقابل، عراق و حجاز بالخصوص ایران کے بہت سے فقہاء و محدثین تھے جو عثمانی نہیں تھے اور علیؑ کی فضیلت پر بھی یقین رکھتے تھے اور اسی حد تک عقیدہ رکھنا ان کو شیعہ کہنے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا اور آج علم رجال کی کتابوں میں ایسے سیکڑوں افراد ملتے جاتے ہیں جو "فیہ تشیع" کے الزام کے تحت اسی دور کے انداز فکر کی نشاندہی کرتے ہیں کیونکہ عثمانیوں کا دستور تھا کہ جس کسی شخص نے حضرت علیؑ سے متعلق کوئی معمولی سی فضیلت بھی نقل کر دی اور اپنی محبت کا اظہار کیا فوراً اس کو شیعہ حتیٰ رافضی کا نام دے دیا جاتا تھا۔(۱) اس کے برخلاف "کان عثمانیا" کی اصطلاح (۲) شیعہ مخالف مذہبی نظریات کے حامل ہونے اور اسلام کی ابتدائی دو صدیوں میں مذہب عامہ سے ہونے کا قطعی ثبوت ہے۔

معتزلہ جو ابتدائی طور پر بصرہ میں متشکل ہوئے اور بعد میں بغداد کو بھی انہوں نے اپنا مرکز بنالیا اپنے فکری رشد کی بنا پر، کیونکہ طبعی طور پر جنگ جمل کے پس پشت جذبۂ عثمانی موجود تھا۔ ان کے یہاں ابتدا میں عثمانی نظریات کی ترویج کا جذبہ پایا جاتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد بصرہ میں ان کے اندر تشیع کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں (۳) (اور یہ ان کے عقل کی طرف رجحان کی وجہ سے تھا)۔

لیکن بغداد کے معتزلہ بہت کٹر قسم کے شیعہ تھے جس کی روشن مثال ابوجعفر اسکافی اور ان کے فرزند ابن الاسکافی ہیں جنھوں نے "المعیار والموازنہ" (۴) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جو اس دور کی گرم ترین بحثوں پر مشتمل ہے اور جس میں انہوں نے دوسروں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے فضائل بیان کئے ہیں اور ان کو دوسروں پر ترجیح دی ہے۔ ابوجعفر اسکافی نے بھی جاحظ کی

استفادہ کیا ہے۔

۱۔ ابن حجر نے احمد بن طارق کی نسبت یاقوت اموی کے فیصلہ "کہ وہ رافضی تھا" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یاقوت "نصب" کا عقیدہ رکھتا تھا اور اس کے نزدیک شیعہ رافضی ہے۔ (لسان المیزان ج ۱ ص ۱۸۸)

۲۔ ملاحظہ فرمائیں: السید دوحانی کی "بحوث مع اہل السنۃ والسلفیۃ" ص نمبر ۲۴، ۲۵ (حاشیہ)

۳۔ دیکھئے مسند ابن جعد ج ۱ ص ۵۲۷

۴۔ یہ کتاب استاد شیخ محمد باقر محمودی کے توسط سے بیروت میں چھپ چکی ہے۔

کتاب "العثمانیہ" کے جواب میں ایک کتاب لکھی ہے۔ (۱)

استاد محقق علامہ دوحانی لکھتے ہیں کہ ابن سعد کی کتاب "طبقات الکبری" کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے کہ بنیادی طور پر ۱۵۰ھ سے قبل لفظ اہل سنت قطعاً کسی بھی عنوان سے کسی کے لئے نہیں بولا جاتا تھا، اس کے بعد شاید یہ تقریباً ۲۰۰ھ کے بعد کا زمانہ ہے جب یہ لفظ مشہور ہوا ہے، بنابریں مذہب "اہل سنت" اپنے نئے مفہوم کے ساتھ "عثمانیہ" کے مفہوم سے عدول کر کے حتمی طور پر تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی تشکیل پایا ہے۔

یہ بات ایسے بہت سے فقہا و محدثین کے اس دور میں موجود ہونے کے منافی نہیں ہے جو انفرادی طور پر اسی طرح کے عقائد رکھتے تھے جو بعد میں اہل سنت حضرات کے عقائد بنے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ جاحظ (وفات ۲۵۵ھ) کے زمانہ تک "العثمانیۃ" کی اصطلاح اس جماعت کے لئے عمومی طور پر رائج تھی جس کا جاحظ نے اپنی کتاب میں دفاع کیا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں مامون کے برسر اقتدار آنے کے بعد تشیع کو عروج حاصل ہوا اور "عثمانیہ" جو اب "اہل حدیث" (۲) اور "اہل سنت و الجماعت" کے عنوان سے ظاہر ہو چکے تھے، سختی کا شکار ہو گئے۔ "خلق قرآن" کے مسئلہ میں مامون کے دباؤ اور اس کی نیز واثق باللہ اور معتصم باللہ کی حدبندیوں کی وجہ سے تقریباً ۲۳۲ھ تک کا زمانہ اہل حدیث کی خاموشی اور دوسری طرف معتزلہ جو امیرالمومنینؑ کی حمایت اور معاویہ و عثمان کی مخالفت حتی گذشتہ دو خلفا پر بھی حضرت علیؑ کو فوقیت دینے کے معنی میں تشیع کی طرف شدید میلان رکھتے تھے، یہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن ۲۳۲ھ میں متوکل کے تخت نشین ہونے

۱۔ اس کتاب کا کچھ حصہ ابن ابی الحدید نے نقل کیا ہے افسوس کہ اصل کتاب ناپید ہے، کتاب العثمانیہ کے آخر میں کتاب اسکافی کے وہ حصے جو ابن ابی الحدید نے نقل کئے ہیں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے العثمانیہ بہ تحقیق عبدالسلام ہارون، طبع مصر ۱۳۷۴ھ ص ۲۴۳ تا ۲۸۲

۲۔ اہل حدیث کے مخالفین ان کے لئے "حشویہ" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے جو غالباً ان کے محض اخبار و روایات پر اعتماد اور اس کی ترویج و اشاعت نیز شاہان وقت کے دربار سے ان کی وابستگی اور برسر اقتدار آنے والے ہر خلیفہ و حاکم کی خوشامد و پیروی کی طرف اشارہ ہے۔

کے بعد اس کی طرف سے اہل حدیث اور ان کی قوی ترین شخصیت احمد بن حنبل ؒ کی حمایت اور سختی کے ساتھ دفاع نے اس کو تشیع اور اعتزال کی مخالفت پر کمر بستہ کر دیا اور بغداد اہل حدیث ، کہ جنھوں نے احمد بن حنبل کی موت کے کچھ دنوں بعد "حنابلہ" کا نام اپنا لیا تھا ، کی جولانیوں اور تاخت و تاز کا میدان بن گیا۔ اس سے قطع نظر کہ احمد بن حنبل نے عقائد عثمانیہ میں اصلاحات کرنے کی کوشش کی اور حضرت علی ؑ کو چوتھے خلیفہ (۱) کے عنوان سے پیش کیا (۲) ۔ گو کہ حقیقت میں فضا ان کے خلاف تھی —— لیکن پھر بھی غیر مستقیم طور پر علی ؑ کو برا بھلا کہنا ، ان کے فضائل سے انکار کرنا اور احادیث میں ظاہری گرہوں اور تشبیہ کا عقیدہ رکھنا نیز اسی قسم کے دوسرے عقائد اہل حدیث کے درمیان باقی رہ گئے ۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے عرض کیا اور آئندہ بھی اس پر مزید روشنی ڈالیں گے ، فقہاء و محدثین کے درمیان بہت سے لوگوں نے اہل حدیث کی مخالفت بھی کی ہے البتہ انہیں طرح طرح کے الزامات اور اتہامات سے نوازا گیا ہے ۔

چونکہ طبری کے عہد میں بغداد کے افکار پر جن سے براہ راست طبری کا سامنا تھا اہم ترین کنٹرول اہل حدیث اور حنابلہ کا تھا لہٰذا اس منزل میں ان کے جذبات و احساسات کی نشان دہی کے لئے بہتر ہے کہ اہل حدیث کی ہی ایک فرد ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی رائے اور فیصلہ پیش کر دیا جائے ، ابن قتیبہ نہ صرف اہل حدیث کا دفاع کرنے والوں میں ہے بلکہ اس کو ابن حجر نے ناصبی گری سے بھی متہم کیا ہے (۳) چنانچہ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا ہے : " كَانَ ابنُ قتيبة يَمِيْلُ اِلَى التَّشْبِيه مُنْحَرِفٌ عَنِ العِتْرَة " ابن قتیبہ عقیدۂ تشبیہ کی طرف میلان رکھتا تھا اور عترت رسول ؐ سے منحرف تھا ۔

یہی ابن قتیبہ اپنی کتاب میں ، جس کے بارے میں قوی احتمال یہ ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنی آخر

۱۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے : ترتیب کے اعتبار سے خلفا کی ایک دوسرے پر فضیلت کے بارے میں اجماع احمد بن حنبل کے دور میں ہی وجود میں آیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔ الاستیعاب جلد اول صفحہ ۱۵۴ ۔

۲۔ طبقات الحنابلہ جلد اول ص ۳۹۳ ، السید روحانی ۔ " بحوث مع اہل السنة والسلفية " صفحہ ۲۵ از طبقات الحنابلۃ ۔

۳۔ لسان المیزان جلد ۳ ص ۳۵۷ ملاحظہ فرمائیے ۔

عمر میں لکھی ہے تمام تر تعصبات اور افراط سے کام لینے کی روش پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

میں نے دیکھا کہ ان (اہل حدیث) نے حضرت علی (ع) کی محبت میں رافضیوں کے افراط سے کام لینے ان کو سب پر مقدم ملتے اور . . . کے جواب میں حضرت علیؑ کو مفضول ثابت کرنے میں افراط سے کام لیا ہے ۔ ان کا حق ادا نہیں کیا اور ان کے بارے میں بدگوئی بھی کرتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے ظلم کی وضاحت نہیں کرتے پھر بھی ان پر ناحق خون بہانے کا الزام عائد کرتے ہیں نیز عثمان کے قتل میں شرکت سے بھی متہم کرتے ہیں ، ان کو ائمۂ ہدیٰ کی فہرست سے نکال کر فتنہ گر ائمہ میں شامل کرتے ہیں ان کے بارے میں لوگوں کے اختلاف کو بنیاد بنا کر ان کے خلیفہ ہونے کے منکر ہو گئے جبکہ یزید کو خلیفہ مانتے ہیں کیونکہ اس کے سلسلہ میں ایک جماعت کی حمایت ثابت ہے ۔ بہت سے محدثین ان (حضرتؑ) کے فضائل نقل کرنے اور جو کچھ ان کے بارے میں نقل ہوا ہے ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہیں حالانکہ یہ ساری حدیثیں ، جو فضائل علیؑ لیے ہیں ، صحیح طرق سے ہم تک پہنچی ہیں ۔

ان لوگوں نے علیؑ کے فرزند حسینؑ کو (معاذ اللہ) خارجی قرار دیا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے عصا ، کو توڑ دیا اور ان کو مہدور الدم (واجب القتل) خیال کرتے ہیں کیونکہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے :

" مَنْ خَرَجَ عَلٰى اُمَّتِي وَهُمْ جَمِيعٌ فَاقْتُلُوهُ كَائِنًا مَنْ كَانَ "(۱) ۔

ہاں یہ لوگ علیؑ اور اہل شوریٰ کو ایک دوسرے کا مساوی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر عمر علیؑ کو برتر خیال کرتے تو ان کو دیگر (اہل شوریٰ) پر مقدم قرار دیتے ، یہ لوگ ان (حضرت علیؑ) کے ذکر سے بھی پرہیز کرتے ہیں حتیٰ ان کے فضائل میں وارد حدیثیں نقل کرنے میں کراہت محسوس کرتے ہیں یہاں تک کہ اہل حدیث کے محدثین ان (علیؑ) کے فضائل میں حدیثیں نقل کرنے میں اکراہ سے کام لیتے ہوئے عمرو بن العاص اور معاویہ کے تمام تر فضائل یوں بیان کرنے لگتے ہیں گویا فضائل نقل کرتے وقت یہ دونوں ان کے پیش نظر نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر ان کا مقصد علیؑ کو نیچا دکھانا ہوتا ہے اگر ایک شخص علیؑ کے بارے میں کہتا ہے : " اَخُوْ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلِيٌّ وَاَبُوْ سِبْطَيْهِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ اَصْحَابُ الْكِسَاءِ عَلِيٌّ وَفَاطِمَةُ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ " تو ان کے

(۱) جو شخص میری امت کے خلاف خروج کرے اور وہ لوگ ایک جماعت کی شکل میں ہوں اس کو قتل کر دو چاہے وہ جو بھی ہو۔

چہرے برہم ہو جاتے ہیں اور آنکھوں سے غیر یقینی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے ... اگر کسی نے قول رسولؐ نقل کیا کہ حضرتؐ نے فرمایا ہے: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاہُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاہُ" یا "اَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى" اور اس قسم کی دوسری حدیث تو فوراً سند وغیرہ سے متعلق تنقید شروع کر دیتے ہیں کہ ان احادیث کو بے وقعت بنا دیں اور غلط قرار دیدیں، اور ان (علیؑ) کے حق کو راضیوں کی وجہ سے پامال کرتے ہیں اور ان کی دشمنی میں جو چیز کہ علیؑ (۱) میں کما اندر نہیں ہے اس کی بھی ان کی طرف نسبت دیتے ہیں، یہ بعینہ جہالت ہے ... تمہارا فرض ہے کہ پیغمبرؐ کے نزدیک ان کی حیثیت کو جانو، ان کی اخوت و دامادی، دشمنوں سے جہاد میں ان کا صبر اور پیغمبرؐ کی معیت میں لڑی جانے والی جنگوں میں ان کی جان نثاری کو سمجھو اس کے ساتھ ہی علم، دین اور شجاعت کے اعتبار سے وہ جس مقام پر فائز تھے اس کا احساس کرو (۲)۔

ابن قتیبہ نے آگے بڑھکر بھی اس طرح کی تعریف و تمجید سے کام لیا ہے اور جیسا کہ اس کے مصحح نے بھی ابتدا میں کہا ہے یہ چیز غالباً ابن قتیبہ کے طرز فکر میں، کسی حد تک، تبدیلی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کا بغض اہلبیت (ع) مشہور رہا ہے ـــــ یہاں ابن قتیبہ کی عبارت صرف اس لئے نقل کر دی گئی ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ حنبلی حضرات جو طبری کے مدمقابل تھے، اور طبری کے فکری ٹکراؤ سے متعلق واقعات کا اہم ترین حصہ جن سے تعلق رکھتا ہے، یہ لوگ کن عقائد و نظریات کے حامل تھے۔

مقدسی نے بھی بغداد کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے :-

"وَبِبَغْدَادَ غَالِيَةٌ يُفْرِطُوْنَ فِي حُبِّ مُعَاوِيَةَ وَمُشَبِّهَةٌ وَبَرْبَهَارِيَّةٌ" (۳)

یعنی بغداد میں انتہا پسند گروہ موجود ہیں جو معاویہ، مشبہہ اور بربہاریہ کی محبت میں افراط سے کام لیتے ہیں۔ (بربہاری بغداد کے حنبلی پیشواؤں میں سے ہے)

---

۱ ـ علیہ السلام کی تعبیر خود ابن قتیبہ کی تحریر میں موجود ہے ـ

۲ ـ ابن قتیبہ ـ الاختلاف فی اللفظ ـ تحقیق محمد زاہد الکوثری مصر ۱۳۴۹ھ، ص ۴۷ تا ۴۹ ـ

۳ ـ المقدسی ـ احسن التقاسیم ص ۱۲۶ ـ

بہرحال، متوکل کے برسراقتدار آنے کے بعد سے بغداد کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ان ہی حنبلی حضرات پر مشتمل تھا، دیگر علماء ان سے خوف ووحشت کی بناپران کا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ بغداد میں شیعہ اور معتزلہ حضرات بھی تھے بالخصوص شیعیان علی محلہ کرخ میں زندگی بسر کرتے تھے مگر حالات کے دباؤ کی وجہ سے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کی چوتھی دہائی میں "آل بویہ" کے ہاتھ میں سیاست کی باگ ڈور آنے کے بعد شیعوں کو تقویت حاصل ہوئی اور پھر حنبلیوں کے مقابلہ میں شیعوں کا ایک نیا اور مضبوط محاذ کھل گیا ــــــ جس کی تفصیل ہمارے اس مقالہ کے دائرے سے خارج ہے۔

حنبلیوں کے مقابل طبری کا موقف

اہل حدیث کے مقابل شیعوں کو قوت حاصل ہونے نیز چوتھی صدی ہجری کے نصف میں جب ابوالحسن اشعری نے عقلی روش وحدیثی روش کے درمیان کی ایک روش کو رواج دیا ہے۔ بغداد میں حنبلیوں کا ہی دور دورہ تھا اور بہت کم ایسے علماء تھے جو ان سے مقابلہ کی جرأت کرتے حتیٰ خلفاء بھی مکمل طور سے ان ہی کی طرف میلان رکھتے تھے۔

حنبلی حضرات جو خلق قرآن، تشبیہ، علی بن ابی طالب (ع) کے حق میں بے حرمتی، نیز اپنے ماسلف ــــ جن کی معاویہ نے ترویج کی تھی ــــ کے فتووں پر پورا زور صرف کرتے تھے۔ ان کے مقابل طبری کی جرأت ودلیری قابل تحسین ہے طبری نے حنبلیوں نیز ان کے حامی وسرپرست حاکموں کی قطعاً کوئی پرواہ کئے بغیر اپنے عقائد کا اظہار کیا اور حنبلیوں کے علمی مراکز کو کمزور کرنے پر کمربستہ ہوگئے۔

یہاں حنبلیوں کے مقابل طبری کی روش وموقف سے متعلق چند تاریخی روایتوں کا پیش کردینا طبری کی زندگی کے اس رخ کو سمجھنے کے لئے مفید ہوگا۔

ا ــــــ طبری کے حالات زندگی سے متعلق متعدد روایتیں ملتی ہیں جو طبری کے حق میں حنبلیوں کے مظالم بیان کرتی ہیں۔ یہ لوگ ان سے ملاقات اور ان سے نقل حدیث کو محدود بنانے کی غرض سے ان کے یہاں طلبہ کی آمد ورفت پر بندش لگاتے تھے۔ چنانچہ حسینک

حسین ابن علی حافظ کہتے ہیں: ابن خزیمہ نے مجھ سے سوال کیا کہ آیا ابن جریر سے تم نے کچھ سنا ہے؟ میں نے جواب دیا، نہیں۔ کیونکہ حنابلہ ان کے یہاں آمدورفت سے مانع ہوتے تھے (۱) ابن خزیمہ سے ہی ایک دوسری روایت میں بہ صراحت ملتا ہے کہ:-

" لَقَدْ ظَلَمَتْہُ الحَنَابِلَۃ " حنابلہ نے طبری کے حق میں ظلم سے کام لیا ہے(۲)

ایک دوسری جگہ ہے:-

" وَکَانَتِ الحَنَابِلَۃ تمنع وَلَا تَترُکُ اَحَداً یَسْمَعُ عَلَیہ " حنابلہ اس کے پاس جانے سے مانع ہوتے تھے اور جو کوئی چاہتا کہ اس سے کچھ پڑھے اس کو جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ (۳)

سبکی نے طبقات میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ حنبلیوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ حسینک جیسے افراد کو طبری کے پاس جانے سے روک سکتے ــــــ یہی وجہ ہے کہ ابن خزیمہ نے حسینک سے کہا تھا کہ تم نے غلط کیا جو طبری کے پاس نہیں گئے۔ (۴) لیکن اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنا، اگرچہ کسی حد تک درست بھی ہو، پھر بھی بنیادی طور پر حنبلیوں کے بارے میں جتنا ان نے سوچا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ غالباً جرأتمند افراد ہی طبری کے پاس جا سکتے رہے ہوں۔

۲ ــــــ اسی سبکی نے لکھا ہے کہ ذی قعدہ میں ابن جریر طبری حنابلہ سے مناظرہ کے لئے علی بن عیسیٰ کے گھر آئے مگر حنابلہ نہ آئے اور ابن جریر گھر لوٹ گئے۔ (۵)

۱۔ بغدادی۔ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۶۴، ۔ابن اثیر ج ۸۔ ص ۱۳۵۔ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ ص ۲۱۷، ابن حجر۔ لسان المیزان ج ۵ ص ۱۰۲، داؤدی۔ طبقات المفسرین ج ۲ ص ۱۱۰

۲۔ السمعانی۔ الأنساب ج ۹ ص ۴۲، ابن کثیر۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱۔ ص ۱۴۶، تاریخ بغداد ج ۲۔ ص ۱۶۴، ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲۔ ص ۲۱۷، ابن اثیر ج ۸ ص ۱۳۱۔

۳۔ یاقوت۔ معجم الأدباء ج ۱۸۔ ص ۴۲

۴۔ طبقات السبکی بنقل طبری ج ۱۵۔ مطبوعہ لیدن ص XCVIII ۵۔ طبری ج ۱۵ ص XCXII

بیانات بھی بغداد میں حنابلہ کے ساتھ طبری کے فکری موقف کے ٹکراؤ کو ظاہر کرتی ہے ۔

۳۔ حنبلیوں کے مقابل طبری کے موقف کی وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ طبری نے اپنی کتاب " اختلاف الفقہاء " میں احمد بن حنبل کا نام نہیں ذکر کیا ہے اور جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا :-

" لم یکن فقیہاً وانما کان محدثاً " یعنی وہ (احمد بن حنبل) فقیہ نہیں بلکہ محدث تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ حنابلہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے ۔(۱)

طبری کے اس موقف کی اہمیت واضح ہے کیونکہ اہل حدیث کے درمیان احمد بن حنبل کی حیثیت بہت ہی اونچی تھی ۔

۴۔ ایک اور روایت جو یاقوت حموی نے نقل کی ہے اس میں ملتا ہے کہ حنابلہ (بغداد کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن طبری کے پاس آئے اور احمد بن حنبل کے سلسلہ میں نیز عرش پر خدا کے "جلوس سے متعلق حدیث کے بارے میں ان سے سوال کیا (یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ حنابلہ اور مشبہہ حدیث (جلوس) کا تحت اللفظی ترجمہ کرتے تھے) ۔

طبری نے کہا : جہاں تک احمد بن حنبل کی بات ہے (فقہی) مسائل میں ان کے اختلافات کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ حنبلیوں نے کہا : مگر علماء نے ان کی رائے کو دوسرے دوسروں کی آراء کے ساتھ نقل کرتے ہوئے ان کے اختلافات کو اہمیت دی ہے ۔ طبری نے کہا : - میں نے نہیں دیکھا ہے چنانچہ (محدثین وفقہاء کے درمیان) کس نے اس کی حمایت کی ہو میرے علم میں نہیں ہے اور جہاں تک عرش پر خدا کے " بیٹھنے سے متعلق حدیث کا سوال ہے یہ بھی محال ہے اور اس کے بعد یہ شعر پڑھا :-

سبحان من لیس لہ انیس
ولا لہ فی عرشہ جلیس

بابرکت ہے وہ جس کا کوئی ساتھی نہیں اور نہ عرش پر اس کا کوئی مصاحب ہے ۔

۱۔ ابن اثیر ج ۸ ص ۱۳۴

حنابلہ اور اہل حدیث نے جب یہ سنا ان پر حملہ کر دیا اور بُری طرح مارا پیٹا۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ابو جعفر اٹھے اور گھر میں چلے گئے۔ لیکن ان لوگوں نے ان کے گھر پر سنگ باری شروع کر دی یہاں تک کہ ان کے گھر میں پتھروں کا ایک ٹیلہ بن گیا۔ پولیس کا سربراہ نازوک دسیوں ہزار افراد کے ساتھ مجمع کو منتشر کرنے کے لئے آیا۔ ان لوگوں نے اس کا شعر جو اس نے دروازے پر لکھ رکھا تھا مٹا دیا اور اس کی جگہ احمد بن حنبل کی مدح و ستائش نیز اس کے تئیں دوسروں کے حسد سے متعلق اشعار لکھ دیئے۔ (۱)

۵ ـــــــ حنبلیوں سے طبری کی مخالفت عمر کے آخری ایام میں خصوصاً موت کے قریب ہونے کے بعد نسبتاً زیادہ شدید ہو گئی تھی ابن کثیر حنبلی نے لکھا ہے کہ طبری کو ان کے گھر میں ہی دفن کر دیا گیا کیونکہ حنابلہ میں سے کچھ عوام نے روز روشن میں ان کی تدفین کئے جانے سے منع کر دیا تھا . . . . اس سلسلہ میں یہ لوگ ابی بکر محمد ابن داود الظاہری (۲) سے متاثر تھے کیونکہ اس نے طبری پر اعتراض کرتے ہوئے ان پر رافضی ہونے کا الزام عائد کیا ہے۔ جب طبری دنیا سے رخصت ہوئے تو لوگ بغداد کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے اور ان کے گھر میں ہی ان کی نماز پڑھی۔ (۳)

طبری کے رات میں دفن کئے جانے کا مسئلہ دوسری روایتوں میں بھی موجود ہے اور اس کی وجہ ان پر شیعہ ہونے کا الزام بتایا گیا ہے۔(۴) ابن اثیر نے یہ بات اپنی کتاب "تجارب الامم" میں مسکویہ سے نقل کی ہے (۵)

ان روایتوں میں بھی کہ جن میں مخفیانہ طور پر ان کی تدفین کا انکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ کہہ کر کہ ان کے مرنے کی کسی کو خبر نہیں کی گئی تھی !! اور پھر بھی لوگ جمع ہو گئے: نادانستہ طور پر حقیقت واقعہ کو

۱۔ یاقوت ۔ "معجم الأدباء" جلد ۱۸ ص ۵۸۔

۲۔ وہ نام جو ابن کثیر نے لیا ہے صحیح ہے اور یہ شخص ۔ داؤد ابن علی، جس نے "ظاہری" مکتب فکر کی بنیاد رکھی ہے، کا فرزند تھا اگرچہ خود اس نے بھی یعنی محمد نے طبری کی رد میں ایک کتاب لکھی ہے الفہرست ص ۲۷۱ لیکن جو شخص طبری کا مدمقابل تھا ابو بکر بن ابی داود ہے جو صاحب سنن ابی داؤد کا بیٹا تھا۔ چنانچہ یہ بات یاقوت نیز دوسروں کی روایتوں سے ثابت ہے۔

۳۔ ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۱۴۶ و ۱۴۷ ۴۔ یاقوت "معجم الأدباء" جلد ۱۸ ص ۴۰

۵۔ ابن کثیر۔ جلد ۸ ص ۱۲۴۔ ۱۳۵

برملا کردیا گیا ہے ۔

۶ ________ اس ضمن میں ابن جوزی نے جو روایت نقل کی ہے اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے چنانچہ ثابت ابن سنان کی یہ روایت کہ طبری کے حالات مخفی رہ گئے کیونکہ عامہ روز روشن میں طبری کی تدفین سے مانع ہوئے اور ان پر رفض و الحاد کا الزام لگایا گیا ، نقل کرنے کے بعد ابن جوزی لکھتا ہے :

"اس پر رفض کی تہمت باندھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ (وضو میں) پاؤں دھونے کے بجائے اس کا مسح کرنے کا قائل تھا" اس کے بعد لکھتا ہے : ابوبکر بن ابی داؤد نے نصر الحاجب سے اس کی شکایت کی اور اس کی طرف ان چیزوں کی نسبت دی جن کا طبری نے انکار کردیا منجملہ ان کے اس پر جہمی[1] کے عقائد رکھنے کا الزام لگایا ۔ اس نے مزید کہا کہ ، طبری کا خیال ہے کہ آیت : "بل یداہ مبسوطتان" میں خدا کے ہاتھ نہیں بلکہ خدا کی نعمتوں کی طرف کنایہ ہے ۔ طبری نے اس کا انکار کیا اور کہا : میں نے نہیں کہا ہے (شاید مطلب یہ نہیں تھا کہ میرا اعتقاد یہ نہیں ہے) اسی طرح ابوبکر بن ابی داؤد نے یہ بھی کہا کہ ، طبری نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ : ۔

"ان روح رسول اللہ لما خرجت سالت فی کف علی فحساھا"

یعنی جب رسولؐ خدا کی روح جسد مبارک سے خارج ہوئی (چونکہ پیغمبرؐ اسلام کا سر حضرت علیؑ کے زانو پر تھا اور حضرت علیؑ کا ہاتھ بھی آپ کے زانو اور پیغمبرؐ اسلام کے سر مبارک کے درمیان تھا) علیؑ کے ہاتھوں پر جاری ہوئی اور علیؑ نے اس کو مل لیا ۔

پھر ابن الجوزی کہتا ہے کہ " فحساھا " نہیں ہے بلکہ " مسح بھا علی وجھہ " یعنی " علیؑ نے اسے اپنے چہرہ پر مل لیا " ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ حتی حدیث اس شکل میں بھی درست نہیں ہے ۔ اس کے بعد ابن جوزی لکھتا ہے ، ابن جریر نے نصر حاجب کو لکھا کہ : "لا عصابۃ فی الاسلام کھٰذہ العصابۃ الخسیسۃ" خست و کمینگی کے لحاظ سے اس گروہ (اہل حدیث) سے بدتر کوئی دوسرا گروہ موجود نہیں ہے ۔ ابن جوزی جو خود بھی ایک انتہا پسند حنبلی ہے اس کے بعد

۱: جہم بن صفوان خراسان میں حارث بن سریج کے ساتھیوں میں سے تھا جو ۱۲۸ھ میں قتل ہوا ، یہ شخص نفی تشبیہ کا عقیدہ رکھتا تھا : جہمی کے لقب سے متہم کرنا بھی ان اقدامات میں سے ہے جو اہل حدیث اپنے مخالفین کے ساتھ کیا کرتے تھے ۔

طبری پر حملہ کرتا ہے کہ اس نے گالی سے کام لیا ہے علمی بحث نہیں کی ہے ۔ (۱)
مذکورہ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حدیث کے ساتھ طبری کا رویہ بہت سخت رہا ہے اور جیسا کہ ہم مشاہدہ کر چکے ہیں ان کی مخالفت طبری کی شخصیت میں اخلاقی جرأت کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے ۔ طبری کی فکری زندگی کا یہ رخ ان کی زندگی کا اہم ترین باب ہے ۔
ان کی طرف "الرد علی الحرقوصیہ" (۲) نامی کتاب بھی منسوب کی گئی ہے جو حنبلیوں کی رد میں ہے ۔ (۳) اصل میں حرقوص بن زہیر خوارج کے ابتدائی لیڈروں میں سے رہا ہے اور اسی مناسبت کے تحت طبری نے حنبلیوں کو حرقوصیہ کے نام سے یاد کیا ہے کہ یہ لوگ حضرت علیؑ کی نسبت وہی عقیدہ رکھتے تھے جو خوارج کا عقیدہ تھا ۔ (۴) طبری کے مخالفین بھی ان پر یہی الزام عائد کرتے تھے کہ وہ اہل حدیث کی راہ سے ، کہ جو تنہا صحیح راہ ہے منحرف ہو گئے ہیں ۔ علمائے اہل حدیث میں سے ایک شخص نے طبری کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے ۔ (۵)

علیك باصحاب الحدیث فانهم — علی نهج للدین لازل معلما
وما الدین الا فی الحدیث واهله — اذا ما دجی اللیل البهیم واظلما

خاتمہ بخیر

خاتمہ بخیر کے عنوان سے ہم یہاں ایک روایت نقل کر رہے ہیں جو ایک طرف اہلبیت علیہم السلام

۱۔ ابن الجوزی ، المنتظم ، جلد ۶ ص ۱۷۲ ، نیز طبری جلد ۱۵ ص XACIX
۲۔ "بروکلمن" نے اس نام کی وجہ یہ لکھی ہے کہ احمد بن حنبل کے دادا کا نام حرقوص تھا لیکن بہر حال اس پر زور دیا ہے کہ یہ کتاب حنبلیوں کی رد میں لکھی گئی ہے (تاریخ الأدب العربی جلد ۳ ص ۵۰)
۳۔ نجاشی ص ۲۲۵
۴۔ اس قسم کی نسبت "لسان المیزان" میں لفظ یاقوت کے ذیل میں یاقوت حموی کی طرف بھی دی گئی ہے کہ وہ علیؑ سے متعلق خوارج کا ہم فکر تھا ۔
۵۔ طبری جلد ۱۵ ص LXXXVII

کی معنوی عظمت کی نشان دہی کرتی ہے دوسری طرف علم و دانش کے حصول میں طبری کی انتھک کوششوں اور محنتوں کا بھی پتہ دیتی ہے۔

نضر بن کثیر کہتا ہے: ساٹھ سال قبل یا اس سے بھی زیادہ کی بات ہے کہ میں سفیان ثوری کے ہمراہ جعفر ابن محمد صادق (علیہم السلام) کی خدمت میں گیا اور جعفر ابن محمد (امام صادق ؑ) سے کہا کہ میں حج کا قصد رکھتا ہوں مجھے کوئی دعا تعلیم فرمائیے۔ جعفر ابن محمد ؑ نے فرمایا: جب مسجد الحرام میں پہنچنا تو اپنے ہاتھوں سے دیوار کعبہ پکڑ کر کہنا:-

"یا سائق الفوت ویا سامع الصوت ویا کاسی العظام لحماً بعد الموت"

اس کے بعد جو کچھ چاہنا دعا کرنا ـــــ اس کے بعد سفیان ثوری نے جعفر ابن محمد ؑ سے کوئی بات کہی جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس وقت جعفر ابن محمد ؑ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:-

"یا سفیان اذا جاءك ما تحب فاکثر من الحمد لله و اذا جاءك ما تکره فاکثر من قول لاحول ولاقوة الا بالله واذا استبطئت الرزق فاکثر من الاستغفار"

اے سفیان! جب تم کو تمہاری پسند کی چیز ملے تو زیادہ سے زیادہ الحمد للہ کہو، اور جب ناپسندیدہ و مکروہ چیز آئے تو زیادہ سے زیادہ لاحول و لا قوۃ الا باللہ پڑھو اور جب رزق میں رکاوٹ پیدا ہو تو زیادہ سے زیادہ استغفار کرو۔

قاضی کا قول ہے: بنی فرات سے کچھ لوگوں نے اپنوں میں سے ایک شخص سے یا کسی اور سے نقل کیا کہ میں ابو جعفر طبری رحمہ اللہ کے پاس موجود تھا، اس کی موت سے کچھ دیر قبل یہ دعا جعفر ابن محمد ؑ کی زبانی اس کے سامنے نقل کی گئی، طبری نے قلم و دوات اور کاغذ طلب کیا اور یہ روایت نقل کر لی۔ لوگوں نے اس سے کہا: یہ لکھنے کا کون سا موقع ہے؟

طبری نے جواب دیا: "ینبغی للانسان ان لا یدع اقتباس العلم حتی یموت"

"انسان کے لیے یہی سزاوار ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحہ تک تحصیل علم سے منہ نہ موڑے"۔

(باقی آئندہ)

اسلام کی جامعیت

اسلام ایک ایسا دبستان ہے جو غیر توحیدی دبستانوں کے برخلاف تمام فردی واجتماعی، مادّی ومعنوی، سیاسی وثقافتی۔ فوجی واقتصادی امور میں دخیل ہے۔ یہ انسان اور معاشرہ کی تربیت اور اس کی مادّی ومعنوی ترقی میں موثر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔

(وصیت امام خمینیؒ سے اقتباس)

اسلامی،
علمی،
فکری،
دو ماہی رسالہ

جلد ۷ شمارہ ۲
رجب - شعبان ۱۴۱۰ھ
فروری - مارچ ۱۹۹۰ء

توحید

مقاصد

کلمة التوحید و توحید الکلمة

- قرآن و سیرت و سنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری، سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپے
ہندوستان	۷۵ روپے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۶ ڈالر

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ - ادارہ۔

خطاطی و [illegible] : صادق علی [illegible]

توحید

جلد - شمارہ -

ترتیب

شذرہ

قرآن

فکر و فلسفہ •

رجب۔شعبان ۱۴۱۰ھ   فروری۔مارچ ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرہ

شب انتظار

منجی بشریت حضرت بقیۃ اللہ الاعظم امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف وہ متفق علیہ شخصیت ہیں جنھیں شیعہ سنی دونوں جانتے ہیں۔ دنیا سے ظلم و ستم فساد و تباہی کے خاتمہ اور عدل و انصاف، مہر و محبت کی فضا قائم ہونے کے سلسلہ میں آپ کی ذات سے لو لگائے ہوئے دونوں ہی فرقے اپنے اپنے طور پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ایک آپ کے پردہ غیبت سے نکلنے کا انتظار کر رہا ہے تو دوسرا آپ کی ولادت کا۔

ہر مسلمان ایک ایسے شخص کے انتظار میں گھڑیاں شمار کر رہا ہے جو مرسل اعظم کے خاندان میں سے ہے اور خداوند عالم کے حکم سے اس دنیا میں آکر پوری دنیا پر علم و عدل کی حکومت قائم کرے گا۔ اخوت و برادری ہمدردی و محبت کی بنیادوں کو مستحکم بنا کر سسکتی ہوئی انسانیت کو نجات دے گا۔ اس کے دور میں انسان مصیبتوں، پریشانیوں اور الجھنوں سے آزاد ہو جائے گا

قرآن کریم اس تابناک مستقبل کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اللہ انھیں اسی طرح زمین کی خلافت و حکومت عطا کردے گا جس طرح ان سے پہلے کے (مومن و صالح) لوگوں کو نواز چکا ہے۔ اللہ کے پسندیدہ ان کے دین کو مستحکم بنا دے گا ان کی پریشانیوں سے چھٹکارا اور خوف و ہراس کو سکون و اطمینان

سے بدل دے گا۔ اس وقت یہ لوگ صرف خدا کی پرستش کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہیں دیں گے۔

☆☆☆

انتظار تو سبھی کر رہے ہیں۔ سب کو ایک مصلح کا انتظار ہے۔ لیکن انداز ذرا بدلا ہوا ہے۔ اگر کچھ منتظر ایسے ہیں جو اپنے آنے والے قائد اور اپنے پسندیدہ معاشرہ کے قیام کے لئے زمین ہموار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں تو کچھ ایسے بھی ہیں جو تمام اصلاحات کی ذمہ داری اپنے موعود پیشوا پر ڈال کر خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس کے انتظار کا نعرہ بلند کرتے رہنا ہی اپنا واحد فریضہ تصور کرتے ہیں اور بعض تو اتنے ستم ظریف ہیں جو امام (عج) کی آمد سے پہلے ہر قسم کے اصلاحی اقدام کو ظہور امام (عج) کی راہ میں رخنہ اندازی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا میں جتنا فسق و فجور بڑھے گا، جتنا ظلم و ستم میں اضافہ ہوگا اتنی ہی حضرت (عج) کے ظہور میں تعجیل ہوگی!!

کون سی تعبیر درست ہے؟ پہلی، دوسری یا تیسری؟ ہمارے ائمہ معصومین[ع] نے کس قسم کے انتظار کی دعوت دی ہے؟ مثبت انتظار یا منفی انتظار؟

جب ہم اپنی گذشتہ تاریخ اور اپنے ائمہ اطہار کی سیرت و سنت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ ہمارے انتظار کو منفی انتظار سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہمارا انتظار ولولہ انگیز، ہلچل آفرا اور آزادی بخش انتظار ہے۔ یہ وہ انتظار ہے جس نے ہمارے معاشرہ کو اس طویل اور پر پیچ تاریخ میں شدید مخالفتوں اور عظیم مصیبتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ ترقی سے نہیں روکا بلکہ اسے شاہراہ ترقی پر گامزن بھی کیا اور اس کی بقا کا راز بھی یہی انتظار ہے۔

یہ وہ انسان ساز انتظار ہے جو ایک مردہ و بے جان ملت سے ایک زندہ قوم، پریشان حال و نامنظم معاشرہ سے منظم و خوش حال سماج، افسردہ انسانوں سے خوش و خرم انسان، غیر مطمئن و پر آشوب بشریت سے مطمئن و پرسکون انسانیت، تاریخ کے تاریک مستقبل سے تاریخ کا تابناک مستقبل بناتا ہے۔

امام جعفر صادق[ع] سچے انتظار کرنے والوں کے اوصاف اور ان کی کیفیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو لوگ قائم آل محمد (عج) کی حکومت کے انتظار میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ان لوگوں کے مانند

ہیں جو حضرت (عج) کے ہمرکاب ہیں ....

بلکہ ان لوگوں کے مانند ہیں جو آپ کے ہمراہ راہ خدا میں شمشیر زن ہیں ... نہیں بلکہ خدا کی قسم وہ ان شہیدوں کے مانند ہیں جنھوں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں پیغمبر اسلامؐ کی رکاب میں قربان کردی۔

اس ذریعے بہانے، انتظار کے چہرے سے نقاب اٹھادی۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ سچے منتظر صدر اسلام کے مومنین اور عصر ظہور کے مجاہدین جیسے ہیں۔ انھیں صدر اسلام کے مجاہدوں کی طرح اپنے دور کے جاہلی ماحول میں، بنی آدم کو تباہی و بربادی کے دہانے سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیئے۔ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھرنے کے لئے جد وجہد کرنی چاہیئے۔ ظالم سے مظلوم کا حق دلانے کے لئے جہاد کرنا چاہیئے۔ مظلوم کا ساتھی اور ظالم کا دشمن ہونا چاہیئے۔ معاشرہ کو الٰہی اور اسلامی حکومت کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ عدل وانصاف کے قیام اور ظلم وستم کے خاتمہ کے لئے آخری حد امکان تک سعی کرنی چاہیئے، مختصر یہ کہ حضرت مہدی (عج) کی غیبت کے اسباب و علل کو دور کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دینی چاہیئے۔

امام صادقؑ ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

"جو شخص ہمارے امر (حکومت) کا منتظر ہے وہ اس شخص کے مانند ہے جو راہ خدا میں اپنے خون میں غوطہ ور ہو۔"

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں "ظہور کا انتظار ظہور کا جزو ہے" یعنی ایک باخبر، ہوشیار اور سچے منتظر کا فرض ہے کہ زمانۂ غیبت میں ایسے کردار کا حامل ہو گویا خود حضرت مہدیؑ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ان حدیثوں سے پیغمبر اسلامؐ کے اس قول کا مفہوم اور اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "میری امت کا بہترین عمل ظہور کا انتظار ہے"

☆☆☆

ایک مثال کے ذریعہ بات اور واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے ایک بہت بڑی فوج کا سربراہ کسی معقول ضرورت کے تحت کسی نامعلوم نقطہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ واپسی کا وقت معین نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور بتا جاتا ہے کہ میری واپسی کے بعد فیصلہ کن اور گھمسان کی جنگ ہوگی۔ مجھے سچے جانباز اور وفادار سپاہیوں کی ضرورت ہوگی۔ سچ بتلائیے ایسے میں اس کے چاہنے والے سپاہیوں کا کیا فریضہ ہوگا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے اونگھتے رہیں گے یا اپنے کو پوری طرح چوکس رکھیں گے کہ سردار لشکر کے آتے ہی بلاجھجک اس کے ایک اشارہ پر سر دھڑ کی بازی لگا دیں؟ ہر ذی شعور انسان یہی کہے گا کہ فوج کو نہ صرف اپنی سابقہ طاقت بحال رکھنا چاہیئے، بلکہ دشمن

کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں اسے بھی اپنی طاقت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ ایک بیدار، ذی شعور اور وفادار فوج شب و روز اپنے سردار کی کامیابی کے لئے زمین ہموار کرنے میں مشغول رہے گی۔ اگر اشکوں سے لبریز آنکھوں اور مشتاق دلوں کے ساتھ اپنے سردار کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوگی تو اپنے سارے امکانات کو بروئے کار لا کر خود کی تربیت اور اپنے کو سردار کی خدمت کے لائق بنانے میں مصروف بھی ہوگی۔ وفادار فوج یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ وہ غفلت کی نیند سوتی رہے یہاں تک کہ خود سالار لشکر واپس آکر تمام مسائل حل کرے اور ہم آرام سے بیٹھے صرف اس کی محبت کا راگ الاپتے رہیں۔ جنگ وہ کرے فاتح ہم کہلائیں جہاد وہ کرے آزادی ہمیں ملے۔ میدان میں وہ جائے عزت کا تاج ہم پہنیں۔ جام شہادت وہ پئے زندگی جاوید ہمیں ملے... اسی لئے کہا گیا ہے کہ "کسی مصلح کا انتظار کرنے والی قوم کو خود بھی صالح ہونا چاہیئے"۔

ہم شیعوں میں جو یہ رسم ہے کہ حضرت قائم آل محمد (ع) کا نام سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ہم ہر وقت آمادہ ہیں۔ حضرت کے ہر اشارہ پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔

☆☆☆

آج اگر ہمارا انتظار سچا انتظار ہے تو ہم کو صالح فرد اور صالح قوم ہونا چاہیئے۔ ہمارے وجود کے ہر ہر ذرہ کو ظہور مہدی (ع) کے لئے چشم براہ ہونا چاہیئے، ہمارا کردار و گفتار، ہمارا قول و فعل "مہدی پسند" ہونا چاہیئے[۵]
صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔ اٹھتے بیٹھتے حضرت (ع) کا نام لینا اور متعلقہ دعاؤں کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ زبان سے آپ کے ظہور کی تمنا اور عمل سے آپ کے ظہور کے لئے رکاوٹیں کھڑی کرنا یہ محبت نہیں منافقت ہے، یہ انتظار نہیں دھوکا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم امام (ع) کے ظہور کا انتظار کر رہے ہوں اور اس حکومت و انقلاب سے لاپرواہ یا خدانخواستہ اس کے مخالف ہوں جو آپ کی عالمی حکومت کے لئے میدان ہموار کر رہا ہو۔ خواجہ نصیر الدین کے بقول "حضرت (ع) کی غیبت کا سبب ہم ہیں"

ہم نے اسلامی تعلیمات کو فراموش کر کے اپنے زمانہ کے امام (ع) اور ان کے نظام حکومت کو نہ پہچان کر ایک ایسا ماحول اور معاشرہ تیار کیا ہے جس میں آپ کے مقدس وجود کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔[۵]

آئیے ہم اس امام (ع) کی معرفت حاصل کریں۔ اس کی غیبت کے راز کو سمجھیں۔ اس کی حکومت کے نظام سے آشنا ہوں اور سب مل کر یہ عہد کریں کہ اسلام کے قوانین پر عمل نیز اپنی اور اپنے سماج کی اصلاح کر کے امام (ع) کے ظہور کی راہ ہموار کریں گے۔

جناب مرتضیٰ حسین صدرالافاضلؒ

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ نساء : ۲۰-۲۳

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ
اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ
قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ
اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ
اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝

ترجمہ

اور اگر تم یہی ارادہ کر لو کہ موجودہ بیوی کے بجائے دوسری بیوی لاؤ۔ اور اس بیوی کو (مہر میں) بڑی بھاری رقم دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم وہ مال بہتان اور برملا گناہ کے ذریعے لے لو گے؟ (۲۰) اور تم مہر کیسے لو گے! حالانکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے

اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط پیمان بھی حاصل کر لیا ہے

﴿۲۱﴾

تفسیر

۲۰ ———— وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ.....

قِنطَار : سونے چاندی کا ڈھیر، بوری بھر کر مال

میثاق غلیظ : پختہ عہد و پیمان اور بروایت امام محمد باقر علیہ السّلام میثاقِ غلیظ سے مراد شوہر سے یہ معاہدہ ہے کہ " امساک بمعروف اور تسریح باحسان" کی پابندی ہوگی، رکھے گا تو حسنِ سلوک کے ساتھ، چھوڑے گا تو احسان کے ساتھ (نور ثقلین)

گذشتہ آیت میں " فَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ "، کھلی برائی کو جرمانہ وصول کرنے کی ایک راہ بتایا ہے۔ اس آیت میں اس کی پوری حقیقت بیان ہو رہی ہے۔

مہر، ھدیۂ محبت ہے واپس نہیں لیا جا سکتا۔

ایک رسم تھی کہ پہلی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے اس سے جتنا دیا ہوا مہر وصول کر سکتے تھے اینٹھ لیتے تھے، پھر دوسری شادی کرتے تھے پھر وہی حاصل کردہ رقم یا اس میں کچھ ملا کر نئی بیوی کو مہر ادا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اگر وہ عورت سختی کرتی تو اس پر نافرمانی، بداخلاقی حتیٰ کہ بدکاری کا الزام لگانے سے گریز نہ کرتے تھے۔ وہ عورت جان چھڑانے اور عزت بچانے کی خاطر رد کا مطالبہ بلول ناخواستہ منظور کر لیتی تھی۔ اسلام نے اس ظالمانہ رویہ کے خلاف عورت کی حمایت کی اور مردوں کو اس غلط کاری سے روکا۔

جب ایک عورت تم سے شادی کر چکی اور تم نے اس کا حق دے دیا، قانون نے اس پیمان کو جائز قرار دے دیا تو اب نکاح باقی رہے یا طلاق کی نوبت آجائے کسی شوہر

کو دیا ہوا مہر پورا یا جزوی واپس لینے کا حق نہیں۔ زبردستی اور الزام تراشی و بہتان طرازی کر کے لینا اور ظالمانہ برتاؤ کرنا جائز نہیں ہے۔ عورت اس لئے نہیں ہے کہ وہ ظلم کا نشانہ بنائی جائے۔ ہرگز یہ جائز نہیں۔ گناہ عظیم ہے۔

۲۱ ـــــــ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ ۔۔۔۔

مہر، قدردانہ خلوص وفا ہے۔ اس کی واپسی کا خیال۔ مرد کی دون ہمتی اور خلاف دانش بات ہے۔ بھلا کوئی صاحب عقل و ہوش پیام محبت اور باہمی اُلفت و موانست، لُطف اندوزی و یگانگت کے بعد جلوت و خلوت میں سب کچھ کر گزرنے کے باوجود، یوں آنکھیں پھرا سکتا ہے؟ اور باہمی عہد و پیمان اس طرح پامال کر سکتا ہے کہ ایک محبوب کو چھوڑتے وقت اس کی ملکیت سے کچھ حاصل کرے اور بندھن توڑنے کے لمحے اس قدر ہلکے پن پر اُتر آئے۔ اسلام اور انسانیت ایسے فرد کو ہرگز قبول نہیں کرتی۔

پہلی آیت میں "إِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ" اور دوسری آیت میں "وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ" بڑی نفیس تعبیریں ہیں۔ جن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ شوقیہ بیوی بدلنے کا ارادہ ہے پھر بھی پہلی رفیقۂ حیات کے مال پر نظر ہے۔ کتنی بُری بات ہے۔

اور مہر پر نظر اس وقت لگی، جب تنہائیوں میں سب کچھ کرتے رہے، دل و جان ایک ہونے کے بعد، یہ سوچنا کس قدر گھناؤنا کام ہے۔

وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ
سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا

ترجمہ

اور نکاح نہ کرو ان عورتوں سے جن سے تمہارے باپ

(دادا) نے نکاح کئے ہوں۔ مگر وہ جو پہلے ہو چکے یہ عمل
بے ہودہ اور غضب الٰہی کا باعث اور بُرا راستہ تھا (۲۲)

تفسیر

یہ رسم بد بھی قابل گرفت تھی کہ بیٹے اپنے باپ دادا کی منکوحہ سے نکاح کر لیتے تھے۔ چنانچہ مدینے میں ایک ایسے معاملے کی آں حضرتؐ کو اطلاع دی گئی۔

شان نزول

ابو قیس بن سلت انصاری فوت ہوئے تو ان کے بیٹے نے اپنی سوتیلی ماں کبیشہ بنت معن سے نکاح کرنے کی ٹھانی، کبیشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا کر کہا کہ اسے نہ تو شوہر کی میراث سے اس کا حصہ دیا گیا ہے نہ گھر والے آزادی دیتے ہیں ابو قیس کا بیٹا تو اس سے نکاح کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس پر یہ وحی آئی۔

حکم ہوا کہ سوتیلی ماں (ہو یا دادی، نانی) سے خبردار نکاح نہ کرنا، اس سے معاشرتی اور عائلی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ فحش کام ہے کہ باپ کی ہتک حرمت کی جائے۔ نفرت غضب کا باعث ہے، ایسے رشتے کے فرزند کو "مقیت" کہا جاتا تھا۔ یہ عمل بے راہ روی ہے

حُرِّمَتْ

عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ
وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ
اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ
نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ
اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

ترجمہ

تم پر حرام کی گئی ہیں : تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں۔ اور بھائی کی لڑکیاں اور بہن کی لڑکیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری وہ مادر جلو لڑکیاں جو تمہاری گودیوں میں تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن بیویوں سے تم نے ہم بستری کی لیکن اگر تم نے ہم بستری نہیں کی تو ان کی لڑکیوں سے (نکاح میں) کوئی گناہ نہیں۔ اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں۔ اور دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا۔ مگر جو ہو چکا وہ ہو چکا بے شک اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۳)

تفسیر

محرم عورتیں :۔

خواتین کو نکاح کرنے نہ کرنے کے لحاظ سے دو ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ نامَحْرَم ۔ اور مَحْرَمْ ۔ مراد وہ عورت جس سے عقد حرام ہے۔ جمع ہے مَحَارِم ۔ اس ایک آیت میں مَحَارِم کو جمع کر دیا گیا ہے۔ گذشتہ آیات میں جائز نکاح اور غلط انداز طلاق، پھر سوتیلی ماں سے حرمتِ نکاح کا بیان تھا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ عورتیں کون ہیں جن سے نکاح نہیں کیا جا سکتا محارم کی مجموعی صورت دیکھ کر ان کی منطقی تقسیم یوں کی گئی ہے :

(۱) ــــ ولادت ــــ نسبی رشتہ ۔

(۲) ــــ دودھ شریک ــــ رضاعی رشتہ ۔

(۲) ـــــ ازدواج ـــــ سببی رشتہ ـ

(۱) ـــــ نسبی رشتے کی بنا پر درج ذیل عورتوں سے نکاح حرام ہے ۔

(الف) ـــــ اُمَّہَاتُکُم :-

(i) خود اس شخص کی ماں اور ماں کی ماں ۔ (ii) دادی، پردادی، سکڑدادی اوپر تک ۔۔ (iii) نانی، پرنانی، سکڑنانی اوپر تک۔

(ب) ـــــ بَنَاتُکُم :-

(i) اس شخص کی بیٹی ۔ (ii) نواسی، کوانسی نیچے تک ۔ (iii) پوتی، پروتی نیچے تک ۔

(ج) ـــــ اَخَوَاتُکُم :-

(i) حقیقی بہن ۔ (ii) پدری بہن ۔ (iii) مادری بہن ۔

(د) ـــــ عَمَّاتُکُم ۔ پھوپھیاں :-

i باپ کی حقیقی بہن ۔ ii باپ کی پدری بہن ـــ iii باپ کی مادری بہن ـــ اوپر تک ۔

(ھ) ـــــ خَالَاتُکُم ۔ خالائیں :-

(i) ماں کی حقیقی بہن (ii) ماں کی پدری بہن (iii) ماں کی مادری بہن ـــ اوپر تک ۔

(و) ـــــ بَنَاتُ الاَخِ ۔ بھتیجیاں :-

(i) بھائی کی لڑکی (ii) بھتیجی کی لڑکیاں ۔ نچلی کڑی تک (iii) بھتیجے کی لڑکی ، نچلی کڑی تک ۔

(ز) ـــــ بَنَاتُ الاُختِ ۔ بھانجیاں :-

(i) بہن کی لڑکیاں (ii) بھانجیوں کی لڑکیاں ـــ آخری کڑی تک (iii) بھانجے کی لڑکیاں ، نچلی کڑیوں تک

(۲)____ دودھ شریک = رضاعت :-

وہ رشتے جو دودھ پینے پلانے کے ذریعے قائم ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارک ہے :-

یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ۔

دودھ پینے کے رشتے سے بھی وہی محارم ہیں جو نسب سے محارم ہیں۔

رضاعت

دودھ پلانا۔ اصطلاحِ فقہ میں : کسی ایسی خاتون کا کسی بچے کو دودھ پلانا جس کے موجود شوہر سے اسے حمل ہو یا اس کا بچہ آغوش میں ہو۔ اس شوہر سے نکاح دائم ہو یا منقطع۔

بچہ اتنا دودھ پیے کہ اس کی ہڈیاں مضبوط اور گوشت پیدا ہو۔ دودھ پینے والا بچہ دو سال یا اس سے کم ہو۔ لیکن یہ گفتگو صرف تعارفی ہے۔ اصل احکام و حدود کتبِ فقہ میں دیکھنا ضروری ہے۔

رضاعت شرعی ثابت ہونے کے بعد :-

(۱)____ امہاتکم اللاتی ارضعنکم :-

دودھ پلانے والی ماؤں سے نکاح حرام ہے۔ اس سلسلے میں نسبی ماں کا سلسلہ دیکھئے۔

(۲)____ واخواتکم من الرضاعۃ تمہاری رضاعی بہنیں

یعنی نسبی اور رضاعی دونوں طرح کی بہنیں، اور ان کی اولاد حسب تفصیل کتب فقہ۔

(۳)____ ازدواجی رشتے :-

اس سلسلے میں چار قسموں کا تذکرہ ہے۔

(الف)____ وامہات نسائکم :-

بیویوں کی مائیں ۔ بیوی نکاحی ہو یا تماعی۔ ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو ۔ ماں رضاعی ہو یا نسبی حسب تفصیل کتبِ فقہ۔

(ب) ــــــ وَرَبَائِبُكُم :-

بیویوں کی لڑکیاں ۔ یعنی پہلے شوہر کے صلب کی لڑکی ، اس لڑکی کی لڑکی نچلی کڑی تک ۔ پہلے شوہر کے لڑکے کی لڑکی نچلی کڑی تک ۔

ــــــ من نسائکم الّٰتی دخلتم بھنّ : ــــــ

یہ حرمت اس وقت نافذ ہو گی جب اس بیوی سے ہم بستری کی ہو۔ بہ تصریح بعد :

ــــــ ان لم تکن دخلتم بھنّ : ــــــ

اگر ان سے ہم بستری نہ کی ہو تو ان رشتوں پر پابندی نہیں ہے

(ج) ــــــ حلائل ابنائکم :

اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں ، پوتے کی بیویاں ، نواسے کی بیویاں ۔ اسی طرح نچلی کڑیوں تک ۔ اس طرح منہ بولے بیٹے کی بیوی کے لئے حکم حرمت نہیں ہے ۔

(د) ــــــ وأن تجمعوا بین الاُختین

ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں لانا اور زوجیت میں رکھنا ۔ دونوں بہنیں ، حقیقی ہوں ، یا پدری یا مادری یا رضاعی۔

ــــــ اِلّا مَا قَدْ سَلَفَ ، ــــــ

اس قانون سے پہلے جو ہو چکا اسے نظر انداز کر دیا گیا ۔ یہ اس لیے کہ قانون جاری کرنے والا حاکم ، اللہ عزّ اسمہٗ غفور و رحیم تھا اور ہے ۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترجمہ: جناب ابوجواد

اسلامی علوم کا تعارف

عرفان

(۱)

عرفان اور تصوف

ایک وہ علم جس نے اسلامی ثقافت کے دامن میں آنکھیں کھولی ہیں اور اسی کے سایہ میں پروان چڑھا ہے، علم عرفان ہے۔

عرفان کے بارے میں دو پہلوؤں سے بحث و گفتگو کی جاسکتی ہے: ایک سماجی پہلو سے اور دوسرے ثقافتی پہلو سے۔

مفسروں، محدثوں، فقیہوں، متکلموں، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں اور اسلامی ثقافتی طبقات سے تعلق رکھنے والے اسی قسم کے دیگر افراد سے "عرفا" کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ ثقافتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے عرفان نامی ایک علم کی داغ بیل ڈالی ہے، بڑے بڑے دانشور ان کے یہاں پیدا ہوئے ہیں اور بڑی اہم کتابیں تالیف کی ہیں ان سب کے باوجود انھوں نے اسلامی دنیا میں ایک ایسے سماجی فرقہ کی بنیاد بھی رکھی ہے، جس کے خود اپنے مخصوص اصول ہیں۔ جبکہ فقہا و حکما جیسے دیگر ثقافتی حلقوں نے ایسا نہیں کیا ہے انھوں نے کوئی سماجی طبقہ تیار نہیں کیا۔ ان کا تعلق صرف اور صرف ثقافت سے ہے انھیں دوسروں سے الگ کوئی فرقہ نہیں کہا جاتا۔

اہل عرفان کا تذکرہ جب ان کے ثقافتی پہلو کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے تو انھیں "عرفا" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جب ان کا سماجی پہلو مقصود ہوتا ہے تو عام طور سے انھیں "صوفیا" کا لقب دیتے ہیں۔

عرفا و صوفیا کو اگرچہ اسلام کے اندر ایک مذہبی فرقہ نہیں سمجھا جاتا اور خود وہ لوگ بھی اس قسم کی تفریق کے دعویدار نہیں ہیں اور یہ حضرات تقریباً تمام اسلامی فرق و مذاہب میں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسا سماجی گروہ تشکیل دے رکھا ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ کچھ مخصوص افکار و نظریات، یہاں تک کہ نشست و برخاست، میل جول خانقاہوں میں سکونت، سر و صورت کی آرائش اور کپڑے وغیرہ پہننے میں کچھ مخصوص آداب و رسوم کی رعایت نے انھیں ایک مخصوص مذہبی و اجتماعی فرقہ کا رنگ دے دیا ہے۔

البتہ ہمیشہ اور ہر دور میں کچھ ایسے عرفا بھی گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں ___ خاص طور سے شیعہ مذہب میں ___ جو ظاہری طور پر دوسروں سے کوئی فرق نہیں رکھتے، جبکہ وہ عرفانی سیر و سلوک کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ سچے اور حقیقی عارف بھی افراد ہیں، نہ کہ وہ ٹولیاں جنھوں نے سیکڑوں آداب و رسوم گڑھ کر بدعتیں ایجاد کی ہیں۔ اسلامی علوم کے کلیات سے متعلق ان دروس میں ہمیں عرفان کے اجتماعی فرقہ جاتی یا درحقیقت اس کے تصوفی پہلو سے کوئی سروکار نہیں، ہم صرف اس کے ثقافتی پہلو کا جائزہ پیش کریں گے۔ یعنی ہم عرفان کو ایک علم اور اسلامی ثقافت کی ایک شاخ کے عنوان سے مورد بحث قرار دے رہے ہیں۔ ایک طریقہ اور روش کے لحاظ سے نہیں جس کی ایک سماجی فرقہ پیروی کرتا ہے۔

اگر ہم اجتماعی پہلو سے بحث کرنا چاہیں تو اس فرقہ کے وجود میں آنے کے اسباب و علل، اسلامی معاشرہ میں اس کے مثبت یا منفی، مضر یا مفید اثرات، اس فرقہ اور دیگر اسلامی فرقوں کے درمیان رونما ہونے والے عمل و رد عمل، اسلامی معاشرہ پر اس کے نقوش اور دنیا میں اسلام کی نشر و اشاعت میں اس کے کردار کا جائزہ لینا ضروری ہوگا لیکن سر دست ہم ان مسائل کو نہیں چھیڑنا چاہتے۔ فی الحال عرفان کے بارے میں ہماری بحث ایک علم اور ایک ثقافتی شعبہ کی حیثیت سے ہے۔

ایک علمی و ثقافتی مجموعہ کی حیثیت سے عرفان کے دو شعبہ ہیں: عملی شعبہ اور نظری

شعبہ عملی شعبے سے مراد وہ حصہ ہے جو انسان کے کائنات، خدا اور خود اپنے ساتھ روابط و فرائض کو بیان اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔

اس شعبہ میں عرفان کی حیثیت، اخلاق جیسی ہے یعنی وہ کچھ تھوڑے سے فرق کے ساتھ — جسے ہم بعد میں بیان کریں گے — ایک عملی علم ہے۔

عرفان کے اس حصہ کو "سیر و سلوک" کا علم کہا جاتا ہے۔ اس حصہ میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ "سالک" کو انسانیت کی بلندترین چوٹی یعنی "توحید" تک پہنچنے کے لئے کہاں سے سفر شروع کرنا چاہیئے نیز ترتیب وار کن منازل و مراحل کو طے کرنا چاہیئے اور درمیان راہ مختلف منزلوں میں اسے کیسے کیسے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور کس کس طرح کے واردات اس پر طاری ہوں گے۔ البتہ ان تمام مرحلوں اور منزلوں کو ایک ایسے باتجربہ انسانِ کامل کی نگرانی میں طے کرنا چاہئے جو پہلے اس وادی سے گذر چکا ہو اور ان منزلوں کے آداب سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر سر پر کسی انسانِ کامل کا سایہ نہ ہو تو گمراہی کا خطرہ سامنے ہے۔

عرفا نے اس انسان کامل کو جس کی مصاحبت و پیروی "نئے راہیوں" کے لئے ضروری ہے کبھی "طائرِ قدس" سے تعبیر کیا ہے اور کبھی "خضر" سے

همتم بدرقه راه کن ای "طائر قدس" — که دراز است ره مقصد و من "نوسفرم"

ترک این مرحله بی همرهی "خضر" مکن — ظلمات است بترس از خطر گمراهی

البتہ وہ توحید جسے عارف، انسانیت کی بلندترین چوٹی تصور کرتا ہے اور جو عارف کی سیر و سلوک کا آخری مقصد و ہدف ہے عام افراد کی توحید حتیٰ کہ فلسفیوں کی توحید — یعنی واجب الوجود صرف ایک ہے — سے بالکل مختلف ہے۔ ان دونوں توحیدوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

عارف کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ موجودِ حقیقی صرف خدا ہے، خدا کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "نمود" ہے "بود" نہیں۔ پرتو اور جلوہ ہے، ہستی و وجود نہیں۔ عارف کی توحید کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"۔

عارف کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان راستوں کو طے کر کے اس منزل پر پہنچ جائے جہاں خدا کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

توحید کے اس مرحلہ کو عارفوں کے مخالف تسلیم نہیں کرتے اور بعض اوقات اسے کفر و الحاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن عرفا کا خیال ہے کہ حقیقی توحید تو بس یہی ہے۔ اس کے علاوہ توحید کے دیگر تمام مراتب شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اور ان کے خیال میں اس مرحلہ تک رسائی عقل و فکر کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ دل، مجاہدت، سیر و سلوک اور تصفیہ و تہذیب نفس کا کام ہے۔

بہر کیف عرفان کا یہ شعبہ عملی عرفان کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے وہ علم اخلاق کے مانند ہے جہاں "کیا کرنا چاہیئے" کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ :-

اولاً : عرفان، انسان کے خدا، کائنات اور خود اپنے آپ سے تعلقات کے بارے میں بحث کرتا ہے اور زیادہ تر اس کی توجہ انسان اور خدا کے روابط پر مرکوز ہے، جبکہ تمام اخلاقی نظام، انسان اور خدا کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کے بارے میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے صرف مذہبی اصولوں پر استوار اخلاقی نظام ہی اس طرف توجہ دیتا ہے۔

ثانیاً : عرفانی سیر و سلوک ــــ جیسا کہ ان دونوں لفظوں کے مفہوم سے واضح ہے ــــ متحرک ہے، جبکہ اس کے برخلاف اخلاق ساکن ہے۔ یعنی عرفان میں ایک نقطہ آغاز، ایک مقصد اور ان منازل و مراحل سے گفتگو کی جاتی ہے جنھیں منزل آخر تک پہنچنے کے لئے سالک کو ترتیب وار طے کرنا ہوتا ہے۔

عارف کی نگاہ میں، کسی قسم کے مجاز کے ہلکے سے شائبہ کے بغیر سچ مچ انسان کے لئے ایک "صراط" ہے جس سے گزرنا اور منزل بہ منزل اسے طے کرنا ضروری ہے اور پچھلی منزل طے کئے بغیر اگلی منزل تک رسائی ناممکن ہے

چنانچہ عارف کی نگاہ میں انسان کی روح کی مثال ایک پودے یا ایک بچے جیسی ہے اور اس کا کمال وارتقاء یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص نظام کے تحت رشد و نمو کے مراحل طے کرے۔ لیکن اخلاق میں صرف صداقت، امانت، عدالت، عفت، احسان، انصاف اور ایثار وغیرہ جیسی کچھ فضیلتوں سے بحث کی جاتی ہے کہ روح کو ان اوصاف سے آراستہ و پیراستہ ہونا چاہیئے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے انسان کی روح اس گھر کے مانند ہے جسے نقش و نگار اور کچھ دوسرے سامان آرائش سے صرف سجا دیا جانا چاہیئے، اس میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں ہے کہ کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم کیا جائے،

چھت سے شروع کریں یا دیوار کے اوپری حصے سے یا نچلے حصے سے؟ جبکہ اس کے برعکس عرفان میں: اخلاقی عناصر کو متحرک شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ثالثاً: اخلاق کے روحی عناصر صرف ان ہی معانی و مفاہیم تک محدود ہیں جنھیں عام طور سے پہچانتے ہیں جبکہ عرفان کے روحی عناصر اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔

عرفانی سیر و سلوک میں کچھ قلبی واردات و احوال کا تذکرہ ہوتا ہے جو مجاہدات اور سفر کے دوران صرف "سالکِ راہ" پر طاری ہوتے ہیں۔ دوسرے افراد ان احوال و واردات سے بے بہرہ ہیں۔

عرفان کا ایک دوسرا شعبہ تفسیر وجود یعنی خدا، انسان اور کائنات کی تفسیر سے تعلق رکھتا ہے اس شعبہ میں عرفان کی حیثیت، فلسفہ جیسی ہے۔ وہ وجود و ہستی کی تفسیر کرنا چاہتا ہے، یہ اس پہلے شعبہ کے برخلاف ہے جو اخلاق کی طرح انسان کو بدلنا چاہتا ہے۔ جس طرح پہلے شعبہ میں اور اخلاق میں فرق تھا اسی طرح اس دوسرے شعبہ اور فلسفہ میں بھی کچھ تفاوت پایا جاتا ہے جسے ہم آئندہ درس میں بیان کریں گے۔

(۲)

نظری عرفان

اب عرفان کے دوسرے شعبہ یعنی نظری عرفان کے سلسلہ میں کچھ وضاحت ملاحظہ فرمائیں:

نظری عرفان وجود و ہستی کی تفسیر کرتا ہے۔ خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

عرفان اس شعبہ میں الٰہی فلسفہ کے مانند ہے جو وجود و ہستی کی تفسیر و تشریح کرتا ہے۔

جس طرح الٰہی فلسفہ اپنے موضوع، مقدمات اور مسائل کا تعارف کراتا ہے، عرفان بھی اپنے موضوع مسائل اور مقدمات کی وضاحت کرتا ہے۔ بات یہ ضرور ہے کہ فلسفہ اپنے استدلالوں میں صرف عقلی اصول و مبادی پر بھروسہ کرتا ہے جبکہ عرفان "کشفی" اصول و مبادی کو استدلال کی بنیاد قرار دیتا ہے اور پھر عقل کی زبان میں اس کی وضاحت کرتا ہے۔

عقلی و فلسفی استدلالات ان مطالب کے مانند ہیں جنھیں اسی زبان میں پڑھا جائے جس میں

وہ تحریر کئے گئے ہیں لیکن عرفانی استدلالات کی مثال ان مطالب جیسی ہے جنہیں کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو، یعنی عارف نے جن چیزوں کا اپنے پورے وجود اور دل کی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے — کم از کم اپنے دعوے کے مطابق انھیں عقل کی زبان میں بیان کرتا ہے۔

عرفان وجود و ہستی کی جو تفسیر پیش کرتا ہے وہ فلسفہ کی پیش کردہ تفسیر سے نہایت عمیق فرق رکھتی ہے۔ عرفانی تصور کائنات اور فلسفی تصور کائنات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

الٰہی فلسفی کی نگاہ میں خدا بھی اصالت رکھتا ہے اور غیر خدا بھی ایک حقیقت ہے۔ فرق یہ ہے کہ خدا، واجب الوجود اور قائم بالذات ہے جبکہ غیر خدا، ممکن الوجود، قائم بالغیر اور واجب الوجود معلول ہے۔ لیکن عارف کی نظر میں غیر خدا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کہ خدا کے مقابلہ میں کوئی وجود ہو، وہ غیر خدا کے وجود کو اس کے معلول کی حیثیت سے بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں خدا کا وجود تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، یعنی تمام چیزیں خداوند عالم ہی کے جلوے اور اس کے اسماء وصفات ہیں نہ کہ اس کے مقابلہ میں کوئی چیز۔

فلسفی اور عارف کے طرز فکر میں اختلاف ہے۔ فلسفی کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ کائنات کی ایک صحیح اور نسبتاً جامع و کامل تصویر اپنے ذہن میں مجسم کرے، فلسفی کی نگاہ میں انسان کا آخری کمال وارتقاء یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کے ذریعہ کائنات کو اسی طرح پہچان لے جیسی وہ ہے۔ یہاں تک کہ کائنات اس کے وجود میں، عقلی وجود اختیار کر لے اور وہ ایک عقلی کائنات بن جائے۔ اسی لئے فلسفہ کی تعریف میں کہا گیا ہے:-

صیرورة الانسان عالماً عقلیاً مضاهیاً للعالم العینی۔

یعنی فلسفی اس انسان کو کہتے ہیں جو اس خارجی عالم و عینی کائنات کی طرح ایک عقلی کائنات بن جائے۔

لیکن عارف کو عقل و فہم سے کوئی سروکار نہیں ہے، عارف مرکز وجود و ہستی یعنی خدا کی کنہ و حقیقت تک پہنچنا، اس سے متصل ہونا اور اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔

عارف کی نگاہ میں انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے ذہن میں وجود و ہستی کی ایک تصویر آمادہ کرلے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ سیر و سلوک کے سہارے اصل کی طرف پلٹ جائے

جہاں سے وہ آیا ہے اور ذات حق سے اپنی دوری اور فاصلہ کو ختم کرے اور بساط تقرب میں خود کو فنا کر کے اس کے وجود میں باقی ہو جائے۔

فلسفی کا ہتھیار، عقل و منطق و استدلال ہے لیکن عارف کا اوزار، دل، مجاہدت، تصفیہ تہذیب اور باطن میں حرکت و اقدام ہے۔

آئندہ جب ہم عرفانی تصور کائنات کے بارے میں بحث کریں گے تو فلسفی تصور کائنات اور عرفانی تصور کائنات کے فرق کو بھی نمایاں کریں گے۔

عرفان اور اسلام

عرفان اپنے عملی و نظری دونوں شعبوں میں دین اسلام سے قربت رکھتا ہے، کیونکہ اسلام نے تمام ادیان و مذاہب کی طرح بلکہ ان سب سے زیادہ انسان کے، خدا، کائنات اور خود اپنے سے مربوط تعلقات کو بھی بیان کیا ہے اور وجود و ہستی کی تفسیر و تشریح بھی کی ہے۔

فطری طور پر یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ عرفان اور اسلام کی پیش کردہ تعلیمات کے درمیان کس قسم کی نسبت پائی جاتی ہے؟

جہاں تک اسلامی عرفا کا تعلق ہے وہ ہرگز یہ نہیں مانتے کہ ان کی کوئی بات اسلام سے جدا ہے اور اس قسم کے الزام سے بڑی شدت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی حقائق کو سب سے بہتر ان ہی لوگوں نے کشف کیا ہے اور سچے مسلمان صرف وہی لوگ ہیں۔ عرفا نے عرفان کے عملی و نظری دونوں شعبوں میں ہمیشہ قرآن و سنت، پیغمبرؐ اور ائمہؑ کی سیرت نیز بزرگ صحابہ کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دیا ہے۔

لیکن دوسرے لوگ ان کے بارے میں کچھ اور ہی رائے رکھتے ہیں جنھیں ہم ترتیب وار بیان کر رہے ہیں:

الف۔ بعض اسلامی فقہاء و محدثین کا نظریہ۔ ان لوگوں کے خیال میں، عرفا عملی طور پر اسلام کے پابند نہیں ہیں، کتاب و سنت سے ان کا تمسک صرف عوام کو فریب دینے اور مسلمانوں کے دلوں کو اپنی جانب کھینچنے کی غرض سے ہے اور بنیادی طور پر عرفان، اسلام سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتا۔

ب ۔ عصر حاضر کے بعض ترقی پسندوں کا نظریہ ۔ یہ گروہ بھی جو اسلام کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا جس چیز سے بھی "اباحیت" کی بو آتی ہو اور اس سے اسلام و اسلامی تعلیمات کے خلاف ایک تحریک کے طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہو اسے بڑی گرمجوشی سے گلے لگاتا ہے ۔ یہ پہلے گروہ (الف) کی طرح ، خیال کرتا ہے کہ عرفا عملاً اسلام پر ایمان نہیں رکھتے ، بلکہ عرفان و تصوف معنویت کی آڑ میں اسلام اور عربوں کے خلاف غیر عرب قوموں کی ایک تحریک تھی ،

یہ دونوں گروہ ، عرفان کے اسلام مخالف ہونے پر متفق ہیں مگر ان کے درمیان بس اختلاف یہ ہے کہ پہلا گروہ اسلام کا احترام کرتا ہے اور مسلم عوام کے اسلامی جذبات کے سہارے ، عرفا کی تحقیر کرتا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے ۔ اور یہی حربہ استعمال کر کے عرفا کو اسلامی معارف کے میدان سے دور کرنا چاہتا ہے ۔ جبکہ دوسرا گروہ ، عرفا ۔ جن میں سے بعض عالمی شہرت کے حامل ہیں ۔ کی شخصیت کے سہارے اسلام کے برخلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کا ایک حربہ فراہم کرنا اور یہ مشہور کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی ثقافت میں پائے جانے والے اعلیٰ اور لطیف عرفانی افکار ، اسلام سے بیگانہ ہیں اور یہ عناصر باہر سے ، اس ثقافت میں داخل ہوئے ہیں ۔ اسلام اور اسلامی افکار کی سطح اس قسم کے افکار سے کہیں پست ہے ۔ اس گروہ کا دعویٰ ہے کہ عرفا نے کتاب و سنت سے تمسک صرف عوام کے خوف سے اور تقیہ کے طور پر کیا ہے ، وہ اس طرح اپنی جان کی حفاظت کرنا چاہتے تھے ۔

ج ۔ بعض غیر جانبداروں کا نظریہ ۔ اس گروہ کے نقطہ نظر سے عرفان و تصوف خاص طور سے عملی عرفان میں اور بالاخص جہاں عرفان ایک فرقہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے بہت سے ایسے انحرافات اور بدعتیں نظر آتی ہیں جو قرآن اور معتبر حدیثوں سے میل نہیں کھاتیں لیکن خود عرفا ، تمام اسلامی ثقافتی طبقات اور اکثر اسلامی فرقوں کی طرح ، اسلام کے تئیں خلوص رکھتے تھے اور وہ اسلام کے خلاف کوئی بات ہرگز نہیں کہنا چاہتے تھے ۔

یہ ہو سکتا ہے کہ وہ لغزشوں کے شکار ہوئے ہوں ، جس طرح دوسرے ثقافتی طبقات مثلاً متکلمین ، فلاسفہ ، مفسرین اور فقہا بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن وہ اسلام کے تئیں بری نیت ہرگز نہیں رکھتے تھے ۔

عرفا کے اسلام مخالف ہونے کا مسئلہ جن لوگوں نے اٹھایا ہے، وہ یا اسلام سے کدورت رکھتے تھے اور یا عرفان سے اگر کوئی شخص غیر جانب دار ہو کر عرفا کی کتابوں کا مطالعہ کرے بشرطیکہ ان کی زبان اور ان کے اصطلاحات سے بھی واقف ہو ___ تو ممکن ہے اسے بہت سے اشتباہات نظر آئیں لیکن وہ اسلام کے تئیں عرفا کے اخلاص و ایقان میں ہرگز شک نہیں کرے گا۔

ہم تیسرے نظریہ کو ترجیح دیتے ہوئے عقیدہ رکھتے ہیں کہ عرفا، بری نیت نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ عرفان اور اسلام کے عمیق معارف میں مہارت رکھنے والے کچھ افراد پوری جانبداری کے ساتھ عرفانی مسائل اور اسلام سے اس کے انطباق کے بارے میں بحث و تحقیق کریں۔

شریعت، طریقت، حقیقت

عرفا و غیر عرفا، خصوصاً فقہا، کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ، شریعت، طریقت اور حقیقت کے بارے میں عرفا کا مخصوص نظریہ ہے۔

عرفا و فقہا دونوں ہی اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت یعنی اسلامی احکام و قوانین کچھ حقیقتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہیں۔ عام طور سے فقہا "مصلحتوں" سے ان چیزوں کو مراد لیتے ہیں جو انسان کو سعادت یعنی مادی و معنوی نعمتوں سے استفادہ کی حد اعلیٰ تک پہنچاتی ہیں۔ لیکن عرفا کہتے ہیں، تمام راستے خدا ہی کی جانب جاتے ہیں اور تمام مصالح و حقائق ان شرائط، امکانات، وسائل اور مقتضیات کے مانند ہیں جو انسان کو خدا کی جانب لے جاتے ہیں۔

فقہا صرف اتنا کہتے ہیں کہ شریعت (احکام و قوانین) کے پس پشت کچھ مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور وہ مصلحتیں، شریعت کی روح اور علت شمار ہوتی ہیں، ان مصلحتوں تک رسائی کا واحد ذریعہ شریعت پر عمل ہے، جبکہ عرفا کا عقیدہ ہے کہ شریعت میں پوشیدہ مصلحتیں اور حقیقتیں ان منزلوں اور مرحلوں کے مانند ہیں جو انسان کو تقرب الٰہی اور وصال حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔

عرفا کا عقیدہ ہے کہ شریعت کا باطن "راستہ" ہے جسے وہ "طریقت" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس راستہ کی انتہا، حقیقت ہے یعنی توحید، ان معنوں میں جن کی طرف پہلے اشارہ

کیا جا چکا کہ وہ عارف کہ اپنی ذات اور اپنی انانیت سے دستبردار ہو جانے کے بعد رونما ہوتی ہے۔
اسی لئے عارف تین چیزوں پر ایمان رکھتا ہے: شریعت، طریقت، حقیقت۔ اس کا نظریہ ہے کہ شریعت، طریقت کے لئے ایک وسیلہ ہے اور طریقت حقیقت تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اسلام کے بارے میں فقہا کا نظریہ وہی ہے جیسے ہم کلام سے مربوط دروس میں بیان کر چکے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اسلامی احکام و قوانین تین شعبوں میں بٹے ہوئے ہیں: پہلا شعبہ اعتقادی اصول سے مربوط ہے جس کا ذمہ دار علم کلام ہے۔

اعتقادی اصول کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ انسان ان پر عقل کے ذریعہ ناقابل تزلزل پختہ ایمان رکھتا ہو۔

دوسرا شعبہ اخلاق ہے، اس شعبہ میں کچھ ایسے احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں جو اخلاقی فضائل و رذائل کے لحاظ سے انسان کے فرائض معین کرتے ہیں اور اس کا ذمہ دار علم اخلاق ہے

تیسرا شعبہ، احکام کا شعبہ ہے جو انسان کے افعال و اعمال سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی ذمہ دار فقہ ہے۔

یہ تینوں شعبے ایک دوسرے سے جدا ہیں، عقائد کا شعبہ عقل و فکر سے تعلق رکھتا ہے اخلاق کا شعبہ نفس اور نفسانی عادات و ملکات سے مربوط ہے اور احکام کا شعبہ اعضاء و جوارح سے ربط رکھتا ہے۔

لیکن عرفا عقائد کے شعبہ میں، صرف ذہنی و عقلی اعتقاد کو کافی نہیں سمجھتے ان کا دعویٰ ہے کہ جن چیزوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے ان تک وصول و رسائی بھی ضروری ہے۔ انسان کو ایسا کام کرنا چاہیئے کہ اس کے ان حقائق کے درمیان حائل پردے اٹھ جائیں۔ دوسرے شعبہ میں جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اخلاق ساکن بھی ہے اور محدود بھی ـــــ وہ اخلاق کو کافی نہیں سمجھتے، وہ علمی و فلسفی اخلاق کے بجائے عرفانی سیر و سلوک کو پیش کرتے ہیں۔

تیسرے شعبہ میں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ صرف کچھ خاص مقامات پر انھوں نے بعض باتیں کہی ہیں جنھیں ممکن ہے فقہی احکام کے خلاف تصور کیا جائے۔

عرفا ان تینوں شعبوں کو شریعت، طریقت، حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں اور عقیدہ رکھتے

ہیں کہ جس طرح خود انسان، واقعی طور پر، تین حصوں میں بٹا ہوا نہیں ہے۔ یعنی جسم، نفس اور عقل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں بلکہ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے متحد ہیں اور ان کی آپسی نسبت، ظاہر و باطن کی نسبت ہے۔ شریعت، طریقت اور حقیقت بھی ایسی ہی ہیں یعنی ایک ظاہر ہے دوسری باطن اور تیسری باطن کا باطن۔ بس فرق اتنا ہے کہ عرفا انسانی وجود کے مراتب کو تین مراحل سے زیادہ جانتے ہیں۔ یعنی وہ عقل سے ماوراء مراحل و مراتب کے بھی قائل ہیں جن کے بارے میں ان شاء اللہ بعد میں توضیح دی جائے گی۔

۳

اسلامی عرفان کا سرمایہ

کسی بھی علم سے واقف ہونے کے لئے اس علم کی تاریخ اس کے تغیرات اور ان شخصیتوں سے واقفیت ضروری ہے جو اس علم کے حامل، وارث یا اس کے موجد ہیں۔ اسی طرح اس علم کی بنیادی کتابوں سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ ہم موجودہ اور چوتھے درس میں ان ہی مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔

پہلا مسئلہ جو یہاں بیان ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آیا اسلامی عرفان، علم فقہ، اصول، تفسیر اور حدیث کے مانند ہے؟ یعنی یہ ان علوم میں سے ہے جن کا اصل سرمایہ اور جوہر مسلمانوں نے اسلام سے حاصل کیا ہے اور ان کے لئے اصول و قواعد کشف کئے ہیں؟ یا یہ طب و ریاضیات کے مانند ہے جس نے باہر سے اسلامی دنیا میں قدم رکھا ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے دامن میں مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے اور یا کوئی تیسری صورت حال بھی ہے؟

عرفا خود پہلی شق، اختیار کرتے ہیں اور کسی دوسری شق کو انتخاب کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہیں بعض مستشرقین کا اصرار تھا اور ہے کہ عرفان اور اس کے دقیق و لطیف افکار، سب کے سب باہر سے اسلامی دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ کبھی اس کے لئے عیسائی جڑیں تلاش کرتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ یہ عارفانہ افکار، عیسائی راہبوں سے مسلمانوں کے ارتباط کا نتیجہ ہیں۔ کبھی اسے اسلام و عرب کے خلاف ایرانیوں کا ردعمل قرار دیتے ہیں کبھی اسے سو فیصد جدید افلاطونی فلاسفہ کی پیداوار بتلاتے ہیں جو خود ارسطو، افلاطون، فیثاغورس، اسکندریہ کے غنوسیوں اور یہود و نصاریٰ کے افکار و عقائد کا مجموعہ ہے۔ اور کبھی اسے بودائی نظریات کی دین قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح خود اسلامی دنیا میں بھی عرفا کے مخالفین، عرفان و تصوف کو سرے سے اسلام سے بیگانہ اور اس کی بنیادوں کو غیر اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ عرفان نے عملی و نظری دونوں شعبوں میں اپنا ابتدائی سرمایہ خود اسلام سے حاصل کیا ہے اور اس سرمایہ کے کچھ اصول و ضوابط وضع کئے ہیں باہر کے حالات خاص طور سے کلامی و فلسفی افکار اور خصوصیت سے اشراقی فلسفہ کے افکار و نظریات سے بھی متاثر ہوا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ عرفا، ابتدائی اسلامی سرمایہ کے لئے صحیح اصول و ضوابط بیان کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور آیا اس سمت میں ان کی کامیابی، فقہا کے برابر ہے یا نہیں؟ وہ اسلام کے واقعی اصول سے منحرف نہ ہونے کے کس قدر پابند تھے؟ اسی طرح بیرونی افکار اسلامی عرفان پر کس قدر اثر انداز ہوئے ہیں؟ آیا اسلامی عرفان نے انھیں اپنے اندر جذب کیا ہے ان پر اپنا رنگ چڑھایا ہے اور اپنے مقاصد کے لئے ان سے استفادہ کیا ہے یا اس کے برعکس ان افکار نے اسلامی عرفان کو خود اپنے راستہ پر ڈال دیا ہے۔

یہ وہ مسائل و مطالب ہیں جن کے بارے میں الگ الگ بحث و گفتگو ضروری ہے البتہ اتنا یقینی ہے کہ اسلامی عرفان نے اپنا اصلی سرمایہ اسلام ہی سے لیا ہے۔

پہلے نظریہ کے طرفدار ــ اور ایک حد تک دوسرے نظریہ کے حامی بھی ــ مدعی ہیں کہ اسلام پیچیدہ، مشکل سے سمجھ میں آنے والے یا سرے سے سمجھ میں نہ آنے والے مفاہیم اور ہر قسم کے اسرار و رموز سے خالی نیز عام فہم، بے تکلف اور سہل و سادہ دین ہے۔

اسلام کی اعتقادی بنیاد توحید ہے۔ اسلام کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھر کا ایک بنانے والا ہوتا ہے جو اس سے جدا اور الگ ہوتا ہے اسی طرح کائنات کا بھی ایک بنانے والا

ہے جو اس سے جدا و علیحدہ ہے ۔ اسلام کی نظر میں متاع دنیا سے انسان کے رابطہ کی بنیاد زہد ہے ۔

زہد سے مراد ، آخرت کی دائمی و جاوید نعمتوں کے حصول کے لئے دنیا کی فانی متاع سے چشم پوشی ہے اس کے علاوہ کچھ آسان عملی احکام ہیں جنھیں فقہ بیان کرتی ہے ۔

اس گروہ کے نقطہ نظر سے ، عرفا نے توحید کے نام پر جو کچھ پیش کیا ہے وہ اسلامی توحید سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتیں ۔ کیونکہ عرفانی توحید کا مطلب ، وحدت وجود اور یہ کہ اس کائنات میں خدا ، اس کے اسماء ، اس کے صفات اور اس کے تجلیات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۔

عرفانی سیر و سلوک بھی اسلامی زہد سے پرے ہے ، کیونکہ سیر و سلوک میں عشق و محبت خدا ، فنافی اللہ اور قلب عارف پر تجلی خدا جیسے معانی و مفاہیم بیان ہوتے ہیں جو اسلامی زہد میں نظر نہیں آتے ۔

عرفانی طریقت بھی ، اسلامی شریعت سے کوسوں دور ہے ۔ کیونکہ آداب طریقت میں ایسے ایسے مسائل پائے جاتے ہیں جن سے فقہ بے خبر ہے ۔

اس گروہ کی نظر میں رسول اکرم کے وہ اصحاب اخیار جن سے عرفا و صوفیا اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور انھیں اپنا پیشرو بتاتے ہیں وہ زاہد کے سوا کچھ اور نہ تھے ۔ عرفانی سیر و سلوک اور عرفانی توحید سے ان کی روح بھی باخبر نہیں تھی ، وہ متاع دنیا سے منہ موڑ کر عالم آخرت سے لو لگائے ہوئے تھے ۔ ان کی روح پر حاکم اصول ، خوف و رجاء تھا ، عذاب جہنم کا خوف اور بہشتی ثوابوں کی امید ۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ کے نظریہ کو کسی بھی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ اسلام کا ابتدائی سرمایہ اس سے کہیں زیادہ مالا مال ہے جیسے اس گروہ نے جہالتاً یا عمداً فرض کیا ہے نہ اسلامی توحید اتنی آسان اور کھوکھلی ہے جیسا ان لوگوں نے فرض کیا ہے ، نہ ہی اسلام میں انسان کی معنویت ، زہد خشک میں منحصر ہے نہ ہی رسول اکرم کے اصحاب اخیار ایسے تھے جیسا ان لوگوں نے بیان کیا اور نہ ہی اسلامی آداب ، اعضاء و جوارح سے انجام پانے والے اعمال میں محدود و مقید ہیں ہم اس درس میں ، اجمالی طور پر کچھ ایسے مطالب بیان کریں گے جن سے یہ واضح ہو سکے کہ

اسلام کے اصلی تعلیمات میں نظری و عملی عرفان کو کچھ عمیق معارف عطا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اب یہی بات کہ اسلامی عرفا نے ان تعلیمات سے کس قدر صحیح فائدہ اٹھایا ہے اور کس حد تک بھٹکے ہیں یہ ایسے مطالب ہیں جنھیں ان مختصر بحثوں میں نہیں بیان کیا جاسکتا۔

قرآن کریم، توحید کے موضوع میں، تخلیق اور خدا کو گھر اور گھر کے بنانے والے پر ہرگز قیاس نہیں کرتا۔ قرآن۔ خدا کو کائنات کا خالق و موجد بتاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی مقدس ذات ہر جگہ اور ہر چیز کے ہمراہ ہے۔

" اَیْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ " جس طرف رخ کرو وہاں خدا کا چہرہ موجود ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْکُمْ مِنْکُمْ " ہم تم سے خود تمہاری ذات سے زیادہ قریب ہیں۔

" ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ، وہ تمام اشیاء کا اول ہے اور وہی تمام اشیاء کا آخر ہے (اسی سے ان کا آغاز ہوا ہے اور اسی پر ان کا انجام ہوگا) وہ ظاہر و آشکار ہے اور وہی باطن و مخفی بھی ہے۔ اور اسی طرح کی بہت سی آیتیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی آیتیں، افکار و خیالات کو عوام کی توحید سے بالاتر توحید کی طرف متوجہ کرتی ہیں چنانچہ اصول کافی میں ہے کہ خدا جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں۔ توحید کے بارے میں غور و فکر کرنے والے افراد پیدا ہوں گے اسی لئے اس نے سورۂ قل ہو اللہ احد اور سورہ حدید کی ابتدائی آیتیں نازل فرمائیں۔

سیر و سلوک۔ اور تقرب الٰہی آخری منزلوں کو طے کرنے کے سلسلہ میں، " لقاء اللہ " ، " رضوان اللہ " اور وحی و الہام نیز انبیاء کے علاوہ دیگر افراد ــــ مثلاً حضرت مریم ــــ سے ملائکہ کی گفتگو اور خاص طور سے معراج رسول اکرمؐ سے مربوط آیتوں کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

قرآن کریم میں نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ کا تذکرہ ہے، " علم افاضی " " علم لدنی " اور مجاہدہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی ہدایتوں کا ذکر ہے : وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا قرآن میں تزکیہ نفس کو فلاح و کامیابی کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے : قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔

قرآن میں بار بار، حب الٰہی کو تمام انسانی محبتوں اور تعلقات سے بالاتر قرار دیا گیا ہے

قرآن نے کائنات کے ذرہ ذرہ کی تسبیح و تحمید کی تصویر کشی کی ہے اور ان کی ایسی تعبیر کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنے "تفقہ" کو مکمل کرے تو ان کی تسبیح و تحمید کو درک کر سکتا ہے

اس کے علاوہ قرآن نے انسان کی سرشت کے سلسلہ میں "نفخۃ الٰہی" کا مسئلہ بھی پیش کیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل، خدا، کائنات، انسان اور خاص طور سے خدا و انسان کے تعلقات کے بارے میں ایک عظیم معنوی افکار کا سلسلہ وجود میں لانے کے لئے کافی تھے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ مسلم عرفا نے ان سرمایوں سے کس طرح استفادہ کیا ہے۔ صحیح یا غلط؟ ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کا عظیم سرمایہ، اسلامی دنیا کو بہترین الہام بخش سکتا ہے۔ بالفرض اگر عرفا کے نام سے مشہور افراد اس سرمایہ سے صحیح فائدہ نہ بھی اٹھا سکے ہوں تو کچھ دوسرے افراد نے جو اس نام سے مشہور نہیں ہیں اس سے صحیح فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کے علاوہ روایتوں، خطبوں، دعاؤں، اسلامی استدلالات، اسلام کے دامن میں پروان چڑھنے والی عظیم شخصیتوں کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ صدر اسلام میں صرف اجر و ثواب کے امید میں عبادت اور خشک زہد ہی نہیں تھا۔

ان روایتوں، خطبوں، دعاؤں اور استدلالوں میں بہت ہی عظیم مفاہیم بیان ہوئے ہیں صدر اسلام کی شخصیتوں کے حالات، روحانی واردات قلبی بصیرتوں، سوز و گداز اور معنوی عشق کے ایک سلسلہ کی حکایت کرتے ہیں۔ بطور نمونہ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

اصول کافی میں ہے کہ: ایک دن نماز صبح کے بعد رسول خدا کی نظر ایک جوان پر پڑی جس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور جسم اتنا نحیف و زار ہو چکا تھا کہ اسے اپنا توازن برقرار رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ حضرت نے اس سے دریافت فرمایا کیف اصبحت؟ کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا: "اَصبحتُ موقناً" یقین کی حالت میں بسر کر رہا ہوں۔

حضرت نے فرمایا: تیرے یقین کی علامت کیا ہے؟

عرض کیا: یہ میرا یقین ہی ہے جس نے مجھے رنج و اندوہ میں غرق کر کے میری شبوں

کو بیدار اور دنوں کو پیاسا بنا دیا ہے (یعنی رات بھر عبادت کرتا ہوں اور دن بھر روزہ رکھتا ہوں) اور مجھے دنیا و مافیہا سے بیگانہ بنا دیا ہے یہاں تک کہ گویا میں عرش پروردگار کا مشاہدہ کر رہا ہوں جسے لوگوں کا حساب کتاب لینے کے لئے نصب کیا گیا ہے۔ سب لوگ میدان حشر میں اکٹھا ہیں اور میں بھی ان کے درمیان ہوں، گویا میں اہل بہشت کو جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہوتے اور جہنمیوں کو جہنم کی آگ میں جلتے دیکھ رہا ہوں گویا ابھی اسی وقت ان ہی کانوں سے آتش جہنم کی حرکت کی آواز سن رہا ہوں۔

رسول اکرمؐ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: یہ وہ بندہ ہے جس کے دل کو خدا نے نور ایمان سے منور کر دیا ہے۔ اس کے بعد اس جوان سے آپ نے فرمایا: اپنی اس کیفیت کی حفاظت کرو کہ کہیں یہ تم سے چھن نہ جائے۔

جوان نے عرض کیا: دعا فرمائیے خدا مجھے شہادت نصیب فرمائے۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک جنگ پیش آئی اور یہ جوان اس جنگ میں درجہ شہادت پر فائز ہو گیا۔

رسول اکرمؐ کی زندگی، حالات، ارشادات اور مناجاتیں معنوی و الٰہی احساسات و جذبات سے سرشار اور عرفانی اشاروں سے لبریز ہیں۔ عرفاء نے رسول اکرمؐ کی دعاؤں سے بے حد استفادہ کیا ہے اور انھیں اپنے مدعا کی دلیل قرار دیا ہے۔

تقریباً سبھی عرفاء و صوفیا اپنے سلسلہ کو امیرالمومنین علی علیہ السلام تک پہنچاتے ہیں آپؑ کے ارشادات، معنویت و معرفت کا بیش بہا خزانہ ہیں، ہم یہاں نہج البلاغہ میں مذکور دو عبارتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:۔

خطبہ ۲۲۰ میں حضرت فرماتے ہیں:۔

"ان اللہ سبحانہ وتعالی جعل الذکر جلاء للقلوب تسمع بہ بعد الوقرۃ وتبصر بہ بعد العشوۃ وتنقاد بہ بعد المعاندۃ وما برح للہ عزت آلاؤہ فی البرھۃ بعد البرھۃ و فی ازمان الفترات عباد ناجاھم فی فکرھم وکلمھم فی ذات عقولھم۔"

بے شک اللہ سبحانہ نے اپنی یاد کو دلوں کی صیقل قرار دیا ہے جس کے ذریعہ وہ بہرا ہونے کے بعد سننے لگے اور اندھے پن کے بعد دیکھنے لگا اور دشمنی وعناد کے بعد فرمانبردار ہو گئے یکے بعد دیگرے ہر عہد اور انبیاء سے خالی دور میں حضرت رب العزت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ موجود رہے ہیں جن کی فکروں میں سرگوشیوں کی صورت میں گفتگو کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے بات کرتا ہے۔

خطبہ ۲۲۰ میں اللہ والوں کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"قَدْ اَحْيیٰ عَقْلَهٗ وَ اَمَاتَ نَفْسَهٗ حَتّٰی دَقَّ جَلِیْلُهٗ وَلَطُفَ غَلِیظُهٗ وَ بَرَقَ لَهٗ لَامِعٌ كَثِیرُ الْبَرْقِ فَاَبَانَ لَهُ الطَّرِیْقَ وَ سَلَكَ بِهِ السَّبِیْلَ وَتَدَافَعَتْهُ الْاَبْوَابُ اِلٰی بَابِ السَّلَامَةِ وَ دَارِ الْاِقَامَةِ وَثَبَتَتْ رِجْلَاهُ بِطُمَاْنِیْنَةِ بَدَنِهٖ فِیْ قَرَارِ الْاَمْنِ وَالرَّاحَةِ بِمَا اسْتَعْمَلَ قَلْبَهٗ وَاَرْضٰی رَبَّهٗ"

مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغر اور تن و توش ہلکا ہو گیا ہے اس کے لئے بھرپور درخشندگیوں والا نور ہدایت چمکا جس نے اس کے سامنے راستہ نمایاں کر دیا اور اسے سیدھی ہی راہ پر لے چلا اور مختلف دروازے اسے دھکیلتے ہوئے سلامتی کے دروازہ اور قرارگاہ تک لے گئے اور اس کے پاؤں بدن کے ٹکاؤ کے ساتھ امن و راحت کے مقام پر جم گئے چونکہ اس نے اپنے دل کو عمل میں لگائے رکھا تھا اور اپنے پروردگار کو راضی و خوشنود کیا تھا۔

اسلامی دعائیں خاص طور سے شیعہ دعائیں معارف کا ایک خزانہ ہیں، دعا کمیل، دعاء ابوحمزہ مناجات شعبانیہ اور صحیفہ سجادیہ کی دعائیں ان کا بہترین نمونہ ہیں۔ اعلیٰ ترین معنوی افکار ان ہی دعاؤں میں ہیں اتنے سارے مصادر و مآخذ کے ہوتے ہوئے۔ کیا کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم اس کے لئے بیرونی مصدر و ماخذ کی جستجو کریں؟ ہمیں یہی منظر ابوذر غفاری کی اس معاشرتی و تنقیدی تحریک میں بھی نظر آتا ہے جو انھوں نے اپنے زمانہ کے ستمگروں کے خلاف چلائی تھی

حضرت ابوذر کو اپنے زمانہ میں ہونے والے ظلم وستم، لوٹ کھسوٹ اور بے جا امتیازات پر سخت اعتراض تھا جس کی پاداش میں انہیں جلا وطنی اور طرح طرح کی جان فرسا اذیتیں برداشت کرنی پڑیں اور آخر کار تنہائی و جلا وطنی ہی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

اب بعض مستشرقین یہ سوال کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر کے اس اقدام کا محرک کیا تھا؟ یہ لوگ حضرت ابوذر کی اس تحریک کا محرک و عامل اسلامی دنیا سے باہر تلاش کرنے کی کوشش میں ہیں

جارج جرداق۔ عیسائی مصنف اپنی کتاب "الامام علی صوت العدالة الانسانیة" میں لکھتا ہے: ان افراد پر تعجب ہے۔ یہ تو بالکل یوں ہی ہے کہ کسی شخص کو دریا کے کنارے دیکھیں اور پھر یہ غور کریں کہ اس شخص نے اپنا برتن کس گڑھے یا حوض سے بھرا ہے اس کے بھرے ہوئے برتن کی توجیہ کرنے کے لئے گڑھے کی تلاش میں سرگرداں رہیں لیکن اس سمندر یا دریا کو نظر انداز کر دیں۔

ابوذر۔ اسلام کے سوا کس چشمہ سے سیراب ہو سکتے تھے۔ اسلام کے سوا کون سا مصدر ابوذر کو معاویہ جیسے ظالموں کے مقابلہ میں اقدام کرنے کے لئے الہام بخش سکتا تھا؟

آج بعینہ یہی صورت حال، عرفان کے سلسلہ میں نظر آتی ہے۔ مستشرقین اس عظیم اسلامی سمندر کو بھلا کر اس کے لئے اسلام کے سوا کوئی دوسرا سرچشمہ تلاش کرنے کے لئے کوشاں ہیں جو عرفانی معنویتوں کو الہام عطا کر سکے

کیا چند مستشرقوں۔ اور ان کے مشرقی پیروؤں کے مفروضہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآن، حدیث۔ استدلال، دعا، خطبہ اور سیرت پر مشتمل اس عظیم سرچشمہ سے انکار کیا جا سکتا ہے؟!

ابتداء میں مستشرقوں کو اصرار تھا کہ اسلامی عرفان کا سرچشمہ، اسلام کی اصلی تعلیمات کے سوا کسی اور چیز کو قرار دیں۔ لیکن اب آج کل برطانیہ کے "نیکولون" اور فرانس کے "ماسینیون" نے ـــ جو اسلامی عرفان کے سلسلہ میں بڑا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں اور اسلام سے بھی نا آشنا نہیں ہیں ـــ صریحاً اعتراف کیا ہے کہ اسلامی عرفان کا اصل سرچشمہ قرآن و سنت ہے۔

میں یہاں نیکلسن کے چند جملے نقل کر کے اس درس کو ختم کر رہا ہوں، وہ کہتا ہے:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن فرماتا ہے " خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۱)، وہ اول و آخر ہے (۲)، اس کے سوا کوئی خدا نہیں (۳)، اس کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی (۴)، میں نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے (۵)، ہم نے انسان کو خلق کیا ہے اور جانتے ہیں کہ اس کی روح اس سے کیا کہتی ہے کیونکہ ہم اس سے رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (٦) جس طرف رخ کرو خدا وہیں ہے (۷)۔ خدا جسے نور نہ دے وہ نور سے محروم ہے (۸) "۔ یقیناً تصوف کی جڑیں ان ہی آیتوں میں پوشیدہ ہیں، اور ابتدائی صوفیوں کی نگاہ میں قرآن صرف کلمات خدا کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ خدا سے تقرب کا وسیلہ بھی تھا۔ عبادات اور قرآن کی مختلف آیتوں خاص طور سے "معراج" سے مربوط پراسرار آیتوں میں غور و فکر کے ذریعہ صوفیا اپنے اندر پیغمبرؐ کی صوفیانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔(۹) وہ کہتا ہے :-

"تصوف میں وحدت کا اصول، ہر جگہ سے زیادہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح پیغمبرؐ کہتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے : " اگر میرا بندہ، عبادت اور نیک اعمال کے نتیجہ میں مجھ سے نزدیک ہو جائے تو میں اسے دوست رکھوں گا، نتیجتاً میں اس کا کان ہوں اس طرح کہ وہ میرے ذریعہ سے سنتا ہے، میں اس کی آنکھ ہوں اس طرح کہ وہ میرے وسیلہ سے دیکھتا ہے

۱۔ اللّٰہ نور السمٰوات والارض۔ سورہ نور / ۳۵

۲۔ ھو الاول والآخر۔ سورۂ حدید / ۳

۳۔ لا الٰہ الا ھو۔ سورۂ غافر / ۳

۴۔ کل من علیھا فان۔ سورہ رحمٰن / ۲٦

۵۔ ونفخت فیہ من روحی۔ سورہ الحجر / ۲۹

٦۔ ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ سورہ قٓ / ۱٦

۷۔ اینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ۔ سورہ بقرہ / ۱۱۵

۸۔ ومن لم یجعل اللّٰہ لہ نورا فما لہ من نور۔ سورہ نور / ۴۰

۹۔ میراث اسلام ص ۸۴۔

میں اس کی زبان اور ہاتھ ہوں اس طرح کہ وہ میرے ذریعے سے بولتا ہے اور پکڑتا ہے۔(۱)

جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ آیا عرفا و صوفیا صحیح سمجھ سکے ہیں یا نہیں ؟ ہماری بحث صرف یہ ہے کہ عرفان کے ان افکار کا سرچشمہ اسلامی متون ہیں یا باہر کی کوئی دوسری چیز ؟ -

بسمہ تعالیٰ

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

۱۔ یہ اس حدیث قدسی کا ترجمہ ہے: لایزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی اذا احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ولسانه الذی ینطق به ویده الذی یبطش بها۔

شہید ڈاکٹر محمد جواد باھنر
ترجمہ جناب سید احتشام عباس زیدی

معارف اسلامی

قرآن میں انبیاء کرام کے معنوی جلوے

اس بحث کے دوران ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن انبیاء الٰہی کا تعارف کس طرح کراتا ہے اور ان کے لئے کن صفات وخصوصیات کا ذکر کرتا ہے اس بحث سے ہم اجمالی طور سے تین نتیجے اخذ کرتے ہیں۔

۱۔۔۔ قرآن ہمیں انبیاء کرام کے سلسلہ میں ہر طرح کی افراط وتفریط سے روکتا ہے۔ یعنی جب ہم قرآن کے تعارف کی نوعیت وکیفیت کو سمجھ لیں گے تو پھر ان کے بارے میں حد سے آگے نہیں بڑھیں گے پیغمبروں کے لئے خدائی پہلوؤں کے قائل نہ ہوں گے نہ انھیں خدا کی طرف رشتہ کی شکل میں منسوب کریں گے اور نہ ہی خدا کی طرح ان کے اختیار مطلق۔ امور عالم میں ان کی کارفرمائی۔ رزق کی تقسیم اور ان کے قاضی الحاجات ہونے کے قائل ہوں گے۔

۲۔۔۔ اسی طرح ہم انبیاء کرام کے فضل وشرف اور ان پر اعتبار ویقین کی نوعیت کو سمجھ لیں گے تاکہ ہمارے لئے ان کے اخلاق اور کردار وفضائل اسوہ اور نمونہ عمل بن جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جان جائیں کہ یہ انبیاء جو خلق کے رہبر تھے، کون تھے اور کیا چاہتے تھے؟ اور ان کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے اور دوست دار کیسے ہیں اور اپنے رہبر سے کس حد تک فاصلہ رکھتے ہیں؟

۳۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے سلسلے میں الٰہی انتخاب بلا سوچے سمجھے

نہیں تھا۔ اور اگر خداوند عالم نے ان کو لوگوں کی رہبری و ہدایت کے لئے چنا ہے تو یہ افراد بھی اعلیٰ و بہترین انسانی و معنوی صفات و فضائل سے آراستہ رہے ہیں۔ انبیاء کرام سے مربوط قرآنی آیات کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تقریباً چالیس صفات و فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں

عبد

یعنی بندہ۔ ایسا شخص جو پورے طور سے خود کو خدا کے اختیار میں سمجھتا ہے اور اسی کے احکام کی پیروی کرتا ہے خود اپنے لئے کوئی اختیار یا کسی مطلق ارادہ کا قائل نہیں ہے اور اپنی ذات میں کسی خدائی پہلو کا اظہار نہیں کرتا۔ یہ لفظ "عبد" حضرت ابراہیم، موسیٰ، ہارون، ایوب، الیاس سلیمان، داود، نوح، اور یوسف علیہم السلام وغیرہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (سورہ صافات آیات: ۱۱۲، ۱۲۲ - سورہ ص آیات ۴۱، ۳۰، ۱۷ - سورۂ اسراء آیت: ۳ - سورہ یوسف آیت: ۲۵ -)

مخلص

یعنی وہ جو صرف خدا کے لئے عمل کرتا ہے اور سوائے خوشنودی و رضائے پروردگار کے خود کوئی نظریہ یا خیال نہیں رکھتا اور نہ کسی طرح کی ظاہرداری، ریاکاری، خود پرستی اور ہوا و ہوس کو اپنے اعمال میں جگہ دیتا ہے۔ یہ کلمہ حضرت یوسفؑ کے لئے سورۂ یوسف کی ۲۵ ویں آیت میں استعمال ہوا ہے

حنیف

اس کے معنی بھی یہ ہیں کہ خدا کے لئے بے لاگ اور خالص عمل انجام دیتا ہے۔ اسی پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اس کی توجہ و نگاہ کا مرکز صرف خدا کی ذات ہوتی ہے۔ اس کی عبادت و عمل میں شرک کی گرد بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ کے لئے ذکر ہوا ہے۔ (سورۂ نحل آیت ۱۲۲)

مسلم

یعنی جو حکم خدا کے آگے تسلیم ہے اور کسی بھی حالت یا خطرے میں اس کے حکم کی اطاعت سے

منہ نہیں موڑتا۔ کوئی لالچ، دھمکی، یا وسوسہ اس کے آہنی عزم میں خلل انداز نہیں ہوتا اور نہ اسے خدا کی راہ سے دور کرتا ہے۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل کے لئے ذکر ہوا ہے۔ (سورۂ بقرہ آیات ۱۲۹ – ۱۳۲)

صالح

وہ جس کا عمل نیک و شائستہ ہے اور کسی طرح کی بدی، سستی، کمی اور آلودگی اس میں نہیں پائی جاتی۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، زکریاؑ، الیاسؑ، اسماعیلؑ، ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۳۱۔ سورہ صافات آیت ۱۱۲۔ سورہ آل عمران آیات ۴۰۔ ۴۷۔ سورۂ انعام آیت ۸۵۔ سورۂ انبیاء آیت ۸۵)

محسن

یعنی نیکوکار۔ جو لوگوں کے ساتھ اس قدر نیکی کرے اور اچھے اعمال بجا لائے کہ اسے نیکوکار کہا جانے لگے۔ یہ کلمہ حضرت موسیٰؑ، ہارونؑ، یوسفؑ اور نوحؑ کے بارے میں آیا ہے۔ (سورہ صافات آیت: ۱۲۲۔ سورۂ یوسف آیت: ۲۲۔ سورۂ ص، آیت ۸۲۶)

صدیق

جو شخص بہت زیادہ سچا ہو۔ جس کی رفتار و گفتار سے سوائے سچائی اور بہتری کے کچھ اور ظاہر نہ ہوتا ہو۔ یہ لفظ حضرت یوسفؑ و ادریسؑ کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ (سورۂ یوسف آیت ۴۷۔ سورۂ مریم، آیت: ۵۵)

صابر

جو شخص بردبار، متحمل اور مضبوط ارادہ کا حامل ہو۔ تمام مشکلات میں ثابت قدم رہے۔ یہ لفظ اولوالعزم پیغمبروں اور جناب ایوبؑ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (سورۂ احقاف، آیت: ۳۵،

سورۂ ص، آیت: ۴۱) ۔

امین

یعنی جو صحیح اور قابلِ اعتماد ہے، کبھی خیانت نہیں کرتا۔ یہ لفظ حضرت موسیٰ اور ہود کے لئے آیا ہے (سورۂ دخان، آیت ۱۹ - سورۂ اعراف آیت: ۶۸)

حصور

عفیف و پاکدامن، ہوا و ہوس سے پاک و بری ۔ یہ لفظ حضرت یحییٰ کے لئے ذکر ہوا ہے (سورۂ آل عمران آیت ۴۰

تقی

پرہیزگار، جو شخص گناہ، گمراہی و کجروی کے مقابلے میں مقاوم و ثابت قدم رہے اور کسی غلط اور ناپسندیدہ عمل میں ملوث نہ ہو۔

صادق الوعد

جو شخص اپنے کئے ہوئے وعدہ کو وفا کرتا ہے اور اپنے عہد و پیمان و قول و قرار میں سچا رہتا ہے یہ لفظ حضرت اسماعیل کے لئے ذکر ہوا ہے (سورۂ مریم، آیت: ۵۴)

کریم

یعنی جو شخص بخشنے اور درگزر کرنے والا ہو کریم النفس اور بزرگی سے کام لیتا ہو ۔ یہ لفظ حضرت موسیٰؑ کے لئے (سورۂ دخان، آیت ۱۹) میں ذکر ہوا ہے ۔

فوج

شکور

شکرگزار بندہ ۔ یعنی جو خدا کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے اور انھیں راہ خیر میں صرف کرتا ہے ۔ ان کے سلسلہ میں خدا کے احکام سے روگردانی نہیں کرتا اور ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے ۔ یہ کلمہ حضرت نوحؑ کے لئے (سورۂ اسراء ۔ آیت ۳:) میں آیا ہے ۔

مرضی

وہ شخص جس سے خدا راضی وخوشنود ہے ۔ یہ لفظ حضرت اسماعیلؑ کے لئے (سورۂ مریم آیت ۵۴) میں ملتا ہے ۔

حلیم

بُردبار یعنی جو شخص اپنا غصہ پی جاتا ہو اور دوسروں کی بدسلوکی و بے ادبی کے مقابلہ میں حلم و متانت کا اظہار کرتا ہو جذبات کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہوجاتا ۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ کے لئے (سورۂ توبہ ۔ آیت ۱۱۵) میں آیا ہے ۔

عابد

جو شخص اپنے پروردگار کی پرستش وعبادت کرتا ہو ، صرف اس کی بارگاہ میں خضوع وخشوع کا اظہار کرتا ہے اور اس کے فرمان سے بغاوت نہیں کرتا ۔ یہ لفظ حضرت اسحاقؑ و یعقوبؑ کے لئے (سورۂ انبیاء ۔ آیت ۷۲) میں ذکر ہوا ہے ۔

اوّاب

جو شخص خدا کی جانب رجوع کرتا ہے اور ہر خطا وگناہ وگمراہی کی منزل میں اسی کی پناہ حاصل کرتا ہے اور توبہ واستغفار کی راہ سے تقرب حاصل کرتا ہے ۔ یہ لفظ حضرت داؤدؑ ، سلیمانؑ اور ایوبؑ کے بارے میں ذکر ہوا ہے (سورۂ ص ۔ آیات : ۱۷ ، ۳۰ ، ۴۱)

اوّاہ

وہ شخص جو اپنے پروردگار کے حضور خائف وخاشع ہوتا ہے اور اس کی عظمت کے سامنے اپنی بے مائیگی کا اظہار کرتا ہے اور اس کے جلال و جبروت کے آگے گڑگڑاتا ہے۔ یہ کلمہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے (سورۂ توبہ، آیت ۱۱۵) میں ذکر ہوا ہے۔

قانت

یعنی عابد۔ خدا کی بارگاہ میں خاضع وخاشع رہنے والا اور اس کی جناب میں سرِ تسلیم خم کرنے والا۔ یہ لفظ حضرت ابراہیمؑ کے لئے (سورۂ نحل، آیت: ۱۲۲) میں ذکر ہوا ہے۔

خیر

خوب اور نیک، بہتر اور نیکوکار۔ یہ لفظ حضرت اسماعیلؑ، الیسعؑ، ذاالکفلؑ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے لئے (سورۂ ص، آیت: ۴۸ و ۴۷) میں ذکر ہوا ہے۔

مصطفیٰ

پاک، برگزیدہ، انتخاب کیا ہوا یعنی وہ شخص جو دوسروں سے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ یہ کلمہ حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ و یعقوبؑ کے سلسلے میں استعمال ہوا ہے۔ (سورۂ ص، آیت ۴۵)

مقرّب

یعنی خدا سے نزدیک ہو یعنی تمام انسانی پاکیزہ صفات و فضائل و کمالات سے نہ صرف آراستہ ہو بلکہ ان میں اس قدر پیش قدم ہو کر فضائل و کمالات کے منبع یعنی خدا سے نزدیک ہو جائے اور اس کے لطف و عنایات کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ یہ لفظ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں (سورۂ آل عمران آیت: ۴۷) میں ذکر ہوا ہے۔

... ت ... حقیقت سے نعب

وجیہ

آبرومند، محترم، قابلِ ستائش اور دنیا و آخرت میں سر بلند ۔ یہ کلمہ حضرت عیسیٰؑ کے لئے (سورۂ آل عمران، آیت: ۴۵) میں آیا ہے ۔

سیّد

پاک و پاکیزہ، آزاد منش، جو شخص روحی طور پر آقا و سردار اور طبعی و فطری طور پر محکم و پائدار ہو اِن کہ اُن کے سامنے نہیں جھکتا، چاپلوسی نہیں کرتا ۔ مادی طاقتیں اور ہیبتیں اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں ۔ یہ لفظ حضرت یحییٰؑ کے بارے میں (سورۂ آل عمران، آیت ۳۹) میں ذکر ہوا ہے

ذاالاید

یعنی قوی و توانا اور جو شخص ہنرمند ہو ۔ یہ کلمہ حضرت داؤدؑ کے لئے (سورۂ صٓ، آیت ۱۷) میں ذکر ہوا ہے ۔

ناصح

خیر خواہ، پند و نصیحت کرنے والا ۔ جو شخص صرف لوگوں کی بھلائی چاہتا ہے اور اس راہ میں جدوجہد کرتا رہتا ہے ۔ اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی خدمت کرے ۔ یہ لفظ حضرت ہودؑ کے بارے میں (سورۂ اعراف، آیت: ۶۸) میں ذکر ہوا ہے ۔

بعض صفات ایسے بھی ہیں کہ انبیاء کرام سے ان کی نفی کی گئی ہے مثلاً :

جبار

یہ حضرت یحییٰؑ کے بارے میں آیا ہے کہ وہ جبار یعنی سرکش، ظالم، قاتل، ستمگر اور جارح نہیں تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ صفات جو قیصر و کسریٰ میں پائے جاتے تھے پیغمبرؑ سے ان کی نفی کی گئی ہے ۔ (سورۂ مریم، آیت ۱۴)

عصی

جناب یحییٰؑ کے بارے میں یہ بھی آیا ہے۔ یعنی آپ حکم خدا کے مقابلہ میں نافرمان و گستاخ نہیں تھے۔ اور معصیت و گناہ نے آپ کے دامن کو آلودہ نہیں کیا ہے۔

بقیہ صفات و فضائل کو پیغمبر اسلامؐ سے مخصوص بحث کے ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

آخر میں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ جسطرح انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کی اساس مشترک اور ایک ہے اسی طرح ان کے فضائل و صفات بھی ایک جیسے اور مشترک ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک صفات بعض پیغمبروں کے لئے ذکر کئے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صفات و فضائل کا ظہور ان پیغمبروں سے مربوط واقعات و حادثات کے ذریعہ زیادہ ہوا ہے۔ یا ان پیغمبروں کی زندگی میں ان صفات کے جلوے دوسرے انبیاء سے زیادہ نظر آئے ہیں۔ اگرچہ مذکورہ تمام صفات و فضائل کو عمومی طور سے سبھی انبیاء کے فضائل میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعض صفات

قرآن میں انبیائے کرامؑ کے معنوی چہرے سے متعلق بحث کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ چند آیات کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بھی اشارہ کر دیا جائے۔ اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے سلسلہ میں الگ سے مستقل اور مفصل بحث آئندہ کی جائے گی۔

عبد

سورۂ حدید کی نویں آیت میں ارشاد ہے کہ "خدا ہی ہے جس نے اپنے بندہ (محمدؐ) پر کھلی ہوئی نشانیاں نازل کی ہیں" ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ عبد وہ بہترین صفت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ کیونکہ خدا کی بندگی ہی میں آزادی ضمیر، سربلندی، استقامت و پائداری، شہامت و اولوالعزمی اور تسلیم و رضا جیسے صفات پوشیدہ ہیں۔

کریم

سورۂ حاقہ کی آیت: ۴۰ میں ارشاد ہے: "اِنَّہٗ لَقَولُ رَسُولٍ کَرِیمٍ" بے شک یہ رسول کریم کا قول ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کریم کے معنی بزرگی ، کرامت نفس اور درگزر کرنے

کے ہیں۔

سورۂ قلم کی پانچویں آیت میں ارشاد ہے: "وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" بلاشبہ آپ عظیم و بہترین خلق و عادات کے مالک ہیں۔ اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام بہترین خوبیوں، اخلاق حسنہ اور عظیم روحی صفات سے آراستہ تھے۔ آپ ایسے باعظمت صفات کے حامل تھے کہ خود خدا بھی ان خصال و صفات کو "عظیم" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۸ میں پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں ارشاد ہے: "اَلَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمَاتِہٖ" وہ پیغمبرؐ جو خدا اور کلمات الٰہیہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اپنے مقصد و ہدف پر ایمان رکھنا ایک ہادی و رہبر کے ضروری و ممتاز صفات میں سے ہے۔ جو رہبر ہے اسے چاہیئے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر یقین و ایمان بھی رکھتا ہو۔ ورنہ موسمی لیڈر اور خود خواہ رہبر تو اپنے خاص حالات کے تحت باتیں بناتے ہیں اور اپنی پالیسیوں میں تبدیلیاں لاکر پے در پے اپنے منافع و مصالح کے تحفظ کے تحت نئے نئے منصوبے پیش کرتے ہیں۔ انبیاء کرامؑ کی ترقیوں کی اولین شرط خدا اور اس کے احکام پر ان کا محکم و پائدار ایمان تھا اور حضرت رسول اکرمؐ کے سلسلہ میں اس حقیقت کی صراحت کی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ" آل عمران / ۱۵۹

یعنی لطف و رحمت پروردگار کی خاطر آپ لوگوں کے لئے نرم دل اور مہربان ہو گئے اور اگر بدخو و سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے دور ہو جاتے اور پراگندہ ہو جاتے۔

چنانچہ اخلاق آنحضرتؐ عدیم المثال تھا۔ آپ نرم گفتار اور مہربان تھے۔ خشونت اور سخت گیری آپ میں نام کو نہ تھی۔ سورۂ والنجم کی آیات ۲، ۳ اور ۴ میں ارشاد ہے:

"مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی"

یعنی تمہارا پیغمبر نہ گمراہ ہے اور نہ دھوکہ دینے والا ہے وہ اپنی خواہش نفسانی کے تحت کلام نہیں کرتا۔ اور جو کچھ بھی کہتا ہے اس پر وحی نازل ہوئی ہے۔

ان آیات کے ابتدائی فقروں میں پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی سے دھوکہ و فریب و گمراہی کی نفی کی گئی ہے اور اس کے بعد اس کا اضافہ کیا گیا ہے کہ آپکی باتیں ہوس و بیجا اغراض سے آلودہ نہیں ہوتیں اگر کسی میں مذکورہ دو تین پہلو صحیح معنی میں نہ پائے جائیں تب بھی وہ انسانی و معنوی فضائل و کمالات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی تائید کر جو کچھ آپؐ فرماتے ہیں اس کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے اور وہ وحی کی شکل میں آپ پر نازل ہوتا ہے۔ یہ امر خود آپ کے احکام و آثار کو کس قدر وقعت و عظمت عطا کرتا ہے۔

قیام۔ سجود۔ سورۂ شعراء کی ایک آیت نمبر ۲۱۸ میں ارشاد ہے: "وہ خدا جو تمہیں بحکام نماز قیام کی حالت میں اور جب تم سجدہ کرنے والوں کے ہمراہ سجدہ میں غلطاں ہوتے ہو دیکھتا ہے" یہ آیت خدائے برتر کی عبادت و پرستش کے تحت پیغمبر اکرمؐ کے والا مقام اور اس کی بارگاہ میں ان کے خضوع و خشوع کو ظاہر کرتی ہے۔ آپؐ کے اندر خدا کی عبادت و بندگی کا اس قدر انہماک ہے کہ خدا خود اس کا تذکرہ اس شان سے فرماتا ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت: ۱۲۸ میں ارشاد ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ"

درحقیقت تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک پیغمبر آیا ہے جس پر تمہاری تکالیف و مصائب شاق ہیں اور جو تمہاری نجات اور خوشبختی کا صد درجہ خواہاں ہے اور صاحبانِ ایمان پر بے انتہا مہربان و رحیم کرنے والا ہے"

اگر اس آیت پر خوب دقت کی جائے تو عالم تاریخ کا ایک عالی ترین اور درخشاں ترین چہرہ اس میں نظر آئے گا۔ ایسا شخص جس کی روح پر لوگوں کے رنج و غم، فقر، جہالت، اختلاف، ذلت غلامی، فساد و بدبختی گراں گزرتے ہیں اور وہ ان باتوں سے اپنے قلب پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہے۔ یعنی وہ سب سے زیادہ لوگوں کی ہلاکت و بدبختی پر فکر مند ہوتا ہے اور ان کی پستی و جہالت پر رنجیدہ خاطر ہوتا ہے۔ یہ شخصیت ان سب سے الگ ہے جو صرف اپنے لئے سوچتے ہیں اور اپنی فقر و ناتوانی پر غمزدہ ہوتے ہیں۔ وہ تنہا سب کے درد اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی بلند و بالا روح کی حامل شخصیت بنی نوع انسان کی نجات کے سلسلہ میں کس قدر فدا کاری سے کام لے گی اور اسے لوگوں کی بھلائی کا کتنا خیال ہوگا۔ اس آیت سے ہمیں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ آنحضرتؐ لوگوں کی سعادت و نیک بختی کے لئے بے انتہا حرص و طمع رکھتے ہیں یعنی آپؐ کو صرف لوگوں کی نجات و خوش بختی اور خدمت خلق کی فکر اور والہانہ شوق ہے۔ وہ شخص جس کی تمام تر فکر و کوشش لوگوں کی ہلاکت و جہالت دور کرنا اور لوگوں کی خدمت کرنا ہو وہ خود غرض خود خواہ اور مطلبی نہیں ہو سکتا۔ اسے صرف اپنے نفع کی فکر نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگوں پر حد درجہ مہربان اور سراپا رحم و کرم ہے۔

وہ معاشرہ کی فلاح اور ہدایت و نجات کے کیف میں اس قدر غرق ہے کہ لوگوں کی گمراہی و ہلاکت پر رنج و غم میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ خداوند عالم سورہ "فاطر" کی آیت نمبر ۸ میں اسے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ" ان لوگوں کے سلسلہ میں اس قدر رنج و افسوس نہ کرو (کہ اس رنج و غم میں اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو) یہ مطلب قرآن کی متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ اور ان تمام آیتوں میں پیغمبر اسلامؐ کو لوگوں کے سلسلہ میں بے انتہا درد و الم کا احساس کرنے سے روکا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ اپنے پورے احساسات و جذبات کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کی فکر میں مشغول رہتے تھے اور ان کی بدبختی و گمراہی پر رنجیدہ خاطر ہو جایا کرتے تھے۔ آپؐ دل سے یہ چاہتے تھے کہ سب راہ راست پر آجائیں اور خوشبختی و کمال حاصل کریں۔ سچ ہے کہ: "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" "خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کسے شخص کو منصب رسالت کے لئے انتخاب فرمائے" (سورۂ انعام، آیت: ۱۲۵)

معجزہ

نبوت کی بحث میں جن مسائل کا ذکر ضروری ہے ان میں ایک معجزہ بھی ہے۔ معجزہ کا مطلب ہے "اعجاز" یعنی لاجواب کردینا۔ چونکہ پیغمبر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ خدا کی جانب سے اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور وحی دراصل ایسی چیز نہیں ہے جسے انسان درک

کر سکے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ لوگوں پر کسی اور ذریعہ سے اس کی پیغمبری کی حقانیت ثابت ہو تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حقیقتاً خدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت پر مامور کیا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کے احکام و معارف کی پائیداری، گفتگو میں حسن تاثیر، کلام کی دلنشینی اس کی ذاتی پاکیزگی اور صلح جوئی، عفو و درگزر، فداکاری، خیر خواہی، خدمت کا جذبہ اور معاشرہ کی فلاح و نجات سے اس کا لگاؤ ہی بہت سے لوگوں کے لئے اس کی نبوت کی کافی و محکم دلیل ہے اور اسی وجہ سے لوگ اس پر ایمان بھی لاتے ہیں لیکن پیغمبرؐ کے لئے بہرحال معجزہ ضروری ہوتا ہے کیونکہ مذکورہ بالا کمالات و صفات جھوٹوں، منفعت پرستوں اور باطل کا ادعا کرنے والوں کے لئے راہیں بند نہیں کر سکتے اور ممکن ہے یہ لوگ یوں ہی اپنے حق میں بھی توہمات کے جال بُن کر ان کی صداقت و حقانیت کا دعویٰ کرنے لگیں اور اپنی دعوت کو بہتر اور اپنے کلام کو پُر اثر ثابت کرنے کی باتیں کریں

قرآن میں معجزہ کو آیت اور بیّنہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی پیغمبروں کی رسالت کی نشانی اور ان کی حقانیت کو آشکار کرنے والا عمل یا اثر۔ معجزہ کسی بھی علمی پیمانہ یا معیار پر پرکھا نہیں جا سکتا اور نہ ہی لوگوں کے لئے قابل عمل ہے۔ کوئی بھی شخص کتنا ہی ماہر فن و ہنرکار ہو کسی بھی علم یا طاقت و ہنر کے ذریعہ وہ عمل انجام نہیں دے سکتا۔

معجزہ، جادو، سحر، شعبدہ بازی، دست شناسی، فال گیری، علم جبر، علم اعداد، طلسمات یا پیشین گوئی یا ریاضت کشوں کی حرکتوں سے بڑا فرق رکھتا۔ کیونکہ اس طرح کے امور زیادہ تر خرافات ہونے کے علاوہ۔ دروغ گویوں اور دھوکہ بازوں کے ہاتھوں کے ہتھکنڈے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر کسی شاذ و نادر موقع پر کوئی عمل انجام پا جائے یا یہ لوگ اگر کوئی پیشین گوئی کر بھی دیتے ہیں تو یہی عمل دوسرے بھی انجام دے سکتے ہیں۔ یعنی ایسا ہی جادو یا شعبدہ بازی وغیرہ دوسرے جادوگر یا شعبدہ باز بھی کر دکھاتے ہیں بہرحال یہ ایک ایسا فن یا حیلہ گری ہے جو ان ہی جیسے لوگوں کے ذریعہ قابل تکرار یا قابل تقلید ہے۔ اس کے علاوہ ایسے امور نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ اکثر و بیشتر ان ہتھکنڈوں کے ذریعہ لوگوں کے سامنے ایسی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جو حقیقت و واقعیت کے خلاف ہوتی ہیں۔ اور اس سے قطع نظر کہ یہ کام دوسرے بھی انجام دے سکتے ہیں آدمی انھیں ظاہر کرنے کے لئے کسی آلہ، وسیلہ اور کسی خاص منصوبہ و نقشہ کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ اور یہی وسائل و آلات، اور منصوبے اس عمل کو دوسروں کے لئے بھی قابل عمل بنا دیتے ہیں

معجزہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ ایک ایسی واقعیت ہے جسے سب محسوس کرسکتے ہیں جبکہ اس کے اجراء کے لئے کسی آلہ یا وسیلہ کا سہارا بھی نہیں لینا پڑتا۔ یعنی ایسا مُردہ جو برسوں پہلے موت کا شکار ہوکر اس دنیا سے کوچ کرچکا ہے جناب عیسیٰؑ کے حکم سے خاک سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوسرے زندہ انسانوں کی طرح زندگی گزارنے لگتا ہے جبکہ اسے زندہ کرنے میں نہ کوئی دوا یا وسیلہ کام میں لایا گیا اور نہ یہ ایسا عمل ہے جسے دوسرے انجام دے سکتے ہیں۔

اب جبکہ ایک حد تک معجزہ کی حقیقت اور اس کی ضرورت واضح ہوگئی۔ اس سے متعلق دو بنیادی بحثوں کی جانب توجہ بھی لازمی ہے

۱۔ قرآن کی رو سے انبیاء کی حیات میں معجزہ کا وجود۔

۲۔ علم اور معجزہ کے درمیان ہم آہنگی۔

پہلی بحث کے سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء کرام کی جانب جن معجزات کی نسبت دی گئی ہے ان کی تاویل و توجیہ عادی و معمولی حادثات و واقعات کی شکل میں کی جاسکتی ہے۔ اور بظاہر اس تاویل و توجیہ کے لئے انھوں نے خاصی زحمتیں بھی اٹھائی ہیں کہ کسی بھی طرح معجزہ کے سلسلے میں موجودہ علوم کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات سے چھٹکارا پالیں۔ ہم کسی اور مسئلہ میں پڑنے سے پہلے ایک نگاہ قرآن پر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ واقعی قرآن نے معجزات کی نسبت انبیاء کی طرف دی ہے اور انھیں اس کمال سے متصف فرمایا ہے یا نہیں تاکہ بعد میں ہم علم اور معجزہ کے درمیان رابطہ پر گفتگو کرسکیں۔

انبیائے کرام کے معجزات

۱۔ حضرت ابراہیمؑ

سورۂ بقرہ کی آیت: ۶۰ میں ارشاد ہے، ابراہیمؑ نے خداوند عالم سے درخواست کی کہ وہ انھیں دکھادے کہ قیامت کے دن مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ خدا نے فرمایا: کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا میں قیامت اور مُردوں کے زندہ کئے جانے پر ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں میرا قلب مطمئن ہو جائے۔ خداوند عالم نے حکم دیا چار پرندوں کو پکڑ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے

کرڈالو اور سب کا گوشت باہم ملا دو اور ہر پہاڑ پر اس گوشت کا کچھ حصہ رکھ دو پھر ہر پرندہ کو آواز دو تم دیکھو گے کہ کس طرح ہر ایک کے بدن کے ٹکڑے آکر باہم مل جاتے ہیں اور دوبارہ وہ پرندہ مکمل شکل و صورت میں زندہ ہو جاتا ہے ۔

یا سورۂ ہود کی ۷۲ ویں آیت میں جناب ابراہیمؑ اور ان کی زوجہ کے عالم پیری میں صاحب اولاد ہونے کی خوش خبری ہے ان کی زوجہ اس قدر ضعیف ہو چکی تھیں کہ اولاد کی امید ہی سرے سے ختم ہو چکی تھی ۔ آیت انھیں صاحب اولاد ہونے کا مژدہ سناتی ہے ۔ اسی طرح سورہ انبیاء کی آیت : ۷۰ میں مہیب آگ کا واقعہ ذکر ہے جو جناب ابراہیمؑ کو نذر آتش کرنے کے لئے بھڑکائی گئی تھی اور انھیں اس میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ آگ خداوند عالم کے حکم سے جناب ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی ہو کر سلامتی کا باعث بنی ۔

۲۔ جناب موسیٰؑ

سورۂ اعراف ۱۵۹ ویں آیت میں جناب موسیٰ کے اس عصا کا واقعہ مذکور ہے جسے آپ نے پتھر پر مارا تو اس سے بارہ چشمے ابلنے لگے ان بارہ چشموں سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے سیراب ہوتے تھے سورۂ طٰہٰ کی آیات : ۱۷ تا ۲۲ میں عصائے جناب موسیٰ کا یہ واقعہ ذکر ہوا ہے کہ آپ نے اسے خدا کے حکم سے زمین پر ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک خطرناک اژدھا بن کر حملہ کرنے لگا ۔ جناب موسیٰ کو حکم ہوا اسے دوبارہ ہاتھ میں پکڑ لیں آپ نے جیسے ہی اسے اٹھایا وہ دوبارہ عصا بن گیا ۔ اس آیت میں "ید بیضا" کا واقعہ بھی ذکر ہوا ہے ۔ یعنی جناب موسیٰ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں لے جاتے اور جب باہر نکالتے تھے تو وہ نور سے درخشاں ہو جاتا تھا ۔ سورۂ شعراء کی آیت : ۶۳ میں ہے کہ جناب موسیٰ اپنا عصا دریائے نیل پر مارتے ہیں اور اس کے درمیان موسیٰ اور انکی قوم کے لئے راستہ بن جاتا ہے اور سب کے سب دریا کے پار ہو جاتے ہیں ۔

۳۔ حضرت سلیمانؑ

سورۂ نمل کی آیات (۱۸ تا ۴۱) میں جناب سلیمان ؑ کا چیونٹی سے باتیں کرنا ۔ ہدہد سے کلام کرنا ، جنوں کا آپ کی مدد کرنا ، تخت بلقیس (ملکۂ سبا) کا ایک طویل مسافت طے کر کے پلک جھپکتے آپ کے دربار میں لایا جانا ذکر ہوا ہے ۔

۴۔ حضرت عیسٰیؑ

سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ میں جناب مریمؑ کے صاحب اولاد ہونے اور بغیر کسی مرد کی قربت کے انھیں جناب عیسٰیؑ کی ماں بننے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ نیز قرآن میں جناب عیسٰیؑ کے گہوارہ میں کلام کرنے پرندہ کا مجسمہ بنا کر اس میں روح پھونکنے اور زندہ کرنے، اندھے و بہرے افراد کو شفا بخشنے مُردوں کو زندہ کرنے اور جو کچھ لوگوں نے کھا رکھا تھا یا گھروں میں چھپا رکھا تھا اس کی خبر دینے کا تذکرہ موجود ہے

۵۔ حضرت یونسؑ

سورۂ یونس کی آیت ۹۸ میں یہ واقعہ ہے کہ جناب یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا اور ایک زمانہ تک آپ اسی کے پیٹ میں زندہ رہے اور آخر کار ایک روز اس سے نجات پائی۔

۶۔ حضرت داؤدؑ

سورہ انبیاء کی آیت : ۷۸ میں جناب داؤدؑ کے ذریعہ پہاڑوں اور پرندوں کے تسخیر ہونے کا ذکر موجود ہے۔

۷۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

سورۂ بقرہ کی آیت : ۲۳ میں قرآن کے اعجاز ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کے ایک سورہ کا بھی جواب نہیں لا سکتا۔ یہ ان سیکڑوں اعجاز آمیز واقعات کے چند نمونے تھے جنھیں قرآن مجید انبیاء کرام کے سلسلہ میں بیان کرتا ہے۔ اس قسم کی آیات پر غور کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ قرآن کی نظر میں انبیاء کے لئے معجزہ کو قطعی قرار دیا گیا ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ آیا معجزات علمی معیار و میزان پر پورے اترتے ہیں یا نہیں اور اگر علمی معیار پر پورے نہیں اترتے تو ان کی توجیہ کس طرح کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ بحث ہے جسے ہم آئندہ پیش کریں گے۔

معجزہ کی محدودیت

یہاں ایک چھوٹے سے نکتہ کی جانب اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہر پیغمبر مخصوص معجزہ یا معجزات کا حامل رہا اور اس نے ان معجزات کو خداوند عالم کے اذن سے ضروری و لازمی مواقع پر لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جب بھی کسی نے چاہا یا فرمائش کی کہ وہ لوگوں کے حسب

دلخواہ معجز نمائی کرنے لگے اور ہر روز لوگوں کی دلبستگی کے لئے معجزہ دکھانے بیٹھ جائے۔ اصولاً انبیاء کرامؑ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے تشریف لائے تھے اور فقط خاص و محدود مواقع پر جیسی ضرورت ہوتی تھی خداوند عالم کے حکم سے ویسا معجزہ ظاہر فرماتے تھے۔ بہرحال نہ وہ لا محدود امکانات رکھتے تھے اور نہ لامحدود قدرت کے مالک تھے یہ اعجاز نمائی ہمیشہ اور لوگوں کے حسب دلخواہ نہیں ہوا کرتی۔ اس بنیاد پر ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بعض شیعوں کی اپنے ائمہ معصومینؑ سے یہ توقعات ان ہی بے جا توقعات کی شبیہ ہیں جو بعض افراد پیغمبرؐ سے رکھتے تھے اور آنحضرت سے ہر لحظہ معجزات کی فرمائش کیا کرتے تھے لیکن قرآن انھیں یہ جواب دیتا ہے کہ یہ کام پیغمبروں کی خواہش اور ان کی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ معجزہ خداوند عالم کے اذن اور اس کے حکم سے ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیئے کہ ان بزرگواروں کی زیارتوں اور ان سے توسل و ارتباط کے ذریعہ اپنے اخلاق و کردار کو سنواریں اور یہ نہ بھولیں کہ یہ حضرات ہماری زندگی کے رہبر و پیشوا ہیں نہ یہ کہ ہم ہمیشہ ان سے کسی معجزہ کی توقع رکھیں۔

علم اور معجزہ کا ربط

محققین کا ایک گروہ ادیان عالم کے سلسلہ میں جو رائے رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ معمولاً تمام آسمانی ادیان میں معجزہ کی بات سامنے آتی ہے اور انبیاء کرام اور دینی پیشواؤں سے متعلق ایسے ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں جو عادت و فطرت کے خلاف ہوا کرتے ہیں اور عام انسان ان امور کے انجام دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اصولی طور پر معجزہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ پیغمبران دین اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے ایسے کام انجام دیتے ہیں جنھیں دوسرے انجام نہیں دے سکتے۔ اس بنا پر لوگ متوجہ ہوتے ہیں کہ انبیاء ما فوق بشر قوت و طاقت کے حامل ہیں اور خداوند عالم کی جانب سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ اور یہ خدائے قوی و دانا ہی ہے جو ان کی حمایت میں ان کی صداقت و حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں ایسے امور ظاہر کرتا ہے۔

آج معجزہ کے سلسلہ میں بڑی بحثیں ہیں۔ لیکن یہاں جو موضوع پیش نظر ہے یہ ہے کہ علم اور معجزہ میں کیا رابطہ ہے۔ یعنی انبیاء کرامؑ کے معجزات کی توجیہ علمی قوانین کی روشنی میں کس طرح

کی جا سکتی ہے یہاں ایک اعتراض یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ :۔

ہم جانتے ہیں کہ علمی قوانین ثابت ، اٹل اور ناقابل تغیر ہیں اور ان کا یہی ثبات ودوام گوناگوں صنعتوں، حرفتوں، اختراعات وایجادات کا باعث ہوا ہے جبکہ معجزہ کے ذریعہ علمی قوانین اور مسلہ اصول ٹوٹتے نظر آتے ہیں ۔ اور چونکہ ہم قبول کر چکے ہیں کہ علم تغیر پذیر نہیں ہے ، لہٰذا ان معجزات کی حقیقت وواقعیت سے ہمیں انکار کر دینا چاہیئے اور اس انکار کا دامن خود بخود ادیان کے اصول تک پھیلتا چلا جاتا ہے ۔

مثال کے طور پر : ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا معجزہ ایک عصا تھا جسے آپ زمین پر ڈال دیتے تھے تو وہ ایک ایسے خطرناک اژدھے میں تبدیل ہو جاتا تھا جس سے لوگ وحشت زدہ ہو جاتے تھے ۔ جبکہ بنیادی طور پر لکڑی کے ایک ٹکڑے کا فطری قوانین ، فزیکس اور بایولوجی کی روشنی میں ایک زندہ عظیم وقوی حیوان میں تبدیل ہو جانا ممکن ہی نہیں ہے ۔

حضرت عیسیٰؑ مُردہ کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور پیدائشی اندھے کو آنکھ والا بنا دیا کرتے تھے ۔ جبکہ ایک بے جان جسم میں جان ڈالنا علمی نقطۂ نظر سے ایسا مسئلہ ہے جو اب تک حل نہیں ہو سکا ہے ۔ میڈیکل سائنس اور بایولوجی اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتی ۔ یہی صورت قوم موسیٰؑ کے لئے دریا کے دو حصوں میں تقسیم ہو کر راستہ بن جانے اور جناب ابراہیمؑ کے لئے آگ کے سرد ہو جانے جیسے معجزات کی ہے ۔

اس اعتراض کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے جن میں سے ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

(۱) پہلا جواب وہی عام طور پر دیا جانے والا جواب ہے جسے تمام اہل دین اپناتے ہیں ، اور وہ یہ کہ یہ معجزات خداوند عالم کے اذن اور اس کے ارادہ سے انجام پاتے ہیں ۔ اور خدا کی قدرت و قوت کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے ۔ یعنی جو خدا ہر شئی کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور ہر شئی کا خالق ہے وہ جناب عیسیٰ کی طرح ایک انسان کو بغیر باپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے ۔

اس سلسلہ میں اک ذرا گہرائی میں اتر کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم اور طبیعی ، فطری قوانین دراصل اشیاء کے باہمی ارتباط ، تاثیر و تاثر اور مثبت و منفی عوامل کا ہی نام ہے جو اس

جہانِ خلقت میں پائے جاتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم اس کائنات کا خلق کرنے والا ہے اور اس نے ہی ہر چیز کے لئے ایک حساب اور ایک قانون معین فرمایا ہے۔ یعنی یہ تمام قوتیں عوامل و قوانین عناصر و موجودات عالم کے تغیر و تبدّل کی ہی حکایت کرتے ہیں۔ اور یہ سب خدا کے تکوینی مقررات ہیں جو عالم کی خلقت کے ساتھ ہی مقرر کر دیئے گئے ہیں جیسا کہ قرآن فرماتا ہے "یہ چاند و سورج ایک نظام اور ایک طے شدہ حساب و کتاب کے تابع ہیں۔ خدا نے آسمان کو بلند فرمایا اور ہر چیز کے لئے ایک میزان اور ایک نظم قائم کیا ہے۔" (سورہ رحمٰن آیات ۵، ۴۔۷)

اب جبکہ یہی نظام خلقت علم ہے، تو اس کائنات کو نظم عطا فرمانے والا خود اپنے بنائے ہوئے نظم و قانون کا ہرگز پابند و مجبور نہیں ہے۔ اگرچہ نظام عالم کی حفاظت اسے استحکام و قاطعیت بخشنے اور تمام موجودات عالم فطرت کی باہمی روابط کو برقرار رکھنے کے لئے خدا خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی رعایت کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے پیدا کردہ نظام کی بنیاد پر ہی چلاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس نظام کو تبدیل کرنے سے مجبور نہیں ہے خاص طور پر اس وقت جب کوئی مصلحت درپیش ہو اور یہ عمل لوگوں کی بیداری اور انسانی معاشرہ کی آگاہی کے لئے مفید بھی ہو۔ ایسی صورت میں وہ عام نظام کے خلاف روابط کا ایک نیا سلسلہ قائم کر دیتا ہے مثال کے طور پر عورت کے نطفے سے انسان خلق فرماتا ہے۔ یا جلا دینے اور پگھلا دینے والی آگ کو نہ صرف سرد بنا دیتا ہے بلکہ اس میں حفاظت و سلامتی کے عناصر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ خدا کی قدرت لامحدود ہے اور وہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کا پابند نہیں ہے۔

۲۔ ایک دوسری راہ حل جو شاید زیادہ قابل قبول ہو، یہ ہے کہ بہت سے دانشوروں اور فلسفیوں کا اعتراف ہے کہ انسان ابھی دنیا کی حقیقت و واقعیت کو نہیں پہچان سکا ہے۔ وہ ابھی تمام قوانین، اثر انداز عوامل اور موجودات عالم کو بخوبی دریافت نہیں کر سکا ہے۔ علمی قوانین کی بنیادیں ثابت، استوار اور قطعی ہونے کے باوجود نسبی و تغیر پذیر ہیں کیونکہ ایسے ناشناختہ عوامل بھی ہیں جو ان موجودات میں تغیر و تبدیلی لاتے ہیں۔ اسی وجہ سے آئن اشٹائن کے نسبیت کے قوانین نے فزکس اور علمی قوانین اور بنیادوں کو دگرگوں کر دیا اور جسم سے متعلق

زمان و حرکت و رفتار اور اسی طرح کے بہت سے مسائل سامنے آئے۔ اگرچہ انسان اپنے علمی ارتقاء کے ہر مرحلے میں اپنی معلومات سے ایک حد تک استفادہ کرنے اور ان سے اپنی زندگی کے بعض مسائل کو حل کرنے میں کامیاب رہا ہے مثلاً "بطلیموس" کے علم ہیئت جس میں وہ زمین کو ساکن اور کائنات کا مرکز تصور کرتا تھا۔ اگرچہ یہ خیال بے بنیاد تھا لیکن اس کے باوجود اس علم نے صدیوں تک انسان کو ماہ و سال، بروج نیز چاند گہن اور سورج گہن کے حساب و کتاب وغیرہ میں مدد دی۔ بعد میں کائنات کے بارے میں "کوپرنیک" اور کیپلر" کی دریافت و انکشافات سے ستاروں کی حرکت اور ان کے مکمل نظام کی معلومات کے متعلق نئے نئے مسائل سامنے آئے اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقیوں کی نئی راہوں پر چل پڑا۔ اور آج انسان اپنے بنائے ہوئے مصنوعی چاند اور سیاروں کے ذریعے فضاؤں اور ستاروں سے متعلق نت نئے انکشافات کی جانب گامزن ہے۔

امیبوں، مائیکروبوں، بیکٹیریاؤں، وائرسوں اور مختلف قسم کے دوسرے جراثیم کی ایک دنیا ہزاروں سال سے انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ اور ناشناختہ تھی۔

یوں ہی ایٹم کی دنیا بھی علم کی نگاہوں سے عرصہ تک پنہاں رہی اور اس کے انکشاف کے بعد ہی بے شمار نئے نئے علمی مسائل سامنے آئے اور اس عظیم قوت نے کیسے کیسے انقلابات کو جنم دیا۔

آج بھی انسان خود کو اس راہ میں ایک ایسا طفل محسوس کرتا ہے جس نے ابھی چلنا سیکھا ہو۔ وہ اپنی کوششیں مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہر لمحہ اس چمن سے ایک نیا پھول چنتا ہے۔ اس مختصر سے مقدمہ سے یہ بات روشن و واضح ہو جاتی ہے کہ انسان ابھی تک اشیاء کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اور علم تمام قوانین فطرت اور اشیاء کے باہمی ارتباطات کا احاطہ نہیں کر پایا ہے۔ سب تو سب خود انسان بھی علم کی روشنی میں ایک سربستہ راز اور "لامعلوم" وجود کی حیثیت رکھتا ہے، بڑے بڑے دانشور انسانی فیزیالوجی اس کی عقل و فہم کے رموز، یہاں تک کہ سماجیات کے میدان میں خود کو مبتدی اور تازہ وارد خیال کرتے ہیں اور ان علوم کے بہت سے شعبوں میں تو مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ ابھی شروع ہوا ہے۔

اس بنا پر ہم آج بھی قطعی طور پر علمی قوانین کے ذریعہ معجزات کا تجزیہ یا ان کی توجیہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہم ابھی تک کائنات میں کار فرما تمام عوامل کو پہچان نہیں پائے ہیں ۔ جس طرح ایک دن آسمانوں میں انسانی پرواز یا آواز یا تصویر کا دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں حتیٰ لاکھوں کیلومیٹر دور تک منتقل ہونا فقط ایک پہیلی تھا بلکہ محال نظر آتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ سب باتیں معمولی اور آسان ہو گئیں ۔ یوں ہی معجزہ کو بھی غیر ممکن یا بر خلاف علم تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

ہاں ہم ثابت مانتے ہیں کہ معجزہ ایک غیر معمولی عمل ہے جو قوانین عالم، انسانی معلومات اور انسان کی محدود قوت و توانائی کے بس سے باہر ہے ۔ اس روش و راہ حل کو دیکھتے ہوئے ہم مجبور نہیں ہیں کہ پہلی روش کو تسلیم کرتے ہوئے معجزات کو خود قانون بنانے والے کی جانب سے ایک طرح کی قانون شکنی سمجھیں ۔ بلکہ ممکن ہے کہ معجزہ صد فی صد قانونی ہو، لیکن ان قوانین کے تحت کار فرما ہو جنھیں ہم ابھی نہیں جانتے ۔

قرآن اور راہ ھدایت

تہذیب نفس

کے ذریعہ انبیاءؑ کی پیروی

جناب جوادی آملی

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

آٹھویں اعتراض کا تیسرا حصہ

گذشتہ بحث میں آٹھویں اعتراض کے دوسرے حصہ کا جواب دیا گیا۔ اب اس اعتراض کے آخری حصہ پر بحث مقصود ہے۔ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی کیا ضرورت کہ منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے پھریں؟ اگر ہم دنیا کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ کتاب و سنت سے مدد حاصل کریں اور تہذیب نفس کے ذریعہ منزل کمال تک پہنچ جائیں!

جواب یہ ہے کہ یہ راہ حکمت و فلسفہ کو مسترد نہیں کرتی بلکہ یہ وہ راہ ہے جسے گذشتہ صدیوں میں بھی بعض فلسفیوں نے اپنایا ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض لوگوں نے یہ کوشش کی ہے کہ جو کچھ انبیاء کرامؑ احکام و قوانین کی شکل میں لے کر آئے ہیں ان کی پیروی تہذیب نفس کے ذریعہ کریں۔ اور یہ بحث کی دوسری منزل ہے کیونکہ تہذیب نفس سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ: آپ جو تہذیب نفس کرنا چاہتے ہیں تو کیا آپ کی خواہش یہ نہیں ہے کہ جو کچھ آپ نے سمجھ لیا ہے اسے دوسروں سے بیان بھی کریں، اور اپنی بات کو دلیل و برہان کے ذریعہ ثابت کریں؟ اگر چاہتے ہیں تو یہی منطق کی راہ ہے لیکن اگر ہمیشہ کے لئے خاموش رہنا چاہتے ہیں جیسے بعض افراد ساکت و خاموش تھے تو یہ بھی

افلاطونی فلسفہ کی روش ہے۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فلسفہ خراب چیز ہے! اور ہمیں تہذیب نفس کی روش کو اپنانا چاہیئے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم فلسفہ کے بعض حصہ کو قبول کرتے ہیں اور بعض سے انکار کرتے ہیں۔ بالکل یوں ہی جیسے کوئی کہے کہ علم اصول کے مقدمات و مبادیات درست نہیں ہیں۔ میں اس علم کے اس حصہ کو تسلیم کرتا ہوں جو اصولی روش کے مقابل اور اس کی ضد، یعنی اخباریت ہے۔ اس شخص نے مقدمات میں دو میں سے ایک شعبہ کو قبول کر لیا جبکہ فقہ سے مخالفت نہیں کی جو اصولی و اخباری دونوں گروہوں میں مشترک ہے۔ وہ اصولی روش کے بجائے اخباری روش کے ذریعہ فقہ تک پہنچنا چاہتا ہے

تہذیب نفس کی راہ

بہر حال جس راہ کو یہ اعتراض کرنے والے تسلیم کرتے ہیں، ان ہی تک منحصر نہیں ہے، بلکہ اس راہ سے اسلام سے قبل سقراط اور اسلام کے بعد شیخ اشراق اور ان کے ہم فکر افراد بھی گذرے ہیں اور اس موضوع پر انہوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہم ان معترضین سے کہتے ہیں کہ اگر آپ تہذیب نفس کرنا چاہتے ہیں اور اس راہ میں مدتوں ریاضت کے بعد اس کا کچھ ثمرہ حاصل کرتے ہیں اور پھر آپ اسے رشتۂ قلم میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو آپ کی تحریر منطقی بنیاد پر استوار ہونا چاہیئے اور آپ کے پاس ایک عقلی پیمانہ اور میزان ہونا چاہیئے جس سے آپ سمجھ سکیں کہ جو کچھ آپ نے حاصل کیا ہے حق ہے یا نہیں؟ اور یہ بات ہر شخص پر صادق آتی ہے، سوائے اس شخص کے جو خود ہی میزان ہو۔ اور اس منزل پر صرف معصومین علیہم السلام فائز ہیں کیونکہ معصوم بذات خود "صراط" ہے، اس کے یہاں باطل یا شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ وہ خود میزان اور حق ہے اور جہاں حق ہی حق ہو، شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر: اگر ہمارے پاس ایک ایسا کتب خانہ ہو جس میں تفسیر کے علاوہ کسی اور موضوع کی کتاب موجود نہ ہو، تو ہم کسی کتاب کے بارے میں شک نہیں کریں گے کہ یہ تفسیر کی کتاب ہے یا حدیث کی، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ یہ تفسیر کی کتاب ہے اس لئے کہ اس کتب خانہ میں سوائے تفسیر کے کوئی دوسری کتاب ہے ہی نہیں، لیکن اگر کسی کتب خانہ میں تفسیر کی کتاب بھی ہو اور حدیث کی بھی تو ہر کتاب کے سلسلہ میں دو احتمال پایا جائے گا۔ اس لئے یہاں شک کی گنجائش موجود ہے۔

پس جس دائرہ میں حق کے علاوہ کچھ اور نہ ہو، قہری طور پر وہاں وسوسہ، باطل یا شیطنت کا گذر ہی نہ ہوگا۔ وہاں صرف عصمت کا بلند مقام ہے اور بس۔ لیکن جو لوگ اس درجہ پر فائز نہیں ہوئے لیکن انہوں نے تزکیۂ نفس کے ذریعہ ایک باعظمت مقام حاصل کر لیا ہے وہ بلاشبہ صرف خود کو مطمئن کرنا نہیں چاہتے بلکہ دوسروں تک حق پہنچانے کے بھی درپے رہتے ہیں، یہی وہ منزل ہے جہاں اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں کہ دوسروں کو سمجھانے کے لئے ایک آلہ یا میزان بروئے کار لائیں۔

بنابریں جس راہ کے لئے کہا گیا ہے کہ ہمیں کتاب وسنت کی روش اپنانا چاہیئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ، اگر انسان نفسانی ہوا و ہوس سے دور رہے اور اخلاقی رذائل و برائیوں سے خود کو پاک و پاکیزہ رکھے نیز روحانی فضائل اور اچھائیاں اپنے اندر پیدا کرے تو بہت سے مسائل اس پر روشن و واضح ہو جاتے ہیں اور یہ وہ دوسرا مرحلہ ہے جسے تزکیہ کہتے ہیں اور جسے انشاء اللہ آئندہ بیان کیا جائے گا یہی وہ راہ تھی جسے بعض یونانی فلسفیوں، اسلامی فلاسفہ اور حتی مغربی فلاسفہ نے بھی طے کیا ہے اور اس کی تائید کرتے ہیں۔ اگرچہ اس معنی و مطلب کی توجیہ و تشریح ہر گروہ اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے۔ مثلاً افلاطون کے پیروؤں کا بعض شواہد کی روشنی میں، خیال تھا کہ چونکہ روحیں، جسموں سے پہلے خلق ہوئی ہیں لہٰذا تمام ضروری علوم فطرتِ اولیہ کی بنیاد پر خود انسان کے اندر ذخیرہ کر دیئے گئے ہیں اور جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کی پوری کوشش یہی رہتی ہے کہ نسیان اور فراموشی کے پردے چھٹ جائیں اور وہ ذخیرہ شدہ علوم ظاہر ہو جائیں۔ اس طرح وہ علوم جو بالفعل انسان کی فطرت اور نہاد میں پوشیدہ تھے غفلت کے ان پردوں سے گرد و غبار کے صاف ہو جانے کے بعد اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔

اسلامی فلاسفہ کا استدلال

اسلامی حکما میں بھی جن لوگوں نے افلاطونی روش کو تسلیم کیا ہے، اکثر انہوں نے اس آیت "وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ....." (اور انھیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا۔ سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۷۲) سے تمسک کرتے ہوئے ان روایتوں سے استدلال کیا ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ ارواح جسموں سے ہزار یا ہزاروں سال قبل پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے علوم جو انسان کی

سعادت وخوش بختی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، فطری طور پر انسان کی روح میں پوشیدہ ہیں اور انسان کو اس کی جسمانی و مادی سرگرمیوں اور تعلقات وروابط نے ان سے غافل بنا دیا ہے۔ اسے چاہئے کہ تزکیہ وتہذیب نفس کے ذریعہ نفس اس غفلت وفراموشی کو دور کرے تاکہ وہ باطنی علوم اس پر ظاہر ہو جائیں۔

ایک دوسرا گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ تمام علوم انسان کے باطن میں موجود ہیں اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ تزکیہ اس لئے ہے کہ انسان اس صفحۂ روح کو آئینہ کی مانند شفاف رکھے کیونکہ اس صورت میں کہ عالم کے اسرار ورموز آئینۂ روح میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر انسان مکمل طور سے کائنات کی معرفت حاصل کرے گا۔ یہ انداز فکر ہمیں فلسفہ اشراق، مولانا روم کے اشعار اور ملا محسن فیض کاشانی کی "المحجۃ البیضاء" میں نظر آتا ہے۔

انسان میں اسرار عالم کی تابشیں

مثلاً ایک داستان جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے اور مولانا روم کی مثنوی نیز محجۃ البیضاء دونوں میں موجود ہے، کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص نے اپنے محل میں تزئین و نقاشی کرانا چاہی۔ اس نے اس کام کے لئے دو گروہوں کو بلایا تاکہ دیکھے کہ ان میں سے کس کا ہنر اچھا ہے۔ اس نے ایک ہی کمرہ کی دو دیواریں جو ایک دوسرے کے مقابل تھیں دونوں گروہوں کے حوالے کیں اور ان سے نقاشی کرنے کو کہا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کس گروہ کی فن کاری بہتر ہے، تاکہ پورا محل نقاشی کے لئے اس کے حوالہ کر دیا جائے۔

پہلے گروہ نے نقاشی کے لئے طرح طرح کے رنگ اور دوسرے وسائل طلب کئے اور اپنی پوری کوشش اس پر صرف کی کہ دیوار پر مکمل طور سے بہترین گل کاری کرے۔ دوسرے گروہ نے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا، اور کوئی ان کے کام کے راز سے بھی واقف نہ تھا لیکن یہ گروہ بھی اپنی کوشش میں مشغول تھا۔ مقررہ دن پر جب یہ طے تھا کہ دونوں گروہوں کی نقاشی کا معاینہ کیا جائے گا، لوگوں نے دیکھا کہ پہلے گروہ نے دیوار پر بڑی خوبصورت اور دلکش گل کاری کی ہے اور بہترین نقش ونگار منقش کئے ہیں لیکن دوسرے گروہ کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ اس مدت میں دیوار کو آئینہ کی مانند صاف وشفاف کر دے

جب پردہ سامنے سے ہٹایا گیا تو پہلے گروہ کی تمام محنتیں اور کوششیں سامنے والی دیوار میں منعکس ہوگئیں
اس داستان کے نقل سے ملا محسن فیض اور دوسرے افراد کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی کوشش و ریاضت کے ذریعہ اپنے باطن اور اپنی روح کو آئینہ کی مانند شفاف بنا ڈالے تو اسرار کائنات اس میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ تزکیہ وتہذیب نفس اسی لئے ہے کہ انسان اخلاق رذیلہ اور برائیوں سے بھی پاک ہوجائے اور اخلاق حسنہ سے اپنے نفس کو جلا بخشنے کی کوشش بھی کرے تاکہ وہ اسرار عالم کا آئینہ خانہ بن سکے۔

اس راہ کو نہ صرف شیخ اشراق نے اپنایا ہے بلکہ محقق طوسی خواجہ نصیرالدین نے بھی اس روش پر کچھ کاوشیں فرمائی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روش فلسفہ سے ٹکراؤ نہیں رکھتی، لیکن جو بات یہاں قابل ذکر ہے، یہ ہے کہ اگر کسی نے اس راہ کو طے کیا تو آخر ایک نہ ایک روز وہ اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ بیان کرے گا یا قلم اٹھائے گا۔ اگر اس نے کچھ لکھنا چاہا تو کم از کم اس میں بہرحال اتنی قوت وصلاحیت ہونا چاہیئے کہ اپنے علم حضوری کو حصولی کی کیفیت میں ڈھال سکے اور اس علم حضوری سے منکشف ہونے والی معلومات کو علم حصولی کے ذریعہ ثابت کرسکے۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو علم حضوری تو رکھتے ہیں لیکن اس کی ترجمانی کی منزل میں یا اسے علم حصولی میں تبدیل کرنے کے مرحلہ میں کامیاب نہیں ہوپاتے۔

شرع کے ذریعہ تزکیۂ نفس

ممکن ہے معترضین یہ کہیں کہ تزکیۂ نفس شرع کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اتفاق سے عرفائے اسلامی نے آپ سے پہلے یہ شرط معین کر رکھی ہے اور ان کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں۔

نمونہ کے طور پر، چند صدی قبل کے ایک عظیم عارف سید حیدر آملی (رہ) فرماتے ہیں: راہِ شرع کے علاوہ کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اور اگر کہیں وہ شریعت کو "قشر" یا چھلکے سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت پوست یا چھلکا ہے اور طریقت مغز یا گودا۔ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اس کی محافظ ہے میوے یا پھل کی حفاظت پوست یا چھلکا کرتا ہے۔

حضور قلب نماز کی حفاظت کرتا ہے۔ پس اگر نماز نہ ہو تو حضور قلب ہی نہیں ہے۔ یعنی "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ" (طٰہٰ، آیت نمبر ۱۴) "نماز کو ہماری یاد کے لئے قائم کرو"، ہی کی مثل نہیں ہے۔ اگر کوئی حضور قلب نہ رکھتا ہو تب بھی تمام فقہاء اپنے رسالۂ عملیہ میں لکھتے ہیں کہ اس کی نماز صحیح ہے لیکن وہ قبولیت جو حضور قلب کے ساتھ ہے اس صورت میں نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں: صحت، شریعت ہے اور قبولیت، طریقت۔ چنانچہ فاسق کی نماز بھی صحیح ہے لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس کی نماز مقبول بھی ہے "اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ" (المائدہ/۲۷) "خداوند عالم صرف صاحبان تقویٰ کا عمل قبول کرتا ہے"۔

پس یہ شرط جو اعتراض کرنے والے معین کر رہے ہیں، کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ان معترضین سے پہلے علمائے اسلامی نے بھی یہی شرط قائم کی ہے۔ سید حیدر آملی مرحوم اپنی کتاب "جامع الاسرار" میں فرماتے ہیں: جو کچھ وحی کی شکل میں نازل ہوا ہے اس سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو کچھ وحی نے بیان کیا ہے کیا یہی ظاہری معنی ہے یا کچھ باطنی معنی بھی ہے؟ یہاں ہم نمونہ کے طور پر ایک نکتہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ابوالقاسم کے معنی

شیخ صدوق اپنی کتاب "معانی الاخبار" میں ایک حدیث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: امام رضا علیہ السلام کا ایک شاگرد کہتا ہے کہ میں نے امامؑ سے سوال کیا کہ: رسول خداؐ کو "ابوالقاسم" کیوں کہتے ہیں؟

فرمایا: اس لئے کہ خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو قاسم نام کا ایک فرزند عطا فرمایا، اور حضرتؐ، قاسم کے پدر بزرگوار تھے۔ اس لئے آپ کو ابوالقاسم کہتے ہیں۔

میں نے عرض کی: کیا میں اس کا اہل ہوں کہ آپ میرے لئے اس مطلب کی مزید وضاحت فرمائیں؟

فرمایا: ہاں! کیا ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہؐ نے علی بن ابیطالبؑ کی تربیت کی ہے اور انھیں اپنے سایۂ مبارک میں پروان چڑھایا ہے؟ عرض کی: ہاں۔

فرمایا: کیا علیؑ "قَسِيْمُ النَّارِ وَالْجَنَّةِ" نہیں ہیں؟ عرض کی: ہاں ہیں۔

فرمایا: علی بن ابی طالبؑ کی تربیت رسول اللہؐ نے فرمائی تھی (اصل اول) اور علی بن ابیطالبؑ قَسِیمُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ ہیں (اصل دوم) اور چونکہ معلم، شاگرد کے لئے باپ کے برابر ہوتا ہے (اصل سوم) لہٰذا رسول اللہؐ ابوالقاسم ہیں۔ (۱)

اس طرح کے بہت سے لطائف ہماری روایات میں پائے جاتے ہیں اور عرفا ان مسائل کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ یہ حدیث شریف میں نے پہلی مرتبہ استاذ مرحوم شیخ محمد تقی آملی رضوان اللہ علیہ کے درس میں سنی تھی۔ آپ نے فرمایا: کاش اس راوی کا ظرفِ علم لبریز نہ ہوا ہوتا اور وہ حضرتؑ سے پھر اس کی مزید وضاحت دریافت کرتا۔ تاکہ ہم سمجھتے کہ حضرت اور کیا بیان فرماتے ہیں۔

شیخ صدوق نقل کرتے ہیں کہ زرارہ نے چھٹے امام (ع) سے دریافت کیا: کیا خداوند عالم قیامت میں دکھائی دے گا؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: کیا تم آج خدا کو نہیں دیکھتے! عرض کی: میں یہ روایت آپ سے نقل کروں؟

فرمایا: نہیں! تم نے اگر یہ حدیث مجھ سے نقل کی تو لوگ یہ خیال کریں گے کہ ان ہی آنکھوں سے خدا کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ "لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار" (الانعام/۱۰۳) "نگاہیں اسے نہیں دیکھتیں اور وہ نگاہوں کو دیکھتا ہے"

حضرت اپنے نابینا صحابی، ابوبصیر سے بھی فرماتے ہیں:

تم اس حالت میں بھی، اس وقت بھی خدا کو دیکھ سکتے ہو۔ یہ وہی روایت ہے جس میں قلب کے ذریعہ اور حقیقتِ ایمان کے ساتھ واقعیت کو دیکھا جا سکتا ہے، ان ظاہری نگاہوں سے نہیں۔

بنابراین، راہ دراصل دو نہیں ہے کہ ایک کو شریعت کہا جائے اور دوسری کو طریقت۔ بلکہ راہ ایک ہی ہے اور وہی علیؑ اور اولادِ علیؑ کی راہ ہے۔ لیکن ہمارے بعض بزرگ اور عرفا خصوصاً سید حیدر آملی مرحوم اس راہ کو تزکیۂ نفس کے ذریعہ طے کرتے نظر آتے ہیں۔

باقی آئندہ

بشکریہ پاسدار اسلام

۱۔ معانی الاخبار ص ۵۲

قال الحجة بن الحسن علیہ السلام

قلوبنا اوعیۃ لمشیۃ اللّٰہ

فاذا شاء شئنا

ہمارے قلب مشیت پروردگار کا ظرف ہیں

پس

جب خدا نے چاہا تو ہم نے بھی چاہا

بحار الانوار / ج ۵۲ / ص ۵۱

معاد

انبیاء اولیاء اور حکماء کی نظر میں

تحریر: آیۃ اللہ شیخ حسین نوری

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

اسلامی دنیا کے عظیم فلسفی "صدر المتألہین" شیرازی اپنی کتاب میں جو انھوں نے "مبدأ و معاد" کے نام سے تالیف فرمائی ہے، فرماتے ہیں: معاد کے موضوع پر ایمان و اعتقاد تمام ادیان اور شریعتوں کی بنیاد و اساس ہے، دنیا کے تمام ادیان کی عمارتیں اسی ستون پر قائم کی گئی ہیں اس مسئلہ پر تمام صاحبان ادیان و شریعت کا اتفاق ہے چنانچہ اقوام عالم میں کوئی قوم ایسی نہیں مل سکتی جن کے درمیان آخرت اور دوسری دنیا میں ثواب و عقاب اور اعمال کی جزا و سزا کے تحت وعدہ و وعید سے کام نہ لیا گیا ہو۔

اس اتفاق نظر اور وحدت عقیدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کے تمام پیغمبروں نے اپنی شریعتیں "مبدأ و معاد" یعنی خدا اور آخرت کی بنیاد پر کہ جس کا انسانوں کی فطرت خود تقاضا کرتی ہے، استوار کی ہیں۔

انبیائے الٰہی کی روشن و تابناک اور متفق و مسلّم تاریخ بھی واضح طور پر اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ خدا کے عظیم پیغمبروں مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تاریخ زندگی کا مطالعہ کریں، جو سراسر رنج و درد و مصیبت سے مملو نظر آتی ہے، اور ان حضرات

کی تعلیمات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ حضرات اس دنیا کی زندگی کو ایک دوسری دنیا کی زندگی کے لئے مقدمہ خیال کرتے تھے۔ اِس دنیا اور اس کی زندگی کو اُس دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُس دنیا کی نعمتوں تک پہنچنے اور جوار قرب الٰہی سے بہرہ ور ہونے کا اشتیاق میں گھڑیاں شمار کیا کرتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ جنھوں نے اپنی پوری زندگی وقت کے طاغوتوں یعنی نمرود اور نمرودیوں سے مقابلہ میں بسر کی اور اس راہ میں بے پناہ مصیبتیں برداشت کیں آخر خداوند عالم سے خواہش کرتے ہیں

"وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ" (شعراء/۸۵)

پروردگارا مجھ کو نعمتوں سے معمور بہشت کے وارثوں میں قرار دے۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام جو کنویں میں ڈالے جانے اور پھر برسوں قید خانے کی تکلیفیں جھیلنے کے بعد مصر کی حکومت پر قابض ہوئے اور دنیا بھر کی نعمتیں آپ کے اختیار میں آگئیں پھر بھی وہاں تمام نعمتوں کو آخرت کی تمام نہ ہونے والی نعمت اور جوار رحمت حق سے قربت کے مقابلہ میں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، کسی وقت بھی آپ کی پُرعظمت روح اس قسم کی زرق برق اور آسائش و آرام کے وسائل دیکھ کر قانع نہ ہوئی بلکہ آپ نے گریہ وزاری کے ساتھ خداوند عالم سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے یوں تقاضا کیا کہ :-

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ (یوسف/۱۰۱)

پروردگار! تو نے مجھے سلطنت و عزت عطا کی اور عالم رؤیا کا علم دے کر مجھے خواب کی تعبیر دینا سکھایا تو ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور تو ہی میرا ولی نعمت اور دنیا و آخرت میں میرا محبوب ہے مجھے اس عالم میں اٹھا کہ تیرے حضور پر سر تسلیم خم رہے اور مجھے اپنے صالح بندوں کے ساتھ محشور فرما۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسلام کی تاسیس و تبلیغ کی راہ میں بہت زیادہ مصیبتیں برداشت کیں انھیں اپنے زمانے کے طاغوتوں سے نبرد آزما ہونے کی بنا پر سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا

اسلامی اہداف ومقاصد کی راہ میں مقدمہ کے طور پر دسیوں جنگیں لڑنا پڑیں، خون بہے، بے پناہ جان ومال کی قربانیاں پیش کیں اور جب اس دنیا سے رخت سفر باندھنے کا وقت آپہنچا تو اپنے دوستوں سے فرمایا

"ستردون علیّ الحوض" تم لوگ جلد ہی حوض کے کنارے مجھ سے ملحق ہو گے میں وہاں تمہارا منتظر رہوں گا۔

خدا کے مخصوص ومقرب اولیائے کرام یعنی اہلبیت پیغمبر علیہم السلام بھی اسی عقیدہ کی بنیاد پر زندگی بھر رنج ومصیبت اٹھاتے رہے قید خانوں کی تنہائی اور صعوبتیں برداشت کیں، دشوار گزار مرحلوں سے گزرتے رہے اور نیزہ وشمشیر کا استقبال کیا اور نہایت ہی اشتیاق وشادمانی کے ساتھ خود کو قتل ہونے اور ٹکڑے ٹکڑے کئے جانے کے لئے قربان گاہ الفت میں پیش کرتے رہے یہ حضرات زخموں کے کرب بھوک وپیاس اور صدموں پہ صدمے برداشت کرتے ہوئے زندگی کی آخری سانسوں تک صبر واستقامت کے جوہر دکھاتے اور ہنستے ہنستے موت کا استقبال کرتے اور اس کو اس دنیا سے ایک وسیع تر دنیا کی طرف پیش قدمی اور بارگاہ مقدس الٰہی میں حاضری وتقرب الٰہی کا وسیلہ وذریعہ سمجھتے رہے۔

بڑے بڑے الٰہی فلسفیوں نے بھی اسی عقیدہ کی بنیاد پر دنیوی زندگی کو حقیر وناچیز شمار کیا ہے وہ اپنی پوری زندگی کے دوران نفوس کی پاکیزگی، انسانی اخلاق ومعارف کی تکمیل اور عوام کی تربیت و نصیحت کے علاوہ اس زندگی کا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں سمجھتے تھے۔

ارسطو، افلاطون، سقراط اور فیثاغورث کی زندگی اور موت کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے لطیف نکتے سامنے آئیں گے جو سب کے سب معاد اور اخروی زندگی پر ان فلاسفہ کے یقین واعتقاد کی حکایت کرتے ہیں۔

الٰہی حکماء وفلاسفہ نے ہمیشہ اپنی تعبیرات واصطلاحات میں اس بدن کو روح کے لئے ایک قید خانے اور جسم سے روح نکل جانے کو قفس عنصری سے طائر روح کے آزاد ہو جانے سے تعبیر کیا ہے یا انھوں نے "انسانی بدن" کو ایک انڈے اور روح کو مرغی کے ایک چوزے سے تعبیر کیا ہے جس کے کامل ہونے کے بعد انڈے کی کھوکھلائی ٹوٹ جاتی ہے اور چوزہ باہر نکل آتا ہے یا یہ کہ دنیا کو "رحم مادر" اور روح کو جنین سے تعبیر کیا ہے جو رحم مادر میں تخلیقی مراحل طے کرتا ہے اور پھر کامل اور اس

دنیا کے لئے ضروری وسائل سے لیس ہو کر جب دنیا میں قدم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے رحم مادر سے باہر نکل آتا ہے اور اس وسیع و روشن دنیا میں زندگی شروع کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان اس رحم دنیا میں اپنی تعمیری منزلوں سے گزرتا ہے اور جس وقت اس (اخروی) دنیا کے لائق لوازمات زندگی سے لیس ہو جاتا ہے تو بڑے ہی شوق و اشتیاق کے ساتھ اس "رحم دنیا" سے نکل کر ایک دوسری دنیا میں جو اس سے بھی زیادہ وسیع و روشن ہے داخل ہو جاتا ہے۔ ان حکماء نے دراصل موت کو ایک ایسے انسان کے لئے جو کمال کی منزلیں طے کر چکا ہے، "دوسری زندگی" قرار دیا ہے۔ (۱)

صاحب "مبدأ و معاد" اس کے بعد فرماتے ہیں: "موت کے بعد بقائے روح" کی دلیلوں میں سے ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ انسان خواب میں اپنے ماں باپ یا کسی دوسرے آشنا کو ان کے مرنے کے بعد دیکھتا ہے اور ان سے مختلف موضوعات کے سلسلہ میں سوالات کرتا ہے اور وہ لوگ بالکل صحیح جواب دیتے ہیں چنانچہ مرنے والے کی اولاد و رشتہ دار اگر کوئی چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انھیں ڈھونڈنے سے نہیں مل پاتی تو یہ مرنے والے خواب میں اس چیز کی نشان دہی کر دیتے ہیں اور یہ رہنمائیاں سو فی صد درست اور واقعہ کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں۔

تقریباً ہر شخص نے اپنی زندگی میں اس طرح کے خواب دیکھے ہوں گے، ظاہر ہے مادیت یا مادی بنیادوں پر استوار طرز فکر میں جہاں روح کے وجود سے ہی انکار پایا جاتا ہے اور جن کے نزدیک موت کے بعد روح کی بقا کا تصور محال ہے۔ اس قسم کے خوابوں کی کوئی تفسیر و توجیہہ ممکن نہیں ہے۔

تاریخ میں ملتا ہے کہ فردوسی نے جب سلطان محمود کی خواہش پر "شاہنامہ" نظم کیا اور اس کی تکمیل کے بعد سلطان محمود نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور فردوسی کی محنت کا پھل اس کو نہ ملا تو وہ بہت ہی ناراض اور آزردہ خاطر ہوا رستم اس کے خواب میں آیا اور اس سے کہا: تم نے اس کتاب میں متعدد مقامات پر میری تعریف کی ہے اور میں اگرچہ اس وقت مردوں کے زمرہ میں داخل ہوں اور تمہارے حق کی ادائیگی کی قوت نہیں رکھتا لیکن فلاں جگہ ایک دفینہ موجود ہے تم کل جا کر اس جگہ کو کھود کر حاصل شدہ خزانہ اپنے کام میں لاؤ، فردوسی خواب سے بیدار ہونے کے بعد، جو نشانیاں خواب میں اس سے بیان کی گئی تھیں اس کے مطابق مذکورہ مقام تک

۱۔ مبدا و معاد ص ۲۳۱ - ۲۳۴

پہنچا، کھدائی کی اور اس کو خزانہ حاصل ہو گیا اور اس نے اس کو اپنی ضروریات میں صرف کیا۔ لہٰذا وہ بار بار کہا کرتا تھا: "رستم اپنی موت کے بعد بھی سلطان محمود سے کہ جو زندہ ہے، زیادہ سخی و کریم ہے۔"(۱)

حکیم بزرگ متوسط شیرازی کی تقریر میں اس نکتہ سے متعلق کہ الٰہی فلاسفہ، اُخروی دنیا کے بارے میں اپنے محکم اعتقاد کے نتیجہ میں اس دنیا اور اس کے مظاہر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے دل اس سے نہیں لگاتے تھے، حکیم سقراط کی تاریخ زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ اس منزل میں اس عظیم فلسفی کی حیات کے بارے میں جس نے حضرت عیسیٰ مسیحؑ سے قبل پانچویں صدی کے آخر میں زندگی گزاری اور عقیدۂ معاد پر راسخ یقین جس کی حیات و موت کا اصل پایہ و اساس تھا، مختصر طور پر توضیح دے دینا مناسب معلوم دیتا ہے۔

سقراط کو حکماء کا امام اور فلاسفہ کا استاد مانتے ہیں اور چونکہ اس نے بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت اور اپنے زمانے کے ظالموں، جابروں اور طاغوتوں کے خلاف نبرد آزمائی کی راہ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی ہے اس لئے اس کو عالم انسانیت کے عظیم شہداء میں شمار کرتے ہیں۔

کہتے ہیں: "سقراط وہ شخص ہے جو فلسفہ کو آسمان سے زمین پر لے آیا" اور اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل عمومی طور پر علم فلسفہ کی بنیاد کا آغاز وجود انسانی سے باہر کی دنیا سے کرتے تھے، لیکن اس نے اپنی تعلیمات کا خود انسانی وجود سے آغاز کیا اور اپنے عہد کے لوگوں کو تاکید کی کہ حقائق عالم کی شناخت و معرفت کے لئے بلند پروازی کو بالائے طاق رکھ کر خود اپنے وجود میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے ہمارا فرض ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو سمجھیں، سنواریں اور اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو صحیح طور پر تشخیص دیں۔

وہ کہا کرتا تھا، میرے پاس علم نہیں ہے کہ میں اس کی تعلیم دوں میں اپنی ماں کی طرح "دائی گیری کے فن" (زچگی کے امور) سے واقف ہوں (سقراط کی ماں قابلہ "دائی" تھی۔) جس طرح دائی بچے کی ولادت میں مدد کرتی ہے میں نفوس کو وجود حاصل کرنے میں مدد پہنچاتا ہوں یعنی: "وہ آپے میں آئیں اور حصول معرفت کی راہ کو پہچان لیں، صحیح معرفت خود تمہاری

۱۔ مبدا و معاد ص ۲۲۴-۲۲۵۔

اپنی شناخت سے پیدا ہوتی ہے۔"

وہ بد عملی اور غلط امور کے ارتکاب کی اصل وجہ اشتباہ و نادانی کو قرار دیتا تھا وہ کہا کرتا تھا اگر عوام خیر و نیکی کو اچھی طرح درک کریں اور اس کی تمیز کا سلیقہ پیدا ہو جائے اور شر کو بھی کامل طور پر مشخص کرنے لگیں تو ہرگز شر کی راہوں میں قدم نہیں بڑھا سکتے اور نیک امور کی انجام دہی سے دوری اختیار نہیں کر سکتے۔

وہ کہتا تھا: انسان قدرتی طور پر خوشی و نیکی کی تلاش میں رہتا ہے لیکن یہ انسانی سعادت و نیکی لذت و شہوت کے حصول سے فراہم نہیں ہو سکتی بلکہ سعادت و خوش بختی تک پہنچنے کی راہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پا لینا ہے۔ افراد کی سعادت و خوش بختی بھی معاشرہ کی سعادت میں مضمر ہوتی ہے۔ حکیم سقراط سے بہت زیادہ حکمت آمیز کلمات نقل ہوئے ہیں۔

اور بالآخر جس زمانے میں سوفسطائیوں کے نام سے بہت سے گروہ ، جو اس دنیا کی تمام چیزوں کو محض "خیال" تصور کرتے تھے حقائق عالم کا کلی طور پر انکار کر دیا تھا اور خدا کے عنوان سے بتوں کی پرستش کرتے تھے ، پورا معاشرہ جابیوں کے ظلم و جور اور اخلاقی فساد کی لپیٹ میں تھا حکیم سقراط نے ان انحرافات کے خلاف آواز اٹھائی طاقت فرسا زحمتوں اور بے پناہ کوششوں کے بعد لوگوں کی فکر اور معاشرے کی صورت حال میں تبدیلی پیدا کی، گمراہی اور سرکشی کی راہیں بند کیں لیکن ارباب زر و نقد ، گندی سیاست کے کھلاڑی ، جن کو اپنی منفعت خطرے میں نظر آ رہی تھی ، عداوت و حسد کے شعلے ان کے سینوں میں بھڑک اٹھے اور آخر کار اس کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور خود ساختہ الزام کی بنیاد پر مقدمہ چلا کر اس کو قتل کی سزا سنا دی گئی

جس دن اس کو زہر کے ذریعہ قتل کیا جانا تھا اس کے شاگرد جن کی تعداد تقریباً ۱۲ ہزار تک پہنچتی تھی ، اپنے عظیم استاد سے ملنے کے لئے قید خانے میں ملنے آئے استاد نے جس کے چہرے سے مکمل طور پر کیف و نشاط کے آثار ہویدا تھے اور جو اس کی روحانی عظمت کی نشاندہی کر رہے تھے مسکراتے ہوئے شاگردوں کا استقبال کیا ، شاگردوں نے بھی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بہت سے علمی سوالات پیش کئے جن کے جوابات استاد نے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ دیئے۔ اس عزم و استقامت اور موت کو کوئی اہمیت نہ دینے پر سب کے سب حیران و

متعجب تھے، اس وقت ایک شاگرد جس کا نام سیمیاس تھا استاد سے مخاطب ہوا: استاد! میں ایک سوال اور کرنا چاہتا تھا لیکن ڈرتا ہوں شاید آپ کی موجودہ حالت اس کا جواب دینے کے لئے مساعد نہ ہو، سقراط نے کہا: میری روحانی کیفیت میں موجودہ صورت حال سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ میں اب جبکہ خود کو شہادت سے اتنا قریب پا رہا ہوں زیادہ خوش حال ہوں کیونکہ اگرچہ میں تمہارے جیسے شریف و وفادار دوستوں سے جدا ہو رہا ہوں لیکن آج اپنے بافضل و باشرف بھائیوں کی خدمت میں، جو اس دنیا میں منتقل ہو چکے ہیں پہنچ جاؤں گا، اس کے بعد اس علمی سوال کا بھی جواب دے دیا پھر اپنی جگہ سے یہ مرد عظیم اٹھا بدن کی طہارت بجا لایا اور خدا کی راہ میں شہادت کا جام نوش کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور بڑی ہی کشادہ روئی اور طمانینت قلب کے ساتھ زبان پر یہ فقرے جاری کئے:۔

"اسلمتُ نفسی الیٰ قابض ارواح الحکماء"

میں نے اپنی جان اس کے حوالے کی جو حکیموں کی روحیں قبض کرتا ہے۔ (۱)

۱۔ "یورپ میں حکمت کا ارتقا" (سیر حکمت در اروپا) جلد اول ص ۲۰۲، دائرۃ المعارف القرن العشرین مادہ ص، "تاریخ التواریخ" جلد اول ص ۱۴۷۔

قالَ علی علیہِ السلام

مِسکِینُ ابنُ آدمَ:
مَکتُومُ الاَجَلِ، مَکنُونُ العِلَلِ،
مَحفُوظُ العَمَلِ، تؤلِمُہُ البَقَّۃ
وَتقتُلُہُ الشرقَۃ وَتُنتِنُہُ العَرقَۃ

نہج البلاغہ/نصیحت/۴۱۹

آدمی کتنا بے چارہ اور بے بس ہے۔ اس کی موت اس سے پوشیدہ ہے، بیماریاں اس سے چھپی ہوئی ہیں اور اس کے اعمال محفوظ ہیں، کھٹمل اسے اذیت پہنچا دیتا ہے۔ اُچھو اسے مار ڈالتا ہے اور پسینہ اسے بدبودار بنا دیتا ہے

قرآن

عظیم ترین الٰہی تحفہ

جناب استاد محمد تقی مصباح یزدی

ترجمہ: سید علی الحسن رضوی

قرآن کریم، خداوند عالم کی جانب سے انسانوں کے لئے عظیم ترین تحفہ ہے جو سعادت جاودانی کی طرف ان کی ہدایت کرتا ہے۔

قرآن مجید، اسلام اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کی حقانیت پر بہترین دلیل ہے جو ہمیشہ اپنے اعجاز آفریں بیان سے تمام انسانوں کے لئے حجت تمام کردیتا ہے۔

قرآن حکیم، اسلامی احکام و معارف کے اثبات کی معتبر ترین سند ہے خداوند متعال نے جس کی بقا کی ضمانت لی ہے۔ اور ہر طرح کی تحریف سے اس کو محفوظ و مصئون رکھا ہے۔

قرآن شریف، تمام مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا محکم ترین محور ہے جس میں تمام فرقوں اور گروہوں کے درمیان اختلافات مٹانے کا منبع و وسیلہ بننے اور تمام حق کے متلاشیوں کے سامنے دین کے اصل خطوط واضح کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ان سب کے باوجود مسلمانوں نے حقائق کی شناخت اور اس کے اصول و قوانین کی اطاعت کے سلسلہ میں ضروری اہتمام سے کام نہیں لیا ہے اسی بنا پر رحمت الٰہی کا پیغام لانے والا بارگاہ پروردگار میں شکایت کرتا نظر آتا ہے:

"وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً"

(اور رسولؐ نے کہا: اے میرے پالنے والے! بے شک میری اس قوم نے اس قرآن کو مہجور و تنہا چھوڑ دیا ہے)۔ فرقان/۳۰

ہمارے عصر کی جلیل القدر ہستی علامہ طباطبائی رضوان اللہ علیہ نے حوزۂ علمیہ قم میں قرآن کے احیاء کا پرچم بلند کیا اور اپنے دروس نیز "المیزان" جیسی تفسیر لکھ کر اس راہ میں ایک عظیم قدم اٹھایا کہ انشاء اللہ خداوند عالم انہیں اس کا اجر عطا کرے گا اس جذبہ سے سرشار ہو کر ہم نے قرآنی افکار سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس کے مطالب کو چند عنوانات کے تحت جدید پیرائے میں اختصار کے ساتھ درس کے عنوان سے رواں و عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

•••

جیسا کہ امیر المومنین صلوات اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ قرآن ایک بے کراں سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک پہنچنا معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے علاوہ کسی کے لئے ممکن نہیں ہے اس کے باوجود خود قرآن نے بھی اور حضرات ائمۂ طاہرین علیہم السلام نے بھی لوگوں کو قرآنی آیات کے بارے میں غور و فکر سے کام لینے کی دعوت دی ہے قرآن کہتا ہے:-

"کتابٌ انزلناه الیك مبارکٌ لیدّبروا آیاته (سورۂ ص آیت ۲۹)

ہم نے برکتوں سے معمور کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں۔

قرآن اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ لوگ جو قرآن میں فکر و تدبر سے کام نہیں لیتے ان کو مورد مواخذہ قرار دیتا ہے:-

"افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالها" (سورۂ محمد آیت:۲۴)

آیا وہ قرآن کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟

پیغمبر اسلامؐ اور ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام نے بھی قرآن کی طرف رجوع کرنے اور اس کی آیتوں پر غور و فکر کرنے کی بڑی شدت کے ساتھ تاکید کی ہے۔ خصوصاً جبکہ معاشرہ کی فکر ظلمت و آشفتگی کا شکار ہو اور مسلمانوں کے درمیان ایسے شکوک و شبہات سر اٹھا رہے ہوں جو ان کو فکری و عقیدتی انحرافات میں مبتلا کرنے کا سبب ہوں تو ایسے حالات میں قرآن کی طرف

رجوع کرنے کی شدید لہجہ میں تاکید کی گئی ہے :-

"اِذَا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن"

(اصول کافی جلد ۲ ص ۴۳۸)

جب فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی مانند تم کو گھیر لیں تو قرآن کی جانب رجوع کرو

اگرچہ بہت سی روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن کا کامل علم محض پیغمبر اسلام ص اور اہلبیت اطہار علیہم السلام کے پاس ہے اور وہی قرآن کے حقیقی معلم و مفسر ہیں [جیسا کہ پیغمبر اکرم ص کے بارے میں قرآن کہتا ہے : قرآن کے معلم اور اس کو بیان کرنے والے خود پیغمبر اسلام ص ہیں] (۱) اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خود نبی اکرم ص اور ائمہ اطہار ع نے بھی قرآن کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی ہے حتیٰ فرمایا ہے : اگر ہم سے منقول روایات کے بارے میں شک پیدا ہو تو انھیں قرآن کی روشنی میں پرکھ لو"

۱ـ پیغمبر اسلام ص کے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ خداوند عالم آپ کے بارے میں "یتلوا علیھم اٰیاتہ و یزکیھم" کے بعد فرماتا ہے : "و یعلمھم الکتاب والحکمۃ" (سورہ جمعہ آیت : ۲) یعنی تلاوت اور لوگوں کا تزکیہ کرنے کے بعد تعلیم قرآن کی نوبت آتی ہے معلوم ہوا قرآن کی تعلیم آیات کی تلاوت سے الگ ایک چیز ہے لہٰذا پیغمبر کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ جب آپ پر قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں تو آپ لوگوں کے سامنے ان آیات کی تلاوت فرماتے تھے تاکہ لوگ قرآن کے الفاظ یاد کریں اور اس کے بعد نبی اکرم ص تزکیہ نفس فرماتے تھے ، اور پھر نبی کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور یہ تعلیم محض قرآن کے الفاظ دہرانا نہیں ہے کیونکہ یہ تو وہی تلاوت قرآن ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن کے مطالب و مفاہیم سے عوام کو آگاہ کریں ، یعنی جو چیزیں لوگ خود سمجھنے سے قاصر ہیں اس کا سمجھانا نبی ص کی ذمہ داری ہے چنانچہ قرآن میں بھی یہ وضاحت موجود ہے : "یعلمکم ما لم تکونوا تعلمون" (سورہ بقرہ آیت : ۱۵۱) اور وہ (پیغمبر اسلام) تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جسے تم نہیں جانتے ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے : "و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم" ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ تم اس کی آیتیں لوگوں کو سمجھاؤ اور بیان کرو ۔ (سورہ نحل آیت ۴۴) پتہ چلا قرآن کی آیتیں بعض وقت تبیین و وضاحت کی محتاج ہوتی ہے اور پیغمبر ص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو

روایات میں "عرض علی الکتاب "(۱)، کے عنوان سے ایک مستقل باب موجود ہے اور جس کا ذکر اصول کی کتابوں میں بھی تعادل و ترجیح کے عنوان سے مذکور باب میں ملتا ہے کہ روایتوں کے درمیان ترجیح یا ان کے قابل اعتبار ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط ان کی قرآن کے ساتھ موافقت یا عدم مخالفت بھی ہے۔

لہٰذا جب ہم کسی روایت کا اعتبار برقرار رکھنے یا کم از کم اس کو دوسری روایت پر ترجیح دینے کے لئے قرآن کے ساتھ اس کی مطابقت کریں تو آیت کا مفہوم ہم پر واضح و روشن ہونا چاہیئے تاکہ روایت کی اس کے ساتھ تطبیق کر سکیں اور اگر یہ صورت ہو کہ آیت کا مفہوم بھی روایت کے ذریعہ سمجھا جائے تو دور لازم آتا ہے لہٰذا یہ اشتباہ کہ کوئی شخص روایت کی طرف رجوع کئے بغیر قرآن کے بارے میں فکر و تدبر اور استفادہ کا حق نہیں رکھتا ایک خیال خام ہے ہم کو خود قرآن میں خداوند متعال نے بھی حکم دیا ہے اور پیغمبر اکرم و ائمہ طاہرین علیہم السلام نے بھی قرآنی آیات میں غور و فکر کی تاکید کے ساتھ دعوت دی ہے۔ مگر افسوس گذشتہ دور میں اس جانب کوتاہی سے کام لیا گیا یہاں تک کہ قرآن اور تفسیر قرآن کے دروس حتی دینی علمی مراکز میں بھی ضعف و اضمحلال کا شکار بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے۔

اور پھر حوزۂ علمیہ قم میں علامہ طباطبائی رضوان اللہ علیہ کو یہ توفیق حاصل ہوئی کہ انہوں نے حوزۂ علمیہ قم میں تفسیر قرآن کو حیات نو بخشی اور یہ عظیم افتخار ان کے نصیب میں آیا ہم سب کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ آج اسلامی معارف کی شناخت کے سلسلہ میں عظیم ترین ماخذ و مدرک یہی تفسیر المیزان ہے جو آپ نے تالیف فرمائی ہے۔

بہر حال، وہ ذمہ داری جو ہم پر خداوند عالم اور اس کے پیغمبرؐ کی جانب سے مقرر کی گئی ہے

سمجھائے بہ یقینی طور پر تبئین، تلاوت سے الگ ایک چیز ہے اور ہم شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ تبئین۔ بیان و فصاحت (جو آنحضرتؐ کے مقام و منصب میں سے ہے) ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی ثابت ہے، نیز دیگر دلیلوں کے مطابق (کہ اس وقت جس کے ذکر کا محل نہیں ہے) قرآن کی معلمی کا منصب پیغمبر اسلام اور ائمہ اطہارؑ کے خصوصیات سے ہے۔

۱۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۷۸، ۸۹ حدیث ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۹، ۳۵، ۳۷، ۴۰، ۴۷، ۴۸۔

اس کے تحت ہمیں قرآن کے بارے میں غور و فکر اور تدبر و تعقل سے کام لے کر ان گراں بہا موتیوں سے استفادہ کرنا چاہیئے جو خداوند عالم نے لوگوں کے لئے اس میں ذخیرہ کر دیئے ہیں ۔

آج بحمداللہ قرآن کریم کی تعلیم و تفسیر کی اہمیت ہمارے عوام پر بڑی حد تک روشن و واضح ہو چکی ہے ان کے درمیان تفسیر قرآن کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا ہے بے نظیر ہے عوام کے درمیان اس کا استقبال اور ان کی گرم جوشی اگرچہ دل کو شادمانی عطا کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات سے خوف زدہ رہنا چاہیئے کہ کہیں قرآن کی تفسیر کجروی کا شکار نہ ہو جائے کیونکہ یہ چیز نہ صرف یہ کہ معاشرہ کو حقائق سے قریب نہیں کر سکتی بلکہ شیطانی مقاصد کے لئے راہ کھول دے گی اور افسوس یہ کام ہوا بھی ہے ۔ آج مختلف ناموں سے ایسے گروہ موجود ہیں جو بزعم خود قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ذاتی افکار کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے کے دعویدار ہیں ان میں سے بعض کا چہرہ تو بالکل پہچانا جا چکا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو گویا ابھی اچھی طرح پہچانے نہیں جا سکے ہیں لیکن اس میدان میں ان کی سرگرمی بہت بڑھی ہوئی ہے لہٰذا اگرچہ قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں عوام خصوصاً نوجوانوں کی بے پناہ دلچسپی ہمارے لئے خوشی کا باعث ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں خبردار رہنا چاہیئے کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں انحراف کی وہ روش پیدا نہ ہونے پائے جو خدانخواستہ معاشرہ کو غلط راہ پر لگا دے اور یقیناً اس منزل میں بھی یہ بھاری ذمہ داری علما کے دوش پر ہی عائد ہوتی ہے کہ وہ قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لئے صحیح راہ مشخص و معین کریں کیونکہ تمام کے تمام منحرفین جان بوجھ کر کسی غرض کے تحت اسلام اور اسلامی حکومت کے دشمن نہیں بن گئے ہیں بلکہ ان کی بڑی تعداد ——— شاید اکثریت ——— اشتباہات اور غلط تعلیمات و تلقینات کا شکار ہو کر اس راہ پر لگ گئی ہے اور کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان میں سے بعض کو ماضی میں، بعض علمار کی تائید بھی حاصل رہی ہے ۔

بہر حال ہمیں ان مسائل سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ نپٹنا چاہیئے اور خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمیں تعلیم قرآن کی وہ درست راہ حل کی پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام نے نشان دہی کر دی ہے اپنانا چاہیئے اور تمام تر خود غرضانہ مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر قرآن کو خود اپنے مقاصد و افکار سے تطبیق کرنے کے بجائے کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنے افکار کو قرآن کی روشنی میں درست کریں کیونکہ یہ وہ بلا ہے جو امیر المؤمنین علیہ السلام کے زمانے میں بھی رائج تھی اور نہج البلاغہ میں حضرتؑ نے اپنے جن دردوں کی

فرمائی ہے ان میں سے ایک یہی ہے کہ بعض لوگ قرآن کو خود اپنے افکار پر منطبق کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

جب اس زمانے میں، حتی عہد پیغمبرؐ سے اتنا قریب ہونے اور حضرت علیؑ جیسے افراد کی موجودگی کے باوجود اس طرح کا انحراف اور گمراہی پیدا ہو سکتی ہے تو اس زمانہ میں جبکہ ہماری علمی کمزوریاں بھی واضح ہیں، کوئی بعید نہیں ہے کہ یہ کجی بہت ہی زیادہ وسیع پیمانے پر پیدا ہو۔

لہٰذا، بلا شک و شبہ یہ علماء اسلام کی واجب ترین ذمہ داریوں میں سے ہے کہ وہ قرآن کریم کے تمام تر مفاہیم مختلف علمی سطحوں (اعلیٰ، اوسط یا ادنیٰ) کے اعتبار سے جس قدر بھی ممکن ہو صحت و یقین کے ساتھ بیان کریں اور معاشرہ کو قرآنی خزانوں سے بہرہ ور کریں۔ اور اگر یہ اہم ترین کام انجام نہ پایا اور علماء نے اس طرف توجہ نہ دی تو گمراہی کی جو صورت آج ہم دیکھ رہے ہیں اس سے بھی بدتر صورت حال کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے

آج زیادہ تر مسلمان نوجوان اس کے لئے تہ دل سے آمادہ اور بیتاب ہیں کہ قرآنی مفاہیم کو سمجھیں اور یاد کریں حتی اپنے خیال و دماغ کے اعتبار سے وہ "المعجم" اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع کر کے اس پر تحقیق فرمانے کی بھی کوشش کرتے ہیں وہ فکر کرتے ہیں کہ یہ ایک معمولی اور سادہ سا کام ہے۔ شاید یہ لوگ اپنے اس گمان میں معذور ہوں لیکن وہ لوگ جو برسوں علمی دینی مراکز میں رہے ہیں اور حوزۂ علمیہ میں بزرگوں سے آیات و روایات میں دقت نظر سے کام لینے کا درس لیا ہے اگر وہ بھی اسی انداز میں فکر کریں تو حق یہ ہے وہ ہرگز قابل معافی نہ ہونگے۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین و اصول جو بزرگ علماء و مفسرین نے ہمارے حوالے کئے ہیں ہم ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ غور و فکر سے کام لے کر قرآن کے روشن و واضح مفاہیم اخذ کریں اور معاشرہ تک پہنچائیں تاکہ قرآن و اسلام کے تئیں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکیں دوسری طرف، اگرچہ قرآن کا آسانی سے سمجھنا اور تفسیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی ایک شخص جو قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے اس سے اگر ہم کہیں کہ اس کے لئے کم از کم تم کو تیس سال کام کرنا ہوگا، تعلیم حاصل کرنی ہوگی تب کہیں تم قرآن سمجھنے کے قابل ہو سکو گے تو گویا ہم نے اس کو قرآنی مطالب سمجھنے اور یاد کرنے سے مایوس کر دیا۔ اور نتیجہ میں اس کا منحرفین کے ہتھے چڑھ جانا یقینی ہے۔

ٹھیک ہے کہ قرآن کا سمجھنا، خاص زحمت، محنت اور مہلت کا طالب ہے اور یہ کام سب نہیں کر سکتے اس لئے چند افراد کو بہر حال یہ زحمتیں اٹھانا پڑیں گی تاکہ وہ اپنی محنت و ریاضت کا پھل دوسروں کی خدمت میں تقدیم کریں تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

جو باتیں ہم پیش کریں ان کے مستند اور قرآن کریم پر مبنی ہونے کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہونا چاہیئے اسی کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے غیر مربوط اور نظم و ترتیب سے عاری بھی نہ ہونا چاہیے کیونکہ اگر مطالب پراگندگی کا شکار رہیں تو نہ صرف ان کا یاد رکھنا مشکل ہے بلکہ ایک غلط فکری نظام کے مقابلہ میں ایک صحیح فکری نظام سے جو فائدہ اٹھانا چاہیئے وہ بھی حاصل نہ ہوگا۔

تمام منحرف مکاتب فکر نے اپنے افکار و تصورات کو ایک نظم اور ایک شکل دینے کی کوشش کی ہے یعنی انھوں نے چاہا ہے کہ اپنے مطالب کی ایک بنیاد پیش کریں اور مربوط مسائل کے ایک سلسلہ کو آپس میں ربط دے کر ایک منظم و ہم آہنگ مجموعہ وجود میں لے آئیں۔ ہم تو صحیح جہت اور صحیح راہ رکھتے ہیں ہمیں ان کے مقابلے میں بعینہ یہی کام کرنا چاہیے۔ یعنی ہم قرآنی معارف کو ایک منظم اور سسٹمیٹک انداز میں اس طور پر پیش کریں کہ ایک محقق اور علم کا متلاشی ذہن ایک نقطہ سے شروع کرے اور اسلامی معارف کی کڑیاں کسی زنجیر کے مانند ایک دوسرے میں پروتا چلا جائے اور آخر میں قرآن و اسلام نے جس ہدف و مقصد تک پہنچانا چاہا ہے اسے حاصل کر لے۔

بنابریں ہم قرآنی معارف کی تقسیم بندی کر کے اسے ایک نظم و ترتیب کے ساتھ پیش کرنے پر مجبور ہیں تاکہ ایسے نوجوانوں کے لئے جن کے پاس وقت کم ہے، اس کا سیکھنا آسان اور ممکن ہو دیگر مکاتب فکر کے مقابلے میں بھی پیش کیا جا سکے۔

قرآنی معارف کی تقسیم بندی جو قرآن کی تفسیر موضوعی کے ساتھ منسلک ہے (یعنی آیات قرآنی کو موضوعات کے تحت الگ الگ تقسیم کردیں اور ان کے مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں نیز ان کے درمیان رابطہ کو پیش نظر رکھیں) یہ کام اگرچہ ضروری ہے مگر اس میں کچھ دشواریاں بھی ہیں۔

قرآنی معارف کی ترتیب و تقسیم کے لئے ہمیں موضوعات سے متعلق ایک خاص نظم و ترتیب ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہر موضوع سے متعلق آیتیں تلاش کرنا پھر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھنا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنا اور ان کے مبہم نکات کو روشن و واضح

کرنے کے لئے ان ہی آیتوں میں ایک دوسرے سے مدد حاصل کرنا چاہیئے یعنی قرآن سے قرآن کی تفسیر کرنا چاہیئے وہی راہ جو علامہ طباطبائی طاب ثراہ نے اپنی تفسیر المیزان میں دکھائی اور اپنائی ہے۔ لیکن اس بات کی طرف بھی متوجہ رہنا ضروری ہے کہ جب ہم نے ایک آیت کو اس کے مخصوص سیاق سے نکال کر الگ کر لیا اور اس کے قبل و بعد کی رعایت کئے بغیر تنہا اسی کو اپنا محور قرار دیا تو ممکن ہے آیت کے حقیقی مطلب تک ہم نہ پہنچ سکیں، دوسرے لفظوں میں قرآن میں کلامی قرائن پائے جاتے ہیں اور یہ قرائن کبھی آیت سے پہلے کبھی اس کے بعد اور کبھی کبھی تو دوسرے سوروں میں نظر آتے ہیں ان قرائن پر توجہ کئے بغیر آیتوں کے حقیقی و واقعی مطالب تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان حالات سے دوچار نہ ہوں اور آیتیں سب ایک دوسرے سے جدا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنے واقعی مطلب سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں تو ہمیں کافی وقت نظر سے کام لینا ہوگا یعنی کسی آیت کو کسی موضوع کے تحت قرار دینے سے پہلے اس آیت کے قبل و بعد پر بھی نظر کر لینا چاہیئے اگر احتمال پیدا ہو کہ قبل و بعد کی آیتوں میں کوئی قرینہ موجود ہے تو اس کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ ہم جس آیت سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس کا قبل و بعد کی آیتوں کے ساتھ ذکر کریں اور دونوں حصوں کو بریکیٹ میں لکھ دیں تاکہ آیت سے استفادہ کرتے وقت متعلقہ "گفتگو کے قرائن" کی طرف سے غفلت کا شکار نہ ہوں۔

میں اس نکتہ کی طرف ایک بار پھر متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیشہ آیت کے قبل و بعد اس کے قرائن پر غور و فکر کے بعد ہی کسی آیت سے استدلال کرنا چاہیئے، حتی مقالہ نگار کو خود اس مرحلے سے دوچار ہونا پڑا ہے کہ بعض وقت ایک آیت سے متعلق غور و فکر کے بعد اظہار نظر کرتا ہوں علاوہ ایک مدت کے بعد متوجہ ہوتا ہوں کہ اس سے قبل کی آیت میں قرینہ موجود تھا جس کی طرف اس وقت متوجہ نہیں ہو سکا تھا اگر اس کی طرف متوجہ ہو گیا ہوتا تو استدلال میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا یا یہ کہ استدلال کا رخ کچھ اور ہوتا لہٰذا ہمیں اس نکتہ کی طرف سے ہرگز غفلت نہیں برتنا چاہیئے

جب ہم قرآن کے مفاہیم و معارف کی تقسیم بندی پر مجبور ہیں اور اس تقسیم بندی کے نتیجہ میں طبیعی طور پر آیتوں کی بھی تقسیم بندی کرنا پڑے گا (یعنی ہر باب کے ذیل میں چند آیتوں کا ذکر ضروری ہوگا) تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیتوں کی یہ تقسیم بندی کس بنیاد پر اور کس نظام کے تحت انجام دیں؟

سبھی جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں انسانی کتب میں رائج تقسیم بندی کے طریقوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے بہت ہی کم ایسے سورے ملیں گے۔ حتی ایک سطری سورے کیوں نہ ہوں۔ جن میں شروع سے آخر تک صرف ایک موضوع پر گفتگو کی گئی ہو زیادہ تر ___ حتی ایک ہی آیت میں کئی کئی مطالب سمو دیئے گئے ہیں اس طرح ایک ہی آیت مختلف پہلوؤں اور گوناگوں رخوں سے قابل استفادہ نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک ہی آیت میں اعتقادی پہلو بھی موجود ہے اور اخلاقی بھی، تاریخی پہلو بھی ہے اور تشریعی بھی وغیرہ وغیرہ چنانچہ آیات کے تجزیے میں یہ بھی ایک مشکل پیش آتی ہے البتہ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ ایک ہی آیت کو ہم متعلقہ مختلف عنوانوں کے تحت تکراری طور پر ذکر کر سکتے ہیں۔

آیات کی تقسیم

کسی مفہوم یا موضوع کے تحت ایک یا چند آیتوں کے لئے مثلاً نماز، جہاد، یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعلق آیتوں کے لئے ایک جامع اور کلی عنوان تلاش کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے البتہ چند عنوانات کو ربط و ترتیب کے ساتھ ایک منظم شکل دینا یا ایک زنجیر میں پرو دینا واقعی مشکل ہے۔ یعنی فرض کیجیئے کہ ہم نے پورے قرآن کی تحقیق کی اور جو مفاہیم ہاتھ آئے مثلاً سو عناوین ان کے تحت، ہم نے ان کی تقسیم بندی کر دی اب مسئلہ یہ ہے کہ خود ان عناوین کو کس طرح مرتب کریں کہ ایک منظم نظام وجود میں آجائے؟ مثال کے طور پر قرآن کی پہلی آیت حمد باری تعالیٰ میں ہے لہٰذا پہلا عنوان "حمد خدا" قرار دیں اسی طرح سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتیں ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ قرآنی ہدایت جن کے شامل حال ہوئی ہے لہٰذا دوسرا عنوان "ہدایت" قرار پائے گا اور اسی طرح تمام عنوانات، لیکن کیا ہم اسی ترتیب سے تمام عنوانات کی تقسیم بندی کریں؟ یا خود ان عنوانات کے درمیان بھی ایک نظم و ترتیب ممکن ہے اور ان کی ابتدا کے لئے بھی ایک طبیعی و منطقی نقطہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟

ان عناوین کو ایک زیادہ جامع اور ہمہ گیر عنوان کے تحت درج کیا جا سکتا ہے مثلاً نماز روزہ، خمس اور زکوٰۃ وغیرہ کو "عبادات" کے عنوان سے، بیع (خرید و فروخت)، اجارہ

(کرایہ و لمبی) اور قرض وغیرہ کو معاملات کے عنوان کے تحت درج کیا جا سکتا ہے اب ان جامع اور کلی عنوانوں کو کس طرح تنظیم و ترتیب دیں؟ اور ان کے درمیان کون سا رابطہ ملحوظ نظر رکھیں؟

تقسیم کے قاعدے

اس منزل میں تین قاعدے بیان کئے جا سکتے ہیں (دیگر قواعد بھی ممکن ہیں لیکن ہم نمونہ کے طور پر یہاں قرآنی معارف کی تقسیم بندی کے جو اہم قاعدے پیش کئے جاتے ہیں بیان کر رہے ہیں تاکہ ان کے درمیان سے ایک قاعدہ اپنے لئے منتخب کر سکیں)۔

پہلا قاعدہ

شاید ذہن اس تقسیم بندی سے زیادہ آشنا ہوں کہ تمام دینی مطالب تین قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ۱۔ عقائد ۲۔ اخلاق ۳۔ اور احکام۔ تفسیر المیزان میں بھی بہت سے مقامات پر اس روش کا ذکر کیا گیا ہے اس طرح تقسیم بندی کا ایک طریقہ تو یہ ہوا کہ تمام قرآنی معارف کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصہ اصول عقائد (توحید، نبوت، معاد، عدل اور امامت) نیز ان اصول دین کے جزئیات مثلاً عالم برزخ کے جزئیات کے باب میں، دوسرا حصہ اخلاقیات کے باب میں اور تیسرا حصہ احکام کے باب میں ہو اور ہمارے فقہاء نے احکام کے باب میں یہ کام کیا بھی ہے۔ انہوں نے آیات الاحکام کے موضوع پر "کنز العرفان" اور "زبدۃ البیان" جیسی مستقل کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

یہ قاعدہ شاید دیکھنے میں بہت اچھا محسوس ہو اور بظاہر ہے بھی بہت خوب۔ لیکن اس میں معمولی طور پر سہی دشواریاں اور خرابیاں بھی نکالی جا سکتی ہیں۔ اولاً یہ کہ تمام مفاہیم قرآنی کو ان تین حصوں میں سمونا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر قرآنی آیات کا خاصا اہم حصہ تاریخ انبیاء اور پیغمبروں کے واقعات پر مشتمل ہے اگرچہ ان داستانوں کے ضمن میں بھی توحیدی، تشریعی اور اخلاقی نکتے موجود ہیں لیکن پوری کی پوری داستان اس فہرست میں رکھی جا سکتی نہ اُس فہرست میں بلکہ یہ خود ایک مخصوص حصہ اور مستقل عنوان ہے جن کو اگر جملوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے تو داستان باقی نہ رہے گی

اور اگر کوئی اصحاب کہف سے متعلق قرآنی نقطہ نظر معلوم کرنا چاہے اس کو پتہ نہ ہوگا کہ یہ واقعہ کس باب میں تلاش کرے ایک روشن گویا باب جس کے ذیل میں ہر انسان آسانی سے تمام قرآنی داستانیں مشخص طور پر جان لے اس تقسیم کے تحت میسر نہ ہوگی۔

اس میں جزئی طور پر، ایک قابل اعتراض پہلو یہ بھی ہے کہ خود یہ تینوں اقسام ایک دوسرے سے کوئی واضح رابطہ و تعلق نہیں رکھتیں اور بڑی دقت کے ساتھ ہی ان میں رابطہ قائم کیا جا سکے گا، البتہ یہ اعتراضات بڑی ہی جزئی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے بہتر و مناسب کوئی دوسری راہ نہ ہونے کی صورت اس ہم اسی قاعدہ پر عمل کر سکتے ہیں۔

دوسرا قاعدہ

دوسرا قاعدہ اس بات پر مبنی ہے کہ قرآن کو انسان کے لئے ہدایت مانتے ہیں: "ھدی للناس" اور انسان چونکہ گوناگوں مادی، معنوی، فردی، اجتماعی۔ دنیوی و اخروی پہلوؤں کا حامل ہے لہٰذا قرآنی معارف کو وجود انسانی کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں اس طرح قرآنی معارف کی تقسیم بندی کا محور خود "انسان" کو قرار دیتے ہیں۔

یہ کام یقیناً ممکن ہے اور اس میں کوئی بنیادی نوعیت کا قابل اعتراض پہلو بھی نظر نہیں آتا لیکن فنی کمزوریاں پہلے قاعدہ سے زیادہ اس میں ہیں کیونکہ جب ہم قرآن کے دقیق مفاہیم سے آشنا ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خود انسان کو محور قرار دینا قرآن کی نظر میں بہت زیادہ قابل قبول نہیں ہے، اور یہ ایک قسم کا "ہیومنسٹ" طرز فکر ہے جس میں انسان کو اصل قرار دیتے ہیں اور ہر چیز کی قدر و قیمت انسان سے ربط و تعلق کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں! قرآن اس انداز فکر کا موافق نہیں ہے۔ ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ تمام قرآنی مفاہیم کے تمام ابواب عقائد سے لے کر اخلاق، موعظہ، داستان، تشریع، فردی و اجتماعی احکام وغیرہ تک سب کے سب ایک اور صرف ایک محور رکھتے ہیں اور وہ خود خداوند تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے۔ چنانچہ قرآن جہاں کوئی قانون اور حکم بیان کرتا ہے کہتا ہے: خدا نے تم پر یہ حکم نازل فرمایا ہے، جہاں کسی اخلاقی پہلو کا ذکر کرتا ہے کہتا ہے یہ وہ خلق و عادت ہے جو خدا کو پسند ہے ــــــ

ملاحظہ فرمائیں :۔

سورۂ مائدہ کی ۴۲ ویں آیت : "واللہ یحب المقسطین" (اللہ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے)

آل عمران کی ۱۴۶ ویں آیت : "واللہ یحب الصابرین" (اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

قصص کی ۷۷ ویں آیت : "ان اللہ لا یحب المفسدین" (اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا)

لہٰذا اخلاق کا محور بھی خدا کی ذات ہے، بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی آیات "اللہ محوری" کی اساس پر مبنی ہیں دوسرے لفظوں میں مکتب قرآن مکتب الٰہی ہے "ہیومنزم" نہیں ہے۔ پس انسان کو محور کل قرار دینا ایک طرح کا انحراف ہے قرآنی معارف کا محور خدا کو قرار دینا چاہیئے اور اس کی پوری طرح حفاظت کرنا چاہیئے۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ انسانی وجود کے پہلو مبہم ہیں اور یہی مشخص نہیں ہے کہ انسان کتنے جنبوں کا حامل ہے کہ ہم کہہ سکیں انسانی وجود کے ان پہلوؤں کی ایک واضح تقسیم بندی کی بنیاد پر قرآنی آیات کی تقسیم بندی کر لی جائے۔ دوسری طرف پہلی نظر میں وجود انسان کے تمام پہلوؤں کے درمیان کوئی واضح ارتباط بھی نہیں پایا جاتا(۱)

تیسری دشواری یہ ہے کہ انسانی وجود کے مختلف پہلو (اگر مشخص ہو بھی جائیں) تو ان کی بنیاد پر قرآنی معارف کی تقسیم بھی ایک لاحاصل کام ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات ایک حکم الٰہی اور ایک خلق و عادت جس کو انسان کے لئے اچھا قرار دیا گیا ہے انسان کے کسی ایک مخصوص جنبہ سے اس کا تعلق نہیں ہے بلکہ وجود انسانی کے بہت سے گوشے اس حکم و قانون اور اخلاق سے اس طور پر تعلق رکھتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا قرآن کا یہ بیان یقینی طور پر انسانی وجود کے فلاں پہلو سے مربوط ہے۔

تیسرا طریقہ

یہ ہے کہ خود اللہ کو محور قرار دیں اور قرآنی معارف کی تقسیم بندی عرض میں نہیں بلکہ ایک دوسرے

۱۔ ممکن ہے بعد میں قرآن کے ذریعہ ہم اس ارتباط کو درک کر لیں لیکن پہلی نظر میں انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کے درمیان

کے طول میں انجام دیں یعنی قرآنی معارف کو ایک ایسے بہتے ہوئے دریا اور آبشار کی مانند خیال کریں کہ جس کا منبع و سرچشمہ فیض الٰہی ہے یہ جس منزل اور مرحلے میں پہنچتا ہے سیراب کر دیتا ہے۔

"اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا..." (رعد/۱۷)

"خداوند عالم آسمان سے جو پانی برساتا ہے اپنی ظرفیت کے اعتبار سے ہر وادی اس سے استفادہ کرتی اور سیراب ہوتی ہے۔"

ہمیں اسلامی معارف کو ایک بہتا ہوا چشمہ خیال کرنا چاہیئے جو ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلہ میں وارد ہوتا ہے اور ان مرحلوں کے تقسیمات طولی ہیں عرضی نہیں ہیں ابتداءً ایک مخصوص نقطہ سے یہ چشمہ ابلنا شروع کرتا ہے جب وہ جگہ لبریز ہو جاتی ہے اس کا فیضان دوسری جگہ پہنچتا ہے اب یہ دوسری جگہ پہلی جگہ کی فرع قرار پائے گی نہ یہ کہ اسی کے برابر اور اسی کی قسیم ہو۔ اگرچہ ایک منزل میں ان طولی تقسیمات سے بھی مختلف شاخیں پھوٹنا شروع کر دیتی ہیں پھر بھی بنیادی طور پر اسلامی معارف کو طول مراتب کے اعتبار سے ہی ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے۔ ہماری نظر میں یہ قاعدہ چند دلیلوں کے تحت قابل ترجیح ہے۔

پہلی دلیل

اس میں محور خدا کی ذات ہے اور اس کے برابر و متساوی کسی بھی چیز کو قرار نہیں دیتے :-

هُوَ الاَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالبَاطِنُ (حدید/ ۳)

وہی (خدا) اول بھی ہے اور آخر بھی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

دوسری تقسیمات کے برخلاف کہ جس میں یا تو اصل محور انسان کی مانند کسی دوسری شئی کو قرار دیتے ہیں یا اگر توحید و عقائد سے بھی بحث کرتے ہیں تو اسی کے برابر و متساوی اخلاق و احکام کا اعتقادات کے قسیم کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس تقسیم میں ابتدائی طور پر ایک کے علاوہ کوئی بھی دوسری بحث نہیں ہے اور نہ ہی اس کے متوازی کسی دوسری بحث کو رکھنے کی گنجائش

کسی واضح ارتباط کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

ہے۔جب تک یہ بحث حل نہ ہو اور اس سے فارغ نہ ہو جائیں دوسرے مرحلے اور دوسری بحث تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ یہ تقسیم بندی اللہ کو محور قرار دے کر انجام پاتی ہے۔ اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام مسائل و تقسیمات کے درمیان ایک منطقی ترتیب پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ جب ان مختلف بحثوں کا سلسلہ آپس میں مربوط ہو تو فطری طور پر پہلے کی بحث بعد کی بحث پر کسی نہ کسی نوعیت سے مقدم ہوگی، کہ جو واضح اور قابل فہم ہے اس کے برخلاف دوسری وہ تقسیمات جن میں مختلف بحثوں کو ایک دوسرے کے عرض میں متوازی قرار دیتے ہیں ایک کو دوسرے پر مقدم قرار دینا توجیہ و وضاحت کا محتاج ہوگا بلکہ بعض اوقات اس میں مشکل بھی پیش آسکتی ہے

فرض کیجئے انسان کی فردی و اجتماعی حیثیت اس کے وجود کے دو پہلو ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس کے فردی جنبہ کو پہلے بیان کریں یا اجتماعی پہلو کو؟ یا یہ کہ ان دونوں پہلوؤں کو مقدم سمجھیں؟ یا سرے سے کوئی دوسری تقسیم اس کے مادی و معنوی جنبہ کے پیش نظر کریں؟ یہ ایک مسئلہ ہے لیکن اگر مختلف عنوانات کے درمیان ایک فطری و طبیعی ترتیب موجود ہو اور اسی فطری و منطقی ترتیب کے تحت تقسیم بندی انجام پائے تو تقدم و تأخر کے لئے ہمارے پاس ایک روشن و واضح دلیل موجود ہوگی اور اس طرح ایسا محکم و منسجم نظام وجود میں آئے گا جس میں گذشتہ قاعدوں کی طرح اعتراض کی گنجائش نہ رہے گی

بنا بریں بہتر ہے کہ تمام معارف قرآنی کا اصل محور "اللہ" کو قرار دیں، جو قرآنی تعلیمات سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے، سب سے پہلے خدا کی معرفت اور انسان کی معرفت سے متعلق مسائل سے ابتدا کریں اس کے بعد تمام انسانی مسائل پر الٰہی تعلیم و تربیت و تدبیر و حکمت کی روشنی میں بحث کریں۔ اس طرح قرآنی معارف کا ایک ایسا منظم و مرتب نظام وجود میں آئے گا جس کا اصل محور بھی اصالت و حقیقت پر مبنی ہوگا۔ اور اس کے گرد بننے والے دائروں کے درمیان بھی ایک نظم و ترتیب اور ربط و تعلق پایا جائے گا۔

اس قاعدے اور اصول کی بنیاد پر قرآنی معارف کا ڈھانچہ اور نظام مندرجہ ذیل عناوین پر قائم ہوگا

۱۔ خدا کی معرفت

اس میں خدا کی معرفت، توحید، صفات الٰہی اور کلیات افعال باری تعالیٰ کی بحثیں شامل ہیں

۲۔ کائنات کی معرفت

اس میں کائنات (زمین، آسمانوں اور ستاروں)، فضائی موجودات (رعد و برق و باد و باراں

وغیرہ) اور زمینی مخلوقات (پہاڑ اور دریا وغیرہ) نیز ضمنی طور پر عرش وکرسی فرشتہ، جن اور شیطان وغیرہ سے متعلق بحثیں شامل ہیں

ظاہر ہے افعال باری تعالیٰ سے متعلق کلیات — جو پہلے حصہ میں انجام پاتے ہیں — کے بعد خود افعال کے تفصیلات (خلق وتدبیر وغیرہ) کے ذکر کی نوبت آتی ہے اور طبیعی طور پر کائنات کی پیدائش کا ذکر انسان کی پیدائش پر مقدم ہے۔

۳۔ انسان کی معرفت

اس میں انسان کی پیدائش، روح کی خصوصیات، انسانی شرافت وعظمت، ذمہ داریاں اور ان کے شرائط (آگاہی، قوت، عمل باختیار)، انسانی وجود کے مختلف پہلو، فردی واجتماعی تدبیروں میں الہٰی سنتیں، معاد اور انسان کا آخری انجام، وغیرہ سے متعلق بحثیں شامل ہیں۔

اس مرحلے میں روشن وواضح ہو جاتا ہے کہ دنیوی زندگی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے یہ انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کو خود اپنے لئے راہ سعادت کا انتخاب کرنا چاہیئے اور اپنے آخری انجام کی داغ بیل ڈالنا چاہیئے اس دنیا میں الہٰی حکمتیں انتخاب کے مقدمات (ابتلا و آزمائش وغیرہ) کی فراہمی کے محور پر گردش کرتی ہے۔

۴۔ راہ وروش کی معرفت

اس منزل میں شناخت ومعرفت کے عادی طریقوں (یعنی دنیا میں رائج علم حضوری وعلم حصولی کی مختلف قسموں) اور غیر عادی طریقوں (یعنی وحی والہام وغیرہ) سے متعلق بحثیں شامل ہیں یہیں نبوت کا مسئلہ بعثت انبیاء کی ضرورت اور مقاصد، نیز ان کے مدارج (نبوت، رسالت و امامت اور اسی طرح معجزہ وعصمت سے متعلق مسائل بیان ہوتے ہیں اور آخر میں انبیاء کی جانشینی کے مسئلے (یعنی امامت اپنے خاص معنوں) پر بحث ہوتی ہے۔

بحث کے اس مرحلے کا تعلق اپنے گذشتہ مرحلے سے واضح ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو انتخاب کی آزادی حاصل ہے یعنی اسے اپنی راہ کا تعین آزادانہ طور خود کرنا ہے راہ وروش کی معرفت کی ضرورت خود بخود پیش آتی ہے اور اس مرحلے میں یہی چیز

موضوع بحث ہے۔

۵۔ رہبر و رہنما کی معرفت

اس منزل میں انبیاء کی تاریخ اور ان میں سے ہر ایک کے خصوصیات ان پر نازل ہونے والی کتابیں، ان میں پیش کئے جانے والے مطالب، پیغمبر اسلام کی تاریخ اور آنحضرت کے دور حیات میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات بیان کئے جاتے ہیں ضمنی طور پر تمام قرآنی داستانیں اور اقوام و ملل کی تاریخ بھی اسی ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔ اس حصہ کا اپنے گذشتہ حصے کے ساتھ ربط اور ترتیب بیان واضح ہے کیونکہ جب وحی و نبوت کی ضرورت و اہمیت سے ہم واقف ہو گئے تو اب ان حاملان وحی و رسالت کی معرفت کی نوبت آتی ہے جو پیغام وحی عوام الناس تک پہنچاتے رہے ہیں۔

۶۔ قرآن کی معرفت

اس میں قرآن سے متعلق اصولی و کلیاتی مباحث۔ اس کے خصوصیات، نزول، [illegible] کا انداز، اعجازی حیثیت، آفاقی و ابدی شان، اسلوب بیان (عقلی استدلال، موعظہ، جدال احسن تمثیل و قصص وغیرہ) نیز محکم و متشابہ اور تاویل وغیرہ سے متعلق بحثیں شامل ہیں۔ گذشتہ بحث سے اس کا بھی ربط اور ترتیب بیان واضح ہے اس لئے کہ گذشتہ آسمانی کتابوں کے ذکر و بحث کے بعد آخری و ابدی کتاب کی شناخت و معرفت فطری سی بات ہے۔

۷۔ اخلاق اور انسانی تعمیر

اس میں خود انسان کی اپنی معرفت اور اپنی تعمیر سے متعلق تمام بحثیں شامل ہیں، انسان اختیاری میں خیر و شر کا وجود اور ان کا آخری کمال و سعادت کے ساتھ ربط، قرآنی تربیت اور تزکیہ نفس کی روش (انذار و بشارت کے ذریعہ تلاش خیر کا جذبہ بیدار کرنا وغیرہ) انسانی تعمیر میں ایمان، عمل کا کردار اور ان کا ایک دوسرے سے رابطہ نیز ان دونوں کا علم سے ارتباط اور بالآخر اخلاق فاضلہ و اخلاق رذیلہ کی تفصیلات اس بحث کا حصہ ہیں۔

”قرآن کی شناخت و معرفت“ کے بعد ”اخلاق اور انسانی تعمیر“ کا ذکر اس لئے ہے کہ گذشتہ بحث میں ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ قرآن کا ہدف و مقصد تزکیہ و تعلیم ہے۔ تزکیہ اخلاق اور انسان

تعبیر سے متعلق بحثوں کو جنم دیتا ہے اور تعلیم آئندہ مباحث کو وجود میں لاتی ہے ۔

۸۔ قرآن کے عبادی احکام

اس میں نماز و روزہ ، حج و قربانی اور ذکر و دعا سے متعلق بحثیں شامل ہیں یعنی جہاں وہ اعمال ذکر ہوتے ہیں جو بنیادی طور پر انسان اور خدا کے درمیان رابطہ کو تقویت پہنچاتے ہیں اگرچہ اجتماعی مصلحتوں کا بھی ان میں بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے ۔

۹۔ قرآن کے فردی احکام

اس میں خورد و نوش (یعنی کھانا، پینا، شکار کرنا اور ذبیحہ کرنا وغیرہ) نیز زینت و آرائش اور ترک بطرک سے متعلق حرام و حلال کے احکام بیان کئے جاتے ہیں ۔

۱۰۔ قرآن کے اجتماعی احکام

اس میں تمام حقوقی ، اجتماعی ، سیاسی و اقتصادی بحثیں شامل ہیں جن کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

الف)______ شہری و مدنی احکام

ب)______ اقتصادی و معاشی احکام

ج)______ قانونی و عدالتی احکام

د)______ حدود و جزار کے احکام

ہ)______ سیاسی و حکومتی احکام

و)______ عالمی و بین الاقوامی احکام

اور بحث کے اس حصے میں مقدمہ کے طور پر "معاشرہ قرآن کی نظر میں" بحث کا مرکز قرار پایا ہے اس تقسیم کے آخری تین حصوں میں انسان سے متعلق قرآن کے پیش کردہ علمی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے ۔ ایک کا تعلق انسان اور خدا ، دوسرے کا تعلق انسان اور خود اس کی ذات اور تیسرے کا تعلق انسان اور معاشرے یا انسان اور دوسرے انسانوں سے ہے اور ہر حصہ سے متعلق اس آسمانی کتاب کی تعلیمات کو جداگانہ طور پر مورد بحث و تحقیق قرار دیا جاتا ہے ۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی معارف عالم ہستی کے نقطۂ آغاز سے شروع

ہوتے ہیں اور خلق و تدبیر الہٰی کے مراحل بالترتیب زیر بحث آتے ہیں اور یہ سلسلہ ایک ایسے معاشرے کی خصوصیات کے ذکر پر منتہی ہوتا ہے جو انسان کی دیرینہ آرزو ہے اور ان تمام مراحل میں اپنے اصل محور، ذات خدا سے ان کا ارتباط بھی باقی و محفوظ رہتا ہے ۔



نہج البلاغہ کے سیاسی تعلیمات

حکومت کے ارکان

جناب شیخ محمد تقی رہبر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

کسی معاشرہ پر حاکم نظام میں فرائض کی تقسیم کے ذیل میں تین طاقتوں کی بات سامنے آتی ہے "مقننہ" یعنی قانون ساز طاقت، "عدلیہ" یعنی قانونی امور میں رجوع، اور حالات کے مطابق احکام صادر کرنے والی طاقت، اور "مجریہ" یعنی احکام کا اجرا کرنے والی طاقت ہم اس ڈھانچہ کے تحت اسلامی نظام کے ارکان کو مشخص کرنا چاہیں تو یہ کہیں گے کہ اس ڈھانچہ کی سب سے پہلی طاقت یعنی قانون ساز طاقت تو جس طرح دوسرے تمام سیاسی نظام اس کی تعریف بیان کرتے ہیں اسلام میں سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرے سیاسی نظام عوامی نمائندوں کی آراء کو ہی مطلق طور سے قانون کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں جو قانونی طور پر اکثریت کی منظوری کے بعد ہی قابل اجراء ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام کے سیاسی نظام میں قوانین کا سرچشمہ پہلے سے مشخص کیا جا چکا ہے اور اس کے تمام اصول و کلیات وحی اور باقی رہنے والی الٰہی شریعت سے ماخوذ ہیں۔

اسلامی شوریٰ یا پارلیمنٹ میں جس بات پر بحث و گفتگو ہوتی ہے وہ موجودہ دور میں پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل ہوتے ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ اسلام کے کلی قوانین میں ان کی کہاں تک گنجائش ہے۔ اور ان ہی کی بنیاد پر موجودہ قوانین مرتب کئے جائیں یہاں اکثریت

آرار بھی اسی بنیاد پر ہے ۔ ورنہ آرار و اکثریت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی قانون وضع کیا جائے اور اسلامی قانون کی روح کے خلاف اس پر عمل کیا جائے۔
حکومتی اداروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ الٰہی احکام و سنن اور قوانین کی پورے طور سے حفاظت کرتے ہوئے حکومت کی سیاست کے تحت انھیں پیش کئے جانے اور ان کا اجرا کرنے کے سلسلہ میں پوری توجہ سے کام لیں ۔

کتاب وسنّت قانون کا سرچشمہ

حضرت علیؑ، مالک اشتر کے نام تحریر کردہ عہدنامہ میں فرماتے ہیں :-

"وَارْدُدْ اِلَى اللّٰهِ مَا يُضْلِعُكَ مِنَ الْخُطُوبِ وَيَشْتَبِهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاُمُوْرِ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِقَوْمٍ اَحَبَّ اِرْشَادَهُمْ : يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، فَالرَّدُّ اِلَى اللّٰهِ الْاَخْذُ بِمُحْكَمِ كِتَابِهِ وَالرَّدُّ اِلَى الرَّسُوْلِ، اَلْاَخْذُ بِسُنَّتِهِ الْجَامِعَةِ غَيْرِ الْمُفَرِّقَةِ "

(خط نمبر ۵۳)

"جس کام میں بھی تم سنگینی اور الجھاؤ کا احساس کرتے ہو یا جن امور میں تردد کا شکار ہو جاتے ہو انھیں خدا اور اس کے رسولؐ کے حوالہ کر دو کیونکہ خداوند عالم جن لوگوں کی ہدایت کرنا پسند کرتا ہے ان کے لئے فرماتا ہے " اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو، پیغمبرؐ اکرم نیز جو لوگ تم میں ولی امر ہیں ان کی پیروی کرو، لہٰذا اگر کوئی کام نزاع کی حد تک پہنچ جائے تو اسے خدا اور اس کے پیغمبر (ص) کے حوالہ کر دو " ۔ خدا کے حوالہ کرنے کا مطلب اس کی روشن اور واضح آیتوں کی طرف رجوع کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا ہے ۔ اور پیغمبرؐ کے حوالہ کرنے کا مطلب آنحضرتؐ کی وسیع و جامع اور غیر اختلافی سنت کی پیروی ہے ۔"

اور اسی خط میں دوسری جگہ رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"وَلَا تَنقُضْ سُنَّةً صَالِحَةً عَمِلَ بِهَا صُدُورُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَاجْتَمَعَتْ بِهَا الْأُلْفَةُ وَصَلَحَتْ عَلَيْهَا الرَّعِيَّةُ ۔ وَلَا تُحْدِثَنَّ سُنَّةً تَضُرُّ بِشَيْءٍ مِنْ مَاضِي تِلْكَ السُّنَنِ ، فَيَكُونَ الْأَجْرُ لِمَنْ سَنَّهَا وَالْوِزْرُ عَلَيْكَ بِمَا نَقَضْتَ مِنْهَا"

"ان اچھی اور نیک سنتوں و رسموں کو مت توڑو جن پر اس امت کے بزرگ افراد عمل پیرا رہے ہیں اور جو ملت و قوم کے درمیان اتحاد و دوستی اور اس کی مصلحتوں کے حق میں مددگار ثابت ہوتی ہیں ۔ اور ایسی رسم جاری نہ کرو جو ماضی کی ان سنتوں و رسموں کو نقصان پہنچانے والی ہو ۔ کیونکہ نتیجہ میں ان صالح اور بہترین رسموں کے بانیوں کو تو اس کی جزائے خیر ملے گی اور تمہارے کاندھوں پر ان رسموں کے توڑنے کے عوض گناہوں کا بوجھ ہوگا۔

علماء دین کا کردار

امامؑ اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مالک اشتر کو صالح علماء اور نیک نفس حکماء کی ہم نشینی کی نصیحت فرماتے ہیں ۔ اور یہ نصیحت بذات خود اس بات کی تاکید ہے کہ حکومت کے ذمہ دار افراد کو رسم و رواج اور قواعد و قوانین کو علماء دین اور حکماء الٰہی کی مفید رہنمائیوں ان کے گراں قدر مشوروں کے مطابق مقرر کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ یہ افراد کتاب خدا اور اس کے احکام سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں ۔ ایسا نہ ہو کہ حکومت کے ذمہ دار علماء کی آراء کے برخلاف اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل کرنے لگیں ۔ امام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

"وَأَكْثِرْ مُدَارَسَةَ الْعُلَمَاءِ وَمُنَاقَشَةَ الْحُكَمَاءِ فِي تَثْبِيتِ مَا صَلَحَ عَلَيْهِ أَمْرُ بِلَادِكَ وَإِقَامَةِ مَا اسْتَقَامَ بِهِ النَّاسُ قَبْلَكَ"

"مذاکرہ اور بحث و گفتگو کے لئے علماء و حکماء کی ہمنشینی زیادہ اختیار کرو اور تاکہ تم ملک کی مصلحتوں اور رفاہ کے کاموں کو قائم و پائدار کر سکو اور قوم کے

اگلے لوگوں کی طرح ملت کے حالات و امور میں استحکام اور مضبوطی لاؤ ۔"

یہ فطری امر ہے کہ اگر کسی حکومت کے ذمہ دار افراد قوانینِ الٰہی کو اپنا محور بنالیں اور اس سلسلہ میں علماء و حکماء سے برابر مشورے کیا کریں تو ملک و قوم نہ صرف یہ کہ گمراہی کا شکار نہ ہوگی بلکہ ملت و حکومت کو روز بروز استقلال اور پائداری حاصل ہوتی جائے گی ۔ امامؑ نے اپنے ایک اور خطبہ میں الٰہی سنن و شریعت کا احیاء، ان کی حفاظت و نگہبانی اور بدعتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے سلسلہ میں حکام کی ذمہ داریوں کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :-

" فَاعْلَمْ اَنَّ اَفْضَلَ عِبَادِ اللّٰهِ اِمَامٌ عَادِلٌ هُدِیَ وَهَدٰی فَاَقَامَ سُنَّةً مَعْلُوْمَةً وَاَمَاتَ بِدْعَةً مَجْهُوْلَةً ۔ وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ اِمَامٌ جَائِرٌ ضَلَّ وَضُلَّ بِهٖ فَاَمَاتَ سُنَّةً مَاْخُوْذَةً وَاَحْيٰى بِدْعَةً مَتْرُوْكَةً " (خطبہ نمبر ۱۶۴)

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کے نزدیک بہترین بندہ وہ حاکم عادل ہے جو خود ہدایت یافتہ ہے اور دوسروں کی بھی ہدایت کرتا ہے جانی بوجھی اور اچھی سنتوں کو قائم کرتا ہے اور جہالت کی پیدا کردہ مجہول بدعتوں کو توڑتا اور ان کا خاتمہ کرتا ہے ۔ اور بلا شبہ اللہ کی نگاہ میں بدترین بندہ وہ ظالم حاکم ہے جو خود گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچتا ہے (پیغمبر اکرمؐ) کی قائم کردہ سنتوں کا خاتمہ کرتا ہے اور متروکہ بدعتوں کو زندہ کرتا جاتا ہے "

اب اس سلسلہ میں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں کہ قوانین و احکام کا مرجع و مرکز کسے ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ اگر معیار کتاب و سنّت ہو ۔ اور پارلیمنٹ میں با صلاحیت افراد موجود ہوں نیز " ولایت فقیہ " کے اصول کے مطابق حکومت کا کام ایک صالح ولی فقیہ کی نگرانی اور سرپرستی میں آگے بڑھے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی ۔

اصل میں تمام مشکلات کی بنیاد یہ ہے کہ حکومت کا نظام غیر صالح ، جاہل اور اقتدار پسند افراد کے ہاتھوں میں چلا جائے جو خود اپنی مرضی کے مطابق من موجی طریقہ پر جو چاہیں کریں اور الٰہی احکام و قوانین کو قدموں تلے روند ڈالیں ۔

اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو پوری تاریخ میں حتی ملت اسلام پر حاکم موجودہ سیاستوں کی شکل میں صدیوں سے انسانی معاشرہ کو دامن گیر رہا ہے۔ لہٰذا اس بات کی کوشش ہونا چاہیئے کہ کسی طرح اس عظیم مصیبت سے نجات حاصل کی جائے۔ اسلام سے آگاہ صالح افراد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی ہوشیار رہنا چاہیئے کہ اسلام دشمن عناصر یا دین سے لاتعلق افراد اسلام کے نام پر حاکم نہ بن بیٹھیں کہ اسلام ہی کے نام پر اسے مٹانے کی کوششیں کرنے لگیں نتیجہ کے طور پر دہی خطرہ جو گذشتہ زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کی آبرو اور دین کی اصالت و حقانیت سے کھیلتا رہا ہے پھر درپیش ہو جائے۔ یہ نکتہ بہرحال ذہن میں رہنا چاہیئے کہ حق کی شناخت کا معیار افراد نہیں ہیں بلکہ حق خود افراد کی شناخت کا معیار ہے اور حق کی راہ و روش، کتاب و سنت اور اسلام کے حقیقی رہبروں کی سیرت و سیاست کے ذریعہ معین و مشخص ہو چکی ہے۔

۲۔ عدالتی مسائل اور قاضیوں کے خصوصیات

قضاوت کی اہمیت اور ایک قاضی کے خصوصیات و شرائط کیا ہیں، قضاوت کی اساس و بنیاد، اس کے مختلف پہلو، اس کا دائرۂ کار، اور اس امر سے متعلق و مربوط دیگر مسائل اسلام کی بنیادی کتابوں میں پوری وضاحت کے ساتھ جامع طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت علیؑ نے بھی اپنے ارشادات میں اس موضوع پر خاص تاکید فرمائی ہے۔ امامؑ نے مالک اشتر کو جو خط تحریر فرمایا ہے اس میں قاضیوں کے شرائط اور ان کی خصوصیات پر یوں روشنی ڈالی ہے:۔

"ثُمَّ اخْتَرْ لِلْحُكْمِ بَيْنَ النَّاسِ أَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِي نَفْسِكَ مِمَّنْ لَا تَضِيقُ بِهِ الْأُمُورُ وَلَا تُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ وَلَا يَتَمَادَىٰ فِي الزَّلَّةِ وَلَا يَحْصَرُ مِنَ الْفَيْءِ إِلَى الْحَقِّ إِذَا عَرَفَهُ وَلَا تُشْرِفُ نَفْسُهُ عَلَىٰ طَمَعٍ وَلَا يَكْتَفِي بِأَدْنَىٰ فَهْمٍ دُونَ أَقْصَاهُ وَأَوْقَفَهُمْ فِي الشُّبُهَاتِ وَآخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ وَأَقَلَّهُمْ تَبَرُّمًا بِمُرَاجَعَةِ الْخَصْمِ وَأَصْبَرَهُمْ عَلَىٰ تَكَشُّفِ الْأُمُورِ وَأَصْرَمَهُمْ عِنْدَ

اتضاح الحکم ممن لا یزدھیہ اطراء ولا یستمیلہ اغراء واولئک قلیل ۔

"لوگوں کے درمیان قضاوت اور فیصلے کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کرو جو تمہاری نگاہ میں رعایا میں سب سے بہتر ہو ، ایسا شخص جو اس کام میں عاجز و محدود نہ ہوتا ہو ، اور طرفین کے رویے سے غصہ میں نہ آتا ہو ۔ اپنے اشتباہ اور لغزش پر اصرار و ہٹ دھرمی کا اظہار نہ کرتا ہو اور حق کو پہچان کر اس کی طرف رجوع کرنے اور اسے اختیار کرنے میں تأمل یا طبیعت پر بوجھ نہ محسوس کرتا ہو ۔ اس کا نفس طمع و لالچ کا شکار نہ ہوتا ہو اور بغیر پوری چھان بین کئے سرسری طور پر کسی معاملہ کو سمجھنے پر اکتفا نہ کرتا ہو ۔ شبہ کے مقامات پر احتیاط سے کام لیتا ہو کافی اور اطمینان بخش دلائل کی بنیاد پر ہی فیصلہ کرتا ہو ۔ شکایت کرنے والوں کے بار بار رجوع کرنے سے تھکتا اور دل تنگ نہ ہوتا ہو ۔ معاملات کی تحقیق اور گتھیوں کو سلجھانے میں بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا ہو اور حق کو پہچان لینے کے بعد اس کے مطابق بےدھڑک فیصلہ سنا دیتا ہو ۔ خوشامد و چاپلوسی اسے مغرور نہ بنا دے اور فریب اسے گمراہ نہ کر دے ۔ البتہ ایسے لوگ بہت کم ہیں ۔"

قاضیوں کی نگرانی اور زندگی کے مسائل سے مستغنی رکھنا

مذکورہ بالا شرائط کے علاوہ خصوصیت سے قاضیوں اور عدالتی امور کے ذمہ دار افراد کے سلسلہ میں مسلمانوں کے ولی امر یعنی حاکم کا فریضہ ہے کہ وہ قاضیوں پر پوری نگاہ رکھے رہے ان کے مسائل و مشکلات کو حل کرتا رہے ۔ ان کے کام کی دیکھ بھال کرتا رہے اور اس اہم ترین گروہ کی نگرانی سے تھوڑی دیر کے لئے بھی چشم پوشی نہ کرے ، بلکہ ہمیشہ انھیں زیر نظر رکھے ۔ چنانچہ امامؑ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ثم اکثر تعاھد قضائہ وافسح لہ فی البذل ما یزیل علتہ وتقل معہ حاجتہ الی الناس واعطہ من المنزلۃ

لَدَيْكَ مَا لَا يَطْمَعُ فِيهِ غَيْرُكَ مِنْ خَاصَّتِكَ. لِيَأْمَنَ بِذَٰلِكَ اغْتِيَالَ الرِّجَالِ لَهُ عِنْدَكَ - فَانْظُرْ فِي ذَٰلِكَ نَظَرًا بَلِيغًا. فَإِنَّ هٰذَا الدِّينَ قَدْ كَانَ أَسِيرًا فِي أَيْدِي الْأَشْرَارِ يُعْمَلُ فِيهِ بِالْهَوَىٰ وَتُطْلَبُ بِهِ الدُّنْيَا "

"مزید یہ کہ اس (قاضی) کے فیصلوں کا ہمیشہ جائزہ لیتے رہا کرو اور اس کو بقدر کافی مال بخشو کہ وہ خلاف ورزی کے سلسلہ میں کوئی بہانہ تلاش نہ کر سکے اور لوگوں کا محتاج بن کر نہ رہے اسے اپنے نزدیک معزز و مقرب قرار دو تاکہ تمہارے دوسرے قوی افراد اسے لالچ دینے یا ضرر پہنچانے کی ہمت نہ کر سکیں اور وہ تمہاری توجہ کی وجہ سے لوگوں کے فریب و سازش سے خود کو محفوظ سمجھے۔ دیکھو اس سلسلہ میں کافی بالغ نظری سے کام لینا۔ کیونکہ (اس سے) پہلے یہ دین شر پسند عناصر کے پنجوں میں اسیر رہ چکا ہے اور انہوں نے اسے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل اور دنیا طلبی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔"

امامؑ کے اس قیمتی کلام میں بہت سے لطیف و ظریف نکتے موجود ہیں جن پر غور کئے بغیر سادگی سے گزر جانا نا انصافی ہو گی۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) نگرانی

ولی امر یعنی اسلامی نظام میں سب سے بلند مقام شخص کو قضاوت کے ذمہ دار افراد سے نہ صرف ہمیشہ رابطہ رکھنا چاہیئے بلکہ ان کے کاموں پر پوری نظر رکھنا چاہیئے اور ان کے سلسلہ میں صرف اطمینان و اعتماد پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ انسان خطاؤں سے محفوظ نہیں ہے اور چند لمحوں کی معمولی سی غفلت بھی بہت بڑے اور ناقابل تلافی نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

(ب) ضرورتوں کی تکمیل

قاضیوں اور حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد کی مادی و اقتصادی ضرورتوں اور زندگی کی دوسری احتیاجات کو پورا کرنا بڑی حساس اہمیت کا حامل ہے۔ بعض لوگ جذبات و احساسات

کے اعتبار سے ضعیف و کمزور ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اپنے مالی مشکلات ، احتیاجات اور تنگیوں میں گرفتار ہو کر گمراہی کی طرف کھینچ لئے جائیں لہٰذا ایسے لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور ان کے مادی مشکلات کو دور کر کے ان کی گمراہی اور انحراف کی راہوں کو بند کیا جا سکتا ہے نیز رشوت اور غلط قسم کے لین دین اور حساب و کتاب سے محفوظ رہا جا سکتا ہے ۔

مزید یہ کہ اقتصادی ضرورتیں بذات خود ایک حقیقت رکھتی ہیں اور حکومت پورے طور سے اس کی ذمہ دار ہے ۔

(ج) قدر دانی

بعض لوگوں کو چاپلوسی، بے جا تعریفوں یا چرب زبانی کے ذریعہ رام ہی نہیں بلکہ گمراہ بھی کیا جا سکتا ہے ۔ ایسے افراد اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے خود غرض اور فتنہ پرداز عناصر کی نظر میں رہتے ہیں اور بہت سے موقع پرست افراد محبت اور لگاوٹ کا جال بچھا کر ان کو اپنے آئینہ میں اتارتے ہیں جس کے نقصانات سے معاشرہ کا نظام محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ لہٰذا مافوق ذمہ داروں یا افسران بالا کو چاہیئے کہ اپنے ان ماتحت افراد سے ایسے روابط رکھیں جن سے وہ حقارت اور غربت کا احساس نہ کرنے پائیں ۔ دوسرے لفظوں میں ان کی شخصیتوں کو اہمیت و عزت بخشیں تاکہ منصب قضاوت کی آزادی اور مستقل مزاجی مجروح نہ ہونے پائے ۔

اس کے علاوہ اصولی طور پر لوگوں کی قدر دانی اور ان کے کاموں کی ہمت افزائی اور تشویق خود ایک مستقل اصول ہے ، کہ حدیث میں بھی ہے :

"مَنْ لَمْ يَشْكُرِ الْمَخْلُوقَ لَمْ يَشْكُرِ الْخَالِقَ" ۔

"جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا ، خالق کا شکر گزار بھی نہیں ہو سکتا ۔"

حضرت علیؑ کے اقوال میں ایسے افراد کی قدر دانی اور تعریف و توصیف کے نمونے موجود ہیں جنہوں نے خوش اسلوبی سے اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں انجام دی ہیں ۔ اس سلسلہ میں مناسب موقع پر تفصیل سے تذکرہ ہوگا ۔ بہر حال ان اقوال کو ملک کے ذمہ دار افراد کے لئے نمونۂ عمل ہونا چاہیئے ۔

(د) عدالت کی آزادی

آخر میں امامؑ نے اپنے کلام میں اہل شر کی حکومت کے دوران دین کی اسیری اور قید و بند کا تذکرہ فرمایا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ملک کے ذمہ دار افراد منجملہ محکمۂ عدلیہ کے عہدے دار اگر مستقل اور خود مختار ہوں یا انھیں گمراہی و خلاف ورزی کی طرف کھینچا جا سکتا ہو اور اثر و رسوخ، سفارش و رشوت یا لالچ، تعریف و خوشامد اور ڈرانے اور دھمکانے والے عناصر ان پر اثر انداز ہو سکتے ہوں تو گویا دین ان لوگوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو کر رہ جائے گا اور ہر طرح کے قوانین و احکام کے اجراء کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ پوری ملت اسیری اور غلامی کا شکار ہو جائے گی۔ اس کی بہت سی مثالیں ظلم و استبداد کے زیر تسلط ممالک کے عدالتی نظاموں حتیٰ ان ہی طاقتوں کی اسیر نام نہاد بین الاقوامی حقوق کو عدالتوں میں بے شمار مواقع پر دیکھنے کو ملی ہے اور ملتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قضاوت اور حقوق و قانون کے مسئلہ سے متعلق اسلام کی عمیق نظری اور باریک بینی کو پہلے سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ لہٰذا حکومت کے ذمہ دار افراد کا فریضہ ہے کہ جس طرح اسلام نے اس کی تاکید کی ہے حقوق و قضاوت کی خود مختاری اور سالمیت کی حفاظت کی پوری کوشش کریں، ساتھ میں اس کا بھی خیال رکھیں کہ عدالت کی اس آزادی میں گمراہ کن، غیر سالم اور نقصان دہ روشیں نفوذ نہ کرنا پائیں، کیونکہ یہ امر اسلام اور مسلمانوں کے لئے حیاتی قدر و قیمت کا حامل ہے۔

۳۔ اجرائی رکن اور ملت کا کردار

نظام حکومت کے ارکان میں سے ایک قانون کو نافذ کرنے والا رکن بھی ہے جس میں وزراء، اس کے معاونین، نائبین، سکریٹری اور منشی سے لے کر معمولی خدمت گزاروں تک سیکڑوں، ہزاروں افراد حکومت کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ ان افراد کا انتخاب و تقرر خود ایک مسئلہ ہے اور ان مختلف صنف کے افراد اور حکومت کے باہمی روابط اکثر ایک دوسرے پر اور خود معاشرہ پر ایک دوسرا مسئلہ۔ امام علیہ السلام نے تفصیل کے ساتھ ان دونوں پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے ملاحظہ ہو ——

وَاعْلَمْ اَنَّ الرَّعِیَّۃَ طَبَقَاتٌ لَا یَصْلُحُ بَعْضُهَا اِلَّا بِبَعْضٍ، وَلَا غِنیٰ بِبَعْضِهَا عَنْ بَعْضٍ فَمِنْهَا جُنُوْدُ اللّٰهِ، وَمِنْهَا کُتَّابُ الْعَامَّۃِ وَالْخَاصَّۃِ وَمِنْهَا قُضَاۃُ الْعَدْلِ، وَمِنْهَا عُمَّالُ الْاِنْصَافِ وَالرِّفْقِ، وَمِنْهَا اَهْلُ الْجِزْیَۃِ وَالْخَرَاجِ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّۃِ وَمُسْلِمَۃِ النَّاسِ، وَمِنْهَا التُّجَّارُ وَاَهْلُ الصِّنَاعَاتِ وَمِنْهَا الطَّبَقَۃُ السُّفْلیٰ مِنْ ذَوِی الْحَاجَۃِ وَالْمَسْکَنَۃِ، وَکُلٌّ قَدْ سَمَّی اللّٰهُ لَهٗ سَهْمَهٗ وَوَضَعَ عَلیٰ حَدِّهٖ فَرِیْضَۃً فِیْ کِتَابِهٖ اَوْ سُنَّۃِ نَبِیِّهٖ۔ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ۔ عَهْدًا مِنْهُ عِنْدَنَا مَحْفُوْظًا (خط نمبر ۵۳)

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں، جن کی فلاح و بہبود ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اور وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں۔ یہ طبقے کچھ اس طرح ہیں، خدا کے سپاہی (لشکر) عمومی و خصوصی شعبوں کے منشی، عدالتوں کے قاضی، امن و انصاف قائم کرنے پر مامور افراد، ذمی کفار اور مسلمانوں سے جزیہ خراج اور دیگر ٹیکس وصول کرنے والے۔ تجار اور اہل صنعت و حرفت اور معاشرہ کا غریب و محتاج اور نچلا طبقہ۔ خداوند عالم نے ہر ایک کا حق معین کر دیا ہے اور کتاب خدا و سنت پیغمبرؐ میں اس کی حد بندی کر دی ہے۔ جو ایک عہد اور آئین نامہ کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

چونکہ اسلام کے سیاسی نظام میں، حکومت، ملت سے الگ نہیں ہے اور رعایا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے معاشرہ کا پست اور محنت کش طبقہ ہی مراد لیا جائے۔ بلکہ معاشرہ کے پست طبقے بھی اس نظام میں ایک حساس جگہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کلام امام میں بلا استثناء معاشرہ کے تمام طبقات کا ذکر موجود ہے اور جس طرح مسلح فوجوں نیز عدالتی حکام کا ذکر کیا گیا ہے یوں ہی کاریگروں، مزدوروں، کسانوں، تاجروں اور محروم و فقیر افراد کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سب کے لئے مخصوص حدود و حقوق بھی معین کئے گئے ہیں۔ جس کی

تفصیل آئندہ سامنے آئے گی۔

امام علیہ السلام نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے حکومت و مملکت کے نظام میں مذکورہ بالا تمام طبقوں کی معاشرہ میں حیثیت و اہمیت نیز ایک دوسرے کے ساتھ ان کے باہمی ارتباط کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

(الف) سپاہ یا فوج

"فَالجنودُ بِإذنِ اللهِ حصُونُ الرَّعيّة، وَزَينُ الوُلاة، وعِزُّ الدِّين، وسبلُ الأمن وَلَيسَ تقُومُ الرَّعيّة إلّا بِهم"

"فوج خدا کے حکم سے ملت کا مستحکم اور ناقابل تسخیر قلعہ، حکام کی زینت و آبرو، دین کے لئے مایۂ عزت و افتخار اور معاشرہ میں امن و امان قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ رعایا کو بغیر اس کے استقلال و استحکام نہیں حاصل ہو سکتا۔"

(ب) دفاعی بجٹ

"ثُمَّ لا قوامَ لِلجُنودِ إلّا بِما يُخرِجُ اللهُ لَهُم مِنَ الخَراجِ الَّذي يقوُونَ بِهِ عَلى جهادِ عدوّهم وَيَعتمدونَ عَلَيهِ فيما يصلحهم وَيَكونُ مِن وراءِ حاجَتِهِم"

"اور پھر فوج کا نظم و استحکام بھی ان مالیات یا ٹیکسوں اور آمدنیوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا جو خدا نے ان کے اختیار میں دے رکھے ہیں کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے دشمن سے جہاد کریں اور خود کو قوی اور ساز و سامان سے آراستہ کریں نیز اپنی ضرورتیں پوری کریں۔"

(ج) قاضی اور دیگر کارکنان حکومت

"ثُمَّ لا قوامَ لِهذينِ الصِّنفَينِ إلّا بِالصِّنفِ الثّالِثِ مِنَ القُضاةِ وَالعُمّالِ وَالكُتّابِ لِما يحكمونَ مِنَ المَعاقِدِ وَيَجمَعونَ مِنَ المَنافِعِ وَيُؤتمنونَ عَلَيهِ مِن خواصّ الأمورِ وعوامِّها"

"پھر مذکورہ بالا ان دو صنفوں یعنی فوج اور رعایا کی بقا کے استحکام کا انحصار تیسرے گروہ پر ہے جن سے مراد قضاۃ، حکومت کے کارکنان اور منشی ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ باہمی معاہدوں کو محکم و استوار کرتے ہیں، منافع اور آمدنیوں کو جمع کرتے ہیں اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے امور میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔"

(د) تجار اور اہل صنعت و حرفت

"وَلَا قِوَامَ لَهُمْ جَمِيعاً إِلَّا بِالتُّجَّارِ وَذَوِي الصِّنَاعَاتِ فِيمَا يَجْتَمِعُونَ عَلَيْهِ مِنْ مَرَافِقِهِمْ وَيُقِيمُونَ مِنْ أَسْوَاقِهِمْ وَيَكْفُونَهُمْ مِنَ التَّرَفُّقِ بِأَيْدِيهِمْ مَا لَا يَبْلُغُهُ رِفْقُ غَيْرِهِمْ"

"اور ان سب کا انحصار تاجروں اور اہل صنعت و حرفت پر ہے۔ جو کسب و کار کے لئے بازاروں اور کارخانوں میں جمع ہوتے ہیں اور اپنی آمدنی و محنت و کاوش سے ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں (اور انھیں آسودہ کر دیتے ہیں) کہ دوسروں کی آمدنی اس کی تلافی کے لئے کافی نہیں ہوتی"۔

(ھ) کمزور اور نچلا طبقہ

"ثُمَّ الطَّبَقَةُ السُّفْلَى مِنْ أَهْلِ الْحَاجَةِ وَالْمَسْكَنَةِ الَّذِينَ يَحِقُّ رِفْدُهُمْ وَمَعُونَتُهُمْ وَفِي اللَّهِ لِكُلٍّ سَعَةٌ وَلِكُلٍّ عَلَى الْوَالِي حَقٌّ بِقَدْرِ مَا يُصْلِحُهُ، وَلَيْسَ يَخْرُجُ الْوَالِي مِنْ حَقِيقَةِ مَا أَلْزَمَهُ اللَّهُ مِنْ ذَلِكَ إِلَّا بِالِاهْتِمَامِ وَالِاسْتِعَانَةِ بِاللَّهِ وَتَوْطِينِ نَفْسِهِ عَلَى لُزُومِ الْحَقِّ وَالصَّبْرِ عَلَيْهِ فِيمَا خَفَّ عَلَيْهِ أَوْ ثَقُلَ"

"اور آخر میں معاشرہ کا وہ نچلا طبقہ ہے جو محتاج اور تہی دست افراد پر مشتمل ہے۔ اور جن کی ضرورتیں اعانت اور مالی امداد کے ذریعہ پوری کی جانی چاہیئے۔ خداوند عالم نے معاشرہ کے ان طبقوں میں ہر ایک کے لئے ایک نہ ایک راہ کھول رکھی ہے اور ان کی حیثیت کے مطابق سب کا حکومت اور والی پر حق مقرر فرمایا ہے۔

اور حاکم اپنے اس فریضہ سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب اس سلسلہ میں عزم

وحوصلہ کے ساتھ پوری صدوجہد سے کام لے، خداوند عالم سے نصرت کا طلبگار رہے حق پر اپنے آپکو پوری طرح جمائے رہے اور صبر اختیار کرے چاہے اس کی یہ ذمہ داریاں سبک ہوں یا سنگین۔

حکومت اور معاشرہ کے ان بنیادی ارکان کی اہمیت وحیثیت سے متعلق اس اجمالی اور جامع بیان کے بعد کلام امامؑ کی چند دوسری خصوصیات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہم یہاں ان میں سے بعض اہم نکات کا ذکر کرتے ہیں :۔

خراج اور مالیات (ٹیکس)

امام علیہ السلام نے بازاروں اور کارخانوں کی آمدنیوں کو جو حکومت کے مالی "اعتبار" کی حیثیت سے توجہ کے بحث، عدالتی محکموں اور دیگر حکومتی اداروں میں کام کرنے والے افراد نیز معاشرہ کے محروم طبقہ کی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تاجروں اور صاحبان صنعت وحرفت کی آمدنی ہی حکومت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اس نتیجہ سے دو بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں جنھیں ہم حسب ذیل ذکر کرتے ہیں ۔

(۱) ـــــ جو آمدنیاں ملک کے معنومیں حکومت کے اعتبار کی حیثیت رکھتی ہیں، قطعی طور پر وہ آمدنیاں نہیں ہیں جو صرف شرعی رقومات (مثلاً خمس وزکوٰۃ) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہو، لہٰذا یقیناً "خراج" جو فقہ وحدیث کی عبارتوں، منجملہ امامؑ کے اسی منشور میں آیا ہے اس سے مراد شرعی رقومات سے بالاتر ہی کوئی چیز ہونی چاہیئے اور جسے آمدنی پر لگنے والا ٹیکس کہا جا سکتا ہے جو وقت کے تقاضوں، حکومت اسلامی کی صوابدید اور ملکی بجٹ کے مطابق ہونا چاہیئے ۔

(البتہ) اگر قومی آمدنی اور ضرورت کے پیش نظر ولی فقیہ کی اجازت سے استعمال کی جانے والی شرعی رقومات بھی ملکی بجٹ کو پورا نہ کر سکیں تو مالیات اور خراج کی صورت میں ادا کئے جانے والے ٹیکس بجٹ کے خسارہ اور ملک کی ضرورت کے مطابق مقرر کئے جائیں گے، جس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے ۔)

(۲) ـــــ جس طرح حکومت ملکی مخارج کے ایک بڑے حصہ کا بوجھ ملت کے کاندھوں پر ڈالتی ہے اور تاجروں نیز اہل صنعت وحرفت پر خصوصی ٹیکس مقرر کرتی ہے تو حکومت کو چاہئے کہ اس کے عوض ہر ممکن طریقہ سے ان کی حمایت کی بھی کوشش کرے اور عمومی طور پر پیداوار کی سطح کو بلند کرنے کی غرض سے ان کے لئے آسانیاں اور ضروری وسائل وامکانات فراہم کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ حکومت اور ملت کے افراد کا باہمی تعاون ہے جو اقتصادی اعتبار سے خود ملت اور حکومت کی بنیادی وحیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت امام کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہی ہے، چنانچہ آپ کے مذکورہ خط میں دوسرے مقامات پر بھی ہمیں یہ نکات نظر آتے ہیں۔

لائق اور نالائق وزراء

"إِنَّ شَرَّ وُزَرَائِكَ مَنْ كَانَ لِلْأَشْرَارِ قَبْلَكَ وَزِيراً وَمَنْ شَرِكَهُمْ فِي الْآثَامِ فَلَا يَكُونَنَّ لَكَ بِطَانَةً فَإِنَّهُمْ أَعْوَانُ الْأَثَمَةِ وَإِخْوَانُ الظَّلَمَةِ وَأَنْتَ وَاجِدٌ مِنْهُمْ خَيْرَ الْخَلَفِ مِمَّنْ لَهُ مِثْلُ آرَائِهِمْ وَنَفَاذِهِمْ وَلَيْسَ عَلَيْهِ مِثْلُ آصَارِهِمْ وَأَوْزَارِهِمْ آثَامِهِمْ مِمَّنْ لَمْ يُعَاوِنْ ظَالِماً عَلَى ظُلْمِهِ وَلَا آثِماً عَلَى إِثْمِهِ أُولَئِكَ أَخَفُّ عَلَيْكَ مَئُونَةً وَأَحْسَنُ لَكَ مَعُونَةً وَأَحْنَى عَلَيْكَ عَطْفاً، وَأَقَلُّ لِغَيْرِكَ إِلْفاً، فَاتَّخِذْ أُولَئِكَ خَاصَّةً لِخَلَوَاتِكَ وَحَفَلَاتِكَ."

"تمہارے بدترین وزراء وہ ہیں جو تم سے پہلے کے ظالم حکام کی وزارت میں رہ چکے ہیں اور ان کے جرائم میں شریک رہے ہیں۔ پس خبردار ایسے لوگ تمہارے رازدار اور مقرب نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ یہ لوگ تباہ کاروں کے شریک کار اور ظالموں کے منہ بولے بھائی ہیں۔ جبکہ تم یہ کر سکتے ہو کہ ان کی جگہ ایسے صالح افراد کو معین کرو جو اس منصب کے لائق ضروری آگاہی اور تجربہ رکھتے ہوں جن کے دامن گذشتہ لوگوں کی طرح جرائم، گناہوں اور گمراہیوں سے آلودہ نہ ہوں اور جنھوں نے ستم کاروں اور خطاکاروں کے

ساتھ تعاون بھی نہ کیا ہو۔ ایسے لوگ کم خرچ اور مختصر معاوضہ پر بہتر خدمت انجام دیتے ہیں، پوری دلجمعی اور گہرے احساسات کے ساتھ تم سے ملتے ہیں اور دوسروں سے کم ہی دل لگاتے ہیں۔ پس انہی لوگوں کو اپنے خفیہ و محرمانہ جلسوں اور مخصوص محفلوں کے لئے منتخب کرو۔

"ثُمَّ لْيَكُنْ آثَرُهُمْ عِنْدَكَ أَقْوَلَهُمْ بِمُرِّ الْحَقِّ لَكَ، وَأَقَلَّهُمْ مُسَاعَدَةً فِيمَا يَكُونُ مِنْكَ مِمَّا كَرِهَ اللَّهُ لِأَوْلِيَائِهِ، وَاقِعاً ذَلِكَ مِنْ هَوَاكَ حَيْثُ وَقَعَ وَالْصَقْ بِأَهْلِ الْوَرَعِ وَالصِّدْقِ ثُمَّ رُضْهُمْ عَلَى أَلَّا يُطْرُوكَ وَلَا يَبْجَحُوكَ بِبَاطِلٍ لَمْ تَفْعَلْهُ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْإِطْرَاءِ تُحْدِثُ الزَّهْوَ وَتُدْنِي مِنَ الْعِزَّةِ"

"اور ان میں بھی اس شخص کو زیادہ ترجیح دو جو حق بات کو چاہے جتنی کڑوی ہو، تم سے کھل کر بیان کر دے۔ اور کسی ایسے کام میں تمہارے ساتھ تھوڑا سا بھی تعاون کرنے پر تیار نہ ہو۔ جسے اللہ اپنے اولیاء کے لئے پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ کام تمہاری خواہش کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ پرہیزگار اور سچے افراد سے گہرے روابط اور نزدیکی تعلقات رکھو اور انہیں اس کا عادی بناؤ کہ تمہاری بیجا تعریفیں کرکے اور تمہارے سر کسی ایسے کارنامہ کا سہرا باندھ کر تمہیں فریب نہ دیں کیونکہ بیجا چاپلوسی کی باتیں غرور و تکبر پیدا کرتی ہیں۔"

مذکورہ بالا کلام کی روشنی میں ایک اسلامی نظام کے لئے وزیروں کے انتخاب اور ان کے خصوصیات سے متعلق چند حسب ذیل نکات قابل غور اور لائق توجہ ہیں۔

(الف) عدم وابستگی و بے داغ ماضی

وزراء اور حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد جو غیر صالح اور ناجائز حکومتوں سے وابستہ رہے ہیں، اسلامی حکومت میں وزارت یا دوسرے عہدوں پر کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ ایک طرف تو ان پر اس لئے اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ ظالموں کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون ان کی عادت ثانیہ بن چکی ہے، اور ان کی اس دیرینہ عادت کو بمشکل ہی ان سے دور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ یہ لوگ ناقابل اعتبار ہو چکے ہیں لہٰذا ہمیشہ عوام کی آنکھوں

کا کانٹا اوران کی روح میں گرہ بن کر کھٹکتے رہیں گے۔ مزید یہ کہ یہ لوگ اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے صالح افراد کو جذب بھی نہیں کر سکتے۔ نتیجہ میں ملک کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا اور گمراہی و کمزوری کا شکار ہو جائے گا۔

(ب) وزیروں کا اخلاق

وزراء، ان کے معاون اور حساس عہدوں کے ذمہ دار بلکہ حکومت کے تمام اہم عہدوں پر کام کرنے والے افراد ایسے ہوں جن کا ماضی خراب نہ ہو، وہ کم توقع، محنتی، رحم دل اور باوفا ہوں کیونکہ یہ صفات حکومت کو استحکام بخشنے، نظام کو پائدار بنانے اور معاشرہ کے عمومی مصالح کے حق میں اہم کردار ادا کریں گے۔ ان خصوصیات کے حامل افراد حکومت کے رازدار اور دشمنوں کے ساتھ ضرر رساں روابط کے خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

(ج) صاف گوئی

حکومت کے کارکنان، چاہے وہ وزراء ہوں یا دیگر عہدہ دار اور اسلامی نظام میں کام کرنے والے افراد، ان کا دامن تملق و چاپلوسی کی عادت سے پاک ہونا چاہیئے۔ وہ نہ صرف بے جا تعریفوں اور مدح سرائیوں سے پرہیز کریں بلکہ حق کو صاف صاف بیان کردیں چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو اپنے سے بڑے عہدہ دار یا افسر کا رعب و داب انھیں حق بات کہنے سے روک نہ دے۔ کیونکہ حقائق کا بیان کرنا ایک فریضہ ہے، خاص طور سے جبکہ اس سے ملک و قوم کی بھلائی اور بہتری بھی وابستہ ہو۔

(د) خوشامد سے پرہیز

اور آخری نکتہ یہ ہے کہ حاکم کا طرز عمل ایسا ہونا چاہیئے جس سے اس کے ساتھ کام کرنے والوں اور ماتحتوں میں خوشامد و چاپلوسی کی عادت پیدا نہ ہونے پائے۔ اسے چاہیئے کہ سیاسی طور پر تقویٰ و پرہیز گاری کے ذریعہ اپنی خود خواہی اور خود پسندی کی عادت کا گلا گھونٹ دے اور خوشامد پسندی کی خو کو کچل ڈالے، سازگار اور مفید تنقیدوں کے لئے ماحول پیدا کرے اور پوری ریاضت و جدوجہد کے ذریعہ خوشامد و چاپلوسی جیسی ذلیل خصلت سے مقابلہ کرتا رہے، جو انسانوں کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔

امام علیہ السلام کے کلام گہربار میں جو بات بیان ہوئی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے آپ نے اپنی حکومت میں عملی طور پر ثابت بھی کیا ہے۔ حکومت اور طاقت کے ہوتے ہوئے بھی آپ کی عظیم روح میں وہ خطرناک اثرات پیدا نہ ہو سکے۔ یہ وہ شان ہے جو خداوند عالم نے اپنے اولیاء کو عطا کی ہے اور حکومت کے ذمہ دار افراد کو اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا کرنا چاہیے۔

دیگر ملازمین کا انتخاب

اس عہدنامہ کے ایک دوسرے حصہ میں امام علیہ السلام نے حکومت کے دیگر عمال و ملازمین کے انتخاب کی جانب اشارہ فرمایا ہے، اور ان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لائق اور باصلاحیت افراد کے انتخاب کے سلسلہ میں یوں راہنمائی فرمائی ہے:۔

"ثُمَّ انْظُرْ فِي أُمُورِ عُمَّالِكَ فَاسْتَعْمِلْهُمْ اِخْتِبَاراً وَلَا تُوَلِّهِمْ مُحَابَاةً وَأَثَرَةً فَإِنَّهُمَا جِمَاعٌ مِنْ شُعَبِ الْجَوْرِ وَالْخِيَانَةِ وَتَوَخَّ مِنْهُمْ أَهْلَ التَّجْرِبَةِ وَالْحَيَاءِ مِنْ أَهْلِ الْبُيُوتَاتِ الصَّالِحَةِ وَالْقَدَمِ فِي الْإِسْلَامِ الْمُتَقَدِّمَةِ. فَإِنَّهُمْ أَكْرَمُ أَخْلَاقاً وَأَصَحُّ أَعْرَاضاً وَأَقَلُّ فِي الْمَطَامِعِ إِشْرَاقاً وَأَبْلَغُ فِي عَوَاقِبِ الْأُمُورِ نَظَراً"

"پھر اپنے عہدہ داروں اور کارندوں کے بارے میں خوب غور کرو اور دقیق آزمائش کے بعد خود آرائی اور جانبداری سے دور رہ کر انھیں عہدوں کے لئے انتخاب کرو، کیونکہ یہ دونوں صورتیں ظلم و ستم اور خیانت کو ہوا دیتی ہیں۔ لوگوں میں سے آزمودہ کار باتجربہ اور حیادار افراد کو منتخب کرو جو نیک اور صالح و اسلام لانے والوں میں پیش قدم خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں، کیونکہ یہ لوگ بلند اخلاق اور قابل اعتماد ہیں۔ طمع و لالچ کی طرف کم جھکتے ہیں اور نتائج و انجام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔"

تجربہ، آزمودہ کاری، غیرت مندی، خاندانی نجابت، درخشاں دینی ماضی، خوش

اخلاق، شرافت، قناعت، عزت نفس اور مآل اندیشی ایسے اصول ہیں جنھیں امام نے لوگوں کے انتخابات کے لئے معیار قرار دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت ان کارگزاروں اور ملازموں کے سلسلہ میں حکومت کے حکام کی ذمہ داریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"ثُمَّ اَسْبِغْ عَلَيْهِمُ الْاَرْزَاقَ فَاِنَّ ذٰلِكَ قُوَّةٌ عَلَيْهِمْ عَلَى اسْتِصْلَاحِ اَنْفُسِهِمْ وَغِنًى لَهُمْ عَنْ تَنَاوُلِ مَا تَحْتَ اَيْدِيْهِمْ، وَحُجَّةٌ عَلَيْهِمْ اِنْ خَالَفُوْا اَمْرَكَ اَوْ ثَلَمُوْا اَمَانَتَكَ "

"اس کے بعد ان کی روزی و معاش (تنخواہیں) انھیں بحد کافی دو جس سے یہ امکان پیدا ہوگا کہ وہ اپنی اصلاح کے سلسلہ میں کوشاں رہیں گے اور ان کے زیر نگیں جو اموال اور امانتیں ہیں ان میں خیانت سے بے نیاز رہیں گے۔ ساتھ ہی یہ امر تمہاری طرف سے ان کے اوپر حجت تمام کردے گا کہ تمہارے حکم کی مخالفت یا امانت میں خیانت کی صورت میں وہ کوئی عذر پیش نہ کرسکیں گے۔"

ساتھ ہی کارگزاروں کے کام اور ان کے اعمال و کردار کی نگرانی کو بھی حکام کی ایک ذمہ داری کی حیثیت سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

نگرانی اور جانچ پڑتال

"ثُمَّ تَفَقَّدْ اَعْمَالَهُمْ وَابْعَثِ الْعُيُوْنَ مِنْ اَهْلِ الصِّدْقِ وَالْوَفَاءِ عَلَيْهِمْ فَاِنَّ تَعَاهُدَكَ فِي السِّرِّ لِاُمُوْرِهِمْ حَدْوَةٌ لَهُمْ عَلَى اسْتِعْمَالِ الْاَمَانَةِ وَالرِّفْقِ بِالرَّعِيَّةِ۔ وَتَحَفَّظْ مِنَ الْاَعْوَانِ فَاِنْ اَحَدٌ مِنْهُمْ بَسَطَ يَدَهٗ اِلَى خِيَانَةٍ اجْتَمَعَتْ بِهَا عَلَيْهِ عِنْدَكَ اَخْبَارُ عُيُوْنِكَ اكْتَفَيْتَ بِذٰلِكَ شَاهِدًا فَبَسَطْتَ عَلَيْهِ الْعُقُوْبَةَ فِيْ بَدَنِهٖ وَاَخَذْتَهٗ بِمَا اَصَابَ مِنْ عَمَلِهٖ، ثُمَّ نَصَبْتَهٗ بِمَقَامِ الْمَذَلَّةِ وَوَسَمْتَهٗ بِالْخِيَانَةِ وَقَلَّدْتَهٗ عَارَ التُّهَمَةِ "

"اس کے بعد ان کی کارگزاریوں کی دیکھ بھال اور نگرانی رکھو۔ سچے اور وفادار افراد کو

بطور ناظران کے اوپر معین کرو کیونکہ ان کی خفیہ نگرانی اور جانچ پڑتال انھیں امانت کی رعایت اور لوگوں کے ساتھ نرم روی پر مجبور کردے گی۔ اپنے مددگاروں اور معاونین سے خود کو محفوظ رکھنا، اگر ان میں سے کوئی خیانت کا مرتکب ہو اور تمہارے خفیہ مخبر متفقہ طور پر اس کی خیانت کی خبر دیں تو یہ گواہی تمہارے لئے کافی ہے کہ اس کی تنبیہ کرو۔ اس نے خیانت سے جو کچھ سمیٹا ہے اس کا مواخذہ کرو۔ اسے ذلیل و خوار کردو، خیانت کا داغ اس کی پیشانی پر ثبت کردو اور ننگ و رسوائی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دو۔"

یہاں حاکم کی ہوشیار رہنے کے ذریعہ سازشوں اور غلط کاریوں کی پہچان نیز براہ راست یا کسی اور ذریعہ سے ماتحت عملہ کی مسلسل نگرانی، دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کی ضرورت اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ یہ اقدام ملکی امور کے چلانے اور حکومت کو پائیداری و استحکام عطا کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

وجہ افتخار

"ہمیں فخر ہے کہ ہم اس مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد خدا کے حکم سے رسول خدا (ص) نے رکھی ہے اور انسان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی ذمہ داری، ہر قسم کی قید و بند سے آزاد (خدا کے) بندہ امیر المومنین علی بن ابی طالب(ع) کو سونپی گئی ہے . . . ہمیں فخر ہے کہ ائمۂ معصومین(ع)، علی بن ابی طالب(ع) سے منجی بشریت حضرت مہدی صاحب الزمان علیہم آلاف التحیۃ والسلام تک جو خدائے قادر کی قدرت و توانائی سے زندہ اور تمام امور کے نگراں ہیں، ہمارے امام ہیں۔"

امام خمینی(رہ) کے وصیت نامہ سے اقتباس

امامت

قرآن کی روشنی میں

سوال و جواب

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

سوال : معصوم کا کیا مطلب ہے؟ یہ ہماری شیعہ منطق کا ساختہ و پرداختہ کوئی کوئی مفہوم ہے یا اس کی کچھ بنیادیں ہیں اور ہم نے انہیں پروان چڑھا کر بہتر بنایا ہے؟ اصولی طور پر کیا معصوم اس شخص کو کہتے ہیں جو گناہ نہ کرے۔ یا اسے کہتے ہیں جو گناہ کے علاوہ کوئی اشتباہ یا غلطی بھی نہ کرتا ہو؟

ہم بیس سال پہلے میرزا ابوالحسن خان فروغی مرحوم کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے یہ بزرگوار خاص طور سے عصمت کے مسئلہ میں خصوصی اور وسیع مطالعہ اور خاص عقیدہ رکھتے تھے۔ اور اس موضوع پر بہترین انداز میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے اگرچہ ہم اس وقت ان کی اسّی فی صد گفتگو سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس میں سے بیس فیصدی جو سمجھتے تھے۔ اس کے مطابق وہ عصمت کی ایک دوسرے انداز میں تعریف کرتے تھے وہ فرماتے تھے۔ معصوم وہ نہیں ہے جو گناہ نہ کرے۔ ہماری نگاہ میں بہت سے ایسے افراد ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں گناہ ہی نہیں کیا۔ لیکن انہیں معصوم نہیں کہتے۔ اس وقت ہمیں اس فکر سے سروکار نہیں ہے۔ آقائے مطہری کے پاس یقیناً اس کا جواب ہوگا کہ معصوم سے کیا مراد ہے؟ اگر معصوم وہ شخص ہے جس سے کبھی کوئی غلطی یا بھول چوک

بھی نہ ہوئی ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ ائمہ علیہم السلام میں سے صرف دو حضرات مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے : حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ اور وہ بھی بڑی مختصر مدت کے لئے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان حضرات سے خلافت کے معاملات اور حکومت چلانے کے سلسلہ میں بہت سے اشتباہ ہوئے اور تاریخی نقطۂ نظر سے ان اشتباہات اور غلطیوں میں کسی شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں ۔ اور یہ بات معصوم کی مذکورہ بالا تعریف سے کسی طرح میل نہیں کھاتی ۔

مثال کے طور پر امام حسن علیہ السلام کا عبیداللہ بن عباس کو معاویہ سے جنگ کے لئے مامور کرنا ۔ یا خود حضرت علی علیہ السلام کا عبیداللہ بن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کرنا ۔ اگر آپ جانتے ہوتے کہ یہ شخص اس قدر رسوائی کا باعث ہوگا اور ایسی بد عملی کا مظاہرہ کرے گا تو یقیناً آپ یہ کام نہ کرتے ۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ آپ حقیقت سے واقف نہ تھے یعنی پہلے آپ کا خیال یہ تھا کہ میں نے جسے انتخاب کیا ہے وہ اس کام کے لئے بہترین شخص ہے ، لیکن بعد میں وہ شخص غلط نکلا ۔ اور اگر حضرتؑ کے دورۂ حکومت سے متعلق مزید تحقیق کی جائے تو یقیناً اس طرح کے اور بھی مسائل نظر آئیں گے اور تاریخی لحاظ سے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں ہے ۔ لیکن یہ بات عصمت کی اس تعریف سے بالکل میل نہیں کھاتی

اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ بحث کرنے کا یک طرفہ انداز یعنی سارے موافق حضرات کا کسی بحث میں حصہ لینا زیادہ مفید نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعی جب انسان کوئی عقیدہ رکھتا ہے تو اسے دوست بھی رکھتا ہے اور اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ اپنے اس عقیدہ کے خلاف کچھ بھی سُنے ۔ خاص طور سے ہم جو بچپن سے ہی شیعیت اور خاندان علیؑ بن ابی طالب سے محبت اپنے دل میں رکھتے آئے ہیں اور کبھی اس کے خلاف تنقید نہیں سنی ہے ۔ شاید خود دین و اصولِ دین یہاں تک کہ توحید و خدا پرستی سے متعلق اعتراضات یا تنقیدیں تو آسانی سے سن لی ہوں لیکن تشیع اور ائمہ علیہم السلام پر تنقید یا کسی کا ان حضرات کی زندگی کا یہ ہولنے یہ کام کیوں کیا اور وہ کیوں نہ کیا ، سے ہمارے کان آشنا نہیں ہیں ، اسی وجہ سے اگر کوئی مثال کے طور پر امام حسنؑ کے عمل یا امام حسینؑ کے اقدام پر اعتراض کرے تو ہمیں بہت

شاق گزرتا ہے۔

لیکن مثال کے طور پر یہ آیت جسے آقائے مطہری نے پہلے جلسہ میں اور اس جلسہ میں موضوع قرار دیا ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے "وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات ادا کرتے ہیں" اس کے بعد آپ نے استدلال فرمایا کہ یہ آیت اس واقعہ کے تحت جس میں حضرت علیؑ نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی سائل کو دی تھی، سوائے حضرت علیؑ کے کسی اور کے بارے میں نہیں ہے۔ میری نظر میں یہ بات کچھ منطقی اور معقول نہیں لگتی۔ کیونکہ اول تو ہم نے امیرالمؤمنینؑ کی زندگی کے بارے میں یہ پڑھا اور سنا ہے کہ نماز کی حالت میں آپ کی توجہ خداوند عالم کی جانب اس قدر ہوا کرتی تھی کہ گرد و پیش کے لوگوں سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وضو کرتے وقت بھی اگر آپ کے سامنے سے لوگ گزر جاتے تھے تو آپ انھیں پہچان نہیں پاتے تھے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز کی حالت میں ایسے شخص کے حواس اس قدر دوسروں کی طرف متوجہ ہوں کہ سائل مسجد میں وارد ہوتا ہے، سوال کرتا ہے، کوئی اسے کچھ نہیں دیتا اور حضرت اپنی انگوٹھی اتار کر اس کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ سائل کو پیسے دینا کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے۔ سائل کو پیسہ دینا اس قدر اہم نہیں ہے کہ انسان اپنی نماز کو کم از کم باطنی اور روحانی اعتبار سے ہی ناقص کر دے یا اس میں خلل پیدا کرے؟

اس کے علاوہ زکات کا تعلق انگوٹھی سے نہیں ہے اور فقہائے شیعہ کے فتووں کے مطابق زکوٰۃ سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں شامل بھی نہیں ہے۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر وہ افراد جو اس سلسلہ میں کثرت سے ہیں اس موضوع کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے یہ بھی فرما گئے ہیں کہ یہ انگوٹھی بہت زیادہ قیمتی تھی۔ جبکہ حضرت علیؑ نے قیمتی انگوٹھی نہیں پہنی۔؟

جواب: جس نکتہ کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا کہ جلسہ میں مخالف موقف رکھنے والے افراد بھی ہونے چاہئے یقیناً تمام جلسوں کے لئے یہ ایک مفید فکر ہے اور میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کام اچھا اور مفید ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ عصمت کیا ہے ؟ تو اس سلسلہ میں اکثر انسان یہ خیال کرتا ہے کہ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں بعض مخصوص افراد کی ہمیشہ نگرانی کیا کرتا ہے کہ جیسے ہی وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتے ہیں فوراً انھیں روک دیتا ہے۔ مسلم طور پر عصمت کے یہ معنی نہیں ہیں ۔ اور اگر یوں بھی ہو تو یہ کسی کے لئے کمال کی بات نہیں ہے۔ اگر کسی بچہ پر ایک شخص برابر نگرانی رکھے اور اسے کوئی غلط کام کرنے نہ دے تو یہ اس بچہ کے لئے کوئی کمال شمار نہ ہوگا ۔ لیکن عصمت کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو قرآن سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید حضرت یوسف صدیق کے بارے میں اس سخت منزل میں جب زلیخا ان کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی ، فرماتا ہے :

"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ یعنی اس عورت نے یوسف کا ارادہ کیا۔
وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ" (۱) اور یوسف بھی اگر دلیل پروردگار کا مشاہدہ نہ کرتے ہوتے تو اس کا ارادہ کرتے۔

یعنی وہ بھی ایک انسان تھے، جوان تھے اور جذبات رکھتے تھے ۔ زلیخا یوسفؑ کی طرف بڑھی لیکن یوسفؑ اس کی طرف نہیں بڑھے ۔ یوسفؑ بھی اگر شہود کی منزل پر نہ ہوتے یعنی اس عمل کی حقیقت کو اپنے سامنے ظاہر و عیاں نہ دیکھتے تو اس کی طرف مائل ہو جاتے ۔ حضرت یوسف چونکہ صاحب ایمان تھے اور آپ کا ایمان کامل تھا اور ایمان شہودی کی حد کو پہنچا ہوا تھا ۔ یعنی گویا وہ اس عمل کی اچھائی اور برائی کو دیکھ رہے تھے وہ ایمان جو خدا نے یوسفؑ کو عطا کیا تھا ، وہی ایمان آپ کو اس عمل سے روک رہا تھا۔
ہم میں کا ہر شخص کسی طاقت کے روک ٹوک کے بغیر بعض لغزشوں اور گناہوں سے معصوم ہے اور یہ ہمارے اس ایمانی کمال کا نتیجہ ہے جو ہم ان گناہوں کے خطرات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مثال کے طور پر کسی چار منزلہ عمارت کی چھت سے چھلانگ لگانا ۔ یا آگ میں کود پڑنا یہ بھی گناہ ہیں لیکن ہم ہرگز ان گناہوں کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ ان کے خطرات و نقصان

۱۔ سورہ یوسف آیت ۲۴

ہمارے لئے ثابت اور ایک دم عیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ادھر ہم نے بجلی کے ننگے تار کو چھوا ادھر ہماری جان گئی۔ ہم صرف اسی وقت اس گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں جب ان خطرات سے آنکھیں بند کریں۔ لیکن ایک بچہ دہکتے ہوئے انگارہ پر ہاتھ مارتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس خطرہ کا گناہ جس قدر ہم پر ثابت و عیاں ہے اس پر عیاں نہیں ہے ایک عادل انسان تقویٰ کا ملکہ رکھتا ہے اسی بنا پر بہت سے گناہ وہ سرے سے انجام ہی نہیں دیتا۔ یہی ملکہ اسے اس حد تک کہ وہ ان گناہوں سے دور رہے، عصمت بخشتا ہے۔ بنابرایں گناہوں سے عصمت کا تعلق انسان کے درجۂ ایمان سے ہے کہ وہ فلاں گناہ کو گناہ اور فلاں خطرہ کو خطرہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گناہوں کو تعبداً قبول کیا ہے یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اسلام نے کہا ہے کہ شراب نہ پیو اس لئے ہم نہیں پیتے، کہا ہے کہ جوا نہ کھیلو، ہم نہیں کھیلتے۔ ہم کم و بیش جانتے بھی ہیں کہ یہ کام برے ہیں، لیکن جس قدر خود کو آگ کے حوالے کر دینے کا خطرہ یا گناہ ہم پر روشن و واضح ہے اس قدر ان گناہوں کے خطرات ہم پر واضح نہیں ہیں۔ ہم جتنا اس خطرہ سے متعلق یقین رکھتے ہیں اگر اتنا ہی ان خطرات اور گناہوں پر یقین و ایمان رکھتے تو ہم بھی ان گناہوں سے معصوم ہوتے۔ پس گناہوں سے عصمت کا مطلب ہے منتہیٰ و کمال ایمان۔ لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے "لَوْ کُشِفَ الغِطَاء لَمَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا"(۱) اگر پردے اٹھ جائیں پھر بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا" وہ قطعی طور پر گناہوں سے معصوم ہے۔ وہ پردے کے اس سمت سے بھی پس پردہ کی چیزوں کو مجسم دیکھتا ہے۔ یعنی مثال کے طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک بری بات منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حقیقتاً اپنی جان کے لئے ایک بچھو پیدا کر لیا ہے اسی بنا پر وہ ایسے کام نہیں کرتا، اور بلاشبہ قرآن بھی اس پایہ کے ایمان کا تذکرہ فرماتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عصمت نسبی ہے یعنی اس کے مراتب و درجات ہیں۔

۱۔ سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۲۴ (از حضرت علی علیہ السلام)

معصومین ان چیزوں میں ـــــ جو ہمارے لئے گناہ ہے اور کبھی ہم ان کے مرتکب ہوتے ہیں اور کبھی ان سے پرہیز کرتے ہیں ـــــ معصوم ہیں اور ہرگز گناہ نہیں کرتے ۔ لیکن تمام معصومین ایک جیسے نہیں ہیں ۔ عصمت کو بھی مراحل و مراتب ہیں ۔ عصمت کے بعض مراحل ہیں وہ ہمارے جیسے ہیں یعنی جس طرح ہم گناہوں سے معصوم نہیں ہیں ، وہ حضرات بھی (عصمت کے ان مراحل و مراتب میں) معصوم نہیں ہیں ۔ جن چیزوں کو ہم گناہ شمار کرتے ہیں ان میں وہ صد فی صد معصوم ہیں لیکن ایسی چیزیں بھی ان کے لئے گناہ ہیں جو ہمارے لئے حسنہ اور نیکیاں ہیں ، کیونکہ ہم (اس درجہ تک) نہیں پہنچے ہیں ۔ مثال کے طور پر درجہ پانچ کا طالب علم چھٹے درجہ کا کوئی سوال حل کردے تو یہ اس کے لئے باعث شرف و فضیلت اور انعام کے لائق بات ہے ، لیکن اگر اسی سوال کو نویں درجہ کا طالب علم حل کرے تو یہ اس کے لئے کچھ اہمیت کی بات نہ ہوگی ۔ اسی طرح سمجھیں کہ کچھ چیزیں ہمارے لئے تو حسنات ہیں لیکن ان کے لئے گناہ ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود ان کی طرف عصیان کی نسبت دیتا ہے (وَعَصىٰ آدَمُ رَبَّهُ) (۱) (آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی) یا پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ .. (۲)

تاکہ خداوند عالم آپ کے پچھلے اور اگلے گناہوں کو بخش دے ۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت ایک نسبی امر ہے ۔ گویا وہ اپنی حد میں اور ہم اپنی حد میں ۔ پس عصمت کی اصل و ماہیت گناہ سے ایمان کے درجہ اور کمال ایمان کی طرف پلٹتی ہے ۔ انسان ایمان کے کسی بھی درجہ میں ہو لیکن جس موضوع سے متعلق وہ کامل ایمان رکھتا ہے ۔ یعنی :

"وَلَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ " کے درجہ پر فائز ہے اور دلیل پروردگار

۱۔ سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۱ ۲ ۔ سورۂ فتح ، آیت ۲

کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس میں وہ لا محالہ معصوم ہے۔ نہ کہ خود معصوم بھی ہماری ہی طرح ہے کہ وہ گناہ و معصیت کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہے لیکن اللہ کی طرف سے مامور کوئی فرشتہ اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور اسے روک دیتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھ میں اور امیر المؤمنین ؑ میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ میں بھی گناہ کی طرف مائل ہوتا ہوں اور (معاذ اللہ) وہ بھی مائل ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان پر ایک ملک معین ہے جو انھیں اس کام سے روکتا ہے اور ہم پر اس طرح کا کوئی مامور نہیں ہے۔ اگر انسان کو گناہ سے روکنے کے لئے کوئی خارجی مامور بھی موجود ہو تو یہ کوئی کمال کی بات نہ ہوئی۔ اس کی مثال یوں ہی ہے کہ ایک شخص چوری کرتا ہے اور میں چوری نہیں کرتا، لیکن میں جو چوری نہیں کرتا اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے اعمال کا نگراں ایک شخص ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس صورت میں، میں بھی اسی کی طرح چور ہوں فرق یہ ہے کہ کوئی نگراں اسے اس کام سے نہیں روکتا اور میرے حرکات و سکنات کا نگراں میری راہ میں حائل ہے۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہوئی۔

مسئلۂ عصمت میں اہم اور کلی مسئلہ گناہ سے معصوم ہونے کا مسئلہ ہے۔ خطا سے معصوم ہونا ایک دوسرا مسئلہ ہے اور اس کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک احکام کی تبلیغ میں خطا کا مسئلہ ہے مثلاً ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام ؐ نے ہمارے لئے احکام بیان فرمائے ہیں لیکن شاید اس میں خطا یا اشتباہ سے کام لیا ہے۔ شاید خداوند عالم نے ان پر وحی کسی اور شکل میں نازل فرمائی تھی لیکن آنحضرت ؐ نے اشتباہاً اسے دوسری طرح سے بیان فرمایا۔ بالکل یوں ہی جیسے ہم خطا کرتے ہیں، یعنی ہم سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ یہ پیغام پہنچادو اور ہم جاکر اس کا الٹا پیغام بیان کر دیتے ہیں۔ یعنی اس امکان پر کہ ممکن ہے پیغمبر ؐ نے تبلیغ احکام میں خطا یا اشتباہ سے کام لیا ہو، سرے سے پیغمبر اسلام ؐ کی باتوں پر اعتماد ہی نہ ہو، قطعی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اب رہی تمام مسائل میں معصوم سے خطا کی بات تو یہاں انجینیر صاحب نے اپنی سرعت فیصلہ کا ثبوت دیتے ہوئے امیر المؤمنین ؑ پر ظلم کیا ہے اور واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

آپ نے کیسے تیزی کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیا کہ اگر آپ امیرالمومنین ؑ کی جگہ پر ہوتے تو عبداللہ ابن عباس کا انتخاب نہ کرتے ۔اور . . . . ؟ اسی طرح کے تاریخی مسائل میں ظنی وگمانی فیصلوں کے اظہار میں تو کوئی ہرج نہیں ہے ۔ مثلاً انسان کسی شخص کے بارے میں اظہار خیال کرے کہ میں سوچتا ہوں اگر فلاں شخص پانچ سو سال پہلے اُس کام کے بجائے یہ کام کرتا تو بہتر تھا، اور کوئی اس سے یہ کہے کہ کیا قطعی ایسا ہے ؟ تو وہ جواب دے کہ میرا یہی خیال ہے ! تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے ۔ لیکن ان مسائل میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا امیرالمؤمنین ؑ ہی کی نسبت نہیں ؟ دوسرے افراد کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے ۔

حضرت ؑ ان واقعات و مسائل میں خود حاضر و ناظر تھے اور عبداللہ بن عباس کو ہم اور آپ سے بہتر جانتے تھے ، یوں ہی اپنے دوسرے اصحاب کو بھی ہم سے اور آپ سے زیادہ بہتر طور پر پہچانتے تھے ۔ اور ہم اپنی جگہ بیٹھ کر قضاوت کریں کہ اگر حضرت علی ؑ عبداللہ بن عباس کی جگہ پر کسی دوسرے کو منتخب فرماتے تو وہ اس کام کو بہتر طور پر انجام دیتا ۔ یہ دراصل اس طرح کے مسائل میں عجولانہ قضاوت کی نشانی ہے ۔ مزید یہ کہ آپ نے خود خود اپنے بیانات میں جن سے ہم ہمیشہ استفادہ کرتے رہے ہیں ، برابر یہ بات ذکر کی ہے کہ علی ؑ ایک مخصوص سیاست پر گامزن تھے اور نہ وہ خود چاہتے تھے نہ ان کے لئے سزاوار ہی تھا کہ ذرہ برابر بھی اس سیاست سے الگ ہوتے اور یہ وہ راہ سیاست تھی جس میں ان کے پاس ناصر و مددگار نہیں تھے ۔ حضرت ؑ خود بھی ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ افسوس میرے پاس افراد نہیں ہیں ۔ یہی عبداللہ بن عباس اور دوسرے افراد حضرت علی ؑ کی خدمت میں آتے تھے اور ان سے اپنی روش میں لوچ اور نرمی پیدا کرنے کی درخواست کرتے تھے یعنی وہی طرز عمل اپنانے کو کہتے تھے " جسے آج کی دنیا میں سیاست کہتے ہیں ۔ آپ کم از کم یہی ثابت کیجیے کہ حضرت علی ؑ کے پاس ان کے ہم فکر و ہم نوا کافی افراد موجود تھے اور آپ ؑ نے ان کے درمیان اشخاص کے انتخاب میں اشتباہ سے کام لیا ۔ میں تو یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ حضرت کے پاس حسب ضرورت افراد موجود رہے ہوں ۔ میں بس اسی قدر جانتا ہوں کہ علی ؑ جنہیں پیغمبر ؐ نے خلافت کے لئے معین فرمایا تھا ۔ جب لوگوں نے خلافت پر

قبضہ کرلیا تو اس قدر احتجاج اور شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ لوگوں نے میرا حق مجھ سے چھین لیا۔ لیکن عثمان کے بعد جب لوگ آپ کی بیعت کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ خود کو اس امر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي فَإِنَّا مُسْتَقْبِلُونَ أَمْراً لَهُ وُجُوهٌ وَأَلْوَانٌ ... وَإِنَّ الْآفَاقَ قَدْ أَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ (۱)

مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لئے) کسی دوسرے کو ڈھونڈ لو۔
بلاشبہ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رُخ اور کئی رنگ ہیں، جسے نہ دل برداشت کرسکتے ہیں اور نہ عقلیں مان سکتی ہیں۔ فضائیں تاریک ہو چکی ہیں اور راستہ پہچاننے میں نہیں آتا"

مفہوم یہ ہے کہ، حالات اب خراب ہو چکے ہیں، اب کام نہیں کیا جاسکتا یعنی میرے پاس افراد نہیں ہیں، میرے رفقا تمام ہو گئے اب میرے کام کے آدمی نہیں رہے (جن کی مدد سے میں معاشرہ کی) اصلاح کرسکوں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ...

اب مجھ پر حجت تمام ہوگئی۔ میں تاریخ کے روبرو کوئی عذر نہیں رکھتا تاریخ میری یہ بات نہیں مانے گی۔ کہا یہی جائے گا کہ علیؑ نے موقع ہاتھ سے کھو دیا، اس کے باوجود کہ یہ موقع میرے لئے کوئی موقع نہیں ہے ــــ لیکن تاریخ کا منہ بند کرنے کے لئے کہ یہ نہ کہا جائے کہ بہترین موقع تھا جسے علیؑ نے کھو دیا ــــ اس منصب کو قبول کرتا ہوں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے خود اس کا اظہار فرمایا کہ میرے پاس آدمی نہیں ہیں اور یہ میری خلافت کا موقع نہیں ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام۔ خطبہ ۹۱

انسان ہر شخص کے سلسلہ میں شک و تردید کا شکار ہو سکتا ہے لیکن خود حضرت علیؑ کے لئے تاریخ کو بھی اس بات میں شک نہیں ہے کہ آپ خود کو دوسروں کی بہ نسبت خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے اور اہل سنت بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ علیؑ خلافت کے لئے خود کو ابو بکر و عمر وغیرہ .... سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ جو علیؑ اپنے آپ کو ابو بکر و عمر سے خلافت کا زیادہ حقدار سمجھے، جب لوگ عثمان کے بعد خلافت کے لئے اس کے پاس جائیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہوا نظر آئے اور یہ کہے کہ:۔

تمہارا امیر بننے سے بہتر ہے کہ میں اس کے بعد بھی تمہارا مشیر ہی بن کر رہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے پاس ایسے افراد نہیں تھے۔ اب اس کے اسباب و علل کیا تھے، یہ ایک دوسری بحث ہے۔

اب رہا: "وَيُؤْتُونَ الزَّكوٰةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ" کا مسئلہ تو اول یہ جو انہوں نے فرمایا کہ زکات انگوٹھی پر نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ کلی طور پر کارِ خیر کے لئے ہر طرح کے انفاق کو زکات کہتے ہیں۔ آج کل جو فقہا کی عرف میں زکات کی اصطلاح رائج ہے اس سے مراد زکات واجب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی "يُقِيمُونَ الصَّلوٰةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكوٰةَ" آیا ہو اس سے مراد یہی زکوٰۃ واجب ہے۔ زکات کا مطلب ہے مال کا پاک و صاف کرنا۔ حتیٰ کہ اس سے مراد روح اور نفس کا پاک کرنا بھی ہے۔ قرآن کلی طور پر مالی خیرات کو مال کی زکات یا روح و نفس کی زکات کہتا ہے۔ چنانچہ لفظ صدقہ کا مفہوم بھی اسی قدر وسعت رکھتا ہے آج صدقہ کا ایک خاص مفہوم ہے مثلاً کہتے ہیں صدقۂ سری (چھپا کر صدقہ دینا) لیکن قرآن ہر کارِ خیر کو صدقہ کہتا ہے۔ اگر آپ ایک اسپتال تعمیر کریں یا کوئی کتاب لکھیں جس کا فائدہ عام طور سے لوگوں کو پہنچتا ہو۔ قرآن کی نظر میں وہ صدقہ ہے "صدقۃ جاریۃ" ایک جاری صدقہ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت نے بھی جب مذکورہ آیت سے اخذ شدہ مفہوم پر اعتراض کرنا چاہا ہے تو اس لفظ پر ایسا کوئی اعتراض

نہیں کیا ہے کہ زکات انگوٹھی سے متعلق نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ادبیات عرب سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ لفظ زکات، زکات واجب سے مخصوص نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ عمل حالتِ رکوع میں کیوں اور کیسے انجام پایا؟ یہ اعتراض فخرالدین رازی جیسے قدیم مفسرین نے بھی اٹھایا ہے کہ علیؑ ہمیشہ حالت نماز میں اس قدر کھو جاتے تھے کہ انہیں اردگرد کا احساس بھی نہ رہتا تھا۔ پھر آپؑ یہ کیسے کہتے ہیں کہ نماز کی حالت میں یہ عمل انجام پایا؟ جواب یہ ہے کہ

اول تو: علیؑ کا نماز کی حالت میں اپنے آپ سے بے خبر ہو جانا ایک حقیقت ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اولیائے خدا کے تمام حالات و کیفیات ہمیشہ ایک ہی جیسے رہے ہیں۔ خود پیغمبر اکرمؐ کے لئے دونوں کیفیتیں بیان کی جاتی ہیں ۔ کبھی نماز کی حالت میں آپؐ پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ اذان کے تمام ہونے کی تاب بھی نہ رہتی تھی فرماتے تھے: "اَرِحْنَا یَا بِلَالُ" اے بلال جلد اذان ختم کرو کہ ہم نماز شروع کریں اور کبھی نماز کی حالت میں ہوتے تھے، سجدہ کے لئے سر مبارک کو خاک پر رکھتے تھے اور آپ کے نواسے امام حسنؑ یا امام حسینؑ آکر آپ کی پشت مبارک پر سوار ہو جاتے تھے اور آپؐ پورے اطمینان کے ساتھ یوں ہی ٹھہرے رہتے تھے کہ یہ بچہ کہیں گر نہ پڑے اور جب تک نواسہ اتر نہ آتا تھا سجدہ کو طول دیتے تھے۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ نماز میں قیام کی حالت میں تھے۔ نماز کی جگہ پر سامنے گویا کسی نے تھوک دیا تھا۔ پیغمبرؐ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پاؤں سے اسے مٹی میں چھپا دیا اس کے بعد اپنی جگہ واپس پلٹ آئے۔ فقہاء نے اس واقعہ کی روشنی میں نماز سے متعلق بہت سے مسائل اخذ کئے ہیں۔ سید بحرالعلوم فرماتے ہیں:-

وَمَشْیُ خَیْرِ الْخَلْقِ فِی الْمِحْرَابِ

یُفْتَحُ مِنْہُ اَکْثَرُ الْاَبْوَابِ

مطلب یہ ہے کہ نماز کی حالت میں پیغمبر اسلامؐ دو قدم آگے بڑھے۔ وہ عمل انجام

دیا اور واپس پلٹ آئے اس عمل نے ان بہت سے مسائل کو حل کر دیا کہ نماز کی حالت میں کس حد تک اضافی عمل جائز ہے یا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتوں کا حل مل گیا۔ چنانچہ ان حضرات کے حالات و کیفیات مختلف رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا مطلب جو عرفانی ہے یہ ہے کہ وہ افراد جو عرفانی مذاق رکھتے ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ اگر استغراق وانجذاب کی کیفیت اپنے کمال پر ہو تو اس میں برگشت کی حالت پائی جاتی ہے یعنی اس صورت میں انسان خدا کی ذات میں مستغرق ہونے کے ساتھ ہی ماسوائے اللہ میں بھی مشغول رہتا ہے۔ یہ اہل عرفان کا خیال ہے اور میں بھی اُسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس جملہ میں شاید بہت زیادہ قابل قبول نہ ہو کہ میں اسے عرض ہی کر دوں۔ یہ خلع بدنی کے مسئلہ کی مانند ہے۔ جو افراد اس مرحلہ میں تازہ وارد ہوتے ہیں ایک لمحہ یا دو لمحہ ایک گھنٹہ تک اپنے آپ سے بے خبر یا اپنے جسم سے الگ ہو جاتے ہیں۔ بعض افراد ہر حال میں اپنے جسم سے الگ یا خود سے بے خبر رہتے ہیں۔ (البتہ میں اس کا معتقد ہی نہیں بلکہ عینی گواہ بھی ہوں) مثال کے طور اس وقت ہمارے اور آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں اپنے جسم سے دور الگ اور لاتعلق ہیں۔

اہل عرفان کی نظر میں یہ حالت و کیفیت کہ نماز کے دوران پاؤں سے تیر نکال لیا جائے اور انسان متوجہ نہ ہو، اس حالت و کیفیت سے ناقص تر ہے جس میں انسان نماز کے دوران فقیر و سائل کی طرف بھی متوجہ ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں وہ خدا سے غافل ہے اور فقیر کی طرف متوجہ ہے بلکہ اس کی توجہ خدا کی طرف اس قدر کامل ہے کہ اس حالت میں وہ تمام عالم کو اپنے سامنے موجود پاتا ہے۔ لہٰذا ان تمام قرائن کی موجودگی میں ان حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سازمان تبلیغات اسلامی

ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

شیطانی سازشیں

بنیادیں، اسباب و علل اور نتائج

موجودہ فکری دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کوئی بے معنی شغل اور سادگی کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ ایک منطقی روش کے آئینہ میں ان کی کیفیت، دوسرے واقعات و حادثات کے مجموعے میں ان کا وجود اور زمانی و مکانی عناصر سے ان کے ربط نیز دیگر حالات کی روشنی میں جب ان کا تجزیہ کیا جائے گا تو ان کے وجود میں آنے کے واقعی اسباب و علل سیاسی آثار چڑھاؤ میں ان کا معیار اور ان واقعات کے بطن میں پوشیدہ اہداف و مقاصد نیز ان سے مقابلہ کے لئے اپنائی جانے والی صحیح و بنیادی پالیسی، ان سے منطقی طور پر نپٹنے کا طریقۂ کار اور ان کے امکانی نقصانات اور مضر اثرات سے دفاع اور بچاؤ کے نکات سامنے آئیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دنوں "شیطانی آیات" کے قالب میں پیش آنے والے واقعات کا اگر اسی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے اور ایک تحلیلی و تجزیاتی نظم کے تحت ان کی تحقیق کی جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ واقعہ بھی ان تاریخی واقعات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جن کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو مختلف ادوار میں سیاسی، جنگی اور ثقافتی شکلوں میں سامنے آتے ہیں اور اس کا ان تمام واقعات و حادثات کے ایک جزء کے عنوان سے جائزہ لیا جانا چاہئے:

کیونکہ اس طرح کے واقعات دراصل وہ سڑے ہوئے زخم ہیں جو انسانی حیات کی شریانوں میں پرانے بخاروں اور کثافتوں و آلودگیوں کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اور یہ سراسر سادہ اندیشی ہوگی کہ یہ واقعہ کوتاہ بینی کی بنیاد پر اس نگاہ سے دیکھا جائے کہ یہ صرف ایک سادہ اور بے مقصد سیاسی شور وغل ہے یا ایک ناول نگار نے اپنی شہرت کے حصول کے لئے سستا ادبی ناول لکھا ہے، یا یہ ناشرین کے پیسہ کمانے کی ایک چال ہے۔ اسی یقین نے ہمیں آمادہ کیا کہ واقعہ کا زیادہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور ماضی میں دنیائے استکبار اور عالم اسلام کے ٹکراؤ پر ایک ہلکی نگاہ ڈالتے ہوئے موجودہ زمانہ میں اس سازش کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل پر غور کیا جائے، ساتھ ہی یہ دیکھا جائے کہ مسلمانوں نے اس سازش کا کس طرح مقابلہ کیا اور اس کے آثار کیا ظاہر ہوئے تاکہ مختصر طور پر سہی واقعات کی صحیح تصویر کشی کی جاسکے۔

مغرب کی اسلام سے مقابلہ آرائی

اہل مغرب[1] عرصۂ دراز سے اپنے علاوہ دوسروں کو وحشی و بربر کہتے آئے ہیں اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے انہوں نے منحوس اور خونیں جنگوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ رومیوں کی جہاں گشائی جو انسانوں کے قتل عام اور غارت گری کا بے مثل نمونہ تھی، روم کی معین کردہ حکومت کے ذریعہ فلسطین کے علاقہ ناصرہ سے اٹھنے والی حضرت عیسیٰ کی اصل تحریک کی بیخ کنی اور اس کے بعد حضرت مسیحؑ کے آئین کو تحریف شدہ شکل میں قبول کرنا، اسلام سے قبل کی تاریخ میں ان کی حرکتوں کے چند نمونے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد اہل مغرب جو اسلام کے عالمی انقلاب کے عظیم خطرہ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اس سے مزید سنجیدگی کے ساتھ مقابلہ کے لئے اٹھے جن کا تذکرہ تاریخ میں صدر اسلام اور پیغمبر اکرمؐ کے بعد خلفاء کے زمانہ کی جنگوں کی شکل میں موجود ہے۔

۱۔ یہاں مغرب سے مراد اس کے جغرافیائی معنی یعنی مغربی سرزمینیں یا ممالک نہیں ہیں بلکہ "مغرب" وہ اصطلاح ہے جس کا اطلاق بہت پہلے سے سیاسی عرف عام میں مغربی بلاک اور مغرب کے استعماری ممالک کے لئے ہوتا آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں اس سے مراد اسلام کے مغربی دشمن ہیں۔

انصاف پسند اسلام کی بیخ کنی کے لئے اہل مغرب کا اموی حکام کے ساتھ تعاون اور حمایت یا امویوں کو روم کی علا غوتی سلطنت کی تقلید پر مائل کرنے کی ان کی کوششیں اور اسلامی حکومت کو شان و شوکت اور ترک بھڑک، عیش پرستی اور موروثی حکومت کی راہ پر لگا کر حقیقی اسلام کو مسخ کرنا اسی سلسلہ کی کڑی ہے[1] اسی طرح جب افریقی مسلمانوں نے حیرت انگیز شجاعت و دلیری کے ساتھ مختصر سی مدت میں یورپ کے خاصے اہم علاقوں کو ختم کر لیا اور فرانس کی سرحدوں سے بھی گزر کر آگے بڑھ چکے تھے۔ امویوں کے فرمان سے ان پر حملے رک گئے۔ اور اس طرح مغرب کے اصلی اسلام مخالف مراکز محفوظ رہ گئے۔ چنانچہ بعد میں صلیبی مغربیوں نے مسلمانوں کی کمزوری اور ان کے درمیان اختلاف و تفرقہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیز مختلف سیاسی و ثقافتی سازشوں کو بروئے کار لاکر اسلام کو اس شہر اندلس سے باہر نکال دیا جو یورپ میں مسلمانوں کا اصل مرکز تھا۔

اس کے بعد مغربی حکام نے کلیسائی طاقت سے مل کر قرون وسطیٰ میں یورپ کے عیسائیوں کے مذہبی تعصبات کو بھڑکایا اور مسلمانوں کے علاقوں پر بارہا حملے کئے اور اپنی عدیم المثال کینہ توزی ہولناک جرائم اور بہیمانہ قتل عام کے ذریعہ مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس پر (۱۰۹۵ء میں) قبضہ کر لیا۔ اگرچہ سرانجام انھیں شکست کھانا پڑی لیکن اس تاریخ (یعنی گیارھویں صدی) سے مغرب اپنی تمام طاقت کے ساتھ پورے یورپ کو ایک پرچم کے گرد متحد کر کے اسلام کے وجود کے لئے ایک بڑا خطرہ بن گیا

بعد کی صدیوں میں بھی مغولوں کو لالچ دلا کر اور بھڑکا کر اسلامی ملکوں پر حملہ کرایا اور خود عملی طور پر

۱۔ امویوں کے دربار میں مغربی حکومتوں کے نمائندوں کے عنوان سے ایسے افراد موجود تھے جو خلافت دمشق کے رازدار اور بعض اموی خلفا کے مشیر خاص تھے اور اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بنی امیہ اسلام کے برسوں پہلے سے رومی سلطنت کی معین کردہ شامی حکومت سے تجارتی و سیاسی روابط رکھتے تھے اور اس علاقہ پر برسر اقتدار آنے کے بعد پیغمبر اسلام کے اہل خاندان اور ان کے حقیقی پیروؤں کا قلع قمع کرنے کے لئے انہوں نے ان سے اپنے روابط کو مزید محکم و مضبوط کر لیا تھا۔ رومیوں اور عیسائیوں

ان کی مدد بھی کی ۔ (۱)

مغربی صلیبیوں کی اس پیہم اور طویل اسلام دشمنی میں ابتدا سے ہی متعصب اور قوم پرست یہودیوں کے ساتھ ان کا تعاون و اتحاد برقرار رہا لیکن موجودہ صدی کی گذشتہ دہائیوں میں یہ تعاون و اتحاد زیادہ مضبوطی کے ساتھ سامنے آیا یہاں تک کہ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانی سلطنت کو ـــــ جو اپنی تمام کمزوریوں اور کمیوں کے باوجود مسلمانوں کی تنہا قانونی حکومت تھی ـــــ نابود کر ڈالا ۔

اسلام دشمنوں نے مسلمان اقوام کے درمیان نسل پرستی اور قومی تعصب کو رائج کیا نیز اختلافات اور ان کی کمزوریوں کو ہوا دے کر ایک مضبوط عثمانی حکومت کے بجائے اپنی طرف سے معین کردہ بہت سی کمزور اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو جنم دیا اور اسی زمانہ میں برطانیہ کی استعماری حکومت نے برصغیر ہند میں بھی مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے اور اندلس ملک سے اسلام کو مٹانے کا وہ معاندانہ رویہ اختیار کیا جو ناقابل فراموش ہے ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد صلیبیوں اور صہیونیوں کے غیر شرعی گٹھ جوڑ کا نتیجہ اسرائیل نامی ایک منحوس وجود تھا جسے ان لوگوں نے خنجر کے مانند اسلامی ممالک کے قلب میں اتار دیا اور ساتھ ہی دوسرے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے اور انھیں غارت کرنے کے لئے آگے بڑھے اسلام کے خلاف مغرب کے معاندانہ ٹکراؤ کی داستان طویل اور پڑھنے کے قابل ہے ۔ ہم یہاں اس بارے میں صرف اجمالی اشارہ کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اسلام آخری دین الٰہی کے عنوان سے ، اہل مغرب کے منحوس خواہشات اور طمع کے مقابلہ میں ایک بند کی حیثیت ہمیشہ سدِ راہ رہا ہے اور ان آخری صدیوں میں بھی پرانے اور نئے استعمار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

کی مشارکت اور ان کے تعاون و ارتباط کا نتیجہ حضرت حسنؑ ابن علیؑ کی شہادت اور اموی سلطنت کے استحکام کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ۔

۱ ۔ مزید اطلاعات کے لئے (جوینی کی تاریخ جہاں گشا) اشپولر کی تاریخ مغول، ترجمہ محمود آفتاب بخش رابطۂ مغولان با ادیان ص ۲۰ کے بعد سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی بے پایاں دشمنی کو اور زیادہ برانگیختہ کر سکتی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مختلف جہات اور گوناگوں پیرایوں میں مغرب کی جدوجہد جاری رہی ہے۔ اب ہم ان کے چند نمونے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

اسلام سے مغرب کے ٹکراؤ کی جھلکیاں

۱ ــــــ اسلام کی تاریخی اور اس کی تابندہ تہذیب کو مٹا ڈالنے کی کوشش اور اس کی جگہ مغربی ثقافت و تہذیب کو مرکزی حیثیت عطا کرنے کی جدوجہد:

مغرب اپنی تہذیب و ثقافت کے پیش نظر اسلام کی حقیقت و واقعیت کا اعتراف کرنے پر کبھی تیار نہیں تھا اور وہ اسلام کو زندہ بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اہل مغرب نے عالمی تاریخ کے نام سے جو متعدد کتابیں لکھی ہیں ان میں انہوں نے بہت بڑا احسان جو کیا ہے یہ ہے کہ اسلامی تاریخ اور اس کی تہذیب کے لئے چند سطریں یا چند صفحے مخصوص کر دیئے ہیں، جبکہ دنیائے مغرب میں ہونے والے بہت معمولی اور غیر اہم واقعات پر انہوں نے بے شمار صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں اہل مغرب کے دنیا طلب اور مادی افکار و نظریات نے نہ صرف اسلامی تاریخ اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے بلکہ دوسرے عظیم پیغمبروں مثلاً حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے حالات و واقعات کو بھی افسانوں اور پارینہ داستانوں کا رنگ دے کر انھیں تاریخ کے دائرہ سے باہر نکال دیا ہے جبکہ اسی کے ساتھ آثار قدیمہ کی کھدائی اور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے فراموش شدہ بادشاہوں اور اقوام و ملل کے بارے میں عجیب و غریب اور طولانی تحقیقات میں مشغول رہے ہیں۔

بعض مغربی مؤرخین مثلاً (گوستاولوبون) اور (ویل ڈورانٹ) جنھوں نے ایک حد تک انصاف پسندی سے کام لیا ہے، انہوں نے مغرب میں اسلامی تہذیب کا انعکاس بڑے وسیع پیمانہ پر محسوس کیا ہے اور بہت سے علمی و ثقافتی میدانوں میں مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی رہین منت اور مغرب کی تہذیب اور اس کی ارتقا کو مسلمانوں کی پُرثمر علمی تحریک کے نتائج میں شمار کیا ہے۔ لیکن مغربی مؤرخین میں یہ استثنائی مثال کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اس قدر شجاعت کا ثبوت پیش کیا ہے، کیونکہ مغربی دنیا میں زیادہ تر اسلام کو حذف کر دینے اور حتیٰ ماضی کے درخشاں

چہروں کو بھی تاریخ سے محو کر دینے کا رجحان موجود رہا ہے ۔

مثال کے طور پر اگر انہوں نے فلسفہ کی تاریخ لکھی ہے تو کوشش کی ہے کہ فلسفہ کو قدیم یونان ۔ اس کے بعد عیسائیت کے قرونِ وسطیٰ پھر مغرب کے جدید دور اور عصر حاضر تک محدود رکھیں اور اگر کہیں اسلامی فلسفہ اور اس کے بعد عظیم مسلمان فلسفیوں کا نام بھی لیا ہے تو انہیں عرب فلسفی کہہ کر اور دوسری تحریفات کے ذریعہ انھیں قومی و ملی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلام سے ان کے ارتباط کے منکر ہوئے ہیں ۔

اسلام کی باشکوہ تہذیب جس کی ارتقا کا دور کئی صدیوں تک جاری رہا اور جس نے عالم انسانیت کو اپنا رہین منت بنایا ، ان کے نزدیک یورپ میں ہونے والے بعض جزئی اصلاحاتی تبدیلیوں سے کہیں بے اہمیت اور کم حیثیت کی حامل رہی ہے ۔ اور ان کی نگاہ میں دنیا کی تاریخ حتیٰ دنیا کا جغرافیہ بھی اصل میں مغرب اور یورپ کی تاریخ اور جغرافیہ ہے ۔ ہماری اس بات کا ثبوت مغربیوں کے تحریر کردہ اکثر منابع و مآخذ ہیں جن میں سے بہت سی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں ۔ بنیادی طور پر مغرب نے تاریخی اور جغرافیائی تقسیمات میں صرف خود ہی کو تمام چیزوں کا محور و مرکز قرار دیا ہے اور اسلام کے وسیع ممالک نیز اس کی طولانی تاریخ کو بالکل ان دیکھا کر دیا ہے ۔ مثال کے طور پر مشرق کی قدیم ملتوں اور قوموں کو جو یونان سے بھی پہلے موجود تھیں ان دیکھا کر دیا اور یونان سے تاریخ کا آغاز کیا ہے ، اور جب قرونِ وسطیٰ میں پہنچے ہیں تو اس کا یوں ذکر کیا ہے گویا ان کی طرح ساری دنیا قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں اور جہالتوں میں گم تھی ۔ کیونکہ وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسی زمانہ میں اسلامی ممالک اپنی ارتقا کے اوج کمال پر پہنچے ہوئے تھے ۔

جغرافیائی نام رکھنے کے سلسلہ میں بھی یہ نزاکت پیش نظر رکھی ہے کہ مشرق اور اسلامی سرزمینوں کو یورپ سے نزدیکی و دوری کے اعتبار سے مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کا نام دیا گیا ہے

البتہ ان لوگوں نے گذشتہ دہائیوں میں مشرق اور اسلامی مشرق کی شناخت کی کوششیں کی ہیں ۔ لیکن یہ کوششیں بھی زیادہ تر استعماری اغراض و مقاصد کے تحت تھیں اور در حقیقت ان علاقوں میں تہذیبی و ثقافتی مداخلت کے لئے مقدمات فراہم کرنے ، زمین ہموار کرنے اور آخر کار مشرق کو اپنے منافع

مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی خاطر کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی ان کے محققین، مؤرخین اور مستشرقین دراصل استعمار کے لئے زمین ہموار کرنے والے ہراول دستے رہے ہیں۔

۲۔ اسلام سے علمی و ثقافتی مقابلہ اور حقائق کی تحریف

اہل مغرب ماضی میں بھی اسلام کے خلاف اکثر بزدلانہ حملے کیا کرتے تھے، تحقیق و تبلیغ کے پیرایہ میں تہمتیں اور تحریفیں عام کیا کرتے تھے۔ یہ تحریفات اور تہمتیں زیادہ تر خاندان، عورت، معاشرہ میں اس کی شخصیت، عورت کے حقوق، اسلام کے پھیلنے کا انداز اور دوسری انسانی تہذیبوں کے ساتھ اس کا رویہ جہاد، وحی، عدالت کے مسائل، اسلام میں جرم و سزا کے قوانین نیز تاریخ اسلام کے مختلف حصوں خصوصاً پیغمبر اسلام اور دوسرے تمام اسلامی پیشواؤں کی زندگی اور ان کی شخصیتوں سے متعلق ہیں جو اسلامی نظریات کے ذیل میں رائج کی گئی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک موضوع پر اسلامی دانشوروں کی طرف سے تفصیلی و استدلالی کتابیں و مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ اور مغرب کے بھی بعض انصاف پسند صاحبان تحقیق نے ان تہمتوں اور الزامات پر غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے عذر کا اظہار کیا ہے اور ان کا جواب دے کر ان خرافات سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ ان میں سے ایک (جان ڈیون پورٹ) کی کتاب "قرآن و پیغمبر کے حضور عذر تقصیر" قابل دید ہے۔

۳۔ قومیت اور ملیت کے رجحان کی ترویج

استعمار ہمیشہ قومی عصبیت کو ہوا دے کر قوم پرستی و نژاد پرستی کی زیادہ سے زیادہ ترویج کے ذریعہ (لڑاؤ اور حکومت کرو) کی پالیسی کو عملی جامہ پہناتا رہا اور قومی اختلافات میں شدت پیدا کر کے مسلمانوں میں عرب جنگجوئی و سرکشی اور قدامت پسندی کو ہوا دیتا رہا۔ ایران میں اس کے نمونے پور داؤد کسروی اور تقی زادہ جیسے روشن خیال نیز دوسرے اسلامی ممالک میں قومی تفکرات کے منادی اور مغربی رجحانات رکھنے والوں کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں جو مصر میں فراعنہ کے زمانہ، ایران میں کسریٰ اور ہخامنشی بادشاہوں کے دور اور عراق میں بخت النصر کے عہد کے جاہلی افکار نیز بابل اور فینقیوں وغیرہ کی تہذیب کو زندہ کرنے میں مصروف تھے۔ ایک حد تک وہ اپنی ان مکاریوں اور پرفریب حرکتوں میں

کامیاب بھی ہوگئے۔ اس طرح مسلمانوں کے ایک پیکر کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے رکھدیا۔

۴۔ مسلمانوں کو اسلامی اقدار سے دور کرنا

اس سلسلہ میں مغرب نے ایک طرف سے مغربی معاشروں کی فساد انگیز تہذیب کو اسلامی ممالک میں وسیع پیمانہ پر رائج کرنے کی کوشش کی دوسری طرف سے اپنے سیاسی و ثقافتی ذرائع کا سہارا لے کر اسلامی آثار و اقدار کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ کبھی مسلمانوں کی قرآنی زبان کو بے ہودہ بہانوں کے ذریعہ۔ مثلاً اسے قدیم ادبیات کہہ کر اور مادری زبان کے زندہ کئے جانے کا الزام لگاکر اپنے حملوں کا نشانہ بنایا، رضاخان نیز اس کے بیٹے مردود شاہ جیسے ضمیر فروش افراد کے ذریعہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکالنے کے لئے مستقل طور پر ایک ادبی مرکز قائم کیا گیا یا اتاترک کے ذریعہ عربی زبان کے خلاف مہم چلاکر ترکی زبان کے لئے لاطینی حروف کے استعمال کو سرکاری حیثیت دے دی گئی اور کبھی پردہ کا مسئلہ اٹھاکر ملکی اور علاقائی لباسوں کو ایک ہی شکل کے مغربی لباس میں تبدیل کردیا گیا فیشن اور ماڈل پرستی نیز مختلف شکلوں میں فحشا و فساد کو رواج دینا اور قدامت پرستی کا ٹائٹل دے کر اسلامی اخلاقیات اور اسلامی قدروں کا مزاق اڑانا وغیرہ۔۔ ان حرکتوں کے ذریعہ اسلامی امت کو اپنی مذہبی حقیقت سے دور کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ جن کے تباہ کن اثرات مسلمان معاشروں میں پورے طور سے مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔

۵۔ ملت اسلام کی چھوٹی چھوٹی کمزور سیاسی اکائیوں میں تقسیم

مغرب جس کو اندلس میں مسلمانوں کے درمیان طوائف الملوکی کی حکومت کو بڑھاوا دے کر یورپ سے اسلام کا صفایا کرنے کا کامیاب تجربہ ہوچکا تھا موجودہ صدی میں بھی وہ دوسرے بھیس اور نئے ہتھکنڈوں کے ساتھ مسلمانوں کی طاقتور اکائیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر کمربستہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قومیت کے جذبات کو ہوا دے کر اور طرح طرح کے اختلافات پیدا کرکے انھیں ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ماوراء النہر سے لے کر خلیج فارس کے سواحل اور وہاں سے چین کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے مختلف اسلامی ملک اسی سازش کا شکار ہے اور یہ بات کسی سے

چھپی ہوئی نہیں ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے عرب قومیت کو ہوا دے کر عثمانی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کتنی تیزی دکھائی اور ترکی نیشنلزم کی بنیاد ڈال کر اس اختلاف کو کتنا محکم بنا دیا۔(۱)

عرب شیوخ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے قیام، امریکہ کی مدد سے اسلامی ممالک کے قلب میں اسرائیل کی تاسیس، برصغیر ہند میں انگریزوں کا کردار اور ایشیا کے اس حصہ میں مسلمانوں کا تجزیہ اور ان میں تفرقہ اندازی اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے حادثات نے پیکر اسلام پر کاری ضربیں لگائیں۔

لیکن ان تمام کوششوں کو اسلامی رہبروں اور اس کی بیدار و ہوشیار طاقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور اپنے بعض مقاصد میں کامیابی کے باوجود استعمار کو بہت سی ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا ہے۔ موجودہ صدی میں اس روش میں زیادہ ہی تیزی آئی اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایک فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ گئی۔

ایران کا اسلامی انقلاب وہ بیداری کی آواز تھی جو مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دے رہی تھی اور استعماری طاقتوں کو ایک زندہ اور متحرک اسلام کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی، لہٰذا سب سے پہلے مغرب نے مختلف سازشوں اور مکر و فریب کے ذریعہ اسے کامیابی سے روکنے کی کوشش کی(۲) اس کے بعد اپنی تمام تر کوششیں انقلاب کو شکست دینے اور اس لہر کو پھیلنے سے روکنے پر صرف کر دیں۔ آٹھ سالہ مسلط کردہ جنگ ان منحوس سازشوں میں سب سے زیادہ مضر و نقصان دہ اور شاید سب سے زیادہ اہم سازش تھی۔ لیکن اسلام کی انصاف پسند اور حق آگیں آواز جس کے شیدائی کم نہیں تھے، ایران کے جغرافیائی حدود میں دفن نہ ہو پائی اور جلد ہی دنیائے اسلام میں ایک وسیع و عریض تحریک حتیٰ دنیا کے تمام کمزوروں اور مستضعفوں کی بیداری اور تحرک کا سبب بنی جو عالمی استعماری حکام کے تمام زور و زر اور مکر و فریب کو بے اثر و بے کار کر دینے والی تھی۔ اور

---

۱ ۔ ترکی نیشنلزم کے موجد "وامبری" یہودی اور عرب نیشنلزم کے خالق "میشل عفلق" عیسائی کے کردار اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں۔

۲ ۔ ایران میں مختلف حکومتوں کا برسر کار آنا، شاہی مشاورتی کونسل کی تشکیل اور جنرل ہائزر کا ایران بھیجا جانا

اب عالم استکبار ایک بار پھر اپنے تمام ہتھکنڈوں کے ساتھ چراغ مصطفوی کے مقابلہ میں شرار بولہبی کے مانند متحد ہو کر میدان میں آیا ہے

مغرب کے منہ کی کھائے ہوئے استعماریوں نے اس بار بظاہر مکر و فریب کا نیا لباس پہن رکھا تھا جبکہ باطنی طور پر یہ بھی ان کی پرانی شیطانی حرکتوں کی تکرار تھی۔ فتنہ انگیز کتاب "شیطانی آیات" ایک قلم فروش و پٹھو مؤلف کے ہاتھوں دنیائے استکبار کی ہمہ جہت مادی و معنوی امداد کے ذریعہ بازار میں آئی۔

یہ سازش اس وقت سامنے آئی جب مغرب کی تہذیب و ثقافت کے خلاف پیدا ہونے والی لہر کا دائرہ بڑی وسعت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اگر گذشتہ برسوں میں مغربی پروپیگنڈہ مشینریوں کے ذریعہ اسلامی انقلاب، امام خمینی کی شخصیت اور اسلامی روحانیت کے خلاف مختلف پوچ اور بیہودہ عنوان سے (رجعت پسندی۔ ٹروریزم و تشدد پسند اور انسانی حقوق کی پامالی) جیسے اتہامات عائد کئے جاتے تھے تو اب :-

۱ ــــــ زہر افشانیاں مسلمانوں کے ایمانی اصول اور اعتقادی اساس پر مرکوز کر دی گئیں تاکہ مذہب کی اصل و بنیاد کی نفی کے ذریعہ مسلمان معاشروں میں تیزی سے پھیلتے ہوئے اسلامی انقلاب کے اثرات اور اصل اسلام کی دوبارہ بحالی کے رجحان کو مخدوش کیا جا سکے۔

۲ ــــــ دوسری طرف یہ عالمی درندے اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ صدی شدت کے ساتھ نظریاتی تبدیلیوں کی طرف مائل ہے۔ اپنے مختلف میدانوں میں مارکسیزم و کمیونزم کی شکست [1]، انسانی زندگی کو منظم اور اسے ادارہ کرنے کے سلسلہ میں اس کا ناکارہ پن ثابت ہونا اور نئی نسل نیز عالمی روشن خیال اور عالمی حریت پسند تحریکوں کے لئے فکری غذا فراہم کرنے میں اس کی ناتوانی اسی طرح ان تمام مکاتب فکر سے مغربی انسان کی بیزاری و مایوسی جو ان کے اپنے مفکروں کی پیداوار تمام سازشوں و کوششوں کے نمونے تھے۔

۱۔ مارکسزم کی شکست کے سلسلہ میں گذشتہ اور موجودہ برسوں کے دوران روس کے لیڈروں کے مکرر اعترافات نیز روس اور مشرقی یورپ میں ترمیم شدہ منصوبوں کا اجراء اس ادعا کے واضح و روشن گواہ ہیں۔

اور زیادہ تر "لبرلزم" اور آزادی کے دعووں کے ساتھ "ہیومینزم" اور "خود پسندی" کی بنیادوں پر استوار تھے۔ (۱) ان تمام مکاتب فکر نے انسان کے سامنے ایک نئے مکتب فکر کی تلاش و دریافت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔ ایک ایسا مکتب فکر جو ہو سکتا ہے مغربیوں کے شیشہ کے محلول اور ان کے شاہنشاہی منافع کو نیست و نابود کر کے رکھ دے۔ نتیجہ کے طور پر اس راہ میں ہونے والا کوئی بھی تغیر و تبدل انھیں برداشت نہیں ہے۔ اور وہ اپنے تمام وسائل و امکانات کے ساتھ اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

۳ ـــــ ایران کے اسلامی انقلاب کا وجود میں آنا اور اسلام کا ایک ایسے جامع و مانع مکتب فکر کی حیثیت سے سامنے آنا جو تمام انسانی معاشروں کی زمام امور اپنے ہاتھ میں لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے اس دوران پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کی اپنی اہلیت اور طاقت کو پوری طرح ثابت کیا ہے۔ مختلف اقوام و ملل کے افراد شدت کے ساتھ اس کا استقبال کر رہے ہیں اور رفتہ رفتہ اسلام "اس صدی کے خاتمہ تک ایک عظیم اعتقادی و فکری طاقت میں تبدیل ہونے والا ہے۔" (۲)

لہٰذا یہ فطری امر ہے کہ وہ اسلام کے اس بڑھتے ہوئے خطرہ سے نپٹنے کے لئے ـــــ جو مستقبل

---

۱ ـ اس بات کا اظہار گذشتہ دہائیوں میں یوں ہوا ہے : ہیپی ازم اور سوفسطائیت کا وجود میں آنا، مغرب میں صوفی افکار کا رواج پانا، "دیوار" جیسی فلموں کا بنایا جانا (جس میں ایک مغربی انسان کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں حیران و پریشان دکھایا گیا ہے یہاں تک کہ آخر میں وہ سوفسطائی و ہیپی بن جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ گذشتہ برسوں میں اس فلم پر پابندی لگانے پر مجبور ہو گئی) اسی طرح ان کے علماء و پادریوں کا صاف لفظوں میں یہ اعتراف کہ مغربی معاشرے فکری جمود کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے افکار و نظریات کا پیدا ہونا کہ عیسائیت میں کوئی نئی تبدیلی ضروری ہے۔ قابل دید حد تک اہل یورپ کا اسلام کی طرف مائل ہونا۔ ایک تیسری لہر کی مانند نئے نئے نظریات کا سامنے آنا جو اس کے لئے کوشاں ہے کہ انسانی سرنوشت کی کوئی نئی تعریف بیان کرے اور نئے سرے سے اس کا تجزیہ و تحلیل کرے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کے تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۲ ـ ایک مشہور مغربی رائٹر "کیبن رائٹ" کے قول کے مطابق۔

میں ان کے ظالمانہ و مستکبرانہ منافع کے لئے خطرناک ثابت ہونے والا ہے ــــ وسیع پیمانہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے ٹکر لینے کے مقصد سے اس کی کامل شناخت کے لئے کانفرنسیں، سیمینار، اور تحقیقاتی سینٹر قائم کئے جاتے ہیں اور ان کے نتائج اور طے شدہ سیاستوں کو زمان و مکان کی پوری ہم آہنگی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اور یک بیک ہم دیکھتے ہیں کہ مصر کے "نجیب محفوظ" کا ناول "اولاد حارتنا" (ہمارے پڑوس کے بچے) ۱۹۸۸ء کا نوبل ادبی ایوارڈ حاصل کرتا ہے۔ جبکہ اس میں بھی مصنف "شیطانی آیات" سے کسی قدر نرم لہجہ میں، پروردگار عالم اور تمام ابراہیمی انبیاء کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔[1] حالانکہ یہ ناول اب سے پچیس سال پہلے جمال عبدالناصر کے زمانہ میں لکھا گیا تھا اور جامعہ الازہر کی طرف سے اس کے خلاف حرمت کا فتویٰ صادر ہوا تھا۔ اور اب اسے ادبی ایوارڈ۔ بلکہ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جائے کہ "سیاسی نوبل ایوارڈ" سے نوازا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کی بہت سی زندہ زبانوں میں اس کے ترجمے نشر کئے جاتے ہیں۔ "محمد عبدالسلام" اسی ناول کی بنیاد پر ایک ٹیلیویژن فلم سیریز تیار کرتا ہے اور یہ طے پاتا ہے کہ یہ فلم مصر کے ٹیلیویژن سے نشر کی جائے گی۔

اسی سال یعنی ۱۹۸۸ء میں "شیطانی آیات" کے انتشار کے ہی زمانہ میں لاڈوں کی کانگریس میں ایک جدید قانون پاس ہو کر عمل درآمد کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس قانون کے مطابق سرکاری اسکولوں کے تمام طلبہ کا ــــ جن میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمان طلبہ بھی شامل ہیں ــــ

۱۔ نجیب اپنی اس داستان میں کعبہ کو اپنے دادا (اس سے مراد جناب ابراہیمؑ ہیں) کا گھر کہتا ہے اس کے بعد تمام ابراہیمی انبیاء کے جعلی نام رکھ کر (یعنی حضرت موسیٰ کو جبل، حضرت عیسیٰ کو رافع اور حضرت محمدؐ کو قاسم) ان کی ایسی عکاسی کرتا ہے گویا یہ حضرات صرف دنیا اور زندگی کی فکر میں رہا کرتے تھے اور معاشرہ کے محروم طبقہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ پیغمبر اسلام کو بابا نی الجیلاوی کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ نجیب محفوظ کتاب "شیطانی آیات" کے نشر ہونے کے بعد سلمان رشدی کی حمایت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ "الخلیج" کی رپورٹ کے مطابق اس کی ملازمت اور گھر کے پتہ پر شیطانی آیات اور امام خمینی کے فتوے کے سلسلہ میں اس کے گستاخانہ اظہار نظر کے ردعمل میں بہت سے خطوط پہنچتے ہیں جن میں اسے موت کی دھمکی دی جاتی ہے۔

صبح کے مذہبی پروگراموں اور عیسائیت کی خصوصی دینی تعلیمی کلاسوں میں شریک ہونا ضروری قرار دے دیا جاتا ہے کہ برطانوی مسلمانوں کے سخت احتجاج اور ثابت قدمی کی بنا پر حکومت اپنا یہ قانون واپس لینے پر مجبور ہو گئی۔ (۱)

مغربی جرمنی کے ٹیلیویژن پر قرآنی سوروں کے پس منظر میں برہنہ رقاصاؤں کے رقص کے ساتھ گانا بھی نشر کیا جاتا ہے۔ (۲)

ایک امریکی فلم ساز کمپنی کی طرف سے سورۂ بقرہ کی ویڈیو فلم (امریکی جاسوسی محکمہ) سی آئی اے کی مدد سے مصر کے بازاروں میں عام کی جاتی ہے۔ جس میں اسلام کے خلاف بہت ہی اہانت آمیز عبارتیں استعمال کی جاتی ہیں اور مصر کے مسلمانوں کے غیظ و غضب کا سبب بنتی ہے۔ یا پھر "شالوم سلام" سیریز بی.بی.سی کے شاہی چینل کے ذریعہ تیار کی جاتی ہے۔ جس میں اسلامی مقدسات کی زبردست اہانت کی جاتی ہے۔ (۳)

۱۔ انگلینڈ کے مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا جن میں سرفہرست ان کے لیڈر انگلینڈ میں دسیوں اسکولوں کے اسلامی تعلیماتی منصوبوں کے ڈائریکٹر پروفیسر غلام سرور نے، قانونی اقدامات کے ساتھ ساتھ مسلمان بچوں کے والدین کو ایک کھلا ہوا خط تحریر کر کے ان سے درخواست کی کہ اولاً۔ اپنے بچوں کو صبح کے عیسائی مذہبی پروگراموں میں شرکت کی اجازت نہ دیں۔ دوسرے۔ وہ اسکول جس میں مسلمان بچوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہو وہاں صبح کے اسلامی پروگرام مرتب کئے جائیں۔ تیسرے۔ عیسائی تعلیمی کلاس کے گھنٹوں کو اسلامی اصول کی تعلیم کے لئے مخصوص کریں کیونکہ حکومت کوئی حق نہیں رکھتی کہ مسلمان بچوں کو ان کے مذہب کے خلاف مراسم میں شرکت کے لئے مجبور کرے۔ آخرکار برطانیہ کے وزیر تعلیم کینیٹ بیکر کو اس دباؤ کے آگے جھکنا پڑا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ جن اسکولوں میں مسلمان طلبہ اقلیت میں ہیں ان کا صبح کے مراسم میں شرکت کرنا ضروری نہیں ہے اور جن اسکولوں میں ان کی اکثریت موجود ہے وہاں وہ اپنے لئے عیسائی پروگرام کے بجائے اسلامی پروگرام رکھ سکتے ہیں۔ (روزنامہ اطلاعات ۱۰/۱۲/۶۷ش مطابق ۳۰/۲/۸۹ء حجۃ الاسلام خسرو شاہی کا انٹرویو)

۲۔ رسالہ العالم العربی (نشر لندن) شمارہ ۳۱۱، مذکورہ فلم ۳۰ بہمن ۶۷ھ ش مطابق ۱۹ فروری ۸۹ء کو دکھائی گئی۔

۳۔ اس فلم سیریز میں ایک مسلمان لڑکی ایک عیسائی لڑکے سے تعلقات پیدا ہونے کے بعد اسلام کو ترک کر دیتی ہے

لیکن ان تمام خرافات کے درمیان اصل کردار سلمان رشدی کے سپرد کیا جاتا ہے ۔ کہ جو مختلف مراحل میں اپنی ترقی کی راہیں طے کرتا ہوا ایک ادبی شخصیت کے عنوان سے تسلیم کرلیا گیا ۔ اس کے بعد مغربیان ثقافتی سازشوں کی طوفانی موجوں کے درمیان اپنا آخری وار کرے جو بے حیائی اور بے شرمی کی آخری ممکنہ حدوں کو بھی پھلانگ کر ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کے مذہبی مقدسات کی توہین کرڈالے ۔ یہ ایک ایسی حرکت کا آغاز ہے جو مسلمانوں میں وہ احساس کمتری پیدا کردے کہ مذہب کے تئیں ان کی حساسیت کم ہوجائے ۔ جس طرح عیسائی دنیا بے شرمی کی ذلیل ترین حرکتوں کے مقابل بھی سکوت اختیار کئے رہتی ہے اور باوجود اس کے کہ ہالی وڈ کے زیر پرست فلم ڈائریکٹر پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ کو فلم " عیسیٰ کے آخری وسوسے " میں (مارتا و ماریا[1]) کی برہنہ آغوش میں دکھاتے ہیں ۔[2] یا اخبار و رسائل وغیرہ میں عیسائی علماء کا تمسخر و مضحکہ اڑایا جاتا ہے ۔ وہ لوگ ان استعماری سازشوں کے خلاف کوئی سنجیدہ اقدام نہیں کرتے ۔ یوں ہی مغرب چاہتا ہے کہ رفتہ رفتہ ان حرکتوں سے مسلمانوں کو بھی مذہب سے بے پروا کرکے بعد کی حرکتوں کے لئے زمین ہموار کرلے ۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اچانک " شیطانی آیات " صہیونی سرمائے اور برطانیہ

اور اخلاقی گمراہیوں و گندگیوں کی طرف مائل کردی جاتی ہے ۔ اس میں ایک اداکارہ لڑکی کے ذریعہ یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے دوری اور اس کی درسی و علمی کامیابیوں کے درمیان ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے ۔ اس فلم کے رائٹر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ سیریز مغرب میں مذہب کے بڑھتے ہوئے رجحان اور رجعت پسندی سے بخوبی مقابلہ کرے گی ۔ سیریز کی اصل اداکارہ (ہیروئن) " ممتا کاشی " ہے جو نسلی اعتبار سے ہندی اور انگلینڈ کی شہری ہے اور اس سیریز میں اپنی اداکاری کی بنا پر فرانس میں ہونے والے فلم فیسٹیول میں بہترین اداکارہ کا انعام حاصل کرتی ہے ۔ ساتھ ہی بی بی سی کے چیف ڈائرکٹر نے مذکورہ سیریز کو سنہ ۸۹ کی سب سے اہم فلم قرار دیا ہے

۱۔ مارتا و ماریا ، اس فلم میں حضرت عیسیٰ کی بیوی اور بہن کے نام ہیں ؛

۲۔ فلم " عیسیٰ کے آخری وسوسے " کی کہانی نیکولس کی کتاب " کازانتزاکیس " سے لی گئی ہے اور اس کا ڈائرکٹر " مارٹن سکورسزی " ہے

کی سلطنتی ادبی انجمن کی حمایت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور انگلینڈ کا سب سے بڑا ادبی انعام "بوکر پرائز" حاصل کرتی ہے اسے ایک یہودی صہیونی پبلیکیشن (پنگوئن) وائکنگ کتابی سیریز کے تحت ۱۹۸۸ء میں چھاپا ہے۔ یہ کتاب وسیع پیمانہ پر مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی ہے اور اعلیٰ پیمانہ پر اس ناول کی پبلسٹی کی جاتی ہے وہ بھی اس طرح کہ سلمان رشدی کو اپنے اشتہاری سفر کے لئے امریکہ کی کئی ریاستوں سے دعوت دی جاتی ہے، یا مختلف اہل قلم اور ادبی انجمنوں مثلاً برطانیہ و امریکہ کی بین الاقوامی قلم و قلمکار انجمن اور بعض دوسرے ملکوں کے ادبی حلقوں سے اس کی حمایت اور تعریف کی جاتی ہے۔

لیکن جو مسلمان گذشتہ کئی برسوں سے مختلف پیمانہ پر عالم استکبار کی جنون آمیز سازشوں کا مشاہدہ کر رہے تھے اور وقتی طور پر جزئی پراگندہ انداز میں ان کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتے آئے تھے، اس شیطانی حرکت کے مقابلہ میں انھوں نے ایسی ہوشیاری و بیداری کا انداز اپنایا کہ مغرب کو اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ لیکن موضوع کے اس حصہ پر روشنی ڈالنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے خود کتاب "شیطانی آیات" کا جائزہ لیا جائے اور سلمان رشدی کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جائے۔ اس کے بعد اس سازش سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالیں گے۔

"شیطانی آیات" کیا ہے؟

"شیطانی آیات" ۵۴۷ صفحہ کی ایک کتاب ہے جسے پنگوئن پبلی کیشن نے اکتوبر ۱۹۸۸ء میں شائع کیا ہے یہ کتاب شائع ہوتے ہی بلا فاصلہ مغربی پروپیگنڈہ مشینریوں کے ذریعہ "تال ٹائمز" کی طرح دنیا بھر میں خوب مشہور کی گئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد اسے انگلینڈ کے سب سے بڑے ادبی انعام "بوکر پرائز" سے بھی نواز دیا گیا۔

سلمان رشدی نے اس کتاب میں اپنی گذشتہ تمام کتابوں کی طرح فطری سحر آمیز طرز اور قوت متخیلہ سے کام لیا ہے۔ درحقیقت وہ اس طرز کے انتخاب کے سلسلہ میں جنوبی امریکہ کے ناول نگاروں (بورخس اور گارسیا مارکز) کا پیرو ہے۔ بہت سے نقادوں کی رائے کے

مطابق اس کے ناول سیاسی مسائل سے پر ہیں اور ان ہی بنیادوں پر لکھے گئے ہیں۔ جیسا کہ اس نے ناول "آدھی رات کے بچے" ہندوستان کے سیاسی حالات اور موجودہ تاریخ کے پس منظر میں لکھا تھا "شرم" پاکستانی مسائل کے پس منظر میں اور ناول "چیتے کی ہنسی" نکاراگوا کے انقلاب کی روشنی میں لکھا۔ اور اس کا یہ آخری ناول "شیطانی آیات" بھی ایران کے اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں مغربی رد عمل کا ایک نمونہ ہے۔

"شیطانی آیات"(1) میں اس کی خیالی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ دو مرکزی کردار (صلاح الدین شمنا اور جبرئیل فاوشیتا) ایک ہندوستانی ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے بعد جہاز کا اغوا کرنے والوں کے ذریعہ یرغمال بنائے جاتے ہیں اور آخر کار جہاز دھماکے سے منفجر ہو کر گر پڑتا ہے، لیکن صلاح الدین شمنا اور جبرئیل فاوشیتا (رائٹر کے تخیل میں) دو دوسری شخصیتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور ان کی روحیں تاریخ کے تحت دو برطانوی وجود میں حلول کر جاتی ہیں اور جب جبرئیل کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک نور کے ہالہ میں (جبرئیل کی شبیہ) پاتا ہے۔

لیکن صلاح الدین ایک بال دار بکری کی شکل (شیطان کی شبیہ) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ دونوں لندن میں وارد ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنے پیروؤں کو اکٹھا کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کے ماننے والوں میں باہم لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں

ناول نگار تخیلاتی دنیا میں جبرئیل کو مختلف تاریخی ادوار سے گزارتا ہوا پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کے

1۔ اس کتاب کا نام ایک جعلی اور بدنام افسانہ یعنی افسانۂ غرانیق کی بنیاد پر رکھا گیا ہے جسے اسلام کی ابتدائی صدیوں کے دروغ سازوں نے قرآن و پیغمبرؐ کے سلسلہ میں گڑھا ہے۔ علماء اسلام نے اس کا مفصل جواب دیا ہے۔ اس افسانہ میں پیغمبر اسلامؐ سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت جس میں مشرکین کی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی ہے جب انیسویں اور بیسویں آیت تک پہنچتے ہیں، جہاں ارشاد ہوتا ہے (اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی) یکایک لہجہ بدل کر مشرکین کے بتوں کی تعریف کرنے لگتے ہیں کیونکہ شیطان پیغمبر کے کلام میں حلول کر گیا تھا اور اس نے (تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى) "یہ ناز و ادا والے بلند پرواز پرندے ہیں اور ان سے شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے" جیسی آیتیں وحی کے برخلاف پیغمبرؐ کی زبان پر جاری کر دیں۔

زمانے تک پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ:

یہ واقعہ شہر جاہلیت میں پیش آیا اور اس کے بعد وہ تاریخ اسلام کے حوالے سے حدیثوں اور اسلام کے قدیم واقعات کو ممکن حد تک بے شرمانہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ازواج پیغمبر کی بڑے ہی شرمناک انداز میں توہین کرتا ہے اور انھیں "پردہ" نامی ایک ایسے گھر میں مقید دکھاتا ہے جو فاسد اور غلط قسم کے افراد کی آمد و رفت کا مرکز ہے۔ وہ اسلامی مقدسات پیغمبر اسلام اور ان کے اصحاب کرام کی شان میں غلط، نارو ا اور توہین آمیز مطالب بیان کرکے اپنے فنی ابتذال اور چھچھورے پن کی حد اور اخلاقی انحطاط کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔

اس جرم کی گہرائی سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہم یہاں اس کے بہتان اور باطل و گمراہ کن تخیلات کا ایک حصہ جنھیں اس نے ممکن حد تک بیہودہ اور شرم انگیز انداز میں بیان کیا ہے (نقل کفر کفر نباشد) کے طور پر پیش کر رہے ہیں:۔

* مزدوروں اور زحمتکشوں کا ایک شہر تھا جسے "جاہلیت" کہتے تھے[1]۔۔۔۔ اس شہر میں ایک مزدور تھا جس کا نام "ماہوند"[2] تھا۔ جو پیغمبر ہوا اور اس نے سب سے بڑے مذہب کی بنیاد رکھی۔۔۔۔۔ ایسے میں اس کے کانوں میں ایک آواز گونجا کرتی تھی: تم کس قسم کا خیال ہو؟ انسان ہو یا چوہے؟ (۳)

* سب سے بڑے پادری: "ابراہیم" نے اپنی بیوی "ہاجر" اور اپنے بیٹے "اسماعیل" کے ساتھ اس بیابان میں قدم رکھا۔ اور اس وحشتناک بیابان میں اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا بیوی نے اس سے پوچھا: کیا ممکن ہے کہ (تمہارا یہ عمل) خدا کی مرضی کے مطابق ہو؟ ابراہیم نے اسے جواب دیا: ہاں یہ اللہ کی مرضی ہے۔ اس کے بعد (معاذاللہ ولدالزنا) وہاں سے چلا گیا۔ (۴)

۱۔ اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔

۲۔ ماہوند وہ نام تھا کہ عیسائی پادری قرون وسطی میں پیغمبر اکرم (ص) کو اس نام سے یاد کرتے تھے۔ مصنف نے بھی یہی نام اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

۳۔۴۔ شیطانی آیات ص ۹۵

* وہاں "خالد" نام کا ایک سقا اور "سلمان" جیسے عجیب نام کا ایک ایرانی بوڑھا و فتنہ گر بھی تھا۔ یہاں تک کہ اس بے کار و بے حقیقت مثلث کو "بلال" نامی ایک غلام نے مکمل کر دیا۔ وہ غلام جسے "ماہوند" نے آزاد کیا تھا۔ وہ بہت ہی سیاہ اور جنگلی تھا (۱)

* مومنین بغیر کسی قانون کے زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن ان برسوں میں (ماہوند) یا بہتر ہے کوئی یہ کہے کہ فرشتوں کے سردار "جبرئیل" یا مزید بہتر ہے یہ کہے کہ "خدا" قانون معین کرنے کے وسوسے سے دوچار ہوا؟ جبرئیل پیغمبر پر ظاہر ہوا اور ایک حکم کے بعد دوسرا حکم لاتا تھا یہاں تک کہ مومنین ہر نئے حکم وحی کو ناگواری اور (ناخوشی) کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ اسی موقع پر سلمان نے کہا: "ہر چیز کے لئے ایک حکم (آرہا ہے) . . . . لعنت ہے!" کیونکہ اگر انسان ریاح خارج کرے تو اسے اپنا چہرہ فلاں طرف کر لینا چاہیئے۔ حتیٰ یہ حکم بھی معین کر دیا ہے کہ انسان طہارت کے لئے کون سا ہاتھ استعمال کرے۔ (۲)

* وحی نے مومنین سے کہا کہ: کس قدر کھائیں۔ کس قدر سوئیں اور کن حالات میں عورتوں سے جنسی تعلقات حرام کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مومنین نے سمجھا کہ لواطا ور جنسی تعلقات قائم کرنا، فرشتوں کے سردار جبرئیل کے ذریعہ معین کیا گیا ہے۔ (۳)

* فرشتوں کے سردار جبرئیل نے میت کے دفن کا طریقہ اور اس کے اموال کی تقسیم کا قانون معین کیا ہے۔ یہاں تک کہ سلمان فارسی نے پوچھا: جبرئیل کا خدا جو اس قدر آشکار ہے کیسا ہے؟ گویا وہ خود ایک کاریگر انسان ہے۔ (۴)

* اور آخر کار جو چیز سلمان اور ماہوند کے باہمی روابط و تعلقات کے خاتمہ کا سبب بنی وہ عورتوں کا قضیہ اور شیطانی آیتیں تھیں۔ سلمان نے مستی کی حالت میں جو کچھ اس کے باطن میں گزر رہا تھا سب کچھ افشا (ظاہر) کر دیا: سنو میں بحث و مباحثہ سے نہیں تھکتا لیکن ماہوند اپنی بیوی (خدیجہ) کی رحلت کے بعد دولت مند نہیں رہ گیا تھا۔ تم سمجھتے ہو میں

۱۔ شیطانی آیات ص ۱۵۱ ۔ ۲۔ شیطانی آیات۔ ص ۳۶۳

۳۔ شیطانی آیات۔ ص ۳۶۴ ۔ ۴۔ شیطانی آیات۔ ص ۳۶۴

کیا کہہ رہا ہوں ؟ وہ یثرب [1] میں جس سے چاہتا تھا ملتا تھا ؛ وہ سب وہیں (مدینہ) کی عورتیں تھیں (یہاں تک کہ) ایک سال کے عرصہ میں پیغمبر کی داڑھی کے بال سیاہی سے سفیدی میں تبدیل ہو گئے ۔ (۲)

سلمان رشدی کون ہے ؟

وہ ایک ۴۱ سالہ ہندی الاصل برطانوی ناول نگار ہے۔ جو بمبئی میں ایک مسلمان خانوادہ میں پیدا ہوا اور وہاں کے انگریزی مشن اسکول میں پروان چڑھا۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ (بیس سال سے زیادہ) برطانیہ میں گزارا اور کیمبرج یونیورسٹی میں (۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۶ء کے دوران) انگریزی ادبیات کے مراحل طے کئے۔ اس نے اپنا پہلا ناول (آدھی رات کے بچے) [3] عالمی استکبار کے سرمایہ سے شائع کیا۔ جس کے ۱۵ سے زیادہ ایڈیشن چھاپے گئے اور یہ کتاب دنیا کی تیس ۳۰ زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ اس کے بعد اس نے دوسرا ناول (شرم) (۴) ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد رشدی ساندینیسٹوں کے انقلاب کی ساتویں سالگرہ کے موقع پر نکاراگوا بلایا گیا۔ اس کے اس تین ہفتہ کے سفر کا نتیجہ اس کا ناول (چیتے کی ہنسی) تھا اور اس کی آخری شیطنت (شیطانی آیات) ہے جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

اس نے اپنی تمام کتابوں کے ذریعہ اس فکر کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ استعمار کے خلاف اٹھائی جانے والی شدید تحریکیں اور انقلابات بے کار و بیہودہ لاحاصل کام ہیں ان سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا اس نے دنیا کے انقلابیوں میں یاس و ناامیدی کی تبلیغ کر کے اور ان کا مضحکہ

۱۔ اس سے مراد مدینہ ہے جسے عہد جاہلیت میں یثرب کہتے تھے۔

۲۔ شیطانی آیات ۔ ص ۳۶۶

۳۔ اس وقت کی ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کتاب پر پابندی لگائی اور اس کے مؤلف کو مجرم قرار دیا، نتیجہ میں بعد کے ایڈیشنوں میں ہندوستان سے متعلق باتیں حذف کر دی گئیں۔

۴۔ یہ ناول بھی پاکستان میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

اڑا کر ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ مغرب کا تسلط و غلبہ تسلیم کرنے کے علاوہ دنیا کے پاس کوئی اور راہ ہی نہیں ہے۔

بہر حال اس نے تاریخ کے محترم ترین اور پاکیزہ ترین انسانوں کی بے شرمانہ طور پر اہانت اور عالمی مقدسات کی ہتک حرمت کر کے قلم، آزادی بیان، تاریخ اور اس کے مسلّمہ حقائق، انسانیت اور انبیائے کرام نیز الٰہی ادیان اور اللہ کے بندوں کے ساتھ سخت خیانت کی ہے اور جذبات کو بھڑکانے نیز روئے زمین پر قتل و فساد برپا کرنے کا سبب بنا ہے جبکہ ایک فرد کے عنوان سے در اصل اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن وہ عالمی کفر کے ہاتھ میں ایک خنجر کے مانند ہے جو پاکیزہ ترین اقدار کے پہلو میں در آیا ہے اور مغرب مکارانہ انداز میں اس خنجر کو استعمال کرنے کے لئے اسے آزاد اور بے تقصیر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاریخ مغرب کے استعماری حکام کی ان رذیلانہ شیطانی چالوں کو ہرگز فراموش نہ کر سکے گی۔ ساری دنیا کے خدا پرستوں اور مسلمانوں کو مغرب کے ان انسانیت سوز اور پلید اغراض و مقاصد کو ان کی پہچان کا معیار اور ذریعہ قرار دے دینا چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ یہ کتاب اسلامی و الٰہی تحریکوں کے خلاف عالمی کفر کی دشمنیوں اور مکاریوں کا ہی ایک حصہ ہے۔

از : علامہ طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ : جناب سید علی الحسن رضوی

رسول اسلامؐ
روایات کی روشنی میں

۳

خوشبو لگانا

کافی میں عبداللہ ابن سنان سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : رسول خداؐ کے پاس ایک مشکدان تھا جسے آپ وضو کے بعد ہمیشہ اپنے گیلے ہاتھوں سے اٹھاتے تھے چنانچہ آپ جب بھی گھر سے باہر تشریف لاتے اس کی خوشبو سے ہی پہچان لئے جاتے تھے کہ رسول اللہؐ صلعم ہیں ۔ (۱)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ جب بھی کوئی عطر حضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا جاتا آپ اس سے ضرور خوشبو فرماتے تھے اور کہتے تھے : اچھی خوشبو ہے اس کا ساتھ رکھنا آسان ہے اور اگر کبھی اس سے خود کو معطر نہ بھی کرتے تو اپنی انگلی کی نوک اس میں تر کر لیتے تھے (تاکہ دل شکنی نہ ہو) ۔ (۲)

اسی کتاب میں ہے کہ : رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قماری اگر (عود) سے دھواں لیتے تھے ۔

---

۱ ۔ کافی جلد ۶ ص ۵۱۵ حدیث ۲ ۲ ۔ مکارم الاخلاق ص ۳۴

ذخیرۃ المعاد میں ہے کہ آپ مشک کو بہترین و محبوب ترین عطر شمار کرتے تھے ۔ (۱)

کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے امیر المومنین علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ : مونچھوں پر عطر لگانا انبیاء علیہم السلام کے اخلاق سے اور کراماً کاتبین کے احترام میں ہے ۔(۲)

کافی میں ہی سکن خزاز سے منقول ہے کہ اس نے امام صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر بالغ پر لازم ہے کہ وہ ہر جمعہ کو اپنے ناخن اور مونچھیں چھوٹی کرے اور تھوڑا عطر استعمال کرے رسولؐ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) جب کبھی جمعہ کے دن عطر آپ کے پاس نہ ہوتا تو آپ مجبوراً اپنی بعض ازواج کے سر کا رومال منگواتے اور ان کو پانی میں تر کرکے اپنے چہرے پر مل لیتے تھے تاکہ اس رومال کی خوشبو سے خود کو معطر کر لیں ۔ (۳)

من لا یحضرہ الفقیہ میں اسحاق بن عمار سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : اگر کوئی عید کے دن رسولؐ کی خدمت میں عطر پیش کرتا تو آپ پہلے اپنی بیویوں کو مرحمت فرماتے تھے ۔ (۴)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ مختلف قسم کے روغنوں سے ضماد (مالش) فرماتے تھے ۔ نیز صاحب مکارم الاخلاق فرماتے ہیں کہ حضورؐ زیادہ تر روغن بنفشہ سے ضماد فرماتے تھے اور کہتے تھے یہ بہترین روغن ہے ۔ (۵)

سفر میں رسولؐ کی سیرت

کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں عبداللہ سنان سے اور وہ امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں

۱۔ اسی مضمون کی حدیث بحار جلد ۱۶ ص ۲۶ (حدیث ۱۵۰) اور فروع کافی ص ۵۱۷ پر کئی حدیثیں موجود ہیں۔

۲۔ کافی جلد ۶ ص ۵۱۰ حدیث ۵ ۔

۳۔ کافی جلد ۶ ص ۵۱۱ حدیث ۱۰

۴۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۲ ص ۱۱۲

۵۔ مکارم الاخلاق ص ۳۲

کہ رسول اسلام زیادہ تر پنجشنبہ کو سفر اختیار کرتے تھے۔ (۱)

کتاب امان الاخطار اور کتاب مصباح الزائر میں ہے کہ صاحب عوارف المعارف فرماتے ہیں کہ رسول خدا(ص) جب بھی سفر فرماتے تھے پانچ چیزیں اپنے ساتھ رکھتے تھے: ۱) آئینہ ۲) سرمہ دان ۳) کنگھی ۴) مسواک اور ۵) ایک دوسری روایت کے مطابق قینچی بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ (۲)

کتاب مکارم الاخلاق میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب راستہ چلتے تو آپ کی وہ کیفیت ہوتی کہ دیکھنے میں تھکن اور کسل مندی کا بالکل احساس نہ ہوتا تھا (۳)

من لا یحضرہ الفقیہ میں معاویہ بن عمار سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: سفر میں پیغمبر اسلام جب بلندی سے نیچے کی طرف آتے تو لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے اور جب بلندی کی طرف بڑھتے تو اللہ اکبر فرماتے تھے۔ (۴)

قطب کی کتاب "لب اللباب" میں روایت ہے کہ رسول خدا صلعم کسی مقام سے اس وقت تک کوچ نہ فرماتے جب تک وہاں دو رکعت نماز نہ ادا فرما لیتے تھے آپ فرماتے تھے: کہ یہ نماز میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ یہ منزلیں جہاں میں نے نمازیں پڑھی ہیں گواہی دیں گی۔ (۵)

من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ جس وقت مومنین کو رخصت کرتے تو فرماتے تھے خداوند عالم تقویٰ کو تمہارا زاد و توشہ قرار دے، تمہارے لئے خیر کی راہیں باز کر دے، تمہاری تمام حاجتوں کو پورا کرے، تمہارے دین و دنیا کو سالم و محفوظ رکھے اور تم کو

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۲ ص ۱۷۳ حدیث ۳۔

۲۔ مستدرک الوسائل جلد اول ص ۵۸، مصباح الزائر فصل اول۔

۳۔ مکارم الاخلاق ص ۲۲۔

۴۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد دوم ص ۱۷۹ حدیث ۱

۵۔ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ سنن النبی در المحاسن ص ۷۲ اور عوارف المعارف ص ۱۳۵

سلامتی اور بے پناہ منفعت کے ساتھ واپس لائے۔ (۱)

کتاب جعفریات میں امام جعفر صادقؑ اپنے آبائے طاہرینؑ سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: رسول خدا صلعم مکہ سے آنے والے افراد سے فرماتے تھے: خداوند عالم تمہاری عبادتوں کو قبول کرے گناہوں کو بخش دے، اور جو کچھ تم نے اس راہ میں خرچ کیا ہے اس کے بدلے تمہیں روزی عطا کرے۔ (۲)

آداب لباس

غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) ہر طرح کا لباس جو آپ کو فراہم ہو جاتا تھا پہن لیتے تھے چاہے وہ لنگی ہو یا عبا، کرتہ ہو یا جبہ یا اسی کے مثل اور کوئی چیز البتہ سبز رنگ کا لباس آپ کو پسند تھا ویسے زیادہ تر سفید رنگ کا ہی لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے اپنے زندوں کو سفید کپڑے پہنایا کرو اور اپنے مرنے والوں کو بھی اسی میں کفن دیا کرو۔ آپ زیادہ تر قبائے محشو (۳) پہنا کرتے تھے تمام جنگ ہو یا کوئی اور موقع ہو آپ کے پاس ایک دیبا کی قبا تھی جب آپ اس کو پہن لیتے تھے تو سفیدی کی زیادتی کے سبب آپ کی زیبائی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا آپ کے تمام لباس ٹخنوں سے اونچے ہوتے تھے، تمام کپڑوں کے نیچے زیر جامہ ہوتا تھا۔ آپ کے کرتے جو پیروں کی نصف پنڈلیوں تک کا ہوتا تھا آپ ہمیشہ اپنا کرتا ایک [illegible] سے باندھے ہوئے رہتے تھے اور کبھی کبھی نماز میں یا نماز کے علاوہ اوقات میں بھی اس کا کمر بند کھول دیا کرتے تھے۔ اور آپ کے پاس ایک عبا تھی جو زعفران میں رنگی ہوئی تھی اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ آپ اسی کو اپنے دوش پر ڈالتے اور لوگوں کے ساتھ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ بغیر کسی اور لباس کے صرف ایک چادر جسم پر لپیٹ لیتے تھے۔ آپ کے پاس ایک چادر تھی جس کا اوپری استر اون کا تھا آپ اس کو پہنتے اور فرماتے تھے کہ میں بھی ایک غلام ہوں اور غلاموں کا لباس پہنتا ہوں۔ اس کے علاوہ دو

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۲ ص ۱۸۰ حدیث ۲ ۲۔ جعفریات ص ۷۵

۳۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں ایک قسم کی قبا تھی

جامے اور بھی تھے جو جمعہ کے دن نماز جمعہ سے مخصوص تھے ، اور ایسے کئی اتفاقات پیش آئے کہ آپ بغیر کسی جامے کے سراپا ایک چادر پہن لیتے اور اس کے دونوں کنارے اپنے دونوں شانوں کے درمیان باندھ لیتے تھے اور اکثر اوقات اسی چادر کو پہن کر نماز جنازہ پڑھاتے تھے اور لوگ آپ کی اقتدا کرتے تھے ، کبھی کبھی گھر میں بغیر کسی لباس کے محض ایک لنگی باندھ کر نماز پڑھ لیتے تھے آپ لنگی اپنے گرد لپیٹ لیتے اور اس کا بایاں کنارہ داہنے کندھے پر اور دایاں کنارہ بائیں کندھے پر ڈال لیتے تھے ... کبھی کبھی اسی لنگی میں آپ نماز شب بھی پڑھتے تھے ... آپ کے پاس ایک سیاہ رنگ کی بھی چادر تھی چنانچہ کسی موقع پر آپ نے وہ کسی ضرورتمند کو دے دی اس وقت ام سلمہ نے سوال کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں آپ کی وہ سیاہ چادر کیا ہوئی ؟ حضرتؐ نے فرمایا پہن لی گئی، ام سلمہ نے عرض کی اس کی سیاہی میں آپ کی سفیدی سے زیادہ حسین کسی کو نہیں دیکھا ۔

انس کہتے ہیں : کئی بار انھوں نے دیکھا کہ حضرت نماز ظہر "شملہ" (شال نما کپڑا) پہن کر پڑھتے اور اس کے دونوں کنارے باندھ لیتے تھے ، رسول خدا صلعم ہمیشہ انگوٹھی پہنتے تھے اور اور اکثر جب آپ گھر سے نکلتے تو انگوٹھی میں ایک تاگہ باندھے ہوتے تاکہ اس کے ذریعہ جس کام کے لئے نکلے ہیں یاد آجائے ، اور اسی انگوٹھی سے خطوط پر مہر لگاتے تھے اور کہا کرتے تھے ، خط پر مہر کردینا تہمت سے بہتر ہے ، رات میں زیادہ تر صرف ٹوپی یا زیر عمامہ سر پر پہن لیا کرتے تھے ، اور اکثر اس کو سر سے اتار کر حاجب کے عنوان سے سامنے رکھ لیتے اور نماز ادا کرتے تھے ، کبھی کبھی عمامہ سر پر نہ ہوتا صرف ایک شال سر پر لپیٹ لیتے تھے ۔ رسولؐ خدا کے پاس ایک عمامہ تھا جس کو لوگ سحاب کہتے تھے ، جو آپ نے علی (علیہ السلام) کو دے دیا تھا اور کبھی کبھی جب علی (علیہ السلام) اس کو پہن کر تشریف لاتے تو پیغمبرؐ اسلام ارشاد فرماتے تھے : علیؑ تو سحاب کے ساتھ آ رہے ہیں حضورؐ ہمیشہ داہنی سمت سے لباس پہننا شروع کرتے تھے اور فرماتے تھے : "الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی الناس" تعریف اس پروردگار کی جس نے مجھ کو وہ لباس عطا کیا جس سے میں ستر پوشی کرتا ہوں اور لوگوں کے درمیان خود کو زینت عطا کرتا ہوں اور جب کبھی کپڑا اتارتے تو بائیں طرف سے اتارنا شروع کرتے تھے جب کبھی نیا لباس پہنتے تو اپنا پرانا لباس کسی فقیر

کو عنایت فرما دیتے تھے اور فرماتے تھے : کوئی مسلمان نہیں ہے جو اپنے پرانے کپڑے سے صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کسی مسلمان کا بدن ڈھانکے مگر یہ کہ وہ چیز جس سے اس نے دوسرے کی تن پوشی کی ہے اسی کے ذریعہ خود کو دنیا و آخرت میں خدا کی ضمانت اور خیر و حفاظت میں دے دیگا ۔

آپ کے پاس چمڑے کی کھال کا ایک فرش تھا جس کا استر لیفِ خرما سے تیار کیا گیا تھا جو تقریباً دو ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ و ایک بالشت چوڑا تھا اور ایک عبا تھی جس کو جہاں کہیں بیٹھنا چاہتے دُہرا کر کے بچھا لیتے اور زیادہ تر بغیر کسی فرش کے چٹائی پر ہی سو رہتے تھے ۔

آپ کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے جانور حتیٰ کہ اسلحے اور اثاثے کے بھی نام رکھ دیا کرتے تھے چنانچہ آپ کے پرچم کا نام عقاب تھا اور وہ شمشیر جس کے ساتھ آپ جنگوں میں شریک ہوتے تھے ذوالفقار تھی اور دوسری شمشیروں کے نام مخذم ، رسوب اور قضیب تھے آپ کی شمشیر کا قبضہ چاندی سے آراستہ تھا ، اور کمر کا تسمہ جو آپ اکثر اوقات باندھتے تھے چمڑے کا تھا جس میں چاندی کے تین حلقے آویزاں ہوتے تھے ۔ آپ کی کمان کا نام کتوم اور ترکش کا نام کافور تھا ، آپ کے ناقے کا نام عضباء ، گھوڑے کا نام دلدل اور گدھے کا نام یعفور تھا اور آپ کی وہ بکری جس کا دودھ نوش فرماتے تھے عینہ تھی ،

حضرتؐ کے پاس ایک مٹی کا لوٹا تھا جس سے آپ وضو کرتے اور پانی پیتے تھے اور چونکہ لوگ جانتے تھے کہ آپ کا لوٹا وضو کرنے اور پانی پینے کے لئے مخصوص ہے لہٰذا بچوں کو بھیجتے کہ وہ حفاظت و تبرک کے عنوان سے اس سے پانی پیئیں اور اس کا پانی اپنے چہرے اور بدن پر ملیں اور بچے بھی آنحضرتؐ سے بے پروا ہو کر یہ کام کرتے تھے ۔ (۱)

جعفریات میں امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا رسول خدا (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) رات میں ایک ٹوپی پہن لیتے تھے جس کے اوپر سلائیوں کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں ، یہاں تک کہ آپؑ نے فرمایا : حضرت (ص) کے پاس ایک زرہ تھی جس کو ذات الفضول کہتے تھے ، اس زرہ میں چاندی کے تین حلقے تھے ایک سامنے کی طرف سے

۱۔ احیاء العلوم جلد ۷ ص ۱۳۰ ۔

اور دو پشت کی طرف سے الی آخرہ۔ (۱)

کتاب عوالی میں روایت ہے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے پاس ایک سیاہ عمامہ تھا جسے کبھی کبھی پہن کر آپ نماز پڑھا کرتے تھے (۲) نیز روایت میں ہے کہ آپ کا عمامہ اتنا لمبا تھا کہ اسے تین یا پانچ پیچ کر کے اپنے سر پر لپیٹتے تھے۔

خصال میں امیرالمومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے حدیث اربعمأتہ کے ضمن میں فرمایا: روئی کے کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ رسول اسلام کا لباس ہے آنحضرتؐ اون اور بال کے کپڑے جب تک ضرورت نہ ہوتی نہیں پہنتے تھے۔(۳)

من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ اسمٰعیل بن مسلم امام صادق علیہ السلام سے اور حضرتؑ اپنے پدر بزرگوار سے نقل کرتے ہیں کہ:

پیغمبر اسلام کے پاس ایک چھوٹا سا عصا تھا جس کے نچلے کنارے پر لوہا لگا ہوا تھا آنحضرتؐ اس عصا پر ٹیک لگاتے تھے اور نماز عید فطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ عصا آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ (۴)

کافی میں ہشام بن سالم امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: پیغمبر اسلام کی انگوٹھی چاندی کی تھی۔(۵)

اسی کافی میں ابی خدیجہ سے روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: انگوٹھی کا نگ گول ہونا چاہیئے پیغمبر اسلامؐ کی انگوٹھی کا نگ بھی ایسا ہی تھا۔ (۶)

خصال میں عبدالرحیم ابن ابی البلاد سے روایت ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے پاس دو انگوٹھیاں تھیں اس میں سے ایک پر

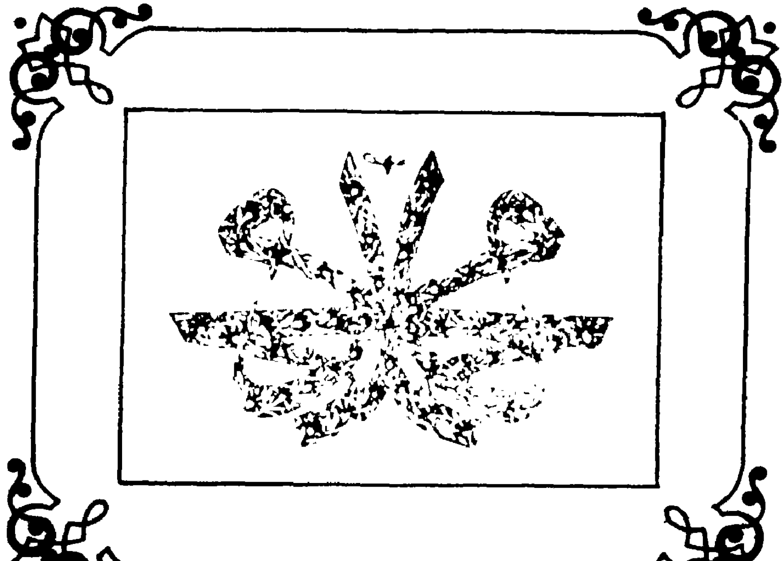
۱۔ جعفریات ص ۱۸۴
۲۔ مستدرک جلد اول ص ۲۰۳ حدیث ۵
۳۔ خصال صدوق ص ۶۱۳
۴۔ من لا یحضرہ الفقیہ، جلد اول ص ۳۲۴ حدیث ۲
۵۔ کافی جلد ۶ ص ۴۶۸ حدیث ۱
۶۔ کافی جلد ۶ ص ۴۶۸ حدیث ۴

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ [illegible] سے مٹے ہوئے تھے [illegible] محمد [illegible] نقش تھا۔(1)

[illegible] حسن بن حسین بن خالد امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ ایک حدیث کے ضمن میں آپ نے فرمایا کہ :

رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ)، امیرالمومنینؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ نیز تمام ائمہ معصومین علیہم السلام ہمیشہ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ (2)

مکارم الاخلاق میں امام صادق امیرالمومنین (علیہما السلام) سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : انبیاء علیہم السلام کرتا، پائجامہ سے قبل پہنا کرتے تھے (3) یہ روایت صاحب جعفریات نے بھی نقل کی ہے۔



1۔ خصال صدوق ص 61
2۔ مستدرک جلد اول ص 229
3۔ مکارم الاخلاق ص 19

طبری

کا علمی و ثقافتی تعارف

از: جناب رسول جعفریان

ترجمہ: سید ولی الحسن رضوی

طبری کا مذہب

طبری کے مذہبی عقائد کو سمجھنے کے لئے جو بحثیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں ان ہی میں سے ایک مشہور و معروف ادیب و شاعر خوارزمی کے ساتھ اس کے ارتباط کا مسئلہ بھی ہے۔

"تاریخ الامم والرسل والملوک" اور "جامع البیان" نامی مفصل تفسیر نیز دیگر کتب کے مصنف محمد بن جریر بن یزید طبری، جیسا کہ مختلف تاریخی، تفسیری و فقہی تحریروں سے پتہ چلتا ہے، تیسری صدی ہجری اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ایران کے بزرگ علمائے اہل سنت میں سے ہوئے ہیں۔ ان کی ولادت ۲۲۴ھ اور وفات ۳۱۰ھ تحریر کی گئی ہے۔ ان کی زندگی کے مفصل حالات بہت سی کتابوں میں موجود ہیں۔

ابوبکر محمد بن عباس خوارزمی چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور ادیب و شاعر ہیں جو امراء و ادباء کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے تھے۔ خصوصاً آل بویہ کے سلسلہ میں بہت شدت پسند تھے اور ان کی بڑی مدح کرتے تھے۔ (۱) ان کی ولادت تقریباً ۳۲۳ھ میں اور وفات ۳۸۳ھ میں

---

(۱) ثعالبی "یتیمۃ الدہر" تصحیح محی الدین عبدالحمید جلد ... ص ۲۰۸ نیز ملاحظہ کریں ص ۲۱۴، ۲۱۰، ۲۱۵۔

لکھی جاتی ہے۔(۱) اشعار کے علاوہ انہوں نے رسائل اور خطوط کا مجموعہ بھی چھوڑا ہے جو ادب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور ۱۹۷۰ء میں شیخ الخازن کے مختصر سے مقدمہ کے ساتھ بیروت میں دار مکتبۃ الحیاۃ کی طرف سے چھپ چکا ہے۔

مذہب کے اعتبار سے وہ ایک شیعہ امامی ہیں جو فرق و مذاہب کے ماہرین اور سنی المذہب رجال کی اصطلاح میں رافضی(۲) کے نام سے جانے جاتے ہیں رفض اور تشیع کی اصطلاح میں، ان کے نزدیک، فرق یہ ہے رفض تشیع میں ہی غلو کی منزل ہے جس نے اثنا عشری کی شکل اختیار کرلی ہے جبکہ غلو سے خالی تشیع ان کے لئے ہے جو علی علیہ السلام کو عثمان پر اور احیاناً تمام خلفاء پر مقدم جانتے ہیں۔(۳) خوارزمی کا وہ خط جو انہوں نے نیشاپور کے شیعوں کے نام لکھا ہے کہ جو اہل بیت علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے حق میں حکام کے ظلم و ستم کی ایک معمولی سی تاریخی جھلک پیش کرتا ہے(۴) اس سے خوارزمی کا رفض بخوبی آشکار ہے۔

اس تمہید کے بعد یہاں طبری اور خوارزمی کے روابط پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جس سے طبری کے عقائد کو سمجھنے میں مدد ملے گی، ممکن ہے اس سے طبری کا شیعیت اور شاید رفض کی طرف میلان ظاہر ہو۔ اس منزل میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ خوارزمی نامی ادیب کا مورخ طبری کا بھانجہ ہونا مشہور ہے۔

دوسری بات یہ کہ خوارزمی کے نام سے کچھ شعر ملتے ہیں جس میں اس نے "بنو جریر" یعنی اپنے ماموؤں کی طرف رفض کی نسبت دی ہے اگر یہ دونوں باتیں درست ہوں اور دوسرے شواہد سے

۱۔ سمعانی۔ "الانساب" جلد ۵ ص ۲۱۳ مطبوعہ ہندوستان۔

۲۔ دراصل اہل سنت اس کو رافضی کہتے ہیں جو خلفاء کو قبول نہیں کرتے اس مسئلہ میں بزرگوں کے درمیان کثرت سے ایسے افراد ہیں جو عثمان کے سلسلہ میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو تمام خلفاء پر اعتراض رہا ہے۔

۳۔ ذہبی کی "میزان الاعتدال" جلد اول ص ۵ ملاحظہ فرمائیں البتہ اس ذیل میں اس کے بعض دعوے درست نہیں ہیں۔

۴۔ "رسائل الخوارزمی" بیروت دار المکتبۃ الحیات، ص ۱۶۔

بھی خوارزمی کی صداقت ثابت ہوجائے تو ہم کسی بھی عنوان سے سہی، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی مورخ طبری کے یہاں تشیع کے ریشے موجود ہونا ثابت کرسکتے ہیں ۔

خوارزمی اور طبری کی رشتہ داری

بنیادی طور پر خوارزمی کے لئے مورخ طبری کا بھانجہ ہونے سے انکار مشکل ہے کیونکہ بہت سی قدیم کتابوں میں اظہار نظر کرتے ہوئے اس کو مورد تائید قرار دیا گیا ہے ۔ سمعانی، کہ جس نے علم انساب میں بہترین کتاب لکھی ہے ۔(۱) اس ذیل میں لکھا ہے : خوارزم سے منسوب افراد میں سے ایک ابوبکر محمد بن العباس خوارزمی ادیب ہے، جس کو طبری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ محمد بن جریر بن یزید الطبری کا بھانجہ ہے ۔

اس کے بعد سمعانی نے صاحب " المستدرک علی الصحیحین "، ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری کا وہ قول نقل کیا ہے جس میں اس نے خوارزمی کے قوت حافظہ اور تاریخ نیشاپور کی تالیف میں اس کی مدد کا ذکر کیا ہے ۔(۲)

ابن اثیر جزری نے بھی سمعانی کے ان ہی خیالات کا خلاصہ اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے ۔(۳)

ثعالبی نے اپنی اہم ادبی کتاب کے کئی صفحات خوارزمی کے رسائل و اشعار سے مخصوص کردیئے ہیں لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس کی اصل " طبرستان " سے تعلق رکھتی ہے اور اس کو " طبرخزی " بھی کہا گیا ہے، اس کا طبری سے ارتباط ذکر نہیں کیا ہے ۔ (۴)

---

۱ ۔ البتہ اس کی کتاب انساب کے رائج معنوں میں نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف نسبتوں کے سلسلہ میں تحقیق کی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں شہروں اور قبیلوں وغیرہ سے منسوب ناموں وغیرہ سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے مثلاً یہی خوارزمی کا عنوان ۔

۲ ۔ سمعانی " الانساب " جلد ۵ ص ۲۱۳ و ۲۱۴ ۔

۳ ۔ ابن اثیر الجزری ۔ " اللباب فی تہذیب الانساب " مطبوعہ دار صادر بیروت ۔ جلد اول ص ۴۶۸ ۔

۴ ۔ ثعالبی ۔ یتیمۃ الدہر، جلد ۴ ص ۲۰۴ ۔

ابن خلکان، جس کو شرح حال لکھنے کے سلسلہ میں شہرت حاصل ہے، اس کو طبری کا بھانجہ قرار دیا ہے۔ (۱)

ذہبی نے بھی، جس کا اہل سنت کے مشہور ترین رجال میں شمار ہوتا ہے، بعینہ اسی بات کی تائید کی ہے۔ (۲)

ان حضرات کی عبارتوں سے بخوبی واضح ہے کہ انھوں نے طبری سے اسی مشہور مورخ طبری کو مراد لیا ہے کہ جس کے دادا کا نام یزید ہے کوئی اور طبری ان کی مراد نہیں ہے۔

جن لوگوں نے خوارزمی کو مورخ طبری کا بھانجہ تحریر کیا ہے ان میں 'ابن فندق' کا نام لیا جا سکتا ہے جو خود بھی طبری سے نسبت کا معتقد ہے، اس نے اپنی تاریخ میں مؤرخین کے ناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "...... اس کے بعد محمد بن جریر طبری نے جو ابو بکر خوارزمی ادیب کا ماموں تھا، ایک عظیم تاریخ تصنیف کی، خاندانی نسب کے اعتبار سے میرا بھی ایک سلسلہ محمد بن جریر طبری مورخ تک پہنچتا ہے، جیسا کہ حاکم ابو عبداللہ حافظ نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے۔ (۳) وہ اپنی کتاب تاریخ بیہق میں ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"..... اور خواجہ ابوالقاسم الحسین ابن ابی الحسن بیہقی ایک شجاع و صاحب شہامت شخص تھا شاہان وقت اس کو عزیز و محترم رکھتے تھے، اور اس کی والدہ ابوالفضل ابن استاذ العالم ابو بکر خوارزمی کی صاحبزادی تھیں، اور استاد عالم فاضل ابو بکر خوارزمی، محمد بن جریر طبری مؤرخ کے بھانجے تھے، کہ جن کی تاریخ و تفسیر مشہور ہے اور حاکم ابو عبداللہ حافظ نے اپنی تاریخ نیشاپور میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ (۴)

ابن العماد حنبلی (۵) اور یافعی (۶) بھی ان متقدمین میں ہیں جنھوں نے اس کو طبری کا بھانجہ کہا ہے۔

۱۔ منقول از خوانساری۔ روضات الجنات جلد ۷ ص ۲۹۶ مطبوعہ اسماعیلیان قم۔

۲۔ ذہبی۔ سیر اعلام النبلاء جلد ۱۶ ص ۵۲۶ مطبوعہ مؤسسہ الرسالہ، بیروت۔

۳۔ ابن فندق۔ تاریخ بیہق تصحیح ڈاکٹر بہمنیار مطبوعہ فروغی، تہران ص ۱۶ ۴۔ ایضاً ص ۱۰۸

۵۔ الحنبلی۔ "شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، جلد ۳ ص ۱۰۵ ۶۔ یافعی۔ مرآۃ الزمان جلد ۲ ص ۴۱۶

اور یہی بات زرکلی نے بھی "الاعلام" میں لکھی ہے۔ (۱)

متقدمین میں کوئی بھی ایسا نہیں ملتا جس نے اس کے طبری کا بھانجہ ہونے کی تکذیب کی ہو یا کسی دوسرے طبری کو، جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے، خوارزمی کا ماموں بتایا ہو۔

خوارزمی کا کلام

(۱) اب جب کہ طے ہوگیا کہ تاریخی اعتبار سے خوارزمی کے طبری کا بھانجہ ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے اگرچہ بعض متأخرین نے اس سلسلہ میں بلاوجہ شک و شبہہ پیدا کیا ہے۔ ہم خوارزمی کا وہ کلام پیش کرتے ہیں جو اس نے اس ذیل میں کہا ہے۔ اس نے اس شعر میں بنو جریر سے اپنے ارتباط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو "رافضی" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ پہلے ہم یاقوت حموی کے حوالے سے شعر پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس کے بارے میں اس کی رائے پیش کریں گے۔

بآمل مولدی وبنو جریر فاخوالی ویحکی المرء خاله

فہا انا رافضی عن تراث وغیری رافضی عن کلاله (۲)

یعنی میں آمل میں پیدا ہوا، اور بنو جریر میرے ننھیالی (یا ماموں زاد) ہیں اور ہر شخص اپنے ماموں کی روش اپناتا ہے۔ یاد رکھو میں "وراثتہً" یعنی باپ دادا سے رافضی ہوں جبکہ دوسرے (ماں باپ کے بجائے) کلالہ کی بنیاد پر رافضی بنے ہیں۔

یہی شعر کتاب "نقض" میں ہیں، جسے عبدالجلیل رازی قزوینی (متوفی ۵۶۰ ہجری) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے مصنف نے نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں: "اور ابو بکر خوارزمی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ شیعہ عقیدہ رکھتا تھا اور اس فضل و شرف کا فضلا انکار نہیں کرتے۔ یہ اشعار اسی کے ہیں"۔

اگرچہ صاحب "نقض" کا خیال ہے کہ ہرگز کسی شیعہ کا ابو بکر نام نہیں ہوا ہے۔ اور اس کے بعد

۱۔ زرکلی۔ "الاعلام" جلد ۶ ص ۱۸۳ ۲۔ یاقوت حموی۔ معجم البلدان جلد اول ص ۵۷

شعر نقل کیا ہے البتہ انھوں نے خوارزمی کا دوسرا شعر یاقوت کے پیش کردہ شعر سے مختلف تحریر کیا ہے

فمن یك رافضیاً عن تراث　　فانی رافضی عن کلالہ (۱)

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب پہلے کے شعر سے بالکل برعکس ہے کہ رفض اس کو وراثت میں نہیں بلکہ کلالہ سے ملا ہے اور شاید یہی مضمون پہلے کی نسبت زیادہ درست بھی ہے ۔

ابن ابی الحدید نے بھی یہ اشعار نقل کئے ہیں (۲) اور غلطی سے مؤرخ طبری کے بجائے طبری امامی کی طرف منسوب کرتے ہوئے طبری کو ہی ان کا خالق جانا ہے اور ظاہری بات ہے اس طرح کی رائے بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ یاقوت ، جو خود بھی ایک مشہور ادیب ہے ، یا صاحب 'نقض' کسی ایک نے بھی اس کو طبری ، چاہے وہ مؤرخ ہو یا امامی ، کسی کی طرف بھی منسوب نہیں کیا ہے بلکہ اس کا خالق خوارزمی کو ہی قرار دیا ہے ۔

ابن فندق نے بھی ، کہ جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ، ان اشعار کی خوارزمی کی طرف نسبت دی ہے البتہ صرف پہلا شعر نقل کرنے پر اکتفا کی ہے ۔ (۳)

صاحب نقض نے خوارزمی کی کنیت ابوبکر ہونے کی بنیاد پر جو اس کے شیعہ ہونے میں شبہہ ظاہر کیا ہے اس کے سلسلہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ :

اولاً ۔ جیسا کہ یاقوت نے کہا ہے اور نیشاپور کے شیعوں کے نام اس کے خط سے بھی پتہ چلتا ہے کہ خوارزمی بلا شبہہ شیعہ امامی یا مروجہ اصطلاح کے مطابق رافضی ہے ۔

دوم ۔ یہ کہ ممکن ہے ، جیسا کہ یاقوت اور ابن ابی الحدید کے نقل کردہ اشعار سے پتہ چلتا ہے (ابن ابی الحدید نے " فمن یك رافضیاً عن ابیہ " لکھا ہے) اس کا باپ سنی رہا ہو اور اسی نے اس کی کنیت ابوبکر رکھی ہو اور اس نے اپنے ماموؤں سے متاثر ہو کر 'رفض' قبول کیا ہو جیسا کہ اس نے کہا ہے " یحکی المرء خالہ " ۔

سوم ۔ یہ کہ صاحب 'نقض' نے دیکھا ہوگا کہ شیعہ رجال کی کتب میں ائمہ علیہم السلام کے

---

۱ ۔ عبد الجلیل رازی قزوینی ۔ "نقض" ص ۲۱۸　　۲ ۔ ابن ابی الحدید ، شرح نہج البلاغہ جلد ۲ ص ۳۶

۳ ۔ ابن فندق ، تاریخ بیہق ص ۱۰۸

بہت سے اصحاب کے نام عمر ملتے ہیں حتیٰ بعض کی کنیت ابو عثمان بھی ملتی ہے (۱) (پس کیسے یہ کہا جا سکتا ہے ایک شیعہ کی کنیت ابو بکر نہیں ہو سکتی؟)

چہارم ۔ یہ کہ ممکن ہے صاحب "نقض" نے اپنے زمانہ پر نظر رکھی ہو یا طنز کے عنوان سے یہ بات کہی ہو ۔

بہر حال صاحب نقض کا ایراد و انکار اس منزل میں قابل قبول نہیں ہے ۔

خوارزمی کے کلام پر یاقوت کی رائے

یاقوت حموی 'معجم البلدان' میں شہر آمل کے ذیل میں خوارزمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "یزعم ان ابا جعفر خالہ" یعنی وہ گمان کرتا ہے کہ ابو جعفر طبری اس کا ماموں ہے اس کے بعد اس کا یہ شعر نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے : وکذب ولم یکن ابو جعفر رحمہ اللہ رافضیاً " یعنی وہ جھوٹ بولتا ہے ابو جعفر رافضی نہیں تھا ۔ (۲)

اب رہا یہ کہ یاقوت نے جملہ کی ابتدا "یزعم" سے کی ہے اور بعد میں اس کی طرف کذب کی نسبت بھی دی ہے تو آیا وہ طبری کا بھانجہ ہونے کے سلسلہ میں خوارزمی کی تکذیب کرنا چاہتا ہے ؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ طبری کی جانب خوارزمی نے رفض کی جو نسبت دی ہے وہ اس کی تکذیب کرنا چاہتا ہے جیسا کہ اس نے طبری کے بارے میں عدم رفض کا اعلان بھی کیا ہے ۔

خوارزمی کی رائے کے جواب میں صاحب 'روضات الجنات' نے وحید بہبہانی کے صاحبزادے کی کتاب 'مقامع الفضل' کی بحث نقل کی ہے چنانچہ صاحب 'مقامع' نے اپنی کتاب میں اس بات کے جواب میں کہ محمد بن جریر طبری کہ جن کا ہماری رجال کی کتابوں میں ذکر ملتا ہے کون شخص ہے ؟ لکھا ہے کہ : دو افراد محمد بن جریر کے نام سے ملتے ہیں ، ایک 'ابن جریر بن غالب طبری' ، ہیں جو شافعی مذہب تھے (۱) اور نووی شافعی نے کتاب 'تہذیب الاسماء' میں ان کی مدح کی ہے ، یہ وہی تاریخ و تفسیر

---

۱ ۔ نجاشی ۔ ص ۲۰۲ ، ۲۱۷ مطبوعہ 'داوری' قم ۲ ۔ یاقوت ۔ معجم البلدان جلد اول ص ۵۷ ۔

۳ ۔ طبری کے شافعی ہونے کی رائے درست نہیں ہے کیونکہ طبری ایک مستقل فقہی مذہب کا حامل ہے جیسا کہ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں ذکر کیا ہے ۔

کے مصنف ہیں جن کی دونوں کتابیں مشہور ہیں۔ دوسرے محمد بن جریر بن رستم طبری ہیں جنھوں نے "المسترشد" اور "الایضاح" نامی کتابیں لکھی ہیں اور جن کے تشیع میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے یہی وہ طبری ہیں کہ جن کے بھانجے خوارزمی نے ان کی تعریف میں کہا ہے "بآمل مولدی . . . ." لیکن یاقوت کو اس مسئلہ میں شبہ ہوا ہے لہٰذا اس نے خوارزمی کی تکذیب کر دی ہے۔

صاحب جامع کی اس توضیح کی بنیاد پر صاحب روضات نے لکھا ہے کہ: یاقوت کے اشتباہ کی وجہ اس کا یہ گمان بنا ہے کہ خوارزمی نے خود کو طبری مورخ کا بھانجہ قرار دیا ہے اور اس کے بعد اس پر استدلال کرتے ہوئے" کہ خوارزمی کی مراد طبری مورخ نہیں ہے اضافہ فرماتے ہیں: اگر شیعہ رجال کی کتب کا دقت نظر کے ساتھ جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ طبری مورخ کا طبقہ خوارزمی سے تقریباً سو سال قبل کا ہے اگرچہ ابن خلکان نے اس کو مورخ طبری کے بھانجے کے عنوان سے ہی ذکر کیا ہے۔ (۱)

صاحب اعیان الشیعہ نے بھی اسی نظریہ کو قبول کرتے ہوئے کہا ہے کہ خوارزمی مورخ طبری کے نہیں بلکہ طبری امامی کا بھانجے ہیں۔ (۲)

اس منزل میں اصولی طور پر ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ تاریخ میں دو طبری کیا بلکہ تین طبری ملتے ہیں جنکی کنیت نام، باپ کا نام طبری سے نسبت حتیٰ لفظ آملی (۳) بھی مشترک طور پر سب کے یہاں موجود ہے۔ رجال نجاشی میں ان دونوں میں سے ایک کا مذہب عامہ کی فہرست میں نام لیا گیا ہے (۴) اور دوسری جگہ دوسرے طبری کا 'امامی' کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔ (۵) اسی طرح شیخ طوسی نے بھی اپنی فہرست میں عامہ سے متعلق محمد بن جریر سے الگ امامی مذہب محمد بن جریر (۶) کا ذکر کیا ہے اور صریحی طور پر کہا ہے کہ یہ صاحب تاریخ و تفسیر طبری سے الگ ہے۔ (۷) مرحوم

۱۔ خوانساری "روضات الجنات، جلد ۷ ص ۲۹۳، ۲۹۴

۲۔ العاملی۔ "اعیان الشیعہ" جلد ۹ ص ۳۷۷، ۳۷۸ و ۱۹۹

۳۔ ابن ندیم "الفہرست" ص ۲۹۱ (اس نے مورخ طبری کو طبری آملی بھی لکھا ہے)

۴۔ نجاشی ص ۲۲۵ ۵۔ نجاشی ص ۲۲۶

۶۔ الطوسی "الفہرست" تحقیق آل بحر العلوم ص ۱۵۰ ۷۔ ایضاً ص ۱۵۹

آقا بزرگ طہرانی اور خوانساری نے بھی اس ذیل میں وضاحت کی ہے خصوصاً مرحوم خوانساری نے زور دیا ہے کہ ایک اور طبری تاریخ میں موجود ہے جو نجاشی کا ہم عصر تھا اور نجاشی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے(۱)

یاقوت کے دعوے کا مسئلہ ذرا اس سے الگ ہے جس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے لیکن ہمارے سامنے جو مشکل ہے وہ یہ کہ طبری اپنی تحریروں کے مطابق عامہ کا مذہب رکھتا ہے لہٰذا ہم مسلم تاریخی شواہد کے برخلاف خوارزمی کو مؤرخ طبری کا بھانجہ سمجھنے کے بجائے طبری امامی کا بھانجہ سمجھیں۔ یہ بات صحیح تاریخی تحقیق کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ جب سمعانی، یاقوت، ابن فندق، ذہبی ابن العماد حنبلی ابن خلکان اور یافعی اس کو مؤرخ طبری کا بھانجہ مانتے ہیں تو یہ کون سی بات ہوئی کہ ہم نص کے مقابل اجتہاد سے کام لے کر اس کو طبری امامی کا بھانجہ تسلیم کرلیں۔ مذہب کا مسئلہ بھی ایک مشکل ہے اور یہی چیز متنازعہ کا سبب ہے اب ایسے میں مورد اختلاف چیز کی قیمت معین نہیں کی جاسکتی۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، ہم بعد میں، طبری کے رافضی یا شیعہ ہونے کے سلسلے میں گفتگو کریں گے لیکن یہاں تک کی گفتگو اور تذکرہ نویسوں کی تحریروں کی روشنی میں اتنا تو تسلیم کرنا ہی چاہیئے کہ خوارزمی مؤرخ طبری کا بھانجہ ہے۔ اب جو اعتراض رہ جاتا ہے، وہ خوانساری کا اٹھایا ہوا نکتہ ہے کہ تاریخ میں طبری کا طبقہ خوارزمی سے تقریباً سو سال قبل کا ہے۔ (لہٰذا خوارزمی کو طبری کا بھانجہ کیسے تسلیم کیا جائے؟)

فرض کرتے ہیں کہ خوارزمی طبری امامی کا بھانجہ ہے، اب سوال یہ ہے کس محمد بن جریر طبری امامی کا؟ مرحوم آقا بزرگ کی تحقیق کے مطابق (۲) ایک ـــــ محمد بن جریر بن رستم بن جریر یا یزید طبری ہے جس نے "کتاب المسترشد" لکھی ہے اور کلینی (متوفی ۳۲۹ ہجری) کا ہم عصر ہے اور دوسرا محمد بن جریر بن رستم طبری، صاحب "دلائل الامامۃ" ہے جو شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ ہجری)

۱۔ خوانساری "روضات الجنات" جلد ۷ ص ۲۹۴، شیخ عباس قمی، الکنی والالقاب جلد اول ص ۳۳۱۔ ۳۳۲

۲۔ آقا بزرگ طہرانی۔ "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" جلد ۲۱ ص ۹۔ جلد ۸ ص ۲۴۱ اور اس کے بعد مطبوعہ دار الاضواء بیروت

اور نجاشی (متوفی ۴۵۰ ہجری) کا معاصر ہے۔ ظاہر ہے اگر پہلا طبری مراد لیں تو وہی اعتراض اس کے بارے میں بھی پیدا ہوگا (کہ اس کا شمار سو سال قبل کے طبقے سے ہے۔) اور اگر دوسرے کو مانتے ہیں تو اس کی رحلت خوارزمی سے تقریباً ستر سال بعد کی ہے۔ جبکہ مؤرخ طبری کی وفات خوارزمی سے تہتر سال قبل واقع ہے اس صورت میں بھی یہ اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔

اسی طرح چونکہ یہ اعتراض بہرحال باقی رہتا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ وہی مشہور قول کہ خوارزمی مؤرخ طبری کا بھانجہ ہے قبول کر لیا جائے۔ اور جو چیز اس نکتہ کی مؤید ہے یہ ہے کہ خوارزمی جیسے شخص کے لئے جو پورے اسلامی معاشرہ کے ثقافتی افق پر ظہور کرتا ہے، وہ معاشرہ جس کی اکثریت اہل سنت حضرات پر مشتمل ہے اس کے لئے افتخار اس میں ہے کہ وہ مؤرخ طبری سے نسبت پر ناز کرے ظاہر ہے سب کے سب طبری امامی کو نہیں جانتے تھے۔ خصوصاً جبکہ آقا بزرگ کی تحقیق کے مطابق کلینی کے ہم عصر محمد بن جریر طبری امامی، طبری صغیر کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، اور دوسرے امامی طبری بھی شاید خوارزمی کی تاریخ وفات کے آس پاس ہی پیدا ہوئے تھے کیونکہ وہ پانچویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں اور خوارزمی نے ۳۸۳ھ میں وفات پائی ہے۔

اب رہا اصل اعتراض کہ اگر مشہور مؤرخ طبری، خوارزمی کے ماموں تھے تو دونوں کی عمروں میں تہتر سال کے فاصلے کا کیا کیا جائے؟ تو اس کے حل کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس میں حرج ہی کیا ہے اگر ایک شخص کے ماموں کی وفات اور خود اس کی وفات کے مابین تہتر سال کا فرق پایا جاتا ہو اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ خوارزمی کو طبری کی بہن کا نواسا مان لیں اس طرح طبری کی بہن کی اولاد ہونے میں بھی کوئی شک نہ ہوگا اور عمروں میں فرق کا مسئلہ بھی پیش نہ آئے گا۔

کیا طبری رافضی تھے؟

اب اصل سوال یہ ہے کہ آیا طبری کو رافضی کہنا درست بھی ہے یا نہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس طرح کی نسبت کے امکان کو، ایک خاص عنوان سے ہی، ظاہر کرتے ہیں۔

سب سے پہلی دلیل تو یہی ہے کہ طبری حنبلیوں کے عتاب و غضب کا نشانہ رہے ہیں اور اس بات سے قطع نظر جو "اختلاف الفقہاء" کی تالیف کے سلسلے میں کہی جاتی ہے کہ یہ کتاب طبری نے لکھی ہے اور چونکہ وہ احمد بن حنبل کو فقیہ نہیں بلکہ صرف ایک محدث کے طور پر تسلیم کرتے تھے اس لئے انہوں نے احمد بن حنبل کا نام اس کتاب میں نہیں لیا ہے۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ ان کا شیعی طرز فکر بھی بنا ہو کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب بغداد میں اصل معرکہ آرائی حنبلیوں اور شیعوں کے درمیان ہی تھی اور یہ ایک مسلمہ امر ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خود یاقوت نے "معجم الادباء" میں لکھا ہے :-

"ودفن ليلاً خوفاً من العامة لانه كان يتّهم بالتشيّع"(۱)

یعنی ان کو عامہ کے خوف سے رات میں ہی سپرد خاک کر دیا گیا کیونکہ ان پر تشیع کا الزام تھا۔

یاقوت نے "معجم البلدان" میں طبری کا رافضی ہونا قبول نہیں کیا ہے اس نے خوارزمی کے شعر کی تکذیب کرتے ہوئے لکھا ہے : "حنبلیوں نے طبری کے سلسلہ میں حسد سے کام لیتے ہوئے ان پر رافضی ہونے کا الزام عائد کر دیا ہے اور خوارزمی نے بھی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو رافضی کہہ دیا ہے"۔(۲)

یہ کہ طبری رافضی ہوں، ان کی تاریخ و تفسیر کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن اس کو سرے سے بے بنیاد بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خوارزمی کے اظہارات نیز ان کے بارے میں جو دوسری باتیں شہرت رکھتی ہیں ان کے پیش نظر اس کی توجیہ دو طرح سے فرض کی جا سکتی ہے۔

اول یہ کہ : طبری اپنی آخر عمر میں شیعیت کی طرف مائل ہو گئے تھے، حتی اپنے رفض کی نشان دہی بھی کر دی، اگرچہ حنبلیوں کے خوف کی وجہ سے صریحی طور پر اس کے اظہار کی جرات نہیں کر پائے۔

دوم یہ کہ : وہ بنیادی طور پر، اموی طرز فکر کے برخلاف، ایک منصف مزاج سُنی کی حیثیت سے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل سے متعلق روایات کو قبول کرتے تھے اور دوسرے مسائل میں بھی انہوں

۱۔ یاقوت۔ معجم الادباء، جلد ۱۷ ص ۴۰ ۲۔ ایضاً جلد اول ص ۵۷

نے اعتدال کی راہ اپنا لی ہے ۔

ایسا لگتا ہے کہ پہلا احتمال صحیح ہو (۱) اور یہ ان کے سلسلے میں رفض کی تعبیر کے ساتھ بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اگر چہ طبری کی عمر کا ایک بڑا حصہ مکتب اہل بیتؑ سے انحراف میں گزرا ہے لیکن آخر عمر میں تشیع اور رفض کی طرف رجحان پیدا ہو گیا تھا لہٰذا عامہ کے خوف سے ان کو لوگوں نے راتوں رات سپرد خاک کر دیا تھا ۔

خوارزمی بھی چونکہ "طبری کے اہل بیت" سے ہے لہٰذا "اہل بیت بما فی البیت" کے تحت گھر کی بات بہتر جانتا ہے ۔ دیگر افراد میں سے جنھوں نے طبری کی طرف رفض کی نسبت دی ہے ایک "احمد بن علی سلیمانی" ہیں جو کہتے ہیں :۔

"کان یضع للروافض" یعنی وہ رافضیوں کے لئے حدیث گڑھا کرتا تھا ۔

ذہبی نے سلیمانی کے اس قول کی تکذیب کرتے ہوئے کہ اس طرح کا الزام طبری جیسے شخص پر صادق نہیں آتا لکھا ہے :۔

"فیہ تشیع (یسیر) وموالاۃ لا تضر" یعنی اس کے اندر تھوڑا سا تشیع اور اہل بیت دوستی کا عنصر ہے مگر نقصان دہ نہیں ہے ۔ (۲)

اس کے بعد ذہبی نے لکھا ہے : "شاید سلیمانی نے ابن جریر بن رستم طبری کو مراد لیا ہے"، لیکن ہماری نظر میں یہ احتمال صحیح نہیں ہے بعید نظر آتا ہے کہ سلیمانی جیسا عالم اہل سنت یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ کس طبری کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے ۔ خصوصاً جبکہ ان کے نزدیک مورخ طبری کی شہرت عام ہے ۔

آخری عمر میں شیعیت کی طرف میلان کا ایک اور ثبوت طبری کی لکھی ہوئی وہ کتاب ہے جس میں انہوں نے حدیث غدیر کے طُرق و اسناد سے بحث کی ہے ۔ اگر چہ اہل سنت کے بہت سے راویوں نے حدیث غدیر کو صحیح مانا ہے لیکن طبری نے اس سلسلہ میں ایک مفصل کتاب لکھ ڈالی ہے اور یہ

۱۔ البتہ یہ کہ وہ ایک انصاف پسند شخص تھے اور اہلبیتؑ سے انحراف کے باوجود اس وقت بغداد میں موجود حنبلی سنیوں کے پیرو نہ تھے اور اسی لئے اہلبیتؑ کی جانب بھی متوجہ تھے اس میں ہرگز شبہ نہیں ہے۔ ۲۔ ذہبی ۔ "میزان الاعتدال" جلد ۳ ص ۴۹۹

اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انھوں نے حدیث غدیر کو کتنی زیادہ اہمیت دی ہے۔ علمائے شیعہ میں نجاشی اور طوسی ہر دو بزرگواروں نے اس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے (۱) ذہبی نے بھی لکھا ہے کہ جب طبری نے سنا کہ ابن ابی داؤد نے حدیث غدیر کو غلط قرار دیا ہے تو اس نے ایک کتاب فضائل (اہل بیت) اور حدیث غدیر کی صحت میں لکھی۔

اس کے بعد اس نے اضافہ کیا ہے کہ: "میں نے بھی حدیث غدیر کے طُرُق کے متعلق ایک جلد دیکھی اور اس کی وسعت اور کثرت طرق کو دیکھ کر گھبرا گیا،، (۳) اسی طرح اس نے لکھا ہے کہ "طبری نے اہل بیت کے سلسلے میں ایک مسند بھی لکھی ہے جیسا کہ اس نے دیگر صحابہ کے سلسلہ میں بھی (مسندیں) لکھی ہیں (۳)

یاقوت حموی نے بھی تائید کی ہے کہ طبری نے ایک کتاب فضائل (اہل بیت) میں لکھی ہے اور اس کی ابتدا میں حدیث غدیر کے طرق اکٹھا کئے ہیں اگرچہ یہ کتاب اتمام کو نہیں پہنچ سکی۔(۴)

اس نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ بغداد کے شیوخ میں سے ایک شیخ نے حدیث غدیر سے انکار کیا تھا (اس کی مراد ابن ابی داؤد ہی ہیں البتہ اس نے نام نہیں لیا ہے) لکھا ہے کہ: اس شخص نے کہا تھا کہ جس وقت پیغمبر اسلام (ص) غدیر خم میں تھے علی (ع) یمن میں رہ رہے تھے اور اس سلسلہ میں کچھ جھوٹے اشعار بھی وضع کئے تھے۔ طبری نے اس کے جواب میں علی (ع) کے فضائل نقل کرتے ہوئے حدیث غدیر کے طرق بیان کئے، احادیث سننے کی غرض سے کثیر تعداد میں لوگ جمع ہو گئے اور روافض میں سے بھی ایک گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو گیا .... لہٰذا انہوں نے ابوبکر و عمر کے فضائل شروع کئے بعد میں عباسیوں نے ان سے خواہش کی کہ عباس کے فضائل بھی بیان کریں لیکن اس کا املا کرنا انھوں نے ابھی تمام بھی نہیں کیا تھا کہ اجل نے ان کو مہلت نہ دی۔ (۵)

۱۔ نجاشی ص ۲۵ ۲، الطوسی۔ الفہرست ص ۱۵۰ ۲۔ ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" جلد ۲ ص ۷۱۳۔
۳۔ ذہبی تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۷۱۳۔ ۴۔ یاقوت حموی۔ "معجم الادبار" جلد ۱۷ ص ۸۱۔
۵ یاقوت حموی۔ "معجم الادبار" جلد ۱۷ ص ۸۲۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یاقوت کی آخری باتیں کہاں تک صداقت رکھتی ہیں جبکہ ان میں تناقص بھی پایا جاتا ہے بہرحال طبری کا حدیث غدیر کے تئیں اتنا اہتمام اور "کتاب الولایۃ" کے عنوان سے ایک کتاب کی تالیف کہ جو طرق حدیث غدیر پر محیط ہے اس کی طرف رفض کی نسبت کے مسئلہ میں ایک اہم کڑی ہے ۔ افسوس اس کا ہے کہ یہ اہم کتاب ذہبی کے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھی مگر اس کے بعد اس کا پتہ نہیں ملتا ۔ (۱)

اسی طرح طبری نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں حدیث طیر کے طرق جمع کئے ہیں یہ وہ حدیث ہے جس میں بیان کرتے ہیں کہ جس وقت پیغمبر اسلام ؐ نے ایک "طیر مشوی" (بھنا ہوا پرندہ) کھانا چاہا تو شروع کرنے سے پہلے خداوند عالم سے دعا کی کہ اپنے بہترین بندہ کو بھیج دے جو آپ ؐ کے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے اتنے میں حضرت علیؑ وارد ہوئے (۲)

اس سے قبل بھی ، موجودہ فقہی مذاہب (۳) کی پیروی نہ کر کے طبری کا خود ایک مستقل فکر رکھنا طبری کی روح کی آزادی کا پتہ دیتا ہے چنانچہ فطری طور پر حدیث غدیر کے سلسلہ میں اہتمام ، عجب نہیں ان کی ہدایت کا باعث بنا ہو خصوصاً جبکہ وہ آملی بھی تھے اور اس علاقہ میں شیعیت بہت زیادہ پائی جاتی تھی ۔

ہمارا مقصد طبری کو ، ان معنوں میں جو ہمارے درمیان عام طور پر رائج ہے ، صد در صد شیعہ امامی ثابت کرنا نہیں ہے ۔ لیکن وہ اس صورت حال سے بہت قریب تھے اور شاید آخر عمر میں اس منزل تک پہنچ بھی گئے ہوں ۔

تیسری صدی ہجری میں ایک مشہور روایت لوگوں کے زبان زد تھی ، کہا جاتا تھا کہ :۔

"اُرنی شیعیاً صغیراً اراک رافضیاً کبیراً " (۴)

۱۔ شاید اب بھی موجود ہو اور ہم کو اطلاع نہ ہو ۔

۲۔ القمی ۔ الکنیٰ والالقاب جلد اول ص ۲۳۱ ، العاملی ۔ اعیان الشیعہ جلد ۹ ص ۱۹۹ طبع جدید ۔

۳۔ ابن ندیم ۔ الفہرست ص ۲۹۱

۴۔ الاسکافی ۔ "المعیار والموازنہ" تصحیح الشیخ المحمودی ۔ طبع بیروت ص ۳۲

"یعنی تم مجھے چھوٹے سے چھوٹا شیعہ دکھادو میں (اس سے) ایک بڑا رافضی تمہارے سامنے لاکھڑا کروں گا۔"

یہ ایک حقیقت ہے کیونکہ جو شخص حدیث غدیر کا اس وسیع پیمانے پر مشاہدہ کرے اور ایک چھوٹا موٹا شیعہ نظر آئے وہ آخر کار ایک بڑا رافضی بھی ہو جائے گا۔

بغداد میں حنبلیوں نے جو پابندیاں ایجاد کررکھی تھیں اس نے یقینی طور پر ان کے سامنے تقیہ کا مسئلہ پیدا کررکھا تھا اور شاید اس لئے ان کی زندگی کے آخری ایام میں مسئلہ واضح طور پر سامنے نہیں آسکا طبری کے مذہب عامہ پر ہونے کی شہرت ان کی تالیفات بالخصوص ان کی تاریخ وتفسیر کی بنا پر ہے جو مسلمانوں خصوصاً اہل سنت حضرات کی اہم ترین میراث میں سے ہے لیکن طبیعی طور پر ممکن ہے کہ وہ اپنی آخر عمر میں اس حالت سے رو گرداں ہو گئے ہوں جیسا کہ اس کے قرائن وشواہد بھی موجود ہیں اور ان کے بھانجے خوارزمی نے بھی ان کے رافضی ہونے پر زور دیا ہے۔ خصوصاً اگر تاریخ وتفسیر میں اہلبیتؑ کی طرف سے طبری کے سخت تعصب اور بعد کی تحریروں میں اہل بیتؑ کے دفاع کی روش کو پیش نظر رکھیں تو فیصلہ آسان ہوگا۔

طبری کے آثار

تفصیل کے ساتھ طبری کی کتابوں کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے اس سلسلہ میں یاقوت حموی نے طبری کی کتابوں کی شناخت سے متعلق چند روایات نقل کرتے ہوئے کتابوں کے تعارف کے ذیل میں چند باتیں لکھی ہیں جو بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں (۱) اس نے طبری کی جن کتابوں کا نام لیا ہے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن ۲۔ الفصل بین القرآئہ ۳۔ کتاب القراءات (یہ شاید سابق الذکر کتاب سے الگ ہے) ۴۔ تاریخ طبری ۵۔ کتاب ذیل المذیل (یہ کتاب صحابہ اور تابعین کے حالات زندگی پر مشتمل ہے) ۶۔ اختلاف علماء الامصار فی احکام شرائع الاسلام (اس میں علماء کے فقہی عقائد کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے) کتاب الشروط ۸ کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام (خود طبری اسی کتاب پر زیادہ تکیہ کرتے تھے ان کی یہ کتاب، فقہ کے مختلف

۱۔ یاقوت جلد ۱۸ ص ۵۴۔ ۹۴

ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب کی مختصر بھی "الخفیف فی احکام شرائع الاسلام" کے نام سے موجود تھی ۔
۹۔ کتاب تہذیب الآثار (یہ ابھی حال میں ۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے) ۱۰۔ کتاب ادب النفوس الجیدۃ والاخلاق النفیسہ (یہ بھی ان کے دینی اور اخلاقی خدمات میں شمار کی جاتی ہے اس کے مطالب کی شرح کا ذکر یاقوت نے کیا ہے) ۱۱۔ کتاب "المسند المجرد" ۱۲۔ کتاب البصیر (التبصیر) فی الدین (جو گویا مختلف فرقوں کی رد میں ہے اعراب بھی موجود ہے) ۱۳۔ کتاب فضائل علی بن ابی طالب (اس میں حدیث غدیر کے طرق جمع کئے ہیں) ۱۴۔ کتاب الرد علی الحرقوصیہ" ۔ (نجاشی نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے ۔ (۱)

نیز کچھ دوسرے رسالے بھی اس نے طبری کی جانب منسوب کئے ہیں منجملہ ان کے "کتاب العدو التنزیل اور الرد علی ذی الاسفار" ہے ان میں سے کچھ ہی کتابیں آج دستیاب ہیں اگرچہ بہت سے دوسرے علما کے تصنیفات کے مقابلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ طبری کے تالیفات نسبتاً زیادہ محفوظ رہ گئے ہیں ۔

بروکل مین نے بھی طبری کی باقی ماندہ کتابوں کا ذکر کیا ہے منجملہ ان کے "تاریخ طبری نیز دوسرے مصنفین کے ذریعہ لکھے ہوئے اس کے کچھ تکملے یا تتمے ہیں اسی طرح اس نے تاریخ طبری کے مختلف ایڈیشنوں نیز اس کے جو ترجمے یا تلخیص ہوئی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے ، بروکل مین نے طبری کی دوسری کتاب تہذیب الآثار کے نام سے ذکر کرنے کے بعد (۲) تفسیر طبری کے مخطوطہ و مطبوعہ نسخوں اور ترجموں کا ذکر کیا ہے اس نے طبری کی ایک اور کتاب "اختلاف الفقہاء" کا نام لیا ہے جس کے چار جزو ہیں ان کا ایک نسخہ یا کچھ حصے اب بھی موجود ہیں (۳)

بروکل مین اس کے بعد لکھتا ہے : کتاب تبصیر اولی النہی و معالم الہدیٰ مخطوطہ شکل میں محفوظ ہے ۔ (۴)

۱۔ رجال نجاشی میں ص ۲۲۵ ، نیز ملاحظہ فرمائیں بروکل مین تاریخ الادب العربی جلد ۳ ص ۵ ترجمہ عبد الحلیم نجار مطبوعہ دار المعارف مصر ۔ ابن ندیم نے بھی طبری کی کتابوں کی فہرست لکھی ہے ۔ الفہرست ص ۲۹۱ نیز داؤدی کی کتاب طبقات المفسرین ، ملاحظہ فرمائیں جلد ۲ ص ۱۱۱ ۔

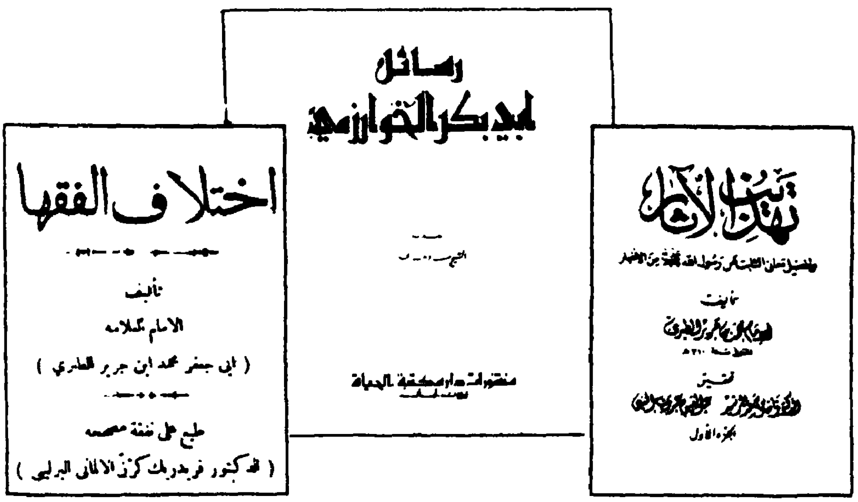
۲ ۔ بروکل مین تاریخ الادب العربی جلد ۳ ص ۴۹ ۳ ۔ ایضاً

۴ ۔ بروکل مین ۔ تاریخ الادب العربی جلد ۳ ص ۵۰ ۔

اس نے گویا غلطی سے کتاب بشارۃ المصطفیٰ جو شیعہ طبری آملی کی تصنیف ہے، مؤرخ طبری کی طرف منسوب کردی ہے۔(۱)

فواد سزگین نے بھی طبری کی باقی ماندہ کتابوں اور ان کے مخطوط نسخوں سے متعلق تفصیل معلومات فراہم کئے ہیں، منجملہ ان کے تاریخ طبری کے نسخوں کی فہرست کافی مفصل ہے (۲) اس نے تاریخ طبری اور اس کے ترجموں سے متعلق بھی کئی باتیں بیان کی ہیں پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بروکل مین کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے، تصحیح اور اپنی طرف سے مزید معلومات کے ساتھ طبری کی باقی ماندہ کتابوں کے نام اس طرح ذکر کئے ہیں:۔

"صریح السنۃ"، "رمی القوس"، "العقیدہ"، "الجامع فی القراءات المشہورہ والشواذ" کہ جس میں شبہ پایا جاتا ہے، کتاب "حدیث الیمان" نیز "الرسالۃ من لطیف القول فی البیان عن اصول الاحکام" یعنی مجموعی طور پر ان کی کل گیارہ کتابیں باقی رہ گئی ہیں۔ (۳)



۱۔ بروکل مین۔ تاریخ الأدب العربي جلد ۳ ص ۵۰۔

۲۔ سزگین۔ تاریخ التراث العربي ترجمہ محمود فہمی حجازی مطبوعہ حجاز ۱۹۸۳ جلد اول جزء دوم ص ۱۶۲۔

۳۔ ایضاً جلد اول، جزء دوم ص ۱۶۷ و ۱۶۸۔

علیہ السلام

قال الحجۃ بن الحسن

وَاکثِرُوا الدُّعَاءَ

بِتَعجِیلِ الفَرَجَ فاِنَّ ذالکَ

فَرَجُکُم

جلد از جلد ظہور کے لئے زیادہ سے زیادہ دعائیں کرو

کیونکہ بلاشبہ اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔

کمال الدین / ج ۲ / ص ۴۸۵

اسلامی، علمی، فکری، دوماہی رسالہ

جلد ۷ شمارہ ۳

رمضان شوال ۱۴۱۰ھ

اپریل مئی ۱۹۹۰ء

توحید

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپئے
ہندوستان	۶۵ روپئے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۶ ڈالر

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

- قرآن و سیرت و سنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ ادارہ۔

[illegible]

توحید

جلد ۷ شمارہ ۳

ترتیب

شذرہ

قرآن

عقائد و معارف

رمضان۔شوال ۱۴۱۰ھ اپریل مئی ۱۹۹۰ء

فکر و نظر

تاریخ و سیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

- اداره کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔
- مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شذرہ

مذہب

افیون یا اکسیر

دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ دیواریں گر رہی ہیں۔ سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں۔ برسوں کے بچھڑے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ ملکوں کی مصنوعی و اجباری تقسیم داستان پارینہ بنا چاہتی ہے۔ مادیت کے کالے بادلوں کی اوٹ سے روحانیت کے آفتاب عالمتاب کا نورانی مکھڑا ابھر رہا ہے۔ مشرقی و مغربی لادینیت کی آہنی زنجیروں کو توڑ کر مذہب، ترانۂ آزادی گا رہا ہے۔ خوابیدہ ذہن بیدار ہو رہے ہیں۔ دنیاوی زرق و برق اور فسادِ شہوت کا سحر باطل ہو رہا ہے۔ برسوں بعد سنسان گلدستوں سے اللہ اکبر کی دلآویز آواز بلند ہو رہی ہے۔ کلیسا کے زنگ خوردہ ناقوس ایک دفعہ پھر بجنے لگے ہیں، جنوبی امریکہ، پولینڈ، زیکوسلواکیہ، ہنگری، مشرقی جرمنی، بلغاریہ، رومانیہ، اسٹونی، لیتوانی، بالٹیک، آذربائیجان، تاجکستان ہر جگہ مذہب، اہم رول ادا کر رہا ہے۔ دین اپنی رسولانہ شان سے سامنے آگیا ہے مادیت یکے بعد دیگرے تاریخی میوزیم کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ اور مذہب مختلف عنوان سے قافلۂ بشریت کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ بجالانے میں مشغول ہے کہیں نجات بخش الہٰیات کے عنوان سے اور کہیں اسلامی انقلاب کے نام پر۔

یہ تبدیلیاں اتنی حیرت انگیز اور برق رفتار ہیں کہ آج سے ایک سال قبل ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کسی کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ اب کمیونزم کو دنیا کی سیاسی تاریخ کے عجائب گھر ہی میں

ڈھونڈنا پڑے گا" کون کہہ سکتا تھا کہ "اب اس وقت دنیا میں کمیونزم نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے" کون کمیونزم کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سن سکتا تھا؟ کس جیوتشی یا نجومی کا اندازہ کردہ تھا کہ ان حالات کی پیشین گوئی کرتا یہ سیاسی جوڑ توڑ یا ستاروں کی چال سے سمجھ میں آنے والی چیزیں نہ تھیں۔ انھیں صرف ایمان بالغیب اور عرفان الٰہی سے مالامال آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھیں۔ یہ صرف سالک الی اللہ، ولی خدا کے بس کی بات تھی کہ وہ مرکزِ کفر و الحاد میں براجمان ایک بڑی طاقت کے سربراہ کو خطاب کرکے مستقبل میں رونما ہونے والے ایسے واقعات سے باخبر کرے جن کا اندازہ بڑے سے بڑے ذہن بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ اے کاش آج وہ عظیم الٰہی رہنما ہمارے درمیان ہوتا اور اپنی آنکھوں سے ان تبدیلیوں کو دیکھتا اور اس بحرانی دور میں قافلۂ بشریت کی ہدایت کا فریضہ انجام دیتا۔

گزشتہ سال، ان ہی ایام میں، اسلامی انقلاب کے قائدِ اعظم حضرت امام خمینیؒ رضوان اللہ علیہ نے روسی صدر گورباچوف کو نہ صرف یہ کہ آئندہ رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ فرمایا بلکہ موجودہ عالمی بحران اور انسانی معاشرہ کے مصائب و آلام کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی اور اس کے علاج کی نشان دہی بھی فرمائی۔ چنانچہ امامؒ اپنے اس تاریخی خط میں فرماتے ہیں:۔

"مشرق و مغرب کے معاشرہ کا سب سے بڑا درد معنویت پر یقین نہ رکھنا ہے اور اس بحران سے بشریت کو مادیت کے ذریعہ نجات نہیں دلائی جا سکتی۔"

ان تمام بیماریوں، ان تمام مصائب و آلام اور ان سارے درد کا واحد علاج ایک الٰہی مذہب اور ایمان بالغیب ہے۔ انسان کی کچھ فطری خواہش ہیں جنھیں مادیات پورا کرنے سے عاجز ہیں۔

صلح پائدار، عدل و انصاف کا قیام، انسانی حقوق کا پاس و لحاظ، آزادی کا بھرم اور امن و سلامتی کی بقاء، مذہب اور معنویات کے بغیر ممکن ہے؟ ایٹمی اور کیمیاوی میزائیلوں کے کابوس سے بشریت کو کون سی چیز نجات دلا سکتی ہے۔ کیا مادی مکاتب فکر ان مقاصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ مشرقی مکتب اس سوال کے سامنے سپر ڈال چکا ہے، مغربی مکتب فکر نے بھی نہ صرف یہ کہ اس سوال کا مثبت جواب نہیں دیا بلکہ اس میں اس کا جواب دینے کی صلاحیت ہی نہیں۔ امریکہ اور مغربی ممالک کا ظلم و ستم اظہر من الشمس ہے۔ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ان کی سفاکی اور بہیمیت کی علامتیں موجود ہیں وہ لاطینی امریکہ ہو یا تیسری دنیا کے کمزور ممالک، حتی خود ان کے اپنے

ملکوں کے مستضعف عوام بھی ان کی درندگی سے محفوظ نہیں ہیں۔

کیا مغربی ممالک کرۂ ارض پر سکون و اطمینان برقرار کر سکتے ہیں؟ اگر بالفرض وہ روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ان کے پاس نفسیاتی و معاشرتی بیماریوں کا کیا علاج ہے؟ وہ طبیعی عمر کے ختم ہو جانے اور فنا و زوال کے خوف کو کس طرح برطرف کریں گے؟ انسان کے دل کو قرار کیسے آئے گا؟ اس کا واحد علاج "غیب پر ایمان" اور "معقولات پر یقین" ہے۔

آج دنیا اس حیات بخش نسخہ سے کسی حد تک آشنا ہو چکی ہے اسی لئے بند ذہنوں کو توڑ کر اس آب حیات کی طرف برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر جگہ مذہب کا بول بالا ہے، ہر تحریک میں دینی عنصر نمایاں ہے۔ اسی چیز نے شرق و غرب دونوں ہی کو حیرت زدہ کر دیا ہے! انہیں اتنی عظیم اور بنیادی تبدیلی کی امید تھی وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ مذہبی طوفان، دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

مغرب کا ہمیشہ یہی خیال تھا کہ دنیا میں اس کا صرف ایک ہی رقیب ہے اور وہ مشرقی بلاک ہے۔ اسی لئے ان چند دہائیوں میں دنیا کو سرمایہ داری و اشتراکی دو بلاکوں میں تقسیم کرنے پر اصرار کیا جاتا رہا ہے۔ دنیا کی تقدیر کے فیصلہ کا حق صرف ان ہی دو بلاکوں کو تھا۔ آج جب مشرقی بلاک دم توڑ رہا ہے اور کمیونسٹ دنیا اتھل پتھل کا شکار ہے، مغربی دنیا ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اسے سرمایہ داری کی جیت قرار دینے کی کوشش میں ہے، حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ یہ طوفان صرف مشرقی بلاک کو نگلنے پر اکتفا نہ کرے گا، مغربی بلاک کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا، موجودہ تمام آثار و قرائن یہی بتلاتے ہیں کہ مغربی دنیا بھی اس طوفان کی زد پر ہے۔ بس انداز ذرا بدلا ہوا ہے۔

اگرچہ گزشتہ چند دہائیوں میں مغرب یہی الاپتا رہا ہے کہ وہ کمیونزم کا مخالف ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ مارکسی نظریات مغرب ہی کی دین ہیں۔ لہٰذا کمیونزم کی شکست درحقیقت، مغرب اور مغرب کے پروردہ نام نہاد مفکروں کے مادی نظریات کی عظیم شکست ہے۔

اگر کمیونسٹ مشرق نے مذہب کو مٹانے کی کوشش کی اور اسے منہ کی کھانی پڑی تو سرمایہ دار مغرب نے بھی مذہب کو مسخ کرنے اور اس کا چہرہ بگاڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا ہے اور یقیناً اسے بھی اپنی اس ناپاک مہم میں شکست و ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ عصر حاضر قوموں کی بیداری کا دور ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں، سامراجیوں نے قوموں پر اپنا اقتدار باقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اس

کی کامیابی کی راہ کا واحد روڑا مذہب رہا ہے کیونکہ مذہب قوموں کو بیدار کرتا ہے، مذہب دوسروں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی دعوت دیتا ہے، مذہب آزاد جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے مذہب... لہٰذا سامراج ہمیشہ مذہب کو محو و نابود یا مسخ و بے اثر کرنے کے لئے کوشاں رہا ہے۔

سامراجیوں کی انسان دشمن کوششوں کی دو سو سالہ تاریخ، شیطانی طاقتوں کے ہاتھوں مذہب کو مٹانے کی کوششوں کو بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس ملک میں سامراج کے قدم پہنچے وہاں مذہب کو محو یا مسخ کرنے کی مہم میں تیزی پیدا ہو گئی۔

عالمی استکبار کو یہ امید ہرگز نہ تھی کہ اس کی دو سو سالہ محنتوں پر اس طرح پانی پھر جائے گا، قومیں اتنے وسیع پیمانے پر اپنے مذہبی احساسات کا اظہار کریں گی۔ اور مذہب اس طرح اچانک زندہ ہو جائے گا۔ عالمی استکبار کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ مذہب کو محو یا مسخ کرنے کی غرض سے بنائی گئی یونیورسٹیوں سے مذہب کی بالادستی کے لئے جان نثار کرنے والے طلبا نکلیں گے۔ دہریت کا درس دینے والی یونیورسٹیوں سے اسلامی حکومت کے طلبگار اٹھ کھڑے ہوں گے اگر یہ استکبار کی شکست نہیں تو پھر کیا ہے؟ اگر مختلف ممالک میں رونما ہونے والے ان حادثات کو مغرب کے کالے سامراج کی دو سو سالہ کوششوں کا ناکام انجام نہ کہیں تو کیا کہیں؟

مغرب، اپنے کو انسانی حقوق کا علمبردار بتاتا ہے، انسانی حقوق کے عالمی منشور میں مذہب و عقیدہ کی آزادی کا راگ الاپتا ہے، لیکن اسلام کے مقابلہ میں اپنے حقیقی مکروہ چہرہ کو نمایاں کر دیتا ہے، وہ ایک مسلمان طالبہ کے سر پر اسکارف بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ آزادیٔ انسان کے تمام نعروں کو پس پشت ڈال کر اپنی پوری طاقت ایک مسلمان بچی سے مقابلہ پر لگا دیتا ہے۔ یہ مغرب کی شکست کا اعلان ہے، یہ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی بھرپور ناکامی کا اعتراف ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے پیدا ہوئی اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ دوست و دشمن دونوں کا جواب یکساں ہے، سب کی انگلی اسلامی ایران ہی کی طرف اٹھتی ہے، سب ہی اس مذہبی بیداری کا علمبردار امام خمینی رضوان اللہ علیہ کو بتاتے ہیں۔ امام خمینی، پیکر عالم میں "روح خدا" تھے۔ یہ ان ہی کی ذات تھی جس نے دنیا کو امید و حوصلہ دیا جس نے گمراہ بشریت کو مذہب کا راستہ دکھایا اور ایک مثالی انقلاب قائم و برپا کر کے اللہ کی لازوال طاقت سے آشنا کرایا اور مذہب کو افیون بتانے والوں سے بھی مذہب کی اکسیری خاصیت کا لوہا منوالیا۔ اور یہ تو ابھی آغاز کار ہے۔ ؎ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

جناب مرتضیٰ حسین صدر الافاضل ؒ

تفسیر

سورہ نساء آیت نمبر ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا

ترجمہ

شوہر والی عورتیں حرام ہیں۔ مگر وہ عورتیں جو تمہارے قبضے میں آجائیں۔ یہ اللہ کا تم پر حکم ہے۔ اور ان کے سوا سب عورتیں جائز ہیں بشرطیکہ بدکاری کے لئے نہیں بلکہ پاکدامنی کے ساتھ اپنے مال کے بدلے نکاح کرنا چاہو۔ ہاں جن عورتوں سے تم نے متعہ

کیا ہو انھیں معین کیا ہوا مہر ادا کردو اور مقررہ مدت تمام ہونے
کے بعد اگر تم باہمی رضامندی سے کچھ طے کرلو تو کوئی گناہ نہیں۔
بے شک اللہ خوب اچھی طرح باخبر اور مصلحتوں کو جاننے والا ہے ﴿۲۴﴾

تفسیر

۲۴ ـــــــــ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ . . . . .

مُحْصَنٰت : (مادہ ح ـ ص ـ ن ـ) حِصن : قلعہ احصان : بچانا ـ غیر سے محفوظ رکھنا
مُحْصِنْ : بچانے والا پاکدامن مرد اپنی شرمگاہ کو غیر عورت سے بچانے والا ـ (مؤنث) مُحْصِنَۃ :
عفیفہ، پاکدامن عورت ـ وہ عورت جس کا شوہر موجود ہو جمع محصنات
کِتٰبَ اللہِ : مفعول مطلق، مصدر ـ کتب اللہ علیکم کتاباً ـ کَتَبَ : اس نے
فرض کیا ـ حکم دیا ـ لازم کیا ـ کتاب اللہ ـ اللہ کی طرف سے عائد شدہ احکام ـ مُسَافِح : بدکار
سِفَاح : ضد نکاح ـ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ـ وہ عورتیں جن کو تم نے ملکیت میں لیا جنگ
میں قید ہو کر آنے والی کافر عورتیں ـ
اِسْتَمْتَعْتُمْ ـ طلبتم المتعۃ : تم نے متعہ کرنا چاہا ـ یہی مصدر بخاری و مسلم
کی صحیحین میں یوں آیا ہے " انہ قد اذن لکم ان تستمتعوا ـ اللہ کی طرف سے تمہیں
متعہ کرنے کی اجازت دی جاچکی ہے لہٰذا متعہ کرو ـ (صحیح بخاری پارہ ۲۱ ـ کتاب النکاح، باب
نہیٰ رسول اللہ عن نکاح المتعۃ اخیراً ـ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب نکاح المتعہ : ج ۱ ص ۵۳۵
طبع عیسیٰ البابی، مصر ـ
دائمی طور پر حرام عورتوں کا قانون بیان کرنے کے بعد ان عورتوں کا تذکرہ جن سے عارضی طور
نکاح حرام ہے ـ
الف : اس عورت سے نکاح جائز نہیں جس کی بہن پہلے سے عقد میں ہو ـ یعنی ایک
شخص کی تزویج میں دو بہنیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں ـ
ب : شوہر دار عورتیں جو دو قسم کی ہیں :ـ

۱۔ وہ عورتیں جو اپنے مسلمان شوہروں کے عقد میں ہوں۔

۲۔ وہ عورتیں جو کافر شوہروں کے عقد میں ہوں، مگر غزوہ و جہاد میں قید ہو جائیں اور مسلمان انہیں گرفتار کر لائیں۔ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کا بالاتفاق یہی مطلب ہے یعنی کنیز اور لونڈی سے مباشرت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اسی شخص کی ملکیت میں ہو۔

پہلی قسم کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ البتہ پہلے شوہر سے طلاق کے بعد بشرط اسلام جائز ہے۔

دوسری قسم کی عورتوں سے ایک طُھر، یا وَضع حمل کے بعد بطور کنیز جنسی تعلقات جائز ہیں۔

اُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ۔ بیان شدہ عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ حکم حلت کا مطلب، عیاشی و بدمستی نہیں، بلکہ حفظِ عفت اور بے راہ روی سے بچنا اور فطری ضرورت کا لحاظ رکھ کر جائز اولاد کا نتیجہ حاصل کرنا ہے۔ متعدد شادیاں سماجی ضرورت اور فعل حرام سے بچنے کی تدبیر ہے۔

حلت متعہ :-

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ ــــ ان جائز عورتوں میں جن کے ساتھ تم متعہ کرو ــــ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ــــ ان کے طے کردہ مہر بطور واجب انہیں ادا کر دو ــــ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ــــ مہر مقرر ادا کرنے کے بعد اور مدت کے تمام ہوتے ہوئے اگر زن و شوہر دونوں عقد دائم یا توسیع مدت پر راضی ہو جائیں تو، بقیہ مدت کے دن ہبہ کر کے دائمی نکاح بھی کر سکتے ہیں اور دوسری مرتبہ متعہ بھی۔

متعہ کیا ہے ؟

متعہ، نکاح دائم اور کنیزی کے درمیان ایک کڑی ہے۔ جسے اللہ نے حلال فرمایا ہے

اور فقہ شیعہ میں اس حکم کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری طبع دہلی کے حاشیے پر مولانا احمد علی سہارنپوری کے الفاظ ہیں:

"هوالنكاح المؤقت بيوم ونحوه وفراقها يحصل بالقضاء الأجل من غير طلاق"

"مولانا عبدالحق حقانی نے اپنی تفسیر میں گویا اس عبارت کا مطلب میں یوں لکھا ہے:

"متعہ ایک قسم کا نکاح ہے جس میں مرد، عورت کو کسی مقدار معین مال سے ایک مدت معین تک اپنے پاس رکھے اور ایجاب و قبول اس میں بھی شرط ہے۔ پھر اس کو رنڈی بازی کہنا فضول ہے" تفسیر حقانی، طبع دہلی۔ آیہ زیر نظر)۔

سید روح اللہ خمینی نے تحریرالوسیلہ میں تحریر فرمایا ہے:-

" نکاح منقطع و متعہ و نکاح مؤجل۔ مسئلہ: نکاح منقطع، دائم کی طرح ایسے عقد کا محتاج ہے جس میں ایجاب و قبول کی دو لفظیں ہوں۔ فقط فریقین کی جذباتی رضامندی یا معاملہ بندی یا تحریر یا اشارہ کافی نہیں۔ (تحریرالوسیلہ، عربی، کتاب النکاح، طبع عراق)

اسلامی فرقے اور فقہاء، متعہ کی تعریف و حدود پر متفق ہیں یہ بھی طے ہے کہ مدت کے اجزاء و شرائط ہیں: مثلاً:

۱۔ مہر: (قرآن مجید میں متعدد آیات میں مہر کے لئے اجر و اجور کا استعمال ہوا ہے۔

۲۔ مدت کا تعین

۳۔ عقد: ایجاب و قبول۔ (جس کے صیغے کتب فقہ میں موجود ہیں)

۴۔ مدت عقد گزرنے یا معاف کرنے سے جدائی فریقین۔ یعنی مدت کا تمام ہونا حکم طلاق میں ہے۔

۵۔ عدہ

۶۔ عدم میراث

۷۔ جواز اثبات نسب برائے اولاد

ادلۂ جواز کا تعارف

احکامِ شرع ہمیشہ کتاب و سنت اس کے بعد اجماع و عقل سے ثابت ہوتے ہیں ۔ جواز متعہ پر بھی یہ دلائل موجود ہیں ۔

۱۔ قرآن کریم :-

سورہ نساء کی زیرِ نظر آیت بہ تصریحِ محدثین و مفسرین و فقہا حلت متعہ پر دلیل ہے ائمۂ اہل بیت علیہم السلام نے اسی آیت کو ہمیشہ سند جانا ہے ۔ اور فقہاء امامیہ و مفسرین آیت کو منسوخ یا مقید نہیں مانتے ۔

۲۔ سنت یعنی احادیث :-

کتاب کے بعد ہم ذخیرۂ احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مجامیع میں بکثرت روایات ہیں جن میں سے ہم چند احادیث نقل کرتے ہیں :-

۱ ________ ابو بصیر نے امام محمد باقر علیہ السلام سے متعہ کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے فرمایا : متعہ کی اجازت قرآن کریم میں موجود ہے : فما استمتعتم الیٰ آخر الآیۃ ۔ (الکافی ، حدیث صحیح ، درابواب متعہ)

۲ ________ زرارۃ کہتے ہیں ، عُبید بن عُمیر لیثی امام محمد باقرؑ کی خدمت میں آیا اور متعۃ النساء کے بارے میں سوال کیا ، امام نے فرمایا : اللہ نے قرآن میں حلال فرمایا اور رسول اللہؐ نے زبانی جائز کہا ، لہٰذا وہ قیامت تک حلال ہے ۔ (الکافی ، روایت صحیح ، اور نذا مفصل ہے)

۳ ________ وسائل الشیعہ میں صدوقؒ کی سند سے روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے کوفہ میں بنی نہشل کی ایک خاتون سے متعہ فرمایا (وسائل ، کتاب النکاح ۔ باب المتعہ ص ۴۴) ۔

۴ ________ جمیل بن صالح کہتے ہیں ، ایک صاحب نے حضرت امام جعفر صادقؑ کے حضور عرض کیا کہ مجھے متعہ کے بارے میں کچھ شبہ ہوا ، اور میں نے قسم

کھائی کہ متعہ کبھی نہ کروں گا۔ امامؑ نے فرمایا، اگر تم اللہ کا حکم نہیں مانتے تو گنہ گار رہو (وسائل باب استحباب المتعہ ص ۴۴۵)

۵۔ ______ ہماری قدیم تفسیر بالحدیث، تالیف ابونصر العیاشی سمرقندی نے بذیل آیت یہ روایت لکھی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جابر بن عبداللہ نے کہا: وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک فوجی مہم (غزوہ) میں تھے وہاں آنحضرتؐ نے حلت متعہ کا اعلان فرمایا اور اسے حرام نہیں کیا۔ اور حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اگر عمر پیش قدمی نہ کرتے تو صرف معدودے چند افراد ہی زنا کرتے۔ اور ابن عباس نے کہا قرآن میں ہے:

"فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً"

اور یہ لوگ انکار متعہ کرتے ہیں درآں حالیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حرام نہیں فرمایا (التفسیر، ج ۱۔ ص ۲۳۳)

اگر کوئی شرعی تکلیف کتاب و سنت سے ثابت ہو جائے تو اجماع وعقل وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر ضمناً عرض ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ کا حلت اجماع، سب مانتے ہیں اور عقلی طور پر بھی، صحت، فراوانی نسواں، جنگ یا دوسری معاشرتی، انتظامی، شخصی یا اجتماعی ضرورتیں، جہاں عورت یا خواتین کی قانونی دستگیری سے بدکاری کا سدِ باب ہو، وہاں یہ قانونی جواز اپنی اہمیت اور واضح کرتا ہے۔

فقہی بحث میں برادران اہل سنت نے قدیم زمانے میں جو غیر معیاری زبان اور لہجہ استعمال کیا تھا حیرت ہے کہ آج کے افاضل بھی اسی طرح بد کلامی سے بات کرتے ہیں مثلاً ایک بزرگ کے ترجمہ و حواشی مختصر مطبوعہ تاج کمپنی لاہور، بے تاریخ۔ میں آیت کا ترجمہ ہے "پھر جس طریق سے تم ان عورتوں سے منتفع ہوتے ہو، سو ان کو ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں"۔ پھر حاشیہ دیا ہے۔ اس کے عموم میں زنا اور متعہ سب داخل ہو گیا حالانکہ قرآن کریم میں فحشا کا داخل کرنا سلب ایمان کا سبب ہے۔ ہم نے متاخرین کے اس

حملوں کے جواب میں جو استدلالی نوٹ لکھا تھا وہ اسلوب تفسیر کے پیش نظر اس سے نکال کر الگ چھاپ دیا ہے۔ (متعہ اور قرآن ۔ کاظمیہ بک ڈپو ۔ لاہور) لہٰذا جواب و بحث کے لئے اسے ملاحظہ فرمائیں۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ــــ بیان شدہ احکام، علیم و حکیم اللہ کے وضع کردہ ہیں اس کے علم و حکمت کا یقین رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ قوانین فطرتِ بشر و فلسفۂ قانون اور اصلاحِ معاشرہ کے حقائق پر مبنی ہیں اس لئے ان میں شک کی گنجائش اور عمل نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ

قال رسول اللہ

مَنْ صَامَ شَهْرَ رَمَضَانَ، وَحَفِظَ فَرْجَهُ وَلِسَانَهُ وَكَفَّ اَذَاهُ عَنِ النَّاسِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ذُنُوبَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْهَا وَمَا تَأَخَّرَ، وَاَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ، وَاَحَلَّهُ دَارَ الْقَرَارِ۔

وسائل الشیعۃ جلد ۷ ص ۱۷۱

رسولؐ خدا نے فرمایا:

جس نے ماہ رمضان میں روزے رکھے، شرمگاہ اور زبان کی حفاظت کی، لوگوں کو اذیت نہ دی، اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش کر، دوزخ سے آزاد کر کے جنت میں جگہ دے گا۔

امامت

ائمہ اطہار کی نگاہ میں (۴)

از : استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

امامت کے کلی مسائل سے متعلق یہ ہماری آخری بحث ہے اس کے بعد ہم اس سلسلہ میں جو بحثیں کریں گے وہ احادیث و روایات کی روشنی میں ہوں گی۔ مثال کے طور پر وہ حدیثیں جو امیر المومنینؑ کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں یا خود امیر المومنینؑ نے اپنے بعد کے ائمہؑ کے لئے ذکر فرمائی ہیں، یوں ہی حضرت رسول خداؐ نے ائمہؑ کے بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے نیز یہ کہ ہر امام نے اپنے بعد کے امام کے لئے کس طرح وضاحت فرمائی ہے ہم ایک ایک کرکے ان سب کا جائزہ لیں گے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر روایات نقلی، نیز تنصیصی پہلو رکھتی ہیں۔

موجودہ بحث کچھ اس ڈھنگ کی ہے کہ اس کا کچھ حصہ شاید ہم گزشتہ گفتگو میں بھی متفرق طور پر پیش کر چکے ہیں لیکن چونکہ یہ مسئلہ امامت کی روح سے مربوط ہے لہٰذا اب ہم ائمہ معصومینؑ کے اقوال کی روشنی میں اس پر بحث کریں گے۔ اور کتاب "اصول کافی" کی کتاب الحجۃ" کا ایک حصہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہم مکرر عرض کر چکے ہیں کہ امامت کا جو مفہوم ہم شیعہ یا کم از کم ائمہؑ شیعہ کے اقوال میں پیش کیا گیا ہے وہ امامت کے اس مفہوم سے بالکل الگ ہے جو اہل سنت کے یہاں رائج ہے۔ یہ مسئلہ حکومت سے بالکل الگ ایک چیز ہے جس کا چرچا ہمارے زمانہ میں بہت ہوتا ہے۔ مثلاً، امامت بنیادی طور پر نبوت کے قدم بہ قدم یا اس کے بالکل

دوش بدوش والا مسئلہ ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ اس کا مرتبہ ہر نبوت سے کمتر درجہ کا ہے۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ نبوت سے مشابہ ایک ایسا منصب ہے جو بڑے انبیاء کو بھی عطا ہوا ہے یعنی یہ ایک ایسا معنوی منصب ہے کہ بڑے انبیاء نبوت کے ساتھ ساتھ امامت کے منصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ ائمہ معصومین نے کلی طور پر اس مسئلہ کے تحت اپنی گفتگو میں انسان کو بنیاد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں پہلے انسان کے متعلق اپنے تصورات و خیالات پر تجدید نظر کرنا چاہیئے تاکہ یہ مسئلہ پورے طور سے واضح ہو سکے۔

انسان؟

آپ جانتے ہیں کہ اساسی طور پر انسان کے سلسلہ میں دو نظریے پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ انسان بھی تمام جانداروں کے مانند صد فی صد ایک خاکی یا مادی وجود ہے۔ لیکن یہ ایسا مادی وجود ہے جو اپنے تغیرات کی راہ طے کرتے ہوئے اس حد کمال کو پہنچ چکا ہے جہاں تک زیادہ سے زیادہ مادہ میں اس کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ حیات، چاہے نباتات میں ہو یا اس سے بلند حیوانات میں یا ان سب سے بڑھ کر انسان میں، یہ خود مادہ کے تدریجی ارتقاء و کمال کی نشاندہی کرتی ہے یعنی اس وجود کی بناوٹ اور ساخت میں مادی عناصر کے علاوہ کوئی اور عنصر کار فرما نہیں ہے۔ (یہاں عنصر کا لفظ اس لئے استعمال ہوا کہ اس کی کوئی دوسری تعبیر ہمارے پاس نہیں ہے)۔ جتنے حیرت انگیز آثار اس وجود میں پائے جاتے ہیں ان کا سرچشمہ یہی مادی تشکیل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قہری طور پر پہلے انسان کو یا دنیا میں آنے والے ابتدائی انسانوں کو ناقص ترین انسان ہونا چاہیئے اور جوں جوں یہ قافلہ انسانیت آگے بڑھا ہوگا انسان کامل تر ہوتا گیا ہوگا خواہ ہم اولین انسان کو قدما کے تصور کے مطابق براہ راست خاک سے پیدا شدہ مانیں یا عہد حاضر کے بعض (سائنس داں) حضرات کے مفروضہ کے مطابق ــــ جو مفروضہ ہونے کی حیثیت سے قابل توجہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے پست تر اور ناقص تر وجود[1] کی تغییر یافتہ اور کامل شدہ مخلوق ہے۔ جس کی

۱۔ ڈاروِن کا مشہور نظریہ۔ انسان پہلے بندر تھا .... (مترجم)

اصل و بنیاد مٹی تک پہنچتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلا انسان براہ راست خاک سے خلق ہوگیا ہو۔

پہلا انسان قرآن کی نظر میں

لیکن اسلامی و قرآنی بلکہ تمام مذاہب کے اعتقادات کے مطابق پہلا انسان وہ وجود ہے جو اپنے بعد کے بہت سے انسانوں حتیٰ کہ آج کے انسانوں سے بھی زیادہ کامل ہے۔ یعنی پہلی بار جب اس انسان نے عرصۂ عالم میں قدم رکھا، اسی وقت سے وہ خلیفۃ اللہ یا دوسرے الفاظ میں پیغمبر کے درجہ پر فائز نظر آیا۔ دین کی منطق میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ کیوں پہلا انسان ہی دنیا میں آیا تو ایک حجت خدا اور پیغمبر کی شکل میں آیا، جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ انسان دنیا میں آتے رہتے اور ارتقائی منازل طے کرتے رہتے اور جب عالی مراحل و مراتب سے ہمکنار ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک نبوت و پیغمبری کے منصب پر فائز ہو جاتا، نہ یہ کہ پہلا ہی انسان پیغمبر ہو۔

قرآن کریم پہلے انسان کے لئے بہت عظیم اور بلند درجہ کا قائل ہے:

"وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ" (۱)

جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا (خدایا) کیا تو انھیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد و خونریزی برپا کریں اور ہم تو تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں (خداوند عالم نے) فرمایا، بلا شبہ (اس انسان کے اسرار کے بارے میں) جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور اللہ نے آدمؑ کو تمام اسمار تعلیم دیئے پھر ان کے حقائق ملائکہ کے سامنے بھی پیش

۱۔ سورہ بقرہ۔ آیات ۳۰۔ ۳۱۔

کیے اور فرمایا ہمیں ان کے نام بتاؤ "۔

مختصر یہ کہ جب پہلا انسان عالم وجود میں آیا تو اس نے ملائکہ کو بھی حیرت میں ڈال دیا کہ آخر اس میں کیا راز پنہاں ہے؟ ــــ پہلے انسان کے بارے میں " نفخت فیہ من روحی " (اپنی روح اس میں پھونکی) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پیکر کی ساخت اور اس کے ڈھانچہ میں مادی عناصر کے علاوہ ایک عُلوی عنصر بھی کارفرما ہے جو (اپنی روح) کی تعبیر کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے ایک خصوصی شئے اس وجود کے پیکر میں داخل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس لئے بھی کہ اس کو خلیفۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ " اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً " میں زمین پر اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں۔

بنابراین قرآن، انسان کو اس عظمت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کہ پہلا انسان جب عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو حجت خدا و پیغمبر خدا اور ایک ایسے وجود کے عنوان سے قدم رکھتا ہے جو عالم غیب سے [illegible] رکھتا ہے۔ ہمارے اکثر [illegible] کرام کے [illegible] [illegible] کی اسی اصل و حقیقت پر ہے یعنی پہلا انسان جو اس زمین پر آیا اسی صنف کا تھا اور آخری انسان بھی جو اس زمین پر ہوگا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہوگا اور عالم انسانیت کبھی بھی ایسے وجود سے خالی نہیں جس میں " اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً " کی روح پائی جاتی ہے۔ (بنیادی طور سے اس مسئلہ کا محور یہی ہے) دیگر تمام انسان، ایسے انسانی وجود کی فرع کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اگر یہ انسان نہ ہو تو بقیہ تمام انسان کسی بھی صورت سے باقی نہیں رہیں گے۔ ایسے ہی انسان کو حجت خدا سے تعبیر کرتے ہیں:۔

" اَللّٰھُمَّ بَلٰی لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰہِ بِحُجَّۃٍ " ہاں (مگر) زمین ایسی فرد سے خالی نہیں رہتی جو اللہ کی حجت ہے یہ جملہ نہج البلاغہ [1] میں ہے اور بہت سی کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ میں نے یہ بات مرحوم آیۃ اللہ بروجردی سے سنی ہے، لیکن یہ یاد نہیں کہ میں نے خود اسے دوسری جگہ بھی کہیں دیکھا ہے یا نہیں، یعنی اس کی جستجو نہیں کی۔ آپ فرماتے تھے کہ

۱۔ نہج البلاغہ، فیض الاسلام، حکمت نمبر ۱۳۹ ــــ مطابق نہج البلاغہ مترجم مفتی جعفر حسین مرحوم، حکمت ۱۴۷

یہ جملہ حضرت کے ان جملوں میں سے ہے جنھیں آپ نے بصرہ میں بیان فرمایا ہے اور شیعہ و سنی دونوں نے اسے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے ۔ یہ جملہ مشہور حدیث کمیل کا ایک حصہ ہے ۔ کمیل کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت علیؑ نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے ہمراہ لے کر شہر کے باہر تشریف لائے ۔ یہاں تک کہ ہم لوگ "جبّان" نامی ایک جگہ پر پہنچے ۔ جیسے ہی ہم لوگ شہر سے خارج ہو کر سناٹے اور تنہائی میں آئے ، فَتَنَفَّسَ الصُّعَداء حضرت نے گہری سانس لی ، ایک آہ کھینچی اور فرمایا :۔

"یا کمیل ! اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ اَوْعِیَۃٌ فَخَیْرُھَا اَوْعَاھَا فَاحْفَظْ عَنِّیْ مَا اَقُوْلُ لَکَ"

"اے کمیل ! اولاد آدمؑ کے دل ظرف کے مانند ہیں اور بہترین ظرف وہ ہے جو کسی چیز کو اپنے اندر محفوظ رکھے (یعنی اس میں سوراخ نہ ہو) لہٰذا میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اسے محفوظ کر لو"۔

پہلے آپ نے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرمایا :۔

"اَلنَّاسُ ثَلَاثَۃٌ : فَعَالِمٌ رَبَّانِیٌّ وَمُتَعَلِّمٌ فِیْ سَبِیْلِ نَجَاۃٍ وَھَمَجٌ رِعَاعٌ" ۔

"انسان تین قسم کے ہیں : ایک گروہ علمائے ربانی کا ہے (البتہ حضرت علیؑ کی اصطلاح میں عالم ربانی سے مراد ہر وہ عالم ربانی نہیں ہے جو ہم ہر ایک کو تکلفاً کہہ دیا کرتے ہیں ، بلکہ اس سے مراد ایسا عالم ہے جو واقعاً صد فی صد الٰہی ہو اور خالص خدا کے لئے عمل کرتا ہو اور شاید یہ تعبیر سوائے انبیاءؑ و ائمہؑ کے کسی اور پر صادق نہیں آتی) وَمُتَعَلِّمٌ عَلٰی سَبِیْلِ نَجَاۃٍ (چونکہ اس عالم کو اس متعلم کے مقابل میں ذکر کیا ہے لہٰذا اُس سے مقصود وہ عالم ہے جو کسی بشر سے علم حاصل نہیں کرتا) یہ دوسرا گروہ اُن سے علم حاصل کرنے والوں اور شاگردوں کا ہے ۔ ان لوگوں کا ہے جو ان علماء سے استفادہ کرتے ہیں ۔ تیسرے گروہ کے لوگ "ہمج رعاع" ہیں (اس کی تشریح یہ ہے) کہ : "لَمْ یَسْتَضِیْئُوْا بِنُوْرِ الْعِلْمِ وَلَمْ یَلْجَأُوْا اِلٰی رُکْنٍ وَثِیْقٍ" جنھوں نے علم کے نور سے نہ کوئی روشنی حاصل کی ہے اور نہ کسی محکم

ستون کا سہارا حاصل کیا ہے ۔"

اس کے بعد آپ نے اہل زمانہ کا گلہ کرنا شروع کیا ۔ فرمایا میں بہت سے علوم اپنے سینہ میں رکھتا ہوں ۔ لیکن مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس میں (انھیں حاصل کرنے کی) صلاحیت موجود ہو ۔ آپؑ نے لوگوں کی گروہ بندی کرتے ہوئے فرمایا، ایسے لوگ بھی ہیں جو زیرک اور عقلمند ہیں لیکن ایسے زیرک ہیں کہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس سے اپنے لئے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی دین کو اپنی دنیا کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا میں ان سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوں ۔ کچھ دوسرے افراد ہیں جو اچھے اور نیک تو ہیں لیکن احمق ہیں ۔ وہ کچھ حاصل ہی نہیں کرتے یا اگر حاصل بھی کرتے ہیں تو ایک دم الٹا اور غلط مطلب سمجھ بیٹھتے ہیں ۔ یہاں تک تو امام کی گفتگو مایوسانہ رنگ لئے ہوئے ہے (کیونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے) کہ کوئی اہل موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں، "اَللّٰھُمَّ بَلٰی . . . . ." نہیں ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی شخص موجود نہ ہو ۔ میں تو یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں لوگوں کی اکثریت کو کہہ رہا ہوں (یہاں آقائے بروجردی فرماتے تھے کہ حضرتؑ نے یہ اشارہ بصرہ میں ایک خطبہ کے ذیل میں فرمایا تھا، ورنہ یہ کمیل کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں بھی موجود ہے) ۔

اَللّٰھُمَّ بَلٰی لَاتَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰہِ بِحُجَّۃٍ اِمَّا ظَاھِرًا مَشْھُوْرًا وَ اِمَّا خَائِفًا مَغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰہِ وَ بَیِّنَاتُہٗ وَکَمْ ذَا وَ اَیْنَ ؟ اُولٰئِکَ وَاللّٰہِ الْاَقَلُّوْنَ عَدَدًا وَ الْاَعْظَمُوْنَ عِنْدَ اللّٰہِ قَدْرًا ، یَحْفَظُ اللّٰہُ بِھِمْ حُجَجَہٗ وَبَیِّنَاتِہٖ حَتّٰی یُوْدِعُوْھَا نُظَرَائَھُمْ وَیَزْرَعُوْھَا فِیْ قُلُوْبِ اَشْبَاھِھِمْ ھَجَمَ بِھِمُ الْعِلْمُ عَلٰی حَقِیْقَۃِ الْبَصِیْرَۃِ وَبَاشَرُوْا رُوْحَ الْیَقِیْنِ وَاسْتَلَانُوْا مَا اسْتَعْوَرَہُ الْمُتْرَفُوْنَ وَ اَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْہُ الْجَاھِلُوْنَ وَ صَحِبُوا الدُّنْیَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُھَا مُعَلَّقَۃٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰی ۔

(نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ۱۳۹ مطابق نہج البلاغہ مترجم مفتی جعفر حسین مرحوم حکمت نمبر ۱۴۷)

آمام علیہ السلام نے فرمایا : ہاں ، زمین ہرگز حجت خدا سے خالی نہیں ہے ۔ اب چاہے یہ حجت ظاہر ہو اور لوگوں کے درمیان ہو یا مستور اور پوشیدہ یعنی موجود تو ہو ، لیکن لوگ اسے دیکھ نہ پائیں ، وہ نگاہ سے پوشیدہ ہو ۔ ان ہی حجتوں کے ذریعہ خداوند عالم اپنی دلیلیں اور نشانیاں لوگوں کے درمیان محفوظ رکھتا ہے ۔ اور یہ لوگ بھی جو کچھ جانتے ہیں اس کے بیج اپنے ہی جیسے افراد کے دلوں میں بو دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ امانتیں ان کے حوالہ نہ کریں اور چلے جائیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اسے بیان کئے بغیر چلا جاؤں گا ۔ اس کے بعد حضرت ان افراد سے متعلق جو ایک ملکوتی مبدأ و مرکز سے استفادہ کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں: هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلٰى حَقِيْقَةِ الْبَصِيْرَةِ خود علم ان پر ہجوم کرتا ہے اور ٹوٹ کر برستا ہے ۔ وہ علم کی طرف نہیں بڑھتے ۔ (مطلب یہ ہے کہ ان کا علم تفویضی ہے) اور وہ علم جو ان پر ہجوم کرتا ہے ، انھیں حقیقی معنوں میں بصیرت عطا کرتا ہے یعنی اس علم میں کوئی اشتباہ ، نقص یا خطا نہیں پائی جاتی ۔ "وَبَاشَرُوْا رُوْحَ الْيَقِيْنِ" وہ روح یقین کو متصل رکھتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عالم دیگر سے بھی ایک طرح کا ارتباط و اتصال رکھتے ہیں ۔ ——— "وَاسْتَلَانُوْا مَا اسْتَعْوَرَهُ الْمُتْرَفُوْنَ" وہ چیزیں جنھیں مترف (یعنی اہل عیش و طرب) اپنے لئے بہت دشوار سمجھتے ہیں ان کے لئے آسان ہیں ۔ مثلاً عیش و عشرت کے عادی افراد کا گھنٹہ بھر اپنے خدا سے لو لگانا اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کرنا گویا سب سے زیادہ دشوار کام ہے ۔ لیکن ان کے لئے یہ کام آسان ہی نہیں بلکہ ان کا پسندیدہ عمل ہے ۔ "وَاَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُوْنَ" جن چیزوں سے نادان اور جاہل افراد وحشت کرتے ہیں یہ ان سے مانوس ہیں ۔

"وَصَحِبُوا الدُّنْيَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰى" وہ اپنے جسموں کے ساتھ لوگوں کے ہمراہ رہتے ہیں جبکہ اسی وقت ان کی روحیں مقام اعلیٰ سے تعلق و اتصال رکھتی ہیں ۔ یعنی ان کا جسم لوگوں کے ساتھ ہے لیکن ان کی

روح یہاں نہیں ہے۔ جو لوگ ان کے ہمراہ ہیں انھیں اپنے ہی جیسا انسان سمجھتے ہیں اور ان میں اور اپنے آپ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس (انسانِ کامل) کا باطن کسی اور عالم سے وابستہ ہے۔

بہر حال امامت کا اصل فلسفہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب "کافی" میں "باب الحجۃ" کے عنوان سے ایک مستقل باب موجود ہے۔ اور اس میں ملتا ہے کہ اگر دنیا میں صرف دو انسان باقی رہیں تو ان میں کا ایک اسی طرح کا انسان ہوگا جس طرح دنیا کا پہلا انسان اسی منصب پر فائز تھا ہم اس فلسفہ کی روح کو لوگوں کے ذہنوں سے مزید قریب کرنے کے لئے اور اس حقیقت سے زیادہ آشنا کرنے کے لئے "اصول کافی" سے "کتاب الحجۃ" کی بعض روایتیں اور حدیثیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلہ سے متعلق تمام دوسرے مسائل مثلاً معاشرہ میں امام کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ لوگوں پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرے۔ یا دینی امور میں لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کر سکے۔ یہ سب باتیں اس اصل مسئلہ میں طفیلی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امام کو لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے امام قرار دیا جائے اور بس، بلکہ یہ مسئلہ ان تمام باتوں سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ باتیں گویا امام کے "فوائد جانبیہ" یعنی اس کے وجود کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے فوائد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم بر بنائے اختصار چند جملے منتخب کر کے آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں تاکہ فلسفہ امامت کی حقیقت اچھی طور سے واضح ہو جائے۔

امام جعفر صادق(ع) سے ایک روایت

یہ روایت انبیاء و مرسلین سے متعلق ہے۔ ایک زندیق (مادہ پرست) نے امام صادق(ع) سے سوال کیا کہ: "مِنْ اَیْنَ اَثْبَتَّ الْاَنْبِیَاءَ وَالرُّسُلَ؟" آپ انبیاء و رسل کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں؟ امام نے جواب میں مسئلہ توحید کو بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّا اَثْبَتْنَا اَنَّ لَنَا خَالِقًا صَانِعًا مُتَعَالِيًا عَنَّا وَعَنْ جَمِيعِ مَا خَلَقَ وَكَانَ ذٰلِكَ الصَّانِعُ حَكِيمًا مُتَعَالِيًا لَمْ يَجُزْ اَنْ يُشَاهِدَهُ خَلْقُهُ وَلَا يُلَامِسُوهُ فَيُبَاشِرَهُمْ وَيُبَاشِرُوهُ وَيُحَاجَّهُمْ وَيُحَاجُّوهُ

ثَبَتَ اَنَّ لَهٗ سُفَرَاءَ فِیْ خَلْقِهٖ يُعَبِّرُوْنَ عَنْهُ اِلٰى خَلْقِهٖ وَعِبَادِهٖ وَيَدُلُّوْنَهُمْ عَلٰى مَصَالِحِهِمْ وَمَنَافِعِهِمْ وَمَا بِهٖ بَقَاؤُهُمْ وَفِیْ تَرْكِهٖ فَنَاؤُهُمْ فَثَبَتَ الْاٰمِرُوْنَ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْحَكِيْمِ الْعَلِيْمِ فِیْ خَلْقِهٖ ... "

مختصر یہ کہ انبیاء و رسل کے ثابت کرنے کی بنیاد، اپنی تمام الٰہی شان و صفات کے ساتھ خود اللہ کے اثبات پر موقوف ہے جب ہم نے یہ جان لیا کہ ہمارا کوئی خالق و صانع ہے جو حکیم ہے اور ہم سے اعلیٰ و ارفع ہے یعنی ہم اپنے حواس و ادراک کے ذریعہ اس سے براہ راست ارتباط پیدا نہیں کر سکتے۔ نہ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور نہ اسے چھو سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے دو بدو سوال و جواب کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس کے محتاج ہیں کہ وہ ہماری راہنمائی کرے۔ کیونکہ فقط وہی حقیقی حکیم و دانا ہے اور ہمارے واقعی مصالح و مفادات سے آگاہ ہے۔ لہٰذا ایسے وجود کا ہونا ضروری ہے جو بیک وقت دو پہلوؤں کا حامل ہو: ایک طرف وہ خدا سے ارتباط رکھتا ہو یعنی اس پر وحی نازل ہوتی ہو اور دوسری طرف ہم اس سے رابطہ قائم کر سکتے ہوں۔ اور ایسے افراد کا ہونا لازم و واجب ہے۔

اس کے بعد امامؑ ان افراد کے بارہ میں فرماتے ہیں "حکماء مؤدبین بالحکمۃ" خود ان لوگوں کو حکیم و دانا ہونا چاہیئے، وہ حکمت کی بنیاد پر مؤدب و مہذب کئے گئے ہوں۔ "مبعوثین بھا" اور حکمت ہی پر مبعوث کئے گئے ہوں یعنی ان کی دعوت اور ان کا پیغام حکمت پر مبنی ہو۔ "غَيْرُ مُشَارِكِيْنَ لِلنَّاسِ عَلٰى مُشَارَكَتِهِمْ لَهُمْ فِی الْخَلْقِ" اگرچہ وہ خلقت کے اعتبار سے انسانوں میں شریک ہوں لیکن بعض جہات میں لوگوں سے الگ اور جدا ہوں۔ ایک انفرادی پہلو اور امتیازی روح ان میں پائی جاتی ہو۔ "مُؤَيَّدِيْنَ مِنْ عِنْدِ الْحَكِيْمِ الْعَلِيْمِ بِالْحِكْمَةِ" خدائے حکیم و علیم کی جانب سے حکمت کی بنیاد پر ان کی تائید کی گئی ہو۔ "ثُمَّ ثَبَتَ ذٰلِكَ فِیْ كُلِّ دَهْرٍ وَّمَكَانٍ" ایسے واسطوں اور ذریعوں کا وجود ہر زمانہ اور ہر عہد میں لازمی و ضروری ہے۔ "لِكَيْلَا تَخْلُوَ الْاَرْضُ مِنْ حُجَّةٍ يَكُوْنُ مَعَهٗ عَلَمٌ يَدُلُّ عَلٰى صِدْقِ مَقَالَتِهٖ وَجَوَازِ عَدَالَتِهٖ" تاکہ زمین کسی وقت بھی ایسی حجت سے خالی نہ رہے جس کے پاس اس کی صداقت گفتار اور اس کی عدالت رفتار کے ثبوت میں کوئی علم (دلیل یا معجزہ) موجود ہو۔

زید بن علیؑ اور مسئلہ امامت

زید ابن علیؑ ابن الحسینؑ امام محمد باقرؑ کے بھائی ہیں اور صالح و محترم شخص ہیں۔ ہمارے ائمہؑ نے آپ کی اور آپ کے مجاہدانہ اقدام کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ جناب زید واقعاً خود اپنے لئے خلافت کے مدعی تھے یا صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور خود خلافت کے دعویدار نہیں تھے بلکہ آپ امام محمد باقرؑ کی خلافت کے خواہاں تھے۔ یہ بہر حال مسلم ہے کہ ہمارے ائمہؑ نے آپ کی تعریف و توصیف کی ہے اور آپ کو شہید کہا ہے۔ اور یہی ان کی عظمت کے لئے کافی ہے کہ: "مَضٰی وَاللّٰہِ شَہِیداً" "وہ شہید ہو کر دنیا سے اٹھے" لیکن بحث اس بات پر ہے کہ آپ خود اس مسئلہ (امامت) میں شبہ کا شکار تھے یا نہیں؟ جو روایت اس وقت میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خود اس سلسلہ میں شبہ میں مبتلا تھے۔ اب یہ بات کہ ایسا شخص اس مسئلہ میں شبہ کا شکار کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ایک دوسری بحث ہے۔

امام محمد باقرؑ کے ایک صحابی ابو جعفر احول بیان کرتے ہیں: جس وقت زید بن علی مخفی تھے انہوں نے میرے پاس پیغام بھیجا اور مجھ سے فرمایا کہ اگر ہم میں سے کوئی جہاد کے لئے قیام کرے تو کیا تم ہماری مدد کے لئے آمادہ ہو؟ میں نے جواب دیا اگر آپ کے پدر بزرگوار اور بھائی (حضرت امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ) اجازت دیں تو میں حاضر ہوں ورنہ نہیں۔ زید نے فرمایا، میں خود قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بھائی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیا اب بھی تم ہماری حمایت پر آمادہ ہو؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیوں؟ کیا تم ہمارے سلسلہ میں اپنی جان سے دریغ کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اِنَّمَا ھِیَ نَفْسٌ وَاحِدَۃٌ فَاِنْ کَانَ لِلّٰہِ فِی الْاَرْضِ حُجَّۃٌ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْکَ نَاجٍ وَالْخَارِجُ مَعَکَ ھَالِکٌ وَاِنْ لَا تَکُنْ لِلّٰہِ حُجَّۃٌ فِی الْاَرْضِ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْکَ وَالْخَارِجُ مَعَکَ سَوَاءٌ " میں ایک ہی جان رکھتا ہوں اور آپ بھی حجت خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اگر زمین پر آپ کے علاوہ کوئی حجت خدا ہے تو جو شخص آپ کے ساتھ قیام کرے اس نے خود کو ضائع کیا بلکہ ہلاک ہوا اور جس نے آپ سے انکار کیا

اس نے نجات پائی لیکن اگر زمین پر کوئی حجت خدا نہ ہو تو میں چاہے آپ کے ساتھ قیام کروں یا نہ کروں دونوں باتیں برابر ہیں ۔

ابو جعفر احول جانتے تھے کہ زید کا مقصد کیا ہے ۔ لہٰذا وہ اس حدیث کے ذریعہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر ایک "حجت" موجود ہے ۔ اور وہ آپ کے بھائی امام محمد باقرؑ ہیں ۔ آپ نہیں ہیں ۔ یہاں روایت میں حضرت زید کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی جبکہ میں امام کا فرزند ہوتے ہوئے اس نکتہ سے واقف نہیں ہوں اور میرے پدر بزرگوار نے بھی مجھے نہیں بتایا ؟ کیا میرے بابا مجھے چاہتے نہیں تھے ؟ خدا کی قسم میرے بابا مجھے اس قدر چاہتے تھے کہ مجھے بچپن میں دستر خوان پر اپنی آغوش میں بٹھاتے تھے اور اگر نوالا گرم ہوتا تھا تو پہلے اسے ٹھنڈا کرتے تھے اس کے بعد کھلاتے تھے تاکہ میرا دہن نہ جلنے پائے وہ باپ جو مجھ سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ ایک لقمہ کے ذریعہ میرا دہن جلنا گوارہ نہ تھا ۔ کیا اس نے اتنی اہم بات جسے تم سمجھے ہو ، مجھے بتانے سے مضائقہ کیا تاکہ میں جہنم کی آگ سے محفوظ رہوں ؟ (ابو جعفر احول نے) جواب دیا ۔ انہوں نے آپ کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہی نہیں بتایا ۔ چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے تھے اس لئے آپ کو نہیں بتایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر میں کہہ دوں گا تو آپ انکار کریں گے اور جہنمی ہو جائیں گے چونکہ وہ آپ کی طبیعت کی تیزی سے واقف تھے لہٰذا آپ سے بتانا نہیں چاہا ۔ اور یہی بہتر سمجھا کہ آپ لاعلمی کی حالت پر باقی رہیں تاکہ کم از کم آپ میں عناد نہ پیدا ہونے پائے ۔ لیکن یہ بات مجھ سے فرمادی تاکہ اسے قبول کرکے نجات حاصل کرلوں یا انکار کرکے جہنمی بن جاؤں .... اور میں نے بھی اسے قبول کرلیا ۔

اس کے بعد میں نے زید سے دریافت کیا : "اَنۡتُمۡ اَفۡضَلُ اَمِ الۡاَنۡبِیاء" آپ افضل ہیں یا انبیاء ؟ فرمایا انبیاء ۔ "قلتُ یَقولُ یعقوبُ لِیُوسُفَ یابُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُؤیاكَ عَلیٰ اِخۡوَتِكَ فَیَكِیۡدُوا لَكَ كَیۡداً" میں نے عرض کیا یعقوبؑ جو پیغمبر ہیں اپنے بیٹے یوسفؑ سے جو خود بھی پیغمبر اور ان کے جانشین ہیں ، کہتے ہیں کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ۔ آیا یعقوبؑ کا یہ حکم یوسفؑ کے بھائیوں سے دشمنی کی بنا پر تھا یا ان کی اور یوسفؑ کی دوستی کی بنیاد پر تھا چونکہ وہ یوسفؑ کے بھائیوں کی طبیعت سے واقف تھے کہ اگر وہ سمجھ گئے کہ یوسفؑ اس مقام منزلت

پر فائز ہونے والے ہیں تو ابھی سے ان کی دشمنی پر کمر بستہ ہو جائیں گے"۔ آپ کے ساتھ آپ کے پدر بزرگوار اور بھائی کا قصہ بالکل یعقوبؑ و یوسفؑ اور ان کے بھائیوں جیسا ہے۔

گفتگو کے اس مرحلہ پر آ کر زید بالکل خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دے سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے فرمایا: "اَمَا وَاللّٰهِ لَئِنْ قُلْتَ ذٰلِكَ" "اب جبکہ تم مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو تو میں بھی تمہیں یہ بتا دوں کہ: لَقَدْ حَدَّثَنِیْ صَاحِبُكَ بِالْمَدِیْنَةِ" تمہارے آقا (یہاں مراد امام ہیں تمہارے امام یعنی میرے بھائی امام محمد باقرؑ) نے مدینہ میں مجھ سے فرمایا ہے: "اِنِّیْ اُقْتَلُ وَاُصْلَبُ بِالْكُنَاسَةِ" "کہ تمہیں قتل کیا جائے گا اور کناسہ کوفہ پر سولی دی جائے گی۔" "وَاِنَّ عِنْدَهٗ لَصَحِیْفَةً فِیْهَا قَتْلِیْ وَصَلْبِیْ" "اور ان کے پاس ایک صحیفہ (کتاب) ہے جس میں میرے قتل کئے جانے اور دار پر چڑھائے جانے کا ذکر ہے۔

یہاں زید، ابو جعفر کے سامنے ایک دوسرا ورق الٹتے ہیں کیونکہ یک بیک بات ایکدم بدل جاتی ہے اور وہ دوسرے نظریہ کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس سے قبل جو باتیں آپ ابو جعفر سے فرما رہے تھے گویا اس سے اپنے آپ کو پنہاں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ابو جعفر مسلمات کے سلسلہ میں اس قدر راسخ الاعتقاد ہیں تو خود سے فرمایا کہ ان کو بتا دوں کہ میں بھی اس نکتہ سے غافل نہیں ہوں۔ وہ کہیں شبہ کا شکار نہ ہوں، میں بھی اس مسئلہ کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ اس کا اعتراف و اعتقاد بھی رکھتا ہوں۔ گفتگو کے آخری جملہ میں اسی مطلب کا اظہار ہے کہ میں پورے علم و ارادہ کے ساتھ نیز اپنے بھائی کے حکم سے جہاد کے لئے اٹھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ (ابو جعفر) کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد ایک سال میں مکہ مکرمہ گیا اور وہاں میں نے یہ پورا واقعہ حضرت امام صادقؑ سے بیان کیا۔ حضرت نے بھی میرے نظریات کی تائید کی۔

حضرت امام صادقؑ سے دو اور حدیثیں

امامؑ ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: "اِنَّ الْاَرْضَ لَا تَخْلُوْ اِلَّا وَفِیْهَا اِمَامٌ" زمین کبھی بھی امام سے خالی نہیں رہتی۔ نیز حضرتؑ سے ایک اور حدیث نقل ہے: "لَوْ بَقِیَ اثْنَانِ لَكَانَ اَحَدُهُمَا الْحُجَّةَ عَلٰی صَاحِبِهٖ" اگر روئے زمین پر دو شخص بھی باقی رہیں تو ان میں

کا ایک اپنے ساتھی پر خدا کی حجت ہوگا۔

حضرت امام رضا سے ایک روایت

اس سلسلہ میں ہمارے یہاں بہت کی حدیثیں موجود ہیں۔ ایک مفصل روایت جو امام رضاؑ سے مروی ہے ملاحظہ فرمائیں۔ عبدالعزیز بن مسلم کا بیان ہے کہ: "کُنَّا مَعَ الرِّضَا عَلَیْہِ السَّلَام بِمَرْوٍ فَاجْتَمَعْنَا فِی الْجَامِعِ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فِی بَدْءِ مَقْدَمِنَا" ہم مرو میں امام رضاؑ کے ہمراہ تھے (یہ اس سفر کی بات ہے جب امامؑ ولی عہدی کے سلسلہ میں خراسان لے جائے جا رہے تھے) جمعہ کے دن ہم مرو کی جامع مسجد میں بیٹھے تھے اور امام جماعت موجود نہیں تھا لوگ جمع ہو کر مسئلہ امامت پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ساری باتیں بیان کر دیں۔ امامؑ نے تمسخر آمیز تبسم فرمایا کہ آخر یہ لوگ کیا سوچتے ہیں؟! یہ لوگ دراصل موضوع (امامت) کو ہی نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: "جَھِلَ الْقَوْمُ وَخُدِعُوا عَنْ آرَائِھِمْ" یہ لوگ جاہل ہیں اور انہوں نے اپنے افکار و عقائد میں دھوکہ کھایا ہے خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو اس وقت تک نہیں اٹھایا جب تک دین کامل نہیں ہوا۔ اس نے قرآن نازل فرمایا جس میں حلال، حرام، حدود و احکام اور وہ تمام باتیں جن کی دین کے سلسلہ میں انسان کو ضرورت ہے سب بیان کر دیں اور اعلان کر دیا: "مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ" ہم نے اس کتاب (قرآن مجید) میں کسی بھی چیز کو نہیں چھوڑا ہے یعنی سب کچھ بیان کر دیا ہے (اس سے مراد حرام و حلال سے متعلق قرآن کے احکام اور انسانوں کے تمام فرائض ہیں) اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تلاوت بھی فرمائی: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" یعنی آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لئے اسلام سے راضی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت امام رضاؑ نے فرمایا "وَاَمْرُ الْاِمَامَۃِ مِنْ تَمَامِ الدِّیْنِ" اور مسئلہ امامت دین کو تمام و کامل کرنے والے مسائل میں سے ایک ہے۔ "وَلَمْ یَمْضِ حَتّٰی بَیَّنَ لِاُمَّتِہٖ مَعَالِمَ دِیْنِھِمْ" پیغمبرؐ اس وقت تک تشریف نہیں لے گئے جب تک انہوں نے

اپنی امت کے درمیان ہدایت کی نشانیوں کو بیان نہ کر دیا اور ان کے لئے دین کی راہ روشن نہ کر دی۔ "وَ اَقَامَ لَهُمْ عَلِيّاً عَلَماً" اور ان کے لئے علیؑ کو راہنما مقرر فرما دیا۔

مختصر یہ کہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ ہم نے کسی بھی امر کو فراموش نہیں کیا۔ اب یہ کہ کیا اس نے تمام جزئیات بھی ---- بیان کر دیئے ؟ یا نہیں " بلکہ فقط کلیات و اصول بیان کئے ہیں اور ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کی لوگوں کو ضرورت تھی ۔ ان ہی کلیات و اصول میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے (پیغمبر اکرمؐ کے بعد کے لئے) ایک ایسے انسان کا تعارف کرا دیا جو قرآن کی تفسیر اس کے معانی کی وضاحت نیز اس کے کلیات کی تشریح سے واقف ہے ۔ اس کا یہ علم اجتہاد کی بنیاد پر نہیں ہے۔ جس میں کچھ باتیں صحیح ہوں اور کچھ غلط (بلکہ وہ علم الٰہی کے ذریعہ ان چیزوں سے آگاہ ہے) اور حقیقت اسلام اس کے پاس محفوظ ہے ۔ پس قرآن یہ جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام چیزیں بیان کر دیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ۔ ہم نے کلیات کے ساتھ ساتھ جزئیات بھی بیان کر دیئے ہیں اور انھیں ایک " دانا " کے پاس محفوظ کر دیا ہے ۔ اور ہمیشہ اسلام سے آگاہ ایک شخص لوگوں کے درمیان موجود رہتا ہے ۔ " مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يُكْمِلْ دِينَهُ فَقَدْ رَدَّ كِتَابَ اللّٰهِ " اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خداوند نے اپنا دین کامل نہیں کیا تو اس نے قرآن کے خلاف بات کہی ہے اور جو بھی قرآن کو رد کرے کافر ہے ۔ " وَهَلْ يَعْرِفُونَ قدر الامامة و محلها من الامة فيجوز فيها اختيارهم " جو لوگ کہتے ہیں کہ امامت انتخابی ہے کیا وہ جانتے بھی ہیں کہ امام کے کیا معنی ہیں ؟ ان لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ امام کا انتخاب کسی سپہ سالار لشکر کے انتخاب کے مانند ہے ، جبکہ امام وہ ہے کہ (جس کی تعیین پر) قرآن فرماتا ہے کہ میں نے دین کامل کر دیا۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے جزئیات قرآن میں نہیں ہیں ، حقیقت اسلام اس (امام) کے پاس ہے ۔ کیا لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا شخص کون ہے کہ خود اسے منتخب کر لیں ؟ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کہا جائے کہ پیغمبر کا انتخاب ہم خود ہی کرتے ہیں !

" اِنَّ الْاِمَامَةَ اَجَلُّ قَدْراً وَ اَعْظَمُ شَاناً وَ اَعْلٰى مَكَاناً وَ اَمْنَعُ جَانِباً وَ اَبْعَدُ غَوراً مِنْ اَنْ يَبْلُغَهَا النَّاسُ بِعُقُولِهِمْ اَوْ يَنَالُوهَا بِآرَائِهِمْ ۔"

" امامت انسان کی فکری حدود سے اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اسے انتخابی قرار دیا جائے اسی مسئلہ کو انتخابی کہا جانا چاہیئے جسے لوگ واقعی طور پر تشخیص دے سکیں جن مسائل میں انسان خود تشخیص کی صلاحیت رکھتا ہے وہاں دین کبھی براہ راست مداخلت نہیں کرتا۔ اور بنیادی طور پر ایسے مسائل میں دین کی براہ راست مداخلت بالکل غلط ہے ۔ کیونکہ ایسی صورت میں سوال اٹھے گا کہ پھر انسان کی فکر و عقل آخر کہاں کام آئے گی ؟ جہاں تک انسانی فکر و عقل کا دائرہ ہے انسان خود انتخاب کرے لیکن جو بات عقل بشر کی حد سے خارج اور بالاتر ہے ۔ اس میں انتخاب کی گنجائش ہی نہیں ہے ۔ (امامت) قدر و منزلت کے اعتبار سے بہت بلند ، شان کے اعتبار سے بہت عظیم ، مرتبہ کے اعتبار سے بہت عالی ہے ۔ اس کی دیواریں ناقابل عبور ہیں اور وہ عقل و فکر کی حد سے باہر ہے " ۔ انسان اپنی عقل کے ذریعہ امام کو درک نہیں کر سکتے نہ اس تک اپنی آراء کے ذریعہ رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اپنے اختیار سے اس کا انتخاب کر سکتے ہیں ۔ " اِنَّ الامامَۃ خصَّ اللّٰہ عزَّ وَجَلَّ بِھا ابراھیمَ الخلیلَ بَعدَ النّبوّۃِ وَالخُلّۃ " اگر امامت کے حقیقی معنی سمجھنا چاہتے ہو تو یہ جان لو کہ (امامت) ان تمام مسائل سے الگ ہے جن کا آج لوگ اظہار کرتے ہیں کہ پیغمبر کا ایک خلیفہ و جانشین منتخب کریں ۔ لیکن یہ جانشین پیغمبر صرف لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرے ۔ امامت تو اصل میں وہ منصب ہے کہ ابراہیمؑ جیسا پیغمبر نبوت کے بعد اس تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اس منصب پر فائز ہونے کے بعد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خدا کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے " وَمِن ذُرِّیَّتِی " خداوندا میری ذریت میں سے کچھ افراد کو بھی یہ منصب عطا فرما ۔ ابراہیمؑ جانتے ہیں کہ یہ عظیم منصب ان کی تمام ذریت کو حاصل نہیں ہو سکتا ۔ جواب دیا جاتا ہے " لَا یَنَالُ عَھدِی الظّالِمِینَ " یہ وہ منصب ہے جو ظالم کو نہیں مل سکتا ۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے ؟ کیا ظالم ہر حال میں ظالم ہے چاہے ماضی میں وہ ظالم رہا ہو یا پہلے نیک اور صالح رہا ہو کیونکہ یہ محال ہے کہ ابراہیمؑ کہیں ، خدایا (یہ منصب) میری ذریت میں سے ظالموں کو عطا فرما ۔ پس بہرحال ان کی نظر میں آپ کی نیک اور صالح اولاد ہی رہی ہے ۔ چنانچہ خداوند عالم کی طرف سے جواب ملا کہ یہ منصب آپ کی ذریت میں سے ان کو عطا ہوگا جن کا ظلم سے سابقہ نہ رہا ہو ۔

"فَاَبْطَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ اِمَامَةَ كُلِّ ظَالِمٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَصَارَتْ فِي الصَّفْوَةِ" یہ منصب ان منتخب افراد میں ہے یعنی ذریت حضرت ابراہیمؑ میں اہل صفوۃ (منتخب اور بہترین) افراد کو عطا ہوا ہے۔ (صفوۃ یعنی مکھن کے مانند ایک ایسی چیز جسے شہد کا اوپر سے نکال لیتے ہیں اور وہی "زبدہ" کہلاتا ہے) "ثُمَّ اَكْرَمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى بِاَنْ جَعَلَهَا فِي ذُرِّيَّتِهِ اَهْلَ الصَّفْوَةِ وَالطَّهَارَةِ" اس کے بعد خداوند عالم نے امامت کو بندگی مکرم بنایا اور وہ اس عنوان سے کہ اسے) صفوۃ اور اہل طہارت یعنی ذریت ابراہیمؑ میں صاحبان عصمت کا حصہ قرار دیا۔ اس کے بعد امامؑ قرآن کی آیات سے استدلال فرماتے ہیں:

وَوَهَبْنَا لَهُ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَّكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِيْنَ
وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ[1]

اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ و یعقوبؑ جیسے فرزند عطا کیے اور ہم نے ان سب کو نیکوکار وصالح (نبی) قرار دیا۔ اور ان کو لوگوں کا ہادی و پیشوا قرار دیا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے تھے۔ اور ہم نے ان کی طرف نیک اعمال بجالانے کی وحی کی۔

قرآن مجید میں اس نکتہ پر کافی زور دیا گیا ہے کہ ذریت حضرت ابراہیمؑ کو منصب امامت سے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں: "فَمِنْ اَيْنَ يَخْتَارُ هٰؤُلَاءِ الْجُهَّالُ" آخر وہ مقام و منصب جو حضرت ابراہیمؑ کو نبوت کے بعد عطا ہوا، یہ نادان اسے آخر کس طرح انتخاب کرنا چاہتے ہیں؟ کیا بنیادی طور پر یہ منصب انتخاب کے ذریعہ حاصل بھی کیا جا سکتا ہے؟! "اِنَّ الْاِمَامَةَ هِيَ مَنْزِلَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِرْثُ الْاَوْصِيَاءِ" امامت دراصل مقام انبیاء اور میراث اوصیاء ہے۔ یعنی یہ ایک وراثتی امر و منصب ہے لیکن قانونی میراث کے عنوان سے نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ اس کی استعداد و صلاحیت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوئی ہے۔ "اِنَّ الْاِمَامَةَ خِلَافَةُ اللّٰهِ" امامت خلافت الٰہی ہے جو سب سے پہلے آدمؑ کو عطا ہوئی۔ "وَخِلَافَةُ الرَّسُوْلِ" اور خلافت پیغمبر ہے۔ اس کے بعد

۱۔ سورۂ انبیاء، آیت نمبر ۷۲۔ ۷۳

امام فرماتے ہیں: "اِنَّ الْاِمَامَةَ زِمَامُ الدِّیْنِ ..." امامت زمام دین، نظام مسلمین، صلاح و فلاح دنیا، عزت مسلمین، اسلام کی اصل و اساس اور اس کا بنیادی تنا ہے۔ "بالامامِ تمامُ الصَّلوٰۃِ وَالزَّکوٰۃِ وَالصِّیَامِ وَالْحَجِّ وَالْجِهَادِ ..." تا آخر۔ یعنی امام ہی کے ذریعہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد اور دیگر اسلامی احکام و اوامر کامل ہوتے ہیں۔

نتیجہ

مذکورہ بالا تمام باتوں سے ایک اساسی و بنیادی منطق ہمارے ہاتھ آتی ہے۔ ہاں اگر بالفرض کوئی اسے بھی قبول نہ کرے تو اور بات ہے۔ یہ منطق ان سطحی و معمولی مسائل سے بالکل الگ کہ اکثر متکلمین کی طرح ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد ابوبکر خلیفہ ہوئے اور علیؑ چوتھے خلیفہ ہوئے۔ آیا علیؑ کو پہلا خلیفہ ہونا چاہیئے یا مثلاً چوتھا؟ آیا ابوبکر میں امامت کے شرائط پائے جاتے تھے یا نہیں؟ اس کے بعد ہم شرائط امامت کو مسلمانوں کی حاکمیت کے عنوان سے دیکھنا اور پرکھنا شروع کریں۔ البتہ یہ بھی ایک بنیادی و اساسی مطلب ہے، اور شرائط حاکمیت کے اعتبار سے بھی شیعوں نے اعتراضات کئے ہیں اور بجا اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن اصولی طور پر مسئلہ امامت کو اس انداز سے بیان کرنا صحیح نہیں ہے کہ ابوبکر میں امامت کے شرائط پائے جاتے تھے یا نہیں۔ اصل میں خود اہل سنت بھی ان کے لئے اس منصب کا اقرار نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں اہل سنت کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمؑ و ابراہیمؑ سے لے کر حضرت رسولؐ اکرم تک خداوند عالم نے ان افراد سے متعلق انسان کے جتنے ماوراء الطبیعی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے آنحضرتؐ کے بعد تمام ہوگئے۔ پیغمبر اکرمؐ کے بعد اب تمام انسان معمولی اور ایک جیسے ہیں۔ اب صرف علماء ہیں جو پڑھنے لکھنے کے بعد عالم ہوتے ہیں اور ان سے کبھی غلطی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ یا حکام ہیں جن میں سے بعض عادل ہیں اور بعض فاسق۔ اب یہ مسئلہ امامت ان ہی کے درمیان دائر ہوتا ہے ــــ اب وہ باب جو ہمارے یہاں حجت الٰہیہ کے نام سے پایا جاتا ہے، یعنی وہ افراد جو عالم ماوراء الطبیعہ یا عالم بالا سے ارتباط رکھتے ہیں، (ان کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ) پیغمبر اکرمؐ کے بعد وہ بساط ہی لپیٹ دی گئی ہے۔

شیعہ جواب دیتے ہیں کہ (پیغمبر اکرمؐ کے بعد) رسالت کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اب کوئی دوسرا انسان کوئی نیا دین و آئین لے کر نہیں آئے گا۔ دین ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ہے اسلام۔ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن حجت اور انسان کامل کا مسئلہ اور اس کی ضرورت انسانوں کے درمیان ہرگز تمام نہیں ہوئی ہے، کیونکہ روئے زمین پر پہلا انسان اس طرح کا تھا اور آخری انسان بھی ان ہی صفات کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ اہل سنت میں صرف صوفیا کا طبقہ ایسا ہے جو ایک دوسرے نام سے ہی، اس مطلب کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے اہل سنت اگرچہ سوفی ہیں لیکن جیسا کہ ان کے بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے انہوں نے مسئلہ امامت کو اسی عنوان سے قبول کیا ہے۔ جیسے شیعہ مانتے ہیں۔

محی الدین عربی، اندلس کا رہنے والا ہے۔ اور اندلس وہ جگہ ہے جہاں کے رہنے والے نہ صرف سنی تھے بلکہ شیعوں سے عناد بھی رکھتے تھے اور ان میں ناصبیت کی بو پائی جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اندلس کو امویوں نے فتح کیا اور بعد میں برسہا برس وہاں ان کی حکومت رہی۔ اور چونکہ یہ لوگ بھی اہل بیتؑ کے دشمن تھے لہٰذا علمائے اہل سنت میں زیادہ تر ناصبی علماء اندلسی ہیں۔ شاید اندلس میں شیعہ ہوں ہی نہیں اور اگر ہوں گے بھی تو بہت کم اور نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔

بہرحال یہ محی الدین اندلسی ہے، لیکن اپنے عرفانی ذوق کی بنیاد پر وہ اس بات کا معتقد ہے کہ زمین کبھی کسی ولی یا حجت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ یہاں وہ شیعی نظریہ کو قبول کرتے ہوئے ائمہ علیہم السلام کے ناموں کا ذکر کرتا ہے، یہاں تک کہ حضرت حجتؑ کا نام بھی لیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے سن چھ سو کچھ ہجری میں حضرت محمدؑ بن حسن عسکریؑ سے فلاں مقام پر ملاقات کی ہے۔ البتہ بعض باتیں اس نے ایسی کہی ہیں جو اس کی ایک دم مذمت ہیں اور وہ بنیادی طور پر ایک متعصب سنی ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ اس کا ذوق عرفانی تقاضہ کرتا ہے کہ صوفیوں کے مطابق زمین کبھی کسی "ولی" (اور ہمارے ائمہؑ کے مطابق حجت) سے خالی نہیں رہ سکتی، اس مسئلہ کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ مشاہدہ و ملاقات کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ میں حضرت محمدؑ بن حسن عسکریؑ کی خدمت میں پہنچ چکا ہوں، اور اس وقت جبکہ ان کی عمر تین سو کچھ برسوں سے زیادہ ہو چکی ہے اور وہ مخفی ہیں، میں ان کی زیارت سے شرفیاب ہوا ہوں۔

انبیاء کے درمیان فرق کے اسباب (۴)

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں ارشاد ہے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى۔

یعنی: خداوند عالم نے تمہارے لئے ایسے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کی اس نے نوحؑ سے وصیت کی، اور اے رسولؐ وہی ہم نے آپ پر وحی کی صورت میں نازل کیا اور اسی کی ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ سے سفارش کی۔

اس آیت اور دوسرے بہت سے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام آسمانی ادیان کی اساس و بنیاد ایک ہی ہے اور پیغمبروںؑ کی دعوت و ہدایت کے اصول بھی باہم مشترک اور ایک ہی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر دور میں ان اصول کے نفاذ اور انھیں مقرر کرنے کے سلسلے میں انبیاء کا طریقۂ کار متفاوت اور جداگانہ رہا ہے۔ جملہ انبیاء کرام میں صرف پانچ بڑے پیغمبر ہیں یعنی حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ موسیٰؑ و عیسیٰؑ و حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو مستقل شریعت لائے اور حقیقتاً وہ "تشریعی نبوت" کے حامل رہے ہیں۔ جس کی طرف مذکورہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بقیہ پیغمبران ہی ادیان

کی تبلیغ ــــــ پر مامور کئے گئے تھے، اور ان کا فریضہ ان ادیان کے مطابق لوگوں کی ہدایت کرنا تھا یا انبیاء "تبلیغی نبوت" کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ ان بڑے انبیاء کرام کے درمیان بھی احکام، قوانین اور انداز تبلیغ و ہدایت کے لحاظ سے خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ جس کی چند جہات ہیں:

۱ــــــ ماحول نیز، احتیاج و ضرورت کی سطحوں اور لوگوں کی ذہنی و فکری استعداد کا فرق۔ یہ ایک ناقابل انکار پہلو ہے کہ انبیاء کرام لوگوں کی ہدایت کے لئے تشریف لائے، اس اعتبار سے قوانین و احکام کی نوعیت اور ارشاد و معارف کی سطح انسانی معاشرہ کی فکری سطح اور ماحول کی ضرورتوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ یہ بات طبیعی و فطری ہے کہ ــــــ قرون اولیہ یا ابتدائی زمانوں میں انسانوں کے باہمی اجتماعی روابط بہت محدود تھے اور اس کا اجتماعی و معاشرتی نظام کوئی وسعت یا پھیلاؤ نہیں رکھتا تھا۔ اس وجہ سے محدود و مختصر قوانین ہی اس کی زندگی کو ادارہ اور رو براہ کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے۔ یوں ہی معاشرہ میں مختلف آراء و خواہشات، افکار و عقائد رائج نہیں ہوئے تھے کہ ان کی اصلاح کے لئے بہت زیادہ ہدایات کی ضرورت ہوتی۔ افکار و روابط کی یہ وسعت، نئی نئی چیزوں کی شناخت، فطری عوامل سے سابقہ اور نت نئی ضرورتیں رفتہ رفتہ نئی ہدایت و رسالت کے اسباب فراہم کرتی رہیں، یہاں تک کہ آخرکار اسلامی دعوت کی شکل میں آخری و کامل تبلیغ و ہدایت کا ماحول سازگار اور اسباب فراہم ہوئے۔

۲ــــــ معاشرہ کے خودغرض اور مطلب پرست حکام، مذہبی علماء اور نادان پیروکاروں کے ذریعہ گزشتہ ادیان میں انحرافات و تحریفیں وجود میں آتی رہیں۔ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ سالہاسال کی طویل مدت میں ایک دینی معاشرہ کے اندر اغیار کے آراء و افکار کی آمیزش، اور نادانوں و صاحبان غرض کے ہاتھوں افسانوں، من گھڑت داستانوں اور خرافات کی ایجادات، ساتھ ہی دین کی اصل کتابوں میں ہونے والی تبدیلیاں اور اس کے باقی ماندہ آثار کی غلط و جاہلانہ توجیہات۔ خاص طور سے ان حالات میں جب کہ ابھی انسان اپنے دینی آثار کو محفوظ کرنے اور اس کی درست تدوین کرنے پر قادر نہ ہوا ہو، یہ دینی آثار و نوشتے آسانی کے ساتھ لوگوں کے حملوں کا نشانہ یا دوسرے حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح کچھ عرصہ کے بعد گزشتہ پیغمبر کے بتائے ہوئے صحیح اصول و قوانین کا معلوم کر لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں لازم ہے کہ ایک دوسرا پیغمبر آئے تاکہ

وہ ان انحرافات و تحریفات کے پہلوؤں سے لوگوں کو آگاہ کرے اور گزشتہ دین کو ان آلودگیوں سے پاک کرے۔ البتہ اسلام میں کامل طور سے یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ گزشتہ ادیان کے تحریف شدہ آثار کو عیاں کر دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اسلام کی دعوت کے آغاز کے دوران چونکہ انسان اپنے آثار کی تحریر و تدوین اور ان کی حفاظت پر قادر ہو چکا تھا لہٰذا مسلمانوں نے قرآن کو بلا کم و کاست اور بغیر کسی تغییر و تحریف کے محفوظ کر لیا ساتھ ہی رسول اکرمؐ اور ائمہؑ کے بہت سے اقوال و آثار آنے والی دنیا کے لئے بخوبی محفوظ کر لئے تھے چنانچہ اب کسی نئی دعوت یا کسی نئے پیغمبر کی آمد کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۲ ـــــــ مختلف انبیاءؑ کی آمد کے زمانہ میں گمراہیوں اور کج رویوں کی نوعیت میں فرق رہا ہے۔ مثلاً جناب موسیٰؑ اس معاشرہ میں تشریف لائے جو ذلت و اسارت، سماجی بے نظمی، طاقتور حکومت کے فقدان اور ظلم و ستم کی زندگی کا عادی ہو چکا تھا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان لوگوں کو عزت کی زندگی بسر کرنے، معاشرہ میں قوت و طاقت حاصل کرنے اور ظلم کے خلاف مبارزہ و جدوجہد کرنے کی دعوت دیں۔ اس وجہ سے جناب موسیٰؑ کی دعوت میں دنیا داری اور دنیاوی زندگی کے پہلو نیز خشونت و تندی کے آثار زیادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن جناب عیسیٰؑ خونخوار، جنگجو اور وسعت طلب حکام و سرداروں کی کشاکش اور طاقت آزمائی نیز مادیات کی طرف شدید جھکاؤ، دنیا پرستی اور اموال کی لوٹ مار کے ماحول میں لوگوں کی ہدایت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس وجہ سے آپ کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کو محبت و یگانگت، اپنے جیسے انسانوں سے الفت نیز مادیات سے کنارہ کشی زہد و تقویٰ اور معنویات کی جانب دعوت دیں۔ یہ اختلاف ماحول اور حالات کی گوناگونی کی بنیاد پر تھا جس سے انبیاء کی تبلیغ کے انداز اور روش ہدایت میں خاصا فرق پیدا ہو گیا۔ اور اسلام چونکہ پورے عالم بشریت کی ہدایت کے لئے آیا اور کسی قوم و علاقہ سے مخصوص نہیں ہے لہٰذا اس کی دعوت کی نوعیت، اس کے اصول اور روش ہدایت کسی ایک جہت اور پہلو کی حامل نہیں ہے بلکہ وہ تمام اقوام و امم میں ہر طرح کی ممکنہ گمراہی، کج روی اور افراط و تفریط پر ناظر ہے۔

اسلام جلوۂ الٰہی ہے ضرورت اجتماعی نہیں

حالات اور ماحول کے عین مطابق انبیاء کرامؑ کی دعوتوں اور تبلیغات کو دیکھ کر بعض

ماہرین سماجیات نے دعوت انبیاء کے سلسلہ کو ایک اجتماعی و معاشرتی ضرورت کہنا شروع کر دیا۔ ان کے خیال میں: برائیوں، ظلم وستم اور اقتصادی بنیادوں پر طبقاتی اختلافات سے آلودہ ایک ماحول اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ بعض صاحبان عقل و ہوش اور معاشرہ کا درد رکھنے والے افراد ان اختلافات کو دور کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھائیں۔ لوگوں کو اصلاح کی دعوت دیں۔ اس کے لئے ایک دین ایجاد کریں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے لوگوں کے اضطراب اور پریشانیوں سے فائدہ اٹھائیں اور اس طرح یہ لوگ انبیاء کرامؑ کی تمام تبلیغات کو انسانی و بشری اصلاح طلب دعوتوں و ہدایتوں کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ اگر انبیاء کرامؑ کی تبلیغات حالات اور ماحول کی ضرورتوں کے عین مطابق ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تبلیغات الٰہی اور غیبی نہیں ہیں کیونکہ جس طرح کائنات کے تمام تکوینی و فطری امور نظم و حکمت کی بنیاد پر استوار ہیں یہاں ہی شرعی اور دینی قوانین بھی کامل نظم و حکمت کی اساس پر مبنی ہیں۔ یعنی اگر انسان دعوت وہدایت کے محتاج ہیں تو جس قدر وہ ہدایت کے محتاج ہیں اسی کے مطابق قوانین و احکام ان کے لئے وضع ہوتے ہیں اور ان ہی کے مطابق محکم نظام کی طرف ان کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اس طرح اجتماعی ضرورتوں کا نظام بھی سنن الٰہیہ کے نظام کا ایک حصہ ہے۔ بنابرایں انبیاء کی یہ دعوتیں اور ہدایتیں مناسب و ضروری حالات میں الٰہی، اجتماعی ضرورتیں ہیں۔

حضرت ابراہیم (ع)

حضرت ابراہیمؑ آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے بابل کے ایک شہر "اور" میں پیدا ہوئے تھے۔ بابل کی سرزمین پر "نمرود بن کنعان" نام کا بادشاہ حاکم تھا وہ ظالم و خود خواہ تھا اور خود کو لوگوں کا خدا سمجھتا تھا۔ وہ لوگوں سے چاہتا تھا کہ اس کے فرمانبردار اور بندۂ بے دام بنیں اور صرف اسی کی اطاعت و ستائش کریں۔

اس سرزمین پر بت پرستی بھی رائج تھی اور معمولاً اس طرح کے حکام بت پرستی، سحر و جادو کے عقائد، معتقدات اور ان پرستاروں کے اثرات اور اسی طرح کے دوسرے خرافات کی زیادہ سے زیادہ ترویج کرتے ہیں، یا کم از کم اس طرح کے اوہام زدہ رواج سے لاتعلق رہتے ہیں۔ کیونکہ اس

طرح کے عقائد لوگوں کی جہالت اور معاشرہ کی فکری عقب ماندگی کا سبب بنتے ہیں اور عموماً موقع پرست افراد لوگوں کی جہالت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور لوگوں کی جہالت و کوتاہ فکری ان کے لئے ماحول کو زیادہ سازگار کرتی ہے۔ ایک طرف تو انسان چاہے یا ان چاہے طور پر۔ مذہبی احساسات اور دینی سرشت و جبلت رکھتا ہی ہے۔ اب اگر یہ احساسات پتھر، درخت، ستارے اور اسی کے مانند دوسری چیزوں کی طرف مائل ہو گئے تو پھر باقی اجتماعی، اقتصادی، قانون سازی اور دیگر اختیارات و فرائض خدایان زمین کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں اور ان کے تاخت و تاز کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں اور جب اس کے برخلاف لوگوں کے دینی احساسات ایک قادر و توانا، حاضر و ناظر اور رحمٰن و رحیم خدا کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ یعنی لوگ جب اس خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو خلقت کی ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجتا ہے اور انھیں جواب دہ قرار دیتا ہے، سب کو ایک برابر سمجھتا ہے اور آقائی و بندگی اور حاکمیت و نوکری کا تصور انسانوں کے درمیان سے دور فرما دیتا ہے تو ایسے دینی و فکری ماحول میں خود غرض اور ظالم افراد کی طاقت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اپنے منافع پر خطرات کے بادل منڈلاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے زمانہ میں بعض ایسے افراد تھے جو "زہرہ" ستارہ کو اپنا پروردگار سمجھتے تھے، بعض چاند کو اور بعض سورج کو معبود جانتے تھے۔ اس طرح کی پرستش و عبادت کا تصور علم نجوم کی ترقی اور لوگوں کے درمیان اس کے نفوذ اور انسانوں کے مقدرات پر سعد و نحس کی شکل میں ان کے اثرات کے تحت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آسمان کے بعض سیارے انسانوں کے معبود کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ خاص طور سے سورج جو نور و حرارت اور امید و حیات کا سرچشمہ ہے اور تاریکی و وحشت اور سردی و خاموشی کو روشنی و مسرت اور گرمی و جوش و ولولہ میں تبدیل کر دیتا ہے یا چاند جس سے پیدا ہونے والی ملائم روشنی اور شاعرانہ منظر خاص طور سے تیرھویں اور چودھویں راتوں میں تاریک صحراؤں اور بیابانوں کے اندر ایک الہام بخش ماحول اور نشاط آور کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ بھی ایک ایسے انسان کے لئے جو صد درجہ جاہل اور نادان ہے، دنیا جس کے لئے سراسر ابہام و اسرار ہے۔

بت پرستی اکثر قبائل کے افراد کے رئیس قبیلہ یا بزرگ خاندان کے شدید احترام کے باعث

بھی وجود میں آتی ہے۔ لوگ ان کے احترام میں یا ان کی یادوں کو تازہ رکھنے کے لئے ان کے مجسمے بناتے تھے اور یہی احترام رفتہ رفتہ خضوع وعبادت میں تبدیل ہو جاتا تھا ۔ اور آخر کار یہ کنوؤں یا غار کے پتھر جو کسی خاص شکل میں امید بخش یا خوف ووحشت سے دوری کے اسباب بن جاتے تھے البتہ دنیا میں انواع واقسام کے بتوں اور ہر ایک کے وجود اور ان کی پیدائش کے اسباب وعلل کی داستان بڑی مفصل ہے اور ان کے سلسلہ میں بڑی دلچسپ تحقیقات سامنے آئی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے مجاہدات

حضرت ابراہیمؑ نے ان تمام گمراہیوں کے خلاف اپنی جنگ کا آغاز کیا۔ ہم ان میں سے ہر ایک کی جانب صرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ نمرود : سورہ بقرہ کی آیت : ۲۵۸ میں ارشاد ہے : کیا تم نے اس شخص کا حال نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم سے ان کے رب کے بارہ میں بحث وحجت کی؟ وہ شخص جسے خداوند عالم نے ملک وحکومت عطا فرمائی تھی حضرت ابراہیمؑ سے یوں بحث وحجت پر اتر آیا کہ جب جناب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مار ڈالتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا : خدا آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ اس طرح وہ شخص جو کافر تھا اور حق سے انکار کرتا تھا مبہوت ومات رہ گیا۔ خدا ستمگاروں کی رہنمائی نہیں فرماتا۔"

حضرت ابراہیمؑ نے اس بحث میں سب سے پہلے موت وحیات سے استدلال کیا ہے۔ راز زندگی، دنیائے خلقت کے سب سے زیادہ حیرت انگیز اسرار ـــــ اور خدائے عالم کی بے پایاں قدرت کی بہترین نشانیوں میں سے ہے۔ لیکن نمرود نے اس عظیم استدلال کو ایک معمولی سے مغالطہ کے ذریعہ بے کار کر دیا۔ اس نے حکم دیا کہ دو قیدی لائے جائیں، پھر اس نے ایک کے قتل کا حکم دے دیا اور ایک کو آزاد کر دیا گویا اس نے اس کا اظہار کیا کہ ان لوگوں کی زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس نے ایک شخص کے آزاد کرنے کو زندہ کرنے اور ایک شخص کے قتل کا سامان فراہم کرنے کو زندگی لے لینے اور روح قبض کرنے کے تصور میں تبدیل کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے

مصلحت یہ دیکھی کہ اس سے عقلی اور علمی بحث کرنے کے بجائے ایک حسّی اور بالکل سامنے کی بحث کی جائے۔ چنانچہ آپ نے آفتاب کے طلوع کی بحث شروع کی نتیجہ میں نمرود فوراً ہی زیر ہوگیا۔ نمرود کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی منطقی بحثوں اور حق کی جانب دعوتوں کا یہ ایک نمونہ ہے۔

۲۔ ستارہ، ماہ اور خورشید پرست قوموں کے ساتھ : سورۂ انعام کی آیات ۷۶ تا ۷۹ میں ارشاد ہے : "جب شب تاریک ہوئی آپ نے ایک ستارہ دیکھا اور فرمایا یہ میرا پروردگار ہے لیکن جیسے ہی وہ غروب ہوا تو فرمایا میں اس خدا کو دوست نہیں رکھتا جو غروب ہوجائے۔ اور جب چاند کو روشن و تابناک دیکھا تو فرمایا یہ میرا پروردگار ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا تو فرمایا اگر میرا پروردگار میری ہدایت نہ کرے تو میں گمراہ ہوجاؤں۔ پھر جب (صبح کے وقت) آفتاب کو درخشاں و تاباں دیکھا تو فرمایا یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ لیکن جب وہ بھی غروب کر گیا تو فرمایا اے لوگو! میں اس شے سے بیزار ہوں جسے تم خدا کی ذات میں شریک قرار دیتے ہو۔ میں اپنا رخ اس خدا کی جانب کرتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ میں خلوص دل سے اس کی ستائش کرتا ہوں اور مشرکوں میں سے نہیں ہوں"

اس استدلال میں دشمن سے لوہا لینے کے لئے اول ایک مؤثر روش سے استفادہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بڑے آرام و آہستگی سے پہلے ظاہری طور پر مخالف کے عقیدہ کو قبول کر لیا گیا پھر اس عقیدہ کو کنڈم اور باطل کرنے کے لئے موقع و فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقدام کیا گیا ہے۔ دوسرے بحث کی بنیاد ان فرضی خداؤں کے غروب و زوال یعنی، تغیر و تبدل کمی و زیادتی اور ان کی حرکت پر رکھی گئی ہے۔ اور اس طرح کے امور خدا میں نہیں پائے جاتے کیونکہ خداوند عالم ابدی، حی و قیوم، کامل، لایتغیر و لایزال ہے۔

بڑے انبیاء (ع)

بحث نبوت کی تکمیل کے لئے لازم ہے کہ بعض انبیاء کرامؑ کی زندگی اور ان کی تبلیغات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔ نہ صرف نقل تاریخ کی صورت میں بلکہ ان انبیاء کرامؑ کے حقیقی چہرے نمایاں کرنے کی غرض سے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انسانی معاشرہ میں انقلاب

لانے اور اس کی اصلاح میں ان مقدس شخصیتوں کا کردار کتنا اہم رہا ہے۔ قرآن نے انبیاء کرام کی تاریخ بیان کرنے کا ایک خاص طرز اختیار کیا ہے۔ یہ کتاب خدا کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ کسی کی زندگی کا ذکر ابتدا سے شروع کرے اور بتدریج رونما ہونے والے تغیرات و انقلابات یا سفر اور مختلف اقدامات کا تذکرہ کرے۔ انبیاءؑ کے واقعات بیان کرنے کے سلسلہ میں قرآن کا مقصد اور اس کی غرض لوگوں کی ہدایت و بیداری اور ان کا نصیحت و عبرت حاصل کرنا، قوموں اور معاشروں کے انحرافات اور گمراہیوں کے نقطوں کا اظہار کرنا۔ ساتھ ہی انبیاءؑ کرام کے اصولی اقدامات اور ان کی دعوتوں کے اصول بیان کرتے ہوئے لوگوں کے افکار اور معاشرہ میں انقلاب لانے کے سلسلہ میں ان کے خدمات کا تذکرہ مقصود ہے۔

انبیاء کرامؑ کی تعداد بہت ہے اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں ان میں سے پانچ افراد مستقل شریعت و کتاب کے حامل تھے، چنانچہ یہاں ہم حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد (ص) کی زندگیوں کا مختصر تذکرہ پیش کرتے ہیں۔ آخر کے تین انبیاء تین عظیم دین دنیا میں لائے جو آج کی دنیا کے زندہ دین ہیں اور تین اسلامی، عیسائی اور یہودی معاشروں کی حیثیت سے تاریخ میں اہم کردار کے حامل رہے ہیں اور آج ان تینوں ادیان کے ماننے والوں کی بڑی تعداد پوری دنیا کے ساتھ موجود ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ ہم اس وجہ سے کریں گے کہ ابراہیمؑ ان بعد کے تینوں پیغمبروں کے جد ہیں، ساتھ ہی آپ نے جس توحید اور مناسک و مراسم کی دنیا کو دعوت دی تھی اسے بقیہ ادیان میں بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان عظیم ادیان یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت کی جڑیں دراصل دین حضرت ابراہیمؑ میں پائی جاتی ہیں۔

سامی انبیاء ـــ یہاں بحث یہ ہے کہ یہ بزرگ انبیاء جنھیں ہم جانتے ہیں اور دیگر انبیاءؑ کرامؑ جن کے اسماء دینی آثار و کتب میں ذکر ہوئے ہیں یہ سب کے سب کیوں صرف مشرقی ہیں اور وہ بھی مشرق وسطیٰ میں ہدایت کے لئے آئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے بابل میں حضرت موسیٰؑ نے مصر میں حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین میں اور حضرت محمدؐ نے مکہ میں ظہور فرمایا اور انبیاءِ بنی اسرائیل بھی سب کے سب ان ہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کیا زمین کے دوسرے خطوں

اور علاقوں میں انسان موجود نہ تھے جنھیں پیغمبر کی ضرورت ہوتی؟ جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اولاً قرآن مجید کے اعتراف کے مطابق اور انبیاء بھی ہوئے ہیں جن کے اسماء قرآن اور دینی کتب میں ذکر نہیں ہوئے ہیں۔ اور چند پیغمبروں کے نام اور ان کے حالات و تبلیغات کے ذکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انبیاء کی تعداد ان ہی تک محدود ہے۔ دوسرے یہ کہ مذکورہ انبیاء کرام کا سلسلہ ایک دوسرے سے باہم پیوستہ اور متعلق رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک نبی دوسرے کے دین کی تکمیل یا تبلیغ و ترویج کے لئے آیا ہے۔ یا اس معاشرہ کی اصلاح کے لئے آیا ہے جو گزشتہ پیغمبر کی ہدایت و تبلیغ کے بعد انحراف و گمراہی کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اسی طرح اس کے بعد کا پیغمبر گزشتہ معاشرہ کی دینی اصلاح و ہدایت کے لئے آیا ...۔ اس طرح چونکہ یہ سلسلہ باہم مربوط ہے اور آخر کار اسلام جیسے عالمی دین پر اس کا تسلسل تمام ہوتا ہے اور اسلام عالمی و ہمہ گیر ہونے کے ساتھ ساتھ گزشتہ سامی ادیان سے مرتبط اور ان کا ناظر بھی ہے اسی وجہ سے ان انبیاءؑ کے نام اور ان کی دعوتوں کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ۔ اصولی طور پر آثار قدیمہ کے تحقیقات کے مطابق انسانی تہذیب و تمدن کی پیدائش اور نشو و نما کا قدیم ترین گہوارہ مشرق کے ہی چند علاقے رہے ہیں۔ مثلاً کلدہ[1]، آشور[2]، مصر، عیلان، بابل، ہند و چین وغیرہ اگر کسی علاقہ یا خطہ میں تہذیب و تمدن کی پیدائش کا مطلب لوگوں کا اس نقطۂ ارضی پر اجتماع اور معاشرتی زندگی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی اجتماع کے قدیم ترین مراکز یہی علاقے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی خطۂ ارضی پر لوگوں کا اکٹھا ہونا، خاص کر جب ان کے امکانات زندگی میں وسعت پیدا ہو جائے اور لوگ زرق و برق اجتماعی زندگی شروع کریں تو یہ اسی بات کا باعث ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں اپنے روابط کو وسعت دیں، حقوق کی باتیں اٹھیں اور باہمی ٹکراؤ وجود میں آئے۔ ان سب باتوں کے پیش نظر یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ صحیح نظام قائم کرنے کے لئے عادلانہ قوانین و قاعدے وجود میں آئیں ایسی صورت میں انبیاء کرامؑ کا وجود اور ان کا ظہور ضروری ہو جاتا ہے بہر حال انبیاء کرامؑ کا ظہور انسانوں کے تمدن اور عظیم اجتماعات سے باہم منسلک و مرتبط رہا ہے۔

۱۔ کلدہ: قدیم بابل۔ دو نہروں کے درمیان واقع جنوبی علاقہ

۲۔ نہر دجلہ کے وسطی میدانی علاقہ کو آشور کہتے تھے

ادیان کے ظہور کا ماحول

انبیاء کرام اور ان عظیم ادیان کے بارے میں وضاحت کرتے وقت ہماری کوشش یہ رہے گی کہ ہر پیغمبر کے زمانہ کے ماحول پر اجمالی روشنی بھی ڈالی جائے، کیونکہ جب یہ بات روشن ہو جائے کہ اس ماحول میں کس طرح کے افکار و تعلقات اور کیسے عقائد و اعمال تھے تو اس روشنی میں ہم پیغمبر کی تبلیغ کی جہت کو بہتر طور پر درک کر سکتے ہیں۔ اور اس نبی نے معاشرہ میں جو اصلاح و تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان سے بخوبی آشنا ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی تحلیل بہتر طور پر انجام پا سکتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی

حضرت ابراہیمؑ کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کا سب سے اہم اقدام بت پرستوں کا مقابلہ تھا۔ آپ نے اپنی دعوت و تبلیغ اپنے اقربا اور خاندان کے افراد سے شروع کی۔ آپ جسے باپ کہہ کر پکارتے تھے (جو آپ کے چچا یا خاندان کے کوئی اور بزرگ تھے) ان سے فرماتے تھے:

"اے پدر بزرگوار آپ ایسی چیز کی عبادت و پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے۔ نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے، اور نہ آپ کی زندگی کی کوئی مشکل حل کر سکتی ہے؟ (سورۂ مریم۔ آیت ۴۲)۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۵۲ میں یوں ارشاد ہے: "جب ابراہیم نے اپنے باپ اور ان کی قوم سے کہا کہ یہ مجسمے کیا ہیں جن کی آپ لوگ تعظیم کرتے ہیں؟!" اس طرح کے استدلالات آپ کی زبان سے بہت نقل ہوئے ہیں اور ان استدلالات کی بنیاد یہ ہے کہ ہمیں بلاسبب اور بلاجہت اس بات کا معتقد نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی جاندار یا بے جان چیز ہماری زندگی پر اثرانداز ہوتی ہے جبکہ یہ چیزیں خود کچھ نہیں کر سکتیں۔

یہ جدوجہد آج بھی زندہ و پائندہ ہے اور اسے پوری دنیائے بشریت کے کانوں تک پہنچنا چاہیے تاکہ انسان بلاسبب درخت، کنوئیں، غار، نشان قدم، دریا، علم اعداد و ہندسہ، طلسمات اور جادو ٹونے وغیرہ کی تاثیر کا قائل نہ ہو اس طرح ایک طرف وہ زندگی کے حقائق و واقعیات سے اور دوسری طرف خالص

وہمہ گیرانداز میں خدائے واحد کی جانب توجہ سے دور نہ ہوجائے۔

آباء واجداد کی روش : اس سورۂ انبیاء کی ۵۲ ویں آیت میں ہے کہ جب جناب ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو بتوں کی پرستش پر سرزنش کی اور جواب میں ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان ہی بتوں کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا (اسی بنا پر ہم بھی بت پوجتے ہیں) تو ابراہیمؑ نے فرمایا کہ: "تم اور تمہارے آباء واجداد سب کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں، آزاد فکری، دوراندیشی اور واقع بینی کی آفات میں سے ایک آفت یہ بھی ہے کہ لوگ اپنے بزرگوں کے آثار اور عادات واطوار کو بے چون وچرا مان لیں اور ان کا اس لئے احترام کریں کہ چونکہ یہ بوسیدہ اور غلط رسمیں پرانے لوگوں کی یادگار اور آبائی سنتیں ہیں لہٰذا انھیں ہر حال میں ماننا اور تسلیم کرنا چاہیئے! حقیقتاً یہ اندھی تقلید جس زمانہ میں بھی رواج پائے بہت بڑی اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

منصوبہ کا آغاز

جب جناب ابراہیمؑ نے اپنے منصوبہ کا آغاز کیا اور قوم کو یکتا پرستی کی دعوت دی تو سرانجام مصلحت اسی میں دیکھی کہ بتوں کا قلع قمع کردیا جائے تاکہ فساد کا گھر ہی باقی نہ رہے۔ یہ خطرناک منصوبہ جس میں آپ کی جان کا بھی خطرہ تھا مکمل تدبیر کے ساتھ انجام پایا۔ اور بعض روایات کے مطابق جناب ابراہیمؑ نے اس کام کے سلسلہ میں تقیہ سے کام لیا۔ یعنی ماہرانہ انداز میں اپنے منصوبہ پر عمل کیا۔ نہ خوف زدہ ہوکر اس اقدام سے پیچھے ہٹے اور نہ اس راز سے کسی دوسرے کو آگاہ کیا۔ پوری موقع شناسی سے کام لیا تاکہ اقدام سے پہلے دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہوجائیں آپ نے بے دھڑک اپنا کام انجام دیا اور خطرات سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ لیکن ماہرانہ انداز میں اور کامیابی کے ساتھ صبر کیا یہاں تک کہ عید کا دن آپہنچا۔ لوگ شہر سے باہر جانے لگے اور آپ کو بھی دعوت دی۔ لیکن حضرت نے بیماری کا بہانہ کیا اور شہر میں ہی رک گئے۔ شہر سنسان ہوگیا اور آپ نے بلا کسی روک ٹوک کے بتوں کو توڑ ڈالا، کلھاڑا بڑے بت کے کاندھے پر لٹکا دیا اور اپنے گھر واپس ہولئے۔ جب لوگ واپس ہوئے اور انہوں نے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھا تو انھیں ابراہیمؑ کا خیال آیا۔ آپس میں کہنے لگے، سنا ہے کہ ابراہیمؑ نام کا ایک نوجوان بتوں کو برا کہتا ہے۔ جب آپ کو حاضر کیا گیا اور اس کام کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب دیا: یہ سب ان کے بڑے نے کیا ہے۔ اگر یہ بول سکتے

ہوں تو ان بتوں سے پوچھ لو۔ سب نے سر جھکا لیا اور کہنے لگے کہ تم جانتے ہو یہ بول نہیں سکتے ....
حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: پھر تم ایسے کی عبادت و پرستش کیوں کرتے ہو جو تمہیں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا ؟!! ..... جناب ابراہیمؑ نے نہ صرف پہلے اس راز سے کسی کو آگاہ نہیں کیا تھا بلکہ موقع کی تلاش میں تھے تاکہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔ یہاں تک کہ خود کو بیمار ظاہر کیا تاکہ ان پر شبہ نہ کیا جا سکے۔ اس کے بعد جب آپ نے بتوں کو توڑا تو ایسا ماحول ترتیب دیا تاکہ محاکمہ کے وقت اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور بعد میں جلدی اعتراف بھی نہیں کیا تاکہ پہلے خود دشمن سے شکست اور محکومیت کا اعتراف کرا لیں۔ اور آخر کار اس کے بعد بھی ہر طرح کے ظلم و ستم برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے اور چونکہ یہ عمل خدا کی راہ میں انجام دیا تھا لہٰذا کوئی ہچکچاہٹ آپ میں پیدا نہیں ہوئی۔ ایک بہت مہیب آگ آپ کے لئے روشن کی گئی اور اس میں آپ کو ڈال دیا گیا لیکن آگ سرد اور خاموش ہو گئی۔ حضرت ابراہیمؑ صحیح و سلامت رہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ سورۂ صافات میں جہاں اس واقعہ کا ذکر ہوا ہے وہیں اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہے: "وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ" (سورۂ صافات، آیت: ۹۹) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں اور وہ جلد ہی میری راہنمائی کرے گا۔ یعنی اس خطرناک واقعہ کے بعد آپ پھر فوراً ہی لوگوں کی ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ خطروں سے گھبرا کر لوگوں کی ہدایت سے باز نہیں رہے۔

مُردوں کا زندہ ہونا: سورہ بقرہ کی آیت: ۲۶۰ میں آیا ہے کہ "جناب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ خدا نے فرمایا: کیا تم روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آواز آئی کہ چار مختلف پرندوں کو پکڑ لو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہم ملا دو اور اس ملے جلے گوشت کے ٹکڑوں کا ایک ایک حصہ الگ الگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دو پھر انہیں آواز دو، وہ تمہاری طرف تیزی سے آئیں گے اور جان لو کہ تمہارا پروردگار غالب اور حکمت والا ہے"

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء کرام کی دعوت کی بنیاد توحید، قیامت پر ایمان اور عدل و انصاف پر استوار ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں جناب ابراہیمؑ کے لئے مُردوں کے زندہ ہونے کا منظر مجسم کیا گیا ہے۔ اصل واقعہ ایک قسم کا معجزہ ہے لیکن اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ موت کے بعد لوگوں کی زندگی

فقط روح کی شکل میں یا خواب وخیال کی صورت میں نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ جہت زندگی ہے یا دوسرے لفظوں میں معاد جسمانی ہے۔

کعبہ کی بنا

حضرت ابراہیمؑ کے عظیم اقدامات میں سے ایک خدا کے بندوں کے مرکز اجتماع، خانۂ توحید یعنی کعبۂ محترم کی بنا بھی ہے۔ چونکہ کعبہ قبلۂ اسلام ہے اور مسلمانوں کی سب سے بڑی مسجد یعنی مسجد الحرام وہیں ہے مسلمانوں کے سب سے اہم اجتماعی عمل یعنی حج کی انجام دہی کا مرکز بھی مکہ مکرمہ کی سرزمین ہے لہٰذا حضرت ابراہیمؑ اور امت اسلامی کے درمیان ایک گہرا رابطہ پایا جاتا ہے۔ مکہ اور کعبہ کی قطعی تاریخ کے مطابق اس شہر اور اس گھر کی بنیاد حضرت ابراہیم کے ہاتھوں پڑی ہے۔ اور اگر کبھی کعبہ اس کے قبل رہا بھی ہے تو یہ امر تاریخ کی روشنی میں پورے طور سے واضح نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ فلسطین کے گرد و نواح میں زندگی بسر کر رہے تھے گھریلو واقعات کی بنیاد پر یہ طے کیا کہ اپنی زوجہ ہاجرہ اور ان کے کمسن بیٹے اسماعیلؑ کو لے کر خدا کے حکم کے مطابق عرب کی جانب سفر کریں اور پہاڑوں کے درمیان اس خشک اور بے آب و گیاہ زمین پر، جہاں آج کل شہر مکہ ہے، انھیں رہنے کے لئے چھوڑ دیں اور خود واپس پلٹ جائیں جب جناب ہاجرہ نے پانی کی تلاش میں سات مرتبہ صفا و مروہ کے درمیان کی راہ طے کی اور آپ کو پانی نہ ملا تو اپنے بیٹے کے پاس آئیں لیکن وہاں چشمۂ زمزم کو ابلتے ہوئے دیکھا۔ رفتہ رفتہ اس چشمہ کے ارد گرد کے علاقے کے بادیہ نشین بسنے لگے اور چند سال بعد جب حضرت ابراہیمؑ اس قوم کی ہدایت اور وہاں قیام کرنے پر مامور ہوئے تو آپ نے اپنے بیٹے اسماعیل کی مدد سے خدا کے حکم کے مطابق کعبہ کی بنیاد رکھی۔

"جب ابراہیمؑ و اسماعیل خانۂ (خدا) کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے خدا کی بارگاہ میں عرض کرنے لگے: خداوندا (اس عمل کو) ہم سے قبول فرما لے شک تو سننے والا اور دانا ہے" (سورہ بقرہ/۱۲۷) ابراہیمؑ نے اس گھر کی تعمیر کی تاکہ لوگ اس سرزمین پر خدا کی عبادت و پرستش کریں اور یہ گھر لوگوں کے اجتماع کا مرکز قرار پائے جیسا کہ سورۂ ابراہیمؑ کی ۳۷ ویں آیت میں خود حضرتؑ کی زبانی ارشاد ہے: "پروردگارا میں نے اپنے خانوادہ کو اس بے آب و گیاہ زمین پر تیرے محترم گھر کے قریب لا چھوڑا ہے تاکہ یہ لوگ نماز ادا کریں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے تاکہ اس سرزمین پر آ کر آباد ہوں اور مختلف پھلوں اور میوں کو ان کا رزق قرار دے تاکہ یہ لوگ تیرا شکر ادا کریں"۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جناب ابراہیم نے نہ صرف مختلف قسم کے بت پرستوں کے خلاف جہاد کیا اور بت خانہ کو تاراج کیا بلکہ خدا پرستی کے لئے ایک مرکزی بنیاد بھی رکھی اور لوگوں کو بے جان خداؤں اور زندہ و نندہ خداؤں کو چھوڑ کر خداوند کائنات کے روبرو تسلیم ہونے کی دعوت بھی دی۔ اور خود بھی تسلیم و رضا اور ایثار و وفا کی منزل میں کمال کی آخری حد تک ثابت قدم رہے۔ آپ نے نہ تنہا اپنے آپ کو آگ کے حوالہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور اپنی جان کو خدا کی راہ میں فدا نہ سمجھا بلکہ آپ اس عظیم امتحان سے بھی کامیابی اور سربلندی کے ساتھ گزر گئے جو اسی مکہ میں آپ کے فرزند کے سلسلہ میں پیش آیا۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ اسماعیل کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ یہ خواب آپ نے تین مرتبہ دیکھا اور آخر کار یہ مسلم ہوگیا کہ یہ حکم خدا ہے۔ خدا کے گھر کی تعمیر اور لوگوں کو اس کی عبادت و پرستش اور حق کی جانب دعوت دینے کے ساتھ اس کے بندوں کو اس راہ میں قطعی اور یقینی کامیابی کے حصول کے راز سے بھی آگاہ کرنا چاہیئے۔ آپ کو ہر طرح کی بت پرستی کے خلاف جہاد اور ہر طرح کے ظلم و ستم سے مقابلہ کی راہ میں قربانی و فداکاری کے ذریعہ راہ کمال کی تعلیم دینی چاہیئے،

سورۂ صافات کی آیت ۱۰۲ میں ارشاد ہے: "جب ابراہیم اپنے فرزند کے ہمراہ قربان گاہ تک پہنچے تو فرمایا۔ بیٹا میں نے خواب دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، تمہارا کیا مشورہ ہے؟ بیٹے نے کہا: باباجان جس امر پر آپ مامور کئے گئے ہیں اسے انجام دیجئے انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ جب یہ دونوں خدا کے حکم کے آگے تسلیم ہوگئے ابراہیم نے اپنے بیٹے کی پیشانی خاک پر رکھی تاکہ اسے ذبح کریں کہ ہم نے انہیں ندا دی: اے ابراہیم تو نے خواب کو سچ کر دکھایا اور اپنا فریضہ انجام دے دیا، ہم نیکوکاروں کو یوں ہی جزائے خیر دیتے ہیں۔

جب ہم حج سے متعلق گفتگو کریں گے تو دیکھیں گے کہ کس طرح بہت سے اعمال حج مثلاً طواف نماز طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، اور قربانی وغیرہ اسی عظیم موحد اور خدا پرست انسان کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جناب ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ اسماعیل اور اسحاق خداوند عالم نے انھیں یہ دونوں بیٹے عالم پیری میں عطا فرمائے تھے چنانچہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۹ میں ارشاد ہے کہ ابراہیم فرماتے ہیں "خدا کا شکر کہ اس نے ایام پیری میں مجھے اسماعیل و اسحاق عطا کئے درحقیقت میرا پروردگار سننے والا اور دعا قبول کرنے والا ہے۔"

معاد

اعمال کا مجسم ہونا

تحریر: آیۃ اللہ شیخ حسین نوری

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

معاد کی اہم بحثوں میں سے ایک اعمال کی سزاؤں کا مسئلہ ہے چنانچہ بنیادی طور پر حشر و نشر اور مرنے کے بعد کی زندگی اسی مقصد کے تحت رکھی گئی ہے کہ انسان نے اپنی دنیوی زندگی کے دوران جو کام انجام دیئے ہیں ان کا "بدلہ" اس کو مل جائے لیکن اس سلسلہ میں سزاؤں کی جو ممکنہ صورتیں ہیں ان کا ایک جائزہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ آخرت میں اعمال کی جزا و سزا کی صورت اور عنوان کیا ہے کلی طور پر سزاؤں کو تین عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مقررہ سزائیں۔

۲۔ فطری سزائیں۔

۳۔ سزا کے طور پر خود جرائم کا مجسم ہو کر سامنے آنا۔

پہلی قسم جس کو ہم نے "مقررہ سزاؤں" سے تعبیر کیا ہے اس سے مراد برے اور ناپسند اعمال کی وہ سزائیں یا نیک اعمال کی وہ جزائیں ہیں جو قانون بنانے والے مقرر کرتے ہیں اور اچھے یا برے کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعمال کی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے جزائیں اور سزائیں معین کرتے ہیں مثلاً ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ مقررہ قوانین کی خلاف ورزی یا ناپسند امور کی انجام دہی کی صورت میں مقررہ مقدار میں کوڑے یا ایک مدت کے لئے قید یا ایک مقدار میں نقد جرمانہ اور تلوان

وغیرہ معین کرتے ہیں کیونکہ اس طرح کی سزائیں معاشرہ میں نظم وضبط قائم کرنے اور قانون کی رعایت نہ کرنے والوں کی گوش مالی کرنے اور ان کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لئے بے حد ضروری ہیں تاکہ مجرم اور قانون شکن افراد دوبارہ وہ کام انجام نہ دیں اور دوسرے افراد بھی اس سے عبرت حاصل کریں اور ان جرائم کے مرتکب نہ ہوں یا ان افراد کے لئے جو مفید اور پسندیدہ عمل انجام دیتے ہیں انعام اور تشویق کی صورتیں فراہم کرتے ہیں اور ان کو جزا دیتے ہیں کیونکہ یہ چیز بھی معاشرہ میں نظم وضبط قائم کرنے اور نیکوکاروں کو شوق و رغبت دلانے کے لئے ضروری ہے تاکہ ان میں اور دوسرے افراد میں ایسے کام انجام دینے کا شوق اور عادت پیدا ہو۔

اس قسم کی سزائیں تمام اقوام وملل اور دنیا کے تمام الٰہی وغیر الٰہی مکاتب ومذاہب میں موجود ہیں اور یہی چیز تمام انسانی معاشروں میں نظم وضبط کا باعث ہے۔

اب یہاں ایک بحث یہ پیش آتی ہے کہ اخروی دنیا میں مجازات یا سزائیں اور اچھے اعمال کی جزا وثواب یا بُرے کرتوتوں کی سزا و عقاب جو معین کئے گئے ہیں آیا اس قبیل کے ہیں؟ نیز یہ کہ ثواب وعقاب اور جنت وجہنم کا انسان کے اچھے اور بُرے اعمال کے ساتھ رابطہ آیا کس طرح کا مقرر اور طے شدہ رابطہ ہے جو تمام حاکموں پر حاکم، یوم آخرت کے مالک خداوند حکیم نے اپنے قانون عدل کی بنا پر مقرر کیا ہے اور اعمال وجزا کے درمیان کسی طرح کا تکوینی و تخلیقی رابطہ نہیں پایا جاتا یا اس کی نوعیت کچھ اور ہے؟ اس سوال کا جواب ان شاء اللہ بعد کی بحثوں سے واضح ہو جائے گا۔

دوسری قسم کی سزائیں، جن کو ہم نے فطری وطبیعی سزاؤں سے تعبیر کیا ہے، ان سے مراد یہ ہے کہ عمل ومجازات (یعنی عمل اور سزاؤں) کے درمیان علت ومعلول کا رابطہ پایا جاتا ہے، عمل کی حیثیت علت اور سزا کی حیثیت معلول یعنی عمل کے نتیجہ کی ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے بُرے اور ناخوشگوار اثرات اسی دنیا میں ان لوگوں پر ظاہر ومرتب ہو جاتے ہیں جنھوں نے وہ عمل بد انجام دیا ہے۔ شراب اجتماعی واقتصادی نقصانات کے علاوہ شرابیوں کے جسم وروح پر بھی مضر اثرات ڈالتی ہے یہ اعصاب میں خلل پیدا ہونے نیز جگر اور دوسرے نظام ہضم کو خراب ومتاثر کرنے کا باعث بنتی ہے اسی طرح فساد وفشار جنسی امراض کا سود خوری اقتصادی نابرابری کا اسراف وفضول خرچی فقر ومحرومیت کا اور زہر آلود اشیاء کا

استعمال موت کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف تقویٰ و پرہیزگاری بہت سے امراض سے محفوظ و مصئون اور صحت و سلامتی کا باعث بنتی ہے۔ صداقت و امانت معاشرہ میں اعتماد و اطمینان پیدا کرنے، دوسروں کے حقوق کی رعایت تظلم و ضبط بحال ہونے، طبّی اصولوں کی پابندی پاکیزگی و صفائی کے ساتھ ہی ساتھ جسم و روح کو سالم و تندرست رکھنے کا موجب بنتی ہے۔ اس قسم کی سزائیں جو اعمال و رفتار کا نتیجہ اور ردعمل ہوتی ہیں اس دنیا میں اس کی بے پناہ مثالیں موجود ہیں۔ مولانا روم نے اسی بات کو اپنے خاص انداز میں یوں نظم کیا ہے۔

این جہان کوہست و فعل ما ندا　　باز آید سوی ما از کُر صدا

یہ دنیا کوہ ہے جس میں عمل کی بانگ دیتے ہیں　　پلٹ کر کوہ سے ہم تک وہی آواز آتی ہے

یا نظامی گنجوی اسی بات کو یوں نظم کرتے ہیں ـ

بچشم خویش دیدم در گذرگاه　　که زد بر جان موری مرغکی راه
هنوز از صید منقارش نپرداخت　　که مرغ دیگر آمد کار او ساخت
چو بد کردی مشو ایمن ز آفات　　که واجب شد طبیعت را مکافات
سپهر آئینه عدل است و شاید　　که هر چ آن از تو بیند وانماید
مگر نشنیدی از فراش این راه　　که هر کو چاه کند افتاد در چاه
سرای آفرینش سرسری نیست　　زمین و آسمان بی داوری نیست

اسی چیز کو سعدیؔ شیرازی نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔

راه است و چاه و دیدهٔ بینا و آفتاب　　تا آدمی نگاه کند پیش پای خویش
چندین چراغ دارد و بیراهه میرود　　بگزار تا بیفتد و بیند سزای خویش

اس دنیا میں تو اس طرح کے اعمال و آثار کے بارے میں کسی حد تک ہم واقف ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا اخروی دنیا میں بھی اسی انداز کی طبیعی سزاؤں کا وجود ثابت ہے یا نہیں؟ آیا وہاں بھی اعمال و جزا کے درمیان علت و معلول کا رابطہ پایا جاتا ہے؟ یعنی "نیک اعمال علت اور ثواب و بہشت کی نعمتیں معلول اور ان کا نتیجہ ہوں، اسی طرح برے اعمال علت اور عذاب و جہنم اور جہنم کی اذیتیں معلول اور ان کا نتیجہ ہوں؟" مختصر یہ کہ ہم اس دنیا میں علت یعنی اعمال و رفتار

تو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن معلول یعنی ان اعمال و رفتار کے تحت اخروی دنیا میں مرتب ہونے والے نتائج کی نوعیت سے بے خبر ہیں، جبکہ خدا اور اس کے انبیاء و اولیاء ہم کو معلول اور نتائج کی کیت و کیفیت سے آگاہ کرتے ہیں اور بڑی تاکید کے ساتھ اعمال کے نتائج و آثار بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں

اس سوال کا جواب بھی انشاء اللہ آئندہ بحثوں میں روشن و واضح ہو جائے گا۔

اب رہیں تیسری قسم کی سزائیں جن کو ہم نے خود عمل کی شکل میں جزاؤں اور سزاؤں کے مجسم ہونے "سے تعبیر کیا ہے شاید آپ کو اس تعبیر پر حیرت ہو کہ کیسے ممکن ہے کہ خود عمل ہی بعینہ عمل کا نتیجہ یعنی خود جرم ہی سزا اور عمل خیر ہی جزا بن جائیں ؟ اور ان کے درمیان "عینیت " کا رابطہ بھی پایا جاتا ہو؟ لیکن یہ حیرت کی چیز نہیں ہے محققین اس بات کے معتقد ہیں اور انہوں نے اس کو "اعمال مجسم ہونے "کا نام دیا ہے وہ کہتے ہیں: قرآن مجید کی بعض آیتوں اور اسلامی روایتوں حدیثوں کی روشنی میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ "اعمال کے مجسم ہونے " پر دلالت کرتی ہیں، اور اعمال مجسم ہونے کی وضاحت کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام انسانی اعمال۔ نیک ہوں یا بد دو چہروں کے حامل ہیں :-

۱۔۔۔۔۔ دنیوی چہرہ

۲۔۔۔۔۔ اُخروی چہرہ

مثلاً نماز جو دین اسلام کا ایک عملی رکن ہے اس کا دنیوی چہرہ اسی شکل میں ہے جو نظر آتا ہے لیکن اخروی چہرہ جس میں یہ وہاں جلوہ نما ہوتی ہے بہت ہی دلکش و نورانی ہے۔ بہشت ہے اور بہشت کی نعمتیں ہیں، اس طرح روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ راہ خدا میں انفاق، احسان و ایثار خدا کی راہ میں جہاد و شہادت غرض یہ کہ تمام اعمال خیر دنیوی چہرے کے اعتبار سے وہی ہے جو ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں لیکن ان کے اخروی چہرے جن میں یہ وہاں جلوہ گر ہوں گے بہشت۔ حور و غلمان، قصر و نہریں اور دیگر بہشتی نعمتیں ہیں۔

جھوٹ اور فریب، ظلم اور زیادتی، خیانت اور حق کشی، دوسروں کے حقوق کی طرف سے بے توجہی اور بے اعتنائی خدا کی راہ میں مقدس جہاد سے غفلت اور اسی قسم کے دیگر وظائف کی طرف

سے بے توجہی و لاپرواہی غرض یہ کہ اعمال بد بھی دنیوی چہرے کے لحاظ سے یہی اعمال ہیں جو انجام دیئے جاتے ہیں لیکن ان کے اخروی چہرے بہت ہی مکروہ اور تاریک ہیں یعنی جہنم اور جہنم کے عذاب ہیں۔

ہم عصر علماء میں سے وہ لوگ جنہوں نے "اعمال کے مجسم ہونے" پر زور دیا ہے استاد معظم علامہ طباطبائی اور آیۃ اللہ شہید مطہری رضوان اللہ علیہما ہیں۔ اس نظریے کے قائل افراد کہتے ہیں کہ جزاء و سزا سے متعلق قرآنی آیتیں تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:۔

۱ـــــ وہ آیتیں جو صاف اور صریح انداز میں روز قیامت انسان کے 'اچھے یا برے' ہر طرح کے اعمال حاضر و موجود ہونے پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر شخص کے اعمال قیامت میں بعینہ سامنے آئیں گے۔

۲ـــــ وہ آیتیں جو روز قیامت جزاء یعنی اعمال کا اچھا یا برا نتیجہ خود اعمال کے مجسم ہونے کی صورت میں بیان کرتی ہیں۔

۳ـــــ وہ آیتیں جن میں نیک اعمال کی جزاء بہشت اور بہشت کی نعمتوں کی شکل میں اور برے اعمال کی جزاء جہنم اور جہنم کے عذاب کی صورت میں ذکر کی گئی ہیں۔

بالآخر ان تینوں قسم کی آیتوں کو باہم یکجا کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ روز قیامت اعمال کا بدلہ اور جزاء خود اعمال کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ یہ اچھے اعمال ہیں جو بہشت اور بہشت کی نعمتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ برے اعمال ہیں جو جہنم اور جہنم کے عذاب کی صورت میں ظاہر و مجسم ہوتے ہیں۔

بنابرایں، سب سے پہلے ان آیات کا مطالعہ ضروری ہے اس لئے اب ہم اس نظریہ کا جائزہ لینے کے لئے ان تینوں قسم کی آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

الف: ـــــ سب سے پہلے وہ آیتیں جو کہتی ہیں کہ روز قیامت انسانوں کے اعمال بعینہ ظاہر ہوں گے:۔

۱۔ "يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ اَمَدًا بَعِيْدًا۔" (سورہ آل عمران/۳۰)

"وہ دن جب ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال جو اس نے انجام دیئے ہیں اس کے سامنے آئیں گے اور وہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کے برے اعمال کے درمیان

لمبا فاصلہ ہو جاتا۔

۲۔ "وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا"

"اس روز لوگوں کے اچھے اور برے اعمال کی کتاب ان کے سامنے کھول دی جائے گی، گناہگار افراد نامۂ اعمال میں اپنی کارستانیاں دیکھ کر پریشان و خوفزدہ ہوں گے، اور اس عالم میں کہہ رہے ہوں گے: ہم پر وائے ہو یہ کس طرح کی کتاب ہے جس میں ہمارا کوئی بھی چھوٹا اور بڑا عمل نہیں چھوڑا گیا ہے سب کچھ جمع کر دیا گیا اور جو کچھ بھی انہوں نے انجام دیا ہے اپنے سامنے حاضر دیکھیں گے۔ (سورہ کہف ۴۹)

۳۔ "إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا أَحْضَرَتْ۔" (سورہ تکویر۔ آیت ۱۔۱۴)

اس وقت جبکہ سورج کی درخشانی زائل ہو جائے گی، جب ستاروں کی چمک ختم ہو جائے گی جب پہاڑ تیرتے نظر آئیں گے، بچہ دینے والی اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوگا، جنگلی جانور محشور ہوں گے دریا میں دھماکے ہوں گے، روحیں بدنوں کے ساتھ ملائی جائیں گی اور ان میں ارتباط پیدا ہوگا جن لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا گیا تھا ان کے بارے میں سوال ہوگا کہ کس گناہ کے تحت ان بچیوں کی جان لی گئی ہے؟ نامۂ (اعمال) باز ہوں گے۔ آسمان کی طنابیں اکھاڑ دی جائیں گی دوزخ بھڑکا دی جائے گی بہشت قریب کر دی جائے گی، ہر شخص سمجھ جائے گا کہ اس نے کیا چیز بھیجی ہے۔

استاد شہید مطہری نے اسی ذیل میں مندرجہ ذیل آیت بھی ذکر کی ہے:

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ" (سورہ حشر/۱۸)

"اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو اور اس کی فکر سے غافل نہ ہو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے کل کے لئے پہلے سے کیا بھیجا ہے اور خدا سے ڈرتے رہو اور اس کی طرف توجہ رکھو۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں: عجیب صاف و صریح اور قطعی لہجہ ہے حکم کے انداز میں کہتا ہے کہ ہر شخص دیکھے اس نے کل کے لئے کیا بھیجا ہے، بات پہلے سے بھیجنے کی ہے یعنی وہی چیز جو تم آج بھیج رہے ہو کل وہاں تمہارے سامنے آئے گی، لہذا قاعدے سے دیکھو کہ کیا چیز بھیج رہے ہو؟ اس انسان کی مانند جو سفر میں کچھ چیزیں خرید کر واپسی سے قبل وہ چیزیں گھر کے پتہ پر ڈاک سے روانہ کر دیتا ہے، اب اسے اطمینان رکھنا چاہیئے کہ جب سفر سے واپس ہوگا اور اپنے گھر پہنچے گا تو اسے ڈاک کے پارسل میں وہی چیزیں ملیں گی جو اس نے خود آمادہ کر کے روانہ کی ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ جو کچھ اس نے بھیجا ہے کسی اور چیز میں بدل جائے۔ اس آیت کریمہ میں دوبار کلمہ "اتَّقُوا اللّٰهَ" آیا ہے اور ان کے درمیان ایک مختصر سا جملہ "وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" ہے قرآن کریم میں شاید اس طرح کی مثال نہ ملے کہ جہاں اس مختصر سے فاصلہ کے ساتھ دوبار اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہو۔" (۱)

یہ چند آیتیں نمونہ کے طور پر ہم نے نقل کر دی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روز قیامت انسان کے اعمال من و عن اس کے سامنے آئیں گے۔ انشاء اللہ آئندہ مقالے میں ہم دوسری اور تیسری قسم کی آیتوں کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔

۱۔ عدل الٰہی۔ استاد شہید مطہری ص ۱۵۴۔

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ

أَرْبَعَةٌ لَا تُرَدُّ لَهُمْ دَعْوَةٌ، وَيُفْتَحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَيَصِيرُ إِلَى الْعَرْشِ:

دُعَاءُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهِ، وَالْمَظْلُومِ عَلَى مَنْ ظَلَمَهُ وَالْمُعْتَمِرِ حَتَّى يَرْجِعَ وَالصَّائِمِ حَتَّى يُفْطِرَ

(بحار الانوار جلد ۹۳ ص ۲۵۵)

رسول خدا نے فرمایا

چار آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی، آسمان کے دروازے ان کے لئے کھلے رہتے ہیں اور دعا عرش تک جاتی ہے: باپ کی دعا بیٹے کے حق میں، مظلوم کی بددعا ظالم کے لئے، عمرہ بجا لانے والے کی دعا واپسی تک اور روزہ دار کی دعا افطار تک۔

خدا کی معرفت

از حضرت محمد تقی مصباح یزدی
ترجمہ جناب سید ولی الحسن رضوی

پیش نظر بحث میں وارد ہونے سے قبل چند نکتوں کی طرف توجہ مبذول کرادینا بہتر ہے :-

(الف) کسی بھی وجود کی شناخت و معرفت مورد شناخت شے کے اعتبار سے دو صورتوں میں متحقق ہوتی ہے : شخصی معرفت ، اور کلی معرفت ۔ محسوسات کی شخصی معرفت حواس (آنکھ ناک ، کان ، زبان اور ہاتھ وغیرہ) کے ذریعہ حسی ادراک کی شکل میں حاصل ہوتی ہے اور غیر محسوسات کی شخصی معرفت علم حضوری و شہودی کی صورت میں امکان پذیر ہے لیکن محسوسات ہوں یا غیر محسوسات تمام موجودات کی کلی معرفت عقلی مفاہیم کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے لہذا یہ شناخت و معرفت دراصل موجودات کی کلی حقیقتوں اور ماہیتوں سے تعلق رکھتی ہے اور ان کی افراد و اشخاص کی جانب بالعرض نسبت دی جاتی ہے ۔

مثلاً انسان کی خود اپنے آپ سے آگاہی اور اپنی اندرونی قوتوں یعنی عزم و ارادہ ، اپنے آپ سے محبت اور اسی کی مانند قلبی عمل ورد عمل کی شناخت و معرفت شخصی و حضوری معرفت ہے ، اسی طرح وہ جو آوازیں سنتا ہے یا رنگ برنگی چیزیں دیکھتا ہے شخصی و حسی معرفت ہے ، لیکن حسن و حسین اور تقی و نقی کو ایک انسان یعنی ایک ایسے زندہ وجود کی حیثیت سے پہچاننا جس میں عقل و فکر کی قوت نیز تمام انسانی خصوصیات موجود ہیں ۔ کلی معرفت ہے جو بنیادی طور پر

انسان کی ماہیت و حقیقت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی حسن و حسین کی طرف بالعرض نسبت دی جاتا ہے ۔ اسی طرح جزئی بلکہ شخصی کی ایک ایسی قوت کے طور پر شناخت، جو نور و حرارت میں تبدیل ہوجاتی ہے .. بہت سی مادی تخلیقات کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے ، ایک کلی معرفت ہے جو بنیادی طور پر ایک کلی عنوان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی ایک مخصوص الکٹریسٹی کی جانب بالعرض نسبت دی جاتی ہے ۔

خداوند تبارک و تعالیٰ کے سلسلہ میں بھی دو طرح کی معرفت مقصود ہے :۔

١۔ حضوری معرفت : جو کسی بھی عقلی مفہوم کو واسطہ بنائے بغیر متحقق ہوجاتی ہے

٢۔ کلی شناخت : جو عقلی مفاہیم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور براہ راست ذات الٰہی سے تعلق نہیں رکھتی ۔ جو معرفتیں عقلی دلائل و براہین کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں وہ سب کی سب کلی و حصولی معرفتیں ہیں جن کا تعلق محض عقلی مفاہیم سے ہے لیکن اگر کسی کو شہودی و حضوری معرفت حاصل ہو، تو خود یہ معرفت ذہنی مفاہیم کو واسطہ بنائے بغیر حاصل ہونے والی معرفت قرار پائے گی اور شاید بعض آیات و روایات میں جس چیز کی طرف " رویت قلبی " کی تعبیر سے اشارہ کیا گیا ہے وہ یہی شہودی معرفت ہو ۔ اور شاید " خدا کو خود اس کے ذریعہ پہچاننا چاہیئے نہ کہ اس کی مخلوقات کے ذریعہ"(١) " اس سے بھی اسی عنوان کی معرفت مراد ہو اسی طرح کے اور بھی بہت سے مضامین روایات کے ٹکڑوں میں موجود ہیں ۔ (٢)

١۔ اصول کافی جلد اول باب " انہ لا یعرف الا بہ " ص ٨٥ مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

٢۔ جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے: کل ما میّزتموہ باوھامکم فی ادقّ معانیہ مخلوق مصنوع مثلکم مردود الیکم (محجۃ البیضاء) جلد اول ص ٢١٩ مطبوعہ مکتبۃ الصدوق (جو کچھ بھی تم اپنے وہم و خیال کے ذریعہ اس کے بارے میں سوچتے اور سمجھتے ہو اصل میں وہ تمہاری طرح خود تمہاری تخلیق و ایجاد ہے جو تمہاری طرف ہی پلٹتی ہے ۔) اسی طرح امام صادق علیہ السلام ایک طویل روایت کے ذیل میں فرماتے ہیں ۔ وَمَنْ زَعَمَ انہ یعبدہ بالصفۃ لا بالادراک فقد احال علی غایب ... ان معرفۃ عین الشاھد قبل صفتہ و معرفۃ صفۃ الغائب قبل عینہ (تحف العقول

اس نکتہ کی طرف توجہ اس لئے ضروری تھی کہ اس طرح ہمارے ذہن خدا کی معرفت سے متعلق آیات کے بارے میں پہلے سے ہی کوئی فیصلہ قائم کر لینے سے محفوظ رہیں گے اور ہم اس میزان پر تولے بغیر ان آیات کو کلی اور عقلائی معرفت پر حمل کرنے کے بجائے قرآنی نقطہ نظر کو جاننے میں زیادہ دقت نظر سے کام لیں گے شاید ان میں بعض آیتیں خداوند عالم کو دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے سے ربط رکھتی ہوں جو کہیں نیم آگاہانہ اور کہیں آگاہانہ صورت میں متحقق ہوتا ہے اور محض شخصی طور پر حضوری و شہودی معرفت کی نوعیت رکھتا ہے ۔

البتہ حضوری و شہودی معرفت قابل تعلیم و تعلم نہیں ہے کیونکہ تعلیم و تعلم الفاظ و مفاہیم کے ذریعہ میسر ہے اور اسی سے سننے اور غور و فکر کرنے والے کے ذہن میں ایک خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے ، علم حضوری نہ تو ذہنی مفاہیم و معانی کی مانند ہے نہ ہی دوسروں کی طرف نقل و انتقال کے قابل ہے . حتیٰ قرآن بیانات بھی خود بہ خود ہمارے اندر علم حضوری و شہودی نہیں پیدا کر سکتے . ہاں ان کے ذریعہ اس راہ کی نشان دہی ممکن ہے جس پر چل کر ہم خداوند متعال کے سلسلہ میں علم شہودی پیدا کریں یا اپنی نا آگاہانہ یا نیم آگاہانہ معرفت کو آگاہانہ معرفت کی سرحد تک پہنچا سکیں ۔ پس ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آیا قرآن کا ہدف و مقصد بس اتنا ہی ہے کہ خداوند متعال اور اس کے اسماء و صفات سے متعلق کلی معرفت ہمارے اندر پیدا کر دے یعنی وہی کام جو فلاسفہ اور متکلمین انجام دیتے ہیں یا اس سے ارفع و اعلیٰ کچھ اور مقصد بھی ہے ؟ اور وہ یہ کہ ہمارے دل خداوند عالم سے آشنا ہو جائیں اور خدا کی حضوری و شہودی معرفت کے سلسلہ میں قرآن ہماری رہنمائی کرے ۔

(ب) اسمائے الٰہی اور وہ الفاظ جو خداوند عالم کے لئے مختلف زبانوں میں بولے جاتے ہیں دو قسم کے ہیں ۔

کلامہ (ع) فی وَصفِ المحبّة لِأهلِ البَیت (ع) ۔

اور جس نے گمان کیا کہ (خداوند عالم کی) معنائے صفتی کے اعتبار سے عبادت کرے نہ کہ ادراک کی بنیاد پر ، پس اس نے اس کو غائب پر محمول کر لیا ..... بے شک حاضر و موجود کی معرفت اس کی صفت کی معرفت سے پہلے ہوتی ہے اور غائب کی صفت اس کی ذات سے قبل ہوتی ہے ۔

۱) ــــــ اسم خاص : وہ اسماء جو "اسم ذات" یا شخصی نام کے عنوان سے استعمال ہوتے ہیں۔

۲) ــــــ اسم عام : کچھ اسماء وہ ہیں جو صفات کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں ان کو اسم عام یا صفتِ عام کہتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی لفظ دونوں صورتوں سے استعمال ہو یعنی کبھی اسم خاص کے عنوان سے اور کبھی اسم عام کے عنوان سے مشترک لفظی کے طور پر استعمال ہو ــــــ چنانچہ فارسی یا اردو زبان میں "خدا" نیز اسی سے مشابہ مفہوم دوسری زبانوں ــــــ مثلاً انگریزی میں God - اسی قبیل سے ہے۔ (۱)

عربی زبان میں اسم "جلالہ" یعنی لفظ "اللہ" اسم خاص یا اسمِ ذات کے عنوان سے اور "الرحمٰن" ذاتِ خدا سے مخصوص "صفت خاص" کے عنوان سے استعمال ہوا ہے لیکن تمام اسماء و صفاتِ الٰہی کے لئے ایسا نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی جمعیں بھی بنتی ہیں اور غیر خدا پر بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے مثلاً رب سے ارباب، الٰہ سے آلھۃ، خالق سے خالقین اور رحیم سے رُحَماء و راحمین وغیرہ چنانچہ سورۂ توبہ کی ۱۲۸ ویں آیت میں "رؤوف" و "رحیم" کی صفتیں پیغمبر اسلامؐ کے سلسلہ میں استعمال ہوئی ہیں:

"..... بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" (ہمارا پیغمبر مومنین کے حق میں رؤوف و رحیم ہے)

(ج) اسم خاص ممکن ہے ابتدا میں ایک معین وجود کے لئے وضع ہوا ہو اور پہلے معنائے علم میں استعمال نہ ہوتا رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے "اسم ذات" کے عنوان سے استعمال ہونے سے قبل اسم عام یا صفت عام کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہو مثلاً محمد و علی جو پہلے بھی صفت کے عنوان سے استعمال ہوتے تھے۔ اس قسم کے اسماء بھی جب شخصی نام کے طور پر "اسم خاص" کی حیثیت حاصل کر لیں پہلی ہی قسم کے اسماء کے حکم میں آجائیں گے۔

۱۔ 'God' جب اسم خاص کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس کی ابتدا میں بڑا "G" لکھتے ہیں اور جب اسم عام کے عنوان سے استعمال کرتے ہیں تو اس کی ابتدا میں چھوٹا "g" استعمال ہوتا ہے۔

بنا برایں لفظ جلالہ یعنی " اللہ " چاہے اسم جامد ہو یا مشتق اب جبکہ اسم ذات " کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے اس کا معنیٰ ذات اقدس الٰہی کے سوا کچھ اور نہیں ہے لیکن چونکہ ذات احدیت قابل مشاہدہ نہیں ہے، لہٰذا اللہ کا مفہوم سمجھانے کے لئے ایک ایسے عنوان کی معرفی کرتے ہیں جو پروردگار عالم کی ذات سے مخصوص ہو مثلاً " ایک ایسی ذات جس میں تمام صفات کمالیہ جمع ہیں " ایسا نہیں ہے کہ اسم جلالہ یعنی لفظ " اللہ " ان مفاہیم کے مجموعہ کے لئے وضع ہوا ہو، چنانچہ اس لفظ کے مادہ اور ہیئت کے بارے میں کی جانے والی تحقیق، " اسم ذات " ہونے کے اعتبار سے، اس کے معنیٰ سمجھنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتی۔

لفظ " خدا " فارسی زبان میں اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ " خود آ " کا مخفف ہے اور تقریباً " واجب الوجود " کا مترادف ہے لیکن اس سے ملتے جلتے الفاظ مثلاً " خداوند " اور " کدخدا " وغیرہ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے اس کے لغوی معنیٰ " صاحب " و " مالک " کے معنیٰ کی شبیہ ہیں اور وہ معنیٰ جو عرف عام میں اس سے سمجھے جاتے ہیں خالق اور پیدا کرنے والے کے ہم معنیٰ ہیں۔

لیکن قرآن کریم میں خداوند عالم کے لئے سب سے زیادہ استعمال ہونے والی تعبیریں " اِلٰہ " اور " رب " ہیں۔ حتیٰ کلمہ توحید " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ " میں بھی لفظ " الٰہ " سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے: " اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ " (تمہارا خدا ہی اکیلا خدا ہے) یہ نہیں کہتا " خَالِقُكُمْ خَالِقٌ وَّاحِدٌ " (تمہارا پیدا کرنے والا ہی اکیلا پیدا کرنے والا ہے) یا لفظ " رب " کے سلسلہ میں سورۂ دخان کی آٹھویں آیت میں اعلان ہوتا ہے: " رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ " [(وہ) تمہارا مالک ہے اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد کا بھی مالک و رب ہے) اس اعتبار سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کلمات کے بارے میں ذرا تفصیل سے وضاحت دے دی جائے :-

کلمہ " اِلٰہ " فِعال کے وزن پر معنائے مفعول میں ہے (جس طرح لفظ کتاب، مکتوب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے) اور لغوی اعتبار سے معبود کے معنیٰ میں ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ لفظ " اِلٰہ " میں بھی بہت سے مشتقات کے مانند شائنیت و لیاقت کے معنیٰ ملحوظ رکھے گئے ہیں اس اعتبار سے اس کا ترجمہ پرستش کی شان رکھنے والا یا " لائق عبادت " کیا جا سکتا

ہے۔ بنابرایں کلمۂ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" میں صفت یا کسی متعلق کو مقدر یا پوشیدہ ماننے کی حاجت نہیں ہے۔ لفظ قرآن کے سلسلہ میں بھی یہی معنی ملحوظ رکھے جا سکتے ہیں، قرآن یعنی "مَا مِنْ شَأْنِهٖ أَنْ يُقْرَءَ" وہ (کتاب) جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے یا (پڑھنے کے لائق کتاب)

توضیح: مزید یہ کہ اگر لفظ "الٰہ" "پرستش کئے ہوئے کے معنی میں ہو تو کلمۂ توحید کا مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ" کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہوتی ہے جبکہ دنیا میں ایسے بہت سے اشخاص اور چیزیں ہیں جن کی عبادت ہوتی رہی ہے اسی مشکل سے بچنے کے لئے یہاں صفت یا ایک متعلق مقدر و پوشیدہ قرار دیتے ہوئے اس کے یوں معنی کئے جاتے ہیں کہ: اللہ کے سوا کوئی برحق، مورد عبادت قرار پایا ہے نہ قرار پائے گا، لیکن اگر کلمۂ اِلٰہ کا معنی "لائق عبادت" ہو اور اصطلاحی طور پر معنائے شائیت و لیاقت اس میں ملحوظ نظر رکھیں تو کسی صفت یا متعلق کو مقدر ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

اب یہاں ممکن ہے ایک دوسرا سوال پیش آئے کہ اگر کلمۂ "اِلٰہ" "لائق پرستش" کے معنی میں ہے، تو قرآن میں اس کی جمع کس بنیاد پر آئی اور اسے باطل خداؤں کے سلسلہ میں کیسے استعمال کیا گیا ہے؟ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں سامری کے گوسالہ کے بارے میں "إِلٰهَكَ" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے (آیت: ۹۷) اور سورۂ اعراف میں فرعونی معبودوں کو کلمۂ "آلِهَتَكَ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (آیت: ۱۲۷)

جواب یہ ہے کہ اس طرح کے اطلاقات، مخاطبین کے اعتقاد کے پیش نظر یا مشرکین کی زبان سے نقل ہوئے ہیں اور درحقیقت ان کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص یا وہ شئے جو کہنے یا سننے والے کے گمان میں لائق پرستش ہے۔ پس ان موارد میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں شان و لیاقت کا مفہوم ملحوظ ہے لیکن کہنے یا سننے والے کے اعتقاد و خیال کے بموجب (ایسا نہیں کہ واقعی طور پر قرآن ان کو لائق عبادت سمجھتا ہے)

اب رہا لفظ "رب" جس کا ترجمہ پروردگار کیا جاتا ہے دراصل "صاحب اختیار" کے معنی سے شباہت رکھتا ہے جیسا کہ اس کے استعمال کے موارد مثلاً "رَبُّ الْإِبِلِ" اور "رَبَّةُ الدَّارِ" سے پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ ممکن ہے "اشتقاق کبیر" کے رو سے یہ مادہ "رَبَا" سے مناسبت رکھتا ہو لیکن یہ عین "مربی" کے معنی میں نہیں ہے اور اس اعتبار سے اس کا

ترجمہ پروردگار کیا جانا دقیق ترجمہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا خداوند متعال کے سلسلہ میں اطلاق اس لحاظ سے ہے کہ وہ اپنی مخلوقات پر کامل اختیار رکھتا ہے اور ان کے امور میں تصرف اور انتظام کے لئے اس کو کسی کی تکوینی و تشریعی اجازت اور اذن کی احتیاج و ضرورت نہیں ہے۔ پس کسی کی ربوبیت پر اعتقاد کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود مستقل طور پر کسی دوسرے کی اجازت کی ضرورت کے بغیر اپنے بندوں کے تمام امور اور شعبۂ زندگی میں تصرف کا پورا حق رکھتا ہو یعنی وہ ہر شخص اور ہر شے کے منزل و مقام اور امور و معاملات کا اس طرح مالک ہو کہ اس کی اجازت کے بغیر اس پر تصرف کر سکے جیسے گھر کی مالکہ جس کو "رَبَّةُ الْعلو" کہتے ہیں، یا حضرت عبدالمطلب جنھوں نے خانہ کعبہ پر ابرہہ کے حملے کے مسئلہ میں فرمایا تھا: "اَنَا رَبُّ الْاِبِل۔۔۔" میں اونٹ کا مالک ہوں اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں خانہ کعبہ بھی ایک صاحبِ اختیار ذات کے ہاتھ میں ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔"

توحید ربوبی کے اعتقاد کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی وہ تنہا ذات ہے جو بلا شرکت غیرے مستقل طور پر اپنی مخلوقات (یعنی پوری کائنات) کے تمام امور و معاملات میں تصرف اور نظم و ضبط کا مجاز ہے اور اس کے لئے اس کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

"الٰہ" اور "رب" کے معنیٰ کے سلسلہ میں غور و فکر سے پتہ چلتا ہے کہ الوہیت ربوبیت کی مستلزم ہے کیونکہ عبادت و بندگی اسی کی نسبت انجام پا سکتی ہے جو پرستش کرنے والے کی نظر میں خود اس کے عقیدہ کے مطابق مالکیت و ربوبیت کے اعتبار سے کلی اختیار رکھتا ہو اور اپنے بندے پر پورا پورا حق تصرف رکھتا ہو اور اس کے نفع و نقصان کا مالک ہو۔

قرآن میں وجود خدا کی عقلی دلیل

قرآن کے اندر، خدا کی معرفت کے ذیل میں سب سے پہلا مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ آیا قرآن مجید میں خدا کا وجود ثابت کرنے کے سلسلے میں دلیلیں پیش کی گئی ہیں یا نہیں؟ بہت سے مفسرین خصوصاً وہ حضرات جنھوں نے علم کلام میں قدم رکھا ہے مثلاً فخرالدین رازی نے قرآن سے بہت سی آیتیں (منجملہ تقریباً وہ تمام آیتیں جو الٰہی تکوین سے متعلق آیتوں پر مشتمل

ہیں) وجود خدا کے اثبات پر مشتمل قرار دی ہیں اور ان سے ماخوذ نتائج کو براہین کی صورت میں پیش کیا ہے جن میں سے اکثر آیتیں " برہان نظم " پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کے مقابل مفسرین کا دوسرا گروہ ہے جو اس بات کا معتقد ہے کہ قرآن کریم نے وجود خدا کو استدلال کا محتاج نہ سمجھتے ہوئے اس کے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور وہ دلائل و براہین جن کا گروہ اول نے ادعا کیا ہے یا تو اثبات توحید اور نفی شرک سے متعلق ہیں یا یہ کہ بنیادی طور پر برہان کی صورت میں قرآن میں ذکر نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ مفسرین ہیں جنھوں نے قرآن کے بعض بیانات کو دوسرے مقدمات کے ساتھ ضمیمہ کر کے برہان کی صورت میں ڈھال لیا ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں کوئی صحیح اور مستند فیصلہ وسیع و دقیق تحقیق کا طالب ہے جس کا چھیڑنا اس مختصر بحث میں مناسب نہیں ہے اگرچہ پہلے گروہ کا استدلال جنھوں نے بہت سی آیات کو وجود خدا کی دلیل قرار دیا ہے مخدوش ہے لیکن جو کچھ ان دونوں اقوال کو جمع یا قریب کرنے کی دلیل کے عنوان سے کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ممکن ہے قرآن کریم نے براہ راست وجود خدا کے اثبات کی ضرورت نہ سمجھی ہو یا وجود خدا کو تقریباً بدیہی اور استدلال سے بے نیاز سمجھا ہو یا یہ کہ کسی قابل اعتنا منکر سے سامنا نہ ہوا ہو اور اس مسئلہ کا اٹھایا جانا ممکن تھا لوگوں میں وسوسہ پیدا کرے اس لئے اس کا چھیڑنا خلاف حکمت سمجھا ہو؛ لیکن بہرصورت قرآنی بیانات سے اس سلسلہ میں استدلال نکالے جا سکتے ہیں حتی یہ بھی بعید نہیں ہے خود قرآن نے بھی غیر مستقیم طور پر ان استدلالوں کو پیش نظر رکھا ہو۔ مثلاً اگر کسی آیت سے براہ راست توحید الٰہی کا اثبات ہوتا ہے لیکن غیر مستقیم طور پر وہ اصل وجود خدا کو بھی ثابت کرتی ہے یا کوئی آیت مشرکین یا پیغمبر اسلام کی نبوت کے منکرین کے مقابل دلیل و احتجاج میں وارد ہو لیکن ضمنی طور پر وجود خدا ثابت کرنے والی کوئی بات بھی بیان کردیتی ہے تو دونوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں پایا جاتا۔ نمونے کے طور پر سورۂ طور کی ۳۵ ویں آیت کو لے لیجئے جو پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے سے انکار کرنے والے کفار کے مقابل مقام احتجاج میں آئی ہے اس آیت میں کچھ سوالات ہیں جو استفہام انکاریہ کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے :۔

" اَمْ خُلِقُوا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ " (طور/۳۵)

آیا یہ لوگ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ لوگ خود اپنے خالق ہیں ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت صریحاً وجود خدا کو ثابت نہیں کرتی لیکن ضمناً اس سلسلہ میں اس آیت سے ایک بین دلیل قائم کی جا سکتی ہے اس طور پر کہ انسان یا تو بغیر کسی پیدا کرنے والے کے خود بخود وجود میں آگیا ہو، یا یہ خود ہی اپنا پیدا کرنے والا ہو یا پھر کوئی دوسرا اس کا پیدا کرنے والا ہو چونکہ پہلے دو مفروضوں کا باطل ہونا واضح ہے اور کوئی بھی عاقل اسے قبول نہیں کر سکتا پس ہم تیسرے فرض کو قبول کرنے پر مجبور ہیں کہ انسان کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔

یہ استنباط، اس بات پر مبنی ہے کہ آیت میں "شئ" کا مصداق "پیدا کرنے والا" ہو یعنی آیا یہ کفار بغیر کسی شئے کے کہ جو ان کی پیدا کرنے والی ہو پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود ہی اپنے کو پیدا کرنے والے ہیں؟ بدیہی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فرض صحیح نہیں ہے اور دونوں سوالوں کے جواب منفی ہیں پس انھیں ایک پیدا کرنے والے خدا کے وجود پر ایمان لانا چاہیئے۔ لیکن اس "شئ" کے مصداق کے سلسلہ میں دو احتمالات اور بھی دیئے جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ شئے سے مراد وہ پہلا "مادہ" ہو جس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے(۱) یعنی آیا یہ کفار بغیر کسی مادۂ قبلی کے خلق ہوئے ہیں؟۔ دوسرے یہ کہ "شئ" سے مراد "غرض وغایت" ہو یعنی کیا یہ لوگ بلا کسی مقصد کے پیدا ہوئے ہیں؟ مگر بظاہر یہ دونوں احتمالات آیت کے دوسرے ٹکڑے سے میل نہیں کھاتے یعنی آیا یہ لوگ خود اپنے آپ کو پیدا کرنے والے ہیں؟ جیسے سوال کے ساتھ یہ کہا جانا کہ آیا یہ لوگ بغیر کسی ماقبل مادہ کے یا بغیر کسی مقصد کے پیدا ہوئے ہیں؟" مناسب نہیں ہے بلکہ دوسرے ٹکڑے کے ساتھ یہی مطلب میل کھاتا ہے کہ "آیا یہ لوگ بغیر کسی پیدا کرنے والے کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ لوگ خود اپنے خالق ہیں؟" لیکن یہ سوال بعینہٖ اسی شکل اور الفاظ میں کیوں نہیں پیش کیا گیا کہ "اَلَيْسَ لَهُمْ خَالِقٌ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ" شاید اس میں یہ نکتہ مضمر ہو کہ ان کی مخلوقیت پر تکیہ کیا جائے "خُلِقُوْا" تا کہ ہر دو مفروضات کا باطل ہونا آشکار و واضح ہو جائے۔

۱۔ کیونکہ قرآن میں مِن کا استعمال مادی مفاہیم کے سلسلہ میں ہی ہوا ہے: مِنْ تُرَابٍ ... مِنْ طِيْنٍ ... وغیرہ۔

غائبانہ معرفت

بنابریں، ہم دیکھتے ہیں قرآن کریم نے وجود خدا کے موضوع کو ایک "مسئلہ" کے عنوان سے نہیں پیش کیا ہے" نہ ہی براہ راست اس کے لئے کوئی استدلالی بحث کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے ؛ لازمی طور پر ایسا بھی نہیں ہے کہ بالواسطہ یا ضمنی عنوان سے بھی اس ضمن میں کسی دلیل کی طرف اشارہ نہ کیا ہو یا کم از کم قرآنی مطالب سے ہی وجود خدا پر استدلال کے لئے مقدمات فراہم نہ ہوتے ہوں۔

ایک نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عقلی براہین، خواہ قرآن میں ہوں یا فلاسفہ اور متکلمین کے بیانات میں، خدا کے وجود کو ذہنی مفاہیم کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں اور ان کا نتیجہ ایک کلی وحصولی معرفت ہوتا ہے، مثلاً "برہان حرکت" ایک وجود کو دنیا کے لئے "محرک" کے عنوان سے لازم قرار دیتی ہے، برہان نظم - وجود خدا کو "ناظم عالم" کے عنوان سے اور دوسرے براہین خالق، صانع، واجب الوجود اور کامل مطلق کے عنوان سے ثابت کرتے ہیں اس کے بعد توحید کے براہین ثابت کرتے ہیں کہ یہ کلی عنوانات" ایک کے سوا دوسرا مصداق نہیں رکھتے، یعنی "خدا ایک ہے"۔ اسی طرح براہین صفات، اس کے صفات کمالیہ کو ثابت بھی کرتے ہیں اور صفات ناقصہ کی نفی بھی کرتے ہیں اور ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ "ایک ایسا وجود موجود ہے جو علم وقدرت وحیات کا حامل ہے اور زمان ومکان یا دوسری قسم کی محدودیت اس کے یہاں نہیں پائی جاتی وہی کائنات اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے" یہ ایک کلی عنوان کی معرفت ہے جو ذات واحد میں منحصر ہے اور ایک موجود، اور "اس" کی غائبانہ معرفت ہے۔

یہاں ایک سوال پیش آتا ہے کہ آیا شخصی وشہودی معرفت یا خدائے واحد کی نسبت علم حضوری کے بارے میں (اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ علم حضوری کے مراتب ودرجے ہوتے ہیں) قرآن کریم کچھ کہتا ہے یا نہیں؟ شاید اس سوال کا مثبت جواب آیہ فطرت اور آیہ میثاق میں مل جائے۔

خدا کی فطری معرفت

فطرت و میثاق سے متعلق آیات کے بارے میں کوئی بحث شروع کرنے سے پہلے بہتر ہے لفظ "فطرت" کے سلسلہ میں کچھ وضاحت کردی جائے۔ کلمۂ "فطرت" جو سرشت کے معنی میں بولا جاتا ہے "مصدر نوعی" ہے اور خلقت و آفرینش کی نوعیت پر دلالت کرتا ہے لیکن عام طور پر انسان کے سلسلہ میں ہی بولا جاتا ہے چنانچہ اسی چیز کو "فطری" کہتے ہیں جس کا خود خلقت انسانی کی نوعیت تقاضا کرے جو خداداد اور غیر اکتسابی ہو اور کم و بیش تمام افراد انسانی میں مشترک طور پر پائی جاتی ہو اور اس طرح اس میں انسان کی تمام خداداد بصیرتیں اور اس کے درونی احساس و رجحانات شامل ہیں۔ فطری بصیرتوں اور رجحانوں سے مراد غیر اکتسابی بصیرتیں اور رجحانات ہیں، قدرتی طور پر جو چیز اکتسابی نہیں ہے تمام انسانوں میں ان کی خلقت اور سرشت کے تقاضوں کے تحت پائی جاتی ہے۔ پس فطری امور کی خاصیت یہ ہے کہ اولاً وہ اکتسابی نہیں ہوتے۔ ثانیاً وہ تمام افراد انسانی میں موجود ہوتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہیں کم ہوں کہیں زیادہ۔ ضمناً یہ بھی پتہ چلا کہ ہم لفظ "فطری" دو موارد میں استعمال کرتے ہیں ایک تو ادراک و آگاہی و بینش و بصیرت کے سلسلہ میں دوسرے میل و رغبت اور احساس و رجحان کے سلسلہ میں، فطرت کا استعمال تمام ادراکات یعنی جو چیز آگاہی و معرفت سے تعلق رکھتی ہے اس کے ذیل میں بھی ہوتا ہے اور خواہش و ارادے سے متعلق چیزوں کے سلسلہ میں بھی ہوتا ہے۔ فطری میلان، فطری رجحان اور فطری خواہش اس میل و رغبت اور جذبہ و خواہش کو کہتے ہیں جو خود انسانی سرنوشت میں موجود ہو خارجی دنیا سے کسب نہ کی گئی ہو۔ مختصر یہ کہ یہ کسبی نہیں ہے بلکہ اس کا خود انسانی فطرت و آفرینش تقاضا کرتا ہے

خدا کی معرفت، خدا کی عبادت اور توحید کے سلسلہ میں کلمۂ فطری کا کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے کبھی کہتے ہیں خدا کی معرفت فطری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر خود اس کی خلقت کے ساتھ خداوند عالم کی نسبت ایک قسم کی معرفت پائی جاتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں خدا کی جستجو فطری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خود انسان کی فطرت میں خدا کی جانب میلان

موجود ہے جو اس کو اس کی معرفت اور عبادت پر آمادہ کرتی ہے۔ اس منزل میں جب ہم کہتے ہیں خدا کی جستجو فطری ہے تو یہ چیز "معرفت" کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ "میلان" کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ خدا کی جانب قلبی میلان اور قلبی کشش ہر شخص میں موجود ہے جو اس کو خدا کی جستجو پر آمادہ کرتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں خدا کی عبادت فطری ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود انسان کے اندر ایک خواہش موجود ہے جس کا تقاضا ہے خدا کے سامنے فروتنی اور احترام کا اظہار کرے یہ وہ خواہش ہے جس کو خدا کی عبادت کے سوا کسی اور چیز سے تسکین نہیں ملتی مگر یہ کہ خدا کے متبادل کوئی اور شئے ہو۔ جیسا کہ دوسری تمام فطری خواہشات کے لئے تسکین کی متبادل صورتیں موجود ہیں۔ علم نفسیات میں ان مسائل پر بحث و تحقیق کا کام انجام دیا گیا ہے کہ جب انسان کی فطری خواہشات کی صحیح اور طبیعی صورت میں تسکین نہیں ہوتی تو وہ متبادل ذرائع سے تسکین حاصل کرتا ہے خدا کی فطری عبادت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کی عبادت کا میلان پایا جاتا ہے اور جب تک یہ خواہش، چاہت اور میلان بیدار اور زندہ رہتا ہے سوائے خدا کی عبادت کے کسی اور ذریعے سے اس کی تسکین نہیں ہوتی چونکہ یہ مفہوم دیگر مفاہیم کی نسبت ذہن سے نسبتاً قریب نہیں ہے۔ اس لئے اس کی تھوڑی توضیح ضروری ہے اس کے بعد ہم اصل موضوع پر بحث کریں گے۔

عبادت کیوں؟

شاید وہ سبھی افراد جو اپنے دل میں کسی کی محبت محسوس کرتے ہیں (خصوصاً اگر جذبہ شدید ہو) تو انہوں نے احساس کیا ہوگا کہ جب وہ اپنے محبوب کے پاس پہنچتے ہیں تو دل یہی چاہتا ہے کہ اس کے تئیں کسی بھی طرح عقیدت کا اظہار کریں۔ یہ وہ چاہت ہے جس کے لئے کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی کہ کیوں محب اپنے محبوب کے سامنے فروتنی کا اظہار چاہتا ہے۔ مثلاً کبھی سر جھکا کر، کبھی ہاتھ یا پاؤں کا بوسہ لے کر، اس کا دل چاہتا ہے خود کو اس کے مقابل چھوٹا بنا کر پیش کرے۔ یہ وہ خواہش ہے جس کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کی جا سکتی لیکن یہ ایک فطری جذبہ ہے جس کی اسی طرح تسکین ہوتی ہے یہ محبت جس قدر

خالص اور شدید ہوگی اسی قدر یہ جذبہ بھی شدید ہوگا یہاں تک کہ ایک منزل پر پہنچ کر گویا محب چاہتا ہے محبوب پر فدا اور قربان ہو جائے ، اسی فطری جذبہ کے شدید مرحلہ کو ہم عبادت اور پرستش کا نام دے سکتے ہیں ۔

وہ عشق جو پاک و خالص ہو اس کی منزل انتہا یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے مقابل خود کو فنا کر دینا چاہتا ہے خود کو اتنا چھوٹا اور حقیر بنا لیتا ہے گویا کچھ بھی نہیں ہے ۔ خداوند متعال کے تئیں اسی طرح کی خواہش پائی جاتی ہے ۔ وہ لوگ جو خدا کی معرفت حاصل کریں اور اس کی محبت ان کے دلوں میں بیدار ہو جائے ، اس طرح کی خواہش ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں خدا کے سامنے خضوع و عقیدت کا اظہار کریں ۔ اس لئے نہیں کہ اس کا عوض پیش نظر ہے بلکہ اصل میں خود محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے مقابل چھوٹا ظاہر کریں ، اس کی بندگی اور پرستش کریں ۔ اور ان کی اس خواہش کو صرف عبادت سے تسکین حاصل ہوتی ہے ۔ ان کے لئے خدا کی بندگی دیگر مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ خود مقصد ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ راتیں صبح تک جاگ کر مناجات میں بسر کرتے ہیں اور تھکن کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا دل چاہتا ہے یہ رات برسوں میں تبدیل ہو جائے اور وہ یوں ہی اپنے محبوب سے راز و نیاز کرتے رہیں ۔ آیا ایک عاشق جو مدت سے وصال معشوق کا منتظر رہا ہے اور مدتوں انتظار کے بعد اسے وصال کا لمحہ میسر آیا ہے کیا اس کی خواہش یہ ہوگی کہ پیسہ طلب کرے ، یا کسی مقام و منصب کا طالب ہو ؟ یا یہ کہ وصال محبوب ہی اس کا اصل مطلوب ہے ؟ اس مقصد کے حصول کی راہ میں عاشق ہر چیز قربان کر دیتا ہے مگر وہ جس نے خدا کو پہچان لیا ہو اور خدا کی محبت جس کے دل میں بیدار ہو گئی ہو۔ وہ خدا سے مناجات اور راز و نیاز کا عاشق ہے اور اسے سیری نہیں ہوتی ، عبادت میں اس کو وہ لذت ملتی ہے کہ ہر چیز فراموش کر بیٹھتا ہے ، بہر حال خدا کی فطری بندگی سے مراد وہ میلان و رجحان ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور چاہتا ہے کہ محبوب کے سامنے عقیدت و احترام کا اظہار کرے اور اس کی بندگی کرے ۔

یہاں خدا کی جستجو اور فطری بندگی کا محض ضمناً ذکر کر دیا گیا ہے ، خدا کی فطری معرفت کے سلسلہ میں آئندہ گفتگو ہوگی۔

حرفِ حق

اسلام اور اسلامی حکومت ایک الٰہی دین ہے جو اپنے نفاذ کی صورت میں فرزندانِ اسلام کے لئے دنیا و آخرت کی سعادت کے اسباب بہترین طریقہ سے فراہم کر سکتی ہے اور اس میں اتنی قدرت و توانائی موجود ہے کہ ہر طرح کی جارحیت، فساد ظلم و تعدی اور لوٹ کھسوٹ پر خطِ بطلان کھینچ کر انسانوں کو ان کے مقصودِ اعلیٰ تک پہنچا دے۔ اسلام ایک ایسا دبستان ہے جو غیر توحیدی دبستانوں کے برخلاف تمام فردی، سماجی، مادی، معنوی، ثقافتی، سیاسی، عسکری اور معاشی امور میں دخیل ہے اور ان کی نگرانی کرتا ہے اور انسان و معاشرہ کی تربیت اور اس کی مادی و معنوی ترقی میں مؤثر چھوٹے سے چھوٹے نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ اسلام نے افراد و معاشرہ کے رشد و ارتقاء کی راہ میں درپیش تمام مشکلات اور رکاوٹیں گوش گزار کر دی ہیں اور انہیں برطرف کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اقتباس از

وصیت نامہ حضرت امام خمینیؒ

عرفان کی مختصر تاریخ (۴)

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ: جناب ابو جواد

گزشتہ سبق میں صرف اس موضوع سے گفتگو ہوئی تھی کہ اسلامی عرفان کا اصلی سرچشمہ کہاں ہے؟ آیا اسلامی تعلیمات اور رسول اکرمؐ وائمہ طاہرینؑ کی عملی زندگی میں ایسی چیزیں موجود ہیں، جو نظری اعتبار سے عمیق و لطیف عرفانی افکار و مفاہیم اور عملی میدان میں روحانی نشاط نیز عرفانی و معنوی تحریکوں کو جنم دے سکیں؟ اس سوال کا جواب مثبت تھا۔ اب اسی سلسلہ کو مزید آگے بڑھا رہے ہیں:

اسلام کے حقیقی معارف اور اسلامی رہنماؤں کی، روحانی تجلیوں اور معنویت سے سرشار زندگی۔ جس نے اسلامی دنیا میں ایک عمیق معنویت ایجاد کی ہے۔ اس اصطلاحی عرفان و تصوف میں منحصر نہیں ہے۔ لیکن اسلامی معارف کے اس حصہ سے بحث و گفتگو ان دروس کے دائرہ سے باہر ہے جنھیں عرفان کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا۔

ہم اپنی گفتگو اسلامی معارف و تعلیمات کے اسی شعبہ کے بارے میں آگے بڑھائیں گے جسے اصطلاح میں عرفان یا تصوف کا نام دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان دروس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان معارف پر تبصرہ یا بھرپور تحقیق پیش کی جا سکے۔

یہاں ہماری کوشش یہی ہوگی کہ ان شعبوں میں ثقافتی اعتبار سے جو واقعات رونما

ہوئے ہیں انھیں بلاکم وکاست بعینہٖ نقل کردیں ۔ میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ ابتدائی تعارف کے طور پر پہلے ۔ صدر اسلام سے کم از کم دسویں صدی ہجری تک کی عرفان و تصوف کی آسان اور سادہ سی تاریخ اشارۃً ذکر کردیں اس کے بعد عرفانی مسائل جہاں تک ممکن ہو سکے بیان کریں ، پھر اس کے علمی تجزیہ اور اس کے اصلی سرچشمہ کی جستجو کا کام شروع کریں ۔

اتنا تو مسلم اور یقینی ہے کہ صدر اسلام اور کم از کم پہلی صدی ہجری میں ، مسلمانوں کے درمیان عارف یا صوفی نامی کسی گروہ کا وجود نہیں تھا ۔ صوفی کا نام دوسری صدی ہجری میں رونما ہوا ہے کہا جاتا ہے ، وہ پہلا شخص جسے اس نام سے یاد کیا گیا ہے ، وہ ابو ہاشم صوفی کوفی ہیں ، جو دوسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں ، وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے "رملۂ فلسطین" میں بعض مسلمان عابدوں وزاہدوں کی عبادت کے لئے ایک خانقاہ بنائی (۱) ابو ہاشم کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے ۔ وہ سفیان ثوری (وفات ۱۶۱ھ) کے استاد تھے ۔

ابوالقاسم قشیری ۔ جو خود بھی مشہور عارف وصوفی ہیں ــــ کہتے ہیں یہ نام ۲۰۰ھ سے پہلے رونما ہوا ہے ۔ نیکلسن کا بھی بیان ہے کہ یہ نام دوسری صدی ہجری کے آخر میں رونما ہوا ہے ۔ کافی کی کتاب المعیشۃ میں ایک روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صادقؑ کے زمانہ میں کچھ افراد ــــ سفیان ثوری اور کچھ دوسرے افراد اسی زمانہ یعنی ، دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں ــــ اس نام سے پہچانے جاتے تھے ۔

اگر ابو ہاشم کوفی وہ پہلے شخص ہوں جنھیں اس نام سے یاد کیا گیا ہے اور وہ سفیان ثوری (وفات ۱۶۱ھ) کے استاد بھی ہوں تو پھر یہ نام دوسری صدی کے نصف اول ہی میں مشہور ہو چکا تھا ۔ نہ کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں (جیسا کہ نیکلسن اور کچھ دوسرے افراد کا کہنا ہے)

---

۱ ۔ تاریخ تصوف در اسلام ۔ تالیف ڈاکٹر قاسم غنی ص ۱۹ ۔ اسی کتاب کے صفحہ ۴۴ پر ابن تیمیہ کی صوفیہ وفقراء نامی کتاب سے نقل ہوا ہے کہ سب سے پہلے جس نے صوفیا کے لئے ایک چھوٹا سا دیر بنایا وہ عبدالواحد بن زید کے کچھ پیرو تھے ۔ عبدالواحد ، حسن بصری کے مصاحبوں میں سے ہیں ، اگر ابو ہاشم صوفی بھی عبدالواحد کے پیروؤں میں سے ہوں تو ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد نہیں ہے ۔

اور بظاہر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ صوفیا کو صوفی کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اونی کپڑے پہنا کرتے تھے (صوف یعنی اون)۔

صوفیا اپنے زہد اور دنیا سے روگردانی کے باعث نرم کپڑے پہننے سے پرہیز کرتے تھے اور جان بوجھ کر اون سے بُنے ہوئے کھُردرے کپڑے پہنا کرتے تھے۔

اب رہی یہ بات کہ ان صوفیوں نے کب سے اپنے کو "عارف" کہنا شروع کیا ہے اس سلسلہ میں بھی صحیح معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ قدر مسلم یہ ہے اور "سری سقطی" (وفات ۲۴۳ھ) سے جو باتیں نقل ہوئی ہیں (۱) ان سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں یہ اصطلاح رائج تھی۔ لیکن ابونصر سراج طوسی کی کتاب "اللمع" میں جو عرفان و تصوف کی معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے، سفیان ثوری سے ایک جملہ نقل ہوا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تقریباً دوسری صدی ہجری ہی میں یہ اصطلاح پیدا ہو چکی تھی۔ (۲)

بہرکیف، پہلی صدی ہجری میں صوفی نامی کسی گروہ کا سراغ نہیں ملتا، یہ نام دوسری صدی ہجری میں وجود میں آیا ہے، اور ظاہراً اسی صدی میں ان لوگوں نے ایک مخصوص گروہ کی شکل بھی اختیار کی ہے، نہ کہ تیسری صدی میں، جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے۔ (۳)

اگرچہ پہلی صدی ہجری میں عارف یا صوفی نام کا کوئی مخصوص گروہ نہیں تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اصحاب اخیار صرف زاہد و عبادت گزار تھے اور سب کے سب ایمان کی ایک معمولی و عام درجہ کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان میں معنوی زندگی کا فقدان تھا،

ہو سکتا ہے کہ بعض نیک سیرت صحابہ صرف زہد و عبادت ہی تک محدود رہے ہوں انھیں دوسرے معارف سے کوئی سروکار نہ رہا ہو، لیکن دوسرے اصحاب اخیار ایک طاقت ور معنوی زندگی کے مالک تھے، خود یہ اصحاب بھی ایک درجہ کے نہ تھے حتی سلمانؓ ابوذر بھی ایمان کے ایک ہی درجہ پر فائز نہیں ہیں سلمان میں ایمان کی وہ ظرفیت پائی جاتی ہے جسے ابوذر برداشت نہیں کر سکتے۔

۱۔ تذکرۃ الاولیاء شیخ عطار　　۲۔ اللمع ص ۴۲۷　　۳۔ تاریخ تصوف در اسلام۔ ڈاکٹر غنی

بہت سی حدیثوں میں یہ ملتا ہے کہ : لَوْ عَلِمَ اَبُوْذَرٍ مَا فِی قَلْبِ سَلْمَانَ لَقَتَلَہٗ[1]
"اگر ابوذر کو سلمان کے دل کی بات معلوم ہو جاتی تو وہ انھیں (کافر سمجھ کر) قتل کر دیتے"
اب ہم یہاں دوسری صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک کے عرفا و صوفیا کے طبقات کا تذکرہ کر رہے ہیں :-

دوسری صدی کے عرفا

الف : حَسَن بصری علم کلام کی طرح اس اصطلاحی عرفان کی تاریخ بھی حسن بصری (وفات ۱۱۰ھ) سے شروع ہوتی ہے۔

حسن بصری ۲۲ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور ۸۸ سال تک زندہ رہے ہیں اس طرح ان کی عمر کے نو حصے پہلی صدی ہجری میں گزرے ہیں۔

یقین ہے کہ حسن بصری "صوفی" کے نام سے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ اس کے باوجود انھیں صوفیا کی صف میں شمار کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اوّلاً انھوں نے "رعایۃ حقوق اللہ" نامی ایک کتاب تحریر کی ہے جسے تصوف کی پہلی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا واحد نسخہ آکسفورڈ میں موجود ہے۔ نیکلسن کہتے ہیں۔

"وہ پہلا مسلمان جس نے حقیقی صوفیانہ زندگی کی روش تحریر کی ہے، حسن بصری ہیں وہی راہ و روش جسے آج کے مصنفین، تصوف اور اعلیٰ مقامات تک پہنچنے کا ذریعہ بیان کرتے ہیں اس میں پہلے توبہ اور اس کے بعد کچھ دوسرے اعمال کا ایک سلسلہ ہے ... جن میں سے ہر ایک کو اعلیٰ مقامات تک پہنچنے کے لئے یکے بعد دیگرے بجالانا ضروری ہے۔"(۲)

۱- سفینۃ البحار - مادہ سلم

۲- میراث اسلام، ص ۸۵ - اسی طرح تہران یونیورسٹی کی الہیات و معارف اسلامی فیکلٹی میں ۱۳۵۰ء میں ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی کے دروس بھی ملاحظہ ہوں۔ قابل توجہ یہ ہے کہ اس رسالہ میں نہج البلاغہ کے بہت سے جملے بھی موجود ہیں۔ یہ نکتہ اس لئے اور بھی توجہ کے قابل ہے کہ بعض صوفیا اپنا سلسلہ حسن بصری کے ذریعہ

۴۱۰

دوسرے، خود عرفا، طریقت کے بعض سلسلوں کو حسن بصری اور پھر وہاں سے امیر المومنین تک پہنچاتے ہیں، جیسے ابو سعید ابو الخیر کے مشائخ کا سلسلہ[1]۔ اسی طرح ابن ندیم اپنی الفہرست کے پانچویں مقالہ کے پانچویں فن میں ابو محمد جعفر خلدی کے سلسلہ کو حسن بصری سے ملاتے ہوئے کہتے ہیں: حسن نے اصحاب بدر میں سے ستر افراد کو دیکھا ہے

۱ تیسرے، بعض ایسے واقعات بھی نقل ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حسن بصری عملی طور پر اس گروہ میں شامل تھے جس نے بعد میں صوفیا کے نام سے شہرت پائی۔ ہم ان میں سے بعض واقعات آگے چل کر بیان کریں گے۔

ب: مالک بن دینار یہ ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے زہد اور ترک لذت کو افراط کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔ موصوف نے ۱۳۵ھ میں وفات پائی ہے۔

ج: ابراہیم ادھم گوتم بدھ کی طرح ان کا بھی ایک بڑا مشہور واقعہ ہے۔ یہ پہلے بلخ کے بادشاہ تھے۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث توبہ کر کے صوفیوں کی صف میں شامل ہو گئے عرفا کی نگاہ میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ مولانا روم نے مثنوی میں ان کی ایک بڑی دلچسپ داستان بیان کی ہے۔ ابراہیم نے تقریباً ۱۶۱ھ میں وفات پائی ہے۔

د: رابعہ عدویہ یہ خاتون عجوبۂ روزگار ہیں۔ چونکہ وہ اپنے خاندان کی چوتھی لڑکی تھیں لہٰذا ان کا نام "رابعہ" رکھا گیا۔ رابعہ عدویہ اور رابعہ شامیہ، یہ دو الگ الگ خاتون ہیں۔ رابعہ شامیہ بھی عرفا کی صف میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ جامی کی ہم عصر اور نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں۔

رابعہ عدویہ کی باتیں بہت اعلیٰ اور ان کے اشعار، عرفان کی معراج پر نظر آتے ہیں ان کے حالات بڑے عجیب و غریب ہیں۔

ھ: ابو ہاشم صوفی کوفی ان کی تاریخ وفات نامعلوم ہے۔ بس اتنا پتہ ہے کہ

حضرت امیر المومنینؑ تک پہنچاتے ہیں یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔

۱۔ تاریخ تصوف در اسلام ص ۴۶۲ ماخوذ از کتاب "حالات و سخنان ابو سعید ابو الخیر"

وہ سفیان ثوری کے استاد تھے جنھوں نے ۱۶۱ھ میں وفات پائی ہے۔ بظاہر ابوہاشم وہ پہلے شخص ہیں جنھیں صوفی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سفیان کہتے ہیں، اگر ابوہاشم نہ ہوتے تو میں ریا کی باریکیوں کو نہ سمجھ سکتا۔

و: **شفیق بلخی** یہ ابراہیم ادہم کے شاگرد تھے۔ علی بن عیسیٰ اربلی کی کشف الغمہ اور شبلنجی کی نورالابصار سے نقل کی ہوئی ریحانۃ الادب وغیرہ کی روایت کے مطابق۔ شفیق نے مکہ کے راستہ میں حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ سے ملاقات کی تھی اور حضرتؑ سے بعض مقامات و کرامات نقل کئے ہیں۔ موصوف نے ۱۵۳ھ یا ۱۷۴ھ یا ۱۹۴ھ میں وفات پائی ہے

ز: **معروف کرخی** یہ معروف عرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے ان کے ماں باپ عیسائی تھے اور خود انہوں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا ہے۔ اور حضرتؑ سے مستفید ہوئے ہیں۔

عرفا کے دعوے کے مطابق، طریقت کے بہت سے سلسلے معروف کرخی، ان سے حضرت رضاؑ اور حضرتؑ سے ائمہ معصومینؑ یہاں تک کہ رسول اکرمؐ سے جا ملتے ہیں۔ اسی لئے اس سلسلہ کو سلسلۃ الذہب (سنہرا سلسلہ) کہا جاتا ہے۔ عام طور سے "ذہبیون" کا یہی دعویٰ ہے

ط: **فضیل بن عیاض** یہ اصل میں "مرو" کے رہنے والے ہیں۔ عربی النسل ایرانی ہیں کہتے ہیں یہ پہلے ڈاکو تھے۔ ایک رات جب وہ چوری کی نیت سے دیوار پھاندنے کی کوشش کر رہے تھے کسی شب زندہ دار کی تلاوت قرآن کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ آیت نے انھیں منقلب کر دیا اور وہ تائب ہو گئے۔ مصباح الشریعہ نامی کتاب انہی سے منسوب ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کچھ دروس ہیں جنھیں انہوں نے امام صادق علیہ السلام سے حاصل کیا ہے۔

اس آخری صدی کے عظیم محدث حاج میرزا حسین نوری مرحوم نے اپنی کتاب مستدرک کے خاتمہ میں اس کتاب پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ فضیل نے ۱۸۷ھ میں وفات پائی ہے۔

تیسری صدی کے عرفا

الف: **بایزید بسطامی** (طیفور بن عیسیٰ) یہ بڑے عرفا میں شمار ہوتے ہیں،

کہتے ہیں یہ پہلے شخص ہیں جس نے صراحت کے ساتھ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ بایزید کا قول ہے: "میں ایک بایزید سے یوں باہر نکلا ہوں جس طرح سانپ اپنی کیچلی سے" بایزید کے کچھ "شطحیات" (وہ کلمات جو بظاہر خلاف شرع ہوں) ہیں جو انھیں کافر قرار دیئے جانے کا باعث بنے ہیں۔

خود عرفا انھیں اصحاب "سُکر" میں شمار کرتے ہیں، یعنی انہوں نے وہ کلمات، جذب و بے خودی کے عالم میں زبان پر جاری کئے ہیں۔

بایزید نے ۲۶۱ھ میں وفات پائی ہے۔ بعضوں کا دعویٰ ہے کہ وہ امام صادق علیہ السلام کے گھر کے سقا تھے۔ لیکن یہ دعوی تاریخ سے میل نہیں کھاتا کیونکہ بایزید نے سرے سے حضرت امام صادقؑ کا زمانہ ہی نہیں دیکھا ہے۔

ب: بشر حافی مشہود عرفا میں سے ہیں۔ یہ بھی پہلے فسق و فجور کے رسیا تھے مگر بعد میں توبہ کرلی۔

علامہ حلی نے منہاج الکرامہ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بُشر نے حضرت موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کے ہاتھوں پر توبہ کی ہے اور چونکہ توبہ کے وقت وہ "حافی" یعنی ننگے پیر تھے لہٰذا وہ بشرِ حافی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ بعضوں نے ان کے "حافی" کے نام سے مشہور ہونے کے کچھ دوسرے وجوہات پیش کئے ہیں۔ بشر حافی نے ۲۲۶ھ یا ۲۲۷ھ میں وفات پائی ہے۔

ج: سری سقطی بشر حافی کے دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ سری سقطی خدا کی مخلوق کے ساتھ شفقت اور ایثار و مہربانی کے خوگر تھے۔

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ "سری" نے کہا: میں اپنی زبان پر ایک "اَلحَمدُ لِلّٰہِ" جاری ہونے کی وجہ سے تیس سال سے استغفار کر رہا ہوں۔ لوگوں نے ان سے پوچھا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا ایک رات بازار میں آگ لگ گئی، میں گھر سے باہر نکلا کہ دیکھوں آگ میری دوکان تک پہنچی ہے یا نہیں؟ مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ تمہاری دوکان آگ سے محفوظ ہے، میں نے کہا الحمد للہ۔ اچانک مجھے ہوش آیا کہ (یہ میں نے کیا کہہ دیا؟)

مانا کہ میری دوکان کو نقصان نہیں پہنچا ہے. لیکن کیا یہ دوسرے مسلمانوں کا خیال نہیں ہونا چاہیئے۔ سعدی تھوڑے سے فرق کے ساتھ اپنے اشعار میں اسی داستان کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

شبی دود خلق آتشی برفروخت — شنیدم کہ بغداد نیمی بسوخت
یکی شکر گفت اندر آن خاک و دود — کہ دوکان ما را گزندی نبود
جہاندیدہ ای گفتش ای بوالہوس — ترا خود غم خویشتن بود و بس؟
پسندی کہ شہری بسوزد بہ نار — اگر خود سرایت بود بر کنار؟

سری، معروف کرخی کے شاگرد و مرید اور جنید بغدادی کے استاد اور ماموں ہیں۔ توحید اور عشق الٰہی وغیرہ کے موضوع پر ان کے بہت سے بیانات ہیں۔ یہ ان ہی کا قول ہے کہ : عارف آفتاب کے مانند سارے عالم میں ضوفشانی کرتا ہے۔ زمین کی طرح ہر اچھے برے کو ڈھوتا ہے پانی کی طرح تمام دلوں کے لئے شربت حیات ہے۔ اور آگ کی طرح سب کو حرارت پہنچاتا ہے۔

سری نے ۲۴۵ھ یا ۲۵۰ھ میں ۹۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

د ۔ **حارث محاسبی** جنید کے دوستوں اور مصاحبوں میں سے ہیں۔ انھیں "محاسبی" کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مراقبہ و محاسبہ کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ موصوف احمد بن حنبل کے ہم عصر ہیں۔ احمد حنبل چونکہ علم کلام کے دشمن تھے لہٰذا انہوں نے حارث کو علم کلام سے دلچسپی کے جرم میں اپنے آپ سے دور کر دیا اور یہی چیز ان سے عوام کے منہ موڑ لینے کا باعث ہوئی۔ حارث نے ۲۴۳ھ میں وفات پائی ہے۔

ھ : **جنید بغدادی** اصل میں نہاوند کے رہنے والے ہیں جس طرح شیعہ فقہا شیخ طوسی کو "شیخ الطائفہ" کہتے ہیں یوں ہی عرفاء صوفیا انھیں "سید الطائفہ" کے لقب سے نوازتے ہیں۔

جنید، اعتدال پسند عارف مانے جاتے ہیں بعض شطحیات جو دوسروں کی زبان سے سنے گئے ہیں ان کی زبان پر جاری نہیں ہوئے، یہاں تک کہ وہ صوفیوں کا مخصوص لباس بھی نہیں پہنتے تھے بلکہ وہ علماء و فقہاء کے لباس میں رہتے تھے۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آپ کم از کم ساتھیوں کی

خاطر ہی سبھی صوفیین کا مخصوص لباس "خرقہ" پہن لیجیئے تو انہوں نے جواب دیا :۔
اگر لباس سے کچھ بن پڑتا تو میں پگھلے ہوئے لوہے کا کپڑا بنوا تا۔ لیکن ندا نے حقیقت تو یہ ہے کہ : "لیس الاعتبارُ بالخرقۃ اِنّما الاعتبارُ بالحرقۃ" خرقہ کی کوئی حقیقت نہیں اصل چیز تو "حرقۃ" یعنی تپش قلب ہے۔ جنید، سری سقطی کے شاگرد، مرید اور بھانجے ہیں۔ وہ حارث محاسبی کے بھی شاگرد ہیں۔ کہتے ہیں جنید نے ۲۹۷ھ میں نوّے سال کی عمر میں وفات پائی ہے۔

و : ذوالنون مصری یہ مصر کے باشندہ اور مشہور فقیہ ہیں۔ انہوں نے فقہ میں مالک بن انس کے آگے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ جامی انھیں صوفیوں کا سربراہ بتاتے ہیں۔ موصوف ہی وہ پہلے شخص ہیں جس نے رمزیہ زبان استعمال کی ہے اور عرفانی مسائل کو رمزیہ اصطلاحات میں بیان کیا ہے تاکہ اسے وہی لوگ سمجھ سکیں جو رمز آشنا ہیں اور نامحرم اس سے باخبر نہ ہوسکیں آہستہ آہستہ یہ روش رائج ہوگئی۔ عرفانی مفاہیم، غزل اور استعماراتی زبان میں بیان ہونے لگے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ عرفان و تصوف میں جدید افلاطونی فلسفہ کے بہت سے تعلیمات، ذوالنون ہی کے ذریعہ داخل ہوئے ہیں[1]۔ ذوالنون نے ۲۴۰ھ یا ۲۵۰ھ میں وفات پائی ہے۔

ز : سہل بن عبداللہ تستری عظیم عرفا، وصوفیا میں شمار ہوتے ہیں۔ عرفا کا ایک فرقہ جو مجاہدہ نفس ہی کو اصل سمجھتا ہے، موصوف ہی کے نام کی مناسبت سے "سہلیہ" کہلاتا ہے۔ سہل نے، مکہ معظمہ میں ذوالنون مصری سے ملاقات بھی کی ہے۔ سہل ۲۸۲ھ یا ۲۹۳ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے ہیں (۲)

ح : حسین بن منصور حلاج۔ اسلامی دور کے عرفا کی ہنگامہ خیز شخصیت ہیں۔ بے شمار شطحیات کہے ہیں۔ ان پر کفر، ارتداد اور خدائی کا دعویٰ کرنے کا الزام ہے۔ فقہا نے انھیں کافر قرار دیا اور مقتدر عباسی کے دور حکومت میں پھانسی دی گئی ہے۔ خود عرفا بھی ان پر راز فاش کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ کہتے ہیں :۔

۱۔ تاریخ تصوف در اسلام ص ۵۸
۲۔ طبقات الصوفیہ، ابو عبدالرحمٰن سلمی ص ۲۰۶

گفت آن یار کزو گشت سر دار بلند　　جرمش آن بود که اسرار هویدا می کرد

بعض انھیں، شعبدہ باز سمجھتے ہیں۔ لیکن عرفا انھیں ان الزامات سے بری قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں، منصور اور بایزید کی وہ باتیں جن سے کفر کی بو آتی ہے بے خودی کے عالم میں منھ سے نکلی ہیں عرفا نے منصور کو "شہید" کا لقب دیا ہے۔ انھیں ۳۰۶ھ یا ۳۰۹ھ میں پھانسی دی گئی تھی۔(۱)

۵

چوتھی صدی کے عرفا

الف: ابوبکر شبلی جنید بغدادی کے شاگرد و مرید ہیں اور مشہور عرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے حلاج کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔ اصل میں خراسان کے رہنے والے ہیں۔ کتاب "روضات الجنات" اور دیگر کتابوں میں ان کے بہت سے عارفانہ کلمات و اشعار نقل ہوئے ہیں۔

خواجہ عبداللہ انصاری نے کہا ہے: سب سے پہلے ذوالنون مصری نے، رمزیہ زبان میں گفتگو کی۔ جنید نے اس علم کو مرتب کر کے اسے پھیلایا اور اس علم کے متعلق متعدد کتابیں تحریر کیں۔ اور جب شبلی کی باری آئی تو انھوں نے اس علم کو منبروں پر پہنچا دیا۔ شبلی نے ۳۳۴ھ کے دوران ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی ہے۔

ب: ابوعلی رودباری ساسانی النسل ہیں اور ان کا سلسلہ نسب انوشیروان تک پہنچتا ہے۔ ابوعلی جنید کے مرید تھے۔ انھوں نے فقہ، ابوالعباس بن شریح سے اور ادبیات

۱۔ کتاب "علل گرایش بہ مادیگری" کے آٹھویں ایڈیشن کے مقدمہ میں ہم نے قدرے تفصیل سے حلاج کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان معاصر مادہ پرستوں کے نظریہ کا جواب دیا ہے جو انھیں مادہ پرست کہتے ہیں۔

ثعلب سے پڑھے ہیں۔ انھیں شریعت طریقت اور حقیقت کا جامع کہا گیا ہے۔ وہ ۳۲۲ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے ہیں۔

ج: ابونصر سراج طوسی مشہور و معروف کتاب "اللمع" کے مصنف ہیں، جو عرفان و تصوف کے اصلی، قدیمی اور معتبر مصادر میں شمار ہوتی ہے۔ ابونصر نے ۳۷۸ھ میں طوس میں وفات پائی ہے۔ طریقت کے بہت سے مشائخ، براہ راست یا بالواسطہ موصوف کے شاگرد ہیں۔

د۔ ابوالفضل سرخسی ابونصر سراج کے مرید و شاگرد اور مشہور ترین عارف ابوسعید ابوالخیر کے استاد ہیں۔ ۴۱۴ھ میں وفات پائی ہے۔

ھ: ابوعبداللہ رودباری ابوعلی رودباری کے بھانجے ہیں شام کے عرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ ۳۶۹ھ میں وفات پائی ہے۔

و: ابوطالب مکی ان کی زیادہ شہرت "قوۃ القلوب" نامی کتاب کی وجہ سے ہے جو انھوں نے عرفان و تصوف کے بارے میں لکھی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور عرفان و تصوف کے قدیمی و اصلی مصادر میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے ۳۸۵ھ یا ۳۸۶ھ میں وفات پائی ہے۔

پانچویں صدی کے عرفا

الف: شیخ ابوالحسن خرقانی مشہور ترین عرفا میں سے ہیں۔ عرفا بڑی تعجب خیز داستانیں ان سے منسوب کرتے ہیں ان ہی میں ابوالحسن کا ایک یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ بایزید بسطامی کی قبر پر جاکر ان کی روح سے رابطہ برقرار کرتے تھے اور اپنے مشکلات حل کرتے تھے۔

مولانا روم کہتے ہیں:

بوالحسن بعد از وفات بایزید — از پس آن سالہا آمد پدید
گاہ و بیگہ نیز رفتی بی فتور — بر سر گورش نشستی با حضور
تا مثال شیخ پیشش آمدی — تا کہ می گفتی شکالش حل شدی

مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ان کا بہت ذکر کیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ ان سے بڑی عقیدت

رکھتے تھے۔ کہتے ہیں ابوالحسن نے مشہور فلسفی بوعلی سینا اور مشہور عارف ابوسعید ابوالخیر سے بھی ملاقات کی تھی۔ انہوں نے ۴۲۵ھ میں وفات پائی ہے۔

ب۔ ابوسعید ابوالخیر : مشہورترین عرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑی اچھی اور لاجواب رباعیوں کے خالق ہیں۔ ان سے پوچھا گیا : "تصوف کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا: تصوف یہ ہے کہ جو کچھ سر میں ہے اسے نکال دو، جو کچھ ہاتھ میں ہے اسے دیدو اور جو کچھ تم پر نازل ہو اسے گزار دو، موصوف نے ابوعلی سینا سے بھی ملاقات کی ہے۔ ایک دن ابوعلی سینا، ابوسعید کے وعظ میں شریک ہوئے۔ ابوسعید عمل کی ضرورت اور اطاعت و معصیت کے آثار کے بارے میں گفتگو فرمارہے تھے چنانچہ ابوعلی نے وہیں پر یہ رباعی کہی :

ماییم بہ عفو تو تولا کردہ ۔۔۔ وز طاعت و معصیت تبرا کردہ
آنجا کہ عنایت تو باشد، باشد ۔۔۔ ناکردہ چو کردہ، کردہ چون ناکردہ

ابوسعید نے فوراً ہی جواب میں کہا :

ای نیک نکردہ و بدیہا کردہ ۔۔۔ وانگہ بہ خلاص خود تمنا کردہ
بر عفو مکن تکیہ کہ ہرگز نبود ۔۔۔ ناکردہ چو کردہ، کردہ چون ناکردہ (۱)

یہ رباعی بھی ابوسعید ہی کی ہے :

فردا کہ زوال شش جہت خواہد بود ۔۔۔ قدر تو بہ قدر معرفت خواہد بود
در حسن صفت کوش کہ در روز جزا ۔۔۔ حشر تو بہ صورت صفت خواہد بود

ابوسعید نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی ہے۔

ج۔ ابوعلی دقاق نیشاپوری : جامع شریعت وطریقت مانے جاتے ہیں قرآن کے مفسر اور واعظ تھے۔ مناجاتوں میں آنسا روتے تھے کہ "شیخ نوحہ گر" لقب ہی پڑ گیا۔ ۴۰۵ یا ۴۱۲ھ میں وفات پائی ہے۔

د۔ ابوالحسن علی بن عثمان ھجویری : کتاب "کشف المحجوب" جو اس فرقہ کی

۱۔ نامہ دانشوران۔ بوعلی سینا کے حالات میں

مشہور کتابوں میں شمار ہوتی ہے ــــــ کے مصنف آپ ہی ہیں، آپ نے ۴۷۰ھ میں وفات پائی۔

و۔ خواجہ عبداللہ انصاری: پیغمبرؐ کے جلیل القدر صحابی ابوایوب انصاری کی اولاد میں ہیں۔ آپ بے حد بلاغت گفتار اور مشہور ترین عرفا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بہت سی مناجاتوں۔ چھوٹے چھوٹے حکیمانہ جملوں اور معنویت سے لبریز اعلیٰ رباعیوں کے خالق ہیں۔ ان کی زیادہ تر شہرت بھی ان ہی مناجاتوں اور رباعیوں کے باعث ہے۔

یہ ان ہی کے کلمات میں سے ہے: "بچپنے میں پستی، جوانی میں مستی، بڑھاپے میں سُستی پھر خدا پرستی کب؟" یہ جملہ بھی ان ہی کا ہے: "برائی کے بدلے میں برائی کرنا کتوں کی روش (سگساری) ہے، بھلائی کے بدلے میں اچھائی کرنا۔ گدھے کا کام (خرخاری) ہے اور برائی کے جواب میں بھلائی کرنا خواجہ عبداللہ انصاری کا شیوہ ہے"۔ یہ رباعی بھی ان ہی کی ہے

عیب است بزرگ برکشیدن خود را — از جملہ خلق برگزیدن خود را

از مردمک دیدہ بباید آموخت — دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

خواجہ عبداللہ نے ہرات میں آنکھیں کھولیں اور ۴۸۱ھ میں وہیں پر وفات پائی اور وہیں دفن بھی ہوئے اسی لئے وہ "پیر ہرات" کے لقب سے مشہور ہیں۔

خواجہ عبداللہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی مشہور ترین کتاب جو عرفان کی پختہ ترین کتاب مانی جاتی ہے اور سیر و سلوک کے درسی نصاب میں بھی شامل ہے کتاب "منازل السائرین" ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

ز۔ امام ابوحامد محمد غزالی: مشہور ترین اسلامی علماء میں شمار ہوتے ہیں ان کی شہرت چاردانگِ عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ معقول و منقول کے جامع تھے۔ جامع نظامیہ بغداد کے سربراہ مقرر ہوئے اور اپنے زمانہ کے اعلیٰ ترین روحانی منصب پر فائز ہوئے، لیکن خود انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ علم اور یہ منصب ان کی روح کو سیراب کرنے سے عاجز ہیں، لہٰذا وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر نفس کو پاکیزہ بنانے اور اسے جلا دینے میں مشغول ہوگئے۔ آشنا نگاہوں سے دور، دس سال تک بیت المقدس میں اپنی اصلاح میں مشغول رہے اسی زمانہ میں عرفان و تصوف کی طرف مائل ہوئے اور پھر زندگی کی آخری سانسوں تک عہدہ و

معرفت کے قریب نہ پھٹکے۔ اپنی مشہور کتاب "احیاء علوم الدین" دوران ریاضت کے بعد لکھی ہے ۵۰۵ھ میں اپنے اصلی وطن طوس میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

چھٹی صدی کے عرفا

الف۔ عین القضاۃ ھمدانی: آپ پُرجوش ترین عرفا میں شمار ہوتے ہیں، محمد غزالی کے چھوٹے بھائی احمد غزالی ۔ جو خود بھی عرفا میں شمار ہوتے ہیں ۔ کے مرید تھے۔ بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں۔ فصیح و سلیس اشعار تخلیق کئے ہیں جو شطحیات سے بھی خالی نہیں ہیں سرانجام انھیں کافر قرار دے کر قتل کردیا گیا اور ان کی لاش جلا کر راکھ منتشر کردی گئی۔ انھیں ۵۲۵ھ سے ۵۳۳ھ کے دوران قتل کیا گیا ہے۔

ب۔ سنائی غزنوی: مشہور شاعر ہیں۔ ان کے اشعار، بڑے گہرے عرفان کے حامل ہیں، مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ان کے اشعار پیش کئے ہیں اور ان کی شرح کی ہے۔ آپ نے چھٹی صدی کے نصف اول میں وفات پائی ہے۔

ج۔ احمد جامی: "ژندہ پیل" کے نام سے معروف ہیں اور مشہور صوفیا و عرفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی قبر ایران افغانستان سرحد کے قریب "تربت جام" میں مشہود ہے خوف و رجاء سے متعلق ان کے اشعار میں سے یہ دو بیتی ملاحظہ ہو:

غرہ مشو کہ مرکب مردان مرد را | در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان جرعہ نوش | ناگہ بیک ترانہ بہ منزل رسیدہ اند

انفاق و امساک (بخل) میں میانہ روی واعتدال کی رعایت کے سلسلہ میں بھی انھوں نے کہا ہے:

چون تیشہ مباش وجملہ برخود متراش | چون رندہ زکار خویش بی بہرہ مباش
تعلیم زارہ گیر درکار معاش | چیزی سوی خود می کش و چیزی میپاش

احمد جامی نے ۵۳۶ھ کے آس پاس وفات پائی ہے۔

د۔ عبد القادر جیلانی: اسلامی دنیا کی اختلافی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔

صوفیوں کا قادری سلسلہ ان ہی سے منسوب ہے۔ بغداد میں ان کی قبر مشہور عام ہے۔ یہ ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے بڑے بڑے دعوے بیان کئے جاتے ہیں۔ موصوف حسنی سید ہیں ۵۶۰ یا ۵۶۱ھ میں وفات پائی ہے۔

ھ۔ شیخ روزبہان بقلی شیرازی : "شیخ شطاح" کے نام سے مشہور ہیں، کیونکہ وہ بہت زیادہ شطحیات کہتے تھے۔ ان آخری برسوں میں ان کی کچھ کتابیں مستشرقین نے چھاپ کر نشر کی ہیں۔ انہوں نے ۶۰۶ھ میں وفات پائی ہے۔

ساتویں صدی کے عرفا

الف۔ شیخ نجم الدین کبرا : بڑے اور مشہور عرفا میں شمار ہوتے ہیں صوفیوں کے بہت سے سلسلے ان پر ہی ختم ہوتے ہیں۔ وہ روزبہان بقلی کے شاگرد، مرید اور داماد تھے۔ انہوں نے بہت سے شاگردوں کی تربیت کی ان میں سے ایک مولانا روم کے والد بہاء الدین ہیں وہ خوارزم میں زندگی بسر کرتے تھے، ان کا زمانہ مغلوں کے حملہ کا دور تھا۔ مغلوں نے شہر پر حملہ کرنے سے پہلے نجم الدین کبرا کو پیغام بھیجا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں سمیت شہر سے نکل کر نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ نجم الدین نے جواب دیا کہ: میں آرام اور سکھ کے دنوں میں عوام کے ساتھ تھا اور آج جب ان پر مشکل کا وقت آپڑا ہے ان سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ خود نجم الدین نے بھی بہادری کے ساتھ اسلحہ اٹھایا اور عوام کے شانہ بشانہ جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۶۱۶ھ میں رونما ہوا ہے۔

ب۔ شیخ فرید الدین عطار : صف اول کے بڑے عرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں تالیفات رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب تذکرۃ الاولیاء ـــ جو عرفا و صوفیا کے حالات کے بارے میں ہے اور امام صادقؑ کے ذکر سے شروع ہو کر امام محمد باقر علیہ السلام پر ختم ہوتی ہے ـــ عرفانی مآخذ و مصادر میں شمار ہوتی ہے اور مستشرقین اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں اسی طرح ان کی کتاب "منطق الطیر" ایک عرفانی شاہکار ہے۔

مولانا روم عطار اور سنائی کے بارے میں کہتے ہیں :

عطار روح بود و سنائی دو چشم او　　　ما از پی سنائی و عطار می رویم

ان ہی کا یہ شعر بھی ہے :

ہفت شہر عشق را عطار گشت　　　ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

"ہفت شہر عشق" سے مولانا روم کی مراد ، وہ وادی ہے جس کی خود عطار نے اپنی منطق الطیر میں تشریح کی ہے۔

محمود شبستری، گلشن راز میں کہتے ہیں :

مرا از شاعری خود عار ناید　　　کہ در صد قرن چون عطار ناید

عطار، شیخ نجم الدین کبرا کے شاگرد و مرید، شیخ مجد الدین بغدادی کے شاگرد اور مرید ہیں اسی طرح موصوف کو قطب الدین حیدر ـــــ جو اس دور کے مشائخ میں سے ہیں اور تربت حیدریہ میں دفن ہیں۔ یہ شہر ان ہی سے منسوب ہے ـــــ کا فیض بھی حاصل رہا ہے۔

عطار، مغلوں کے فتنہ کے زمانہ میں اس دنیا سے چل بسے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انھیں مغلوں نے ۶۲۶ھ سے ۶۲۹ھ کے دوران قتل کیا ہے۔

۶۔ **شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی :** مشہور کتاب "عوارف المعارف" جو عرفان و تصوف کا بڑا اچھا متن ہے آپ ہی کی تخلیق ہے ، ان کا سلسلۂ نسب ، ابو بکر سے ملتا ہے۔ کہتے ہیں وہ ہر سال مکہ و مدینہ کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ عبد القادر جیلانی کی صحبت میں بھی رہے ہیں۔

مشہور شاعر کمال الدین اسماعیل اصفہانی اور شیخ سعدی شیرازی ان کے مریدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سعدی ان کے بارے میں کہتے ہیں :

مرا شیخ دانای مرشد شہاب　　　دو اندرز فرمود بر روی آب

یکی اینکہ در نفس خود بین مباش　　　دگر آنکہ در جمع بد بین مباش

یہ سہروردی وہ مشہور فلسفی شیخ شہاب الدین سہروردی معروف بہ شیخ اشراق نہیں ہیں جنھیں ۵۸۱ھ سے ۵۹۰ھ کے دوران حلب میں قتل کیا گیا ہے۔

ان عارف سہروردی نے تقریباً ۶۳۲ھ میں وفات پائی ہے ،

د ۔ ابن الفارض مصری : صفِ اوّل کے عرفا میں شمار ہوتے ہیں ۔ عربی دیوان کے عرفانی اشعار، نہایت لطیف اور بلند پایہ ہیں ۔ ان کا دیوان کئی مرتبہ چھپ چکا ہے اور دانشوروں نے اس کی شرح بھی لکھی ہے ۔ ان کے دیوان کے شارحین میں، نویں صدی کے مشہور عارف، عبدالرحمٰن جامی بھی ہیں ۔

عربی میں ان کے عرفانی اشعار کا موازنہ فارسی میں حافظ کے عرفانی اشعار سے کیا جاسکتا ہے ۔ محی الدین عربی نے ان سے اپنے اشعار کی شرح خود ہی لکھنے کی خواہش کی ۔ ابن الفارض نے جواب دیا آپ کی کتاب "فتوحات مکیۃ" ان ہی اشعار کی شرح ہے ۔

ابن الفارض، ان افراد میں سے ہیں جو غیر معمولی حالات میں بسر کرتے تھے ۔ وہ عموماً جذب واستغراق کے عالم میں رہا کرتے تھے ۔ انہوں نے اپنے بہت سے اشعار ان ہی حالات میں تخلیق کئے ہیں ۔ ابن الفارض نے ۶۳۲ھ میں وفات پائی ہے ۔

ھ ۔ محی الدین عربی طائی اندلسی : حاتم طائی کی نسل سے ہیں ۔ یوں تو اندلس کے باشندہ ہیں لیکن بظاہر اپنی زیادہ تر عمر مکہ اور شام میں گزاری ہے ۔ موصوف چھٹی صدی کے عارف، شیخ ابو مدین مغربی اندلسی کے شاگرد ہیں ۔ ان کا سلسلۂ طریقت ایک واسطہ سے شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے ۔

محی الدین ـــ جنھیں ابن العربی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ، بلاشبہ اسلام کے عظیم ترین عارف ہیں ۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد، کوئی شخص ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا ، اسی لئے انھیں "شیخ اکبر" کا لقب دیا گیا ہے ۔

اسلامی عرفان نے اپنی پیدائش کے ابتدائی دنوں سے ، رفتہ رفتہ ، صدی بہ صدی ترقی پائی ہے ۔ ہر صدی میں ـــ جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے ـــ بڑے بڑے عرفا میدان میں آئے ہیں اور انہوں نے عرفان کو ترقی دی ہے اور اس کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے ۔ یہ ترقی تدریجی تھی ۔ لیکن ساتویں ہجری میں عرفان، محی الدین عربی کے ہاتھوں ایک جست میں اپنے کمال وارتقاء کی آخری منزلوں پر پہنچ گیا ۔

محی الدین نے عرفان کو ایک نئے مرحلہ میں داخل کر دیا جس کی مثال ماضی میں نظر نہیں آتی

عرفان کے دوسرے حصہ یعنی اس کے علمی، نظری اور فلسفی شعبہ کی بنیاد ابن عربی ہی نے ڈالی ہے۔ ان کے بعد کے عرفا عام طور سے ان ہی کے خوانِ نعمت سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ محی الدین عربی، عرفان کو نئی منزل اور نئی سمت دینے کے علاوہ خود بھی عجوبہ روزگار ہیں۔ وہ بڑے ہی عجیب انسان ہیں۔ اسی لئے ان کے بارے میں متضاد نظریے پیش کئے گئے ہیں۔

اگر کچھ لوگ انھیں "ولی کامل اور قطب الاقطاب" مانتے ہیں تو بعض افراد انھیں کفر کی حد تک گراتے ہیں۔ کبھی انھیں دین کو تباہ و برباد کرنے والا قرار دیا جاتا ہے اور کبھی دین کو حیات نو بخشنے والا بتایا جاتا ہے۔ عظیم اسلامی فلسفی صدر المتألہین کی نگاہ میں ابن عربی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان کی نظر میں محی الدین عربی، بوعلی سینا اور فارابی سے کہیں زیادہ [illegible] ہیں۔

محی الدین نے دو سو سے زائد کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں [illegible] اور شاید ان کی وہ تمام کتابیں جن کے نسخے دستیاب ہیں (تقریباً تیس کتابیں) چھپ چکی ہیں۔ ان کی ایک اہم کتاب "فتوحات مکیہ" ہے جو بڑی عظیم کتاب ہے اور درحقیقت عرفانی دائرۃ المعارف ہے۔

ان کی ایک دوسری کتاب "فصوص الحکم" ہے جو مختصر ہونے کے باوجود عرفان کا عمیق ترین متن ہے اور اس کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر دور میں [illegible] دو ہی تین افراد ایسے گزرے ہیں جو اس عمیق متن کے مفاہیم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

محی الدین نے ۶۳۸ھ میں دمشق میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ شام میں ان کی قبر آج بھی مشہور خلائق ہے۔

و۔ صدر الدین محمد قونوی: محی الدین عربی کے شاگرد، مرید اور سوتیلے بیٹے نیز خواجہ نصیر الدین طوسی اور مولانا روم کے ہم عصر ہیں۔ صدر الدین اور خواجہ نصیر طوسی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ خواجہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ [illegible] مولانا روم اور ان کے درمیان بڑے خلوص و محبت کی فضا قائم تھی۔ قونوی امامت جماعت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور مولانا روم ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کہا جاتا ہے مولانا روم ان کے شاگرد بھی تھے۔

کہتے ہیں ایک دن مولانا روم، قونوی کی بزم میں حاضر ہوئے۔ قونوی اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی مسند مولانا روم کو پیش کی لیکن مولانا روم نے یہ کہتے ہوئے مسند پر بیٹھنے سے انکار کر دیا

کہ "آپ کی جگہ پر بیٹھ کر خدا کو کیا جواب دوں گا" قونوی نے بھی مسند، یہ کہہ کر دور ہٹا دی کہ "جو مسند آپ کے لئے مناسب نہیں وہ ہمارے لئے بھی موزوں نہیں ہے"۔

قونوی، محی الدین عربی کے افکار و نظریات کے بہترین مفسر ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید محی الدین کو سمجھنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ مولانا روم، قونوی ہی کے وسیلہ سے محی الدین عربی کے دبستان سے آشنا ہوئے ہیں۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ مولانا روم، قونوی کے شاگرد تھے، بظاہر اس کا تعلق، محی الدین عربی کے افکار و نظریات کے حصول سے ہے۔ محی الدین کے افکار۔ مثنوی اور دیوان شمس کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ قونوی کی کتابیں، گذشتہ چھ صدی سے اسلامی عرفان اور فلسفہ کے تعلیمی مراکز میں درسی کتابوں میں شامل ہیں۔

قونوی کی مشہور کتابیں یہ ہیں: مفتاح الغیب، نصوص، فکوک، قونوی نے ۶۷۲ھ (سال وفات مولانا روم و خواجہ نصیر الدین طوسی) یا ۶۷۳ھ میں وفات پائی ہے۔

ز۔ مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی: شہرۂ آفاق مثنوی کے خالق ہیں۔ وہ دنیا کے عظیم ترین نوابغ اور اسلامی عرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نسب، ابوبکر سے ملتا ہے ان کی مثنوی، حکمت و معرفت نیز سماجی، عرفانی اور روحانی شناخت سے مربوط نہایت عمیق نکات کا سمندر ہے۔ مولانا روم ایران کے صف اول کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا، اصلی بلخ کے باشندہ ہیں۔ بچپنے میں اپنے والد کے ہمراہ بلخ سے نکلے۔ ان کے والد نے انھیں اپنے ہمراہ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف کرایا۔ موصوف نے شیخ فریدالدین عطار سے نیشاپور میں ملاقات کی۔

مکہ سے واپسی میں اپنے والد کے ہمراہ قونیہ گئے اور وہیں مقیم ہو گئے، مولانا روم شروع میں صرف ایک عالم دین تھے اپنے ہم عصر دوسرے علماء کی طرح پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے اور عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے، یہاں تک کہ مشہور عارف، شمس تبریزی سے انکی ملاقات ہو گئی۔ وہ بری طرح شمس کے گرویدہ ہو گئے اور تمام چیزوں سے منھ موڑ لیا۔

ان کی غزل کا دیوان، شمس کے نام پر ہے۔ مثنوی میں بڑے سوز و گداز کے ساتھ بار بار

شمس کو یاد کیا ہے۔ مولانا نے ۶۷۲ھ میں وفات پائی ہے۔

ح ۔ فخرالدین عراقی ہمدانی : مشہور عارف اور شاعر و غزل گو ہیں۔ صدرالدین قونوی کے شاگرد اور شہاب الدین سہروردی کے مرید و پروردہ ہیں۔ ۶۸۸ھ میں وفات پائی ہے

آٹھویں صدی کے عرفا

الف ۔ علاء الدولۃ سمنانی : پہلے وہ دیوانی کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ اس پیشہ سے دستبردار ہو کر عرفا کی صف میں شامل ہو گئے اور اپنی تمام دولت خدا کی راہ میں تقسیم کر دی۔ بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ نظری عرفان کے بارے میں اپنے کچھ مخصوص نظریات رکھتے ہیں جنھیں عرفان کی اہم کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ موصوف نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی ہے۔ مشہور شاعر خواجوی کرمانی جوان کے مریدوں میں سے تھے ان کی توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ہر کو بہ رہ علی عمرانی شد	چون خضر، بہ سرچشمہ حیوانی شد
از وسوسہ عادت شیطان وارست	مانند علاء دولہ سمنانی شد

ب ۔ عبدالرزاق کاشانی : اس صدی کے محقق عارفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ محی الدین کی " فصوص " اور خواجہ عبداللہ انصاری کی " منازل السائرین " کی شرح لکھی ہے۔ دونوں ہی کتابیں چھپ چکی ہیں اور اہل تحقیق ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

شیخ عبدالرزاق لاہیجی کے تذکرہ کے ذیل میں صاحب روضات الجنات کی روایت کے مطابق، شہید ثانی نے عبدالرزاق کاشانی کی بہت تعریف کی ہے۔ عرفان کے نظری مسائل ۔ جس کی بنیاد محی الدین نے رکھی ہے ۔۔۔ کے بارے میں عبدالرزاق کاشانی اور علاء الدولہ سمنانی کے درمیان کافی گرما گرم بحثیں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ۷۳۵ھ میں وفات پائی ہے۔

ج ۔ خواجہ حافظ شیرازی : حافظ کی عالمی شہرت کے باوجود ان کی تاریخ زندگی کچھ واضح نہیں ہے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ ایک عالم، عارف، حافظ اور مفسر قرآن تھے خود انہوں نے اپنے ان صفات کی طرف بارہا اشارہ کیا ہے :

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ　　به قرآنی که اندر سینه داری

عشقت رسد به فریاد گر خود بسان حافظ　　قرآن ز بر بخوانی با چارده روایت

ز حافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد　　لطائف حکمی با نکات قرآنی

اگرچہ حافظ نے اپنے اشعار میں بار ہا پیر طریقت اور مرشد کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خود ان کا مرشد و مربی کون تھا۔ حافظ کے اشعار عرفان کی معراج پر نظر آتے ہیں اور اس کے عرفانی لطائف و نکات سمجھ سکنے والوں کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ حافظ کے بعد کے تمام عرفا معترف ہیں کہ حافظ نے عرفان کے اعلیٰ مقامات و مدارج عملی طور پر طے کئے ہیں۔

بعض بزرگوں نے حافظ کے کچھ شعروں کی شرح لکھی ہے۔ مثلاً نویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی محقق جلال الدین دوانی نے حافظ کے اس شعر کی شرح میں ایک پورا رسالہ لکھا ہے۔

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت　　آفرین بر نظر پاک خطا پوشش باد

حافظ نے ۷۹۱ھ میں وفات پائی ہے۔ (۱)

د۔ شیخ محمود شبستری : "گلشن راز" نامی ایک نہایت اعلیٰ عرفانی نظم کے خالق ہیں۔ یہ نظم، عرفان کی نہایت اعلیٰ کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اس نے اپنے خالق کو جاوداں بنا دیا ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان شرحوں میں شاید سب سے اچھی شرح شیخ محمد لاہیجی کی شرح ہے جو چھپ چکی ہے اور دستیاب بھی ہے۔ شبستری

۱۔ اس زمانہ میں حافظ ایران میں فارسی شاعروں کے درمیان محبوب ترین شخص ہیں ابن الوقت مادہ پرستوں نے حافظ کو بھی ایک مادہ پرست یا کم از کم ایک شکاک شخص کی صورت میں پیش کرنے اور اپنے مادہ پرستی کے مقاصد کے لئے ان کی محبوبیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے "علل گرایش بہ مادیگری" کے آٹھویں ایڈیشن کے مقدمہ میں حافظ اور اس طرح حلاج کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔

نے تقریباً ۷۲۰ھ میں وفات پائی ہے۔

ہ۔ سید حیدر آملی : ایک محقق عارف ہیں۔ انہوں نے "جامع الاسرار" نامی کتاب لکھی ہے جو محی الدین کے نظری عرفان پر لکھی گئی عمیق کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور آج کل بڑے اچھے انداز سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی ایک دوسری کتاب نص النصوص ہے جو فصوص کی شرح ہے۔ وہ مشہور فقیہ، فخر المحققین حلی کے ہم عصر ہیں۔ آملی کے سنہ وفات کا صحیح علم نہیں ہے۔

و۔ عبدالکریم جیلی : "الانسان الکامل" نامی مشہور کتاب کے مصنف ہیں نظری طور پر "انسان کامل" کی بحث پہلی مرتبہ محی الدین عربی نے چھیڑی۔ اس کے بعد اس بحث نے اسلامی عرفان میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔

محی الدین کے مرید و شاگرد، صدرالدین قونوی نے اپنی کتاب "مفتاح الغیب" میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نام سے دو عارفوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک، ساتویں صدی کے نصف دوم کے عارف عزیزالدین نسفی ہیں اور دوسرے یہی عبدالکریم جیلانی ہیں اور دونوں ہی کتابیں اسی نام سے چھپ چکی ہیں۔ جیلانی نے ۸۰۵ھ میں ۲۱ سال کی عمر میں وفات پائی ہے۔

نویں صدی کے عرفا

الف۔ شاہ نعمت اللہ ولی : خاندان آل علی علیہ السلام سے تعلق رکھتے ہیں مشہور و معروف عارف و صوفی ہیں۔ عصر حاضر میں نعمۃ اللّٰہی سلسلہ تصوف کے معروف ترین سلسلوں میں شمار ہوتا ہے۔ کرمان کے ایک قصبہ ماہان میں ان کی قبر صوفیوں کی زیارتگاہ ہے۔

کہتے ہیں انہوں نے ۹۵ سال عمر پائی اور ۸۲۰ھ یا ۸۲۷ھ یا ۸۳۴ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی بیشتر عمر آٹھویں صدی میں گزری ہے اور حافظ شیرازی سے ملاقات بھی رہی ہے عرفان میں ان کے بہت سے اشعار آج بھی موجود ہیں۔

ب۔ صائن الدین علی ترکہ اصفہانی : محقق عارفوں میں شمار ہوتے ہیں محی الدین کے نظری عرفان میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی کتاب تمہید القواعد۔ جو چھپ چکی

ہے اور آج بھی دستیاب ہے۔ عرفان میں ان کے تبحر و مہارت کی بہترین دلیل ہے اور ان کے بعد کے محققین اس سے سند کے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔

ج۔ محمد بن حمزہ فناری رومی : عثمانی مملکت کے علما میں سے ہیں۔ ایک جامع شخصیت کے مالک اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عرفان میں ان کی شہرت کا سبب ان کی کتاب "مصباح الانس" ہے، جو صدرالدین قونوی کی کتاب مفتاح الغیب کی شرح ہے محی الدین عربی یا صدرالدین قونوی کی کتابوں کی شرح ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن فناری نے یہ کام کر دکھایا اور ان کے بعد کے عرفانی محققوں نے ان کی شرح کی تائید و تعریف بھی کی ہے۔

یہ کتاب، اس آخری صدی کے محقق عارف، آقا میرزا ہاشم رشتی مرحوم کے حواشی کے ساتھ تہران میں چھپ چکی ہے لیکن افسوس، طباعت کی خرابی کی وجہ سے آقا میرزا ہاشم مرحوم کے حواشی کا بعض حصہ پڑھے جانے کے قابل نہیں ہے۔

د۔ شمس الدین محمد لاھیجی نور بخشی : محمود شبستری کی "گلشن راز" کے شارح اور میر صدرالدین دشتکی نیز علامہ دوانی کے ہم عصر ہیں۔ نور بخشی شیراز میں رہتے تھے۔ "مجالس المومنین" میں قاضی نوراللہ شوشتری، کی تحریر کے مطابق صدرالدین دشتکی اور علامہ دوانی ۔ یہ دونوں ہی اپنے زمانہ کے جید فلسفی تھے ۔ نور بخشی کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔

شمس الدین نور بخشی، سید محمد نور بخش کے مرید تھے اور نور بخش ابن فہد حلی کے شاگرد تھے۔ شمس الدین، گلشن راز کی شرح میں ص ۶۹۸ پر اپنے سلسلہ فقر کو سید محمد نور بخش سے شروع کر کے معروف کرخی تک پہنچاتے ہیں۔ پھر وہاں سے حضرت امام رضا علیہ السلام نیز، بقیہ ائمہ معصومین (ع) اور حضرت رسول اکرم (ص) سے ملاتے ہیں۔ اور اس سلسلہ کا نام سلسلۃ الذہب رکھتے ہیں۔

لاہیجی کی شہرت کا اصل سبب وہی گلشن راز کی شرح ہے جو عرفان کے اعلیٰ متون میں شمار ہوتی ہے۔ لاہیجی نے جیسا کہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے، ۸۷۷ھ سے

تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا ہے۔ ان کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے بظاہر انہوں نے ۶۰۹ھ سے پہلے ہی وفات پائی ہے۔

۵۔ نور الدین عبدالرحمٰن جامی: ان کا نسب، دوسری صدی ہجری کے مشہور فقیہ محمد بن حسن شیبانی سے ملتا ہے۔ جامی ایک نادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ انھیں فارسی زبان میں عرفان کا آخری عظیم شاعر مانا جاتا ہے۔

پہلے وہ "اپنا تخلص "دشتی" رکھا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ مشہد کے مضافات میں واقع "جام" میں پیدا ہوئے تھے اور احمد جامی (ژندہ پیل) کے مرید بھی تھے لہٰذا انہوں نے اپنا تخلص بدل کر "جامی" رکھ لیا۔ وہ کہتے ہیں: (۱)

مولدم جام و رشحہ قلمم — جرعہ جام شیخ الاسلامی است
زین سبب در جریدہ اشعار — بہ دو معنی تخلصم جامی است

جامی، نحو، صرف، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ، عرفان جیسے علوم میں مہارت رکھتے تھے اور بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

شرح فصوص الحکم محی الدین، شرح لمعات فخر الدین عراقی، شرح تائیہ ابن فارض، قصیدہ بردہ کی شرح جو حضرت رسول اکرمؐ کی مدح میں ہے، حضرت علی بن الحسینؑ کی مدح میں فرزدق کے قصیدہ کی شرح، لوائح، بہارستان ـ جو سعدی کی گلستان کے طرز پر لکھی گئی ہے ـ نفحات الانس (عرفا کے تذکرہ سے متعلق ہے)۔

جامی اگرچہ نقشبندی طریقت کے مؤسس بہاء الدین نقشبند کے مرید طریقت تھے۔ لیکن جس طرح سے محمد لاہیجی، سید محمد نوربخش کے مرید طریقت تھے لیکن ان کی ثقافتی و تاریخی حیثیت اپنے پیر و مراد سے زیادہ تھی اسی طرح جامی کی بھی ثقافتی و تاریخی حیثیت اپنے مرشد بہاء الدین نقشبند سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔ چونکہ یہاں ہمارا مقصد، عرفان کے ثقافتی شعبہ کی مختصر تاریخ بیان کرنا تھا۔ اس کے طریقتی حصہ سے ہمیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی لئے

۱ـ احمد جامی کا لقب شیخ الاسلام تھا۔

ہم نے صرف محمد لاہیجی اور عبدالرحمٰن جامی کے تذکرہ میں پر اکتفا کی اور ان کے مرشدوں کے ذکر سے اجتناب کیا ہے)۔ جامی نے ۸۹۸ھ میں ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی ہے۔

یہ تھی عرفان کی ابتدا سے نویں صدی کے اختتام تک کی مختصر تاریخ۔ میرے خیال میں نویں صدی ہجری کے بعد عرفان ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس تاریخ تک تمام عرفانی، ثقافتی اور علمی شخصیتیں تصوف کے باقاعدہ سلسلوں کا حصہ رہی ہیں۔ صوفیوں کے قطب و مرشد عرفا کی عظیم ثقافتی شخصیت مانے جاتے رہے ہیں اور عرفان کے عظیم آثار ان ہی شخصیتوں کے رہین منت ہیں۔ لیکن نویں صدی کے بعد کچھ دوسری ہی صورت حال رونما ہوتی ہے۔

اول یہ کہ صوفیوں کے تمام یا اکثر قطب و مرشد ان علمی و ثقافتی کمالات سے محروم نظر آتے ہیں جبکہ ان کے اسلاف مالا مال تھے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور کے بعد مروجہ و اصطلاحاً تصوف زیادہ تر آداب و رسوم و ظواہر اور بعض اوقات ان بدعتوں میں غرق ہو گیا، جنھیں خود اسی نے ایجاد کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ بعض افراد جو کسی بھی صوفی سلسلہ سے وابستہ نہیں ہیں، ابن عربی کے نظری عرفان میں اتنی مہارت حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کی نظیر، تصوف کے دعویداروں میں نظر ہی نہیں آتی۔

مثلاً صدرالدین کے عرفان نظری میں صدر المتالہین شیرازی (وفات ۱۰۵۰ھ) اور ان کے شاگرد ملا محسن فیض کاشانی (وفات ۱۰۹۱ھ) اور ان کے شاگرد کے شاگرد قاضی سعید قمی (وفات ۱۱۰۳ھ) کی معلومات اپنے زمانہ کے قطبوں اور مرشدوں سے کہیں زیادہ تھی جبکہ وہ تصوف کے کسی بھی سلسلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے یہ حالت آج ہمارے دور تک جوں کی توں باقی ہے مثلاً آقا محمد رضا قمشہ ای مرحوم اور آقا میرزا ہاشم رشتی مرحوم، نظری عرفان کے استاد رہے ہیں۔ حالانکہ وہ عملی طور پر تصوف کے کسی سلسلے سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔

بنیادی طور پر محی الدین کے زمانہ ہی سے جس وقت نظری عرفان کی بنیاد رکھی گئی اور عرفان نے فلسفی شکل اختیار کی اس روش کا آغاز ہو چکا تھا۔

مثلاً محمد حمزہ فناری۔ جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ شاید اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں،

لیکن دسویں صدی سے یہ صورت حال۔ یعنی نظری عرفان میں ان لوگوں کی مہارت جو یا تو سرے سے سیر و سلوک اور عملی عرفان سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے، یا اگر کچھ لگاؤ رکھتے بھی تھے تو وہ مروجہ تصوف کے سلسلوں سے کنارہ کش تھے ــ پورے طور پر ختم ہو گئی ہے

تیسرے یہ کہ ہمیں دسویں صدی سے کچھ ایسے افراد و گروہ نظر آتے ہیں جو اگرچہ عرفان اور سیر و سلوک کے دلدادہ تھے اور انہوں نے عرفانی مراحل و مقامات کو بہترین طور پر طے بھی کیا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے عرفان و تصوف کے مروجہ سلسلوں سے خود کو وابستہ نہیں کیا بلکہ ان سے بے توجہی بھی برتی ہے اور ان کی کلی و جزوی طور پر مخالفت کرتے رہے ہیں۔

یہ گروہ جو ساتھ ہی ساتھ فقہ و فقاہت کا بھی دلدادہ تھا اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سیر و سلوک کے آداب کو فقہی آداب سے پورے طور پر منطبق کر دیا ہے۔ اس گروہ کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے جسے بیان کرنے کی فی الحال گنجائش نہیں ہے۔

الله ولي التوفيق

وبه نستعين ونستجير انه ولي الهداية والتوفيق وعليه التكلان

تفکّر اور تزکیۂ نفس کا راستہ

جناب شیخ جوادی آملی

ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

آٹھویں اعتراض میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ہمیں اپنے گزشتہ بزرگوں کی راہ اختیار کرنا چاہیے کیونکہ وہ علم اور منطقی اصول سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے اور صرف کتاب و سنت کے مطابق عمل کرتے تھے، یہ وجہ تھی کہ وہ حکماء اور منطقیوں کے اشتباہات سے بری تھے۔

گزشتہ مقالہ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر اس سے اعتراض کرنے والوں کی مراد یہ ہے کہ ہم عمل صالح کے ذریعہ حقائق تک پہنچیں، نہ کہ فکر و نظر کے ذریعہ تو یہ وہ روش ہے جسے اسلام سے قبل کے حکماء اور اسلام کے بعد کے بعض متاخرین حکماء و محققین نے اپنایا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: انسان کو تزکیۂ نفس کے ذریعہ کمال حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن بعض حکماء اسلام کے قائل ہیں کہ ارواح، جسموں کے پہلے موجود تھیں اور ایک انسان کے لئے سزاوار تمام علوم و معارف سے آگاہ و واقف تھیں۔ اور جب ان روحوں نے بدن سے رابطہ قائم کیا تو ان علوم کو فراموش کر گئیں۔ اب تزکیہ نفس اس لئے ہے کہ یہ روحیں جو کچھ فراموش کر گئی ہیں دوبارہ انھیں یاد آجائے، نہ یہ کہ تزکیہ نفس کے ذریعہ کوئی علم حاصل کریں۔ یا پھر تزکیہ نفس اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ انسان اپنی روح کو آئینہ کے مانند صیقل کرکے شفاف بنائے تاکہ تمام اسرار عالم اس کے آئینہ دل میں جلوہ گر ہو جائیں اور جس طرح خواب کے عالم میں انسان پر حقائق منکشف ہوتے ہیں یوں ہی وہ بیداری میں اسرار

عالم کا مشاہدہ کرے۔ یہ وہ راہ ہے جس کے قائل اشراقی حکماء اور ان کے ہم فکر افراد ہیں۔

شرع کے ذریعہ تزکیۂ نفس

اور اگر اس سے اعتراض کرنے والوں کی مراد یہ ہے کہ ہم تزکیۂ نفس کریں عرفان کے ذریعہ نہیں بلکہ شرع کے ذریعہ! تو یہ عارف اور اخباری کے اقوال کے درمیان ایک طرح کا جوڑ اور پیوند ہے اخباری کہتے ہیں کہ حقائق کو کتاب و سنت کے ظواہر سے حاصل کرنا چاہیئے اور عارف کہتے ہیں کہ تزکیۂ نفس کے ذریعہ الٰہی معارف و حقائق تک رسائی حاصل کرنا چاہیئے۔ اور اعتراض کرنے والے اس سلسلہ میں ان دونوں اقوال کے درمیان جوڑ اور ربط پیدا کرنا چاہتے ہیں لہٰذا کہتے ہیں کہ ظواہر کتاب و سنت کو تزکیۂ نفس کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیئے!

بہرحال یہ درست نہیں ہے کہ ہم کتاب و سنت کے ظاہری معانی و مطالب پر ہی اکتفا کریں اور اسی پر جم جائیں، جیسا کہ اخباریوں نے کیا، بلکہ ظواہر کتاب و سنت کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرنی چاہیئے کہ تجسس و تحقیق کے ذریعہ کتاب و سنت میں مضمر اور گہرے معارف و حقائق حاصل کئے جائیں۔ روایت میں ہے کہ:"

"القرآن علیٰ اربعۃ اقسام: الحقائق للأنبیاء والاشارات للأولیاء وَاللطائف للخواص وَالعبارات للعوام"

یہ حدیث مرحوم مجلسی نے بحار الانوار میں حضرت سید الشہداء امام حسینؑ سے بھی نقل کی ہے اور امام صادقؑ سے بھی۔ روایت کا مضمون یہ ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں: کتاب یعنی قرآن کا ظاہری معنی و مطلب بھی معتبر ہے اور آیات و روایات کے اسرار و رموز بھی لہٰذا ظواہر کے ساتھ اسرار و رموز کو بھی ضرور حاصل کرنا چاہیئے اور ان کی بنیاد پر تزکیۂ نفس کا آغاز کرنا چاہیئے ایسا نہیں ہے کہ ہر راہ کے ذریعہ منزل یا مقصد تک پہنچا جا سکتا ہے، کوئی عارف یہ نہیں کہتا کہ: ہم نے خود راہ کا تعین کیا ہے بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ وہی راہ جس کی نشان دہی وحی کرتی ہے طے کرنا چاہیئے، اور بہرحال تمام آیات و روایات کو بخوبی سمجھنا چاہیئے پھر ان پر عمل کرنا چاہیئے۔

عارف اور اخباری کا اختلاف

وہی نزاع جو اصولیوں اور اخباریوں کے درمیان ہے کہ ہر خبر کے ظاہر ہی کو نہیں اپنا لینا چاہیئے بلکہ متشابہ روایتوں کو محکم روایتوں کی طرف پلٹانا چاہیئے۔ مطلق روایتوں پر مقید روایتوں کی قید لگانا چاہیئے، عمومی روایتوں کو مخصص روایتوں کے ساتھ تخصیص دینا چاہیئے پھر ان کو جمع کرنے کے بعد آخری نتیجہ کا اظہار کرنا چاہیئے بالکل ایسا ہی نزاع عارف اور اخباری کے درمیان بھی ہے عارف کہتے ہیں، تمام روایات کی چھان بین کرنا چاہیئے اور ان کی باریکیوں تک پہنچنا چاہیئے۔ نہ یہ کہ ایک ہی روایت سے چپک کر رہ جائیں! چنانچہ اگر مثال کے طور پر، ایک روایت سے یہ ظاہر ہو کہ "لوہا نجس ہے" تو انسان کو اخباریوں کی طرح یہ فتویٰ نہ دے بیٹھنا چاہیئے کہ لوہا نجس ہے! اور اسی کے مانند دوسرے مسائل۔

چلہ کشی

گزشتہ بحث میں ہم نے شیخ اشراق کی بات نقل کی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنا تزکیۂ نفس کرے تو وہ الٰہی معارف و حقائق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ شیخ اشراق (سہروردی) "حکمۃ الاشراق" کے آخر میں ایک وصیت بھی فرماتے ہیں کہ: مقدمۂ بحث کے طور پر، جب تم منطقی اصول اور مشائین کے طرز تفکر سے آشنا ہو گئے تو چالیس روز کا ایک وظیفہ مقرر کر لو۔

اس چلہ کشی کا ذکر ہماری روایتوں کے بہت سے مجموعوں میں آیا ہے۔ منجملہ ان کے رسول خدا سے ایک روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ یَوْماً فَجَّرَ اللّٰہُ یَنَابِیعَ الْحِکْمَةِ مِنْ قَلْبِہِ عَلٰی لِسَانِہِ" (۱) "جو شخص چالیس روز تک خالص اللہ کے لئے اعمال انجام دے خداوند عالم حکمت کے چشمے اس کے قلب سے جاری کر کے اس کی زبان پر رواں کر دے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خداوند عالم کی توفیق شامل حال رہی تو بحث کی

۱۔ بحار الانوار ج ۶۷ ص ۲۴۹۔ رسول خداؐ سے ایک دوسری روایت بھی منقول ہے، جس کا مضمون یہ ہے:

دوسری منزل یعنی "تزکیہ" کے ذیل میں کچھ اور باتیں بیان کی جائیں گی ۔

بہرحال شیخ اشراق کہتے ہیں کہ: میرے طرز تفکر سے آشنا ہونے کے لئے نظری مقدمات کی احتیاج کے علاوہ چلہ کشی کی بھی ضرورت ہے ۔ چلہ کشی کا مطلب یہ ہے کہ انسان چالیس شب و روز تک بہت محتاط رہے، کوئی قدم اللہ کی مرضی کے خلاف نہ اٹھائے اور اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرے ۔ البتہ یہ کام بہت دشوار ہے لیکن نتیجہ خیز اور ثمر بخش بھی ہے۔ جناب موسیٰ کلیم اللہ چالیس شب و روز اللہ کے مہمان رہے جس کے نتیجہ میں آپ کو توریت عطا ہوئی :

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (۱)

"اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور دس شبوں کا اضافہ کر کے انھیں پورا کر دیا اس طرح ان کے پروردگار کا وعدہ چالیس راتوں میں مکمل ہوا۔"

یہاں جو "لیل" یعنی رات کا ذکر ہے ، اس لئے ہے کہ کہتے ہیں : اکثر و بیشتر فیوض و برکات اہل طریقت کو شب زندہ داری میں ہی نصیب ہوتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ آیت میں بھی آیا:

"اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا" (۲)

"یعنی شب کا قیام اور عبادت خضوع و خشوع اور حضور قلب میں اضافہ کرتی ہے اور گفتار و کلام میں استحکام و پائداری عطا کرتی ہے۔"

بنابرایں تزکیۂ نفس کو حکمت اشراق میں پہلی شرط کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے تاکہ انسان صحیح راہ طے کرے اور حقائق و معارف کو بخوبی سمجھ سکے ۔

٭ مَا اَخْلَصَ عَبْدٌ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحاً اِلَّا جَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ" (عیون الاخبار ، ج ۲ ۔ ص ۶۹) مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ خالص اللہ کے لئے چالیس دن کوئی عمل انجام دے تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے ابل کر اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

۱۔ سورہ اعراف / ۱۴۲

۲۔ مزمل / ۶

صالح اسلاف کا نظریاتی اختلاف

اگر اعتراض کرنے والے کہیں کہ ہمیں صالح اسلاف کی روش پر چلنا چاہیئے کیونکہ یہ حضرات اختلاف واشتباہ اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے محفوظ تھے۔ تو ان کا جواب یہ ہے کہ: شیخ اشراق (سہروردی) اور شیخ مفیدؒ سے بہتر اسلاف اور کون ہوں گے؟ شیخ صدوق نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام "اعتقاداتنا" ہے اور جو "اعتقادات شیخ صدوق" کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اس میں اصول و فروع، جنت وجہنم، لوح وقلم اور قضا وقدر وغیرہ سے متعلق تقریباً سو مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے ان سب پر یا ان میں سے بہت سے عقائد پر خط بطلان کھینچتے ہوئے دلائل کے ذریعہ ان کی باتوں کو رد کیا ہے اور یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔(۱)

یہ دونوں بزرگوار شیعوں کے عظیم علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صالح اور نیک اسلاف آپس میں نظریاتی اختلاف نہیں رکھتے تھے، یعنی اگر کسی ایک نے کوئی روایت نقل کی یا کسی روایت کے سلسلہ میں اطمینان حاصل کر لیا تو ایسا نہیں تھا کہ دوسرا بھی بہرحال اسے وحی الٰہی سمجھ لے اور اس کو رد نہ کرے! مزے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے اختلافات صرف فقہی فروعات ہی میں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ حضرات ذات اقدس الٰہی اسماء حسنیٰ اور صفات ربوبیت سے لے کر وحی وجنت وجہنم وغیرہ جیسے تمام مسائل میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔

۱۔ شیخ صدوقؒ کی کتاب کا نام "اعتقاداتنا" ہے اور شیخ مفید کی کتاب کا نام جو انہوں نے اس کے جواب میں لکھی ہے "تصحیح اعتقادات الصدوق" ہے یہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور علماء و دانشور افراد کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔ اس رسالہ کی ابتداء "کشف الساق" کے معنی سے ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت (یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود) میں ہے۔ اور اس کا اختتام "فی الحظر والاباحۃ فی الطّلب" کے موضوع پر ہوا ہے۔ اس میں جہاں بھی شیخ صدوق کوئی بات بیان فرماتے ہیں اس طرح شروع ہوتی ہے۔ "قال ابوجعفر" اعتقادنا۔ مثلاً۔ فی المسألۃ

بہرحال اگر انسان تزکیۂ نفس اور عمل صالح کے ذریعہ کسی بات کا علم حاصل کرے اور اس کی قدر و قیمت یا اہمیت کو سمجھنا چاہے تو اسے بہرصورت "منطقی روش" کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اگر اعتراض کرنے والے بھی اپنے صاحبان کی روش پر چلنا چاہتے ہیں تو ان کی باتیں معلوم کرنے کے لئے مجبوراً انھیں بھی منطقی قوانین [redacted] لینا پڑے گا، اور اگر ذرا بھی ان منطقی قوانین میں بھول چوک یا سہل انگاری سے کام لیا گیا تو نتیجہ الٹا برآمد ہوگا۔ جس طرح ایک زبر و زیر سے مطلب بدل جاتا ہے یوں ہی منطقی قوانین میں بھی اگر سالبہ کو موجبہ کی جگہ اور موجبہ کو سالبہ کی جگہ رکھ دیا جائے یا صغریٰ کے شرائط کبریٰ [redacted] کبریٰ کے شرائط صغریٰ میں بیان کر دیئے جائیں تو مطلب یا نتیجہ مبہم اور ناقص ہو کر رہ جائے گا لہٰذا کسی بھی مفہوم یا مطلب کو منطقی روش کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا تھا مگر یہ کہ انسان معصوم ہو [redacted] ت، ہمیشہ معصوم کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

پس جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہمیں فلسفی اصول یا [redacted] فکری روش کی کوئی ضرورت نہیں ہے آخر اس سے ان کی مراد کیا ہے؟ انھیں مندرجہ ذیل تین [redacted] میں سے بہرحال ایک بات ماننی چاہیئے

۱ ـــــ منطقی طرز تفکر باطل ہے!

۲ ـــــ منطقی طریقہ فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ حقیقی راہ تزکیۂ نفس کی راہ ہے!

۳ ـــــ منطقی و عقلی روش درست ہے اور تزکیۂ نفس کی روش بھی صحیح و درست ہے

یعنی درحقیقت راہیں دو ہیں۔

فکر کے ذریعہ انسانی ارتقا

اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ منطقی روش باطل ہے اور انسانی [redacted] کا واحد راستہ تزکیۂ نفس ہے۔ تو یہ انسانیت نے جو ترقی کی ہے اور کر رہی ہے [redacted] کے ذریعہ اپنی مشکلات و ضروریات

فی القبر انها حق ..... " پھر شیخ مفیدؒ اس کے جواب میں [redacted] کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں: قال
ابو عبداللہ الشیخ المفید (رحمہ اللہ): الذی ذکرہ ابو [redacted] ..." اور یہی صدوقؒ پسند کتاب کی

حل کرتی ہے یا اس نے تزکیۂ نفس کی راہ طے کی ہے اور کررہی ہے یا منطقی روش کو اپنا رکھا ہے ؟!
انسانی علوم نے آج جو اس قدر پیش رفت کی ہے کہ دنیا کے بہت سے اسرار و رموز حل کرڈالے ہیں اور اپنے کمال کی طرف گامزن ہے ، اس نے یہ اسرار استدلالی روش کے ذریعہ حاصل کئے ہیں یا تزکیۂ نفس کے ذریعہ ؟! اصل میں دنیا کے بہت سے مفکرین نے تو "تزکیۂ نفس" کا لفظ سنا بھی نہیں ہے اس کے علاوہ تزکیۂ نفس کی راہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار گذار ہے کہ سوائے معدودے چند بے نظیر افراد کے کوئی اور اس راہ میں چل نہیں پاتا ۔ مزید یہ کہ جب خداوند عالم نے انسان کو آنکھیں کان اور دل عطا کئے ہیں اور غور و فکر کا طریقہ سکھایا ہے پھر وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ راہ باطل ہے اور صرف دل کی راہ کے ذریعہ معارف و حقائق تک پہنچا جاسکتا ہے ؟!
پس فکری و عقلی راہ کو باطل نہیں کہا جاسکتا اور صرف تزکیۂ نفس کو ہی تنہا راہ فلاح نہیں گردانا جاسکتا ۔

فکری اسباب و وسائل کی ضرورت

اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان منطقی و فکری روش کا محتاج نہیں ہے تو یہ بھی ایک سراسر غلط اور مہمل بات ہے ، کیونکہ اگر انسان کو غور و فکر کی ضرورت نہ ہوتی تو خداوند عالم اسے ان فکری وسائل سے آراستہ نہ کرتا ۔ خداوند عالم نے انسان کو ایک غور و فکر کرنے والے سمیع و بصیر کے عنوان سے خلق فرمایا اور متعارف کرایا ہے اگر اسے ان چیزوں کی ضرورت نہ ہوتی تو خداوند عالم نے انسانی فطرت کو فکر و تدبر کے ملکہ کے ساتھ خلق نہ فرمایا ہوتا ۔ اگر انسان احساس ہی کھو بیٹھا ہو تو وہ علوم جنھیں حاصل کرنے کے لئے اسے حس یا احساس کی ضرورت ہے انھیں تزکیۂ نفس کے ذریعہ کیسے حاصل کرسکتا ہے ؟
اور اگر کوئی کہے کہ سماعت و بصارت اور دوسرے تمام ادراک کے وسائل تزکیۂ نفس ہی کا مقدمہ ہیں تو گویا اس نے یہ کہہ کر خود اپنی بات کو غلط قرار دیا ہے ۔ اگر انسان کو ادراک کرنے والے وسائل کی ضرورت نہیں ہے اور وہ فقط دل کی راہ سے کائنات کے حقائق سے آشنا ہوسکتا ہے اگر وہ اپنے حواس کھو بیٹھے تو دل کی راہ بھی اس پر کھلی نہ رہے گی ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ارتقا و کمال کی دو راہیں ہیں (۱) فکری راہ (۲) تزکیۂ نفس کی راہ تو یہی وہ صحیح اور درست نکتہ ہے۔ جسے تمام حکماء نے بیان کیا ہے، لیکن پہلی راہ نسبتاً آسان ہے اور اس کا نتیجہ و حاصل بھی بہت زیادہ ہے۔ جبکہ دوسری راہ بہت دشوار ہے اور اس کا نتیجہ و حاصل بھی کم ہے۔ البتہ اس نتیجہ کے کم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں کم ہے، ورنہ جو کچھ زید بن حارثہ نے پایا، کم نہ تھا۔ زید بن حارثہ کہتے تھے: میں تم لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوں، لیکن اسی عالم میں اہل جہنم کی چیخ پکار سن رہا ہوں، اپنی آنکھوں سے اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں۔ بہت دشوار ہے کہ عقلی روش اس بلند ترین مقام تک رسائی حاصل کر سکے چنانچہ اگر سلف صالح کی روش کا مطلب یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ تزکیۂ نفس کی کوشش کرے تو یہ درست ہے۔



نہج البلاغہ
کے سیاسی تعلیمات

سپہ سالاروں کے خصوصیات

جناب شیخ محمد تقی رھبر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

تسلیم واطاعت

گزشتہ مقالہ میں کلی طور سے حکومت کے عہدہ داروں اور مملکت کے کارگزاروں کے خصوصیات ناظرین کی نگاہ سے گزر چکے ہیں۔ اب یہاں ہم مالک اشتر کو تحریر کردہ امامؑ کے اس منشور کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں حضرت فوجی سپہ سالاروں اور مسلح افواج کے خصوصیات، ان کے انتخاب کی کیفیت نیز ان کے ساتھ ذمہ دار افراد کے سلوک اور طرز عمل پر ایک ذرا وضاحت و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَوَلِّ مِنْ جُنُودِكَ أَنْصَحَهُمْ فِي نَفْسِكَ لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِإِمَامِكَ وَأَنْقَاهُمْ جَيْبًا وَأَفْضَلَهُمْ حِلْمًا مِمَّنْ يُبْطِئُ عَنِ الْغَضَبِ وَيَسْتَرِيحُ إِلَى الْعُذْرِ وَيَرْأَفُ بِالضُّعَفَاءِ وَيَنْبُو عَلَى الْأَقْوِيَاءِ وَمِمَّنْ لَا يُثِيرُهُ الْعُنْفُ وَلَا يَقْعُدُ بِهِ الضَّعْفُ"۔ (نہج البلاغہ خطبہ/۵۳)

اپنے لشکر میں سے سپہ سالاری کے لئے اسے منتخب کرو جو تمہاری نگاہ میں اللہ، رسول اور تمہارے امام کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہو۔ سب سے زیادہ پاک دامن اور بردبار ہو غصہ سے پرہیز کرتا ہو عذر معذرت قبول کر لیتا ہو۔ کمزوروں پر مہربان ہو اور طاقتوروں

کو خاطر میں نہ لاتا ہو۔ خشونت اسے جوش میں نہ لاتی ہو اور پست ہمتی و ناتوانی اسے پیچھے نہ ڈھکیل دیتی ہو۔

خاندانی نجابت، درخشاں ماضی اور اخلاقی صلاحیت

"ثُمَّ الْصق بِذَوِي الْمُرُوآتِ وَالْأَحْسَابِ وَأَهْلِ الْبُيُوتَاتِ الصَّالِحَةِ وَالسَّوَابِقِ الْحَسَنَةِ، ثُمَّ أَهْلِ النَّجْدَةِ وَالشَّجَاعَةِ وَالسَّخَاءِ وَالسَّمَاحَةِ فَإِنَّهُمْ جِمَاعٌ مِنَ الْكَرَمِ وَشُعَبٌ مِنَ الْعُرْفِ."

"اس کے بعد اپنے تعلقات و روابط ان لوگوں کے ساتھ مستحکم کرو جو بلند ہمت، جواں مرد اور شریف ہوں نیز درخشاں ماضی رکھنے والے اور صالح و نیک خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں، شجاعت و شہامت اور بخشش و سخاوت رکھتے ہوں، کیونکہ ایسے ہی لوگ بزرگی و کرامت کا منبع اور نیکیوں کا سرچشمہ ہیں۔"

غیر الٰہی سیاسی نظاموں میں، فوجیوں اور دفاعی قوتوں کا کام صرف حاکم قوتوں کی حفاظت اور طاقتور عناصر کے مقاصد کی تکمیل ہوا کرتا ہے۔ اس فوجی اور سیاسی نظام میں ایک فوجی سے یہی تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کر کے، اسلحہ اٹھائے اور جدھر بھی افسر حملہ کا حکم دیں حملہ کر دے۔ اگر بندوق کی گولیوں کے لئے عقل، ایمان اور اخلاق کوئی مفہوم رکھتے ہیں تو فوجیوں کے لئے بھی یہ باتیں بامعنی ہوں گی! یہ لوگ خود اس حقیقت سے غافل ہیں اور دشمن نے جو اسلحہ ان کے ہاتھوں میں تھمایا ہے اس سے خود اپنے اور اپنے ہی جیسے دوسرے مظلوم افراد پر گولیاں برسا دیتے ہیں۔

دنیا کی مظلوم اور قید و بند میں جکڑی ہوئی قوموں پر تمام مظالم کے پہاڑ ان ہی فوجیوں کے ہاتھوں توڑے جاتے ہیں۔ یہی لوگ کشتوں کے پشتے بھی لگاتے ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں جبکہ فتح و کامیابی کے فائدے اور تمام منافع ظالم و جابر حکام کے قدموں میں یہی لوگ بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ یہ تو ہے ایک غیر الٰہی نظام کی حاکمیت کا انداز۔ لیکن ایک الٰہی نظام میں صورت حال ہی کچھ اور ہے۔

یہاں افسر اور سپاہی سب ایک مقصد رکھتے ہیں ۔ ایسا مقصد جو حکومت اور ولی امر کے مقصد سے ہم آہنگی رکھتا ہے ۔ وہ مقصد ہے رضائے خدا اور اس کے محروم و مظلوم بندوں کی حمایت ۔ ظالموں کے فتنوں کو دفع کرنا اور عدل و انصاف قائم کرنا ۔ جیسا کہ قرآن کی آیتیں اس بات کی گواہ ہیں :

"الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ" (نساء/۷۶)

"جو لوگ صاحبان ایمان ہیں ، خدا کی راہ میں قتال کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت اور شیطان کی راہ میں جنگ کرتے ہیں ۔"

قرآن میں "مجاہد فی سبیل اللہ" انسان کی کتاب فضیلت و شرف کا سب سے عظیم عنوان ہے ۔

فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۔" (سورہ نساء ، آیت نمبر ۹۵)

" خداوند عالم نے مجاہدوں اور راہ خدا میں جان و مال لٹانے والوں کو بیٹھے رہ جانے والوں پر بلندی عطا کی ہے ۔"

مجاہدین راہ خدا نے یہ درجہ اور یہ بلندی یہ عظمت و فضیلت ، خود سازی ، شرافت نفس ، اخلاص و عمل ، تقویٰ و پرہیزگاری اور ایثار و فداکاری کے ذریعہ حاصل کی ہے ورنہ ان کے لئے ان محاسن سے الگ فضیلت کا کوئی مفہوم نہ ہوتا ۔

حضرت علیؑ چونکہ خود بھی اسلامی افواج کے سپہ سالار رہے ہیں لہٰذا جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اسی اصل کے پیش نظر آپؑ نے اسلامی فوجیوں اور سپہ سالاروں کے معیار و خصوصیات بہترین عنوان سے بیان فرمائے ہیں ، اور اس کے بعد ان فرائض و حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے جو فوجیوں اور ان کے سپہ سالاروں کے سلسلہ میں اسلامی نظام کے حاکم و ذمہ دار شخص پر عائد ہوتے ہیں ۔

جہاد کرنے والوں کی دیکھ بھال

"ثُمَّ تَفَقَّدْ مِنْ اُمُوْرِهِمْ مَا يَتَفَقَّدُ الْوَالِدَانِ مِنْ وَلَدِهِمَا وَلَا يَتَفَاقَمَنَّ فِيْ نَفْسِكَ شَيْءٌ قَوَّيْتَهُمْ بِهِ وَلَا تَحْقِرَنَّ لُطْفًا تَعَاهَدْتَهُمْ بِهِ وَاِنْ قَلَّ، فَاِنَّهُ دَاعِيَةٌ لَهُمْ اِلٰى بَذْلِ النَّصِيْحَةِ لَكَ وَحُسْنِ الظَّنِّ بِكَ. وَلَا تَدَعْ تَفَقُّدَ لَطِيْفِ اُمُوْرِهِمْ اِتِّكَالًا عَلٰى جَسِيْمِهَا. فَاِنَّ لِلْيَسِيْرِ مِنْ لُطْفِكَ مَوْضِعًا يَنْتَفِعُوْنَ بِهِ وَلِلْجَسِيْمِ مَوْقِعًا لَا يَسْتَغْنُوْنَ عَنْهُ"

(نہج البلاغہ / خط: ۵۳)

"پھر ان کی اس طرح دیکھ بھال کرو جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کی خبر گیری اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اگر تم کسی کام سے انھیں تقویت پہنچاؤ تو اسے بڑا کام نہ سمجھنا، اور ان کے لئے اپنے کسی بھی لطف و کرم کو حقیر و ناچیز شمار نہ کرنا چاہے وہ بالکل معمولی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اس حسن سلوک سے ان میں تمہارے لئے حسن ظن اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ سچائی، لگن اور اعتماد کے ساتھ خدمت کریں گے۔ ان کی بڑی اور اہم ضرورتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کی چھوٹی اور معمولی ضرورتیں بھی دریافت کرنے سے دریغ نہ کرنا کیونکہ یہ حقیر و معمولی مہربانیاں اپنی جگہ مفید ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور بڑی ضرورتیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ جن سے وہ بے نیاز نہیں ہوں گے۔"

اسلامی فوجیوں اور امت کے خدمت گزاروں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کے سلسلہ میں امام (ع) کے فرمان و ہدایات اور مادی و استکباری نظاموں میں فوجیوں کے حالات و کیفیات کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان نظاموں میں سپاہی و فوجی کم ترین قدر و منزلت سے دور اور معمولی محبتوں اور مہربانیوں سے بھی محروم ہیں۔ ان کے یہاں فوجی مقاصد کے حصول کا راز بے رحمی و سختی رعب و دھمکی، قید و بند، اذیت اور قتل و غارت کا خوف ہے۔ اس طرح کی فوجوں میں اپنے ماتحت سپاہیوں کی اہانت و تحقیر کرنا، انھیں فحش و گالیاں دینا ایک ایسی عادت ہے جس کی

انھیں باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے اور اگر ظاہری طور پر کوئی شاباشی یا عہدہ کی ترقی نظر آتی بھی ہے تو ان سے اچھی خدمت لینے اور ان پر زیادہ تسلط پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے تاکہ یہ فوجی، شیطانی طاقتوں کے بہترین خدمت گزار اور فداکار بنے رہیں۔

یہ ہے غیر الٰہی فوجوں کی صورت حال، چاہے اسے ماضی و حال کے آئینہ میں دیکھا جائے یا مستقبل کے دھندلکے میں، لیکن اسلام میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں چونکہ دین اور اسلامی سرزمین کا دفاع کرنے والے ایک خاص قدر و منزلت اور عظمت و تقدس کے حامل ہیں اس لئے بلا شبہ ہر ایک انھیں اکرام و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ حتیٰ ان کے سردار اور افسر بھی ان کی قدر کرتے ہیں اور حفظ مراتب کے ساتھ ان کی منزلت اور ان کا مقام بھی محفوظ ہے۔ حضرت علیؑ کے ارشاد کے مطابق سپہ سالار اپنے ماتحت سپاہیوں اور جانبازوں کے لئے ویسا ہی ہے جیسے بیٹوں کے لئے ماں باپ ہوتے ہیں۔ ایسے مہربان ماں باپ جو اپنی اولاد کے لئے ہر طرح کی محبت و شفقت کا اظہار کرتے ہیں اور ہر خوشی و غم، راحت و پریشانی اور جنگ و امن کے حالات میں ان کے دوش بدوش رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے نظام میں ایک سپاہی یا جانباز کبھی حقارت و ذلت کا احساس نہیں کرتا۔ سپہ سالار کو اپنے باپ کے مانند سمجھتا ہے اور خود کو اس کا بیٹا سمجھتا ہے۔ لہٰذا فطری سی بات ہے کہ ایسے فوجی نظام میں اتحاد و یکجہتی اور مہربانی و ایثار کا دور دورہ ہوگا جس کے نمونے ہمیں پیغمبر اکرمؐ اور ائمۂ معصومینؑ کی سیرت و سیاست میں نظر آتے ہیں۔

حضرت علیؑ خود فرماتے ہیں: جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی تو ہم پیغمبرؐ کے سایہ میں پناہ حاصل کرتے تھے، اس وقت ہم دیکھتے تھے کہ پیغمبرؐ دشمن سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ یعنی آنحضرتؐ محاذ جنگ کی صف اول میں نظر آتے تھے۔ حضرت علیؑ کی بھی یہی شان تھی یہ حضرات اپنے جانبازوں اور سپاہیوں کے ساتھ نہایت لطف و محبت سے پیش آتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انھیں اپنی بہترین اولاد سمجھتے تھے۔ فوجی نظاموں کی تاریخ میں پیغمبر اکرمؐ اور امامؑ کے زمانہ کے بعد اس طرز عمل کے آثار پہلی مرتبہ اسلامی جمہوریہ ایران کی فوج اور سپاہ میں نظر آرہے ہیں جسے اس انقلاب کے لئے افتخار کی ایک اور سند شمار کیا جا سکتا ہے۔

سپہ سالاروں کا فوجیوں سے رابطہ

بات یہیں تمام نہیں ہوتی۔ بلکہ سپاہیوں اور جانبازوں کے حالات کی دیکھ بھال سے متعلق ہدایات کا سلسلہ یوں جاری رہتا ہے:

"وَلْيَكُنْ آثَرُ رُؤُوسِ جُنْدِكَ مَنْ وَاسَاهُمْ فِي مَعُونَتِهِ وَأَفْضَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ جِدَتِهِ بِمَا يَسَعُهُمْ وَيَسَعُ مَنْ وَرَاءَهُمْ مِنْ خُلُوفِ أَهْلِيهِمْ حَتَّى يَكُونَ هَمُّهُمْ هَمّاً وَاحِداً فِي جِهَادِ الْعَدُوِّ۔ فَإِنَّ عَطْفَكَ عَلَيْهِمْ يَعْطِفُ قُلُوبَهُمْ عَلَيْكَ"۔

- تمہارے سپہ سالاروں میں منتخب اور باشرف وہ سپہ سالار ہونا چاہیئے جو سپاہیوں اور جانبازوں کی مدد اور اعانت میں سب سے آگے ہو اور موجودہ امکانات و وسائل سے ان کی اور ان کے عیال کی ضرورتیں پوری کرے۔ تاکہ یہ سپاہی مصمم ارادے کے ساتھ متحد ہو کر دشمن سے جنگ کریں۔ مسلّم ہے کہ سپاہیوں کے ساتھ تمہاری محبتوں اور عنایتوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے دل تمہاری طرف کھنچتے جائیں گے۔

اب تک جو باتیں اوپر ذکر ہوئیں ان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں مسلح افواج ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ مادی و روحانی، دنیوی و اُخروی شرف و منزلت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس نظام میں ماتحت اور مافوق افراد کی شخصیت ان کی صداقت، ایمان، مساوات اور ایثار و فداکاری سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اور ان کے اہل و عیال زندگی کے مسائل میں کسی دشواری کا شکار نہیں ہوتے بلکہ اسلامی نظام ان کا بھرپور خیال کرتا ہے۔

سپہ سالار لشکر کہ اپنے ماتحتوں سے روابط باپ اور بیٹے کے مشفقانہ روابط کی حد تک بڑھ جاتے ہیں، اس طرح وہ ایک دل ہو جاتے ہیں اور ایک ہدف و مقصد کی جانب باہم قدم بڑھاتے ہیں اور وہ مقصد دین خدا کا قیام، امت کی نجات و آزادی، ضعیفوں اور کمزوروں کی فلاح اور اسلامی ملک و وطن کی عقیدتی، سیاسی اور جغرافیائی حدوں کی حفاظت ہے اور کبھی وہ اس راہ میں شہادت کے عظیم مرتبہ یا اسی کے ہم رتبہ درجہ پر فائز بھی ہو جاتے ہیں

یہ باتیں ان مادی حکومتوں کے جابر حکام اور بے لگام فوجوں میں کہاں ملیں گی جو ہوس پرستوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں اور بد سرشت سیاہ فاموں کے ہاتھ کا ہتھیار ہیں؟!

روزمرہ کے مسائل سے حکومت کی دلچسپی

گزشتہ بحثوں میں جو باتیں نظر سے گزریں ان سے ہمیں مختلف جماعتوں و گروہوں نیز اپنے ارکان کارکنوں خدمت گزار افراد اور حامیوں کے ساتھ اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں سے آگاہی ہوئی ان بحثوں کے دوران جو ایک بہت اہم نکتہ سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ اسلامی حکومت کے سربراہ حاکم یا اس نظام کے دوسرے افراد کے لئے کسی طرح یہ درست نہیں ہے کہ اپنے فرائض و امور دوسروں کے سپرد کرکے خود ایک گوشہ میں بیٹھ رہیں۔ بلکہ مملکت کے مسائل سے براہ راست نمٹنا چوکس نگرانی اور حالات کا مطالعہ کرنا ایک حاکم کا ناگزیر فریضہ ہے۔ حکومت، ریاست یا اسے جو چاہیں کہیں ـ کا فریضہ ہے کہ تمام اجتماعی و سیاسی مسائل کو قانون و قضاوت سے لے کر فوج و سپاہ تک، قانون کا اجرا کرنے والوں سے لے کر قانون سازوں، مختلف اداروں کے کارکنوں سے لے کر عوام کی مشکلات تک مختصر یہ کہ ان تمام امور کو براہ راست زیر نظر رکھے جن کا حکومت اور عوام سے سروکار ہے۔ اسے کلی طور پر تمام امور سے آگاہی رکھنا چاہئے۔

یہاں بعض مسائل خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ایسے مسائل میں حاکم اور اسلامی حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد کو چاہئے کہ براہ راست میدان عمل میں آئیں اور حالات سے آگاہی حاصل کرکے انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت علیؑ اپنے فرمان میں مالک اشتر کو اس مطلب کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثُمَّ أُمُورٌ مِنْ أُمُورِكَ لابُدَّ لَكَ مِنْ مُبَاشَرَتِهَا: مِنْهَا إِجَابَةُ عُمَّالِكَ بِمَا يَعْيَا عَنْهُ كُتَّابُكَ، وَمِنْهَا إِصْدَارُ حَاجَاتِ النَّاسِ يَوْمَ وُرُودِهَا عَلَيْكَ بِمَا تَحْرَجُ بِهِ صُدُورُ أَعْوَانِكَ. وَأَمْضِ لِكُلِّ يَوْمٍ عَمَلَهُ فَإِنَّ لِكُلِّ يَوْمٍ مَا فِيهِ"

بعض امور ایسے ہیں جو براہ راست تم سے مربوط ہیں۔ اور انھیں بہرحال تم ہی کو

انجام دینا ہے۔ منجملہ ان کے : "اپنے عمّال اور کارگزاروں کی باتیں سننا کہ اس سے تمہارے منشی معذور ہیں۔ لوگوں کی حاجتیں اور ضرورتیں اسی روز پوری ہونی چاہئیں جس دن وہ تمہارے سامنے پیش کی جائیں اور تمہارے معاونین ان کی انجام دہی سے جی چرائیں۔ ہر روز کا کام اسی روز انجام دے دو کیونکہ ہر روز خود اپنے کام کے لئے مخصوص ہے۔"

امامؑ نے یہاں دو طرح کے افراد کا نام لیا ہے جن کے سلسلہ میں حاکم کے نائبین اور حاشیہ نشینوں کے بجائے خود حاکم کے لئے ضروری ہے کہ ان سے ملاقات کرے اور ان کے مسائل خود ان کی زبان سے سنے۔

اوّل — حکومت کے بااثر افراد، عمّال اور نمائندے جو ملک کے اطراف و جوانب میں حکومت کی طرف سے منسوب ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ملک کے جن حالات و مسائل سے واقفیت رکھتے ہیں اس سے اپنے افسر بالا یا حاکم کو آگاہ کرتے ہیں۔ جبکہ اگر یہ گزارشات و اطلاعات دوسرے واسطوں یا ذریعوں سے حاکم یا ولی امر تک پہنچیں تو ان میں تحریف اور الٹ پھیر کا امکان رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حاکم کے اردگرد بیٹھنے والے اور حاشیہ نشین افراد حکومت کے کارکنوں اور نمائندوں کو حاکم تک براہ راست پہنچنے میں رکاوٹ نہ بننے پائیں۔

دوم — عوام کو اپنے حاکم سے ملاقات کرنے اور اس سے براہ راست اپنی تکلیفیں اور شکایات بیان کرنے کا موقع حاصل ہونا چاہیئے کیونکہ بیچ کے افراد اس میں روڑے اٹکاتے ہیں تاکہ حقائق حکام یا ذمہ دار افراد تک نہ پہنچنے پائیں۔ لہٰذا حاکم یا ذمہ دار افراد کو چاہیئے کہ عوام سے ملاقات کے لئے خاص طور سے اوقات معین کریں اور لوگوں کی باتیں ان کی شکایات اور گزارشات خود سنیں، نیز ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرے لفظوں میں حکام بند کمروں میں بیٹھے نہ رہیں جس سے درمیانی لوگ ان کے اور عوام کے درمیان حائل ہو جائیں اور حقائق و واقعیات کو تحریف اور مسخ کرنے لگیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ: کبھی ان ہی حاشیہ نشینوں اور نزدیک رہنے والوں میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد خیانت ہوتا ہے اور وہ اپنے اس مقصد کو چھپائے رہتے ہیں،

لیکن جو لوگ انھیں پہنچانتے ہیں ان کی حقیقت سے حاکم کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ نتیجہ میں یہ سازش ابتداء ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ ذیل کا جملہ اس طرح کی سازشوں اور مذکورہ احتمالات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حکام کی چوکسی اور ہوشیاری

"وَتحفظ مِن الاعوان فان احدٌ منهم بسط یده الیٰ خیانة اجتمعت بها علیه عندك اخبار عیونك اكتفیت بذلك شاهداً"

"اپنے نزدیک رہنے والوں سے محتاط رہو۔ اگر تمہارے جاسوسوں نے متفق طور پر ان میں سے کسی ایک کی سازش یا خیانت کی رپورٹ پیش کی تو تم شاہد اور دلیل کے طور پر اس رپورٹ پر بھروسہ کر سکتے ہو۔"

حاکم کی قدر دانی

حاکم کی سیاست و مدیریت اور نظم و ضبط کے لوازمات میں سے ہے کہ وہ اپنے معاونین اور کارگزاروں کے اعمال اور کارگزاریوں سے بے پروا اور لاتعلق نہ رہے۔ نیک اور خدمت گزار افراد کی کارگزاریوں کی قدر دانی کرے اور غیر صالح یا غلط کار افراد کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرتا رہے اور ہر ایک کے ساتھ مناسب رویہ اختیار کرے۔ امامؑ اس ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مالک اشتر سے فرماتے ہیں:-

"وَلَا يَكُونَنَّ الْمُحْسِنُ وَالْمُسِيءُ عِنْدَكَ بِمَنْزِلَةٍ سَوَاءٍ فَإِنَّ فِي ذٰلِكَ تَزْهِيداً لِأَهْلِ الْإِحْسَانِ فِي الْإِحْسَانِ وَتَدْرِيباً لِأَهْلِ الْإِسَاءَةِ عَلَى الْإِسَاءَةِ وَأَلْزِمْ كُلّاً مِنْهُمْ مَا أَلْزَمَ نَفْسَهُ"

دیکھو ایسا نہ ہو کہ نیکوکار اور بدکار دونوں تمہاری نگاہ میں یکساں ہوں، کیونکہ تمہارا یہ انداز خود نیکوکاروں کی اچھی کارکردگی سے بے رغبتی ولا پرواہی اور بدکاروں کے لئے برے اعمال میں شوق پیدا ہونے اور ان کے جری ہونے کا باعث بنے گا۔

ہر شخص کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جس کا وہ مستحق ہے۔"

اگرچہ مومن خدمت گزاروں کا مقصد سوائے رضائے خدا کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن ایک طرف تو نیکوکاروں کی عزت و قدردانی نیکیوں کے عام ہونے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور دوسروں میں بھی نیک کام اور اچھی کارگزاریوں کا شوق پیدا کرتی ہے، دوسری طرف نیکوکاروں کی تعریف کرنا حاکم کا وہ فریضہ ہے جس سے کوتاہی کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے "مَنْ لَمْ یَشْکُرِ الْمَخْلُوْقَ لَمْ یَشْکُرِ الْخَالِقَ" جس نے مخلوق کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ خالق کا شکرگزار نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ماتحتوں کے اعمال سے چشم پوشی اور لاپرواہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدکار اپنے برے اعمال پر شرمندگی کا احساس نہیں کرتے بلکہ ان میں اور زیادہ جسارت پیدا ہو جاتی ہے۔

شخصیت نہیں بلکہ عمل کی قدر کرو

اس خط کے ایک حصہ میں جہاں سپاہیوں اور جانبازوں کے ساتھ حکومت کے سلوک اور برتاؤ کا تذکرہ ہے بعض ظریف نکتے بھی بیان کئے گئے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔

"وَوَاصِلْ فِیْ حُسْنِ الثَّنَاءِ عَلَیْهِمْ وَتَعْدِیْدِ مَا اَبْلٰی ذَوُو الْبَلَاءِ مِنْهُمْ۔ فَاِنَّ کَثْرَةَ الذِّکْرِ لِحُسْنِ اَفْعَالِهِمْ تَهُزُّ الشُّجَاعَ وَتُحَرِّضُ النَّاکِلَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ ثُمَّ اعْرِفْ لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اَبْلٰی وَلَا تَضُمَّنَّ بَلَاءَ امْرِئٍ اِلٰی غَیْرِهٖ وَلَا تُقَصِّرَنَّ بِهٖ دُوْنَ غَایَةِ بَلَائِهٖ وَلَا یَدْعُوَنَّکَ شَرَفُ امْرِئٍ اِلٰی اَنْ تُعْظِمَ مِنْ بَلَائِهٖ مَا کَانَ صَغِیْرًا وَلَا ضَعَةُ امْرِئٍ اِلٰی اَنْ تَسْتَصْغِرَ مِنْ بَلَائِهٖ مَا کَانَ عَظِیْمًا۔"

"اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی برابر تعریف و توصیف کرو اور ان کے قابل قدر کارناموں کا تذکرہ کرتے رہو جن کے ذریعہ وہ آزمائے جا چکے ہیں کیونکہ ان کے کارناموں کا بار بار تذکرہ بہادر کو جذبہ و جوش دلاتا اور بزدل میں ان کی انجام دہی کے لئے رغبت پیدا کرتا ہے (انشاءاللہ) پھر ہر شخص کے عمل کی حیثیت و

وقعت کو پیش نظر رکھو اور ایک کا عمل دوسرے شخص کے نام منسوب نہ کرو۔
کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت سے نہ گھٹاؤ۔ دیکھو کسی انسان کی شخصیت اس کا سبب نہ بننے پائے کہ اس کے معمولی کام کو بڑا کارنامہ شمار کرو اور کسی شخص کی گمنامی اس کا سبب نہ ہو کہ اس کے عظیم کارنامہ کو حقیر سمجھو۔"

اس دستور کے مطابق :-

الف)_____ ولی امر، حاکم یا ذمہ دار شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے سچے اور صالح خدمت گزار کی صرف ایک مرتبہ تعریف پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر مناسب موقع پر اس کے گزشتہ کارناموں کی طرف اشارہ کرتا رہے۔

ب)_____ یہ تعریف و توصیف نیک اور صالح افراد میں مزید شوق پیدا کرتی ہے اور دوسروں کو اس کام کی طرف رغبت دلاتی ہے۔ یہ روش کلی طور پر معاشرہ کی اصلاح میں ایک اصولی کردار ادا کرتی ہے۔

ج)_____ ہر شخص کو اس کے نیک کام کی مناسبت سے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانا چاہیئے اور اس کے کارنامہ کو دوسرے کی طرف نسبت نہ دینا چاہئے۔

د)_____ نمایاں چہروں یا مشہور افراد کو ان کے قابل قدر عمل سے زیادہ سراہنا نہیں چاہیئے۔ اس سے حقیقت بھی مخدوش ہوتی ہے۔

ھ)_____ نمایاں کارنامہ انجام دینے والے گمنام افراد کو بجا طور پر سراہنا چاہیئے تاکہ اپنے عمل کی روشنی میں وہ اور نمایاں ہو سکیں۔

حکام بالا کے ذریعہ مذکورہ اصولوں کی رعایت و پابندی ماتحتوں کے دلوں میں امیدوں کے چراغ جلاتی ہے۔ بہترین اور قابل قدر کارکردگی کے لئے زمین ہموار کرتی ہے اور لوگوں میں اطمینان کی یہ روح جگاتی ہے کہ اپنی شخصیت کو عمل، خدمت، لیاقت اور بہترین کارکردگی کے ذریعہ بنانا چاہیئے تعلقات و وابستگی، چاپلوسی اور شخصیت فروشی یا تصنع آمیز اور نقصان دہ کاموں کے ذریعہ نہیں۔
اگر یہ طرز فکر معاشرہ کے احساسات و افکار پہ سایہ افگن ہو تو بلاشبہ اقدار زندہ ہونے لگیں گے اور نتیجہ میں انسانیت زندہ ہوجائے گی۔ صلاحیتوں اور استعدادوں کو اجاگر ہونے کا موقع

ے گا اور عملی ارتقا کے میدان میں ہر روز نئی راہیں کھلتی جائیں گی۔ حاکم کو ان تمام باتوں پر گہری توجہ کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔

حکام کی دین داری اور دشمن سے ان کا جہاد

امامؑ کے اپنے منصوب کردہ حکام سے تعلقات و روابط کچھ اس طرح کے تھے کہ جب آپ نے بحرین میں اپنے گورنر "عمر ابن ابی سلمہ مخزومی" کو معاویہ کے خلاف جہاد میں شرکت کے لئے اپنے پاس بلانا اور "نعمان بن عجلان زرقی" کو ان کی جگہ معین فرمانا چاہا تو انھیں ایک خط میں یوں تحریر فرمایا:۔

"اَمَّا بعد فَاِنِّی وَلَّیتُ نُعْمَانَ ابن عجلانَ الزّرَقِی عَلَی البحرینِ وَ نَزَعْتُ یَدَکَ بِلاذَمّ لَکَ وَلَا تَثْرِیبَ عَلَیْکَ، فَلَقَدْ اَحْسَنْتَ الْوِلَایَۃ وَاَدَّیتَ الْاَمَانَۃَ فَاَقْبِلْ غَیْرَ ظَنِیْنٍ وَلَا مَلُوْمٍ، وَلَا مُتَّھَمٍ وَلَا مَاْثُوْمٍ، فَلَقَدْ اَرَدْتُ الْمَسِیْرَ اِلٰی ظَلَمَۃِ اَھْلِ الشَّامِ وَاَحْبَبْتُ اَنْ تَشْھَدَ مَعِیْ فَاِنَّکَ مِمَّنْ اَسْتَظْھِرُ بِہٖ عَلٰی جِھَادِ الْعَدُوِّ وَاِقَامَۃِ عَمُوْدِ الدِّیْنِ، اِنْشَاءَ اللّٰہُ"

" حمد و ثنائے الٰہی کے بعد۔ میں بحرین کی ولایت و حاکمیت "نعمان ابن عجلان زرقی" کے حوالہ کرتا ہوں اور تم کو اس سے سبکدوش کرتا ہوں میں بلا کسی مذمت و توبیخ کے تم سے یہ منصب لے رہا ہوں۔ کیونکہ تم نے اپنے فریضہ کو بخوبی انجام دیا اور امانت کو ادا کیا ہے اب تم میرے پاس کسی طرح کے سوئے ظن یا ملامت، اتہام یا گناہ کا خیال دل میں لائے بغیر چلے آؤ۔ میں شام کے ستم گاروں کی طرف پیش قدمی کا ارادہ رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میرے ہمراہ رہو۔ بلاشبہ تم ان افراد میں سے ہو جن پر میں دشمن سے جہاد کرنے اور ستون دین کو مستحکم و استوار کرنے کے سلسلہ میں اعتماد کر سکتا ہوں۔ انشاء اللہ"

امامؑ، بحرین میں معین اپنے اس نمائندہ کی جدوجہد کی قدردانی کرتے ہوئے نیز اس کی معزولی سے پیدا ہونے والے ہر طرح کے بے جا توہم کو دور کرتے ہوئے اپنی اس تعریف و توصیف میں دو

بنیادی شرطوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی دشمن سے جہاد نیز دین کا دفاع اور اس کی ترویج، ساتھ ہی اسے اپنے ترویجی مددگار کے عنوان سے زیادہ اہم کام کے لئے اپنے پاس بلایا ہے نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ: اسلام کے سیاسی ماحول میں ان افراد پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جو :۔

اوّل : دشمن خدا اور دشمن خلق کے مقابلہ میں قاطع اور محکم و استوار ہوں اور نہ اس سلسلہ میں لاابالی ہوں نہ دشمن سے ساز باز کرنے والے ہوں۔

دوسرے : دین کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوں۔ اس سے لاتعلق یا دین کے لئے نقصان دہ نہ ہوں۔ بلکہ دین کا قیام ان کے لئے ایک مسلّم اصل کی حیثیت رکھتا ہو۔ چنانچہ اگر دینداری اور دشمن کے ساتھ جہاد جیسی دو اصلوں کی رعایت کی جائے تو کوئی مشکل درپیش نہیں ہو سکتی۔

جس طرح امامؑ اپنے نیک اور صالح ماتحتوں و معاونوں کی تعریف و قدردانی فرماتے ہیں یوں ہی جب بھی اپنے گورنروں اور عمّال کو غلط کاریوں کی بنا پر مذمت کا سزاوار پاتے تھے تو بلا تأمل انھیں ان کی غلطیوں سے آگاہ کرتے اور نا اہل گورنر کی اصلاح یا اس کی معزولی کے سلسلہ میں تیزی سے اقدام فرماتے تھے۔

امامؑ کے حکومتی دور کے مطالعہ سے اس طرح کے بہت سے مواقع سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں "منذر ابن جارود عبدی" کو لکھے گئے امامؑ کے خط کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو اپنی خیانتوں کی بنا پر حضرتؑ کے عتاب کا نشانہ قرار پایا:

"اَمَّا بَعْدُ. فَاِنَّ صَلاحَ اَبِیْکَ غَرَّنِی مِنْکَ. وَظَنَنْتُ اَنَّکَ تَتَّبِعُ هَدْیَهُ وَتَسْلُکُ سَبِیْلَهُ. فَاِذَا اَنْتَ فِیْمَا رُقِّیَ اِلَیَّ عَنْکَ لَا تَدَعُ لِهَوَاکَ انْقِیَاداً وَلَا تُبْقِی لِآخِرَتِکَ عَتَاداً تَعْمُرُ دُنْیَاکَ بِخَرَابِ آخِرَتِکَ وَتَصِلُ عَشِیْرَتَکَ بِقَطِیْعَةِ دِیْنِکَ. وَلَئِنْ کَانَ مَا بَلَغَنِی مِنْکَ حَقّاً لَجَمَلُ اَهْلِکَ وَشِسْعُ نَعْلِکَ خَیْرٌ مِنْکَ. وَمَنْ کَانَ بِصِفَتِکَ فَلَیْسَ بِاَهْلٍ اَنْ یُسَدَّ بِهِ ثَغْرٌ اَوْ یُنْفَذَ بِهِ اَمْرٌ اَوْ یُعْلَی لَهُ قَدْرٌ اَوْ یُشْرَکَ فِی اَمَانَةٍ اَوْ یُؤْمَنَ عَلَی جِبَایَةٍ فَاَقْبِلْ اِلَیَّ حِیْنَ یَصِلُ

اِلَیۡکَ کِتَابِیۡ هٰذَا - اِنۡ شَاءَ اللّٰهُ۔ (خطوط/۷۱)

"امابعد، تمہارے باپ کی نیک نفسی اور پاکیزگی نے مجھے تمہارے سلسلے میں فریب میں رکھا اور میں نے خیال کیا کہ تم ان کی پیروی کرتے ہو اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہو لیکن جو خبریں مجھ تک پہنچی ہیں ان کے مطابق تم خواہشات نفسانی کے پھندے میں گرفتار ہو گئے ہو اور تم نے اپنی آخرت کے لئے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا ہے۔ تم نے اپنی دنیا آباد کرتے اور اسے رونق بخشنے کے لئے اپنا دین تباہ کرنا شروع کر دیا ہے اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحم کرنے کے سلسلہ میں اپنے دین سے بھی رشتہ توڑ لیا ہے۔ جو خبریں مجھ تک پہنچی ہیں اگر وہ سچ ہیں تو تمہارے گھر کی سواری کا اونٹ اور تمہارے جوتے کا تسمہ بھی تم سے بہتر ہیں۔ تمہارے جیسا کوئی بھی شخص اس کا اہل نہیں ہے کہ اس سے کسی رخنہ کو پُر کیا جا سکے یا اس کے ذریعہ کوئی کام انجام پا سکے، اس کا رتبہ بلند کیا جائے یا اسے امانت میں شریک کیا جائے یا حکومت کی آمدنی میں سے امین قرار دیا جائے۔ لہٰذا جیسے ہی تم تک میرا خط پہنچے میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔ انشاءاللہ۔"

شارحین نہج البلاغہ کے مطابق اس شخص نے چار ہزار درہم بیت المال سے ہڑپ کر لئے تھے جس کی اطلاع حضرت علیؑ تک پہنچ گئی۔ حضرت نے فوراً اسے مذکورہ بالا خط تحریر فرمایا۔

مشیرانِ حکومت

مشاورت جس کا مطلب دوسروں کی عقل و فکر اور عمل و تجربہ سے مدد حاصل کرنا ہے عام طور سے تمام اقوام و ملل کی منطق و افکار میں تسلیم شدہ ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے: "وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ" (سورہ شوریٰ آیت ۳۸)، "وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ (آل عمران آیت ۱۵۹) مشورہ کے سلسلہ میں اسلامی آثار اور اخبار و احادیث میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بلاشبہ حکام اور ذمہ دار افراد کو اپنی وسیع و عظیم ذمہ داریوں کی بنا پر مشورہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ مشورہ دوسروں کی عقل

اور ان کے تجربات سے استفادہ کو کہتے ہیں لہٰذا مشیران، حکام کے نظریات اور ان کے ارادوں اور فیصلوں کو ایک رُخ پر لگانے میں مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صالح و مخلص خیراندیش اور تجربہ کار مشیروں کا انتخاب حکومت کی راہ میں فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔ امامؑ کے کلام وارشادات میں مشیروں سے متعلق بہترین ہدایات و راہنمائیاں نظر آتی ہیں چنانچہ مالک اشتر کے نام تحریر کردہ خط میں فرماتے ہیں:

"وَلَا تُدْخِلَنَّ فِي مَشُورَتِكَ بَخِيلاً يَعْدِلُ بِكَ عَنِ الْفَضْلِ وَ يَعِدُكَ الْفَقْرَ، وَلَا جَبَاناً يُضْعِفُكَ عَنِ الْأُمُورِ، وَلَا حَرِيصاً يُزَيِّنُ لَكَ الشَّرَهَ بِالْجَوْرِ۔ فَإِنَّ الْبُخْلَ وَالْجُبْنَ وَالْحِرْصَ غَرَائِزُ شَتَّى يَجْمَعُهَا سُوءُ الظَّنِّ بِاللهِ"

"اپنے مشورہ میں کسی بخیل کو شریک نہ کرو کیونکہ وہ تمہیں دوسروں کے ساتھ بذل و بخشش کرنے سے روکے گا اور فقر و تنگدستی سے ڈرائے گا۔ نہ کسی ڈرپوک اور بزدل سے مشورہ کرو کیونکہ وہ تم میں ضعف و ناتوانی پیدا کردے گا اور نہ حریص کو اپنا مشیر بناؤ کیونکہ وہ ظلم وجور کو خوبصورت بنا کر تمہارے سامنے پیش کرے گا۔ یقیناً بخل، بزدلی اور حرص ایسے صفات ہیں جو اللہ سے بدگمانی کا سبب بنتے ہیں"

سچ ہے بخل کی صفت مخلوق اور خالق کے حقوق ادا کرنے، انفاق و حسن سلوک کرنے اور قوم و ملت کی ضرورتیں پوری کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے جس کا نتیجہ اقتصادی و مادی بحران، امتیازی اور طبقاتی روش کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ حکام اور ان کے مشیروں کو اس صفت سے مبرا اور دور رہنا چاہیئے کیونکہ مشیر اپنے مشوروں اور راہنمائیوں کے ذریعہ اپنے صفات حکام میں منتقل کرتے ہیں۔

رہی خوف اور بزدلی کی بات تو یہ صفت ایک مستقل اور آزاد حکومت کے لئے عظیم سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ دشمنوں اور ظالم طاقتوں سے خوف و دہشت حکومت اور عوام کو ذلت و رسوائی اور اسیری و غلامی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ اور اگر

مشیر ڈرپوک اور بزدل ہوں تو حاکم کو ذلت ورسوائی کی طرف مائل کردیں گے جو ملک و ملت کی تباہی و بربادی کا سبب ہوگی۔

اب رہا حرص کا مسئلہ تو عرض یہ ہے کہ مال و دولت اور دنیا کے حصول نیز حکومت پر باقی رہنے کی حرص و ہوس بے شمار جرائم و مظالم کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ حاکم کے لئے حرص و ہوس کی خصلت سب سے زیادہ نقصان دہ اور تباہ کن ہوگی۔ لہٰذا اس کے مشیروں کو اس خصلت سے دور رہنا چاہئے تاکہ صاحبان اقتدار کے اندر حرص کی آگ بھڑکا کر مظالم کے بڑھنے اور پھیلنے میں مددگار نہ ہوں۔

امیر المومنین علیہ السّلام نے فرمایا

عَزَّ مَنْ قَنِعَ وَذَلَّ مَنْ طَمِعَ

جس نے قناعت کی اسے عزت ملی اور جس نے طمع کی وہ ذلیل ہوا۔

از: سازمان تبلیغات اسلامی

ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

شیطانی سازشیں

عالم اسلام کا رد عمل

سلمان رشدی کی اس اہانت آمیز کتاب کے وسیع پیمانہ پر شائع ہونے اور منظم طور پر صیہونی معاشروں کی طرف سے اس کی زبردست پبلسٹی کے بعد دنیا کے گوشہ و کنار سے مسلمانوں کے اعتراض و احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں ایک طرف کتاب کے ناشروں کو بار بار خبردار کیا جاتا ہے اور دوسری طرف "شیطانی آیات" پر پابندی لگانے اور سلمان رشدی کی مذمت کے سلسلہ میں قانونی اقدامات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان میں وہاں کی پارلیمنٹ کے دو مسلمان ممبر (سید شہاب الدین اور خورشید عالم خان) پارلیمنٹ اور ہندوستانی عدالت میں اسلامی مقدسات کی اس توہین کی شکایت کرتے ہیں اور ان کی مسلسل کوششوں سے آخر کار ہندوستانی آئین نامہ کے بنیادی حقوق کی گیارہویں شق "ثقافتی آداب و دستور کی رعایت" کے مطابق "شیطانی آیات" کی اشاعت پورے ہندوستان میں ممنوع قرار دے دی جاتی ہے

انگلینڈ میں مسلمانوں کے اسلامی و مذہبی لیڈر وہاں کے ۱۵ لاکھ مسلمانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کتاب کو نہ صرف اپنے آپ سے دور رکھیں بلکہ اس کی علی الاعلان مذمت بھی کریں

اسلامی کالج کے سربراہ اور "جامعہ ائمہ جماعت و مساجد" کے سکریٹری ڈاکٹر ذکی بدوی نے اس کتاب کو اسلام پر براہ راست حملہ اور عیسائی دنیا کے خلاف بننے والی علم "مسیح کے آخری وسوسے" جیسی ایک گندی حرکت قرار دیا اور اس سلسلہ میں اپنا اور مذکورہ "جامعہ" کا نقطہ نظر پورے برطانیہ کی ۳۸۲ مسجدوں کو ارسال کیا۔

لندن میں "موسسۂ اسلامی" کے مدیر خورشید احمد وم اور مناظر احسان نے ساری دنیا کے مسلم حکمرانوں اور تمام مسلمانوں کے نام ایک کھلا خط تحریر کیا اور اس کتاب کے نشر ہونے کے سلسلہ میں اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسلامی مقدسات یا کلی طور پر دین اسلام کی کھلی ہوئی اہانت کے چند اہم نمونے اس کتاب سے انتخاب کرکے خط کے ہمراہ ارسال کئے۔(۱)

اسی طرح اس ناول پر بہت سی تنقیدیں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔(۲) اور مسلمانوں سے اس کے خلاف سخت اقدام کی اپیل کی جاتی ہے۔ لیکن استکباری دنیا نہ صرف ان دھمکیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی بلکہ اس ناول سے متعلق اپنے تبلیغات کا دائرہ اور وسیع کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ رشدی، یورپی نشریات میں ایک انقلابی شخصیت کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اکثر و بیشتر ممالک نیز ایشیا کے بعض ممالک میں بڑے بڑے مطبوعاتی و نشریاتی ادارے مختلف زبانوں میں اس ناول کے وسیع پیمانہ پر ترجمے کرانے اور ان کی اشاعت کے لئے بڑی بڑی قرار دادیں طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حرکتوں کے ساتھ ہی یہ ادارے سلمان رشدی کے گرد حفاظتی حصار قائم کرتے ہوئے اس کی کھلم کھلا حمایت کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی حلیف طاقتوں کو متحد کرکے مسلمانوں کے اقدامات کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

۱۔ کیہان فرہنگی، سال پنجم، شمارہ ۹۔

۲۔ عربی زبان کا رسالہ (العالم) طبع لندن، سب سے پہلا رسالہ تھا جس نے اپنے ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۸ کے شمارے میں "شیطانی آیات" ناول کا انکشاف کیا اور اس سلسلہ میں دو مقالے نشر کئے جن میں سے ایک مقالہ کی سرخی تھی "آیات شیطانیة روایة مجرمة تسخر من الاسلام ومقدساته" (روزنامہ اطلاعات سے حجۃ الاسلام خسرو شاہی کا انٹرویو مورخہ ۱۲،۱۰، ۶۷ مطابق یکم مارچ ۱۹۸۹ء)۔

اسی سلسلہ میں قلمی بین الاقوامی انجمن ، ہارولڈ پینٹر اور امریکہ کے چند دیگر مشہور اہل قلم ، ہندوستان کے ناشروں اور کتاب فروشوں کی انجمن اور یورپ کے بعض ناشروں نے مسلمانوں کے اقدامات خاص طور پر شیطانی آیات کو ہندوستان میں ممنوع قرار دیئے جانے پر ان کی مذمت کرتے ہیں اور پروپیگنڈہ اسٹیج رشدی کے اختیار میں دے دیئے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اپنا دفاع کرے۔

وہ مسٹر گاندھی (سابق وزیراعظم) کی حکومت سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اپنی حکومت کے افراد کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے ہندوستان میں جمہوریت کے مستقبل کے سلسلہ میں پرامید کریں۔(۱) وہ اپنی کتاب پر لگی ہوئی پابندی کو طاقت کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لئے ایک سیاسی کھیل شمار کرتا ہے۔ اور اعلان کرتا ہے کہ "آج ہندوستان کی باگ ڈور رجعت پسند مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ۔۔۔ اصل مسئلہ اور بنیادی لڑائی اس پر ہے کہ آئندہ انتخابات میں کون دس کروڑ مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے ۔ مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میری کتاب ایک سیاسی فٹبال بن گئی ہے "(۲) اور دنیا کے آزادی پسند افراد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی اجازت نہ دیں کہ میں متعصبوں کے خوف سے پوشیدہ اور قید و بندکی زندگی بسر کروں۔

چنانچہ مسلمان اس بات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کہ اس سازش کی جڑیں، جس قدر ظاہر میں نظر آتی ہیں اس سے کہیں زیادہ گہرائی میں اتری ہوئی ہیں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جانا چاہیئے ، لہٰذا عین اسی وقت جب کہ امریکیوں کی طرف سے "سلمان رشدی" اور اس کی بیوی "ماریان" کو امریکہ کی مختلف ریاستوں کے سفر کی دعوت سے "شیطانی آیات" کے سلسلہ میں مغربی پروپیگنڈوں کی نئی لہر چلتی ہے اور سلمان رشدی کی تقریروں کے ذریعے اور اس کتاب سے متعلق اس کے دفاع نیز پاکستان و بنگلہ دیش اور بہت سے یورپی اور ایشیائی ملکوں میں اس کی اشاعت سے متعلق فیصلے کئے جاتے ہیں ، مسلمانوں نے اسلام آباد پاکستان میں امریکی ثقافتی مرکز کے سامنے اور ہندوستان کے شہر سری نگر نیز بمبئی اور بنگلہ دیش میں اپنے شدید رد عمل اور غم و غصہ کا اظہار کیا، جس کے نتیجہ میں پاکستان میں پانچ افراد شہید اور سو سے زیادہ زخمی اور ہندوستان میں بیس سے زیادہ

---

۱ ـ ۲ کیہان فرہنگی ، سال پنجم ، شمارہ ۹۰

افراد جاں بحق اور بہت سے زخمی ہوئے ۔(۱)

اس کے ساتھ ہی پاکستان میں مختلف پارٹیوں کے بہت سے پارلیمانی ممبران اس کتاب کے متعلق احتجاج کرنے والوں کے خلاف حکومت کی روش اور اس کے موقف نیز عوام سے پولیس کے تصادم کے احتجاج میں پارلیمنٹ کا اجلاس ترک کرکے باہر نکل جاتے ہیں (۲) اور پاکستانی حکومت ملک کے غیرت مند مسلمانوں کے سخت دباؤ کے تحت اس سازش کے خلاف اقدام پر مجبور ہو جاتی ہے ۔

چنانچہ محترمہ بھٹو خوداً حکومت کا موقف بیان کرتے ہوئے اعلان کرتی ہیں کہ : " پاکستان اس کوشش میں ہے کہ امریکہ اور تمام ممالک میں " شیطانی آیات " کی نشر و اشاعت پر پابندی لگائی جائے "

ہندوستانی و پاکستانی مسلمانوں کی مظلومانہ شہادت کے ساتھ ہی عالم اسلام ایک دھماکہ خیز شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اور امام خمینی قدس سرہ اپنے بے مثال فیصلہ کے تحت ایک حکم کے ذریعہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اس کفر آمیز کتاب کے مؤلف اور اس کے ناشروں کے قتل کا فتویٰ صادر فرماتے ہیں ۔ پوری اسلامی امت نے دنیا کے کونے کونے میں متحد ہو کر اپنی بیداری کا ثبوت دیا اور اپنے عظیم رہبر انقلاب کے حکم کی مرکزی و قطعی حمایت کے ذریعہ اس استعماری سازش کے تئیں شدید غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ، رشدی کے خلاف عدالتی کاروائی کئے جانے نیز شیطانی آیات کو بازاروں سے اٹھا لیے جانے اور اس کی مزید نشر و اشاعت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلامی مقدسات اور تمام الٰہی ادیان کے دفاع کا مطالبہ کیا ۔

اسی طرح امام کے تاریخی حکم نے مسلمانوں کی عظیم طاقت اور اس کے اثرات کو آشکار کر دیا اور عالمی کفر سے مقابلہ کے لئے ان ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے ذریعہ ایک ایسی عظیم ، ہیبت ناک اور طوفانی موج کھڑی کر دی جس نے مشرق و مغرب کے استکباری ستونوں کو لرزہ براندام کر دیا اور تاریخ کو ایک بار پھر پاک فطرت اور بیدار مومنوں کی فتح و کامرانی کا دلکش منظر دکھایا ۔

یہی وہ منزل ہے جہاں اس حکم الٰہی کے حیرت انگیز اثرات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا جانا چاہیئے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے ۔

۱۔ صفحہ ۲۰ ۔ ایضاً بتاریخ ۲۵ ۔ ۱۱ ۔ ۶۷ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۸۹ء

۲۔

آثار و نتائج

امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے پیغمبرانہ شان کے حامل انقلاب آفرین فتوے کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ہم یہاں عالم اسلام ،مغربی استکبار ، دنیا کی غیر جانبدار شخصیتوں اور مفکروں کے نقطۂ نگاہ کی جہت سے اس کا جائزہ لیتے ہیں ۔ اس کے بعد اس حکم سے ملک کے اندر مرتب ہونے والے اثرات کا بعض نتائج و ثمرات کی روشنی میں بھی جائزہ لیں گے ۔

۱۔ عالم اسلام

دنیائے اسلام میں اس سلسلہ میں حسب ذیل خاص اثرات ظاہر ہوئے ۔۔

الف ـــ اسلامی قوت و طاقت کا اظہار ، اور مسلمان معاشروں کے اسلامی انقلاب کی جانب جھکاؤ میں اضافہ :۔

اسلامی انقلاب ایک بار پھر بین الاقوامی میدان میں استکباری طاقتوں سے ٹکر لینے والی طاقت کے عنوان سے سامنے آیا ۔خصوصیت سے جنگ تمام کرنے سے متعلق مغربی و مشرقی طاقتوں کے زبردست دباؤ اور اسلامی جمہوریہ کی طرف سے قرار داد قبول کئے جانے ، نیز اس الٰہی نظام کے اس کے اپنے جغرافیائی حدود میں محصور ہو جانے اور عالمی سطح پر اس کے اثرات زائل ہو جانے کی خام خیالی کے بعد وہ اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ میدان میں اترا اور مسلمان قوتوں اور ملتوں کی زبردست حمایت کے ساتھ دنیائے کفر کے مقابل صف آرا ہو گیا۔ ترکی کے مشہور اہل قلم اور شاعر حکیم اوغلو اسماعیل کے بقول:" امام قدس سرہ نے اسلام کی طاقتور آواز تمام دنیا والوں کے کانوں تک پہنچا دی ہے "۔ (۱)

ب ـــ اسلامی انقلاب کا پھیلاؤ اور اس کے بنیادی افکار کا مقصد :۔

مسلمان یہ جان گئے کہ ایران کا اسلامی نظام بے مثل توانائی و استحکام کا مالک ہے اور وہ اپنے اصولی افکار و نظریات کے سہارے مسلمانوں کی حیثیت کو استحکام بخشنے اور اعتقادی حدود

۱۔ روزنامہ کیہان ۲۹، ۱۱، ۶۷ ھ ش مطابق ۱۸ فروری ۱۹۸۹ء ۔

کا دفاع کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا اور بہت سی اقتصادی و مادی سختیوں اور دشواریوں کے باوجود، اقتصادی ناکہ بندی کی دھمکیوں اور یورپی مشترکہ منڈی(۱) کی چالوں کے برخلاف اسلام کی سیاسی مصلحتیں ہی وہ محکم و مدافع طاقت ہے جو شیطانی سازشوں کے مقابل بلا کسی جھجک کے ڈٹ جاتی ہے۔ اور یہ اقدام خود اسلامی ملتوں کی روشن خیال نئی نسل کو خالص محمدی اسلام کی جانب زیادہ سے زیادہ جذب کرنے کی راہ میں ایک مؤثر عامل ہے اور اسلامی ممالک میں اسلامی انقلاب کے افکار کے زیادہ سے زیادہ پھیلنے کی سمت ایک بڑا قدم ہے۔

ج ـــــ اسلامی معاشروں میں حضرت امام رضوان اللہ علیہ کی قیادت و رہبری کے استحکام اور اس کے نفوذ کا اظہار :-

مختصر سے وقفہ میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کی زبردست حمایت نے امام خمینی قدس سرہ کی عالمی قیادت و رہبری سے متعلق ہر طرح کے شکوک و شبہات دور کر دیئے، اور مغربی دنیا کے لئے خطرہ کی گھنٹی بجا دی۔ ان مغربی لوگوں نے پاکستان، ہندوستان، برطانیہ کے مختلف شہروں، فرانس، امریکہ، ارجنٹائنا، اسپین، موریشس، لبنان، تنزانیہ اور دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں میں امام خمینی کے حکم سے متعلق مسلمانوں کی ہمہ جہت صریح حمایت ـــــ جو عملی طور پر عالم اسلام میں ان کی قیادت و رہبری کے استحکام کا ثبوت تھی۔ کا بڑے ہی اضطراب کے ساتھ نظارہ کیا۔

یہی وجہ تھی کہ ابتدا میں انہوں نے امام خمینیؒ کے فتوے کے مقابل، فضا ہموار کرنے کے لئے اندھی چالیں چلنی شروع کیں اور ایک طرف برطانیہ کی وزارت خارجہ امام خمینیؒ کے فتوے کے خلاف اپنی پریشانی کا اظہار کرتی ہے (۲) اور دوسری طرف فرانس کا وزیر اعظم میشل روکار

۱۔ جیسا کہ امام امت قدس سرہ نے فرمایا تھا: "مغربی استکبار نے شاید یہ تصور کر لیا ہے کہ جیسے ہی بازار مشترک اور اقتصادی ناکہ بندی کا نام آئے گا ہم اپنی جگہ مفلوج ہو کر رہ جائیں گے اور رہبر عالم کا حکم جاری کرنے سے صرف نظر کر لیں گے۔" از روزنامہ کیہان مورخہ ۱۱ / ۱۲ / ۶۷، مطابق ۲ / مارچ ۱۹۸۹ء

۲۔ روزنامہ کیہان ۲۷ / ۱۱ / ۶۷ مطابق ۱۶ / فروری ۱۹۸۹ء

مغربی ممالک کے حکام سے مطالبہ کرتا ہے کہ " امام خمینی کے اقدام کی مذمت کرتے ہوئے انسانی حقوق کا دفاع کریں "(۱) یا امریکہ کا صدر جارج بش اپنے نظریہ کا یوں اظہار کرتا ہے کہ " قتل کے لئے اکسانا تہذیب یافتہ معیار و اقدار کی روشنی میں سخت توہین آمیز ہے "(۲) اس کے بعد برطانوی وزیر داخلہ اور فرانسیسی حکام اپنی تقریروں کے ذریعہ یورپی مسلمانوں کو اس طرح کی دھمکیاں دے کر کہ " جو شخص بھی اعلانیہ طور پر سلمان رشدی کی زندگی کو خطرہ میں ڈالے گا اسے گرفتار کر لیا جائے گا "(۳) یا " جو لوگ بھی عوام میں غم و غصہ کی لہر پیدا کریں گے یا لوگوں کو کسی کے قتل پر آمادہ کریں گے ان کے خلاف فوراً قانونی چارہ جوئی کی جائے گی ۔"(۴) فتوے کے اثرات کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلامی جمہوریہ ایران کے بعض نمائندوں اور طلبہ پر بعض یورپی اہل قلم اور نشریاتی اداروں کے کارکنوں کو امام خمینیؒ کے نظریات کی پیروی یا ان کے دفاع کے جرم میں ملک بدر کرنے یا ان کی آمد و رفت کو محدود کرنے کا اقدام کرتے ہیں اور اس طرح وہ اس تاریخی حکم کے مقابل ــــ جو مسلمانوں کے درمیان انقلاب کی قیادت و رہبری کے نفوذ کی بیّن دلیل تھا ۔ اپنی حساسیت ظاہر کرتے ہیں اور اس فلسفہ کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں کہ " مغرب کے لئے سلمان رشدی کی جان سے زیادہ اس کے قتل کا حکم اہمیت رکھتا ہے "(۵)

د۔ مسلمانوں کے ایمانی عقائد کو کمزور کرنے کے لئے مغرب کی طرف سے کی جانے والی مذہبی تحریفات کا مقابلہ :۔

جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے ، مغرب نے اسلامی انقلاب کے نفوذ کی بنیادوں یعنی مسلمانوں کی اعتقادی اصولوں کو نابود کرنے کی غرض سے یہ رذیلانہ حرکت شروع کی ، اور یہی

۱۔ روزنامہ کیہان ۳۰/۱۱/۶۷ مطابق ۱۹ فروری ۱۹۸۹ء

۲۔ روزنامہ کیہان ۲/۱۲/۶۷ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۸۹ء

۳۔ روزنامہ کیہان ۱۱/۱۲/۶۷ مطابق ۲ مارچ ۱۹۸۹ء

۴۔ روزنامہ کیہان ۹/۱۲/۶۷ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۸۹ء

۵۔ روزنامہ المجاہد ، الجزائر

نکتہ اس بات کا باعث بنا کہ مسلمان ہوش میں آجائیں اور اب بے حسی کو ترک کرکے پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی فکری و اعتقادی حدود کا دفاع کریں اور اس طرح کی شرمناک حرکتوں کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے میں مزید ہوشیاری سے کام لیں اور اسلام پر حملہ آور مغربی دشمنوں کی دشمنی کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے مکتب فکر اور اپنی اصل حقیقت کی طرف پلٹ آئیں کہ امام خمینی (قدس سرہ) کے ارشاد کے مطابق " یہ ایک نمونہ ہے خدا چاہتا تھا کہ اس کفر آمیز شیطانی کتاب کے شائع ہونے کے بعد اس زمانہ میں پیش آئے اور فرعونیت و بربریت و استکبار کی دنیا، اسلام دشمنی میں اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دے تاکہ ہم سادہ لوحی اور خوش خیالی کی دنیا سے باہر نکل کر حقیقت کا مشاہدہ کر سکیں " اور وہ شیطانی آیات، دین اور دینداری اور سب سے بڑھ کر اسلام و روحانیت کی جڑیں کاٹنے کی ایک منظم سازش ہے " (۱) اس کتاب کے مطالب " کفر آمیز اور اسلامی حقائق و واقعیت کو تحریف کرنے والے ہیں " (۲) اور مغربی دنیا سے مسلمانوں کے نظریاتی ٹکراؤ کی نشان دہی کرتے ہیں ۔

۵ ۔۔۔ اسلامی ممالک پر حاکم امریکی اسلام کا دفاع کرنے والے حکمرانوں کی قلعی کھل گئی ۔

رہبر انقلاب کے فتوے نے دراصل حقیقی اسلام کے حامیوں کی صف کو اسلام سے لگاؤ کا دعویٰ کرنے والے ظاہر داروں سے علیحدہ کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ اسلامی ممالک کے رجعت پرست حکام اور امریکی اسلام کا دفاع کرنے والی کمیٹیاں ملت اسلام کے اس تلاطم خیز اور متحدہ اقدام کے باوجود اپنی طرف سے معمولی ردعمل کے اظہار حتیٰ لفظی مذمت پر بھی آمادہ نہیں ہیں ۔ اگرچہ عوام کی طرف سے پڑنے والے دباؤ نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ملک میں کتاب " شیطانی آیات " کی درآمد اور اس کی اشاعت پر پابندی لگائیں اور اپنی خاموشی کے طلسم کو توڑ کر اپنے موقف کا اظہار کریں (۳)

---

۱ ۔ روزنامہ کیہان ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۶۷ مطابق ۲ ، مارچ ۱۹۸۹ء

۲ ۔ شام کے مفتی اعظم شیخ احمد کفتارو کا بیان ، کیہان ۱۱ ، ۱۲ ، ۶۷ مطابق ۲ ، مارچ ۱۹۸۹ء

۳ ۔ مسلمان ملکوں میں یہ اعلانات زیادہ تر غیر سرکاری اداروں کی طرف سے کئے جاتے تھے ، اور یہ نکتہ قابل غور ہے ! مثال کے طور پر اسلامی فقہی اکیڈمک کونسل نے مکہ مکرمہ میں یہ اعلان کیا : " ہندوستان

یہ سب اس حالت میں تھا جب پاکستانی و ہندوستانی مسلمان گولیوں کا نشانہ بن کر خاک و خون میں لوٹ رہے تھے، یورپ کے مسلمان شدید ترین دباؤ اور سختیوں کا شکار ہونے کے باوجود "برمنگھم" "ناٹنگھم" اور "مانچسٹر" جیسے شہروں میں احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے اور شیطانی آیات کو برطانوی سڑکوں پر مجمع عام میں نذر آتش کر رہے تھے۔(۱) ناروے میں مسلمانوں نے اسلام کے دفاع کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی فرانس میں حکومت کی طرف سے سخت دھمکیوں کے باوجود پیرس اور دوسرے شہروں میں احتجاجی جلوس نکالے گئے اور خود اسلامی جمہوریہ ایران کا یورپ کی مشترکہ منڈی کی طرف سے اقتصادی و سیاسی بائیکاٹ کیا جا چکا تھا۔

اسلامی ممالک پر حکمران جماعت خصوصاً عرب حکام کی طرف سے اس واقعہ کے خلاف ڈھیلی ڈھالی اور کمزور روش برقرار رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخبارات و رسائل نیز دیگر نشریات عمومی افکار کے سخت دباؤ کے تحت ان حکومتوں کے خلاف اعتراض پر اتر آتے ہیں۔ کویت، لبنان، متحدہ عرب امارات، شام، الجزائر اور دوسرے ممالک کے نشریات اسلامی ممالک کے حکام کی روش کو قابل توجیہ نہیں سمجھتے۔ "المجتمع" کے مانند بہت سے اخبارات "شیطانی آیات کے مصنف اور اس کے ناشرین کی سزا کا مطالبہ"(۲) کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض خود اپنی علمی و سیاسی محفلوں کے سامنے سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں اور الجزائر کے روزنامہ "المجاھد" کے مانند صاف لفظوں میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ "اس کتاب کی اشاعت نے جامعہ الازہر کے تعجب خیز اور ریاکارانہ ظاہر کو، جس

کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والا سلمان رشدی ایک کذاب اور ملحد ہے اور ارتداد کی سزا موت ہو سکتی ہے! ۴، ۱۲، ۶۷ مطابق ۲۳ فروری ۱۹۸۹ء۔ یا ریاض میں موجود مسلمانوں کی عالمی کمیٹی نے آزادی بیان سے متعلق مغربی ممالک کے تصور کو مورد سوال قرار دیتے ہوئے یہ درخواست کی کہ "شیطانی آیات کے مصنف پر حقوق سے متعلق کسی مناسب عدالت میں مقدمہ چلایا جائے"

کیہان ۱۱، ۱۲، ۶۷ مطابق ۲ مارچ ۱۹۸۹ء

۱۔ کیہان ۲، ۱۲، ۱۳۶۷ھ

۲۔ کیہان ۲، ۱۲، ۱۳۶۷ھ

ایک صدی سے خواب کا عالم طاری ہے برملا کردیا "۔ (۱)

اس طرح اس واقعہ کی روشنی میں دنیا کے تمام حریت پسند مسلمانوں کے لئے خالص محمدیؐ اسلام اور امریکی اسلام کے درمیان ایک خط واضح ہوگیا اور اس نے اسلام کے بہت سے جھوٹے دعویداروں کی قلعی کھول کر رکھ دی۔

۲۔ دنیائے استکبار اور مغرب

اس منحوس سازش سے ٹکر لینے کے سلسلہ میں امام خمینی کا تاریخی اقدام، اس بات کا سبب بنا کہ بہت سے حقائق روشن ہو کر سامنے آگئے، جن میں سے بعض اہم حقائق کا ہم بیان ذکر کرتے ہیں

الف ــــ اسلامی انقلاب کے صحیح تجزیہ و تحلیل کے سلسلہ میں مغرب کی ناتوانی

مغربی استعماری طاقتوں نے مسلط شدہ جنگ کے خاتمہ کے بعد اپنے زعم ناقص میں اسلامی جمہوریہ کو اندرونی طور پر سماجی، سیاسی اور اقتصادی مشکلات کا بری طرح شکار اور انقلاب کی عالمی و علاقائی حیثیت کو متزلزل تصور کرلیا تھا۔ لیکن اس اقدام نے ایک بار پھر ان پر یہ بات واضح کردی کہ برسہا برس کے اپنے تجربات کے باوجود وہ اسلامی انقلاب سے متعلق اپنے تجزیوں و تحلیلوں میں غلطی و اشتباہ سے دوچار ہوئے ہیں اور اس کی معنوی طاقت اور اثر اندازی کی حد کو صحیح طور پر محسوس نہیں کرپائے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے وسیع پیمانہ پر اسلامی جمہوریہ کی حمایت نے انھیں اس حقیقت کو سمجھنے اور باور کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے تجزیوں کا دوبارہ جائزہ لینے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ چنانچہ سلمان رشدی کے واقعہ کے بعد منعقد ہونے والی کانفرنسیں اور سیمینار اس نکتہ کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

ب ــــ مغرب کا اسلامی انقلاب سے گہری دشمنی کا اظہار اور اسلام کی حیات نو

استکبار کی برابر کوشش رہی ہے کہ وسیع پیمانہ پر پروپگنڈہ کے ذریعہ اسلامی انقلاب سے ــــ جو ان کی نظر میں اسلام کی تجدید حیات کا پہلا قدم ہے ــــ اپنی دشمنی کو انتہا پسندی ٹیررزم

---

(۱) ــــ المجاہد، الجزائر - ۴، ۱۲، ۶۷، مطابق ۲۳ فروری ۱۹۸۹ء

رجعت پرستی اور انسانی حقوق کے دفاع وغیرہ کے قالب میں ڈھال کر بیان کرے اور دنیا کے کانوں میں یہ باتیں بھر بھر کر بین الاقوامی سطح پر لوگوں کو اسلامی جمہوریہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے آمادہ کرے لیکن شیطانی آیات کے واقعہ میں ان کی طرف سے رشدی کی ہمہ جہت حمایت، پھر تحریم اسلام کے دفاع کے سلسلہ میں حضرت امام خمینی قدس سرہ کے فتوے کے خلاف ان کے عجولانہ اور سخت اقدامات، نیز اس سازش کی مذمت نہ کئے جانے پر اصرار اور مسلمانوں کے خلاف ان کے غیر منطقی اور کینہ توزانہ برتاؤ نے اسلام سے ان کے عناد اور گہری دشمنی کو آشکار کردیا۔ یہاں تک کہ "پنگوئن پبلیکیشن" کے "وائکنگ" شعبہ کے ایک نگراں نے انگلینڈ کے مصنفین کی انجمن کے ایک ہنگامی اجلاس میں کتاب "شیطانی آیات" کے دوبارہ نہ چھاپے جانے کی تکذیب کرتے ہوئے کہا: "ہم اس کتاب کی اشاعت جاری رکھیں گے۔" (۱) یا فرانس کا وزیر اعظم ایک عمومی اجلاس میں مغربی حکام سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ "(امام) خمینی (قدس سرہ) کی جانب سے سلمان رشدی کو جان کی دھمکی دیئے جانے پر اعتراض واحتجاج کے سلسلہ میں سب متحد ہو جائیں" (۲) اور برطانیہ کی وزیر اعظم مسز تھیچر بھی "سلمان رشدی کے قضیہ میں فرانسیسی حکام کی حمایت پر ان کا شکریہ ادا کرتی ہے"۔ (۳)

اسی طرح ان سب نے یہ ظاہر کردیا کہ یہ صرف چند بنیاد پسند متعصب اور . . . افراد کو کچلنے کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقی اسلام ہے جو ان کے لئے ناقابل تحمل ہے۔ جب بھی اسلامی جمہوریہ ایران کی بات سامنے آتی ہے تو اچانک تمام آرا، امکانات و وسائل اکٹھا اور متحد ہو جاتے ہیں تا کہ اسلامی جمہوریہ کو زیادہ سے زیادہ ضرب پہنچائیں، اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے بیدار مسلمان قومیں غافل ہوں۔

ج ـــــ امت اسلام کے متعدد قیام و احتجاج کے مقابل عالمی کفر کی بے چارگی اور اعتراف شکست

۱۔ کیہان ۸ / ۱۲ / ۶۷ مطابق ۲۷ فروری ۱۹۸۹ء

۲۔ کیہان ۳۰ / ۱۱ / ۶۷ مطابق ۱۹ فروری ۱۹۸۹ء

۳۔ کیہان ۱۱ / ۱۲ / ۶۷ مطابق ۲ مارچ ۱۹۸۹ء

اہل مغرب اس وہم و خیال میں تھے کہ مسلمانوں کے احتجاجات کو کچل دیں گے یا یہ اثر بنا دیں گے اور آخر کار انھیں اسلام کے ساتھ کی جانے والی کسی بھی اہانت کے سلسلہ میں سکوت و خاموشی پر مجبور کر دیں گے لہٰذا انہوں نے شروع میں پوری قطعیت کے ساتھ اس شیطانی سازش کا دفاع کیا۔ حتیٰ ان ہی دفاع اور حمایتوں کے نمائشی اقدامات کے تحت سیاسی حکام اور "ہارولڈ پینٹر" اور "نجیب محفوظ" جیسے بہت سے قلم فروش مصنفین سلمان رشدی کی تعریفیں کرتے ہیں اس کا اعزاز بڑھاتے ہیں اور اس کی حفاظت کے لئے وسیع سائبان تعمیر کرتے ہیں، لیکن امام خمینی قدس سرہ کے ناقابل تصور اقدام اور اس سے متعلق حتیٰ یورپی و امریکی ممالک میں مسلمانوں کی وسیع و عریض حمایت نے انھیں مبہوت کر کے رکھ دیا، لہٰذا وہ لوگ بازار مشترک کے ذریعہ ایک شدید قسم کے سیاسی و اقتصادی دباؤ کے ساتھ اس اقدام کے مقابلہ پر اتر آئے لیکن امام قدس سرہ نیز جمہوری اسلامی نظام کے ذمہ داروں اور اسلامی پارلیمنٹ کی دنیا بھر کے مسلمانوں کی بھرپور حمایت کے ساتھ ان کے خلاف قدرت مندانہ ردعمل اور برابر کے منہ توڑ جواب نیز اس منحوس واقعہ کے اصل محرک برطانیہ سے قطع تعلق کے اقدام نے یورپی حکومتوں کو شکست و ندامت کی طرف مائل کر دیا اور مسز تھیچر کی حکومت کے دباؤ کے باوجود ان کی بظاہر متحدہ صف میں شگاف پیدا ہو گیا اور ان کے پیچھے ہٹنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برطانیہ نے ایک بیان جاری کر کے اس امید کا اظہار کیا کہ: "ہم اس اطلاع کے ذریعہ اسلامی پارلیمنٹ کے نمائندوں کی توجہ جو دونوں ملکوں کے روابط کے مستقبل نیز امکانی قطع رابطہ کے موضوع پر آج بحث و گفتگو اور نتیجہ کا اعلان کرنے والے ہیں اس سرکاری نکتہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ برطانیہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ ایران سے اپنا رابطہ منقطع کر لے۔"(۱)

مغربی جرمنی میں جبکہ خود اس ملک کے ٹیلیویژن کے ایک چینل کی خبر کے مطابق یہ طے تھا کہ یہ ملک "ایران کی اقتصادی ناکہ بندی کے سلسلہ میں غور کرے" (۲) یک بیک روزنامہ "دی ولٹ" "اسلام کی قانونی حمایت" (۳) کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسز تھیچر اپنی پیشین گوئی کہ "ایران کے خلاف یورپی مشترکہ منڈی کا اقدام مؤثر ثابت ہوگا" کو فراموش کرتے ہوئے فرماتی ہیں

۱۔ کیہان ۹، ۱۲، ۶۷ مطابق ۲۸ فروری ۸۹ء ۲۔ روزنامہ کیہان ۴، ۱۲، ۶۷ مطابق ۲۳ فروری ۸۹ء

۳۔ کیہان ۱۱، ۱۲، ۶۷ مطابق ۲ مارچ ۸۹ء۔

کہ "شیطانی آیات توہین آمیز کتاب ہے"(۱) اور برطانیہ کے وزیر خارجہ جیفری ہاؤ نے اعلان کیا کہ "حکومت برطانیہ اسلام کا احترام کرتی ہے اور کتاب "شیطانی آیات" سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کرتی ہے ،(۲) اور آخر کار برطانیہ کو اس بات کا احساس ہوگیا ! کہ "یہ کتاب اس قدر تنقید اور مذمت کا نشانہ کیوں بنی ہے ؟ "(۳)

معلوم ہوا کہ "جس طرح مسلمان اس کتاب کے ذریعہ اپنے مذہب پر حملوں سے خوش نہیں ہیں" یہ (برطانوی حکام) بھی اس سے خوش نہیں ہیں ! "۔ برطانیہ کے وزیر داخلہ نے بھی برطانوی مسلمانوں سے متعلق اپنی گزشتہ دھمکیوں اور "سلمان رشدی کی حفاظت کے لئے ان سے(۴) عوامی پارلیمینٹ کے ۴۳ ممبران کی(۵) درخواست کو پس پشت ڈال کر اعلان کرنا ضروری سمجھا کہ : "سلمان رشدی کی جان کی حفاظت حکومت برطانیہ کے حکم سے نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ اقدام اس ملک کی پلیس کی ذمہ داری ہے "(۶)

اس پسپائی میں برطانوی اخبارات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور اس قدر آگے بڑھے "ڈیلی ٹیلیگراف" نے "رشدی کو قصوروار ٹھہرایا" اور لکھا کہ : "جو مصیبت بھی اس پر کے اس میں اس کا اپنا قصور ہے "،(۷) "گارڈین" نے بھی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ "اسلامی جمہوریہ سے کسی طرح عذر خواہی کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے سیاسی روابط ٹوٹنے نہ دے "(۸) اس کے علاوہ بھی بہتوں نے کہا اور لکھا : پسپائی کا یہ سلسلہ کچھ اس قدر تیز تھا کہ اس نے رشدی کو وحشت میں

۱-۲- روزنامہ کیہان ۲۰/۱۲/۶۷ مطابق ۳ مارچ ۸۹ء

۳- روزنامہ کیہان ۱۲/۱۲/۶۷ مطابق ۳ مارچ ۸۹ء

۴- روزنامہ کیہان ۱۲/۱۲/۶۷ مطابق ۳/۳/۸۹ء

۵- روزنامہ کیہان ۲۹/۱۱/۶۷ مطابق ۱۸/۲/۸۹ء

۶- روزنامہ کیہان ۱۲/۱۲/۶۷ مطابق ۳/۳/۸۹ء

۷- روزنامہ کیہان ۱۳/۱۲/۶۷ مطابق ۳ مارچ ۸۹ء

۸- روزنامہ کیہان ۱۱/۱۲/۶۷ مطابق ۲ مارچ ۸۹ء

مبتلا کردیا اور وہ گروہ مخالف کے ایک پارلیمانی نمائندہ (پری اشڈان) کے ذریعہ اپنی "پریشانی" کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگیا کہ: "لندن نے اس کے خلاف موقف اختیار کرلیا ہے"۔

اس سرد جنگ کا سب سے خوبصورت پہلو اسلامی جمہوریہ کا محکم و پرشکوہ موقف تھا جس نے پوری بے نیازی کے ساتھ مطالبہ کیا کہ "برطانیہ" عالم اسلام، اسلامی جمہوریہ اور اسلام مخالف کتاب شیطانی آیات کے مطالبہ کے مقابل اپنے غیر اصولی موقفوں کی سرکاری طور پر مذمت کرے" اور اس بوڑھے شیطان کی نمائشی حکمت عملی کے آگے جھکنے کے بجائے اس نے بلا کسی خوف وخطر کے برطانیہ سے اپنے روابط توڑ لئے۔ اس طرح مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اپنی ایمانی طاقت کے بل بوتے پر دشمن کی بظاہر متحد صفوں کو درہم و برہم اور انہیں ذلیل و رسوا کیا جاسکتا ہے۔

د ــــ مغرب میں اسلامی انقلاب کی مقبولیت میں وسعت اور عالمی توازن پر اس کا اثر:

یورپ میں مسلمانوں کے وسیع پیمانہ پر احتجاج نے اسلامی انقلاب کی قوت وطاقت کو علاقائی توازن اور مشرق وسطیٰ اور ایشیا کی حدود سے نکال کر عالمی سطح پر، خاص طور سے یورپ میں اس کے اثرات ظاہر کردیئے۔ مغربی طاقتیں برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی، بلجیم، ناروے، اٹلی، ڈنمارک، ترکی، سوئیڈن، آسٹریا اور تمام مغربی ممالک میں مسلمان معاشروں کا سامنا کرنے کے بعد اب اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوئیں کہ وہ خود اندرونی سطح پر کس قدر مخدوش اور خطرات سے گھری ہوئی ہیں اور اب انھیں اس صدی کے بت شکن (امام خمینی قدس سرہ) کی قیادت میں عصر حاضر میں اسلام کی حقیقت وواقعیت کو وہ بھی اس کی انقلابی اور طاقتور شکل میں اپنے ممالک کے قلب میں بھی قبول کرنا پڑے گا اور اسلامی انقلاب کے ساتھ زیادہ محتاط رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

دوسری طرف یورپ کے مسلمانوں نے بھی یہ دکھا دیا کہ آج کی پرآشوب اور پیچیدہ دنیا میں وہ اپنا حساس کردار بخوبی ادا کرنا جانتے ہیں انہوں نے اپنے اس متحدہ اقدام کے ذریعہ اور اپنی صفوں کو دنیا کے تمام مسلمانوں کی صفوں سے ہم آہنگ کرکے، اسلام کی انقلابی طاقتوں کے اتحاد ویکجہتی اور قوت و توانائی کو مزید استحکام عطا کیا نیز عملی طور سے ثابت کردیا کہ اسلام کی عظمت وشرف کا ایک نیا دور دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔

۴۔ عالمی انجمنیں اور شخصیتیں

شیطانی آیات کے خلاف مسلمانوں کے احتجاجات کے سلسلہ میں دنیا کی انجمنوں اور شخصیتوں کے مختلف نظریات وخیالات سامنے آئے ہیں۔

الف : (عیسائیوں) کی مذہبی محفلیں اگرچہ خود بھی مکرر طور پر اس طرح کے ثقافتی حملوں کا شکار رہی ہیں لیکن اپنے مذہبی رہنماؤں کے سیاسی واجتماعی جوڑ توڑ کی وجہ سے عیسائیت ان حملوں سے ٹکرانے کی طاقت نہیں رکھتی تھی، لیکن اس سازش کی ان محفلوں نے بھی مذمت کی ہے۔ واٹیکان سرکاری طور پر روزنامہ (لوزرواتورہ رومانو) میں "اس کتاب کی اشاعت پر افسوس کا اظہار کرتا ہے" (۱) اسی طرح فرانس کے کیتھولک عیسائیوں کا رہبر، سلمان رشدی کی کتاب کی مذمت کرتا ہے۔ (۲) اسی کے مقابل صہیونیوں اور یہودیوں سے مربوط انجمنیں اس کثیف کتاب کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں اپنا پورا زور صرف کرتی ہیں اور اسرائیل کی طرف سے پنگوئن پبلیکیشن کے وائکنگ شعبہ میں "شیطانی آیات" کے نئے سرے سے ترجمہ اور اشاعت کی قرارداد یں باندھنے نیز وہاں سلمان رشدی کو پناہ دینے کے لئے زمین ہموار ہونے کی خبریں نشر ہوتی ہیں۔ (۳)

ب : یونسکو جیسے عالمی ثقافتی ادارے، بظاہر غیر جانبدارانہ لیکن حقیقت میں ایک رخی پالیسی اختیار کرتے ہیں یونسکو اپنے اطلاعیہ (۴) میں مختلف کنایات اور استعارات کے ذریعہ امام خمینیؒ کے فتوے پر تنقید کرتا نظر آتا ہے اور ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کے مقدسات کی توہین سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ "آزادی کا گھر" ہونے کی حیثیت سے جب بھی کسی فرد کے بنیادی حقوق اور اس کے افکار وخیالات کے بیان کے حق کو ان دیکھا کیا جاتا ہے تو یونسکو سخت متاثر ہوتا ہے۔ اور "کائنات کا گھر" ہونے کی حیثیت سے

۱۔ روزنامہ کیہان ۱۴ / ۱۲ / ۶۷ھ مطابق ۵ / ۳ / ۸۹ء

۲۔۳۔ روزنامہ کیہان ۲ / ۱۲ / ۶۷ھ مطابق ۲۱ / ۲ / ۶۷ھ

۴۔ روزنامہ کیہان ۱ / ۱۲ / ۶۷ مطابق ۲۰ / ۲ / ۸۹ء

جب بھی کسی انسان کا تخیل سکوت اور خاموشی پر مجبور کیا جاتا ہے یونسکو اس میں اپنی توہین محسوس کرتا ہے نیز" یہ ہر شخص کا فریضہ ہے کہ دوسرے کے مذہب کا احترام کرے، لیکن یہ بھی ہر شخص کا فرض ہے کہ دوسرے کی آزادیٔ بیان کا احترام کرے اور اس طرح کے حملہ کے جواب میں کسی بھی طرح کی شورش وخشونت کی دعوت چاہے جس طرف سے بھی ہو، روا نہیں ہے"۔

ج۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے بھی ایک نرم رد عمل کے تحت اس بات کا اظہار کیا:

"ہمیں جس چیز کی اہمیت کا قائل ہونا چاہیئے وہ انسانوں کی جان کا تحفظ ہے"(۱) اس واقعہ میں وہ اس سے زیادہ قدم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے۔

د۔ مختلف ادبی، فنی اور ثقافتی انجمنیں، محفلیں اور شخصیتیں اس واقعہ سے اپنے منفی رتباط کے لحاظ سے خاص حساسیت میں مبتلا تھیں۔ برطانیہ کی سلطنتی ادبی انجمن اور امریکہ کی قلمی انجمن (پن سینٹر) رشدی کی حمایت کا موقف اختیار کرتی ہیں اور اس کی خوب پیٹھ ٹھونکتی ہیں۔ انگلینڈ کا مشہور ڈرامہ نگار "رو الڈ ڈال" یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اب جبکہ ایک مصنف اور ناشرین کی جان ایک اخلاقی مسئلہ کے تحت خطرہ میں ہے اور جبکہ ہمارا سابقہ متعصب وکٹر قسم کے افراد سے ہے تو تسلیم ہوجانا ہی بہتر ہے"(۲) ہارولڈ پنیٹر" رشدی کی تائید اور حمایت میں پیش پیش نظر آتا ہے اور "نجیب محفوظ" باقاعدہ طور پر "شیطانی آیات" کی حمایت کرتے ہوئے امام خمینیؒ کے فتوے پر تنقید کرتا ہے لیکن دوسری طرف ڈیلی ٹیلیگراف کا قلم کار "مارٹن ہیرس" مسلمانوں کے غیظ وغضب کو نظر انداز کرنے کے سبب رشدی کو اپنے حملوں کا نشانہ بناتا ہے۔

ایک ابھرتا ہوا نامہ نگار "رافائل گونزاپا" اپنے ملکی ریڈیو کے ایک مخصوص پروگرام میں کہتا ہے: دنیا کے تمام انقلابات میں تحریکات کا ایک سلسلہ مغرب کی طرف سے موجود رہا ہے اور اب امام خمینیؒ اسلام کے دفاع کے لئے اٹھے ہیں اور ایک کافر کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا ہے(۳)

۱۔ روزنامہ کیہان، ۲/۱۲/۶۷ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۸۹ء

۲۔ روزنامہ کیہان، ۲۹/۱۱/۶۷ مطابق ۱۸ فروری ۱۹۸۹ء

۳۔ روزنامہ کیہان، ۲/۱۲/۶۷ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۸۹ء

ترکی کے مشہور اہل قلم حکیم اوغلو اسماعیل نے امام خمینیؒ کے حکم کو اسلام کی طاقت و آداب کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور دوسری شخصیتوں نے بھی امام خمینیؒ کے اقدام اور مسلمان ملتوں کے موقف کی حمایت کی۔ چنانچہ اس صف میں زیادہ تر تیسری دنیا اور انقلابی ممالک کی شخصیتیں نظر آتی ہیں۔

لیکن وہ شخصیتیں جن کی حمایت سرکاری ثقافتی محفلوں کی طرف سے ہوتی ہے، یا جو بین الاقوامی انعامات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر لوگوں نے یا غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا ہے یا پھر سلمان رشدی کے دفاع پر کمر بستہ ہوئے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ استعمار نے ادبی و ثقافتی میدان میں اسلامی انقلاب کے خلاف زہر افشانیوں کے سلسلہ میں کس حد تک کوشش کی ہے اور کس قدر دنیا کے اہم ثقافتی و فنی مراکز میں رسوخ پیدا کر رکھا ہے، اور جیسا کہ بہت سی عالمی شخصیتوں کی طرف سے بارہا اس کا اظہار بھی ہوا ہے کہ استعمار نے ان ثقافتی انجمنوں نیز ان اہم اور بڑے بڑے انعامات کو ایک سیاسی حربہ اور اپنی شیطانی حرکتوں کی توجیہ و تاویل کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جب نجیب محفوظ کو ادب کا نوبل ایوارڈ نہیں ملتا تو وہ لکھتا ہے:۔ نوبل ایوارڈ ایک شرمناک جھوٹ ہے اور ہمیں ہرگز اس کا دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے، ہمارے یہاں بہت سے عظیم ادبا گزرے ہیں جو موجودہ نوبل انعام پانے والوں سے بہت بلند سطح کے تھے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی یہ انعام حاصل نہیں ہوا۔ کیوں؟" اور ایک بار جب دو اسرائیلیوں کو یہ ایوارڈ ملا تھا تو اس نے کہا تھا "یہ انعام اب حاصل کرنے کے لائق نہیں رہا" (۱)

لیکن بعد میں وہ انور سادات کی حمایت کے سلسلہ میں قابل توجہ خدمات نیز (محلے کے بچے) نامی کتاب لکھ کر اور اس میں ابراہیمی انبیاءؑ کی اہانت کر کے یہ سیاسی انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ اس انعام کے پس پشت کوئی خاص سبب بھی اسے نظر آتا ہے؟ تو وہ کہتا ہے "کیوں نہیں، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں یہ ادبی

۱۔ حجۃ الاسلام خسرو شاہی کا انٹرویو، روزنامہ اطلاعات چہارشنبہ، مورخہ ۱۰/۱۲/۶۷ مطابق ۱/۳/۸۹ء

انعام رکس کے صرف اس اہل قلم کو دیا جاتا ہے جو حکومت کا مخالف ہے۔ اور اس کنایہ کے ذریعہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ ان انعامات کے پیچھے سیاسی مقاصد چھپے ہوئے ہیں۔ یا اگر ہم خود نوبل کے ادبی انعامات حاصل کرنے والوں کا جائزہ لیں تو اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اکثریت بلکہ تقریباً سبھی استعماری حساب و کتاب پر پورا اترنے کے سبب اس انعام کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اپنے عالمی رہبر کی سرپرستی میں امت اسلام کے اس اقدام نے بخوبی ظاہر کر دیا کہ کہ ستم رسیدہ قوموں اور ملتوں کو خود اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اس کے منتظر نہ رہیں کہ بظاہر غیر جانبدار نظر آنے والی انجمنیں اور شخصیتیں ان کا دفاع کریں گے۔ انھیں اس طرح کے اداروں اور شخصیتوں کی حقیقت کو اچھی طرح پہچان لینا چاہیئے۔

۴۔ ایران میں مرتب ہونے والے اثرات

اسلامی انقلاب کے عظیم رہبر امام خمینیؒ کے فتوے سے، ملک کے اندر بھی مثبت و مفید اثرات مرتب ہوئے۔ جو اس بات کے موجب ہوئے کہ:۔

الف۔ اسلامی انقلاب کی اصالت و حقانیت ثابت ہو گئی اور لوگوں پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ رہبر انقلاب اسلام کے بنیادی اقدار و اصول کے پوری سختی سے پابند ہیں۔ نتیجہ میں مغربی خبر رساں ایجنسیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور اشتباہات پر مبنی بہت سے سیاسی تبصرے جن میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ انقلاب اپنے ابتدائی و بنیادی اغراض و مقاصد سے منحرف ہو گیا ہے بڑی حد تک بیکار اور بے اثر ہو گئے۔

ب۔ جنگ بندی کی قرارداد نمبر ۵۹۸ قبول کرنے کے بعد استکبار کے منفی پروپیگنڈے اور ایران کی مظلوم ملت کی ذلت و تحقیر کی اس کی کوششیں بے کار ہو گئیں اور مغربی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلامی جمہوریہ ایران کی قطعیت اور استحکام نیز اپنے حق بجانب موقف پر اس کا جمے رہنا ایران کے مسلمان عوام کے فخر و سربلندی کا باعث بنا، اور انھیں مغربی مستکبرین کے مقابلہ میں اپنی حیثیت و اہمیت کا احساس ہوا۔

ج۔ ملت ایران یہ اچھی طرح سمجھ گئی کہ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ دشمنان انقلاب کے

فریب کاریاں اور سازشیں ختم نہیں ہوئی ہیں ان کا سلسلہ ابھی یوں ہی جاری رہے گا ۔ ہاں ان کی ماہیت تبدیل ہو گئی ہے ۔ اسلامی جمہوریہ کے دشمنوں نے انقلاب اسلامی سے تہذیبی و ثقافتی میدان میں مقابلہ کے لئے خاص طور سے وسیع پیمانہ پر پیسہ لگا رکھا ہے اور اسی راہ میں وہ ذرا بھی شک و شبہ سے کام نہیں گے لہٰذا ان کے مقابلہ میں پوری قطعیت کے ساتھ ڈٹے رہنا چاہیئے

د ۔ ایران کی امت مسلمہ نے پورے جوش و جذبہ کے ساتھ کثیر تعداد میں میدان میں آکر اور ملک کے مختلف شہروں میں (اس شیطانی کتاب کے خلاف) پے در پے احتجاجی جلوس نکال کر دشمنان انقلاب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور مسلسل طور پر پڑنے والے طرح طرح کے دباؤ، مشکلوں اور دھمکیوں کے باوجود ان کی سازشوں سے مقابلہ کے لئے اپنی پوری آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے رہبر کی پیروی کے سلسلہ میں اپنا عقیدہ اور عزم و ارادہ بیان کر دیا نیز اپنی صفوں کو مستحکم رکھتے ہوئے ملک میں داخلی سطح پر اختلاف و افتراق انگیز حرکتوں سے پوری طرح پرہیز کیا اور اسلامی اقدار کے دفاع کی ضرورت پر زور دیا۔

البتہ یہ بات یہاں سے نہ رہ جائے کہ اس مقدس جدوجہد میں سیاسی و اقتصادی جہات سے مشکلات کا بھی سامنا ہوگا، جن میں خاص طور سے اسلامی جمہوریہ سے مغربی حکومتوں کے سیاسی تعلقات و روابط میں کھینچا تانی، انقلاب مخالف عناصر کو عمل کی کھلی چھوٹ، بین الاقوامی کمیٹیوں کی طرف سے مختلف قسم کے دباؤ، تعمیر نو کی راہ میں اڑچنیں مثلاً مطلوبہ عالمی اقتصادی ذرایع سے استفادہ اور دفاعی و صنعتی ارتقا کی راہ میں خلل اندازی، آزادی بیان اور آزادی عقیدہ کے نام پر نمائش .... جیسے مشکلات سامنے آئیں گے۔

لیکن ایران کی مسلمان انقلابی اور معرکہ ساز ملت یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ عالمی کفر کے ساتھ اپنی یہ جدوجہد پوری قوت و توانائی کے ساتھ جاری رکھنا چاہیئے اور اس مقدس راہ میں معمولی سے معمولی پسپائی بھی امت اسلام کی دائمی ذلت اپنے ساتھ لائے گی، لہٰذا یہ اس اہمیت کو درک کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ رہبر کی جانب اولین ردعمل کا اظہار ہونے کے ساتھ ہی پورے اسلامی ملک میں مسلمانوں کا کفر شکن سیلاب امنڈ پڑا اور انہوں نے حریم اسلام کے دفاع اور خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہ جھکنے والے رہبر کی پیروی کے سلسلہ میں اپنی استقامت و پائداری کا آشکار کر دیا۔

رہبر مسلمین
حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای
نے فرمایا

کچھ بکے ہوئے ہاتھ، ثقافتی و نشریاتی سازشوں کے ذریعہ اسلامی اقدار کو لوگوں کی نظروں سے گرانا اور اسے ذلیل و خوار کرنا چاہتے ہیں۔ اغیار کے ایجنٹ اس زر خرید قلمکار کے ہاتھوں "شیطانی آیات" کی تصنیف کی سازش اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ لیکن یہ ان کی بھول ہے اس سے خود انھیں ہی نقصان پہنچے گا۔

ہمارے عظیم المرتبت امام (رحمہ اللہ) نے اس کتاب کے مصنف جو اس سازش کا ایک نمونہ ہے، کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا ہے یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے اور اس کا نفاذ ضروری ہے۔

(۹ / فروری ۱۹۹۰ء)

از : علامہ طباطبائی طاب ثراہ
ترجمہ : جناب سید علی الحسن رضوی

رسول اسلام

روایات کی روشنی میں

(۴)

مکان و مسکن

مکان و سکونت کے آداب سے متعلق ابن فہد اپنی کتاب "تحصین" میں لکھتے ہیں کہ :۔
رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور ایک بھی اینٹ اینٹ پر نہ رکھی[۱] (یعنی اپنے لئے کوئی مکان نہیں بنوایا۔)

کتاب لب اللباب میں امام کا ارشاد ہے : مسجد مجالس انبیاء ہے[۲] یعنی انبیاء مسجد میں بیٹھا کرتے ہیں۔ کافی میں سکونی امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : رسول خدا جب گرمی کے دنوں میں کمرے کے باہر رہنا شروع کرتے تو جمعرات کے دن نکلتے تھے اور جب سردیوں میں ٹھنڈک کی وجہ سے کمرے میں پلٹتے تو جمعہ کے دن پلٹتے تھے (۳)۔ اس روایت کو صاحب خصال نے بھی سند تحریر کئے بغیر نقل کیا ہے۔(۴)

۱۔ مستدرک الوسائل ج اول ص ۲۴۵ حدیث ۱۰ ۲۔ ایضاً جلد اول ص ۲۲۷ حدیث ۱۸

۳۔ کافی جلد ۶ ص ۵۳۲ حدیث ۱۴

۴۔ خصال صدوق ص ۳۹۱

علامہ حلّی علیہ الرحمہ کے بھائی شیخ علی بن الحسن بن مطہر اپنی کتاب " العدد القویۃ " میں حضرت خدیجہ علیہا السلام سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتی ہیں: رسول خدا (صلی اللہ علیہ و آلہ) جس وقت گھر میں داخل ہوتے پانی کا برتن طلب کرتے اور نماز کے لئے وضو کرتے اور پہلے مختصر طور پر دو رکعت نماز پڑھتے اس کے بعد اپنے بستر پر تشریف رکھتے تھے ۔ (۱)

کافی میں عباد بن صہیب سے روایت ہے کہ انھوں نے امام صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ : رسولؐ اسلام نے کبھی بھی اپنے دشمن پر شبخون نہیں مارا ۔ (۲)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ : کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ پیغمبر اسلامؐ خواب سے بیدار ہوئے ہوں اور بلا فاصلہ بارگاہ معبود میں سر بسجود نہ ہو گئے ہوں۔ (۳)

اھل و عیال کے ساتھ معاشرت

سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ اپنے " رسالہ محکم و متشابہ " میں تفسیر نعمانی سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ : اصحاب کی ایک جماعت نے دن میں ازواج کے پاس جانا ___ کھانا کھانا اور رات میں سونا اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا۔ ام سلمہ کے ذریعہ یہ خبر پیغمبر اسلامؐ کو ملی تو آپ اٹھ کر ان کے پاس گئے اور فرمایا :۔

" آیا تم اپنی عورتوں سے بے رغبت ہو گئے ہو، میں اپنی ازواج کے پاس جاتا ہوں، دن میں کھانا بھی کھاتا ہوں اور رات میں سوتا بھی ہوں ۔ اگر کوئی میری سنت کو ترک کرتا ہے تو وہ مجھ سے نہیں ہوگا " تا آخر (۴)

اسی مفہوم کی بہت سی روایتیں شیعہ و سنی کتابوں میں مختلف طریقوں سے نقل ہوئی ہیں ۔
کافی میں اسحاق بن عمار امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : بیویوں کو دوست

۱۔ بحار الانوار جلد ۱۶ ص ۸۴ ۲۔ کافی جلد ۵ ص ۲۸ حدیث ۳
۳۔ مکارم الاخلاق ص ۳۹ ۔ ۳۸
۴۔ مستدرک جلد ۲ ص ۵۳۰

رکھنا اخلاق انبیاء سے تھے۔ (۱)

کافی میں ہی بکار بن کردم نیز دوسرے بہت سے لوگوں سے روایت ہے کہ امام صادق (ع) نے فرمایا: رسول اسلام کا ارشاد ہے: میری آنکھوں کی روشنی نماز اور میری لذت عورتوں میں قرار دی گئی ہے۔ (۲)

اسی مضمون سے قریباً ایک روایت دوسرے طریقہ سے بھی نقل ہوئی ہے۔

صاحب "من لایحضرہ الفقیہ" فرماتے ہیں: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی عورت سے شادی کرنا چاہتے تو کسی کو بھیجتے تھے کہ اس عورت کو دیکھ آئے۔ تا آخر۔ (۳)

تفسیر عیاشی میں حسین بن بنت الیاس سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رضا علیہ السلام کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: خداوند عالم نے شب اور عورت آرام و آسائش کے لئے قرار دی ہے رات میں شادی کرنا اور کھانا کھلانا پیغمبر اسلام کی سنت ہے (۴)

خصال میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے حدیث اربعمائہ کے ضمن میں فرمایا: اپنے بچوں کا ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کرو اور سر کے بالوں کا وزن کر کے اس کے برابر چاندی کسی مسلمان کو صدقہ دے دو رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی حسن و حسین (علیہما السلام) اور اپنے تمام بچوں کے سلسلہ میں ایسا ہی کیا تھا۔ (۵)

کھانے پینے کے اصول

کافی میں ہشام بن سالم نیز دوسروں سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا: کہ رسول خدا کو کوئی بھی چیز اس سے زیادہ پسند نہ تھی کہ آپ ہمیشہ گرسنگی اور خوف خدا میں مبتلا رہیں (۶)

احتجاج طبرسی میں امام موسیٰ کاظم اپنے آبائے طاہرین سے نقل کرتے ہیں کہ امام حسین نے ایک طویل حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کے وہ جوابات نقل کئے ہیں جو حضرت نے ایک یہودی کے

۱۔ کافی جلد ۵ ص ۳۲۰ حدیث ۱ ۲۔ ایضاً ص ۳۲۱ حدیث ۷ ۳۔ من لایحضرہ الفقیہ جلد ۳ ص ۲۴۵ حدیث ۲
۴۔ تفسیر عیاشی جلد اول ص ۳۷۱ ۵۔ خصال صدوق جلد دوم ص ۶۱۹ ۶۔ کافی جلد ۸ ص ۱۲۹ حدیث ۹۹

جواب میں ارشاد فرمائے تھے اسی حدیث کے ذیل میں یہودی حضرت علیؑ سے سوال کرتا ہے: لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ایک زاہد منش تھے کیا یہ صحیح ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا ہاں ایسا ہی ہے لیکن حضرت محمدؐ تمام انبیاءؑ سے زیادہ زاہد تھے۔ کیونکہ کنیزوں کے علاوہ آپ کے تیرہ بیویاں تھیں اس کے باوجود آپ کے لئے کبھی دسترخوان چنا نہیں گیا اور کبھی آپ نے گیہوں کی روٹی نہ کھائی اور جو کی روٹی بھی کبھی شکم سیر ہو کر نہ کھائی آپ عموماً تین شبانہ روز بھوکے رہتے تھے۔ (۱)

امالی صدوق میں عیص بن قاسم سے روایت ہے کہ اس نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کے والد سے ایک حدیث روایت ہوئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسولؐ خدا نے کبھی گیہوں کی روٹی سیر ہو کر نہ کھائی کیا یہ صحیح ہے؟ حضرتؑ نے جواب دیا: نہیں، کیونکہ رسولؐ خدا نے اصلاً کبھی گیہوں کی روٹی کھائی ہی نہیں اور جو کی روٹی بھی شکم سیر ہو کر نہ کھائی۔ (۲)

دعوات قطب میں روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے کبھی تکیہ لگا کر کھانا نہ کھایا مگر صرف ایک مرتبہ اور اس وقت بھی فوراً اٹھ کر بیٹھے اور خدا سے معذرت طلب کی: بارالٰہا میں تیرا بندہ اور تیرا رسول ہوں۔ (۳)

اسی مفہوم کی احادیث کلینیؒ اور شیخ طوسیؒ نے کئی طریقوں سے نقل کی ہیں ـــــ صدوقؒ، برقیؒ نے اور حسین بن سعید نے بھی کتاب "زہد" میں اس طرح کا ذکر کیا ہے۔

کافی میں زید شحام امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: خداوند عالم نے جس دن سے پیغمبر اسلامؐ کو نبوت پر مبعوث کیا اس دن سے دم رحلت تک کبھی حضرتؐ نے تکیہ پر ٹیک لگا کر کھانا نہ کھایا بلکہ ہمیشہ غلاموں کی طرح کھانا نوش فرماتے تھے اور ان ہی کی طرح بیٹھتے تھے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو فرمایا: تاکہ خود کو خداوند عزوجل کے سامنے ادنیٰ اور متواضع ظاہر کریں۔ (۴)

اسی کتاب میں ابی خدیجہ سے منقول ہے: بشیر دہان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا: آیا کبھی ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلامؐ نے داہنے یا بائیں ہاتھ پر ٹیک لگا کر کھانا کھایا ہو؟ ابی خدیجہ کہتے ہیں میں بھی اس وقت بزم میں موجود تھا۔ امام علیہ السلام نے جواب دیا: نہیں! رسول اسلامؐ

۱۔ احتجاج طبرسی جلد اول ص ۳۲۵ ۲۔ بحار جلد ۱۶ ص ۲۴۳ از مکارم اخلاق ص ۲۸

۳۔ مستدرک الوسائل جلد ۳ ص ۸۳ حدیث ۵ ۔ ۴۔ کافی جلد ۶ ص ۲۷۰ حدیث ۱

دائیں یا بائیں سمت ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ ایک غلام کی مانند بیٹھا کرتے تھے میں نے عرض کی کیوں؟ فرمایا: خدائے عزوجل کے مقابل خود کو منکسر و متواضع ظاہر کرنے کے لئے۔ (۱)

اسی کتاب میں جناب جابر امام محمد باقرؑ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا: رسولؐ خدا غلاموں کی طرح کھانا کھاتے تھے اور ان ہی کے مانند زمین پر بیٹھتے تھے، ہمیشہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور زمین پر ہی سو رہتے تھے۔ (۲)

غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں، رسولؐ خدا جس وقت کھانے کے لئے بیٹھتے تھے دونوں زانوؤں اور دونوں قدموں کو سمیٹ لیتے تھے اور جس طرح ایک نمازی بیٹھتا ہے بیٹھ جاتے تھے مگر یہ کہ ایک زانو دوسرے زانو پر اور ایک قدم دوسرے قدم پر رکھ دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے میں ایک بندہ ہوں لہٰذا بندوں کی طرح کھانا کھاتا ہوں اور ان ہی کے مانند بیٹھتا ہوں۔ (۳)

صفوانی نے کتاب "تعریف" میں حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ خدا جس وقت غذا کے لئے بیٹھتے تھے تو آپ کی نشست کا انداز غلاموں کا سا ہوتا تھا آپ بائیں زانو پر تکیہ فرماتے تھے۔ (۴)

مکارم الاخلاق میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا زمین پر بیٹھتے تھے، اپنے دونوں پیروں کے درمیان میں لے کر بھیڑوں کا دودھ دوہتے تھے، اگر کوئی غلام آپ کو دعوت دیتا تھا تو اسے قبول کر لیتے تھے۔ (۵)

محاسن میں حماد بن عثمان سے اور وہ امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: پیغمبر اسلامؐ جس وقت کھانا نوش فرماتے تھے بعد میں اپنی انگلیاں چاٹ لیتے تھے۔ (۶)

صاحب "احتجاج" نے کتاب "موالید الصادقین" سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ رسولؐ خدا ہر قسم کی غذائیں کھا لیتے تھے اور جو کچھ بھی خداوند عالم نے حلال کیا ہے آپ اپنے اہلبیت علیہم السلام اور غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے تھے اور ان کے شریک بن جاتے تھے، اسی طرح جب بھی کوئی مسلمان آپ کو دعوت دیتا آپ اس کے ساتھ بیٹھ جاتے جو کچھ وہ کھاتے آپ بھی نوش فرماتے جہاں وہ لوگ بیٹھ کر کھاتے آپ بھی بیٹھ کر کھا لیتے مگر یہ کہ ان کا کوئی مہمان آ جاتا تو اس صورت میں آپ اس مہمان کے ساتھ

۱۔ کافی جلد ۶ ص ۲۷۱ حدیث ۷ ۲۔ کافی جلد ۶ ص ۲۷۱ حدیث ۱ ۳۔ احیاء العلوم جلد ۷ ص ۱۲۱
۴۔ مستدرک الوسائل ج ۳۔ ص ۸۱۳۔ حدیث ۳ ۵۔ بحار ج ۱۶ ص ۲۲۹ حدیث ۱۳۵ (از مکارم الاخلاق ص ۲۶)
۶۔ محاسن برقی مطبوعہ اسلامی ص ۴۴۴ حدیث ۳۱۳

کھانا نوش فرماتے تھے ، یہاں تک کہ وہ لکھتے ہیں : آپ کو سب سے زیادہ وہ غذا پسند آتی تھی جس میں سب سے زیادہ کھانے والے شریک ہوتے تھے ۔ (۱)

کافی میں ابن قداح سے روایت ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا : پیغمبر اسلامؐ جب لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتے تھے تو آپ کھانا شروع کرنے والی سب سے پہلی فرد اور کھانے سے ہاتھ روکنے والی سب سے آخری فرد ہوتے تھے ۔ آپ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ سب لوگ کھانا کھائیں اور ان میں شرمندگی کا احساس بھی نہ پیدا ہو ۔ (۲)

کافی میں ہی محمد بن مسلم امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے امیرالمومنینؑ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا : انبیاء رات کا کھانا نماز عشاء کے بعد کھاتے تھے ۔ تم لوگ بھی رات کا کھانا ترک کیا کرو کیونکہ یہ بدن کی خرابی کا باعث ہوتا ہے ۔ (۳)

اسی کتاب میں عنبسہ بن نجاد امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ : کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضورؐ کے کھانے پر خرما آیا ہو اور آپ نے سب سے پہلے خرما نوش نہ فرمایا ہو ۔ (۴)

اسی طرح کافی اور صحیفۃ الرضا میں حضرت کے آبائے کرام سے منقول ہے کہ : رسول اسلامؐ جس وقت خرما کھاتے تھے اس کے بیج ہاتھ کی پشت پر جمع کرتے جاتے تھے اور پھر دور پھینک دیتے تھے ۔ (۵)

کتاب "اقبال" کے مصنف نے "تاریخ نیشاپوری" جلد دوم سے نقل کیا ہے کہ حسن بن بشر کے حالات کے ذیل میں ان سے روایت ہے کہ : رسول خداؐ ہر دو لقمہ کے درمیان خدا کی حمد کیا کرتے تھے ۔ (۶)

کافی میں وہب بن عبد ربہ سے روایت ہے کہ : میں نے امام صادقؑ کو خلال کرتے ہوئے دیکھا حضرتؑ نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر فرمایا : رسول خداؐ ہمیشہ خلال کیا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ خلال دہن کو خوشبودار بھی بناتا ہے ۔ (۷)

مکارم الاخلاق میں رسول خدا سے روایت ہے کہ آپ ہمیشہ پانی پینے سے قبل بسم اللہ کہتے تھے

۱ـــ مکارم الاخلاق ص ۲۶ ۲ـــ کافی جلد ۶ ص ۲۸۵ حدیث ۱ ۳ـــ کافی جلد ۶ ص ۲۸۸ حدیث ۱
۴ـــ کافی جلد ۶ ص ۳۴۵ حدیث ۱ ۵ـــ عیون الاخبار جلد ۲ ص ۴۰ حدیث ۱۳۴
۶ـــ اقبال ۱۱۶ ۷ـــ کافی جلد ۶ ص ۳۷۶ حدیث ۳

اس کے بعد فرماتے ہیں : آپ صلعم اس انداز پر آہستہ آہستہ پانی پیتے تھے بھر منہ کبھی گھونٹ نہیں لیتے تھے اور فرماتے تھے : درد جگر اسی سبب بڑے گھونٹ لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ (۱)

جعفریات میں امام جعفر صادق اپنے آبائے طاہرین سے نقل کرتے ہیں کہ امیرالمومنین نے فرمایا: میں نے کئی مرتبہ دیکھا اور تجربہ کیا کہ رسول اسلام پانی یا دیگر ہر طرح کا مشروب تین سانسوں میں پیا کرتے تھے ہر سانس کے شروع میں "بسم اللہ" اور آخر میں الحمد للہ کہا کرتے تھے۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو حضور نے فرمایا : حمد اداۓ شکر پروردگار کی غرض سے اور بسم اللہ ہر طرح کے ضرر و درد سے محفوظ رہنے کی غرض کہتا ہوں (۲)

صاحب مکارم الاخلاق لکھتے ہیں : رسول خدا کبھی پینے کا برتن منہ سے لگا کر سانس نہیں لیتے تھے جب سانس لینا چاہتے تھے (تو منہ سے) برتن کو دور کر لیتے تھے۔ (۳)

غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے : جب رسول اسلام گوشت کھاتے تھے تو اپنا سر گوشت کے برتن کی طرف نہیں جھکاتے تھے بلکہ اس کو اپنے دہن کے قریب لے جاتے تھے اور اس کو ایک خاص انداز میں اور تمام دانتوں سے چباتے تھے، اور خاص طور سے جب بھی گوشت تناول فرماتے تھے کھانے کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو اچھی طرح ضرور دھوتے تھے اور اپنے گیلے ہاتھ چہرے پر پھیر لیا کرتے تھے۔ (۴)

مکارم الاخلاق میں ہے : رسول خدا ہر قسم کی غذا نوش فرمالیا کرتے تھے۔ (۵) طبرسی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کچھ کھانوں کا بھی ذکر کیا ہے جو آپ کھایا کرتے تھے منجملہ ان کے روٹی اور گوشت کی مختلف قسموں کا ذکر کیا ہے اسی طرح خربوزہ، شکر، انگور، انار، خرما، دودھ، ہریسہ (حلیم کی ایک قسم)، روغن، سرکہ، کاسنی (ایک قسم کا ساگ ہے) یا دروج یا ریحان کوہی، کرم کلہ یا گوبھی وغیرہ کا ذکر ہے، روایت کی گئی ہے کہ آپ کو شہد بہت زیادہ پسند تھا، نیز یہ بھی روایت ہے کہ آپ کو پھلوں میں سب سے زیادہ انار مرغوب تھا۔

شیخ طوسی امالی میں ابو اسامہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا : رسول خدا کا کھانا، اگر میسر آتا، تو جو تھا، ان کی مٹھاس خرما اور ان کے گھر کا ایندھن خرمے کے درخت کی چھال، پتے اور ٹہنیاں ہوتی تھیں (۶)

۱۔ مکارم الاخلاق ص ۳۱ ۲۔ جعفریات ص ۱۵۵ ۳۔ مکارم الاخلاق ص ۳۱ ۴۔ احیاء العلوم ج ۷ ص ۱۴۶
۵۔ مکارم الاخلاق ص ۲۶ ۶۔ بحار ج ۱۶ ص ۲۸۸ حدیث ۱۳۶ (از امالی شیخ طوسی)

مکارم الاخلاق میں ہے کہ رسولِ خداؐ گرما گرم کھانا پسند نہیں کرتے تھے ٹھنڈا ہونے کے بعد کھانا کھاتے تھے اور فرماتے تھے: خداوند عالم نے ہم کو آگ نہیں کھلائی ہے جلتے ہوئے کھانے میں برکت نہیں ہوتی اور جب کھانا کھاتے تھے بسم اللہ کہتے تھے ہمیشہ تین انگلیوں سے اور اپنے سامنے ہی رکھا ہوا کھانا نوش فرماتے تھے دوسرے کے سامنے رکھا ہوا کھانا نہیں اٹھاتے تھے۔ جب دسترخوان بچھا دیا جاتا تو ہر ایک سے پہلے کھانا شروع کر دیتے تھے کھانا تین انگلیوں یعنی انگوٹھے اور اس کے بغل کی دو انگلیوں سے کھاتے تھے کبھی کبھی چوتھی انگلی بھی شامل فرما لیتے تھے اور کبھی پوری ہتھیلی کھانا نوش فرماتے تھے لیکن صرف دو انگلیوں سے کبھی نہیں کھاتے تھے آپ فرماتے تھے: دو انگلیوں سے کھانا کھانا شیطان کی عادت ہے۔ ایک دن آپ کے اصحابؓ فالودہ لے کر حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ نے ان کے ہمراہ بیٹھ کر نوش فرمایا اس کے بعد سوال کیا یہ فالودہ کس چیز سے بنتا ہے؟ لوگوں نے عرض کی: روغن میں شہد ملا کر تیار کرتے ہیں آپ نے فرمایا اچھی غذا ہے۔ رسولِ خداؐ جو کی روٹی بھوسی الگ کئے بغیر کھایا کرتے تھے، آپ نے کبھی بھی گیہوں کی روٹی کھائی اور نہ ہی جو کی روٹی سیر ہو کر کھائی۔ کبھی خوان پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے خربوزہ، انگور اور خرما کھاتے اور ان کی بیج بھیڑ کو کھلا دیتے تھے۔ آپ کبھی لہسن، پیاز، لہسن کا ساگ اور شہد کہ جس میں مغافیر ہوتی تھی نہیں کھاتے تھے، یہ مغافیر ایک طرح کا مرکب ہے جو شہد کی مکھی کے بدن میں ہضم نہیں ہوتا اور وہ اسے شہد میں انڈیل دیتی ہے کھانے کے بعد جس کی بو منھ میں رہ جاتی ہے، رسولِ خداؐ کبھی کسی غذا میں عیب نہیں نکالتے تھے اگر پسند آتی کھا لیتے ناپسند ہوتی تو چھوڑ دیتے تھے عیب نہیں نکالتے تھے کہ دوسرے بھی نہ کھائیں۔ کھانے کا برتن انگلی سے چاٹ کر صاف کر دیتے تھے اور فرماتے تھے: برتن میں لگی آخری خوراک میں برکت زیادہ پائی جاتی ہے۔ غذا سے فارغ ہو کر ہاتھ کی تینوں انگلیاں بھی یکے بعد دیگرے چاٹ لیتے تھے کھانے کے بعد اپنے ہاتھ دھو کر صاف کر لیتے تھے اور کبھی تنہا کھانا نوش نہیں فرماتے تھے۔ (۱)

صاحب مکارم الاخلاق تحریر فرماتے ہیں: رسولِ خداؐ مشروبات بھی کبھی شام سے لائے جانے والے بلوری پیالوں یا لکڑی، مٹی یا چمڑے کے برتنوں میں نوش فرماتے تھے۔ (۲) اسی کتاب میں پیغمبر اسلامؐ سے ہی منقول ہے کہ آنحضرتؐ چلو میں بھی پانی پیا کرتے تھے اور ہاتھوں میں پانی لے کر فرماتے تھے کوئی بھی برتن ہاتھوں سے زیادہ پاکیزہ نہیں ہوتا۔ (۳)

کافی میں عبد اللہ ابن سنان سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: عید قربان کے دن رسولِ اسلامؐ سینگوں والے دو بھیڑ ذبح کیا کرتے تھے ایک اپنی طرف سے دوسرا اپنی امت کے فقرا کی جانب سے (۴)

۱۔ مکارم الاخلاق ص ۲۸
۲۔ مکارم الاخلاق ص ۲۱
۳۔ مکارم الاخلاق ص ۱۲۰
۴۔ کافی جلد ۲ ص ۵۱۴ حدیث ۱

طبری کا مکتب تاریخ نگاری

تحریر: جناب صادق آئینہ وند
ترجمہ: سید ولی الحسن رضوی

مقدمہ کے طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ مباحث جو اسلامی تاریخی مفروضات کو کمال وارتقا عطا کرنے، ان کو روایتی پیرائے سے تاریخی قالب میں تبدیل کرنے اور پھر تاریخی مکاتب کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس کے بعد ہم ـــــ طبری کے منابع و مآخذ، انداز تحریر، قوی اور ضعیف پہلو نیز اسلامی مؤرخین کے درمیان طبری کے کام کی مقبولیت ـــــ پر بحث کرتے ہوئے اس کی تاریخ نگاری کے مکتب کا جائزہ لیں گے۔

اسلامی تاریخ نگاری کے میدان میں دو طرح کے انداز تحریر سب سے زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔

۱ـــــ موضوع کی بنیاد پر تاریخ کی تدوین
۲ـــــ سال کی بنیاد پر تاریخ کی تدوین

اسلامی مؤرخین کے تقریباً ہر گروہ نے، مذکورہ بالا جو روش بھی اپنائی، اپنی منتخبہ روش کے دفاع اور اسے ثابت کرنے کے لئے دلیلیں پیش کرتے ہوئے اس کے نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔

لیکن بہتر ہے ۔ان تمام تاریخی زاویۂ نظر کو بیان کرنے سے پہلے جو خود ہر مؤرخ کی تاریخ نگاری کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں ۔ ابتدائی صدیوں میں ،اسلامی تاریخ نگاری کے مختلف مکاتب کی پیدائش کے وقت موجود ان بنیادوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو خود ان مکاتب کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں ۔

جس وقت تاریخ حدیث شریف سے تدریجی طور پر جدا ہو رہی تھی اور خود اپنی مستقل حیثیت حاصل کرنے کے لئے ابتدائی مقدمات فراہم کر رہی تھی ، یونانی فکری رجحانات و نظریات کے ورود نیز فلاسفہ اور متکلمین نے جو مخصوص بحثیں چھیڑ رکھی تھیں' مشخص طور پر اسلامی تاریخ نگاری میں دو طرفہ فکر کے وجود کا سبب بنے ۔

(الف) کچھ لوگ جو سنت و حدیث پر بھروسہ کرتے ہیں اور " اخباریوں " کے نام سے معروف ہیں ، معتقد تھے کہ تاریخ کو اپنے تاریخی مفروضات قائم کرنے میں اپنی دینی پیغام رسانی کو نہیں ترک کرنا چاہیئے ، بلکہ ہر لمحہ ایک مفید علم کی حیثیت سے علوم تفسیر و حدیث کی مدد کرنا چاہیئے ۔

(ب) دوسرا گروہ یہ خیال رکھتا تھا کہ تاریخ وہ تجرباتی سلسلہ ہے جو آئندہ آنے والوں کے لئے فائدہ مند ہے ۔اس سے فکر و تدبر کے ایک وسیلے اور علوم مادی کے ایک جزو کی حیثیت سے کام لینا چاہیئے

ہمیں تاریخ پر فلسفہ اور علم کلام کے اثرات کا بھی جائزہ لینا چاہیئے ۔ فلاسفہ اور متکلمین علوم کی ترتیب کے ضمن میں خصوصاً عملی علوم سے متعلق بحث کے ذیل میں تاریخ کو رکھتے تھے ۔اور تاریخ کے علمی ہونے نیز اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی ماہیت کے بارے میں فیصلے کرتے تھے ۔ان کے عقائد و نظریات اسلامی مؤرخین کے کام پر اثر ڈالتے تھے یہی وجہ ہے کہ تاریخی افکار نے بھی اسلامی فلسفہ کے ساتھ ہی ساتھ برابر سے ارتقائی منزلیں طے کیں ۔(۱)

---

۱ ـــ فلسفہ تاریخ ابن خلدون ، محسن مہدی ترجمہ مجید مسعودی ' ناشر بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران ۱۹۷۴ء ص ۱۴۶

فلاسفہ نے ارسطو کی پیروی کرتے ہوئے تاریخ کو علم تسلیم نہیں کیا اور اپنی علوم کی تقسیم بندی میں اس کا علم کے عنوان سے ذکر نہیں کیا ارسطو نے اپنی کتاب "اخلاق نیقو ماخسی (NICOMACHEAN ETHICS) میں جو بعد میں علوم کی تقسیم بندی کے سلسلہ میں اسلامی فلاسفہ کا ماخذ قرار پائی، علوم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے :-

۱۔ علوم نظری ۲۔ علوم عملی ۳۔ علوم مفید۔

تاریخ چونکہ ایک مخصوص زمان و مکان میں رونما ہونے والے مخصوص واقعات سے سروکار رکھتی ہے اس لحاظ سے علوم کے بالکل مقابل کی ایک چیز ہے۔ کیونکہ علوم کے بارے میں ارسطو کے مفروضے کے مطابق علم فقط اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب ایک کلی تصدیق حاصل ہو اور اشیاء کے ایک طبقے کی علت و ماہیت کا پتہ دے۔ تاریخ کوئی نظری علم نہیں ہے کیونکہ اس کا موضوع بدلتا رہتا ہے اس میں ماضی کی تحقیق، واقعات کی جمع آوری اور طبقہ بندی کی جاتی ہے اس اعتبار سے یہ ایک فن یا تخلیقی علم و ہنر سے زیادہ قریب ہے "(۱)

اسلامی مؤرخین میں شاید "سخاوی" نے سب سے زیادہ اپنے ماسلف "طبری" کی پیروی کرتے ہوئے حدیث اور اس سے تاریخ کی وابستگی و ہم آہنگی کے توازن کی پابندی کی ہے۔ وہ اپنی کتاب "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" میں ابن خلدون کو اس کے اس خیال پر جس میں اس نے حدیث کی روشنی میں تاریخ لکھنے والے، رائج روش کے پابند مؤرخین کو نشانہ بنایا ہے، کنایۃً مورد تنقید قرار دیتے ہوئے کہا ہے : تاریخ وہ فن ہے جس میں دنیا میں رونما ہونے والے مخصوص زمانے کے واقعات و حالات پر مکان و زمان کے تعین کے اعتبار سے بحث ہوتی ہے۔ اس کا موضوع "انسان" اور زمانہ ہے : اس کا فائدہ امور سے متعلق عمومی معلومات حاصل کرنا ہے اور اس کے اہم فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تاریخ کے ذریعہ دو متعارض اور ناقابل جمع حدیثوں کے سلسلہ میں نسخ کی راہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ

۱۔ فلسفۂ تاریخ ابن خلدون ۔ محسن مہدی ترجمہ مجید مسعودی تہران ناشر بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب ۱۳۵۲ شمسی ہجری ص ۱۶۷/۱۶۸ ۔

وہ اضافہ کرتا ہے: "تاریخ، علم حدیث نبوی کے فنون میں سے ایک فن ہے"۔ (۱)

اس کے مقابل نقطہ نظر یعنی مؤرخین کے دوسرے گروہ کا نظریہ بھی ابن خلدون کے مقدمہ میں علم تاریخ کے موضوع کی تعریف کے ذیل میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

"تاریخ کا اصل کام انسانی معاشرہ یا دوسرے لفظوں میں عالمی معاشرہ کے ان حالات وکیفیات سے آگاہ کرنا ہے جو اس معاشرہ کی طبیعت پر عارض ہوتے ہیں مثال کے طور پر جنگلی طرز زندگی یا اجتماعی معاشرت، تعصب اور دشمنیاں یا انسانوں کے ذریعہ کائنات کو مسخر کرنے کی کوششیں، ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر غلبہ و تسلط اور وہ سب کچھ جو اس معاشرہ میں رونما ہوتا ہے مثلاً حکومت و سلطنت کی تشکیل ان کے مراتب و درجات اور جو کچھ انسان اپنی کوشش و کاوش کے ذریعہ حاصل کرتا ہے یعنی مختلف پیشے، معاش علم و دانش، ہنر و فنکاری نیز دیگر وہ تمام حالات و کیفیات جو اس معاشرہ کی طبیعت کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (۲)

عصر عباسی میں علوم عقلی کے ارتقائی دور اور یونانی آثار کے ترجموں سے متاثر فکری رجحانات کے گرما گرم بازار میں معتزلہ کا وہ پہلا گروہ ہے جس نے حدیثوں پر اعتماد کرنے والی تاریخ نگاری کی روایتی یا سنتی روش پر کھل کر حملہ کیا۔ انہوں نے عقلی معیار پر حالات و واقعات کا جائزہ لینے اور طبیعت میں جھانک کر تمام چیزوں کے وجوہات تلاش کرنے پر زور دیا، اور ایسی روایتوں کو قبول کرنے سے احتراز کیا جن کی صحت کی واحد دلیل راویوں کی وہ مسلسل کڑیاں تھیں جن کے ناموں کا ذکر ہر روایت سے پہلے کیا جاتا تھا، وہ کہتے تھے: "ممکن ہے پوری امت ایک جھوٹ کی گواہی دے دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کا گروہ جھوٹا ہو۔" (۳)

۱۔ علم تاریخ در اسلام "صادق آئینہ وند" ناشر وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی تہران ۱۹۸۵ء۔ ص ۳۶-۳۷

۲۔ مقدمہ ابن خلدون جلد اول ترجمہ محمد پروین گنابادی ناشر بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب ۱۹۵۷ء، ص ۶۴

۳۔ بغدادی کی اصول الدین اور شہرستانی کی "الملل والنحل" ملاحظہ فرمائیں۔

ان کی رائے میں، یقین عقلی دلائل پر مبنی ہونا چاہیئے نہ کہ محض روایتوں کی بنیاد پر قائم کرلیا جائے۔ (۱)

تاریخ نگاری کی راہ میں ایک اور دشواری تاریخی واقعات اور روایات کے ذرائع کی ماہیت کا مسئلہ تھا، تمام تاریخی واقعات کو، زمانۂ وقوع تک موثق زنجیروں میں منسلک کرنا محال تھا، خصوصاً اسلام سے قبل کے واقعات کو، ظاہر ہے اس صورت میں بھلا کون ان واقعات کے لئے حجت قرار پاسکتا تھا۔ (۲)

مندرجہ بالا مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیز مسلمانوں اور ان کے درمیان مختلف گروہوں کی ـــــ جن کی اس زمانہ کے معاشرہ میں کمی نہ تھی ـــــ ذہنی و فکری حالت کا احساس کرتے ہوئے، طبری نے تاریخ نگاری کا عظیم فریضہ، خود اپنی ایجاد کردہ خاص روش کے تحت شروع کیا جو بعد میں مؤرخین کی اکثریت کے لئے نمونہ بن گئی۔

اب ہم طبری کی تصنیف و تالیف کے ذرائع و منابع اور ان کی کیفیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

تاریخ کی تدوین میں طبری کے مآخذ

طبری نے زیادہ تر پہلی صدی ہجری کے نصف سے تیسری صدی ہجری کے نصف اول تک (۵۰ تا ۲۵۰ ہجری) کے تحریری آثار سے استفادہ کیا ہے اس نے خود اپنے دور کے تالیفات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ (۳) موضوعات کے اعتبار سے طبری کے تاریخی ذرائع کی تشریح کچھ یوں کی جاسکتی ہے :-

(ـــــ پیغمبروں اور الٰہی نمائندوں کی تاریخ کے لئے "ابن اسحاق" کی تفسیر

۱۔ فلسفہ تاریخ ابن خلدون ص ۱۷۶، ۱۷۷

۲۔ فلسفہ تاریخ ابن خلدون ص ۱۷۴

۳۔ تاریخ التراث العربی فواد سزگین عربی ترجمہ محمود فہمی حجازی مطبوعہ سعودی عربیہ ۱۹۸۳۔ جلد اول جزو ثانی۔ ص ۱۶۰۔

وسیرت اور" وہب بن منبہ" کی کتابیں ۔

۲ـــــ ایران کی تاریخ کے لئے ایرانی کتب کے عربی ترجمے خصوصاً ابن مقفع اور ہشام کلبی کی کتابیں ،اس کے علاوہ وہ تدوین شدہ اطلاعات ومعلومات نیز "حیرہ" کی اسناد جو اس کے ہاتھ لگی ہیں ۔

۳ـــــ روم کی تاریخ کے لئے عیسائیوں کی وہ کتابیں جو عربی میں نقل ہوئی ہیں ۔

۴ـــــ یہودیوں کی تاریخ کے لئے توریت کی کتابوں اور قصوں پر تکیہ کیا ہے ۔

۵ـــــ اسلام سے قبل عرب تاریخ کے سلسلہ میں جو کچھ "عبید بن شرمیہ" ، "محمد بن کعب قرظی" اور" وہب بن منبہ" خصوصاً "ہشام کلبی" اور ابن اسحاق نے لکھا ہے ،ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۶ـــــ سیرت نبیؐ کے سلسلہ میں "ابان ابن عثمان" ، "عروہ ابن زبیر" ، "شرجیل ابن سعد" ، "موسیٰ ابن عقبہ" ، "عاصم ابن عمر" نیز "ابن شہاب زہری" اور" ابن اسحاق" کے تالیفات پر بھروسہ کیا ہے ۔

۷ـــــ مرتدین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں "حروب الردۃ"(۱) اور اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں "سیف بن عمر اسدی"(۲) اور "مدائنی" سے فائدہ اٹھایا ہے ۔

۸ـــــ جمل اور صفین کی جنگوں کے سلسلہ میں "ابو مخنف" ، "مدائنی" اور" سیف ابن عمر" کی تحریروں پر اعتماد کیا ہے ۔

۹ـــــ امویوں کی تاریخ "عوانہ بن حکم" ،"ابو مخنف" ، "مدائنی" ،" واقدی" "عمر ابن شبہ" اور" ہشام کلبی" سے حاصل کیا ہے ۔

۱۰ـــــ عباسیوں کی تاریخ "احمد ابن ابی خیثمہ" ، "احمد ابن زہیر" ، "مدائنی" ، "عمر ابن راشد" ، "ہیثم ابن عدی" ، "واقدی" اور" ابن طیفور" سے نقل کی ہے ۔(۳)

۱۔ خلیفہ اول ابوبکر کے دور میں نبوت کے جھوٹے دعویداروں اور موجودہ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرنے والوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگیں "حروب الردۃ" کے نام سے مشہور ہیں "مترجم" ۔

۲۔ جناب سید مرتضیٰ عسکری نے اپنی کتاب عبد اللہ ابن سبا " میں اسدی کے بجائے اسیدی کو صحیح کہا ہے ۔

۳۔ التاریخ العربی والمؤرخون ۔شاکر مصطفیٰ ۔بیروت ، دار العلم للملایین ۱۹۷۸ء جلد ۱ ص ۲۵۵

طبری کے زیادہ تر ذرائع عراقی ہیں کیونکہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ عراق ہی میں گزرا ہے۔ یہاں اتنا اضافہ کردینا ضروری ہے کہ بغداد نے اپنی حادثہ آفرینی کے سبب اسلامی دنیا میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ اموی دور میں یہی جنگ وجدال اور مقابلہ آرائی کا مرکز تھا۔

راویوں میں سے تین شخصیتیں جن سے طبری نے فائدہ اٹھایا ہے یہ ہیں :- لی

۱۔ ابو مخنف (متوفی ۱۵۷ھ): یہ شیعہ ہیں اور کوفیوں میں سے ہیں اگرچہ حجاز سے متعلق ابو مخنف سے منقول روایتیں طبری کے یہاں بہت کم ہیں اور اس نے محض "شوریٰ کے قضیئے" اور "مدینہ کے انقلاب" پر اکتفا کی ہے لیکن اسی مختصر و منتخب مواد سے امویوں کے بارے میں ابو مخنف کی بے پروائی ظاہر ہے۔

۲۔ عوانہ ابن حکم (متوفی ۱۴۷ ہجری) دوسرا راوی جس سے طبری نے اقتباس کیا ہے عوانہ ابن حکم ہے، یہ چونکہ کلبیوں کے حلیفوں میں ہے اور یزید بھی بنی کلب سے ہی ہے لہٰذا اس نے امویوں کی جانب داری کی رعایت برتی ہے۔

۳۔ سیف ابن عمر (متوفی ۲۰۰ ہجری) تیسرا عراقی راوی طبری نے جس سے تاریخ نقل کی ہے سیف ابن عمر ہے۔ عثمان کے خلاف انقلاب سے متعلق زیادہ تر روایتیں طبری نے اسی سے نقل کی ہیں۔ یہ چونکہ بنی تمیم کے قبیلہ سے منسوب ہے اور خوارج کے ابتدائی لیڈر زیادہ تر اسی قبیلہ کے رہے ہیں لہٰذا شیعوں سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چونکہ "خلافت قریش میں ہونے" کے نظریہ کا پابند ہے۔ (۳۳ھ ہجری میں اپنے خلاف کھڑے ہونے والے کوفیوں کے ایک گروہ کے سامنے معاویہ نے اس پالیسی اور نقطۂ نظر کو پیش کیا تھا) نیز برسراقتدار حکام کی پالیسیوں کو سراہتا بھی ہے اس لئے بنی امیہ کے موالی راویوں کے زمرہ میں تقریباً اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔[1]

طبری نے جو کچھ ابو مخنف، عمر ابن شبہ، سیف ابن عمر، ابن طیفور وغیرہ سے نقل کیا ہے تمام روایتیں جمع کر کے ان کی تقسیم بندی کی ہے اور کہیں کہیں انتخاب سے کام لیا ہے۔

تاریخ طبری، اگرچہ بنیادی طور پر تاریخی روایتوں سے مربوط ہے لیکن اس کے قاری کو

۱۔ الحجاز والدولۃ الاسلامیۃ۔ ڈاکٹر ابراہیم بیضون بیروت ۱۹۸۳ء، ص ۲۰، ۲۱۔

ادبی دولت کے عظیم ذخیرے اس میں نظر آتے ہیں اس نے مختلف روایات کو صاف و بلیغ زبان میں متن کے عنوان سے بڑے ہی محکم انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس نے عمومی تاریخ لکھتے وقت خلقت کے آغاز سے اپنی عمر کی انتہا تک سیرت و جنگ کے عالم، "محمد ابن اسحاق" کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے نیز وہب ابن منبہ" کے جیسے 'عبریوں' پر اعتماد کیا ہے۔ اس نے ابان عثمان، عاصم ابن عمر، ابن قتادہ اور ابن شہاب زہری وغیرہ کی "سیرتوں" سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح کہنا چاہیئے کہ عراق میں موجود ہونے کی وجہ سے اس کو وہاں کی مالامال ثقافت سے بھرپور استفادہ کا موقع ملا ہے۔ (۱)

وہ، وہب ابن منبہ، کعب الاحبار، عبداللہ سلام اور محمد بن کعب قرظی نامی چار افراد سے تاریخ نقل کرتا ہے اور اہل کتاب کی روایتیں اور اسرائیلیات کا بڑا حصہ ان سے ہی اخذ کرتا ہے۔

ہمیں تاریخ طبری میں توریت کے بہت سے ٹکڑے ملتے ہیں جن کا بہت ہی محکم اور بلیغ عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اسی طرح "مزامیر" اور "تلمود" کے بھی بہت سے ٹکڑے اس تاریخ میں موجود ہیں۔ (۲)

طبری نے حجاز کی روایتیں، اموی خلافت کے آخری ایام میں ظاہر ہونے والی مدنی طرز تاریخ نگاری سے حاصل کی ہیں اور اپنے طبیعی میلان کے تحت زیادہ تر امویوں سے متعلق روایتوں کے بجائے خلفائے راشدین سے متعلق روایتیں تدوین کی ہیں۔

تاریخ نگاری کی اس روش کے نمایاں چہروں میں "واقدی" (متوفی ۲۰۶ ہجری) کا نام لیا جانا چاہیئے جو راوی کی نسبت مؤرخ زیادہ ہے، طبری نے حجاز سے متعلق زیادہ تر مشہور روایتیں ـــ مثلاً عثمان کا قتل ، مدینہ کا انقلاب، ابن زبیر کی شورش وغیرہ جن کے لئے اگر کہا جائے کہ طبری نے خاص اہتمام برتا ہے اور جذبات سے کام لیا ہے، تو غلط نہ ہوگا، یہ تمام چیزیں اس نے واقدی سے ہی نقل کی ہیں۔

۱۔ التاریخ والجغرافیہ فی العصور الاسلامیہ عمر رضا کحالہ دمشق المطبعۃ التعاونیہ ۱۹۷۲ء، ص ۳۹۔

۲۔ ایضاً ص ۴۴-۴۵

ان سب باتوں کے باوجود، ہمیں معلوم ہے کہ واقدی اگرچہ اس ماحول کا پروردہ ہے جو بنی امیہ کا دشمن ہے۔ پھر بھی حجاز میں ان کی حاکمانہ کارکردگی اور قوانین کے اجراء کے سلسلہ میں اولویت کا قائل ہے۔ حکومت شام کی طرف سے حجاز میں معین اکثر گورنروں اور حج کے امیروں کے نام اس نے اپنی تاریخ میں ذکر کئے ہیں۔ (۱)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طبری چاہے یا ان چاہے طور پر بہرحال امویوں کے حق میں تنافر کے شکار ماحول سے متاثر ہے کیونکہ اس نے اپنی یہ تاریخ تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں تحریر کی ہے۔ اس نے مذکورہ ماحول سے متاثر تہذیب و ثقافت نیز اپنے سیاسی فقہی نقطہ نظر کے تحت ہمیشہ اقتدار کے حامل حاکموں کا ساتھ دیا ہے۔ اہل اقتدار کا ساتھ دینا اس کی نظر میں فرق نہیں رکھتا راشدی ہو یا اموی اور عباسی۔ لیکن یہ تمام باتیں، جو ہم نے عرض کی ہیں ان کے باوجود چونکہ وہ ایک صاحب نظر فقیہ تھا، اور معتقد حکام کی جانب سے منسوب فقہی مکاتب و مذاہب سے الگ ایک مستقل مکتب و خیال رکھتا تھا لہٰذا تقریباً ہر طرح کی افراط، اور ناپسند طرفداری کی وبا سے، جس میں ہر مؤرخ گرفتار نظر آتا ہے طبری آزاد رہا ہے۔

طبری کا تاریخی طرز تحریر

تاریخ طبری یعنی "تاریخ الرسل والملوک" کا تحریری خاکہ یہ ہے کہ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔

۱۔ اسلام سے قبل کی تاریخ جس میں خلقت کی ابتداء، حضرت آدمؑ کی زمین پر تشریف آوری اور ہابیلؑ و قابیل کی داستان جیسے مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت یونسؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ

۱۔ الحجاز والدولۃ الاسلامیۃ ص ۲۱

کا ذکر ہے۔

اس کے بعد مختلف استوں کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ ایران ابتدا سے، یعنی منوچہر کے دور سے خسرو پرویز تک، بیان کی ہے) پھر ذی قار اور شہریار کے بیٹے یزدجرد کے واقعات نقل کئے ہیں۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے شاہان روم کا تذکرہ، مسیحیت کے آغاز سے نقل کیا ہے جس کے بعد قوم عاد، قوم ثمود، قوم طسم، قوم جدیس، قوم جرہم اور شاہان یمن اور مختصر طور پر مشاہیر عرب "زبارہ" کا ذکر کیا ہے۔

اور آخر میں پیغمبر اکرمؐ کے اسلاف صالحین کا عصر بعثت کے ظہور کے عنوان سے ذکر کیا ہے لیکن اس حصے میں ترتیب سال کا خیال نہیں رکھا ہے بلکہ انتخاب کا محور، واقعات کی تاریخی اہمیت کو قرار دیا ہے۔

۲۔ اسلامی دور: اس حصے میں اسلامی تاریخ پیغمبر اکرمؐ کے دور سے ۳۰۲ھ ہجری تک سنہ وار تحریر کی ہے۔ سنہ وار تاریخ نگاری کے سلسلہ میں اور اس پر کہ آیا اسلامی تاریخ نگاری میں یہ روش طبری کی ایجاد ہے یا نہیں، مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ان نظریات کا ذکر کرنے سے قبل یہ جان لینا بیجا نہ ہوگا کہ طبری کو اس میدان میں سبقت حاصل ہو یا نہ ہو، اس کا کام ایک نمونے کے طور پر جامع و مدون صورت میں ان لوگوں کے لئے بہر صورت نمونۂ عملی رہا ہے جنھوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے، اور اس طرز تحریر کو تاریخ نگاری میں ایک مستقل روش کے طور پر منتخب کیا ہے۔

روزنتھل نے، طبری کے ڈھیر سارے کام بطور ثبوت پیش کرتے ہوئے، ان روایتوں کے پیش نظر جو ابتدائی مؤرخین کے بیان سنہ وار تاریخ نگاری کی روش موجود ہونے کے سلسلہ میں، ہم تک پہنچی ہیں، اس میدان میں طبری کو موجد ماننے سے انکار کیا ہے۔

ابتدائی اسلامی مؤرخین میں جن لوگوں نے اس روش پر کام کیا ہے مندرجہ ذیل افراد کا نام لیا جانا چاہیئے۔

۱۔ ابو عیسی ابن المنجم (متوفی ۲۷۹ ہجری): اس نے طبری سے قبل ایک کتاب "تاریخ سنی العالم" لکھی ہے یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، جس سال جو واقعہ رونما ہوا ہے اسی ترتیب کے اعتبار سے سنہ وار لکھی گئی ہونا چاہیئے۔

۲۔ محمد بن یزداد : اس نے ابن ندیم کے قول کے مطابق ایک کتاب اسی طرز و روش پر لکھی ہے، یہ کتاب بعد میں اس کے بیٹے عبداللہ نے سنہ ۳۰۳ ہجری میں مکمل کی ہے، جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ وار طرز تحریر کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

روزنتھل کا خیال ہے کہ حمزۂ اصفہانی اور الیاس نصیبی دونوں کی تاریخیں محمد ابن موسیٰ خوارزمی کی تاریخ سے ماخوذ واقعات پر مبنی ہیں اور یہ خوارزمی چوتھی صدی ہجری کے نصف اول سے تعلق رکھتا ہے یہ بات خود ثابت کرتی ہے کہ خوارزمی کی کتاب سنہ کے اعتبار سے تالیف کی گئی ہے۔ (۱)

موجودہ منابع ۔ کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے کہ طبری وہ پہلا شخص نہیں ہے جس نے اس طرز پر سب سے پہلے تاریخ لکھی ہو۔ بلکہ "ہیثم ابن عدی" (متوفی ۲۰۶ ہجری) نے تاریخ میں ایک کتاب اسی سنہ وار طرز پر لکھی ہے جس کا نام "کتاب التاریخ علی السنین" ہے۔ خود یہ امر بتاتا ہے کہ سنہ کی بنیاد پر تاریخ نگاری کی روش عراق میں دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں رائج ہو چکی تھی۔

اس کے علاوہ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں لکھا ہے کہ جعفر ابن محمد الازہر (متوفی ۲۷۶ ہجری) نے تاریخ میں ایک کتاب لکھی ہے جو سنوں کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ (۲)

ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اسلام میں عمومی تاریخ کی کتابیں لکھنے کی دو روشیں ملتی ہیں : (۱) موضوعات کی بنیاد پر (۲) سنہ کی بنیاد پر ۔

سنہ کی بنیاد پر جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں واقعات کو سنہ وار ترتیب کے تحت قلمبند کیا گیا ہے پہلا شخص جس نے اس طرز پر لکھنا شروع کیا ہیثم ابن عدی ہے اس کے بعد طبری مسکویہ، ابن اثیر، ابن طقطقی، ابن عبری اور ابو الفداء نے اس طرز پر تاریخیں لکھی ہیں۔ (۳)

۱۔ "علم التاریخ عند المسلمین" فرانز روزنتھل ۔ ترجمہ ڈاکٹر صالح احمد العلی ۔ بغداد، ۱۹۶۳ء ص ۱۰۲ - ۱۰۳

۲۔ "التاریخ والمؤرخون العرب" ڈاکٹر سید عبدالعزیز سالم مطبوعہ دار النہضۃ العربیہ بیروت (سنہ ۱۹۸۱ء) ص ۸۷، ۸۸

۳۔ مجلہ "الفکر" عربی شمارہ ۲۷ جلد ۴ ص ۱۴۳ بیروت ۱۹۸۲ء

طبری نے اپنی تاریخ کی ترتیب میں واقعاتی تسلسل کی رعایت برتی ہے اور ان کو وقوع کے مطابق سال بہ سال پیغمبر اسلام ؐ کی ہجرت کے آغاز سے ۳۰۲ھ ہجری تک تحریر کیا ہے۔ اس نے ہر سنہ کے ذیل میں قابل ذکر واقعات کو نقل کر دیا ہے لیکن اگر واقعہ طویل ہے تو اس کا سنۂ وقوع کے اعتبار سے محض اشارہ کے طور پر ذکر کر دیا ہے اور پھر مناسب موقع سے بعد میں اس کی تفصیل پیش کی ہے۔

طبری نے تاریخی روایات جمع کرنے اور ترتیب دینے میں ابتدا میں بھی اور تدوین کے بعد بھی ان کے اصل منبع و مأخذ کی طرف نسبت دے دی ہے، یا اصل منبع کبھی اس کی کوئی مؤثق و معتمد شخصیت ہے اور کبھی ایسا عادل ہے جس نے واقعہ میں شرکت کی ہے یا اس سے واقف ہے اور کبھی کوئی کتاب ہے جو اس نے براہ راست سند رکھنے والے سے پڑھا اور سنا ہے اور اس سے روایت کی اجازت لی ہے۔ اور کبھی بادیہ نشیں گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، کبھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو مختلف شہروں اور ملکوں سے آئے ہیں اور اس کی نظر میں مورد اعتماد ہے ہیں۔ (۱)

ہم آج اصول حدیث کی کتابوں کے ذریعے یا وہ منابع جو ہم تک پہنچے ہیں ان کی مدد سے اس بات کی حقیقت کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ طبری نے اپنی تاریخی معلومات کو ایسی کتابوں سے اخذ کیا ہے جس کے بعض حصّوں کے سلسلہ میں روایت کی اس کو اجازت حاصل تھی اور بعض دوسرے حصوں کے سلسلہ میں اس طرح کی اجازت اسے حاصل نہیں تھی۔

وہ سلسلۂ اسناد جن کے نقل میں طبری کو روایت کی اجازت حاصل تھی، حدّثنا، اخبرنا یا کتب، کی عبارتوں سے شروع ہوتے ہیں لیکن جن کتابوں سے نقل روایت کی اجازت اس کو حاصل نہیں رہی ہے اس کی عبارتیں "قال"، "ذکر"، "روی" اور "حدثت" سے شروع ہوئی ہیں۔ (۲)

۱۔ "التاریخ والجغرافیۃ فی العصور الاسلامیۃ"۔ ص ۴۰

۲۔ "تاریخ التراث العربی" ص ۱۶۰

تدوینِ تاریخ کی جو روش طبری نے انتخاب کی ہے یہ وہی محدثین کی روش ہے ، اور وہ یہ کہ تاریخی واقعات موجودہ طُرق سے نقل کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی سند کو ذکر کرتے ہوئے اصل صاحبِ قول تک پہنچا دیتے ہیں ، طبری اکثر موارد میں اپنی رائے اور نظریے کا اظہار نہیں کرتا اور یہ وہ روش ہے جو اس نے اپنی اکثر کتابوں میں اپنائی ہے ۔ اس نے بعض مقامات پر نقل قول کرتے وقت کتاب کا نام بھی نقل کر دیا ہے اور کہیں کہیں صرف مؤلف کا نام لیا ہے کتاب کا نام نہیں ذکر کیا ہے ۔

طبری نے چونکہ اصحابِ حدیث کی روش کے مطابق اسناد پر تکیہ کیا ہے اس لئے تاریخی واقعات کو سند ذکر کرتے ہوئے شروع کیا ہے ۔ اور چونکہ تاریخ نگاری کے اس کے اپنے مکتب میں روایت کو قبولیت حاصل ہے اور روایت نقل کرتے وقت کتاب کا نام ذکر کرنا ضروری نہیں ہے ، اسلئے کتاب کی جگہ راوی کا نام ذکر کر دینا ہی کافی ہے ۔

وہ اپنی تاریخ میں حتی تفسیر کی تکمیل کا بھی قصد رکھتا ہے ، طبری کی نظر میں صحت روایت کی بنیاد راویوں کا "عدالت" ، "حافظہ" اور "صحتِ سند" کے سلسلہ میں معتمد ہونا ہے اور یہ وہ روش ہے جس کا خود طبری نے اپنی کتاب میں "امانت" و "دقت" کے ساتھ لحاظ رکھا ہے ۔ حتیٰ اس کو اپنی اس روش میں ایسی ڈھیروں روایات سے سابقہ پڑتا ہے ، جن کو قبول کرنے کی عقل بھی اجازت نہیں دیتی لیکن وہ روایت کے کسی ٹکڑے پر بھی کوئی تنقید و تبصرہ یا اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر گزر جاتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں سند کا صحیح ہونا ہی کافی ہے چاہے وہ عقل و منطق پر پوری اترے یا نہ اترے ۔

اس طرح کی زیادہ تر روایتیں انبیاء سے مربوط ہیں اور دینی روایات کا جزو ہیں اور غیب کی باتیں ہیں عقل کا اس میں کوئی راہ نہیں ہے وہ اس قضیہ کی وضاحت کے لئے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھتا ہے :۔ (۱)

۱۔ "منہج النقد التاریخی" ڈاکٹر عثمان موافی ناشر موسسة الثقافة الجامعية اسکندریہ ۱۹۷۶ء ص ۲۲۹ ، ۲۳۰

"وليعلم الناظر في كتابنا هذا ان اعتمادي في كل ما احضرت ذكره فيه مما شرطت اني راسمه فيه، انما هو على ما رويت من الاخبار التي انا ذاكرها فيه والآثار التي انا مسندها الى رواتها فيه، دون ما ادرك بحجج العقول، واستنبط بفكر النفوس، الا اليسير القليل منه، اذ كان العلم بما كان من اخبار الماضين، وما هو كائن من انباء الحادثين، غير واصل الى من لم يشاهدهم ولم يدرك زمانهم، الا باخبار المخبرين، ونقل الناقلين، دون الاستخراج بالعقول، والاستنباط بفكر النفوس۔
فما يكن في كتابي هذا من خبر ذكرناه عن بعض الماضين مما يستنكره قارئه، او يستشنعه سامعه، من اجل انه لم يعرف له وجها في الصحة ولا معنى في الحقيقة، فليعلم انه لم يؤت في ذلك من قبلنا۔ وانما اتى من قبل بعض ناقليه الينا۔ وانا انما ادينا ذلك على نحو ما ادى الينا۔(۱)

"...اس کتاب کو مطالعہ کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مندرجات کے سلسلہ میں میرا اعتماد اس بات پر ہے کہ میں نے محض تحریر کیا ہے جو کچھ آپ کے سامنے ہے۔ اور روایات سے میں نے نقل کیا ہے یا آثار کا ذکر کرتے ہوئے راویوں سے استناد کیا ہے محض نقل کرنے کی حد تک ہے میں نے اس میں عقل کو راہ نہیں دی ہے اور رائے اخذ کرنے کے سلسلہ میں چند موارد کو چھوڑ کر کہیں عقل کا استعمال نہیں کیا ہے۔

۱۔ تاریخ الرسل والملوک۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری۔ تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم ناشر دار المعارف" مصر ۱۹۶۰ء جلد اول ص ۷، ۸۔

جب گزشتہ لوگوں کے واقعات سے آگاہی، یا کسی زمانہ میں رونما ہونے والے واقعہ کا علم مقصود ہو تو جو لوگ اس وقت موجود نہیں رہے ہیں یا جنھوں نے واقعہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے ان سے علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ ان راویوں اور ناقلوں سے حاصل ہوتا ہے جنھوں نے اس کی خبر دی ہو یا نقل کیا ہو اس میں اپنی عقل لڑانا چاہیئے نہ ہی ذاتی رائے قائم کرلینا چاہیئے۔

یہ کتاب جو میں نے لکھی ہے گذشتہ لوگوں سے تعلق رکھتی ہے ممکن ہے کسی پڑھنے والے کو جو اس کی صحت میں شک رکھتا ہو یا حقیقت سے عاری خیال کرتا ہو، پسند نہ آئے یا سننے والے کو یہ روایت اچھی نہ لگے۔ لیکن قاری کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ روایت ہم نے اپنی طرف سے وضع نہیں کی ہے۔ بلکہ راویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے اور ہم نے بھی جس صورت میں ہم تک پہنچائی گئی تھی اپنی کتاب میں نقل کردی ہے۔"

طبری کی طرف سے اس طریقہ کے انتخاب نے ماہرین تاریخ کے لئے تنقید کا میدان فراہم کردیا ہے وہ کہتے ہیں آنکھ بند کرکے بلا کسی غور و فکر کے روایتیں نقل کردینا ایک سمجھدار مؤرخ کو زیب نہیں دیتا" اگرچہ سند ذکر کرتے ہوئے، واقعہ روایت کرنے کی روش، اس صورت میں جبکہ اسناد کے رجال علمائے جرح و تعدیل کے نزدیک مشہور ہیں، تاریخ اسلام میں پیش آنے والے واقعات کے سلسلہ میں واقعہ کی صحت و دقت نظر کی ضامن ہو لیکن اسلام سے قبل پیش آنے والے واقعات کی صحت کی ضمانت نہیں دے سکتی۔

خاص طور پر اس وقت جب کہ اس میدان میں، اسرائیلیات اور وضع شدہ حدیثوں کی مانند فضول روایتوں اور بے معنی داستانوں کا ایک ڈھیر موجود ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی محدثین نے تائید نہیں کی ہے۔ (۱)

یہی امر، تاریخ طبری کی تحقیق کرنے والوں کو دو حصوں میں منقسم کردیتا ہے جس کا

۱۔ مقدمہ تاریخ طبری۔ محمد ابوالفضل ابراہیم ص ۲۵

ہم طبری کے یہاں قوی اور کمزور پہلوؤں کی تحقیق سے متعلق بحث کے ذیل میں جائزہ لیں گے ۔

طبری کے قوی و ضعیف پہلو

طبری کی تاریخ پر نظر اور اس کی تاریخ نگاری کا اسلوب ایک محدث اور فقیہ ہونے کے اعتبار سے خود اس کی تحقیق اور ثقافت سے متاثر ہے ، وہ اپنی تاریخ کی تدوین میں تاریخ کے دو بنیادی نظریات پر تکیہ کرتا ہے ۔

الف) ایک طرف آسمانی نمائندوں یعنی انبیاء علیہم السلام کا سلسلۂ وحدت

ب) دوسری طرف امت کے تجربات و حالات اور زمانہ کے ساتھ انہیں متصل کرنے کا اہتمام

طبری کی نظر میں کسی واقعہ کی اہمیت قوت اسناد کی کیفیت سے وابستگی رکھتی ہے ۔ سند واقعہ سے جتنی قریب ہو اس کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہے ، یہی وجہ ہے اس کی تحریروں کے درمیان ہمیں ایسی نئی نئی تاریخی روایتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جو صرف اسی کی کتاب میں ہیں ۔

روایتیں نقل کے مرحلوں میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچنے اور حامل شخص کی دلچسپی ، جذبات و احساسات ، نیز اسی قسم کے دوسرے عوامل سے متاثر ہو جاتی ہیں ، بنابر تغییر کی نذر ہو جاتی ہیں اس لحاظ سے تحقیق و تنقید کے بعد بھی ان کی صحت و دقت کے سلسلہ میں کوئی حتمی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا ۔

جب "رائے" یا غلطی سے غیر محفوظ شخصی نظریے کا دخل ہو جائے — جو خود غلطی کی طرف پہلا قدم ہے تو اس سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ محض ایسے مؤرخین کی روایت پر اکتفا کی جائے جو موثق اور مورد اطمینان ہیں اس طرح واقعہ کی صحت کی ذمہ داری بھی خود انہی پر ہوگی ۔

طبری نے ہر جگہ اپنی رائے اور نظریہ کے اظہار سے گریز برتا ہے اور بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دیتا ہے وہ عموماً (خود اپنی نظر میں) معتبر یا مشہور روایت کا ذکر کرنے کے بعد صاف طور پر اپنی بے طرفی ظاہر کر دیتا ہے ۔

دراصل طبری تاریخ کو مشیت الٰہی کے بیان کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی نگاہ میں تاریخ امتوں کے حالات و تجربات کا "مخزن" یا "امانت کدہ" ہے۔

طبری کی تاریخ نگاری کے خصوصیات

اس طرز تاریخ نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ طبری نے اپنے ما سلف محدثین کی مانند چاہا ہے کہ اسلام کی تمام تاریخی روایات کو اپنی کتاب میں ایک جگہ جمع کر دے، لہٰذا اس عنوان سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلام کی بڑی قیمتی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے تمام مصادر و منابع کی تحقیق اور چھان پھٹک میں بڑا اہتمام برتا ہے اور ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ اس نے تاریخ نگاری کو ابتدائی اول کے تغیر و تبدل کے مرحلے سے نکال کر ایک مستقل نہج پر لگا دیا ہے۔(۱)

طبری کی تاریخ نگاری کے کچھ دوسرے خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱) اسلامی تاریخی مواد نسبتاً بہتر اور زیادہ مؤثق و معتبر ہیں۔

۲) اس نے ثقافت و تمدن کے بجائے زیادہ توجہ سیاسی امور اور طور طریقوں کے ذکر پر دی ہے۔

۳) تاریخ ایران کے بارے میں وہ حقائق نقل کئے ہیں جو عربی زبان کے کسی بھی دوسرے معتبر متن میں نظر نہیں آتے۔

۴) تاریخ روم کے سلسلہ میں کافی محنت سے مواد جمع کئے ہیں اگرچہ منابع و ذرائع کے اعتبار سے وہ بہت ہی فقیر ہے۔

۵) اس نے واقعات قلمبند کرتے وقت وہ تھکاوٹ اور جھنجلاہٹ کا شکار نہیں ہوا ہے بلکہ حتی الامکان بے طرفی کی رعایت برتی ہے۔

۶) خود اپنے دور کے واقعات سے بے توجہی برتی ہے اور انہیں قلمبند نہیں کیا ہے (کیونکہ اگر ان واقعات کو لکھنے بیٹھ جاتا تو بعد میں لوگ اس کی تحریر سے استفادہ کرتے اور ایک ہمعصر مؤرخ کے عنوان سے اس کی پیروی ہوتی اور حوالہ پیش کیا جاتا اور واقعات کے مسخ و تحریف ہونے

۱۔ التاریخ عند العرب، ڈاکٹر عبد العزیز الدوری، ناشر دار المشرق بیروت ۱۹۸۳ء ص ۵۶

میں اس کی تحریر مؤثر ہو سکتی تھی)

طبری پر کئے جانے والے اعتراضات

اس ذیل میں ہم کچھ موارد اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں :۔

۱۔ تاریخی نقد و تحقیق سے اجتناب، راویوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد، تاریخی حوادث سے خود مؤرخ کے عصر کی دوری، تاریخ طبری کے کچھ واضح کمزور پہلو ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر اور ابن خلدون جیسے مؤرخ اس پر اعتراض وارد کرتے ہیں ۔ وہ دوسرے محدثین کی مانند راویوں کی چھان بین پر توجہ دے سکتا تھا لیکن اس نے یہ کام نہیں کیا اور کعب الاحبار، سیف بن عمر اور دوسرے غیر مؤثق راویوں سے استفادہ کیا ہے ۔

۲۔ منابع کا ذکر نہیں کیا ہے مثلاً جس وقت مدائنی سے اس کا قول نقل کرتا ہے تو اس کی کتاب کا حوالہ نہیں دیتا ___ اب ہمیں نہیں معلوم کہ مدائنی نے یہ بات اپنی دوسو چالیس کتابوں میں سے کس کتاب میں لکھی ہے ۔

۳۔ تاریخی واقعات کا تسلسل سنہ وار تاریخ لکھنے نیز ایک واقعہ کے ذیل میں متعدد و مختلف روایات نقل کرنے سے خلط ملط ہو جاتا ہے اور جس روایت کو اصل محور قرار دیا ہے، اس سے معارض روایات کے ذکر سے عملاً ارتباط، سیاق اور تاریخی یکسانیت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے ۔

۴۔ اسلام سے ماقبل و مابعد تاریخی فصل کو پر کرنے میں توازن سے کام نہیں لیا ہے ۔

۵۔ اسرائیلیات اور اوہام و خرافات کو نقل و قبول کرنے میں خصوصاً خلقت اور انبیاء علیہم السلام کی داستانوں کے سلسلہ میں غور و فکر سے کام لئے بغیر حد سے آگے بڑھ گیا ہے ۔

۶۔ گذشتہ اسناد پر ضرورت سے زیادہ تکیہ کرنے کے سبب اس نے خود اپنے عصر اور زمانے کی تاریخ پر توجہ نہیں کی ہے اور اس کی تاریخ میں اس عصر کا چہرہ اور تاریخی واقعات و حوادث بے رنگ اور مبہم نظر آتے ہیں ۔ اس کا اعتقاد تھا کہ :۔

" التاریخ مستودع خبرات الاجیال السابقة فقط "

"تاریخ گزشتہ [illegible] کی پناہگاہ ہے اور بس"

۷۔ تاریخ عالم کے [illegible] میں اس کی فہم و معلومات اپنے ہم عصر اور گزشتہ مؤرخین مثلاً یعقوبی اور ابن قتیبہ سے کم ہے۔

۸۔ اس کی توجہ زیادہ تر حکومت کے سیاسی امور اور داخلی مشکلات کی طرف مرکوز رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے فتوحات، بیرونی ممالک سے تعلقات و روابط نیز اندلس اور دیگر مغربی یورپی ممالک کے داخلی حالات وغیرہ کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ (۱)

مؤرخین کے نزدیک طبری کی مقبولیت

طبری اپنے بعد کے مؤرخین کے درمیان "شیخ المؤرخین" اور حدیث کی روش پر لکھی جانے والی سنتی تاریخ نگاری کے مکتب کے بانی کے طور پر قبول کیا گیا ہے، شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ وہ تنہا اسلامی مؤرخ، جس کو بعد کے مؤرخین نے دوسروں سے زیادہ مورد استقبال اور قابل تقلید قرار دیا ہے، وہی ہے۔ اس دعوے کی تائید میں آپ مسعودی، ابن اثیر اور ابن خلدون جیسے بڑے مؤرخین کے اقوال میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

مسعودی اپنی تاریخ "مروج الذہب و معادن الجوہر" کے مقدمہ میں کہتا ہے:-

"... اور جہاں تک ابو جعفر طبری کی تاریخ کا سوال ہے یہ دوسری تاریخ کتب پر برتری رکھتی ہے اور ان سے بلند تر ہے۔ اس میں ہر طرح کی روایتیں جمع کردی گئی ہیں اور مختلف قسم کے علوم و فنون پر حاوی ہے اس کتاب میں بہت سے فوائد اور خوبیاں ہیں اور گزشتگان کے آثار و تاریخ کے جویا تمام طالب و محققین کے لئے نفع بخش ہے۔

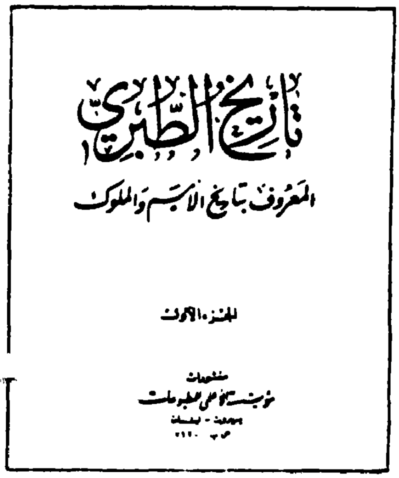
اس کتاب کا مؤلف اپنے زمانے کا فقیہ اور زاہد و متقی شخص ہے مختلف شہروں کے علماء و فقہاء کے علوم اور آثار و حدیث کے مستقین کی روایتیں اسی پر منتہی ہوتی ہیں۔"

ابن اثیر جزری نے بھی اپنی کتاب "کامل التواریخ" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

۱۔ "التاریخ العربی و المؤرخون" جلد اول ص ۲۵۹ ـ ۲۶۱۔

... اور میں نے امام ابوجعفر طبری کی تالیف کردہ عظیم تاریخ سے شروع کیا کیونکہ مذکورہ کتاب تمام محققین کی نظر میں مورد اعتماد ہے اور اختلافی موارد میں لوگ اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں ... اور میں نے تمام مؤرخین کے درمیان اسی پر اعتماد کیا ہے کیونکہ وہ از روئے حق و صواب اس فن میں پیشوا ہے اور حقیقت و واقعیت کے اعتبار سے تمام علوم و فنون پر جامع ہے ۔ (۱)

ابن خلدون نے اس کو " مؤرخ و محدث امت " کے نام سے یاد کیا ہے ۔ وہ تیمور کو مخاطب کر کے کہتا ہے : " میں طبری کے قول کی بنیاد پر تم سے باتیں کر رہا ہوں ۔ (۲)



۱۔ " احوال و آثار محمد بن جریر طبری " ۔ علی اکبر شہابی ناشر ، انتشارات اساطیر تہران ۱۹۸۴ء صفحہ ۷۴

۲۔ " فلسفۂ تاریخ ابن خلدون " ص ۱۷۳

اسلامی،
علمی،
فکری،
دوماہی رسالہ

جلد ۷ شمارہ ۴
ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
جون جولائی ۱۹۹۰ء

توحید

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

- ○ قرآن وسیرت وسنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی وعملی پہلوؤں کی تلاش۔
- ○ علمی سطح پر علماء ومحققین امت میں اتحاد وہم آہنگی۔
- ○ اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- ○ فلسفۂ مشرق ومغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- ○ عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری وسماجی انقلاب ونتائج پر گفتگو۔

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپے
ہندوستان	۷۵ روپے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عربیامارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۷ ڈالر

ارباب نظر وصاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ ادارہ۔

خطاطی: [illegible]

توحید

جلد ۷ شمارہ ۲

ترتیب

ذیقعدہ و ذی الحجۃ ۱۴۱۰ھ جون جولائی ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔

○ مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

* شذرہ *

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ وارث غدیر

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین (قصص/۵)

اور ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ روئے زمین پر کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو لوگوں کا امام بنائیں اور ان ہی کو زمین کا وارث قرار دیں۔

چودہ سو سال قبل ۱۴۰۰

۱۸، ذی الحجۃ الحرام ۱۰ھ تاریخ اسلام کا عظیم ترین دن

پیغمبر عظیم الشان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری حج سے واپسی، غدیر کا میدان، دور ختم نبوت کا عظیم ترین اجتماع، اکمال دین، اتمام نعمت اور رضایت خداوند متعال کی خوش خبری، عالم کفر و الحاد کی مایوسی اور الٰہی اسلامی حکومت کی تاسیس کا دن۔

وہ دن جو انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ پرشکوہ دن شمار کیا جاتا ہے کائنات انسانیت کا مبارک ترین دن، وہ دن جب آدمیت اپنے اوج پر پہنچ گئی، ایک لاکھ چوبیس ہزار نبوت و رسالت کو معراج کمال حاصل ہو گئی۔ کیسی کیسی عبادتیں، اطاعتیں اور اعمال اس دن کی برکت سے وجود میں آئے، کیسے کیسے تاج و تخت اور طاغوتی عمارتیں اس دن کے صدمے میں زمین بوس ہو گئیں۔ کیسے کیسے ظلم و ستم کا خاتمہ ہوا اور کیسے کیسے ظالم و ستمگر نمونۂ عبرت بن گئے، اس مبارک دن کے طفیل کیسی کیسی بلند شخصیتیں اور

کیسے کیسے عظیم کردار پیدا ہوئے جنھوں نے زمین پر عدل و انصاف قائم کیا۔

وہ دن جب خداوند تعالیٰ نے صالح مومنین سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم۔ (نور/۵۵)

عمل صالح انجام دینے والے مومنین سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین پر خلیفہ وحاکم قرار دے گا جیسے ان سے قبل کچھ لوگوں کو خلیفہ بنا چکا ہے اور ان کو ان کے دین کے اجراء کی قدرت وقوت عطا کرے گا جسے اس نے ان کے لئے چن لیا ہے۔

نیز الٰہی حاکم اور حکومت کی شان بھی بتادی:۔

ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً یعبدوننی لایشرکون بی شیئاً۔ (نور/۵۵)

اور (یہ حاکمان الٰہی) خوف وہراس نہیں رکھتے وہ اس کو امن وامان میں بدل دیتا ہے (مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قتل وشہید نہیں ہوں گے بلکہ ان کے وجود میں کوئی ایسی چیز رعب ووحشت پیدا کرے اور حدود الٰہی کے اجراء میں مانع ہو نہیں پائی جائے گی) اور یہ گروہ حاکمین کسی بھی حالت میں کسی بھی چیز اور کسی بھی شخص کو خداوند عالم کی عبادت واطاعت میں شریک قرار نہیں دیتے۔

●

حضرت ختمی مرتبت کی نبوت ورسالت کو ۲۳ سال پورے ہو چکے ہیں، اس دوران وحی الٰہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی حکیمانہ تعلیمات کے سائے میں حضرت کے دلنشین انداز تبلیغ اور اوہام وخرافات شرک وبت پرستی نیز اخلاقی مفاسد کے خلاف بے نظیر ثبات واستقامت کی وجہ سے پورے جزیرۃ العرب پر اسلام کا پرچم لہرا چکا ہے، دور جہالت کا زائیدہ وپروردہ عرب غرور جھکنا چور ہو کر خدا کے رسول کی سادہ اور بے لوث تعلیمات کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا ہے، مکہ ومدینہ جیسے بڑے بڑے شہر اور حجاز ویمن کے مختلف عرب قبائل اسلامی قلمرو میں شامل ہو چکے ہیں۔

تمام اسلامی اصول و قوانین قرآنی آیات سوَر اور احادیث صاحب "ماینطق عن الھویٰ" کی صورت میں تشریح پا چکے ہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک مسلمان فرد کی حیثیت سے جو کچھ بھی جاننا چاہئے اور قیام قیامت تک انجام دینا چاہئے سب کچھ پیغمبر اسلامؐ خدا کی جانب سے عوام کے حوالے کر چکے ہیں، دین اسلام اس عظیم قائد و رہبر اور اس کے منتخب روزگار جان نثاروں کی قربانیوں اور جانفشانیوں کی بدولت ہر جہت سے کامل ہو چکا ہے لیکن ان سب کے باوجود ایک بہت ہی اہم اور ضروری کام باقی رہ گیا ہے۔

●

دسویں ہجری کا آخری سال، پیغمبر اکرمؐ کی جانب سے تمام مسلمانوں کو فریضۂ حج کی ادائگی کی عمومی دعوت، اسلام کی سب سے عظیم اجتماعی عبادت میں شرکت کا حکم، عالم اسلام کے تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے جوان اور بوڑھے، اصحابؓ انصار کا بے مثال سفر حج، نبیؐ کی معیت میں ارکان حج کی ادائگی۔ اور پھر مکہ سے واپسی کے وقت ایک لاکھ سے زائد حاجیوں کا کاروان ظہر کا ہنگام جحفہ کے قریب خم کی سرزمین پر ورود، غدیر کا بیکراں بیاباں، آفتاب کی تمازت سے تپے ہوئے چہرے، حاجیوں کے ماتھوں پر پسینہ کی بوندیں ایک غیر معمولی کیفیت سے دوچار مسلمان، ایسے میں جبرئیل امین کا پیغام خدا کے ساتھ نزول:۔

یاایّھاالرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربّک وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ واللہ یعصمک من النّاس (مائدہ/۶۷)

اے ہمارے رسولؐ! جو کچھ آپ پر خدا کی جانب سے نازل کیا جا چکا ہے لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر ایسا نہ کیا تو گویا کوئی کار رسالت ہی انجام نہیں دیا خداوند عالم آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

واقعۂ غدیر کا ماخذ یہی قرآنی آیت ہے جو مولائے متقیان علیؑ ابن ابی طالب کی جانشینی کے اعلان کا سبب   بنی   ، اس اعلان کے ذریعہ خداوند عالم نے رسول اسلامؐ کی جانشینی کے موضوع کو معین کر دیا، سیکڑوں بڑے بڑے شیعہ و سنی محدثین کے مطابق پیغام الٰہی سن کر نبیؐ نے حکم دیا قافلہ میں آگے بڑھ جانے والے واپس پلٹیں، پیچھے رہ جانے والے آگے بڑھ آئیں، جب نبیؐ کے گرد سب جمع ہو گئے، اونٹوں کے کجاوے ایک پر ایک رکھے گئے اور پیغمبر اسلامؐ ان کے اوپر تشریف

لے گئے، ایک فصیح و بلیغ خطبے کے بعد علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کیا اور فرمایا :۔

الا من کنت مولاہ فہٰذا علی مولاہ

یاد رکھو! جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ بھی مولا ہیں ....

اس وقت جبرئیل وحی پروردگار لے کر نازل ہوئے :۔

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم ..... الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (مائدہ/۳)

آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ... آج کے دن میں نے تمہارے دین کو (قیم و سرپرست کی تعیین کے ذریعہ) کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے دین اسلام سے راضی ہو گیا۔

الیوم کی تکرار آج کے دن اسلامی معاشرہ کو نصیب ہونے والی ایک نئی اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ ہے وہ نعمت جس نے دین کو کمال تک پہنچا دیا وہ نعمت جس کو دیکھ کر دشمنان دین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گئے۔

علیؑ ابن ابی طالب کی ۳۳ سالہ زندگی، آپ کا ایمان، راہ اسلام میں آپ کی قربانیاں، میدان جنگ میں آپ کی جانفشانیاں، مکہ و یمن نیز دیگر مقامات پر آپ کی نہایت ہی مؤثر تبلیغات، آپ کا علوم ربانی سے سرشار ہونا، تمام دینی و دنیوی مسائل سے اس منتخب الٰہی کی کامل آگاہی، اور ان سب سے بڑھ کر آپ کا تقویٰ، عظمت نفس اور بے نظیر شخصیت اس بات کا سبب بنی کہ خداوند عالم نے اس یکتا مرد اسلام کو پیغمبرؐ کی جانشینی کے لئے منتخب کر لیا۔

●

چونکہ رہبری انسانی معاشرہ کے لئے ایک ضروری امر ہے اس لئے رہبری و سرپرستی کا سلسلہ انبیاء کی رحلت کے بعد بھی جاری رہنا لازمی ہے۔ الٰہی رہبری صرف لوگوں کے خون اور ناموس کی حفاظت اور معاشرہ میں ہرج و مرج سے دوری تک محدود نہیں ہے کیونکہ یہ امور مملکت کفر میں بھی قابل تحصیل ہیں

بلکہ اس کے فرائض میں ہر طرح کی تحریفات سے دین و آئینِ الٰہی کی حفاظت اور اسلامی معارف و عقائد اور اخلاق و احکام کی پاسبانی اور قافلۂ انسانیت کو کمال تک پہنچانا بھی شامل ہے اسی لئے اسلام نے اسلامی قیادت و رہبری کی تعیین میں اس قدر اہتمام سے کام لیا ہے۔

خدا کی جانب لوگوں کی ہدایت و رہبری، انسانیت کے اعلیٰ مقاصد تک معاشرے کی رہنمائی، عدل و انصاف کے قیام اور ظلم و بیداد کے خلاف جنگ کے لئے دو بنیادی شرطیں ضروری ہیں ـــ امام و رہبر کی بصیرت و تدبیر اور تقویٰ و پاکیزگی، تاریخ کا اتفاق ہے کہ ان دونوں صفتوں میں کوئی بھی علیؑ ابن ابی طالب کا مثل و نظیر پیدا نہیں ہو سکا۔ کوئی بھی ان کے پایے اور مرتبہ تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ اور اس برتری کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نے ہر چیز کا ملاک و معیار حق و حقیقت کو قرار دیا نہ کہ افراد و اشخاص کو آپ فرماتے تھے :-

اعرف الحق تعرف اهله

حق کو پہچان لو اہلِ حق کو خود بخود پہچان لو گے۔

●

لیکن اسلامی جمہوریۂ ایران کے بانی، رہبرِ انقلاب امام خمینی کے الفاظ میں "لوگوں کو حق کے پہچاننے کا موقع نہیں دیا گیا" حضرت امام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ انقلاب اسلامی سے قبل پہلوی شاہنشاہیت کے ۲۵۰۰ سالہ جشن کے موقع پر عالمِ اسلام کے نام اپنے ایک پیغام میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ابتدا میں ہی مسلمان اور اسلام لوگوں کی خواہشات نفسانیہ کا شکار ہو گئے۔ یہ تمام مشکلات جن سے ہم آج دوچار ہیں ان کا سرچشمہ یہی نفسانی خواہشات ہیں، پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد یہی خواہشات حکومت حق کی تشکیل سے مانع ہوئے وہ حکومت جو اسلام چاہتا ہے وہ حاکم جس کی تعیین کا حکم خداوند تبارک و تعالیٰ نے فرمایا تھا اور جس کو رسول اکرمؐ نے معین فرما دیا تھا، اگر اس میں لوگ مانع نہ ہوتے اور وہ نظام بروئے کار آتا، حکومت حکومت اسلامی ہوتی، منتخب ہونے والا حاکم منصوص من اللہ حاکم ہوتا اس وقت لوگ سمجھتے کہ اسلام کیا ہے اور اسلامی حکومت کا کیا مطلب ہے،

لیکن افسوس! رسول اللہ صلعم کے بعد عوام کو اس چیز سے منحرف کر دیا گیا جس کا پیغمبر نے حکم دیا تھا اور یہ انحراف خود ان کے زمانے تک محدود نہیں رہا بلکہ ان لوگوں نے زمین فراہم کر دی کہ آخر تک اسلامی حکومت تشکیل نہ پا سکے ..."

"حضرت امیر علیہ السلام اس بنیادی دشواری میں مبتلا ہو گئے جو ان لوگوں نے کھڑی کی تھی اور آپ کے بعد تو حکومت مکمل طور پر اپنی اسلامی صورت سے خارج ہو کر ملوکیت اور شاہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی۔ خود اسلام کو، رسول خدا صلعم کے بعد چند روز کے علاوہ جبکہ امیر المومنین سلام اللہ علیہ ولی امر تھے، اسلامی حکومت کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی، اور وہ مختصر سا دور بھی مشکلات سے بھرا ہوا، جنگ جمل کی مشکلات، صفین کی مشکلات، جنگ خوارج (نہروان) کی مشکلات، مشکلات ہی مشکلات، پھر بھی یہی چند روز جن میں حضرت امیر سلام اللہ علیہ نے حکومت کی، اپنے حکومتی پروگرام معین و مقرر کر دیئے یہی چند روز مسلمانوں کے لئے، اسلام کے لئے ایک درس عبرت بن گئے، اگر لوگوں نے موقع دیا ہوتا کہ اسلامی حکومت اور اسلام کی پناہ میں حکومت قائم ہو، لوگ اسلامی حکومت کی پناہ میں زندگی بسر کریں تو یہ تمام مشکلات پیش نہ آتیں۔"

"عظیم ترین مصیبت جو اسلام پر وارد ہوئی یہی حضرت امیر سلام اللہ علیہ سے حکومت سلب کر لئے جانے کی مصیبت ہے آپ کی عزا کربلا کی عزا سے بالاتر تھی، امیر المومنین پر اور اسلام پر پڑنے والی مصیبت اس مصیبت سے بالاتر ہے جو سید الشہداء سلام اللہ علیہ پر وارد ہوئی، تمام مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ لوگوں کو موقع نہیں دیا گیا کہ وہ سمجھ سکیں اسلام کسے کہتے ہیں؟ اسلام آج بھی حالت ابہام میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اب بھی مبہم ہے، آج بھی لوگ نہیں جانتے کہ اسلام کا مطلب کیا ہے؟ اسلامی حکومت کیا چیز ہے؟ اسلام کیا کرنا چاہتا ہے؟ اسلام کے حکومتی منصوبے کیا ہیں؟ حضرت امیر سلام اللہ علیہ کی یہ ۵—۶ سالہ حکومت، ان تمام مشکلات کے باوجود جن سے یہ دوچار رہی ہے اور وہ تمام زحمتیں جو حضرت امیرؑ کی راہ میں کھڑی کی گئیں اس حکومت کا سلب کیا جانا ایک عظیم غم ہے اور یہی ۵-۶ سالہ حکومت اس قابل ہے کہ

مسلمان عالم اس کا جشن منائیں حق و عدالت کا جشن، توسیع عدالت کا جشن، ایک ایسی حکومت کے لئے جشن جس کے زیر سایہ اگر مملکت میں ایک جگہ ایک معاہد (عیسائی) زحمت کش عورت کے پاؤں سے پازیب اتر دالی جاتی ہے تو حضرت حاکم کے لئے موت کی دعا کرتے ہیں ..... یہ حکومت وہ حکومت ہے جس کے سلب کر لئے جانے پر لوگوں کو ماتم و عزاداری کرنا چاہیئے اور یہی حضرت امیرؑ کی ۵ سال اور کچھ مدت کی حکومت ہے جس کے لئے لوگوں کو جشن منانا چاہیئے، عدالت کے لئے جشن، خدا کے لئے جشن، اس بات کا جشن کہ یہ حاکم وہ حاکم ہے کہ جو قوم و ملت کا شریک و ہم رنگ ہے جس کی سطح زندگی عوام سے بھی معمولی اور جس کی سطح روحی تمام آفاق سے بالاتر ہے ....

ایک ایسی حکومت جو حکومت عقل ہے، حکومت عدل ہے، حکومت ایمان ہے، حکومت الٰہی ہے اس سے محرومی پر عزا لازم ہے اور اس کی برقراری پر، ان ہی چند برسوں کی حکومت علیؑ پر مسلمانوں کو چاہیئے جشن منائیں ....."

(صحیفہ نور ج ۱ ص ۱۹۵-۱۹۶ مورخہ ۲ مئی ۱۹۷۱)

●

اسلام اور ملت اسلام کا یہی درد، اپنی اسلامی ذمہ داری کا احساس، خدا کی قدرت کاملہ پر محکم ایمان و اعتقاد اور محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام کے تعلیم کردہ فلسفۂ امامت و ولایت پر کامل یقین و اعتماد تھا کہ نائب امام زمانؑ حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے عالم اسلام کے سب سے بڑے طاغوتی نظام کے خلاف قیام کیا، اپنی مخلصانہ قیادت اور ملت ایران کی بے دریغ اطاعت و حمایت کے سہارے کاشانۂ آل محمدؐ قم سے شروع ہونے والی علوی اسلامی تحریک کو ایک عظیم اسلامی انقلاب میں تبدیل کر دیا، دنیا کی تمام بڑی طاقتیں متحد ہو کر بھی ایمان و اسلام سے سرشار عوامی قوت کا مقابلہ نہ کر سکیں اور ایران سے ہزاروں سالہ شہنشاہی ظلم و استبداد کا جنازہ نکل گیا۔

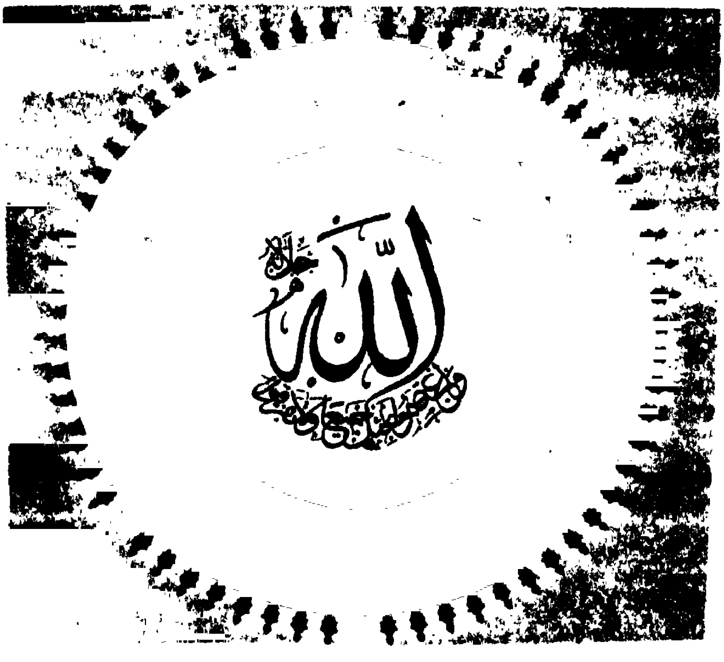
اور چودہ سو سال بعد

حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور امام حسنؑ کی مختصر اسلامی حکومت کی یاد تازہ کرتے ہوئے

پہلی بار "وارث غدیر" حضرت امام خمینیؒ نے روئے زمین پر ایک ایسی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی جس نے شرق و غرب کے تمام استعماری تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔

آج بحمد اللہ نہ صرف مسلمان ملتیں بلکہ ساری دنیا کی مظلوم و محروم قومیں عالمی سیاسی بساط پر چھائے ہوئے اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام کو ٹھوکر مار کر اسلامی سیاسی نظام کے زیر سایہ عزت و شرافت کی زندگی بسر کرنے کو بے چین نظر آ رہی ہیں۔

ہم ارحم الراحمین سے دعا کرتے ہیں کہ الٰہی نیابت و رہبریت کا یہ غدیری سلسلہ یونہی قائم رہے اور ملت اسلام نائب حضرت حجت ولی امر مسلمین حضرت آیت اللہ خامنہ ای مدظلہ کی قیادت و رہبری میں منزل کمال تک پہنچ جائے ـــــ آمین



ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کا ایک عرفانی خط

یہ خط امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی چھوٹی بہو یعنی حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید احمد خمینی دام ظلہ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ طباطبائی کی درخواست پر تحریر فرمایا تھا۔ محترمہ نے امام سے ایک خط کے ذریعہ عرفانی معلومات سے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کی، جس کے جواب میں امام طاب ثراہ نے انھیں یہ خط تحریر فرمایا تھا۔ خط کی ہمہ گیری، جامعیت اور افادیت کے پیش نظر ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاطی کہ ز من نامۂ عرفانی خواست | از مور چہ ای تخت سلیمانی خواست
گوئی نشنیدہ "ما عرفناک" از آنک | جبرئیل از او نغمۂ رحمانی خواست

آخر اصرار کے بعد مجھے تم نے مجبور کر دیا کہ جس چیز سے میرا قلب ناآگاہ اور میں جس سے اجنبی ہوں طوطے کی مانند رٹی رٹائی چند سطریں لکھ دوں جبکہ حالت یہ ہے کہ جو کچھ میرے حافظہ میں محفوظ تھا، اگرچہ وہ بھی ناچیز تھا، اسے بھی ضعف پیری نے طاق نسیاں کے حوالے کر دیا اور اس پر ناقابل بیان و ناقابل تحمل مشغولیتوں کا اضافہ ہو گیا۔ کافی ہے کہ اس تحریر کی تاریخ کا ذکر کر دوں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے اصرار کو رد نہ کرتے ہوئے میں نے کب اس خط کا آغاز کیا۔ ۲۴ شعبان المعظم بروز شنبہ سنہ ۱۴۰۴

ؒ رسول خدا کی ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے ما عبدناک حق عبادتک وما عرفناک حق معرفتک یعنی پروردگارا! جیسا تیری عبادت کا حق ہے ہم نے تیری عبادت نہیں کی اور جیسا تیری معرفت کا حق ہے ہم نے تجھے نہیں پہچانا (مرآۃ العقول ج ۸ ص ۱۴۶)

قارئین ان ایام میں دنیا اور ایران کے حالات ملاحظہ فرمائیں۔

کہاں سے شروع کروں؟ بہتر ہے کہ آغاز فطرت سے ہو (فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ)[1]۔ یہاں قدرت نے انسانوں کی فطرت پر ہی اکتفا کی ہے ، اگرچہ یہ خلقت کا خاصہ ہے (وان من شئ الا یسبّح بحمدہ ولکن لا تفقہون تسبیحہم) کوئی شئے نہیں ہے مگر یہ کہ وہ حمد کے ذریعہ اس کی ستائش کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیحوں کو نہیں سمجھتے (اسراء/۴۴)

سبھی کہتے ہیں ؛ ما سمیعیم و بصیریم و ہشیم ؛ با شما نامحرمان ما خامشیم[2]

اب ہم بھی انسانوں کے فطری عرفان پر نگاہ ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فطرت و خلقت میں ممکن نہیں کہ انسان کمال مطلق کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ کرے اور اس سے دل لگائے۔ ساری جانیں اور سارے دل اسی کی جانب رخ کئے ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ نہ کسی اور کی جستجو میں ہیں نہ ہوں گے اسکے ثنا خواں ہیں کسی اور کی ثنا نہیں کر سکتے۔ ہر شے کی ثنا اسی کی ثنا ہے۔ اگرچہ ثنا کرنے والا جب تک حجاب میں ہے، سمجھتا ہے کہ دوسرے کی مدح کر رہا ہے۔ عقلی تجزیہ سے بھی جو خود ایک طرح کا حجاب ہے یہی نتیجہ برآمد ہوگا۔

جو شخص کمال کا طالب ہے، وہ چاہے کسی بھی شئے کی طرف ہو، کمال مطلق کا عشق رکھتا ہے نہ کہ کمال ناقص کا۔ ہر کمال ناقص عدم کے دائرہ میں محدود ہے اور فطرت عدم سے بیزار ہے۔ طالب علم علم مطلق چاہتا ہے اور علم مطلق کا عشق رکھتا ہے۔ یہی حال طاقت و قوت کے طالب اور ہر کمال کے طالب کا ہے۔ انسان فطری طور پر کمال مطلق کا عاشق ہے اور ناقص کمالات میں جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کا کمال ہے نہ کہ نقص کیونکہ فطرت نقص سے بیزار ہے اور یہ ظلمانی و نورانی حجاب ہیں جو انسان کو دھوکہ میں ڈال دیتے ہیں۔ شعراء اور مداح یہ گمان کرتے ہیں کہ فلاں صاحب اقتدار بادشاہ یا فلاں عالم و فقیہ کی مدح کر رہے ہیں۔ وہ اقتدار اور علم کی مدح کرتے ہیں لیکن محدود طور پر نہیں اگرچہ گمان یہی کرتے ہیں کہ یہ مدح محدود اور فلاں شخص کی ہے۔ اور یہ فطرت ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں (لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیّم) خلق خدا میں کوئی دگرگونی نہیں ہے۔ یہی استوار اور پایدار دین ہے۔"

---

[1] (پیروی کرو) فطرت خدا کی کہ اس نے انسانوں کو اسی پر خلق فرمایا ہے۔ خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے (روم/۳۰)

[2] مثنوی معنوی، مولانا روم، دفتر سوم

جب تک انسان اپنے حجاب میں ہے اور اپنے آپ میں مشغول ہے اور اس نے حجابوں حتی نوری حجابوں کو پار نہیں کیا ہے، اس کی فطرت حجابوں میں پنہاں و مستور ہے، اس منزل سے نکلنے کے لئے مجاہدتوں اور ریاضتوں کے علاوہ انسان حق تعالی کی ہدایت کا بھی محتاج ہے۔ تم مناجات شعبانیہ میں پڑھتے ہو:

الٰھی ھب لی کمال الانقطاع الیک وانر ابصار قلوبنا بضیاء نظرھا الیک حتی تخرق ابصار القلوب حجب النور فتصل الی معدن العظمۃ وتصیر ارواحنا معلقۃ بعز قدسک الٰھی واجعلنی ممن نادیتہ فاجابک ولاحظتہ فصعق لجلالک فناجیتہ سرا۔"

"بارالٰہا! اپنی بارگاہ کی طرف توجہ کے لئے (دنیا کے تمام متعلقات سے) میرے اندر کامل انقطاع اور لاتعلقی پیدا کر دے اور ہمارے دل کی آنکھوں کو اپنے جمال کے دیدار کے نور سے منور فرما دے تاکہ دل کی آنکھیں نور کے حجابوں کو چیر کر سرچشمۂ عظمت و جلال تک پہنچ جائیں اور ہماری روحیں تیری ذات مقدس سے تعلق پیدا کر لیں۔

پروردگارا! مجھے ان لوگوں میں قرار دے جنہیں تونے آواز دی اور انہوں نے تیری آواز پر لبیک کہی۔ تونے ان پر ہلکی سی ایک نظر ڈالی اور وہ تیرے جلال کے روبرو مدہوش ہو گئے پس تونے ان سے در پردہ راز و نیاز کی باتیں کیں۔"

یہ کمال انقطاع و لاتعلقی یعنی خود اور خودی سے نکلنا، چاہے وہ کچھ یا جو شخص ہو اس سے دوری اختیار کرنا) اس سے مل جانا اور (اس کے) غیر سے علیحدہ ہو جانا، یہ اپنے مخلص ترین اولیاء کے لئے وہ الٰہی عطیہ ہے جو اس کی نیم نگاہی کے جلال سے طاری ہونے والی مدہوشی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ (ولاحظتہ) الخ اور دل کی آنکھیں جب تک اس کی دید کا نور حاصل نہ کر لیں، نور کے حجابات پارہ پارہ نہیں ہو سکتے اور جب تک یہ حجابات میں معدن عظمت تک پہنچنے کی راہ مسدود ہے اور روحیں اس کے عز قدس سے تعلق پیدا نہیں کر سکتیں نہ انھیں تدلی کا مرتبہ

حاصل ہو سکتا ہے (ثم دنیٰ فتدلیٰ[1]) اور اس سے "ادنیٰ" فنائے مطلق اور وصال مطلق کی منزل ہے۔

صوفی ز رہ عشق صفا باید کرد ❊ عہدی کہ نمودہ ای وفا باید کرد

تا خویشتنی، بہ وصل جانان نرسی ❊ خود را بہ رہ دوست فنا باید کرد

اپنے خاص بندہ سے حق کی در پردہ راز و نیاز کی باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں جب تک اس پر صعق (مدہوشی کی کیفیت طاری نہ ہو اور اس کا کوہ ہستی چور چور نہ ہو جائے[2]۔ خدا ہمیں اور تمہیں اس نعمت سے سرفراز فرمائے۔

بیٹی! مختلف علوم حتی عرفان و توحید میں سرگرم ہونا اگر اصطلاحات کا ڈھیر لگانے کے لئے ہے۔ جیسا کہ ہے۔ اور خود ان علوم کے لئے ہے، تو یہ عمل سالک راہ کو مقصد سے نزدیک نہیں کرتا بلکہ دور ہی کرتا ہے (العلم هو الحجاب الاكبر) علم سب سے بڑا حجاب ہے اور اگر حق کی جستجو اور اس سے عشق کی آرزو ہے، جو بہت ہی نادر ہے تو یہی چراغ راہ اور نور ہدایت ہے (العلم نور يقذفه الله فی قلب من يشاء[3]) اور اس کے ایک گوشہ تک پہنچنے کے لئے تہذیب تطہیر اور تزکیہ لازم ہے، تہذیب نفس اور تطہیر قلب غیر خدا سے، چہ جائیکہ برے اخلاق سے خود کو مہذب بنانا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑی ریاضت کی ضرورت ہے اور چہ جائیکہ حق تعالیٰ کی رضا کے خلاف اعمال سے عمل کی پاکیزگی اور نیک صالح اعمال جن میں واجبات سر فہرست ہیں نیز جہاں تک ممکن ہو مستحبات کی پابندی وہ بھی اسی حد تک کہ انسان کو تکبر و خود نمائی میں مبتلا نہ کر دے۔

میری بیٹی! تکبر و خود پسندی، اپنی بے مائیگی اور خالق کی عظمت سے انتہائی درجہ جہالت و لاعلمی کی دلیل ہے۔ اگر عالم خلقت کی عظمت پر ایک ذرا غور کر لیا جائے، کم از کم اسی قدر جتنا آج تک انسان علم کی تمام تر ترقی کے ذریعہ اس سے آگاہ ہوا ہے تو انسان اپنی اور تمام شمسی منظومہ

---

[1] سورۂ نجم، آیت/۸

[2] سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۳ کے ایک ٹکڑے کی طرف اشارہ ہے۔ فلما تجلی ربه للجبل جعله دكا وخر موسی صعقاً"

[3] علم ایک نور ہے خدا جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے:
المحجة البیضاء ج ۱ ص ۲۵، بحار الانوار جلد ۱ ص ۲۲۵ (معمولی فرق کے ساتھ)

اور کیکٹ نوں کی حقارت و کم مایگی کو محسوس کرے، ان کے خالق کی عظمت کو ایک حد تک درک کرے گا اور اپنے تکبر و خود بینی اور خود پسندی سے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جہالت کا احساس کرے گا۔ ہم نبی خدا حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں پڑھتے ہیں کہ جب آپ وادی نمل سے گزر رہے تھے:۔

"قالت نملة یا ایها النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنوده وهم لا یشعرون" [1]

(ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں لاعلمی میں پامال کر دے۔)

چیونٹی سلیمان پیغمبر کو ان کے ہمراہیوں کے ساتھ "لا یشعرون" یعنی لاعلم و جاہل کی صفت سے یاد کرتی ہے اور ہدہد ان سے کہتا ہے "احطت بما لم تحط به" [2] (یعنی میں اس چیز سے واقف ہوں جس سے آپ آگاہ نہیں ہیں) اور دل کے اندھے افراد اس چیونٹی اور پرندہ کی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے چہ جائیکہ ذرات وجود اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، ان کے کلام کو، کہ ان کا خالق فرماتا ہے (... الا یسبح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم) [3]

انسان خود کو ساری خلقت کا محور سمجھتا ہے — ہر چند کہ انسان کامل کی یہی شان ہے — تمام موجودات کی نظر میں معلوم نہیں کہ ایسا ہی ہو، اور رشد و ارتقا سے عاری انسان (یقیناً نہیں) ایسا ہے "مثل الذین حملوا التوراة ثم لم یحملوها کمثل الحمار" [4] (ان لوگوں کی مانند جن پر توریت بار کی گئی (یعنی انھیں توریت پر عمل کا حکم دیا گیا) پھر انہوں نے گدھے کی مانند اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا) یہ چیز تہذیب سے عاری عملی ترقی سے مربوط ہے اور ایسے شخص کی صفت "کالانعام بل هم اضل" [5] (جانور بلکہ اس سے بھی زیادہ ذلیل) عنوان سے بیان کی گئی ہے۔

بیٹی! انبیائے کرام اس لئے مبعوث ہوئے کہ انسان کی معنوی و روحانی سطح کو بلند کریں اور انھیں جاہلوں سے آزاد کریں۔ افسوس کہ شیطان، کہ جس نے قسم کھا رکھی ہے اپنے چیلوں کے ذریعہ انھیں اس بات کا موقع نہیں دیا کہ جو وہ حضرت چاہتے تھے پورا ہو جاتا "فبعزتك لاغوینهم

1۔ سورۂ نمل، آیت ۱۸ — 2۔ سورۂ نمل / آیت ۲۲

3۔ سورۂ اسرا آیت / ۴۴ گزشتہ حوالہ — 4۔ سورۂ جمعہ / ۵

5۔ سورۂ اعراف / ۱۷۹، سورۂ فرقان / ۴۴

اجمعین[1]۔" (تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا) ہم سب سوئے ہوئے ہیں اور حجابوں میں گھرے ہوئے ہیں۔" الناس نیام و اذا ماتوا انتبھوا[2]" (لوگ سوئے ہیں جب مریں گے تو بیدار ہوں گے) گویا جہنم ہم کو گھیرے ہوئے ہے اور طبیعت کی مستی شہود و احساس میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے "وانّ جھنّم لمحیطۃ بالکافرین[3]" (بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرنے والا ہے) کفر کے بہت سے مراتب مدارج ہیں، خود بینی، جہاں بینی اور اس "خدا" کے غیر کی طرف نظر کرنا بھی اسی کفر کے مراتب میں سے ہے۔ قرآن کے پہلے سورہ کو اگر تدبر و تفکر اور اس حیوانی آنکھ کے علاوہ دوسری آنکھ سے دیکھیں اور ظلمانی و نورانی حجابوں کے بغیر اس تک پہنچیں تو حقائق و معارف کے چشمے قلب کی جانب رواں ہو جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ ہم اس کے افتتاح سے بھی بے خبر ہیں ؎

"آن را کہ خبر شد خبرش باز نیامد"

(سعدی از دیباچہ گلستان)

میں بے عمل و بے خبر ناصح اپنی بیٹی سے کہتا ہوں کہ اس سرچشمۂ فیض الٰہی یعنی قرآن کریم کے مفاہیم پر غور و فکر کرو، ہر چند کہ اس کا صرف پڑھنا بھی، کیونکہ یہ حجابات میں گھرے ہوئے سامع کے نام محبوب کا خط ہے، دلپذیر آثار کا حامل ہے، لیکن اس میں تدبر و تفکر انسان کی بالاتر اور عظیم مقامات کی طرف رہنمائی کرتا ہے: "افلا یتدبّرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا[4]" (کیا وہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں) اور جب تک یہ تالے نہ کھلیں اور بندشیں نہ ٹوٹ جائیں، تدبر و تفکر سے بھی جو واقعی نتیجہ ہے حاصل نہ ہوگا۔

خدا عظیم قسم کے بعد فرماتا ہے" انّہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسّہ الا المطھّرون[5]"۔ (بلاشبہ یہ قرآن کریم ہے، اس کتاب (لوح محفوظ) میں جو (خلق کی نظروں) پوشیدہ ہے جسے پاک لوگوں کے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔) اور ان کے سرگروہ وہ افراد ہیں

---

[1] سورۂ ص / ۸۲

[2] عوالی اللئالی، جلد ۴، ص۷۳، بحار الانوار جلد ۴ ص۴۳

[3] سورۂ توبہ، آیت ۴۹، سورۂ عنکبوت / ۵۴

[4] سورۂ محمدؐ، / ۲۴

[5] سورۂ واقعہ / ۷۷ – ۷۹

جن کی شان میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی ہے۔

تم بھی مایوس نہ ہو کیونکہ یأس و ناامیدی عظیم قفلوں میں سے ہے، اس آب زلال اور سرچشمۂ نور تک پہنچنے کے لئے حتی المقدور حجابوں کو اٹھانے اور قفلوں کو توڑنے کی کوشش کرو۔ جب تک تم جوان ہو عمل اور تہذیب نفس میں کوشاں رہو، قفلوں کو توڑنے اور حجابوں کو اٹھانے کی کوشش کرو کہ ہزاروں جوان جو افقِ ملکوت سے نزدیک ترین کامیاب ہو جاتے ہیں اور ایک بوڑھا کامیاب نہیں ہو پاتا۔

قید و بند اور شیطانی قفل، اگر جوانی میں ان کی طرف سے غفلت برتی گئی تو زندگی کا جو دن بھی گزرتا ہے زیادہ مضبوط اور قوی ہوتے جاتے ہیں ؎

درختی کہ اکنون گرفتست پای ✤ بہ نیروی شخصی برآید ز جای
گرش ہمچنان روزگار ہلی ✤ بگردونش از بیخ بر نگسلی[1]

شیطان اور اس سے زیادہ خطرناک نفس کے فریبوں میں سے ایک فریب یہ ہے کہ وہ انسان کو آخر عمر پیری کے زمانہ میں اصلاح کا وعدہ دیتا ہے اور تہذیب نفس نیز خدا کی بارگاہ میں توبہ کو اس زمانہ کے لئے ٹال دیتا ہے جب فساد کا درخت اور "شجرۂ زقوم" قوی و مضبوط ہو جاتا ہے اور تہذیب نفس کا ارادہ کمزور بلکہ مردہ ہو جاتا ہے۔

گوشہ نشینوں میں قرآن سے دور نہ ہو جاؤں، حبیب و محبوب کے درمیان اس مکالمہ اور عاشق و معشوق کے مابین سر میں ایسے اسرار ہیں کہ سوائے اس کے اور اس کے حبیب کے کسی اور کا ان میں گذر نہیں ہے اور کسی کے گزر کا امکان بھی نہیں ہے۔ شاید بعض سورتوں میں حروف مقطعات مثلاً "الٓمٓ" "صٓ" "یٰسٓ" اسی قبیل کے ہوں۔ اور بہت سی آیات کریمہ بھی جنھیں اہل ظاہر، اہل فلسفہ، اہل عرفان، اہل تصوف میں سے ہر ایک اپنے حق میں تفسیر و تاویل کرتا ہے، اسی طرح کی ہیں، اگرچہ ہر طائفہ و گروہ اپنی ظرفیت کے بقدر حصہ خیال رکھتا ہے اور ان اسرار کا ایک شمّہ اہل بیت وحی کے ذریعہ — جن پر سرچشمۂ وحی اہل کر جاری ہوا ہے — دوسروں تک بھی بقدر استعداد پہنچ جاتا ہے۔ اور گویا اکثر و بیشتر مناجاتیں اور دعائیں اسی امر کے لئے انتخاب ہوئی ہیں۔ جو چیزیں ہم معصومین علیہم السلام کی دعاؤں اور

---

[1] گلستان سعدی، باب اول حکایت چہارم

مناجاتوں میں پاتے ہیں، اخبار و احادیث میں، جو اکثر عرف اور عوام کی زبان ہے، بہت کم نظر آتی ہیں۔ لیکن قرآن کی زبان ایک دوسری زبان ہے۔ ایسی زبان ہے کہ ہر عالم و مفسر خود کو اس سے آشنا سمجھتا ہے جبکہ وہ آشنا نہیں ہے۔ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس کے معارف بے نظیر ہیں اور اس کے بہت سے معارف کا تصور اس کی تصدیق سے زیادہ مشکل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فلسفی دلیل و برہان اور عرفانی نقطۂ نگاہ سے کسی مطلب کو ثابت کیا جا سکے لیکن اس کا تصور ممکن نہ ہو۔ حادث سے قدیم کے ربط کا تصور جسے قرآن کریم نے گوناگوں تعبیروں سے یاد کیا ہے اور خلق کے ساتھ حق کی معیت کی کیفیت جسے بعض لوگ معیت قیومی کہتے ہیں جس کا حتی تصور بھی ان لوگوں کے لئے دشوار ہے، اور خلق میں حق کا ظہور نیز خلقت کا حق کے پیش نظر ہونا اور اس جل سبحانہ کا مخلوق سے حبل الورید (رگ گردن) سے بھی زیادہ قریب ہونا اور "اللہ نور السمٰوت والارض"[1] اور "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن"[2] اور "مایکون من نجوی ثلثۃ"[3] الخ اور "ایاک نعبد و ایاک نستعین"[4] اور ان ہی جیسی دوسری آیتوں کے مفاد و مطالب کہ میں نہیں سمجھتا کہ مخاطب (رسول خداؐ) اور ان سے نزدیک ترین افراد جنہیں آنحضرتؐ نے تعلیم دی اور جو اس طرح کے مسائل کے اہل رہے ہیں ان کے علاوہ کوئی اور ان باتوں کا تصور بھی کر سکا ہو۔ اس روزن میں راہ پانے کے لئے تہذیب نفس کے ساتھ سخت مجاہدت و ریاضت کی ضرورت ہے۔

افسوس کہ مجھ شکستہ قلم کی عمر گذر گئی اور ؎

از قیل و قال مدرسہ ام حاصلی نشد ؛ جز حرف دلخراش پس از آن ہمہ خروش

اور آج جبکہ جوانی، جو کچھ پانے اور حاصل کرنے کی بہار کا زمانہ ہے کا کہیں پتہ نہیں اور اپنے گزشتہ (افکار و نظریات کے) تار و پود کو چند الفاظ کے مجموعہ سے زیادہ کچھ نہیں پاتا، تمہیں

---

1. اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے سورۂ نور/۳۵
2. وہ (اللہ) اول ہے اور آخر، ظاہر ہے اور باطن، سورۂ حدید/۳
3. تین افراد رازکی بات نہیں کہتے .... سورہ مجادلہ/۷
4. (خداوندا) میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ (حمد/۴)

اور معرفت کے طالب علم جوانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ تم اور جملہ موجودات اس (خدا) کا جلوہ اور اسی کا ظہور ہیں۔ ریاضت و مجاہدت کرو تاکہ اس سے کوئی روشنی حاصل کر کے اسی میں محو ہو جاؤ اور عدم سے وجود مطلق تک جا پہنچو ۔

پس عدم گردم عدم چون ارغنون ٭ گویدم کانا الیہ راجعون[1]

بیٹی ! دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب جہنم ہے کہ اس کا باطن اس سفر کے آخر میں ظاہر ہوگا اور دنیا سے ماورا آخری مرحلے تک بہشت ہے جس کا چہرہ سفر کے آخر میں طبیعت کے گرد و غبار سے نکلنے کے بعد ظاہر ہوگا۔ ہم، تم اور سبھی قعر جہنم کی طرف بڑھ رہے ہیں یا بہشت اور ملأ اعلیٰ کی طرف۔

حدیث میں ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، ناگہاں ایک مہیب ڈراؤنی آواز سنائی دی، پوچھا گیا یہ کیسی آواز تھی؟ فرمایا: "ایک پتھر جہنم کے دہانے سے اس کے اندر گرا اور ستر سال بعد اب اس کی تہ میں پہنچا ہے"۔ اہل دل نے کہا اسی وقت ہم نے سنا کہ ایک ستر سالہ کافر ابھی ابھی مرا ہے اور قعر جہنم میں پہنچا ہے[2]۔ ہم سب صراط پر ہیں اور صراط جہنم کے درمیان سے عبور کرتی ہے[3]۔ اس کا باطن دوسرے عالم میں ظاہر ہوگا۔ یہاں ہر انسان خود اپنی مخصوص صراط پر سفر میں مصروف ہے یا صراط مستقیم پر گامزن ہے جو بہشت پر جا کر تمام ہوتی ہے یا اس سے بلند منزلوں کی طرف لے جاتی ہے، یا پھر بائیں یا داہنی طرف منحرف صراط کہ یہ دونوں جہنم پر جا کر تمام ہوتی ہیں۔ ہم خداوند منان سے صراط مستقیم کی آرزو کرتے ہیں:۔

"اھدنا الصّراط المستقیم صراط الّذین انعمت علیہم" (ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت کر، ان کا راستہ جن پر تو نے نعمت نازل کی)۔ "غیر المغضوب علیہم" (ان کا نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا) یہ ایک طرف انحراف و گمراہی ہے اور" ولا الضّالّین" اور نہ گمراہوں کا راستہ) یہ دوسری طرف کی گمراہی ہے ، یہ حقائق محشر میں پورے طور سے

---

[1] مثنوی مولانا روم دفتر اول

[2] علم الیقین، ج ۲/ ۱۰۰۲ (مقصد چہارم، تیرھواں باب چوتھی فصل)

[3] ان الصّراط جسر ملی متن جہنم مرّ علیہ الخلائق" علم الیقین ج ۲/ ۹۶۰ (مقصد رابع، باب نہم، فصل سوم)

عیاں اور ظاہر ہو جائیں گے۔

صراط جہنم جس کی تعریف و توصیف اس کے باریک، گرم اور تاریک ہونے کی حیثیت سے روایات میں[1] بیان کی گئی ہے۔ اس دنیا میں صراط مستقیم کا باطن ہے کس قدر باریک اور اندھیری راہ ہے اور ہم جیسے عاجز اور خستہ حالوں کے لئے اس سے عبور کس قدر مشکل ہے، جنھوں نے بغیر کسی انحراف و گمراہی کے یہ راہ طے کی وہ "جزناها وهي خامدة"[2] کہتے ہیں اور جو شخص اس صراط (دنیا) میں جس اعتبار کا سفر کرتا ہے وہاں بھی ویسا اور اتنا ہی سفر منعکس ہوتا ہے۔

غروروں اور جھوٹی شیطانی آرزوؤں کو ترک کرو اور اپنے عمل (اور نفس کی) تہذیب و تربیت کے سلسلہ میں جدوجہد کرو کہ کوچ بہت نزدیک ہے۔ اور جو دن بھی تمہاری غفلت کی وجہ سے گزر جائے گویا وقت ہاتھ سے جا رہا ہے۔ مجھ سے نہ کہو کہ تم خود کیوں آمادہ نہیں ہو "انظر الی ما قال ولا الی من قال"[3] (دیکھو کیا کہا یہ نہیں کہ کس نے کہا) میں جو کچھ ہوں اپنے لئے ہوں اور سبھی ایسے ہیں۔ ہر شخص کی جنت و جہنم اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ جو کچھ ہم نے بویا ہے کاٹیں گے۔ انسان کی فطرت و خلقت استقامت و نیکی کی بنیاد پر ہے۔ خیر و نیکی سے محبت کرنا انسانی سرشت ہے، ہم خود اس سرشت کو گمراہی کی طرف کھینچتے ہیں۔ ہم خود پردے کھینچتے اور اپنے اوپر تار و پود تنتے ہیں ؎

این تشنگان کہ در صراطند ہمہ ❊ جویندۂ چشمۂ حیاتند ہمہ
حق می طلبند و خود ندانند آن را ❊ در آب بہ دنبال فرات اند ہمہ

گزشتہ شب تم نے عرفانی کتابوں کے نام دریافت کئے تھے۔ بیٹی! حجابات کو دور کرنے

---

1. حضرت امام صادق علیہ السلام سے جو روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صراط بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ (الصراط ادق من الشعر ومن حد السیف) بحار الانوار ج ۸ ص ۶۴

2. روایت ہے کہ معصومؑ سے عموم آیت (وان منکم الا واردھا...) کے سلسلہ میں سوال ہوا، آپ نے فرمایا (جزناها وهي خامدة) یعنی ہم صراط سے اس وقت گزرے جب جہنم خاموش تھا علم الیقین ج ۲ ص ۹۶

3. غرر الحکم، فصل ۳۰ حدیث ۱۱

کی کوشش کرو، کتابیں جمع کرنے کی نہیں۔ میں نے مانا کہ تم نے عرفان و فلسفہ کی کتابوں کو بازار سے گھر اور پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا یا اپنے دل و دماغ کو الفاظ و اصطلاحات کا انبار بنا ڈالا اور مجالس و محافل میں جو کچھ تمہارے حافظہ میں تھا اسے پیش کر کے حاضرین کو اپنی معلومات کا شیفتہ بنا لیا اور شیطان نیز اس سے زیادہ خبیث نفس امارہ کے فریب میں آکر اپنے بوجھ کو اور سنگین کر لیا، ابلیسی کھلونہ سے تم نے بزم سجائی اور خدانخواستہ علم و عرفان کا غرور تم میں پیدا ہو گیا جو ضرور پیدا ہوگا تو کیا ان سنگین بوجھوں کے ساتھ تم نے اپنے حجابات میں اضافہ کیا یا انھیں کم کیا ہے؟ خداوند عالم نے علماء کی بیداری کے لئے آیۂ شریفہ "مثل الذین حملوا التوراۃ"[۱] نازل فرمائی ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ علوم کا انبار کر لینا۔ چاہے وہ شرائع و احکام اور توحید کا علم ہی کیوں نہ ہو۔ حجابات کو کم نہیں کرتا بلکہ ان میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور چھوٹے حجابات سے بڑے حجابات کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ علم و فلسفہ و عرفان سے گریز کرو اور جہالت میں اپنی عمر گزارو کہ یہ گمراہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی کوشش اور مجاہدہ کرو جس کا مقصد و ارادہ الٰہی اور دوست کے لئے ہو، اور اگر اسے پیش کرو یعنی عملی شکل دو تو خدا کے لئے اور اس کے بندوں کی تربیت کے لئے ہو ریا اور خودنمائی کے لئے نہ ہو کہ خدانخواستہ علماء سوء کے گروہ میں شامل ہو جاؤ، جن کی بدبو اہل جہنم کو بھی آزار پہنچائے گی[۲]۔ جن لوگوں نے اسے (خدا کو) پا لیا اور اس کا عشق رکھتے ہیں وہ خدا کے سوا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے اور اس جذبہ کے ساتھ ان کے تمام اعمال الٰہی ہیں جنگ و صلح، تلوار چلانا، جہاد کرنا اور جو بھی تم تصور کرو "ضربۃ علی یوم الخندق افضل من عبادۃ الثقلین"[۳] (جنگ خندق کے دن علی کی ضربت دو جہان کی عبادت سے افضل ہے) اگر تصور الٰہی نہ ہو اور اس سے بڑی فتح بھی حاصل ہو جائے تو بھی ایک کوڑی کی فضیلت نہیں رکھتی۔ یہ گمان نہ ہو کہ اولیائے خدا کا مقام خاص کر ولی اللہ اعظم (ان پر اور ان کی اولاد پر درود و سلام ہو) کا مرتبہ اس حد پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ قلم کو آگے بڑھنے کی جرأت اور زبان میں شرح و بیان کی طاقت نہیں ہے ہم حجابات میں

۱۔ سورۂ جمعہ/۵

۲۔ یہ رسول خدا کی ایک روایت کی طرف اشارہ ہے جس میں آیا ہے کہ "وانّ اھل النار لیتاذون بریح العالم التارک لعلمہ" الخصال، ج ۱ ص ۵۱

۳۔ بحار الانوار ج ۳۹ ص ۲

گرفتار لوگوں کو، آخر ہم حجابوں میں گھرے ہوئے لوگ کیا کہیں، ہم خود کیا جانتے ہیں کہ کچھ کہیں اور جو کچھ ہے اس کے لئے بیان میں گنجائش نہیں اور ہمارے وجود کے افق سے بلند و برتر ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ حبیب کی یاد اور اس کا ذکر دل و جان پر اثر کرے، ہر چند کہ اس کی کوئی خبر نہ ملے پھر بھی ان پڑھ عاشق کے مانند جو محبوب کے خط کی سیاہی کو دیکھتا ہے اور اسی میں خوش رہتا ہے کہ یہ محبوب کا خط ہے اور عربی سے نابلد فارسی داں کے مانند جو قرآن کریم کو پڑھتا ہے اور چونکہ اس (خدا) کلام ہے لہٰذا لذت حاصل کرتا ہے اور اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جو ہزاروں گنا بہتر ہے اس دانشور ادیب سے جو قرآن کے اعراب، ادبی لطائف اور اس کی فصاحت و بلاغت سے خود کو گرمائے، اور اس عارف فلسفی سے جو قرآن کے عقلی و ذوقی مسائل پر غور کرے اور محبوب سے غافل رہے، بالکل فلسفی و عرفانی کتابوں کے مانند کہ وہ ان کے مطلب و موضوع میں مشغول ہوجاتا ہے اور ان کے لکھنے والے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

بیٹی! فلسفہ کا موضوع مطلق وجود ہے خداوند عالم سے لے کر وجود کے آخری مراتب تک، اور علم عرفان و عرفان عملی کا موضوع وجود مطلق ہے یا کہو حق تعالیٰ ہے اور اس میں ذات حق تعالیٰ اور اس کے جلوہ ـــ جو اس سے الگ نہیں ہے ـــ کے علاوہ کسی اور چیز سے بحث نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کتاب یا کوئی عارف خدا کے علاوہ کسی اور چیز سے بحث کرے تو نہ وہ کتاب عرفانی ہے اور نہ بیان کرنے والا عارف ہے۔ اگر کوئی فلسفی عالم وجود پر جیسا کہ وہ ہے نگاہ کرے اور بحث کرے تو اس کی نظر الٰہی اور اس کی بحث عرفانی ہے اور یہ سب کچھ ذوق عرفانی سے الگ ہے جو بحث سے خارج ہے اور جس کے بغیر یہ سب کچھ بھی نہیں ہیں چہ جائیکہ شہود و جدانی اور اس کے بعد بحر ہستی میں غرق ہونے کے ساتھ ہی ساتھ فنا کی منزل" ادفع السراج کہ شمس طالع شد"[1] (چراغ بجھادو کہ سورج نکل آیا)

---

[1] روایت ہے کمیل ابن زیاد نے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا: حقیقت کیا ہے، اور جب چند سوال و جواب کے بعد مطلب ان کی سمجھ میں آگیا تو عرض کیا: اطفیٔ (ادفع) السراج فقد طلع الصبح" مجالس المومنین ج ۲ ص ۱۱ (مجلس ششم)

بیٹی! میں نے سنا ہے کہ تم کہتی تھیں کہ میں ڈرتی ہوں کہ امتحان کے دنوں میں کہیں مجھے کف افسوس نہ ملنا پڑے کہ میں نے چھٹی کے دنوں میں کیوں کام نہیں کیا۔ یہ اور اس کے جیسے تاسف جو کچھ بھی ہیں، آسان اور جلد گزر جانے والے ہیں۔ دائمی و ابدی افسوس وہ ہے کہ جب ہوش میں آؤ تو متوجہ ہو کہ سوائے اس (خدا) کے سب کچھ دیکھ رہی ہو اور اس حقیقت پر پردے گرنے والے اور حجابات اٹھنے والے نہیں ہیں۔

امیرالمومنینؑ دعائے کمیل میں عرض کرتے ہیں:۔

"فهبني يا الهي و سيدي و مولاي و ربي صبرت على عذابك فكيف اصبر على فراقك"

[اے میرے اللہ، میرے آقا، میرے مولا میرے پالنے والے، میں نے مانا کہ تیرے عذاب پر صبر کر لوں لیکن میں تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا (دعائے کمیل کا ایک فقرہ)]

مجھ جیسا دل کا اندھا ابھی تک دعائے شریفہ کے اس فقرہ اور بعض دوسرے فقروں کو اب تک سنجیدگی سے نہیں پڑھ سکا بلکہ اسے حضرت علیؑ کی زبان سے پڑھتا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس پر صبر کرنا جہنم میں خدا کے عذاب سے بھی زیادہ مشکل ہے؟ وہ عذاب جو "تطلع على الافئدة" (دلوں پر مسلط ہو جاتا ہے) گویا یہ "عذابك" وہی "نار الله"[1] (خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ) ہے جو فؤاد یا قلوب کو جلا ڈالتی ہے۔ شاید یہ عذاب، جہنم کے عذاب سے بڑھ کر ہو، ہم جیسے کور باطن لوگ انسانی فہم سے برتر ان معانی و مفاہیم کو درک اور ان کی تصدیق نہیں کر سکتے۔

چھوڑو، ان چیزوں کو ان کے اہل کے لئے رہنے دیں جو بہت ہی کم ہیں۔ بہرحال فلسفہ کی کتابیں اور خاص طور سے اسلامی فلسفیوں اور اہل حال و عرفان کی کتابیں ہر ایک اپنا اپنا اثر رکھتی ہیں۔ ان میں اول الذکر کتابیں، دلو دوربین کے طور پر سہی انسان کو ماورائے طبیعت سے آشنا کرتی ہیں اور آخر الذکر کتابیں خاص طور سے ان میں سے بعض کتابیں مثلاً "منازل السائرین"[2]

[1] سورۂ ھمزہ / ۶،
[2] منازل السائرین "خواجہ عبداللہ انصاری کی ایک عرفانی، اخلاقی کتاب ہے۔ عارف کامل کمال الدین عبدالرزاق کاشانی نے اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔

و "مصباح الشریعہ"[1] جو گویا ایک عارف کی کتاب ہے جس نے حضرت صادق کے نام سے روایت کے طور پر یہ کتاب لکھی ہے، دلوں کو محبوب تک پہنچنے کے لئے آمادہ و مہیا کرتی ہیں اور ان سب سے زیادہ دل انگیز ائمہ معصومین کی مناجاتیں اور دعائیں ہیں جو منزل و مقصد کی طرف رہنمائی نہیں بلکہ رہبری کرتی ہیں۔ یہ دعائیں و مناجاتیں حق کے جویا انسان کا ہاتھ پکڑ کر لے اس (خدا) کی طرف لے جاتی ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہم ان دعاؤں سے فرسخوں دور اور مہجور ہیں۔

میری بیٹی! کوشش کرو کہ اگر اس کی اہل نہیں ہو اور نہیں ہو پائی ہو تو عارفین و صالحین کے مراتب و مقامات کا انکار نہ کرو اور ان سے بغض و عناد کو اپنے دینی فرائض میں شمار نہ کرو۔ بہت سی باتیں جو ان لوگوں نے کہی ہیں قرآن کریم میں رمز اور سربستہ طور پر اور اہل بیت عصمت کی دعاؤں و مناجاتوں میں واضح طور سے ذکر ہوئی ہیں اور چونکہ ہم جاہل ان سے محروم ہیں لہٰذا ان حضرات سے مقابلہ کرنے اور جھگڑنے پر اتر آئے۔ کہتے ہیں کہ صدر المتألہین نے جوار حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا میں دیکھا کہ ایک شخص ان پر لعنت کر رہا ہے۔ آپ نے پوچھا ملا صدرا پر لعنت کیوں بھیج رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وہ (ملا صدرا) واجب الوجود کی وحدت کا قائل ہے، تو فرمایا کہ اچھا تب اس پر لعنت کرو!

یہ بات اگر ایک قصہ ہی ہو پھر بھی ایک واقعیت کی حکایت ضرور کرتی ہے، ایک دردناک واقعیت کہ میں نے خود ایسے واقعات دیکھے اور سنے ہیں جو ہمارے زمانہ میں ہوئے ہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ مدعیوں کو پاک صاف بنا کر پیش کروں کہ ؎

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد[2] (حافظ)

بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اصل معنویت و روحانیت کا انکار نہ کرو، وہی معنویت جن کا کتاب و سنت نے بھی ذکر کیا ہے اور مخالفوں نے اسے یا ان سب کو نظر انداز کر دیا ہے یا پھر اس کی عامیانہ

---

[1] مصباح الشریعہ و مفتاح الحقیقہ، معارف و مواعظ اور اخلاق کی ایک کتاب ہے اور سو ابواب پر مشتمل ہے کہ ہر باب "قال الصادق" کے جملہ سے آغاز ہوتا ہے۔ اس کتاب کے اعتبار اور اس کے مؤلف کے سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں، بزرگان مسلک امامیہ منجملہ سید ابن طاوس، ابن فہد حلی، مجلسی، شہید ثانی، ملا محسن فیض، کفعمی، نراقی اول رضوان اللہ علیہم نے اس کی طرف رجوع اور اس سے استناد کیا ہے۔

[2] نقد صوفی نہ ہمہ صافی بی غش باشد ؛ ای بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد (حافظ)

توجہ پر اتر آئے ہیں اور میں نہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ضخیم حجابات سے باہر نکلنے کا پہلا قدم انکار ہے جو ہر ترقی اور ہر مثبت قدم کی راہ کی رکاوٹ ہے۔ یہ قدم کمال نہیں ہے لیکن کمال کی طرف بڑھنے کی راہ باز کرتا ہے۔ چنانچہ "یقظہ" جس کو سالکین کی منازل میں پہلی منزل شمار کیا گیا ہے لسے منازل میں شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ سالکین کی منازل کے لئے مقدمہ اور راہ باز کرنے کی منزل ہے۔ بہرحال انکار کی روح کے ساتھ معرفت کی راہ نہیں مل سکتی۔

جو لوگ عارفوں کے مقامات و مراتب اور سالکوں کے منازل کا انکار کریں چونکہ وہ خود خواہ و خود پسند ہیں لہٰذا جو کچھ وہ نہیں جانتے اسے اپنی جہالت پر محمول نہیں کرتے بلکہ اس کا انکار کرتے ہیں تاکہ ان کی خود خواہی اور خود بینی پر کوئی حرف نہ آنے پائے!

مادر بت ہا بت نفس شماست [1]

جب تک یہ بڑا بت اور یہ طاقتور شیطان درمیان سے ہٹایا نہ جائے، اس (خدائے جلّ و علا) تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں ہے اور بہت مشکل ہے کہ یہ بت توڑا جائے اور شیطان رام ہو جائے۔ معصومؑ سے نقل ہے کہ "شیطانی آمن بیدی" (میرا شیطان میرے ہاتھ پر ایمان لا چکا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے ایک شیطان ہے چاہے وہ جتنا عظیم المرتبت ہو اور اولیائے خدا اس پر قابو پانے اور اسے مومن بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

جانتی ہو کہ شیطان نے ہم سب کے بابا آدم صفی اللہ کے ساتھ کیا کیا؟ انھیں جوار حق سے نیچے کھینچ لیا اور شیطان کے وسوسہ اور "شجرہ" سے نزدیک ہونے کے بعد، جو شاید نفس یا اس کے بعض مظاہر ہوں "اھبطوا"، کا فرمان پہنچا اور تمام فسادوں اور عداوتوں کا

---

[1] مادر بتہا بت نفس شماست   زان کہ آن بت مار و این بت اژدہاست (مثنوی مولانا روم۔ دفتر اول)

[2] روایت ہے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "ما منکم الا و لہ شیطان" (تم میں سے ہر شخص کا ایک شیطان ہے) آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا: کیا آپ کا بھی کوئی شیطان ہے؟ فرمایا: میرا بھی ہے، مگر یہ کہ خدا نے اس کے مقابلہ میں میری نصرت کی اور وہ میرے ہاتھوں پر ایمان لایا" علم الیقین ج ۱ / ۲۸۲

سرچشمہ بنا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے خداوند عالم کی نصرت سے توبہ کی اور خدا نے ان کو اپنا صفی قرار دیا، مجھے اور تم کو بھی جو اس شجرۂ ابلیسیہ میں مبتلا ہیں، توبہ کرنا چاہئے اور خداوند عالم سے خلوت و جلوت میں استغاثہ کے ساتھ یہ درخواست کریں کہ جس وسیلہ سے چاہے، ہماری بھی دستگیری کرے اور ہمیں بھی توبہ کی منزل تک پہنچائے تا کہ شیدا آدمیت کے اصطفاء سے کچھ ہم بھی فائدہ اٹھائیں۔ اور یہ مجاہدت و ریاضت اور اس ابلیسی شجو کو اس کے تمام شاخ و برگ اور جڑوں کے ساتھ ترک کئے بغیر ممکن ہی نہیں ہے جو ہمارے وجود میں منتشر اور روز بروز محکم و قوی ہو رہا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔

شجرۂ خبیثہ اور اس کی شاخوں اور جڑوں سے تعلق ہونے کی بنا پر بلاشبہ مقصد و منزل تک پہنچنے کی راہ نہیں مل سکتی، ابلیس نے اسی دھمکی کو عملی طور پر انجام دیا اور بڑا کامیاب رہا۔ گنتی کے صالح بندگان خدا نیز اولیاء مقربین علیہم السلام کے علاوہ شیطان کے فریبوں اور ابلیس کے مظہر نفس خبیث سے کوئی محفوظ نہیں رہا اور اگر کوئی محفوظ رہا بھی تو اس کی تمام باریک شاخوں، ٹہنیوں، اور بہت ہی پیچیدہ جڑوں سے محفوظ نہیں رہ سکا مگر خداوند متعال کی نصرت اور دستگیری کے ذریعہ جیسے اس نے صفی اللہ کو نجات دی لیکن ہم کہاں اور کلمات کو قبول و تحمل کرنے کی وہ استعداد کہاں۔

آیۂ کریمہ اس سلسلہ میں سزاوار ہے کہ اس پر خوب غور کیا جائے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے، "فتلقّٰی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ۔"[1] (پس آدم نے اپنے پروردگار سے کلمات دریافت کئے اور ان کے واسطے سے توبہ کی) یہ نہیں فرمایا کہ "و القیٰ الیہ کلمات" (خدا نے کلمات ان تک بھیجے) گویا "اللہ" کی طرف سیر کے ذریعہ کلمات دریافت کئے ہیں اگرچہ "القیٰ الیہ" بھی ہوتا جب بھی کمالی سیر کے بغیر کلمات کا قبول کرنا ممکن نہ تھا۔

ایک دوسری آیت بھی جو اسی قضیہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، قابل غور ہے، ارشاد ہوتا ہے، "فلمّا ذاقا الشجرۃ"[2] (جب ان دونوں نے اس درخت سے چکھا) گویا وہ مزہ و ذائقہ

---

[1] سورۂ بقرہ، ۳۷/

[2] سورۂ اعراف/ ۲۲

سے زیادہ کچھ نہیں تھا اس کے باوجود چونکہ وہ ابوالبشر تھے۔ ان کے لئے اس قدر سخت نتائج برآمد ہوئے۔ اب ایسے میں ہمیں اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہئے جبکہ بلاشبہ ہم اس شجرہ کی تمام شاخوں، پتوں اور جڑوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔

میری بیٹی: آفتیں وبلائیں سرراہ بہت زیادہ ہیں، ہمارا ہر ظاہری وباطنی عضو بدن آفتوں میں گرفتار ہے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک حجاب ہے اگر ہم ان سے نہ گزریں تو گویا سلوک الی اللہ کے پہلے قدم تک بھی نہیں پہنچے۔ میں جو خود ان آفتوں میں مبتلا ہوں اور میرا جسم وجان اس چھوٹے سے عضو بدن اور اس زبان سرخ کی بنا پر شیطان کے ہاتھوں کا کھلونا ہیں جو عزت دار دل کے سر اڑا دیتی ہے اور جب وہ شیطان کا کھلونا اور اس کے ہاتھ کا ہتھیار بن جائے تو جان وروح اور قلوب کو تباہ وبرباد کردیتی ہے، میں اس کی بعض آفتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انسانیت ومعنویت کی اس عظیم دشمن سے غافل نہ ہو۔ اکثر جب اپنے دوستوں کے ساتھ کسی بزم میں ہو تو اس چھوٹے سے عضو کی بڑی بڑی غلطیوں کو جہاں تک ہوسکے شمار کرو اور دیکھو کہ تمہاری زندگی کے ایک گھنٹہ میں، جسے دوست (خدا) کی رضا کے حصول کے لئے صرف ہونا چاہئے، یہ زبان کیا کرتی ہے اور کتنی مصیبتیں کھڑی کرتی ہے ان ہی میں سے ایک بھائیوں اور بہنوں کی غیبت ہے۔ دیکھو کیسے کیسے اشخاص کی عزتوں سے کھیلتی ہو اور مسلمان بھائیوں کے کیسے کیسے اسرار بزم کے اوپر برملا کرتی ہو، کیسی شخصیتوں کو داغدار کرتی ہو اور کتنی شخصیتوں کو مجروح کرتی ہو؟ اس کے بعد اس شیطانی بزم کو مقیاس ومیزان قرار دو اور غور کرو کہ سال بھر میں اس ذلیل حرکت کے ذریعہ کیا کیا اور آئندہ پچاس ساٹھ سال میں کیا کیا کروگی اور اپنے لئے کتنی مصیبتیں اور بلائیں کھڑی کروگی جب کہ تم اسے چھوٹی اور حقیر شمار کرتی ہو اور یہ حقیر ومعمولی شمار کرنا ابلیس کی حیلہ بازیوں میں سے ہے کہ خداوند عالم اپنے لطف کے ذریعہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

میری بیٹی: غیبت کرنے، مومنین کو آزار پہنچانے، عیب جوئی کرنے، ان کے راز فاش کرنے اور ان پر تہمت لگانے کے سلسلہ میں جو آیات وروایات وارد ہوئی ہیں ان پر ایک ہلکی نگاہ ڈالنا ہی ان دلوں کو جن پر شیطان کی مہر نہ لگی ہو لرزا دیتا ہے اور انسان کی زندگی تلخ کردیتا ہے۔ اور اب میں تم سے اور احمد(۱) سے جو تعلق خاطر رکھتا ہوں اس کی بنا پر وصیت

(۱) امام خمینی کے چھوٹے صاحب زادے حجۃ الاسلام والمسلمین سید احمد خمینی دام ظلہ

کرتا ہوں کہ شیطانی آفتوں اور بلاؤں خصوصاً زبان کی بہت سی آفتوں سے بچو اور اسے اپنی قابو میں رکھنے کی کوشش کرو۔ البتہ کام شروع میں ذرا مشکل ہے لیکن عزم و استقامت اور اس کے برے نتائج پر غور کرنے سے آسان ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کی بے انتہا سرزنش کرنے والی تعبیر سے عبرت حاصل کرو جو فرماتا ہے:

ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً (حجرات/۱۲)

(ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے)

شاید اخبار و روایات عمل کی برزخی شکل و صورت کو ظاہر کرتی ہیں اور شاید حضرت سید الموحدین امیر المومنین علیہ السلام سے منقول حدیث میں آپ نے نوف بکالی کو بہت سی نصیحتیں اور موعظے فرمائے ہیں ایک احتمال کے مطابق اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔ اس حدیث میں ہے کہ نوف بکالی نے حضرت سے موعظہ کی درخواست کی، آپ نے فرمایا:۔

اجتنب الغیبۃ فانہا ادام کلاب النار۔ ثم قال۔ یا نوف کذب من زعم انہ ولد من حلال وھو یاکل لحوم الناس بالغیبۃ[1]

(غیبت سے پرہیز کرو کہ یہ جہنم کے کتوں کی خوراک ہے۔ اس کے بعد فرمایا اے نوف! جھوٹا ہے جو اپنے کو حلال زادہ سمجھتا ہے اور غیبت کے ذریعہ لوگوں کا گوشت کھاتا ہے)

اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

وھل یکب الناس فی النار یوم القیامۃ الا حصائد السنتہم[2]

(کیا قیامت کے دن لوگوں کو ان کی زبانوں کے محصول کے علاوہ کوئی اور چیز جہنم میں جھونکے گی؟)

خداوندا! ہم کو، ان خواتین کو اور ہم سے مربوط خاندانوں کو شیطانی آفات و بلیات سے نجات مرحمت فرما، اور ہم کو ان لوگوں میں قرار نہ دے جنھوں نے مسلمانوں کو اپنی زبان اور عمل کے ذریعہ آزار پہنچایا ہے۔[3]

یہ چند صفحے میں نے فاطی (فاطمہ) کی فرمائش پر لکھے ہیں اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں خود شیطان کے فریبوں سے دور نہیں رہ پایا۔ امید ہے "فاطی" جو جوانی کی نعمت سے بہرہ ور ہے اسے توفیق حاصل ہو جائے۔ والسلام علی عباد اللہ الصالحین ۱۲، رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۲ھ

روح اللہ الموسوی الخمینی

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۲، ص ۲۴۵ [2] اصول کافی، کتاب الایمان والکفر، باب الصمت وحفظ اللسان حدیث ۱۴ (تھوڑے اختلاف کے ساتھ)

[3] امام نے اپنے سے منسوب و مربوط افراد کے لئے مختلف موارد میں دعائے خیر کرنا بزرگوں اور اولیائے دین کی سنت رہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے: رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذریتی ... "پالنے والے مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والوں میں قرار دے (سورۂ ابراہیم/۴۰) اور "ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا ..." خدایا! مجھے اور میرے خاندان والوں کو اپنا مسلمان قرار دے (سورہ بقرہ/۱۲۸) اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے نماز پڑھنے والوں کو اپنے خاندان والوں اور متعلقین کے حق میں دعا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بحار الانوار ج ۸۲/ ۲۰۹

امام خمینیؒ اور قرآن

تحریر : جناب استاد جعفر سبحانی

ترجمہ : جناب سید ولی الحسن رضوی

قرآن مجید ان دو گران بہا یادگاروں میں سے ایک ہے جو پیغمبر اسلامؐ نے اپنے بعد چھوڑی ہیں اسلامی محدثین نے حضور صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا :۔

"انی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض" (۱)

میں تمہارے درمیان دو بڑی ہی باوزن اور گراں بہا یادگاریں ۔ خدا کی کتاب اور اپنی عترت ۔ چھوڑ کر جا رہا ہوں اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک (روز قیامت) حوض پر مجھ سے ملحق ہو جائیں۔

بنابراین، قرآن وعترت دنیا و آخرت کی سعادت مندانہ زندگی کے لئے دو رکن رکین اور دو اصل اصیل شمار کئے جاتے ہیں ۔ اس مقالہ میں ہماری گفتگو کا محور امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے افکار و نظریات میں مختلف قسم کے قرآنی جلوے ہیں ۔ جہاں تک عالم انسانیت کی ہدایت و رہبری میں پیغمبر اسلامؐ کی عترت علیہم السلام اور ان کے اقوال و سیرت کی عظمت و اہمیت سے متعلق امام خمینی طاب ثراہ کے افکار و

۱۔ مسند احمد بن حنبل جلد دوم ص ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹۰ ۔ جلد چہارم ص ۳۶۶ و ۳۷۱ ۔ جلد پنجم ص ۱۸۲ و ۱۸۹ نیز ملاحظہ فرمائیں سنن ترمذی جلد دوم ص ۳۰۸ اور صحیح مسلم جلد ہفتم ص ۱۲۲ ۔

نظریات کا سوال ہے ۔ یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے دلچسپی رکھنے والے حضرات پیغمبر اسلام کی عترت اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں موصوف کے جذبات واحساسات آپ کے وصیت نامہ کے مقدمہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔ خوش قسمتی سے آپ کی یہ آخری یادگار مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور قرآن وعترت کے بارے میں امام خمینی کے طرز فکر کو واضح کرتی ہے

ہم نے قرآن کریم کے مختلف پہلوؤں میں سے چند پہلو جو انہوں نے اپنے دروس اور تقریروں کے دوران خود بیان فرمائے ہیں منتخب کئے ہیں جن کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان کے بارے میں امام خمینی کے نقطۂ نظر کو پیش کریں گے ۔ آپ کے افکار و نظریات پیش کرنے کے سلسلہ میں ہم نے مندرجہ ذیل منابع و مآخذ سے استفادہ کیا ہے :۔

۱۔ ایران سے ترکی کے لئے جلاوطن کئے جانے سے قبل ۱۳۶۹ھ ہجری سے ۱۳۸۳ھ کے دوران حوزہ علمیہ قم میں فلسفہ ، فقہ ، اصول اور تفسیر کے موضوعات پر آپ کے عظیم علمی دروس جن میں مقالہ نگار کو بہ نفس نفیس شرکت کرنے اور آپ کے دستر خوان علم سے خوشہ چینی کرنے کا شرف حاصل رہا ہے

۲۔ **صحیفۂ نور** امام خمینیؒ کے رہبرانہ ارشادات اور تقریروں کا مجموعہ جو وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی کی جانب سے کئی حصوں میں چھپ کر نشر ہو چکا ہے ۔

۳۔ سورۂ حمد کی تفسیر کے ذیل میں امام خمینی کی عالمانہ بحثیں جو ایران ٹیلیویژن پر نشر ہوئیں اور اس کے بعد انتشارات جامعۂ مدرسین " کی طرف سے ایک مجموعہ کی شکل میں چھپ کر نشر ہو چکی ہیں ۔

وہ مسائل جن کے بارے میں امام خمینیؒ کی فکر اور نقطۂ نظر کو ہم نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کچھ اس طرح ہیں :۔

۱ ——— قرآن کریم کی وسعتیں ۔
۲ ——— قرآن کے عرفانی و عقیدتی پہلوؤں کی وضاحت ۔
۳ ——— مادی طرز فکر پر مبنی تفسیر اور تفسیر بالرائے سے پرہیز ۔
۴ ——— یہودیوں اور عیسائیوں کا ساختہ و پرداختہ تحریف قرآن کا افسانہ ۔

۵ ـــــــ قرآن کریم کی مختلف قرأتوں کی حیثیت جن کی پیغمبر اسلامؐ کی طرف نسبت دی جاتی ہے ۔

اب ہم مذکورہ مسائل کو مختصر طور پر خود امام خمینیؒ کی ہی زبان اور قلم سے پیش کرتے ہیں یا پھر جو کچھ میں نے خود ان سے پڑھا اور سنا ہے من و عن پیش خدمت ہے :

لیکن اس سے قبل تیمن و تبرک کے طور پر دو حدیثیں ۔ ایک پیغمبر اکرم (ص) اور دوسری آپ کی وصی و جانشین امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں ، پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے :-

اذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانہ شافع مشفع وماحل مصدق ۔ من جعلہ امامہ قادہ الی الجنۃ ... " (۱)

جب اندھیری رات کے مانند فتنے تم کو اپنے گھیرے میں لے لیں تو قرآن کی طرف رجوع کرو یہ وہ شفیع اور گواہ ہے جس کی شفاعت و سفارش اور شہادت و گواہی قبول ہوتی ہے ۔ جو شخص قرآن کو اپنے سامنے رکھتا ہے وہ اس کی جنت کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

امیر المومنین علی (ع) فرماتے ہیں :-

"واعلموا انہ لیس علی احد بعد القرآن من فاقۃ ولا لاحد قبل القرآن من غنی " (۲)

یاد رکھو ! کوئی بھی قرآن پانے کے بعد فکری و معنوی طور پر فقیر و محتاج نہیں ہے اور اسی طرح کوئی بھی قرآن پانے سے قبل بے نیاز نہیں ہے ۔

قرآن کریم کی وسعتیں

قرآن آخری آسمانی کتاب کے عنوان سے پیغمبر اسلامؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا کہ وہ لوگوں

---

۱ ۔ الکافی ج ۲ ص ۲۳۸ ۲ ۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶

کے درمیان اس کی تلاوت کریں اور معاشرہ میں اس کے احکام و قوانین رائج و نافذ کریں، یہ کتاب چونکہ خدا کی جانب سے نازل ہونے والے آخری دستور حیات کی حامل ہے لہٰذا اسے انسانی معاشرہ کے لئے کامل ترین اصول زندگی پیش کرنا چاہیئے، ایسے اصول و قوانین جو گزشتہ آسمانی کتابوں پر محیط ہوں اور ان کو تمام و کمال عطا کرنے والے ہوں۔

عموماً اپنے درس میں حضرت امام خمینیؒ مندرجہ ذیل تین آیتوں پر تکیہ کرتے تھے:۔

وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ روح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین۔ (۱)

یہ پروردگار عالم کی تنزیل ہے جو روح الامین نے آپ کے قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ڈراتے رہیں۔

استاذ علام بار بار فرماتے تھے کہ قرآن کریم الفاظ کے جامے میں ڈھلنے اور مفاہیم کی صورت میں قلب رسولؐ پر نازل ہونے سے قبل ایک بلند تر واقعیت کا حامل رہا ہے جس نے اس ارفع و اعلیٰ مقام سے تنزل کی وجہ سے لفظ و معنیٰ کی صورت اختیار کی ہے۔ لیکن اس نزول کی حقیقت کیا ہے؟ اور کس طرح اس بلند و بالا رتبہ و مقام سے ایسے کم رتبے اور مقام تک اس نے تنزل کیا۔ یہ باتیں ہم پر واضح و روشن نہیں ہیں اگرچہ ارباب معرفت اس تنزل میں مطالب بیان کرتے ہیں۔ (۲)

قرآن کی عظمت میں بس اتنا کافی ہے کہ خداوند عالم نے اس کتاب کو گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کے لئے حافظ و نگہبان اور تمام قدیم و جدید ادوار کے مطالب و واقعات کی صحت و پرکھ کے لئے بے مثل معیار و میزان قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب ومھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللہ (۳)

ہم نے اس کتاب کو برحق طور سے تم پر نازل کیا ہے کہ جو گزشتہ کتابوں کی مصدق اور ان کے

۱۔ سورہ شعراء آیت ۱۹۲ تا ۱۹۴ ۲۔ اسفار ج ۷ ص ۲۲۔ ۳۰

۳۔ سورہ المائدہ آیت ۴۸

درمیان حاکم و داور ہے ان کے بارے میں۔ جو کچھ تم پر نازل کیا جا چکا ہے اس کے مطابق حکم فیصلہ کرو۔
دوسری آیت میں خدا فرماتا ہے :-

"ان ھذا القرآن یقص علی بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون"
یہ قرآن وہ بہت سی باتیں جن کے بارے میں بنی اسرائیل اختلاف رکھتے ہیں ان کے سامنے بیان کرتا ہے۔ (سورۂ نمل / ۷۶)

ایک ایسی کتاب کو اپنی ان تمام عظمتوں کے ساتھ کہ یہ خدا کی جانب سے آخری کتاب ہے دوسری آسمانی کتابوں پر حاکم ہے اور اختلاف کی صورت میں ان کے درمیان داور اور فیصلہ کنندہ ہے وسیع پہلوؤں کا حامل اور تا قیام قیامت افکار کا مرکز ہونا چاہیئے۔

حضرت امام خمینیؒ نے (انقلاب کی کامیابی سے قبل) ۶/۷/۱۳۵۶ کو نجف اشرف میں اپنی تقریر کے دوران قرآن کے وسیع پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تاسف کا اظہار فرمایا کہ بہت سے مفسرین نے قرآن کریم کے کچھ مخصوص پہلوؤں کے بیان کرنے کے سلسلہ میں اپنی نظر توجہ مبذول رکھی ہے اس کے دوسرے پہلو بیان کرنے سے باز رہے ہیں، چنانچہ آپ نے بارہا قرآن کی جامعیت اور ہمہ گیری کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

فلاسفہ، عرفاء، اور متکلمین نے قرآن کے معنوی پہلوؤں اور اس کے فلسفی و کلامی مسئلوں کے بیان پر توجہ صرف کی ہے اور تفسیریں لکھی ہیں جن کے دیکھنے سے ایسا لگتا ہے گویا قرآن محض اسی جہت کے تحت بھیجا گیا ہے اور یہ سیاست و تربیت کی کتاب نہیں ہے دوسری طرف بڑے بڑے فقہاء نے قرآن کی فقہی آیتوں پر توجہ صرف کی ہے اور اس کے دوسرے پہلوؤں کے سلسلہ میں سعی و کوشش سے باز رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مفسرین ہیں جنھوں نے اپنے اپنے ذوق و فن کے اعتبار سے، قصص، تاریخ، ادب اور فصاحت و بلاغت پر کام کرتے ہوئے اس کے مخصوص پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

ہم اگرچہ ان حضرات کی مساعی جمیلہ اور ان میں سے ہر گروہ کی محنت اور حسن کارکردگی کو نظر

۱۔ صحیفۂ نور ج ا ص ۲۲۳-۲۴۲ ' صحیفۂ نور ج ۵ ص ۱۶۸ تقریر ۱۶/۱۱/ ۱۳۵۷ھ ش

یہ کہ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ شکر گزار بھی ہیں پھر بھی اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کے کسی ایک پہلو یا چند گنے چنے پہلوؤں میں محدود کرنا اور دوسرے پہلوؤں کی طرف سے بے توجہی برتنا قرآن کے ہدف و مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔

قرآن اگر ایک طرف عقیدہ و عرفان کی کتاب ہے اور ظریف ترین عرفانی و فلسفی مفاہیم بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اخلاق و معاشرت اور سیاست و حکومت کے دائرہ میں بھی عالم بشریت کی تربیت اور انسانی تعمیر کا کام انجام دیتا ہے ۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک جامع و کامل کتاب کے عنوان سے قرآن کا مطالعہ کریں ایک ایسی کتاب جس میں ان کے تمام سوالوں اور ضرورتوں کا جواب موجود ہے البتہ اس سلسلہ میں خاتم النبیین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز آپ کی ذریت مطہرہ کے اقوال وارشادات سے قرآنی مفاہیم کی تفہیم و توضیح میں رہنمائی حاصل کریں جیساکہ قرآن کا خود ارشاد ہے :

وانزلنا الیك الذكر لتبين للناس ما نزل الیهم ولعلهم يتفكرون[1]

ہم نے ذکر (قرآن) کو تم پر نازل کر دیا ہے تاکہ جو کچھ تم پر نازل کیا جا چکا ہے تم اسے لوگوں کے سامنے بیان کرو کہ شاید وہ لوگ غور وفکر سے کام لیں ۔

قرآن کا معنوی پہلو

قرآن مجید کا عرفانی، فلسفی واعتقادی پہلو ان زندہ اور جاودان پہلوؤں میں سے ہے جس نے ہر دور میں بڑے بڑے علماء اور دانشوروں کی توجہ اپنی جانب جذب کی ہے اور آج بھی اسے صحیح عقائد کو غلط عقائد کے ساتھ امتیاز عطا کرنے کی بہترین کسوٹی سمجھا جاتا ہے ۔ قرآن نے عرفان و معارف کے وہ باب کھولے ہیں جن کی بلندیوں تک کسی بھی فلسفی کے طائر فکر نے پر نہیں مارے ہیں کبھی کبھی تو مختصر ترین عبارت میں ایسے نکات بیان کر دیئے ہیں جنھیں مفکرین عالم کئی صدیوں کی مسلسل محنتوں کے بعد سمجھنے میں کامیاب ہو سکے ہیں ۔

۱۔ سورہ نحل آیت ۴۴

امام خمینیؒ نے سورۂ حمد کی جو تفسیر پیش کی ہے اس میں قرآن کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس پہلو پر پوری توجہ دی ہے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اس فراموش شدہ پہلو کو دوبارہ منصۂ شہود پر واپس لائے ہیں ۔ جو تفسیریں ادھر چند صدیوں میں لکھی گئی ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جن میں قرآن کے ادبی یا تاریخی، یا فقہی پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے لیکن روح کو بالیدگی عطا کرنے والے عرفانی پہلو جو بہترین و کامل ترین انسانوں کی تخلیق و تربیت کر سکتے تھے بہت ہی کم لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہیں ۔

استاد معظم امام خمینیؒ نے سنہ ۱۳۶۹ھ میں اپنے درس کے دوران فرمایا تھا :۔

قرآن کریم تمام ضرورتوں خاص طور سے عقل وخرد کے مطالبوں کو پورا کرتا ہے ہمیں اگرچہ قرآن کے محض کسی ایک پہلو کو مورد نظر قرار نہیں دینا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کے اس رخ پر زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے ۔ بنیادی طور پر الہیون کے درمیان ذات خدا کے بارے میں اختلاف نہیں ہے سبھی خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ان کے اختلاف محض خدا کے اسماؤ صفات اور عقلی معارف تک محدود ہے اگر اسلامی محققین پہلے سے کوئی نتیجہ قائم کئے بغیر اور دوسرے مکاتب سے متاثر ہوئے بغیر قرآن کی طرف رجوع کریں تو معارف خاص طور پر صفات خدا کے بارے میں اپنا گم شدہ مطلوب پالیں گے ۔

معارف کے اس باب میں ابتدائی صدیوں سے ہی اہل حدیث ، معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان زبردست ہنگامہ آرائی رہی ہے ۔

اس کے بعد امام خمینیؒ نے ایک حدیث امام علی بن الحسینؑ کی نقل کی جس میں شیخ کلینی علیہ الرحمہ (متوفی ۳۲۹ھ) کی روایت کے مطابق حضرت فرماتے ہیں :

ان اللہ عزوجل علم انہ یکون فی آخر الزمان اقوام متعمقون فانزل اللہ سورۃ التوحید والآیات الست من سورۃ الحدید اعنی قولہ سبحانہ (سبح للہ ما فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم لہ ملک السموات والارض یحیی ویمیت وھو علی کل شئ قدیر. ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شئ علیم ، ھو الذی خلق السموات

والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو معکم اینما کنتم واللہ بما تعملون بصیر، لہ ملک السمٰوات والارض والی اللہ ترجع الامور، یولج اللیل فی النھار ویولج النھار فی اللیل وھو علیم بذات الصدور)

ثم قال الامام السجاد: "فمن رام وراء ذلک فقد ھلک" (۱)

خداوند عالم کو معلوم تھا کہ آخری زمانہ میں صاحب فکر و نظر قومیں ہوں گی لہٰذا اس نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید کی یہ چھ آیتیں نازل فرمائیں کہ:

جو کچھ بھی زمین اور آسمانوں میں ہے سب اس اکیلے اور حکیم و قدرتمند خدا کی تسبیح و ستائش میں مشغول ہیں، وہ خدا کہ تمام آسمان اور زمین سب کے سب جس کی ملکیت ہیں، وہ خلق کو زندگی دیتا ہے اور پھر موت دے دیتا ہے۔ اور وہی ہے جو (عالم کی) تمام چیزوں پر قدرت و توانائی رکھتا ہے۔ وہی کائنات کی ابتدا ہے وہی انتہا ہے ظاہر و باطن ہر جگہ اسی کا وجود ہے۔ وہ دنیا کے تمام امور کا جاننے والا ہے وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق کیا اور پھر عرش کے امور (نظام عالم) درست کئے وہ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور اس میں سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اوپر آتا ہے سب جانتا ہے، تم جہاں کہیں رہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کام بھی کرو وہ اس سے آگاہ ہے تمام آسمان اور زمین سب کچھ اس کی ملکیت ہے اور تمام امور کی بازگشت اس کی طرف ہے رات کو دن کے (پردۂ زرین میں) پنہاں کرتا ہے اور دن کو رات کے (سیاہ خیمے) میں چھپا دیتا ہے اور کائنات کے دلوں کے رازوں سے بھی وہ آگاہ ہے۔ اس

اس وقت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: جس نے ان تمام باتوں سے الگ ہٹ کر خدا کے بارہ میں سوچا وہ ہلاک ہوا۔

اس کے بعد امام خمینی نے سورۂ حدید میں بیان شدہ معارف کے درمیان سے دو ٹکڑوں کا انتخاب کیا:

۱۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۳۱۔

(۱) "ھوالاول والآخر والظاھر والباطن"

(۲) وھو معکم اینما کنتم

اور فرمایا: وسیع پیمانے پر بحث کے بعد فلاسفہ کی فکر اس مقام تک پہنچی ہے کہ وجود حق تعالیٰ ایک لامتناہی وجود ہے اور اس کے لامتناہی ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہرگز کوئی "ممکن" "واجب" سے خالی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عقلی و قرآنی معارف سے بے بہرہ افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ آیات ممکنات میں واجب کے حلول کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ایک دوسرا گروہ حلول کے فلسفہ سے گریز کرتے ہوئے ممکنات پر اس کے وسیع احاطہ کو "احاطۂ علمی" کی صورت میں تفسیر کرتا ہے یعنی ان کا خیال ہے کہ اس کا وجود ممکنات پر محیط نہیں ہے بلکہ ان سب پر اس کا علم احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے لیکن کہنا چاہیئے کہ دونوں گروہ (جب حقیقت کو نہ دیکھ سکے) تو انسانوں کی راہ پر چلے گئے ہیں)

حلول، امکانی صفات اور جسمانی خصوصیات میں سے ہے اور واجب الوجود خدا اجسام کا خالق ہے، نہ جسم ہے اور نہ کسی جسم میں حلول کرتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر علمی احاطہ کے عنوان سے کیا جانا ایک طرح کی تفسیر بالرائے ہے کیونکہ وہ واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے: ھو معکم اینما کنتم "تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے" اور یہ اس بات سے کہ "وہ ہر چیز سے آگاہ ہے" قطعی مختلف معنیٰ رکھتا ہے۔

نہ صرف یہ آیت، ممکنات پر اس کے تسلط اور احاطۂ وجودی کو بیان کرتی ہے بلکہ دوسری آیات بھی اس خیال کی تائید کرتی ہیں مثلاً سورۂ مجادلہ کی ساتویں آیت میں ارشاد ہے:-

"مایکون من نجویٰ ثلاثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنیٰ من ذٰلک ولا اکثر الا ھو معھم اینما کانوا ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ ..."

تین افراد باہم راز کی باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا اور نہ پانچ افراد کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا (ہوتا ہے) نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ جہاں بھی ہوں خدا ان کے ساتھ ہے (کیونکہ خدا تمام جزئیات عالم پر کامل احاطۂ وجودی رکھتا ہے) پس قیامت کے دن ہر ایک کو

ان کے اچھے اور برے اعمال کے نتیجہ سے آگاہ کرے گا۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے ؟ ہمیں بڑی ہی عمیق نگاہوں سے قرآن کا جائزہ لینا چاہیئے ،لامتناہی وجود کو ہر جگہ موجود لیکن اس کی موجودگی کو دیگر اجسام کے ساتھ جسمانی موجودگی کی صورت میں نہیں بلکہ معلول امکانی کی حقیقت میں علت الٰہی کے وجود کی شکل میں سمجھنا چاہیئے۔اور یہ وجود تمام اشیاء پر خدا کے قیومی احاطے اور ذات واجب پر ممکنات کے قیام وانحصار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے اور یہ قیام اس قدر ظریف و دقیق ہے کہ خود نفس پر علمی صورتوں کے قیام سے بالاتر ہے اور عالم ممکنات میں خدا کا وجود نفس پر مبنی قوتوں (سماعت و بصارت وغیرہ) کے پہلو بہ پہلو نفس کے وجود سے بالاتر ہے۔

ٹھیک ہے کہ نفس مجرد علمی صورتوں کے پہلو بہ پہلو ایک طرح کی موجودگی رکھتا ہے اور اس سے بالاتر نفس کی قوت فعالہ کے پہلو بہ پہلو نفس کا وجود ہے کہ اگر ان علمی صورتوں یا قوت فعالہ کے ساتھ نفس کی موجودگی یا اس کا ارتباط قطع ہو جائے تو ان کا نابود ہو جانا قطعی و یقینی ہے لیکن ممکنات کے پہلو بہ پہلو واجب کی موجودگی اور واجب پر ممکنات کا قیام بہت ہی زیادہ دقیق و ظریف ہے کیونکہ یہ واجب پر ممکن کے قیام کا مسئلہ ہے ،ممکن پر ممکن کے قیام کی بات نہیں ہے ۔یہی وہ منزل ہے جہاں انسان کو قرآنی توحید اور اس کے باریک عرفانی پہلوؤں کے سامنے سر تعظیم خم کر دینا چاہیئے اور خود کو اس کی حقیقت کے درک کرنے کے سلسلہ میں عاجز و ناتواں سمجھنا چاہیئے۔ (۱)

اخروی جزا و سزا ، اعمال کا مجسم ہونا ہے

حضرت امام خمینی قدس سرہ اپنے باقاعدہ دروس کے اختتام پر مخصوص دنوں کی مناسبتوں سے اخلاقی و تربیتی بحثوں پر روشنی ڈالا کرتے تھے ،اعمال کی جزا و سزا کے سلسلہ میں آپ آخرت میں اعمال کے مجسم ہونے پر کافی زور دیا کرتے تھے ، ہم یہاں اُن کی کتاب "تہذیب الاصول" سے ایک موقع کی مناسبت سے ذکر شدہ گفتگو کا خلاصہ پیش کرتے ہیں :۔

۱۔ تفسیر سورۂ الحمد کے ذیل میں اسی حقیقت کی طرف حضرت امام قدس سرہ نے ایک ہلکا سا اشارہ فرمایا ہے ۔

"بعض لوگ خیال کرتے ہیں آخرت کی جزائیں اور سزائیں پہلے سے مقرر شدہ قرارداد یا معاہدے کی صورت رکھتی ہیں بالکل ویسے ہی جیسے دنیوی سزائیں اور انعامات مختلف انسانی معاشروں میں رائج ہیں جبکہ یہاں مطلب کچھ اور ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور صرف یہی وہ آسمانی کتاب ہے جس نے ان کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے اور وہ یہ کہ خیر و شر کے اعتبار سے انسان کا عمل دو طرح کا وجود رکھتا ہے :

"ان کا دنیوی وجود" ہمارے اعمال میں اور "اخروی وجود" ہماری جزا و سزا کی شکل میں ظاہر ہوگا، چونکہ انسان برزخی واخروی وجود کے جس کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے عمل کو صرف دنیوی لباس میں دیکھتا ہے اور اس کے باطن سے جو ایک طرح سے اس کے اخروی وجود کی حکایت کرتا ہے غافل ہے روز قیامت عمل کے اوپر چڑھی کھال یا پرت اتر جاتی ہے اس وقت اس کی حقیقی شکل اور مغز جزا و سزا کی صورت میں جلوہ گر ہو جاتا ہے"۔ ان آیات پر غور و فکر اس حقیقت کی گواہ ہے جہاں اعلان ہوا ہے :-

یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضراً و ما عملت من سوء تود لو ان بینها و بینه امداً بعیداً (سورہ آل عمران : ۳۰)

اس روز جبکہ ہر نفس اپنے اچھے اور برے کام اپنے سامنے موجود دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس نے جو برے کام انجام دیئے ہیں ان کے اور اس کے درمیان ایک لمبا فصل قائم ہو جائے ۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :-

"و وجدوا ما عملوا حاضراً ولا یظلم ربك احداً (سورہ کہف/۴۹)

جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے اسے حاضر و موجود پاتے ہیں اور تمہارا پروردگار، کسی پر ظلم نہیں کرتا ۔

اسی ذیل میں ایک تیسری آیت ہے جو ذرا واضح انداز میں یہ حقیقت بیان کرتی ہے ۔ اعلان ہوتا ہے :

والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم یوم یحمیٰ علیها فی نار جهنم فتکویٰ بها جباههم وجنوبهم وظهورهم، هذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون" (توبہ/۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور ان چیزوں کو راہ خدا میں انفاق نہیں کرتے آپ ان کو

دردناک عذاب کی بشارت دے دیں! وہ دن جب ان کی یہ ذخیرہ کردہ چیزیں دوزخ کی آگ میں لال کی جائیں گی اور ان سے ان کی پیشانی، ان کا پہلو اور ان کی پشت داغی جائے گی اور اس کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے ذخیرہ کیا تھا اب جو کچھ تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا ان کا مزہ چکھو۔

اس آیت پر غور و فکر کرنے سے اعمال کے مجسم ہونے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے احتکار کیا جانے والا سونا بیک وقت دو جگہ دو طرح کا وجود حاصل کرتا ہے یہاں دلکش و دیدہ زیب سونے اور چاندی کی صورت میں اور وہاں آگ میں تپتے ہوئے جانکاہ دھات کی صورت میں۔

تفسیر بالرائے امام خمینی کی نظر میں

تفسیر بالرائے تمام علمائے اسلام کے نزدیک متفق علیہ طور پر حرام و ممنوع ہے۔ مذاہب کی کثرت اور ہر مذہب کا اپنے حق میں قرآن سے شاہد و گواہ لے آنا اس بات کی نشان دہی ہے کہ سبھی نے پہلے سے قائم اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت قرآن کی طرف رجوع کیا ہے۔

امام خمینیؒ اپنی ایک تقریر میں خاص طور سے تفسیر بالرائے کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے یاد دہانی فرماتے ہیں کہ آج کل ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے پہلے سے ہی اپنے کچھ عقائد و اصول قرار دے لئے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اپنے حق میں قرآن کریم سے شاہد و گواہ لے آئیں اور اگر کامیاب نہ ہو سکے تو تاویل اور خلاف ظاہر مفاہیم پیدا کر کے قرآن کو اپنی باتوں کے مطابق ڈھال لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

عصر حاضر میں "مادہ پرستی" نے بہت سے افکار پر تسلط حاصل کر رکھا ہے جس کی وجہ سے حتیٰ بعض الہیون بھی قرآن کے علمی و معنوی حقائق کو مادیت کے ان ہی امور پر منطبق کرتے ہیں، ہمیں اس طرح کی تفسیر بالرائے بعض مصری قلم کاروں کے یہاں اور آج کل بعض گروہوں کی مستقل تحریروں میں بھی نظر آتی ہے، ان کا مقصد قرآن کے غیبی معارف سے پردہ اٹھانا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خود ساختہ نظریات کی تائید کی تلاش میں ہیں اور اسی غرض کے تحت ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔

امام خمینیؒ طلاب ثرامسلے مورخہ ۲۳/۳/۱۳۵۸ ھ ش (۱۲ جون ۱۹۷۹ء) کو اپنی تقریر میں

ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو پہلے سے قائم شدہ اپنے نظریات کے تحت قرآن سے مطالب نکالتے ہیں آپ خبردار کرتے ہیں کہ اس گروہ کا کام سب سے زیادہ خطرناک ہے یہ لوگ اس پر تلے گئے ہیں کہ جو کچھ ان کا دل چاہتا ہے قرآن کے سر تھوپ دیں۔ (۱)

تحریف قرآن کا افسانہ

تحریف قرآن کا شاخسانہ جو مدتوں سے عیسائی مبلغین کی طرف سے اٹھایا جارہا ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ تحریف قرآن کے نظریہ کی داغ بیل دوسری و تیسری صدی ہجری میں ہی احبار و رہبان کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان ڈالی گئی انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کے نقائص کی تلافی کے لئے کوشش کی کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب کو بھی ایک تحریف شدہ کتاب کے عنوان سے پیش کریں۔

حضرت امام خمینیؒ نے آج سے تقریباً ۳۶ سال قبل ۱۳۷۰ء میں ایک روز تحریف قرآن کی تہمت کے سلسلہ میں تقریر فرمائی تھی جس کا اصل متن عربی زبان میں آپ کی کتاب "تہذیب الاصول" میں موجود ہے اس اتہام کے سلسلہ میں آپ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے یہاں ہم اس کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں امام خمینی فرماتے ہیں :۔

"ان عناية المسلمين بجمع كتابهم وحفظه وضبطه فی حالی القراءة والكتابة يدفع الانسان الى اليقين ببطلان مزعمة التحريف وانه امر لا ينبغی ان يركن اليه ذو مسكة" (۲)

بیان کے اس حصہ میں حضرت امام طاب ثراہ آیات قرآنی کی جمع آوری اور حفاظت کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اہتمام کا ذکر فرماتے ہوئے یاد دلاتے ہیں کہ صدر اسلام میں قرآن کریم سے متعلق مسلمانوں کا سخت اہتمام اس میں کسی ایک کلمہ کے کم یا زیادہ ہونے سے مانع تھا قرآن اسلام کی

۱۔ روح خدا در ولایت فقیہ (امام کی تقاریر و بیانات کا مجموعہ) مطبوعہ ارشاد ص ۵۱۔

۲۔ تہذیب الاصول جلد ۲ ص ۹۶۔

موجودیت اور پاکیزگی نیز مسلمانوں کی عظمت کی نشانی تھا کیسے ممکن تھا کہ اس۔ حافظوں قاریوں اور کاتبوں کے ہوتے ہوئے قرآن میں تحریف ہو جائے؟

اس کے بعد آپ فریقین کی کتب میں تحریف قرآن سے متعلق مختلف روایات کا ذکر کرتے ہیں اور ان کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وماوردت فيه من الاخبار :۔

۱ ـــــ بين ضعيف لا يستدل به

۲ ـــــ الى مجعول تلوح منها آثار الجعل

۳ ـــــ الى غريب يقضى منه العجب

۴ ـــــ الى صحيح يدل على ان مضمونه تفسير الكتاب وتبيين معنى الاٰية "

تحریف سے متعلق روایات چار دستوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں جن میں سے تین دستے غلط اور ناقابل قبول ہیں اور چوتھا دستہ قابل قبول ہے لیکن اس کا تحریف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱ ـــــ پہلے دستے کی وہ روایات ہیں جن کے راوی ضعیف ہیں، یہ روایات زیادہ تر بصورت مرسل نقل ہوئی ہیں:

۲ ـــــ دوسرے دستے میں وہ روایات ہیں جن کے اصل متن سے ہی ان کے جعلی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

۳ ـــــ تیسرے دستے میں وہ مضحکہ خیز روایات ہیں جن کو دیکھ کر عقل و وجدان حیرت و تعجب میں پڑ جاتے ہیں۔

۴ ـــــ چوتھے دستے میں وہ روایات ہیں جن میں تفسیر قرآن سے متعلق گفتگو کی گئی ہے اور ہرگز ان کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کا جزء ہیں۔

اس کے بعد امام خمینی رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر ان روایتوں کا جائزہ لینے اور الگ الگ دستوں میں تقسیم کرنے کا وقت ملتا تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ کس طرح تحریف کا مسئلہ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"ولو لا خوف الخروج عن طور البحث لارخينا عنان البيان الى تبيين تاريخ القرآن وما خدم به المسلمون القرآن طيلة القرون، ولاوضحنا لك ان كتاب الله هو الموجود ما بين الدفتين" (تہذیب الاصول ج ۲ ص ۹۶)

اگر بحث سے خارج ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو ہم اپنی گفتگو کا رخ تاریخ قرآن کے بیان کی طرف موڑ دیتے اور بتاتے کہ ان طویل صدیوں میں مسلمانوں نے قرآن کی کیا خدمتیں انجام دی ہیں اور آپ کے سامنے یہ واضح کر دیتے کہ اللہ کی کتاب یہی ہے جو دونوں جلدوں کے درمیان موجود ہے۔

ایک دن حضرت امام طاب ثراہ نے فرمایا: اگر میرزا شیرازی مرحوم کتاب "فصل الخطاب" کی اشاعت کے وقت زندہ ہوتے یقینی طور پر اس کتاب کو بے اہمیت قرار دیدیتے اور اعلان کر دیتے یہ کتاب سرے سے ایسی ضعیف یا مرسل روایات پر مشتمل ہے جن سے روز اول سے ہی اسلامی محققین نے پرہیز برتا ہے۔

قرأت کا اختلاف

امام خمینیؒ اپنی بحث کے دوران اس بات پر زور دیتے تھے کہ قرآن مجید کی نص کے اعتبار سے ایک سے زیادہ قرأت نہیں ہے اور پیغمبر اسلام نے صرف ایک قرأت مسلمانوں کو تعلیم دی ہے اور خلیفۂ سوم کے زمانہ میں اگر کوئی کام انجام پایا ہے تو وہ قرآنی مفردات کی تلفظ کے اعتبار سے ہم آہنگی و یکرنگی سے مربوط ہے اور وہ بھی قریش کے لہجہ کے مطابق ہوئی ہے، کیونکہ قرآن "ام القریٰ" کے لہجہ میں نازل ہوا لہٰذا طبعاً اسی لہجہ میں محفوظ رہنا چاہیئے۔

سات قرأتوں کے سلسلہ میں امام خمینیؒ کا موقف قطعاً منفی تھا، کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ اس بات پر واضح ترین گواہ کہ ایک کے علاوہ ان میں سے تمام قرأتیں قاریان قرآن کا اجتہاد اور ان کے افکار کی اختراع ہیں: خود یہ امر ہے کہ ان میں سے تمام صاحبان قرأت نے اپنی قرأت کی حقانیت میں دلیل و برہان اور حجتیں قائم کی ہیں اور ہر ایک کہتا ہے: اس دلیل کے تحت میری قرأت دوسری قرأتوں پر ترجیح رکھتی ہے۔

ہماری تفاسیر کا ایک بڑا حصہ صاحبان قرأت کی حجتوں اور دلیلوں پر مشتمل ہے اگر ان

قاریوں کی قرأت راویوں کی طرق سے حضرت رسولؐ خدا صلعم پر منتہی ہوتی تو حجیتیں قائم کرنے اور ادبی تحلیل و تجزیہ پیش آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، یہ بات خود گواہ ہے کہ قرّاء کے درمیان ادب کی ترویج، ان کے اجتہاد کا اختلاف اور ان کا طریقہ کار قرأتوں میں اختلاف پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔

امام خمینیؒ رضوان اللہ علیہ بعض کاتبین قرآن سے، کہ جنھوں نے قرآن کے حاشیوں پہ قرأتوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے سخت نالاں تھے آپ کہا کرتے تھے: کیا قرآن انسان کا کلام ہے کہ اس کے مختلف نسخے پائے جاتے ہوں؟

مذکورہ موضوع کے تحت امام خمینی طاب ثراہ کے نقطہ نظر کا یہ ایک اجمالی خاکہ تھا۔ لیکن آپ قرآن کے اجتماعی و تربیتی مسائل کے سلسلہ میں بہت ہی بلند انقلاب آفریں وانسان ساز افکار رکھتے تھے جس پر کبھی آئندہ بحث کی جائے گی۔



امام خمینی

کے افکار میں قرآنی تجلیاں

تحریر: جناب سید علی شاہ چراغی
ترجمہ: جناب سید ابوجواد

رہبر اعظم انقلاب اسلامی امام خمینی رضوان اللہ علیہ سیکڑوں اہم اور ذی قیمت خصوصیات و امتیازات کے مالک تھے۔ آپ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ کے بیانات میں قرآن و عترت سے تمسک کا عنصر نمایاں رہتا تھا۔ جس طرح حضرت علی اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات قرآن کے ترجمان ہوا کرتے تھے اسی طرح امام خمینی کے افکار کے سلسلہ میں بھی یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کے اکثر بیانات قرآن و عترت کی عکاسی کرتے تھے۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث سے بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم یہاں صرف اسلامی انقلاب سے مربوط بیانات کے سلسلہ میں چند نمونے پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔ چنانچہ اس بحث کو حسب ذیل عناوین کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اسلامی انقلاب کے مقاصد و محرکات

۲۔ اسلامی انقلاب کے اصول

۳۔ اسلامی انقلاب کے دوست

۴۔ اسلامی انقلاب کے دشمن

۵ ـــ اسلامی انقلاب کا مستقبل

۱ ـــ اسلامی انقلاب کا محرک

دنیا کے دیگر انقلابات سے ایران کے اسلامی انقلاب کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ اس کا محرک الٰہی ہے۔ دنیا کے گوشہ و کنار میں خاص طور سے اس آخری صدی کے اندر رونما ہونے والے انقلابات جیسے روس کا انقلاب اکتوبر اور فرانس کا انقلاب عظیم۔ اس امتیاز سے محروم ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایران کے اس عظیم الشان اسلامی انقلاب کو دیگر انقلابات سے موازنہ کرنا ہی غلط اور قیاس مع الفارق ہے۔

اسلامی انقلاب کا یہی الٰہی محرک تھا جس نے مختصر سی مدت میں مشرق و مغرب کے بنائے ہوئے تمام فارمولوں کو غلط ثابت کر دیا اور ان کے تمام شیطانی نظریات پر بجلی بن کر گرا۔ یہاں تک کہ آج مارکسزم کی بوسیدہ و فرسودہ ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ اور انشاء اللہ ہم عنقریب مغرب کے فاسد نظام کی نابودی کا بھی نظارہ کریں گے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے انقلاب کے الٰہی محرک کی کڑی ہے۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کے رہبر اعظم حضرت امام خمینی قدس سرہ نے اس الٰہی محرک کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

" میرے عزیز بھائیو! جو چیز ملت ایران اور ہم سب کے لئے بے حد اہم ہے یہ ہے کہ، ہم خدائے تبارک و تعالیٰ سے لو لگائے رہیں اس سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوں۔ اس نکتہ کی طرف متوجہ رہیں کہ ہم نے خدا کے لئے قیام کیا ہے، ہماری تحریک و انقلاب کا مقصد اللہ تھا اور ہم اسی کے لئے آگے بڑھتے رہیں گے" (۱)

ایک اور موقع پر غازیان اسلام کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

" ایران کا انقلاب خدا کے لئے ہے۔ شروع ہی سے ہمارا نعرہ "اللہ" تھا، اللہ اکبر تھا اور انشاء اللہ آخر تک یہی رہے گا۔ میں تمام موجودہ اور آئندہ نسلوں سے وصیت کرتا ہوں کہ اگر وہ اسلام

۱ـ ۱۱ر ۹ر ۶۰ کو فوجیوں کے مجمع میں تقریر

اور اللہ کی حکومت باقی رکھنا چاہتے ہیں، اگر وہ اپنے ملک کے اندرونی و بیرونی استحصالیوں اور سامراجیوں کے ہاتھ کاٹنا چاہتے ہیں تو یہ الٰہی محرک ہاتھ سے نہ جانے دیں جس کی خود خداوند عالم نے قرآن مجید میں تاکید کی ہے :

آپ اپنے الٰہی سیاسی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں :

"بلاشک و شبہ اسلامی انقلاب کی بقا کا راز بھی وہی ہے جو اس کی کامیابی کا راز تھا کامیابی کے راز سے ملت واقف ہے اور آئندہ نسلیں تاریخ میں پڑھیں گی کہ اس کامیابی کے دو بنیادی رکن ہیں : ایک ہے پاکیزہ الٰہی مقصد یعنی جذبۂ للٰہیت، نیز اسلامی حکومت کا قیام اور دوسرے اس مقصد کو (جامۂ عمل پہنانے کے لئے) ملک بھر میں پوری قوم کا اتحاد و اجتماع"[۱]

امام خمینیؒ کے ان بیانات کی قرآنی بنیاد، تمام انبیائے الٰہی خاص طور سے مرسل اعظمؐ کی تحریکوں کے محرکات میں نظر آتی ہے۔

چنانچہ خداوند عالم، مرسل اعظمؐ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے :-

قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا [۲]

(اے نبیؐ) ان سے کہدیجئے کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر خدا کے لئے قیام کرو اور پھر سوچو)۔

ایک دوسری آیت میں اس الٰہی محرک کی طرف ان لفظوں میں اشارہ ہوتا ہے :-

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ [۳]

انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اپنے دین کو خدا کے لئے خالص کرکے اس کی بندگی کریں۔ (شرک سے توحید کی جانب پلٹ آئیں) نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔ ایک اور آیت میں ہے :-

---

۱۔ سیاسی الٰہی وصیتنامہ

۲۔ سبا / ۴۶ ۳۔ سورہ بینہ آیت ۵

قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ فِی خَوْضِھِمْ یَلْعَبُونَ (۱)

(اے رسول) بس کہدیجیئے اللہ! اور پھر انھیں اپنی ہٹ دھرم بحثوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دیجیئے۔

اسی طرح کی اور بھی دسیوں آیتیں ہیں جو اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن ان سب کو بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی انقلاب کے بنیادی اصول

چونکہ ہماری یہ تحریک، اسلامی تحریک ہے لہٰذا یہ فطری سی بات ہے کہ اس کی بنیاد بھی اسلامی اصولوں ہی پر استوار ہوگی۔ اور اس کے اہم اصول یہ ہیں:

الف۔ الٰہی تصور کائنات پر اعتماد

ہمارے اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اس کی بقا کا بنیادی رکن، مبدأ و معاد اور اس سے مربوط مسائل پر یقین ہے اور یہی وہ رکن ہے جس نے تمام انبیائے الٰہی کی تحریکوں میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ تمام انبیاءؑ اپنی قوموں سے کہا کرتے تھے:

یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (۲)

اے میری قوم اللہ کی پرستش کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

مرسل اعظمؐ نے بھی اپنی عالمی تحریک اسی اصول پر استوار کی تھی۔ بعثت کے آغاز میں پیغمبر اسلامؐ کی جانب سے پیش کئے جانے والے مسائل کا زیادہ تر حصہ مبدأ و معاد ہی سے مربوط ہوتا تھا، نمونے کے طور پر بعثت کے آغاز میں نازل ہونے والے قرآن مجید کے چھوٹے چھوٹے سوروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان سوروں کا زیادہ تر حصہ مبدا و معاد سے مربوط مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے بیانات کا بھی اہم ترین حصہ ان ہی مسائل سے تعلق رکھتا ہے نمونے کے طور پر آپ کے بیانات کے بعض حصے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سورۂ انعام آیت ۹۱ ۲۔ سورۂ اعراف آیت ۵۹

"اسلامی انقلاب کی بنیاد توحیدی اصول ہیں اور یہ اصول معاشرہ کے تمام امور پر سایہ فگن ہیں۔ اسلام میں، انسان بلکہ ساری کائنات کا واحد معبود، خدا ہے اور ہر انسان کا فریضہ ہے کہ اس کا ہر عمل اللہ اور اس کی رضا کے لئے انجام پائے"۔ (۱)

اس طرح لا رکالج کے طلبا رکے مجمع میں آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جو چیز بنیاد تھی وہ یہ تھی کہ عوام اسلام، ایمان اور عقیدہ کے نام پر میدان میں اتر آئے اور چونکہ بات اسلام و ایمان کی تھی لہٰذا تمام طبقے آپس میں متحد ہو گئے اور یہ اتحاد توحید کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔(۲) امام خمینی اپنے الٰہی سیاسی وصیتنامہ میں فرماتے ہیں:۔

"اسلام اور اسلامی حکومت ایک الٰہی تجلی ہے جو اپنے نفاذ کی صورت میں فرزندان اسلام کے لئے دنیا و آخرت کی سعادت کے اسباب بہترین طریقہ سے فراہم کر سکتی ہے"۔

ب: اُمت کا اتحاد پر بھروسہ

امام خمینی نے اپنے بیانات میں بارہا اس نکتہ پر زور دیا ہے اور اتحاد کو انقلاب کے سب سے اہم بنیادی اصولوں میں شمار کیا ہے۔ آپ ۹ ر ۱۱ ر ۵۹ کو فضائیہ کے جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انقلاب کے آغاز میں قوم جس بات پر جمی ہوئی تھی وہ اتحاد اور خدا سے لو لگانا تھا، اور یہ اتحاد ہی ہے جس نے تمہیں قلت کے باوجود بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں کامیاب بنا دیا"۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"مل جل کر رہیئے۔ یک دل بنئے اور سب کو اتحاد کی دعوت دیجئے۔ الحمد للہ آج اتحاد کی فضا قائم ہے۔ اس اتحاد کی حفاظت کیجئے۔ جب تک آپ اپنا اتحاد باقی رکھیں گے خدا آپ کے ساتھ ہے۔ "ید اللہ مع الجماعۃ" جب آپ اللہ کی رسّی سے متمسک ہیں گے تو خدا آپ کے ساتھ ہوگا"۔ (۳)

۱۔ السفیر اخبار سے انٹرویو ۲/۹/۵۷ ۲۔ "در جستجوی راہ از کلام امام" گیارہواں دفتر۔ ص ۱۳۳ ۔ ۱/۳/۵۸ ۳۔ صحیفۂ نور ج ۱۸ ص ۲۰/۲/۶۳

امام خمینیؒ اپنے سیاسی الٰہی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں :

" تمام مسلمانوں اور خاص طور سے ایرانیوں نیز عصر حاضر کے انسانوں سے میری وصیت یہ ہے کہ ان سازشوں کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں اور ہر ممکن طریقہ سے اپنے درمیان اتحاد و ہم بستگی کو مستحکم کرکے کافروں اور منافقوں کو مایوس کر دیں "

شاید امام خمینی کے بیانات میں رائج ترین لفظ یہی اتحاد و وحدت ہو ، جس کی آپ ہمیشہ تاکید فرمایا کرتے تھے اور آپ نے یہ روش مرسل اعظمؐ کی سیرت سے اخذ کی تھی ۔

پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ میں محدود پیمانہ پر اسلامی حکومت تشکیل دینے کے بعد جو پہلا قدم اٹھایا وہ اسلامی امت کے درمیان اتحاد قائم کرنا تھا ۔ آپ نے مہاجرین و انصار کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور اوس و خزرج کے صدیوں پرانے جھگڑے کو محبت و اخوت میں تبدیل کر دیا ۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے :-

وَاعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً ولا تفرّقوا واذکروا نعمتَ اللّٰہِ علیکم اذ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً (۱)

تم سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے ، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے ۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :-

اِنما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتّقوا اللّٰہ لعلکم ترحمون" (۲)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں ، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح و دوستی برقرار کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۔

خداوند عالم ایک مقام پر مومنین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

---

۱ ۔ سورہ آل عمران آیت ۱۰۳ ۲ ۔ سورہ حجرات آیت ۱۰

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون "(۱)

اور ان مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ، جنھوں نے اپنا اپنا دین بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ اپنے اپنے عقیدہ و نظریات میں مگن ہے۔

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

" وَالَّفَ بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الَّفت بین قلوبھم ولکنّ اللہ الّف بینھم " (۲)

خدا نے مومنوں کے دل، ایک دوسرے سے جوڑ دیئے۔ ہم اگر آپ روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے پھر بھی ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت و محبت برقرار کر دی۔

ج: عوام پر اعتماد

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں نافذ قانون، خدا کا قانون ہے۔

وَمَنْ اَحسن من اللہ حکماً لقوم یوقنون (۳)

لیکن اس قانون کو نافذ کرنے والے عوام ہیں اور اصلی قانون ساز خدا ہے۔ قانون پر عمل کرنے کے لئے خدا نے اتنے اچھے اسلوب سے گفتگو کی ہے کہ قانون پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کے نفسوں میں ایک اندرونی کشش پیدا ہو جائے۔ مثلاً روزہ کے سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس قانون کے نفاذ کے لئے میدان ہموار کرنے کی خاطر، پہلے بڑے پیار اور محبت سے فرماتا ہے " یا ایھا الذین آمنوا " اپنے مخاطبین کو مومن کے لقب سے نوازتا ہے، اس کے بعد روزہ کے وجوب کا اعلان کرتا ہے۔ " کتب علیکم الصیام " پھر اسے آسانی سے قبول کرنے کی خاطر فرماتا ہے " صرف تم ہی لوگوں پر روزہ واجب نہیں ہوا ہے۔ بلکہ تم سے پہلے کی قوموں پر بھی روزہ واجب تھا "، کما کتب علی الذین من قبلکم " اس کے

۱۔ سورہ روم آیت ۳۱-۳۲ ۲۔ سورۂ انفال آیت ۶۳ ۳۔ سورۂ مائدہ/ ۵۰

بعد روزہ کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ اس کا مقصد تمہارے دلوں میں تقویٰ پیدا کرنا ہے "لعلکم تتقون" اس کے بعد فرماتا ہے یہ روزہ صرف چند دن کی بات ہے "ایاما معدودات" اور ان چند دنوں میں بھی اگر بیماری یا سفر وغیرہ کا کوئی عذر پیش آگیا تو اسے بعد میں بھی رکھ سکتے ہو "فمن کان منکم مریضاً او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر" ۔

دیکھئے! خدا اپنے قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں بھی عوام کا خیال رکھتا ہے یہ خدا کی طرف سے عوام کو خاطر میں لانے اور انھیں اہمیت دینے کی ایک مثال ہے۔

رسول اکرمؐ کی سیرت بھی بہترین گواہ ہے کہ حضورؐ عوام کو بہت اہمیت دیتے تھے اور آپؐ کی نگاہ میں ان کی غیر معمولی قدر و منزلت تھی ۔

رسول خداؐ کے مشوروں کا ایک اہم ترین فلسفہ یہی ہے، یعنی عوام کے افکار کا احترام خاص طور سے جب جنگوں میں حضورؐ عوام کے ایثار و فدا کاری کا مشاہدہ فرماتے ہیں تو بعض اوقات کئی کئی مرتبہ عوام سے مشورہ کرتے ہیں اور ان کی رائے دریافت فرماتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ امام خمینیؒ بھی اس الٰہی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہمیشہ عوام پر بھروسہ کرتے تھے اور انھیں اس انقلاب کا اصل مالک بتاتے تھے ۔ امامؒ نے اسلامی جمہوریہ کے ذمہ داروں سے عوام کی خدمت کرنے کی بارہا تاکید کی ہے ۔ ہم یہاں امام خمینیؒ کے بیانات میں سے چند نمونے پیش کر رہے ہیں جن میں آپ نے عوام کی رائے کو معتبر جانا ہے اور ان کے نظریہ کو معیار قرار دیا ہے ۔

• جن لوگوں نے خون دیا وہ یہی جوان تھے اور جنھوں نے اپنے جوانوں کی قربانیاں دیں وہی لوگ تھے کچھ لوگ میدان سے باہر تھے اونچے طبقہ والے اپنے محلوں میں ٹھاٹھ سے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ لوگ اپنا خون دے رہے تھے یا آپ کے گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا لہٰذا وہی ہونا چاہئے جو آپ لوگوں کی مرضی ہے نہ کہ وہ جو بالا اور باہر کے محلے والے چاہتے ہیں، اونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے چاہتے ہیں، قانون داں چاہتے ہیں ۔ جو کچھ آپ لوگ چاہیں گے وہی ہوگا ۔ جس نے خون دیا ہے اسی کی بات سننی چاہیئے اور اسی کی رائے واجب ہے ۔"(۱)

۱۔ مدرسہ فیضیہ قم میں ۱۰؍۱۲؍۵۷ کو امام خمینی کی تقریر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔

"ہم اس نکتہ پر زور دیتے ہیں کہ کامیابی اسی کے قدم چومے گی جس کے ساتھ قوم ہے اور ہماری قوم، اسلام، اسلامی سعادت اور اسلامی جمہوریہ کی حامی ہے ۔" (۱)

امام خمینیؒ اپنے الہٰی سیاسی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں :-

"میں پوری جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ عصر حاضر میں ملت ایران اور اس کے لاکھوں کروڑوں عوام رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے عہد کی ملت حجاز، امیر المومنین اور حسین بن علی صلوات اللہ وسلامہ علیہا کے زمانہ میں کوفہ و عراق کی قوم سے بہتر ہیں" ہم سب کو فخر ہے کہ ایسے دور میں اور ایسی قوم کی خدمت میں ہیں ۔"

وصیت نامہ کے ایک دوسرے حصہ میں پارلیمنٹ اور حکومت کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"پارلیمنٹ، حکومت اور دیگر اداروں کے ذمہ داروں سے وصیت کرتا ہوں کہ اس ملت کی قدر کیجئے اور ان کی خدمت میں، خاص طور سے محروموں، مستضعفوں اور ستم دیدہ لوگوں کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کیجئے ۔ یہ ہماری آنکھوں کے نور اور ہم سب کے ولی نعمت ہیں ۔ جمہوری اسلامی ان ہی لوگوں کی کوششوں اور قربانیوں کا ثمرہ ہے اور اس کی بقا بھی ان ہی کی خدمتوں کی رہین منت ہے ۔ خود کو عوام کا اور عوام کو اپنا سمجھئے ۔"

عوام کو اہمیت دینے کے سلسلہ میں کچھ دوسری آیتوں کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے جن سے امام خمینیؒ کے بیانات کی تائید ہوتی ہے ؛ چنانچہ ارشاد رب العزت ہے :

يا ايها النبى حسبك الله و من اتبعك من المؤمنين (۲)

اے رسول آپ کے لئے بس اللہ اور وہ مومنین کافی ہیں جو آپ کے تابع فرمان ہیں

خدا اپنے پیغمبرؐ کو مشرکین کے ایمان نہ لانے کے سلسلہ میں تسلی و دلاسا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ اپنی ساری توجہ ان لوگوں پر مرکوز کریں جو آپ پر ایمان لائے ہیں ۔

۱۔ جمہوری اسلامی اخبار کے کارکنوں کے مجمع سے تقریر ۲۴/۴/۵۸

۲۔ سورۂ انفال/۶۴

ولا تحزن علیھم واخفض جناحک للمؤمنین (۱)

امیر المومنین علیہ السلام، عوام کا لحاظ رکھنے کے سلسلہ میں محمد بن ابی بکر کو ایک دستور العمل دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

فاخفض لھم جناحک والن لھم جانبک [redacted] بسط لھم وجھک وآس بینھم فی اللحظۃ والنظرۃ (۲)

لوگوں سے تواضع کے ساتھ ملو، ان سے نرم برتاؤ کرو، [redacted] پیش آؤ اور سب کو ایک نظر سے دیکھو۔

د۔ مستضعفین ومحرومین کا پاس ولحاظ

تحریک کی اس طویل مدت خاص طور سے جمہوری اسلامی [redacted] حکومت کے ان دس برسوں میں امام خمینیؒ کے موقف کی ایک واضح خصوصیت یہ رہی ہے کہ آپ محرومین ومستضعفین اور جھونپڑیوں میں رہنے والے ستم رسیدہ عوام کا بڑا خیال [redacted] ۔ اس سلسلہ میں چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

"میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ شہیدوں کا نذرانہ پیش [redacted] والوں اور جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے سر کا ایک ایک بال تمام دنیا کے قصر نشینوں سے اشرف وبرتر ہے" (۳)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :

"ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جس طرح ہو سکے، [redacted] کی حمایت ودفاع کے راستہ کی حفاظت کریں" (۴)

شہیدوں کے اہل خاندان کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں :

"یہ مستضعف عوام، یہ جھونپڑوں میں رہنے والے اور متوسط طبقہ کے افراد ہی اس

---

(۱) حجر / ۸۸ (۲) نہج البلاغہ خط ۲۷

(۳) پیغام حج ۱۳۶۶ ش ۱۹۸۷ء

(۴) پیغام حج ۱۳۶۷ ش ۱۹۸۸ء

میدان میں ڈٹے ہوئے تھے اور آج بھی وہ تمام بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں ڈٹے ہوئے ہیں اور آخر تک اسی طرح مقابلہ کرتے رہیں گے۔ " (۱)

۱۳۶۷ھ ش میں حجاج کرام کے نام ایک پیغام میں فرماتے ہیں: ہم سب کا یہ فریضہ ہے کہ مستضعفین کی حمایت پر مبنی پالیسی کے تحفظ کی بھرپور کوشش کریں۔

۱۳۶۶ھ ش میں بیت اللہ الحرام کے حاجیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"خدا وہ دن نہ دکھائے جب ہماری اور ہمارے ملک کے ذمہ داروں کی سیاست محروموں کی حمایت کو پس پشت ڈال کر سرمایہ داروں کی حمایت کرنا بن جائے اور دولتمندوں کا اعتبار و وقار بڑھ جائے۔"

۱۳۶۷ھ ش کے پیغام حج میں اس ستم دیدہ اور شہادت طلب طبقہ کی حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میں آپ لوگوں کے درمیان رہوں یا نہ رہوں آپ سب سے وصیت و نصیحت کرتا ہوں کہ اس انقلاب کو نا اہلوں اور نامحرموں کے ہاتھ میں نہ جانے دیجئے، شہادت و خون کے میدان میں پیش قدم رہنے والے افراد زندگی کے پیچ و خم میں بھلا نہ دیئے جائیں۔"

امام خمینیؒ کا یہ موقف، درحقیقت اسلامی و قرآنی ثقافت کا صحیح ادراک ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قریش کے دولتمندوں نے مرسل اعظمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اگر آپ محروموں کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں تو ہم سب مسلمان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن رسول اکرمؐ نے خدا کے حکم سے ان کی اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ پیغمبر اسلامؐ کو حکم خدا یہ تھا کہ:

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداوة والعشى يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوٰة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هوٰه و

۱۔ ۲۹/۷/۶۰ھ ش

وکان امرہ فرطاً ۔ (۱)

"آپ نفس کو ان ہی لوگوں کی ہمراہی پر قانع رکھئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کرتے ہیں اور اس کی رضا کے خواہاں ہیں اور دنیا کی آسائش و زینت کی خاطر ان سے ہرگز نظر نہ پھیریئے۔ ایسے شخص کی بات ہرگز نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور وہ اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس کا کام سراسر زیادتی ہے ۔"

ایک دوسرے مقام پر خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو خطاب کرکے فرماتا ہے :

ولا تطرد الذین یدعون ربّھم بالغداوۃ والعشیّ یریدون وجھہٗ ماعلیک من حسابھم من شیءٍ ومامن حسابک علیھم من شیءٍ فتطردھم فتکون من الظّالمین ۔ (۲)

جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اسی سے لو لگائے ہوئے ہیں انھیں اپنے سے دور نہ کیجیئے نہ ان کی جوابدہی آپ کے ذمہ ہے اور نہ آپ کی جوابدہی ان کے ذمہ ہے کہ آپ انھیں دھتکار سکیں ؟ (اگر آپ ایسا کریں گے) تو ظالموں میں شمار ہوں گے۔

خود پیغمبر اسلامؐ، محروموں اور مستضعفوں کے اتنے حامی تھے کہ آپؐ دعا فرماتے تھے:

اللّٰھمّ احینی مسکیناً وامتنی مسکیناً واحشرنی فی زمرۃ المساکین ۔ (۳)

" پروردگارا مجھے مسکین کی زندگی عطا کر ، مسکین ہی دنیا سے اٹھا اور قیامت میں مسکینوں کے زمرہ میں محشور فرما "

اور شاید اس حدیث شریف " الفقر فخری " کا ایک معنے یہی ہو کہ مجھے محروموں اور مظلوموں کے ساتھ رہنے پر فخر ہے (اگرچہ اس حدیث کے اور بھی بہت سے معانی ہیں)

حضرت علی علیہ السلام کو بھی اس بات پر فخر تھا کہ آپؑ کا رہن سہن آپ کی رعایا میں

۱۔ کہف / ۲۸ ۲۔ سورۂ انعام آیت ۵۲

۳۔ سنن النبیؐ مؤلف علامہ طباطبائی ۔

غریب ترین افراد جیسا ہے۔ حضرت علیؑ، عثمان بن حنیف کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

أأقنع من نفسي بان يقال هٰذا امير المومنين ولا اشاركهم في مكاره الدهر او اكون اسوة في جشوبة العيش ۔ (۱)

کیا میں اسی میں مگن رہوں کہ مجھے امیر المومنین کہا جاتا ہے اور میں زمانہ کی سختیوں میں اپنی رعایا کا شریک و ہمدم اور زندگی کی تلخیوں میں ان کے لئے نمونہ نہ بنوں؟

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اگر اسلام محروموں اور مستضعفوں کی حمایت کرتا ہے تو اس کا سرچشمہ الٰہی تصور کائنات ہے۔ اسے اس طبقاتی نظریہ سے کوئی سروکار نہیں جس کا کھوکھلا پن آج مارکسی دنیا میں اظہر من الشمس ہو چکا ہے۔

ھ۔ صدور انقلاب

اس مقدس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ عالمی اسلامی تحریک ہے اور اسلامی انقلاب کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اس عالمی اسلامی تحریک کی ایک جھلک ہے۔

جس طرح اسلام، جزیرۃ العرب تک محدود نہیں تھا۔ فطری طور پر یہ اسلامی انقلاب بھی اسلامی ایران کی چار دیواری تک محدود نہیں رہ سکتا۔ اسلام اور اسلامی انقلاب کے مخاطب وہ تمام پاک اور سالم فطرتیں ہیں جو دنیا کے چپہ چپہ میں موجود ہیں۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذٰلك الدين القيم ۔ (۲)

ہمارے اسلامی انقلاب کا پیغام، فطرت کا پیغام ہے لہٰذا جہاں کہیں صحیح و سالم فطرت ہوگی وہاں اسلام اور اسلامی تحریک بھی پہنچے گی اور صدور انقلاب کے سلسلہ میں امام خمینیؒ کے بیانات کا بھی یہی مطلب ہے کہ "ہم یہ روح افزا الٰہی پیغام پاک و سالم فطرتوں تک پہنچائیں گے۔ واضح رہے کہ ہم نے اپنے انقلاب کو ایک دن بھی اسلحہ کے بل بوتے پر نہ برآمد کیا ہے اور نہ آئندہ ایسا کریں گے" اسلحہ کے زور پر انقلاب برآمد کئے جانے کی بات

۱۔ نہج البلاغہ مکتوب ۴۵ ۲۔ سورہ روم / ۳۰

دشمن کی من گھڑت اور کلام امام کی تحریف ہے۔

البتہ یہ واضح ہے کہ جب قومیں اپنی فطرت کے پیغام پر کان دھریں گی اور اللہ کی حکومت تسلیم کریں گی تو پھر ظالم، ستمگر اور بدعنوان حکومتوں کی گنجائش نہیں رہ جائے گی اور وہ قومیں اپنی حکومتوں کے ساتھ وہی کریں گی جو ایرانی عوام نے عالمی استکبار کی کٹھ پتلی بدعنوان پہلوی حکومت کے ساتھ کیا۔ اب ہم اس ضمن میں آپ کی توجہ امام خمینی کے گراں قدر ارشادات کی طرف موڑتے ہیں :۔

ہم اپنا انقلاب ——— جو درحقیقت سچے اسلام کی برآمد اور محمدی احکام و تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے۔ صادر کر کے عالمی لٹیروں کے ظلم و اقتدار کو ختم کر دیں گے"(۱)

"ایران کی تحریک نہ صرف ایران سے مخصوص تھی اور نہ ہے۔ کیونکہ اسلام کسی ایک طبقہ کی جاگیر نہیں ہے۔"(۲)

"ہم اپنی اسلامی، بین الاقوامی اور خارجہ پالیسی میں اس حقیقت کا بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم دنیا میں اسلام کے اثر و رسوخ کو بڑھانا اور عالمی لٹیروں کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتے تھے اور ہیں۔ اب اگر امریکی گماشتے اس سیاست کو توسیع پسندی اور ایک عظیم شہنشاہیت کی تشکیل کا نام دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا کوئی خوف نہیں ہے بلکہ ہم اس کا استقبال کرتے ہیں۔"(۳)

یہ ہیں امام خمینی کے وہ دلآویز الٰہی بیانات جن سے قرآنی آیات کی خوشبو آتی ہے

خداوند عالم فرماتا ہے:

وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون ۔(۴)

اے رسولؐ! ہم نے آپ کو تمام دنیا کے لئے الٰہی نعمتوں کی بشارت دینے والا اور اس کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر بہت سے لوگ اسے نہیں جانتے ۔

۱۔ جستجوی راہ از کلام امام ۲۔ پیام حج سنہ ۱۳۶۶ ھ ش

۳۔ پیغام حج سنہ ۱۳۶۷ ھ ش ۴۔ سورۂ سبا آیت ۲۸

ایک دوسری آیت میں ، پیغمبر اسلامؐ کی تحریک کے عالمی ہونے پر تاکید کی گئی ہے :

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (۱)

ہم نے آپ کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔

مشرکین مکہ نے پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آکر کہا کہ آپ کیسے پیغمبر ہیں کہ کوئی بھی آپ کا حامی نہیں ہے ۔ ان ہٹ دھرم مخالفوں کے جواب میں جو حضور اکرمؐ کی حقانیت پر اتنے تمام دلائل و براہین کے ہوتے ہوئے بھی آنکھ بند کر کے پیغمبرؐ سے دلیل و گواہ کا مطالبہ کرتے تھے ۔ پیغمبر اسلامؐ کو خدا کی طرف سے حکم ہوتا ہے کہ ان سے پوچھئے کہ سب سے بڑی گواہی کس کی ہے :۔

قل ای شیء اکبر شہادۃ قل اللہ شہید بینی و بینکم واوحی الی ہذا القرآن لانذرکم بہ و من بلغ (۲)

اے رسولؐ ان سے پوچھئے کہ کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے ؟ کہدیجئے میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور یہ قرآن وحی کے ذریعہ میرے پاس بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس تک اس کا پیغام پہنچے ، سب کو اس کے ذریعہ متنبہ کروں ۔

' و من بلغ ' دلیل ہے کہ پیغمبرؐ فقط جزیرۃ العرب کے لئے مامور نہیں تھے بلکہ آپ کے مخاطب رہتی دنیا تک آنے والے تمام انسان ہیں ۔ اس پیغام کو دنیا کے چپہ چپہ تک پہنچنا چاہیئے

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

لینذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین ۔ (۳)

(نزول قرآن کا) مقصد یہ ہے کہ زندہ افراد کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے ۔

یہ اور اس طرح کے تمام تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی تحریک عالمی تحریک تھی اور خداوند عالم نے قرآن مجید میں اپنے پیغمبرؐ کو اس تحریک کو عالمی بنانے کی

۱۔ سورہ انبیاء آیت ۱۰۷ ۲۔ سورۂ انعام آیت ۱۹

۳۔ سورہ یٰس آیت ۷۰

کیفیت سے آگاہ کیا ہے ۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کے رہبر اعظم امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے بھی قرآن کی ان ہی نورانی تعلیمات کی روشنی میں فرمایا ہے :

" ہم دنیا میں اسلام کے اثرو رسوخ کو بڑھانے اور عالمی لٹیروں کے اقتدار کو ختم کرنے کے درپے ہیں " ۔

و ۔ نہ شرق نہ غرب

ایک دوسرا اصول جو اسلامی انقلاب کے نمایاں خصوصیات میں سے ہے اور اس انقلاب کو دنیا کے تمام دوسرے انقلابات سے ممتاز بناتا ہے وہ مشرقی و مغربی بلاک سے وابستہ نہ ہونا ہے ۔ دنیا میں جہاں کہیں انقلاب آتا تھا اس کے پیچھے دو بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا ۔ اگر کوئی ملک کسی ایک بڑی طاقت سے دامن چھڑاتا تھا تو دوسری طاقت کے سایہ میں پناہ لیتا تھا ۔ لیکن اس آسمان تلے وہ واحد ملک ہے جس نے اپنا انقلاب ، استقلال کی بنیاد پر برپا کیا ہے اور انقلاب و جنگ کے دس سالہ مشکلات کو مشرق و مغرب پر بھروسہ کئے بغیر حل کیا ہے ۔ اسلامی جمہوریہ ایران کا مقدس نظام ہے ۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہم نے یہ استقلال و آزادی حاصل کرنے کے لئے بہت بھاری قیمت ادا کی ہے مادی و مالی نقصانات کے علاوہ جن کی مقدار بھی کچھ کم نہیں ہے ہزاروں ایسے پاک دل و فرشتہ صفت جوانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے جو راتیں اپنے معبود سے راز و نیاز میں گزارتے تھے اور دن کو میدان جنگ میں شجاعت و دلیری کے بے نظیر جوہر دکھاتے تھے ۔ انہوں نے اپنے خون سے اس استقلال و آزادی کی عمارت تعمیر کی ہے ، ہماری قوم نے اس کی خاطر ہی فوجی حملہ ، سیاسی دباؤ ، اقتصادی ناکہ بندی اور نفسیاتی و نشریاتی یلغار برداشت کی ہے لیکن استقلال و آزادی وہ گراں بہا گوہر ہے جس کی خاطر بڑی سے بڑی مشکل برداشت کی جا سکتی ہے ۔ اس کی شیرینی ان تمام مشکلات کی تلخیوں کو حلاوت میں بدل دیتی ہے ۔ اور ایک اہم نکتہ جس سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے یہ ہے کہ ایران نے اپنے اس عمل سے دنیا کے تمام ملکوں کے لئے استقلال و آزادی کا ایک بہترین تجربہ فراہم کر دیا ہے ۔ اس الٰہی تحریک کی حیات بخش نسیم بڑی طاقتوں کے پنجوں میں اسیر ملکوں میں پہنچ چکی ہے اور اسلامی انقلاب کی

برکت سے ان میں بھی آزادی کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے ۔

افغانستان کے مسلمانوں کی دلیرانہ دفاعی تحریک ، مقبوضہ فلسطین میں مسلمانوں کا دنداں شکن مقابلہ ، امریکہ ، فرانس اور اسرائیل کو لبنان کے بہادر عوام کا ناقابل فراموش سبق اور دنیا کے دوسرے حصوں میں ابھرتی ہوئی تحریکیں ، یہ سب اس اسلامی انقلاب کے اثرات ہیں جس نے دنیا کو مشرق و مغرب کی غلامی سے آزاد ہو کر آزاد و مستقل زندگی بسر کرنے کا سبق دیا ہے اور یہ سب کچھ خدا کی برکت اور امام خمینی کے اعلیٰ افکار کا نتیجہ ہے ۔ یہ امام خمینی کے نظریات میں تھے جس نے مشرق و مغرب کی ہوابگاڑ دی ہم سب ایران میں امریکہ کی ذلت و خواری اور افغانستان میں روس کی شکست و رسوائی کے شاہد ہیں ۔ اس سلسلہ میں امام خمینیؒ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں :

" ہمارا نہ شرقی نہ غربی کا نعرہ بھوکوں اور مستضعفوں کی دنیا میں اسلامی انقلاب کا اصولی نعرہ ہے ۔ یہ نعرہ اسلامی ممالک اور ان تمام ممالک کی ناوابستہ سیاست کو مشخص کرتا ہے جو انشاء اللہ مستقبل قریب میں اسلام کو ، بشریت کے تنہا نجات دہندہ مکتب کی حیثیت سے اپنائیں گے ۔ اس سیاست سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا " (۱)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :

" جب تک میں ہوں حکومت لبرل عناصر کے ہاتھوں میں نہیں جانے دوں گا جب تک میں ہوں منافقین کو ان بے پناہ عوام کے اسلام کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا ۔ جب تک میں ہوں " نہ شرقی نہ غربی " کے اصول سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا ۔ جب تک میں ہوں امریکہ اور روس کے ہاتھوں کو ہر میدان میں قلم کرتا رہوں گا ۔ " (۲)

اپنے وصیت نامہ میں اقوام عالم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

میں اس موقع پر دنیا کی شریف و مظلوم قوموں اور ایران کے عزیز ملت کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ پورے عزم و ثبات کے ساتھ اس الٰہی صراط مستقیم پر ڈٹے رہیں جو نہ ملحد شرقی

---

۱ ۔ پیغام حج سنہ ۶۲ ھ ش ۲ ۔ ۳ / ۱۲ / ۶۷ ش

سے وابستہ ہے اور نہ کافر و ستمگر مغرب سے، بلکہ یہ وہ راستہ ہے جو خداوند عالم نے انہیں دکھایا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس نعمت کا شکرانہ بجالانے سے غفلت نہ برتیں اور بڑی طاقتوں کے اغوا کے ناپاک ہاتھ چاہے وہ بیرونی ایجنٹ ہوں یا ان سے بدتر داخلی ایجنٹ، ان کی پاک اور خالص نیت میں تزلزل اور آہنی ارادہ میں رخنہ پیدا نہ کرنے پائیں۔

حضرت امام خمینی کے ان بیانات و ارشادات کے سلسلہ میں ان آیات سے استدلال کیا جا سکتا ہے جن میں خدا عوام کو الٰہی صراط مستقیم پر چلنے، مسلمانوں پر کفار کے اقتدار کو قبول نہ کرنے اور حقیقی و واقعی استقلال و آزادی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (۱)

یہی میرا سیدھا راستہ ہے اور اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا کر تتر بتر کر دیں گے۔ یہ تمہارے رب کی ہدایت ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے زمین پر ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے پاس کچھ آڑی ترچھی لکیریں بھی کھینچیں۔ اس کے بعد فرمایا: یہی وہ راستہ ہے جو اسلام اور توحید کا راستہ ہے۔ دوسرے تمام راستے منحرف اور اسلام و توحید سے دور ہیں۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا (۲)

اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

چونکہ لفظ سبیل نکرہ ہے اور نفی کے بعد آیا ہے لہٰذا وہ عموم کا معنی دے گا۔ چنانچہ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ کفار کو نہ صرف منطق و استدلال بلکہ فوجی، سیاسی، ثقافتی اقتصادی مختصر یہ کہ کسی بھی عنوان سے مسلمانوں پر تسلط و غلبہ حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔

ایک دوسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کے ساتھیوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ سورہ انعام ۱۵۳ ۲۔ سورہ نساء آیت ۱۴۱

سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذلک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطئہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ" (۱)

سجدے کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ یہی اوصاف ان کے توریت میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی گویا وہ ایسی کھیتی ہیں جس نے پہلے کونپلیں نکالیں پھر ان کو تقویت دی تاکہ محکم ہو جائیں یہاں تک کہ اپنے تنے پر کھڑی ہو گئیں۔

"فاستویٰ علیٰ سوقہ" اصحاب پیغمبرؐ کے استقلال و آزادی اور ان کی عدم وابستگی کی دلیل ہے، آخر میں ہم ایک حدیث نقل کر رہے ہیں جسے شیعہ و سنی دونوں مانتے ہیں حضور فرماتے ہیں:-

الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ

اسلام ہر چیز سے بلند ہے اس پر کسی چیز کو برتری حاصل نہیں۔

۳۔ اسلامی انقلاب کے دوست

انقلاب کے بارے میں ایک دوسری بحث اپنے دوستوں کے سلسلہ میں انقلاب کا مثبت موقف ہے۔ چنانچہ کسی انقلاب کو پہچاننے کا ایک ذریعہ اس کے دوستوں اور ساتھیوں کی معرفت ہے۔ انبیائے کرامؑ اور خاص طور سے اسلام کی عالمی مقدس تحریک، ہمارے اسلامی انقلاب کے لئے بہترین نمونۂ عمل تھی۔ لہٰذا ان تحریکوں کے حامی اور پیرو ہمارے اسلامی انقلاب کے بھی سچے پیرو ہیں۔

انبیاء کی تحریکوں کے دوست اور حامی کون لوگ ہیں؟

اس کا جواب ایک جملہ میں یوں دیا جا سکتا ہے کہ: انبیاء کے طرفدار وہ حق پسند انسان ہیں جنھوں نے اپنی فطرت کی آواز پر لبیک کہی ہے اور یہ لوگ معاشرے کے ہر طبقہ میں مل سکتے ہیں

۱۔ سورہ فتح آیت ۲۹

یہ صحیح ہے کہ انبیاء کے پیرؤوں کی اکثریت محروموں اور مستضعفوں پر مشتمل ہوتی تھی کیونکہ یہ ریب طبقہ، مادیات میں غرق نہ ہونے کی وجہ سے۔ پاک وصاف فطرت کا مالک ہوتا تھا، ان کی رت کا آئینہ جاہ ومقام اور مال ودولت کے غلیظ غبار سے پاک رہتا تھا۔ وہ انبیائے عظام اور ان ے پیغام کو اپنی آرزوؤں کا آئینہ دار پاتے تھے۔ لیکن ہمارا نظریہ یہ نہیں ہے کہ مالدار طبقہ کی کوئی فرد بیاء عظام کی طرف رجحان نہیں رکھتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ "کہ انبیاء کے طرفدار صرف ریب ومحروم عوام ہی تھے اور ان کی حمایت کا سبب بھی ان کی غربت ومحرومیت تھی" فطرت کی واز کا صحیح جواب نہیں ہے۔ ہم اس طرز فکر کو مارکسی طرز فکر سے متأثر سمجھتے ہیں اور اس کا سلام سے کوئی ربط نہیں تاریخی واقعات بھی اسے غلط ثابت کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ پر فرعون ی بیوی آسیہ اور مومن آل فرعون کا ایمان، اسلام کی فداکار خاتون ملیکۃ العرب حضرت خدیجہ ور مصعب بن عمیر کا رسول اسلام پر ایمان لانا اس طبقاتی نظریہ کو غلط قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

یہ ہستیاں اپنے دور کی مالدار ترین ہستیاں تھیں اور اس وقت تک کی اپنی پوری زندگی ز ونعم میں کاٹی تھی۔ لیکن پیغمبروں کی دعوت کان تک پہنچتے ہی اپنی فطرت کی آواز پر لبیک ہتے ہوئے ان انبیاء پر ایمان لائیں۔

مذکورہ گفتگو سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ عالمی سطح پر اسلامی انقلاب کے مخاطب ور اس کے دوست وہ افراد ہیں جو پاک وصاف فطرت کے مالک ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو سخت گھٹن کے ماحول اور ظلم وتشدد کی فضا کے باوجود، شجاعت ودلیری کے ساتھ اسلامی انقلاب کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ خالد اسلامبولی جیسے مجاہد جو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی سلامی انقلاب کے سچے سپاہیوں کا نمونہ پیش کرتے ہوئے نعرے لگاتے تھے کہ اگر ہمارا دل چیروگے تو اس کے خون کے قطرہ قطرہ میں امام خمینیؒ کا عشق ہی پاؤگے۔ ان کے ملکوں کی ظالم و ستمگر حکومتوں کی نگاہ میں ان کا ناقابل معافی جرم یہی تھا کہ ان کے گھروں میں اسلامی انقلاب کے رہبر اعظم حضرت امام خمینیؒ کی کتابیں پائی جاتی تھیں۔

اسلامی انقلاب کے دوستوں کو کسی خاص ملک تک محدود نہیں مانا جا سکتا اس کے دوستوں کو اگر تلاش کرنا ہے تو سرحدوں کو توڑ کر آگے نظر دوڑانی ہوگی۔ جیسا کہ خود امام خمینیؒ اس سلسلہ میں

فرماتے ہیں :-

"اس میں شک نہیں ہے کہ یہ "اللہ اکبر" کی آواز، ہماری قوم کا وہی نعرہ ہے جس نے ایران میں شاہ کو اور بیت المقدس میں غاصبوں کو ناامید کردیا یہ وہی نعرۂ برائت کا تحقق ہے کہ ملت فلسطین نے نعرہ تکبیر کے مظاہرے کے دوران اپنے ایرانی بھائی بہنوں کے دوش بدوش قدس کی آزادی کا نعرہ بلند کیا ... اور یہ انقلاب کی ترقی کا صرف ایک نمونہ ہے، جبکہ ہمارے اسلامی انقلاب کے حامیوں کی تعداد پوری دنیا میں بڑھ رہی ہے اور ہم انھیں اپنے انقلاب کا امکانی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ وہی لوگ جو اپنے خون سے ہماری حمایت و طرفداری کے محضر پر دستخط کرتے ہیں اور جان و دل سے انقلاب کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور خدا کی مدد و نصرت سے ایک دن پوری دنیا کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیں گے" (۱)

ایک دوسرے مقام پر انقلاب کے مددگاروں کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"اگر آپ جنگی محاذوں کا معائنہ کریں تو سرمایہ دار طبقہ کا ایک شخص بھی نظر نہ آئے گا۔ محاذ پر موجود تمام افراد ان ہی محروموں اور جھونپڑوں میں رہنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں یہ انقلاب ان ہی کا ہے، دوسرے لوگ صرف تماشائی ہیں۔" (۲)

"صرف وہی لوگ آخری مرحلہ تک ہمارے ساتھ ہیں جنھوں نے فقر، محرومیت اور مظلومیت کا مزہ چکھا ہے۔ غرباء اور بے بضاعت دیندار افراد ہی انقلابوں کے حقیقی بانی ہیں۔" (۳)

اس میں شک نہیں ہے کہ ملک کے اندر تمام مومن و صالح، غریب و مستضعف عوام ہمیشہ اس انقلاب کے یار و مددگار رہے ہیں اور اس کے لئے ایثار و قربانی پیش کرتے رہے ہیں۔ یہاں کا ایثار و جانبازی ہی تھی جس نے اس آٹھ سالہ مقدس دفاع کے دوران اسلام اور اسلامی ملک کو افتخارات سے مالامال کردیا چنانچہ حضرت امام خمینیؒ اپنے الٰہی سیاسی وصیت نامہ

۱- پیغام حج ۱۳۶۷ش   ۲- تقریر ۱۱/۲/۶۲

۳- پیغام حج ۱۳۶۷ش

ہیں ان افتخارات کو شمار کرتے ہوئے ایثار و جان بازی کی پیکر خواتین کا نام لیتے ہیں جو پوری شجاعت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس انقلاب کی مدد و نصرت کے لئے شب و روز کوشاں رہی ہیں۔ اسی سلسلہ کے چند جملے ملاحظہ ہوں :۔

"ہمیں فخر ہے کہ ہماری خواتین چاہے وہ بوڑھی ہوں یا جوان، چھوٹی ہوں یا بڑی، سب کی سب جنگی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں حاضر ہیں اور مردوں کے شانہ بہ شانہ یا ان سے بہتر طریقہ سے قرآن کریم کے مقاصد اور اسلام کی سربلندی کے لئے سرگرم عمل ہیں . . . ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ عظیم المرتبت خواتین حضرت زینب علیہا السلام کے انداز میں اعلان کر رہی ہیں کہ ہم اپنی اولاد قربان کر چکے ہیں۔ خدا اور اسلام عزیز کی سربلندی کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نے ان قربانیوں کے بدلے میں جو کچھ پایا ہے وہ جنات نعیم سے بھی برتر ہے پھر اس دنیا کی ناچیز متاع کی کیا حقیقت ہے" (۱)

ہمارے اسلامی انقلاب کے حامی و ناصران ہی صفات و خصوصیات کے حامل ہیں جن سے انبیائے عظام اور پیغمبر اسلام کے دوستدار مالامال تھے۔ قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے :

وکاین من نبیّ قاتل معہ ربیّون کثیر فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحبّ الصابرین (۲)

کتنے ہی ایسے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والوں نے جہاد کیا اور خدا کی راہ میں ان پر جو جو مصیبت پڑی اس کے مقابلہ میں نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ بودا پن دکھایا اور نہ دشمن کے سامنے گڑگڑائے اور خدا ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے

خداوند عالم پیغمبر اسلامؐ کے جان نثاروں کے بارے میں فرماتا ہے :۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ترٰھم رکعًا سجدًا یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانًا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذٰلک مثلھم فی التورٰۃ ومثلھم

۱۔ وصیت نامہ امام خمینیؒ ۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۴۶

فی الانجیل کزرع اخرج شطئہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ
علیٰ سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین
آمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجراً عظیماً۔ (۱)

" محمد خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحمدل ہیں ۔ تم انھیں خدا کے سامنے سربسجود اور اس کے فضل و خوشنودی کا طالب پاؤ گے۔ سجدے کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ یہی اوصاف ان کے توریت میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی ۔ گویا وہ ایسی کھیتی ہیں جس نے پہلے کونپل نکالی پھر اس کو تقویت دی تو وہ مستحکم ہو گئی یہاں تک کہ اپنے تنہ پر کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی ۔ اور یہ اس لئے ہے کہ ان کے ذریعہ کافروں کا جی جلے ۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کئے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے "۔

اسی طرح کی دسیوں دوسری آیتیں ہیں جنھیں ہم یہاں طول کلام کے خوف سے نقل نہیں کر رہے ہیں ۔

۴ اسلامی انقلاب کے دشمن

قرآن کی نظر میں ہمیشہ " ملاء " یعنی معاشرہ پر حاکم تانا شاہ اور سیاسی طاقت کے مالک افراد اور " مترفین " یعنی عیاش سرمایہ دار ۔ یا امام خمینی کی خوبصورت تعبیر کے مطابق درد ناآشنا عیش پرست اور آرام طلب سرمایہ دار ـــــ نیز دنیا دار ضمیر فروش علماء نے انبیاء کے خلاف محاذ آرائی کی ہے ۔ اور انبیاء نیز اولیاء اللہ کے حملوں کا نشانہ بھی یہی افراد رہے ہیں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے گزشتہ دس برسوں کے ایک سرسری جائزہ سے ہی یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ہمارے انقلاب کے مقابلہ میں بھی ان ہی تین گروہوں نے بھیس بدل بدل کے صف آرائی کی ہے اور ہمارے خلاف سیاسی، معاشی، ثقافتی میدانوں میں رنگ برنگی سازشیں

۱۔ سورہ فتح آیت ۲۹

رہی ہیں۔ اگر امام خمینیؒ کی دانشمندانہ قیادت نہ ہوتی تو شاید اسلامی انقلاب کا گلا گہوارہ ہی میں گھونٹ دیا جاتا۔

جس طرح ان تینوں گروہوں سے انبیائے عظام کو شدید نفرت تھی اور انہوں نے ان سے ہرگز مفاہمت نہ کی اسی طرح امام خمینیؒ نے بھی اسلامی انقلاب کے ان دشمنوں پر بڑے کاری وار لگائے اور پورے عالم استکبار کا طلسم توڑ دیا۔

اس سلسلہ میں امام خمینیؒ کے موقف کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

"مسلمین ایک لمحے کے لئے بھی اس مقدس توحیدی آہنگ اور اسلام کی آفاقیت سے غفلت نہ برتیں۔ کیونکہ یہ یقین ہے کہ عالمی لٹیرے اور قوموں کے دشمن انقلاب کی کامیابی کے بعد سے چپ چاپ بیٹھے نہ رہیں گے۔ دھوکہ دھڑی، فریب اور حیلوں سے کام لیتے ہوئے مختلف چہروں کا سہارا لیں گے۔ نقلی مولوی، درباری ملا، بادشاہوں کے گماشتے، قوم پرست اور منافقین غلط و گمراہ کن فلسفوں، تفسیروں اور تاویلوں کا رخ کریں گے۔ وہ مسلمانوں کو نہتا بنانے نیز امت محمدیؐ کے اقتدار، ہیبت اور صلاحیت کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر طرح کی حرکت کریں گے" (۱)

"ہماری عزیز قوم جو اسلامی اقدار کی حقیقی اور سچی مجاہد ہے، اچھی طرح سمجھ چکی ہے کہ جہاد، آرام طلبی اور عیش پسندی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ دنیا کے محروم و مستضعف افراد کی آزادی و استقلال کی راہ میں جہاد و پیکار، سرمایہ داری اور عیش پسندی و آرام طلبی سے کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتا وہ جہاد و پیکار کی "ابجد" سے بھی واقف نہیں ہیں اور وہ لوگ بھی جو یہ تصور کرتے ہیں کہ درد ناآشنا عیش پرست اور سرمایہ دار، پند و نصیحت کے ذریعہ راہ راست پر آجائیں گے اور آزادی کے مجاہدوں کی صف میں شامل ہو کر ان کی مدد کریں گے ریت کی دیوار بناتے ہیں۔ جہاد اور رفاہ و سرمایہ، قیام اور آرام پسندی، آخرت طلبی اور دنیا پرستی، دو الگ الگ مقولے ہیں جو کبھی ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے" (۲)

۱۔ پیغام حج سنہ ۱۳۶۶ ھ ش ۲۔ پیغام حج سنہ ۱۳۶۷ ھ ش

امام خمینیؒ علامہ عارف حسینی کی شہادت کے موقع پر فرماتے ہیں :-

"احساس ذمہ داری رکھنے والے اسلامی علماء اور نقلی ملاؤں کے درمیان سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مجاہد اسلامی علماء ہمیشہ عالمی لٹیروں کے زہریلے تیروں کا نشانہ بنے رہے ہیں ... لیکن نقلی ملا، دنیا طلب مذہب پرستوں کے زیر سایہ۔ باطل کی ترویج۔ ظالموں کی مدح سرائی اور ان کی تائید و توثیق کرتے رہے ہیں"۔ (۱)

یقیناً ہمارے یہ دشمن جب تک ہمیں ہمارے اسلامی تشخص سے بیگانہ نہ بنالیں گے نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہمیشہ ہوشیار و بیدار رہنا چاہیئے اور تمام سازشوں کو ابتدا ہی میں کچل دینا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہمارے اسلامی نظام کے مخالفوں کی جڑیں تاریخ میں بڑی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام اور اسلامی جمہوریہ کی مخالفت کا راستہ وہی انبیاء اور الٰہی پیغمبروں کی مخالفت کا راستہ ہے جس کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اشارہ ہوا ہے۔

"وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون"۔ (۲)

ہم نے جب بھی کسی دیار میں عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بھیجا تو اس بستی کے ناز و نعم میں پلنے والوں نے کہا کہ ہم تمہاری رسالت کے منکر ہیں۔

وقال الملاء من قومہ الذین کفروا وکذبوا بلقاء الآخرۃ واترفناھم فی الحیوۃ الدنیا ما ھذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منہ ویشرب مما تشربون ولئن اطعتم بشراً مثلکم انکم اذاً لخاسرون (۳)

ان کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا، وہ کہنے لگے یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر تم ہی جیسا ایک بشر،

۱۔ محرم ۱۴۰۹ھ ش   ۲ سورہ سبا آیت ۳۴

۳۔ سورہ مومنون آیت ۳۳-۳۴

جو کچھ تم کھاتے ہو ــــــــــ وہی یہ کھاتا ہے، جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کرلی تو تم گھاٹے میں ہی رہو گے۔"

اِنَّ کَثِیراً مِنَ الاحبار والرّھبان لَیَاْکلونَ اَموال النّاس بالباطل وَیَصدّون عَن سَبیلِ اللّٰہِ ط (۱)

"اہل کتاب کے اکثر علماء اور راہب لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

یہاں بہت مناسب معلوم ہوتا کہ ایک اشارہ ان جانے پہچانے دشمنوں کی طرف بھی کردیا جائے جو بے نقاب ہو کر کھلم کھلا ہمارے مقابلہ میں آئے ہیں اور اسلامی انقلاب کے خلاف ایک منحوس متحدہ محاذ تشکیل دے کر اس کے خلاف کسی بھی جرم و خیانت سے گریز نہیں کیا ہے اس سے آپ کو ان کی دشمنی کی گہرائیوں کا اندازہ ہوگا کہ انہوں نے کس طرح سے بے پناہ سیاسی اقتصادی، فوجی، ثقافتی اور نشریاتی مشکلیں کھڑی کرکے انقلاب کے سیل رواں کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ یہیں آپ اسلامی انقلاب کے کینہ پرور دشمنوں کے تئیں امام اور امامت کے شجاعانہ موقف اور قرآن مجید میں اس کی جڑوں سے بھی آشنا ہوں گے۔

الف: امریکہ کی قیادت میں استکبار کی عداوت

ہمارے اسلامی انقلاب اور عالمی استکبار کے درمیان پایا جانے والا تضاد کوئی سیاسی تضاد نہیں ہے جسے ڈپلومیٹک طریقے سے برطرف کیا جاسکے، اس تضاد کی جڑیں ہمارے الٰہی تصور کائنات کی گہرائیوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلاب نے نہ کبھی استکبار سے مفاہمت کی ہے اور نہ کبھی مفاہمت کرے گا۔ اسلامی انقلاب، عالمی استکبار سے نبرد آزما ہے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی ــــــــــ جب تک مشرقی و مغربی استکبار کے سرغنہ اپنی استکباری روش سے دست بردار نہیں ہو جاتے اور انسانی رویہ

۱۔ سورہ توبہ آیت ۳۴

نہیں اپناتے اور بظاہر یہ محال ہی معلوم ہوتا ہے۔

اسلامی انقلاب کے دشمنوں میں شاید امریکہ اور روس نے بنیادی کردار ادا کیا ہے خاص طور سے امریکہ جسے ہمارے عظیم المرتبت قائد امام خمینیؒ نے "شیطان بزرگ" کے لقب سے نوازا ہے امریکہ بعض مسائل میں روس کو بھی فریب دے دیتا ہے۔

جس طرح تمام اولوا العزم پیغمبر، کفر و شرک و استکبار کے سرغنوں کے خلاف جہاد کرنے پر مامور تھے اور اس راہ میں ان لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں یوں ہی امام خمینیؒ نے بھی عالمی استکبار کے خلاف جہاد کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو بنحو احسن پورا کیا اور دنیا کو قاطعیت، ثبات قدم نیز دشمن سے ساز باز نہ کرنے کا ناقابل فراموش سبق دیا۔ آیئے اس سلسلہ میں امام خمینیؒ کے کچھ بیانات پر ایک نظر ڈالیں:-

"میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اسلام بڑی طاقتوں کی ناک رگڑ دے گا" (۱)

"میں پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اگر عالمی لٹیرے ہمارے دین کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو ہم ان کی دنیا کو نقصان پہنچائیں گے اور ان سب کی نابودی تک چین سے نہ بیٹھیں گے۔" (۲)

"ہمیں چاہیئے کہ مغرب اور جارح مشرق کو خاطر میں لائے بغیر اور دنیا پر حاکم ڈپلومیسی کو نظرانداز کر کے اسلام کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کرنا چاہیئے" (۳)

"ہم دنیا میں صہیونزم، کمیونزم اور کیپٹلزم کی جڑیں خشک کرنا چاہتے ہیں" (۴)

"ہم اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک امریکہ کے خلاف جہاد کرتے رہیں گے اور جب تک اسے ٹھکانے نہ لگالیں اور علاقہ کو اس کی دسترس سے محفوظ نہ کریں..... خاموش نہ بیٹھیں گے" (۵)

"ہماری نگاہ میں جارح مشرق اور مجرم مغرب میں کوئی فرق نہیں ہے، ہم لڑیں گے اور

۱۔ پیغام حج ۱۳۶۶ ش
۲۔ پیغام حج ۱۳۶۶ ش
۳۔ ۱۲/۲/۶۷ ش
۴۔ ۱۳۶۶ ش
۵۔ ۲۰/۱۲/۵۸ ش

چونکہ حق کامیاب ہے اہم بھی کامیاب ہوں گے ۔" (۱)

"میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ صرف مسلمانوں کے کعبہ ہی سے نہیں بلکہ دنیا کے کلیساؤں سے بھی امریکہ مردہ باد اور روس مردہ باد کے نعرے بلند ہوں ۔" (۲)

"ہم اپنے تمام وجود سے امریکی کارگزاروں کی خراج طلبی کے تحفظ اور پھیلاؤ کی روک تھام کریں گے ، اگر ہمیں اس کے لئے طاقت کا استعمال بھی کرنا پڑے تو ہم اس سے بھی گریز نہ کریں گے۔" (۳)

امام خمینی کی تقریروں اور پیغامات میں سیکڑوں ایسے ہدایات اور دستور العمل مل سکتے ہیں جن سے اس صدی کے ام الفساد ، شیطان بزرگ ، دنیا کو ہڑپنے والے امریکہ کی سرکردگی میں استکبار سے امام خمینیؒ کی دیرینہ نفرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ امام خمینیؒ کے نقطۂ نظر سے دنیا کے تمام محروموں اور حریت پسندوں کی نجات کا واحد راستہ استکبار اور اس کے ایجنٹوں کے خلاف مسلح جہاد اور عام لام بندی ہے اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے امام خمینیؒ کا یہ سخت رویہ ہماری آسمانی کتاب قرآن اور الٰہی تصور کائنات کا آئینہ دار ہے مثال کے طور پر چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ۔ (۴)

مستکبروں نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم اس کے منکر ہیں ۔

تمام پیغمبروں اور مصلحوں کے مقابلہ میں مستکبروں نے ہمیشہ یہی کہا ہے ۔ کہہ رہے ہیں اور کہتے رہیں گے ۔ ہمارا اسلامی انقلاب بھی اس تاریخی حقیقت سے مستثنیٰ ہے نہ ہوگا ۔ کفر و شرک و استکبار کی طاقتیں جب تک اسلامی قوموں کو ان کے الٰہی اسلامی ، دینی تشخص و ماہیت سے بیگانہ نہ بنا لیں گی چین سے نہ بیٹھیں گی ۔ چنانچہ قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا " (۵)

وہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے تاکہ اگر ہو سکے تو تمہیں اس دین سے پٹا لے جائیں گے ۔

---

۱ ۔ یرغمالیوں کے سلسلہ میں پیغام ۱۳۵۸ ش ۲ ۔ پیغام حج ۱۳۶۷ ش

۳ ۔ پیغام حج ۱۳۶۷ ش ۴ ۔ سورہ اعراف آیت ۷۶

۵ ۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۷

اور جیسا ہم نے عرض کیا نجات کا واحد راستہ، استکبار اور اس کے گماشتوں کا ڈٹ کر مقابلہ اور اعلانیہ جہاد ہے۔

"فقاتلوا ائمة الكفر انهم لا ایمان لهم لعلهم ینتهون" (۱)

کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو، کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں، شاید وہ باز آجائیں۔

ب: اسرائیل اور صہیونزم

غاصب اسرائیل اور اس کی پشت پناہ صہیونیت، ہمارے تاریخی دشمنوں میں سے ہیں چنانچہ امام خمینیؒ نے اپنی تحریک کے ابتدائی دنوں ہی سے مسلمین عالم کو اس خطرہ سے متنبہ کیا ہے قرآن اور بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کی درخشاں تاریخ سے جو بات ہاتھ آتی ہے وہ یہ کہ یہود اور بنی اسرائیل کی ایک نسل ابتدا ہی سے روئے زمین پر فتنہ و فساد، قتل و غارت میں ملوث رہی ہے۔ ان کے ہاتھ انبیائے الٰہی کے خون ناحق سے رنگین ہیں وہ خدا کے صالح بندوں کو آزار پہنچانے میں پیش پیش رہے ہیں ان کی سنگدلی اور شقی القلبی پر قرآن گواہ ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی تحریک کے دوران بھی سب سے زیادہ مشکلیں اسی فاسد اور منحرف فرقہ نے پیدا کیں۔ بدترین افواہیں پھیلائیں، لوگوں کو اسلام کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بنی نضیر، بنی قریظہ بنی قینقاع کے یہودیوں نے رسول اسلامؐ کے خلاف ہر قسم کے ہتھکنڈے اپنائے اور آپ کو اذیت دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اسی گروہ کی آتش افروزی سے پہنچا ہے۔

ادیان الٰہی خاص طور سے اسلام کے خلاف یہودیوں کے گھناؤنے جرائم کا احصاء کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔ جنھیں اس مختصر مقالہ میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔

۵ رجب ۶۳ھ کو شروع ہونے والی یہ اسلامی تحریک اور اس کی قیادت شاہ اور اس کی گماشتوں کے جرائم کا پردہ چاک کرنے کے ساتھ ساتھ اسرائیل کے خطرہ سے بھی دنیا کو آگاہ کرتی رہی ہے۔ اور اس میں شک نہیں ہے کہ اسرائیل اور صہیونیوں سے امام خمینیؒ کی یہ شدید نفرت آپ کے

۱۔ سورہ توبہ آیت ۱۲

الہٰی طرزِ فکر کی آئینہ دار ہے جب ہی آپ فرماتے ہیں "اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیئے"۔ ہم یہاں اس سے متعلق امام خمینیؒ کے بیانات سے چند نمونہ پیش کر رہے ہیں کہ جن سے بخوبی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ امام خمینیؒ کو اسلام، مسلمانوں، مسلمان ملکوں اور خاص طور سے فلسطینی و لبنانی مظلوم عوام کے سخت ترین دشمن سے کتنی دشمنی ہے :-

"میں برسوں سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسرائیل اور اس کے جرائم سے مسلمانوں کو باخبر کرتا آرہا ہوں کہ یہ (اسرائیل) کینسر کا ایک غدہ ہے" (۱)

مدرسۂ فیضیہ میں آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

"اسرائیل نہیں چاہتا کہ اس ملک میں قرآن رہے، اسرائیل نہیں چاہتا کہ اس ملک میں علمائے اسلام رہیں، اسرائیل نہیں چاہتا کہ اس ملک میں اسلامی احکام نافذ ہوں" (۲)

"میں تمام اسلامی ملکوں اور مسلمانوں کو باخبر کرتا ہوں کہ محترم شیعہ قوم، اسرائیل اور اس کے گماشتوں سے متنفر ہے وہ اسرائیل سے سمجھوتہ کرنے والی حکومتوں سے بھی متنفر و بیزار ہے" (۳)

۱۵ خرداد کی سالگرہ کے موقع پر آپ نے فرمایا :-

"میں اسرائیل کی آزادی اور اسے تسلیم کئے جانے کے منصوبہ کو مسلمانوں کے لئے ایک المیہ اور اسلامی ملکوں کے لئے خودکشی سمجھتا ہوں اور اس کی مخالفت کو ایک عظیم شرعی فریضہ جانتا ہوں" (۴)

اپنے پیغام حج میں اسلامی حکومت کے ذمہ داروں، عوام اور دنیا کی قوموں کو خطاب کر کے فرمایا :-

"مملکت ایران کے معزز حکام، ہمارے عوام اور اسلامی قومیں، اس خبیث درخت کی جڑیں کاٹنے کی جدوجہد سے دست بردار نہیں ہوں گی۔ اللہ کی نصرت کے سہارے اسلام کے پیروؤں کے بکھرے قطروں یا امت محمدؐ کی معنوی طاقت اور اسلامی ملکوں کے وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور پوری دنیا میں حزب اللہ کے دفاعی مراکز قائم کر کے اسرائیل کو اپنے گزشتہ جرائم سے پشیمان

۱۔ جنوب لبنان کے شیعوں کے مجمع میں تقریر ۲/۱۳/۵۹ ۲۔ ۱۳/۳/۴۳

۳۔ نہضت امام خمینی ص ۶۹۲ ۲۱/۱/۴۳ ۴۔ ۱۵/۳/۶۱

کر دینا چاہیئے اور اس کے چنگل سے مسلمانوں کے غصب شدہ علاقوں کو نکال لینا چاہیئے "(۱)

امام خمینیؒ کے ان تابناک اور نورانی افکار کی جڑیں بھی قرآن کی حیات آفریں آیتوں میں ملیں گی۔ چند آیتیں ملاحظہ ہوں:۔

لتجدن اشد الناس عداوة للذین آمنوا الیهود والذین اشرکوا (۲)

تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے سخت یہود اور مشرکین کو پاؤگے۔

ثم قست قلوبکم من بعد ذٰلك فهی کالحجارة او اشد قسوة (۳)

"آخر کار تمہارے دل سخت ہوگئے یہ سختی پتھر کے مانند ہے بلکہ سختی میں کچھ اس سے بھی زیادہ"

ایک دوسری آیت میں خداوند عالم نے ان کے ہاتھوں پیغمبران خداؑ کے قتل پر سے پردہ اٹھایا ہے۔

وضربت علیهم الذلة والمسکنة وباءو بغضب من الله ذٰلك بانهم کانوا یکفرون بآیات الله ویقتلون النبیین بغیر الحق ذٰلك بما عصوا وکانوا یعتدون۔ (۴)

"ذلت وخواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور حدود الٰہی سے تجاوز و سرکشی کا نتیجہ تھا"۔

یہ یہودیوں اور بنی اسرائیل کے جرائم کا ایک گوشہ تھا جس کے نتیجہ میں وہ مختلف مصیبتوں میں گرفتار ہوئے۔ ہم اس فصل کو یہیں ختم کرتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ فلسطین و لبنان کے عوام امام خمینیؒ کے ہدایات کے سایہ میں جلد از جلد غاصب اسرائیل اور خون آشام صہیونیت کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔

۱۔ پیغام حج ۱۳۶۶ ھ ش
۲۔ مائدہ آیت ۸۲
۳۔ سورہ بقرہ آیت ۷۴
۴۔ سورہ بقرہ آیت ۶۱

ج: منافقین

اس عظیم الشان اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آزاد سیاسی فضا نے، ملک بھر میں مختلف سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کے ابھرنے کے لئے زمین ہموار کر دی۔ ان پارٹیوں نے تہران اور دیگر شہروں میں اپنے دفاتر قائم کرنے کے بعد اپنی تنظیمی سرگرمی اور ممبر سازی کی مہم شروع کر دی۔ فطری طور پر انقلاب کے آغاز میں نوبنیاد اسلامی نظام نے بھی ان کی سرگرمیوں کی مخالفت نہیں کی اور شاید ذمہ داران مملکت کو انقلاب اس کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ لیکن جس چیز کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ تھا کہ انقلاب کی قیادت اور انقلابی عوام کو ان گروہوں سے بنیادی اختلاف تھا جو اپنے کو عوام کی صف میں چھپائے ہوئے موقع کی تاک میں تھے کہ فرصت ملتے ہی اپنے پہلے سے تیار شدہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنائیں۔ عوام اور اسلامی نظام کو ان گروہوں سے سب سے بڑا اختلاف یہ تھا کہ یہ لوگ بنیادی طور پر اسلام ہی کے مخالف تھے۔ ان گروہوں کو بھی شروع ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس انقلاب کے ساتھ زیادہ دن تک نہیں چل سکتے اسی لئے انہوں نے اپنے اخبارات اور شب ناموں (خفیہ نشریات) میں مختلف بہانوں سے انقلاب کی مخالفت شروع کر دی اور اسلامی حکومت کی راہ میں روڑے اٹکانے لگے۔ اسلامی انقلاب کے قائدین اور شاید عوام بھی اس نتیجہ پر پہلے ہی پہنچ چکے تھے کہ یہ پارٹیاں ایک نہ ایک دن انقلاب اور عوام کے خلاف صف آرائی ضرور کریں گی اور ایسا ہی ہوا بھی۔

ایک اجمالی جائزہ کے ذریعہ ان پارٹیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱ـــــ وہ گروہ جس نے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے ابتدائی دنوں میں فوجی چھاؤنیوں پر حملہ کے دوران اسلحہ لوٹا اور انہیں عوام کی نگاہ سے بچا کر کسی دور دراز مقام پر چھپا دیا حتیٰ مملکت کے ذمہ داروں کے حکم کے باوجود ان لوگوں نے اپنے اسلحے واپس نہیں کئے۔

۲ـــــ کچھ وہ بزدل افراد تھے جن میں اس وقت اسلحہ لوٹنے کی بھی جرأت نہ تھی۔ وہ صرف اپنے سیاسی تبصروں کے ذریعہ دشمن کو مدد پہنچاتے تھے لیکن یہ دونوں ہی گروہ اسلامی انقلاب کو ناکام بنانے کے سلسلہ میں متفق تھے۔

"کوملہ" "ڈیموکریٹ" اور "فدائیان خلق (اقلیت)" جیسے آتش افروز اور خدا دشمن گروہ گنبد، کردستان اور سیستان و بلوچستان وغیرہ میں عوام کے خون کی ہولی کھیلنے میں مشغول تھے۔ نیز منافقین کی خونخوار وسفاک ٹولی نے تہران اور دیگر شہروں کے بے گناہ عوام کو اپنے اسلحوں کا نشانہ بنایا۔ سڑکوں اور گھروں میں بموں کے دھماکے کرکے بے گناہ عوام کے خون میں اپنے ہاتھ کہنیوں تک رنگین کر لئے۔

جو لوگ دور سے بیٹھے بیٹھے اس آگ کو ہوا دے رہے تھے وہ بھی مختلف طریقوں سے ان منافقوں کی اعلانیہ تائید وحمایت کرنے لگے۔ امریکی جاسوسی اڈے سے ان لوگوں کی امریکہ نوازی اور اغیار کی غلامی دستاویزیں ہاتھ آچکی ہیں اور ان میں سے بعض کو ان کے کالے کرتوت کی سزا بھی مل چکی ہے۔

انقلاب اور جنگ کے دس سالہ دور میں، کوملہ، ڈیموکریٹ، منافقین، فدائیان (اقلیت اکثریت) جیسے دہشت گرد اور دشمنان خدا و رسولؐ ٹولوں نیز احمق و نادان لبرلوں، غیروں کے لئے جاسوسی کرنے والی "تودہ پارٹی" اور مشرق و مغرب سے وابستہ دوسرے سیاست باز گروہوں کے کردار کے سلسلے میں ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی مختلف سازشیں نہ صرف مسلمان عوام کی آہنی صفوں میں کوئی شگاف نہ ڈال سکیں بلکہ آج ایران کی مسلمان قوم پورے احساس قوت کے ساتھ ایران اور پوری دنیا میں ان سفاکوں کی شکست و رسوائی کا نظارہ کر رہی ہے۔

انقلاب کے جانے پہچانے اور انجانے دشمنوں میں شاید منافقین کی درندگی و سفاکی کی مثال نہ مل سکے۔ انقلاب کے ابتدائی دس برسوں میں ان درندوں نے ایسے ایسے بھیانک جرائم کئے ہیں جنھیں بیان کرنے سے قلم کو شرم آتی ہے۔ محراب عبادت میں علماء کا قتل، جمہوری اسلامی پارٹی کے دفتر میں بم کا دھماکہ، بہشتی، مطہری، مفتح، رجائی، باہنر، قدوسی، ہاشمی نژاد اور دیگر اسلامی مفکروں کی شہادت، تہران کی سڑکوں پر بموں کے دھماکے، اللہ کے پرستاروں کا قتل عام، مسافروں سے بھری ہوئی بسوں میں دھماکے، افطار کرتے ہوئے روزہ دار خاندانوں کا بے دردی سے قتل، پاسداروں کی لاش کا مثلہ کیا جانا، ان کی زندگی میں ان کے بدن سے کھال کھینچ لینا وغیرہ ان درندہ صفت منافقوں کے کالے کرتوت کا ایک سرسری جائزہ ہے۔

آج یہ منافقین امریکہ سے اپنے جرائم کا بھاری انعام لے کر صدام کے لئے جاسوسی کرنے کم سن لڑکوں لڑکیوں کو فریب دینے اور فسق و فجور نیز بدکاری و عیاشی میں مشغول ہیں ۔ اور اپنی ذلت بار زندگی کے آخری دن گن رہے ہیں۔

اس طویل مقدمہ کے بعد اب آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ انقلاب کی قیادت اور منافقوں کے ہاتھوں دکھا اٹھائی ہوئی یہ قوم ان منافقوں سے اتنی متنفر کیوں ہے ۔ بے شک منافقوں سے دشمنی کی جڑیں اسلامی نظام کے طرفداروں کے افکار و نظریات اور ان کے تصور کائنات سے تعلق رکھتی ہیں ۔ جو خود ایک علیحدہ مفصل بحث ہے ۔

ہم یہاں اس سلسلہ کی قرآنی آیتوں کو پیش کرنے سے پہلے اپنے عظیم قائد کے چند ارشادات پیش کر رہے ہیں جنھوں نے اپنی الٰہی بصیرت کے ذریعہ ہر شخص سے پہلے ان منافقوں کی چھپی ہوئی پلید ماہیت کو بھانپ لیا ۔ چنانچہ آپ نے ایک موقع پر فرمایا کہ جب یہ لوگ نجف میں میرے پاس آئے تو میرے سامنے نہج البلاغہ پڑھتے تھے اور میں سنتا رہتا تھا ۔ یہیں سے مجھے ان کی حقیقت کا احساس ہو گیا ان لوگوں نے لاکھ کوشش کی کہ میں ان کی حمایت کروں لیکن میں نے ان کی تائید نہیں کی یہاں تک کہ اپنے دوستوں کی سفارشوں کی بھی پرواہ نہیں کی ۔ اب امام کے چند دل نشین و دشمن شکن ارشادات ملاحظہ فرمایئے تاکہ اسلامی انقلاب کے اس دشمن کی خیانتوں کا اندازہ ہو سکے ۔

" ایران کی شریف قوم کو یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ ان سیاہ بخت منافقوں اور ان کے ساتھیوں نے جرائم و رذالت میں دنیا کے تمام پست و ذلیل مجرموں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے میں نہیں سمجھتا کہ آپ دنیا میں کوئی ایک ایسا گروہ یا جماعت تلاش کر سکتے ہیں جن کی فرومایگی و جرائم ان منافقوں کے جرائم و فرومایگی کے برابر ہوں " (۱)

" آج ہم جس مصیبت سے دوچار ہیں وہ منافقوں کا وہ گروہ ہے جو اسلام کا نام لیتا ہے لیکن اسلام کی کمر توڑنے کے درپے ہے ۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کا کام مشکل ہے ، ان کے مسئلہ کا حل

۱۔ صحیفہ نور جلد ۱۷ ص ۱۲ ۱۷ / ۶ / ۶۱ ھش

بہت مشکل ہے۔ اسلام اپنی پیدائش کے ابتدائی دنوں ہی سے اس گروہ کے ہاتھوں مصیبتوں میں مبتلا ہے" (۱)

"اے شیطان زادو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ اے بین الاقوامی خود فروختہ مجرمو شرم کرو... تمہارا اور تمہارے حامیوں کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تم نہ اسلام اور اس کی معنوی طاقت سے واقف ہو اور نہ ہی ایران کی مسلمان قوم اور اس کے ایثار سے آگاہ ہو" (۲)

اب قرآن مجید کی چند آیتیں ملاحظہ ہوں تاکہ منافقین کے بارے میں امام خمینیؒ کے ارشادات کا قرآنی سرچشمہ معلوم ہو سکے:

ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیٰوۃ الدنیا ویشہد اللہ علیٰ
ما فی قلبہ وھو الد الخصام واذا تولّیٰ سعیٰ فی الارض لیفسد
فیھا ویھلک الحرث والنسل واللہ لا یحب الفساد (۳)

"لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم دیتی ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ بدترین دشمن ہیں۔ جب وہ منہ موڑتے ہیں (یعنی تمہاری بزم سے خارج ہوتے ہیں) تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائیں کھیتوں کو غارت کریں اور نسل انسانی کو تباہ کریں۔ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

ھم العدو فاحذرھم قاتلھم اللہ انّیٰ یؤفکون (۴)

"یہ (منافقین) آپ کے پکے دشمن ہیں۔ ان سے بچ کر رہیئے۔ اللہ کی مار ان پر یہ کیسے حق سے منحرف ہوئے ہیں۔"

خدا اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے فرماتا ہے:-

یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم و

۱۔ صحیفہ نور جلد ۱۰ ص ۲۸۶ ۲۔ صحیفہ نور جلد ۱۵ ص ۵۱
۳ سورہ بقرہ آیات ۲۰۴ ۔ ۲۰۵ ۴۔ سورہ منافقین آیت ۴

ماواٰھم جہنم و بئس المصیر - (۱)

اے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیے۔ آخرکار ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

یہ اور اس طرح کی دیگر آیتیں اسلامی معاشرہ کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اس فاسد و مفسد گروہ سے ہرگز غافل نہ ہوں اور یقین جانیں کہ وہ لوگ اپنی دشمنی پر باقی ہیں۔

۵۔ اسلامی انقلاب کا مستقبل

قرآن مجید نے معاشروں کے مستقبل اور ان کی سرنوشت کے بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ گفتگو کی ہے اس سلسلہ کی بے شمار آیتوں سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ مادی سوچ رکھتے ہیں کائنات کو صرف اسی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں اور اپنے تنگ نظر، محدود اور مادی افکار کی بنیاد پر انسان و کائنات کی تفسیر کرتے ہیں اور اس دنیا کے بعد کسی دنیا پر یقین نہیں رکھتے ان کے نظریات کے برخلاف الٰہی بانیات اسلام کے عطا کردہ تصور کائنات کی بنیاد پر نہ صرف اپنے مستقبل کو تاریک نہیں سمجھتے بلکہ ان کا ایمان ہے کہ مستقبل میں بھی وہ کامیاب و کامراں ہوں گے۔ وہ اپنی سعی و کوشش میں روشن مستقبل کی امید رکھتے ہیں خدا کی لازوال طاقت کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں مشکلات و مصائب میں ہراساں نہیں ہوتے۔ انبیائے الٰہی نے ان ہی افکار کے سہارے اپنے دور کے طاغوتوں سے جہاد کیا ہے اور تن تنہا اس وقت کی طاقتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ مرسل اعظمؐ نے لوگوں کے دلوں میں پرامید مستقبل کی شمع روشن کی ہے خندق میں ایک پتھر سے اٹھنے والی چنگاری دیکھ کر قیصر و کسریٰ پر فتح و غلبہ کی خوش خبری سنائی اور مکہ و مدینہ کے مسلمانوں کو فتح عظیم کی بشارت دی اور شرک و بت پرستی کے تمام مظاہر پر اسلام کے غلبہ کا اعلان کیا ہے۔

ہمارے دور میں پیغمبرؐ و علیؑ کی نسل کی ایک عظیم فرد خمینیؒ نے اسی مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر خمینی یکہ و تنہا رہ جائے پھر بھی کفر و ظلم، شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد

---

(۱) سورہ توبہ آیت ۷۳

کے راستہ پر گامزن رہے گا۔ یہاں ملاحظہ فرمائیے۔ اسلامی انقلاب کے مستقبل کے بارے میں ہمارے عظیم المرتبت قائد کے اعلیٰ افکار کے چند نمونے :۔

" ہم مشرکوں سے برائت کا اعلان کر کے اسلامی دنیا کی جمع شدہ توانائی آزاد کرانے کا ارادہ رکھتے تھے اور رکھتے ہیں اور خداوند عالم کی نصرت سے فرزندان قرآن کے ہاتھوں یہ کام ایک دن انجام پا کر رہے گا۔"(۱)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :

" اے دنیا کے مسلمانو! اے ستمگروں کے پنجہ میں اسیر مستضعفو! اٹھو ایک دوسرے سے متحد ہو کر اسلام اور اپنے مقدرات کا دفاع کرو۔ طاقت وروں کے شور شرابہ سے مت ڈرو کیونکہ خداوند قادر کی مشیت سے یہ صدی، مستکبروں پر مستضعفوں اور باطل پر حق کے غلبہ کی صدی ہے"(۲)

" میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اسلام، بڑی طاقتوں کو ناک رگڑوا دے گا، اسلام اندرونی و بیرونی رکاوٹوں کو یکے بعد دیگرے نابود کر کے دنیا کے کلیدی مورچوں کو فتح کرے گا۔"(۳)

" تمام چھوٹی بڑی طاقتیں یہ جان لیں کہ ہم اللہ کا نام اونچا کرنے کے لئے آخری قطرۂ خون آخری شخص اور آخری منزل تک ڈٹے رہیں گے اور ان تمام طاقتوں کی مرضی کے خلاف، دنیا کے اکثر ملکوں میں مشرق و مغرب سے آزاد حکومت کی بنیاد رکھیں گے۔"(۴)

امام خمینی کے ارشادات کے چند نمونے پیش کرنے کے بعد ہم قرآن مجید میں اس کی تلاش کرتے ہیں :۔

الف : صالحین زمین کے وارث ہوں گے

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون۔ (۵)

۱۔ منشور انقلاب۔ پیغام حج سنہ ۱۳۶۶ ھ ش — ۲۔ پیغام حج۔ سنہ ۱۳۶۰ ھ ش

۳۔ پیغام حج سنہ ۱۳۶۶ ھ ش — ۴۔ ۱۶/۱۱/۶۵

۵۔ سورہ انبیاء آیت ۱۰۵

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ لکھ دیا کہ ہمارے صالح بندے ہی زمین کے وارث ہوں گے ۔

ب : پوری دنیا میں اسلام کا پھیلاؤ

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون (۱)

خدا وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ دین حق کو تمام ادیان پر غالب کردے چاہے مشرکوں کو برا ہی کیوں نہ لگے ۔

ج : راہ انبیاء کی کامیابی

ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ۔ انهم لهم المنصورون ۔ وان جندنا لهم الغالبون (۲)

اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا ۔

د : باطل پر حق کی فتح

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق (۳)

ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے

ھ : مومنین کا غلبہ

وان جندنا لهم الغالبون ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا ۔

باطل پر حق کی فتح ، دنیا میں شرک ، بت پرستی کے آثار کی بھرپور شکست اور اپنے مرحوم رہبر حضرت امام خمینی قدس سرہ کے توحیدی و الٰہی مقاصد کی تکمیل کی امید کے ساتھ ۔ والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

۱۔ سورہ توبہ آیت ۳۳ ۲۔ سورہ صافات آیات ۱۷۱ ۔ ۱۷۳ ۳۔ سورہ انبیاء آیت ۱۸

جناب محمد رشتی
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

امام خمینی کا عرفان

تاریخ کی عظیم ہستیوں کے حیرت انگیز کمالات میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کے تحت ہر گروہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کی زندگی کے کسی ایک پہلو سے خیرہ ہو کر اسی ایک پہلو پر سوچنے لگتا ہے ظاہر ہے ہر صاحب کمال اپنی استعداد کے مطابق ان کو کسی ایک میدان میں فضیلت کی چوٹیوں پر دیکھتا ہے اور ان کی دوسری فضیلتوں سے غافل رہتا ہے اور حق یہ ہے کہ "عظیم روح اللہ الخمینی" (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) ان ہی لوگوں میں سے تھے۔ کچھ لوگوں کی نظریں ان کے فقہ و اصول کے احاطہ پر مرکوز ہیں اور علوم منقولہ میں ان کی گہری معلومات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو کچھ لوگ ان کی شجاعت و دلیری سے مات ہو کر ان کی شیردلی کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ ایک گروہ ان کی دور اندیشی اور تیز بینی سے متاثر ہو کر انگشت بدنداں ہے، تو دوسرا گروہ ان کے غیر معمولی حسن نظم و تدبیر پر سر دھن رہا ہے، اسی طرح صاحبان سیر و سلوک ان کو عرفان و تکامل کی راہ طے کر لینے والے توانا شیخ و مرشد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور . . .

البتہ جو چیز اس مرد الٰہی کے تمام کمالات و امتیازات کے درمیان بنیادی و اساسی کردار کی حامل ہے وہ ان کا عرفانی تصور کائنات ہے عرفانی نقطۂ نظر جس نے عملی سیر و سلوک کے ساتھ ضم ہو کر ان کو ایک انسان کامل بنا دیا ہے۔

ہم اس مقالہ میں حضرت امام خمینی قدس اللہ نفسہ الزکیہ کے عرفانی نظریات کی خصوصیتوں کی طرف

مختصر اشارہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ دیگر عرفانی نظریات کے ساتھ مقائسہ کے ذیل میں خود آپ کے عملی و فکری پہلوؤں پر مرتب ہونے والے ان عمیق افکار کے اثرات کا جائزہ لے سکیں۔

یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ کر دینا مناسب ہے کہ جمہوریہ اسلامی ایران کے قیام سے قبل اس کے کہ ملکی سطح پر قائد و رہبر، اور ایک بڑے طبقے میں مرجع تقلید کے عنوان سے یا حوزہ علمیہ میں ایک بزرگ فقیہ اور ماہر اصول کی حیثیت سے جانے پہچانے اور مانے جائیں حوزۂ علمیہ قم میں علماء و اساتذہ کے درمیان ایک ایسے الٰہی صفت پاکیزہ چہرے کے طور پر معروف تھے جنہوں نے الٰہی معارف اور عرفانی حقائق کو درک کرنے کے لیے برسوں حضرت آیت اللہ میرزا محمد علی شاہ آبادی جیسے استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور ان کے ایسے عارف کامل کے ارشاد و نصیحت کے ذریعہ خود بھی مقامات معنوی کے اعلیٰ مراحل طے کر چکا ہے کہ اس کا ذوق معنوی مباحث سے سرشار ہے۔

اس مرد عظیم کے تالیفاتی سلسلہ پر ایک نظر خود اس بات کی گواہ ہے کیونکہ حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی سب سے پہلی یادگار "شرح دعائے سحر" ہے جو انھوں نے صرف ستائیس[۱] سال کی عمر میں تحریر فرمائی ہے۔ (۱۳۴۷ ہجری قمری)، اس کے بعد ۳۵ سال کی عمر میں (۱۳۵۵ ہجری قمری) شرح فصوص الحکم و مصباح الانس کی تالیف تکمیل کرتے ہیں۔ یقیناً اس پایہ کے تالیفات کو اور وہ بھی اوائل تحقیق میں علوم عرفانی پر نظر رکھنے والے صاحبان فن اور اہل بصیرت بھی حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں خاص طور پر یہ دیکھ کر کہ انھوں نے اس وقت قلم اٹھایا ہے جب کہ ابھی انھیں اپنے استاد کے محضر مبارک سے فارغ ہوئے کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کیونکہ ۱۳۵۰ ہجری میں، مصباح الانس، جو عرفان نظری کے متون عالیہ میں سے ہے آپ اپنے استاد آیت اللہ شاہ آبادی کی خدمت میں شروع کرتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد قم سے استاد کے ہجرت کر جانے کے سبب درس کا سلسلہ رک جاتا ہے چنانچہ حضرت امام طاب ثراہ نے شرح مصباح الانس کے حاشیہ میں صفحہ ۲۴۸ پر خود تحریر فرمایا ہے:

"الیٰ ھیھنا قرأت الکتاب عند شیخنا العارف الکامل الشاہ آبادی روحی فداہ وقد اتفق انتقالہ الیٰ طھران فصرت محروماً عن فیضہ دام ظلہ"

---

[۱] تعلیقہ بر فصوص الحکم ص ۲۵۱

اُس صفحہ تک میں نے یہ کتاب اپنے استاد عارف کامل شاہ آبادی روحی فداہ کی خدمت میں پڑھی اتفاقاً انہیں تہران منتقل ہونا پڑا جس کے سبب ان کے فیض سے محروم ہو گیا، خدا ان کا سایہ باقی رکھے۔"

امام خمینی طاب ثراہ کے عرفانی افکار کی بنیاد و اساس توحید سے متعلق ان کے گہرے تصورات پر استوار ہے، اس سلسلہ میں وہ بار ہا صراحت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ تمام کلمات و اصطلاحات حتیٰ جو کچھ اہل عرفان کہتے ہیں، سب نارسا ہیں اور توحید کی حقیقت بیان کرنے سے قاصر ہیں چنانچہ وہ عموماً سورۂ نور کی ۳۵ ویں آیت :۔

اللّٰہ نور السمٰوات والارض۔ (اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے)

اور سورۂ حدید کی تیسری آیت :۔

ھو الاول والآخر والظاھر والباطن (وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے وہی باطن) سے توحید کی حقیقت بیان کرنے اور حق و خلق کے درمیان رابطہ کی توجیہ کرنے کے سلسلہ میں استفادہ کرتے ہوئے عالم وحدت کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتے تھے، وہی اول ہے اور وہی آخر بھی ہے جیسے اس کے سوا اصلاً کچھ بھی نہیں ہے، سب نفی و منفی ہیں، جو کچھ ظہور ہے وہی ہے۔ نہ کہ اس سے ہے ایسا نہیں ہے کہ جلوے، جلوہ نما سے جدا کوئی چیز ہوں۔[1]

جلوے اور جلوہ نما یا دوسرے لفظوں میں حق و خلق کے رابطے کی وضاحت کے سلسلہ میں کبھی کبھی تمام مثالوں کو نارسا اور واقعیت پر پوری نہ اترنے والی مثال قرار دیتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ رابطہ باپ اور بیٹے کے درمیان رابطے کی قسم سے نہیں ہے، جو آپس میں دو مستقل وجود رکھتے ہیں یا سورج اور سورج کی شعاعوں کے درمیان رابطے کی قسم سے بھی نہیں ہے کہ یہ دونوں چیزیں بھی آپس میں مغایرت رکھتی ہیں اور نہ ہی یہ ارتباط نفس مجرد کی قوتوں مثلاً بصارت اور سماعت وغیرہ سے خود نفس مجرد کے رابطے کی قسم سے ہے کیونکہ ان میں بھی کثرت اور غیریت پائی جاتی ہے۔[2]

البتہ کبھی کبھی امام خمینیؒ اس کی دریا اور دریا کی موجوں سے مثال دیا کرتے تھے اور اس کو "ظل" اور "صاحب ظل" کی مثال سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، کیونکہ موج دریا سے جدا کوئی چیز نہیں ہے بلکہ موج اسی متموج دریا کو کہتے ہیں یہ اصلاً دریا سے الگ نہیں ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر ان کا

[1] تفسیر سورۂ حمد ص۱۳۸
[2] تفسیر سورۂ حمد ص۱۳۸

عقیدہ تھا" واقعیت کے اعتبار سے اصلاً حق تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ ہے وہ ہے ،جلوہ بھی وہی ہے وہ خود متجلی ہے، اور اگرچہ کبھی کبھی دنیا کو "سائے" سے بھی تعبیر کرتے تھے مگر فصوص الحکم کے شارح قیصری سے گلہ کرتے ہوئے کہ انھوں نے نہ جانے کیوں "سائے" کو کسی شخص موجود کا سایہ تصور کیا ہے اور پھر فرماتے تھے "سایہ" اصلاً وجود نہیں رکھتا بلکہ اس کا وجود خیالی ہے:۔

لاوجود للظل اصلاً وجوده خیلی فان الظل عدم تنوس المحل عن نور المنیر ولکن یتخیل انه شئ مع انه لیس بشئ کالعالم یتخیل انه موجود ولیس بموجود عند التحقیق العرفانی.
الا کل شئ ماخلا الله باطل "[۲]

ظل یعنی سایے کا اصلاً کوئی وجود نہیں ہے اس کا وجود خیالی ہے ،جس جگہ تیز روشنی نہیں پڑتی اس جگہ کو سائے سے تعبیر کرتے ہیں بظاہر وہ ایک موجود شے لگتا ہے درآں حالیکہ وہ کوئی چیز ہی نہیں ہے جیسے کہ عالم بظاہر موجود معلوم ہوتا ہے لیکن عرفانی تحقیق کی رو سے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے ،بلاشبہ اللہ سے الگ جو چیز بھی ہے باطل و بے حقیقت ہے"

اور کبھی توحید کی حقیقت کو ناقابل بیان قرار دیتے ہوئے کہتے تھے کہ صرف "راسخون فی العلم" (ارباب عصمت وطہارتؑ) ،اس کی کنہ تک پہنچ سکتے اور اس حقیقت سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں کیونکہ الفاظ وعبارات کے قالب میں حتی اس کے بیان کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

ان المقیّد مربوط بباطنه وسرّه مع المطلق بل هم عین المطلق بوجه یعرفه الراسخون فی المعرفة ....[۳]"

الفاظ مطلق محض کی ترجمانی سے عاجز ہیں وہ تو صرف معانی خفیہ کی وضاحت کرتے ہیں اس کے اسرار مطلق محض بلکہ عین مطلق ہیں اور اس سے فقط "راسخون فی العلم" یعنی اہلبیت عصمت وطہارتؑ ہی آگاہ ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امام خمینی طاب ثراہ حقیقت توحید کو "نسبیت و سببیت" یا علیت و معلولیت کی

[۱] تفسیر سورہ حمد ص ۶۵

[۲] تعلیقہ بر فصوص الحکم ص ۲۵ [۳] شرح دعا سحر ص ۱۳۱

کی تعبیرات سے بلند تر جانتے تھے[1]، حتیٰ قیومیت کی معیت" یا "جلوے اور جلوہ نما کی معیت" جیسی تعبیروں کو بھی ناقص خیال کرتے تھے[2]۔

اور چونکہ "وحدت وجود" پر اپنے توحیدی نظریات کی اساس کے عنوان سے عقیدہ رکھتے تھے، لہٰذا حکماء کے برخلاف وہ اس کے قائل تھے کہ مجعول "کا" وجود" سے واسطہ نہیں ہوتا[3]۔ مختصر یہ کہ "توحید" کو انہوں نے اس طور پر درک کیا تھا کہ بڑے بڑے محققین اور اہل عرفان کی بہت سی باتوں کو نہ صرف ناقص بلکہ بعض وقت رکیک خیال کرتے تھے چنانچہ قیصری نے اپنی شرح فصوص کے مقدمات میں صفحہ ۲۱ پر ایک بحث "تتمیم" کے عنوان سے کی ہے کہ جس پر حاشیہ لگاتے ہوئے حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اپنے تعلیقہ میں فرماتے ہیں:

هو معنى مبتذل مخالف للتّوحيد، فهل ترىٰ ان مرادهم الاعيان الثابتة ما شمّت رائحة الوجود.... ماذكره هٰذا الفاضل او لكلام امير المؤمنين ع، مع كمال لطافته هٰذا التوجيه الركيك، بل مقصودهم كسر الاصنام ومحو الاوهام وترك الغير ورفض الشرك مطلقاً "[4]

قیصری نے توحید کے جو معنی بیان کئے ہیں بالکل لچر اور سطحی ہیں اور توحید کے خلاف ہیں، ان لوگوں کے خیال میں "اعیان ثابتہ" سے مراد وہ موجود ہے جو زیور وجود سے آراستہ ہو .... اگرچہ اس مرد فاضل نے جو کچھ کہا ہے اس میں کلام امیر المومنین علیہ السلام سے بھی مدد لی ہے اس کے باوجود یہ بہت ہی رکیک اور بے دم توجیہ ہے عرفا کے نزدیک اعیان ثابتہ سے مراد ہر اعتبار سے نفس کے بت کو توڑنا، وسوسوں کی دنیا سے نکل آنا، غیر اللہ سے رشتہ منقطع کر لینا اور ہر طرح کے شرک سے بچنا اور رفض اختیار کرنا ہے۔

---

1. تفسیر سورۂ حمد ص۱۶
2. صحیفۂ نور جلد ۱۸ ص۱۹۰
3. تعلیقہ بر فصوص الحکم ص۲۵
4. تعلیقہ بر فصوص الحکم ۲۸

امام خمینیؒ کی عرفانی بصیرت کی خصوصیات

۱۔ ظاہر و باطن کا آپس میں جڑا ہونا؛

کچھ صاحبان شریعت دین کے ظاہری احکام و آداب کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور باطن سے، جو اس کی اصل روح و جان ہے، غفلت برتتے ہیں اور دوسری طرف کچھ لوگ اپنی تمام کد و کاوش اور تلاش و جستجو باطن پر مرکوز کر دیتے ہیں اور ظاہر پر اعتبار اور اہمیت کے قائل نہیں ہیں، ان دونوں خطا کار گروہوں کے بالمقابل سچے عارفین کی منزل ہے جو مقام باطنی تک پہنچنے کے لئے شرع مقدس کے ظواہر و دستورات کی پیروی کرتے ہیں اور شرعی آداب و احکام کی پابندی کے بغیر کمال تک رسائی کو ناممکن جانتے ہیں۔ عارفین و سالکین کے امام و پیشوا توحید کے علمبردار آیت اللہ العظمیٰ آقای خمینیؒ فرماتے ہیں:۔

"الصورة المربوطة بالمعنى والعلن الموصول بالسر فهو المتبع على لسان الله ورسوله واوليائه ..... علم ظاهر الكتاب والسنة هو الطريق المستقيم الى الاسرار الربوبية والانوار الغيبية والتجليات الالهية ولولا الظاهر لما وصل سالك الى كماله ولا مجاهد الى مآله[1]۔"

وہ شیوہ و راہ جو عالم معنی سے مربوط ہے اور ظاہر جو کہ سر و باطن سے وابستہ ہے وہی ہے جو خدا اس کے رسول اور اس کے اولیاء کے اقوال و گفتار کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، دینی احکام و آداب یعنی شرع مقدس الٰہی (کتاب و سنت) کے ظواہر کا علم اسرار ربانیہ، انوار غیبیہ اور تجلیات الٰہیہ تک رسائی حاصل کرنے کی سیدھی راہ ہے، اگر ظواہر (آداب و شریعت) نہ ہوتے تو کوئی سالک الی اللہ کمال تک اور کوئی مجاہد مقصود و حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اور حاشیہ میں خاص طور پر فرماتے ہیں کہ "شریعت" کے بغیر "طریقت" و "حقیقت" تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اگر ظاہر پر جس طرح ہونا چاہئے توجہ اور احترام ہو تو یہ چیز یقیناً انسان کو باطن تک پہنچا دیتی

---

[1] شرح دعاء السحر ص ۴۲

ہے اور جو چیزیں باطن تک پہنچاتی ہیں ان پر عمل کرنے کے باوجود جو لوگ باطن تک نہیں پہنچ سکے ہیں یقیناً انہوں نے جس طرح سزا وار ہے ظاہر کو انجام نہیں دیا ہے، دوسری طرف جو لوگ بعض عوامی سطح کے صوفیا کے مانند ظاہر پر عمل کئے بغیر باطن تک پہنچنا چاہتے ہیں اپنے پروردگار کی ذات بھی لقبیر نہیں رکھتے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ "شطحیات" کی ایسے افراد کی طرف نسبت دیتے ہیں جو اپنی ریاضت میں شرعی ریاضتوں سے منحرف ہو گئے ہوں یا انہوں نے الٰہی نیت و مقصد کے تحت سیر و سلوک کی راہ نہ اپنائی ہو۔

ما وقع من الشطحيات من بعض اصحاب المكاشفة السلاك وارباب الرياضة فهو لنقصان سلوكهم وبقاء الانانية في سرهم او سر سرهم فتجلى عليهم انفسهم بالفرعونية واما السالكون على طريق الشريعة مع رفض الانانية بجملتها و ترك العبودية لانفسهم ...... فهم في اعلى مرتبة التوحيد والتقديس[2]

"جو شبہات بعض صاحبان مکاشفہ و طریقت اور ارباب ریاضت و مشقت کے یہاں "شطحیات" کی شکل میں ملتے ہیں راہ سلوک و طریقت میں نقص و کمی اور ان کی راہ یا ان کے سر و رموز میں نفس کے دخل کی بنا پر ہے جو ان کے نفوس پر طرود فرعونی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے لیکن جن لوگوں نے (باطن تک) پہنچنے کے لئے راہ شریعت اپنائی اور اس کے ساتھ ہی انانیت سے اعراض برتا اور اپنے نفس کی بندگی و پرستش کو ترک کر دیا ..... یہ وہ لوگ ہیں جو توحید و تقدیس کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔

چنانچہ اسی نکتہ کو "فصول الحکم" پر اپنے تعلیقہ میں بھی ذکر کیا ہے اور اپنے استاد سے نقل کیا ہے کہ:۔

انّ اكثر اهل الدعاوى الباطلة كانوا من اصحاب الرياضات الباطلة[3]

---

[1] تعلیقہ فصوص الحکم ص ۲۱ [2] مصباح الهدایہ ص ۱۱۱ [3] مصباح الهدایہ ص ۱۴۰

جھوٹے دعوے کرنیوالوں میں اکثریت جھوٹی ریاضتیں کرنے والے افراد کی رہی ہے۔

۲۔ عقل و کشف اور برہان و عرفان میں ہم آہنگی

عرفانی کتابوں میں اس نکتہ کی طرف بڑی شدت سے زور دیا گیا ہے کہ "کشف و شہود عقل کی حدود سے مافوق ہے" اور بہت سے ایسے جاہل افراد ہیں جنھوں نے اپنے جہل کی وجہ سے اس حق بات پر اعتراض کیا ہے حتی اس بات کو کتاب و سنت کہ جن میں عقل و فکر کی دعوت دی گئی ہے، کے خلاف سمجھا ہے لیکن اہل عرفان کے درمیان جو محققین اور بزرگ شخصیتیں گزری ہیں ان کی باتوں پر غور کرنے سے اس عبارت سے ان کا اصل مقصد کیا ہے معلوم کیا جا سکتا ہے مثلاً اپنی شرح فصوص میں قیصری نے بہت سی جگہوں پر "وہم میں مبتلا عقل" کو اس کا مصداق قرار دیا ہے نہ کہ وہ عقل جو بدیہی مقدمات کی بنیاد پر کام کرتی ہے[۱] کیونکہ دوسرے مقامات پہ توضیح کر دی ہے کہ عقل، ادراک تام کی قوت نہیں رکھتی اور صفائے باطنی کے ساتھ نفس کی طہارت کے ذریعہ ہی معرفت کے بلند و بالا مراحل تک دسترسی حاصل کی جا سکتی ہے۔[۲]

اس سلسلہ میں، حضرت امام خمینی طاب ثراہ کے نظریہ کے مطابق، اگرچہ عرفان، عقل سے الگ ایک چیز ہے لیکن کسی بھی عالم میں عقل صریح کا مخالف نہیں ہے کیونکہ عقلی برہان بھی صاحبان عرفان کے "شہود" کے خلاف نہیں ہے:۔

فان طور العرفاء وان کان طوراً وراء العقل الّا انّه لایخالف العقل الصریح والبرهان الفصیح، حاشا المشاهدات الذوقیه ان تخالف البرهان والبراهین العقلیه ان تقام علی خلاف شهود اصحاب العرفان[۳]

عرفاء کے کشف و شہود کا طریقہ اگرچہ عقل سے ماورا ایک راہ ہے لیکن یہ امر مقدمات بدیہیہ کی بنیاد پر سیر کرنے والی عقل صریح کے خلاف نہیں ہے مشاہدات ذوقیہ ہرگز برہان

۱۔ ملاحظہ فرمائیں شرح فصوص قیصری، صفحات ۸۸، ۱۹۳، ۲۸۲، ۲۸۹۔

۲۔ ملاحظہ فرمائیں شرح فصوص قیصری صفحات ۱۸۱، ۲۸۲، ۳۰۳، ۳۰۴

۳۔ مصباح الہدایہ ص ۱۲۵

اور براہین عقلیہ کی مخالفت نہیں کرتے کہ صاحبان عرفان کے مشاہدے خلاف ہوں۔

اور اسی اساس پر صدر المتألہین کا یہ فیصلہ بھی مبنی ہے کہ:۔

"البرھان الحقیقی لا یخالف الشھود الکشفی"[1]

حقیقی برہان (یا واقعی عقلی دلیل) کشفی شہود کے خلاف نہیں ہوا کرتی۔

۳۔ جامعیت اور وسیع النظری

معنوی و عرفانی افکار، اپنے تمام تر تقدس و احترام کے باوجود امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے ذہن کو اسلام کے دوسرے زندگی بخش پہلوؤں کی طرف سے غافل نہیں بناتے، کیونکہ وہ اسلام کو ایک جامعیت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس آسمانی نظام و مکتب کو صرف اہل عرفان کے اقوال و تعبیرات میں منحصر نہیں کرتے جتنی ان لوگوں سے جو عموماً انسانی زندگی کے سیاسی و اجتماعی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک طرف سے تمام قرآنی آیات و روایات کو اپنے معنوی تخیلات کے پرتو میں تفسیر کرتے ہیں امام خمینیؒ نے شکوہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"افسوس یہ ہے کہ اسلام ہمیشہ اسی زاویۂ نظر میں مبتلا رہا، ایک بڑی مدت تک ہم عرفا کے ہاتھوں میں گرفتار رہے، اسلام عرفا کے ہاتھوں میں گرفتار تھا، ان لوگوں نے بڑی اچھی خدمتیں انجام دیں لیکن گرفتاری اس اعتبار سے تھی کہ تمام چیزوں کو بس اسی طرف پلٹا دیتے تھے، جو آیت بھی ان کے ہاتھ میں آ گئی اسی طرف کی ہو گئی مثال کے طور پر ملا عبد الرزاق کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں، بڑی فاضل شخصیت تھی، بڑی ہی عظیم و با فضیلت ہستی تھی لیکن پورے قرآن کو اس طرف پلٹا دیا، جیسے قرآن ان (دنیوی) امور سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتا۔"[2]

۴۔ محی الدین ابن عربی پر خصوصی توجہ

محی الدین ابن عربی عام طور پر اسلامی عرفان کے "باوا آدم" کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے عرفان نظری کو محکم و استوار بنیادوں کی بنیاد پر بہترین صورت میں بیان و منظم کیا ہے، آپ کے آثار اتنے مستحکم اور گہرائی کے حامل ہیں کہ تقریباً ہزار سال گزر جانے کے باوجود آج بھی درس و تحقیق کے متون کے طور پر دینی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں علمی دنیا کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

---

[1] اسفار جلد اول ص ۱۸۹

[2] صحیفہ نور جلد ۸ ص ۷۱

زمانۂ قدیم سے اسلامی دنیا کے عظیم علماء اور دانشوروں نے ابن عربی کو بڑی عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کے لئے بڑی ہی اونچی اونچی تعبیریں استعمال کی ہیں شیخ بہائی نے "جمال العارفین"، "محی الملۃ والدین" اور "صدر المتألہین" نے "الشیخ العارف المتألہ" اور "قدوۃ الکاشفین" جیسے خطابات سے آپ کی جلالت کا اعتراف کیا ہے اور علمائے معاصر میں آیت اللہ العظمیٰ سید صدر الدین صدر مرحوم نے ان کی "فتوحات مکیہ" کی ان لفظوں میں تعریف کی ہے :-

لا اظن ان یصدر لہ ثان فی عالم المؤلفات[1]

گمان نہیں کرتا کہ تالیفات کی دنیا میں کوئی ان کا ثانی موجود ہو۔

شہید مطہری کے بقول صاحب تفسیر "المیزان" علامہ طباطبائی معتقد تھے کہ :-

"اصلاً اسلامی دنیا میں کسی بھی شخص سے ممکن نہیں ہو سکا ہے کہ وہ محی الدین کی مانند ایک سطر بھی پیش کر سکے۔"[2]

بہر حال حضرت امام خمینیؒ کے عرفانی افکار میں ابن عربی کی جانب خصوصی توجہ کی جھلک ملتی ہے ایک طرف تو ان کو "الشیخ الکبیر"[3] کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور دوسری طرف مختلف مباحث میں ان کے اقوال کی نقل و تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔[4]

اور اسی توجہ اور اعتبار کا نتیجہ ہے کہ آپ سوویت یونین کے صدر گورباچوف کے نام اپنے پیغام میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اس سے زیادہ میں آپ کو نہیں تھکاؤں گا اور عرفا بالخصوص محی الدین ابن عربی کی کتابوں کا نام نہیں لوں گا اگر آپ ان بزرگوار کی بحثوں سے آشنائی حاصل کرنا چاہیں تو اپنے موذ اقمار چند ذہین و زیرک افراد کو جو اس طرح کے مسائل میں محکم دسترس رکھتے ہوں، قم روانہ کیجئے کہ وہ خدا پر توکل کرتے ہوئے چند برسوں کے بعد بال سے بھی زیادہ باریک و لطیف عرفانی منازل کی گہرائیوں سے آگاہی حاصل کریں کیونکہ علم و آگہی کا یہ سفر طے کئے بغیر وہاں تک رسائی ناممکن ہے۔"

1۔ خاتمہ کتاب "المہدی"

2۔ شرح مبسوط منظومہ استاد مطہری جلد ۱ ص ۲۳۹

3۔ مصباح الہدایہ ص ۱۲۸، ۱۴۲

4۔ نمونہ کے لئے ملاحظہ فرمائیں مصباح الہدایہ صفحات ۸۷، ۱۰۴، ۱۱۴، ۱۴۵، ۱۲۵۔

۵۔ آزاد اندیشی اور محققانہ طریقۂ نظر

حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے محض عرفانی کتابوں کے متون کے مطالعہ پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اس سلسلہ میں کدوکاوش اور تحقیق و جستجو سے کام لیا۔ آپ ایسی علمی قوت و توانائی کے حامل ہو چکے تھے کہ بلا جھجک آزادانہ طور سے ان پر تنقید و تبصرہ اور ان کی قدر و قیمت اور اہمیت بیان کر دیتے تھے، نہ تو کلمات و عبارات آپ کو خیرہ کرتے تھے نہ ہی صاحبان قلم کا تقدس و احترام آپ کو اپنی ناقدانہ بات کہنے سے روکتا تھا، شیخ اکبر محی الدین سے کہ جن کو آپ عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں، قیصری اور ملا عبد الرزاق قاسانی جیسے بزرگ اساتذہ تک بلکہ خود اپنے ذی قدر اساتذہ مثلاً میرزا جواد آقا ملکی اور مرحوم شاہ آبادی تک فکر و نظر کی دنیا میں کسی کی بھی تقلید اور پابندی میں رہنا قبول نہیں کرتے، بلکہ آزادانہ تحقیق و نظر سے کام لیتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر :۔

بلقیس کے عرضی طور پر حضور کی کیفیت کی بحث میں، جس کو شیخ اکبر ابن عربی نے وجود و عدم سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت امام خمینیؒ نے ان کے اس نظریہ کو "غیر تام" قرار دیا ہے اسی طرح ایک دوسرے مسئلہ میں بھی ان کی بات کو خلاف تحقیق سمجھا ہے[1]۔ شرح دعائے سحر میں ایک مقام پر میرزا جواد آقا ملکی کے کلمات نقل کرتے ہوئے ان کو مورد تنقید قرار دیا ہے[2]۔ شرح فصوص میں قیصری اور آپ کے نقطۂ نظر میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے[3]۔ حتیٰ کہیں کہیں اپنے استاد شاہ آبادی کے نظریات اور نقطۂ نظر پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کو ذوق عارفانہ کے خلاف ایک فلسفی و حکیم کے مسلک کے مطابق بتاتے ہیں[4]۔

ان تمام موارد کی الگ الگ تحقیق و تجزیہ اور حضرت امام خمینیؒ کے گہرے اور لطیف نظریات کی وضاحت اس قلم اور اس مقالہ کے دائرۂ قوت سے خارج ہے۔

اجتماعی فیصلوں میں عرفانی تصور کائنات کی کارفرمائی

حضرت امام خمینی طاب ثراہ کے سیاسی و اجتماعی رجحانات اور فیصلے بلاشبہ توحید کے بارے میں آپ کے بلند افکار و نظریات سے متأثر تھے، دوسرے لفظوں میں آپ کا یہ عرفانی تصور کائنات جس وقت

۱۔ تعلیقۂ فصوص الحکم ص ۱۷۲ و ۱۹۳
۲۔ شرح دعاء سحر ص ۵۹ و ۱۰۰
۳۔ تعلیقۂ فصوص الحکم صفحات ۳۲، ۴۶، ۵۲، ۶۶، ۱۲۶ اور ۱۶۵ وغیرہ
۴۔ تعلیقۂ فصوص الحکم صفحات ۱۱۴، ۱۲۴، ۱۸۲ اور ۱۸۵

اجتماعی زندگی میں جلوہ گر ہو تو ان خصوصیات و امتیازات کی حامل امام خمینی جیسی عظیم شخصیت وجود میں آئی۔ گہرے احساس و ادراک، بے نظیر ثبات استقامت، پر جوش دلیری و شجاعت آئندہ کے بارے میں زندگی بخش امید و آرزو، عزم راسخ اور ناقابل تسخیر ارادے۔

یقیناً ہمارے اس دعوے کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کے پیغامات اور تقریروں کے جس حصہ کو بھی دیکھئے اس میں توحیدی رنگ و بو اور الٰہی جلووں کا احساس ہوتا ہے چاہے وہ لوگوں کو اتحاد و یکجہتی کی دعوت دے رہے ہوں یا دشمن کے مقابل استقامت اور اولوالعزمی کی نصیحت فرما رہے ہوں، وہ چاہے بڑی طاقتوں کو ان کی پالیسیوں کے سلسلہ میں پھٹکار رہے ہوں یا کمزور و بے سہارا مستضعفین کی حمایت پر زور دے رہے ہوں۔ مختصر یہ کہ ہمیشہ اور ہر جگہ آپ کی رہنما تحریروں اور پیغاموں کی اصل و بنیاد توحید پر استوار عرفان و معنویت کی خوشبو لئے نظر آتی ہے، نمونہ کے طور پر آپ کے یہ دلنشیں جملے قابل غور ہیں:۔

"تمام عبادتیں اس بات کا وسیلہ ہیں کہ انسان کی اصل و حقیقت جلوہ گر ہو جائے طبیعی انسان الٰہی انسان بن جائے، انبیاء حکومت قائم کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں یہ بھی ایک کام ہے حکومت بھی قائم کرتے ہیں لیکن یہ مقصد نہیں ہے یہ سب کچھ بس وسیلہ ہے۔"[1]

ایران کے سابق صدر اور وزیر اعظم شہید رجائی اور شہید باہنر کی ایک ساتھ شہادت کے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"ہماری منطق قرآن کی منطق ہے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" اس منطق سے کوئی بھی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی۔"[2]

"ہماری قوم بیدار ہو چکی ہے یہ خدا کے لئے میدان میں اتر چکی ہے، جو خدا کے لئے اٹھا ہو اسے شکست نہیں ہوا کرتی۔"[3]

---

[1] تفسیر سورۂ حمد ص ۸۱

[2] صحیفۂ نور جلد ۹ ص ۶۳

[3] صحیفۂ نور جلد ۱۱ ص ۶۰

ماہ رمضان المبارک کے آخری جمعہ "روز قدس" کی مناسبت سے فرماتے ہیں :۔

"مناسب و سزاوار ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان بڑی طاقتوں اور بڑے شیطانوں کی اسارت و بندگی سے رہائی حاصل کر کے اللہ کی کبھی نہ ختم ہونے والی طاقت سے منسلک ہو جائیں"[1]

اس طرح کی باتیں سیکڑوں اور ہزاروں مواقع پر امام خمینی رہ کے ارشادات میں بکھری نظر آتی ہیں۔

امام خمینی رہ کی ایک وصیت

امام خمینی طاب ثراہ کے عرفانی آثار میں عرفانی مباحث کے منکرین و مخالفین کے لئے کثرت کے ساتھ یہ وصیت ملتی ہے کہ نفی و انکار یا تکفیر کا حکم جاری کرنے کے بجائے الٰہی معارف کے سلسلہ میں غور و فکر سے کام لیتے ہوئے خداوند تبارک و تعالیٰ سے ان کے درک و فہم کی توفیق طلب کرو۔ البتہ کسی قوی و توانا استاد کی رہنمائی کے بغیر اہل توحید کے مقصود تک رسائی حاصل کر لینا آپ نے ناممکن جانا ہے یہی وجہ ہے کہ عرفانی متون کے مطالعہ کی استاد کی خدمت میں حاضری اور اہل فن کے بیان سے مدد حاصل کئے بغیر نہ صرف یہ کہ اجازت نہیں دی ہے بلکہ اس کو گمراہ کنندہ بھی کہا ہے۔ اپنی قیمتی کتاب مصباح الہدایہ میں اُثولوجیا سے ایک بات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"فلیراجع الیٰ ذالک الکتاب الشریف لکن بعد الفحص الکامل عن رموزات القوم والرجوع الیٰ اھلہ فانّ لکل علم اھلا وایاک والرجوع الیہ ومسئلۃ بانانیّتک ونفسیتک فانہ لا یفیدک شیئًا بل لا یزیدک الا حیرت وضلالۃ ..... وھٰذہ نصیحۃ منی الیٰ اخوانی المومنین لئلّا یھلکوا من حیث لا یعلمون"[2]

پس اس کتاب شریف کی طرف رجوع کرو لیکن ارباب کتاب (اہل عرفان) کے رموز و اصطلاحات کے سلسلہ میں پوری کدو کاوش اور اس کے جاننے والوں کی طرف

---

[1] صحیفۂ نور جلد ۱۵ ص ۲۷

[2] مصباح الہدایہ ص ۱۵۲

رجوع اختیار کرنے کے بعد کیونکہ ہر علم کے لئے اس علم کے ماہرین موجود ہیں، تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اپنی من مانی، نفس پرستی اور ذہن کے غرور میں مبتلا ہو کر کسی مسئلہ کو نہ دیکھنا کیونکہ اس میں تمہارے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ چیز تمہاری گمراہی اور حیرت و پریشانی میں اور اضافہ کر دے گی ... اور یہ میری طرف سے ایک نصیحت ہے مومن بھائیوں کے لئے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کریں۔ ان چیزوں کے بارے میں جن کو وہ نہیں جانتے۔

اپنی عرفانی تحقیقات کے درمیان بعض عالم نما گروہ سے، جو معنوی حقائق کو سمجھے اور فکر کئے بغیر عرفان پر حملہ آور ہوتے ہیں، گلہ کرتے ہوئے ان کو جاہلی تعصب کا شکار بتاتے ہیں:۔

ولا تاخذ بيدك الطعن عليهم من غير فهم مقصدهم كما هو داب بعض المنتسبين الى العلم جعلوا ميزان عدم صحة المطالب عدم اطلاعهم عليها او عدم فهمهم اياها فتراهم يتهمون هولاء العظماء بكل تهمة ويغتابون هذه المكاشفين كل الغيبة مع انها اشد من الزنية نعصبًا منهم تعصب الجاهلية[1]"

عرفا کے ہدف و راہ کو سمجھے بغیر ان کے خلاف حملہ آور نہ ہو اور نہ ہاتھ نہ بڑھاؤ جیسا کہ بعض عالم کہے جانے والے افراد کی عادت ہے جو عرفانی مطالب کی عدم صحت کا معیار ان کے سلسلہ میں اپنی لاعلمی اور نافہمی کو قرار دیتے ہیں، پس تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ ان بزرگ عرفا پر ہر طرح کی تہمتیں باندھتے ہیں اور ان (صاحبان کشف و شہود) کی ہر طرح سے غیبت کرتے ہیں جبکہ یہ امر زنا سے زیادہ سخت اور قبیح ہے، ان کے سلسلہ میں ان کا یہ تعصب جاہلیت کا تعصب ہے

یہی وجہ ہے کہ اپنی کتاب مصباح الہدایہ کے آخر میں تاکید فرماتے ہیں کہ ان معارف تک رسائی حاصل کرنا ان ہی کے لئے ممکن ہے جنہوں نے بزرگ مشائخ اور گرانقدر عرفاء کی خدمت میں معارف حاصل کئے ہوں

---

[1] مصباح الہدایہ ص ۲۰۲

دوسرے لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ کرنا موجب ضرر و نقصان قرار دیا ہے۔[۱]

اور کتنے کفر کے فتوے اور ناسزا باتیں جہل کا نتیجہ ہوتی ہیں در اصل کہنے والا خود اپنے آپ کو برا بھلا کہتا ہے:۔

"گمان نہ کیجئے کہ اگر کسی نے ایک عرفانی بات کہہ دی تو وہ کافر ہے۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے پہلے آدمی کو کہنے والے کی بات سمجھنا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ انکار کر دے۔[۲]"

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ جنہوں نے ایک طرف تو برسوں شاہ آبادی جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور دوسری طرف ایک عمر ریاضت اور سیر و سلوک میں بسر کی ہے۔ مشائخ عرفا کے بارے میں اس طرح کا فیصلہ اور تاکید کرتے ہیں:۔

"اوصيك ايها الاخ الاعز الله لاتسوء الظن بهولاء العرفاء والحكماء والذين هم من خلص شيعة علي بن ابي طالب واولاده المعصومين وطريقتهم والمتمسكين بولايتهم واياك ان تقول عليهم قولا منكراً او تسمع الى ما قيل في حقهم فتقع فيما تقع ولا يمكن الاطلاع على حقيقة مقاصدهم بمجرد مطالعة كتبهم من غير الرجوع الى اهل اصطلاحهم....[۳]"

اے برادر عزیز! میں تم کو تاکید و وصیت کرتا ہوں کہ ان عرفا و حکما کے سلسلہ میں کہ جو علی ابن ابی طالب اور ان کی معصوم اولاد کے مخلص دوست و شیعہ ہیں ان کی راہ پر

---

[۱] مصباح الھدایہ ص ۲۱۳ [۲] تفسیر سورۂ حمد ص ۵۴

[۳] مصباح الانس ص ۲، امام خمینی اپنی کتاب اربعین ج ۲ ص ۵۹ پر لکھتے ہیں: اگر خدائے تبارک و تعالیٰ ہم سے سوال کرے کہ جب تم مثلاً وحدت وجود کا مفہوم حکما کے مسلک کے مطابق نہیں جانتے تھے اور اس علم کے جاننے والے صاحبان فن سے بھی تم نے استفادہ نہیں کیا تو کیوں اندھے پن کے ساتھ ان کی تکفیر و توہین کی؟ تو محضر اقدس حق میں کہنے کے لئے ہمارے پاس کیا جواب ہے، سوائے اس کے کہ اپنا سر خجالت سے اس کے سامنے خم کر دیں۔۔

گامزن ہیں اور ان کی ولایت سے متمسک ہیں خبر دار بدگمانی سے کام لینا، اور تم کو انکے بارے میں کسی طرح کی ناسزا بات کہنے، یا اگر کچھ کہا جائے تو اس کے سختی سے منع کرتا ہوں ورنہ وہاں جا پڑو گے جہاں جا پڑنا چاہئے اور ان کے اہداف و مقاصد کی حقیقت سے آگاہی، ان کی اصطلاحات سے باخبر افراد کے پاس زانوئے ادب تہ کئے بغیر محض ان کی کتابیں پڑھ لینے سے ممکن نہیں ہے۔

آخری بات

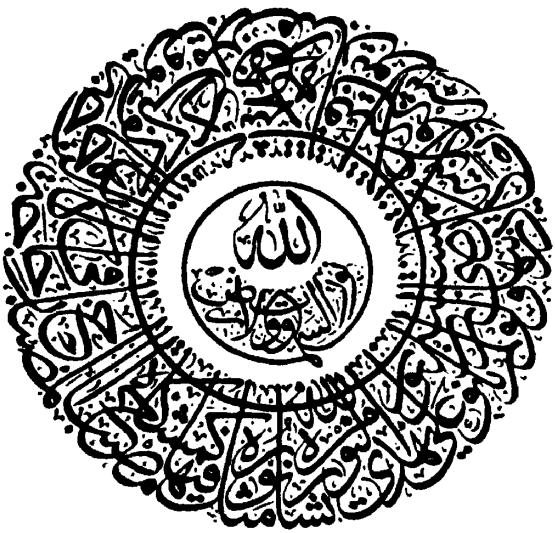
ایک آخری بات محققین اور دانشوروں نیز صاحبان علم و معرفت سے یہ کہنی ہے کہ وہ بیٹھیں اور تاریخ بشریت کے اس عظیم انسان کے بلند افکار کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے ہوئے پوری سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ قلم اٹھائیں، خاص طور پر ارباب کمال و معرفت کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے عرفانی مباحث کے دوران اس مرد عارف کے اقوال و آثار کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کریں اور تشنگان زلال معرفت کو حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریات سے سیراب کریں کیونکہ یہ کام ہرگز میرے اور میرے جیسے کم ترین افراد کے بس کا نہیں ہے۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے انفاس قدسیہ کی برکت سے ایک بار پھر تشنگان حق کے لئے باب معرفت وا ہوگیا ہے۔ آپ نے ایک طرف تو عشق سے معمور رضا کار جوانوں کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اس راہ پر لگا دیا اور دوسری طرف حوزۂ علمیہ میں اپنے درس عرفان کے ذریعہ دلچسپی رکھنے والے طلاب و اساتذہ کو گرمی عطا کردی وہ واقعی طور پر معتقد تھے کہ عرفان کو دوبارہ میدان میں آنا چاہئے یہی وجہ ہے خود اس راہ میں سب سے آگے اس میدان کے علمدار تھے، آپ نے توحیدی و عرفانی پہلوؤں کے حامل عمیق مطالب عوام کے مجمع میں بیان فرمائے اور سیاسی و اجتماعی مسائل میں ان ہی بنیادوں پر نتائج اخذ کئے، سورۂ حمد کی تفسیر کے دوران جب مخالفین کی چہ میگوئیوں کی آپ کو خبر ہوئی کہ عرفانی مباحث کا دوبارہ چھیڑا جانا ان کو ناگوار ہوا ہے تو آپ نے فرمایا:۔

"باتیں مختلف نہیں ہیں صرف تعبیریں مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، اپنی جگہ اشعار کی خود ایک زبان ہے، حافظ خود ایک خاص زبان کا مالک ہے، ان برکات سے عوام کو دور اور محروم نہیں کرنا چاہئے، بلکہ عوام کو اس وسیع الٰہی دستر خوان پر جو قرآن و سنت

اور دعاؤں سے جتنا ہو سکے دعوت کرنی چاہئے تاکہ ہر شخص اپنے ظرف اور صلاحیت کے مطابق ان سے استفادہ کر سکے یہ مقدمہ تھا ان تمام مطالب کے لئے جو بعد میں آنے والے ہیں اگر عمر نے ساتھ دیا، اور ہم نے اس طرح کی تعبیرات کا استعمال کیا تو یہ نہ کہئے گا کہ آپ ان تعبیرات کو دوبارہ میدان میں لے آئے جی نہیں، ان کو دوبارہ میدان میں آنا ہی چاہئے۔" [1]

مگر افسوس ہزار افسوس کہ یہ جملے امام خمینی طاب ثراہ کے آخری درس تفسیر میں ٹیپ ہو کر رہ گئے اور یہ مقدمہ جن مباحث کو پیش نظر رکھ کر تفسیر ذیل میں حضرت امام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے قائم کیا تھا وہ مطالب سامنے نہ آسکے۔ پھر بھی انہوں نے اپنے عزم و ارادے کا اظہار کر دیا کہ یہ تعبیرات دوبارہ عمومی سطح پر بیان ہونی ہی چاہئے۔



---

[1] تفسیر سورہ حمد ص۱۰۰

آیۂ غدیر

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الاِسْلَامَ دِیْنًا

آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا
تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کر دیا

سیوطی نے ابو سعید خدری کی روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہؐ نے علیؑ کو غدیر خم میں اپنی جگہ نصب کر کے ان کی ولایت کا اعلان کر دیا تو جبرئیل آیت " الیوم اکملت لکم دینکم " لے کر نازل ہوئے ۔

(تفسیر درمنثور جلد ۲ ص ۲۵۹ چاپ قدیم مصر ... ۱۳۱۴ ... مولا ...

جناب ابراہیم امینی
ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

یونیورسٹی
امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی نگاہ میں

ملکوں اور قوموں کی ترقی و پیش رفت میں یونیورسٹی کی اہمیت اور اس کا حساس و تقدیر ساز کردار کسی سے پوشیدہ نہیں ہے وہ ممالک جو علم و صنعت میں اعلیٰ مدارج پر پہنچے ہیں، اپنی ترقیوں میں زیادہ تر یونیورسٹیوں کے مرہون منت ہیں لہٰذا تمام ممالک اور قومیں یونیورسٹیوں کے وجود کو قبول اور اس پر افتخار کرتی ہیں اور اس راہ میں بکثرت انسانی طاقت اور پیسہ صرف کرتی ہیں۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہے کہ یونیورسٹی نے ہر جگہ مثبت ہی نتیجہ بخشا ہو اور قوموں کی فلاح و بہبود اور ملکوں کی ترقی و برتری کے اسباب فراہم کئے ہوں بلکہ یہی خیر و برکت کا مرکز اکثر ملک و قوم کی تباہی و زوال کا سبب بھی ہوا ہے۔ جیسا کہ تیسری دنیا کے ممالک اور خاص طور سے اسلامی ممالک میں زیادہ تر یونیورسٹی نے یہی شکل اختیار کر رکھی ہے۔

اسی بنا پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے اور اس پر نظر ثانی کی جائے۔ اور اس کی اصلاح، تکمیل نیز درست مقصد کی طرف اس کی رہنمائی کے سلسلہ میں پوری سنجیدگی سے کام کیا جائے۔

چنانچہ یہ خیال سامنے آیا کہ امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے افکار و نظریات اس سلسلہ میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور یونیورسٹیوں کی اصلاح اور ان کی تکمیل میں ہماری مدد کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ ایک کامل اسلامی فقیہ و مجتہد ہیں اور اس سلسلہ میں بہترین شخص ہیں جو حقیقی اسلام شناس ہو سکتے

حیثیت سے حوادث و موضوعات کی شناخت پر بھی پوری مہارت رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں اسلامی نظریہ کی تشریح و وضاحت کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ وہ ایسے باخبر اور انسان شناس رہبر ہیں جو پچیس ۲۵ سال سے زیادہ عرصہ تک اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل اور اس کے بعد بھی عملی طور پر یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ سے جڑے رہے اور اپنی راہنمائیوں کے ذریعہ اس عظیم و قوی طاقت سے فائدہ اٹھانے اور انہیں عالمی استکبار کے خلاف جہاد کی راہ میں آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئے لہٰذا آپ یونیورسٹیوں کے مشکلات اور انکی راہ حل سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ایک صاحب نظر اسلام شناس ہونے کے عنوان سے ان کے نظریات تیسری دنیا کی یونیورسٹیوں اور خاص طور سے اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں کی اصلاح کے سلسلہ میں مفید ثابت ہوں گے۔

ہم یہاں امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریات کا چند عنوانات کے تحت جائزہ لیں گے اور ان کی تشریح کریں گے:

الف۔ ملک کی ترقی یا زوال میں یونیورسٹی کا کردار

حضرت امام خمینیؒ یونیورسٹی کو تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا اور سب سے حساس مرکز جانتے ہیں، جس کی اچھی یا بری صورت حال قوم کی سعادت و خوشحالی اور ملک کی ترقی و کامیابی یا عوام کی ہلاکت و بدبختی اور ملک کی تباہی و زوال میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں امام خمینیؒ کے بہت سے اقوال ہیں جس کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

"یونیورسٹی ایک قوم کی سعادت و خوشحالی اور اسی کے برعکس شقاوت و تباہی کا مرکز ہے، یونیورسٹی کے ذریعہ ہی ایک قوم کی تقدیر کا فیصلہ کیا جانا چاہئے، ایک اچھی یونیورسٹی قوم کو سعادت مند کرتی ہے اور غیر اسلامی یا خراب یونیورسٹی ایک قوم کو پس ماندہ بنا دیتی ہے۔"[1]

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"یونیورسٹی کے ذریعہ ہی ایک ملک مستقل ہو سکتا ہے اور یونیورسٹی کے ذریعہ ہی ایک

---

[1] در جستجوی راہ در کلام امام، دفتر ۲۱

ملک وابستہ اور دوسرے ملک کا پٹھو ہو سکتا ہے۔"[1]

دنیا کے موجودہ حالات و شرائط میں ملکوں کا نظام چلانے والے زیادہ تر یونیورسٹی کے افراد ہیں، صدر جمہوریہ، وزراء، ان کے معاونین اور نمائندے، ڈائریکٹر، اساتذہ، فوج اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدہ دار، ڈاکٹر، انجینئر، جج، پائلٹ، اہل قلم، نامہ نگار، تعلیمی و ثقافتی نیز دیگر اداروں کے نگراں اور ذمہ دار افراد یہ سب زیادہ تر دانشگاہوں کے فارغ التحصیل افراد ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دانشگاہ کے افراد ہیں جو ملک کو چلاتے ہیں۔

اس بنا پر یونیورسٹی کے تعلیم و تربیت کے منصوبوں، طلبہ کی نگرانی کے طریقے، یونیورسٹی پر محیط فکری فضا اور وہ طرز تفکر جوان کے حوالہ کیا جاتا ہے، ملک کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہم اور تقدیر ساز ہیں۔ ایک قوم کی سعادت و عظمت کی منصوبہ بندی اور پیشین گوئی یونیورسٹی کے ماحول میں ہونا چاہیے۔ اگر یونیورسٹی سے فارغ ہونے والے افراد خیر خواہ، باعظمت، صاحب علم، فرض شناس، مخلص، فداکار، مدبر، دیندار، ذمہ دار، سنجیدہ اور محنتی ہوں تو ان کا ملک آباد اور ان کی قوم سربلند اور خوشحال ہوگی کیونکہ کل ملک کو چلانے والے یہی فارغ التحصیل افراد ہوں گے۔

لیکن اگر دانشگاہ کے فارغ التحصیل افراد مادی، منفعت پرست، مطلبی، خودخواہ، ریاست طلب، غیر ذمہ دار، فرض ناشناس، عیش پسند اور کم ظرف ہوں اور اپنے ذاتی منافع کو تمام چیزوں ترجیح دیتے ہوں تو ان کا ملک تباہ و برباد اور ان کی قوم بدبختی، ہلاکت و ذلت کا شکار ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ حاکم طبقے اور ملک کو چلانے والوں کا اچھا یا برا، طرز تفکر، رفتار و کردار زیر تسلط یا نچلے طبقہ کے افراد میں بھی سرایت کرے گا کیونکہ قوم کے تمام افراد زیادہ تر اخلاق و کردار میں اپنے بزرگوں اور امرار کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اس بنا پر حضرت امام (رضوان اللہ علیہ) کے قول کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ دانش گاہ و یونیورسٹی ایک قوم کی سعادت و نیکی اور اسی کے برعکس شقاوت و بدبختی کا مرکز ہے۔

ب۔ یونیورسٹی میں استعمار کا کردار

بڑی اور استعماری طاقتیں یونیورسٹی کے نہایت اہم اور تقدیر ساز کردار پر پوری توجہ رکھتی

---

[1] تعلیم و تربیت در رہنمود ہای امام، ص ۶۸

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے اپنی استعماری سرگرمیوں اور غارت گریوں کے لئے سب سے بڑا امر کرنا قرار دیتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں یونیورسٹیاں بنانے میں مدد دیتی ہیں اور اس ذریعہ سے خود کو قوموں کا خیر خواہ ظاہر کرتی ہیں، ان کے لئے منصوبے تیار کرتی ہیں، کتابیں اور اساتذہ بھیجتی ہیں اور طلبہ کو وظیفے دیتی ہیں۔ انھیں بلامعاوضہ قرض اور مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ طالب علموں کی تربیت کرتی ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ یہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی خدمت کریں، بلکہ اس لئے کہ اپنے استعماری تسلط و حاکمیت اور غارت گری کو قائم رکھنے میں ان سے استفادہ کریں۔ اپنا طرز تفکر اور اپنی ثقافت دانشگاہوں میں رائج کرتی ہیں اور یونیورسٹیوں اور طلبہ کو اپنا ہم رنگ اور اپنے آپ سے وابستہ بنا لیتی ہیں۔ ان سے فکری استقلال و آزادی چھین لیتی ہیں اور ان ہی دانشگاہوں کے فارغ التحصیل افراد کے ذریعہ جو ملکوں کے اونچے اور حاکم و ذمہ دار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان ممالک کے تمام اقتصادی، سیاسی، ثقافتی، فوجی حتیٰ دینی امور کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے کھلم کھلا اور پرانے استعمار کو نئے اور پوشیدہ استعمار میں تبدیل کر کے اپنی آمریت برقرار رکھتے ہیں۔

حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

"وہ سب سے بلند و بالا چیز جس پر کمزور اور اسلامی ملکوں کے دشمنوں نے انسانیت کے مخالفوں کی جانب سے اپنی انگلی جما ئی ہے یونیورسٹی ہے۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر یونیورسٹی ان کے قبضہ میں ہو تو گویا پورا ملک ان کے قبضہ میں ہے۔ یہ یونیورسٹی ہے جو ملک کو چلاتی ہے، یونیورسٹی ہی ہے جو موجودہ اور آئندہ نسل کی تربیت کرتی ہے۔ چنانچہ اگر یونیورسٹی مشرق و مغرب کی غارت گریوں کے قبضہ میں ہو تو ان کے اختیار میں ہے۔ یہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی کی تربیت ہے جو ہمارے جوانوں کو مغرب یا مشرق کی طرف موڑ رہی ہے۔"[1]

"سب جانتے ہیں کہ ایک ملک ایک قوم اور ایک نظام کی تقدیر عوام کے بعد پڑھے لکھے طبقہ کے ہاتھوں میں ہے اور نئے استعمار کا سب سے بڑا مقصد اس طبقہ کے

---

[1] در جستجوی راہ از کلام امام۔ دفتر ۲۱ صـ ۲۲

مراکز کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ ہمارے ملک نے گزشتہ دہائیوں میں جو کچھ بھی صدمہ اور رنج اٹھایا اسی طبقہ کے خیانت کاروں کے ہاتھوں اٹھایا ہے۔ مشرق زدہ اور مغرب زدہ افراد کی مشرق و مغرب سے وابستگی یا دوسرے لفظوں میں ان روشن خیال افراد کے ذریعہ جوان ہی دانشگاہوں سے نکلے ہیں۔"[1]

"یہ بڑی طاقتیں ہمارے جوانوں کو تباہی کی طرف کھینچ لے جانا چاہتی ہیں ہماری یونیورسٹیوں کو استعماری یونیورسٹیاں بنانا چاہتی ہیں۔ ہمارے اقتصاد کو وابستہ کرنا چاہتی ہیں، ہماری فوج کو وابستہ اور محتاج کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی نگاہ صرف ایران پر نہیں ہے، وہ تمام مسلمان ملکوں پر، ان ممالک پر جنھیں اسلام کے زیر تسلط ہونا چاہئے اپنی نظریں گڑائے ہوئے ہیں۔"[2]

بڑی اور استعماری طاقتیں یونیورسٹیوں کو تسخیر کرنے، طلبہ کو جذب کرنے اور ان کی استعماری تربیت کرنے کے لئے بڑے ہی دقیق اور حساب شدہ منصوبوں پر عمل کرتی ہیں جن میں سے چند اہم نکتوں کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے:۔

۱۔ مادیت اور منفعت طلبی کی تربیت

استعماریوں کا ایک اہم کام یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ماحول میں طلبہ، اور اساتذہ کے اندر مادیت اور منفعت طلبی کا شدید رجحان پیدا کر دیتے ہیں اور طلبہ و اساتذہ کی ایسی تربیت کرتے ہیں کہ وہ اپنی تعلیم کا مقصد سند اور منصب و مقام حاصل کرنے، پیسہ کمانے اور مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے۔ یونیورسٹی کے ماحول کو جسے علم و دانش، فضیلت و معنویت و اخلاص اور اللہ کے بندوں کی خدمت کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے آمادگی کا ماحول ہونا چاہئے، اور ایک جملہ میں جسے عبادت گاہ ہونا چاہئے اسے اس کی حقیقت سے کھوکھلا بنا کر مادیت اور منفعت طلبی کا مرکز بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ جو طلبہ ایسے ماحول اور ایسی فکر کے تحت تربیت پائیں گے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد

۱۔ در جستجوی راہ از کلام امام۔ دفتر ۲۱ ص ۱۳۵

۲۔ در جستجوی راہ از کلام امام۔ دفتر ۲۱ ص ۱۴۰

معاشرہ میں قدم رکھیں گے، ملک کو چلانے کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائیں گے وہ ملک اور عوام کی خدمت نہیں کریں گے بلکہ وہ اپنے ذاتی منافعوں کے حصول اور استعماریوں کے خواہشات پر عمل پیرا ہوں گے پھر ایسے ملک و قوم کی سرنوشت روشن و واضح ہے۔

امام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:۔

"جو کچھ اسلام میں پیش کیا گیا ہے مادیات نہیں معنویات ہیں جنھیں یونیورسٹی کے ذریعہ طبقات میں سرایت کرنا چاہئے۔ (اس) یونیورسٹی کو درست و صالح انسان بنانے کا مرکز ہونا چاہئے...۔"

"تمام آسمانی کتابیں انسان کو انسان بنانے کے لئے آئی ہیں۔ اگر انسان صحیح ہو جائے تو تمام چیزیں معنویت کی شکل میں ڈھل جائیں گی، یعنی مادیت بھی معنویت کی صورت اختیار کرے گی۔"...

"اگر آپ نے انسان کو درست کر لیا تو گویا اپنی مملکت کو نجات دیدی۔ اگر آپ نے اصول پسند اور باوفا انسان تربیت کیا، امین انسان، ایک دوسری دنیا پر اعتقاد رکھنے والا انسان، اللہ پر ایمان رکھنے والا انسان۔ اگر آپ کی اور ہماری یونیورسٹی میں ایسے انسان کی تربیت ہوئی تو گویا آپ نے اپنے ملک کو نجات دیدی۔[1]"

"ہمارے جوانوں نے اگر علم حاصل کر بھی لیا تو تربیت سے خالی ہیں، یا تربیت تو ہوئی ہے لیکن اسلامی بنیادوں پر نہیں ہوئی۔ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں تو وہ اس لئے ہے کہ زندگی ایک ورق حاصل کر لیں اور جاکر قوم کے سر کا بوجھ بنیں۔[2]"

"اہم یہ ہے کہ جو شخص یونیورسٹی سے فارغ ہو کر باہر آئے وہ یہ سمجھے کہ میں نے اس مملکت کے بجٹ سے تعلیم حاصل کی ہے، مہارت پیدا کی ہے، اعلیٰ عہدوں پر پہنچا ہوں اور اب مجھ پر لازم ہے کہ اس مملکت کی خدمت کروں، ملک کے استقلال کے سلسلے میں اس کا

---

[1] در جستجوی راہ از کلام امام - دفتر ۲۱ ص۱۹۔۲۰

[2] در جستجوی راہ از کلام امام - دفتر ۲۱، ص۱۲

خدمت گزار ہوں.... جو لوگ اس ملت و قوم سے لگاؤ رکھتے ہیں، جو لوگ خود وابستہ اور بڑی طاقتوں کے خدمت گزار نہیں ہیں وہ آگے بڑھیں اور یونیورسٹی کو ایک ایسا مرکز بنانے کی کوشش کریں جو علم و تہذیب کا مرکز ہو اس کے سارے تخصصات اور مہارتیں خود ملک کی خدمت کے لئے ہوں، یہ نہیں کہ انسان ماہر فن بن کر اپنی اس مہارت سے ہم کو امریکہ کے جال میں پھنسائے۔ ماہر ہو اور اپنی اس مہارت سے ہمارے ملک کو نقصان پہنچائے۔"[1]

۲۔ استعماریوں کا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ طلبہ سے ان کی شخصیت، روحی طاقت اور ان کی مستقل مزاجی چھین لیتے ہیں اور انہیں ایک ہارے ہوئے، ناتواں، بے ارادہ اور غیر پر منحصر شخص کی حیثیت سے تربیت دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے منصوبے کچھ اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے اور منظم کرتے ہیں جن کا نتیجہ اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ یونیورسٹی کے طلبہ مغربی دیار سے اپنے ملک میں آنے والی ترقی یافتہ اور حیرت انگیز صنعتوں کے نمونے دیکھتے ہیں، یا کتابوں، رسالوں اور روزناموں میں پڑھتے ہیں یا ریڈیو اور ٹیلیویژن سے سنتے ہیں یا یورپ گئے ہوئے لوگوں سے ان کی خبریں حاصل کرتے ہیں یا خود ہی ان ممالک میں سفر کرکے ترقی و تمدن کے مظاہر کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں اور علم و صنعت و ٹیکنالوجی کی عظیم طاقت کے سامنے مبہوت ہو کر سر تعظیم جھکا دیتے ہیں۔

یہ طلبہ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، سائنسی علوم، ریاضی اور دیگر علوم سے آشنا ہوتے ہیں جو ان تمام ترقی، تمدن، ایجادات اور صنعتوں کا سرچشمہ ہیں، لیکن جس قدر پڑھتے ہیں اپنے اندر وہ صلاحیت نہیں پاتے کہ علوم سے استفادہ کریں اور صنعت و ٹیکنالوجی کی راہ میں کوئی قدم اٹھائیں اسی وجہ سے بدحواس ہو کر خود اعتمادی کھو دیتے ہیں اور کمزوری اور حقارت کا احساس کرتے ہیں، ترقی یافتہ ملکوں کے صنعت گروں اور دانشوروں کو بہت ممتاز اور غیر معمولی عقل کے مالک افراد سمجھنے لگتے ہیں اور خود کو نیز اپنے ملک کو اس سطح سے نیچے اور کمزور تصور کرتے ہیں کہ علم و صنعت کی راہ میں کوئی قدم اٹھائیں اور تحقیق و تجسس اور صنعت و ایجاد کے میدان میں قدم رکھیں۔

ایسی یونیورسٹیاں تحقیق و تجسس، ترقی و صنعت اور ایجادات کا مرکز نہیں بنیں گی بلکہ استعماری

---

[1] وہ جستجوی راہ از کلام امام - دفتر ۲۱ ص۱۴۳

ملکوں سے وارد ہونے والے علوم اور مفروضات کے بیان کرنے، پڑھنے اور نوٹ کرنے کا مرکز بن کر رہ جائیں گی ان یونیورسٹیوں کے طلاب اور ان سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے علوم کی قبلہ گاہ یا مشرق ہے یا مغرب ہمیشہ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی نئی بات اس دنیا سے پہنچے اور وہ اسے نگل کر منہ چلانا شروع کر دیں۔ وہ کبھی اس کی جرأت و ہمت نہیں کرتے کہ خود تحقیق و عمل کے میدان میں قدم رکھیں اور علوم و فنون میں کوئی اضافہ کریں یا کم از کم دوسروں کے ایجاد کردہ صنائع خود بنائیں اور اپنے ملک و قوم کو استعمار کی وابستگی سے نجات دیں۔

حکام اور ملکوں کی باگ ڈور سنبھالنے والے افراد بھی زیادہ تر ان ہی یونیورسٹیوں سے نکلنے والے افراد ہوں گے جو ایسے ہی احساس حقارت اور طرز تفکر کے ساتھ معاشرہ میں داخل ہوتے ہیں اور ملک کا نظام چلاتے ہیں۔ نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا کہ اپنے ملک کے دروازے اغیار کے لئے کھول دیں، قدرتی ذخائر اور خداداد معدنیات کو بہت ہی حقیر و ناچیز قیمت پر ان کے حوالہ کر دیں اور ان کے بدلے آرائش و سجاوٹ کی کچھ غیر ضروری چیزیں حاصل کر کے عوام تک پہنچائیں اور اپنے ملک کو اقتصادی، فوجی ثقافتی اور سیاسی امور میں ان سے وابستہ کر دیں اور کبھی ملک کو چلانے اور عوام کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ان کے آگے ہاتھ پھیلائیں اور ہزاروں منت و سماجت کے ساتھ ایک قرض حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے وابستگی اور غلامی کی سند پر دستخط کر دیں۔

البتہ اساتذہ، طلاب اور ملکوں کے ذمہ داروں میں اچھے، خیر خواہ اور اصلاح پسند افراد بھی ہوتے ہیں جو اپنے ملکوں کے حالات پر رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے میں مشغول رہتے ہیں لیکن چونکہ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے اور وہ خود بھی ان ہی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ ہیں جس کی عمومی فضا پر کمزوری اور حقارت کا احساس طاری رہا ہے، لہذا اس عظیم مشکل یعنی اغیار سے ملک کی وابستگی کے مسئلہ میں خود کو ناتواں اور عاجز خیال کرتے ہیں۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ذلت و احساس کمتری اور کمزوری یونیورسٹیوں کی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک بلائیں ہیں جنھیں استعماری طاقتیں بڑے ہی نپے تلے پروگرام کے ساتھ تیسری دنیا کے ممالک کی یونیورسٹیوں میں رائج کرتی ہیں۔

امام رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

انہوں نے کوشش کی کہ ہماری ثقافت کو استعماری بنا دیں، تعلیمات کا سلسلہ اس طرح قائم کیا کہ انسانی تعلیم میں ارتقا پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن انہوں نے ہمیں ایسا بنا دیا ہے کہ ہم خیال کریں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ بھائیو! جوانوں کو اپنے آپ پر اعتماد کرنے والا اور مستقل مزاج بناؤ[1]۔"

انہوں نے یونیورسٹی کو ایسی شکل میں ڈھال دیا کہ جو افراد اس میں سے نکلتے ہیں ان ہی غیر ملکیوں کے لئے کارآمد ہوتے ہیں . . . انہوں نے مغرب اور اس کی ترقیوں کا اس قدر پروپیگنڈہ کیا کہ ہمارے جوان یونیورسٹیوں سے مغربی بن کر نکلے[2]۔" 'یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے ان طویل برسوں میں خصوصیت سے گزشتہ پچاس برسوں میں ایسی چیزوں کو جوانوں کے دماغوں میں بھر دیا تھا اور انہیں یہ یقین دلا دیا تھا کہ ہم خود کچھ بھی نہیں ہیں ہماری ساری چیزیں وہاں کی ہونی چاہئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دماغوں میں یہ بات نہ آئی کہ خود بھی کوئی چیز ایجاد کریں[3]۔"

"ہر معاشرہ کا وجود اور اس کا استقلال خود اس کی مستقل ثقافت پر منحصر ہے اور یہ سوچنا سادہ اندیشی ہے کہ ثقافتی وابستگی کے ساتھ دوسرے شعبوں یا کسی ایک شعبہ میں اس معاشرہ کا استقلال و سالمیت ممکن ہے۔ یہ بلاوجہ اور صرف اتفاقیہ نہیں ہے کہ استعماریوں کا اصل مقصد جو ان کے تمام مقاصد میں سرفہرست ہے اپنے زیر تسلط تمام معاشروں کی ثقافت پر حملہ کرنا ہے۔ یہ اتفاقی نہیں ہے کہ مختلف ملکوں منجملہ ایران کے تعلیم و تربیت کے مراکز، پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک استعماریوں خصوصاً مغربیوں اور ادھر گزشتہ برسوں میں امریکہ اور روس کی تاخت و تاز کا نشانہ بنے اور مغرب یا مشرق سے متاثر افراد کی زبانیں اور قلم نیز یونیورسٹیوں کے مغرب زدہ اور مشرق زدہ اساتذہ نے جان بوجھ کر یا بلا سوچے سمجھے یونیورسٹی کی تاسیس سے اب تک کی طویل مدت میں اور خاص طور سے ان گزشتہ دہائیوں میں مغرب و مشرق کے لئے یہ عظیم خدمت انجام دی[4]۔"

---

[1] در جستجوی راہ از کلام امام - دفتر ۲۱ ص ۱۰۶
[2] " " " " " " ص ۱۰۷
[3] " " " " " " ص ۱۲۲
[4] " " " " " " ص ۱۲۱

۳۔ استعماریوں کا تیسرا خطرناک منحوس منصوبہ علمائے دین کو اہل دانشگاہ سے جدا کرنا ہے۔ علمائے دین اور یونیورسٹی کے دانشور معاشرہ کے دو ممتاز، روشن خیال اور محبوب طبقے ہیں اور عوام کے درمیان ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس قدر علمی و فکری توانائی رکھتے ہیں کہ لوگوں کے سماجی امور کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں اور انہیں سعادت و خوشبختی سے ہمکنار کر سکیں اگر یہ دو ممتاز گروہ باہمی تعاون و ہمفکری رکھیں تو ان کا ملک آباد و مستقل اور ان کی قوم سعادت مند و سربلند رہے گی۔ اور استعمار ایسے ملک میں نفوذ و تسلط پیدا نہ کر پائے گا، اسی وجہ سے استعماریوں کا ایک منحوس و خطرناک منصوبہ ان دو گروہوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا ہے۔ وہ اپنے پروپیگنڈوں اور گوناگوں حیلہ بازیوں سے اہل دانشگاہ کو دینی مراکز اور علمائے دین سے بدبین کرتے ہیں، ان کو فضول و بیہودہ رجعت پسند علم و دانش اور ملکی ترقی کا مخالف ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی آبرو ریزی کے لئے جھوٹ بولتے ہیں، تہمت لگاتے ہیں اور ڈرامے رچتے ہیں، دوسری طرف علمائے دین اور دینی مراکز کو یونیورسٹی اور یونیورسٹی والوں سے بدبین بناتے ہیں، ان کو بے دین، لاابالی اور وطن فروش ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح علماء دین گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور سیاست سے خود کو الگ کر لیتے ہیں نیز یونیورسٹی میں بھی ان کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

نتیجہ میں استعماری طاقتوں کے لئے یونیورسٹی پر قبضہ کرنے اور وہاں اپنے منحوس منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے اور طلبہ کو اپنی طرف جذب کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتی اور ایسی صورت میں وہ یونیورسٹی کے طلبہ سے معنویات کو دور کر کے ان میں مادیت کی روح پیدا کر سکتے ہیں اور ان ہی حالات میں وہ یونیورسٹی کو خود سے وابستہ اور اس کے طلبہ کو مغرب زدہ یا مشرق زدہ پروان چڑھا سکتے ہیں۔

حضرت امام طاب ثراہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"انہوں نے ان دو طبقوں کے درمیان بھی جدائی ڈال دی، اس طرح کہ روحانی و علماء دانشگاہ سے بدبین تھے اور اہل دانشگاہ علماء اور روحانیوں سے، اور یہ منصوبہ اس لئے تھا کہ ان دو مؤثر گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیں اور ان سب کو قوم سے علیحدہ کر دیں تا کہ یہ لوگ کوئی کام انجام نہ دے سکیں اور وہ (استعماری طاقتیں) اس ملک سے فائدہ اٹھائیں۔" [1]

---

[1] در جستجوی راہ از کلام امام۔ دفتر ۲۱ ص۱۱۰

"ان دو گروہوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لئے بڑی کوششیں ہوئی ہیں کہ اگر یہ دونوں گروہ متحد ہو جائیں گے تو ملک کے امور میں اصلاح پیدا ہو جائے گی اور یہ دو گروہ علمائے دین اور اہل دانشگاہ ہیں۔ انہوں نے ان دو گروہوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کس قدر کوشش کی یہاں تک کہ یونیورسٹی میں عالم دین کا نام نہیں لے سکتے تھے اور نہ فیضیہ میں کسی اہل دانشگاہ کا ذکر کر سکتے تھے۔"[1]

"جب تک یہ دو گروہ باہم رابطہ رکھیں گے تمہارے ملک کا استقلال محفوظ ہے۔"[2]

"اہل دانشگاہ اہل فیضیہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیں اور مشرق و مغرب کو الگ ہٹا کر خود اپنے ملک کے مصالح کے لئے اور اپنے اسلام عزیز کے مصالح کے لئے عمل کریں اور ہمارے عزیز نونہالوں کی اس طرح پرورش کریں کہ نہ ان کا قبلہ ماسکو ہو نہ ان کا قبلہ لندن اور نہ واشنگٹن، ان کا قبلہ مکہ ہو اور ان کی توجہ خدائے تبارک تعالیٰ کی جانب ہو، وہ اسلام کو اپنی آغوش میں لیں کہ ان کا استقلال اور ان کی عزت اسلام کے سایہ میں ہے۔"[3]

"میرے یونیورسٹی کے عزیزو! اور میرے فیضیہ کے عزیزو! آگاہ رہئے کہ دشمن اس کوشش میں ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان تفرقہ ڈال دے۔ اور یہ بات پیش نظر رہے کہ اگر یونیورسٹی اور فیضیہ کی اصلاح ہو جائے تو آپ کا ملک اپنے استقلال و آزادی کا بیمہ کرلے گا۔"[4]

۴۔ تیسری دنیا کے ممالک کی یونیورسٹیوں کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ استعماری طاقتوں کے پروگراموں اور منصوبوں کے مطابق چلائی جاتی ہیں۔ پروگرام ان سے لئے جاتے ہیں، کتابیں وہاں سے آتی ہیں تعلیمی موضوعات ان کی خواہشات کے مطابق ترتیب و تنظیم کئے جاتے ہیں، اکثر اساتذہ بیرون ملک کے تعلیم یافتہ یا غیر ملکی ہوتے ہیں، اور ایک جملہ میں یونیورسٹی مخفی اور کبھی علنی طور پر استعماری

۱۔ در جستجوی راہ کلام امام ۔ دفتر ۲۱ ص ۱۴۲

۲۔ تعلیم و تربیت در رہنمودہای امام ص ۷۹

۳۔ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ص ۸۲

۴۔ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ص ۸۳

طاقتوں کے زیر نظر ان کے خواہشات و ارادوں کے مطابق چلائی جاتی ہے۔ اس طرح وہ یونیورسٹی کو تسخیر کر لیتے ہیں اور اپنی ثقافت و تہذیب یہاں برآمد کرتے ہیں۔ ان کے پروگراموں کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ ان یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے ان ہی کی خدمت میں رہیں، قوم کے خدمت گزار نہیں۔ پروگراموں کی ترتیب و تنظیم میں مادیت، منفعت پرستی اور سند کے حصول کی روح یونیورسٹی کے طلبہ میں انجکٹ کرتے ہیں۔ خدا کو علوم و سائنس کے میدان سے خارج کر دیتے ہیں۔ علم کو خدا کی جگہ پر قرار دیتے ہیں اور طلبہ کو اس کی عبادت و کورنش پر مجبور کرتے ہیں، انسانی اخلاق نیز معارف و معنویات کو یونیورسٹی کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں۔

تعلیمی پروگراموں کو اس طرح منظم کرتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبہ کہنے اور سننے، یاد کرنے اور مکررات کی تکرار کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کرتے۔ ان میں کبھی تحقیق کرنے، آزمائش کرنے نیز ایجاد و تعمیر کرنے کی جرأت پیدا نہیں ہوتی نتیجے میں ایسی یونیورسٹی اور ایسا ملک کو یا ایک دوسرے سے وابستہ اور استعماری طاقتوں کے غلط مقاصد کی تکمیل کرنے والا ہی بنا رہنا چاہئے۔

اور یہ تیسری دنیا کے ملکوں خاص طور سے اسلامی ممالک کی سب سے بڑی مشکل ہے جس کا حل تلاش کرنا ضروری ہے، اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ پروگراموں اور منصوبوں کی تنظیم کا کام روشن خیال دینی علماء اور یونیورسٹی کے متدین دانشور خود اپنے ہاتھ میں لیں اور یونیورسٹی میں تبدیلی اور ایک انقلاب لائیں۔ ایسی یونیورسٹی جس کا منصوبہ قوم کا درد رکھنے والے افراد ملکی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کریں، یقیناً قوم کی خدمت کرے گی۔ ایسی یونیورسٹی نہیں جس کے پروگرام استعماری طاقتیں مرتب کریں۔ ایسی یونیورسٹی استعماریوں کی خدمت کرے گی کیونکہ وہ اپنے منافعوں کو ہمارے منافعوں پر ترجیح دیں گے۔

امام خمینی طاب ثراہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"ایک قوم کو تہذیب و ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم اپنی تہذیب و ثقافت کے ذریعہ ہی سیاسی زندگی جی سکتی ہے۔ آج ہماری ثقافت ایسی ثقافت ہے جو خود مستقل نہیں ہے اور عوام سے مربوط نہیں ہے، بلکہ اس کا انتظام غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہونا اور ان ہی کے حکم سے اس کا منصوبہ بننا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ ایک سالم تہذیب

وثقافت ہمیں نہیں دیتے اور نہ ہی تہذیب یافتہ ومہذب افراد ہمارے حوالہ کرتے ہیں[1] انہوں نے کوشش کی کہ ہماری تہذیب کو استعماری بنا دیں، ہماری تعلیم کو اس انداز سے قرار دیا کہ انسانی تعلیمی رشد وارتقا پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن انہوں نے ہم کو ایسا بنا ڈالا ہے کہ ہم سوچیں کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔[2]

"چونکہ یہ بات دنیا میں منعکس تھی کہ یونیورسٹی کو بند نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا انہوں نے یونیورسٹی کو کھلا رہنے دیا لیکن اس یونیورسٹی کی صورت میں نہیں جو ایک قوم کے کام آئے اور قوم کے کسی درد کا مداوا کرے۔ انہوں نے یونیورسٹی کو اس شکل میں ڈھال دیا کہ وہاں سے ایسے افراد نکلتے ہیں جو ان ہی غیر ملکیوں کے کام آئیں۔"[3]

"اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ تمام دستگاہوں اور مشینریوں خاص طور سے یونیورسٹی اور کالجوں میں تعلیم وتربیت کے منصوبوں کی بنیادی تبدیلیوں کا ہے تاکہ ثقافتی مشنری غرب زدگی اور استعماری تعلیمات سے نجات پا جائے۔ صحیح بنیادی تغیرات اور ثقافتی وعملی انقلاب کے بغیر فکری انقلاب ممکن ہے۔[4]

"ان ہی خفیہ مشینریوں نے اس کی مہلت نہ دی کہ تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے مقدس، احکام، خاص طور سے اس کے تنظیمی، اجتماعی اور اقتصادی احکام کی طرف متوجہ ہو، اور اپنے گوناگوں پروپیگنڈوں کے ذریعہ انہوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسلام کے پاس عبادی احکام کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے جبکہ اس کے سیاسی وسماجی اصول وقوانین اس کے عبادی مطالب سے کہیں زیادہ ہیں۔[5] "یونیورسٹیوں کو ایسا مرکز بنایئے کہ وہ علم وتہذیب کا مرکز ہو تاکہ تمام لیاقتیں اور تجربات ملک کی خدمت میں ہوں۔[6]

۱ـ در جستجوی راہ از کلام امام، دفتر ۲۱ ص۱۰۳
۲ـ " " " " " ص۱۰۶
۳ـ " " " " " ص۱۰۷
۴ـ " " " " " ص۲۵
۵ـ تعلیم وتربیت در منظور امام، ص۹۳
۶ـ تعلیم وتربیت در منظور امام، ص۹۶

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسی یونیورسٹی ہو کہ آئندہ چند برسوں کے بعد اپنی تمام ضرورتوں کے لئے خود ہمیں تعلیم حاصل کریں۔[1]

ج۔ یونیورسٹیوں کو اسلامی بنانا

حضرت امام طاب ثراہ کے نقطہ نظر سے ملکوں کی مشکلات کا تنہا حل یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اسلامی ہوں۔ قوموں کی تمام بدبختیاں یونیورسٹی والوں کے ذریعہ ہی جنم لیتی ہیں لہٰذا ان کی سعادت و خوشبختی کی بنیادیں بھی یونیورسٹیوں کو اسلامی بنا کر ان ہی یونیورسٹیوں میں پڑنا چاہئے۔ حضرت امام قدس سرہٗ کے نظریہ کے مطابق اگر یونیورسٹیاں تمام جہات میں اسلامی ہو جائیں تو قوموں کی سعادت و خوشبختی اور ملکوں کی عظمت و ترقی کی ضامن بن جائیں گی۔ لہٰذا آپ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"یونیورسٹیوں کو ایک اسلامی یونیورسٹی بنائیے۔"[2]

"یونیورسٹیوں میں بنیادی طور سے تبدیلی آنا چاہئے۔ اور انھیں نئے سرے سے بنانا چاہئے تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر ہمارے جوانوں کی تربیت کریں مغربی تعلیمات کی بنیاد پر تربیت نہ کریں۔"[3]

"یونیورسٹی کو ایک ایسا مرکز بنائیے جو علم و تہذیب کا مرکز ہو تاکہ تمام مہارتیں و لیاقتیں خود ملک کی خدمت میں ہوں۔"[4]

"یونیورسٹی کو اسلامی کیا جانا چاہئے تاکہ جو علوم اس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ قوم کے لئے، قوم کو قوی بنانے کے لئے اور قوم کی ضرورتوں کے مطابق ہوں۔"[5]

"یونیورسٹی کے اسلامی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود مستقل ہو اور خود کو مغرب سے جدا کرے، خود کو مشرق کی وابستگی سے علیحدہ کرے اور ہم ایک مستقل قوم، ایک مستقل یونیورسٹی اور ایک مستقل ثقافت و تہذیب کے مالک ہوں۔"[6]

---

1. تعلیم و تربیت و رہنمود ہای امام، ص۹۱
2. " " " ص۶۹
3. " " " ص۶۹
4. " " " ص۷۰
5. " " " ص۷۲
6. " " " ص۹۳

ہم جو اسلامی یونیورسٹی کی بات کرتے ہیں، تو اس سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک ایسی یونیورسٹی ہو جس کی بنیاد قوم کی ضرورتوں پر استوار ہو اور وہ قوم کے لئے ہو۔[1]"

مغربی یونیورسٹیوں اور اسلامی یونیورسٹیوں کے درمیان فرق قرآن کے ان منصوبوں میں ہونا چاہئے جنھیں اسلام یونیورسٹیوں کے لئے پیش کرتا ہے۔ مغربی یونیورسٹیاں چاہے جس مرتبہ کو پہنچ جائیں صرف طبیعت کو درک کرتی ہیں طبیعت کو معنویت کے لئے مہار نہیں کرتیں۔ اسلام طبیعی علوم کے استقلال کا نظریہ نہیں رکھتا، تمام طبیعی علوم چاہے جتنی ترقی کر جائیں پھر بھی وہ نہیں ہیں جو اسلام چاہتا ہے۔

اسلام حقیقت و واقعیت کے لئے طبیعت کو مہار کرتا ہے اور سب کو وحدت توحید کی طرف لے جاتا ہے۔ تمام مکاتب فکر اور توحیدی مکاتب فکر، جن میں سب سے عظیم مکتب فکر اسلام ہے، اس کے درمیان فرق یہ ہے کہ اسلام اسی طبیعت میں ایک دوسرا معنی و مفہوم رکھتا ہے۔ اسی طب میں ایک دوسرے معنی چاہتا ہے، اسی علم نجوم میں ایک دوسرے مفہوم کا مطالبہ کرتا ہے۔[2]

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، حضرت امام خمینی قدس سرہ اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں کو استعماریوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھتے ہیں، کہ وہ وہاں اپنی مادیت کی تہذیب کو رائج کرتے ہیں اور بڑے ہی دقیق منصوبوں کے ساتھ کم ظرف، خود فروش اور منفعت پرست افراد کی تربیت کرتے ہیں تاکہ اگر وہ کسی منصب یا عہدہ پر پہنچیں تو استعماریوں کے منافع کا پورا خیال رکھیں اور ان کے نئے استعماری منصوبوں اور لوٹ کھسوٹ کے لئے راہ ہموار کرتے رہیں اور ملک کی ویرانی، اس کے طبیعی ذخائر کے غارت ہونے اور اپنی قوم کے فقر و محرومیت پر انھیں ذرا بھی دکھ کا احساس نہ ہو۔

اسی وجہ سے حضرت امامؒ ثقافتی تبدیلی اور یونیورسٹی کے انقلاب کو مشکلات کے حل کی سب سے

---

[1] تعلیم و تربیت در رہنمود ہای امام ص ۱۲

[2] در جستجوی راہ از کلام امام - دفتر ۲۱ ص ۱۳۸

اہم راہ سمجھتے ہیں لیکن یہ انقلاب اسلامی ہو، نہ کہ کسی اور طرح کا انقلاب۔ امامؒ کا اعتقاد یہ ہے کہ اگر یونیورسٹیاں اسلامی ہو گئیں تو اسلامی ممالک کی زیادہ تر مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ اور یونیورسٹیوں میں اسلامی انقلاب کے بغیر ہر طرح کی معاشرتی اصلاح بلکہ کسی طرح کا انقلاب بھی اپنی کامیابی کی آخری منزل تک نہیں پہنچ پائے گا کیونکہ اس کے پاس کوئی قابل اعتبار اجرائی و عملی ضامن نہیں ہے۔ بنابرایں یونیورسٹیوں کے اسلامی ہونے کی ضرورت و اہمیت طالبان فکر اور اصلاح پسند افراد پر پوشیدہ نہیں ہے لیکن اس مفہوم کی [illegible] وضاحت اور اس کا خارج میں عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن اگر روشن خیال اور اسلام شناس افراد اور یونیورسٹی کے علوم کے متدین دانشور باہمی تعاون و تفاہم کریں تو بہت ممکن ہے کہ وہ یونیورسٹیوں کو مکمل طور پر اسلامی بنانے کے لئے ایک جامع منصوبہ مرتب کر سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے حضرت امام طاب ثراہ جو اس اہم ترین اور تقدیر ساز مسئلہ پر خصوصی توجہ رکھتے تھے انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی بہت سی تقریروں کے ضمن میں بہت ہی اہم اساسی نکتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو راہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔ راقم الحروف موصوف کے بیانات [illegible] کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ مستقبل میں ایک اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ پیش کرتا ہے۔

اسلامی یونیورسٹی

اس یونیورسٹی کا مقصد، عالم و دانشور، دیندار، ذمہ دار، خیر خواہ، طاقتور، [illegible] صالح اور باعظمت انسانوں کی تربیت کرنا ہے کہ وہ اپنے علم اور لیاقت کو ملک کی آبادی اور لوگوں کی سعادت و خوشبختی اور رفاہ و ترقی کے لئے کام میں لائیں۔ اور اپنے ملک کے استقلال و عظمت کی راہ میں سنجیدگی سے جد و جہد کریں۔ اس یونیورسٹی کا منصوبہ باہر سے حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اسلام شناس فقہا اور یونیورسٹی سے متعلق علوم کے ماہرین کے ذریعہ لوگوں کی واقعی ضرورتوں کے مطابق مرتب، اور اس پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ اس منصوبہ میں انسانوں کے نفسانی و روحی پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے اور ان کی جسمانی و دنیوی زندگی کی بھی۔ اس منصوبہ میں دینی علوم یونیورسٹی کے علوم سے جدا اور نامانوس نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے منسجم اور واحد امر کو تشکیل دیتے ہیں جس میں انسان کے دو [illegible] حقیقی و واقعی پہلوؤں کی طرف توجہ دی گئی ہو۔ چونکہ طلبہ ہر چیز سے پہلے مسلمان ہیں اور انہیں اسلام کو سمجھنا [illegible]

ہے لہٰذا اسلام شناسی کے ایک مکمل کورس (عقائد، معارف، اخلاق، احکام نیز اسلام کے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی موضوعات) کی تعلیم ان کے لئے تنظیم و تدوین ہو اور ان کے درس کا جزو قرار پائے لیکن بس ان کی ضرورت کے بقدر، نہ کہ تخصص و مہارت کی حد تک۔

درس اخلاق اور نفس کا تزکیہ و تہذیب یونیورسٹی کے باقاعدہ نصابوں کا حصہ ہو بلکہ ان میں سر فہرست ہو اور اس درس کی تعلیم میں مہذب اور باتقویٰ اساتذہ سے استفادہ کیا جائے تاکہ وہ طلبہ کے لئے نمونہ عمل قرار پائیں اور طلبہ ان کی گفتار و کردار کو اپنے لئے نمونہ قرار دیں۔ آداب زندگی، اجتماعی اخلاق خاص طور سے زن و شوہر کے حقوق اور بچوں کی تربیت کے اصول بھی اسی درسی نصاب کا حصہ ہوں گے اس یونیورسٹی میں طبیعی علوم، خدا شناسی سے جدا نہیں ہیں بلکہ علم الارض (GEOLOGY)، علم الحیات (BIOLOGY)، علم النباتات (BOTANY) اور علم نجوم، میڈیکل سائنس، فیزیکس، کیمسٹری اور دیگر طبیعی علوم بھی خدا شناسی کے بہترین سرچشمے شمار ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے اساتذہ و طلبہ اپنی بحث و تحقیق میں دو بہت ہی اہم مقصد پیش نظر رکھتے ہیں۔ پہلا مقصد ملک کو آباد کرنے، لوگوں کی گوناگوں ضرورتوں کو پورا کرنے اور زیادہ سے زیادہ آسائش کی صورت فراہم کرنے کی غرض سے عالم طبیعت میں چھپے ہوئے اسرار و رموز کا انکشاف۔ اساتذہ اور طلبہ اپنے اسلامی اخلاص اور بلند ہمتی کے ساتھ یونیورسٹی اور ملک کو باہر کی وابستگی سے نجات دینے کی کوشش میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کو محض بیان کرنے، سننے، نوٹ کرنے، امتحان دینے اور سند حاصل کرنے والے خشک ماحول سے نکال کر بحث و تحقیق، تجربہ اور ایجاد و صنعت کے فعال ماحول میں لے آتے ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ فقط بیان کرنے، سننے، مغرب سے آئے ہوئے علوم کو بار بار دہرانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دانشوروں کے تحقیقات کے نتائج سے استفادہ کرتے ہوئے خود بھی صاحب نظر اور اہل تحقیق بنیں اور اپنے نئے تحقیقات کے نتائج ملک کے صنعتی مراکز کے حوالہ کریں اور ملک کی خود کفائی اور علمی و صنعتی وابستگی سے نجات کے لئے دوسرے ملکوں کی بھی مدد کریں۔ اس طرح وہ نہ صرف گزشتہ کمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے خود کو اور اپنے ملک کو انسانی تہذیب کے قافلہ تک پہنچاتے ہیں بلکہ خود اس کی اگلی صف میں نظر آتے ہیں۔

دوسرا مقصد جس پر اسلامی یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ کار بند ہیں یہ ہے کہ طبیعی علوم کو خدا شناسی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، اپنی بحثوں، تحقیقات اور تجربات میں کائنات کے خلق کرنے والے

کے علائم و آثار کی جستجو میں بھی ہیں، کائنات کی زیبائیوں اور حیرت انگیزیوں کے مطالعہ اور جہان خلقت میں پوشیدہ اسرار و رموز کے انکشاف کے ذریعہ خلاق کائنات کی قدرت و عظمت، حکمت و تدبیر اور علم و دانائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر اساتذہ اور طلبہ اس نقطۂ نگاہ سے جہان مادی کی طبیعتوں کا جائزہ لیں تو یہ عالم طبیعت معرفت خدا کی ایک بہترین اور خوبصورت ترین کتاب میں تبدیل ہو جائے گا۔

اس یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ مختلف انسانی علوم کے مطالعہ و تحقیق کے دوران ان میدانوں میں اسلامی نظریات کے مطالعہ اور تحقیق سے غفلت نہیں برتتے بلکہ ہمیشہ انہیں بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

اس یونیورسٹی کا ماحول، بحث و تحقیق، علم و عمل، اخلاص و معنویت کا ماحول ہے اور ایک واقعی عبادتگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگ پڑھنے پڑھانے کو ایک الٰہی فریضہ اور بہترین عبادت جانتے ہیں۔

اساتذہ فقط تنخواہیں لینے کے لئے درس نہیں دیتے بلکہ ایک فرض اور عبادت کے عنوان سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ ایسے طلبہ کی تربیت کرتے ہیں اور ایسے دانشور اور فرض شناس انسان بناتے ہیں جو قوم کی خدمت کریں اور اپنے ملک کو وابستگی و غلامی سے نجات دیں اور اسے آباد و خوشحال بنا دیں۔

اس یونیورسٹی کے طلبہ بھی ڈگریوں کے حصول، منصب و مقام اور مال و دولت کے ارادے سے درس نہیں پڑھتے بلکہ قربت کی نیت اور بندگان خدا کی خدمت کے ارادے سے درس پڑھتے ہیں۔ درس پڑھنے کو ایک عبادت اور کلاس و تجربہ گاہ کو بمنزلہ مسجد شمار کرتے ہیں اور خود کو عبادت کی حالت میں مشغول جانتے ہیں۔ درس پڑھتے ہیں تاکہ دانشور و محقق بنیں اور اسلامی ملک کو منظم طور پر چلانے کے لئے کسی شعبہ کی ذمہ داری سنبھالیں۔ اپنے ملک کو آباد اور اپنی قوم کو سعادت مند و سربلند بنائیں۔ تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ عوام کی خدمت کریں اور اپنے ملک کو غیروں کی وابستگی سے نجات بخشیں۔

اسلامی یونیورسٹی میں علوم قدیم و جدید دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوتے، بلکہ وہ دونوں کو علم اور قابل قدر سمجھتے ہیں۔ علماء دین اور یونیورسٹی کے علوم کے ماہر دانشور ایک دوسرے سے جدا اور ایک دوسرے سے بدبین نہیں ہیں، بلکہ دونوں یونیورسٹی میں سرگرم عمل ہیں اور اپنے اپنے فریضہ کو انجام دیتے ہیں اور دونوں ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اور وہ ہے دانشور، ذمہ دار، فرض شناس خدمت گزار، خوش اخلاق، قوی اور نعمت کشانسانوں کی تربیت۔

اس دن کی امید کے ساتھ جب حوزہ علمیہ اور یونیورسٹی کے باہمی تعاون سے اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوں اور یہ یونیورسٹیاں اسلامی ممالک کی خود کفائی، ترقی اور عظمت کی راہ میں ایک قوی مرکز کی حیثیت سے قدم اٹھائیں۔

آغا عبد الحسین سرحدی (پاکستان)

امام خمینی

اور اسلامی انقلاب

انقلاب کے معانی

بدل جانا۔ اُلٹ پلٹ ہونا، تہ و بالا ہو جانا، تغیر و تبدل، اُلٹ پھیر، گردش[1] مفسر لغوی راغب اصفہانی کے نزدیک اس کے معنی قلب الشئ، تصریفہ و صرفہ عن وجہ الی وجہ کقلب الثوب و قلب الانسان ای صرفہ عن طریقتہ[2]۔

کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے کپڑے کو الٹنا یا انسان کو اُس کے رستے سے پھیرنا

اپنے عام مفہوم میں انقلاب سے مُراد یہ ہے کہ نظامِ حکومت میں طاقت کے ذریعے تبدیلی لانا

"REVOLUTION MAY ALSO MEAN ANY FUNDAMENTALLY NEW DEVELOPMENT IN PRACTICALLY ANY FIELD OF HUMAN ENDEAVOR"[3]

۱۔ علمی اردو لغت وارث سرہندی ص ۱۴۲ مطبوعہ لاہور۔

۲۔ المفردات فی غرائب القرآن ص ۴۲۱ مطبوعہ کراچی۔

انقلاب کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ (معیشت، ثقافت، سماجی ڈھانچہ غرض کہ) انسانی مساعی کے کسی بھی شعبہ میں عملاً کوئی بنیادی تبدیلی لائی جائے۔(۱)

استاد شہید مطہری کے نزدیک انقلاب عبارت ہے معاشرے کے بُنیادی طور پر بدل جانے سے یعنی معاشرے کا بنیادی طور پر دِگرگوں ہونا اور بدل جانا (۲)

رہبر انقلاب آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :-

معنیٔ واقعیٔ انقلاب نوسازی یعنی اینکہ ہمہ بخش ہا و قسمتہائی از ساختمان جامعہ راکہ وابستگی ما بہ اربابان خارجی، خراب و نابسامان کردہ است دوبارہ بہ شکل اسلامی و انسانی و برطبق عقیدۂ ایمانی خودمان بسازیم۔(۳)

انقلاب کے حقیقی معنی تعمیر نو ہے یعنی زندگی کے تمام شعبوں کو جنھیں ہماری خارجی طاقتوں سے وابستگی نے بگاڑا اور خراب کیا تھا دوبارہ انسانی و اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور نئے سرے سے اپنے عقیدہ و ایمان کے مطابق بنائیں۔

عوامی اور الٰہی انقلاب

انقلابات کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ایک مشترک خصوصیت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام انقلابات کم و بیش فوج کی مدد سے آئے ہیں چاہے اس کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ رہی ہو۔ جدید تاریخ میں فرانس کا انقلاب برپا کرنے میں سپاہیوں کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا انگلستان میں اولیور کرامویل کی قیادت میں بادشاہیت کے خلاف جو انقلاب برپا ہوا تھا اس میں بھی فوج کا حصہ ظاہر ہے۔

امریکہ نے انگلستان کے خلاف جو جنگِ آزادی لڑی تھی وہ فوج ہی کی مدد سے لڑی تھی۔ دورِ جدید کا سب سے بڑا انقلاب روس کا انقلاب ہے اس میں اگر فوج لینن کا ساتھ نہ دیتی تو اس کی

۱۔ انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز جلد ۱۳ ۲۔ پیرامون جمہوری اسلامی ص ۱۴۱ مطبوعہ تہران شہید مطہری

۳۔ در مکتب جمعہ ج ۱ ص ۲۶ مطبوعہ وزارت ارشاد اسلامی۔

کامیابی ناممکن تھی۔

چین کا سرخ انقلاب بھی فوجی جدوجہد کا نتیجہ ہے یوں کہیئے کہ جب کبھی انقلاب برپا ہوتا ہے فوج اس کے ساتھ ہو تو کامیاب ہو جاتا ہے ورنہ ناکامی اس کا مقدر ہوتی ہے لیکن ایرانی انقلاب تاریخ انسانیت کا وہ پہلا انقلاب ہے جس میں ڈھائی ہزار سال پرانی شہنشاہیت کا تختہ اُلٹ دیا گیا لیکن اس میں فوج نے کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ واقعات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ فوج پوری طرح اس انقلاب کے خلاف تھی اور اس نے عوام کو قتل و غارت کے سیلاب میں غرق کر دینے کی پوری کوشش کی ہزاروں غیر مسلح ایرانی مرد، عورتیں، بچے، اپنے ہی ملک کے فوج کے ہاتھوں جام شہادت پینے پر مجبور ہوئے اور ہزاروں افراد آج بھی فوج کی چیرہ دستیوں کے زندہ گواہ ہیں لیکن عوامی طاقت کے سیلاب نے نہ صرف شاہ کی فوج کو شکست دی بلکہ اس کے پس پشت کارفرما مغربی طاقتوں کو بھی ڈبکیاں دیں (۱)

ایرانی ایرفورس انقلاب کے آخری مرحلے میں عوام کی صف میں شامل ہوئی ہے اور اس کو انقلاب کی کامیابی کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔

انقلاب کے محرکات واسباب

فاؤسٹ نے دنیاوی عیش و عشرت کی طلب میں شیطان سے اپنی روح کا سودا کر لیا تھا۔ رضا شاہ پہلوی دولتِ اقتدار کی ہوس میں ایران کی آزادی اور ساڑھے تین کروڑ ایرانیوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو داؤ پر لگا دیا۔

وہ اس کا غرور کج کلاہی وہ اس کی بے رحمی اور سفاکی ہم وطنوں پر ظلم و ستم کے تازیانے اغیار پر لطف و کرم کی بارش زر اندوزی کا جنون جمہوری حقوق کی پامالی نظم و نسق کی ابتری، رشوت خیانت اور خُرد بُرد کی گرم بازاری خونِ انسانی کی ارزانی اور اشیار خورد و نوش کی گرانی امیروں کی روز افزوں امارت مفلسوں کا روز افزوں افلاس اور پھر حرفِ شکایت زبان پر لانے والوں کو اذیت ناک

---

(۱) مقدمہ دستور ایران مطبوعہ لاہور سید سجاد رضوی

سزائیں غرض کہ ایران کے معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو شاہ کے ناوک جور کا زخم خوردہ نہ ہو۔
رضا شاہ پہلوی نے ایران کو اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا، مجلس کے نمائندے شاہ کی پارٹی رستاخیز سے چُنے جاتے تھے وزیروں کو وہ مقرر اور برطرف کرتا تھا اور پولیس اس کے تابع تھی ملک کی اقتصادی سیاسی پالیسی وہ وضع کرتا تھا۔
ابلاغ عامہ کے ذرائع اُس کے ماتحت تھے غرض کہ ملک کا سارا نظم و نسق اُس کی مرضی سے چلتا تھا۔ قوم تقریر، تحریر، تنظیم اور اجتماع کے جمہوری حق سے محروم تھی۔ ارباب اختیار نہ پبلک کے روبرو جوابدہ تھے نہ پبلک ان سے کسی قسم کی باز پُرس کر سکتی تھی ایران ایک قیدخانہ تھا جس کی چابی شاہ کے جیب میں تھی۔
امریکی تسلط اس جلتی پر تیل کا کام کر رہا تھا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس پر دو چار امریکی مسلط نہ ہوں ان کی تنخواہیں اپنے ہم رتبہ ایرانیوں سے دس گنا بیس گنا زیادہ ہوتی تھیں اور ان کا برتاؤ بھی بڑا حاکمانہ تھا۔ ان کو تنخواہ کے علاوہ دوسری مراعات بھی حاصل تھیں مثلاً ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ اُن پر کسی ایرانی عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔
ایران کی صنعت اور تجارت پر امریکی چھائے ہوئے تھے سب سے اہم اور نفع بخش کاروبار تیل کا تھا جس کا سارا نظام ایک کنسورشیم کے سپرد تھا جس میں پانچ کمپنیاں امریکی تھیں اور ایک ڈچ ایک انگریزی۔
تیل کی پیداوار کی آمدنی کا سارا حساب کتاب کنسورشیم کے غیر ملکی حکام کرتے تھے ان کے بیان کے مطابق ۱۹۷۷ء میں ۳۰۱ کروڑ ٹن تیل نکالا گیا اُس سے ۴۲ ارب ڈالر آمدنی ہوئی مصارف کا تخمینہ ۷ ارب ڈالر تھا جس کو وضع کرنے کے بعد ۳۵ ارب ڈالر جو حکومت کو ملے وہ بھی امریکہ، مغربی جرمنی، برطانیہ، اور فرانس کے ٹھیکیداروں کی جیب میں گئے، یا امریکہ سے جنگی سازوسامان خریدنے میں صرف ہوئے۔ انقلاب کے دوران اگر "امریکہ مردہ باد" اور "امریکیو ملک سے چلے جاؤ اور اپنے پالتو کتے کو بھی ساتھ لے جاؤ" کے نعرے لگتے تھے اور امریکی سفارتخانہ کے سامنے مظاہرے ہوتے تھے تو اس نفرت کے ٹھوس اسباب موجود تھے (۱)

۱۔ انقلاب ایران سید سبط حسن ص ۲۹۱ مطبوعہ کراچی

اسلامی اقدار سے معرکہ آرائی کا اجمالی خاکہ

★ مکمل استبدادیت اور ہر قسم کی آزادی کا خاتمہ، جدید نوآبادیاتی نظام کا نفوذ۔

★ استعمارِ نو یعنی ایک خطرناک اور ناقابلِ دید صورت میں سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی استعمار کا نفوذ۔

★ دین اور سیاست میں دوری پیدا کرنا بلکہ دین کو میدانِ سیاست سے بالکل الگ کر دینا۔

★ ایران کو زمانۂ جاہلیت یعنی اسلام سے ماقبل کی طرف لے جانا اور مجوسی تہذیب کے اجراء کی کوشش محمدی ہجری کی مجوسی کیلنڈر میں تبدیلی اس بات کی مظہر ہے۔

★ اسلامی بیش بہا تہذیب میں تحریف اور تبدیلیاں لا کر اس کو موہوم ایرانی کلچر میں تبدیل کرنا

★ ایرانی مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا اور سیاسی لیڈروں کو جیلوں میں اذیتیں دے دے کر مارنا

★ نام نہاد اصلاح کے باوجود سوسائٹی میں طبقاتی تفاوت پیدا کرنا۔

★ غیر مسلموں کو مسلمانوں پر حکومت میں اور دیگر تمام شعبوں میں فوقیت دینا۔

★ اسلامی قوانین اور اقدار میں یا تو براہ راست تحریف کرنا اور ختم کرنا یا لوگوں کی کلچرل اور سوشل زندگیوں میں فساد کی ترویج اور اشاعت کی شکل میں اسلامی قوانین کا خاتمہ کرنا۔

★ ادبیاتِ فارسی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا اور یہ جتلانا کہ فارسی زبان کو بیرونی اصطلاحات سے نجات دلائی جا رہی ہے (حالانکہ وہ اس فارسی ادب کو تباہ کر رہے تھے جو ہمیشہ اسلام کا محافظ و نگہبان رہا تھا)

★ اسلامی ممالک کے ساتھ روابط کم کرنا اور اسلام دشمن ممالک جیسے اسرائیل کے ساتھ تعلق بڑھانا ایران کے بہادر اور مذہب کا درد رکھنے والے علماء عرصہ سے ان زیادتیوں کی وجہ سے مغموم و فکر مند تھے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے۔ (۱)

اسلام کو جب تیری فضا راس نہ آئے　　　اے میرے وطن تجھ کو کوئی آگ لگائے

۱۔ نہضتہای اسلامی در صد سالۂ اخیر ص ۶۵ مطبوعہ تہران شہید مطہری۔

"زمانہ کار گذشتہ است انقلاب کنید"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا حق آگین ارشاد ہے کہ :-

تمنوا الموت ففیھا ھلاک الجبابرۃ وطھارۃ الارض من الفسقۃ

انقلاب کی آرزو کرو کیونکہ اس میں جابر ہلاک ہوجاتے ہیں اور زمین گناہ گاروں اور فاسقوں سے پاک ہوجاتی ہے ۔

فتنہ کے لغت میں متعدد معنی ہیں منجملہ ایک معنی انقلاب بھی ہے چنانچہ اقرب الموارد میں اس کے معنی اختلاف النّاس فی الآراء ومایقع بینھم من القتال ۔

لوگوں کی رائے میں اختلاف اور ان کے درمیان جنگ وجدل واقع ہونے کے ہیں ۔

انقلاب کو ثورہ کہتے ہیں حدیث میں ثورہ اور انقلاب کے بجائے فتنہ کا لفظ آیا ہے ۔ اس میں روشن قرینہ ہے کہ انقلاب اور فتنہ میں جابر ہلاک ہوجاتے ہیں اور گناہ گار اور مجرم درمیان سے چلے جاتے ہیں ۔

انقلاب ۔ قتل وغارت ، کاموں میں تعطل نقصان اور ضرر واقع ہونے کا نام ہے اور یہ سب کچھ عوام کے خلاف ہے ۔

تو آپ دیکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام نے یہ کیوں فرمایا کہ انقلاب کی تمنا کرو ہمیں معلوم ہے کہ انقلاب کے نتائج بہت سنگین اور دردناک ہوتے ہیں لیکن جابروں کی حکومت اور اس میں جان لیوا گھٹن کو برداشت کرنا اس سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے ۔

مثلاً بہت سے لوگ جیل کی کوٹھریوں اور سیلوں میں سخت اور ناگفتہ بہ زندگی بسر کر رہے ہوں اور نجات کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں تو وہ مجبور ہو کر اس بات کے آرزومند ہوں گے کہ زلزلہ آئے اور جیل کی دیواریں توڑ کر گرا دے تاکہ پہرےدار اور جیلر کسی طرف منہ کریں تو ہم بھی فرار ہوجائیں حالانکہ قیدی یہ جانتے ہیں کہ زلزلہ سے تباہی وبربادی ہوتی ہاتھ پیر شکستہ ہوتے بلکہ موت آجاتی ہے

۱۔ اقرب الموارد ص ۹۰۲ ج ۲ سعید الخوری (مطبوعہ قم)

لیکن پھر بھی وہ جیل سے فرار کے لئے موت کی تمنا کرتے ہیں۔

انقلاب اضطراب اور پریشانیوں کے ماحول میں زلزلہ کے مانند ہے جو پسے ہوئے لوگوں کو بدبختی سے نجات دیتا ہے۔ محمد رضا خان اور پہلوی رژیم کے ۵۸ سالہ تاریک دور میں عوام نے بہت گھٹن اور تنگی میں وقت گذارا آخر جب مظالم اور سختیاں اپنی انتہا تک پہنچیں تو عوام بلبلا اٹھے اور لاکھوں مرد و زن، پیر و جوان سڑکوں پر آکر فضا میں اپنے مکے لہرا کر یہ آوازیں بلند کرنے لگے کہ

ے حکومت اسلامی ایجاد باید گردد　　　این شاہ آمریکائی اعدام باید گردد (۱)

انقلاب کی قیادت

اللہ تعالیٰ نے اہل ایران کی سُن لی اور اُنہیں آیۃ اللہ خمینی جیسا باہمت اور عظیم قائد عطا فرمایا جن کے بارے میں اُن کے جدِ امجد حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا یہ فرمان صادق آتا ہے کہ :-

قم سے ایک شخص لوگوں کو حق کی دعوت دے گا اور اُس کے ارد گرد آہنی عزم کے حامل افراد اکٹھے ہوں گے جنہیں حالات کی تند و تیز ہوائیں متزلزل نہیں کر سکیں گی وہ نہ تو جنگ سے خستہ ہوں گے اور نہ ہی بُزدلی دکھائیں گے۔

خداوند عالم پر توکل کریں گے اور آخرت کی بھلائی متقین کے لئے ہے۔ (۲)

موصوف سرزمین خمین کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے جس نے بچپن ہی میں رضا خان پہلوی کے خلاف جدوجہد میں اپنے پدر بزرگوار کو شہید ہوتے دیکھا جہاد کا جذبہ آپ کو ورثہ میں ملا اسلامی علوم کو حوزہ علمیہ قم میں حاصل کیا اور پہلوی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد اور مجاہدات کا آغاز اس وقت کیا جب رضا خان پہلوی نے سامراجیوں کے حکم سے ایران میں اسلام کی بیخ کنی کی بُنیاد ڈالی۔

۱۹۶۳ء میں آپ امریکا اور شاہ پر براہ راست حملے کے الزام میں گرفتار کئے گئے آپ کی گرفتاری

۱۔ خطابہ تاریخی آملئے فلسفی نہضت روحانیون ایران علی دوانی ص ۴۵ ج ۱۰ مطبوعہ بنیاد فرہنگی امام رضاؑ ایران

۲۔ بحار الانوار ص ۲۱۶ ج ۶۰ مطبوعہ بیروت۔

کی خبر سن کر عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور وہ سڑکوں پر نکل آئے مظاہروں کو کچلنے کے لئے شاہ کی فوج نے قتل عام کیا جس میں پندرہ ہزار سے زائد افراد شہید ہوئے۔

شاہ آپ کو موت کی سزا سنانے والا تھا مگر دیگر مجتہدین اور عوام کے دباؤ کی وجہ سے اس جرم کا ارتکاب نہ کر سکا بلکہ آپ کو آٹھ ماہ قید میں رکھ کر آزاد کر دیا گیا۔

۱۹۶۴ء میں آپ کو دوبارہ اُسی الزام میں گرفتار کر کے ترکی اور پھر نجف اشرف جلا وطن کر دیا گیا۔ امریکہ اور شاہ پر اس دفعہ آپ کا حملہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔

۱۴ سال کی جلا وطنی اور شاہ و امریکہ اور عالمی صہیونیت کے خلاف بے پناہ جدوجہد کے بعد آخر کار امام خمینی کو ۵ ستمبر ۷۸ء کو عراقی بعثی حکومت نے بھی عراق سے نکال دیا آپ عراق سے پیرس چلے گئے۔

پیرس میں دنیا کے اخباری نمائندوں نے چار مہینے تک طرح طرح کے سوال کر کے اور مختلف زاویوں سے آپ کے شب و روز دیکھ کر آپ کی سیاسی بصیرت، دینی عظمت اور اسلام کی قوت کا اعتراف کیا اور کہا کہ ایسا شخص کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں کسی لیڈر نے مسلسل قوم کی قیادت اس طرح نہیں کی جیسے آپ نے فرمائی۔

فلاں دن ہڑتال کرو، فلاں دن نہ کرو، کارخانوں میں کام کی رفتار یہ ہونی چاہیئے پولیس کو یہ نہ کرنا چاہیئے فوج فلاں کا حکم نہ مانے یونیورسٹی کے طلباء یہ کریں وغیرہ وغیرہ۔ اِدھر ایران کی فداکار قوم تھی جو ہمہ وقت سراپا تعمیل بنی ہوئی تھی جسے دیکھ کر دنیا حیران رہ گئی کہ پیرس کے نواح "نوفل لاشاتو" کے علاقے میں واقع ایک سادہ مکان میں سیب کے درخت کے نیچے ایک بوریا نشین شخص ہزاروں میل دور سے نہتے عوام کی قیادت کرتے ہوئے تختِ طاؤس کو کیسے لرزا رہا ہے۔

با سلاطین در فتد مرد فقیر از شکوہ بوریا لرزد سریر[1]

آخر آپ کی رہبری میں ایرانی عوام کی جدوجہد کامیابی کے مراحل میں داخل ہو گئی اور شاہ کو بادلِ ناخواستہ ملک کو چھوڑنا پڑا۔

---

(۱) رہبر عالم اسلام کا قم سے قیام ص۱۱ مطبوعہ فیصل آباد آغا مبین سرحدی۔

بقول رہبر انقلاب آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای اس عظیم قائد کی بے نظیر اور اپنے موقف پر ڈٹ جانے والی شخصیت نے آخری تاریخ کا وہ حیرت انگیز ترین واقعہ یعنی اسلامی انقلاب برپا کیا اور اس ملک کو جو صدیوں سے آزادی اور استقلال سے دور تھا آزادی بخشی اسی لحاظ سے انقلاب اور امام خمینی دو ایسے عناصر ہیں جنھیں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں کیا جا سکتا۔

ایران کا اسلامی انقلاب خمینی کے نام کے بغیر دنیا میں کہیں نہیں پہچانا جاتا کیونکہ یہ وہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے انقلاب کا نعرہ بلند کیا اور پھر وہی تھے جنھوں نے سخت اور دشوار وقت میں قوم کی راہنمائی فرمائی اور ایران کے عوام اسلامی انقلاب کو عظیم ظہور اور دنیا بھر کے لئے لائق تقلید نمونہ بنایا۔

بلا شبہ دنیا کا کوئی انقلاب کسی قائد کے بغیر بر ومند نہیں ہو سکتا ہمارے اس انقلاب میں بھی امام خمینیؒ کے وجود کی برکت اور بے مثال قیادت کی نعمت سے باوصف دو اور عناصر اسلامی ایمان اور قوم کی شجاعت نے بھی اس کی تکمیل کی لیکن امام خمینیؒ۔ قائد انقلاب ہونے کے علاوہ اسلامی فقیہ (یعنی اسی ایمان کے مظہر) اور مرجع تقلید (یعنی عوام کی دل بستگی اور اعتماد کا پرتو) بھی ہیں وہ انبیاء کی طرح اپنے وجود کے ساتھ دین ہیاست، انقلاب، اللہ تعالیٰ اور عوام کو ایک ساتھ محقق کے سامنے پیش کرتے ہیں اُن کا قیام انبیاء علیہم السلام کا قیام یاد دلاتا ہے وہ ہمارے دور میں دینی نظریہ کے دوبارہ زندہ کرنے والے شعلہ ایمان جلانے والے اور عوامی شجاعت کا عظیم ترین مظاہرہ پیش کرنیوالے ہیں یہ سب کچھ اُنہوں نے اپنے پیغامات اور خطبات سے کیا ہے[1] انہوں نے ملت ایران کو اغیار کی اسارت و غلامی سے نجات دلائی اور انہیں تشخص و خودداری سے نوازا۔

بندۂ حق وارث پیغمبران   اُو نگنجد در جہانِ دیگران

انہوں نے استقلال و آزادی کی آواز پوری دنیا میں بلند کی اور دنیا کے ستم زدوں کے دلوں میں امیدوں کے دیئے روشن کر دیئے۔

۱۔ مقدمہ صحیفۂ نور جلد اصل ——— مطبوعہ وزارت ارشاد اسلامی ایران۔

انہوں نے اس عہد میں جب دنیا کے تمام قومی و سیاسی ہاتھ دینی معنویت اور اخلاقی اقدار کو مٹانے کی کوشش میں مصروف تھے ان ہی دین و معنویت اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ایک نظام قائم کیا اور ایک اسلامی سیاسی حکومت کی بنیاد رکھی ۔

انہوں نے مسلسل دس سال تک خوفناک طوفانوں اور تقدیر ساز حوادث میں اسلامی جمہوریہ کو برقرار رکھا اس کی حفاظت و رہنمائی فرمائی اور اُسے محفوظ و مطمئن مقام تک پہنچادیا۔ (۱)

قائد انقلاب کی دینی وانقلابی سوچ

امام خمینی نے سیاست میں علماء کی شرکت کو شجرۂ ممنوعہ سمجھے جانے والے تصور کو ختم کیا اور امت مسلمہ کو اپنا درخشاں ماضی یاد دلایا کہ خاتم النبیین اور ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے عہد زریں میں دین و سیاست آپس میں جدا تھے اگر نہیں تو پھر ہم کس کی پیروی میں اُسے جدا سمجھ رہے ہیں ۔

انہوں نے دور حاضر میں ایک انقلابی نظریہ کے طور پر اسلام کو پیش کیا ہے اُن کی تحریروں اور اُن کے پیدا کردہ انقلاب کی حکمتوں میں یہ احساس روشن اور نمایاں ہے کہ اسلام ایک تہذیب ہے جو مغربی تہذیب سے جزوی نہیں بلکہ کلی اختلاف رکھتی ہے ۔

اسلام کا تصور انسان و کائنات، وحی کی ہدایت و رہنمائی آخرت کی جوابدہی کا تصور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم اس کا تصور اخلاق اور انسانی مساوات و اخوت کا نظریہ اس کے ایسے اجزاء ہیں جو اسے مغربی تہذیب سے یکسر ممتاز کر دیتے ہیں اس کے ساتھ آیۃ اللہ خمینی کے فہم اسلام میں جو عالمی نظریہ (WORLD VIEW) کام کر رہا ہے وہ انتہائی ترقی پسندانہ اور جدید ہے ۔ وہ استعمار کی ہر شکل کے مخالف ہیں اور اُسے انسانیت کے خلاف خوفناک جرم سمجھتے ہیں وہ اگر امریکی استعمار کے دشمن ہیں تو روسی عالمی حکمت عملی سے بھی اُنہیں بھرپور اختلاف ہے وہ استبداد کی ہر شکل کے مخالف ہیں اور دنیا بھر کے مظلوموں (مستضعفین) کے لئے اعلانیہ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں ۔

۱۔ مجلہ توحید شمارہ ۵ جلد ۶ ص ۲۰ مطبوعہ سازمان تبلیغات اسلامی ایران

ان کے نزدیک عدلِ اجتماعی جس میں معاشی و سماجی انصاف کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور وہ سچائی اور خلوص سے اُس پر عامل اور اُس کے قائل ہیں ۔

اُن کے نزدیک انسان کا مطمحِ نظر اونچے سے اونچا معیارِ زندگی حاصل کرنا نہیں بلکہ تخلقوا باخلاق اللہ کی راہ پر چلتے ہوئے تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق اور انسانیت کبریٰ کے منصب پر فائز ہونا ہے ۔

اس مقصد سے وہ ایک صالح اور متقی معاشرہ وجود میں لانا ضروری سمجھتے ہیں ۔ جس میں عدل احسان کا دور دورہ ہو ، ظلم اور استحصال نابود ہو اور " تاکس نباشد در جہان محتاج کس " کی کیفیت کے ساتھ ساتھ ہر شخص رضائے الٰہی کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر سمجھتا ہو اور شعوری کوشش سے ایک بہتر اور سچا مسلمان بننے کی جدوجہد کرے ۔

آیۃ اللہ خمینیؒ کی سوچ کے یہ اجزاء اُنھیں دوسرے انقلابی رہنماؤں سے ممتاز کر دیتے ہیں اور ان کے انقلاب کو فرانسیسی یا روسی انقلاب سے کئی قدم آگے لے جاتے ہیں ۔

فرانسیسی انقلاب کا مقصد صرف آزادی اور حریتِ فکر تھا ۔

روسی انقلاب سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف ایک ردِ عمل تھا ۔

ایرانی انقلاب میں ان اجزاء کے علاوہ ایک انتہائی ارفع عنصر ہے یہ اُس کا تصورِ انسانی ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے جس کے مطابق انسان کا مطمحِ نظر " لاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون " کی حالت کو پہنچنا ہے ۔ یہ تصور انقلابِ ایران کو جوہری طور پر دوسرے انقلابوں سے ممتاز اور مہتم بالشان بنا دیتا ہے اور اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو اس سے ایک سچی اسلامی تہذیب جنم لے سکتی ہے جس کے مقابلہ پر موجودہ مغربی تہذیب ایک بدترین دورِ جاہلیت کی حیثیت اختیار کر جائے گی اس میں انسان کے ایک معاشی حیوان ہونے کی بجائے ایک اخلاقی وجود ہونے کا تصور کارفرما ہوگا ۔ جس کی منزل تزکیۂ نفس کے ذریعہ رضائے الٰہی کے بلند ترین مقام پر فائز ہونا ہوگا ۔ (۱)

۱۔ انقلابِ ایران ایک مطالعہ ص ۱۸۱ ارشاد احمد حقانی مطبوعہ لاہور ۔

انقلاب ایران کے امتیازی پہلو

★ اس انقلاب کا پورا خمیر عقیدۂ توحید اور اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے نافذ کرنے کے عزم سے اٹھا اس کی قوتِ محرکہ محض معاشی مفادات نہیں تھے یہ قوت ایمان کے سرچشمہ سے پھوٹی اور اس نے مادیت کو اس دور میں مادی وسائل پر ایمان کی برتری کا لوہا منوایا۔

★ ہماری تاریخ دربار اور مدرسہ کے پیہم ٹکراؤ کی تاریخ ہے۔ اہل مدرسہ دربار کو قرآن و سنت کے تابع بنانے کی جدوجہد کرتے رہے اور دربار دین کو اپنی قائم کردہ حدود میں پابند رکھنے پر تلا رہا یہ کش مکش اچھے اور برے بادشاہ کے انفرادی کردار کے لحاظ سے کبھی شدید اور کبھی دھیمی رہی لیکن تاریخ کا کوئی لمحہ اس سے خالی نہ رہا۔

ایران دنیا کا پہلا اسلامی ملک ہے جہاں اہل مدرسہ کی قیادت میں اسلام کے پرچم تلے ایک مکمل عوامی انقلاب برپا ہوا۔

★ ایران کے اسلامی انقلاب نے ایک اور عظیم کارنامہ انجام دیا کہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم پانے والے نوجوانوں اور دینی مدارس کے علماء اور طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا و متحد کر دیا۔۔۔ مغربی تعلیم کی آغوش میں پروان چڑھنے والے نوجوانوں نے علماء کی قیادت قبول کی اور خود کو دوسری صف میں رکھنے پر رضامند ہو گئے۔

★ آیۃ اللہ خمینی کی قیادت میں تاریخ کا انوکھا تجربہ دنیا کے سامنے آیا کہ بالکل نہتے عوام محض اپنے اتحاد عزم و ایمان اور جذبۂ شہادت کے ذریعے بڑی سی بڑی قوت کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں اس تجربے نے دنیا کے تمام مظلوم اور کچلے ہوئے لوگوں میں نئی امنگ پیدا کی ان کے اندر چھائی ہوئی مایوسی کو دور کر کے یقین و اعتماد کی تازہ روح پھونکی۔

★ انقلاب ایران نے بڑی طاقتوں اور بالخصوص امریکہ کے غرور کو توڑنے اور چھوٹی اقوام کے اعصاب پر اس کی ہیبت کے بوجھ کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

★ مذہب پر اب تک "رجعت پسندی" کی پھبتی کسی جاتی تھی اور اشتراکیت کا دعویٰ یہ تھا کہ انقلاب صرف معاشی عوامل کے ذریعے برپا ہو سکتا ہے مغرب کی سیکولر دنیا بھی مذہب کو کوئی

سیاسی قوت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی انقلاب ایران نے ان دونوں کا دماغ درست کر دیا ہے

★ اسلامی انقلاب کی کوشش مختلف ممالک میں طویل عرصے سے جاری ہیں لیکن یہ شرف صرف ایران کو حاصل ہوا کہ اس نے تمام مزاحم قوتوں کو زیر کر کے اقتدار تک پہنچنے کی منزل سر کی اور اس معاملے میں اولیت کے درجے پر فائز ہوا۔ (۱)

انقلاب ایران کی کامیابی کے راز

انقلاب فرانس اور انقلاب روس کی بنیاد مذہب سے بغاوت پر تھی تو انقلاب ایران کی مذہب کی طرف مراجعت پر اور مذہب کی طرف مراجعت ہی مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ کی طرف لوٹاتی اور ترقی دلاتی ہے۔

اس بات کی وضاحت سید جمال الدین اسد آبادی المعروف بہ افغانی نے بہت خوبصورت انداز میں فرمائی ہے چنانچہ ایک خطاب کے دوران کسی نے آپ سے پوچھا کہ مسلمانوں کے زوال کی بڑی وجہ کیا ہے سید صاحب نے جواب دیا۔ "ترکِ مذہب"

سوال کرنے والے نے دوسرے سوال کا جواب چاہا اور استفسار کیا کہ عیسائیوں کے عروج کی وجہ کیا ہے؟ اس پر سید صاحب نے جواب دیا: "ترکِ مذہب"

پورے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔

اور سوالات کی بوچھار میں یہ پوچھا گیا کہ مذہب کے ترک کیے جانے کی وجہ سے ایسے بنیادی طور پر متضاد نتائج کیونکر پیدا ہوئے؟

سید نے اس وقت جواب دیا عیسائیت کے برخلاف اسلام ترقی کا مذہب ہے

پس جب مسلمانوں نے اپنے مذہب کو ترک کر دیا تو انہوں نے ترقی کرنا بند کر دی۔

بانیٔ انقلاب اسلامی امام خمینیؒ نے بھی کامیابی کا راز یہی بتایا چنانچہ فرماتے ہیں کہ "جو بات انقلاب میں اس ایرانی قوم کی مددگار ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی

۱۔ انقلاب ایران کیا کھویا کیا پایا۔ محمد صلاح الدین ص ۲۷ مطبوعہ کراچی۔

ہمیت کو اس طرح سمجھ لیا جس طرح کہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں نے سمجھا تھا وہ اسلام
یقین رکھتے ہوئے اس پر ایمان لائے ۔

رہبر انقلاب آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای فرماتے ہیں کہ ہمارے محبوب ہمنلے زا تحادسے عوامی
الی چارے کے ذریعے اسلامی انقلاب جیتا ہمیں کامیابی کے اس راز کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے
ایران نے سادگی کو اپنا کر اسلام کی روش اپنائی ہے اور سادگی نے اس کے ہاتھ سے کاسہ
الی لے کر اسے قرآن اور تلوار تھما دیئے ہیں ۔
مسلمانوں کی کامیابی کے یہی اوزار و ہتھیار ہیں ۔

ایران کا اسلامی انقلاب اور امت مسلمہ کی ذمہ داری

ایران میں کئی صدیوں بعد اسلام کو امور مملکت کے فیصلے کرنے کے مقام پر لا کر کھڑا کیا گیا ہے
ور سیاست بلا مذہب کی پالیسی ترک کرکے اسلام کی حقیقی پالیسی اپنائی گئی ہے ۔
ایران میں آج وہاں کے سارے مسائل کا حل اسلام میں ہے ۔
اسلام دین فطرت ہے یہی دنیا کا آخری دین ہے جسے قیامت تک انسانیت کی ہمہ جہت
ہنمائی کرنی ہے اس لئے صدیوں بعد اسلام کی سیاسی، معاشی، اخلاقی، سماجی اور بین الانسانی
روایات کو ایران میں بروئے کار لایا جا رہا ہے ۔
جو گروہ نفاذِ اسلام کے معاملے میں صدیوں بعد پہل کر رہا ہے اس سے غلطیاں بھی
ہوں گی لیکن اگر فراخدلی موجود ہو اور دوسرے مخلصین کے مخلصانہ مشورے بھی اس کو ہمہ وقت
حاصل ہوں تو یہ تجربہ یقیناً کامیاب رہے گا ۔
دورِ حاضر میں اسلامی نظام کے تجربے کو کامیاب کرنا پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے ۔
گر یہ تجربہ ایران میں ناکام ہو جاتا ہے تو یہ پورے عالم اسلام کا ایک عظیم نقصان ہوگا اور تمام دنیا
میں اسلامی تحریکیں بیک وقت دم توڑ دیں گی ۔
دنیا کے لوگ یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دورِ حاضر میں اسلام بہ حیثیت نظام زندگی

نہیں چل سکتا۔

یہ بات تو دنیا کے کامیاب کفار نے خود مسلمانوں کے اندر مرعوب ذہنوں میں پہلے ہی اُتار رکھی ہے جس کا بارہا اظہار بعض علمائے کرام تک کی گفتگوؤں میں جھلک جایا کرتا ہے۔

اس کے بعد تو لوگ علی الاعلان کہیں گے کہ اگر ہزاروں انسانوں کی جانی قربانیاں دے کر بھی اسلامی نظام قائم نہیں رہ سکتا تو پھر دورِ حاضر میں یہ ناقابل عمل نظام ہے۔

اس لئے ایران انقلابیوں کو بھی اس بھاری ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیئے کہ وہ پوری دنیا کے سامنے یا تو اسلام کے حق میں کامیابی کے سچے گواہ بن کر رہیں گے اور یہ بڑی سعادت ہے اور یا خدانخواستہ ناکامی کی صورت میں وہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کے جھوٹے گواہ بن جائیں گے اور یہ بہت بڑی ذلت و رسوائی ہے اُنہیں اس ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے دنیا کی تمام تحریکوں کے ذمہ دار لوگوں سے رابطہ قائم کر کے ان کا فکری اور عملی تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔

دنیا کے مسلمانوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس انقلاب کو کامیاب کرنے کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کریں۔ ناکامی کی صورت میں کوئی شخص دنیا کو یہ کہہ کر مطمئن نہیں کر سکے گا کہ یہ تو شیعہ انقلاب تھا، اسلامی انقلاب نہیں تھا دنیا سُنّی کے انقلاب کو شیعہ انقلاب تسلیم کرتی ہے اور نہ دوسرے کسی انقلاب کو سنی انقلاب تسلیم کرے گی۔

یہ تو مسلمانوں کے گھر کے تفریقات ہیں، کافر دنیا تو صرف اسلام کو جانتی ہے وہ یہ ناکامی اسلام کے کھاتے میں ڈال کر اپنی گمراہی پر اور زیادہ مطمئن ہو جائیگی اور یہ اسلامی دنیا کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔(۱)

مشہور سیاسی رہنما احمد بن بیلا سابق صدر الجزائر نے بھی یہی خدشہ ظاہر فرمایا ہے "اگر ایران کے اسلامی انقلاب کو شکست ہوئی تو بڑی بدبختی ہوگی۔ انقلاب ایران اس صدی کا معجزہ ہے اس کی شکست کے آثار ہزار سال تک باقی رہیں گے اور پھر اس صدی کی یہ شکست اسلامی دنیا اور تیسری دنیا کی شکست ہوگی۔ اس دور میں جبکہ ایران کے اسلامی انقلاب نے اُن کی فکری

---

(۱) سفرنامۂ ایران، سید اسعد گیلانی مطبوعہ لاہور ص۲۲۹

رہنمائی کی ہے امت مسلمہ کا فرض ہے کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی بھرپور حمایت کرے جو مسلمان اور اسلامی ممالک امام خمینی کی حکومت کی مدد نہیں کر سکتے وہ اسلام سے خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں[1]

ایران کا اسلامی انقلاب عالم کے مسلمانوں اور محروم و مظلوم انسانوں کے لئے خدا کا تحفہ و ہدیہ ہے جس کی روشنی اور خوشبو ہر طرف پہنچ رہی ہے۔ ہم سب کا فرض ہے ہم خدا کی اس نعمت کی حفاظت کریں

اسلامی انقلاب کی برکات

★ ملت ایران اسلام کے سہارے ملت واحدہ میں بدل گئی ہے وہاں اب تمام فرقوں میں مذہبی یگانگت موجود ہے۔ اُن کے ہاں مسجد صرف اللہ کا گھر ہوتی ہے شیعہ یا سنی نہیں ہوتی وہ چاہتے ہیں کہ ساری مساجد سارے مسلمانوں کی عبادت کے لئے ہوں جس مکتب فکر کے نمازی زیادہ ہوں اس مکتب فکر کا امام نماز پڑھائے اور دوسرے لوگ اپنے مکتب فکر کے طریقے پر اُس کے پیچھے نماز پڑھیں نماز سب کو اللہ کی پڑھنی ہوتی ہے اور کوئی امام کسی کی نماز میں حائل نہیں ہوتا۔

★ ایران میں نماز جمعہ کا کوئی اجتماع لاکھ ڈیڑھ لاکھ افراد سے کم نہیں ہوتا۔ شہروں میں نماز جمعہ ایک ہی جگہ ادا کی جاتی ہے۔ تہران میں جمعہ کی امامت خود ولی امر مسلمین فرماتے ہیں۔ صوبوں میں وہاں کے گورنر امامت کرتے ہیں جمعہ کے خطبے سیاسی و عبادی ہر دو موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ راقم الحروف تہران کے جمعہ میں شرکت کر کے بہت متأثر ہوا اسلام کے نام پر مرد و زن کا اتنا عظیم اور پرخلوص روحانی اجتماع گویا اسلامی حکومت کے حق میں ہفتہ وار ریفرنڈم ہے جس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔

★ اسلامی انقلاب نے عوام کو حکومت میں شریک بنایا ہے اب عوام اور حکومت میں کوئی ذہنی فاصلہ نہیں رہا جس کے سبب ایران میں کبھی بھی مارشل لاء نافذ نہیں ہو سکتا۔

۱۔ نہضت روحانیون ایران، ملحقات جلد ۱۰ ص ۴۴۳ مطبوعہ ایران۔

★ ایران میں عورت کو مرد کے ساتھ مساوی حقوق حاصل ہیں اور وہ مردوں کی طرح قومی امور میں برابر کی شریک ہے۔

★ یونیورسٹیوں کے نصاب کو اسلامی اور قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے درسی کتب بدلی گئیں اور یونیورسٹیوں کو اسلامی لائحہ عمل کے مطابق دوبارہ کھولا گیا۔

★ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور مطبوعات جیسے ذرائع ابلاغ کو بے ہودہ ثقافت سے پاک کر کے اسلامی ثقافت کے لئے راہ ہموار کی گئی۔

بے پردگی اور بے حیائی کو فروغ دینے والی فلموں کی نمائش ختم کر کے اسلامی اقدار کو فروغ دینے والی فلموں کی تیاری کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کی گئیں۔

★ مسلم خواتین کے درمیان برہنگی اور بے پردگی کا رجحان ختم کر کے اسلامی پردے کو فروغ دیا گیا جس کے اثر سے باہر سے آنے والی خواتین بھی باپردہ رہنے لگی ہیں۔

★ ملک کے اقتصادی نظام کو جو ماضی میں صرف تیل کی برآمدات پر منحصر تھا دیگر وسائل کے ذریعے جن میں صنعتی اور زرعی وسائل بھی شامل ہیں وسعت دی گئی۔

★ سابقہ بینکاری کے نظام کو جو سود کی غیر اسلامی بنیادوں پر استوار تھا ختم کر کے اسلامی بینکاری کا نظام نافذ کیا گیا۔

★ دیہاتوں کی ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی جس کے سبب شہروں میں آباد دیہاتی اب دوبارہ دیہات کی جانب لوٹ رہے ہیں۔

★ سابقہ شاہ کے دور کے تمام قرضے ادا کر دیئے گئے اور کسی دوسرے ملک سے قرضہ لئے بغیر زبردستی مسلط کردہ جنگ کے اخراجات پورے کئے گئے۔

★ غربت، جہالت، ناانصافی اور مظالم کو ختم کرنے کے لئے مختلف کمیٹیوں اور فاؤنڈیشنوں کے ذریعے بنیادی اور پائیدار اقدامات کئے گئے۔ جنگ زدہ متاثرین اور مستضعفین کے ضروریات زندگی مثلاً علاج، رہن سہن، تعلیم، روزگار اور کاروبار کا خصوصی بندوبست کیا گیا۔

★ ایران میں جیل کا تصور بدل دیا گیا جیل کو وہ اب تربیت گاہ کا نام دیتے ہیں۔

★ اس انقلاب نے قوم کو خود کفالتی کی راہ پر لگا دیا اب ایرانی اس فارمولے پر کہ

"آنچہ از خاک تو رست اے مردِ حُر　　آن فروش و آن بپوش و آن بخور"
عمل کرتے ہوئے ملکی ساخت کی چیزیں خریدتے اور استعمال کرتے ہیں۔

* غیر ملکی ماہرین کے جانے کے بعد ملکی ماہرین میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے جنگ اور غیر ملکی اقتصادی بائیکاٹ نے قوم کو بیدار اور خود کفیل بنا دیا ہے
آج ایران میں ملکی ماہرین بیرونی امداد کے بغیر گولا بارود سے لے کر میزائیل تک اور ہیلی کاپٹر سے لے کر لڑاکا طیاروں تک خود بنانے لگے ہیں

* آبادان ریفائنری جس کے بارے میں امریکی ماہرین کا خیال تھا کہ یہ اس حد تک تباہ ہو چکی ہے کہ اب اس کی تعمیر نا ممکن ہے اسے اسلامی انقلاب کے ماہرین نے چند ماہ میں قابل استعمال بنا لیا ہے۔

* مشترکہ مفادات کی بنیاد پر مختلف ممالک سے سیاسی تعلقات استوار کئے گئے۔
تیسری دنیا کے ممالک کے ساتھ اقتصادی مبادلات کی شرح میں ۲۵ فی صد اضافہ ہوا جو انقلاب سے قبل ۹ فیصد تھا۔

* فلسطین کے مظلوم عوام سے اظہارِ یکجہتی کے لئے ماہِ رمضان کے آخری جمعہ (جمعۃ الوداع) کو عالمی سطح پر یوم القدس قرار دیا۔

* افغانستان سے روسی افواج کو نکالنے کے لئے افغان مجاہدین کی بھرپور مدد کی۔

* اسرائیل اور جنوبی افریقہ جیسی کٹھ پتلی حکومتوں اور امریکہ کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی تعلقات ختم کر دیئے گئے اور اسرائیلی سفارتخانہ کو فلسطینی سفارتخانے میں بدل دیا گیا۔

اسلامی انقلاب کے معنوی ثمرات

الحمد للہ اب ایران کا اسلامی انقلاب عالم بھر میں برآمد ہو چکا ہے اور ربع مسکون کے چپہ چپہ پر اللہ اکبر کی لاہوتی صدا گونج رہی ہے۔
اللہ تعالیٰ کی ذات کو سُپَر سمجھنے والوں اور لا شرقیۃ لا غربیۃ اسلامیۃ اسلامیۃ کی صدائیں لگانے والوں کی سیاست سے ایک دنیا اسلام کی عظمت اور صداقت کی قائل اور معترف

ہو رہی ہے جس کے اثرات وثمرات اب دنیا جہاں کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں۔
یہاں نمونۃً چند ایک کو ذکر کیا جاتا ہے۔

خانۂ خدا میں

ایران کے فرزندانِ اسلام نے خانۂ خدا میں جاکر مولا علیؑ کی پیروی میں مشرکین سے برأت کا درس دے کر امت مسلمہ کو یہ جتلا دیا ہے کہ ہمیں مرکز توحید کے ایمانی اجتماع میں عصرِ نو کے لات و منات اور طاغوت سے بیزاری کا اعلان کرنا چاہیئے کیونکہ خانۂ خدا صرف معبد ہی نہیں بلکہ اسلامی تحریکوں کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے اگر ہم اللہ کے گھر جاکر بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنا دکھ نہیں سنا سکتے اور زخم نہیں دکھا سکتے اور ظالموں کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے تو اس سے بڑھ کر اور کون سی موزوں جگہ ہے جہاں جاکر ہم ایک دوسرے کا غم بانٹیں اور اس کے لئے حل سوچیں کتنے افسوس کی بات ہے دنیا کی ہر ملت اور قوم نے تو اپنے دکھ درد سنانے اور اس کا مداوا کرنے کے لئے پلیٹ فارم اور فورم بنا لئے ہیں لیکن قدرتی وسائل سے مالا مال تقریباً ایک ارب مسلمان اپنی دینی و ملی ضرورتوں کے لئے مرکزِ توحید خانۂ خدا کو اپنی پناہ گاہ اور پلیٹ فارم کیوں نہیں بنا سکتے حالانکہ خانۂ خدا کو جانے اور وہاں فریضۂ حج بجالانے میں بہت سے منافع اور فوائد ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہے اور اُن فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تمام اسلامی ممالک ایک دوسرے کے اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کو جانیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔

ھندوستان

جس بات سے میں اسلامی جمہوریہ ایران کا بہت زیادہ احسان مند ہوں وہ یہ ہے کہ آپ سمجھیے میں اپنے دین کی طرف واپس آیا ورنہ میں پہلے نام کا مسلمان تھا اور مجھے یہ کہنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں ہے کہ کروڑوں مسلمان جو اپنے دین سے مغربی ذرائع ابلاغ کی غلط بیانی اور اسلام دشمنی کی وجہ سے اور اسلام کو بدنام کرنے والے مضامین کے شائع ہونے کے سبب ہٹتے جا رہے تھے وہ اس انقلاب کی وجہ سے دوبارہ اسلام پر واپس آگئے۔

(جناب محمد طاہر صدیقی ایڈوکیٹ)

کینیڈا

جناب علامہ حافظ سید ریاض حسین صاحب نجفی صدر وفاق علماء شیعہ پاکستان اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں کہ ڈھائی سال قبل جب میں ایران گیا تو ایک عالم دین کے پاس دو کینیڈین لڑکیاں موجود تھیں جو کہہ رہی تھیں۔ ہم کینیڈا سے آئے ہیں اور ہمارے والد اسی ایران میں کسی زمانے میں سفیر بھی رہ چکے ہیں ہمارے یہاں کے لوگوں سے تعلقات اور مراسم ہیں اب ہم اپنی والدہ کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ اس دفعہ ہمارے سفر کا مقصد یہ ہے کہ ہم خمینی والا اسلام چاہتے ہیں اور اس کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو سب نے کہا خمینی کا اپنا اسلام کوئی نہیں کوئی نیا اسلام نہیں آیا۔

اُن لڑکیوں نے کہا ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ عیسائیت یہ ہے کہ اتوار کے دن آدمی گرجے چلا جائے اور عبادت کرے اور اسلام یہ ہے کہ جمعہ کے دن مسجد میں چلا جائے اور تھوڑی سی عبادت کرے لیکن آیۃ اللہ خمینی کے آنے سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ اسلام تو ایک عظیم طاقت ہے جس نے پوری دنیا کے ذہن میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور ہر شخص کو متاثر کیا ہے (۱)

فلسطین

تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما ہانی الحسن فرماتے ہیں کہ "یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ انقلاب ایران کامیاب ہو گیا ہے دنیا کے تمام سیاسی تجزیہ نگار حیرت زدہ ہو گئے کہ کس طرح اسلامی انقلاب اور حکومت اسلامی کی بازگشت ہوئی جب میں چین کی ایک فوجی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا تو ہمیں وہاں پڑھایا گیا کہ ہمیں رات کو دشمن پر حملہ کرنا چاہیئے۔ لیکن آپ نے بتایا کہ روشن دن کو بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں سکھایا گیا کہ مسلح ہو کر حملے سے کامیابی ملتی ہے مگر آپ نے بتلایا کہ اپنے خون سے بھی دشمن پر حملہ آور ہوا جاتا ہے۔ ہمیں سکھلایا گیا کہ اگر کوئی شہید ہو جائے تو فوراً اس کی لاش میدان سے ہٹائی جائے لیکن آپ نے ہمیں سکھلایا کہ شہید کا لاشہ ہاتھوں میں لے کر بھی دشمن پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ رہبر عالم اسلام کا قم سے قیام ص ۱۴۸ مطبوعہ فیصل آباد۔

دنیا حیران ہوگئی کہ آیۃ اللہ خمینی نام کا ایک معمر عالم دین جو چٹائی پر بیٹھتا ہے کئی ملین مردوں بلکہ پردہ دار عورتوں کو بھی ظلم کے خلاف جنگ کے لئے بلا سکتا ہے۔

میں ایران اس لئے نہیں آیا کہ آپ کو انقلاب فلسطین کے بارے میں کچھ بتاؤں بلکہ میں تو آپ سے یہاں کچھ سیکھنے آیا ہوں ۔ "(۱)

دیکھا اس انقلاب کی برکت کو آزمودہ کار کہنہ مشق انقلابی بھی اب یہاں درس لینے آتے ہیں ۔

امریکہ

ایسے ماحول میں جب کہ آیۃ اللہ خمینی کی کتاب تصویر، تحریر یا کوئی خط اپنے پاس رکھنا اور آپ کا نام لینا سخت ترین جرم تھا امام خمینی نے کیسٹوں کے ذریعہ سے اپنے عوام سے رابطہ رکھا اور برابر ملت کو صبر و استقامت اور مبارزہ و مجاہدہ کی تلقین کرتے رہے تا اینکہ انقلاب کامیابی سے ہم کنار ہوا ۔

ایک ایرانی نوجوان جنھوں نے ان ہی دنوں امریکہ میں صحافت پر ڈاکٹریٹ کر لیا ہے بتایا کہ پچھلے چند مہینوں میں امریکہ کی جرنلزم کی یونیورسٹی میں "CASSTTE REVOLUTION" یعنی "بھری ہوئی کیسٹوں کا انقلاب" کے نام سے ایک نیا سلسلۂ تدریس شروع کردیا ہے کیونکہ ان ہی کیسٹوں کی مدد سے ایران صنم پرستی سے ایمان کی طرف، حکومتی نیشنلزم سے اسلامی نیشنلزم کی طرف، اسرائیل دوستی سے اسرائیل دشمنی کی طرف عربیوں سے نفرت کے بجائے ان کے پشت پناہوں سے نفرت کی طرف امپریلزم اور صیہونزم کے مرکزوں سے جمہوریت اور آزادی کے سرچشموں کی طرف اور ترقی پذیری سے ترقی یافتہ ہونے کی طرف منتقل ہوگیا ۔

دیکھا خود کو سپر سمجھنے والی نام نہاد طاقت بھی اسلامی انقلاب کے ایجاد کردہ فارمولے کو شامل نصاب کرنے پر مجبور ہوگئی ۔

بلکہ اب تو امت مسلمہ کے ذمہ دار افراد دوسری نام نہاد طاقتوں کے مقابلے میں اسلامی جمہوریہ ایران کو اپنی طاقت اور پناہ گاہ سمجھتے ہوئے اس پر بھروسہ کرنے لگے ہیں جیسا کہ یاسر عرفات نے امام خمینیؒ سے ملاقات کے دوران کہا کہ میں نے موشے دایان اور ریگن سے کہا کہ اگر تم اپنے پشت پناہ

۱۔ المختار من اقوال الامام الخمینی جلد ۱ ص ۱۸ مطبوعہ وزارت ارشاد اسلامی ۔ ایران ۔

بنا سکتے ہو اور امریکہ پر اعتماد کر سکتے ہو تو میں بھی اپنے مدد گار پیدا کر سکتا ہوں چنانچہ میں نے بھی ملت ایران اور آیۃ اللہ خمینی کی رہبری پر اپنا تکیہ کر لیا ہے۔ (۱)

اور تو اور ایران کے اسلامی انقلاب کی سطوت اور حیرت انگیز کامیابیوں کو دیکھ کر جمی کارٹر سابق صدر امریکہ بھی اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ اسلام کے حقائق و احکام کی ریسرچ کرے (۲)

برطانیہ

بی بی سی نے اس سال ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی کی وفات کے بعد اسلامی نظام کے طریقے پر اپنے ایک تبصرے میں کہا ہے کہ اس بنیاد پرست نظام کے قوی ہونے کی ایک بڑی مثال سلمان رشدی کے خلاف آپ کا فتویٰ ہے۔ مغرب والوں کے برعکس اس فتوے سے مسلمانوں کی رائے انتہائی سخت ہو گئی ہے آیۃ اللہ خمینی کی وفات کے بعد بھی اس کا اثر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

لبنان میں کئی مغربی باشندے ایرانی نواز گروہوں کے یرغمالی ہیں۔ حج کے دوران بھی مکہ مکرمہ میں بم پھٹے مشرق وسطیٰ میں کئی جگہ انتخاب میں بنیاد پرستوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مغربی یورپ میں اسلامی طرز معاشرت اسکولوں تک جا پہنچی ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا چیلنج اب ایک عالمی چیلنج ہے۔ (ریڈیو رپورٹ) (۳)

علاوہ ازایں اور ممالک مثلاً روس وغیرہ میں مسلمانوں کو مذہبی آزادیاں اور تحفظات ملے یہ سب کچھ اس الٰہی و ایمانی انقلاب کے اثرات و برکات ہیں۔

ہم ذیل میں چند اہل نظر اور دیدہ ور حضرات کے بے لاگ تجزیئے اور تبصرے نقل کرتے ہیں جو ایران کے اسلامی انقلاب کی عظمت و حقانیت پر گواہ اور مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

اہل نظر کے تاریخی ریمارکس

★ آیۃ اللہ خمینی پیغمبر انقلاب تھے۔ (کرنل معمر قذافی۔ لیبیا)

۱۔ صحیفہ نور جلد ۵ ص ۹۲ مطبوعہ وزارت ارشاد اسلامی ایران ۲۔ المختار من اقوال الخمینی جلد ۱ ص ۱۱ مطبوعہ وزارت ارشاد
۳۔ روزنامہ جنگ لاہور ۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ ص ۸ ۔ میر شکیل الرحمٰن۔

★ اس انقلاب کو ہندوستان کے آزاد خیال مسلمان اور ہندو اس زمانے کا معجزہ سمجھتے ہیں ۔
(محمد طاہر صدیقی ایڈوکیٹ سپریم کورٹ ۔ انڈیا)

★ خمینی مومن دنیا سے طوفان کی طرح اٹھے یہ پارسا انسان اس تلاش میں ہے کہ ایران کا اسلامی تشخص واپس لائے ۔ (اطالوی روزنامہ پورکا)

★ حضرت آیۃ اللہ خمینی بہت باہوش اور دانا آدمی ہیں ایران کے مشکلات کو حل کرنے کی کلید ان کے ہاتھ میں ہے ۔ (رمزی کلارک سابق وزیر انصاف امریکہ)

★ ایران اب اسلامی نظام کے نفاذ کا مرکز بن چکا ہے ۔
(مولانا ملک محمد اکبر ساقی چیئرمین تحریک وحدت اسلامی پاکستان)

★ ایران کا اسلامی انقلاب دنیا میں شریعت اسلامی قائم کرنے کے لئے رونما ہوا ہے ۔
(شیخ سعید شعبان سربراہ تحریک توحید اسلامی لبنان)

★ ہم ایران کے اسلامی انقلاب کو دنیا میں اسلامی انقلابات کا ہراول دستہ سمجھتے ہیں ۔
(مولانا سید اسعد گیلانی ممبر قومی اسمبلی پاکستان)

★ خمینی کے اسلام نے ثابت کیا کہ اسلام آئیڈیالوجی کے لحاظ سے دنیا کی طاقتور ترین معنوی قوت ہے اور دیگر تمام ادیان سے زیادہ اخلاقی ہے ۔ (نیوزویک)

★ بلاشبہ خمینی نے مشرق کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر مغرب کو لرزہ براندام کر دیا اور عربوں کو تنگی میں ڈال کر پوری دنیا کی فکروں کو اپنی طرف جذب کر لیا ۔ (ڈاکٹر حسنین ہیکل ۔ مصر)

★ بیسویں صدی کے آخری زمانے میں دنیائے اسلام ایک شخص سے جس کا نام آیۃ اللہ خمینی ہے حیات تازہ حاصل کر رہی ہے (پیٹر ویلسٹر سابق ایڈیٹر سنڈے ٹائمز ۔ لندن)

★ امام خمینی نے اسلامی انقلاب کا بیج تمام دنیا میں چھڑک دیا ہے اور یہ بیج نشو و نما کی حالت میں ہے ۔ (جان نور ترون نمائندہ خبر رساں ایجنسی رائیٹر)

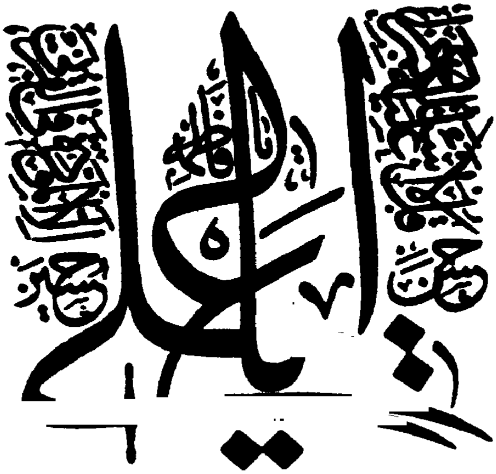
★ اس انقلاب سے ناامیدی میں ہم کو امید ملی ہے اس انقلاب نے ہمیں خود اعتمادی واپس دی ہے ہم اس کی طرف اشارہ کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو ہم یہ کچھ کر سکتے ہیں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ۔ (ڈاکٹر کلیم صدیقی ڈائرکٹر مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن)

★ نظریہ سب نے دیا لیکن امام خمینیؒ نے اپنے نظریئے پر عمل کرکے دکھایا وہ لینن اور ماؤزے تنگ سے بڑے انقلابی تھے۔

(مولانا کوثر نیازی۔ سابق وفاقی وزیر امور مذہبی پاکستان)

اب ہم اس دعا کے ساتھ گفتگو ختم کرتے ہیں ے

انقلاب معجز آسای خمینی یاد باد
تا قیامت کاخ دین از غیرتش آباد باد



امام خمینی (قدس سرہ)

اور

اسلام میں عورت کے حقوق

از: محترمہ زہرا مصطفوی (دختر حضرت امامؒ)
مترجم: جناب سید احتشام عباس زیدی

میرا ارادہ ہے کہ پیش نظر موضوع "امام خمینیؒ اور اسلام میں عورت کے حقوق" کے سلسلہ میں دو باتوں کی طرف اشارہ کروں اور اپنے معروضات کے ضمن میں ان کی ایک تحقیق و تحلیل پیش کروں اول یہ کہ موضوع کے سلسلہ میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلام اور اس کی روشنی میں حضرت امام خمینیؒ عورت کو مرد سے جدا ایک الگ وجود نہیں سمجھتے اور اسے پیدائش و خلقت، بندگی و اطاعت نیز جزا و سزا میں مرد کے برابر جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بعض امور مثلاً "یوم خواتین" کے سلسلہ میں ــــ نہ کہ "مردوں کا دن" پر ــــ اس قدر اصرار و مطالبہ اور اس کے مانند شبہ میں ڈالنے والے مقاصد یوں نظر آتے ہیں گویا ایک کم قیمت اور حقیر چیز کو بیش قیمت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ عورت کی حقیقت اور اس کے حق بجانب حقوق کے سلسلہ میں ہر طرح کے سطحی اور غلط افکار کو دور کرنے کی راہ میں تحقیق و تجسس کا ایک خلا محسوس ہوتا ہے اور وہ دوسرے تمام موجودات کی معرفت ان کی حیثیت اور قدر و قیمت کے مانند، اسلامی مکتب فکر میں، عورت کے پاکیزہ وجود کی صحیح پہچان اس کے حقیقی مرتبہ اور اس کی طبیعی و اجتماعی حیثیت کی شناخت کا مسئلہ ہے اس کائنات ہستی میں، جس کا یقیناً ایک وسیع اور عالمی پیمانہ پر مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔ چونکہ اقدار کا

سرچشمہ نظریات ہوا کرتے ہیں لہٰذا عورت یا مرد کے حدود یا دائروں کی تعیین کا سرچشمہ بھی یہی افکار و نظریات ہیں اور اس اعتبار میں نہ رہنا چاہیئے کہ ایک الٰہی معاشرہ عورت کو جس نگاہ اور جس توجہ سے دیکھتا ہے مادی بنیادوں پر استوار معاشرہ بھی فطرت کو اسی حیثیت سے دیکھے گا۔ دوسرے لفظوں میں جس کی فکری بنیادیں اقتصادی ستونوں پر استوار ہوں وہ توحیدی نظریہ رکھنے والے کے برخلاف عورت کو ایک دوسری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ سبھی اس بات کے مدعی ہیں کہ عورت کو اس کے صحیح و حقیقی حقوق ملنا چاہیئے اور شاید اس کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ان میں سے کون اس سلسلہ میں واقعیت سے زیادہ نزدیک ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام اقتصادی نظام یا اسلامی نظام؟

ہمارا ادعا یہ ہے کہ جب تک نظریات میں تبدیلی نہ آئے اور تصور کائنات سے متعلق افکار میں فرق نہ پیدا ہو اور اس عالم ہستی کے اندر عام طور سے انسانی منزلت و مقام اور خاص طور سے عورت کی حیثیت سے متعلق تحقیق و مطالعہ نہ کیا جائے تمام بحث و کوشش بے کار ہے۔ خلقت کائنات کے مقصد سے لاتعلق ہو کر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے کائنات ہستی میں عورت کے لئے سزاوار اور اس کے مرتبہ کے مطابق حقوق اسے عطا کر دیئے۔ اس بنا پر ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم جو خالق بشر اور اس کے وجود کے ہر پہلو نیز اس کی تمام ظاہری و باطنی خواہشوں سے آگاہ نیز عالم آدم پر مکمل تسلط و احاطہ رکھتا ہے، صرف وہی بشریت کے لئے قانون اور عادلانہ نظام معین کرنے والا ہے۔

مغربی افکار نے تمام ملکوں پر جو ماہرانہ تسلط و نفوذ پیدا کر رکھا ہے اور اکثر و بیشتر انسانی معاشروں کے اعمال و عادات و اطوار پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اس کا پہلی نظر میں جائزہ لینے سے شاید میری یہ بات قبول نہ کی جائے کہ ایک مسلمان عورت اپنے دقیق اور منظم منصوبوں اور اپنے ان قیمتی اخلاقی فرائض کے تحت جو خداوند عالم کی جانب سے اس پر عائد کئے گئے ہیں موجودہ دنیا میں اپنا تشخص متولیٰ کے ساتھ ہی اپنے شائستہ و ممتاز مرتبہ کو بھی محفوظ رکھ سکتی ہے، چہ جائیکہ وہ عورتوں سے متعلق جدید ترین اور ترقی یافتہ افکار کی قافلہ سالاری بھی کرے۔

لیکن اس سلسلہ میں غور و فکر ہمیں یہ نوید بخشتی ہے کہ مسلمان عورت، قرآنی تربیت اور

حقیقی مسلمان حکام ومرپرستوں کی حمایت ورہبری کے سایہ میں، تیزی کے ساتھ عورتوں سے متعلق ذلت آمیز و رسواکن افکار وخیالات کو غلط اور بے حقیقت ثابت کرسکتی ہے اور ان کے ظاہری زنگ و روپ زائل کرسکتی ہے۔ نیز مغرب زدہ افراد کی طرف سے ایسے جو ہمیشہ یہ جھڑکیاں ملتی ہیں کہ مغربی تہذیب نے عورت کو آزاد بنایا ہے اور اسے استقلال بخشا ہے، وہ یہ ثابت کرسکتی ہے کہ اس نے اسلام اور قرآن سے ناحق دل نہیں لگایا ہے بلکہ تمام انسانوں اور خصوصاً ان کے انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ مساوات کی بنیاد پر دیگر افکار وخیالات سے برتری رکھتا ہے۔ عورت اس بات کی سزاوار ہے کہ دنیا میں اپنے باارزش مقام و مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرے چنانچہ دقت نظر کے ساتھ غور وفکر و تحقیق کے بعد ہر انصاف پسند اس کی حقانیت اور اس کی اہمیت کا اعتراف کرے گا جیسا کہ گفتگو کے مفہوم سے ظاہر ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے تحقیقات و مطالعات اور سیمیناروں کے ساتھ ساتھ ہی تسلط پسند استعماری نظاموں کی سازشوں اور حیلہ بازیوں کی شناخت سے متعلق بحث سے بھی گریز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عورت جیسے باارزش اور قابل قدر وجود کی ماہیت اور اس کی ذاتی حقیقت کے سلسلہ میں تحقیق نیز ان خرابیوں کی چھان بین کے بغیر جن کا سرایت کرنا عورت میں شر و فساد، خودپسندی اور مجموعی طور پر اس کے انحطاط وتباہی کے لئے زمین ہموار کرتا ہے دوسری ساری کوششیں لاحاصل و بیکار ہیں۔

البتہ اس بات سے کسی بھی صورت میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے مکتب فکر کی غیر معقول جانبداری اور دوسرے مکاتب فکر اور طور طریقوں کی خرابیاں بیان کرنے پر اڑے رہیں۔ کیونکہ غیر معقول اور اوچھی طرفداری اور بلاوجہ کی ملامت و سرزنش دونوں ہی اسلامی عقل وخرد کے شایان شان نہیں ہے بلکہ یہاں غیر جانبدارانہ طور پر ایک ایسی حقیقت کو پہنچوانا مقصود ہے جو حتیٰ دوستوں کے نزدیک بھی محروم و بے کس رہی ہے۔ البتہ یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ یہ بے کسی و تنہائی نہ صرف بیرونی عوامل کا نتیجہ ہے بلکہ اس تباہی کے سلسلہ میں عورت کو خود اپنے آپ پر، مسلمان امراء و سلاطین پر اور ظاہری فقہی و دینی بزرگوں پر بھی گریہ کرنا چاہیئے۔ (۱)

۱۔ سیمانۂ زن در کلام امام خمینی ص ۱۳۵ آرام (رای عبد الوہاب)

بس ایک جملہ میں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس انہدام و تاسیس اور تخریب و تعمیر کی دنیا میں ایک تحقیقی روش کی بنیاد پر اور مغربی و مشرقی صنعتی ترقیات کی تائید و حمایت کے ضمن میں جہاں تک دوسروں کے نظریات و اعمال ہمارے اسلامی مسلک و مشرب اور عورتوں کی ترقی کے موافق ہیں ہم ان سے ہم آہنگ ہیں، دوسری صورت میں ان کی آگ میں جلنے اور ان کی آواز میں آواز ملانے کے بجائے بغیر کسی چشم پوشی اور بے جا شرم و حیا کے ان سے جدائی کی آواز بلند کریں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو فراق و جدائی سے بڑھکر قہر و غضب پر آمادہ ہو جائیں گے ۔

امام خمینیؒ ۲۰ ردی ۱۳۵۷ھ (۱۰ جنوری ۱۹۷۹ء) کو لکزمبرگ کے ٹیلیویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" اسلامی حکومت رجعت پرست نہیں ہے اور تمام تہذیبی مظاہر کے موافق ہے، مگر یہ کہ ان سے قوم کی بحالی کو نقصان پہنچتا ہو اور وہ ملت کی عمومی عفت و پاکیزگی کے خلاف ہوں۔ اسلام نہ صرف عورت کی آزادی کا حامی ہے بلکہ وہ خود عورت کے تمام وجودی پہلوؤں کی آزادی کا بانی ہے " (۱)

پس یہ ضروری ہے کہ عورت کی حقیقت اس کے حقوق نیز اس کی جسمی و روحی ضروریات توقعات اور فطری خواہشات کی معرفت و آگاہی حاصل کی جائے اور اس حقیقت کو محسوس کیا جائے کہ غلطی سے صرف عورت کا جسم ہی مرد کی توجہ کا مرکز قرار پایا ہے اور بس ۔ اس کے بعد صحیح تدبیروں کے ذریعہ کج فکریوں کا مقابلہ کیا جائے ۔ وہ غلط اور بے جا تصورات جو ماضی میں مشرقی اور مغربی دونوں معاشروں کے اندر عورت کو سماج سے دور گھر کی چار دیواری میں محدود کرتے یہاں تک کہ شادی اور خاندان کی تشکیل حتیٰ کبھی کبھی دین کے نام سے اس پر طاقت فرسا روحی و جسمی بوجھ ڈالنے کا جو عمل جاری رہا ہے اور آج بھی جاری ہے ۔ ان دباؤں، سختیوں اور بندشوں کے نہ ٹوٹنے کا براہ راست رد عمل مغرب میں بڑی تیزی کے ساتھ گمراہی و کجروی کی گہری کھائی میں گرنے اور حقیقی مذہب اور دین کے متوازن قوانین اور بلند

۱۔ طلیعۂ انقلاب اسلامی، ص ۲۹۷

احکام کی طرف سے بے توجہی وبے اعتمادی کی شکل میں ظاہر ہوا اور یہی حال مشرق کا ہوا جہاں خدا اور وحی وغیرہ سے سراسر انکار کا دور دورہ تھا اور یہ تمام تصورات اوہام شمار کئے جاتے تھے اور سب کے لئے ضروری تھا کہ مشین کی طرح معاشرہ کے پہیہ کو گردش میں لائیں اور چونکہ انسان بھی مادی ہے لہٰذا مادیات کے ذریعہ اس کی ضرورتیں پوری ہونا چاہئیں۔

لیکن دراصل مشرق ومغرب دونوں کی حقیقت وماہیت ایک ہی ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کی طرف رواں دواں ہیں فقط اس تک پہنچنے کے وسائل میں فرق ہے۔ ایک اجتماع کو بنیادی حیثیت دیتا ہے اور دوسرا فرد کو محور قرار دیتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے دونوں کا آزمودہ ہتھیار سب سے پہلے دین کی ظاہری صورت کی نفی ہے اس کے بعد دین کے اصل مقصد اور ماحصل کی نفی ونابودی کا منصوبہ ہوتا ہے۔ دونوں نظاموں نے اس تصور کو وسعت دی اور اسے اپنے زیر تسلط ممالک نیز تیسری دنیا تک کھینچ لائے کہ امام خمینیؒ آئے اور انہوں نے ان چنگاریوں کو جو زمانہ کی راکھ کے نیچے دبی رہ گئی تھیں پھر سے شعلہ ور کردیا اور اپنی دوررس نظروں کے ذریعہ اس اسلام کو جس میں نہ کلیسائی نظام کی گھٹن تھی نہ کمیونزم کی دہریت بلکہ یہ وہی حضرت محمدؐ کا حقیقی وخالص اسلام تھا جسے آپ نے دوبارہ زندہ کیا اور انسان کو نیز اسی کے ساتھ عورت کو گمراہی سے نکلنے اور خود اپنے آپ کو پہچاننے کی دعوت دی۔

پس جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، امام خمینی رح نے پہلی منزل میں مسلمان عورت میں یہ یقین واعتقاد پیدا کیا کہ وہ خود کو اسلامی معارف کے صاف وشفاف سرچشمہ میں تلاش کرے اور اپنی حقیقی معرفت حاصل کرے، بیدار ہو، گمراہیوں اور کج رویوں کو بھی اچھی طرح پہچانے اسے اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ ایک مسلمان عورت انقلاب لاتی ہے، خود منقلب نہیں ہوتی تغیر پیدا کرتی ہے خود متغیر نہیں ہوتی ..... وہ یہ جان لے کہ عورت کے سلسلہ میں غلط تصورات کے ناخوشگوار نتائج اور ان کے برے اثرات انسانی تہذیب کے دوسرے تمام پہلوؤں کو بھی متأثر کریں گے اور ان پر غالب ہوجائیں گے۔ لہٰذا عورت اپنے آپ کو پہچانے کہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو انسانی کمال کی بلندترین منزل تک آسانی کے ساتھ پرواز کرسکتا ہے اس کے وجود نے تاریخ کو تابناک بنایا ہے نیز انقلابوں اور تحریکوں کو روشنی بخشی ہے۔

عورت تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانوں کو جہالت اور طاغوتیت کے چنگل سے رہائی دلانے والی تحریکوں کی روح رواں رہی ہے پھر بھی مختلف معاشروں میں اس پر ظلم و ستم روا رکھا گیا اور اس کی شخصیت کو پامال کیا گیا ہے جبکہ اس کی ذات کو اہمیت و وقعت دی گئی ہے۔ اگر پندرہ صدیوں پہلے عرب کے بدو انسان عورت کے جسم کو زندہ درگور کر دیتے تھے تو آج کے خلائی دور میں اس کی روح کو زندہ درگور کیا جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "عجبتُ لمن ینشد ضالته وکیف لا ینشد نفسه" مجھے تعجب ہے اس پر جو اپنی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کرتا ہے اور خود اپنے آپ کو تلاش نہیں کرتا۔ اور امام خمینیؒ فرماتے تھے: "سلوک کی پہلی منزل یقظہ ہے یعنی بیداری اور خواجہ عبداللہ انصاری نے کتاب منازل الصالحین میں، جس میں انہوں نے اہل سلوک کے منازل بیان کئے ہیں۔ تحریر فرمایا ہے: پہلی منزل کو منزل یقظہ یعنی بیداری کی منزل کہتے ہیں اور دلیل کے طور پر یہ آیت بھی ذکر کی کہ خداوند عالم فرماتا ہے "اَن تَقُومُوا..." یعنی بیدار ہو جاؤ۔ بیدار ہونا بھی ایک طرح کا قیام ہے اور تمام تحریکیں جو دنیا میں برپا ہوتی ہیں یہ بھی قیام ہیں۔ خواب سے قیام، بیداری کے بعد قیام اور ہم جو کیف عالم طبیعت کی بنا پر کھوئے ہوئے ہیں اور خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، ہماری آنکھیں اور ہمارے کان عالم طبیعت کی طرف لگے ہوئے ہیں۔ یہاں خدا کی جانب سے یہ موعظہ و نصیحت ہے کہ اس غفلت اور گہری نیند سے بیدار ہو جاؤ" (۱)

لیکن چونکہ تعرف الاشیاء باضدادھا" (یعنی چیزیں اپنی ضد یا مقابل سے پہچانی جاتی ہیں) لہٰذا پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ یہ اپنے آپ سے غفلت کیسی ہے اور یہ کاہلی انسان میں کیسے پیدا ہوئی ہے؟

اس کا جواب ہم اپنے عظیم رہبر کی لفظوں میں دیتے ہیں، آپ نے فرمایا:

جو کام غلط ہیں وہ ظلمت و تاریکی ہیں۔ بداخلاقی ظلمت ہے، نور وہ ہے جس کی طرف خداوند عالم نے دعوت دی ہے اور اسلام نے جس کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کیجئے (۲)

۱۔ کتاب پیام انقلاب ص ۵۱ خواہران مکتب توحید سے امام ؒ کا خطاب مؤرخہ ۱۶/۷/۵۰ھ ش

۲۔ کتاب پیام انقلاب ص ۸۵ انجمن خیریہ اصفہان کی ممبر خواتین سے ملاقات کے موقع پر امام کا خطاب مؤرخہ ۲۰/۸/۵۸ھ ش

اور دوسروں کو بھی اس پر مائل کیجیئے۔

یہ فطری بات ہے کہ اگر حقیقی الٰہی و انسانی اقدار بے رنگ ہو جائیں اور اپنی رونق کھو بیٹھیں فطری و ذاتی اچھائیاں رخصت ہو جائیں۔ جو خیر ہے شر میں اور وجود، عدم میں تبدیل ہو جائے تو گویا غفلت نے انسانی وجود میں اپنا گھونسلا بنا لیا ہے اور وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا ہے اور انگریزوں کی اصطلاح میں ALIENATION یعنی بیزاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس خلا کو کوئی نہ کوئی دوسری چیز ضرور پُر کرے گی اور یہی وہ منزل ہے جہاں حیلہ باز افراد اور تسلط پسند طاقتیں اپنا کام شروع کرتی ہیں تاکہ انسانی وجود خاص طور سے عورت کو جو انسانوں کو تربیت کرنے والی اور انھیں انسان بنانے والی ہے، خود فراموشی، غیر پرستی، علمی احساس کمتری اور اسی جیسی دوسری زہر آلود باتوں سے آشنا کریں تاکہ جو کچھ خود اس کے پاس ہے وہی وہ غیروں سے طلب کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے تیسری دنیا کے انسانوں، خاص کر مسلمانوں کی تحقیر کی جائے۔ ان کے مذہب، ان کے افکار، ان کے ماضی اور تاریخ سب کی تحقیر کی جائے اور ان کو یہ جتلایا اور یقین دلایا جائے کہ ان کی تمام تر کوشش، جدوجہد، خواہشیں اور آرزوئیں یہ ہونی چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ ان (مغربیوں) سے مشابہت پیدا کریں اور خود کو ان کے جیسا بنائیں۔

جی ہاں! مسلمان عورت کو اپنے آپ سے بیگانہ بنا دینے کی راہ میں اب نوبت یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشوں و آرزوؤں اور ان کے استعماری منصوبوں و فارمولوں کے مطابق ایک نسل وجود میں آجائے لہٰذا مؤرخین، جامعہ شناس، اقتصاد داں اور تعلیم و تربیت کے ماہرین سرمایہ اور طاقت کے بل بوتے پر اپنے اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں اور عورت کو جو بذات خود اصیل و الٰہی فطرت "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا" کی بنیاد پر خلق ہوئی ہے کھوکھلا اور ذلیل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اس کے سامنے یہ بحران پیدا ہو جاتا ہے کہ خود اس کی اپنی حقیقی حیثیت معدوم ہو جاتی ہے اور پھر مغربی استعمار اسے اپنے خود ساختہ قالب میں ڈھال لیتا ہے۔

یہ وہ منزل ہے جہاں امام کی تیغ بیان کی تیز دھار عورت کو اس کی حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اسے اغیار کے پیدا کردہ امراض سے نجات دلاتی ہے۔ امام "یوم خواتین" کی مناسبت سے مؤرخہ ۵۹/۲/۱۵ ھ ش مطابق ۲۰ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ کو اپنے ایک پیغام میں فرماتے ہیں ـــــ

فاطمہ ایک عورت ہیں جن کے فضائل پیغمبر اکرمؐ اور خاندان عصمت و طہارت کے لامحدود فضائل کے ہم پلہ ہیں۔ ہمیں عورت کے فضائل کی طرف توجہ دینا چاہیئے، کیونکہ پہلوی دور کا اس تاریک و ذلت آمیز نصف صدی میں زہریلے قلموں اور غیر متمدن و بدتہذیب زبانوں نے عورت کو خریدی اور بیچی جانے والی ایک چیز بنا دینا چاہا تھا" (۱)

آپ موضوع کی تعیین اور اس کے ذاتی صفات و خصوصیات کی شناخت کراتے ہوئے مستقبل قریب ہی میں اس کے براہ راست اور درخشاں نتائج کا وعدہ دیتے نظر آتے ہیں۔ عورت کو معاشرہ کی مربیہ۔ اس کی آغوش کو انسانوں کے لئے جائے امن اور کمال و معراج کی تعبیر سے یاد کرتے ہیں۔ اسے تعمیر انسانیت کے لئے ماں اور زوجہ جیسا اٹوٹ کردار شمار کرتے ہیں اہل طاقت و اہل دولت کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں سمجھتے اور بین الاقوامی حقوق انسانی کے ادارہ (ایمنسٹی انٹرنیشنل) کے نمائندہ کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "عورتیں اسلام کی نگاہ میں معاشرہ کی تعمیر میں ایک حساس کردار رکھتی ہیں۔ اسلام عورت کو اس حد تک بلندی عطا کرتا ہے کہ وہ معاشرہ کے اندر اپنے انسانی مقام و مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرلے، ایک "چیز" ہونے کی حد سے باہر نکل آئے اور اپنی اس ارتقا کی مناسبت سے وہ اسلامی حکومت کے نظام میں مختلف عہدوں و منصبوں پر فائز ہو سکتی ہے" (۲) کیونکہ "عورت انسانی آرزوؤں کی تکمیل کا مظہر ہے" (۳) اور "ماں کی آغوش خیر یا شر کا گہوارہ بن سکتی ہے" (۴) اور "عورت عظیم عورتوں و مردوں کو پروان چڑھانے والی ہے۔ عورت ہی کی آغوش سے مرد معراج کو پہنچتا ہے" (۵) نیز "ماں کے فرائض کو حقیر و ذلیل ظاہر کرنا اغیار کی سازش ہے" (۶) یعنی امامؒ ان فکر سے عاری روشن خیالوں اور غیر متمدن مہذب نماؤں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جنھوں نے نادانستہ یا خودغرضانہ طور پر عورت کو اس کی حقیقی روش کے خلاف چلنے پر مجبور کیا اور بلا سوچے سمجھے اس کے معنوی اقتدار

۱۔ کتاب صحیفۂ نور، جلد ۱۲ ص ۶۲

۲۔ کتاب طلیعہ انقلاب اسلامی، ص ۱۰ مورخہ ۱۹ آبان ۱۳۵۷ھ ش مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۷۸ء

۳۔ صحیفۂ نور، جلد ۶ ص ۱۹۴ ۔ ۴۔ صحیفۂ نور جلد ۸ ص ۱۶۲

۵۔ صحیفۂ نور، جلد ۸ ص ۱۶۲ ۔ ۶۔ صحیفۂ نور جلد ۶ ص ۱۹۴

کمال یعنی اس کے کارساز کردار سے اسے جدا کر کے اس کے بدلے ظاہری و بیہودہ قسم کی کھوکھلی ترقی یعنی دفتری میز کے پیچھے بیٹھنے کے قائل ہوئے ہیں۔ کیونکہ آپ اس اصل کو ترقی نہیں بلکہ تنزل و رجعت پسندی کی اصل و اساس قرار دیتے ہیں۔ ارتقاء کی اصل، معنوی و حقیقی کمال کی جانب پیش قدمی ہے نہ کہ تن پروری و مادہ پرستی۔

اب میں یہاں اپنی پہلی بات کہ توحیدی تصور کائنات کی بنیاد پر مرد و عورت کے درمیان نہ کوئی فرق ہے اور نہ کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل ہے اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ۱۹۷۵ء کو عورتوں کا بین الاقوامی سال اعلان کئے جانے کے بعد سے عورتوں کے مسائل کے سلسلہ میں عالمی پیمانہ پر بہت کچھ کہا اور سنا گیا ہے، لیکن معاشرہ میں عورت کی موجودہ صورت حال پر توجہ یورپ میں "ماڈرنائزیشن" کے آغاز کے بعد شروع ہوئی اور چونکہ موجودہ مغربی معاشرہ کا رخ "مشینی کیپٹلزم" کی طرف ہے اور اس نے اپنی سرگرمیوں کا محور اجتماعی اور اقتصادی بنیادوں پر قائم کر کے رفتہ رفتہ تہذیبی و تمدنی بنیاد کو ذہن سے دور کر دیا ہے نتیجہ میں مختلف مسائل میں تغیر و تبدل پیدا ہونے کے سبب عورت و مرد کے روابط میں بھی گہرے اور بنیادی تغیرات پیدا ہو گئے ہیں۔ موجودہ معاشرہ کی حیرت انگیز ترین خطاؤں میں سے ایک مختلف قسم کی موجودات کے درمیان تمام کیفیاتی فرق کو مٹا کر ڈیموکریسی کے نام پر سب کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرنے کی خطا ہے۔

ہمارے زمانہ میں ہر چیز کی قیمت مادی اعتبار سے لگائی جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ کیفیت کے بجائے مقدار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ رجحان موجودہ معاشرہ کو نقصان اور صدمہ پہنچانے کا سبب بنتا ہے اور یہ غلطی خاص طور سے مرد و عورت کے درمیان رابطہ اور معاشرہ میں عورت کے کردار کے سلسلہ میں محسوس طور پر سامنے آ چکی ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں عورتوں کی حالت مسلمان معاشرہ کے اندر کبھی مکمل طور پر اسلامی احکام و قوانین کے مطابق نہ رہی، مسلمانوں کے اندر اسلامی احکام کی اطاعت میں تنزلی کا اوسط مسلمان معاشروں کی فکری سطح نیچے آنے اور مختلف مشکلات کے پیدا ہونے کا سبب بنا ہے جبکہ اسلام انسانی فطرت کے سلسلہ میں اور یہ کہ انسان دو جنس سے خلق کیا گیا ہے اپنے دامن میں خاص تعلیمات رکھتا ہے، ساتھ ہی ساتھ توحید کا بھی ذکر کرتا ہے اور اسے کائنات ہستی کی خلقت کا محور قرار دیتا ہے۔ یعنی تمام مخلوقات اپنے اجزا کے درمیان لامحدود فرق و تفاوت کے باوجود ایک ہی سطح پر قائم ہیں، یعنی تمام موجودات خداوند عالم کی مخلوق

ہیں، لیکن چونکہ انسان سب سے زیادہ قوی و توانا ہے لہٰذا نظام ہستی کا ذمہ دار ہے۔ مغربی معاشرہ کے برخلاف اسلام میں جنسیت کی اہمیت اور عورت و مرد کے درمیان فرق صرف تعلقات و روابط کی حد تک ہے، حیثیت اور نظام کی بنیاد پر نہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِی خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِی تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیبًا" (۱)

ملاحظہ کیجیئے کہ پہلے مرحلہ میں خداوند عالم نے ایک "نفس واحدہ" کو پیدا کیا جو ابو البشر ہے۔ اس کے بعد اس کا جوڑا خلق فرمایا، اب خلقت کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے کفو اور ہمسر اور حقیقت انسانیت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور ان دونوں کے درمیان فقط تقویٰ کا رابطہ پایا جاتا ہے۔ توحید کا عقیدہ رکھنے والے معاشرہ میں ہر فرد کو چاہئے کہ اپنا مخصوص کردار ادا کرے اور اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرے۔ ایک باایمان انسان کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ ایک بامقصد اور شریعت پر مبنی معاشرہ وجود میں لائے۔ اسی طرح مومن اپنے آزادی بخش پیغام کے ذریعہ ان لوگوں کے افکار و عقائد پر خط کھینچ دیتا ہے جنھوں نے عورت کی شخصیت کو نظرانداز کیا، یا اسے حقارت و اہانت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ عورت میں قرب پروردگار اور معنوی کمالات کے ادراک تک، جو بندگی کا عالی ترین رتبہ ہے، معراج حاصل کرنے کی توانائی پاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم حضرت مریم کے سلسلہ میں فرماتا ہے "لیس الذکر کالانثیٰ" (۲)

امامؒ یوم خواتین کی مناسبت سے اپنے ایک پیغام میں فرماتے ہیں:

"عورت کے مختلف پہلو ہیں، جیسا کہ مرد اور (مجموعی حیثیت سے) انسان کے مختلف پہلو ہیں یہ صوری و طبیعی ورق (ظاہری شکل و شمائل) انسان یا عورت و مرد کا سب سے نچلا و ادنیٰ مرتبہ ہے لیکن اسی ادنیٰ مرتبہ سے کمال کی جانب سیر بھی ہے، انسان ایک متحرک وجود ہے، طبیعت کے

۱۔ سورہ نساء آیت

۲۔ سورہ آل عمران ۳۶

مرتبے سے غیب کی منزل تک اور وہاں سے فنافی اللہ تک " (۱)

جی ہاں ! یہ عرصۂ گیتی اپنے تمام تغیر و تبدل کے ساتھ اس باعظمت مخلوق کی جلوہ گاہ ہے اور عالم طبیعت کی خلقت کا آخری مقصد کمال عظیم یعنی تقرب الی اللہ ہے جس تک اس صاحب انتخاب و اختیار اور صاحب ارادہ مخلوق یعنی انسان کو رسائی حاصل کرنا چاہئے اور مادہ کا تنگ ظرف ان عظمتوں کو تحمل کرنے کی تاب نہیں رکھتا کیونکہ سیر الی اللہ نفس انسانی کا خاص معنوی کمال ہے اور صرف نفس انسانی ہی " نفخت فیہ من روحی " (جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں) کی شان کا حامل ہے۔ انسان گہوارہ طبیعت میں بچپن کی منزلیں طے کر کے بلوغ معنوی کے اوج پر پہنچتا ہے اور یہ فطرت اور نفس واحدہ جن کا " فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا " (وہ فطرت الٰہیہ جس پر اس نے انسانوں کو خلق کیا) اور " ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ" یعنی (تمہارا وہ خدا جس نے تم کو ایک نفس سے خلق فرمایا) آیتوں میں ذکر ہے ، مرد یا عورت سے مخصوص نہیں ہے اور نہ کسی خاص قوم ، قبیلہ یا نژاد سے تعلق رکھتا ہے۔ " انّ اکرمکم " (تم میں بڑا وہ ہے) چاہے مرد ہو یا عورت جو " عند اللہ اتقٰکم " (اللہ کے نزدیک زیادہ متقی) ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ انسان کا نفس ہے جو کمال کو پہنچتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ یہ انسان کا نفس ہی ہے جس نے خلافت الٰہیہ کی سنگین امانت اپنے دوش پر اٹھا رکھی ہے :

" انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فأبین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان " (۲)

" ہم نے اپنی امانت آسمانوں ، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے (لیکن) انسان نے اسے اٹھا لیا "

استاد شہید مطہریؒ فرماتے ہیں: علم کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ جس طرح وہ انسان کو دنیا و مافیہا سے آگاہ کرتا ہے خود اپنے آپ سے بھی اسے آشنا کرے لیکن اس طرح کی معرفت

۱۔ صحیفہ نور ، جلد ۶ ص ۱۸۵ مورخہ ۲۶ / ۷ / ۵۸

۲۔ سورہ احزاب ۷۲

عطا کرنا علم کا کام ہے نہ فلسفہ کا کیونکہ علم و فلسفہ کبھی کبھی غفلت کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ پس الٰہی بنیاد پر اپنے آپ کو پہچاننے والا انسان خلقت کی ساری عظمت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں خدا سے منسوب سارے خصوصیات پائے جاتے ہیں لیکن نچلی سطح پر، وہ بھی خدا کی طرح عالم، مرید، انتخاب کرنے والا، خلق کرنے والا، تربیت کرنے والا، مسخر کرنے والا اور اپنی تقدیر اور معاشرہ اور تاریخ کو بدل دینے والا ہے یہ ممکن نہیں ہے جب تک انسان سب سے عظیم انسانی قدر و منزلت یعنی نفی کے بعد اثبات کی منزل حاصل کرلے۔ برائیوں اور پستیوں، ظالموں اور جابروں کی نفی اور ان سے دوری اختیار کرنا اس کے بعد خوبیوں، کمالات اور حقائق کا اثبات اور انھیں اپنانا اسی کو "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کہتے ہیں۔ چنانچہ امامؒ بزرگوار فرماتے ہیں:

لا الٰہ الا اللہ ایک عبارت ہے لیکن اس کی عظمت اکثر و بیشتر اوراد و اذکار سے زیادہ اور اس کی معنویت کا حجم کہیں وسیع تر ہے اعمال کے اندر اخلاص، عمل کی روح کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام حیوانات سے انسان کے امتیاز کا سبب اس کی معنویت کا پہلو اور انسانی روح ہے۔[1]

اپنی گفتگو کے اس حصہ میں چاہتی ہوں کہ قرآن کریم اور سیرت ائمہ ہدیٰ میں موجود احکام کی حضرت امامؒ کے بیانات کی روشنی میں حسب ذیل عنوان سے دستہ بندی کروں:

الف: عورت کے انسانی حقوق، جو عالم ہستی میں اس کی خلقت اور اس کے وجود سے مربوط ہیں...

ب: عورت کے سیاسی حقوق، جو انقلاب، جنگ اور اسلام کی خدمت میں اس کے کردار کو مشخص کرتے ہیں۔

ج: عورت کے سماجی حقوق جس کے تحت ہم سماج میں اس کے کردار اور اس کے وجود کی حیثیت کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

د: عورت اور مرد کے ایک دوسرے پر حقوق، جن کے ذریعہ شادی، طلاق نیز خاندان میں عورت کے رول پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ پیام انقلاب، ص ۵۲ مکتب توحید کی خواتین سے خطاب، مورخہ ۸/۱۰/۱۳۵۹ – ۱۶/۷/۸۰ھ ش

ھ : آئندہ نسل کی نگرانی و حفاظت کے سلسلہ میں عورت کے حقوق۔

الف : عورت کے انسانی حقوق

حضرت امامؒ ایک انٹرویو کے دوران فرماتے ہیں : عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں انسان ہیں ہاں بعض موارد میں عورت اور مرد کے درمیان کچھ فرق پائے جاتے ہیں جو ان کی انسانی حیثیت سے ربط نہیں رکھتے۔(۱) یہ اس سوال کا جواب ہے جو عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں کیا گیا تھا اور آپ نے بڑے ہی دلچسپ اور نپے تلے انداز میں انسانی حقوق سے متعلق اپنی بات کا آغاز کیا ہے اور عورت کے انسان ہونے پر زور دیتے ہوئے اس بات کی تاکید کی ہے کہ عورت، عورت ہونے سے پہلے ایک انسان ہے اور اس کے بعد آپ نے "تفاوت" و فرق کے مسئلہ پر خاص طور سے توجہ کی ہے کہ یہ فرق انسانی حیثیت کی طرف نہیں پلٹتا، بلکہ چونکہ عورت و مرد کے یہ دو وجود اس عالم طبیعت و فطرت میں ایک دوسرے کے مکمل ہیں اس لئے دونوں آپس میں کچھ عرضی فرق رکھتے ہیں کہ ایک مناسب زندگی برقرار کرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص حقوق نظام کے تحت تمام نعمتوں اور انسانی حقوق کی آزادیوں سے بہرہ مند ہے اور یہ عورت کے سلسلہ میں عالمی افکار کا ایک قابل توجہ جواب ہے کیونکہ وہ لوگ مرد کو جسمانی طاقت اور ظاہری توانائی و سختی کی بنا پر، جس کے ذریعہ وہ دشوار کاموں کو انجام دینے پر بھی قادر ہے، عورت سے برتر جانتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مرد حاکم اور اطاعت کے قابل ہے اور عورت حکم بجا لانے والی ہے۔ مثلاً جب ارسطو یہ دیکھتا ہے کہ غلام تلوار اپنے آقا کے ہاتھ میں دے کر یہ کہتا ہے مجھے سزا دو، حتیٰ مجھے جان سے مار ڈالو۔ تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ خداوند عالم نے دو طرح کے بندے پیدا کئے ہیں، ایک آقا دوسرا غلام۔ اس مثال سے مقصد یہ تھا کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر خود عورتیں اس ذلت و حقارت کو قبول کرتے ہوئے اس پر راضی رہتی ہیں، جبکہ ہم نے کئی مرتبہ حضرت امام خمینیؒ سے یہ سنا ہے کہ نہ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو ایک "چیز" ہونے کی حیثیت

۱۔ اٹلی کے ایک روزنامہ "دی واسٹ گرانٹ" کو انٹرویو ۱۲/ ۸/ ۱۳۵۷ (۷/ ۱۱/ ۷۸ء) بحوالہ کتاب صحیفہ نور ج ۲ ص ۴۲

تک گرائے اور نہ مرد، عورتوں کے سلسلہ میں ایسا سوچنے کا حق رکھتے ہیں۔ آپ ہمیشہ فرماتے تھے کہ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی انسانیت کے بلند مقام پر فائز رہیں کیونکہ خداوند عالم نے انھیں کرامت و بزرگی کے ساتھ خلق فرمایا ہے اور عرفان پروردگار عالم یہ ہے کہ: "لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَم" (ہم نے بنی آدم کو بزرگی و عظمت عطا کی ہے) پس عورت یا مرد ہونا یا بازوؤں کی قوت و توانائی دونوں کی انسانی حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتی اور اس طرح کا فرق کسی کے کمزور اور کسی کے طاقتور ہونے کی بنیاد ہرگز نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں حیوانات اور درندے تو زیادہ قوی ہوتے ہیں لہٰذا وہ سب سے برتر ہوئے! پس اس جواب کے ذیل میں چند قیمتی نکتے سامنے آتے ہیں

۱۔ عورت انسان ہونے کے اعتبار سے مرد کے دوش بدوش اور دنیائے آفرینش میں اس کی ہم خلقت ہے

۲۔ اسے خود "معاشرہ یا فرد" کی طرف سے کسی بھی طرح کی ذلت یا حاکمیت قبول نہ کرنا چاہیئے۔

۳۔ مردوں کے غلط اعمال اور بیہودہ افکار خود بہت اہم پیمانہ ہیں لہٰذا خود مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کو ان کے حقوق دلائیں چنانچہ عورت کے انسانی حقوق میں سے ایک اس کی اپنی آزادی ہے۔

لیکن آزادی کا مطلب کیا ہے؟ افسوس کہ ہر تہذیب اور ہر مکتب فکر میں لفظ آزادی کا ایک خاص مطلب و مفہوم ہے لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ "پرندہ پنجرہ سے آزاد ہوگیا" تو یہ آزادی کا صحیح مفہوم ہے کیونکہ پرندہ اڑنے کے لئے خلق ہوا ہے اور پنجرہ اس کی یہ آزادی اس سے چھین لیتا ہے۔ لیکن عورت کے سلسلہ میں اس لفظ کے استعمال سے کون سا مفہوم نکلتا ہے؟ عورت کیسی مخلوق ہے؟ اس کی قوت پرواز اور اس کا کمال کس چیز میں ہے؟ اس کا پنجرہ کیا ہے؟ آزادی کا مفہوم اس کے سلسلہ میں کیا تعبیر رکھتا ہے؟ بہتر ہے کہ اب ہم آزادی کے دوسرے اصطلاحی مفہوم پر غور کریں، یہ مفہوم عالمی استعمار کی زبان میں اپنے غیر انسانی اعمال کی توجیہ میں رائج ہے اور اس کا مطلب یہ ہے ہر اس پابندی اور قانون سے رہائی و آزادی جو انسان ہونے کے اعتبار سے اس پر نافذ و حاکم ہے۔ چنانچہ یہ جو دعوی کرتے ہیں کہ ہم نے عورت کو آزاد کر دیا ہے تو کس چیز سے آزاد کر دیا ہے؟ کیا عورت اسیر و مقید خلق ہوئی ہے کہ یہ لوگ اسے آزاد کرنا چاہتے ہیں؟ خود یہ دعوی

ہی عورت کی خلقت و آفرینش کی سراسر تحقیر و اہانت ہے۔ فکر کی یہ بے مائیگی اور عورت کے سلسلہ میں ان افکار سے پیدا ہونے والے سوالات روزنامہ گارڈین کے ایک انٹرویو میں بخوبی واضح نظر آتے ہیں۔ محترمہ الیزبتھ تارگود سوال کرتی ہیں کہ: کیا عورتیں اسلامی حکومت کے پرچم تلے اس پر قادر ہوں گی کہ انھیں پردہ اور مغربی لباس میں سے کسی ایک کو آزادی کے ساتھ انتخاب کا حق حاصل ہو؟ اور جواب میں امامؒ فرماتے ہیں کہ "عورتیں اپنے کام اور سرگرمیوں اپنی قسمت کے فیصلہ اور اسی طرح اپنے لباس کے انتخاب میں قوانین کی رعایت کے ساتھ پوری طرح آزاد ہیں" (۱) اس سوال و جواب پر اک ذرا غور کرنا ضروری نظر آتا ہے۔ پہلی بات تو اس عظیم انقلابی تحریک کے بارے میں جو اپنے آخری مراحل میں ہے اور یقیناً ایسے انقلاب کا قائد و رہبر تحریک کی اصل بنیاد اس کے حقیقی زاویوں پر غور کر رہا ہے اور انہیں مستقبل کے آئینہ میں دیکھ رہا ہے۔ وہ انقلاب جو کاخ سفید اور قصر کریملن کی بنیادوں کو متزلزل کرنے والا ہے اور وقت کے قیصر و کسریٰ کو خدا کی نصرت لیکن ان ہی عورتوں و مردوں کی مدد سے ان کے تخت سے اتار پھینکنے والا ہے گویا سوال کرنے والی کی نگاہ میں عورت کی پوری شخصیت اس کی توانائی اور حقانیت نیز اس کی تمام تخلیقی صلاحیتیں صرف پردہ ہی کے مسئلہ میں چھپی ہوئی ہیں کہ وہ سوال کرتی ہے کہ مغربی لباس یا پردہ!؟

اور دوسری طرف امامؒ بھی یقیناً سوال کی بے مائیگی اور کھوکھلے پن کی طرف متوجہ ہیں۔ جواب میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی دوراندیشی کے دریائے بیکران نیز اسلام کی اطاعت و پیروی کے سلسلہ میں عورتوں سے ان کی عظیم توقعات اور عورتوں کے اندر ان توقعات کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت و توانائی کو اجاگر کرتے ہیں۔ مشاغل و سرگرمیاں، قسمت کے فیصلے اور لباس و حجاب (وہ بھی اس لئے کہ سوال بے جواب نہ رہے) جیسی عبارت اپنے تمام حقوق اور زندگی کے تمام امور پر عورتوں کے مکمل تسلط کو ظاہر کرتی ہے یعنی کام اور مشاغل جو اصطلاحاً معاشرہ میں انسان کے وجود اور سماج کے امور میں اس کی براہ راست شرکت کو ظاہر کرتے ہیں ان کا انتخاب عورت کا مسلم حق ہے۔ اس کے بعد اس سے بلند تر مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ گویا ان تمام لوگوں کے نظریہ پر خط

۱۔ مؤرخہ ۱۰/۸/۵۷ پیرس

کھینچ دینا چاہتے ہیں جو انسانوں کے مقدر کو ثابت، اٹل اور پہلے سے تحریر شدہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح امام قدس سرہ عورت کو اس امر میں انتخاب کا حق دیتے ہیں کہ یہ کوئی اٹل فیصلہ نہیں ہے بلکہ عورت اپنی قسمت کے فیصلہ میں خود مختار اور صاحب ارادہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے :-

"إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" (رعد ۱۳/۱۱)

"بلاشبہ خداوند عالم اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں"۔

اور یہ حجاب بذات خود ایک بلند نعرہ ہے کہ عورت کی آزادی کا مطلب نہ تو لباس سے اس کی آزادی ہے کہ یہ خود ایک طرح سے عورت کو ضائع اور تباہ کرنا ہے۔ اور نہ گھر اور خاندان سے علاحدگی اس کی آزادی ہے کہ اس سے بھی اس اکائی کے بنیادی ستون متزلزل ہو جاتے ہیں اور نہ ہر طاقت فرسا کام کے انتخاب میں آزاد ہونا اس کی آزادی ہے کہ یہ بھی اس کی فطرت اور خلقت کے لئے ناساز گار ہے، بلکہ معاشرہ میں اس کا وجود اس کے مشاغل اور اس کا لباس وحجاب سب کچھ دستورات و قوانین کے مطابق ہونا چاہیئے کیونکہ ہر انسان، انسان ہونے کی بنا پر ایک پُر سکون اور آرام دہ زندگی کا محتاج ہے اور یہ بات اس قانون کی برقراری کے بغیر جس کی پیروی سب پر واجب ہو ممکن ہی نہیں ہے۔ پس عورت کو بھی نہ صرف اپنے لباس وحجاب بلکہ اپنے کام کے انتخاب نیز اپنی قسمت کے فیصلوں کے سلسلہ میں قوانین کا پاس و لحاظ رکھنا چاہیئے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ ہر معاشرہ اپنے خاص نظریہ پر مبنی قانون رکھتا ہے اور اسلامی معاشرہ بھی اس کلیہ سے الگ نہیں ہے یہاں معاشرہ پر حاکم قانون الٰہی قانون ہے جو انسانی فطرت کے مطابق اور اس کے وجودی رشد و کمال کی طرف گامزن ہے عورتوں کو اجتماعی و سیاسی کاموں میں اسی عمومی عفت کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے کیونکہ یہ طے ہے کہ اگر عورت ان تمام قوانین کی رعایت کئے بغیر۔ جو اسلام میں اس کی اور معاشرہ کی حفاظت کے لئے معین کئے گئے ہیں معاشرہ میں قدم رکھتی ہے تو وہ اپنی صلاحیت نیز تخلیق اور رشد و کمال میں اپنی تاثیر کی قوت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور فساد کی راہ پر لگا دی جاتی ہے۔ پھر نہ صرف وہ معاشرہ کے اعلیٰ مقاصد کو آگے بڑھانے کا سبب نہیں رہ جاتی بلکہ ایک سالم معاشرہ کو ترقی سے روکنے اور خراب کرنے کا کردار ادا کرتی ہے اور اس کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

(ب) عورت کے سیاسی حقوق اور خدمت اسلام

اب رہے عورت کے سیاسی حقوق اور انقلاب و جنگ میں اس کا کردار نیز دوسرے انسانی، اجتماعی و سیاسی تغییرات میں اس کا حصہ لینا تو حضرت امام قدس سرہ نے فرمایا کہ: "خواتین سیاست میں حصہ لینے کا حق رکھتی ہیں اور یہ ان کا فریضہ ہے"(۱) اور اس سے بڑھ کر "عورت کے لئے لازمی ہے کہ وہ حکومت کے بنیادی، مقدرات امور میں حصہ لے"(۲) اور "اسلام کی حفاظت، ملت کے دفاع، اسلامی وقار کے تحفظ اور آخری حد تک اسلامی ملک کا دفاع، عورتوں، مردوں اور بچوں سب پر واجب ہے۔ دفاع کا مسئلہ سب کے لئے ایک عمومی امر ہے۔ جو بھی طاقت رکھتا ہے اسلامی ملک کا دفاع کرے۔"(۳)

عورت کے سیاسی حقوق کی وضاحت کرنے کے سلسلہ میں شاید امام کے محکم و قاطع ارشادات کے مانند کوئی اور بیان نہ مل سکے۔ جو بات طے ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی امور میں حصہ لینے، اپنی اور معاشرہ کی سرنوشت میں دخل و اختیار نیز دیگر امور مثلاً انتخابات میں ووٹ دینے اور لینے، قوم کی طرف سے منتخب ہونے اور اس کی نمائندہ اور نجات دہندہ ہونے، مختلف حکومتوں سے ارتباط یا قطع تعلق کرنے، جنگ و صلح یا ملکی و غیر ملکی ثقافتی و اقتصادی قوانین بنانے کے سلسلہ میں ایک تو عورت خود انسانی حیثیت سے ایک شخصیت کی مالک ہے دوسرے وہ خود مختار اور صاحب ارادہ ہے اور تیسرے وہ ایک قوی، سیاسی فکر اور خلاق و فعال ذہن کی مالک ہے کہ حضرت امامؒ نے عورتوں کو ان خصوصیتوں کی طرف اپنے مندرجہ بالا ارشادات اور ان سے مشابہ دوسرے بیانات میں متوجہ فرمایا ہے۔ حتیٰ دفاع اور جنگ کے سلسلہ میں بھی اسے مردوں کے برابر اور ان کے دوش بدوش قرار دیتے ہیں اور مذکورہ بالا تمام امور کو اس کا فریضہ قرار دیتے ہیں آپ عورت کی رائے کو قیمتی قرار دیتے ہوئے اسے عقیدتی و سیاسی افکار و نظریات کا اظہار کرنے میں آزاد و خود مختار جانتے ہیں کہ جیسا وہ چاہتی ہے سوچے سمجھے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اس طرح امام نے ہمیشہ کے لئے

۱۔ طبر لنگرود کے تعلیمی محکمہ والوں سے خطاب ۵۸/۶/۲۶ از کتاب سیمای زن در کلام امام خمینیؒ

۲۔ سپاہ پاسداران کے کمانڈروں سے خطاب ۶۰/۵/۲۸ " " " " " "

۳۔ مورخہ ۵۷/۱۰/۷ ش از کتاب سیمای زن در کلام امام خمینیؒ

اور پوری قاطعیت کے ساتھ ان تمام دل کے اندھوں کو ــــــ جو عورت کو کبھی دین کے نام اور کبھی معاشرتی خرابیوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے نام پر گھر اور اس کے امور میں محدود کر دیتے ہیں اور ان کی ہدایت اور قیادت و رہبری کو مردوں کے سپرد کر دیتے ہیں فریضہ اور حکم کی صورت میں خبردار کرتے ہیں۔ انھیں اس کج فکری سے روکتے ہیں اور عورتوں کو ان کے ضائع شدہ حقوق کا حقدار ثابت کرنے کے لئے انھیں عورتوں کی توانائیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

ج۔ عورت کے معاشرتی حقوق، اور کردار

امریکہ کی روٹگرز یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر جیم کوکرز فتھ کے ساتھ انٹرویو میں حضرت امامؒ عورت کے اجتماعی حقوق سے متعلق بڑا واضح اور صریح انداز اختیار کرتے ہیں کہ "ہم عورت کے کام کرنے کے مخالف کیوں ہوں؟ عورت حکومتی امور کیوں انجام نہیں دے سکتی؟ اسلام نے عورت کو جو احترام و آزادی بخشی ہے کسی بھی قانون یا مکتب فکر نے نہیں دی ہے" (۱)

آپ نے مختلف موقعوں پر فرمایا ہے :-

- عورتیں اسلامی معاشرہ میں آزاد ہیں، انھیں یونیورسٹیوں، دفتروں، اور اسمبلی و پارلیمنٹ میں جانے سے ہرگز روکا نہیں جاتا۔ لیکن جہاں تک اخلاقی فساد کی بات ہے اس میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں اور یہ دونوں کے لئے حرام ہے" (۲) "عورت اور مرد دونوں یونیورسٹی جانے کے لئے آزاد ہیں" (۳)۔ "اسلامی نظام میں عورت کے بھی وہی حقوق ہیں جو مرد کے ہیں، کام کا حق تعلیم حاصل کرنے کا حق، مالکیت کا حق ....." (۴)

عورت کے اجتماعی و معاشرتی حقوق میں سے ایک تعلیم حاصل کرنے اور فکر میں کمال و بلندی

۱۔ سیمائے زن در کلام امام خمینیؒ، مورخہ ۱۵، ۱۲، ۵۷ (۶، ۳، ۷۹ عیسوی)

۲۔ لاس اینجلس ٹائمز امریکہ کے نامہ نگار سے انٹرویو، مورخہ ۱۶، ۹، ۵۷ (۷، ۱۲، ۷۸ عیسوی)

۳۔ مورخہ ۲، ۹، ۵۷ (۱۱، ۱۲، ۷۸ عیسوی)

۴۔ صحیفۂ نور، جلد چہارم، ص ۳۳ (اہل سے انٹرویو مورخہ ۱۶، ۹، ۵۷ (۷، ۱۲، ۷۸ عیسوی)

لانے کا حق ہے۔ اگرچہ کیا ماضی اور کیا موجودہ زمانہ مختلف سماجوں کے اندر عورت کو اس کے اس مسلّم حق سے محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا امام عورت کو نہ صرف اس عمل خیر و سعادت کا حقدار سمجھتے ہیں بلکہ اعلیٰ مراتب و مدارج کے حصول کے لئے جہاں تک اہل علم کی راہ مردوں کو میسر ہے عورتوں کے لئے بھی اس راہ کو باز دیکھتے ہیں۔

لیکن امامؒ جو عورتوں کے سلسلہ میں صراحت کے ساتھ حکومتی سرگرمیوں میں کام اور مالکیت کے حق کو ذکر فرماتے ہیں وہ اس اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ایسے اعتقادات و نظریات موجود ہیں جو ایک تو عورت کو گھر ہی میں محدود اور منحصر رکھتے ہیں اور اسے اجتماعی جدوجہد نیز بنیادی اور حکومتی کاموں کے لائق نہیں جانتے ساتھ ہی اسے اپنی محنتوں اور کوششوں کی پاداش کا مستحق شمار نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں چونکہ اسے ایک مکمل انسان نہیں جانتے یعنی ایک مستقل و عاقل انسان نہیں جانتے جس کے اندر اپنے حقوق کی مالکیت اور ان سے استفادہ کرنے کے شرائط موجود ہوں۔ لہٰذا ان موارد میں بھی ہمیں امامؒ کے صریح اور راہ گشا ارشادات نظر آتے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا تمام امور میں عورت کی شرکت کو آپ نے ہمیشہ اس کی عفت و پاکدامنی کے ساتھ واجب قرار دیا ہے جس کا ذکر اور اسباب و علل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

د۔ شادی اور طلاق کے سلسلے میں عورت اور مرد کے باہمی حقوق

اپنی گفتگو کے اس حصہ کو بھی میں حضرت امامؒ کے کلام سے شرف بخشتی ہوں کہ شادی بیاہ کے سلسلہ میں اسلام نے عورت کو شوہر کے انتخاب میں آزادی عطا کی ہے۔

"ہر عورت جس مرد کو اپنا شوہر منتخب کرنا چاہے، اسلامی قوانین کے دائرہ میں اسے اس کا پورا اختیار ہے" (۱)، یا اس استفتاء کے جواب میں کہ طلاق کے سلسلہ میں عورت کے اختیار کی کیا صورت ہے؟ فرماتے ہیں "محترم عورتوں کے لئے شارع مقدس نے آسان راہ معین فرمائی ہے تاکہ وہ خود طلاق کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور وہ اس صورت میں کہ عقد و نکاح کے دوران

۱۔ از کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینی مؤرخہ ۷،۱۰،۵۷

اگر وہ یہ شرط کریں کہ بطور مطلق یعنی جب بھی ان کا دل چاہے گا یا مشروط طور پر یعنی اگر مرد بد قماشی یا ظلم پر اتر آئے گا یا مثلاً دوسری عورت سے شادی کرے گا تو وہ شوہر کی طرف سے وکیل ہوں گی کہ خود کو طلاق دے لیں۔ ایسی صورت میں عورتوں کے لئے کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور وہ خود کو طلاق دے سکتی ہیں۔" (۱)

جیسا کہ ظاہر ہے حق ازدواج و طلاق کے سلسلہ میں امامؒ کا کلام اس قدر صریح اور واضح ہے کہ اس میں کسی طرح کے شبہ یا وضاحت کی گنجائش نہیں ہے۔ امامؒ عورتوں کو اپنے پسندیدہ شریک زندگی کے انتخاب میں مکمل آزادی دیتے ہیں۔ البتہ "اسلامی قوانین کے دائرہ میں" کی قید اس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ شادی چاہے عورت کے لئے ہو یا مرد کے لئے، صرف جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم اور بلند مقصد بھی ہے اور وہ ان گلوں کی پیدائش جو نسل انسانی اور امت اسلامی کی بقا و دوام کا سبب ہیں اور یہ عظیم مقصد اس وقت تک ہاتھ نہیں آسکتا جب تک عورت و مرد شادی سے پہلے اس سلسلہ میں خوب غور و فکر نہ کریں۔ وہ ایسے شریک زندگی کا انتخاب کریں جو ایک سالم اور صالح نسل کو وجود عطا کرنے میں ان کا مددگار ہو جیسا کہ صادق آل محمد علیہم السلام نے فرمایا ہے "**الولد الصالح ريحانة من رياحين الجنة**" (۲) نیک و صالح فرزند جنت کے پھولوں میں سے ایک پھول ہے یہ پھول جو الٰہی امانتیں ہیں، سالم پیدا ہوں، اچھی تربیت پائیں اور رسول خداؐ کی آنکھوں کا نور قرار پائیں اس کے لئے بہت ہی مناسب اور صالح شریک حیات کے انتخاب کی ضرورت ہے

اب رہا طلاق تو چاہے یہ مسئلہ عورت کی جانب سے ہو یا مرد کی جانب سے ناپسند اور مذموم ہے اور ایک ایسا امر ہے جو عرش الٰہی کو بھی لرزا دیتا ہے۔ لیکن (آخری چارۂ کار اور راہ حل کی حیثیت سے) بعض ادیان کے برخلاف جو راہ حل کو سرے سے بند اور مسدود جانتے ہیں اسلام نے یہ راہ بند نہیں رکھی ہے لیکن چونکہ عورت یا مرد ممکن ہے غلط راہ اختیار کریں اور

۱۔ طلاق کے سلسلہ میں امام خمینی کا ایک فتویٰ۔ کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینی۔ تاریخ ۵۸/۸/۷

۲۔ وسائل الشیعہ۔

ہوا و ہوس میں مبتلا ہوں، خود سری اور ہرائی جھگڑے پر اتر آئیں لہٰذا اس نکتہ کو کہ عورتیں اگر چاہیں تو حق طلاق کی شرط کریں مکمل طور سے جائز شمار کیا ہے۔ اس طرح امامؒ نے طرفین کی بہت سی مشکلوں کو حل کیا ہے۔ زوجین کو مزید اطمینان خاطر بخشا ہے اور خاندان کو بہتر استحکام و ثبات عطا فرمایا ہے۔

۵۔ عورتوں کے حقوق اور نسل آئندہ کی حفاظت و نگہداشت

یہ کلام یوم خواتین کی مناسبت سے حضرت امامؒ کے ایک پیام سے انتخاب ہوا ہے تاکہ گفتگو کے اس حصہ کو واضح کر سکے "دنیا میں عورتوں کا ایک مخصوص کردار رہا ہے۔ کسی معاشرہ کی اچھائی یا برائی اس معاشرہ کی عورتوں کی اچھائی یا برائی سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت ہی وہ تنہا وجود ہے جو اپنی آغوش سے ایسے افراد معاشرہ کے حوالہ کر سکتی ہے جس کی برکتوں سے ایک معاشرہ کیا بہت سے معاشرے استقامت و پائداری اور بلند انسانی اقدار سے ہم کنار ہو سکتے ہیں یا اس کا الٹا بھی ہو سکتا ہے۔"(۱)

جیسا کہ ماہرین نفسیات کی تلاش و تحقیق سے پتہ چلتا ہے۔ ایک بچہ کی شخصیت سات سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ایک ڈھرہ اور ایک رخ اختیار کر لیتی ہے اور بچے زیادہ تر اپنی عمر کے یہ سال ماں کے سایہ میں بسر کرتے ہیں اور مہر و محبت، ایثار و فداکاری، فرحت و نشاط، دلگرمی و خوش بینی ایمان و عقیدہ، عزم و ثبات نیز دوسرے بلند اخلاقی مفاہیم یا اس کے برعکس بغض و کینہ، رشک و حسد بے اعتقادی و بے ایمانی، خست و بخل، بدبینی و تعصب، غم و اندوہ، کاہلی و سستی ۔۔۔ کا پودا ماں کی طرف سے اس کے دل و نہاد میں لگایا جاتا ہے اور اس میں شگوفے پھوٹتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امام بزرگوارؒ ماں کو اصلاح و فساد کا منبع و مصدر قرار دیتے ہیں۔

آخر کلام میں وہ باتیں جو حضرت امامؒ سے نسبی قرابت ہونے کی بنا پر مجھ سے مربوط ہیں اور جنھیں میں نے تحقیق و مطالعہ سے نہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ سے حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امامؒ کی باتیں اور ان کی گفتگو حقیقت و عینیت پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں جن چیزوں پر ان کو

۱۔ کتاب سیمائے زن در کلام امام خمینی۔ تاریخ ۲۵ /۱۲ /۵۸

یقین اور عقیدہ تھا دقیق طور سے وہی کچھ ان کی زبان پر جاری اور ان کے اعمال پر طاری و مسلط تھا حقیقت میں وہ عورتوں کی جس شخصیت، قدر و قیمت اور حقانیت کے زبان سے قائل تھے عمل کے ذریعہ بھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔ یہ امامؒ ہی تھے جنھوں نے ایک نئی بنیاد رکھی اور اپنی بات پر عملی طور سے بھی جمے رہے۔ اپنی گفتگو میں پیغامات میں نیز عملی طور سے بھی ایک عورت کو پیغام بر کی صورت میں روس بھیج کر برابری و مساوات کو مستحکم کر دیا۔ انہوں نے ہر موقع پر چاہے لفظاً ہو یا عملاً اپنی صداقت کا ثبوت پیش کیا اور اس صداقت و سچائی کے ساتھ جو ان کا ملکہ تھی انہوں نے کسی طبقہ یہاں تک کہ عورتوں سے بھی قول و عمل میں دو رنگی اختیار نہیں کی۔ لہٰذا جب وہ آواز بلند کرتے تھے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان کسی بھی حقوقی امر میں کوئی فرق نہیں ہے تو اسے سچ کر دکھاتے تھے اور عملی جامہ بھی پہناتے تھے۔

میں یہ بات پورے زور اور تاکید کے ساتھ کہتی ہوں کہ وہ کسی بھی سلسلہ میں کوئی بات لاف گزاف یا تکلف کے انداز میں یا اپنی شہرت و محبوبیت کے لئے نہیں کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے الٰہی احکام کے اجراء اور رضائے پروردگار کے حصول کے لئے فرماتے تھے جس نے آپ کے پورے وجود کو پُر کر رکھا تھا اور اس سلسلہ میں اس قدر دقت نظر سے کام لیتے تھے کہ اکثر اس کا تصور بھی دشوار ہے۔ ایک مثال یہاں پیش کرتی ہوں جو شاید کسی حد تک اس بات کو واضح کر سکے۔

ایک روز آپ نے کسی مناسبت سے ایک پیغام لکھا تھا لیکن فوراً ہی حکم دیا کہ وہ پیغام واپس کیا جائے فوراً حکم کی اطاعت کی گئی غالباً لشکر اسلام کے نام پیغام تھا۔ انہوں نے اس پیغام میں کچھ تبدیلی کی اور واپس کر دیا۔ جب میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے لکھا تھا کہ میں اپنی تمام آرزوؤں کے ساتھ تم سب کے لئے دعا کرتا ہوں لیکن بعد میں یہ احساس ہوا کہ شاید یہ بات حقیقت کے مطابق نہ ہو لہٰذا دوبارہ لکھا کہ میں اپنی بیشتر آرزوؤں کے ساتھ تم سب کے لئے دعا کرتا ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص اس طرح اور اس حد تک اپنے قلم اور بیان کو اپنے ضمیر و باطن سے ہم آہنگ رکھتا ہے کہ اس کے دشمن بھی اس پر دو رنگی اور ریاکاری کا الزام نہیں لگا سکے۔ یہ محال ہے کہ انہوں نے تمام مسائل اور خاص طور سے عورتوں کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں اور جن کا بہت مختصر سا نمونہ یہاں ذکر کیا گیا ہے ان میں ذرہ برابر بھی حقیقت سے عدول ظاہر ہو

تکلفات اور لاف و گزاف سے کام لیا ہو۔

اس منزل پر جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں اپنی قرابت کی بنیاد پر چاہتی ہوں کہ تحریری مثالوں کے علاوہ کچھ عینی مثالیں بھی پیش کروں اور اس تہذیب کی طرف اشارہ کروں، جو انہوں نے گھر میں رائج کر رکھی تھی، محبت و مفاہمت کی بنیاد پر استوار روابط اور ذمہ داریوں کا احساس جو اسی تہذیب کی دین تھا، دوسروں کے حقوق کا احترام اپنے فرائض پہچاننے اور ذمہ داریوں کو انجام دینے کی تہذیب حریم اہل خانہ کی حرمت و پاسداری کی تہذیب نیز احباب و اقربا سے مسالمت آمیز برتاؤ کا ماحول۔

میں اپنی والدہ محترمہ کا قول نقل کرتی ہوں، فرماتی ہیں: حضرت امامؒ نے شادی کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ واجبات پر عمل کرو اور محرمات سے پرہیز کرو۔ تمہارے مستحب و مباح افعال میں کوئی دخل نہیں دوں گا۔ اپنی خصوصی زندگی پر تمہیں پورا پورا اختیار ہے" یعنی دقیق طور پر امامؒ نے اپنی بیوی سے اسلام پر عمل کا تقاضا کیا ہے اور بس۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ آپ والدہ گرامی کے مسائل میں کسی طرح کی مداخلت نہیں فرماتے تھے حتیٰ ان سے ایک گلاس پانی کا تقاضا کرنے سے بھی گریز کرتے تھے اور صرف یہ کہنے پر اکتفا فرماتے تھے کہ "محترمہ حکم دیجیے کہ میرے لئے فلاں چیز لے آئیں۔"

میری والدہ محترمہ ایک واقعہ اور بیان فرماتی ہیں کہ "بچوں کی پرورش کے دوران راتوں میں دو گھنٹے وہ بچہ کی نگرانی فرماتے تھے۔ میں سوتی تھی اور دو گھنٹے میں بچہ کی دیکھ بھال کرتی تھی، وہ سوتے تھے، حتیٰ یہ مقدار بھی میری رضامندی کے مطابق تھی۔" اے کاش میں ان تمام مناظر و لمحات کو قلم بند کر کے ان کی تصویر کشی کر سکتی جن میں وہ اپنی زوجہ، اولاد اور اقربا کے حقوق کی رعایت فرماتے تھے۔

آج امامؒ کے تمام ماننے والوں خصوصاً عورتوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی جلائی ہوئی اس فروزاں مشعل کو خاموش نہ ہونے دیں اور اسلام و امامؒ کے پیرو بھائیوں پر لازم ہے کہ اسلام نے عورتوں کے لئے جو حقوق معین کئے ہیں اور امامؒ نے جنہیں نافذ فرمایا ہے اپنی مسلسل سعی اور بھرپور طاقت کے ساتھ ان کی رعایت کریں کیونکہ ان کا لحاظ نہ کرنے کے برے نتائج زیادہ سے زیادہ خود ان ہی بھائیوں اور ساتھ ہی معاشرہ کو بھگتنا ہوں گے اور خاندانوں کا سکون و قرار جو نسل آئندہ کے پھلنے پھولنے کے لئے ضروری ہے غارت ہو کر رہ جائے گا۔

حدیث غدیر

قال یوم غدیر خم من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ

"پیغمبر اسلامؐ نے غدیر خم کے دن فرمایا:

جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔ اے اللہ جو انھیں دوست رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو انھیں دشمن رکھے تو اسے دشمن رکھ۔

الاستیعاب، ابن عبد البر، ج ۲، ص ۴۶۰ چاپ قدیم

از : جناب حائری شیرازی
ترجمہ : جناب سید ولی الحسن رضوی

امام خمینی اور عبادات و شعائر سے بہترین استفادہ

ایک تر و تازہ، حسین و دلکش اسلام جو عوام و خواص خصوصاً جوان نسل اور ان سب سے بڑھ کر دین کے متعہد و وفادار، صالح اور پاکباز افراد کا پسندیدہ اسلام ہو اس وقت شکل پیدا کرتا ہے جب اسلام کے ایک ایک جزء اپنی مخصوص اور مناسب جگہ پر باقی رہیں، تمام پہلو نہ صرف آپس میں ہم آہنگ بلکہ ایک دوسرے کو قبول بھی کرتے ہوں۔ اسلام کے متعہد پسند اور انقلابی پسند ہونے کی بات میں نے اس حدیث کی بنیاد پر کہی ہے جس میں اعلان ہوتا ہے کہ :۔

"لَا تنظروا اِلٰی طول الرکوع رجل والسجود ولٰکن انظروا الیٰ حسن امانتہ وصدق حدیثہ"

انسان کے انقلابی اور صالح و رستگار ہونے کی بنیاد صرف طولانی سجدے اور رکوع نہیں ہیں بلکہ صداقت اور امانت داری ہے۔

ممکن ہے ابھی بعض لوگ دین سے کامل طور پر آشنا نہ ہوئے ہوں یا بدبینیوں کا شکار ہوں لیکن صادق القول اور امانت دار ہوں، اسلام کو اس طرح کے لوگوں میں بھی مقبول و پسندیدہ قرار پانا چاہیے یعنی اسلام کو امین پسند اور صادق پسند ہونا چاہیئے مطلب یہ ہے کہ ایسا اسلام ہو جس کو دنیا کے امانت دار اور سچ بولنے والے افراد پسند کریں۔ لیکن یہ ان لوگوں کو کس صورت میں پسند آسکتا ہے؟

اس وقت جبکہ اسلام اپنی اصل اور حقیقی شکل میں سامنے آئے، یعنی عرفان اپنی جگہ، فلسفہ اپنی جگہ، فقہ اپنی جگہ، حکومت و سیاست اپنی جگہ اقتصاد اپنی جگہ ہنر و فن اپنی جگہ مختصر یہ کہ اسلام کے تمام پہلو اپنا صحیح مقام اور اپنی مناسب جگہ حاصل کریں۔ اور امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی تمام تر کوشش و جستجو یہی تھی کہ ان تمام پہلوؤں کو ان کا صحیح مقام حاصل ہو جائے۔ وہ تلاش و جستجو جو کسی کا نفاذ و زبردستی کے ذریعہ ممکن نہ تھی بلکہ متعدد تحریکوں کے ذریعہ مختلف مرحلوں میں طرح طرح کے مسلسل اقدامات کے ذریعہ ان مسائل میں تنظیم و ترتیب پیدا کر کے ان کو ایک ایسی شکل دی جا سکتی تھی کہ ہر وہ چیز جو پیر کی جگہ پہنچ چکی ہے سر کی جگہ پر آجائے اور ہر وہ چیز جو سر کی جگہ پر رکھ دی گئی ہے پیر کی جگہ پر آجائے۔ یہ چیزیں ہزاروں سال کے دوران ایک طرف تو ظالم و جابر طاغوتی نظام اور حکمرانوں اور دوسری طرف یہودی مستشرقین وغیرہ بلکہ عموماً دونوں کی کوششوں سے درہم برہم کی گئیں، اب چاہے داخلی طاغوتوں کے ذریعہ ہو یا جاہل و نادان ملاؤں اور مقدس نماؤں کے وسیلہ سے خارجی جاسوس اس میں کامیاب ہو گئے اور حقیقی اسلام تشکیل دینے والے اجزاء کو ایک دوسرے سے جدا کر کے سر کو پیر کی جگہ اور پیر کو سر کی جگہ رکھکر، الٹ پلٹ دیا گیا۔ اس طرح یہ لوگ اسلام کی غلط ملط اور تحریف شدہ شکل تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بالکل اسی طرح جیسے بچوں کو مشغول و سرگرم رکھنے کے لئے انسانی مجسمہ کے کھلونے کو ۱۵-۲۰ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کو اس انداز سے کاٹ کر جدا کر دیتے ہیں کہ بچے گھنٹوں جوڑ سے جوڑ ملا کر اسے صحیح طور پر درست کرنے میں مشغول رہتے ہیں جب تک ترتیب نہیں ملتی الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں نہ تو ان میں سے کسی ٹکڑے کو نکالا جا سکتا ہے اور نہ ہی زبردستی کسی جگہ پر لگایا جا سکتا ہے ہر ٹکڑے کو اس کی صحیح اور مناسب جگہ پر ہی لگایا جانا چاہیئے اور پھر جب تمام ٹکڑے اپنی جگہ حاصل کر لیتے ہیں ایک نہایت حسین و زیبا شکل تیار ہو جاتی ہے جس کو ہر دیکھنے والا تحسین کی نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

البتہ ان کو اپنے صحیح مقام اور صحیح شکل میں واپس لانے کے لئے ذہن میں پہلے سے ایک ڈھانچہ اور منصوبہ تیار کرنا ضروری ہے کون سا ٹکڑا کب اور کہاں ملانا ہے پیش نظر رکھنا چاہیئے کبھی کبھی ایک ایک ہی ٹکڑے کو اس کی جگہ پر لانے کے لئے بیس تیس مرتبہ آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ایک ٹکڑا اپنی صحیح جگہ پر بیٹھتا ہے۔ ابتدائی مرحلے بہت ہی دھیمے دھیمے طے پاتے ہیں اور جب

کچھ ٹکڑے اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں تو بقیہ بھی رفتہ رفتہ اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں، لیکن بہرحال اس کام کے لئے بڑی ہی لگن اور محنت کی ضرورت ہے یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لئے کہا جا سکتا ہے ؎

چو در طاس لغزندہ افتاد مور　　رہا ننده را چاره باید نہ زور

اگر چیونٹی کوئی گر جائے چکنے طشت کے اندر　　رہائی کے لئے طاقت نہیں حکمت ضروری ہے

چنانچہ اس راہ میں امام خمینی لماب ثراہ نے یہاں تک کامیابی حاصل کی کہ ہنر و فن جس کو ایک طبقہ نے سرے سے حرام و ناجائز قرار دے رکھا تھا اور اس کے مقابل دوسرے طبقہ نے تفریح و لذت اور عیش و تفنن طبع کا ذریعہ یا اخلاقی بے راہ روی اور شہوت رانی کا وسیلہ قرار دے رکھا تھا، اسے اس منزل سے اٹھایا اور دائرہ حرمت سے باہر نکال کر اس کو اسلامی و انقلابی افکار کی ترویج اور پیغام رسانی کا ذریعہ قرار دیا، ہنر کے ذریعہ مطالب پھیلائے جائیں تاکہ تبلیغ میں حُسن پیدا ہو، باتیں دلوں میں گھر کر سکیں احکام کی طرف لوگوں کا جھکاؤ اور جاذبیت پیدا ہو جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں حافظ نے بڑی ہی دلکش و زیبا، نصیحتیں اپنے حسین و جمیل ہنر کے پیرائے میں اس طرح پیش کی ہیں کہ یہ دنیا کا عظیم "دواخانہ" لوگوں کو نہایت ہی شیریں اور لذیذ مٹھائیوں سے سجی ہوئی ایک بہت ہی بڑی اور خوبصورت دوکان نظر آتا ہے۔

امام خمینیؒ نے آرٹ اور فن کو اس کا اصل مقام واپس دلایا، اسی طرح سیاست جو دین سے خالی ہو جانے کے سبب فریب، ریاکاری اور ظلم و تعدی کا ذریعہ بن گئی تھی اس کو آپ نے صداقت و پاکیزگی کے دفاع کا وسیلہ قرار دیا

اسی طرح عرفان جو اسلام کے دیگر شعبوں سے علیحدہ رہ جانے کے سبب بعض افراد کے ہاتھوں عیش پرستی اور کھانے کمانے کا وسیلہ بن گیا تھا، ولایت و حکومت کی مانند جو اسی طرح کا ایک وسیلہ بن گئی تھی۔ امامؒ نے عرفان کو جب اس کا اپنا مقام واپس دلایا تو یہی عرفان صداقت و آگہی اور کمال طہارت و کمال ایثار تک رسائی کے لئے وہ چیز بن گیا جس کے ذریعہ زیادہ صداقت و خلوص کے ساتھ جہاد اور زیادہ صحیح اور با اصول انداز میں خدمتیں انجام دی جا سکتی ہیں، یہ وہ عرفان ہے جس کی تہوں میں لوگوں کو وحدت و یگانگی کے موتی ہاتھ آتے ہیں۔

یہی صورت فقہ کی ہے امام خمینیؒ نے اس کو ہر لمحے اور ہر موقع کے لئے تمام میدانوں میں ایک زندہ اور فعال اجتہاد کی صورت میں محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرح کے تعصب اور جمود سے دور کرنے کی سعی

کی ہے۔

یہ تو ہم نے مقدمہ کے عنوان سے مختصر طور پر چند باتیں پیش کی ہیں ۔اب ہم اصل موضوع پر آتے ہیں کہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے عبادات و شعائر سے کس طرح بہترین استفادہ فرمایا ہے یہاں عبادات سے مراد نماز جمعہ و جماعت اور حج و جہاد وغیرہ ہیں اور شعائر سے خوشی اور غم کے ایام اور مراسم جشن و عزاداری مراد ہیں ۔ یہ سوال کہ آیا ان سے کیا فائدہ اٹھایا اور ان کو کس طرح زندہ کیا تو ہمیں عبادات کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ فحشا و منکر سے بچنے کے لئے ایک کلیدی شعبہ کے طور پر ان سے استفادہ کیا جاتا ہے :۔

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ" (عنکبوت/۴۵)

بے شک نماز (تمام) غلط اور ناجائز کاموں سے باز رکھتی ہے ۔

ہم چاہتے ہیں اس وقت دنیا میں رائج فحشا و منکرات سے جنگ کریں اور امریکہ نیز دنیا کی دوسری بڑی طاقتیں اس کوشش میں ہیں کہ اگر ہو سکے تو فساد و فحشا اور منکرات و منہیات کی آگ سے شہداء کی ریاضت اور ان کی تعمیر کردہ تہذیب و ثقافت کو جلا کر نابود کردیں ۔ اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے فحشاء و منکرات کو ختم کرنے میں سب سے پہلی چیز جو ہماری مدد کرتی ہے نماز ہے ۔یعنی اگر کسی محلہ میں پانچوں وقت کی نماز جماعت سے قائم ہو اور اس میں خاص طور پر وہاں کے جوان اور سرگرم افراد شریک ہوں تو یہی نماز آہستہ آہستہ ان نوجوانوں کو منکرات یا غلط و ناجائز امور کی انجام دہی اور بے توجہی کی دنیا سے نکال کر ان میں اسلامی احکام کے سلسلہ میں ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتی ہے ۔ایک دوسرے کے کندھوں سے کندھا ملا کر عمل انجام دینے والے ان نوجوانوں میں جب ایک مشترک ہدف و مقصد پیدا ہو جائے تو یہ مشترک ہدف کسی مقناطیس کی مانند جو لوہے کے برادوں میں بھی ایک طرح کی مقناطیسی قوت بھر دیتا ہے ان نوجوانوں کو آپس میں متحد و منسجم کر کے ایک شکل عطا کر دیتا ہے یہ نوجوان جنھوں نے نماز کے ذریعہ مقناطیسی کیفیت پیدا کر لی ہے اور اپنے آپ کو پا لیا ہے ایک متحدہ شکل اور صورت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر حاکم اور ولی فقیہ کے ضروری احکام و دستور کی بنیاد پر ، مختلف میدانوں مثلاً ابلاغ و نصیحت اور تذکر و تبلیغ نیز فلم سازی ،عکاسی اور نقاشی وغیرہ میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں ۔

جب اخبار سب بے پردگی کے آرٹ سے معاشرہ میں گندگی پھیلائیں تو مومنین کو آرٹ ہی کے ذریعہ خود اپنا اور پردے کا دفاع کرنا چاہیئے۔ ایسے مومنین مسجد میں تربیت پاتے ہیں، نماز کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں ہمارے نمازی اور ہنرمند مومنین رفتہ رفتہ فلموں اور ڈراموں میں اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ یہ سینما جو آج آرٹ کے میدان میں فقر و تنگدستی کا شکار ہو کر، آرٹ کو اپنے اصل مقام سے بہت دور لے جا چکے تھے گویا سینما دوسروں سے وابستہ اور دوسروں کا ترجمان ہو کر رہ گیا تھا۔ جب ملک کے اندر کوئی فلم بنائی جائے تو وہ ملکی فلم اسی وقت ایک اچھی فلم کہی جانے کی مستحق ہے جبکہ ہمارے مسلمان و متعہد جوانوں کے لئے کارآمد ہو۔ کہ جب وہ اسے دیکھکر سینما ہال سے باہر نکلیں تو لوگوں کو فساد اور فحشا کی دعوت دینے کے بجائے، فساد و فحشا سے جنگ اور مقابلے کی دعوت کا عزم لے کر باہر نکلیں۔ یعنی مسجد کی اصلاح کے بعد، سینماؤں کی بھی اصلاح ہو جائیگی۔ ہم دوسرے تبلیغی وسائل کی نسبت بہتر طور پر خود سینماؤں کے ذریعہ ہر طرح کے فساد و فحشا، بے پردگی، بد چلنی اور بد اخلاقی وغیرہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور مسائل و مشکلات کے سلسلہ میں شرعی و اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرا سکتے ہیں۔ آرٹ ہی کے ذریعہ سب سے بہتر طور پر ان اقدار کو دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے جن کو آرٹ کے ذریعہ ابتذال اور بے ہودگی کا رنگ دے دیا گیا ہے معاشرہ کی عفت و پاکیزگی کو آرٹ کے ذریعہ نجات دلائی جا سکتی ہے چنانچہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ جانتے تھے کہ نماز جو بظاہر ایک سادہ سی چیز نظر آتی ہے اس کے اندر کچھ ایسی ہی بات موجود ہے کہ خدا فرماتا ہے۔

"وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" (بقرہ / ۱۵۳)

صبر اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو۔

ہنر و فن یہ ہے کہ ہم اپنی مسجدوں کو جوانوں سے پُر کریں، نوجوانوں کو معلوم ہے وہ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ یہاں آ کر وہ مختلف میدانوں میں اسلام کی حیات نو کے ضروری ہتھیار سے لیس ہوتے ہیں خاص طور پر نماز صبح، اگر ہر جگہ صبح کی نماز جماعت سے قائم ہونے لگے تو یہ خود دوسری جماعتوں کے لئے ضمانت اور ان کے لئے ایک طرح کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر رہبر انقلاب اسلامی طاب ثراہ نے اپنے الٰہی و سیاسی وصیت نامہ میں لوگوں کو جمعہ و جماعت قائم رکھنے کی تاکید کے ساتھ دعوت دی ہے

یہ تو تھی نماز اور جماعت کی بات ۔ جہاں تک نماز جمعہ کا مسئلہ ہے تو یہ چیز انقلاب سے قبل ہمارے معاشرے میں تقریباً متروک ہونے کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اگرچہ زیادہ تر مراجع تقلید واجب تخییری کے قائل تھے لیکن اسی تخییر کا فائدہ اٹھا کر لوگوں نے نماز جمعہ کو اکثر متروک کر رکھا تھا، ہاں یہ اور بات ہے کہ شہر کی کسی ایک مسجد میں مختصر طور پر نماز جمعہ قائم ہو جائے اور بس۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ برادران اہل سنت کے یہاں تو اس کا ہمیشہ اہتمام رہا ہے تو ہم کہیں گے کہ وجود کے نقطۂ نظر سے اگر کہا جائے تو یقیناً ان کے یہاں نماز جمعہ قائم ہوتی رہی ہے لیکن وہ نماز جمعہ جو اسلام چاہتا ہے ، حقیقت یہ ہے ، نہ ان کے یہاں تھی نہ ہمارے یہاں ، ان کے یہاں بھی جمعہ کی نمازوں میں معاشرے کے زندہ و حیات بخش سیاسی مسائل بیان نہیں ہوتے تھے بلکہ نماز جمعہ محض ایک تکلف آمیز نمائشی عبادت ہو کر رہ گئی تھی ۔

آج بھی عالم اسلام میں بہت سی جگہوں پر خصوصاً جن علاقوں میں مغرب کا عمل دخل اور تسلط ہے خطبۂ جمعہ میں درحقیقت جو کچھ کہتے ہیں اس کا مقصد مغرب یا مشرق کے حق میں توجیہ و حمایت ہوتا ہے ، تمام عبادتیں اپنی صحیح شکل میں اور حقیقی صورت میں اپنے سیاسی و سماجی پہلوؤں کے ساتھ مرکزی طور پر انجام پانا چاہئے تاکہ اہل سیاست وہاں جمع ہوں اور وہ عملی طور پر سیاست و عبادت میں اتحاد و یکجہتی کا مرکز و مظہر بن سکے ۔ جن لوگوں کی ، عبادت کو ایک جگہ اور سیاست کو دوسری جگہ دیکھنے کی عادت پڑ چکی تھی ، انہوں نے دیکھا کہ تہران یونیورسٹی جو ملکی سیاست کا مرکز تھی عبادت کا مرکز بن گئی ، یہاں سیاست و عبادت نے ایک دوسرے کو پا لیا اور پھر وہاں سے ، اور دوسرے صوبوں اور شہروں میں قائم ہونے والی جمعہ کی نمازوں سے ہر ہفتہ لوگوں کو ایک بار پھر دوسروں کو جانتے اور پہچانتے کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے اور دشمن کی وہ تمام تر کوششیں جو انہوں نے کوچہ و بازار اور دیگر اجتماعی مقامات پر خود اپنے افکار و خیالات ذہنوں میں اتار کر عوام میں انقلاب اور اسلامی نظام کی طرف سے بدظنی اور بے چینی پھیلانے اور شک و شبہ کی فضا تیار کرنے کے سلسلہ میں کی ہے نماز جمعہ میں ایک معمولی سا اقدام ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہے نماز جمعہ کی اسی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام خمینیؒ نے اس کے قیام پر اتنا زور دیا ہے ۔

رہی حج کی بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے حج کو کبھی ترک نہیں کیا تھا لیکن حج خود اپنی

حقیقت سے دور ہو چکا تھا ایک نوجوان کے سامنے یہ ایک سوال تھا کہ رمی جمرات کا کیا مطلب ہے؟

ہم اپنے اپنے مقام سے ایک طولانی سفر طے کر کے وہاں پہنچتے ہیں کیا محض اس لئے کہ وہاں نصب پتھروں پر کنکریاں ماریں؟ ممکن تھا کہ لوگ اس عبادت کے ہی منکر ہو جائیں، کیونکہ عوام اس عبادت کی حقیقت اور اس عمل کے سمبلک اور محاکاتی ہونے سے بے خبر تھے وہ اس کے اصل مقصد اور نقطۂ نظر سے غافل تھے، حج کے ارکان میں مجہول ترین اور غیر واضح ترین رکن " رمی جمرہ " تھا لیکن امام خمینی نے " مشرکین سے برائت " کا عنوان پیدا کر کے اور دنیا کے سامنے بڑے شیطان " کو متعارف کرا کے اس نکتہ کی طرف متوجہ کیا کہ جو لوگ میدان منیٰ میں " رمی جمرات " کرتے ہیں خود اپنے زمانے کے " جمرہ " اور شیطان کو بھی رمی کریں۔ جیسے ہی اپنے زمانے اور اپنے عصر کے شیطان کی بات سامنے آئی یہ عبادت جو اب تک مجہول و مرموز تھی اور صرف بندگی میں غرق افراد کے سمجھ میں آتی تھی تمام صادق و امین انسانوں کے لئے ایک پسندیدہ عمل بن گئی۔ حج زندہ ہو گیا۔ اس حج کو زندگی مل گئی جس میں ساری دنیا سے انسان جمع ہوتے تھے۔ جہاں دنیا بھر سے صادق و امین افراد آتے تھے اور ارکان حج میں شریک ہوتے تھے، صادق ترین اور امین ترین انسان اور ان میں بعض تو مقتدر ترین و طاقتور ترین افراد بھی ہوتے تھے وہاں سب کے سب سوکھے اور ڈھلے ہوئے پتھر کے کوئلہ کی مانند سلگ اٹھنے اور شعلہ ور ہونے کے لئے مستعد و تیار نظر آتے تھے لیکن حج کی چنگاری " مشرکین سے برائت " کی حرارت شامل ہو جانے کے بعد ایک ایسی چنگاری بن گئی جس نے ان کے اندر عشق الٰہی کا آتش فشاں روشن کر دیا۔

" مشرکین سے برائت " نے مسلمانوں کی اجتماعی طاقت اور ان کی برق آسا قوتوں کو (جو اکٹھا ہونے کے باوجود درہم و برہم تھیں) ہر طرح کی رکاوٹوں سے آزاد کر دیا۔ ان کی یہ قوت دنیا کے بڑے شیطانوں کی غلامی اور حاکمیت قبول کر لینے کی وجہ محبوس و مقید ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ جب امام خمینیؒ نے اس ولایت و حاکمیت کو توڑ دیا، جب مسلمانوں نے امریکا مردہ باد، اسرائیل مردہ باد جیسے نعرے لگا کر ــــ دشمن کی حاکمیت کا قلادہ اپنے گلے سے اتار پھینکا تو ان کے حلقۂ حکومت سے خارج ہونے کے بعد خداوند عالم کے دائرہ حکومت میں ورود کے لئے ان کو ویزہ مل گیا جیسا کہ قرآن کا اعلان ہے:

" فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ "

پس جس شخص نے طاغوتی خداؤں سے انکار کیا اور خدائے (وحدہٗ لاشریک) پر ایمان

لایا تو اس نے وہ مضبوط رسی پکڑ لی ہے (جو ٹوٹنے والی نہیں ہے) بقرہ/۲۵۶

جو شخص شیطان کی ولایت و حکومت میں ہو اس میں اللہ کی ولایت کا عشق پیدا نہیں ہو سکتا امام خمینیؒ نے مسلمانوں کو سفر حج میں صرف ایک کلمہ "مشرکین سے برائت" کے ذریعہ شیطان کی ولایت و سرپرستی سے آزاد اور رہا کر دیا اور اللہ کی ولایت کا دروازہ ان کے سامنے کھل گیا جو ان کے وجود میں خداوند عالم کا عشق انگڑائیاں لینے لگا۔ چنگاریوں سے عشق کے شعلے اٹھنے لگے، کوئلے انگارے بن کر ہر چہار طرف پھیل گئے یہ انگارے حج سے پلٹنے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں عشق افروزی کرنے لگے یہ عشق الٰہی کی آتش افروزی کا ہی نتیجہ ہے کہ آج فلسطین میں ایسے جیالے "شعلہ جوالہ" نظر آ رہے ہیں، مختلف ملکوں بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں میں مدتوں قبل لشکر الٰہی کی دفاعی ٹولیاں حج کے دوران وجود میں آچکی ہیں اور یہ کام اسی برائت مشرکین کے ذریعہ شروع ہوا یہی حج سے بہترین استفادہ ہے جو امام خمینی نے کیا ہے۔

امام خمینیؒ اور جہاد

لوگ کہتے تھے کہ ہم ابھی دفاع کی منزل میں ہیں اور دفاع بھی جہاد کی ہی ایک صورت ہے لیکن جو کچھ بھی کہا جاتا تھا کتابوں تک محدود تھا، حتی عملیوں اور رسالوں میں بھی جہاں عوام کو پیش آنے والے مسائل کا بہرحال ذکر ہونا چاہیئے تھا یہ مسائل موجود نہ تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحثیں ذکر نہیں ہوتی تھیں، امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے پہلی بار اپنے عملیہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحث شامل کی اور لوگوں کو اچھائی کی طرف بلانا۔ برائی سے روکنا، راہ خدا میں جہاد و دفاع کرنا، مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے جاہل و غافل افراد کی ارشاد و ہدایت اور تنبیہ و طہارت کرنا واجب قرار دیا درحقیقت یہ اقدام عمومی دفاع کی راہ میں ایک انسان کی ذہنی خلاقیت اور فکری جودت کا پتہ دیتا ہے۔

"وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"

قسم عصر کی بے شک انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ جو صاحب ایمان ہیں اور اچھے

کام انجام دیتے ہیں۔

سورۂ عصر کے ابتدائی حصہ میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر ہے لیکن آخری حصہ میں انسان کے گھاٹے میں نہ ہونے یا گھاٹا اٹھانے والوں کی فہرست سے خارج ہونے کی شرط کے طور پر اس کو ــــــ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کے حامل گروہ میں شامل کیا گیا ہے انسان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی منزل میں حق کی وصیت اور جہاد کی منزل میں صبر کی نصیحت کرنے والوں کے زمرہ میں جگہ حاصل کرنا چاہیئے۔ امام خمینی نے اس مفہوم کو زندہ کیا۔ جب لوگوں نے دنیا کی بڑی طاقتوں کی راہ و روش کو ترک کیا تو ان سے بڑی طاقتوں نے ٹکرانے پر کمر باندھی اور دفاع کی منزل پیش آئی۔ آٹھ سال کا مقدس دفاع بنیاد بن گیا کہ مسلمان اپنی زنگ خوردہ شمشیر کو پھر سے صیقل کریں، وہ خون جو مسلمانوں کی رگوں میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے ان میں حرارت و روانی پیدا ہوئی، یہ روانی خون میں جوش و خروش اور پھر ابال پیدا کرنے کا باعث بنی۔ اور اسلام نے مسلمانوں کے دفاع اور ایثار و قربانی کا چہرا دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسلام کا یہ دفاعی چہرہ جو دنیا کی تمام طاقتوں کے مقابل ثبات و استقامت کا حامل ہے جب لوگوں کے سامنے آیا تو دنیا کے تمام صادق و امین انسانوں کی نظروں میں قابل قبول اور مرکز نظر چہرہ بن گیا۔ اسلام کے حقیقی نقوش اور خدوخال راہ خدا میں جنگ کرنے والے مجاہدوں اور شہیدوں، عزم و ثبات کا جوہر دکھانے والے اسیروں اور جانبازوں نیز شہداء، اسراء، مفقودین اور مجروحین کے اہل خاندان کے صبر و استقلال اور غازیان اسلام کی قربانیوں اور فداکاریوں میں جلوہ نما ہوئے۔ دراصل یہی اسلام کا وہ حقیقی چہرہ تھا جو محبان اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ پردے کا نمونہ پیش کیا۔ عفت کا مرقع دکھایا غرض یہ کہ اسلام کے مختلف پہلوؤں کا ایک کامیاب و مطمئن چہرہ دنیا کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ خاص طور سے یہ زمانہ جبکہ مشرق اپنی ناکامیوں کا کھل کر اعتراف کر چکا ہے اور مغرب بھی اپنے آخری ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف ہے اب جبکہ مشرق کی طرف سے اس کے لئے کوئی پریشانی باقی نہ ہوگی فطری طور پر مشرق کی رقابت میں انجام پانے والی اس کی تبلیغی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جائیں گی اور راستہ صاف دیکھ کر اس کی شرارتیں اور زیادہ عروج پر پہنچیں گی اور بہت ہی جلد اس کا چہرا دنیا کے سامنے مزید روشن ہو جائے گا۔

آج جبکہ یہ دونوں چہرے شکست و ناکامی سے دوچار ہیں تو یہی وہ زمانہ ہے جب خدا کا احساس

ہوتا ہے اور ایسے میں اسلام ان انسانوں کی شکل میں جلوہ نما ہو کر جو مشرق و مغرب پر تکیہ کئے بغیر آٹھ سال تک جنگ کرتے رہے ہیں ساری دنیا کے لئے جلوہ سامانی کا سبب بنا ہے۔ اسلام کو ایک نئی روح اور نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی حیات جو صحیح معنوں میں صبر و استقامت کا نتیجہ ہے "استعینوا بالصبر والصلوٰۃ" یہ وہ صبر ہے جو گزشتہ آٹھ سال کے دوران اس اسلام سے جلوہ گر ہوا۔ ایسا زندہ اسلام جو دین کی راہ میں والہانہ طور پر لاکھوں کی قربانیاں پیش کردے۔ یہ عزت جو آج اسلام کو حاصل ہوئی ہے اس استقامت و پائداری کی دین ہے۔

"الجہاد عز بہ الاسلام" (جہاد، اسلام کی عزت و عظمت کا ذریعہ ہے)

اسلام نے اپنی حقیقت کو ظاہر کر دیا۔ آج شرافت مند افراد اسلام کی طرف ملتفت ہو رہے ہیں سچے اور امین افراد جنھیں دنیا شریف و باعزت کہتی ہے۔ آج، مشرق و مغرب کی اطاعت و پیروی کو ذلت و رسوائی خیال کرتے ہیں وہ اسلام کی راہ میں طمانچے کھانے اور قید کی صعوبتیں برداشت کرنے میں اپنی عزت اور افتخار سمجھتے ہیں اور اس کے بعد اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ ہمارا یہ خون راہ اسلام میں شہید ہونے والے ایرانی نوجوانوں کے خون سے زیادہ شوخ نہیں ہے، اپنے اس آٹھ سالہ دفاع کے ذریعہ امام خمینیؒ نے دنیا بھر کے مسلمان جوانوں میں ایک لگن اور لہر پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے اس آٹھ سالہ جہاد کے ذریعہ دنیا کو بتا دیا کہ کام کیا جاسکتا ہے، طمانچے لگائے جاسکتے ہیں، ظلم کے مقابل استقامت و جواں مردی کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ نام نہاد بڑی طاقتوں سے ٹکرلی جاسکتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے جاسوسی کے اڈے "امریکی سفارتخانہ" پر قبضہ کے ذریعہ آپ نے دنیا کو دکھایا تھا کہ مسلمان اگر چاہیں تو دشمن کے منظور نظر نور چشموں کو ایک مدت تک قیدی بنا کر رکھ سکتے ہیں، یہ کام ممکن اور عملی ہے، وہ نقصان جو آٹھ سالہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئے برداشت کئے جاسکتے ہیں یہ وہ اسلامی استقامت اور اولو العزمی تھی جو امام خمینیؒ نے دنیا کے سامنے پیش کردی۔ یہ جہاد کا وہ پہلو جس سے آپ نے بھرپور استفادہ کیا۔

امام خمینیؒ اور عزاداری

جہاں تک عزاداری کا سوال ہے عظیم ترین عزاداری محرم کی عزاداری ہے "عاشورا" امام خمینیؒ

سے پہلے بھی تھا، لیکن اس کی یہ صورت نہیں تھی، تمام بحثوں کے محور واصل مبہم ہو جانے والے زمانۂ گزشتہ کے یزید اور شمر ہوا کرتے تھے، اور نوجوانوں کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا تھا۔ گزشتہ یزیدوں اور شمروں کے لعن و نفرین کے سلسلہ میں آخر کیوں اس قدر اصرار پایا جاتا ہے۔ دراصل ماتم و سینہ زنی اور گریہ و زاری کے مفہوم و مقصد سے بہت سے لوگ ناواقف تھے، ایرج میرزا جیسے لوگ بھی تھے جو کہتا ہے: "میں بھی کہتا ہوں کہ یزید نے برا کیا، یزید پر لعنت ہو، لیکن یہ تمام تام جھام کس لئے؟ یہ مضحکہ خیز جلوس اور انجمنیں کس لئے؟ وہ اس کو ایک داستان پارینہ اور ماضی کا مسئلہ خیال کرتا تھا۔

کشتہ حسین و گشت او خاک خاکش علف و علف چرندہ

یہ چرند کی باتیں اور بے ربط گفتگو اس نے اس عنوان کے تحت کی ہیں کہ وہ اس کو زمانۂ گزشتہ سے مربوط ایک مسئلہ خیال کرتا تھا! امام خمینیؒ نے عزاداری کو اس قسم کے شبہات سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ مسئلہ موجودہ زمانہ اور اسی طرح آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے ہم جب یزید کو برا کہتے ہیں تو اس سے موجودہ زمانے کے یزیدوں سے برائت کا اظہار ہوتا ہے موجودہ زمانے کے شمر صفتوں سے بیزاری ظاہر ہوتی ہے، موصوف نے عزاداری کی تیغ کی دھار طاغوتوں کی طرف موڑ دی جبکہ گزشتہ زمانے میں طاغوت مجالس عزا برپا کر کے، جن میں دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ ٹھاٹ باٹ اور بھڑک ہوتی تھی، اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تھے" مخالفتوں کا دباؤ اپنی طرف سے کم کریں اور ان مسائل کو زمانۂ گزشتہ تک محدود کر دیں، لیکن امام خمینیؒ نے تیغ کی اس دھار کو ان کی طرف موڑ دیا اور امام حسین علیہ السلام کے مسئلہ کو ایک ایسے شخص کے عنوان سے پیش کیا جو اپنے زمانہ کے طاغوتی نظام کے خلاف میدان میں آیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انقلاب کی ایک بنیاد قائم کر دی یعنی ہر وہ شخص جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی غرض سے طاغوت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے امام حسینؑ کے اصحاب و انصار میں سے ہے اور ایسے افراد کی بیعت و حمایت امام حسینؑ کی بیعت ہے، اس طرح آپ نے رہبری کو متروک حالت سے نکال کر زندہ کیا کہ رہبر کے پاس وقت ضرورت باندازۂ کافی راہ اسلام میں خون دینے والے موجود ہوں یہ کامیابی امام خمینیؒ نے عاشورا کے عظیم اجتماعات سے حاصل کی اور اس مقدس غم و غصہ کا رخ موجودہ زمانے کے طاغوتوں کی طرف موڑ دیا۔

عید اور جشن

عیدوں اور جشنوں کو بھی دوسروں نے محض ایک رسم اور مشغلہ بنا کر رکھ دیا تھا نہ ان میں کوئی زندگی تھی اور نہ ہی زندگی بخش علامتیں، امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے تینوں موسموں میں تقریریں کیں اور موضوع کی اہمیت نیز ان مخصوص ایام کی عظمت پر روشنی ڈالی مثلاً روز بعثت اور ولادت وغیرہ کے موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موضوع کی اہمیت کی طرف دنیا کی توجہ جذب کرنے کے لئے آپ نے استفادہ کیا امام حسینؑ کی تاریخ ولادت کو "روز پاسدار" (رضاکار دستوں کا دن) قرار دیا تا کہ محافظ دستے اس بات کو محسوس کریں کہ ان کی تاسیس کا روز حسین بن علیؑ کی ولادت کا دن ہے لہٰذا ہر "پاسدار" نے اسے امام حسینؑ کی زندگی کو انتخاب کرنا چاہئے۔ عید میلاد النبیؐ کو ہفتہ وحدت کا عنوان عطا کیا تا کہ تمام مسلمان متحد ہو کر نبی اکرمؐ کی زندگی کا مطالعہ کریں اور اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یعنی ایک اچھا شافعی مسلک کا حامل مسلمان وہ شخص ہے جو بہادری کے ساتھ دشمن سے جنگ کر سکے، یہی صورت ایک مالکی مسلک کے حامل مسلمان کی بھی ہے، ویسے ہی جیسے کہ آج فلسطین کے مسلمان ممکن ہے مختلف مسلک و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں لیکن اچھے مسلمان ہیں، جس طرح ایک اچھا شیعہ وہ ہے جس نے امام حسین علیہ السلام سے بہتر سے بہتر طور پر درس لے کر استفادہ کیا ہو، بہر حال مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسلام کی عزت کا پرچم اونچا رکھیں اور ہم کو اس میدان میں مقابلہ کرنا چاہئے کہ کون طاغوتی طاقتوں سے دوری اختیار کرنے میں سب سے آگے ہے، کس نے اسلام کے دفاع میں پیش قدمی اختیار کی ہے امام خمینی نے جشن کی محفلوں کو، اسلام کی عظیم شخصیتوں کو دنیا میں روشناس کرانے اور پہچاننے کا وسیلہ قرار دیا ہے عید غدیر کے جشن کو امام خمینیؒ نے اس طرح پیش کیا کہ حضرت علی علیہ السلام، جن کا آج یوم جشن ہے وہ عظیم شخصیت ہے جس نے اسلامی نظام کے دفاع اور تحفظ کے لئے، جن لوگوں نے ان کا حق لے لیا تھا، ان کی بھی مدد کی ہے" ایک وزیر و مشیر کی مانند ان کے ساتھ رہے ہیں۔ ان کی نماز جماعت میں شریک رہے ہیں، اپنے فرزندوں کو ان کی معیت میں جنگوں کے لئے بھیجا ہے مدد کی ہے اور دیگر اقدامات کئے ہیں۔ جب اسلامی نظام خطرے میں پڑ جاتا ہے تو یہ مسائل مورد بحث نہیں رہتے چنانچہ امام خمینی کہا کرتے تھے کہ آپ لوگ جو اپنے آپ کو ان کا شیعہ کہتے ہیں اسلام کی حفاظت کے لئے کس حد تک حاضر ہیں نسبتاً چھوٹے مسائل کو کنارے رکھ دیجئے تا کہ زیادہ سے زیادہ اسلام کی خدمت کر سکیں۔

از : جناب سید رضا تقوی
ترجمہ : جناب سید احتشام عباس زیدی

امام خمینی اور جہاد کی حکمت عملی

شخصیت امام کی عظمت

ہمارے عہد کی ایک عظیم ترین شخصیت جس نے موجودہ دنیا میں حیرت انگیز انقلابات برپا کیئے، دلوں میں اثر گراں میں ایمان کی گرمی پیدا کی اور ایک امت کو دنیا پر حاکم نظاموں کے مقابل لا کھڑا کیا وہ اسلامی انقلاب کے عظیم رہبر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی قدس سرہ کی مقدس ذات ہے۔

امام خمینیؒ نے اسلامی افکار و نظریات کی بنیاد پر ایک انقلاب کی رہبری فرمائی اور دو ہزار پانچ سو سالہ حیرونی نظام کو سیاست اور معاشرتی ثقافت کے میدان سے محو کر کے شاہنشاہی نظام کی جگہ اسلامی معیاروں پر استوار ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی اور تمام عالمی سازشوں اور سخت ترین بین الاقوامی مسلح دشمنوں کے روبرو پوری شجاعت و استقامت کے ساتھ ڈٹے رہے۔

اس عظیم رہبر کی شخصیت کے مختلف پہلو ایسی وسعت و عظمت کے حامل ہیں کہ افکار ان کے درک کرنے، زبان ان کی توصیف کرنے اور قلم ان کی شرح کرنے سے عاجز ہیں۔

مستضعفین کے امام کی سیاسی شخصیت نے دنیا کی سیاست کو تسخیر کر لیا۔

ان کی مجاہدانہ شخصیت نے میدان رزم و پیکار کے بڑے بڑے سورماؤں اور جیالوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ اس عارف عاشق کی عرفانی شخصیت نے وادی سیر و سلوک کے عارفوں

کو مقام حیرت تک پہنچا دیا۔

" فیضیہ" کے پر فیض چشمہ سے ابلنے والی اس کی فقاہت نے شیعہ مرجعیت کو امامت اور امامت کو حکومت اور حکومت کو ولایت مطلقۂ الٰہیہ تک معراج عطا کردی۔

اور آخر کار حکمت و فلسفہ اور اخلاق جنہوں نے اس کے دریائے وجود میں اتر کر اس کی الٰہی و اسلامی عظمتوں سے جلوہ بار و تابناک موتی نکالے کہ اس کو تمام بزرگیوں سے بڑھ کر بزرگی عطا کردی، اور ہم یہیں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اب تک اس باعظمت شخصیت کے تمام پہلو حتیٰ ان کے سچے پیروؤں اور عاشقان صادق پر بھی واضح نہیں ہو پائے ہیں۔

امام خمینیؒ کی عظیم شخصیت نہ صرف ان کی حیات میں ایک اسوۂ حسنہ اور ہر دل عزیز مقتدا شمار ہوتی تھی بلکہ ان کی موت کے بعد بھی بہترین مشعل ہدایت رہے گی۔ ان کے قابل قدر اور قیمتی اقوال اور ان کی سازگار ہدایات آئندہ نسلوں کو اس طرح سنواریں گی کہ ان میں خداوند عالم کی بارگاہ کے مقابل خضوع و خشوع اور ظالم و ستمگر حکمرانوں کے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ بیدار ہو جائے گا۔

اس عظیم المرتبت رہبر کی تقریریں، پیغامات اور خطوط نسل انقلاب کے لئے گراں بہا سرمایہ ہیں اور چونکہ اس خدا رسیدہ حکیم کے حکیمانہ اقوال قرآن و عترت کا پرتو ہیں لٰہذا یہ اقوال بھی کتاب اللہ کی مبارک آیتوں کے مانند تاریخ ملت اسلامیہ کی پیشانی پر درخشاں نظر آتے ہیں۔

مذکورہ بالا باتوں کے پیش نظر ہم نے طے کیا کہ اس حکیم ربانی کی حکمتوں پر ایک نگاہ ڈالی جائے اور جہاد و مبارزہ کی حکمت عملی کو ان کے نقطۂ نگاہ سے حاصل کیا جائے۔ اگرچہ ہم اس بات کے مدعی نہیں کہ ایک جامع و کامل کام آپ کے حوالہ کر رہے ہیں کیونکہ ایسا اہم موضوع نہ تو ایک مقالہ میں سما سکتا ہے اور نہ ہم میں رہبر انقلاب کے بلند افکار و خیالات کا احاطہ کرنے کی طاقت ہے پھر بھی:-

آب دریا را اگر نتوان کشید | ہم بقدر تشنگی باید چشید

یا دوسرے الفاظ میں " مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ " اگر سب نہ سمجھا جائے تو سب چھوڑ بھی نہیں دینا چاہیئے۔

جنگی حکمت عملی (STRATEGY)

اصطلاح شناس اور اہل لغت حضرات اسٹراٹیجی (حکمت عملی) کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "جنگی نقل وحرکت کے کنٹرول، فوجی حملوں کی ہدایت وراہنمائی اور لشکر کو آگے بڑھانے کے فن کو اسٹراٹیجی کہتے ہیں۔" (۱)

بعض صاحبان نظر نے اسٹراٹیجی کی تعریف یوں بیان کی ہے: "اسٹراٹیجی وہ فن ہے جس کے ذریعہ فوجوں کو بروئے کار لاکر اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے جو کسی حکومت یا قوم کی کلی سیاست کے ذریعہ معین کیا گیا ہو۔" (۲)

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ: اسٹراٹیجی کی اصل بنیاد ایک تاثیر وتاثر ہے جو دو الگ الگ اور متضاد ارادوں کے باہمی ٹکراؤ سے وجود میں آتا ہے اور یہ گروہ اس سے یہ نتیجہ حاصل کرتا ہے کہ: "اسٹراٹیجی وہ فن ہے جو انسان کو (اس روش سے قطع نظر جو وہ بروئے کار لاتا ہے) اس بات پر قادر کرتا ہے کہ پیش آنے والے دو متضاد تقاضوں کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل کو اچھی طرح سمجھے اور ان کی بھرشناخت کے بعد وہ ٹیکنک وروش اپنائے جس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔" (۳)

ہمارے زمانہ میں فن حرب کو تین جدا جدا شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں، اس تقسیم بندی میں اسٹراٹیجی کی جگہ بخوبی مشخص ومعین ہوتی ہے:۔

۱۔ اسٹراٹیجی (دشمن سے مقابلہ کے وقت فوجی نقل وحرکت کو کنٹرول کرنے والا علم)۔

۲۔ ٹیکٹیک (جنگ میں اسلحوں کے استعمال اور ان کی صلاحیت کی شناخت کا فن اس طرح کہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے)۔

۳۔ لوجسٹک (اسلحوں اور ساز وسامان کی فراہمی اور فوج کے پچھلے حصہ کو منظم رکھنا...

۱۔ فرہنگ معین، ج ۱ ص ۲۴۶، فرہنگ عمیدی انگلش۔فارسی حیم، ص ۱۱۷۸

۲۔ مقدمہ ای بر استراتژی، ص ۳۰ ۳۔ مقدمہ ای بر استراتژی، ص ۳۱

کہتے ہیں کہ ٹیکٹیک اور لوجسٹک تاثیر و تاثر اور مادی اور محسوس کئے جانے والے اثرات و اسباب سے سروکار رکھتے ہیں لیکن اسٹراٹیجی " غیبی امداد " یا " الٰہی امید " ہے ۔ (۱)

اسٹراٹیجی کے سلسلہ میں اس مختصر سی وضاحت کے بعد اب ہم حضرت امام خمینی قدس سرہ کے قابل قدر اقوال اور قیمتی نظریات کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اس جہاد و مبارزہ کے معلم سے اسلامی بنیادوں پر جہاد کا فن سیکھیں ۔

جہاد کی اہمیت

ہر چیز کی مقبولیت ایک حد تک اس کی تاثیر کی مقدار و میزان سے وابستہ ہوتی ہے جو انسان کو اس کے مقاصد تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے ۔ کیونکہ جہاد کا مطلب ہے ان تمام رکاوٹوں اور مشکلوں سے فیصلہ کن مقابلہ جو انسان کی سعادت و کمال کی راہ میں حائل ہیں ۔ اس لئے جہاد کی اہمیت مقصد کی عظمت و اہمیت سے پوری طرح مربوط ہے ۔ دوسرے لفظوں میں جس قدر مقصد عظیم اور قیمتی ہوگا ، اس تک پہنچنے کی راہ میں کیا جانے والا جہاد بھی اسی قدر قیمتی اور بااہمیت ہوگا

الٰہی نظریۂ فکر میں کفر و شرک و ظلم سے خدا کی راہ میں کیا جانے والا جہاد ایک قیمتی معیار و اساس تصور کیا جاتا ہے اور اسلامی نظام کو شرع کے حکم سے ملک کے امور کو چلانے کے لئے ایسے افراد کا انتخاب کرنا چاہیئے جو خدا کی راہ میں جہاد کی اہمیت کی اساس کو سمجھتے ہوں ۔

قرآن کریم فرماتا ہے :

" فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ اَجْرًا عَظِيمًا " (۲)

" خداوند عالم نے راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلہ میں عظیم اجر عطا کیا ہے ۔"

امام خمینی قدس سرہ بھی قرآن کریم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی رہبری میں جہاد کی اہمیت پر توجہ رکھتے ہیں

---

۱ ۔ مزید مطالعہ کے لئے آندرہ بوفر کی کتاب مقدمہ ای بر استراتژی ملاحظہ فرمائیں

۲ ۔ نساء / ۹۶

اور مشرکین سے برأت کے سلسلہ میں اپنے ایک پیغام میں اسلامی نظام کے ذمہ داروں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"میں اپنے ملک کے تمام ذمہ دار افراد کو یاد دہانی کراتا ہوں کہ انسانی معیاروں میں کوئی بھی اساس "تقویٰ" اور "خدا کی راہ میں جہاد" سے زیادہ اہم قیمتی اور مقدم نہیں ہے اور یہی بالا ترین الٰہی امتیاز لوگوں کے درمیان انتخاب و ترقی نیز امکانات و وسائل سے استفادہ، ذمہ داریوں کی تعیین اور ملک کو چلانے کا معیار ہونا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ تمام مادی و نفسانی رسموں اور امتیازات کی جگہ برتری کا یہی معیار دائم ہونا چاہیئے۔ چاہے وہ جنگ کا زمانہ ہو یا صلح کا، چاہے آج ہو یا کل، کہ خداوند عالم نے یہ امتیاز انھیں عطا فرمایا ہے۔ اور صرف لفظی و عرفانی امتیاز کافی نہیں ہے بلکہ انھیں قوانین و دستورات کے متن میں اور معاشرہ کے عمل و عقیدہ اور روش و سرشت میں بھی رائج ہونا چاہیئے۔

امام خمینیؒ اس بات کے معتقد ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ ایک مسلمان کو اسے ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیئے اسے ظلم و فساد کے بانی حکام سے متعلق اپنے دشمنانہ موقف اور انقلابی غیظ و غضب کا ہر ممکن شکل میں اظہار کرنا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں :

موقف اور پالیسیاں ایسی ہونی چاہیئں کہ تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اسلامی اصول کے تحفظ کے ساتھ ہی ساتھ مغربی سرمایہ داری اور ان کے سرغنہ عالمی درندے امریکہ نیز کمیونزم اور بین الاقوامی سوشلزم نیز ان کے سرغنہ جارح روس کے خلاف اپنے اور عوام کے انقلابی غیظ و غضب کے بھی محافظ ہوں۔" (۱۰، ۸، ۶۷) یکم نومبر ۱۹۸۸ء۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

اگر یہ لوگ میری ہڈیوں کے جوڑ جوڑ جدا کر دیں، اگر ہمارا سر دار پر چڑھا دیں، اگر مجھے زندہ زندہ آگ میں جلا ڈالیں۔ اگر میری بیوی بچوں اور میری ہستی کو میری نگاہوں کے سامنے اسیر اور تباہ و برباد کر دیں پھر بھی ہم کفر و شرک کے امان نامہ پر ہرگز دستخط نہ کریں گے۔ (۲۹، ۴، ۶۷) ۲۰ر جولائی ۱۹۸۸ء۔

امام خمینیؒ قرآنی آیات کو بطور سند پیش کرتے ہوئے اسلامی تفکر میں جہاد کی حیثیت اور اس کے مقام

کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" قرآن کہتا ہے " جنگ جنگ تا رفع فتنہ از عالم " یعنی جو لوگ قرآن کی پیروی کرتے ہیں یہ بات ان کے پیش نظر رہے کہ جہاں تک ان میں طاقت ہو اپنا جہاد جاری رکھیں یہاں تک کہ دنیا سے فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو جائے " (۲۱ ، ۹ ، ۶۳) ۱۲ ، دسمبر ۱۹۸۴ء ۔

جہاد کی حقیقت و ماہیت

ہر جہاد و پیکار کو سمجھنے کے لئے پہلے اس کی حقیقت و ماہیت کا پہچاننا ضروری ہے ، کیونکہ جہاد کی ماہیت کی شناخت اس جہاد کی گہرائی و گیرائی سے آگاہ کرتی ہے ۔ اگر جہاد کی ماہیت اور اس کے جوہر کی طرف توجہ نہ ہو تو جہاد کی منصوبہ سازی ، مجاہد طاقتوں کی تعلیم طریقہ کار کا انتخاب ، سرمایہ گزاری کی مقدار اور اس سرمائے سے بھرپور استفادہ میں کامیابی حاصل نہ ہو پائے گی لہٰذا ہر محاذ کے مجاہد رہبروں پر واجب ہے کہ کسی بھی جہادی اقدام سے پہلے اس جہاد کی حقیقت و ماہیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کریں ۔ انبیاء ؑ کے مکتب فکر میں جہاد کی حقیقت الٰہی ماہیت رکھتی ہے یعنی اللہ کے لئے ہے اور جہاد کی تمام راہیں و روشیں خداوند عالم پر تمام ہوتی ہیں ۔ ان تمام اقدامات کی اصل جڑ خداوند عالم کی ذات پر بھرپور ایمان و اعتقاد ہے اور اس محاذ کے مجاہد اس اصل پر ایمان رکھتے ہوئے ہی میدان کارزار میں قدم رکھتے ہیں کہ :۔

" فمن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ "

" جو ظالم و ستمگر سے کفر اختیار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے پس اس نے مضبوط رسی تھام رکھی ہے " (بقرہ / ۲۵۶)

ایسے طرز تفکر میں تمام کوششیں الٰہی رنگ اختیار کر لیتی ہیں اور پھر تجارت ، عبادت ، زراعت اور اعتقاد و ایمان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ۔ انبیاء کرام نے اپنے وسیع و عظیم جہاد کی ابتداء میں ہی بڑے فنکارانہ انداز میں اس کی ماہیت کو واضح کر دیا ہے ۔ جناب ابراہیم ؑ بت پرستوں سے فرماتے ہیں

انني براء مما تعبدون

میں ان بتوں سے بیزار ہوں جن کی تم خدا کے عنوان سے پرستش کرتے ہو اور پیغمبر ؐ اسلام کافروں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

۔ لا اعبد ما تعبدون " (۱) یعنی جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو ۔ میں ان کی عبادت نہیں کرتا

امام خمینی رح نے اپنے اجداد کرام کی مانند اس جہاد کے دوران بارہا دنیائے کفر کے آقاؤں کو مخاطب کر کے ان پر اپنے جہاد کی حقیقت و ماہیت واضح کی ہے ۔ آپ اپنے " پیام برائت " میں فرماتے ہیں :

" یہ طاقتیں ، بڑی طاقتیں اور ان کے زرخرید غلام مطمئن رہیں کہ اگر خمینی یک و تنہا بھی رہ گیا تو بھی اپنی راہ پر جو کفر و ظلم اور شرک سے جہاد کی راہ ہے گامزن رہے گا اور خداوند عالم کی مدد سے عالم اسلام کے رضا کار دستوں اور ان ڈکٹیٹروں کے ظلم کا شکار پابرہنہ لوگوں کے ذریعہ عالمی درندوں اور ان کے نوکروں کی آنکھوں سے راحت و آرام کی نیند چھین لے گا جو اپنے ظلم و ستم پر اصرار کرتے جا رہے ہیں ۔ "

امام خمینی رح ایک دوسری جگہ اسی " اعلان برائت " کے پیغام میں جہاد کی دینی حقیقت و ماہیت کو اس طرح ظاہر فرماتے ہیں :-

" میں پوری دنیا کے سامنے قاطعیت اور فیصلہ کن طور پر یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر عالمی درندے ہمارے دین کے خلاف اٹھیں گے تو ہم ان کی تمام دنیا کے مقابل اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان سب کی نابودی و خاتمہ تک آرام سے نہ بیٹھیں گے ۔ "

آپ مؤرخہ ۲۹، ۴، ۶۷ (۲۰ جولائی ۱۹۸۸ء) کو اپنے ایک پیغام میں فرماتے ہیں :-

" ہماری جنگ عقیدہ کی جنگ ہے اور اس کا کسی معین جغرافیہ اور سرحد سے سروکار نہیں ہے "

اور یہ اسی رہبر کا نعرہ ہے کہ :-

" ہماری جنگ حق و باطل کی جنگ تھی اور یہ جنگ ختم ہونے والی نہیں ہے ۔ ہماری جنگ غریبی و امیری کی جنگ تھی ، ہماری جنگ ایمان و رذالت کی جنگ تھی اور یہ جنگ حضرت آدم ع سے زندگی کے خاتمہ تک جاری رہے گی " ۔ پیام : ۳، ۱۲، ۶۷ (۲۲ فروری ۱۹۸۹ء)

امام خمینی قدس سرہ کی نظر میں جہاد ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آپ فرماتے ہیں :-

" ہم اس سے نہیں ڈرتے کہ گزشتہ اخبارات میں یا ایران کے باہر کے اخباروں میں ہمارے لئے کچھ لکھا جائے ۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایران میں ، دنیائے اسلام میں اور باہر کی دنیا میں اپنی شخصیت بنائیں ۔ ہم خدا کے حکم پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور یہ کر کے رہیں گے دسمبر ۱۹۷۹ء "

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

" اہم یہ ہے کہ ہم موجودہ زمانہ اور مستقبل میں اپنے فریضہ سے آگاہ ہوں " (جون۔ ۸۹ء)

جہاد کا مقصد

جہاد کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ جہاد کا مقصد ہے ۔ مقصد یعنی وہ بلند ترین نقطہ اور آخری چوٹی جس تک رسائی کے لئے تمام کوششیں انجام پاتی ہیں ۔ جہاد کی راہ میں قید اور اذیتیں ، فریادیں اور سختیاں ، ہجرتیں اور شہادتیں ، جان و مال کی قربانیاں چاہے مادی ہوں یا معنوی ان ہی معین و مشخص مقاصد کے حصول کے لئے عمل میں آتی ہیں اور یہیں سے جہاد کے مقصد کی اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے ۔ قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ مقصد جس قدر عظیم اور بلند ہوگا اس تک رسائی بھی اتنی ہی مشکل ہوگی اور اس کے لئے سرمایہ گزاری بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی لہٰذا ہمیشہ بلند مقاصد تک عظیم شخصیتیں اور عالی ہمت انسان ہی پہنچیں گے ، بزدل اور پست انسان نہیں ۔ نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند ۔

جہاد کے سلسلہ میں رہبر و قائد کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ جہاد کے مقصد کی وضاحت کر دے ۔ اس میں مقصد کی جاذبیت اور خوبصورتی کو نمایاں کرنے کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ جب بھی کوئی انسان ایک معین مقصد میں جاذبیت و کشش ، آرزوؤں کی تکمیل اور اوج کمال کا مشاہدہ کرے گا تو حصول کمال کی فطرت کی بنیاد پر اس کے پیچھے پڑ جائے گا اور کسی بھی صورت اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا ۔

ایک موقع جہاں جہاد میں رہبر کی قیادت کے فن کو افکار و خیالات کی ترازو پر تولا جا سکتا ہے یہ ہے کہ وہ معاشرہ کے افراد پر جہاد کے مقصد کی وضاحت و توجیہہ بیان کرنے کی کتنی توانائی رکھتا ہے اور کس قدر مؤثر ثابت ہوتا ہے ۔

محاذ توحید پر جہاد کی قیادت و رہبری انبیاء الٰہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مدرسہ جہاد میں ہدف و مقصد کی وضاحت کے ذمہ دار بھی یہی حضرات ہیں ۔ انبیاء کرام کے مکتب فکر میں جہاد کا مقصد خدا اور کمالات الٰہی تک رسائی ہے ۔ یعنی اس نقطہ کمال تک پہنچنا

جیسے حیات مطلق، نور محض اور ابدیت کہتے ہیں۔ جہاں فرشتوں کی بھی رسائی نہیں ہے۔

امام خمینی " کمالات تک پہنچنے اور کمال مطلق میں فنا ہو جانے کی راہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

(وہ خالق جس نے) غیب سے انبیاء کرام پر "صفی اللہ" سے "خلیل اللہ" تک اور خلیل اللہ سے "حبیب اللہ" صلوات اللہ وسلامہ علیہم وسلم تک آسمانی کتابیں نازل فرمائی ہیں اس نے ان کتابوں کے ذریعہ کمالات کو حاصل کرنے اور کمال مطلق میں فنا ہو جانے کی راہ تعلیم فرمائی اور اللہ کی جانب سیر و سلوک کا طریقہ بتایا ہے جیسے آیت کریمہ "ومن یخرج من بیتہ مھاجراً الیٰ اللہ" اور اپنے گھر سے نکل کر خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والے کو "ملحدین، مستکبرین اور اپنے دشمنوں سے" برتاؤ کا طریقہ بھی سکھایا ہے "محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم"۔ ۶۷،۵،۶ (۲۸ جولائی ۱۹۸۸)

جس روز لشکر اسلام نے ایران کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کی فوجوں کے مقابل صف آرا ہوا تو ایرانی فوج کے مغرور سردار "رستم فرخزاد" نے لشکر اسلام کے نمائندہ "زہرۂ ثقفی" سے سوال کیا تم کس مقصد کے تحت ہم سے جنگ کرنے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا:۔ "اخراج العباد من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللہ" (۱) ہم لوگوں کو خسرو پرویز کی غلامی سے آزاد کر کے خدا کی بندگی کی طرف راہنمائی کے لئے آئے ہیں۔

چونکہ انسان فطری طور سے بزرگی و عظمت کا طالب رہا ہے اور مختلف طریقوں سے انسانی فضیلتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے فطری تقاضوں کے پیش نظر اس کی فلاح و نجات کی راہ جہاد کے سایہ میں معین کی ہے۔ اور راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو اس عظیم مقصد کی طرف ہدایت دیتا ہے:

"جاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون" (۲)

خدا کی راہ میں جہاد کرو امید ہے کہ کامیاب ہو جاؤ۔

۱۔ کامل ابن اثیر

۲۔ سورۂ مائدہ، آیت ۳۵

پیغمبر اکرمؐ ایک دوسرے انداز سے جہاد کو انسانی کمال کے حصول کا ذریعہ بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:
"اغزوا تورثوا ابناءکم مجداً" (۱) جنگ کرو تاکہ تمہاری اولاد بزرگی و عظمت کی وارث ہو۔ امام خمینی رضوان اللہ علیہ مؤرخین اور اہل قلم کے گروہ کو بھی قیام و جہاد کے مقصد کی وضاحت و توجیہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔
"میں آپ لوگوں سے چاہتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے عوام کے قیام و جہاد کا مقصد مشخص کرنے کی کوشش کیجئے۔ کیونکہ مؤرخین ہمیشہ انقلابات کے مقاصد کو اپنی یا اپنے آقاؤں کی اغراض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتے رہے ہیں۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح جیسا کہ انقلابات کی تاریخ رہی ہے۔ کچھ ایسے لوگ ایران کے اسلامی انقلاب کی پرافتخار تاریخ لکھنے میں مشغول ہیں جو مشرق اور مغرب کے کاسہ لیس ہیں۔ ہمارے اسلامی انقلاب کی تاریخ کی بنیادیں خود انقلاب کی مانند ظالم طاقتوں اور بڑی طاقتوں کے ستائے ہوئے غریب و نادار افراد کے کاندھوں پر ہونا چاہیئے" ۲۵/۱۰/۶۷ (۱۵ جنوری ۱۹۸۹ء)۔

جہاد کے مقصد و ہدف کے سلسلہ میں اس مختصر وضاحت کے بعد اب ہم اس انقلاب میں اسلامی جہاد کے اغراض و مقاصد کا امام خمینیؒ کے افکار کی روشنی میں فہرست وار جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی مقاصد کو عملی شکل دینا

امام خمینیؒ مکتب انبیاءؑ کے ایک شاگرد کی حیثیت سے یہ اعلان فرماتے ہیں:۔
"ہمارا مقصد فقر و فاقہ کی دنیا میں اسلام کے بین الاقوامی اغراض و مقاصد کو رائج کرنا ہے ہم کہتے ہیں جب تک شرک و کفر ہے جہاد بھی ہے اور جب تک جہاد ہے ہم بھی ہیں۔" ۲۹/۴/۶۷۔ (۲۰ جولائی ۱۹۸۸ء)

امام خمینیؒ مورخہ ۱۳/۳/۵۸ (۳ جون ۱۹۷۹ء) کو ایک تقریر کے دوران فرماتے ہیں:۔
"ہمارا اور ملت ایران کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ سلطنتی نظام ختم ہو جائے۔ بلکہ ہمارا

۱۔ وسائل الشیعہ، پندرھویں جلد

مقصد اسلامی حکومت یعنی اللہ کی حکومت اور قرآن کی حکومت ہے .... تمام لوگوں نے اس لئے خون دیا ہے کہ اسلام قائم ہو. یہ قیام و جہاد انبیاءؑ کے قیام کا تتمہ ہے - ہماری کوششیں صرف اسلامی جمہوریہ کے نام کے لئے نہیں ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری مملکت کے تمام امور اسلامی احکام کی بنیاد پر ہوں ."

۲. اسلامی حیثیت کا احیاء

امام خمینیؒ ایک دوسری جگہ مسلمانوں کی اسلامی حیثیت کے احیاء کو الٰہی اقدار کے زندہ ہونے کا مقدمہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ ایران اپنے پورے وجود کے ساتھ ساری دنیا میں مسلمانوں کی اسلامی حیثیت کو زندہ کرنے کے لئے سرمایہ لگا رہی ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کے مسلمانوں کو ساری دنیا پر اقتدار حاصل کرنے کے اصول کی دعوت نہ دے اور دولت و اقتدار کے مالکوں اور فریب کاروں کی جاہ طلبی اور زیادہ سے زیادہ بڑھنے کی راہ میں دیوار نہ بنے ."

مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کو عید الاضحیٰ کی مناسبت سے حجاج کرام اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"اے قرآن و اسلام کے سمندر سے جدا ہو جانے والے قطرو ! ہوش میں آؤ ، اس الٰہی سمندر سے متصل ہو جاؤ اور اس نور مطلق سے روشنی حاصل کرو تاکہ عالمی درندوں کی لالچی آنکھیں تم سے دور ہو جائیں اور ان کی سرکشی و جارحیت کا ہاتھ کٹ جائے . تم شریفانہ زندگی اور انسانی اقدار سے ہمکنار ہو جاؤ اور اس بے شرمی و رسوائی کی زندگی سے کہ تھوڑے سے آوارہ گرد اسرائیلی تم پر حکومت کریں اور مظلوم و ستم زدہ مسلمانوں کو تمہارے سامنے پائمال کریں ، نجات حاصل کر لو ."

اسلامی انقلاب کے رہبر مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۸۸ء کو امت اسلامیہ کو الٰہی اقدار کی حفاظت و پاسبانی کی وصیت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دشمن نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ مسلمان ان اقدار سے رخ موڑ لیں :-

"وہ اہم نکتہ جس پر ہم سب کو توجہ دینا چاہئے اور اسے اغیار کے مقابلے میں اپنی سیاست کی اصل و اساس قرار دینا چاہئے ، یہ ہے کہ ہمارے دشمن اور عالمی درندے ہم کو کب تک اور کہاں تک

برداشت کرتے ہیں اور کس حد تک ہمارے استقلال اور آزادی کو تسلیم کرتے ہیں؟ یقیناً وہ ہمیں ہماری تمام معنوی والٰہی حیثیت و اقدار سے روگردان کرنے کے سوا کسی حد کے قائل نہیں ہیں اور قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ لوگ آپ سے جنگ و جدال اور قتل و غارت سے باز نہیں آئیں گے مگر یہ کہ وہ آپ کو آپ کے دین سے منحرف کر دیں۔"

۳. جہل و خرافات کے حصار توڑنا

امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ مؤرخہ ۴، اکتوبر ۱۹۸۸ء کو فرماتے ہیں:۔

"ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جہالت و خرافات کے حصاروں کو توڑ کر خالص محمدیؐ اسلام کے سرچشمۂ زلال تک پہنچیں۔ آج دنیا میں سب سے زیادہ غریب یہی اسلام ہے۔"

اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ مؤرخہ ۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۹ء کو اپنے ایک پیام میں کمال کی راہ میں حائل اس طرح کے حصاروں کو توڑنا علمائے کرام اور دینی مراکز کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"افسوس ملت اسلامیہ کے اب بھی بہت سے افراد پر امریکی اسلام اور خالص محمدیؐ اسلام، ناداروں و محروموں کے اسلام اور مقدس نما جمود پسندوں، خدا سے بے خبر سرمایہ داروں اور درد سے عاری عیش پرستوں کے اسلام کا فرق پورے طور سے واضح نہیں ہو پایا ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح کرنا کہ ایک مکتب فکر اور ایک آئین و شریعت میں دو متضاد اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ رکھنے والی فکروں کا وجود ممکن نہیں ہے، اس وقت بہت ہی اہم سیاسی واجبات میں سے ہے اور اگر یہ کام دینی مراکز اور درس گاہوں کے ذریعہ انجام پاتا تو بہت ممکن تھا کہ ہمارا یہ عزیز سید (عارف حسین) ہمارے درمیان موجود ہوتا۔"

۴. عالم اسلام کی سمٹی ہوئی طاقت کی آزادی

اسلامی انقلاب کے بہت سے مقاصد میں سے ایک مقصد جسے اسلامی انقلاب کے عظیم رہبر نے مؤرخہ ۲، جولائی ۱۹۸۸ء کو اعلان کیا وہ عالم اسلام کی ایک جگہ سمٹی ہوئی طاقت کو آزاد کرنا ہے، آپ نے فرمایا:۔

"ہم مشرکین سے برائت کے اعلان کے ساتھ عالم اسلام کی کھوئی ہوئی طاقت کو آزاد کرنے کا ارادہ رکھتے اور رکھتے ہیں اور (انشاء اللہ) خداوند عالم کی مدد سے فرزندان قرآن کے ہاتھوں یہ کام ہو کر رہے گا۔"

مشرکین سے برائت کے پیغام میں فرماتے ہیں :۔

"ہم اپنے تجربات تمام دنیا تک پہنچائیں گے اور بلا کسی جھجک کے ظالموں سے جہاد کا نتیجہ بھی راہ حق میں جہاد کرنے والوں تک منتقل کریں گے اور مسلّم طور پر ان تجربات کے برآمد کرنے کا ماحصل قید و بند میں گرفتار قوموں کی فتح و آزادی اور اسلامی احکام کے عملی شکل میں رائج ہونے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔"

آپ یوم عرفہ کی مناسبت سے اپنے ایک پیام میں جو مؤرخہ ۳۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو نشر ہوا تھا، پوری دنیا کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"اے دنیا کے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ اسلام کے ابتدائی دنوں میں بہت ہی مختصر تعداد ہونے کے باوجود تم نے بڑی بڑی طاقتوں کو شکست دی اور ایک عظیم اسلامی انسانی امت کو وجود بخشا اور آج تقریباً ایک ارب کی جمعیت اور ایسے عظیم ذخائر جو دشمن کے مقابل سب سے بڑا ہتھیار ہیں، رکھنے کے باوجود اس قدر محکوم اور ذلیل و خوار ہو گئے ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری تمام بدبختیاں تمہارے ملکوں کے حکام کے درمیان اختلاف و تفرقہ اور نتیجہ میں خود تمہارے درمیان تفرقہ کی وجہ سے ہیں؟ اٹھو اور قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر خداوند عالم کے فرمان کے آگے سر جھکا دو تاکہ اسلام عزیز کی بزرگی و عظمت دوبارہ واپس پلٹا سکو۔ آؤ اور خداوند عالم کی ایک نصیحت کو غور سے سنو۔ وہ فرماتا ہے "قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للّٰہ مثنیٰ و فرادیٰ" اے مسلمانو! اور اے دنیا کے محروم لوگو! ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر خدا کی طرف رخ کرو، اسلام کے دامن میں پناہ حاصل کرو اور قوموں و ملتوں کے حقوق کے لئے مستکبروں اور ظالموں کے خلاف برسرپیکار ہو جاؤ۔"

۵۔ فتنہ کا خاتمہ

جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ جہاد کا ایک مقصد فتنہ کا خاتمہ اور شرک و کفر کو دنیا سے دور کرنا بھی سمجھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"قرآن کہتا ہے: "جنگ جنگ تا رفع فتنہ از عالم" جب تک فتنہ دنیا سے دور نہ ہو جائے جنگ جاری رہے گی")

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

"ہم کہتے ہیں جب تک شرک و کفر ہے، جہاد بھی ہے اور جب تک جہاد ہے ہم بھی ہیں۔"

"ہم ان تمام (عالمی درندوں) کے مکمل خاتمہ تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

جہاد میں دشمن کی شناخت

دشمن کی شناخت اور اس کی پہچان ہر جنگ کا لازمی پہلو شمار ہوتا ہے کیونکہ جب تک دشمن کے طرز تفکر، اس کی توانائی، اسلحوں کی نوعیت، کمین گاہوں اور اس کے ارادوں سے آگاہی نہ ہو، اس سے جنگ میں ہرگز کامیابی حاصل نہ ہوگی۔

محاذ توحید کے سپہ سالار عظیم انبیائے الٰہی اپنے مقدس جہاد کے آغاز میں پہلے دشمن کی شناخت اور اس کے سلسلہ میں معلومات حاصل کرتے تھے، اس کے بعد بڑے وسیع پیمانہ پر آگاہی کے ساتھ میدان جہاد میں قدم رکھتے تھے۔

قرآن کریم میں دشمن کی شناخت کی بحث کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ قرآن اپنے حیرت انگیز اور عبرتناک واقعات کے ضمن میں محاذ توحید کے رنگا رنگ دشمنوں کا مختلف شکلوں میں تعارف کراتا ہے۔

شیطان کی شناخت : شیطان کی شناخت قرآن کی بڑی ہی اہم اور بنیادی بحثوں میں سے ہے کہ خداوند عالم نے خود اس موضوع کو انسان کی ہدایت کے لئے قرآن میں بیان فرمایا ہے اور انسان کے اس دیرینہ دشمن کے چہرہ کی عکاسی مختلف زاویوں سے کی ہے :-

اِنَّ الشَّیطان لکم عدوٌّ فاتّخذوہ عدوًّا (سورۂ فاطر/۶)

بلاشبہ شیطان تمہارا سخت ترین دشمن ہے پس تم بھی اسے اپنا دشمن قرار دو۔

اِنَّ الشَّیطان للانسان عدوٌّ مبین (سورۂ یوسف/۵)

یقیناً شیطان، انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

منافق کی شناخت : منافق کی شناخت پر بھی قرآنی آیات کا ایک حصہ مشتمل ہے۔ خداوند عالم نے ان آیات میں استکبار کے چیلوں اور طاغوتوں کی چھپی ہوئی بھیڑوں کا تعارف کرایا ہے اور ان کے بظاہر مسلمان چہرہ

سے مکر و فریب اور نفاق کی نقاب الٹ دی ہے۔ قرآن کریم منافقین کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ سے فرماتا ہے:-

هم العدو فاحذرهم قاتلهم الله انّٰى يؤفكون (منافقون/۴)

"اے پیغمبرؐ! منافقین درحقیقت دشمن ہیں، ان سے خبردار رہئے۔ خدا انہیں قتل کرے کس قدر حیلہ گر کے ساتھ حق کی طرف سے منہ موڑتے ہیں۔"

طاغوت کی شناخت: دشمن شناسی کے تحت آنے والی قرآنی بحثوں میں ایک قابل توجہ بحث طاغوت کی شناخت ہے۔ طاغوت انسانیت کا سخت ترین دشمن ہے، وہ انسانوں سے ان کی آزادی اور استقلال سلب کر کے مظلوم انسانیت کے ارتقاء و کمال کی راہ بند کر دیتا ہے۔ یہ مغرور اور شیطانی وجود سب کچھ اپنے ہی لئے چاہتا ہے اور تمام راہیں اپنی خواہشات نفسانی کی طرف موڑ دیتا ہے یعنی سب کچھ اپنی ہوس کی بیدی پر قربان کر دیتا ہے۔

قرآن کریم طاغوتوں کے نمونہ کی حیثیت سے فرعون کا تعارف کراتا ہے۔ فرعون یعنی درحقیقت دشمن انسان و انسانیت کیونکہ جب فرعون اور اس کا لشکر دریائے نیل میں غرق ہوئے تو خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو یہ بشارت دی:-

يا بنى اسرائيل قد انجيناكم من عدوكم (طٰہٰ/۸۰)

"اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن فرعون سے نجات دے دی۔"

صہیونیت کی شناخت: صہیونیت شناسی پر دشمنی کی شناخت کے ذیل میں پوری سنجیدگی سے بحث کرنا چاہئے، کیونکہ عقل و منطق سے کام نہ لینے والے متعصب یہودی جو آغاز اسلام سے ہی پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کے ساتھ پست ترین خائنانہ حرکتیں کیا کرتے تھے اور آج بھی مقبوضہ فلسطین میں مسلمانوں پر جو ہر لمحہ نئے نئے مظالم ڈھا رہے ہیں، ہمیشہ سے اسلام اور مسلمانوں کے بے رحم ترین دشمن رہے ہیں۔ قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے:-

لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود (مائدہ/۸۲)

"اے پیغمبرؐ! آپ مسلمانوں کا سب سے سخت دشمن یہودیوں کو پائیں گے۔"

بحث کے اس حصہ میں بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں لیکن اختصار کی بنا پر ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں اور دشمن کی شناخت کی اہمیت کے سلسلہ میں صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں جو درحقیقت قرآنی آیات کی تفسیر بھی ہے:-

قال النبیؐ: الا ان اعقل الناس عبد عرف ربه فاطاعه و عرف عدوه فعصاه

(بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۱۴۹)

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : آگاہ رہو کہ لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کو پہچانے اور اسی معرفت کی بنیاد پر اس کی اطاعت کرے اور اپنے دشمن کو بھی پہچانے اور اس سے مقابلہ کرے ۔

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اپنی طویل جدّ و جہد اور مقدس جہاد میں جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے، دشمن کی شناخت کے اصول پر بڑی تاکید کرتے ہیں اور اپنی پیروی کرنے والے مومنین کو مختلف مواقع اور مختلف بیانات میں یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچانیں اور اس کی توانائیوں نیز روش کار اور طرز عمل سے مکمل طور پر آگاہ ہو جانے کے بعد اس کا مقابلہ کریں۔

اسلامی انقلاب کے رہبر اعظم کلی طور پر دشمن کی پیچیدہ اور شیطانی ماہیت بیان کرنے کے علاوہ ان کے مصداق اور ان کے چہروں کو بھی پہچنوا دیتے ہیں۔ ہم یہاں ان دشمنوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے نام اور چہرے تک اس عظیم رہبر نے مشخص کر دیئے تھے اگرچہ اس حصہ سے متعلق حضرت امام خمینیؒ کے اقوال اور ان کی ہدایات کو سمیٹا جائے تو بجائے خود ایک مفصل کتاب ہو جائے گی۔

۱۔ امریکہ :

امام خمینیؒ کے نقطۂ نگاہ سے امریکہ دنیا کے محروم و مظلوم انسانوں کا دشمن نمبر ایک ہے جو دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور ملک ہونے کی حیثیت سے پوری درندگی کے ساتھ دنیا کی محروم و بے سہارا قوموں کے قیمتی ذخائر کو نگلتا جا رہا ہے اور بے رحمی کے ساتھ انسانوں کی شخصیتوں کو ذلیل کر رہا ہے :۔

"سب سے اہم اور سب سے زیادہ دردناک مسئلہ جس سے زیر تسلط ممالک کی اسلامی و غیر اسلامی قومیں روبرو ہیں، امریکہ کا مسئلہ ہے۔ امریکی حکومت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہونے کی حیثیت سے اپنے زیر نگیں ممالک کے مادی ذخائر کو زیادہ سے زیادہ ہڑپ نے کے سلسلہ میں کسی بھی کوشش کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ۔"

" امریکہ دنیا کے محروم اور مستضعف انسانوں کا دشمن نمبر ایک ہے، وہ اپنے زیر تسلط دنیا پر سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور فوجی قبضہ جمانے کے لئے کسی بھی خیانت اور دھوکہ بازی سے پرہیز نہیں کرتا، وہ دنیا کے مظلوم لوگوں کو اپنے وسیع پروپیگنڈوں کے ذریعہ جو بین الاقوامی صہیونیت کے ذریعہ تیار کئے جاتے ہیں، اسیر و غلام بناتا ہے ۔ وہ اپنے زرخرید

بدعنوانیوں اور خیانت کاروں کے ذریعہ بے سہارا انسانوں کا خون اس طرح چوس رہا ہے جیسے دنیا میں اس کے اور اس کے ہمنواؤں کے سوا کسی اور کو جینے کا حق ہی نہیں ہے۔"

(۱۲، ستمبر ۱۹۸۰ء)

۲۔ بڑی طاقتیں:

امام خمینیؒ کے اسلامی جہاد میں استکباری حکومتیں اور مشرق و مغرب کی بڑی طاقتیں انسانیت کی دشمن کے عنوان سے جانی جاتی ہیں اور امام کے شدید ترین حملے ان ہی بین الاقوامی مجرموں پر ہوئے ہیں۔

مشرق و مغرب کی استکباری حکومتوں خصوصاً امریکہ اور روس نے عملی طور سے دنیا کو دو حصوں آزاد اور سیاسی قرنطینہ یا اچھوتوں کے علاقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ دنیا کے آزاد حصہ میں یہ بڑی طاقتیں ہیں جو کسی بھی قانونی سرحد کو خاطر میں نہیں لاتیں اور دوسروں کے منافع پر حملہ کرنا اور قوموں و ملتوں کو اپنا دست نگر اور اسیر و غلام بنانا ایک ضروری امر اور پوری طرح قابل توجیہ منطقی اور اپنے خود ساختہ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق اقدام سمجھتی ہیں لیکن سیاسی قرنطینہ یا اچھوتوں کے علاقوں میں کہ افسوس جہاں دنیا کی بیشتر ضعیف و کمزور قومیں، خاص طور سے مسلمان محصور و قیدی ہو گئے ہیں نہ کسی کو جینے کا حق ہے نہ اظہار خیال کا، تمام دستورات و قوانین اور تمام اصول و ضوابط وہی بڑی طاقتوں کے املا کرائے ہوئے اور ان کے حسب دلخواہ کٹھ پتلی حکومتی نظاموں اور مستکبروں کے منافعوں کو پیش نظر رکھنے والے قوانین ہوں گے۔"

۳۔ صہیونزم:

امام خمینیؒ بین الاقوامی صہیونزم کو اسلام اور مسلمانوں کے دیرینہ دشمنوں میں شمار کرتے ہیں اور صہیونیوں کے ذریعہ فلسطین پر قبضہ کئے جانے کے آغاز سے ہی اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے سامنے اس جرثومۂ فساد کا کریہہ چہرہ نمایاں کرتے رہے ہیں۔ آپ یہودیوں کی قدیم اسلام دشمنی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"اسلام اپنی ابتدا میں ہی یہودیوں کے ہاتھوں مصیبتوں میں گرفتار ہوا، اسلام مخالف پروپگنڈے اور مکاری چال بازیاں و مکر و فریب سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کئے اور جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ان عیارانہ دشمنیوں کا سلسلہ ہمارے زمانہ تک پھیلا ہوا ہے۔"

(ولایت فقیہ ص ۱۶۱)

۵. زراندوز اور بے حس عیش پرست افراد

مال و دولت اکٹھا کرنے والے پیسوں کے پجاری اور بے حس عیش پرست یہ دونوں گروہ الٰہی اور اسلامی تصور کے مخالف ہیں۔ یہ دو گروہ جنہیں دو شیطانی سلسلوں کا نام دینا چاہئے انبیاء کرام اور انسانیت کے عظیم مصلحین کی پوری تاریخ میں یہی لوگ رکاوٹ بنتے رہے ہیں اور ہمارے اسلامی انقلاب کے اوج کے دوران بھی یہ آن دلیریوں اور جانفشانیوں کے خلاف اپنے کام میں مصروف رہے، کیونکہ عیش طلبی اور سرمایہ اندوزی کی تہذیب ہمیشہ حقائق کو قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہے۔

مذکورہ دو گروہوں کو بت پرستوں کے زمرہ میں شمار کیا جانا چاہئے کیونکہ ان میں سے ایک دولت کے بت کا اور دوسرا نفس کے بت کا پجاری ہے۔ امام خمینیؒ زراندوزوں اور دولت پرستوں کے خلاف جہاد کو اسلام کی آزادی کا عظیم ترین تحفہ اور مژدہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"نظریات کا پیش کرنا اور اصولی طور سے محروموں اور کمزور طبقوں کی منافعوں کے تحفظ کی راہ میں اسلامی اقتصادی پالیسی کی وضاحت کرنا اور اس میں عمومی طور سے زیادہ محروم افراد کا شریک ہونا نیز اسلام کا سرمایہ اندوزوں اور دولت پرستوں سے جہاد کرنا، فقر و تنگدستی کی قید سے انسان کی آزادی کی سب سے بڑی بشارت اور عظیم ترین تحفہ شمار ہوتا ہے۔" (پیغام برائت)

اسی پیغام میں ایک دوسری جگہ اس بات سے خبردار کیا ہے کہ کہیں دولت ہی انسانی صلاحیتوں اور اقدار کا معیار نہ بن جائے۔ آپ لوگوں کو اسلامی ملک کو چلانے میں خدا سے غافل سرمایہ داروں کے نفوذ کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"دولت مند اپنی مالی طاقت و قدرت کی بنا پر حکومت، حکام اور اسلامی ملک کے ذمہ داروں کے درمیان ہرگز نفوذ پیدا نہ کرنے پائیں اور اپنے مال و دولت کو امتیازات اور فخر و مباہات کا ذریعہ نہ قرار دیں اور غریب و تنگدست افراد پر اپنے افکار و خواہشات نہ تھوپنے پائیں۔ یہ بات بذات خود امور حکومت میں عوام کے تعاون اور ان کی شرکت اور اخلاق کریمہ نیز اعلیٰ اقدار کی طرف ان کے جھکاؤ اور تملق و چاپلوسی سے ان کی دوری کا بہت بڑا سبب ہوتی ہے۔" (پیغام برائت)

عالم اسلام کے درد مند قائد و رہبر بے حس عیش پرستوں کے اسلام کو امریکی اسلام کا پرتو شمار کرتے ہیں اور ایسے افکار و خیالات سے ٹکر لینے کو ثقافت کی ایک ذمہ داری قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"خوبصورت اور پاک آرٹ وہ ہے جو خونخوار جدید سرمایہ داری اور کمیونزم پر ضرب لگانے والا ہو اور عیش و عشرت اور ٹرک بھڑک والے اسلام، التقاطی اسلام، دشمن کے آگے جھکنے اور اس سے ساز باز کرنے والے اسلام، بے حس عیش پرستوں کے اسلام اور ایک جملہ میں امریکی اسلام کو نیست و نابود کرنے والا ہو۔"

(۳۱ ستمبر ۱۹۸۸ء)

۶۔ جمود پسند اور مقدس نما افراد

ہر زندہ فکر و خیال کے لئے سب سے بڑی آفت و بلا جمود پسندی ہے اور یہ جمود پسند مقدس نما افراد ہی ہیں جو خالص محمدیؐ اسلام کی راہ میں دیوار ہیں اور اسلام کی کارسازی نیز خالص اسلامی تبدیلیوں کے مخالف ہیں۔ اسلامی انقلاب کے دانشور قائد امام خمینیؒ جمود پسندی اور کٹھ ملائیت کے خلاف جہاد کو اسلام و انقلاب کی کامیابی کی ایک راہ قرار دیتے ہیں اور دینی تعلیم کے مراکز اور اسلام کے باخبر علماء کو نصیحت فرماتے ہیں کہ اپنے مسلسل جہاد کے ذریعہ اسلام عزیز کو جمود پسندی کے زنگ سے پاک صاف کردیں:۔

"ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ اسلام ناب محمدیؐ کے زہد و تقدس کو امریکی اسلام کی تقدس مآبی اور جمود پسندی کے زنگوں سے پاک کرکے اس کا اصل چہرہ انسانوں اور مستضعف لوگوں کو دکھائیں"

(۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ)

اس کشرپن اور گمراہ کن تقدس مآبی کے خلاف میدان جہاد کے بہادر سپہ سالار امام خمینیؒ ان آزاد اور باخبر علماء کو تحسین و آفرین کہتے ہیں جو ان جمود پسندوں اور گمراہ کن مقدس مآبوں کے خلاف مردانہ وار میدان کارزار میں اترے ہیں۔ آپ اسلامی انقلاب میں ان لوگوں کے بلند درجات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آپ لوگوں کو یہ دکھا دینا چاہئے تھا کہ علماء کس طرح ظلم و جور، جمود اور رجعت پرستی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کس طرح خالص محمدیؐ اسلام کے تصور کو سلطنتی اسلام، سرمایہ داری کے اسلام، غیروں کے عطا کردہ اسلام اور ایک جملہ میں امریکی اسلام کے تصور کی جگہ لا کھڑا کیا۔ آپ کو یہ بتانا چاہئے کہ اس زمانہ کے دینی تعلیمی مراکز کے فکری جمود میں جب ہر حرکت پر مارکسسٹی یا برطانوی تحریک کا الزام لگا دیا جاتا تھا، دین پر یقین رکھنے والے چند

گئے چند علماء نے کو چہ و بازار کے انسانوں، فقیر و تنگ دست اور ستائے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا اور خود کو آگ و خون کے حوالہ کر دیا اور اس میں سے کامیابی کے ساتھ باہر آگئے۔

آپ لوگ پوری وضاحت کے ساتھ اس کی عکاسی کیجیے ۱۳۴۱ھ ش (۱۹۶۲ء) یعنی اسلامی انقلاب کے ابتدائی برسوں اور حقیقی علماء کے جہاد کے آغاز ہی میں جمود پسندی اور تقدس مآبی کے قبرستان میں ان پاک مجاہد علماء و روحانیوں پر کیا کیا ظلم ہوئے، انہوں نے درد و کرب میں کتنے آنسو بہائے اور کس قدر خون دل پیا، ان پر جاسوسی اور بے دینی کا الزام لگایا گیا لیکن انہوں نے خدا پر توکل کر کے کمر ہمت باندھی، تہمتوں اور گالیوں سے ہراساں نہ ہوئے اور خود کو طوفان بلا کے حوالہ کر دیا اور ایمان و کفر، علم و خرافات، روشن خیالی اور جمود پسندی کے مابین نابرابری کی جنگ میں سرفرازی کے ساتھ لیکن اپنے اور اپنے دوستوں و رفیقوں کے خون میں غرق ہو کر کامیاب ہوئے۔"

(۱۵، جنوری ۱۹۸۹ء)

۷۔ وہابیت:

بدنام زمانہ استعمار کی پوری تاریخ میں کم ہی کوئی ایسا گروہ ہوگا جس نے وہابیت کی مانند اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہو۔ وہابی ہمیشہ برطانوی اور امریکی استعمار کی سیاستوں کے مہرے رہے ہیں۔ اس گروہ نے بظاہر تند و تیز اسلامی نعروں اور اصطلاحاً بدعت کے خلاف جہاد کے نام پر بہت سے اسلامی مقدسات کی توہین کی ہے اور بڑی طاقتوں کے ہاتھوں بکے ہوئے غلام بن کر امت اسلامیہ کے ساتھ بڑی بڑی خیانتیں روا رکھی ہیں۔

امام خمینیؒ، اسلام سے منحرف اس گروہ سے متعلق بہت زیادہ حساس رہے ہیں۔ آپ نے اپنی مشہور کتاب "کشف الاسرار" وہابیوں کے شبہوں کے ہی جواب میں تحریر فرمائی ہے اور پورے اسلامی انقلاب کے دوران خاص طور سے مکہ مکرمہ کے خونیں حادثہ کے بعد سے جو امریکہ کے مزدور وہابیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا اور جس میں چار سو سے زیادہ زائران خانہ کعبہ خاک و خون میں غلطاں ہوئے، آپ کی یہ حساسیت اور زیادہ بڑھ گئی اور آپ نے اپنی زبان و قلم سے اس تباہ کار گروہ کی حقیقت کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا:۔

"کیا مسلمان نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آج وہابیت کے مراکز دنیا میں فتنہ و فساد اور جاسوسی کے مراکز میں تبدیل ہو گئے ہیں کہ ایک طرف تو وہ امراء و سلاطین کے اسلام، ابوسفیان کے اسلام،

ذلیل درباری ملاؤں کے اسلام، دینی علمی مراکز اور دانشگاہوں کے بے شعور مقدس نماؤں کے اسلام، ذلت و نکبت کے اسلام، پیسہ اور طاقت کے اسلام، فریب کارانہ صلح اور قید و اسارت کے اسلام، مظلوموں اور محروموں پر سرمایہ اور سرمایہ داروں کی حاکمیت کے اسلام، اور ایک جملہ میں امریکی اسلام کی ترویج و اشاعت کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے آقا عالمی درندہ امریکہ کے آستانہ پر پیشانیاں رگڑتے ہیں۔"

(۲۰، جولائی ۱۹۸۸ء)

امام خمینی قدس سرہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پھیلانے میں وہابیوں کے کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ہم پھر دیکھتے ہیں کہ اسلامی مسائل سے بالکل بے خبر اور اغیار سے وابستہ ایک ملا کے بھونپو سے پھر آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ پیغمبر کا احترام شرک ہے، (ان کے میلاد کا) جشن برپا کرنا شرک ہے۔ لیکن وہ ایران کی مذمت کر رہا ہے، معلوم ہے کیوں!؟ ... کیونکہ ایران سے اتحاد کی آواز بلند ہو رہی ہے اور حجاز سے اختلاف کی آواز! مرکز وحی سے جہاں رسول اکرم نے لوگوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے اور اتحاد قائم کرنے کی دعوت دی تھی وہاں سے ایک درباری ملا نفاق کی آواز بلند کر رہا ہے اور نفاق انگیز نعرے لگا رہا ہے اور یہ ایران جہاں کے لوگ اس آخوند و ملا کی نگاہ میں مشرک ہیں۔ اسی ایران سے اتحاد کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ رسول اکرم کا جشن برپا کرنا کہاں سے شرک ہے؟ تم شرک کے بارہ میں نہیں جانتے کہ کیا ہے؟ یا وہ جانتا ہے اور (جان بوجھ کر) مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہے ..."

(۱۶، دسمبر ۱۹۸۱ء)

جنگ میں دشمن کے طریقۂ کار کی شناخت

جہاد میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے دشمن کی جنگی روش اور طریقۂ کار سے آگاہی حاصل کرنا چاہیئے تاکہ اس کے مکر و حیلہ اور اس کے منصوبوں کی بنیاد پر اس سے ٹکر لی جا سکے۔

دشمن ہمیشہ جنگ میں خفیہ سرگرمیوں کے اصول کا پابند ہوتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی

جنگی حکمت اور نقل و حرکت کو مخفی رکھ کر اور مناسب حالات میں اپنے مد مقابل کی غفلت و بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر ضرب لگائے۔ امام خمینی قدس سرہ اپنے قیمتی بیانات میں اس حساس نکتہ پر توجہ دلاتے ہیں کہ محاذ نور کے مجاہدوں کو امریکی اسلام کے خلاف جہاد کی پیچیدگیوں اور باریکیوں پر غور کرنا چاہئے:۔

"امریکی اسلام سے جہاد کی راہ بڑی پیچیدگی رکھتی ہے، ان مظلوم محروم مسلمانوں پر اس کے تمام پہلوؤں کو روشن و واضح ہونا چاہئے۔"

(۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۹؁ھ)

ہم یہاں امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ کے اقوال کی روشنی میں دشمن کی چالوں اور اس کی نقل و حرکت کے کچھ نمونے اشارتاً ذکر کرتے ہیں:۔

(الف) استعماری ثقافت و تہذیب کا پھیلاؤ

"اغیار اور خاص طور سے امریکہ گزشتہ آدھی صدی سے اس کوشش میں رہا ہے اور ہے کہ ہماری ثقافت اور ہمارے ثقافتی، علمی و ادبی منصوبوں کو ان کے اپنے اسلامی، انسانی اور قومی دائرے سے خارج کر دے اور اس کی جگہ پر استعماری و استبدادی ثقافت کو رائج کرے جلاوطن (شاہ مردود) کے زمانہ کی ثقافت و تہذیب نے ہمارے ملک کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔

(۲۴، ستمبر ۱۹۷۹؁ء)

(ب) شخصیتوں کا بہیمانہ قتل

"آج چونکہ مشرقی و مغربی استکبار عالم اسلام سے براہ راست ٹکر لینے سے عاجز ہو چکا ہے اس لئے اس نے ایک طرف تو تشدد اور دینی و سیاسی شخصیتوں کو قتل کرنے کی راہ اپنائی ہے اور دوسری طرف امریکی اسلام کی ثقافت کی ترویج و اشاعت اور اس کے نفوذ کو اپنے مقصد کی آزمائش پر لگا رکھا ہے۔"

(۲۳، محرم الحرام ۱۴۰۹؁ھ)

(ج) دلکش نعرے

محروم قوموں و ملتوں کے خلاف عالمی استکبار کا ایک مکر و حیلہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو جذب کرنے والے نعروں اور پُر فریب جملوں مثلاً "صلح آمیز باہمی زندگی" "انسانی شرافت و عظمت" اور "انسانی حقوق" سے فائدہ

اٹھاتا ہے۔ امام خمینیؒ برائت مشرکین سے متعلق اپنے پیغام میں فرماتے ہیں:-

"یہ تماشہ آخر کیا ہوا کہ عالمی استکبار اور ان سب کا لیڈر امریکہ قوموں کا اس قدر طرفدار ہو گیا ہے اور جنگ کے شعلے بھڑکانے والے اور لڑائیوں کی آگ لگانے والے اس صدی کے جلاد دوں میں انسانیت سے کشف اور مسالمت آمیز باہمی زندگی کا اعتقاد کیسے پیدا ہو گیا ہے؟ اور اپنی نہ بجھنے والی پیاس اور خونخواری کی عادت سے کہ جو سرمایہ داری اور کمیونزم کی ثقافت کی فطرت ہے، منہ موڑ لیا ہے؟.... یہ حقیقت ہے یا فریب؟"

(د) علمی مراکز میں نفوذ پیدا کرنا

محروم قوموں اور ملتوں کے دشمنوں اور عالمی استکبار کا ان ستم دیدہ قوموں پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کا ایک شیوہ یہ بھی رہا ہے کہ حساس علمی مراکز مثلاً یونیورسٹیوں میں اثر رکھنے والوں کو آلہ کار بنا کر اور اپنے مقاصد کے لئے مناسب چہروں کو خرید کر ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں تک نفوذ پیدا کرنے نیز اس قسم کے زرخرید افراد کے ذریعہ اپنے پلید و منحوس مقاصد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ امام خمینیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

"فرزندان انقلاب کسی بھی صورت اس کی اجازت نہ دیں کہ امریکہ اور روس کے ہاتھ ان دو حساس طبقات (حوزۂ علمیہ اور یونیورسٹی) میں نفوذ پیدا کر سکیں۔ صرف بسیج (رضاکار فورس) ہی کے ذریعہ یہ مہم انجام پا سکتی ہے۔"

(تشکیل بسیج کی سالگرہ کی مناسبت سے امام کا پیغام)

امامؒ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

"اغیار نے اپنے کارندوں کے ذریعہ ہماری یونیورسٹیوں کو پسماندہ بنا رکھا تھا۔"

(۱۱ جون ۱۹۷۹ء)

(ھ) تفرقہ پھیلانا

عالمی استکبار مختلف انسانی طبقوں کے اتحاد کو دنیا کی محروم قوموں میں اپنے افکار و خیالات کے نفوذ اور ان میں اپنے آلہ کاروں کی موجودگی کی راہ میں سب سے بڑا پتھر سمجھتا ہے اور اس نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے اپنے استعماری پروگراموں میں سرفہرست "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا فارمولہ قرار دے رکھا ہے۔

عالمی دشمنوں نے تفرقہ پھیلانے کے سلسلے میں اب تک جو طریقہ اپنائے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ لوگ سب سے پہلے ان گروہوں یا ان مراکز کے پیچھے لگے ہیں جن سے عوام اپنی فکری و ثقافتی راہ حاصل کرتے ہیں۔

امام خمینی قدس سرہ فرماتے ہیں :۔

"قدیم و جدید علمی۔ ثقافتی مراکز، علماء و دانشور، دینی طالب علم اور دانشگاہوں اور کالجوں کے طلبہ دو حساس قطب اور معاشرے کے دو دماغ ہیں۔ اغیار کے منصوبوں میں اس بات کی کوشش تھی اور ہے کہ ان دو قطبوں میں جدائی اور ان دو انسان ساز حساس مراکز میں تفرقہ ڈال دیا جائے۔ ان دو مرکزوں کو جدا کر کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں لا کھڑا کرنا، انھیں ایک دوسرے سے لڑانا اور نتیجہ میں استعماری و استثماری طاقتوں کے خلاف ان کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر دینا ہے۔"

(۱۳۵۸ھ ش / ۱۹۷۹ء کے تعلیمی سال کے آغاز کی مناسبت سے پیغام)

اسلامی انقلاب کے آگاہ و ہوشیار رہبر نے بین الاقوامی تباہکاروں کے ہاتھوں کو آشکار کرتے ہوئے فرمایا :۔

"ان کے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ ان دو طبقوں (علماء اور دانشور) کو جو قوم کے دماغ کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا کر دیں، اور نہ صرف جدا کر دیں بلکہ ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کریں۔ یہ اس پر حملہ کرے اور وہ اس پر۔ ان چیزوں کو ختم ہونا چاہئے، ہم کو بیدار ہونا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم سب بھائی ہیں۔ ہم کو کبھی شیعہ و سنی کے نام سے لڑایا جاتا ہے کبھی کسی دوسرے نام سے۔ ہمیں اب بیدار ہونا چاہئے اور ان کے منصوبوں کو سمجھ لینا چاہئے۔"

(ٹیکنیکل یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ سے خطاب ۱۹۷۹ء)

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ استعماریوں کی ایک اور پُر فریب چال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لئے منصوبہ سازوں نے جو منصوبے بنائے اور استعمار کے نوکروں نے جن کا خوب خوب پروپیگنڈہ کیا ہے ان میں سے ایک قومیت و ملیت کا مسئلہ ہے کہ عراق کی حکومت برسوں سے اس پر عمل کر رہی ہے نیز بعض طائفوں اور قبیلوں نے بھی یہی راہ اپنا رکھی ہے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کئے ہوئے ہیں۔"

(۱۲، ستمبر ۱۹۸۰ء)

(د) دین کو سیاست سے جدا کرنا

دشمنوں کے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ "دین کو سیاست سے جدا کرنا" بھی ہے۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ دین، ایمان کی طاقت اور ستمگاروں کے خلاف آواز اٹھانے کے جذبہ میں اضافہ کرتا ہے اور حقیقی دیندار ظالموں، غاصبوں اور غارت گروں کے سخت ترین دشمن ہیں لہٰذا دین کی سیاست سے جدائی کا نعرہ ایجاد کر کے انہوں نے دین اور دینداروں کو میدان سیاست سے باہر کر دیا تاکہ استعماری طاقتوں کے لئے میدان صاف ہو جائے۔ چنانچہ امام خمینیؒ نے اپنی تقاریر کے دوران بہت سے مواقع پر استعمار کے اس منحوس اور خطرناک منصوبہ کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

"ان کی کوشش تھی کہ یہ یقین بھی دلادیں کہ دین سیاست سے جدا ہے، اس کے بعد خود لوٹ مار اور غارتگری میں مشغول ہوں اور قوم اس سے کوئی سروکار نہ رکھے کہ کیا ہو رہا ہے اور غیرملکی اس مملکت پر کیا قیامت توڑ رہے ہیں، یہ وہ طریقہ کار ہے جسے مغربیوں نے عملی جامہ پہنایا اور ان سے وابستہ افراد نے بھی ان کی تقلید و پیروی کی کہ مسلمان فقط مسجدوں میں جائیں اور دعائیں کریں مملکت و حکومت، پارلیمنٹ اور دیگر شعبوں سے جن سے دالطہ ضروری ہے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ یہ وہ منصوبہ ہے جو برسہا برس کی مدت میں پھیلایا گیا ہے۔"

(۱۷، ستمبر ۱۹۷۹ء)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"عالمی درندوں کے پوشیدہ مخفی ہاتھ ایسے اشخاص اور گروہوں کے ذریعہ جو اسلامی قوموں کے مختلف طبقوں میں نفوذ کئے ہوئے ہیں، انہوں نے برسہا برس میں ایک منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا اور افسوس کہ وہ منصوبہ انجام پا گیا اور اس کے لئے خبیث و مکروہ تاریخ بھی فراہم کر دیئے اور وغیرہ

علماء کو مسجدوں، حجروں اور خانقاہوں کے گوشوں میں ہی پڑے رہنا چاہئے۔"

(علماء کے درمیان تقریر، مارچ ۱۹۸۱ء)

ایک دوسرے موقع پر عظیم اسلامی امت کی طرف توجہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"جن شیطانوں نے قوموں کے تمام مسائل کا مطالعہ کیا، انھوں نے یہ نتیجہ حاصل کیا کہ اگر علماء و طلاب علوم دینی میدان سیاست میں وارد ہو تو قوموں و ملتوں کے لئے عظیم پشت پناہ ہونے کی بناپر خود ان کی ٹوپی اتر جائے گی۔ لہٰذا ایسے میں کیا کرنا چاہئے؟ اس کے لئے عمومی طور سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بھرنا چاہئے کہ اہل علم کو سیاست سے کیا کام: علماء کا فریضہ صرف یہ ہے کہ اپنی عبا سر پر ڈالیں اول وقت ظہر جاکر نماز پڑھائیں۔ اس کے بعد منبر پر جاکر چند دینی مسائل بیان کریں ۔ وہ مسائل نہیں جو سیاست اور قوم کے مشکلات سے مربوط ہیں....."

(علماء و روحانیوں سے خطاب، جولائی ۱۹۸۷ء)

اپنی کتاب "ولایت فقیہ" کے ص ۳۳ پر فرماتے ہیں :۔

"یہ کہ دین و دیانت، سیاست سے جدا ہے اور علماء اسلام اجتماعی و سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کریں، اسے استعماریوں نے کہا اور مشہور کیا ہے، یہ بات بے دین افراد کہتے ہیں۔"

(ش) امریکی اسلام کا پھیلاؤ

دشمن نے اسلامی انقلاب کی بڑھتی ہوئی لہر اور اسلام کے عاشقوں کی روز افزوں تعداد پر کنٹرول کرنے کے لئے بہت ہی عجیب مکارانہ اور خطرناک طریقۂ کار اختیار کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ انقلابی اسلام کے افکار کو قابو میں کرسکے اور وہ شیوہ یہ ہے کہ بظاہر اسلامی نظر آنے والے نعروں اور دین کے ظاہری ارکان کے تحفظ کے پردہ میں خود کو اسلام کا بہی خواہ اور قرآن دوست ظاہر کرے تاکہ اپنے سلسلہ میں آزاد ضمیر انسانوں کے مقدس انقلابی غیظ و غضب کو کم کرے ۔

قرآنی آیات کو سمجھے اور درک کئے بغیر بہترین کاغذ اور اعلیٰ جلدوں میں قرآن کو طبع اور شائع کرنا، حج پر شکوہ مراسم میں خشک اور بے روح مذہبی آداب و مناسک پر قناعت کرنا، ساری دنیا میں عظیم الشان اور باشکوہ لیکن بیلدی و معنویت سے خالی مسجدیں بنوانا..... یہ وہ اقدامات ہیں جو عالمی استکبار کے کارندوں کے ہاتھوں انجام پا رہے ہیں۔ امام خمینی قدس سرہ اس بات پر بہت افسوس کرتے ہیں کہ بہت سی قومیں امریکی

اسلام اور حقیقی محمدی اسلام کے فرق کو پہچان نہیں پائی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:-

"افسوس کہ ابھی بہت سی اسلامی ملتوں پر امریکی اسلام اور حقیقی محمدی اسلام، پابرہنہ اور محروم لوگوں کے اسلام اور مقدس نما جمود پسندوں اور خدا سے غافل ثروت داروں اور بے حس عیش پرستوں کے اسلام کا فرق پوری طرح مشخص نہیں ہو پایا ہے۔"

(۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ)

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ امریکی اسلام کو مکر و فریب، جمود اور دروغ بافیوں کا اسلام سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

"ہمیں کوشش کرنا چاہئے اور حقیقی محمدی اسلام کے زندہ تقدس کو امریکی اسلام کی مقدس مآبی اور جمود کے زنگوں سے صاف کر کے دنیا کے محروموں کو دکھا دینا چاہئے۔"

(۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ)

جہاد میں بسیج ملینی فوج پر انحصار

جذبۂ ایمان، تنظیم و تشکیل، وسائل و امکانات اور جنگی معلومات کے لحاظ سے جنگجو فوجوں کی شناخت میں جہاد کی حکمت عملی کے فارمولوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ہر دفاعی نظام کا تحقق اور جنگ و جہاد کی طاقت کا ارتقا بڑی حد تک اس سے وابستہ ہے کہ اس کی جنگی طاقت کیسی ہے، کیونکہ عقائد و نظریات کی حفاظت اور اس راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کی راہ میں انسانی طاقت جو کردار ادا کرتی ہے وہ ناقابل انکار ہے لہٰذا اس موضوع کی طرف توجہ دینا قیادت و رہبری کی فکر، اعتقاد، درایت اور قوت کے کمال کو بخوبی واضح کرتا ہے۔

عصر حاضر میں محاذ جہاد کے سپہ سالار حضرت امام خمینی قدس سرہ پہلے جہاد کو اسلامی اصول کا محافظ اور کفر و استکبار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی عزت و شرف کا موجب قرار دیتے ہیں، اس کے بعد جہاد کی حکمت عملی بیان کرتے ہوئے بسیج ملینی فوج پر تکیہ کرتے ہیں اور اسلامی انقلاب کے اعتقاد کا دفاع کرنے کے لئے "بسیج" کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ بسیج یعنی وہ فوج جو ملک کے دفاعی نظام میں بڑا بلند درجہ اور حیثیت رکھتی ہے اور اپنے ان خصوصیات کی بنا پر جن کی وہ حامل ہے ہر چند کہ آج کی اصطلاح میں ایک کلاسک فوج نہیں ہے لیکن عملاً وہ کلاسک فوجوں سے ٹکر لینے کی پوری طاقت رکھتی ہے۔ یہ فوج اسلحوں سے زیادہ ایمان و اعتقاد پر بھروسہ

کرتی ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ ایمان کا ہتھیار لوہے کے اسلحوں پر فاتح و غالب ہے۔

بسیج یعنی رضاکار فوج کو اسلامی انقلاب میں اس کی فوجی خصلتوں سے زیادہ اس کی اعتقادی و ثقافتی خصلتوں کے سبب پہچانا جاتا ہے، البتہ وہ میدان جہاد و پیکار کو اعتقاد کی پختگی اور ثقافت کی بالیدگی کا میدان سمجھتی ہے۔ بسیج ایک ہمیشہ آگاہ رہنے والی فوج ہے کہ جب بھی اسلام و انقلاب کو کوئی خطرہ پیش آئے تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دفاع کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں :۔

"وہ قوم جو حقیقی محمدی اسلام کی راہ پر گامزن اور استکبار، دولت پرستی، جمود پسندی اور مقدس نمائی کے خلاف ہو اس کے تمام افراد کو بسیجی ہونا چاہئے اور ضروری فوجی و دفاعی فنون سے واقف ہونا چاہئے، کیونکہ خطرے کے وقت وہی قوم سربلند اور جاوید ہو سکتی ہے جس کی اکثریت ضروری جنگی آمادگی رکھتی ہو۔"

(۲۳، نومبر ۱۹۸۸ء)

دو کروڑ افراد پر مبنی بسیج کے افراد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس غریب، پابرہنہ اور محروم طبقہ سے اٹھے ہیں جو موجودہ دور کے ڈکٹیٹروں کے ستائے ہوئے ہیں۔ یہی افراد امام خمینیؒ کے تنہا ناصر و مددگار ہیں اور امامؒ بھی کفر و ظلم اور شرک و بت پرستی کے خلاف اپنے وسیع جہاد میں ان ہی پر تکیہ کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں :۔

"بڑی طاقتیں اور ان کے نوکر مطمئن رہیں کہ اگر خمینی یکہ و تنہا رہ جائے تب بھی اپنی راہ یعنی کفر و ظلم اور شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد کی راہ پر گامزن رہے گا اور خداوند عالم کی مدد سے عالم اسلام کے بسیجیوں (رضاکاروں) یعنی ان غریبوں اور ڈکٹیٹروں کے ستائے ہوئے محروموں کے ہمراہ ان عالمی درندوں اور ان کے نوکروں کی آنکھوں سے چین کی نیند چھین لے گا جو اپنے ظلم و ستم پر اصرار کر رہے ہیں۔"

(فریاد برائت)

امام خمینیؒ کی نگاہ میں یہ دو کروڑ کی فوج صرف ایران سے مربوط نہیں ہے کیونکہ اس فوج کا کوئی خاص علاقہ یا محدود جغرافیہ نہیں ہے یہ دنیا کے ہر اس علاقہ میں موجود ہے جہاں مظلوم موجود ہوں۔

"عالم اسلام کے رضاکار ایک عظیم اسلامی حکومت قائم کرنے کی فکر میں رہیں اور یہ بالکل ہو سکتا

ہے۔ کیونکہ بسیج صرف اسلامی ایران میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ساری دنیا میں عوامی یونٹیں وجود میں آنا چاہئیں اور مشرق و مغرب کے خلاف ڈٹ جانا چاہئے۔" (۲۳، نومبر ۱۹۸۸ء)

اس کے بعد دینی علمی مراکز اور یونیورسٹیوں میں موجود رضاکاروں کو "نہ شرقی نہ غربی" کے اصول کی محافظت کی دعوت دیتے ہیں:۔ "میرے بسیجی فرزندوں کو ان دو مرکزوں میں "نہ شرقی نہ غربی" کے بدلنے والے اصول کا محافظ رہنا چاہئے۔" (۲۳ نومبر ۱۹۸۸ء)

آخر میں بسیجیوں کے سپہ سالار اس بات کے معتقد ہیں کہ بیس ملینی فوج سے غفلت برتنا عالمی درندوں کے جال میں گرنے کے مترادف ہے:۔

"بیس ملینی فوج کے قیام سے غفلت برتنا دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے دام میں گرفتار ہونے کی صورت میں برآمد ہوگا۔"

جنگ میں کامیابی کا راز

انقلابات اور تیز و تند اجتماعی تحریکیں ایک مشخص نقطے سے شروع ہوتی ہیں اور اپنے مقصد تک پہنچنے کیلئے پر پیچ اور دشوار گزار راہوں کو طے کرتی ہوئی آخری نقطے اور منزل مقصود تک پہنچتی ہیں۔ سماجیات کے ماہرین نے اجتماعی۔ انقلابی تحریکوں کو آغاز، ارتقاء، استمرار اور کامیابی جیسے مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم خود اپنی جگہ پر بہت عمدہ اور اہم ہے لیکن ایک انقلاب میں خود انقلابیوں اور انقلاب کی قیادت و رہبری کو جس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہئے وہ کامیابی کا راز ہے۔

امام خمینیؒ اپنی قیادت کے دوران بارہا انقلابی امت اور اپنے ماننے والوں کو کامیابی کا راز بتلاتے رہے تاکہ محاذ انقلاب ہمیشہ شاداب و سربلند رہے، نئے نئے میدانوں اور بلند چوٹیوں کو فتح کرے۔ ہم یہاں کامیابی کے راز کے چند پہلوؤں کے سلسلہ میں اس عظیم انسان کے نظریات اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ خدا پر ایمان:

"بلاشبہ اسلامی انقلاب کی بقا کا راز وہی کامیابی کا راز ہے اور کامیابی کے راز سے ملت واقف ہے اور آئندہ نسلیں اسے تاریخ میں پڑھیں گی کہ کامیابی کے دو اصلی رکن الٰہی جذبہ اور اسلامی حکومت کے قیام کا اعلیٰ مقصد نیز اسی جذبہ و مقصد کیلئے پورے ملک میں قوم کا اجتماع اور باہمی اتحاد ہیں۔ میں تمام موجودہ اور آئندہ نسلوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اسلام اور اللہ کی حکومت برقرار رہے اور آپ کے ملک سے ملکی و بیرونی استعماری و استثماری طاقتوں

کے ہاتھ کٹ جائیں تو اس الٰہی جذبہ مقصد کو جس کی خداوند عالم نے قرآن میں تاکید کی ہے، ہاتھ سے جانے نہ دیں اور یہ جذبہ جو کامیابی اور اس کی بقا کا راز ہے اس کا دوسرا رخ مقصد و ہدف کی فراموشی، تفرقہ اور اختلاف ہے۔"

(وصیت نامہ امام خمینی رہ)

ایک دوسری جگہ اس حقیقی مومن کے ایمان کے جلوے یوں نظر آتے ہیں :۔

"ہم خدا، پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کی ولایت کی رسی کو تھامے ہوئے ہیں اور جو کچھ ان کی مرضی کے خلاف ہے اس سے ہمیں سنجیدگی کے ساتھ متنفر اور دور رہنا چاہئے اور اس دوری اور علیحدگی پر ہی فخر و مباہات کرنا چاہئے۔"

(۲۴، محرم الحرام ۱۴۰۹ھ)

اپریل ۱۹۷۹ء میں ایک تقریر کے دوران فرماتے ہیں :

"آپ لوگ اپنی کامیابی کے راز کو محفوظ رکھئے، ہماری قوم جب تک خدا کے ساتھ ہے کامیاب ہے۔ جب تک ہماری قوم کی پناہ گاہ قرآن ہے وہ کامیاب ہے جب تک قرآن کا پرچم ہماری ملت کے سر پر ہے وہ کامیاب ہے گزشتہ تحریکیں یا سیاسی تھیں یا نیم اسلامی لیکن ہم آج مکمل اسلامی ہیں اور یہ کامیابی کا راز ہے۔"

۲۔ اتحاد :

"ہم سب کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اپنے اپنے علاقے کے ماحول پر اتحاد و پاکیزگی کی فضا قائم کریں تاکہ تمام طاقتوں اور بڑی طاقتوں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکیں۔"

(۱۹، ستمبر ۱۹۸۸ء)

آپ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

"یہ اتحاد و ہم فکری ہے جسے اس ملت نے اپنایا اور یوں اٹھ کھڑی ہوئی کہ تمام بڑی طاقتوں کو زیر کر دیا۔"

(۵، نومبر ۱۹۷۹ء)

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ مورخہ ۲، مارچ ۱۹۷۹ء کو ایک تقریر کے دوران

فرماتے ہیں :-

"آپ کی کامیابی کا راز سب سے پہلے آپ کا ایمان ہے اور اس کے بعد اتحاد و یکجہتی ان دونوں باتوں کی حفاظت کیجئے۔"

۳. استقامت و پائداری :

"جس بات کو ہماری ملت نے دنیا پر ثابت کیا وہ یہ تھی کہ ایمان، عزم و حوصلہ اور مستحکم ارادہ کے ذریعہ شیطانی طاقتوں پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

(جون ۱۹۷۹ء)

مئی ۱۹۷۹ء کو استاد مطہری کی شہادت کے موقع پر اپنے پیغام میں فرماتے ہیں :-

"یہ تشدد آمیز کاروائیاں اسلام کے جیالوں کی انسانی شخصیتوں کو قتل نہیں کر سکتیں۔ وہ جانتے ہیں کہ خدائے قوی و توانا کے منشاء کے مطابق ہماری قوم فتنہ و فساد، استبداد اور استعمار کے خلاف جہاد کی راہ میں عظیم اشخاص کی قربانیوں سے اور مصمم و قوی ہو جائے گی۔ ہماری قوم نے خدا کی راہ کو پا لیا ہے وہ گزشتہ حکومت کی سڑی ہوئی جڑوں اور اس کے منحوس طرفداروں کو ختم کرنے کی راہ میں خاموش نہ بیٹھے گی۔"

اسلامی انقلاب کے عظیم رہبر فرماتے ہیں :-

"ہم خالی ہاتھ اس غیر معمولی شیطانی طاقت پر غالب آئے جس کی پشت پر تمام طاقتیں تھیں اور یہ صرف اسی بنا پر ہو سکا کہ ہماری قوم باہم متحد تھی، مشکلوں میں صبر کرتی تھی اور اس نے اپنی مشکلوں کو صبر اور خدا کی ذات پر اعتماد کے ذریعہ حل کیا۔"

(اکتوبر ۱۹۸۰ء)

۴. اپنے آپ پر اعتماد

"اطمینان رکھو کہ اگر تم چاہو تو کام ہو کر رہے، اگر بیدار ہو جاؤ تو گویا چاہتے ہو، تم بیدار ہو جاؤ اور یہ بات سمجھ لو کہ جرمنی نسل کے لوگ آریائی نسل سے اونچے نہیں ہیں۔ مغربی لوگ ہم سے اونچے نہیں ہیں۔"

(جنوری ۱۹۸۱ء)

امام امت ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

"بنیادی وہ باتوں کا یقین کرنا ہے بکمزوری، سستی اور ناتوانی کا یقین ۔ اور طاقت، قوت اور توانائی کا یقین۔ اگر ملت کو یہ یقین ہوجائے کہ ہم بڑی طاقتوں کے مقابل کھڑے ہو سکتے ہیں تو یہ یقین اس بات کا سبب ہوتا ہے کہ ان میں قوت و توانائی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ بڑی طاقتوں کے مقابل ڈٹ جاتی ہیں۔ یہ کامیابی جو آپ نے حاصل کی ہے اس لئے ہے کہ آپ کو یقین آگیا تھا کہ ایسا کر سکتے ہیں۔"

(اپریل ۱۹۸۱ء)

امام خمینیؒ امت کے پیکر میں امید کی روح پھونکنا صاحبان قلم اور مقررین کا فریضہ سمجھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"ہمارے اہل قلم اور اہل زبان سب اس امت کو امید دلانے کی کوشش میں مصروف رہیں۔ امت کو مایوس نہ کریں۔ کہیں کہ ہم قوی و توانا ہیں....." (جنوری ۱۹۸۱ء)

ایک دوسری جگہ مایوسی اور ناامیدی کا ذکر کرتے ہوئے ۔ جو انسان میں بے اعتمادی پیدا کرتی ہے ۔ فرماتے ہیں:۔

"مایوسی ابلیس کے لشکر میں سے ہے یعنی شیطان انسان کو یاس و ناامیدی تک کھینچ لے جاتا ہے۔ یہی سارے ابلیس جنھیں آپ دیکھ رہے ہیں، کہ انہوں نے پوری تاریخ میں کمزور و ضعیف قوموں کو مایوس کیا ہے۔ یہی لوگ جنھوں نے ضعیف قوموں کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ابلیس کے لشکر کو دور بھگا دینا چاہئے اور امید کو جو "اللہ" کے لشکر میں سے ہے ۔ اپنے اندر زندہ کرنا چاہئے۔"

(جنوری ۱۹۸۱ء)

امام خمینی

ایک بے مثال رہبر

جناب سید حسن عباس فطرت (ہندوستان)

عظیم اسلامی انقلاب کے عظیم الشان قائد، جمہوری اسلامی ایران کے بانی، جہان اسلام کے پیشوا امام امت حضرت سید روح اللہ الموسوی الخمینی قدس سرہ الشریف کی جان سوز و دلگداز وفات حسرت آیات کو آٹھ مہینے ہو چکے ہیں لیکن اس طرۂ دستار اسلام و فرزند زہرا نے اپنی پر مشقت و محن طویل مجاہدانہ قیادت کے آخری دنوں میں دو اہم اقدام ایسے کئے کہ ہمیں لگتا ہے کہ آج ان معنوی وجود کا آفتاب مادی وجود کے ماہتاب سے بھی زیادہ تابناک و منور ہو کر عالم اسلام کو متجلی، توانا و ہشیار بنائے ہوئے ہے کم و بیش یہی زمانہ تھا جبکہ ہمارے محبوب فقید امام نے مادیت کے سب سے بڑے پجاری و مہنت کو ایک زلزلہ افگن تاریخی پیغام بھیجا تھا جس کی جرأت مردان الٰہی کے سوا کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ اس پیام میں روسی رہنما گورباچوف کو پیمبرانہ اسلوب میں حیات بشری میں معنویت و روحانیت کی اہمیت بتائی گئی تھی اور بڑے مشفقانہ مگر منطقی انداز میں ان کو اسلام کے مطالعہ کی دعوت دی گئی تھی ساتھ ہی یہ پیشین گوئی بھی کی گئی تھی کہ عنقریب کمیونزم تاریخ کے میوزیم میں محدود ہو کر رہ جائیگا اور اس کا کلیدی سبب عقیدۂ خداپرستی و روحانیت کا فقدان ہے اس عظیم و منفرد مہم میں تاریخ اسلام کے طول و عرض میں وہ پیغمبر اسلامؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے والے تنہا ایک رہبر ملتے ہیں غالباً کل بھی ان کی نظیر نہیں مل سکے گی۔ ابھی اس ندائے دعوت و بشارت کی گونج

باقی رہی تھی کہ اس نذیر امت کے لئے آزمائش کی دوسری منزل سامنے آگئی جو اس سے بھی کٹھن تھی اس کے نتائج و عواقب سے بھی حضرت امامؒ آگاہ تھے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ سلمان رشدی کی کفر آمیز کتاب سے مسلمانوں میں بے چینی و انتشار کا طوفان اٹھ رہا ہے اور اس منحوس کتاب آیات شیطانی کے خلاف مسلمانوں نے جان و مال کی بازی لگادی ہے تو آپ سے نہ رہا گیا اور آپ بھی امت کے اس جوش و خروش میں شامل ہو گئے اور اپنے تاریخی فتوے سے صور اسرافیل کا کام لیا جس سے دشمنان اسلام کا دم نکل گیا اور مسلمانوں کو حیات نو مل گئی حضرت امامؒ نے کتاب شیطانی آیات کے دل آزار متن اور مسلمانان عالم کے بڑھتے ہوئے ہیجان کو ملاحظہ فرمایا اور سوچ سمجھ کر اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بڑی جرأت و صلابت کے ساتھ حکم دیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

دنیا بھر کے غیرت مند مسلمانوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ "شیطانی آیات" نامی کتاب جو اسلام، پیغمبر اور قرآن کے خلاف لکھی، چھاپی اور شائع کی گئی ہے اس کے مؤلف اور کتاب کے مواد و مضمون سے باخبر ناشر کی سزا موت ہے۔ میں غیرت مند مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ان افراد کو جہاں کہیں پائیں جلد از جلد موت کے گھاٹ اتار دیں تاکہ پھر کسی میں، مسلمانوں کے مقدسات کی توہین کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو۔ اس (حکم کے نفاذ کی) راہ میں قتل ہونے والے افراد شہید ہیں انشاء اللہ۔ اگر کوئی شخص مؤلف تک رسائی رکھتا ہے، لیکن اسے سزائے موت دینے کی خود اس میں توانائی نہیں ہے تو وہ عوام کو اس کا ٹھکانہ بتلائے تاکہ وہ اپنے کیفر کردار تک پہونچ جائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
روح اللہ الموسوی الخمینی
۸ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

اس فتوے نے ساری دنیا کے سمندر میں طغیان پیدا کر دیا اور شرق سے غرب تک ایک سنسنی پھیل گئی اور زخم خوردہ مسلمانوں کے دل میں مرہم مل گیا۔ برطانوی حکومت اور دوسرے غیر مسلم ممالک کے

افراد وحکومت نے اس فتوی پر جو ردعمل ظاہر کیا اس کی تو کسی حد تک توقع تھی لیکن مسلم ممالک و اشخاص کی خاموشی اور استہزا نہ صرف قابل حیرت بلکہ لائق تعزیر وملامت بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فتوے کے بعد دنیائے اسلام کے غیرت دار مسلمانوں نے حضرت امام خمینیؒ کی رہبریت کو صدق دل سے قبول کرلیا اور ان کے بدخواہوں کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ آج بھی امامؒ کا فتویٰ زندہ وبرقرار ہے اور رشدی کے طرفداروں کو کچل رہا ہے۔ مغربی ممالک میں اب ایسے قوانین بن رہے ہیں جس کے تحت پیغمبر اسلامؐ کے حضور میں ہر چھوٹی بڑی گستاخی کو جرم قرار دیا جارہا ہے۔

حضرت امام خمینیؒ کی حیات طیبہ کے آخری دور کے ان دو واقعات کا ذکر صرف بیان واقعہ کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ بتانا یہ ہے کہ ہماری دنیا میں امام امت ہی ایک ایسے منفرد رہبر تھے جن پر ماحول وقت، زمانہ تقاضائے عمر، مصلحت، رعایت جیسے عوامل اثر انداز نہیں ہوتے تھے چنانچہ ارمان و حرکت وعمل سے بھرے ہوئے پرشور ایام شباب میں امام فقید نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ درس ومطالعہ کے سوا ان کا کوئی قولی وعملی کردار نہضت و انقلاب کی راہ میں دکھائی نہیں دیتا آج سے پچاس ساٹھ سال قبل وہ اپنے اساتذہ کے چہیتے اور قابل فخر شاگرد تھے اور ان کی صلاحیت واستعداد کا شہرہ تھا اس کے بعد وہ فلسفہ واخلاق، سیر وسلوک وعرفان، تفسیر و حدیث و فقہ اور اجتہاد کے درس میں نمایاں وممتاز حیثیت کے مالک اور اپنے بزرگ علما کے معتمد اور مشاور تھے۔ ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی مگر عملی اقدام سے وہ خود کو الگ رکھے ہوئے تھے اگرچہ تمام انقلابی علمار اور رہنماؤں سے ان کا ربط تھا لیکن باقاعدہ وہ کسی سے ملحق نہیں تھے البتہ اگر اس زمانے کی تحریر، تقریر، درس وتصنیفات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے آپ کو آنے والے زمانے میں اپنی مسؤلیت ورسالت کا احساس تھا اور جس طرح درخت کے بیج میں پورا درخت چھپا ہوتا ہے اور وہ زیر زمین جانے کے مدتوں بعد پھٹتا رہو کر پھیلتا ہے اور اسی وقت اس کی تمام خاصیت وکیفیت ومنفعت حواس خمسہ سے محسوس کی جاتی ہے۔

اسی طرح ساٹھ کی دہائی کے بعد حضرت امام خمینیؒ نے حکومت اسلامی، ولایت فقیہ، عدلیہ و انتظامیہ ومقننہ کا جو تفصیلی ومنضبط خاکہ پیش کیا اور انقلاب کی کامیابی کے بعد اسے عملی جامہ پہنا کر دنیائے مغرب وشرق کو چکاچوند وحیرت زدہ کردیا اس کا بنیادی تصور ان کی ابتدائی تصنیفات

میں موجود ہے جس میں ایک کتاب "کشف اسرار" ہے جو انقلاب سے پچاس سال قبل لکھی گئی۔

"کشف اسرار" نہایت جامع و پر حکمت کتاب ہے اگرچہ وہ ایک مخالف اسلام، پہلوی حکومت کے پاپتو کے کی بت بت بنام "اسرار ہزار سالہ" کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس وقت جبکہ بعض وجوہ سے کوئی اس کام کے لئے آگے نہیں بڑھا تو حضرت امامؒ نے مرض چشم کے ہوتے ہوئے اس قلمی جہاد پر کمر کس لی اور اسلامی و جعفری عقائد کو آیات قرآنی، فلاسفہ کے بیانات اور حکم و مسکت دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ناہنجار رضا خان کی حکومت کی اسلام شکن حرکات اور جبر و استبداد و وحشیانہ پن کو بھی بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا عصر حاضر کے چند کم نظروں اور فتنہ پروروں نے کتاب مذکور کے بعض اجزاء کو ان کے سیاق و سباق سے جدا کر کے امامؒ کی شخصیت کو داغدار بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کی بے تاب روح اسلام پرستی اور انقلابی افکار کے تانے بانے کو نزدیک سے دیکھنے اور چھونے کے لئے اس مختصر سے رسالے کا مطالعہ بے حد ضروری ہے یہ صرف میرا اپنا ذاتی خیال نہیں بلکہ انقلاب اسلامی ایران تک کے پیچ و خم اور اس کے فلسفہ کے ماہر و شناسا پروفیسر حامد الگار کا بھی یہی کہنا ہے انقلاب اسلامی ایران اور اس کے بے مثال قائد حضرت امام خمینیؒ ذیلۂ اسلام و مستضعفین عالم کے لئے جس قدر باعث شرف و برکت و سرفرازی ہیں اتنے ہی مظلوم و مقہور و عبرت و حسرت کا نمونہ ہونے میں بھی وہ آپ اپنا جواب ہیں اور وہ یوں کہ آج کے روشنی یافتہ ترقی پسند آزادی انسان کے دور میں بھی ذرائع ابلاغ و وسائل رسل و رسائل کا بہتات کے باوجود یہ دنیا انقلاب اسلامی کی کامیابی کے پہلے اس اسلامی تحریک اور انقلاب یہ آگئی تھی نہ اس کے طویل و خونچکاں ماضی سے آشنائی رکھتی تھی اور نہ ہی اسے اس انقلاب کی تحریک و سازش ناپذیر قیادت کا کوئی ادراک تھا حتی کہ ۱۹۷۸ء میں جب اس تحریک نے خون ناحق کی دھاروں سے سرزمین ایران کو سرخ سمندر میں بدل دیا جب بھی غیر تو درکنار امت اسلامی اور عام مسلمان اس کی پرچھائیں سے دور تھے۔ اگر کچھ جانتے بھی تھے تو وہی جو معدوم شاہ کی ساختہ پرداختہ اخباری مشینری سناتی تھی یعنی "اسلامی مارکسسٹوں کی شورش" یا استعمار سرخ و سیاہ کا گٹھ جوڑ، شرق و غرب کے تمام ذرائع ابلاغ شاہ کے زیر دست تھے اور اسلامی دنیا بھی اسی کو سچ مان لینے میں اپنی بھلائی

وادائیگی فرض جانتی تھی حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی تھی :۔

۱ــــــ ملت ایران نے پہلی بار اپنے تئیں دنیائے اسلام کا ایک حصہ ہونے کا اعلان کیا تھا

۲ــــــ قومی بورژوا حکومت اور اس سے وابستہ ہر گروہ کی نفی کی تھی ۔

۳ــــــ اسلامی بنیادوں پر حکومت اسلامی کی تشکیل مصمم ہو چکی تھی ۔

۴ــــــ ایران کے تمام گروہوں اور سیاسی و مذہبی جماعتوں کو اس تحریک میں شامل کیا گیا تھا ۔

۵ــــــ بڑی طاقتوں اور ملک میں ان کے عوامل سے ان کا مقابلہ تھا ۔

۶ــــــ ہر بات میں عالم اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا گیا تھا ۔

۷ــــــ ایسا رہبر اور ایسی رہبری تلاش کر لی گئی تھی جو کسی خاص گروہ یا مخصوص طبقہ کے مفاد کا پاسدار نہ ہو ۔

امام امت کی رہبری کی انفرادیت یہ تھی کہ ان کے پاس نہ کوئی اخبار تھا نہ جدید دور کی تبلیغ کا کوئی وسیلہ ۔ گذشتہ کئی صدیوں کے رہبروں کے درمیان اس صفت میں امام اور انقلاب اسلامی کے دیگر رہنما تنہا نظر آتے ہیں ۔ انقلاب فرانس ، انقلاب روس و چین ، اٹلی ، ہند و الجزائر سب کے پاس ضعیف یا ضعیف تر یا قوی ذرائع ابلاغ رہے ہیں حتی کہ انقلاب مشروطہ کے دور میں بھی ایران کے باہر کئی اخبارات شائع ہوتے تھے کلکتہ (ہندوستان) کا حبل المتین اس کی ایک مثال ہے

اتنا ہی نہیں بلکہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد تو ہر چہار جانب سے معاندانہ پروپگنڈہ کی برسات شروع ہو گئی اور سب کی کوشش یہی رہی کہ اس انقلاب کی آگ کو بجھا دیا جائے یا اسے منحرف کر دیا جائے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اسے محدود کر کے مقامی و مسلکی بنا دیا جائے اور اس کے رہبر عظیم کو عام مسلمانوں اور دنیا کی نظروں میں منفور کر دیا جائے اس "کار خیر" میں سعودی وظیفہ خوار علماء نے بھی خاصا ہاتھ بٹایا اور ہندوستان و پاکستان کے اہل قلم نے کافی مادی فوائد اٹھائے اور اٹھا رہے ہیں اور بعض حالات مثلاً طویل جنگ اقتصادی محاصرہ ، اپنی نیک نفسی و سادہ اندیشی و تجربے کی کمی کے باعث حکومت جمہوری اسلامی اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے سے قاصر رہی اس کے بعد بھی یہ انقلاب زندہ ہے ، متحرک ہے ، سفر میں ہے کیا یہ اس انقلاب اور اس کے رہبر کی انفرادیت کے لئے کافی نہیں ہے

حضرت امام خمینی کی بے مثال قیادت کا تجزیہ اگر ان ہی کے اقوال و افکار کی روشنی میں کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ان کی بھاری بھرکم قیادت اور عوام کے بے مثل فداکارانہ جذبہ کو دیکھ کر مادی دنیا کے پرستاروں کی عقل دنگ اور زبان گنگ ہے۔ مغربی ممالک امریکہ و اسرائیل میں انقلاب اسلامی اور امام خمینیؒ کی قیادت، دو تین سال سے بحث و تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنی ہوئی ہے مگر ابھی تک وہاں کے لال بجھکڑ کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں اسی طرح حضرت امامؒ کی زندگی میں ان کے آئندہ اقدام کا اندازہ لگانے میں ماڈرن آلات بھی کند ہوگئے وجہ یہ کہ امام خمینیؒ کی قیادت کی بنیاد ایمان و تقویٰ پر استوار قائم ہے۔ ولایت فقیہ کا مطلب ہی ہے متقی علما کی حکومت۔ تقویٰ کیا ہے اور متقی کون ہے مختصر یہ کہ تقویٰ ہر انسانی فضیلت کا سرچشمہ بھی ہے سراج بھی۔ حب دنیا، حب جاہ اور ہر دنیاوی حرص و خوف سے دوری مگر اللہ سے بے انتہا خوف و خشیت۔ نالۂ نیم شبی اور آہ صبحگاہی کے کاسہ میں نجات و غفران کی طلب ہی متقی قائد ولی کا سرنامہ امتیاز ہے اور یہ قیادت پیغمبروں کا و سید النبیینؐ و امام المتقینؑ کی میراث ہے ان کی قیادت دین کے خطوط پر ہوتی ہے اسی لئے ان کی سیاست و دین میں جدائی نہیں ہوتی۔ امام خمینیؒ نے اپنے پیشرو علمائے حق مثلاً سید حسن مدرس کی طرح اسے عمل و کردار سے ثابت کر دیا و لہٰذا عمر کے بیشتر حصہ میں صرف پیشوائے دین، مرجع تقلید، روحانی رہنما، حوزہ علمیہ کے معلم اعلیٰ زینت مسند اجتہاد رہے لیکن اس کے بین السطور میں ہمیشہ پاک سیاست کی زیریں لہر موجزن رہی اور ان کے جہاد اسلامی کا آغاز بنی ہیں تیاری و مشق بھی شہر علم قم اور مدرسہ فیضیہ و حسینیہ و مساجد میں ہوئی عملی سیاست کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد مسلسل دس سال تک امامؒ نے انتہائی پیچیدہ، وحشتناک اور پرخطر حالات اور مصائب و ابتلا کے دور یعنی داخلی شورش و بھیانک دہشت گردی و ہولناک جنگ تحمیلی کے زمانے میں اپنی فہم و فراست، قدرت و طاقت و مقبولیت کے سکے دوست و دشمن کے دلوں پر بٹھائے لیکن ساتھ ہی ساتھ کار دینی، علم و تعلم حوزہ علمیہ، مجلس فتوی کو بھی بے انتہا فروغ دیا ایران اور ایران سے باہر تبلیغات اسلامی کا جال بچھا دیا جس سے آج اسلام حقیقی کا افق وسیع و روشن تر ہو رہا ہے اور یہ آواز ہر جانب سے آرہی ہے کہ اسلام ہی انسان کی ہر جائز خواہشات و ضروریات کی مکمل خانہ پری کرسکتا ہے۔

پہلے یہ اشارہ کیا جا چکا ہے اور اسے صاف لفظوں میں یہاں کہنا مناسب ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کا ہر عمل تکلیف شرعی کے تحت ہوتا تھا ۔ چاہے وطن ہو یا جلاوطنی قیادت ہو یا عوامی وانفرادی حیثیت چنانچہ جب نجف اشرف سے آپ نے اپنا اخراج منظور کیا تو یہی کہا کہ یہ میری تکلیف شرعی کا تقاضہ ہے اسی طرح جنگ تحمیلی کو مردانہ وار جھیلا تو بھی شرعی ذمہ داری جان کر، اسی لئے سخت سے سخت مصیبت ان کے قدم میں لرزش نہیں پیدا کر پائی خواہ وہ پردیس میں ان کے جوان وصالح وقوت بازو بیٹے کی اچانک و پُراسرار موت ہو یا دل کے ٹکڑے اور پارہ تن کی دلخراش شہادت یا بہتّر جانثاروں کی یکبارگی و اجتماعی شہادت صبر و استقامت کے ساتھ وہ صرف خود ایسے حالات میں مثل کوہ جمے نہیں رہتے بلکہ امت کو حوصلہ و توانائی بھی بخشتے تھے ہر مصیبت کے مستقبل کو چیر کر ان کی مومن نگاہیں خوشگوار مستقبل کو دیکھ لیتی تھیں اور وہ اسے بشارت بنا کر عوام کی ہمت افزائی کرتے تھے یہ بات بھی ان کو تمام رہبروں سے ممتاز کرتی ہے ۔ عراق کی بعثی حکومت نے جب اچانک بیس ڈویژن کا لشکر اور ٹینک و توپ خانے کو ہزاروں کلومیٹر ایران کی سرحد کے اندر داخل کر دیا تمام انتشار و بوکھلاہٹ کے ماحول میں امامؒ نے صدا دی کہ یہ "جنگ نعمت ہے" یہ جنگ ملک و سرحد کی نہیں اسلام کے خلاف ہے اور جمہوری اسلامی کو نابود کرنے اور انقلاب اسلامی کو برباد کرنے کے لئے ہے اس لئے اس کا مقابلہ ملت کی ایک ایک فرد پر واجب ہے اس صدائے غیبی کا بلند ہونا تھا کہ ساری امت اسی طرح صحنۂ جہاد میں کود پڑی جیسے انقلاب کے لیے اسلامی حکومت کے حصول کے لئے میدان میں اتری تھی اور چند ہفتوں کے اندر عالمی امپریلزم کے خواب تار تار ہو گئے اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا

عام رہبروں اور قائدین کے یہاں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ دوران انقلاب اور تحریک آزادی کے شباب کے دور میں پُرجوش تقریر، اشتعال انگیز تحریروں کا استعمال کرتے ہیں خفیہ ریڈیو اسٹیشن پمفلٹ و اخبار سے کام لیتے ہیں لیکن امام خمینی نہایت سکون کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اور پندرہ سال کی جلاوطنی میں امت کو اس قدر جوش و جذبۂ ایمان سے بھر دیتے ہیں کہ ان کو تاریخ اپنا سرمایہ افتخار بنا لیتی ہے کوئی یقین کرے یا نہ کرے امام خمینیؒ نے جون ۱۹۷۸ء تک نجف اشرف میں رہ کر کسی اخبار کی بات نہیں سنی صرف مشہور فرانسیسی اخبار "لے موند" کا نمائندہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اس نے

امام کا پہلا انٹرویو اپنے اخبار میں شائع کیا۔ کیونکہ امام خمینیؒ اخبارات کے غلط رویہ سے ہمیشہ نالاں رہے اور ان کی بات بالکل سچ تھی۔ اس انٹرویو میں امامؒ نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور انقلابی حکومت کے خدوخال بھی واضح کردیئے ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا اس میں تا حیات یعنی انقلاب کے بعد بھی سرمو فرق نہیں آیا۔ اب لازم ہے کہ میں یہاں پر انقلاب اسلامی اور اس کی قیادت کی اس انفرادیت کا ذکر کروں جو سورج کی طرح روشن ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ حضرت امام نے تبلیغات اور اپنے پیغام کی اشاعت صرف اپنے ملک و ملت کے لوگوں کو کی اور یہ سلسلہ نجف سے پیرس تک جاری رہا۔ امام کے فرمودات کو ٹیپ کرلیا جاتا تھا پھر ٹیلیفون کے ذریعہ اسے ایران پہونچادیا جاتا جس کے بعد ہزاروں لاکھوں کیسٹ ملک کے چپہ چپہ میں پھیل جاتے تھے اور یہ طریقہ انتہائی مؤثر و کامیاب رہا اور بے مثال بھی۔

ہر انقلاب کے لئے ابتدا سے ایک گروہ مصیبت بن جاتا ہے اور اس سے نمٹنا دشمنوں سے لوہا لینے سے زیادہ سخت ہوتا ہے پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے منافقین سے لے کر آج کے درباری علماء کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ دوسری اصطلاح میں انقلاب اصلی اور انقلاب نقلی کے گروہ کا تصادم نہایت خطرناک ہوتا ہے اور کبھی کبھی انقلاب اصلی کی شکست بھی ہو جاتی ہے جیسے کہ انقلاب مشروطہ ایران ۱۹۰۶ء اور ہندوستان میں جے پرکاش نرائن کے انقلاب ۱۹۷۷ء کا انجام ہوا۔ چین میں ان دونوں گروہوں میں تیس سال تک خونریزی ہوتی رہی۔ لینن کے بعد انقلاب روس اسٹالین ایسے بدخواہ اور سفاک انسان کے ہاتھ میں آیا جس نے لاکھوں آدمیوں کو مولی گاجر کی طرح اڑا دیا لیکن یہ حضرت امام خمینیؒ کی رہبری و قیادت کا کمال اور انفرادیت ہے کہ جنگ تحمیلی کے دور میں منافقین اور انقلاب بدلی کے مختلف گروہ کو آہستہ آہستہ اس طرح ختم کردیا گیا کہ آج ان کے نام لیوا بھی نہیں رہ گئے ہیں۔

امام خمینیؒ کی سادگی مشہور ہے اور اس میں کسی وقت بھی تبدیلی نہیں آئی بعض لوگ اس کے مقابلے میں چند دیگر رہبروں کی مثال بھی پیش کرتے ہیں جس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا مگر امامؒ کی سادگی کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں صرف غذا و لباس و مکان ہی کی سادگی نہیں بلکہ گفتگو

تحریر، فکر و نظر، طرز و ادا میں خمینی سادگی تھی اور اس کی وہ دوسروں کو تلقین بھی کیا کرتے تھے بشنو
جب آپ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد کروڑوں افراد کے استقبال کے ساتھ تہران آئے تو پہلی منزل
قبرستان بہشت زہرا قرار دی۔ وہ خود کو نہ عالم کہلانا پسند کرتے تھے نہ رہبر۔ وہ پابرہنہ لوگوں
کے ہاتھ چومتے تھے وہ شہادت کی آرزو کرتے تھے اور برادر کہا جانا زیادہ پسند کرتے تھے
ان کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کی تصویریں بکثرت شائع ہوں وہ بے انتہا پابند وقت اور
تہجد گزار تھے اور دوسروں کو اس کی نصیحت کرتے تھے۔ اتنی مصروفیت اور بلند مقام پانے
کے بعد بھی عام اور چھوٹے ملاؤں اور عالموں کا کام کرنے میں ان کو کوئی انکار نہ تھا نکاح
خوانی، استخارہ، دستار بندی، قرآن خوانی، قرآن و دینیات کی تعلیم ایسے کام بھی مرحوم امام رح
نے اپنی عظیم رہبری کے پرآشوب دور میں کمال انبساط و آمادگی سے انجام دیئے ہیں حتیٰ کہ اپنی
چھوٹی بہو کے اصرار پر امام نے بہت سی عرفانی غزلیں بھی کہی ہیں جو اگرچہ علم و معرفت کا ایک
سمندر ہیں لیکن میرے خیال میں یہ بھی ایک رہبر قوم کے لئے انسان دوستی بلکہ ایک بے مثال کارنامہ ہے
ظاہر ہے کہ شاعری فکر و غور و تعلم کے لئے وقت و محنت چاہتی ہے اور ایسا رہبر جس کی زندگی کا ہر لمحہ
تاریخ کی ایک صدی پر بھاری ہو وہ اپنا قیمتی وقت محض اپنے میاں کا دل رکھنے پر صرف کردے
بہت بڑی بات اور سبق آموز واقعہ ہے۔ امام مرحوم کی انفرادی سادگی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں سے
بھی سادگی چاہتے تھے زندگی میں بھی اور تقریر و تحریر میں بھی۔ ان کی عبارت بہت آسان و سادہ
ہوتی تھی ہر تصنع و جذبات سے عاری۔

یہ سوال اکثر اٹھتا رہا ہے اور اس پر دنیا کے مختلف الخیال افراد نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ
امام خمینی رح کی کامیابی کا راز کیا تھا لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کامیاب قیادت اور ایسی پرجوش و
فداکار امت کو امام خمینی رح نے اپنی روحانیت و معنویت اور شب و روز کی تربیت و محنت سے
تیار کیا تھا انہوں نے جو کچھ کیا، کہا، دکھایا، سنایا سب کچھ کھلی کتاب کی طرح تھا اور اسلام اصلی کا
پرتو۔ انہوں نے ابتدائے زندگی سے آخر تک اس پر حرف بحرف عمل کیا اور بیس تیس سال کی تعلیم و تربیت
کی مشقت اٹھا کر سیکڑوں باعمل و اخلاص و سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ساتھی و ہم خیال
لوگوں کی جماعت بکھیر دی۔ تعلیم، تزکیۂ نفس اور اخلاق کی تہذیب کی تھی امام رح اس امر پر بہت رنجیدہ

ہے کہ آجکل تعلیم یافتہ افراد میں تہذیب و اخلاق سے آشنائی ختم ہو چکی ہے اور دنیا میں فساد و فحش و بد اخلاقی اسی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔ وہ ایک واحد قائد تھے جو کہتے تھے اور انہوں نے بار بار کہا کہ انقلاب اور اس کی برکتوں میں میرا کوئی ہاتھ نہیں نہ میرا قیام ایران کی حکومت کو بدلنے کے لئے تھا بلکہ یہ خدائی کارنامہ ہے ہمارا قیام صرف اسلام کے لئے تھا وہ اسلام جو خالص محمدیؐ اسلام ہے نہ کہ اسلام امریکائی والتقاطی۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انقلاب کسی ایک فرد کا رہین منت نہیں ہے البتہ جب تک میں ہوں عوام کی اس امانت اسلام کو مٹنے نہ دوں گا نہ ملک کی مہار قومیت پرستوں یا لبرل لوگوں کے ہاتھ میں جانے دونگا۔ کیونکہ اسلام غریب و بے سہارا عوام کی امانت ہے اور یہی ہوا انحراف پسندوں کی ہر سعی بے کار گئی اور عوام نے انھیں رسوا کر کے ان سے بیزاری کا اظہار کیا۔

جنگ تحمیلی حضرت امام خمینی کی عظیم آزمائش اور خدا کی طرف سے ان کا سخت و آخری امتحان تھا جس میں وہ صد در صد کامیاب ہوئے انہوں نے آٹھ سال تک نہ صرف عراق کی درندگی کا منہ توڑ جواب دیا بلکہ ساری دنیا خصوصاً امریکہ سے مقابلہ کیا اور کسی منزل پر گھٹنے نہیں ٹیکے امت کی فرد فرد میں جذبۂ شہادت و دفاع کو بھر دیا اور شمع اسلام و وطن پر پروانہ وار جان نثار کرنے پر آمادہ کر دیا تمام دنیا کو انگشت بدنداں کر گیا امامؒ نے صحیح معنوں میں جہاد حسینی کا نمونہ دنیا کی نظروں کے سامنے پیش کر دیا اور "کل ارض کرب وبلا و کل یوم عاشورا" کے رجز کو سب کے دل و دماغ میں اتار دیا۔ اس جنگ کے دوران بھی امام کی قیادت بے مثل رہی کہ ایک ہی وقت میں وہ فوج کے اعلیٰ کمانڈر تھے تو دوسری طرف عوام کے دل و دماغ کی ڈور بھی ان ہی کے ہاتھوں میں تھی اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ زہر کا پیالہ نہ پیتے اور جنگ کو مجبوراً نہ بند کرتے تو قوم کا بچہ بچہ ان کی رضا کے لئے جان سے گزر جاتا بیس برس تک جنگ جاری رکھنے کا جو نعرہ انہوں نے دیا اسے بھی عوام نے بسر و چشم قبول کیا اور جب جنگ بندی قبول کر لیا تو بھی سب نے سمعاً و طاعۃً کہہ کر خاموشی اختیار کر لی یاد رکھنا چاہئے ایسے سخت و پیچیدہ حالات میں عوام اور فوج دونوں پر کنٹرول بہت مشکل امر ہوتا ہے اور اگر ایران میں امام خمینیؒ جیسا عظیم رہبر نہ ہوتا تو ملک میں انتشار و خانہ جنگی کے پھیل جانے کا سراسر خطرہ موجود تھا

ایک انفرادیت حضرت امامؒ کی عالمی قیادت کی یہ بھی ہے کہ اول و آخر جنگ و صلح کوشش و کامیابی ہر مرحلے پر اپنا ناطہ صرف عوام سے قائم رکھا اور ملک کے اندر و باہر کے کمزور و کچلے ہوئے عوام اور علما ان کے مخاطب رہے انہوں نے کسی بڑے سیاست داں سے نہ رابطہ رکھا نہ کسی ملک کے سربراہ کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا نہ خود کسی مستکبر حکمراں سے ملے نہ اس کے پاس گئے اور یہیں پر امام خمینیؒ و سید جمال الدین اسد آبادی کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں اول الذکر نے عوام کے نچلے طبقہ کو نظر میں رکھا اور ان کی تربیت کر کے ان سے کام لیا اور مؤخر الذکر کا تعلق خواص کے طبقے یا فرمانروایان مملکت و رہبران سیاسی و دینی سے تھا امام خمینیؒ نے اگر سربراہان مملکت کو خطاب بھی کیا تو برائے نصیحت و وہ فرمانرواؤں سے کہتے تھے کہ اپنے عوام کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لو ان کا حق دو۔ اسلام کی ترازو پر اپنے اعمال کو تولو ان کی آزادی کو سلب نہ کرو اور عوام سے یہ کہتے تھے تم اپنی طاقت کو جانو، اپنی شناخت کے لئے قیام کرو اور اپنا حق لینے کے لئے برائے خدا اٹھ کھڑے ہو علما سے کہتے تھے کہ وسائل و امکانات نتیجہ و ثمر کی پروا کئے بغیر عمل کے میدان میں پیغمبرؐ کی طرح آجاؤ ہمت کرو تو خدا بھی مدد کرے گا۔ اسلام کی فریاد کو پہونچو قرآن کی فریاد سنو۔ یہی آواز ۱۵ ر خرداد ۱۳۴۲ھ ش کو امام نے مدرسہ فیضیہ سے لگائی تھی اور شاہ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تو اسلام و قرآن سے دشمنی ختم کر دے اسرائیل و امریکہ کی دوستی سے توبہ کر۔ ہمیں تیرا تخت و تاج نہیں چاہیئے بلکہ صرف اسلام و قرآن کی عزت و حرمت کو واپس لانا منظور ہے۔

اسرائیل سے معدوم شاہ کی بے انتہا وابستگی امام خمینیؒ کے لئے شروع سے سوہان روح رہی ہے اور وہی از ابتدا تا ایں دم واحد مسلم قائد ہیں جنھوں نے اسرائیل کو امریکہ کی ناجائز اولاد کہا اور اس کو تسلیم کرنے کی ہر قیمت پر مخالفت کی بلکہ اقوام متحدہ سے اس کی ممبری کو ختم کرنے کے لئے پوری جد و جہد کی لیکن عرب ممالک کی دورخی پالیسی سے وہ اس نیک مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور امریکہ اپنی چال چل گیا آج اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں اکثر عرب ممالک بے شرمی کے ساتھ کر رہے ہیں امام خمینیؒ اس مسئلے پر روس سے بھی ناراض تھے کیونکہ اسرائیل کی غیر قانونی حکومت کو تسلیم کرنے والوں میں وہ دوسرا بڑا ملک تھا۔ امریکہ و اسرائیل کے خلاف

اگر امام خمینیؒ اپنی تبلیغ بند کر دیتے تو شاہ معدوم سے ان کا اتنا شدید اختلاف ہرگز نہ ہوتا۔

اس بات کا ذکر ہم نے اس لئے کیا ہے تاکہ یہ بتلایا جا سکے کہ امام خمینیؒ اقتدار پانے سے پہلے ہی عالم اسلام کے ساتھ فلسطینیوں کے ہمدرد و مددگار اور اسرائیل سے نفرت کرتے تھے اخوان المسلمین کو بھی حضرت امامؒ اور ان کے پیروؤں کی حمایت حاصل تھی۔ فلسطین کانفرنس میں وہ اپنے نمائندوں کو خاموشی کے ساتھ بھیجتے تھے۔ قاہرہ میں دار التقریب اسلامی کی بنیاد و تصور میں وہ آیت اللہ بروجردی کے ساتھ تھے بلکہ اتحاد اسلامی کے مسئلہ میں وہ اپنے پیشرو سید جمال الدین اسدآبادی سے زیادہ شدت پسند تھے اور وہ وحدت کلمہ کو کلمہ توحید کے ہم پلہ گردانتے تھے لیکن اس اتحاد کی بنیاد ملیت اور پان اسلامزم پر نہیں اسلام پر تھی یہ ان کا فیصلہ تھا جسے انہوں نے تحقق بخشا اور ان کی زندگی میں ان کو کامیابی ہوئی اور "لاشرقیہ لاغربیہ اسلامیہ اسلامیہ" کے ساتھ ساتھ "لاشیعیۃ لاسنیہ اسلامیہ اسلامیہ" کی صدائیں تمام عالم اسلام کے گوشے گوشے میں گونج گئیں یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ امام خمینی کی صدائے اتحاد ہر حلقہ اور ہر مرحلہ کے لئے اور ہمیشہ کے لئے تھی وقتی نہیں ملک و ملت کا اتحاد، شیعہ سنی کا اتحاد، مستضعفین عالم کا اتحاد حوزہ و دانشگاہ کا اتحاد حکومت و عوام کا اتحاد۔ علماء اور امت اور خود روحانیوں کے اتحاد کا مطالبہ ملت اسلامیہ میں صرف امام خمینیؒ کی دین ہے یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی و غیر اسلامی ملکوں میں اب اسلامی گروہ ایک قوی سیاسی عنصر بن کر ابھر رہا ہے اور سیکولرزم و نیشنلزم و میٹریلزم کی دیواروں کو سیلن لگ گئی ہے اور نائیجریا، اردن، مصر الجیریا، انڈونیشیا، ٹیونس اور کئی ملکوں میں اسلامی جماعتوں کی کامیابی کے دروازے بالکل باٹوں پاٹ کھل گئے ہیں اور عالمی سیاسی تسلط پر اسلام ایک قدرت مند آئیڈیالوجی کے طور پر جلوہ افگن ہو رہا ہے۔ اسلام کے نظام کو تسلیم کیا جانے لگا ہے اور ہر طرف حکومت اسلامی کا شور ہے لیکن امامؒ نے اسلام کا بھی تصفیہ و تنقیہ کیا ہے اور اسلام اصلی اسلام حقیقی یا اسلام خالص ناب محمدیؐ کو اسلام امریکائی و مارکسیسٹی سے الگ کیا ہے۔ علما و روحانیت کو اسلام کا محافظ و اجرا کنندہ بتاتے ہوئے ان کے احترام و رعایت کی نصیحت کے بعد بھی درباری علما کو اسلام کے جسم کا ناسور اور متحجرین و جمود پسند علماء کو بدگوشت کہا ہے اور اس تفریق کے بعد سنی و شیعہ

کی تقسیم دم توڑ دیتی ہے اس لئے کہ دونوں فرقوں میں درباری علماء کل اور آج دونوں زمانے میں رہے اور انہوں نے دشمنان اسلام سے زیادہ روحانی لباس کی آڑ میں اسلام کو دانستہ ضرر پہونچایا ہے

امام خمینیؒ کے منفرد نظریہ قیادت و اسلوب رہبری کا راز جاننے کے لئے مستکبرین و مستضعفین کی بازیافت پر بھی خصوصی توجہ دینا ضروری ہے جو قرآن مجید کی صدہا سال قدیم اصطلاحیں ہیں امام خمینی نے اپنی عملی سیاست کی بنیاد ان ہی دو زمینوں پر رکھی اور ساری دنیا کو استکبار و استضعاف میں بانٹ کر مستضعفین کو سینے سے لگایا اور ان کی وکالت فرمائی اور استکبار کے تمام کنبے قبیلے حوالی موالی کو ٹھوکریں لگاتے رہے نتیجتاً جتنا عالم استکبار ان کے خون کا پیاسا ہوتا گیا مستضعفین کا سیل رواں امامؒ کے حریم سیاست کی طلایہ گری کرنے لگا جس کی ایک مثال نمیبیا کے سیاہ فام رہنما سام نجوما کی ہے ۔ ۲۷ سال کی جلاوطنی کے بعد جب ان کو وطن جانے کا مژدہ و موقع ملا تو پہلے وہ تہران میں امام خمینیؒ کے مزار پر پہونچے اور کہا امام کے مرقد کی زیارت سے مجھے عجیب تازہ قوت ملی ہے ۔

مستضعفین و مستکبرین اور ان کے گرگوں اور آلہ کاروں پر امامؒ کی نظر و توجہ برابر رہی اور اسی نظریہ کی کامیابی نے ایران سے کمیونسٹوں اور سوشلزم نوازوں کی فکری جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیں اور آج حضرت امام رضوان اللہ علیہ کی رحلت کے چند ماہ بعد ہی نصف کرۂ ارض میں استکبار شرق کو مرگ ناگہاں نے آگھیرا اور بقیہ نصف دنیا بھی اسی روش پر چل پڑی ہے ۔

آخر میں امام خمینیؒ کی رہبری کی ایک معرکہ آرا صفت کا بیان بھی ضروری ہے جو ان کی ذات ہی کی طرح کمیاب یا نایاب ہے اور وہ ہے اقتدار کے مرکز ہی نہیں بلکہ دائرے سے بھی اپنی اولاد امجاد، اعزہ و اقارب و احباب کو الگ رکھنا وہ اپنے تئیں خادم قوم کہتے تھے اسی طرح سے اپنے متعلقین سے بھی غیر رسمی خدمت اسلام چاہتے تھے ۔ ان کے برادر بزرگ، فرزند رشید اور بے شمار قریبی عزیزوں کی زندگی اس کی گواہ ہے انہوں نے اول روز سے یہ طے کر دیا تھا کہ حکومت سے ان کے اپنے خاندان کا کوئی شخص فائدہ نہیں اٹھائے گا ۔ اس اصول پر حضرت امامؒ سختی سے قائم رہے اور کوئی دباؤ انہیں اس راہ سے ہٹا نہیں سکا ۔

حضرت امام خمینیؒ کی ہستی اعلیٰ خصائل و بے نظیر کردار کے لحاظ سے ایک بحر ذخار و

حیلۓ ناپیداکنار ہے ان پر ابھی تک میری اطلاع کے مطابق چھوٹی بڑی سو سے زائد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور اس سے زیادہ لکھی جارہی ہیں یہ کیوں صرف اس لئے کہ "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ" کی آیت ان کا سرنامۂ زندگی تھی خدا کے سوا ان کو کچھ دکھائی نہ دیتا تھا نہ کوئی نظروں میں سماتا تھا ہم سب سے ان کا یہی تقاضا تھا کہ جو کرو خدا کے لئے جو سوچو خدا کے لئے "اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن" کا وہ جیتا جاگتا نمونہ تھے وہ ہر تاریخی و عظیم دن کو خصوصاً ۱۵ خرداد و ۲۲ بہمن کو "یوم اللہ" کہتے تھے اس لئے ان کے قول کے مطابق ان کی ولادت و وفات کا دن بھی یوم اللہ ہے لیکن خود ان کو ہم کیا کہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا وہ "مرد اسلام" تھے یا "مرد قرآن" - "مرد سال" یا "مرد قرن" . "مرد تاریخ" "مرد ایران" یا "مرد خدا" بے شک "مرد خدا" ہی ان کے لئے موزوں و مناسب ہے کیونکہ ان کی نظر میں یا تو خدا تھا یا پھر اس کے نیک بندے مظلوم ولاچار عوام۔

آخر میں برسبیل تذکرہ یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح حضرت امام خمینی رح کے جملہ معتقدات و احساسات ابتدائے زندگانی سے آخر دم تک یکساں تھے اسی طرح خانۂ خدا حج، اہمیت کعبہ اور اس عظیم اجتماع مسلمین کے تعلق سے امامؒ کے خیالات میں اقتدار و رہبری کے قبل و بعد کے دور میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور آپ ربع صدی پہلے نجف اشرف کی جلاوطنی کے زمانے میں وہی وظیفۂ شرعی ادا کر رہے تھے جو اقتدار کے بعد آپ نے کیا یعنی حج کے اجتماع سے استفادہ اور عامۂ مسلمین کی خیر خواہی. عراق میں اگرچہ آپ فوجی و بعثی حکومت کی سخت نگرانی میں تھے لیکن جیسے ہی حج کا زمانہ قریب آتا آپ لاکھوں کی تعداد میں اپنا الٰہی و سیاسی پیغام چھپوا کر مخفیانہ طور پر سعودی مملکت میں پہونچاتے تھے امام کے فدائی ہر خطرہ مول لے کر اسے حاجیوں میں تقسیم کرتے تھے اور اتحاد اسلامی کی تحریک کو اندر اندر بڑھاوا ملتا رہتا تھا۔ اس پیغام میں یہی برائت من المشرکین و وحدت مسلمین کی دعوت ہوتی تھی اور حاجیوں کو بتایا جاتا تھا کہ حج صرف ایک رسمی اور چند مناسک کی ادائیگی کا کام نہیں بلکہ جہان اسلام کے مفاد و مصالح پر غور و فکر کرنے اور ان کی مشکلات کا حل ڈھونڈھنے کا محل و مقام ہے اور ہر حاجی کی تکلیف شرعی یہ ہے کہ وہ اس عظیم اجتماع اسلامی میں اپنا فریضہ ادا کرے اپنا حال

دوسروں کو سنائے اور دوسروں کی زبانی ان کی سماجی، معاشی، سیاسی صورت حال کو معلوم کر کے فکرمند ہو۔ انقلاب کے بعد اس رہبر عظیم نے اپنا وظیفہ ادا کرتے ہوئے اعلیٰ پیمانے پر حج کے عبادی و سیاسی پہلوؤں کو روشن کیا اور مختلف آزار ورکاوٹوں کے باوجود مسلمان امت اس پر عامل رہی مکہ و مدینہ کی زمین اور آسمان وحدت کلمہ اور کفر شکن نعروں سے گونجتے رہے یہاں تک کہ امریکہ و اسرائیل کے لئے یہ آوازیں قاتل بننے لگیں اور انہوں نے حکومت سعودی کو مجبور کیا کہ وہ جبر و ستم، ظلم و شقاوت ہیکڑی اور فریب کے زور پر اس عظیم مشن کو اس انوکھی درس گاہ کو بند کر دے اور مکہ کی مقدس زمین حرم امن الٰہی کو بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین کر کے ایرانی زائرین ایرانی حکام اور رہبر انقلاب اسلامی کی تصویر کو عام نگاہوں میں خراب کر دے لیکن امامؒ کی رحلت سے چند ماہ پہلے ہی ان کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمانان عالم کو دوست دشمن کی پہچان ہوگئی اصل و نقل کا فرق واضح ہوگیا اور آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو کر اصل حقیقت سامنے آگئی ہے کہ نام نہاد پاسبان حرم کو حرم و مقدسات اسلامی سے کتنی دلچسپی ہے اور انشاء اللہ دن بہ دن تاریکی کے بادل چھٹتے جائیں گے اور جلد ہی پھر ساری دنیا کے مسلمان حج کے ایام خدائی میں مثل سابق مشرکین سے برأت اور اتحاد اسلامی کی دعوت کا ملی فریضہ انجام دینے میں آزاد ہونگے اس وقت اس رہبر عظیم کی یاد ہر دل میں ہوگی اور لب پر اس کے لئے دعائے خیر" وَلا تَهِنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین " خلاصہ یہ کہ ان کی حیات بھی اسلام و امت کے لئے نعمت تھی اور ان کی وفات بھی۔ ان کا کام ان کا امتحان پورا ہوا وہ کامیاب ہوئے اور اللہ نے ان کو اپنے پاس بلالیا۔

ولی امر مسلمین حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ نے فرمایا

"امام خمینی قدس سرہ"

رھبر، باپ، معلم، مرکز آرزو، ملت ایران کے محبوب اور دنیا بھر کے مستضعفین خصوصاً مسلمانوں کے لئے امیدوں کا ایک روشن چراغ تھے۔

امام خمینیؒ اللہ کے صالح و متقی، عابد شب زندہ دار بندے اور ہمارے عہد کی عظیم روح تھے، وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک مکمل اسوہ اور اسلامی رھبری کا ایک روشن و تابناک نمونہ تھے۔

امام خمینیؒ نے اسلام کو عزت بخشی اور پرچم قرآن کو پوری دنیا میں سربلند کردیا......

اس عہد میں جبکہ دنیا کے تمام قومی و سیاسی ہاتھ۔ دین، معنویت اور اخلاقی اقدار کو مٹانے میں مصروف تھے آپ نے ان ہی دین، معنویت اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ایک نظام قائم کیا اور ایک مستقل اسلامی سیاسی حکومت کی بنیاد رکھدی۔ (پہلا پیغام رہبری ۴ ذیقعدہ الحرام ۱۴۰۹ھ)

امام خمینیؒ

کے امتیازات و خصوصیات

تحریر: جناب مولوی اسحٰق مدنی

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

ہمارے زمانے میں جو چیز "اسلامی انقلاب" کے نام سے ظہور پذیر ہوئی ہے دوست اور دشمن ہر ایک کے تصورات سے بالاتر تھی مختلف ممالک میں اسلامی تحریکوں کی مسلسل شکست کی وجہ سے مسلمان یہ سوچنے لگے تھے کہ جو وسائل و امکانات دشمنان اسلام کے اختیار میں ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اسلامی حکومت کی تشکیل عملاً ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف مخالفین اسلام بھی اپنے منصوبوں اور سازشوں کے تحت مطمئن ہو چکے تھے کہ خود مسلمانوں اور اسلامی ملتوں کے درمیان انہوں نے "مذہب، قوم، نژاد اور ملک کے نام پر جو اختلافات پیدا کر دیئے ہیں ان کی بنیاد پر ان ممالک میں اسلامی حکومت نام کی کوئی شئے وجود میں لانا اب کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خود ایران کے اندر گزشتہ پچاس برسوں میں پہلوی حکومت کے ہاتھوں اسلام کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی کوششیں کی گئیں، پہلوی شہنشاہیت نے نہ صرف اپنے دربار میں بلکہ ملک کے تمام حساس مقامات پر اخلاقی اقدار کی پامالی کا بازار گرم کر رکھا تھا، شاہ ایران نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا جشن برپا کر کے، جو در اصل مجوسیت کا مظہر تھا، اور ہجری تاریخ کا نام شہنشاہی تاریخ میں تبدیل کر کے، عالمی کفر اور استعمار کے تسلط کے لئے مکمل طور پر زمین ہموار کر دی تھی ایک ایسے ملک میں اسلامی انقلاب کی کامیابی یقیناً ناقابل تصور،

غیر معمولی چیز تھی ۔

بلا شبہ جس ہستی نے اس انقلاب کی قیادت ورہبری کی ، ملکی و غیر ملکی تمام تر رکاوٹوں اور مادی وسائل کی کمی کے باوجود پوری ملت کو اپنے گرد جمع کرکے نہ صرف اس اسلامی انقلاب کو ایران میں کامیابی سے ہمکنار کیا بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلامی حریت کا بیج چھڑک دیا اور مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور ولولہ کے ساتھ بیداری وآگاہی کی انقلابی کیفیت پیدا کردی یقیناً یہ ہستی عالم اسلام کی ایک غیر معمولی اور استثنائی شخصیت کی حامل ہے ۔ ظاہر ہے اس عظیم ہستی نے ، مسلمانوں کی آگاہی و بیداری ، ان کے درمیان اتحاد و یکجہتی ، اور ان کے امراض کی تشخیص اور علاج کے سلسلہ میں بے پناہ زحمتیں اور مشقتیں اٹھائی ہیں ۔

اس وحدت اور استقلال و آزادی کی راہ میں امام خمینی طاب ثراہ نے جو کوششیں کی ہیں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں نہ تو میں ان کا احصاء کرسکتا ہوں اور نہ ہی دنیا کی بڑی سے بڑی لکھنے اور بولنے والی شخصیت ان کو بیان کرسکتی ہے ۔ میں نے وہ گفتگو اور تقریریں جو حضرت امام خمینی قدس سرہ نے صرف ایک ماہ اردیبہشت ۱۳۵۸ ہجری شمسی (اپریل و مئی ۱۹۷۹ء) کے دوران ملاقاتیوں کے سامنے مختلف جلسوں میں بیان فرمائی ہیں ان کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ شاید ہی کوئی ایسی نشست ہو جس میں آپ نے امت مسلمہ کے اصلی مرض "اختلاف اور فرقہ بندی" کو ختم کرنے اور باہم "وحدت واتحاد" قائم کرنے کے سلسلہ میں (جو آپ کی نظر میں اس کا بہترین علاج تھا اور جس کے ذریعہ آپ کو کامیابی ملی ہے) سخت تاکید و نصیحت سے کام نہ لیا ہو . . .

حضرت امام خمینی قدس سرہ یکم اردیبہشت (۲۱ اپریل ۱۹۷۹ء) کو سعودی عرب سے آنے والے علماء کے ایک وفد کے سامنے جو وہاں کی بڑی شخصیتوں کی نمائندگی کررہا تھا فرماتے ہیں :۔

"میں چاہتا ہوں کہ اسلامی امتیں اٹھ کھڑی ہوں اور "وحدت کلمہ" کے ساتھ اسلام اور ایمانی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے غیروں پر اور ان تمام طاقتوں پر جو ملت کو ہمیشہ اپنے اختیار اور تسلط میں رکھنا چاہتی ہیں غلبہ حاصل کریں ، صدر اسلام میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز ہی "وحدت کلمہ" اور ایمانی قوت تھی "۔

اسی طرح ۲ اردیبہشت (۲۲ اپریل ۱۹۷۹ء) کی تقریر میں فرماتے ہیں :۔

"اور اب احساس بھی کرتا ہوں اور لمس بھی کرتا ہوں کہ اگر ملت آپس میں اتحاد پیدا کرے اگر مختلف جماعتیں ایک ہو جائیں تو بڑی طاقتیں بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔"

۴ / اردیبہشت (۲۴ / اپریل ۱۹۷۹ء) کو انتظامیہ پولیس اور شہر سادہ کے عوام کے سامنے فرماتے ہیں:

"میں امید رکھتا ہوں کہ یہ اتحاد و "وحدت کلمہ" جو ہماری ملت کے تمام طبقوں کے درمیان ہے باقی رہے اور اسی وحدت کلمہ کے سہارے اسلامی تحریکیں آگے بڑھیں اور اسلامی حکومت عدل قائم کر کے تمام طبقے اپنے حقوق حاصل کریں"

۵ / اردیبہشت (۲۵ / اپریل ۱۹۷۹ء) کو آمل سے آئے ہوئے لوگوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"کامیابی کا راز ایران نے پالیا ہے۔ خدا پر یقین اور وحدت کلمہ کا راز۔ اس وحدت کلمہ کی حفاظت کیجیئے" اسی طرح شہر لوئی سے آنے والے ایک وفد کے سامنے ۷ / اردیبہشت (۲۷ / اپریل ۱۹۷۹ء) کو آپ فرماتے ہیں:-

"خداوند تبارک و تعالیٰ اگر توفیق دے اور ہم اور ہماری ملت اس راز کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں تو مجھے امید ہے کہ ہم اس اسلامی حکومت اور اسلامی احکام کو استقرار دے سکتے ہیں لیکن اس کے لئے وحدت کلمہ کی ضرورت ہے ہماری ملت کو اتحاد و یکجہتی باقی رکھنا چاہیئے وہ ملتیں جو مختلف شہروں اور علاقوں میں ہیں ہماری اس کوشش میں شریک ہوں اور سب کے سب متحد اور ایک آواز ہو کر اسلامی جمہوریہ اور اسلام کے مقدس احکام کی طرف آگے بڑھیں"

مؤرخہ ۸ / اردیبہشت (۲۸ / اپریل ۱۹۷۹ء) کو حضرت امام خمینی قدس سرہ حبیب بورقیبہ کے خط کے جواب میں فرماتے ہیں:-

"مجھے امید ہے کہ اسلامی جمہوریہ (ایران) دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان اتفاق و وابستگی کے سلسلہ میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتی رہے گی۔"

۱۵ / اردیبہشت (۵ / مئی ۱۹۸۰ء) اسلامی تحریک آزادی کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ہم اسلامی وحدت کو اپنا شعار بنائیں ۔وحدت کے ساتھ اور " لا الٰہ الا اللہ " کے پرچم تلے رہ کر ہی ہم کامیاب ہو سکتے ہیں جب تک دنیا کے مسلمان ایران میں رونما ہونے والے اس راز سے آگاہی پیدا نہیں کرتے کامیاب نہیں ہو سکتے ۔"

۱۷؍اردیبہشت (۷؍مئی ۱۹۸۹ء) کو صومالیہ کے سفیر سے ملاقات کے دوران فرماتے ہیں:

"اسلامی حکومتوں کو باہم ایک حکومت کی مانند ہونا چاہیئے ۔یہ سب ایک وسیع معاشرہ کی طرح ہیں، ایک پرچم ہے ،ایک کتاب ہے اور ایک پیغمبر ہے ان کو ہمیشہ متحد رہنا چاہیئے اور آپس میں ہمہ جہت تعلقات و روابط رکھنا چاہیئے چنانچہ اگر یہ آرزو پوری ہو جائے اور اسلامی حکومتوں میں ہمہ جہت وحدت پیدا ہو جائے تو امید ہے وہ اپنی مشکلات پر قابو پالیں گی اور دیگر تمام طاقتوں کے مقابل ایک بڑی طاقت بن کر سامنے آئیں گی ۔"

۲۱؍اردیبہشت (۱۱؍مئی ۱۹۸۹ء) کو ڈاکٹر مصدق اسپتال کے ڈاکٹروں اور کارکنوں نیز" ہلال احمر" کی منتظم جماعت کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

یہ وحدت کلمہ محفوظ رہنا چاہیئے کیونکہ اگر خدانخواستہ یہ "وحدت کلمہ" ہاتھ سے چلی گئی اور خدانخواستہ ہم شکست سے دوچار ہوئے تو پھر کبھی ایران کے چہرے پر اس کی شادمانی لوٹ کر نہ آسکے گی ۔بنابریں ہم سب کا فریضہ ہے کہ اس تحریک کی حفاظت کریں اور وحدت کلمہ کو محفوظ رکھیں"

اسی طرح اصفہان کی عدلیہ سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کے سامنے جو آپ کی خدمت میں ۲۳؍اردیبہشت (۱۳؍مئی ۱۹۸۹ء) کو ملاقات کے لئے آیا تھا آپ نے فرمایا :۔

"آپ جانتے ہیں کہ یہ تحریک جو اس منزل تک پہنچی ہے ۔تمام طبقوں کے درمیان اتحاد لعد اسلام سے وابستگی کی برکت سے ہے

" ۲۴؍اردیبہشت (۱۴؍مئی ۱۹۸۹ء) کو ہندوستان و پاکستان سے آئے ہوئے ایک وفد سے فرماتے ہیں :۔

" وہ مختصر سے افراد جو آج سازشوں میں مصروف ہیں انشاءاللہ بہت جلد ہی نابود ہو جائیں گے وہ اس خیال باطل میں گرفتار ہیں کہ ایک شجاع قوم کے خلاف وہ سازش کر سکتے ہیں ،وہ دفن کر دیئے جائیں گے ،لیکن شرط یہ ہے کہ مستضعفین وحدت کلمہ کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں تمام گروہ آپس میں متحد رہیں ویسے ہی جیسے وہ اب تک باہم متحد رہے ہیں ،اور اس تحریک کو

وحدت کلمہ کے ساتھ خداوند عالم پر بھروسہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچایا ہے۔ بڑی بڑی دیواروں کو گرایا ہے اب اس کے بعد بھی آپس میں متحد رہیں اور اس (کامیابی کے) راز کی حفاظت کریں کامیابی کی کلید اپنے ہاتھ میں رکھیں، اگر یہ راز یعنی وحدت کلمہ خدائے عظیم پر بھروسہ اور خدائے عظیم کی طرف توجہ محفوظ رہے۔ اگر مسلمان اس راز کی حفاظت کریں تو کامیابی ان کے ساتھ ہے آخری کامیابی۔

حضرت امام خمینی قدس سرہ ایرانی تاجرین کے مختلف گروہوں کے مجمع میں ۲۵ اردیبہشت (۱۵ مئی ۸۹ء) کو فرماتے ہیں:-

"سب کی ایک عمومی ذمہ داری ہے اور وہ یہ کہ ہم سب اپنی تمام تر قوت و طاقت کے ساتھ کوشش کریں کہ یہ انقلاب محفوظ رہے، یہ وحدت کلمہ محفوظ رہے۔ یہ انقلاب الٰہی انقلاب کی صورت میں محفوظ رہے۔"

۳۱ اردیبہشت (۲۱ مئی ۸۹ء) کو جنوبی لبنان کے شیعوں کی نمائندہ جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں اور خود اپنے آپ کو بھی پہچانیں، اس فکر میں نہ رہیں کہ بڑی طاقتیں کیا ہیں؟!

جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے امور کی ادائیگی میں بھی اپنے آپ کو پہچانیں اور سب کے سب باہم جمع ہوں، باہم اتحاد برقرار رکھیں تاکہ انشاءاللہ کامیاب ہوں اور انشاءاللہ کامیاب ہوں گے۔ مجھے امید ہے یہ انقلاب اور تحریکیں جو مسلمانوں کے درمیان وجود میں آچکی ہیں۔ ہر جگہ متحد رہیں۔ اور وحدت کلمہ کے ساتھ خداوند تبارک و تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہوئے، جو تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے۔ آگے بڑھیں اور تمام اسلامی ممالک متحد ہو کر پرچم اسلام کے زیر سایہ خوشحالی اور عزت کی زندگی بسر کریں۔

جب انسان دقت نظر سے کام لیتا ہے اور غور و فکر کرتا ہے تو یہ بات اس پر روشن ہو جاتی ہے کہ امام خمینی طاب ثراہ کی تمام تر توجہ "وحدت" و اتحاد پر رہی ہے چنانچہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں عالم اسلام کا اصل مرض یہی ہے جبھی امام "قدس سرہ" اتحاد و وحدت پر، جو اس کا واقعی علاج

ہے۔ اس قدر زور دیتے ہیں اور اس راہ میں بے انتہا زحمتیں برداشت کرتے ہیں، اگر چہ ہوتا یہ ہے کہ جب انسان کو اپنی زندگی میں ایک کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو درحقیقت وہ ایک طرح کا آرام وسکون محسوس کرتا ہے لیکن چونکہ حضرت امام خمینی قدس سرہ کا مقصد صرف ایرانی مسلمانوں کی کامیابی تک محدود نہ تھا، لہٰذا اس کامیابی کے باوجود پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے سلسلہ میں اپنی مجاہدانہ کوششیں جاری رکھتے ہیں، ایک جملہ جو آپ نے عید قربان کی مناسبت سے ارشاد فرمایا ہے اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ شاید وہی احساس جو کامیابی سے قبل آپ کے قلب میں پایا جاتا تھا رحلت کے وقت بھی آپ کے قلب میں موجزن تھا اور وہ جملہ یہ ہے:

"اسلام کے لئے اور مسلمانوں کے لئے مبارک وہ دن ہے جب ظالموں کا ہاتھ قلم ہوجائے اور وہ اسلامی ممالک میں خون چوسنے کے قابل نہ رہ جائیں۔"

یعنی آپ نے عید کو اس دن پر موکول کر دیا جب دنیا بھر کے مسلمان حقیقی معنوں میں استقلال وآزادی پیدا کریں اور ایسے حالات میں زندگی گزاریں کہ ان کے سروں پر بڑی طاقتوں کا وجود باقی نہ رہے اور واقعی طور پر انہیں استقلال وآزادی نصیب ہو"

یہاں اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ وہ مرض جو امام خمینیؒ نے اس امت کے لئے تشخیص دیا، ایسا نہیں ہے کہ کسی دوسرے نے یہ مرض تشخیص نہ دیا ہو اور اس راہ میں تلاش وکوشش نہ کی ہو۔ لیکن وہ خصوصیت وامتیاز جو امام خمینیؒ ان مسائل میں رکھتے تھے شاید ان میں نہ ہو درحقیقت بہت سی شخصیتوں نے یہ مرض تشخیص دیا اور اس کے علاج کی صورت کو وہ جانتے تھے مگر وہ علاج میں کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ خصوصیت حضرت امام خمینی کے نصیب میں تھی کہ مرض اور اس کا علاج تشخیص دینے کے بعد علاج میں کامیاب بھی ہوئے اور اس کی کچھ خاص وجوہات تھیں جن کا ہم آخر میں ذکر کریں گے۔

بنابرایں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس منزل میں ان شخصیتوں کا بھی ذکر کر دیا جائے جنھوں نے اس راہ میں زحمتیں اٹھائی ہیں اور اسی ضمن میں ہم یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ کیوں امام خمینی قدس سرہ اس راہ میں کامیاب ہوئے اور وہ لوگ اس علاج میں کامیاب نہ ہوسکے اگر چہ بہت سے لوگوں نے اس راہ میں تگ ودو اور کوششیں کی ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض کی

زحمتیں محدود پیمانے پر تھیں اور مختلف وجوہات کی بنا پر اور وسائل و امکانات کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہونے یعنی ان کو وہ وسائل نہ مل سکے کہ ان کی خدمتیں پورے عالم اسلام تک پہنچ سکتیں اس منزل میں خاص طور پر ہم چار شخصیتوں کے نام لینا چاہیں گے جنھوں نے اس راہ میں بڑی کوششیں کی ہیں

عالم اسلام کی ان اہم شخصیتوں میں سے ایک عظیم ہستی، جسے ہمیشہ عالم اسلام کی نجات کی فکر رہی۔ سید جمال الدین اسدآبادی ہیں جنھوں نے امت اسلامی کے درمیان اتحاد پیدا کرنے اور عالم اسلام کو استقلال دلانے کے سلسلہ میں بے پناہ کوششیں کی ہیں۔ سید جمال الدین نے بھی حضرت امام خمینیؒ کی طرح ملت اسلامی کی بیماری اور اس کا علاج تجویز کر لیا تھا جس طرح امام فقید طاب ثراہ ہمیشہ وحدت اور اس کے راز کے بارے میں گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ سید جمال الدین کا بھی یہی کردار رہا۔ وہ بھی ملت اسلام کا علاج اتحاد اور صدر اسلام کی طرف بازگشت خیال کرتے تھے لیکن افسوس ان کی تمام کوششیں جو در اصل اتحاد و یکجہتی اور ملت اسلام کے استقلال کے لئے تھیں خود ان کی زندگی میں بار آور نہ ہو سکیں۔

دوسری شخصیت جس نے عالم اسلام خاص طور پر عرب دنیا کو بیدار کرنے کے سلسلہ میں قابل ذکر کردار ادا کیا اور ہر ہر قدم پر سید جمال الدین اسدآبادی کے ہمراہ رہی مفتی عبدہ کی ذات تھی اور یہ بھی اپنی محنتوں کا پھل دیکھنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

تیسری شخصیت جس نے اسلامی وحدت و استقلال کی راہ میں سید جمال الدین اسدآبادی اور مفتی عبدہ کی نسبت زیادہ تر اثرات چھوڑے ہیں اقبال لاہوری کی ذات گرامی ہے لیکن یہ بھی بعض وجوہات کی بنا پر اپنے کام میں کامیاب نہ ہو سکے ایک تو اپنی زندگی کا وہ زمانہ اور وہ مدت جو انہوں نے اس کام کے لئے منتخب کیا بہت ہی مختصر تھا، اس کے علاوہ ثقافتی و تعلیم یافتہ گروہ ہی آپ کے افکار سے استفادہ کر سکتا تھا، آپ کے افکار و نظریات یونیورسٹیوں اور کتابوں سے دور عوام الناس کے درمیان نہ تو نفوذ پیدا کر سکے اور نہ ہی ان پر اپنے اثرات مرتب کر سکے۔

مسلمانوں کی کامیابی کے راز یعنی وحدت اور یہ کہ مسلمانوں کو استقلال و آزادی حاصل کرنے کے لئے آپس میں متحد رہنا چاہئے علامہ اقبال نے بھی امام خمینی قدس سرہ کی مانند حصول اتحاد کی مختلف راہیں بیان کی ہیں ان کا خیال تھا کہ قوت و طاقت اور عظمت و شوکت کے بغیر اسلام کا تصور درست تصور نہیں ہے

علامہ اقبال کہتے تھے کہ مسلمان کو قوی اور کامیاب ہونا چاہیئے اس کے اندر کمزوری کا احساس نہیں پیدا ہونا چاہیئے۔

اقبال کا عقیدہ تھا کہ تین صورتوں سے ملت اسلام کو متحد کیا جاسکتا ہے پہلی صورت جو اتحاد کی کی سب سے زیادہ مثالی صورت ہے وہ یہ کہ پوری ملت اسلامیہ کی رہبری ایک ہاتھ میں ہو دوسری صورت یہ کہ تمام اسلامی ممالک متحد جمہوریوں کی شکل میں ایک واحد نظام کے تحت کام کریں اور تیسری صورت یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک اپنی خود مختاری کو محفوظ رکھتے ہوئے آپس میں بھی سیاسی اقتصادی اور فوجی معاہدوں کے تحت ایک دوسرے سے بہ جہت تعاون وہم آہنگی قائم رکھیں۔

چوتھی شخصیت جس نے ملت اسلام خصوصاً نئی نسل میں وحدت وہم آہنگی، اتحاد واستقلال اور بیداری و آگاہی پیدا کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا اور اس راہ میں اپنی جان کی قربانی پیش کردی حسن بنا، شہید کی ذات ہے وہ اسلام سے متعلق اپنے تمام تر علم و معرفت اور آگاہی کے باوجود چونکہ روایتی علماً کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لہٰذا عوام الناس کو اپنی جانب جذب کرنے میں ناکام رہے اور اقبال کی مانند زیادہ تر ان کی مقبولیت یونیورسٹیوں سے وابستہ افراد اور روشن فکر طلاب تک محدود رہی

امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے خصوصیات میں سے ایک اہم چیز آپ کا تقدس اور پاکیزہ نفسی تھی گویا خود حضرت امام طاب ثراہ ابتدائے زندگی سے اس بات کی طرف متوجہ تھے کہ خداوند عالم نے آپ کو ایک عظیم کام کے لئے خلق کیا ہے۔ دوران عمر یقینی طور پر ہر انسان کی زندگی میں بہت زیادہ نشیب وفراز پائے جاتے ہیں انبیاء و ائمہ علیہم السلام جن کو خداوند عالم نے لوگوں کی ہدایت کے لئے منتخب فرمایا معصوم ہیں اور اس عظمت کے بعد جس کے وہ حامل رہے ہیں، ان کی زندگیاں ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک رہی ہے۔ لیکن غیر معصومین کے یہاں وہ چاہے کتنی ہی اہم شخصیت کے حامل کیوں نہ ہوں یہ بات کہ کسی طرح کا کوئی کمزور پہلو ان کے یہاں موجود نہ ہو بہت مشکل ہے لیکن امام خمینی کی پاکیزگی اس منزل پر نظر آتی ہے کہ حتیٰ آپ کے سخت ترین دشمن بھی آپ کے یہاں کوئی معمولی سا ضعیف پہلو پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ جس وقت پہلوی حکومت نے آپ کے خلاف افواہ پھیلانا چاہی کہ اس طرح آپ کی شخصیت کو کسی عنوان سے مجروح کیا جاسکے تو سب سے بڑی بات جو وہ کہہ سکے یہ تھی کہ آپ "ہندی الاصل" اور ہندوستان سے ایران آئے ہیں بالفرض اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے تو

اس میں کوئی عیب کی بات نہیں ہے ۔ ایک انسان اپنی پوری زندگی ہر طرح کی آلودگی اور لغزش سے محفوظ رہ کر بسر کردے یقیناً کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جو بہت ہی نادر طور پر دنیا کی گنی چنی شخصیتوں میں ملتی ہے ۔

امام خمینیؒ کی دوسری خصوصیت ان کی روحانیت تھی ، وہ ریاضت و مجاہدت وہ توجہ اور دل سوز یا اور وہ خاص روحانی کیفیات جن کے آپ حامل تھے ہر دیکھنے والے بلکہ جو بھی آپ کے درس میں حاضر ہوتا تھا ، اس کو اپنی طرف جذب کر لیتے تھے ، یہی روحانیت مسلمان ملتوں اور اسلامی شخصیتوں کے قلوب تسخیر کر لینے کا سبب بنتی تھی ۔

امام خمینیؒ کی ایک اور خصوصیت انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جانا اور عوام کا آپ کی بے دریغ حمایت کرنا تھی ۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبران خدا ، ائمہ معصومین اور صدر اسلام کی عظیم شخصیتوں کے بعد قلوب میں گھر کر جانے کی یہ کیفیت کسی عالم اور روحانی شخصیت میں نظر نہیں آتی وہ شخص جس کا ایک بیٹا یا دو ، تین بیٹے شہید ہو چکے ہوں جس وقت اس سے انٹرویو لیا جاتا ہے تو کہتا نظر آتا ہے ہمارے بچے اسلام اور امام (خمینیؒ) پر قربان ہوئے ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ امام خمینی سلامت رہیں ۔ اور یہ کہ ایک جماعت حاضر ہو اور اپنے قلوب ہدیہ کرے تاکہ امام خمینیؒ زندہ رہیں ۔ لوگوں کے درمیان یہ مقبولیت ممکن ہے اس کے نمونے دوسری جگہوں پر بھی مل جائیں لیکن وہ عاشقانہ کیفیت اور والہانہ جوش و خروش جس سے سرشار ملت امام خمینی کا وطن واپسی پر استقبال کرتی ہے اور وہ حالت کہ جس وقت آپ خطاب فرماتے تھے سب کے سب مشتاقانہ انداز میں گوش بر آواز رہتے تھے یا وہ کیفیت جو آپ کی تشییع جنازہ کے وقت دیکھنے کو ملی عوام کے درمیان آپ کو غیر معمول مقبولیت اور ان کے قلوب میں بے مثال اور غیر معمولی نفوذ کی نشان دہی کرتی ہے ۔

حضرت امام خمینیؒ کی ایک اور خصوصیت جو آپ کی کامیابی میں بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوئی آپ کا مرجع تقلید ہونا تھا یہ امر سبب بنا کہ جو افراد داخلی طور پر انقلاب کے کرتا دھرتا تھے آپ کے افکار قبول کرنے پر دل و جان سے آمادہ ہوئے اور وہ خود کو اس بات کا مکلف اور ذمہ دار سمجھتے تھے کہ ان افکار کی تبلیغ و ترویج کریں اور زندگی کے آخری لمحات تک ان کا دفاع کریں ۔ یقیناً اگر امامؒ مرجع تقلید نہ ہوتے تو آپ کے پاس بھی سید جمال الدین اسد آبادی

اور شیخ عبدہ کی مانندان میں آگاہی پیدا کرنے اور انقلابی تحریک کے تئیں ان کو معتقد بنانے کا کافی وقت نہ تھا۔ حقیقت میں اس گروہ نے جو امام خمینیؒ کا مقلد تھا اور شرعاً خود کو امام خمینیؒ کے افکار پر عمل کرنے کے سلسلہ میں مکلف سمجھتا تھا، کامیابی میں بنیادی کردار ادا کیا اور حضرت امام قدس سرہ کے ارد گرد اس گروہ کا اجتماع دیگر اسلامی معاشروں میں مسلمانوں کی روح کو تقویت پہنچانے کا سبب بنا۔

امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی ایک اور خصوصیت مسلسل طور پر بار بار اتحاد کی دعوت اور عوام و خواص کے درمیان اس کی طرف شدت کے ساتھ تاکید تھی، یہاں تک کہ بعض وقت کم فہم افراد کی جانب سے آپ کو متہم بھی کیا گیا، امام خمینی، ان دوسرے بہت سے افراد کے برخلاف جو فروعی مسائل اٹھا کر مسلمانوں کے کسی ایک یا چند گروہوں کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کا سبب بنتے تھے خود اسلامی اتحاد اور اسلامی حکومت کو، جو اسلام کی اصل و اساس ہے، دیگر فروعی مسائل پر ترجیح دیتے تھے

ایک اور امتیاز جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے امام خمینی کے ترقی یافتہ اور انوکھے افکار تھے۔ آپ کے نظریات کچھ ایسے تھے کہ تمام پڑھے لکھے افراد، طلبہ اور اساتذہ، ملازم اور مزدور، کسان اور تاجر حتیٰ ان پڑھ افراد بھی اپنے تمام کے تمام تقاضے امام خمینیؒ کے افکار میں مشاہدہ کرتے تھے اسلام کے بلند افکار جن کو امام خمینی نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا، لوگوں کے اندر بیداری و آگاہی اور بھولے سبق دوبارہ یاد آنے کا سبب بنے اور ملت ایران اس انقلاب کے گرد جمع ہوگئی۔

حضرت امام خمینیؒ کے دیگر خصوصیات میں سے ایک آپ کا طریقۂ کار بھی تھا جو دراصل وہی انبیاء علیہم السلام کا انداز و شیوہ تھا۔ یعنی اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے آپ نے کوئی حزب اور جماعت تشکیل نہیں دی کہ کچھ مخصوص افراد تحریک کے اصل محور اور آرگن کے طور پر سامنے آجائیں اور پھر کامیابی کے بعد حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں اور دوسرے ان کے مطیع و فرمان بردار بن جائیں بہت سے اسلامی ممالک میں وہ جماعتیں جو اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں عموماً انھیں قابل ذکر کامیابی نہیں مل سکی ہے اور اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ خود یہ گروہ تحریک کے تئیں عوامی ہم فکری کی راہ میں مانع ہوتے ہیں، امام خمینی قدس سرہ نے انبیاء علیہم السلام کی سیدھی سادی سیرت کا انتخاب کیا اور ایک عالم دین کے عنوان سے لوگوں کو اسلامی مسائل سے آشنا و باخبر کیا اور خود کو ہر طرح کی پارٹی و جماعت کی تشکیل سے دور رکھا، امام خمینیؒ کا یہ سادہ اور صاف ستھرا برتاؤ اس انقلاب کی کامیابی میں بہت ہی مؤثر ثابت ہوا ہے

اسلامی انقلاب کی کامیابی اور موجودہ دنیا میں اسلامی تحریک کو وسعت بخشنے میں جن چیزوں نے مؤثر اور قابل توجہ کردار ادا کیا ان میں سے ایک امامؒ کی یہ خصوصیت بھی تھی کہ آپ نے عالی دماغ مفکرین اور علماء پر مشتمل اپنے شاگردوں کے ایک وسیع گروہ کی بڑی ہی اعلیٰ سطح پر تربیت کی تھی جنھوں نے دقیق طور پر امامؒ کی باتوں کو سمجھا اور آپ کی زندگی کے دوران آپ کے قوی و مستحکم بازو بنے رہے، حضرت امام خمینیؒ نے مفتی اعظم یا دیگر شخصیتوں کے برخلاف کہ جن کی تحریکیں خود ان کی ذاتوں سے وابستہ ہو کر رہ گئیں اور ان کی موت کے بعد کوئی ان کی راہ پر چلنے والا نہ رہا، علماء اور دانشوروں کی ایک توانا جماعت تربیت کی دی تھی جن میں سے ہر ایک نے قوی بازو کی مانند تحریک کی حمایت کی اور انقلاب کی کامیابی، یہاں تک کہ آخری لمحۂ حیات تک امام خمینیؒ کے ساتھ رہے اور آپ کی رحلت کے بعد بھی آپ ہی کے نقش قدم پر آگے بڑھ رہے ہیں جنھوں نے حضرت امامؒ کی وفات کے بعد اس راہ میں کسی طرح کا خلل پیدا ہونے کی مہلت ہی نہیں دی۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح اسلامی ملت نے اپنے مخلصانہ عمل سے اس انقلاب کو کامیابی تک پہنچایا ہے آئندہ بھی اس اسلامی تحریک اور انقلاب کی حفاظت کریں گے اور ہم (انشاءاللہ) ساری دنیا میں کلمۃ اللہ اور شعائر اللہ کی بلندی و برتری کا نظارہ کریں گے

امام کی خصوصیات میں سے ایک بہت ہی روشن و تابناک خصوصیت انقلاب اسلامی کی کامیابی کے پہلے بھی اور بعد بھی، مختلف ملکوں میں زندگی بسر کرنے والے مظلوم و ستم دیدہ مسلمانوں، خصوصاً فلسطینیوں کی بے دریغ حمایت تھی۔ باوجود اس کے کہ یہ حمایت ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد اس نوزائیدہ اسلامی حکومت کے حق میں بڑی مشکلات پیدا کرنے کا سبب بنی، اور باوجود اس کے کہ ان ممالک میں ظلم و ستم کا شکار مسلمانوں کی اکثریت سنی المذہب تھی، پھر بھی امام خمینی کی بے لوث حمایت بتاتی ہے کہ آپ عالم اسلام کے مسائل کے سلسلہ میں، چاہے وہ سنیوں سے مربوط ہوں یا شیعوں سے یکساں طور پر فکر کرتے تھے۔ اور یہی چیز ان ممالک کے لاکھوں مسلمانوں کے قلوب امام امت اور اسلامی انقلاب کے تئیں جذب ہو جانے کا باعث بنی ہے۔

یہ وہ خصوصیات اور امتیازی موارد تھے جو میری فکر میں آسکے ہیں یقیناً بہت سے ایسے موارد ہیں جن تک ہماری فکری رسائی نہیں ہو سکی ہے خداوند متعال سے امید ہے کہ وہ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ حضرت امام قدس سرہ الشریف کے ارفع و اعلیٰ مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کر سکیں اور تمام

اسلامی سرزمینوں سے غیروں کے تسلط کے خاتمے، اسلامی حکومت کی تشکیل اور نور اسلام سے پوری دنیا کے منور ہونے" کی راہ میں کوشاں رہیں اور دعا کرتا ہوں کہ دنیا کے تمام انقلابی اور حریت پسند افراد امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے نشان قدم کو اپنا نصب العین قرار دیں اور آپ کے جانشین رہبر ملت اسلام ولی امر مسلمین آیۃ اللہ خامنہ ای، جو اس وقت امام کے نزدیک ترین ساتھیوں میں سے ہیں، کی اطاعت و پیروی کرتے ہوئے اسلام کے آخری اور اعلیٰ ترین ہدف تک رسائی حاصل کریں۔ انشاء اللہ۔



از : شعبۂ تحقیق سازمان تبلیغات اسلامی
ترجمہ : جناب سید احتشام عباس زیدی

شیطانی سازشیں

اسلامی مآخذ کی روشنی میں امام خمینیؒ کے تاریخی فتوے کا جائزہ

بڑے شیطان امریکا اور بوڑھے استعمار برطانیہ کے منصوبہ پر عمل کرنے والے "شیطانی آیات" کے مصنف (سلمان رشدی) اور اس کتاب کے مطالب سے آگاہ ناشرین کے واجب القتل قرار دیئے جانے سے متعلق مسلمانوں کے عظیم رہبر اور ولی امر کے حکم نے اس صدی کے استعمار کے پیکر پر سب سے زیادہ کاری ضرب لگائی اور پوری دنیا میں اس حکم کی اشاعت نے نہ صرف دشمنان اسلام کی اس زبردست ثقافتی سازش کو ناکام بنا دیا بلکہ استعماری قلم فروشوں کے اوپر اس قدر رعب و وحشت طاری کر دی ہے کہ اب کوئی رائٹر اسلام کے خلاف جلدی کچھ لکھنے کی جرأت نہ کرے گا۔

الٰہی حدود جاری ہونے کے یہی وہ قیمتی ثمرات و نتائج ہیں جن کے پیش نظر پیغمبر اسلامؐ نے الٰہی حدود میں سے ایک حد کے اجراء کو کرۂ زمین کے ساکنوں کے لئے چالیس روز کی بارش اور باران رحمت سے بھی زیادہ قیمتی قرار دیا ہے اور چونکہ تمام الٰہی حدود و قوانین کا نفاذ امام عادل کی حاکمیت اور اس کی طرف سے تقاضائے وقت کے مطابق صادر کئے جانے والے صحیح اور مؤثر حکم پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک ساعت کی امامت اور معاشرہ میں اس کے وجود کو ستر سال کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔

قالَ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ : ساعة امام عادل افضل من عبادة سبعين سنة وحد يقام للہ فی الارض افضل من مطر اربعين صباحاً " (۱)

اور امام موسیٰ کاظمؑ نے تاریخ کی ان عظیم شخصیتوں کو نعمتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے جو خداوندعالم کی جانب سے مبعوث ہوئے تاکہ اپنی حکیمانہ قیادت و رہبری اور حدود الٰہی کے اجراء کے ذریعہ دنیا میں عدل وانصاف کو زندہ کریں اور زمین واہل زمین کو ایک نئی زندگی عطا کریں ۔

" عن ابی ابراھیم (ع) فی قول اللہ عز وجلّ : "یحیی الارضَ بعدَ موتها " قالَ لیس یحییھا بالقطر ولکن یبعث اللہ رجالاً فیحیون العدلَ ۔ فتحیی الارض لاحیاء العدل ولاقامة الحدِ فیہ انفع فی الارض من القطر اربعین صباحاً ". (۲)

" امام موسیٰ کاظمؑ نے قرآن کی آیت "خداوندعالم زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے" کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ خداوند عالم بارش کے ذریعہ زمین کو زندہ کرتا ہے بلکہ خداوندعالم ایسے عظیم افراد کو مبعوث کرتا ہے جو عدل وانصاف کو زندہ کرکے زمین کو حیاتِ نو بخشتے ہیں کیونکہ زمین میں ایک الٰہی حد کا اجراء کیا جانا چالیس شب وروز کے باران رحمت سے زیادہ نفع بخش ہے ۔"

آج وقت کے اس حساس موڑ پر تاریخ اسلام کا ایک عظیم عادل وشائستہ ترین رہبر اپنے تاریخی فتوے کے ذریعہ استعمار کے اُس پست و ذلیل غلام کے قتل کا حکم صادر فرماتا ہے جس نے بڑے ہی بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا یعنی پاکیزہ ترین مخلوق حق اور درخشندہ ترین جلوۂ پروردگار، تمام رسولوں کے سردار خاتم انبیاء حضرت محمد بن عبداللہ (ص) کی پاکیزہ شان میں گستاخی کی ہے اور ان کی محترم ازواج اور اصحاب کرام نیز دیگر جلیل القدر الٰہی انبیاء مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیلؑ ذبیح اللہ کی اہانت اور وحی ، جبرئیل ، مرکز وحی مکہ نیز دیگر اسلامی مقدسات کا

۱۔ ۲۔ وسائل الشیعہ / ج ۱۸ / ص ۳۰۸

مضحکہ اڑایا ہے۔ اپنے عصر کے ولی فقیہ نے اس بابرکت حکم کو صادر فرمانے اور اس اعلان کے ساتھ ہی ساتھ یہ کہہ کر کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہے، دشمنان خدا اور رسولؐ کی سازشوں کے مقابل اسلام کے تحفظ اور اس کی عزت کی ضمانت لے لی اور اب مسلمانان عالم انشاء اللہ سالہا سال تک اس حکم کے برکات سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

اب ہم تمام اہل اسلام کی خدمت میں اس مقدس حکم کے مآخذ و مدارک اور شرعی دلیلیں پیش کرتے ہیں نیز عالم اسلام کی ان دینی و سیاسی شخصیتوں، گروہوں اور ثقافتی و دینی مراکز و اداروں کو بھی اس سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنی غفلت و بے توجہی کی وجہ سے اس حکم شرعی کے مآخذ و مدارک کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کی اور اس الٰہی حکم کی تائید و حمایت کے اعلان اور حق اس دھارے کی تقویت نیز دشمنان خدا و رسولؐ پر رعب و وحشت طاری کرنے کے بجائے اپنے سکوت کے ذریعہ نہ صرف بہت سے ناواقف مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں ڈال دیا بلکہ دشمنانِ خدا کو اپنی طرف سے شاد و مسرور بھی کیا ہے۔ ہم یہاں معتبر روایات و احادیث کو شیعہ اور اہل سنت کے معتبر ترین روایاتی مجموعوں نیز تاریخ شیعیت کے عظیم فقہا، اہل سنت کے ائمۂ اربعہ اور اسلامی مذاہب کے دیگر مشہور و معروف مفتیوں کے فتاویٰ کو حسب ذیل تین ابواب کے تحت پیش کرتے ہیں تاکہ امام خمینی قدس سرہ کے اس قاطع و محکم حکم کی اصالت و حقیقت پورے طور سے واضح ہو جائے:

پہلا باب:
فریقین کی روایات نیز ائمہ و فقہائے مذاہب خمسہ کے فتاویٰ کی روشنی میں مرتد کا واجب القتل ہونا۔

دوسرا باب:
فریقین کی روایات اور ائمہ و فقہائے مذاہب خمسہ کے فتووں کی روشنی میں نبیؐ پر سب و شتم کرنے والے کا واجب القتل ہونا۔

تیسرا باب:
ثقافتی حملہ آوروں اور دشمنوں سے اسلامی عقائد کی سرحدوں کا دفاع۔

۱ اسلامی نقطۂ نگاہ سے مرتد کا حکم

سورہ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت میں ارشاد ہے : "وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ"

"اور جو شخص تم (مسلمانوں) میں سے اپنے دین سے پھر جائے اور کفر کی حالت میں مرے۔ ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں حبط ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ اہل جہنم ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مرتد کی تعریف

ہر وہ شخص جو مسلمان ہو اور بعد میں اسلام کو ترک کر کے دوسرا دین و آئین اختیار کرلے یا اسلام اور اس کے مقدسات کا مضحکہ اڑائے اور ان کی اہانت کرے یا پیغمبر اسلام کی رسالت کو جھٹلائے یا کسی خاص غرض کے تحت اسلام پر اعتراضات کرے، مرتد ہے، جیسا کہ امام خمینی رہ نے اپنی کتاب تحریر الوسیلہ میں اور شیعوں کے عظیم فقیہ صاحب جواہر الکلام نیز عقائد نسفی کے شارح نے "مرتد" اور "کافر" کی اسی عنوان سے تعریف کی ہے۔

امام خمینی قدس سرہ فرماتے ہیں

"الكافر وهو من انتحل غير الاسلام او انتحله وجحد ما يعلم من الدين ضرورة بحيث يرجع جحوده الى انكار الرسالة او تكذيب النبى (ص) او تنقيص شريعته المطهرة او صدر منه ما يقتضى كفره من قول او فعل، من غير فرق بين المرتد والكافر الاصلى ..." (۱)

۱۔ تحریر الوسیلہ / ج ۱ / ص ۱۱۸

"کافر وہ شخص ہے جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین و آئین کا انتخاب کرے۔ یا دین اسلام کو تسلیم کرتا ہو لیکن دین کی بعض ضروریات کا اس طرح انکار کرے کہ اس کا نتیجہ پیغمبر اسلام کی رسالت کے انکار کی شکل میں برآمد ہو یا سیدھے سیدھے پیغمبر اکرمؐ کی رسالت ہی کو جھٹلادے یا دین اسلام میں نقص نکالے اور اس پر اعتراض درست سمجھے یا ہر وہ کام کرے یا ایسی بات کہے جس کا نتیجہ کفر ہو۔ کفر کی ان تمام صورتوں میں مرتد، جو پہلے مسلمان تھا اور کافر میں جو شروع سے ہی کافر رہا ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔

صاحب "جواہر الکلام" فرماتے ہیں :۔

"یتحقق الارتداد ..... بکل فعل دالٍ صریحاً علیٰ الاستهزاء بالدین والاستهانة به ......" (۱)

عظیم شیعہ فقیہ آیۃ اللہ محمد حسن نجفیؒ فرماتے ہیں :

ارتداد متعدد طریقوں سے ثابت ہو جاتا ہے۔ یہاں پر آپ چند طریقے شمار کرنے کے بعد فرماتے ہیں : کبھی ارتداد ہر اس کام کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے جس سے صاف طور پر دین اسلام کا مضحکہ اڑایا جائے یا اس کی اہانت ہوتی ہو۔

علامہ نسفی اپنی مشہور کتاب عقائد نسفی میں تحریر فرماتے ہیں : (۲)

"الاستهزاء علی الشریعة کفر لانّ ذٰلك من امارات التکذیب"

"دین کا مذاق اڑانا کفر ہے کیونکہ یہ بھی دین کو جھٹلانے کی نشانیوں میں سے ہے"

مذکورہ بالا دو تعریفوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "شیطانی آیات" کا مصنف سلمان رشدی دو جہتوں سے مرتد ہوا ہے۔ ایک یہ کہ پہلے وہ مسلمان تھا بعد میں اس نے عیسائیت کو اپنے دین کے عنوان سے منتخب کیا۔ اور دوسرے اس نے دین و وحی کا مذاق اڑایا ہے ان کی اہانت کی ہے اور اسلامی شریعت پر اعتراضات کئے ہیں گویا ایک جملہ میں یوں کہا جائے کہ وہ "دو آتشہ" مرتد ہے

۱۔ جواہر الکلام / ج ۴۱ / ص ۶۰۰ ۔ ۲۔ شرح عقائد نسفی / ص ۲۴۸ + المقنع کتاب المرتد

مرتد کی قسمیں

مرتد فطری و مرتد ملی : اگر کوئی شخص فطرت اسلام پر پیدا ہو (یعنی مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور اس کے ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک مسلمان ہوں) پھر وہ اس دین کو چھوڑ دے اور مرتد ہو جائے تو اسے مرتد فطری کہتے ہیں۔ اور اگر کافر گھرانہ میں پیدا ہوا اور مسلمان ہو کر پھر کافر ہو جائے تو اسے مرتد ملی کہتے ہیں۔

ان دونوں قسموں کے مرتد کی سزا تمام اسلامی مذاہب کی نگاہ میں قتل ہے۔ جیسا کہ تمام اسلامی مذاہب اس بات کے معتقد ہیں کہ اگر مرتد ملی توبہ کرے تو قانوناً اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور وہ قتل کی سزا سے بری ہو جائے گا، لیکن اگر مرتد فطری توبہ کرے تو مذہب امامیہ اور بعض دیگر مذاہب یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی توبہ قانوناً قبول نہیں ہوگی جبکہ بعض علماء اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی توبہ بھی قبول ہوگی جس کی وضاحت ہم اس فصل کے آخر میں کریں گے۔

فریقین کی روایات میں مرتد کا واجب القتل ہونا

(الف) امامیہ کی روایت : مرتد کے واجب القتل ہونے کے سلسلہ میں شیعوں کے یہاں بہت سی روایتیں موجود ہیں۔ ہم یہاں نمونہ کے طور پر اپنی معتبر کتابوں سے بعض روایتیں پیش کرتے ہیں :-

۱۔ "محمد بن مسلم . قال : سئلت اباجعفر (ع) عن المرتد ؟ قال: من رغب عن الاسلام وکفر بما انزل علی محمد (ص) بعد اسلامه فلا توبة له وقد وجب قتله وبانت منه امرأته ویقسم ما ترك علی ولده "(۱)

" امام محمد باقرؑ کے ایک صحابی محمد بن مسلم نقل کرتے ہیں کہ میں نے امامؑ سے

۱۔ وسائل الشیعہ / ج ۸ / ص ۵۴۴

مرتد کے حکم کے سلسلہ میں سوال کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا: (مرتد) وہ شخص ہے جو مسلمان ہونے کے بعد اسلام سے پھر جائے اور جو کچھ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا ہے اس سے انکار کر دے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہے، اس کا قتل واجب ہے اس کی زوجہ اس سے جدا ہو جائے اور اس کا مال و ترکہ وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔"

اس سے امامؑ کی مراد یہ تھی کہ مرتد کو ایک مردہ سمجھنا چاہیئے کہ جس کی بیوی اور مال و جائداد اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

۲۔ صحیحۃ علی بن جعفرؒ عن اخیہ ابی الحسن (ع) قال: سئلتہ عن مسلم تنصر؟ قال: یقتل ولا یستتاب "(۱)

امام جعفر صادقؑ کے صاحب زادے یعنی علی بن جعفرؒ نقل کرتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی امام موسیٰ کاظمؑ سے اس مسلمان سے متعلق حکم دریافت کیا جو عیسائی ہو گیا ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا: ایسا شخص قتل کر دیا جائے اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔"

۳۔ موثقۃ عمار ساباطی، قال، سمعت ابا عبداللہ (ع) یقول: کل مسلم بین مسلمین ارتد عن الاسلام وجحد محمداً نبوتہ، وکذبہ، فان دمہ مباح لمن سمع ذلک منہ .... وعلی الامام ان یقتلہ ولا یستتیبہ۔ "(۲)

"عمار ساباطی کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: مسلمانوں میں سے جو شخص بھی اسلام سے روگردانی کرے اور مرتد ہو جائے حضرت محمدؐ کی نبوت کا انکار کرے اور اسے جھٹلائے تو بلاشبہ ہر اس شخص کے لئے اس کا خون مباح ہے جو اس سے ارتداد کی باتیں سنے .... اور مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ اسے قتل کر دے۔ اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کرے۔"

۱-۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۵۴۵

۴۔ صحیحہ حسین بن سعید قال : قرأت بخط رجل الی ابی الحسن الرضاؑ
رجل ولد علی الاسلام ثم کفر واشرک وخرج عن الاسلام
ھل یستتاب ؟ او یقتل ولا یستتاب ؟ فکتب (ع) : یقتل"[1]
"حسین بن سعید نقل کرتے ہیں کہ میں نے ایک خط دیکھا جس میں ایک شخص نے امام رضاؑ کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک شخص مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کے بعد کافر و مشرک ہو کر اسلام سے خارج ہو گیا، کیا اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے؟ یا اس سے توبہ کا مطالبہ کئے بغیر قتل کر دیا جائے؟ حضرتؑ نے جواب میں تحریر فرمایا : قتل کر دیا جائے۔

۵۔ فضیل بن یسار عن الصادق (ع) : انّ رجلین من المسلمین
کانا بالکوفۃ فاتی رجلٌ امیر المومنینَ (ع) فشھد انہ راٰھما
یصلّیان للصنم فقال لہ : ویحک لعلّہ بعض من تشبّہ
علیك، فارسل رجلاً فنظر الیھما وھما یصلّیان الی الصنم
فاتی بھما فقال لھما : ارجعا فأبیا ، فخدّ لھما فی الارض
خدّاً فاجج ناراً فطرحھما فیہ ۔"[2]

"فضیل بن یسار امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا : ایک شخص نے امیر المومنین علیؑ کو خبر دی کہ میں نے دو کوفی مسلمانوں کو بتوں کا سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا : وائے ہو تجھ پر شاید تجھے شبہ ہوا ہے۔ (کیونکہ حضرت ایک شخص کی گواہی پر ارتداد کا حکم صادر نہیں کر سکتے تھے) اس کے بعد آپ نے ایک شخص کو (تحقیق کے لئے) بھیجا اور اس نے بھی ان دونوں کو بتوں کے آگے سجدہ ریز دیکھا۔ ان دونوں کو (گرفتار کر کے) حضرتؑ کی خدمت میں لے آیا۔ حضرت نے دونوں کو حکم دیا

۱۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۵۴۶ ۲۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۵۵۶

کہ (کفر سے) واپس پلٹ آؤ۔ (بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں مرتد ملی تھے اسی لئے حضرتؑ نے ان سے توبہ کا مطالبہ کیا)۔ لیکن ان دونوں نے انکار کیا، اس وقت حضرتؑ نے زمین میں ایک گڑھا تیار کیا، اس میں آگ روشن کی اور ان دونوں کو اس آگ میں ڈال دیا۔"

۶۔ "فضیل بن یسار عن ابی عبداللہ (ع): ان رجلاً من المسلمین تنصر فاتی بہ امیر المؤمنین (ع)، فاستتابہ فابیٰ علیہ، فقبض علیٰ شعرہ، ثم قال: طئوا یا عباد اللہ، فوطئوہ حتیٰ مات"۔ (۱)

"فضیل بن یسار امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مسلمانوں میں سے ایک شخص عیسائی ہوگیا۔ اسے امیر المومنینؑ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضرتؑ نے اس سے توبہ کرنے کو کہا لیکن اس نے انکار کیا، تو حضرتؑ نے اس کے بال پکڑ لئے اور فرمایا: اللہ کے بندو، اسے خوب مارو، تو لوگوں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ مرگیا۔"

ان دو آخری حدیثوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو مرتد کو جلد از جلد قتل کر ڈالنا چاہیئے۔

۷۔ "ابن عباس، عن النبی (ص): مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ"۔ (۲)

"ابن عباس" پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے دین (اسلام) کو تبدیل کیا اسے قتل کر ڈالو"

۸۔ "محمد بن مسلم، عن ابی جعفر (ع): مَنْ جَحَدَ نَبِیّاً مُرْسَلاً نُبُوَّتَہٗ فَکَذَّبَہٗ فَدَمُہٗ مُبَاحٌ"۔ (۳)

"محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: جو شخص کسی پیغمبر مرسلؐ

۱۔ وسائل الشیعہ / ج ۱۸ / ص ۵۴۵

۲-۳۔ مبسوط / ج ۷ / ص ۲۸۱

کی تکذیب کرے اور اس کا انکار کرے اس کا خون مباح ہے ۔"

۹ روی ان معاذاً قدم الیمن ابوموسیٰ الاشعری ، فقیل له :
ان یهودیاً اسلم ثم ارتد منه شهرین فقال : واللّٰه لا اجلست
(وفی بعضها لا انزلت) حتی یقتل قضی رسول اللّٰه بذلك
فقتل وعلیه اجماع الامة " (۱)

معاذ (صحابی پیغمبرؐ) یمن میں وارد ہوئے ۔ ابوموسیٰ اشعری بھی اس شہر میں موجود تھا ۔ لوگوں نے معاذ سے کہا کہ ایک یہودی جو مسلمان ہوا تھا گزشتہ دو ماہ سے دوبارہ مرتد ہوگیا ہے ۔ (معاذ) نے کہا ، خدا کی قسم میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا (اور بعض مقام پر سواری سے نہ اتروں گا) جب تک وہ قتل نہ ہوجائے ، کیونکہ رسول خداؐ نے یہ حکم صادر فرمادیا ہے ۔ اس کے بعد اسے قتل کیا اور اس بات پر تمام امت اسلام کا اتفاق واجماع ہے ۔"

۱۰ روی شیخاً تنصر فقال له علی (ع) : ارتددت ؟ فقال : نعم
فقال له : لعلك اردت ان تصیب مالاً ثم ترجع ؟ قال : لا ، قال :
لعلك ارتددت بسبب امرأة خطبتها فأبت علیك فاردت ان
تزوج بها ثم ترجع ؟ قال ، لا ، قال : فارجع ، قال لا حتی القی
المسیح ، فقتله " (۲)

روایت کی گئی ہے کہ ایک مسلمان عیسائی ہوگیا ۔ حضرت علیؑ نے اس سے دریافت فرمایا : کیا تو مرتد ہوگیا ہے ؟ کہا ، ہاں ۔ فرمایا ، شاید تمہارا یہ ارادہ ہے کہ ارتداد کے ذریعہ مال و دولت اکٹھا کرو پھر اسلام کی طرف پلٹ آؤ ؟ اس نے کہا نہیں ۔ فرمایا : شاید تم کسی عورت سے شادی کرنے گئے اور اس نے مسلمان ہونے کی وجہ سے تمہیں قبول نہیں کیا اب تم مرتد ہوگئے ہو تاکہ اس سے شادی کرو پھر اسلام کی طرف پلٹ آو ؟ اس نے کہا نہیں ۔ فرمایا پھر اسلام کی طرف پلٹ آؤ ۔ اس نے جواب دیا : نہیں پلٹوں گا یہاں تک کہ مسیحؑ (عیسیٰ) سے

۱ ، ۲ ۔ مبسوط / ج ۷ / ص ۲۸۱

ملاقات کروں۔ پس حضرتؑ نے اسے قتل کر دیا۔

(ب) اہل سنت کے روایات

۱۔ "عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ (ص): من بدل دینہ فاقتلوہ"(۱)

"ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اپنے دین (اسلام) سے روگردانی کرے اسے قتل کر دو"

۲۔ "عن ابی امامۃ بن سہل ان عثمان اشرف یوم الدار فقال: انشدکم باللہ اتعلمون ان رسول اللہ قال: لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدی ثلاث: زنا بعد احصان او ارتداد بعد اسلام او قتل نفس بغیر حق یقتل بہ" (۲)

ابی امامہ کہتے ہیں کہ عثمان نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: مسلمان کا خون تین چیزوں کے ذریعہ حلال و مباح ہوتا ہے: ایک وہ شخص جو زنائے محصنہ (یعنی شادی شدہ عورت سے زنا) کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ شخص جو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے اور تیسرا وہ شخص جس نے کسی کا ناحق خون بہایا ہو (۳)

۳۔ "قال رسول اللہ (ص): لا یحل دم رجل یشهد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا احد ثلاث نفر: النفس بالنفس والثیب الزانی والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ

۱۔ ابن ماجہ / ج ۲ / ص ۸۴۸، سنن دار قطنی / ج ۳ / ص ۱۱۳

۲۔ مستدرک حاکم / ج ۴ / ص ۳۵۰، کتاب الحدود۔ سنن دارمی تالیف: تالیف عبداللہ بن عبد الرحمن دارمی شیخ الامام مسلم و ابی داؤد الترمذی ج ۲ / ص ۱۷۱۔ الامام الشافعی / ج ۱ / ص ۲۵۷

۳۔ ان احادیث سے ملتی جلتی حدیثیں سنن دار قطنی / ج ۲ و صحیح مسلم / ج ۳ کتاب الحدود وغیرہ میں بھی نقل ہوئی ہیں۔

"پیغمبر اکرم نے فرمایا: کسی بھی مسلمان کا خون جو کلمہ شہادتین زبان پر جاری کرتا ہو حلال نہیں ہے مگر یہ کہ وہ تین افراد میں سے ایک ہو: کسی شخص کا قاتل، زنا محصنہ کرنے والا، اور جو اپنے دین (اسلام) کو ترک کر دے اور مسلمانوں کی جماعت سے دوری اختیار کرے۔" (۱)

۴ و ۵ ۔ مذکورہ شیعہ طریقوں سے نقل ہونے والی ساتویں اور نویں حدیثیں، اہل سنت کے طرق اور واسطوں سے بھی نقل ہوئی ہیں ۔ (۲)

۶۔ "قَالَ النَّبِی (ص) لمعاذ، حین بعثہ الی الیمن: ایما رجل ارتد عن الاسلام فادعہ فَان تابَ فاقبل منہ وَانْ لم یتب فاضرب عنقہ" (۳)

"پیغمبر اکرم نے معاذ کو یمن روانہ کرتے ہوئے فرمایا: جو شخص بھی اسلام سے پھر جائے اسے دوبارہ اسلام کی دعوت دو۔ اگر اس نے توبہ کی تو اس کی توبہ قبول کرلو اور اگر توبہ نہ کی تو اس کی گردن اڑا دو۔"

مذاہب خمسہ کے ائمہ اور عظیم فقہا کی نگاہ میں مرتد کا واجب القتل ہونا

(الف) فقہائے امامیہ کے فتوے

چونکہ اس موضوع کے تحت بہت سی روایتیں موجود ہیں جن میں مرتد کا واجب القتل ہونا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لہٰذا عمومی طور سے علماء شیعہ نے مرتد کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا ہے اور کوئی فقیہ اس مسئلہ میں مخالف نظریہ نہیں رکھتا، بلکہ مرتد فطری کے سلسلہ میں تو حتیٰ

۱۔ سنن دارمی / ج ۲ / ص ۱۷۲۔

۲۔ مغنی ابن قدامہ / ج ۱۰ / ص ۷۶

۳۔ الفقہ علی المذاہب الأربعہ / ج ۵ / ص ۴۲۶

اگر وہ توبہ کا اظہار بھی کرے تو قانونی نقطۂ نظر سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور حکم خدا بہر حال جاری ہوگا۔ اگرچہ اس نے واقعی توبہ کیوں نہ کی ہو اس صورت میں قیامت کے دن خدا کی بارگاہ سے لطف و کرم کا مستحق ہوگا۔ (لیکن یہاں حکم خدا اس پر جاری ہو کر رہے گا۔)

آیۃ اللہ شیخ محمد حسن نجفی جو صاحب جواہر کے لقب سے مشہور اور شیعوں کے عظیم فقیہ ہیں کتاب "شرائع الاسلام" کی عبارت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"وَالْمُرْتَدُّ عَنْ فِطْرَةٍ لَايُقْبَلُ اِسْلَامُهُ لَوْتَابَ وَرَجَعَ اِلَى الْاِسْلَامِ وَيَتَحَتَّمُ قَتْلُهُ۔۔۔ بلاخلاف معتدبه اجده فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْاَحْكَامِ الْمَذْكُورَةِ بَلِ الْاِجْمَاعُ بِقِسْمَيْهِ عَلَيْهَا"[1]

"مرتد فطری نے اگر توبہ کی ہو اور اسلام کی طرف پلٹ بھی آیا ہو تب بھی اس کی توبہ قبول نہ ہوگی اور اسکا قتل حتمی و یقینی ہے ۔۔۔ اور میں نے اس مسئلہ میں کسی ایک کو نہیں دیکھا جو اس کے مخالف نظریہ رکھتا ہو۔ چاہے اس کے واجب القتل ہونے کے سلسلہ میں یا اس کی توبہ قبول نہ ہونے کے سلسلہ میں، بلکہ تمام علماء شیعہ منزل فتویٰ اور منزل عمل دونوں میں اس مسئلہ پر اتفاق و اجماع رکھتے ہیں۔"

جلیل القدر فقیہ شیخ طوسی کہ ایک ہزار سال سے فقہاء شیعہ ان کے خوان کرم سے استفادہ کرتے آرہے ہیں، اپنی فقہی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اِذَا ارْتَدَّ الْمُسْلِمُ عَنِ الْاِسْلَامِ اِلَى اَيِّ كُفْرٍ۔۔۔ لَمْ يُقَرَّ عَلَى دِيْنِهِ بَلْ يَجِبُ قَتْلُهُ۔۔۔ فَاِنْ كَانَ عَنْ فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ قَتَلْنَاهُ عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَاِنْ لَمْ يَكُنْ كَذٰلِكَ اسْتَتَبْنَاهُ" (۲)

اگر کوئی مسلمان مرتد و کافر ہو جائے ۔۔۔ تو اسے اس کے نئے دین پر چھوڑ نہیں دیا جائے گا بلکہ اس کا قتل واجب ہے ۔۔۔ پس اگر وہ مرتد فطری ہوگا تو اسے ہر حال میں قتل کر دیں گے اور اگر مرتد فطری نہ ہو تو پہلے اس سے توبہ کا مطالبہ کریں گے (اور اگر

۱۔ جواہر الکلام / ج ۴۱ / ص ۶۰۵ ۲۔ مبسوط / ج ۸ /

قبول نہ کرے تو قتل کردیں گے) ۔

شہید ثانی فرماتے ہیں :۔

"وھذا الحکم (لزوم القتل وعدم قبول توبۃ الفطری) بحسب الظاھر لا اشکال فیہ بمعنی تعین قتلہ"(۱)

"مرتد فطری کی توبہ قبول نہ کرنا اسلام کا مسلم ظاہری و قانونی حکم ہے اور بلاشبہ اس کا قتل واجب ہے ۔ (اگرچہ حقیقت میں شاید خدا کے نزدیک اس کی دعا قبول ہو جائے)

امام خمینی قدس سرہ فرماتے ہیں :

"فالفطری لا یقبل اسلامہ ظاھراً و یقتل ان کان رجلاً"(۲)

"مرتد فطری کی توبہ اور اسلام کی طرف اس کی بازگشت ظاہری و قانونی طور پر قبول نہیں ہوگی اور اگر وہ مرد ہوگا تو قتل کر دیا جائے گا ۔

(ب) حنفی فقہا کے نظریے(۳)

حنفیوں کی فقہی کتابوں میں مرتد کے واجب القتل ہونے کا نظریہ کبھی حنفی مذہب کے فتوے کے عنوان سے اور کبھی خود امام ابوحنیفہ کے نقطۂ نظر کے عنوان سے ذکر ہوا ہے ۔ جیسا کہ شیعوں کی فقہی کتابوں میں بھی یہ نظریہ نقل ہوا ہے ۔ کتاب شرح الوقایہ کے مؤلف مولوی حافظ محمد عبدالحیٔ لکھنوی فرنگی اس سلسلہ میں یوں رقم طراز ہیں :۔

"واذا ارتد المسلم عن الاسلام والعیاذ باللہ عرض علیہ الاسلام فان کانت لشبھۃ کشفت عنہ لانہ عساہ اعترتہ شبھۃ فتزاح وفیہ دفع شرہ باحسن الامرین الا ان

۱۔ مسالک / ج ۲ / ص ۴۵۱ ۲۔ تحریر الوسیلہ / ج ۲ / ص ۴۹۴

۳۔ یہاں یہ یاد آوری ضروری ہے کہ ہم نے مختلف مذاہب کے نظریات تاریخی اعتبار سے ان کی قدامت کا ترتیب کے مطابق نقل کئے ہیں ۔

العرض على ما قالوا غير واجب لان الدعوة بلغته و يحبس ثلاثة ايام فان اسلم و الا قتل . وفي الجامع الصغير : المرتد يعرض عليه الاسلام حرا كان او عبدا فان ابى قتل ..."[1]

"جب کوئی مسلمان (معاذاللہ) اسلام سے دوری اختیار کرے تو اسلام اس پر پیش کیا جائے گا۔ پس اگر اس کا ارتداد کسی شبہ کی وجہ سے ہو تو اس کا شبہ دور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی سوال یا اعتراض اس کے ذہن میں پیدا ہوا ہو جس کا جواب دے کر اس کے ارتداد کی مشکل کو بہترین طور پر حل کیا جا سکتا ہو مرتد کے شر کو اسے قتل کرنے کے بجائے اس کا شبہ ختم کر کے دور کیا جانا بہتر ہے مگر یہ کہ فقہاء کے قول کے مطابق شبہ کا دور کرنا ہم واجب نہ جانیں، کیونکہ اسلام کی دعوت اس تک پہنچ چکی ہے۔ مرتد کو ہر حال میں تین روز تک قید رکھنا چاہیے اگر وہ اس مدت میں اسلام نہ لایا تو قتل کر دیا جائے گا۔ کتاب "جامع الصغیر" میں ہے کہ: مرتد پر اسلام پیش کیا جائے گا (چاہے وہ آزاد ہو یا غلام) پس اگر اس نے دوبارہ اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو قتل کر دیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کے نظریے

"وعن ابي حنيفة و ابي يوسف انه يستحب ان يؤجله ثلثة ايام طلب ذلك او لم يطلب ....."[2]

"امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف سے نقل ہے کہ: مستحب ہے کہ مرتد کو تین روز کی مہلت دی جائے، چاہے وہ یہ مہلت طلب کرے یا نہ کرے۔"

شیخ طوسی اپنی کتاب "الخلاف" میں جو مذاہب خمسہ کے فتوؤں کا مجموعہ ہے، امام ابوحنیفہ

۱۔ کتاب شرح الوقایہ مع حاشیہ عمدۃ الرعایۃ / ص ۳۸۳ و کنز الدقائق / ج ۱ / ص ۱۲۳

۲۔ شرح الوقایہ / ص ۳۸۳

سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ مرتد فطری سے توبہ کا مطالبہ کرنا مستحب جانتے ہیں، اس جہت سے کہ توبہ طلب کئے بغیر بھی مرتد فطری کو قتل کیا جا سکتا ہے:

مسئلة: ان الاستتابة واجبة فيمن شرط الاستتابة، وللشافعي فِيهِ قَوْلَانِ أَحَدُهُمَا مِثْلُ مَا قُلْنَاهُ وَالثَّانِي مُسْتَحَبَّةٌ وَبِهِ قَالَ أَبُو حَنِيفَةَ " (۱)

"توبہ طلب کرنا اس کے سلسلہ میں واجب ہے جس کے لئے طلب توبہ شرط ہے۔ شافعی کے یہاں اس میں دو قول ہیں ایک تو وہی جو ہم کہہ چکے ہیں اور دوسرے یہ کہ مرتد فطری سے بھی طلب توبہ مستحب ہے اور یہی ابوحنیفہ کا قول ہے۔"

(ج) امام شافعی کی نگاہ میں مرتد کا واجب القتل ہونا

امام شافعی مرتد کے قتل کے وجوب سے متعلق روایات کا ذکر کرتے ہوئے اپنا فتوی کتاب "الام" میں بیان کرتے ہیں:

"قال الشافعي اخبرنا الثقة من اصحابنا عن احمد بن يحيى بن سعيد، عن ابي امامة بن سهل بن حنيف، عن عثمان بن عفان انّ رسولَ الله (ص) قال: لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ، كُفْرٌ بَعْدَ إِيمَانٍ اوزنا بَعْدَ إِحْصَانٍ أَوْ قَتْلُ نَفْسٍ بِغَيْرِ نَفْسٍ " (۲)

"امام شافعی کہتے ہیں... رسول خدا نے فرمایا: مسلمان کا خون بہانا حلال نہیں ہے مگر ان تین موارد میں سے کسی ایک میں۔ پہلے یہ کہ ایمان کے بعد کفر اختیار کرے...

قَالَ الشافعي: اخبرنا مالك بن انس، عَنْ زيد بن اسلم، انّ رسول الله قَالَ: مَنْ غَيَّرَ دِينَهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ " (۳)

۱۔ الخلاف، شیخ طوسی / ج ۳ / ص ۱۴۵ ۲-۳۔ الام، امام محمد شافعی

"شافعی کہتے ہیں کہ : پیغمبر اکرم ص نے فرمایا : جو شخص اپنے دین (اسلام) کو تبدیل کرے اس کی گردن اڑادو"

قَالَ الامام الشافعی : اذا قُتِلَ المُرتَدُّ وَالمُرتَدَّةُ فَامَوالُهُمَا فَیءٌ لَایَرِثُهُمَا مُسلِمٌ وَلَا ذِمِّیٌّ "،

جب بھی کوئی مرتد مرد یا عورت قتل ہو تو اس کا مال و اسباب فیء یعنی غنیمت یا خراج قرار دیا جائے گا اور کوئی مسلمان یا کافر ذمی اس کا وارث نہ ہوگا۔

قَالَ الشافعی : وَمَن انتقل عن الشرك الی الإیمان ثم انتقل عَنَ الایمان الی الشرك من بالغی الرِّجال وَالنِّساء اُستُتِیبَ فَاِن تَابَ قُبِلَ مِنه وَاِن لَم یَتُب قُتِلَ "(۱)

امام شافعی کا قول ہے : اگر کوئی شخص شرک سے ایمان کی طرف آئے اور ایمان سے پھر شرک کی طرف پلٹ جائے اور بالغ بھی ہو چاہے مرد ہو یا عورت اس سے توبہ کرنے کو کہا جائے۔ اگر وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کرلی جائے گی لیکن اگر اس نے توبہ نہ کی تو قتل کردیا جائے گا۔

یہاں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ جس مورد میں امام شافعی نے توبہ کو قابل قبول جانا ہے وہ "مرتد ملی" کا معاملہ ہے جو ابتدائی طور پر مشرک ہوتا ہے نہ کہ اصلاً اور فطرتاً مسلمان جیسے سلمان رشدی"۔

ابن قدامہ اپنی کتاب المغنی میں اور شیخ طوسی اپنی کتاب الخلاف میں امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے مرتد فطری کی توبہ قبول کرنے کے سلسلہ میں دو فتوے دیئے ہیں:-

۱۔ توبہ کا مطالبہ کرنا واجب ہے اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردیا جائے۔

۲۔ اس سے توبہ کا مطالبہ مستحب ہے اس معنی میں کہ اسے توبہ کا مطالبہ کئے بغیر بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔(۲)

۱۔ الأم ، امام محمد شافعی۔ ۲۔ خلاف ، شیخ طوسی ، ۵ / ۳ / ص ۱۴۵

"وَرُوِیَ عن احمد روایۃ اُخریٰ انّہٗ لا تجب استتابتہ لکن تستحبُّ وھٰذا القولُ الثانی للشافعی" (۱)

اس سے توبہ کا مطالبہ کرنا واجب نہیں ہے لیکن مستحب ہے اور یہ دوسرا قول شافعی کا ہے۔

(د) امام مالک اور مالکی فقہا کے فتوے

۱۔ حَدَّثنا یحییٰ عَن مالِك، عن زید بن اسلم، انَّ رسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ غیّرَ دِینَہٗ فَاضْرِبُوا عُنُقَہٗ " (۲)

"جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کی گردن اڑا دو"

امام مالک اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں:

"وَمعنیٰ قَولُ النبیِّ ﷺ فیما نریٰ (واللہ اعلم) من غیّر دینہ فاضربوا عنقہ، انّہ مَن خرج من الاسلام الیٰ غیرہ مثل الزنادقہ واشباھھم فانّ اُولٰئك اذا ظُھِرَ علیھم قتلوا ولم یستتابوا لانّہٗ لا تعرف توبتھم وانّھم کانوا یسرّون الکفر ویعلنون الاسلام فلا اریٰ ان یستتاب ھٰولاء ولا یقبل منھم قولھم و...."

جو شخص اسلام سے خارج ہو جائے مثلاً دہریے وغیرہ تو جب بھی ان تک رسائی حاصل ہو انھیں قتل کر دیا جانا چاہیئے اور قتل سے پہلے ان سے توبہ کا مطالبہ کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ان کی توبہ قبول نہیں ہے بلا شبہ یہ ایسے افراد ہیں جو اپنے کفر کو پوشیدہ رکھتے اور اسلام کا اظہار کرتے ہیں اس بنا پر ان سے توبہ طلب کرنا ضروری نہیں ہے ..... نیز ان کی بات بھی تسلیم

۱۔ المغنی، ابن قدامہ / ج ۱۰ / ص ۷۶ ۲۔ موطأ ابن مالک / ج ۲ / ص ۷۶۳

نہیں کی جائے گی۔"

۲۔ ابن رشد اپنی کتاب "البیان والتحصیل" میں امام مالک کا نظریہ یوں نقل کرتے ہیں:

"جو شخص بھی رسول خدا کو دشنام دے، بلاشبہ اس کا قتل واجب ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔"(۱)

۳۔ عبدالرحمٰن جزیری اپنی کتاب "الفقہ علی المذاھب الاربعۃ" میں مرتد کے قتل کے سلسلہ میں اہل سنت کے چاروں مذاہب کا نظریہ یوں نقل کرتے ہیں:

"ویجب قتل الزندیق بعد الاطلاع علیه بلا توبة منه"(۲)

"دہریہ کو اس کے کفر کی اطلاع پانے کے بعد اس سے توبہ کا تقاضا کئے بغیر قتل کردینا واجب ہے۔

۴۔ شمس الدین شیخ محمد عرفہ دسوقی، کتاب شرح کبیر تالیف سیدی احمد دردیر کے متن پر اپنے حاشیہ کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں: پیغمبر اکرمؐ کی شان میں گالی اور ناروا باتیں کہنا کفر و ارتداد کا موجب ہے اور مرتد و کافر کا حکم قتل ہے۔

"وَاِنْ سَبَّ مُكَلَّفٌ نَبِيًّا..... قتل وَلَمْ يُسْتَتَبْ اى بلا طلب او بلا قبول توبة منه حداً ان تاب والا قتل كفراً"(۳)

"یعنی اگر ایک بالغ انسان پیغمبر اکرمؐ کی شان میں ناسزا باتیں کہے تو اسے قتل کردینا چاہیئے۔ اس سے توبہ طلب نہ کی جائے یعنی اول یہ کہ اس سے توبہ کرنے کو نہ کہا جائے یا اگر وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔ چنانچہ اگر اس نے توبہ کرلی تو پہلے جرم کی حد اجراء کرنے کے عنوان سے قتل کیا جائے گا اور اگر توبہ نہ کی تو کفر (اور سبّ النبیؐ سے پیدا ہونے والے ارتداد) کے جرم میں قتل

۱۔ البیان والتحصیل / ج ۱۶ / ص ۱۴۳

۲۔ الفقہ علی المذاھب الاربعۃ / ج ۵ / ص ۴۲۸

۳۔ حاشیہ دسوقی بر شرح کبیر / ج ۲ / ص ۳۰۹

کیا جائے گا۔

(ھ) امام احمد بن حنبل اور حنبلی فقہا کے فتوے:

۱۔ فتاوای امام احمد بن حنبل کے شارح ابن قدامہ مقدسی اپنی کتاب "المقنع" میں لکھتے ہیں۔

حکم المرتد وهو الذی یکفر بعد الاسلام فمن اشرك بالله او جحد نبیاً او کتاباً من کتب الله تعالیٰ او شیئاً منه او سب الله تعالیٰ او رسوله کفر، فمن ارتد عن الاسلام من الرجال والنساء وهو بالغ عاقل دعی الیه ثلاثة ایام وضیق علیه فان لم یتب قتل، وعنه لا تجب استتابة بل تستحب ویجوز قتله فی الحال ویقتل بالسیف ولا یقتله الا الامام او نائبه۔ (۱)

"مرتد وہ ہے جو مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جائے بنا برایں اگر کوئی خدا کے لئے شریک ہونے کا قائل ہو یا اس کی ربوبیت، وحدانیت یا خدا کے اور دوسرے صفات سے انکار کرے یا خدا کا کسی کو ہمسر یا فرزند قرار دے یا کسی پیغمبر کا انکار کرے یا آسمانی کتاب یا اس کے کسی حصہ کا منکر ہو جائے یا خدا اور اس کے رسول کی شان میں نازیبا الفاظ منہ سے نکالے تو وہ کافر ہے۔

عاقل و بالغ مرتد کو دوبارہ اسلام کی دعوت دی جائے گی اور اسے تین روز کی مہلت دی جائے گی۔ اور اس پر سختی کی جائے گی تاکہ توبہ کرلے۔ اگر اس نے توبہ نہ کی تو قتل کر دیا جائے گا، اور امام احمد بن حنبل سے نقل ہے کہ اس سے توبہ طلب کرنا لازم نہیں ہے بلکہ مستحب ہے لہٰذا اسی حالت میں (یعنی توبہ طلب کرنے سے پہلے یا توبہ کرنے کے بعد بھی) اسے قتل کرنا جائز ہے۔ اور اس کا قتل تلوار کے ذریعہ اور فقط امام یا اس کے نائب کے حکم سے انجام پانا چاہیئے۔"

۱۔ المقنع

یہاں اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ امام احمد بن حنبل اور ابن قدامہ نبیؐ کی شان میں بدکلامی کو بھی ارتداد کا موجب جانتے ہیں ، لہذا مرتد کا حکم پیغمبر کی شان میں بدکلامی کرنے والے پر بھی لاگو ہوگا اور سلمان رشدی دونوں جہتوں سے موت اور قتل کی سزا کا مستحق ہے ۔

کیا مرتد فطری کی توبہ قابل قبول ہے ؟

فریقین کی تمام مذکورہ روایات اور مذاہب خمسہ کے نقل شدہ فتووں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس سلسلہ میں فقہا کے نظریے مختلف ہیں ۔ البتہ مرتد ملی یعنی جو بنیادی طور پر کافر گھرانے میں پیدا ہوا اور مسلمان ہونے کے بعد کافر ہوگیا ۔ اس سلسلہ میں مذاہب خمسہ کے تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ اس سے توبہ کرنے کو کہا جائے گا اگر اس نے توبہ کرلی تو قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر توبہ نہ کی تو قتل کردیا جائے گا صرف ایک " حسن بصری " ہیں جو اس سلسلہ میں مرتد ملی کی توبہ کو بھی اہمیت نہیں دیتے اور اس کے قتل کو واجب جانتے ہیں ۔

" وقال الحسن البصری المرتد یقتل بغیر استتابۃ " (۱)

لیکن مرتد فطری کے بارے میں فقہا کا ایک گروہ اس کا معتقد ہے کہ اسے بہرحال قتل کیا جانا چاہیئے اور اس سے توبہ کا مطالبہ کرنا بھی ضروری نہیں ہے ۔ بلکہ اگر اس نے توبہ کر بھی لی تو بھی ظاہری و قانونی حکم کے تحت اسے تسلیم نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کا قتل واجب ہے ۔ کیونکہ جس طرح ایک قاتل کی سزا قتل ہے کہ یہ سزا اس پر جاری ہوگی چاہے اس نے توبہ کرلی ہو یوں ہی ارتداد کی سزا بھی قتل ہے چاہے وہ توبہ کرلے اور یہ حکم اس پر جاری ہوکر رہے گا ۔ البتہ اس کی واقعی توبہ خداوند عالم کی بارگاہ میں اس کے ارتداد کے گناہ کی بخشش کے لئے زمین ہموار کرے گی تاکہ عذاب آخرت اس پر سے اٹھالیا جائے ۔

اور بعض وہ فقہا جنھوں نے توبہ کے مطالبہ کا مسئلہ اٹھایا ہے اس سے ان کی مراد " مرتد ملی " ہے جیسے امام شافعی کا فتویٰ جسے ہم نقل کرچکے ہیں ۔

اور جن فقہا نے مرتد فطری کے سلسلہ میں توبہ طلب کرنے کی بات کہی ہے وہ بھی اسے مستحب

۱۔ الخلاف از شیخ طوسی / ج ۳ / ص ۱۴۵

جاتے ہیں مثلاً امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل [1] اور وہ بھی اس معنی میں کہ اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کرنا جائز ہے بلکہ فوراً حکم خدا کا اجراء کرنا چاہیئے ۔

اور فقہاء کا وہ گروہ جو مرتد فطری کے قتل کے سلسلہ میں توبہ طلب کرنے کو شرط جانتا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول کرلی جائے گی اور اس کے لئے تین روز کی مہلت یا اتنی مدت کو کہ اسے توبہ واستغفار کا موقع فراہم ہو جائے، مہلت کے عنوان سے معین کرتا ہے، اس گروہ کی نگاہ میں بھی اگر یہ مدت تمام ہو جائے اور وہ توبہ نہ کرے تو مسلّم طور پر واجب القتل ہوگا

بنابرایں "سلمان رشدی" جو مرتد فطری ہے، مذاہب خمسہ کے تمام فقہا کے فتوؤں کے مطابق حتیٰ محتاط ترین فتوؤں کی روشنی میں بھی قتل کا مستحق ہے اور چونکہ تین روز کے بعد کی توبہ کسی بھی فقیہ کی نگاہ میں حد کے ساقط ہونے کے لئے قانونی اعتبار نہیں رکھتی لہٰذا اگر "سلمان رشدی" اب توبہ کرے اور "زاہد وقت بن جائے پھر بھی شرعی طور سے اس پر قتل کا حکم نافذ ہے ۔

آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والی مغربی جمہوریت کے برخلاف اسلام میں مرتد کے قتل کا حکم کیوں؟

اسلام کے اس قاطع ومحکم دستور العمل کے ساتھ مغرب کی بے قید وشرط آزادی اور بے لگام جمہوریت کے میل نہ کھانے کا راز شاید یہ ہے کہ اسلام اگرچہ عقائد وافکار اور تبادل خیالات کی آزادی کا دفاع کرتا ہے اور بہترین افکار وخیالات کے انتخاب کو مختلف افکار کی چھان بین اور مختلف دعوتوں اور اقوال کے سننے کا نتیجہ قرار دیتا ہے :۔

"فَبَشِّرۡ عِبَادِ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ" [2]

اے رسول! میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو باتیں سنتے ہیں اور ان میں اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں ۔

لیکن چونکہ ارتداد اور دین سے خارج ہونے کی راہ کے کھلا چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جھوٹے

۱۔ التشریع الجنائی الاسلامی / ج ۲ / ص ۷۲۲ ۲۔ سورہ زمر / ۱۸

عقائد اور پُر فریب مکاتب فکر کی تبلیغ کرنے والے فریب کا شکار ہوکر ذہن کے نوجوانوں کو اپنی طرف جذب کرنے اور دبستان منطق و استدلال (اسلام) کے لطیف مکتب افراد کو استعمار کے قوی مراکز کی طرف کھینچ لے جانے میں کامیاب ہوجاتے، لہٰذا ضروری تھا کہ اس قانون (قتل مرتد) کے ذریعہ وہ بھی ہر ممکن صورت میں سختی کے ساتھ معاشرہ کی نئی نسل کی گمراہی کی راہ میں ایک بند باندھ دیا جائے چنانچہ اسلام اسلامی علوم و معارف سے بھرپور آگاہی کے بعد اس کی ہر کتاب اور ہر مکتب فکر کا جائزہ لینے اور اس پر تحقیق کرنے کے امکانات فراہم کرتا ہے۔ آخر آزادی اور جمہوریت کے نام پر معاشرہ کی نئی نسل کو اس امید پر ثقافت و تمدن کے استعماری شکاریوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ دیا جائے کہ جب ان کے ذہنوں کی اچھی طرح دھلائی ہوجائے گی اور ان کی ساخت بن جائے گی تو ہم ان کو اسلام کی طرف پلٹا لائیں گے؟ جس چرواہے کو بھیڑ بکریوں کی دیکھ بھال اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، کیا اسے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ بھیڑوں کے بچوں کو خونخوار بھیڑیے کے حملہ کے وقت اس امید پر آزاد چھوڑ دے کہ جب وہ پکڑا جائے گا تو ان بچوں کو صحیح سالم واپس لوٹا دے گا؟

نتیجتاً ایک ملک میں ایک یا چند مرتد کا قتل لاکھوں کروڑوں انسانوں کی فکری سلامتی اور تحفظ کا سبب بنتا ہے اور اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بظاہر انسان دوست، سادہ لوح افراد اور ماں سے زیادہ مہربان دایائیں ایک یا چند مرتد افراد کے قتل پر پابندی لگا کر پوری ملت کو مشرقی و مغربی استعماری تہذیبوں کے دامن میں گمراہی، بدبختی اور انحطاط کے خطرات سے دوچار کیے ہوئے ہیں اور اپنی اس خدمت و انسان دوستی پر خوش ہیں!!!

فرض کرلیں کہ ایک فرد کی مصلحت اس کی آزادی میں ہے، لیکن اگر اس کی انفرادی آزادی کا انجام معاشرہ میں بہت بڑے فساد کی شکل میں برآمد ہو اور ایک مرتد شخص کی آزادی کا نتیجہ رفتہ رفتہ بہت سارے نوجوانوں اور کم پڑھے لکھے افراد کی گمراہی کی صورت میں ظاہر ہو تو یہی وہ منزل ہے جہاں ایک فرد کی آزادی پر پابندی لگنا چاہیئے اور معاشرہ کی مصلحت کو فرد پر مقدم ہونا چاہیئے۔ بالکل یوں ہی جس طرح اگر موت کے سوداگر بازاروں میں ہیروئن کو عام کرنا چاہیں تو مسلّم طور پر معاشرہ کی مصلحت کے لئے ان کی آزادی پر پابندی لگا دی جاتی

چاہیئے، ورنہ ایسے موقعوں پر مغربی جمہوریت اور انسانی حقوق کے دفاع کا دعویٰ کرنے والوں کی آوازوں پر کان دھرنے کا نتیجہ استعمار کی آرزوؤں کے مطابق معاشرہ کی تباہی کے سوا اور کچھ برآمد نہ ہوگا۔

۲۔ نبیؐ پر دشنام کی سزا اسلامی نقطۂ نگاہ سے

تمام اسلامی مذاہب کی فقہ کے تسلیم شدہ قوانین میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ جو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ کی شان میں گستاخی کرے، ان پر سب و شتم کرے اور ان کے لئے اہانت آمیز بات کہے اس کی سزا لازمی ہے۔ جو شخص تاریخ کے سب سے زیادہ پاک و پاکیزہ، مہربان اور دردمند مصلح کی شان میں بے جھجک گستاخی کرے وہ ذات گرامی جس نے اپنا پورا وجود انسانیت کی خدمت اور اس کی ہدایت پر وقف کر رکھا تھا اس کا مضحکہ اڑائے اور اس کی اہانت کرے، عالم انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ شخصیت کو مجروح کر کے انسانی معاشرہ کو اس کے رہبر اور خضر راہ سے محروم کرے، اس کی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی دین اور مکتب فکر پر ضرب لگانے کی سب سے زبردست اور مؤثر ترین راہ یہ ہے کہ اس کے پیامبر اور رہبر کی شخصیت کو مجروح کیا جائے چنانچہ اس بار استعمار کا نوکر "سلمان رشدی" اس راہ سے میدان میں آیا ہے۔

اسلامی امت کے رہبر کی شخصیت کے تحفظ کی ضرورت کے پیش نظر ہی خداوند عالم نے قرآن کریم میں پیغمبر اکرمؐ کو معمولی سے معمولی اذیت و آزار پہنچانے کو بھی "کفر" کا موجب اور اہانت کرنے والے کو "ملعون اور رحمت خدا سے دور" اور "دنیا و آخرت کے عذاب" کا مستحق قرار دیا ہے۔

۱۔ وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱)

۱۔ سورہ توبہ / ۶۱

"بعض افراد (منافقین) رسول اکرمؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کان ہے یعنی بہت سادہ ہے (اور بڑی دلچسپی کے ساتھ ہماری تمام باتیں سنتا ہے) لہٰذا (اے پیغمبرؐ) آپ کہہ دیں کہ کان کا سادہ ہونا تمہارے لئے بہتر ہے۔ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اس کا ایمان مومنین کے حق میں ہے اور ان کے لئے رحمت ہے۔
اور جو لوگ رسول خداؐ کو آزار پہنچاتے ہیں دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔"

۲۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا" (۱)

"یقیناً جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو آزار پہنچاتے ہیں خداوند عالم نے دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کی ہے (اور اپنی دنیوی و اخروی رحمت سے انھیں دور کردیا ہے) اور ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ان کے لئے فراہم کیا ہے۔"

۳۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَا آیَاتٍ بَیِّنَاتٍ وَلِلْکَافِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ" (۲)

"درحقیقت جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ سے سختی و دشمنی کا اظہار کرتے ہیں وہ اپنے ہی جیسے گزشتہ لوگوں کی طرح (جہنم کی آگ میں) گر پڑے۔ جبکہ ہم نے اپنی واضح نشانیاں نازل کردی ہیں اور کافروں کے لئے تو دردناک عذاب ہوگا۔"

قارئین کرام! آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ خداوند عالم نے رسول خداؐ کے ساتھ تلخ کلامی اور سختی کے اظہار کو بھی کفر کے برابر شمار کیا ہے۔

رسول گرامیؐ کی شخصیت اور ان کی عزت و حرمت کی حفاظت اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ خداوند عالم نے حتیٰ (راہ چلتے وقت) پیغمبرؐ سے آگے بڑھ جانے اور ان سے بلند آواز میں گفتگو کرنے کو بھی بے ادبی شمار کیا اور اس سے روکا ہے:۔

۴۔ "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

۱۔ سورۂ احزاب / ۵۷ ۲۔ سورۂ مجادلہ / ۵

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ - یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ " (۱)

" اے ایمان لانے والو (کسی بھی کام میں) خدا اور اس کے رسولؐ پر سبقت اختیار نہ کرو اور خدا سے ڈرو (نافرمانی نہ کرو) کہ خداوند عالم (تمہاری باتوں کو) سننے والا اور (تمہارے اعمال کو) دیکھنے والا ہے ۔ اے مومنین اپنی آوازیں پیغمبرؐ کی آواز پر بلند نہ کرو اور دوسروں کی طرح ان سے تیز لہجہ میں گفتگو نہ کرو کہ تمہارے نیک اعمال (بے ادبی کی وجہ سے) حبط اور باطل ہو جائیں گے جبکہ تم اسے محسوس نہیں کرتے "

اب بھلا خداوند عالم کی جانب سے پیغمبر اکرمؐ کی عزت و حرمت کی حفاظت کے لئے اس قدر اہتمام ان کے پاس و ادب کی رعایت اور معمولی سی بے ادبی سے پرہیز کی تاکید کو دیکھتے ہوئے آنحضرتؐ کی شان میں سلمان رشدی کی شدید ترین بے ادبیوں ، اہانتوں اور گستاخیوں کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے ؟

اب ہم نبی اکرمؐ کو سب و شتم کرنے والے کے واجب القتل ہونے کے ثبوت میں شیعہ سنی احادیث کی کتابوں سے چند روایتیں اور مذاہب خمسہ کے ائمہ و فقہا کے فتوے نقل کرتے ہیں تاکہ اس استعماری نوکر کے قتل کے سلسلہ میں امام خمینی قدس سرہ کے قاطع حکم کی بنیاد و اساس واضح ہو جائے :

نبی اکرمؐ پر دشنام ارتداد کا موجب

تمام اسلامی مذاہب کے علماء نے حضرت رسول خدا اور دیگر انبیاء الٰہی پر سب و شتم کو بھی ارتداد کا ایک سبب جانا ہے ہم نے اوپر " مرتد کی تعریف " کے ذیل میں اس لفظ کی وضاحت کے

۱۔ سورہ حجرات / ۱-۲

تحت جو باتیں بیان کی ہیں وہ اس حقیقت کا ایک نمونہ ہیں۔ (۱) چنانچہ نبی اکرمؐ پر سب و شتم کرنے والا مرتد ہے۔ نبی کریمؐ کو دشنام دینے والے کے واجب القتل ہونے پر دلیلیں بیان کرنے سے پہلے مرتد کو واجب القتل ثابت کرنے والی دلیلوں کی بنیاد پر ہی ایسے شخص کو قتل کیا جاسکتا ہے پھر بھی یہاں ہم سب النبیؐ کے حکم سے متعلق روایتیں اور فتوے نقل کرتے ہیں :۔

فریقین کی روایات سے نبیؐ کو دشنام دینے والے کا واجب القتل ہونا

امامیہ کی روایات :

۱۔ صحیحة هشام بن سالم، عَنْ اَبِی عبدالله (ع) : اَنَّهُ سُئِلَ عَمَّنْ شَتَمَ رَسُوْلَ اللهِ (ص) فقَالَ (ع) یَقْتُلُهُ الْاَدْنیٰ فَالْاَدْنیٰ قَبْلَ اَنْ یُرْفَعَ اِلَی الْاِمَامِ ۔ (۲)

" امام جعفر صادقؑ کی درسگاہ کے تربیت یافتہ ایک جلیل القدر دانشور ہشام ابن سلم امام علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت سے سوال کیا گیا کہ رسول خداؐ کو دشنام دینے والے کا کیا حکم ہے ؟ حضرتؑ نے فرمایا : اس سے پہلے کہ یہ خبر امام تک پہنچائی جائے نزدیک ترین افراد (جو اس تک رسائی حاصل کرسکیں) اسے قتل کردیں "

۲۔ "عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤمِنِیْنَ (ع) اَنَّهُ کَتَبَ اِلیٰ رِفَاعَة : مَنْ تَنَقَّصَ نَبِیّاً فَلَا تُنَاظِرْهُ " (۳)

" حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے رفاعہ کو ایک خط میں تحریر فرمایا کہ جو شخص کسی پیغمبر میں عیب نکالے یا ان پر اعتراض کرے اسے (زندہ رہنے کی) مہلت نہ دو ۔"

یہاں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ یہ حدیث پیغمبر اکرم حضرت محمدؐ کے علاوہ کسی بھی پیغمبر پر

۱۔ تحریر الوسیلہ / ج ۲ / ص ۱۱۸ ۔ جواہر الکلام / ج ۴۱ / ص ۶۰۰ ۔ شرح عقائد نسفی / ص ۱۴۸ الفقہ علی المذاہب الاربعہ / ج ۵ / ص ۴۲۳

۲۔ وسائل الشیعہ / ج ۱۸ / ص ۵۵۴ ۳ مستدرک الوسائل / ج ۳ / ص ۲۳۳

سب وشتم کرنے والے کو واجب القتل جانتی ہے اور سلمان رشدی حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اہانت کے سبب بھی واجب القتل ہے۔

۳- "فی صحیفۃ الرضا (ع) عن آبائہ، عن رسول اللہ (ص) قال: من سب نبیاً یقتل ۔ ۔ ۔ ۔" (۱)

کتاب صحیفۂ رضا میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا، جو شخص کسی بھی پیغمبر پر سب وشتم کرے، قتل کر دیا جائے گا۔"

صدرِ اسلام میں نبی اکرمؐ کو دشنام دینے والوں کا قتل

۴- "محمد بن مسلم، عن ابی جعفر (ع) ان رجلا من ھذیل کان یسب رسول اللہ فبلغ ذلک النبی (ص) فقال: من لھذا؟ فقام رجلان من الانصار فقالا: نحن یا رسول اللہ، فانطلقا حتی اتیا عربۃ فسألا عنہ فاذا ھو یتلقی غنمہ، فقال: من انتما وما اسمکما؟ فقالا: انت فلان ابن فلان؟ قال: نعم، فنزلا فضربا عنقہ ۔ ۔ ۔ ۔" (۲)

محمد بن مسلم، امام محمد باقر (ع) سے روایت کرتے ہیں کہ: قبیلۂ ہذیل کا ایک شخص پیغمبر اسلامؐ کو دشنام دیتا تھا۔ جب یہ خبر آنحضرتؐ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: کون ہے جو اس کا قصہ پاک کرے؟ انصار میں سے دو افراد کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہؐ ہم آمادہ ہیں۔ وہ دونوں گئے اور اسے ایسی جگہ پایا جہاں وہ اپنی بھیڑیں چرانے میں مشغول تھا۔ اس نے ان دونوں سے پوچھا، تم لوگ کون ہو اور تمہارے نام کیا ہیں؟ ان دونوں نے اس سے دریافت کیا کہ تم فلاں ابن فلاں ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ تو یہ دونوں اپنی سواریوں سے اترے اور اس کی گردن اڑا دی۔"

۱- وسائل الشیعہ / ج ۱۸ / ص ۴۶۰ ۲- وسائل الشیعہ / ج ۱۸ / ص ۴۶۰

۵۔ "رُوِیَ اَنَّہٗ (ص) لَمَّا فَتَحَ مَکَّۃَ عَھِدَ اِلَی الْمُسْلِمِیْنَ اَنْ لَّا یَقْتُلُوْا بِمَکَّۃَ اِلَّا مَنْ قَاتَلَھُمْ سِوٰی نَفَرٍ کَانُوْا یُؤْذُوْنَہٗ، مِنْھُمْ بِنْتَانِ کَانَتَا یُغَنِّیَانِ بِھِجَائِہٖ. فَقَالَ: اُقْتُلُوْھُمْ وَاِنْ وَجَدْتُمُوْھُمْ مُتَعَلِّقِیْنَ بِاَسْتَارِ الْکَعْبَۃِ" (۱)

"روایت ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے مکہ کو فتح کیا تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو لوگ تم سے جنگ نہ کریں انھیں قتل نہ کرنا، سوائے ان افراد کے جو آنحضرتؐ کو اذیتیں دیا کرتے تھے۔ ان میں دو گانے والی لڑکیاں بھی تھیں جو پیغمبر اسلام کی ہجو میں اشعار گایا کرتی تھیں۔ آنحضرت نے فرمایا: ان سب کو قتل کر ڈالو چاہے تم انھیں کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے دیکھو۔"

۶۔ "رُوِیَ عَنْ عَلِیٍّ (ع) اَنَّ یَھُوْدِیَّۃً کَانَتْ تَشْتُمُ النَّبِیَّ (ص) وَتَقَعُ فِیْہِ، فَخَنَقَھَا رَجُلٌ حَتّٰی مَاتَتْ فَاَبْطَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ص) دَمَھَا" (۲)

حضرت علی (ع) سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت پیغمبر اسلام کو دشنام دیا کرتی اور ان کی شان میں نازیبا الفاظ بکا کرتی تھی۔ ایک شخص نے اسے گلا دبا کر مار ڈالا تو پیغمبر اسلام نے اس کے خون کو باطل (یعنی بے قیمت) قرار دے دیا"۔

۷۔ "فقہ الرضا (ع) انّہ من ذکر السیّد محمد (ص) اَوْ وَاحِدًا مِنْ اَھْلِ بَیْتِہٖ بِمَا لَا یَلِیْقُ بِھِمْ اَوِ الطَّعْنَ فِیْھِمْ صلوات اللہ علیہم وَجَبَ عَلَیْہِ الْقَتْلُ" (۳)

کتاب فقہ الرضاؑ میں تحریر ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت محمدؐ یا ان کے اہل بیتؑ میں کسی ایک کی شان میں نازیبا باتیں کہے یا ان پر طعن و تشنیع کرے اس کا قتل واجب ہے"

۱۔ جواہر الکلام / ج ۴۱ / ص ۴۴۴ ۔ سنن بیہقی / ج ۸ / ص ۲۰۵

۲۔ جواہر الکلام / ج ۴۱ / ص ۴۳۹ ۔ سنن بیہقی / ج ۸ / ص ۲۰۵

۳۔ مستدرک الوسائل / ج ۳ / ص ۲۴۲

۸۔ "عن الرضا عن آبائہ (ع) قال رسول اللہ (ص) من سب نبیاً من الانبیاء فاقتلوہ" (۱)

"امام رضا (ع) اپنے آبائے کرام اور وہ رسول خدا (ص) سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص انبیاء میں سے کسی ایک نبی کی شان میں نازیبا الفاظ کہے اسے قتل کردو"

۹۔ "عن ابی عبداللہ (ع)، قال رسول اللہ (ص) قال اللہ عز وجل: من اھان لی ولیاً فقد ارصد لمحاربتی" (۲)

"امام جعفر صادق علیہ السلام حضرت رسول خدا سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، خداوند عالم کا ارشاد ہے: جو شخص میرے دوستوں میں کسی ایک کی اہانت کرے وہ مجھ سے جنگ اور مقابلہ پر آمادہ ہوا ہے"۔

ب) کتب اہل سنت سے نبی کو دشنام دینے والے کے قتل سے متعلق حدیثیں

۱۔ عن ابن عباس، ان اعمیٰ کانت لہ ام ولد تشتم النبی (ص) و تقع فیہ فینھاھا فلا تنتھی و یزجرھا فلا تنزجر، فلما کان ذات لیلۃ جعلت تقع فیہ (ص) و تشتمہ فقتلھا فلما اصبح ذکر ذلک للنبی فقال الاعمیٰ فقال یا رسول اللہ انا صاحبھا کانت تشتمک و تقع فیک فانھاھا فلا تنتھی وازجرھا فلا تنزجر فقتلتھا فقال النبی (ص) اشھدوا ان دمھا ھدر۔ (۳)

"ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک نابینا شخص کے پاس ایک ام ولد" (یعنی وہ کنیز جو اپنے آقا سے صاحب اولاد ہوگئی ہو) تھی، جو پیغمبر اکرمؐ کی شان میں نازیبا الفاظ بکا کرتی تھی اور اپنے آقا کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرتی تھی اس

۱۔ بحار الانوار / ج ۹۷ / ص ۲۲۱   ۲۔ بحار الانوار / ج ۹۷ / ص ۱۵۵

۳۔ صحیح مسلم کتاب الحدود / ج ۳ و سنن دار قطنی / ج ۳ / ص ۱۳

شخص نے کنیز کو مار ڈالا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میری کنیز آپ کو ناسزا الفاظ کہا کرتی تھی ، میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس عمل سے باز رہے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور چونکہ وہ برابر آپ کی شان میں نازیبا باتیں کہا کرتی تھی لہٰذا میں نے اسے قتل کر ڈالا ۔ حضرتؐ نے فرمایا : آگاہ رہو کہ اس عورت کا خون ضائع ہے (یعنی اس کی کوئی قیمت نہیں ہے)

۲۔ "قَالَ النَّبِيُّ (ص) : مَنْ سَبَّ الْاَنْبِيَاءَ قُتِلَ " (۱)

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ، جو شخص انبیاء کرام کی شان میں ناسزا باتیں کہے ۔ اسے قتل کر دیا جائے گا ۔"

۳-۴ ۔ شیعہ طریقوں سے منقول پانچویں اور چھٹی حدیثیں ، اہل سنت کے واسطوں سے بھی سنن بیہقی اور سنن نسائی میں نقل ہوئی ہیں ۔

۵ ۔ "عَنِ النَّبِيِّ (ص) : مَنْ سَبَّ الْاَنْبِيَاءَ قُتِلَ " (۲)

" پیغمبر اکرم ص نے فرمایا : جو شخص انبیاء کرامؑ کی شان میں ناسزا الفاظ کہے وہ قتل کر دیا جائے گا ۔"

نبی کرمؐ کو دشنام دینے والے کا مذاہب خمسہ کے فقہا کی نگاہ میں واجب القتل ہونا

عظیم شیعہ فقہا کے فتوے : فقہا شیعہ نے پوری تاریخ میں متفق طور پر پیغمبر اسلام کی شان میں ناسزا الفاظ کہنے والے اور آنحضرتؐ کی اہانت کرنے والے کی سزا قتل قرار دی ہے صاحب جواہر اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ ؐ جَازَ لِسَامِعِهِ بَلْ وَجَبَ قَتْلُهُ بلاخلاف اجده فِيهِ ، بَلِ الْاِجْمَاعُ بقسميه عَلَيْهِ ، مضافاً الى النصوص (۳)

۱۔ مستدرک حاکم / ج ۴ / ص ۳۵۴ وسنن ابی داود / ج ۲ / ص ۴۴۳

۲۔ السراج الوہاج ، کتاب الردہ   ۳۔ جواہر الکلام / ج ۴۱ / ص ۴۳۲

جو شخص بھی پیغمبر اسلام کو دشنام دے تو ہر سننے والے کے لئے جائز بلکہ واجب ہے کہ اسے قتل کر دے، میں نے کسی عالم کو اس نظریہ کا مخالف نہیں پایا بلکہ تمام علماء شیعہ فتویٰ و عمل دونوں منزلوں میں اس پر متفق ہیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں ہمارے پاس بہت سی روایتیں بھی موجود ہیں۔"

صاحب جواہر چونکہ ایسے فقیہ ہیں جو شیعی دنیا کے تمام فقہاء کے فتوؤں سے واقف ہیں اور تمام فقہاء متاخرین آپ کو تسلیم کرتے ہیں وہ اس مسئلہ میں علماء شیعہ کا اجماع نقل کرتے ہیں۔ لہٰذا اب دوسرے تمام فقہاء کے فتوے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

امام خمینی قدس سرہ کتاب تحریر الوسیلہ میں فرماتے ہیں :۔

"مَنْ سَبَّ النَّبِیَّ وَالعیاذ بِاللّٰہِ وَجَبَ عَلٰی سَامِعِہٖ قَتْلُہٗ ..." (۱)

"اگر کوئی شخص (معاذا...) نبی اکرمؐ کو دشنام دے تو اس کے سننے والے پر واجب ہے کہ اسے قتل کر دے"

حضرت آیت اللہ العظمیٰ گلپائگانی جو دور حاضر کے عظیم مراجع میں سے ایک ہیں انہوں نے حوزۂ علمیہ قم میں منعقد ہونے والی علوم قرآن کی پہلی تحقیقاتی کانفرنس میں اپنے پیام میں قرآن کے اہتمام کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔

"اسلام و قرآن کے خلاف استعماری طاقتوں کی سازشوں کا ایک واضح نمونہ گزشتہ دنوں منظر عام پر آنے والی کتاب "شیطانی آیات" کی تالیف و اشاعت ہے .... ان لوگوں نے قرآن کو اسلامی معاشرہ سے خارج کرنے کے لئے مختلف ذرائع اپنا رکھے ہیں۔ اس کتاب کا مؤلف شرعی طور پر واجب القتل ہے۔ وہ اور دوسرے یہ جان لیں کہ حضرت ختمی مرتبت رسول خدا صؐ نیز اسلامی مقدسات کی اہانت کی سزا موت ہے اور توہین کرنے والا اسلامی معاشرہ کی نگاہ میں مجرم ہے ...."

۱۔ تحریر الوسیلہ / ج ۲ / ص ۴۷۶

اہل سنت کے چاروں مذاہب کے فقہا کے فتوے

مذاہب اربعہ کے تمام فقہا نبی اکرمؐ کو دشنام دینے والے کو واجب القتل جانتے ہیں ، ہم ہر مذہب کے فقہا کے فتوے الگ الگ ذکر کریں گے لیکن پہلے مقدمہ کے طور پر ایک تاریخی واقعہ کے ذیل میں ان مذاہب کا ایک جامع بطور نمونہ پیش کرتے ہیں :۔

ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم اللواتی جو ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہے اپنی کتاب " رحلۃ ابن بطوطۃ " (سفرنامہ ابن بطوطہ) میں لکھتا ہے :۔

وَاتَّفَقَ فِی تِلْكَ الْاَيَّامِ اَنَّ فَقِيْراً يُعْرَفُ شَيْخَ الْمَشَايِخْ وَهُوَ سَاكِن فِی جَبَلٍ خَارِجِ مَدِيْنَةِ عَيْنتَاب وَالنَّاسُ يَقْصُدُوْنَهُ وَهُمْ يَتَبَرَّكُوْنَ بِهِ، وَلَهُ تِلْمِيْذٌ مُلَازِمٌ لَهُ، وَكَانَ مُجَرَّداً عَزَباً لَا زَوْجَةَ لَهُ، قَالَ فِی بَعْضِ كَلَامِهِ :

"اِنَّ النَّبِیَّ كَانَ لَا يَصْبِرُ عَنِ النِّسَاءِ وَاَنَا اَصْبِرُ عَنْهُنَّ " فَشَهِدَ عَلَيْهِ بِذٰلِكَ وَثَبَتَ عِنْدَ الْقَاضِی وَرَفَعَ اَمْرُهُ اِلَی مَلِكِ الْاُمَرَاءِ وَاَتَی بِهِ وَبِتِلْمِيْذِهِ الْمُوَافِقِ لَهُ عَلَی قَوْلِ قَاضِی الْقُضَاةِ الْاَرْبَعَةِ وَهُمْ شِهَابُ الدِّيْنِ الْمَالِكِی وَنَاصِرُ الدِّيْنِ الْعَدِيْمِ الْحَنَفِی وَتَقِی الدِّيْنِ اِبْنُ الصَّائِغِ الشَّافِعِی وَعِزُّ الدِّيْنِ الدِّمَشْقِی الْحَنْبَلِی بِقَتْلِهِمَا مَعاً فَقُتِلَا۔ (۱)

"اس زمانہ میں (سال وبا کے دوران) ایک فقیر تھا جو شیخ المشائخ کے لقب سے مشہور تھا اور شہر عینتاب کے باہر ایک پہاڑ پر زندگی بسر کرتا تھا لوگ اس سے فیض حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جاتے تھے اس کا ایک شاگرد بھی تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ شیخ اکیلا اور غیر شادی شدہ تھا۔ ایک روز اس نے (غرور اور مذاق اڑانے کے انداز میں) کہا : پیغمبر اکرمؐ عورتوں سے ازدواج کرنے کے سلسلہ میں صبر کی طاقت

۱۔ رحلۃ ابن بطوطۃ ص ۲۵۲

نہیں رکھتے تھے کہ ان سے دور رہیں لیکن میں اس کی طاقت رکھتا ہوں (اس کی مراد یہ تھی کہ پیغمبر اکرمؐ کو (معاذاللہ) میرے برابر بھی جنسی خواہشات پر قابو نہیں تھا) گواہوں نے قاضی کے پاس پیغمبر اسلامؐ کے سلسلہ میں اس کے اس تمسخر و عیب جوئی کی گواہی دی۔ اس کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اسے اور اس کے ہم خیال شاگرد کو بادشاہ کے پاس لے جایا گیا۔ مذاہب اربعہ کے قاضیوں نے جن کے نام ۱۔ شہابُ الدین مالکی ۲۔ ناصر الدین عدیم حنفی ۳۔ تقی الدین شافعی ۔ ۴۔ عزّالدین حنبلی تھے بالاتفاق ان کے قتل کا فتویٰ دیا اور ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔

امام ابوحنیفہ کا نظریہ

قال ابوحنیفۃ واصحابہ : مَنْ سَبَّ النَّبِیَّ (ص) او عَابَہ وَکَانَ مُسْلِماً فَقَدْ صَارَ مُرْتَدّاً وَإِنْ کَانَ ذِمِّیّاً عُزِّرَ وَلَمْ یُقْتَلْ "[1]

"جو شخص پیغمبر اکرمؐ کو دشنام دے یا آنحضرتؐ کی عیب جوئی کرے اور مسلمان بھی ہو تو وہ مرتد ہو جائے گا (نتیجہ کے طور پر اسے مرتد کی سزا بھگتنی ہوگی یعنی قتل کر دیا جائے گا) اور اگر کافر ذمی ہو تو اسے سزا تو دی جائے گی لیکن قتل نہیں کیا جائے گا۔"

امام مالک کا نظریہ

حاشیہ دسوقی اور شرح کبیر کے مؤلف مالکی مسلک کی اہم ترین کتابوں کے حوالہ سے اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :

"اِنْ سَبَّ مُکَلَّفٌ نَبِیّاً . . . . اَوْ لَعَنَہُ اَوْ عَابَہُ اَیْ نَسَبَہُ لِعَیْبٍ اَوْ

۱۔ کتاب "انتصار" سید مرتضیٰ علم الہدیٰ / ص ۲۳۴

قَذَفَهُ اَوْ اسْتَخَفَّ بِحَقِّهِ كَأَنْ قَالَ : لَا اُبَالِيْ بِاَمْرِهٖ وَلَا نَهْيِهٖ اَوْ وَلَوْ جَاءَ فِيْ مَا قَبِلْتَهُ اَوْ غَيَّرَ صِفَتَهُ كَأَسْوَدَ اَوْ قَصِيْرًا اَوْ اَلْحَقَ بِهٖ نَقْصًا وَاِنْ فِيْ بَدَنِهٖ كَاَعْوَرَ اَوْ اَعْرَجَ اَوْ خَصْلَتُهُ (بِفَتْحِ الْخَاءِ الْمُعْجَمَةِ) اَيْ نَسَبَتْهُ وَطَبِيْعَتُهُ كَبَخِيْلٍ اَوْ غَضَّ اَيْ نَقَصَ مِنْ مَرْتَبَتِهِ الْعَلِيَّةِ اَوْ مِنْ وُفُوْرِ عِلْمِهٖ اَوْ زُهْدِهٖ اَوْ اَضَافَ لَهٗ مَا لَا يَجُوْزُ عَلَيْهِ كَعَدَمِ التَّبْلِيْغِ اَوْ نَسَبَ اِلَيْهِ مَا لَا يَلِيْقُ بِمَنْصَبِهٖ عَلٰى طَرِيْقِ الذَّمِّ ..... قُتِلَ وَلَمْ يُسْتَتَبْ اَيْ بِلَا طَلَبِ اَوْ بِلَا قَبُوْلِ تَوْبَةٍ مِنْهُ حَدًّا اِنْ تَابَ وَاِلَّا قُتِلَ كُفْرًا .....“ (۱)

” اگر ایک بالغ شخص کسی پیغمبر کو اسزا باتیں کہے ..... یا ان پر لعنت کرے، ان میں عیب نکالے، ان کی طرف کسی عیب کی نسبت دے یا ان کے حق کو سبک شمار کرے۔ یعنی مثال کے طور پر یہ کہے (کہ مجھے ان کے امر و نہی سے کوئی سروکار نہیں) یا (وہ جو بھی حکم دیں میں اسے نہیں مانوں گا۔) یا ان کی طرف کسی دوسری صفت کی نسبت دے، مثلاً کہے کہ (وہ کالا ہے یا پستہ قد ہے) یا ان کے جسم میں کوئی عیب نکالے جیسے کہے کہ وہ بھینگا یا لنگڑا ہے یا پیغمبر کے مزاج و خصلت میں عیب نکالے مثلاً ان کی طرف بخل کی نسبت دے یا ان کی کسی فضیلت اور کمال یعنی کثرت علم یا زہد و تقویٰ کا انکار کرے یا جو کام پیغمبر کے لئے جائز نہیں ہے ان کی طرف منسوب کرے مثلاً رسالت کی تبلیغ نہ کرنا ..... ایسا شخص قتل کردیا جائے گا، اس سے توبہ بھی طلب نہ کی جائے گی اور اگر وہ توبہ کرے بھی تو اس کی توبہ قبول نہیں ہے بلکہ اس صورت میں اس پر حد جاری ہوگی ورنہ کفر و ارتداد کے جرم میں قتل کیا جائے گا۔“

۲- (قولہ، وَاِنْ سَبَّ الخ) اَلسَّبُّ هُوَ الشَّتْمُ وَهُوَ كُلُّ كَلَامٍ قَبِيْحٍ

۱- شرح کبیر، ص ۳۰۹

وَحِينَئِذٍ فَالْقَذْفُ وَالِاسْتِخْفَافُ بِحَقِّهِ وَإِلْحَاقُ النَّقْصِ بِهِ، كُلُّ ذَٰلِكَ دَاخِلٌ فِي السَّبِّ، ومكرر معه قاله: شيخنا العدوي وقوله: شيخنا العدوي وقوله: مكلف أي سواء كان مسلماً او كافراً۔[1]

یعنی شرح کبیر کے مؤلف متن (وَإِنْ سَبَّ) کے ذیل میں لکھتے ہیں: سب وہی گالی ہے اور یہ ہر گندی اور بے ہودہ بات کو شامل ہوتی ہے۔۔ اور ہمارے استاد شیخ عدوی نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے، اور متن میں (مکلف) کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کو دشنام دینے والا قتل کر دیا جائے گا، چاہے مسلمان ہو یا کافر۔

بنابریں شرح کبیر اور حاشیۂ دسوقی کے مطابق نبیؐ کو دشنام دینے والا چاہے وہ مسلمان ہو (جیسے سلمان رشدی) یا کافر، واجب القتل ہے۔ اور اگر یہ فرض کریں کہ نبیؐ کو دشنام دینے والے نے توبہ کرلی تو اسے دشنام کی حد کے عنوان سے قتل کیا جائے گا۔

گراں قدر کتاب "التشریع الجنائی الأسلامی" کے مؤلف جناب عبدالقادر جودہ نے بھی نبی اکرمؐ کو دشنام دینے والے کی توبہ قبول نہ ہونے کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کا فتویٰ نقل کیا ہے:

"فَإِنَّ مَالِكاً يَمْنَعُ عَنْ اسْتِتَابَةِ ثَلَاثَةٍ۔۔۔۔ ۳۔ مَنْ سَبَّ نَبِيّاً أَوْ مَلَكاً أَوْ عَرَّضَ بِهِ أَوْ لَعَنَهُ أَوْ عَابَهُ أَوْ قَذَفَهُ أَوْ اسْتَخَفَّ بِحَقِّهِ وَمَا أَشْبَهَ، فَإِنَّهُ يُقْتَلُ وَلَا يُسْتَتَابُ وَلَا تُقْبَلُ مِنْهُ التَّوْبَةُ وَلَوْ أَعْلَنَهَا وَلَوْ جَاءَ تَائِباً قَبْلَ أَنْ يُطَّلَعَ عَلَيْهِ، لِأَنَّ الْقَتْلَ فِي هٰذِهِ الْحَالَةِ حَدٌّ خَاصٌّ وَإِنْ كَانَ يَدْخُلُ تَحْتَ الرِّدَّةِ (۲)

امام شافعی کا نظریہ

مذہب شافعی کے ماننے والوں نے بھی دیگر اسلامی مذاہب کی طرح پیغمبر اسلامؐ کا مذاق اڑانے اور ان کی اہانت کرنے کو کفر و ارتداد جانا ہے، لہٰذا وہ نبی اکرمؐ کو دشنام دینے والے کو

۱۔ شرح کبیر/ص ۳۰۹ ۲۔ التشریع الجنائی الاسلامی/ج ۲/ص ۷۴۴

واجب القتل جانتے ہیں، کیونکہ یہ لوگ بھی مرتد کے واجب القتل ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ مرتد کی بحث میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

منہاج کے شارح اپنی کتاب "سراج الوہاج" در فقہ شافعی، میں لکھتے ہیں:۔

"اَلرِّدَّةُ هِيَ قَطْعُ الْإِسْلَامِ بِنِيَّةٍ أَوْ قَوْلٍ كُفْرٍ أَوْ فِعْلٍ، سَوَاءٌ قَالَهُ اسْتِهْزَاءً أَوْ عِنَادًا أَوِ اعْتِقَادًا ...(۱)

مرتد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کفر کی نیت کرے کفر کی باتیں کرے یا کفر کے اعمال بجا لائے۔ چاہے اس نے کفر آمیز باتیں مضحکہ اڑانے کے ارادے سے کہی ہوں یا عناد و دشمنی کی بنا پر یا واقعی ان باتوں کا معتقد ہو۔

امام احمد بن حنبل کا نظریہ

۱۔ ابن قدامہ مقدسی حنبلی اپنی کتاب المقنع میں لکھتے ہیں:۔

(۲)
"فمن ... سبّ اللّٰہ تعالیٰ أو رسولہٗ کفر ومن ارتدّ عن الإسلام..."

جو شخص خدا یا رسول خدا کی شان میں نا سزا باتیں کہے وہ کافر ہے اور جو شخص اسلام سے خارج و مرتد ہو گیا ہے ... اس کے بعد کافر و مرتد کے حکم یعنی قتل کا بیان ہے جسے ہم گزشتہ بحث میں ذکر کر آئے ہیں۔

۲۔ امام موفق الدین بن قدامہ رسول خدا کی شان میں دشنام و ناسزا کہنے کو ارتداد کا موجب اور قتل کا مستحق جانتے ہیں اور لکھتے ہیں:

وَقَذْفُ النَّبِيِّ (ص) وَقَذْفُ أُمِّهِ رِدَّةٌ عَنِ الْإِسْلَامِ وَخُرُوجٌ عَنِ الْمِلَّةِ وَكَذٰلِكَ سَبُّهُ بِغَيْرِ الْقَذْفِ إِلَّا أَنَّ سَبَّهُ بِغَيْرِ الْقَذْفِ يَسْقُطُ بِالْإِسْلَامِ...(۳)

۱۔ السراج الوہاج، کتاب الردہ ۲۔ المقنع

۳۔ المغنی / ج ۱۰ / ص ۲۳۱

"نبی اکرمؐ اور ان کی والدہ گرامی پر تہمت لگانا مرتد ہونے اور اسلام سے خارج ہو جانے کا موجب ہے ....:

۳۔ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب (الصارم المسلول علی شاتم الرسولؐ) کہ یہ کتاب اس نے خاص طور سے اسی موضوع کے تحت لکھی ہے، اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کا قول یوں نقل کیا ہے ۱۔

قالَ حَنبل : سَمِعتُ اَبا عَبدِ اللهِ یَقولُ : کُلّ مَن شَتَمَ النَّبیَ(ص) اَوتَنَقَّصَهُ (مُسْلِماً کانَ اَوْ کافِراً) فَعَلَیهِ القَتلُ ۔ (۱)

امام حنبل کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق (ع) سے سنا کہ جو شخص بھی پیغمبر اکرمؐ کو ناسزا باتیں کہے یا ان کی عیب جوئی کرے چاہے مسلمان ہو یا کافر، قتل کر دیا جائے گا۔

ابن تیمیہ نے اپنی اسی کتاب کے دوسرے حصہ میں لکھا ہے:

"اِنَّ السّابَّ اِن کانَ مُسلِماً فاِنَّهُ یَکفُرُ وَیُقتَلُ بِغَیرِ خِلافٍ وَهُوَ مَذهَبُ الاَئِمَّةِ الاَربَعَةِ وَغَیرِهِم ... وَحَدیثُ حصین اَنَّ ابنَ عُمَرَ قالَ : مَنْ شَتَمَ النَّبیَّ (ص) قُتِلَ "۔

جو شخص پیغمبر اسلام کو دشنام دے اور اگر مسلمان ہو تو اسی دشنام کی بنیاد پر کافر ہو جائے گا اور قتل کر دیا جائے گا۔ یہ تمام مذاہب اربعہ کے ائمہ و فقہا کا نظریہ ہے اسی طرح ابن عمر سے ایک حدیث نقل ہے کہ: جو شخص پیغمبر اکرمؐ کی شان میں نازیبا باتیں کہے، قتل کر دیا جائے گا۔

ابن تیمیہ نے تیسرے صفحہ پر ابن منذر کے قول کی روشنی میں اس مطلب پر اجماع کو بھی نقل کیا ہے اور احمد، اسحاق، مالک اور لیث کے نظریات اس سلسلہ میں نقل کئے ہیں۔

ایک دوسری جگہ پر پیغمبر اکرمؐ کو ناسزا کہنے کو ارتداد سے بھی بڑا جرم شمار کیا ہے:۔

"سَبُّ الرَّسُولِ اعظم جرماً مِنَ الرِّدة ... " (۲)

اور اس کے بعد خود اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے: "تطهیر الارض مِن سبِّ الرسول

۱۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسولؐ ۲۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسولؐ / ص ۲۹۷

وَيَجِبُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ بِقَدْرِ الْإِمْكَانِ۔ "

پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کرنے والے سے زمین کو پاک کرنا مسلمانوں پر حتی الامکان واجب ہے"

کیا ساب النبی کو قتل کرنے کی راہ میں جان و مال کی حفاظت بھی شرط ہے؟

یہاں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ فقہا نے سب دشتم کرنے والے کے وجوب قتل کے سلسلہ میں یہ شرط لگا رکھی ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ نتیجہ کے طور پر اگر کوئی مسلمان کسی کو پیغمبر اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہوا دیکھے تو اس پر اس کا قتل اسی صورت میں واجب ہے کہ جب خود اس کی جان کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ لیکن اگر وہ اپنی جان و مال و آبرو کو خطرہ میں دیکھے تو اس پر پیغمبرؐ کو سب و شتم کرنے والے کا قتل واجب نہیں ہے۔

لیکن جس بات پر توجہ ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس احتیاط کی رعایت اسی صورت میں ہے جب سب وشتم کا مسئلہ انفرادی و شخصی صورت میں انجام پائے اور وہ شخص سب وشتم کے علاوہ کسی اور بڑے جرم کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ لیکن اگر دشنام دینے والا اسلام کو مٹانے اور نابود کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی علی الاعلان فحشیات کے ذریعہ لوگوں کے دین وایمان کو کمزور کرنے اور اسلامی مکتب فکر کی بنیاد اور قرآن کی تخریب میں مصروف ہو تو پھر اپنی جان و مال و آبرو کی حفاظت کی احتیاط کوئی معنی نہیں رکھتی اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ پوری شدت اور اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلام اور قرآن کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور جب تک اس خطرناک دشمن کا خاتمہ نہ ہو جائے چین سے نہ بیٹھیں اور جو شخص بھی اس راہ میں قتل ہوا شہید ہے بالکل یوں ہی جیسے اسلام پر حملہ آور فوج سے جنگ میں قتل ہونے والے شہید ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مخصوص زمان و مکان اور حالات میں۔ نبی اکرمؐ پر سب وشتم کرنے والے کے سلسلہ میں حکم اور خود شرائط حکم کو بدلتے رہتے ہیں اور یہ زمان و مکان کی بنیاد جس کی رعایت کو امام خمینی قدس سرہ نے اپنے اجتہاد اور احکام شرعی کے استنباط میں لازم و ضروری قرار دیا ہے۔ اپنی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود انہوں نے (سلمان رشدی) کے قتل کے حکم میں فرمایا:

"۔۔۔ جو بھی اس راہ میں قتل کیا جائے شہید ہے۔"

۳۔ اسلام کی اعتقادی وثقافتی سرحدوں کا دفاع

اپنی جان، مال، آبرو اور اپنے دین کا دفاع کرنا انسانی فطرت و سرشت کا تقاضا ہے اور اصولاً ہر زندہ وجود طبیعی، حتیٰ غیر دانستہ طور پر ہر طرح کی جارحیت اور ظلم و تعدی کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔

اس بنیاد پر دفاع کے لازمی یا ضروری ہونے کی بات ہی نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ دین اسلام جو انسان کی الٰہی فطرت کے عین مطابق ہے فطرت ہی کے تقاضے کے تحت دفاع کو واجب و ضروری جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مذاہب کے علماء و دانشور مسئلہ جہاد کی بحث کے تحت فرماتے ہیں :۔

اگر دشمن اسلامی شہروں یا ملکوں کی سرحدوں پر حملہ آور ہو یا بعض مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کے مال و اسباب کو غارت کرنا چاہتا ہو یا ان کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا چاہتا ہو تو تمام مسلمانوں پر واجب کفائی ہے کہ دشمن کے حملہ کو روکیں اور اسے دفع کریں۔ حتیٰ علماء اس سلسلہ میں امام، خلیفہ یا حاکم مسلمین سے اجازت لینا بھی شرط نہیں جانتے۔

اس بیان میں فقہا نے اسلامی ممالک کی زمینی و جغرافیائی سرحدوں پر دشمن کے حملہ کے خلاف مسلمانوں کے فریضہ کا ذکر تو کیا ہے لیکن دشمن آج کل گرم جنگ اور سرحدوں پر حملے سے کم ہی کام لیتے ہیں آج دشمن علم و صنعت اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ اس کوشش میں مشغول ہیں کہ جہاں تک ہو سکے دوسری راہوں سے مثلاً مسلمانوں کی ثقافتی و تہذیبی اور اعتقادی سرحدوں پر حملے اور جارحیت کے ذریعہ اسلامی ملکوں اور مسلمانوں پر تسلط جمائیں اور انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

یہ کم خرچ بھی ہے اور اس میں بہت تھوڑے سے افراد اور مختصر وسائل کی ضرورت پڑتی ہے ایسی منزل میں علماء اور عوام کی کیا ذمہ داری ہے؟ یعنی انھیں اس طرح کے حملہ آوروں سے کیسے مقابلہ کرنا چاہیئے؟

کیا یہاں بھی جان و مال و ... کے دفاع کے مانند دشمن سے مقابلہ اور دین اسلام کی حمایت کرنا چاہیئے یا ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ؟

کیا کوئی عالم دین یا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ: زمینی سرحدوں پر حملہ کے وقت تو دفاع کرنا چاہیئے قتل کرنا اور قتل ہونا چاہیئے لیکن اعتقادی سرحدوں اور دین اسلام کے دفاع کے سلسلہ میں ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ؟

کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اعتقادی سرحدوں اور دین اور اس کے اصول پر کئے جانے والے حملے کا خطرہ زمینی سرحدوں پر ہونے والے حملے سے کم ہے ؟ کیا اسلامی مذاہب کے علماء جو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی جان، مال، اپنی زوجہ اور اولاد وغیرہ کا دفاع کرتے ہوئے قتل ہو جائے، شہید ہے:

"المقتول دون ماله شهيد والمقتول دون اهله شهيد والمقتول دون نفسه شهيد" (۱)

کیا وہ اسلام اور دین کے دفاع کے سلسلہ میں اس بات کے قائل نہیں ہیں ؟ اسلامی مآخذ کی روشنی میں "دین" انسان کی تمام چیزوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا شیعہ و سنی دونوں محدثین سے بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں کہ اگر انسان کو یہ اختیار دیا جائے کہ یا وہ اپنی جان سے ہاتھ دھولے یا اپنا دین گنوائے تو اسے اپنی جان کو دین پر فدا کر دینا چاہیئے۔ اور اصولاً ہم ان روایات سے استفادہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز بھی دین کے برابر نہیں ہو سکتی۔ نمونہ کے طور پر پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:

".... ان عرض بلاء ، فاجعل مالك دون دمك ، فان تجاوزك البلاء فاجعل مالك ودمك دون دينك فانّ المسلوب من سلب دينه والمخروب من خرب دينه" (۲)

"اگر تم پر کوئی بلا نازل ہو تو اپنا مال اپنی جان پر فدا کر دو اور اگر بلا اس سے بھی سخت

۱۔ کنز العمال / ج ۴ / ص ۴۲۵ حدیث ۱۱۲۳۸ ، اس سلسلہ میں حدیث ۱۱۲۳۵ اور ۱۱۲۳۶ وغیرہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ کنز العمال / حدیث ۴۳۶۰۱

ہو تو اپنا مال اور اپنی جان کو اپنے دین پر فدا کر دو بلاشبہ اسی نے اپنے آپ سے ہاتھ دھوئے جو اپنا دین گنوا دے اور وہی برباد ہوا ہے جس نے اپنا دین خراب کیا ہو ۔"

"قال النبی (ص): اذا حضرت بلیۃ فاجعلوا اموالکم دون انفسکم واذا نزلت نازلۃ فاجعلوا انفسکم دون دینکم واعلموا ان الهالک من هلک دینہ والحریب من حرب دینہ"[1]

اگر کوئی بلا و مصیبت پیش آئے تو اپنے اموال کو اپنی جانوں پر فدا کر دو اور اگر کوئی سخت و جانکاہ حادثہ سامنے آئے تو اپنی جانوں کو اپنے دین پر قربان کر دو اور یہ جان لو کہ وہی شخص ہلاک ہوا جس نے اپنا دین گنوا دیا اور وہی تباہ ہوا جس کا ایمان خراب ہوا ہو ۔"

"من وصایا النبی (ص) لعلی (ع) .... والخامسۃ بذلک مالک ودمک دون دینک "[2]

"پیغمبر اسلام کی ایک وصیت جو آپ نے حضرت علی سے فرمائی: ... اور پانچویں یہ کہ اپنے مال اور اپنی جان کو اپنے دین پر فدا کر دو ۔"

اسلامی مکتب فکر کی ان روایات کے پیش نظر دین کی اہمیت ہر چیز سے زیادہ ہے اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی چیز بھی اس کی برابری نہیں کر سکتی ۔

اس بنا پر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام پر ہونے والے ہر طرح کے حملہ کا دفاع کریں اور استعمار نیز اس کے خائن پٹھوؤں کے بزدلانہ حملوں کے مقابل آہنی دیوار بن جائیں ۔ مسلمانوں پر واجب ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) اور گزشتہ انبیاء کرام کی شان میں فحش و نازیبا باتیں لکھنے، دین اور قرآنی آیات کا مذاق اڑائے جانے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ یہ خود اسلامی بنیاد اور قرآن پر زبردست حملہ ہے ۔ اور اس حملہ کا اپنی آخری سانسوں تک مقابلہ کریں ۔ کیا قرآن کریم یہ نہیں کہتا کہ:

۱۔ وسائل الشیعہ / ج ۱۱ / ص ۴۵۱ اور بحار الانوار / ج ۷۸ / ص ۵۵ میں بھی ملاحظہ کریں ۔

۲ وسائل الشیعہ / ج ۱۱ / ص ۴۵۲ ۔

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ" (۱)

"یعنی کفار و مشرکین سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور صرف دین خدا باقی و حاکم رہے۔"

اسلام اور قرآن کا مذاق اڑانا اور پیغمبر اسلام نیز دیگر انبیاء کرام کے سلسلہ میں زبان و قلم سے اور وہ بھی وسیع پیمانہ پر اپنے غلط شبہات و تخیلات کو شائع کرنا فتنہ ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی شخص کسی بھی صورت سے راہ خدا میں رکاوٹ ڈالے اور لوگوں کو دین حق سے بدگمان کرے، فتنہ ہے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے جہاد و جنگ صرف زمینی سرحدوں پر حملہ کرنے والوں کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ دین کی راہ میں جہاد اور اس کا دفاع اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"الفتنۃ اشد من القتل" (۲) "فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید ہے"

پیغمبر اکرمؐ کی سیرت طیبہ بھی اس بات پر گواہ ہے کہ ان دشمنوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ ضروری ہے جو اپنے غلط پروپگنڈوں کے ہتھیار سے اپنی گندی تہذیب کو رواج دے کر اسلام سے جنگ پر آمادہ ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ بھی ایسے لوگوں کے لئے "موت" سے ہلکی سزا معین نہیں کرتے تھے۔ یہاں ہم آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ سے دو نمونے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ہجرت کے تیسرے سال، جب جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح کی خبر مدینہ پہنچی تو (کعب اشرف) نام کا ایک پلید شخص جس کی ماں یہودی تھی، مسلمانوں کی کامیابی اور اسلام کے عروج کو دیکھ کر بہت غصہ ہوا اس نے مشرکین کو تقویت پہنچانے اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے اسلام و پیغمبر اسلام کی مذمت اور مسلمانوں کی ناموس و عزت کی اہانت میں اشعار کہکر پڑھنا شروع کئے۔ ایک عرصہ تک وہ مکہ میں اسلام کے خلاف اس ثقافتی جنگ میں مصروف رہا جس کا نتیجہ مشرکین کی تقویت اور جنگ احد کے لئے ان کی تیاری کی شکل میں برآمد ہوا۔ اس کے بعد پھر وہ مدینہ آکر اسی کام میں مشغول ہوا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس کے دودھ شریک بھائی "ابونائلہ" کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ ابونائلہ نے بھی کچھ مسلمانوں کے ہمراہ راتوں رات جاکر اسے قتل کر دیا۔ اس طرح اسلام اور مسلمان اس کے شر سے نجات

۱۔ سورہ بقرہ / ۱۹۳ ۲۔ سورہ بقرہ / ۱۹۱

پاگئے ۔ (۱)

۲۔ ایک دوسرا شخص ابو رافع یہودی بھی کعب اشرف کا کردار ادا کر رہا تھا اسلام کے خلاف ثقافتی ٹکراؤ اور محاذ آرائی کے جرم میں اسے قتل کی سزا سنائی گئی اور کعب کے بعد وہ بھی قتل کیا گیا ۔ (۲)

لہٰذا (سلمان رشدی) اور اس جیسے افراد کے ساتھ جو استعماریوں کی دولت اور پروپیگنڈہ کی مدد سے اسلام اور قرآن کے خلاف وسیع پیمانہ پر مختلف زبانوں میں زہر اگل رہے ہیں ، نہ صرف مرتد اور نبی اکرمؐ کو دشنام دینے والے کے عنوان سے بلکہ دین اور قرآن پر حملہ ور دشمن کے عنوان سے سلوک کرنا چاہیئے اور (سلمان رشدی) اور اس کے رفقائے کار سے متعلق امام خمینی قدس سرہ کے فتوے نیز پیغمبر اکرمؐ کو دشنام دینے والے کے سلسلہ میں بھی ان کے فتوے کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے ۔

اب اگر امام خمینی قدس سرہ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے اس کا بنیادی محور ، جس کا آپ نے یہ دنداں شکن جواب دیا ہے ارتداد کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ یہ اقدام اسلام ، پیغمبر اسلام اور قرآن پر حملے کے جواب میں تھا ۔



۱۔ فروغ ابدیت / ج ۲ / ص ۳۰ نقل از سیرۃ ابن ہشام / ج ۲ / ص ۵۸ - ۵۱ اور مغازی واقدی ج ۱ / ص ۱۹۱ - ۱۸۴ ۔

۲۔ فروغ ابدیت / ج ۲ / ص ۳۱ نقل از تاریخ کامل (ابن اثیر) جلد ۲ ، ص ۱۰۱ ۔

عید غدیر

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ بَيْنَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحَى وَالْجُمُعَةِ كَالْقَمَرِ بَيْنَ الْكَوَاكِبِ

مفضل امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا:

غدیر خم کا دن عید فطر، عید قربان اور جمعہ کے درمیان ستاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کے چاند کے مانند درخشاں ہے۔

(بحار الأنوار، ج ۹۵، ص ۲۲۳)

حکومت الٰہیہ کی تعیین

یعنی

حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام

کی ولایت و امامت کے اعلان کو چودہ سو ۱۴۰۰

سال پورے ہو گئے

ہم اس عظیم **عید سعید** کے موقع پر

حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ، ان کے نائب ولی امر مسلمین

حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ العالی اور

تمام مسلمانان عالم کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں "ادارہ"

جلد ، شمارہ ۵
محرم - صفر ۱۴۱۱
اگست - ستمبر ۱۹۹۰ء

اسلامی،
علمی،
فکری،
دوماہی رسالہ

توحید

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

- قرآن و سیرت و سنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپے
ہندوستان	۷۵ روپے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۷ ڈالر

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ ادارہ۔

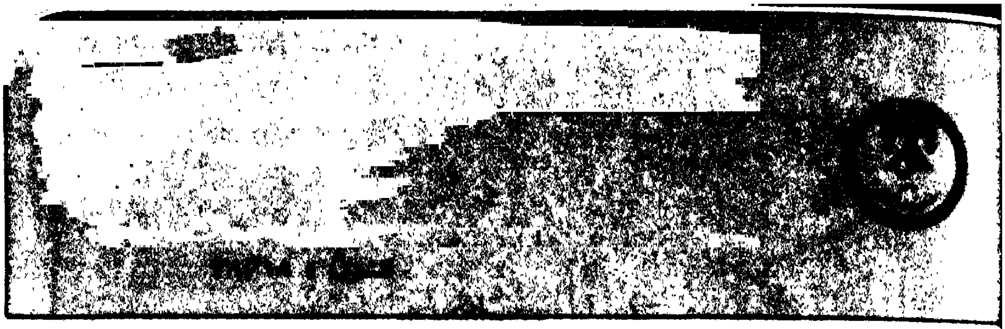
خطاطی و ڈیزائن: [illegible]

توحید

اسلامی، علمی، فکری
دو ماہی رسالہ

جلد - شمارہ

ترتیب



محرم ـ صفر

فکر و نظر

تاریخ و سیرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔

○ مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شذرہ



کعبہ دشمنوں کے نرغے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے، اللہ کے راستہ سے روک رہے ہیں اور اس مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی زیارت میں روڑے اٹکا رہے ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لئے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں !! اور یہاں جو کوئی ظلم و گمراہی کا راستہ اپنائے گا ہم انہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کیلئے خانۂ کعبہ کی جگہ معین کی اور انہیں یہ ہدایت دی کہ کسی کو میرا شریک نہ بناؤ اور میرے گھر کو طواف، قیام اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔ اور لوگوں کو حج کی عام دعوت دو تاکہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور سوار آئیں تاکہ ان فائدوں کا مشاہدہ کریں جو اس حج میں ان کے لئے موجود ہیں۔ اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو خدا نے انہیں عطا کئے ہیں

قربانی کا گوشت خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں۔ پھر لوگ اپنے آپ کی کثافتوں کو دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔ یہ ہے (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کی تعظیم کرے گا تو یہ اس کے پروردگار کے نزدیک اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور ان جانوروں کے سوا جو تمھیں بتائے جا چکے ہیں تمام چوپائے تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ پس تم ناپاک بتوں سے بچو، جھوٹی اور بے ہودہ باتوں سے پرہیز کرو خلوص نیت سے صرف اور صرف اللہ کے بندے بنو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جس نے اللہ کا شریک بنایا گویا وہ آسمان سے گر پڑا اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا کے جھونکے اس کے چیتھڑے اڑا دیں گے۔

اسے (یاد رکھو) اور جو اللہ کی نشانیوں کا احترام کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری کی علامت ہے۔ اور ایک معین مدت تک تمہارے لئے اس میں بہت فائدے ہیں۔ پھر ان جانوروں کے ذبح کئے جانے کی جگہ اسی پرانے گھر کے پاس ہے۔ ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے تاکہ خدا کے عطا کردہ چوپایوں پر خدا کا نام لیں۔ پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اسی کے تم فرمانبردار بن جاؤ..... اور قربانی کے اونٹوں کو (بھی) ہم نے تمہارے لئے خدا کی نشانی قرار دیا ہے۔ ان میں تمہارے لئے بہت سی بھلائیاں ہیں ...“

(سورۂ حج ۲۵ــــ۳۶)

"خدا نے اپنے محترم گھر کعبہ کو لوگوں کی بقاء کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اور محترم مہینوں، قربانی کے جانور اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پٹے یہ سب اس لئے ہیں کہ تم جان لو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے خدا سب سے واقف ہے اور بلاشبہ خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔"

(مائدہ - ۹۷)

●

قرآن مجید کی یہ آیتیں نہایت صاف ستھرے اور واضح انداز میں حج اور اس کے اسرار و رموز بیان کر دی ہیں۔ ان آیات کا ایک ہلکا سا جائزہ ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ:

۱۔ خداوند عالم نے کعبہ کو تمام لوگوں کی بقا اور ان کی دنیا و آخرت سنوارنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جعل الله الكعبة البيت الحرام قياماً للناس.... ليشهد وامنافع لهم

۲۔ بنائے کعبہ کا اصل مقصد، لوگوں کے دلوں سے کفر و شرک کی آلودگیوں کو دور کرنا اور ان کی فردی و معاشرتی زندگی سے اس کے آثار و علائم کو مٹانا ہے۔ بانی کعبہ حضرت ابراہیم خلیلؑ انتہائی سخت، کٹھن اور امتحانی منزلوں کو طے کرتے ہیں تاکہ خدا اور عوام کے اس مشترکہ گھر سے ہمیشہ کے لئے شرک کے آثار دور کر دیں۔ واذ بوأنا لابراهيم مكان البيت ان لا تشرك بي شيئاً.

..... مکہ اور مسجد الحرام کا چپہ چپہ، اس عظیم اور موحد بت شکن کی یاد دلاتا ہے۔ کعبہ اپنے معمار کی کہانی سناتا ہے، مقام ابراہیمؑ ان کے نعروں کو دہراتا نظر آتا ہے۔ صفا و مروہ ہاجرہ کے اضطراب و ہرولہ کو مجسم کرتے ہیں اور خدا پر ابراہیمؑ کے سچے اعتماد و توکل کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مکہ کی سخت، گرم اور سنگلاخ زمین پر شیر خوار اسماعیل کے قدموں سے پھوٹنے والا سدا بہار چشمہ "زمزم" لوگوں کی روحانی و جسمانی بیماریوں کا علاج ہے۔ اسماعیل کی قربان گاہ "منیٰ" رہ معبود میں اپنی عزیز ترین شئے سے دست بردار ہو جانے، اور اس کی چوکھٹ پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کا سبق سکھاتا ہے۔ الٰہی راستہ میں آڑے آنے والے شیطانوں پر سنگباری اور ان سے نبرد آزمائی کا درس دیتا ہے۔ غرض ہر چیز خدا کے سوا ہر شئے سے منہ موڑنے اور ہر قسم کے جلی و خفی شرک کو

مٹانے کی تعلیم دیتی ہے۔

سورۂ حج کی تیسویں آیت میں لوگوں کو اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کی تعظیم اور شرک کے مظہر، ہر قسم کے نئے پرانے اور پلید بتوں سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور اکتیسویں آیت میں شرک کو نہایت بھیانک اور بھرپور تباہی کا سبب بتایا گیا ہے۔

۳۔ مسجد حرام کو خدا اور اس کے پیغمبروں نے "لوگوں" کے لئے بنایا ہے۔ اس پر اس شہر کے باسی اور دور دراز سے آنے والے برابر کا حق رکھتے ہیں کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں۔ اس کے نظم و نسق اس کی دیکھ ریکھ اور اس سے فائدہ اٹھانے میں کسی کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، کسی کو کسی پر پابندی عائد کرنے کا حق نہیں مسجد الحرام کا انتظام چلانے کا حق کسے ہے۔ آیت نے واضح کر دیا ہے۔

۴۔ جو لوگ ابراہیمؑ و محمدؐ کے الٰہی راستہ پر چلنے سے روکتے ہیں، خالص محمدیؐ اسلام اور ابراہیمیؑ حج کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں، خدا کی خالص بندگی سے منع کرتے ہیں۔ جاں باز، پاک سیرت مسلمانوں پر مسجد الحرام کا دروازہ بند کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔ یہ بھی حج کا ایک اہم فائدہ ہے کہ اس موقع پر خائن و خادم کی شناخت ہو جاتی ہے، غاصبین حرم کا مکروہ چہرہ عوام کے سامنے آجاتا ہے۔

●

اسلامی انقلاب کے قائد اعظم حضرت امام خمینی قدس سرہ کے جہاد پیہم کا یہ اثر ہے کہ آج خالص محمدی اسلام کو نئی زندگی مل گئی ہے۔ تمام دنیا خاص طور سے ایرانی مسلمان محمدیؐ و ابراہیمیؑ حج کے فلسفہ سے آشنا ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ محمدی حج ان الگ الگ قطروں کو یکجا کر کے ٹھاٹھیں مارتا سمندر بنا سکتا ہے، جس کی طاقتور موجیں، حجاز اور تمام دیگر اسلامی سرزمینوں سے کفر و شرک، الحاد اور صہیونیت کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں گی۔

مسلمان یہ سمجھ چکے ہیں کہ اگر ابراہیم بتوں کے توڑنے پر مامور تھے اور حضرت علی علیہ السلام نے رسول خداؐ کے دوش مبارک پر چڑھ کر کعبہ کے بتوں کو سرنگوں کیا تو آج اس دور میں ابراہیمؑ و محمدؐ و علیؑ کے پیروؤں پر بھی فرض ہے کہ وہ اس مبارک گھر سے کفر و شرک کے آثار مٹا دیں اور ان کی نابودی کے لئے اسی الٰہی مرکز سے قیام کریں۔

دنیا کے مظلوم مسلمان اچھی طرح جان چکے ہیں کہ یہ صرف ابراہیمیؑ حج ہے جو انھیں دنیا

آخرت کے فائدے سے مالامال کرسکتا ہے۔ قرآن کی وعدہ کی ہوئی عزت سے سرافراز کرسکتا ہے۔ امریکہ پسند حج اس خاصیت سے محروم ہے۔ مسلمین سمجھ چکے ہیں کہ مغرب کی معاشی اجارہ داری کا مقابلہ کرنے کے لئے اسی مرکز میں "اسلامی مشترکہ منڈی" کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ مسلمین یہ سمجھ چکے ہیں کہ جب تک سرزمین حجاز پر امریکی و برطانوی کمپنیوں کی حکمرانی باقی رہے گی اور جب تک یہ پلید بت سرنگوں نہ ہوں گے اس وقت تک مسلمان چین کا سانس نہیں لے سکتے۔ مسلمین یہ سمجھ چکے ہیں حج کی یہ عظیم کانفرنس انھیں کفر و استکبار کے سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی تسلط سے نجات دلاسکتی ہے۔ اسی لئے وہ امریکہ و برطانیہ کے آلہ کار آل سعود سے اس کا مطالبہ کررہے ہیں۔ پاکستانی و ترکی مسلمانوں کے مظاہرے اسی حق کے حصول کے لئے ہیں اور اسی حق سے محروم رکھنے کے لئے ترکی لبنانی، فلسطینی، پاکستانی جوانوں نیز ایران کے پیرو جوان تمام مسلمانوں کو حج سے روک دیا گیا ہے۔ مکہ کے دروازے ان پر بند کردیئے گئے ہیں۔ اسی حق سے محروم رکھنے کے لئے ۴۰۰ ایرانی و فلسطینی و ... حاجیوں کو خاک و خون میں ملادیا گیا۔

مسلمین عالم، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حرم الٰہی کو اغیار کے آلہ کار و نابیوں کے تسلط سے آزاد کرانے پر کمربستہ ہیں۔ اور اسے کسی ملک کے داخلی معاملات میں مداخلت تصور نہیں کرتے کیونکہ مکہ کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں ہے سواءً العاکف فیہ والباد۔ آج پیروان محمدؐ بانگ دہل یہ سوال کررہے ہیں:

اے کعبہ کے غاصبو! اے راہ خدا میں روڑے اٹکانے والو، اے شیطان بزرگ کے ایجنٹو، اے پلید بتو، اے خائن آل سعود! کیا رسول اعظمؐ نے حج کے دوران مشرکوں سے برائت کا اعلان نہیں کیا تھا (انّ اللہ بریءٌ من المشرکین و رسولہ) کیا آج امریکہ و اسرائیل کفر و شرک کا واضح و بیّن مصداق نہیں ہیں؟ سرزمین الٰہی پر امریکی و برطانوی طاغوت پوری آزادی کے ساتھ دندناتے پھریں لیکن اسلام کے وفادار ایرانی مسلمان حج سے محروم رہیں اور حرم امن الٰہی میں ان کا خون ناحق بہا یا جائے، تمہیں یہ جان لینا چاہیئے کہ مسلمان بیدار ہوچکے ہیں وہ اپنے حق کے حصول کے لئے ثبات قدم کے ساتھ کوشاں رہیں گے۔ وہ محمدؐ و ابراہیمؑ کی طرح

امتحانی منزلوں میں صبر کرتے رہیں گے۔ اور ان شاء اللہ کسی سیاسی، اقتصادی اور فوجی طاقت کو اللہ کا شریک قرار نہیں دیں گے، اپنے پیغمبرؑ کی طرح تمہاری اور تمہارے آقاؤں کی منشا کے خلاف ایک دن فاتحانہ انداز میں سرزمین حرم پر قدم رکھیں گے اور ابراہیمی حج کا نمونہ پیش کریں گے۔

●

جملہ ابھی اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا کہ سرزمین حرم سے ایک اور دل ہلا دینے والی خبر نے پورے عالم اسلام کو مبہوت اور غم والم کے سمندر میں غرق کر دیا۔ عین عید قربان کے دن جب خدا کے عزیز بندے منیٰ میں شیطانوں کو سنگسار کرنے میں مشغول تھے۔ شہر اور منیٰ کے درمیان چھ سو میٹر لمبی ایک ٹنل میں ایک دلدوز حادثہ پیش آیا اور دیکھتے دیکھتے ایک ہزار چار سو چھبیس (۱۴۲۶) افراد جاں بحق اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔ یہ حادثہ کیسے پیش آیا اور اس کے اسباب کیا تھے اب تک حکومت فہد اور اس کی حلیف عالمی خبر رساں ایجنسیوں نے اس سلسلہ میں مختلف اور متضاد بیانات دیئے ہیں جن سے دنیا کے مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں اور ذہنوں میں چند باتیں ابھر رہی ہیں:

۱۔ حادثہ اس قدر مشکوک ہے کہ اسے حادثہ کا نام دینا مشکل نظر آتا ہے اور ہو سکتا ہے جب اس مشکوک اور سربستہ راز سے پردہ اٹھے تو حجاج کرام کے ایک اور بہیمانہ قتل عام کا منظر نگاہوں میں پھر جائے۔

۲۔ اور اگر بفرض محال یہ حادثہ ہی ہے اور اچانک سرنگ میں گیس کی پائپ لائن پھٹنے یا بجلی فیل ہو جانے کے نتیجہ میں رونما ہوا ہے تو اس سے حکومت فہد و آل سعود کی نااہلی اور بدانتظامی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ تیل کی اتھاہ دولت کے علاوہ حاجیوں سے لئے جانے والے بھاری ٹیکسوں کے عوض حکومت آل سعود کا یہ جان لیوا انتظام اس کے کھلے ناکارہ پن کا ثبوت ہے۔

۳۔ دنیا کے مسلمان اب پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ان مقدس مقامات کا انتظام اس ظالم، سفاک اور نااہل حکومت کے بجائے مشترکہ طور پر پوری دنیا کے اسلامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

آخر میں ہم تمام درد مند مسلمانوں سے یہ درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر اس زاویے سے بھی غور کریں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ حکومت آل سعود اپنے صہیونی آقاؤں کے اشارہ پر ان سفاکانہ و بہیمانہ اقدامات کے ذریعہ مسلمانوں میں دہشت پھیلانا چاہتی ہے کہ اس طرح حاجیوں کی تعداد میں کمی آ جائے پھر آل سعود، جو من مانی چاہے کرے اور ایک دن صہیونیت اپنے دیرینہ خواب کو مجسم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

جناب مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

تفسیر

سورہ نساء آیت نمبر ۳۲ — ۳۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اور اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں جو کچھ زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملتا ہے جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے جو وہ حاصل کریں اور اللہ سے اس کے فضل و کرم کا سوال کرو۔ یقیناً، اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾

تفسیر:

مفسرین نے نزول آیت کے ضمن میں دو روایتیں لکھی ہیں:

ام المومنین ام سلمہ رضوان اللہ علیہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کی: مردوں پر

جہاد ہے۔ عورتوں کو جہاد کی اجازت کیوں نہیں؟ عورتوں کو میراث میں مردوں کے حصے سے آدھا کیوں دیا گیا ہے؟ ہم مرد ہوتے تو جہاد میں جاتے۔ معاشرے میں برابر کا درجہ حاصل کرتے۔

جب آیت اتری اور لوگوں کو حکم معلوم ہوا تو مردوں نے کہا، جس طرح دنیا میں ہمارا حصہ دوگنا ہے اسی طرح آخرت میں ہوتا تو کیا اچھا تھا۔ اور خواتین نے کہا کہ جیسے میراث میں ہمارا حصہ کم ہے کیا ہی ویسا ہی سلوک آخرت میں ہو اور مردوں کے مقابلے میں ہمیں وہاں سزا بھی کم ملے۔

آیت میں ان سوالوں کا جواب بھی جو بیان ہوئے اور ایسے مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے جو فکر بشر میں پیدا ہو رہے یا آئندہ سامنے آئیں گے۔

—ولاتتمنوا ما فضل اللہ ......

کائنات میں بلندی و پستی، کمزوری و شہ زوری کا وجود عام ہے۔ کوئی چیز سخت ہے کوئی نرم، کوئی خطہ سرد ہے کوئی گرم، کبھی رات ہے کبھی دن، کوئی کالا ہے کوئی گورا، کوئی جوان ہے کوئی بوڑھا کوئی مرد ہے کوئی عورت۔ درجوں کا یہ فرق اور مخلوقات کی یہ جہتیں، سائنسی نظام اور حیاتیاتی انتظام پر قائم ہیں۔ ان کی تہہ در تہہ حکمتوں تک پہنچنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ابھی تک اس بارے میں علم بشر نارسا ہے۔ جبکہ علم و حکمتِ خالقِ کائنات ہر شئے پر محیط ہے۔

خود جسم انسانی میں، دماغ مرکزِ ادراک احساسات ہے۔ آنکھیں روشنی کا خزانہ، کان آوازوں کو سمیٹنے کا آلہ، زبان لذت آشنائی کا مرکز، اور اظہارِ مافی الضمیر کا ذریعہ۔ سر بلند ہے، پیر زمین سے لگتے ہیں، ہاتھ اونچے ہیں، سینہ جسم کا بالائی اور شکم حصۂ زیریں ہے۔ اسی فرق میں ہر حصے کے حقوق و فرائض و نتائج کار و حصولِ خوراک پر غور کر لیجئے، بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور کہنا پڑے گا کہ اللہ نے جیسے جہاں خلق کیا ہے وہی صحیح ہے اور کسی جزو بدن کو دوسرے کی جگہ آنے کی خواہش یا کسی کی جگہ بدلنے کی سعی غیر منطقی اور یقیناً نقصان دہ عمل ہے۔

انسانی معاشرے میں، مرد و عورت، ذہین و کند ذہن، تندرست و بیمار، شہری و دیہاتی جیسے فرق موجود ہیں۔ ان طبقات میں جو بھی دوسرے کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہے اسے اپنی نسبت سے اپنی ذمہ داریاں، اپنے فرائض کا احساس ہونا اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے اور جو اپنے آپ کو

کمتر و محروم جانتا ہے اس سے رشک و حسد، لوٹ مار کے بجائے اپنے فرائض اور نظام تمدن و معاشرہ و حیات انسانی میں اپنے حصے کا کام کرنا اور اس میں کمال حاصل کرنا چاہیے۔ یہ وجہ استحصال و ظلم کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے ان کے لئے جو قوانین بھیجے ہیں کسی کو ان سے تجاوز کا حق نہیں ہے انسانوں میں فضل و شرف کا دار و مدار تقویٰ پر ہے۔

— للرّجال نصیب مّمّا اکتسبوا . . . . .

مرد و زن کا تخلیقی، جبلّی، فطری اور دائرۂ کار کا فرق، نظام انسانیت کی بقاء و ترقی کے لئے ہے استحصال و استحصال کے لئے نہیں۔ دونوں کے الگ الگ فرائض و حقوق ہیں، جو اپنے فرائض ادا کرے گا۔ اسے اس کے کسبِ کار کا صلہ عدل و انصاف و مساوات کے مطابق دیا جائے گا۔ دونوں تجارت کریں، دونوں آزاد اور اپنے اپنے منافع کے مالک ہیں۔ دونوں محنت مزدوری کریں ان کی اجرت کارکردگی کے اعتبار سے دی جائے گی دونوں اپنی کمائی کے مالک، دونوں عبادت کریں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں دونوں کو اجر مساوی ملے گا۔ نان و نفقہ، حمل و تربیت، حصۂ میراث، دائرۂ کار اور زندگی کے بعض حصوں میں جنسی فرق کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ اس فرق کے بغیر انسانی زندگی اور معاشرتی ڈھانچہ بگڑ جائے گا۔

— وسئلوا اللہ من فضلہ —

فضل، برتری۔ عطیہ و احسان۔ رحمت و انعام۔ روزی اور خوشحالی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس آیت میں فضل کے معنے ہیں انتظارِ فرج (طبری)، عبادت و ثواب۔ نیز رزق و روزی جیسا کہ سورۂ جمعہ میں ہے .... فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۞ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ ....." جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو ذکر الٰہی کیلئے تیزی سے جاؤ، یہ تمہارے لئے اچھا ہے اگر تم صاحب علم ہو۔ اور جب نماز تمام ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور فضل الٰہی (روزی) کی جد و جہد و تلاش میں نکلو۔

آیت زیر نظر میں تعلیم یہ ہے کہ دوسروں کی برتری دیکھ کر، حسد اور خیالوں میں الجھنے،

احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے بجائے کسب، کار، محنت و کوشش کرو۔ اور جو مال وا عزاز شرعی طور پر حاصل کر سکتے ہو وہ حاصل کرو۔

۔ انّ اللّٰہ کان بکلّ شیءٍ علیماً — یہ بات پیش نظر رہنا چاہئے کہ اللّٰہ عزّ اسمہ دلوں کے بھید، سعی و عمل کی راہوں اور مقاصد سے کما حقہ عالم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا

مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ
أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿۳۳﴾

ترجمہ:

اور ہم نے ایسے وارث مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتے داروں کا ترکہ لیں۔ اور جن لوگوں سے تم نے عہد کیے ہوں، ان کا حصہ ادا کرو۔ اللّٰہ ہر چیز کا شاہد و ناظر ہے ﴿۳۳﴾

تفسیر

موالی : جمع مولیٰ ، وارث۔

الاقربون : اقرب، زیادہ قریبی [illegible] ، اس سے وارثوں کے لیے کلیہ بنا "الاقرب فالاقرب"

— لکلٍّ جعلنا موالی ممّا ترک الوا[illegible] : — والدین کے ترکے میں چھوڑی ہوئی چیز ملنے کے لئے ہر شخص کا وارث اللّٰہ نے مقرر کیا — "لکلّ" میں آنحضرت بھی داخل ہیں لہذا ان کی وراثت ان کی دختر کو از روئے قرآن ملنا واجب ہے۔

آیت میں وارثوں کی مجموعی تقسیم کی گئی ہے:

۱۔ والدین، جن میں ماں باپ، دادا، [illegible]، نانا، نانی اوپر کی پیڑھی تک — یہ لوگ اولاد

یا در اولاد کے وارث ہوں گے ـ اور ان کے وارث ـ

۲- اقربین ، اولاد ، ان کی عدم موجودگی میں ان کی اولاد نچلی پیڑھی تک بھائی، چچا ، خالہ ...

۳- والّذین عقدت ایمانکم ـ "عقدِ یمین" معاہدہ ، داھنے ہاتھ کی گرہ ـ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد ائمہ علیہم السلام آتے ہیں کہ وہ اس کے وارث ہیں جس کا کوئی وارث نہ ہو ـ نیز ، عقد یک عقدِ ضامن جریرہ ـ

ضامنِ جریرہ ، وہ شخص ہے جس سے یوں عقد واقع ہو ؛

عاقدتک علیٰ ان تنصرنی وانصرك وتعقل عنّی واعقل عنك وترثنی وارثك" اس کے جواب میں فریق ثانی کہے ، "قَبِلْتُ" یعنی میں تم سے پیمان کرتا ہوں کہ میری مدد کروگے میں تمہاری مدد کروں گا ، تم میرے جرمانے ادا کروگے میں تمہارے جرمانے ادا کروں گا تم میرے وارث ہوگے ، میں تمہارا وارث ہوں گا ـ دوسرا شخص کہے ؛ میں نے قبول کیا ـ

تفصیلات "ولاء" کے لئے دیکھئے کتبِ فقہ ـ

خلاصہ یہ ہوا کہ ـ اللہ عزّ اسمہ ہر معاملے کا حاضر ناظر ہے اس لئے مسلمانوں کو اطاعت میں سرتابی اور اداءِ حقوق میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے ـ جس کا جو حصہ ہے وہ ادا کرتے میں بھلائی اور حصولِ رضاء الٰہی ہے ـ

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ
نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ
فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

عَلِيًّا كَبِيرًا ۝ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا
حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا
يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝

ترجمہ

مرد، عورتوں پر ذمہ دار سربراہ ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں ایک کو دوسرے پر برتری (و فضیلت) دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ لہٰذا صالح عورتیں وہ ہیں جو اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ جو تحفظات اللہ نے ان کے ذمے کئے ہیں، پیٹھ پیچھے ان کا تحفظ کرتی ہیں۔ اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں سمجھاؤ۔ اور خواب گاہوں میں ان کو الگ رکھو۔ اور انھیں مارو۔ اب اگر اطاعت کرنے لگیں تو پھر ان پر دست درازی کی راہ نہ ڈھونڈو یقیناً، اللہ برتر، بزرگ (کبریائی والا) ہے (۳۴) اور اگر تم میاں بیوی میں پھوٹ کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد اور ایک ثالث عورت کے رشتے داروں میں سے معین کرو۔ اگر وہ دونوں اصلاح (حالات) چاہیں گے تو اللہ، ان دونوں میں موافقت کی صورت پیدا کرے گا۔ یقیناً اللہ جاننے والا ہے، باخبر (۳۵)

تفسیر:

۳۴ ——— الرِّجَالُ قَوَّامُونَ ...

قوّام: مبالغہ کا صیغہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ دیکھ بھال کرنے والا۔ معاملات کو درو براہ رکھنے والا۔ کفالت کرنے والا۔ سربراہ۔ نگرانِ اعلیٰ۔ حاکم۔

عورت فطرتاً اور نفسیاتی طور پر مرد سے قوت محسوس کرتی ہے۔ اسے مرد کی نگہبانی درکار رہتی ہے۔ حفظِ ناموس اور جنسی خواہش کے لئے۔ اس کے علاوہ زمانۂ حمل اور عملِ تولید کے قبل و بعد امورِ معاش و خانہ داری میں اور معاملات کی تدبیر و مشورہ، سربراہی کے وقت، عورت کو شوہر کے وجود سے

تقویت اور نفسیاتی سکون ملتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات

مرد کسب و کار، ضبط و نظم، دیکھ بھال میں ذہنی اور تخلیقی بنا پر برتری رکھتا ہے۔ اس کی طرف ایک معجزانہ اشارہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۷ میں ہے۔

اللہ جل جلالہ نے عائلی زندگی اور معاشرتی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لئے مردوں کو عورتوں پر حاکمیت و سربراہی عطا کی۔ اور اس کی دو حکمتیں اس آیت میں بیان فرمائیں۔ ایک یہ وجہ، خلقت، فطرت اور اندرونی بیرونی طور مرد چند ایسے خصوصیات کا حامل ہے جو خواتین میں موجود نہیں۔ دوسرا سبب ہے، مرد کا عورت پر روپیہ پیسہ خرچ کرنا۔ یہ واقعہ و مشاہدہ ہے کہ عورت کے اخراجات مرد سے زیادہ ہوتے ہیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف غذائیں اور لباس میں اس کی ضرورت اور پسند، زیور اور گھر کی زیب و زینت اور جسم کو آراستہ و معطر رکھنے کی ہر آن نئی خواہش ایسی بات ہے جس کے لئے محنت و کوشش اور کمائی بھی درکار ہوتی ہے اور مال خرچ کرتے وقت ایک بالادست سرتاج کا مشورہ، فیصلہ اور کبھی کبھی حکم بھی ضروری ہوتا ہے اسی مفہوم کی وسیع تر ادائیگی کے لئے "قوامون علی النساء" کے الفاظ اور جملہ بڑا اعجازی نوعیت رکھتا ہے۔

حاکم یا سربراہ، کفیل اور سرپرست' ہمہ وقت نگرانِ کار کے معنے، بادشاہ، آمرِ مطلق، جابر فرماں روا نہیں، بلکہ ذمہ دار باللوست' خدمت گزار مراد ہے۔ ایسا حاکم، جو عائلی زندگی کو خوش و خرم رکھے گھر کا ضبط و نظم قائم کرنے میں مدد دے، غلطی پر روک ٹوک سکے۔ ضروریاتِ زندگی فراہم کرے اور مستقبل ہوشمندانہ نظر رکھنے والا۔ جو تربیت کے معاملے میں، ذہنی، فکری اور وسیع تر تجربوں کے مطابق صحیح راہ پر بیوی کو چلنے میں مدد دے۔

۔ فالصّٰلحٰت ۔ مرد کی فضیلت کے بعد، عورت کی تعریف فرمائی ہے۔ صالح عورت نیکوکار بیوی ۔ یعنی نیک رفتار، نیک گفتار، نیک کردار، صحیح عقیدے اور اللہ، رسولؐ و ائمہؑ کی اطاعت گزار شوہر کی خیر خواہ و پابند رضا بیوی (قانت ۔ فرماں بردار، دعاگو)

۔ حافظات للغیب ۔ بما حفظ اللہ ۔ اللہ عزوجل نے عائلی زندگی میں زن و مرد کے لئے جو تحفظات و حقوق مقرر کئے ہیں ان میں معزز بیوی وہ ہے جو شوہر کی غیر حاضری میں اپنی ذات و ناموس، شوہر کے احترام، گھر کے راز اور بچوں کی نگہداشت اور، روپے پیسے کے استعمال میں ایسا رویہ رکھے جو شریعت و اخلاق کے مطابق ہو۔ ایسی بیویاں احترام کے قابل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کے بعد دوسرا اہم فائدہ مسلمان کا یہ ہے کہ اسے وہ مسلمان شریک حیات ملے کہ جب اسے دیکھے تو خوشی ہو، جب کہے تو وہ بات مانے، جب وہ گھر میں نہ ہو تو بیوی اپنی ذات اور شوہر کے مال اور اللہ کے دیئے ہوئے تحفظات کی نگہداشت کرے (صافی)

۔ والّاتی تخافون نشوزھنّ ۔ قابل تعریف و احترام بیویوں کے بعد ان انواع کا تذکرہ ہے، جو بحیثیت بیوی کے غیر ذمہ دار ہوں۔ ایسی بیویاں بد اخلاقی اور سرکشی کرتی ہیں، شوہرسے ہم آہنگی چھوڑ کر گھریلو زندگی میں خلفشار پیدا کرتی اور اپنی نفسیاتی افتاد کو تیز کردیتی ہیں۔ ایسی بیویوں کے لئے قانونی طور پر تین اقدام کیے جاسکتے ہیں۔ تنبیہ و فہمائش۔ ابتدائی سزا، ترک ہم بستری ۔ مار۔

۱۔ فعظوھنّ : ایسی سرکش بیویوں کو سمجھاؤ۔ خوف خدا یاد دلاؤ، اسے آخرت کے عذاب و ثواب، گھر کی تباہی، زندگی کی مشکلات جیسے حوالے دو، غرض اس کو سرکشی و علیحدگی سے روکو۔ زبان اور دلیل سے بات بناؤ۔ اگر پھر بھی حالات قابو میں نہ آئیں تو ثانی کرو جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

۲۔ واھجروھنّ فی المضاجع ۔ مضجع، لیٹنے کی جگہ۔ مراد ہے وہ جگہ جہاں میاں بیوی ساتھ سوتے ہیں۔ ھجر۔ چھوڑنا۔ دوسرا قانونی قدم یہ ہے کہ نافرمان اور ساتھ نہ دینے والی بدمزاج بیوی کے ساتھ سونے میں اس کی طرف پشت کرلیا کرو (حدیث امام باقر علیہ السلام) اس کے بستر سے دور رہو۔ اس سے نفسیاتی سزا اور غصے کا اظہار مقصود ہے اور ایک غیرت دار بیوی کے لئے یہ قدم سخت ہوگا۔

۳۔ واضربوھنّ ۔ تیسری سزا۔ مار ہے۔ قانون شکنی، جرم میں شدت اور ذمہ داریوں کی توہین ہے۔ عائلی زندگی کو زہرناکی سے بچانے کی آخری اصلاحی کوشش بدنی سزا ہے کہ اس سے

نفسیات میں تبدیلی، غیرت میں جوش اور غلطی کا احساس ابھر سکتا ہے۔ یہ حکم بالکل انصاف و حکمت پر مبنی ہے۔ تو ہین زن کا سبب اس کا نشوز ہے۔ اس کا اپنے احترامات و فرائض کو پامال کرنے اور دو سزاؤں کے بعد بھی اصلاح احوال نہ کرنے کی یہ سزا قانون کی سائنس کے عین مطابق ہے۔ مارنے کے لئے مسواک کے برابر چھڑی کے استعمال کی نصیحت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اور اس کی آخری حد یہ ہے جہاں ہڈی نہ ٹوٹے۔ جلد پر نشان نہ پڑے نقصان دہ نہ ہو۔

یہ سب باتیں طلاق سے پہلے بحالی تعلقات کی خاطر ہیں کیونکہ اسلام عائلی زندگی کا شیرازہ توڑنے کا حامی نہیں ہے، اسی لئے واضح تاکید فرمائی ہے کہ۔ اگر بیویاں بات مان لیں اور اطاعت شعار بن جائیں تو ان کے خلاف رویہ اختیار نہ کیا جائے اور شوہر الزام تراشیاں اور تجاوز نہ کریں۔ یاد رہے کہ اللہ، بلندی و کبریائی کا مالک ہے۔

۳۵ ـــــ وان خفتم شقاق بینھما . . .

میاں بیوی باہمی مفاہمت نہ کر سکیں اور صورت حال جدائی کے خطرے سے دوچار ہو تو اسلام کی نظر میں دونوں خاندانوں کی ذمہ داری ہے کہ آگے بڑھیں، شوہر اپنے خاندان کا ایک دانا بینا بالغ و تجربہ کار، ثالث نامزد کرے اور ایک ثالث بیوی اپنے خاندان سے مقرر کرے۔ اس طرح نفسیاتی جذباتی اور خاندانی مفادات کا تحفظ ممکن الحصول ہوگا، ایک گھر کا اجاڑ، مزید دو گھروں پر اثر انداز ہونے کے خطرے سے دوچار ہو کر سب کو مفاہمت اور آبرومندانہ حل پر مجبور کرے گا۔ اور اگر دونوں ثالث مخلصانہ جدوجہد کے لیے تیار ہو گئے تو علیم و خبیر اللہ، تعلقات کی بحالی کی راہ دکھائے گا۔

قرآن مجید کی یہ رہنمائی فطرت انسانی اور معاشرتی بھلائی، سماجی اصلاح اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے لئے کس قدر اہم ہے، اسے علم نفسیات کے ماہر سمجھ سکتے ہیں۔

مثلاً:

قانونی عدالتیں اور قاضی کے سامنے دعوے اور قانون کے تقاضے ہوتے ہیں، وہ قانون

کے نظام اور فیصلۂ مقدمہ کا پابند ہوتا ہے، وہ نجی معاملات سے دلچسپی نہیں رکھ سکتا۔

عام عدالتوں میں جنسی جھگڑے بڑی عجیب روش اختیار کر لیتے ہیں۔ پہلے تو میاں بیوی کے ایک دوسرے کے خلاف بیان نجی معاملات اور خلاف حیا باتوں اور رازوں کے پردے چاک کرتے ہیں پھر ان پر جرح اور غیروں کی دل لگی سے جگ ہنسائی اور رسوائی کے اسباب فراہم ہوتے ہیں، دو آدمیوں کی لڑائی دو خاندانوں بلکہ پورے معاشرے کو بدنام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مقدموں کے اخراجات اور اس سلسلے میں دوڑ دھوپ مستقل عذاب ہے۔

اسلام کے نظریۂ ثالثی میں اول تو یہ خروج اور مذاق نہیں، دوسری بڑی بات، رازداری ہمدردی اور مفاہمت و مصالحت کے عزیزدارانہ جذبات اور اپنوں کی بات ماننے منوانے کے امکانات کے جیسے متعدد روشن پہلو سب کے سامنے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات اللہ کی رضا اور حصول ثواب کی نیت اور اللہ کے علیم و خبیر ہونے کا عقیدہ ساتھ ہوتا ہے۔

تجربے گواہ ہیں کہ ایسی ثالثی عموماً اچھے نتائج دیتی ہے۔ اور گھر آباد ہو جاتے ہیں۔ نیز دیکھئے آیات ۱۲۷ بعد۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾

ترجمہ:

اور تم سب اللہ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اور ماں باپ سے حسن سلوک کرو نیز قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور قریبی پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پہلو نشین اور مسافر اور جو تمہاری ملکیت میں ہوں ان سے

حسن سلوک کرو، بیشک اللہ، کسی ایسے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں اکڑنے والا اور شیخی خورا ہو۔ (۳۶)

تفسیر

عائلی زندگی سے خاندان، خاندان سے معاشرے اور عام انسانوں سے نیکی و حسنِ سلوک کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ تعلقات اور معاشرتی آداب سے پہلے یہ بات یاد دلائی ہے کہ انسانیت کی ابتداء اور فکری رفتار کا آغاز نیز عملی رویّوں کا اہم ترین نظریہ و عقیدہ اللہ کی اطاعت و بندگی ہے اور اللہ عزّ اسمہ کو وحدہ لاشریک جاننا اور ماننا ہے۔ اس عقیدے کے بغیر ایسے کام کرنے والا خود فریب و مغرور ہے۔ اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا، گویا اس کے یہ احسان حسنِ عمل ہی نہیں ہیں۔

آیت میں جن لوگوں پر احسان و حسنِ سلوک کا تذکرہ ہے وہ یہ ہیں:

والدین ــــ جن کی محنت، محبت اور احسان کی بدولت آدمی کسی قابل بنتا ہے۔ ماں اور باپ کے احترام اور ان کی اطاعت اور ان سے احسان کا سلوک بار بار یاد دلایا ہے۔ مادّی و جسمانی پرورش و پرداخت کرنے والوں کے ساتھ روحانی نگہداشت و رہنمائی کرنے والے بھی اس حکم کے اہم ترین مصداق ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: "میں اور علیؑ اس امت کے دو باپ ہیں" (تفسیر عیاشی)

رشتے دار ــــ جن کی محبت، تعاون اور نسلی سلسلے سے ایک قسم کی معاشرتی اکائی جنم لیتی ہے اور خاندان جیسے اہم حلقے کو قوت ملتی ہے۔

یتیم ــــ بن باپ کے بچے، قرآن مجید اس گروہ پر خاص توجہ دلاتا ہے۔ اس طبقے کی دلدہی، اس سے حسنِ سلوک اللہ کو بہت پسند ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی دو انگلیوں کو بلند کر کے فرمایا تھا، یتیم کی کفالت کرنے والا، اور میں جنت میں یوں ہوں گا ــــ یعنی پہلو بہ پہلو ــــ

مسکین ــــ محتاج، وہ لوگ جو ضروریاتِ زندگی سے محروم ہوں۔

قریبی پڑوسی ــــ حدیث میں ایک گھر سے متصل چالیس گھروں تک پڑوس کہا گیا ہے اور اللہ نے ان کے حقوق کی اتنی تاکید فرمائی کہ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ میراث کی شرکت کا حکم بھی آئے گا۔

۔ الجار ذی القربیٰ ۔ کے لفظی معنی تو قریب کے ہمسایہ ہیں لیکن قریب سے مراد عام ہے۔ مکانی قرب ہو یا نسبی یا دینی قربت۔ سب اس کلمہ میں داخل ہیں، کیونکہ اس کے بعد جار الجنب ۔ دور کے پڑوسی کا تذکرہ ہے۔

جار الجنب ۔ دور کا پڑوسی، یہ دوری مکان، عقیدے اور نسب سب کو شامل ہے۔ وسیع مفہوم کے پیش نظر، مردِ مومن کے احسان کا دائرہ قریب اور دور کے پڑوسیوں تک ہونا چاہیے۔

پاس یا پہلو کا ساتھی ۔ الصّاحب بالجنب ۔ جنب ۔ پہلو کو کہتے ہیں۔ یعنی رفیقِ کار درس کا ساتھی۔ ہم سفر اور ہم نشین۔

مسافر ۔ دور از وطن ۔ جو تمہارے گھر، بستی یا قرب جوار میں آجائے یا گزرتے ہوئے ٹھہرے۔ اس سے حسنِ سلوک بھی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

لونڈی، غلام ۔ تمہارے خادم اور زر خرید بھی احسان کے مستحق ہیں۔ آنحضرتؐ اور ائمہؑ نے ان افراد کے ساتھ احسان کی مثالِ بے مثال پیش کی ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اللہ عزاسمہٗ نے لوگوں پر احسان کی تاکید فرمائی ہے ان میں غلاموں اور کنیزوں کا نام اسی طرح رکھا ہے جس طرح والدین اور رشتے داروں کے نام ہیں۔

۔ ان اللہ لا یحب مختالا فخورا ۔ مختال، اپنی دولت پر اترانے اور اپنی ذات پر گھمنڈ کرنے والا۔ اپنے پندار میں مبتلا ۔ فخور ۔ بڑھ چڑھ کر اپنی دولت مندی اور بڑائی جتانے والا۔ شیخی خورا ۔ ناشکرا۔

اللہ عزاسمہ، اس سے محبت کرتا ہے جو اس کے حضور عاجزی کرے۔ اور بندگانِ خدا سے جھک کر ملے۔ ان کے حالات سے ہمدردی برتے، دوسروں کے کام آئے۔ خود پسند و مغرور شخص اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ (نیز دیکھئے سورۃ البقرہ آیت/ ۱۷۷)

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ
وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ "

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا
بِالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا
عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ ۚ وَكَانَ
اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿۳۹﴾

ترجمہ

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کا حکم دیتے ہیں۔ اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے جو انھیں دیا ہے، اسے چھپاتے ہیں۔ اور ہم نے کفرانِ نعمت کرنے والوں کے لئے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے ﴿۳۷﴾ اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ یوم آخرت پر۔ اور جس کا ساتھی شیطان ہوا تو برا ساتھی ہو ﴿۳۸﴾ ان کا کیا بگڑتا۔ اگر اللہ اور قیامت پر ایمان لے آتے اور اللہ تعالیٰ نے جو انھیں دیا اس میں سے خرچ کر دیتے۔ اور اللہ ان سے خوب واقف ہے۔ ﴿۳۹﴾

تفسیر

۳۷ ــــ الذین یبخلون و یأمرون ....

انفاق: اللہ عزاسمہ جن خود فریفتہ ومتکبر اشخاص کو ناپسند فرماتا ہے ان میں یہ صفت بھی ہوتی ہے کہ وہ لوگ خود تو کنجوس اور مال دوست ہوتے ہی ہیں، اس سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی مال بچانے اور ضرورت مندوں پر خرچ نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، وہ اللہ کے انعامات وکرم مال، علم اور دوسرے امکانات کو لوگوں کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ ان منکرین حق اور دین کے باغیوں بلکہ کافروں کے لئے رسواکن عذاب کی خبر ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ میں، اللہ، قیامت، ملائکہ اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ ایمان کی شرط عزیز مال کا ضرورت مندوں پر خرچ اور انفاق بھی ہے۔ جو انفاق نہیں کرتے وہ ایمان سے دور ہیں۔

۳۸ ـــــ والذین ینفقون .....

کچھ لوگ ایسے ہیں جو "انفاق" ـ مال خرچ ـ کرتے ہیں، لیکن اپنے پروپیگنڈے سے اپنی برتری اور اپنی نمود و نمائش کے لئے اللہ جل جلالہ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل کے مقابلے میں اپنی ذات اور اپنے ارادے کو اولیت دے کر طاغوت بن بیٹھتے ہیں۔ ایسے آدمی نہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں نہ قیامت کا اعتقاد رکھتے ہیں، در اصل ان حقائق کا منکر کافر ہے، ان کا ساتھی شیطان ہے اور شیطان کا ساتھی بدترین نتائج سے دوچار ہوتا ہے۔

۳۹ ـــــ وماذا علیہم لو آمنوا .....

یہ لوگ اگر حقائق کو مان لیں، اللہ پر ایمان اور قیامت کا یقین پیدا کرلیں۔ تو ان کا کیا نقصان ہوگا؟ یہ عقیدے تکمیل انسانیت کے لئے ضروری اور فطرت سلیم کے مطابق ہیں۔ دلائل عقل اس کے حق میں ہیں، انبیاء کی تعلیم اور قرآن کریم جیسی عظیم کتاب کی دعوت ہے۔ اس سے دنیا و آخرت میں فائدے ہی فائدے ہیں ـــ وانفقوا مما رزقہم اللہ ـــ دولت رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اگر انفاق، ایمان باللہ اور ایمان بہ قیامت یعنی اسلامی عقیدے کے ساتھ انفاق مل کرے گا، تو اس کے بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔ اللہ، ان کے اعمال و افکار انفاق و ضیاع مال کے جزئیات و کلیات کا علم کامل رکھتا ہے وہ علیم بالذات ہے۔ اس سے کسی چیز کے چھپنے چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز دیکھئے، البقرہ آیت ۳ و ۲۷۲ و ۲۷۳ وغیرہ

حضرت موسیٰؑ

(تقریباً ۱۳۰۰ سال قبل مسیح)

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ کو مصر میں بنی اسرائیل کی نجات کے لئے معین فرمایا۔ یہ قوم جو جناب ابراہیمؑ کے پوتے جناب یعقوبؑ کی اولاد سے، حضرت یعقوبؑ کے فرزند حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں مصر آئی اور سالہا سال کی افزائش نسل کے بعد ان کی تعداد ہزاروں افراد تک پہنچ گئی۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ کی شان و شوکت اب ان میں نہ رہی اور نتیجتاً وہ فراعنہ کے پنجۂ ظلم و ستم میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے ساتھ غلاموں، غیر قوموں اور اسیروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ خود بھی اس قوم کی ایک فرد تھے اور حیرت انگیز حالات کے تحت خود فرعون کے دربار میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے ان ہی دنوں ایک کشمکش کے دوران فرعون کے قبیلہ کا ایک (قبطی) شخص آپ کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا لہٰذا آپ وہاں سے کنعان کی طرف چلے گئے وہاں آپ کی ملاقات حضرت شعیب پیغمبر سے ہوئی اور آپ نے ان کی ایک صاحبزادی سے شادی کر لی۔ چند برس کے بعد اپنی قوم والوں سے ملاقات کی غرض سے مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں خداوند عالم کی جانب سے پیغمبری کے لئے مبعوث ہوئے اور اپنی قوم کی ہدایت اور فرعون کے ظلم سے بنی اسرائیل کو نجات دلانے پر مامور کئے گئے۔ اس کام کے لئے آپ کے بھائی ہارون بھی آپ کے مددگار کے طور پر منتخب ہوئے۔ سورۂ طٰہٰ میں آیت ۴۳ کے بعد سے اس کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے: "تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، کیونکہ اس نے سرکشی پر کمر باندھ

رکھی ہے، اس سے نرم لہجہ میں گفتگو کرو، شاید وہ ہوش میں آجائے یا اپنی بدکرداری اور عذاب الٰہی سے خوف زدہ ہوجائے۔ دونوں نے عرض کی: خداوندا ہم ڈرتے ہیں کہ وہ کہیں ہمارے ساتھ زیادتی نہ کرے یا سرکشی پر اتر آئے۔ اللہ نے فرمایا: ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں"

حضرت موسیٰ کی ہدایت کی اساس و بنیاد کو سمجھنے اور ان کے مقصد کو جاننے کے لئے اس سے آگے کی آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں: "تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے پیغمبر ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ہمراہ کردے (اور انھیں آزاد کردے)۔ ان پر ظلم و ستم نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے معجزہ اور نشانیاں لے کر آئے ہیں۔ جو راہ راست کی پیروی کرے اس کے لئے سلامتی ہے۔ اور بے شک ہم پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہے کہ بلاشبہ عذاب اسی شخص پر ہے جو دین خدا کو جھٹلائے اور اس سے روگردانی اختیار کرے۔ فرعون نے پوچھا: اے موسیٰ، تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ موسیٰ نے فرمایا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے تمام چیزوں کو خلق کیا ہے اور زندگی اور اس کی بقا کے مناسب طریقے بتائے ہیں ...."

ان آیات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کی ہدایت کا بنیادی مقصد اس قوم کی آزادی اور نجات، کائنات کے خلق کرنے والے خدا کی طرف دعوت، عذاب الٰہی اور قیامت سے ڈرانا ہے۔ اس طرح اللہ کی جانب دعوت۔ قیامت۔ اور انسانوں کی نجات، انبیاء کے بنیادی عمل قرار پائے۔

حضرت موسیٰ کی دعوت و ہدایت کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ لوگ ذلت اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ انبیاء کرام اور ان کی پیروی کرنے والوں کی یہی خاصیت ہے کہ وہ ان زنجیروں کو توڑنے اور انسانوں کو ذلت و بردگی سے آزاد کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں۔ مندرجہ ذیل دو آیتوں سے یہ بات اور واضح ہوجاتی ہے:۔

(سورۂ شعراء، آیت ۱۵) فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم پروردگار عالمین کے رسول ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ (قرآن یہاں فرعون کی باتوں کو نقل کرتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ موسیٰ کو گزشتہ زندگی اور ان کے بچپن کے دوران اپنی خدمات اور سرپرستی کی یاد دلاتا ہے) .... یہ بھی کوئی نعمت ہے جس کے ذریعہ تم مجھ پر احسان جتا رہے ہو جبکہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے (ان عبدت بنی اسرائیل — سورۂ شعراء/۲۲)

سورۂ مومنون کی آیت ۴۵ میں ارشاد ہے :۔

"پھر ہم نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کو روشن نشانیوں اور واضح دلیلوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں اور ہی خواہوں کی طرف بھیجا ۔ انہوں (فرعون اور اس کے درباریوں) نے خود کو بڑا سمجھا اور غرور اختیار کیا اور یہ لوگ مغرور، خود خواہ اور سرکش ہی تھے ۔ لہٰذا ان لوگوں نے کہا: کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں جبکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔" (وقومهما لنا عابدون)۔ سورۂ مومنون/۴۷

فرعون کی تہمتیں اور دھمکیاں

سورۂ یونس کی آیت ۸۳ ۔ ۸۴ میں ارشاد ہے : "موسیٰؑ کی قوم میں چند افراد کے علاوہ کوئی ان پر ایمان نہ لایا ، کیونکہ وہ لوگ فرعون اور اس کے لاؤلشکر سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ انھیں اذیتیں نہ پہنچائیں ۔ حقیقتاً فرعون روئے زمین پر مغرور اور سرکش شخص تھا ۔" اس آیت میں اور بعض دوسری آیات میں فرعون کے ساتھ "ملاء" کا لفظ بھی آیا ہے اور اس سے مراد بھی اس کے درباری اور سردار ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی قوت اور اس کا وجود انھیں سرداروں اور درباریوں سے وابستہ تھا ۔ نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کا ماحول سخت گھٹن، اذیتوں اور صعوبتوں کا ماحول تھا ، اور فرعون غرور و تکبر اور ظلم و ستم کا مجسمہ تھا ۔

سورۂ مومن کی آیات ۲۵ تا ۲۸ میں ارشاد ہے کہ :۔

"جب انہوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ ہماری جانب سے سچا دین لے کر آئے ہیں تو کہنے لگے جو لوگ موسیٰؑ پر ایمان لائے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور ان کی لڑکیوں یا عورتوں کو زندہ چھوڑ دو ، کافرین کی تدبیریں سوائے تباہی کے اور کیا ہیں ۔ فرعون نے کہا : مجھے موسیٰؑ کو قتل کرنے دو ، وہ جس قدر اپنے خدا کو یاد کرنا چاہے یا مدد کے لئے بلانا چاہے بلالے ۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ تمہارے دین کو بدل نہ ڈالے یا زمین پر فتنہ و آشوب اور فساد نہ برپا کرے ۔ موسیٰؑ نے کہا : میں ہر اس خود خواہ و متکبر سے جو روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ۔"

ان آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک موسیٰ پر ایمان لانے والوں کے بیٹے قتل کئے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ فرعون نے خود موسیٰؑ کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا لیکن شاید عمومی مخالفت یا لوگوں کی بغاوت سے خوف زدہ تھا لہٰذا اس نے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ماحول سازگار کرنے کے لئے تہمتوں، دھمکیوں اور ریاکاریوں کا سہارا لیا۔ اور اس طرح وہ خود کو لوگوں کا طرفدار اور موسیٰؑ کو گمراہی کا وسیلہ ظاہر کرتا ہے، ساتھ ہی انھیں فساد اور بدنظمی پھیلانے والے کے عنوان سے یاد کرتا ہے ..... جناب موسیٰؑ کی گفتگو سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف تو فرعون بری طرح سے خود خواہی اور غرور کا شکار ہے دوسری طرف روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں سورۂ زخرف کی آیات ۵۱ تا ۵۷ بھی بہت دلچسپ ہیں:۔

"فرعون نے اپنی قوم والوں سے پکار کر کہا: اے میری قوم والو! کیا مصر کی حکومت میری ملکیت نہیں ہے اور یہ جو نہریں میرے محلوں کے نیچے سے گزرتی ہیں میری نہیں ہیں۔ آیا میں بہتر ہوں یا یہ ذلیل و خوار انسان جو کوئی نام و نمود نہیں رکھتا؟ اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس کے لئے آسمان سے زیورات اور سونے کے دست بند کیوں نہیں نازل ہوتے یا فرشتے اس کے ہمراہ اس کی خدمت میں کیوں نہیں رہتے!!" حکومت کے غرور، زرق برق زندگی اور پر فریب ٹھاٹھ باٹ نے فرعون کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ وہ موسیٰؑ کے پاس جواہرات اور محل نہ ہونے کی وجہ سے انھیں ذلیل و خوار سمجھتا ہے اور اکثر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ پیغمبر ہیں تو ان پر آسمان سے فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے!!

بہر حال موسیٰؑ کے خلاف اس قدر غلط پروپیگنڈے نہ ان کے عمل میں کوئی رکاوٹ ڈال سکے اور نہ ان کی محبوبیت و ہر دل عزیزی میں کوئی کمی لاسکے۔ چنانچہ فرعون نے ایک نئی چال چلی۔ اسی سورہ کی آیت ۵۵ میں ارشاد ہے:۔

فاستخفّ قومہ فاطاعوہ انّھم کانوا قومًا فاسقین

فرعون نے اپنی قوم کو بے حقیقت، خفیف و ذلیل اور پست بنادیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کرلی اور وہ لوگ تو فاسق تھے ہی۔"

سچ ہے اگر لوگوں کو دولت کی لالچ اور پر فریب وعدوں کے ذریعہ یا ڈرا دھمکا کر غلامی

پر مجبور کیا جائے اور لوگ بھی اطاعت کرنے اور تسلیم ہونے کے عادی ہو جائیں تو فطری سی بات ہے کہ ان کا کوئی عزم و ارادہ اپنا نہیں رہ جاتا، ان کی ترقی رک جاتی ہے اور شخصیت مردہ ہو جاتی ہے، انہیں کچھ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ سورۂ قصص کی آیت ۳ میں ہے :۔

بلاشبہ فرعون نے روئے زمین پر بہت سر اٹھا رکھا تھا۔ اس نے اپنی قوم کو پراگندہ اور مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو بری طرح ذلیل و عاجز کر دیا تھا.... اور اس کے خطرناک حیلوں میں سے ایک حیلہ یہ بھی تھا کہ اس نے پہلے لوگوں میں تفرقہ ڈالا اور پھر اسی راہ سے ان پر سوار ہو گیا اور اپنے مخالفین پر ظلم و ستم کرنے لگا۔ سورۂ شعراء کی آیت ۳۰ میں ہے کہ:۔

'فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا : اگر میرے علاوہ کسی اور کو خدا مانوگے تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا"۔ ... اس آیت میں بھی قید کی دھمکی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اپنے آپ کو خدا اور سب سے زیادہ قدرت مند سمجھتا ہے۔ اسی سورہ کی آیات ۲۵ و ۳۶ میں ہے کہ فرعون حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھنے کے بعد ان پر یہ الزام اور تہمت لگاتا ہے :۔

'فرعون نے اپنے گرد جمع افراد سے کہا یہ بہت عقلمند جادوگر ہے اور تمہیں تمہاری اس سرزمین سے جادو کے زور سے دور کرنا چاہتا ہے۔ تم لوگ اس کے بارہ میں کیا کہتے ہو .....؟"

اس آیت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون جناب موسیٰؑ پر جادوگری، فتنہ و آشوب برپا کرنے اور گھروں کو اجاڑنے کا اتہام لگا کر ان کی دعوت کو غلط ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح وہ ان کی ہر دل عزیزی اور ترقی کو روکنا چاہتا ہے۔

فرعون کی شدید ترین دھمکیوں میں سے ایک اور دھمکی جادوگروں سے متعلق ہے۔ ان جادوگروں نے پہلے تو خود کو حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا تھا، لیکن جب انہوں نے موسیٰؑ کے عصا کا عجیب و حیرت انگیز معجزہ دیکھا تو خدا کے لئے موسیٰؑ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گئے اور اس پر ایمان لے آئے۔ جادوگروں کا ایمان لانا معاشرہ کے لئے بے انتہا مؤثر تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے زمانہ کے عظیم دانشور اور مشہور فنکار سمجھے جاتے تھے اور معاشرہ میں ایک ہیبت اور مقام رکھتے تھے۔ اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں تو موسیٰؑ کے پیروؤں کو قوت حاصل ہو جائے گی، لہٰذا فرعون نے انھیں یہ دھمکی دی:۔

"فرعون نے کہا : تم میری اجازت کے بغیر موسیٰ پر ایمان لے آئے۔ موسیٰؑ تم جادوگروں کا سردار ہے

اسی نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے - میں تمہارے ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پیر کاٹ ڈالوں گا اور تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔" (شعراء، آیت ۵۱) لیکن اس شدید دھمکی سے زیادہ دلچسپ بات تو وہ ہے جو ان جادوگروں نے اس کے جواب میں کہی ہے:۔

"لا ضیر انا الیٰ ربنا منقلبون"

کوئی حرج نہیں اگر ہمیں اس طرح قتل کر دیا جائے، بلاشبہ ہم تو اپنے پروردگار کی جانب پلٹنے والے ہیں - اللہ اور آخرت پر ان کا شدید اور قوی ایمان انھیں ہر خطر اور ہر بلا سے مقابلہ کے لئے آمادہ کر دیتا ہے - اور وہ اس راہ میں اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں - یہ دھمکیاں دینا اور دشواریاں پیدا کرنا فرعون سے ہی مخصوص نہیں تھا بلکہ اس کے موقع پرست سود جو اور چاپلوس طرفدار بھی اکثر ایسی باتیں کہا کرتے تھے:۔

"...... کیا تم موسیٰ اور ان کے ماننے والوں کو یوں ہی چھوڑ دو گے تاکہ یہ لوگ زمین پر فساد اور آشوب برپا کریں - اور تجھ سے اور تیرے خداؤں سے دوری اختیار کرلیں - (فرعون نے) جواب دیا - جلد ہی ہم ان کے بیٹوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کی بیٹیوں کو (کنیزیں بنا کر) زندہ چھوڑ دیتے ہیں - ہمیں ان پر تسلط اور قابو حاصل ہے۔" (سورۂ اعراف، آیت ۱۲۷)

استقامت و پائداری کی دعوت

حضرت موسیٰ ان تمام سختیوں، دشواریوں اور دھمکیوں سے مقابلہ کے لئے اپنی قوم سے فرماتے تھے:۔

"خدا سے نصرت طلب کرو اور استقامت و پائداری اختیار کرو - یہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور آخرکار فتح و کامیابی پرہیزگاروں کا حصہ ہے۔" (سورۂ اعراف/۱۲۸)

اور ظاہر ہے کہ یہ مژدہ اور امید و نشاط کی کیفیت اس قوم کی پائداری اور استقامت میں کس قدر مؤثر و کارگر تھی - اس کے بعد والی آیت میں ایک دلچسپ نکتہ کی طرف اشارہ ہے، ملاحظہ فرمائیں:۔

"موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ سے کہا، تمہارے آنے سے پہلے تو ہم ظلم اور سختیوں میں گرفتار تھے ہی، اور اس کے بعد (یعنی تمہاری موجودگی میں بھی) وہی مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔"

(سورۂ اعراف / ۱۲۹)

ظاہر ہے کہ انہیں یہ توقع تھی کہ بلا کسی دشواری کے اچانک غیبی طاقتیں ان کی مدد کو پہنچیں اور انہیں کامیابی حاصل ہو جائے۔ کاہل اور بے جا توقع رکھنے والے افراد ہی ہمیشہ ایسی امیدیں رکھتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ انبیائے کرام کو بھی طویل مدت تک جنگ و پیکار اور سختیاں جھیلنے کے بعد کامیابیاں ہاتھ آئی ہیں جس طرح موسیٰؑ نے بھی اپنی قوم سے یہ تمام باتیں بیان کرنے کے بعد کامیابی و کامرانی کا مژدہ سنایا اور فرمایا:-

"امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے اور روئے زمین پر تمہیں ان کا جانشین قرار دے، پھر دیکھا جائے کہ تم کیا عمل کرتے ہو۔" (اعراف/۱۲۹)

اس آیت کا آخری حصہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ خدا ان سے دائمی خوش بختی کا وعدہ نہیں کرنا چاہتا کہ وہ یہ تصور کر لیں کہ اب ہم ہمیشہ خدا کی نگاہ میں اچھے بنے رہیں گے۔ جو چاہیں کریں خدا ہم سے لطف و محبت سے پیش آئے گا۔ نہیں، بلکہ ان کو اپنے مستقبل کے سلسلہ میں بھی محتاط رہنا چاہئے کہ وہ بھی کہیں ظالموں اور ستمگاروں کی صف میں نہ شامل ہو جائیں اور دوبارہ انہیں خدا کے قہر و انتقام کا نشانہ بننا پڑے۔

قوم یہود

جناب یعقوبؑ کی اولاد جناب یوسفؑ کے زمانہ سے مصر میں ساکن ہوئی۔ چار سو سال کی مدت میں اولاد حضرت یعقوبؑ بنی اسرائیل جیسی عظیم قوم کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ فرعون کے ظلم و ستم اور اسارت و غلامی کا شکار ہوتے گئے۔ حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً تیرہ صدیوں پہلے خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ کو اس قوم کے درمیان سے منتخب فرمایا، تاکہ آپ انہیں فرعون کے مظالم سے نجات بخشیں اور انہیں خدا کی معرفت اور نیک اعمال کی ہدایت فرمائیں۔ حضرت موسیٰؑ اس قوم کو بحر احمر سے گزار کر صحرائے سینا میں کنعان کی جانب فلسطین لے آئے۔ یہیں سے اس قوم کے دینی اور اجتماعی واقعات و حوادث کا آغاز ہوتا ہے:-

بیجا توقعات، دینی انحراف، حیلہ گری و بہانہ بازی، زور آزمائی اور مارکاٹ، محرومیت و آوارگی اور اس کے بعد دوبارہ حیلے، بہانے، حملہ اور انتقام ...

بت پرستوں کی طرف سے گزرے تو بت پرستی کی خواہش بیدار ہوئی۔ اور حضرت موسیٰؑ سے پرستش کے لئے ایک بت کا تقاضا کرنے لگے۔[1] جب قوم کے برگزیدہ افراد کا ایک گروہ موسیٰؑ کے ساتھ طور کی جانب گیا کہ شریعت اور آسمانی الواح ملنے پر گواہ رہے تو وہاں حضرت موسیٰؑ سے یہ تقاضا کر بیٹھا کہ خدا کا دیدار کرادیں۔ اس بیجا ضد کے نتیجہ میں طور پر چمکنے والی برق تجلی نے انھیں نقش زمین کردیا۔[2]

عہد لعنت کی دنیا

جب طور پر حضرت موسیٰؑ کی میعاد تیس روز کے بجائے چالیس روز میں تبدیل ہوئی تو سامری نے یہ بہانہ بنا کر کہ موسیٰؑ اور قوم کے منتخب افراد خدا کی جستجو میں گئے لیکن انھیں خدا نہ مل سکا، سونے کا ایک گوسالہ بنایا اور بنی اسرائیل کے بہت سے افراد اس کے آگے سجدہ ریز ہوگئے اور اس کی پرستش کرنے لگے۔[3] طور سے موسیٰؑ کی واپسی کے بعد پہلی مرتبہ اس قوم کی تطہیر اور قتل عام کا آغاز ہوا۔[4] کبھی حضرت موسیٰؑ سے بیابانوں میں پانی کے چشموں کا تقاضا کرتے تھے اور کبھی طرح طرح کی پکی غذاؤں کی فرمائش کرتے تھے جو ان کے لئے فراہم ہوتی تھیں۔[5]

ایک روز جب یہ لوگ شہر "اریحا" کے نزدیک پہنچے اور طے پایا کہ یہ لوگ اس شہر کی بت پرست اور ظالم قوم کو شہر سے نکال باہر کریں اور خود اس میں سکونت اختیار کریں تو انہوں نے سستی کا اظہار کیا۔ وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ خدا اور موسیٰؑ دونوں مل کر اس شہر کے لوگوں سے جنگ کریں اور شہر پر قبضہ کرکے ان کے حوالہ کردیں۔ لیکن اس بیجا توقع کی پاداش میں انھیں "تیہ" کے بیابان میں چالیس برس تک بھٹکنا پڑا۔[6]

---

1. سورۂ اعراف، آیت ۱۳۸
2. سورۂ اعراف، آیت ۱۵۵ - سورۂ بقرہ، آیت ۵۶
3. سورۂ طٰہٰ، آیات ۸۷ تا ۹۸
4. سورۂ بقرہ، آیت ۵۴
5. سورۂ بقرہ آیات ۵۷ سے ۶۰ تک - سورۂ اعراف، آیت ۱۵۹
6. سورۂ مائدہ، آیات ۲۲ سے ۲۰ تک

سرانجام یہ قوم اس خدائے واحد کی صحیح معرفت حاصل نہ کر پائی، جس کی دعوت حضرت موسیٰ دے رہے تھے۔ وہ برسہا برس تک "یہوہ" کو بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا خدا سمجھتے رہے جو صرف ان ہی کی فلاح و نجات کو پیش نظر رکھتا ہے۔

یہ طرز فکر عہد بعثت تک باقی تھا کہ یہ لوگ صرف اپنے آپ کو خدا کا دوستدار تصور کرتے تھے[1]۔ خدا کے الطاف اور اس کی برکتوں کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے تھے، حتیٰ کہ دوزخ کا عذاب بھی دوسروں ہی کا مقدر جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ خود زیادہ سے زیادہ چند روز تک عذاب کا مزہ چکھیں گے اور بس[2]۔

اس مخصوص طرز فکر نے گویا انہیں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ دوسری قوموں کے حقوق کو حقیر و ناچیز سمجھیں، یہاں تک کہ اگر ہو سکے تو دوسروں کے اموال کو تباہ و برباد کریں یا مکر و فریب کے ذریعہ ہڑپ کر جائیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کا مال ان کے پاس ہو تو اسے واپس نہ کریں، سوائے اس کے کہ زور زبردستی کے ساتھ ان سے واپس لیا جائے[3]۔

یہ قوم ابتدا ہی سے دنیا پرستی اور سود جوئی کی عادی ہو گئی تھی، یہاں تک کہ خود حضرت موسیٰؑ کا چچا زاد بھائی قارون جو حافظ توریت بھی تھا جب اس نے دولت کے بے شمار خزانے بھر لئے تو زکات دینے سے انکار کر دیا، موسیٰؑ کے مقابل آ گیا۔ اس طرح غرور و خود نمائی کرتا تھا کہ دوسروں کو بھی اپنی طرف مائل کر لیتا تھا۔ لیکن آخرکار اسی دولت پرستی کی پاداش میں ہلاک ہوا[4]۔

"سبت" یعنی (سنیچر) کے واقعہ نے انھیں مشکل میں ڈال رکھا تھا، کیونکہ 'الواح' کے دس احکام میں سے ایک حکم کے مطابق ان پر لازم قرار دیا گیا تھا کہ "سبت" یعنی سنیچر کے روز کاموں کی چھٹی رکھیں، لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس دن بھی کسی حیلہ و بہانہ سے مچھلی کا شکار کریں جبکہ بظاہر ایسا لگے کہ کوئی کام نہیں کر رہے ہیں[5]۔

---

[1] سورۂ جمعہ، آیت ۶
[2] سورۂ بقرہ، آیت ۸۰
[3] سورۂ آل عمران، آیت ۷۵
[4] سورۂ قصص، آیات ۷۶ سے ۸۲ تک
[5] سورۂ اعراف، آیت ۱۶۳

قرآن کریم نے عذاب الٰہی اور بلاؤں کے نزول کے دسیوں مواقع نقل کئے ہیں کہ یہ سب کے سب ان کی عہد شکنی، قتل و غارت، فساد اور دنیا دوستی کا نتیجہ ہیں[1]۔ مال و دولت کی فراوانی کی بنا پر دنیا کی لذتوں کی طرف مائل ہوئے، بعض گوشت اور غذائیں ان پر حرام کر دی گئیں اور ان کی سرکشی اور قانون شکنی کے عوض ایک طرح کی سزا تھی[2]۔

برسوں بیابانوں میں آوارگی کے دن گزارنے کے بعد ان کی شہری زندگی کا آغاز ہوا اور حضرت داؤد اور سلیمانؑ کے زمانہ میں فلسطین ان کے اختیار میں تھا۔ بیت المقدس حضرت سلیمانؑ کے ذریعہ تعمیر ہوا۔ جنگ و جدال کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

تیرہ صدیوں کے دوران یعنی حضرت عیسیٰ کے ظہور تک جب بھی یہ لوگ حکام و سلاطین کے ظلم، کاہنوں کی رشوت خوری اور دنیا پرستی اور عام لوگوں کے ظلم و ستم، فساد اور حیلہ و فریب سے دوچار ہوتے تھے، ان پر ایک نہ ایک پیغمبر معین کیا جاتا تھا لیکن گویا ان کی یہ عادت ثانیہ بن گئی تھی کہ پیغمبروں کا مذاق اڑائیں، انھیں خاطر میں نہ لائیں اور آخر کار ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کریں۔ قرآن نے ان کی بے انتہا خون ریزیوں اور انبیاء کے قتل کا شکوہ کیا ہے[3]۔

جنگ، فرار، قتل عام، حملہ اور آوارگی جیسے ان لوگوں کی عادت بن گئی تھی۔ ان تمام حالات کے باوجود یہ لوگ ۷۰ عیسوی تک فلسطین میں رہے۔ یہاں تک کہ اس سال رومی سردار ٹائیٹس[a] نے یوروشلم کا محاصرہ کر کے آگ اور خون کا خوب بازار گرم کیا۔ یوروشلم کی عبادت گاہ کو جلا ڈالا، شہر کے تمام لوگوں کو تہ تیغ کر دیا اور پورے شہر کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کر ڈالا۔ اس کے بعد ہی سے یہودیوں کی آوارگی اور مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ لوگ بابل کی طرف گئے۔ ایک جماعت نے جنوب میں عرب ممالک کا رخ کیا، کچھ دیگر افراد شام، ایشیائے صغیر، اٹلی، مصر، شمالی افریقہ یہاں تک کہ اسپین وغیرہ میں پھیل گئے[4]۔

---

a. TITUS

1. سورۂ نساء، آیت ۱۵۵
2. سورۂ انعام، آیت ۱۴۶
3. سورۂ بقرہ، آیت ۹۱
4. تاریخ ادیان صفحہ ۲۶۷

یہودیوں اور عیسائیوں کی خصومت

اگرچہ یہودیوں کی دینی کتابوں میں مسیح موعود کا تذکرہ بار بار آیا تھا، اور جہاں بھی یہ قوم بلاؤں اور مصیبتوں میں گرفتار ہوتی تھی حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کی اُمید پر اپنا دل خوش کر لیا کرتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ اسی قوم کے درمیان سے دین یہود کی تکمیل اور انہیں گمراہیوں سے روکنے اور محفوظ رکھنے کے لئے تشریف لائے تھے، لیکن یہ لوگ ابتداہی سے ان کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دین یہود کے پیشوا اور رہبر حضرت عیسیٰؑ کے سب سے کٹر دشمن تھے۔ یہاں تک کہ آخرکار انہیں سولی دینے کی سازش بھی ان ہی لوگوں نے تیار کی اور اگرچہ قرآن کے مطابق وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوئے لیکن "یہودا" کو ان کی جگہ پر سولی دے دی اور یہ خیال کر لیا کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی دے دی گئی ہے[1]۔

کاہنوں کی خود غرضی، صلیب کا قضیہ، دینِ عیسیٰؑ میں تدریجی طور پر یونانی فلسفہ کی آمیزش، توریت کے قوانین پر یہودیوں کی کٹھ حجتیاں، ربانیوں (علماء) کی آراء اور دینی آثار قلم بند کرنے والوں کی ہٹ دھرمیاں اس دشمنی کی کھائی کو مزید عمیق و گہری بناتی گئیں۔ مذہبی کشمکشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخرکار ۳۱۲ء میں جب "کانسٹنٹائن" نے عیسائی دین کو روم کا حکومتی و سرکاری دین قرار دیا تو اس جنگ و جدال نے اور شدت اختیار کر لی۔ عیسائی علماء (پادری) جو روئے زمین پر عظیم طاقت اور سیاسی اختیارات حاصل کر چکے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ یہودی اب بھی عیسائیت کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں تو ان سے بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے ان کے ساتھ دشمنی، آزار اور اذیتیں پہنچانے کا طریقہ اختیار کر لیا۔ یہ جدال و قتال پورے قرون وسطیٰ میں روز بروز بڑھتا ہی رہا، خونریزی اور مار کاٹ شدید سے شدید تر ہوتی گئی ہے[2]۔

توریت

توریت کے نام سے اس وقت جو مجموعہ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہے، وہ حسب ذیل پانچ اسفار پر مشتمل ہے:۔

1۔ سورۂ نساء، آیت ۱۵۷

2۔ تاریخ جامع ادیان، جان ناس، ص ۳۴۲

۱۔ سِفرِ تکوین (پیدائش) جو اوّل خلقت سے حضرت یعقوب کی وفات تک کی تاریخ ہے۔ اس میں پچاس باب ہیں۔

۲۔ سِفرِ خروج، اس میں کوہ سینا میں احکام کی بنا و تاسیس کا ذکر ہے۔ اور چونتیس باب پر مشتمل ہے۔

۳۔ سِفرِ احبار یا لاویان، اس میں لاویوں (یعقوب کے پسر لاوی کی اولاد) کے آئین و اصول، دینی احکام و شریعت وغیرہ کی تفصیل ہے۔ یہ ۲۷ ابواب پر مشتمل ہے۔

۴۔ سِفرِ اعداد، اس میں "تیہ" کے بیابان میں بنی اسرائیل کے انتشار اور کنعان کی فتح کا ذکر ہے اور اس کے چھ باب ہیں۔

۵۔ سِفرِ تثنیہ، جو عمومی شرائع و احکام سے متعلق ہے اور اس میں چونتیس باب ہیں۔

یہ مجموعہ اس اصل توریت سے الگ ایک چیز ہے جسے قرآن "ہدایت نور" سے تعبیر کرتا ہے یا جس کے لئے فرماتا ہے کہ الواح میں "موعظہ اور احکام کی تفصیل وغیرہ ہر چیز" موجود تھی۔ توریت کا اصلی نسخہ جو صندوق شہادت میں تھا، اسلام سے صدیوں پہلے فلسطین کی جنگوں کے دوران ضائع ہو گیا، حتیٰ کہ جو کچھ بعد میں "عزیرؑ" پیغمبر نے "حجؑ" اور "زکریاؑ" کی مدد سے کہ یہ دونوں بھی پیغمبر تھے، جمع کیا تھا، وہ بھی جنگوں اور حادثات کی نذر ہو چکا ہے۔

خود یہودی علماء نے پندرھویں صدی کے بعد سے جو تحقیق کی ہے اس کے مطابق، سِفرِ تثنیہ حضرت عیسیٰ سے ۷ ۔ ۸ صدیاں پہلے اور سِفرِ احبار ۵۱۶ق م کے بعد کا ہے۔ اس سِفر کا سارا مواد ان تمام آداب و رسوم اور قوانین و دستورات پر مشتمل ہے جو اس وقت مشرق وسطیٰ کی قوموں کے درمیان رائج تھے۔ یا اس میں وہ معلومات مندرج ہیں جو بنی اسرائیل نے بابل میں اپنی اسیری کے دوران وہاں کے نظام اور مشہور قوانین کی شکل میں محفوظ کر لی تھیں [1]

قرآن نے بارہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان (یہودیوں) نے آسمانی کتابوں کی تحریف کر دی ہے۔ اور اپنے ہاتھوں سے کتابیں لکھ کر انھیں خدا اور اس کے رسول کی طرف منسوب کر دیا ہے [2]

۱۔ فرہنگ قصص قرآن، صدر بلاغی، ص ۳۴۶ ۔ ۳۴۷

۲۔ بقرہ/۷۹، مائدہ/۱۳

موجودہ توریت کی دینی قدر و قیمت سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے مناسب ہے کہ ذیل میں اس کے دو تین نمونے ذکر کئے جائیں :-

"جب آدم و حوا نے جنت میں نیک و بد کی معرفت کرانے والے درخت کے پھل کھائے تو انہوں نے خدا کی آواز سنی جو جنت میں چہل قدمی کر رہا تھا"۔ "ان دونوں نے خود کو بہشت کے درختوں کے درمیان چھپا لیا" "خدا نے آدم کو آواز دی اور پوچھا کہاں ہو؟ آدم نے کہا، میں تیری آواز جنت میں سنی اور چونکہ برہنہ تھا لہٰذا خوفزدہ ہو کر درختوں میں چھپ گیا ۔خدا نے کہا : تمہیں کس نے بتایا کہ برہنہ ہو ، کیا تم نے درخت ممنوعہ کے پھل کھائے ہیں ؟ خدا نے کہا ، اس انسان نے بھی ہماری طرح خیر و شر کی معرفت حاصل کر لی ہے اور اب ممکن ہے کہ درخت حیات کی طرف بھی ہاتھ بڑھائے اور اس کے پھل کھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جائے ، اس لئے اس نے آدم کو جنت عدن سے نکال دیا ۔"

(سفر تکوینی ، فصل ۳ ص ۸ تا ۱۱، ۲۲ و ۲۳)

" خدا نے بنی اسرائیل پر ایک وبا نازل کی ، وہ لوگ جو سبیع کنویں کے نزدیک تھے ان میں سے ستر ہزار افراد مر گئے فرشتۂ غضب نے یوروشلم کو تباہ کرنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔خدا اپنے اس شر سے پشیمان ہوا اور اس سے کہا کہ بس کرو!"

(کتاب دوم شموئیل ، فصل ۱۴، ۱۵، ۱۶)

"جب اہل زمین کی تعداد زیادہ ہوئی اور لڑکیاں آئیں تو خدا کے بیٹوں نے دیکھا کہ خدا کی بیٹیاں خوبصورت ہیں، لہٰذا ان لوگوں نے ان لڑکیوں کو اپنی بیویوں کی صورت میں انتخاب کر لیا ....."

"..... ان سے ایسے بچے پیدا ہوئے جو روئے زمین پر جبار و ظالم بن کر ابھرے خدا نے دیکھا کہ آدمی کا شر زیادہ ہو گیا ہے ... (تو اسے) غم و افسوس ہوا ، اور اس نے طے کیا کہ تمام آدمیوں اور جانوروں کو ہلاک کر ڈالے ۔"

(سفر تکوین ، فصل ۶، ۲-۷)

مذکورہ بالا نمونوں میں خدا کو حاسد ، غمگین ، نادان و جاہل ، پشیمان ، آنکھوں اور جسم والا

راستہ چلنے والا اور باتیں کرنے والا بتایا گیا ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر بدترین گناہوں سے انبیائے کرام کو نسبت دی گئی ہے مثلاً قتل، شراب نوشی اور نامحرموں کے ساتھ زنا وغیرہ ..... (معاذ اللہ)

تلمود

صدیوں کے دوران یہودیوں کی زندگی میں جو تغیرات وجود میں آئے ان سے ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ توریت کے احکام پر شرحیں اور تفسیریں لکھی جائیں۔ تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں قانون شفاہی کتابی شکل میں اکٹھا ہوئے اور "میشنا" کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ مجموعہ متن توریت کی تفسیر کی شکل میں چھ باب اور قریب چار ہزار دینی مسائل پر مشتمل ہے اور اس کا ترجمہ دوسری صدی عیسوی کی مروجہ زبان میں کیا گیا ہے۔ "میشنا" کی تدوین تقریباً ۲۲۰ عیسوی میں تمام ہوئی اور قریب ایک سو پچاس علماء بنی اسرائیل نے مل کر اسے تحریر کیا۔ پھر صدیوں کے بعد مناظروں، فتوؤں اور "میشنا" کے مطالب کی وضاحت کے ذریعہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک نیا مجموعہ "گمارا" مکمل ہوا۔ میشنا اور گمارا کو جمع کرنے سے "تلمود" وجود میں آئی، جو بڑے سائز کے ۲۹۴۷ اوراق پر مشتمل ہے (یعنی تقریباً ایسے چھ ہزار صفحات پر حاوی ہے جس کا ہر صفحہ ۴۰۰ کلمات پر مشتمل ہو) اس میں چھ باب اور چھتیس ۳۶ رسالے ہیں۔ تلمود قوم یہود کے اتحاد و ہمبستگی کا سب سے اہم وسیلہ و ذریعہ ہے اور درحقیقت ان کے تمام دینی معارف و معلومات پر مشتمل ہے۔

۵۰۰ء سے ۶۵۰ء کے دوران یہودی علماء نے بابلی "تلمود" کی مزید تشریح اور اصلاح کا کام انجام دیا۔ بنابرایں بعثت (پیغمبر اسلام) کے زمانہ میں یہ مجموعہ قوم یہود کے درمیان پائے جانے والے تمام آراء و احکام، من گھڑت روایات اور خرافات کا ایک شاہکار نظر آتا ہے۔

ہم یہاں نمونے کے طور پر تلمود کے احکام و معارف سے متعلق چند نکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:—

"تلمود" کا خدا انسان کی شبیہ ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے، غصہ ہوتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، تعویذ باندھتا ہے، تخت پر ٹیک لگا کر بیٹھتا ہے، فرشتے اور کروبیان اس کے اردگرد رہتے ہیں اور وہ روزانہ تین بار توریت کی تلاوت کرتا ہے۔

عورت لڑکا پیدا کرنے کے بعد چالیس روز تک اور لڑکی کی پیدائش کے بعد اسی ۸۰ روز تک

نجس رہتی ہے (اور اس سے مقاربت حرام ہے) ایک مرد اپنی خواہش کے مطابق جتنی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ ایک دوسری جگہ اس تعداد کو چار تک محدود کیا گیا ہے۔ اس میں عورتوں کے زیادہ باتونی ہونے سے متعلق تفصیل سے بیان ملتا ہے۔ آسمان سے زمین پر کلام کے دس پیمانے نازل ہوئے، عورتوں نے نو پیمانے اٹھا لئے اور ایک پیمانہ مرد کے حصہ میں آیا۔ عورت روح عالم کو خوش کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عورتوں کی آمدنی چاہے جس ذریعہ سے ہو ان کے شوہروں کا حق ہے۔ ایک سو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر بھی نہیں ہے۔

کھانے پینے اور طہارت سے متعلق بہت زیادہ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ چالیس سال تک کھانا نفع بخش ہے اور چالیس سال کے بعد پینا مفید ہے۔

پینے میں اعتدال رکھنا بالکل نہ پینے سے زیادہ بہتر ہے۔ شراب اکثر و بیشتر فائدے اور منافع رکھتی ہے اور بغیر اس کے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ کھانے پینے کا موضوع اسی قدر اہمیت رکھتا ہے کہ جو شخص بیت الخلا میں زیادہ دیر تک بیٹھے، اس کی عمر میں اسی قدر اضافہ ہوگا۔

قوم کی اخلاقی مشکلات کے حل کے لئے، جھوٹ اور فریب، من گھڑت قصوں، افسانوں اور قسمت کا حال بیان کرکے اور جنات شناسی، خرافات، جادو ٹونے، علم الاعداد اور خواب کی تعبیر وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا "تلمود" گزشتہ پندرہ صدیوں کے دوران، یہودی علماء و طلاب کی بحثوں، ہر زمانہ میں لوگوں کی اپنی آراء یا ماحول و معاشرہ میں رائج اقوال اور عادات و اطوار یا ذہنوں میں پڑے ہوئے توریت کے تحریف شدہ یا غلط تعبیر شدہ کلمات اور جملوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ قرون وسطیٰ میں دنیا کے بہت سے ممالک میں بار ہا کھٹکرایا اور رد کیا جا چکا ہے۔ اور شیطانی و جادو ٹونے کی کتابوں کی مانند حکام کی طرف سے اسے بھی ختم کرنے اور معدوم کرنے کا حکم دیا جا چکا ہے نیز اس کے نسخے سر بازار نذر آتش کئے گئے یا انھیں پھاڑ کر پارہ پارہ اور دریا برد کیا گیا ہے لیکن بہر حال اس کے بچے ہوئے نسخے یہودیوں کے لئے مائۂ حیات اور سرور کا باعث ہیں دیگر تمام اقوام کی نگاہ میں یہ کتاب بیہودہ اور پوچ ہے لیکن یہودیوں کی نگاہ میں حکمت و معرفت کا سرچشمہ ہے۔

* * *

فرصت کو غنیمت جانو!

امام حسین علیہ السلام:

وقال (ع) یا ابن آدم، انما انت ایام، کلما مضیٰ یوم ذهب بعضك

"اے فرزند آدم! بلاشبہ تو چند دنوں سے کچھ زیادہ نہیں ہے، جو روز بھی گزرتا ہے گویا تیرے وجود کا ایک حصہ چلا جاتا ہے۔"

(بلاغۃ الحسینؑ ص ۲۸۲ نقل از ارشاد دیلمی)

جزاء و سزا اور تجسم اعمال

جناب شیخ حسین نوری
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

گزشتہ مقالہ میں ہم نے معاد کی بحثوں میں سے ایک اہم بحث سزاؤں کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کی تھی کہ آخرت میں اعمال کی سزائیں اور اچھے یا برے کردار کے نتائج کس شکل میں سامنے آتے ہیں؟ آیا وہاں سزا کا عنوان وضعی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے پہلے سے مقرر ہے؟ یا انسانی اعمال کے آثار و عمل کی بنیاد پر ایک طبیعی شکل میں رونما ہوتے ہیں یا یہ کہ سزائیں خود مجسم عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

اس ذیل میں ہم نے اپنے عہد کے بعض علماء محققین مثلاً علامہ طباطبائی اور شہید مطہری کے اقوال نقل کئے تھے جو اس بات کے قائل ہیں کہ آخرت میں جزائیں اور سزائیں خود انسانی اعمال کے مجسم ہونے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں اور انسان کے اچھے اعمال بہشت کی شکل میں اور برے اعمال جہنم کی صورت میں مجسم ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ کسی حقیقت تک رسائی قرآن مجید کی آیات اور اسلام کی معتبر احادیث و روایات کی تحقیق کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ حضرات قرآنی آیات سے استناد کرتے ہوئے احادیث سے شواہد پیش کرتے ہیں لہٰذا ہم نے بھی ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے اس نقطۂ نظر سے قرآنی آیات کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد ان احادیث کا جائزہ لیا جائے جن سے ان حضرات نے بھی استناد کیا ہے اور

آخر میں اس موضوع سے متعلق دیگر احادیث و روایات کا بھی مطالعہ کیا جائے تاکہ حقیقت امر بالکل واضح ہوجائے۔ چنانچہ جیسا کہ گزشتہ مقالہ میں تجسم اعمال پر دلالت کرنے والی آیات کو ہم نے تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلی قسم کی آتیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ روز قیامت انسانی اعمال بعینہ ظاہر ہوتے ہیں۔" پیش کی تھیں، اب ہم دوسری قسم کی آتیں، جو روز قیامت، جزاء و سزا یعنی اعمال کا اچھا یا برا نتیجہ خود اعمال کے مجسم ہونے کی صورت میں بیان کرتی ہیں، پیش کر رہے ہیں:۔

(۱) لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون

(تحریم/۷)

"آج ہرگز کوئی عذر پیش نہ کرو کیونکہ محض تمہارے اپنے اعمال تمہاری سزا بنیں گے"

اس آیہ کریمہ نیز اسی کے مثل دوسری آیتوں میں، جیسا کہ ظاہر ہے، خود اعمال کو اعمال کی سزا بتایا گیا ہے۔

(۲) "واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون"

(بقرہ/۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جب تم سب کے سب خدا کے حضور میں پلٹائے جاؤ گے، پھر جو کچھ جس شخص نے کیا ہے (اس کا بدلہ) اس کو دیا جائے گا اور کسی پر (اس دن) ظلم (ناانصافی) نہیں ہوگی۔

(۳) ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمناً قلیلاً اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار"

(بقرہ/۱۷۴)

بے شک جو لوگ (یہود وغیرہ) ان آیات کو جو خدا کی جانب سے (اسلام سے قبل بعثت پیغمبر سے متعلق) نازل ہوئی ہیں، چھپاتے ہیں اور ان کو معمولی قیمتوں پر (دنیا کے عوض) بیچ دیتے ہیں یہ لوگ محض آگ سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں (انہیں کوئی دوسرا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

(۴) ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلماً انما یاکلون فی بطونھم

فانہ وسیصلون سعیراً " (نساء/ ۱۰)

جو لوگ ظلم و زیادتی کے ساتھ یتیموں کا مال چٹ کر جاتے ہیں وہ لوگ در اصل جہنم کی آگ سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں جو جلد ہی (ان کے شکم میں) بھڑک اٹھے گی۔

علامہ طباطبائی اپنی تفسیر المیزان میں تجسم اعمال سے بحث کرتے ہوئے روز قیامت خود اعمال کے ذریعہ اعمال کی سزا ملنے سے متعلق آیتوں کا ذکر کرنے کے بعد (جن میں سے کچھ آیتیں ہم نے یہاں ذکر کی ہیں) فرماتے ہیں:۔

" میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر قرآن میں (سورۂ ق کی ۲۱ ویں) آیت:۔

"لقد کنت فی غفلۃ من ھٰذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔"

(یعنی تم اس بات سے غافل تھے پس ہم نے تمہاری آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھا دیئے اور آج تمہاری چشم بصیرت میں روشنی پیدا ہوگئی ہے)

کے علاوہ کوئی اور آیت نہ ہوتی تو بھی یہ اس مطلب کے لئے کافی تھی کیونکہ غفلت سے کسی چیز کو تعبیر کرنا، اسی وقت صحیح ہے جب چیز ظاہر میں موجود ہو اور انسان اس کی طرف متوجہ نہ ہو اسی طرح پردہ اٹھانے کی تعبیر اس وقت صادق آتی ہے جب چیز موجود ہو مگر یہ کہ اس پر پردہ پڑا ہوا ہو۔

اگر عذاب نامی وہ چیز کہ جس کا انسان روز قیامت مشاہدہ کرتا ہے پہلے سے موجود نہ ہوتی تو یہ کہنا ہرگز درست نہ ہوتا کہ تم اس چیز کی طرف سے غافل تھے یا یہ چیز تم سے مستور و پوشیدہ تھی لیکن آج اس پر سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے اور اس کی طرف سے غفلت برطرف کردی گئی ہے" اور پھر آخر کلام میں علامہ طباطبائی اضافہ کرتے ہیں:

میں خود اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر خود آپ اس حقیقت (یعنی تجسم اعمال) کو رسا اور بلیغ زبان میں بیان کرنا چاہیں تو یقیناً ان ہی عبارات و اوصاف میں بیان کریں گے جس میں قرآن نے بیان کیا ہے۔"[۱]

---

[۱] المیزان جلد ۱ ص ۹۱-۹۲

اب تیسری قسم کی قرآنی آیات جو جنّت وجہنم کو اعمال کی جزا قرار دیتی ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وجزاهم بما صبروا جنة وحريراً (انسان/۱۲)

یعنی خداوند عالم نے ان لوگوں کو ان کے صبر کے عوض بہشت اور حریر (لباس بہشتی) جزا میں عطا کیا۔

(۲) انّی جزیتهم الیوم بما صبروا انهم هم الفائزون"

(مومنون/۱۱۱)

یعنی میں نے ان کو ان کے صبر کے بدلے میں آج (روز قیامت) جزا دی اور یہ وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔

(۳) انّ الذین قالوا ربّنا الله ثمّ استقاموا فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون اولئك اصحاب الجنّة خالدین فیها جزاءً بما کانوا یعملون۔

(احقاف/ ۱۳-۱۴)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور اس قول پر ثابت و پائدار رہے تو ان کے لئے کسی طرح کا خوف اور غم و اندوہ نہیں ہے، یہی لوگ اہل بہشت ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ ان کے اعمال کی جزا ہے۔

(۴) انّ الذین آمنوا و عملوا الصّالحات اولئك هم خیر البریّة جزاؤهم عند ربّهم جنّات عدن تجری من تحتها الانهار خالدین فیها ابداً"

(بیّنہ/ ۷،۸)

بے شک جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور اچھے عمل انجام دیتے رہے وہی لوگ دنیا کی بہترین مخلوق ہیں، ان کی جزا پیش پروردگار بہشت کے دائمی باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اس میں تا ابد رہیں گے اور اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے

مذکورہ بالا آیات میں بہشت کا نیک اعمال کی جزا کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اب کچھ وہ آیات

بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں جہنم کو بسے اعمال کی سزا کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔

(۱) ولو تری اذ الظالمون فی غمرات الموت والملائکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن آیاتہ تستکبرون

(انعام / ۹۳)

یعنی (اے رسولؐ) اگر تم دیکھتے کہ یہ ظالم (جاں کنی کے وقت) موت کی کیسی سختیوں میں گرفتار ہیں اور فرشتے ان کی طرف (جنی روح کے لئے قہر و غلبہ کے ساتھ) ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اپنی جانیں بدن سے باہر نکالو آج تم کو رسوائی کے عذاب میں مبتلا کرکے سزا دی جائے گی کیونکہ تم خدا پر ناحق بہتان باندھا کرتے تھے اور اس کی آیتوں اور نشانیوں کے مقابل تکبر و غرور کا اظہار کرتے تھے۔

(۲) ان الذین کذبوا بآیاتنا واستکبروا عنھا لا تفتح لھم ابواب السماء ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط وکذلک نجزی المجرمین لھم من جھنم مھاد ومن فوقھم غواش وکذلک نجزی الظالمین

(اعراف / ۴۰ و ۴۱)

جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے سامنے نخوت و تکبر کا اظہار کیا ہرگز نہ ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے نہ ہی وہ جنت میں داخل ہونے پائیں گے، مگر یہ کہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے ہوکر نکل جائے (یعنی جس طرح سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا داخل ہونا محال ہے ان کا جنت میں داخل ہونا محال ہے) اور ہم مجرمین کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں اور ان کے لئے جہنم میں (آتشیں) بستر لگا دیا گیا ہے اور سر پر (انگاروں کی) چادر تن دی گئی ہے اور یہی ظالمین کی سزا ہے۔

(۳) انما السبیل علی الذین یستأذنونک وھم اغنیاء رضوا بان

یکونوا مع الخوالف وطبع اللہ علیٰ قلوبہم فہم لا یعلمون...
انہم رجس وما وٰیہم جہنم جزاءً بما کانوا یکسبون
(توبہ/۹۳-۹۵)

راہ عقوبت صرف ان لوگوں کے لئے باز ہے جو مالی طور پر صاحب استطاعت ہونے کے باوجود تم سے (جہاد میں شریک ہونے سے) معافی طلب کرتے ہیں اور انہیں پیچھے رہ جانے والوں (عورتوں اور بچوں) کے ساتھ گھر میں بیٹھے رہنا اور میدان جہاد میں حاضر نہ ہونا پسند ہے خداوند عالم نے (ان کے اس عمل کے بدلے) ان کے دلوں پر (کفر و ظلمت کی) مہر لگا دی ہے کہ یہ لوگ حقائق کو درک نہیں کرتے ..... یہ (منافقین) نہایت ہی پلید و ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ ان کے ان ناپاک اعمال کی سزا ہے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا مطالب کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان تمام آیات کا ماحصل یہی ہے کہ قیامت میں انسان کے اعمال اچھے یا برے چہروں کے ساتھ مجسم ہوں گے چنانچہ شیخ بہائی جن کا بزرگ علماء میں شمار ہوتا ہے، اس مسئلہ کے شدید حامیوں میں سے ہیں وہ کہتے ہیں:۔

"سنی و شیعہ ہر دو طریقوں سے روایت کی جانے والی بہت سی حدیثیں قیامت میں اعمال کے مجسم ہونے پر دلالت کرتی ہیں، ہمارے علماء نے قیس بن عاصم سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے: "میں قبیلہ بنی تمیم کی ایک جماعت کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے محضر مبارک میں اس وقت حاضر ہوا جب حضرت کی خدمت میں شاعرانہ طبیعت کا حامل صلصال نامی ایک شخص موجود تھا، میں نے کہا: اے خدا کے پیغمبرؐ! ہم بیاباں نشینوں کے لئے موعظہ ارشاد فرمائیں تا کہ ہم ان سے بہرہ مند ہو سکیں۔"

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: اے قیس! دنیاوی عزتیں باقی رہنے والی نہیں ہیں یہ ناپائیدار ہیں، دنیوی زندگی موت سے اور خود دنیا آخرت سے الگ نہیں ہے، جو عمل بھی انجام دیتا ہے اس کی پشت پر ایک حساب کرنے والا موجود ہے اور زندگی کا ہر لمحہ ختم ہونے والا ہے"

اے قیس! جب تم اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوگے تو یقیناً ایک ہم سفر ہو زندہ ہے، تمہارے ہمراہ رہے گا اور وہ تمہارے ساتھ ہی دفن ہوگا۔ اب اگر وہ ہم سفر نیک و کریم ہوا تو تمہاری عزت و کرامت کا سبب بنے گا اور اسی طرح اگر وہ پست و حقیر ہوا تو تم کو تمہارے حال پر چھوڑ دے گا تمہاری کسی طرح کی مدد نہیں کرے گا، نیز یہ کہ وہ قیامت کے دن محشور نہ ہوگا مگر یہ کہ تم اس کے ساتھ ہوگے اور تم بھی محشور نہ ہوگے مگر یہ کہ وہ تمہارے ساتھ ہوگا اور تم سے محض اسی کے بارے میں سوال کیا جائے گا لہٰذا تم کو کوشش کرنا چاہئے کہ تمہارا ہم سفر صالح و شائستہ ہو کیونکہ اگر وہ صالح ہوا تو تم اس سے انس محسوس کروگے اور اگر بدکردار ہوا تو اس کے علاوہ کوئی اور چیز تمہاری وحشت کا سبب نہ ہوگی اور وہ تمہارا "اپنا عمل" ہے۔ قیس نے عرض کی، یا رسول اللہؐ! میں چاہتا ہوں یہ کلمات شعر کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہوں تاکہ ہمارے لئے موجب افتخار رہے اور ہم اس کو ذخیرہ کر سکیں۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے حکم دیا کہ حسان بن ثابت حاضر ہوں اور اس موعظہ کو نظم کے قالب میں ڈھال دیں لیکن اس صلصال نامی شخص نے کہ جو حضورؐ کی خدمت میں موجود تھا اس مضمون کو ان اشعار میں قلم بند کر دیا ؎

تخیّر خلیطاً من فعالك انّما ∴ قرین الفتیٰ فی القبر ما کان یفعل

اپنے اعمال کو ہی اپنا بنا نا ساتھی ∴ جز عمل قبر میں کوئی بھی نہ ہوگا ساتھی

ولا بدّ بعد الموت من ان تعدّہ ∴ لیوم ینادی المرء فیہ فیقبل

ایسا اک دوست ہو جو یار رہے وقت مرگ ∴ خود رفاقت پہ جو تیار رہے وقت مرگ

وان کنت مشغولاً بشیءٍ فلا تکن ∴ بغیر الّذی یرضی بہ اللہ تشغل

ہو خبردار کوئی اور نہ مقصود ترا ∴ ہر عمل ہو پئے خوشنودی معبود تیرا

ولن یصحب الانسان من قبل موتہ ∴ ومن بعدہ الّا الّذی کان یعمل

موت سے قبل ہو یا بعد یہ کام آئے گا ∴ جز عمل ساتھ نہ انسان کے کوئی جائے گا

الا انما الانسان ضعیف لاھلہ یقیم قلیلا بینھم ثم یرحل

تھوڑی مدت کا ہے مہمان تو اعزا کے لئے کوچ کر جائے گا پھر ان سے ہمیشہ کے لئے

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد شیخ بہائی فرماتے ہیں، بعض صاحبان معرفت کا قول ہے کہ قبر میں یا روز قیامت جو سانپ بچھو اور شعلہ و آتش وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں بعینہ انسان کے یہی برے اعمال و رفتار، ناپسندیدہ اخلاق و کردار اور باطل عقائد و افکار ہوتے ہیں جو وہاں اس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جس طرح سے عالم آخرت کی نعمتیں حوریں اور میوے وغیرہ سب کے سب انسان کے یہی اخلاق حمیدہ، اعمال شائستہ اور اعتقادات حقہ ہیں جو اس دنیا میں ان چہروں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، اس لئے کہ ایک ہی حقیقت گوناگوں شکلوں اور مختلف لباسوں میں پرورش و نمو اور ماحول کے فرق کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ سورۂ عنکبوت کی ۵۴ ویں آیت میں خداوند عالم نے یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"یستعجلونک بالعذاب و ان جھنم لمحیطۃ بالکافرین"

(یہ کفار) جو اپنی جلد بازی سے عذاب کے خواہش مند ہیں جبکہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے"

اس میں کلمہ "اسم فاعل" استقبال (یعنی آئندہ) کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ حال کے معنیٰ میں ہے یعنی مقصود یہ نہیں ہے کہ جہنم آخرت میں کفار کو اپنے گھیرے میں لے لے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج بھی جو ان کو (دنیا میں) اخلاقی، عملی اور اعتقادی برائیاں گھیرے ہوئے ہیں یہی بعینہ جہنم ہیں جو آخرت میں آگ، سانپ اور بچھو کی شکل میں ظاہر ہوں گی۔

اور اسی انداز کا خداوند عالم کا یہ ارشاد بھی ہے:۔

الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلماً انما یاکلون فی بطونھم ناراً

(نساء/۱۰)

"جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کی بنیاد پر کھا رہے ہیں در اصل وہ اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں"۔

اور اسی طرح کا یہ ارشاد بھی ہے:۔

يوم تجد كلّ نفس ما عملت من خير محضراً

(آل عمران/ ۳۰)

یعنی وہ دن جب ہر شخص اپنے ہر نیک عمل کا انجام سامنے پائے گا

بنابراین مقصود یہ نہیں ہے کہ اس عمل کی جزا دوسری دنیا میں اس کو ملتی ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ عین یہی عمل دوسری دنیا میں اس کے سامنے آتا ہے بس شکل بدلی ہوئی ہوتی ہے یعنی وہاں خود یہی عمل، عمل کی جزا قرار پائے گا۔

چنانچہ خداوند عالم نے سورۂ یٰسین میں یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

فاليوم لا تظلم نفس شيئاً ولا تجزون الّا ما كنتم تعملون

(آیت/ ۵۴)

یعنی آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور لوگوں کو خود ان کے عمل کے سوا کوئی اور جزا نہیں دی جائے گی۔

یہ آیت بالکل ہی صریحی طور پر تجسم اعمال پر دلالت کرتی ہے اور اس طرح کی تعبیرات قرآن کریم میں کثرت سے موجود ہیں۔

اسی طرح رسول اکرمؐ سے منقول حدیثیں بھی بہت زیادہ ہیں۔

مثال کے طور پر حضورؐ فرماتے ہیں:۔

"الذى يشرب فى آنية الذهب والفضة فانما يجرجر فى جوفه نار جهنّم"

یعنی جو سونے اور چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے جہنم کی آگ خود اپنے وجود میں داخل کرتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

الظّلم ظلمات يوم القيامة

یعنی ظلم کرنا" روز قیامت کی تاریکیاں ہیں

آپؐ ہی کا ارشاد گرامی ہے:۔

"الجنۃ قیعان وان غراسہا سبحان اللہ"
بہشت ایک ویران بیابان ہے اس کی کھیتی "سبحان اللہ" یعنی ذکر خدا کے ذریعہ وجود میں آتی ہے۔
مختصر یہ کہ اس موضوع یعنی تجسم اعمال پر بہت سی حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔[1] نیز عالم شیعیت کی ایک بزرگ شخصیت شیخ بہائی کی تحریر۔ ہم اس سلسلہ بحث کو یعنی اعمال کی سزا کے طریقے اور تجسم اعمال سے متعلق گفتگو کو ان شاء اللہ آئندہ مقالہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔



[1] بحار الانوار طبع جدید جلد ۷ ص ۲۲۸، ۲۲۹

خدا کی فطری معرفت

جناب مصباح یزدی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

خدا کی معرفت کے سلسلہ میں دو طرح کی معرفت بیان کی جا سکتی ہے جس کا ہم گزشتہ مقالہ میں ذکر کر چکے ہیں ایک حضوری و شہودی معرفت یعنی خدا سے قلبی رابطہ اور دوسری حصولی و ذہنی معرفت یعنی وہ معرفت جو عقل خدا کی نسبت رکھتی ہے۔

حضوری معرفت کے معنی میں فطری معرفت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تخلیق ہی اس نہج پر ہوئی ہے کہ وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں خداوند عالم سے ایک وجودی رابطہ رکھتا ہے اگر وہ اپنے قلب کو ٹٹولے اور اس کی گہرائیوں میں اچھی طرح جھانک کر دیکھے تو اس قلبی رابطہ کو پالے گا ایسا نہیں کہ وہ صرف اتنا جان جاتا ہے کہ خدا سے بلکہ خدا سے اپنے رابطے کو پالیتا ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ خدا کو دیکھتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا وجدان حاصل کرتا ہے، یہ علم حضوری اور "پا جانا" ہے۔

اپنے دوسرے معنی میں فطری خدا شناسی سے مراد یہ ہے کہ انسان خدا کی معرفت کے مسئلہ میں کسی قسم کی تلاش و جستجو کی ضرورت محسوس کئے بغیر اپنی خداداد فطری عقل کے ذریعہ بآسانی وجود خدا کو معلوم کر لیتا ہے یعنی ذہنی فطری معرفت ایسی بدیہی یا قریب بہ بدیہی معرفت کو کہتے ہیں جس کے لئے انسان کو کسب علم اکتساب کی ضرورت نہیں پڑتی، ایک انسان کے لئے ضروری نہیں ہے پہلے تعلیم حاصل کرے تبھی اس مسئلہ کو حل کر سکے گا بلکہ اپنے اندر موجود خداداد فطری صلاحیت کے ذریعہ وہ مسئلہ کو درک کر سکتا ہے۔

بہرحال، فطری معرفت پر ان دونوں میں سے کسی بھی معنیٰ میں لفظ فطری کا اطلاق اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ یہ کسب و تحصیل کی محتاج نہیں ہے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی زحمت میں مبتلا ہو اور اس کے بعد جو چیز اس کے پاس نہیں ہے حاصل کرے۔

ذہنی معرفت یا دوسرے لفظوں میں فطری عقلی معرفت سے مراد خدا کی وہ معرفت ہے جو بغیر کسی دلیل کے تو نہیں ہوتی لیکن اس دلیل کی ذہن کو تلاش نہیں کرنا پڑتی، اہل منطق کہتے ہیں بدیہیات ثانویہ کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم "فطریات" بھی ہے۔

"فطریات" ایسے قضایا کو کہتے ہیں جن میں موضوع کے لئے محمول کا ثبوت ایسے وسیلے سے ہوتا ہے جسے کشف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ خود بدیہی و مسلم ہوتا ہے اگرچہ ایک وسیلہ سے ہی موضوع کے لئے محمول ثابت ہوتا ہے لیکن یہ وسیلہ ہمیشہ ذہن میں موجود ہوتا ہے اس کے کسب کی ضرورت پیش نہیں آتی جب ہم کہتے ہیں کہ علم حصولی و علم عقلائی کے معنیٰ میں خدا کی معرفت بھی فطری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری عقل ایک راہ کے ذریعہ وجود خدا کا ادراک کرتی ہے لیکن یہ راہ عقل کے سامنے ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ اسے کشف یا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ تمام افراد چاہے پڑھے لکھے نہ ہوں یا بلوغ کے ابتدائی مراحل میں ہوں کسی سے بھی خدا کے مسئلہ کو بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں یا اگر تیز ذہن کے مالک ہوں تو خود بخود متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس کا ادراک کر لیتے ہیں۔

جو بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ حضوری و شہودی علم کے معنیٰ میں خدا کی معرفت ہے یعنی آیا انسان اپنے خدا سے واقعاً ایک طرح کی قلبی آشنائی رکھتا ہے کہ اگر اپنے قلب کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھے تو اس رابطے کو پالے گا۔ اگر ایسا ہے تو علم حضوری کے معنیٰ میں خدا کی معرفت ثابت ہو جاتی ہے اور یہ معرفت عقلی و حصولی معرفت سے بہت زیادہ فرق رکھتی ہے جیسا کہ ہم مقدمہ میں عرض کر چکے ہیں کہ عقلائی معرفت ہمیشہ کلی نوعیت کی حامل ہوتی ہے اور اس سے کلی معرفت کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے، مثلاً کوئی ایک ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے مگر غائب ہے اسے دیکھا نہیں جا سکتا، ایک ذات ہے جس نے پوری دنیا خلق کی ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے، یہ ایک طرح کی غائبانہ معرفت ہے لیکن اگر حضوری و شہودی علم ہو تو یہ نہیں کہنا چاہیے کیونکہ وہ اسے پہچانتا ہے، اس سے آشنا ہے، شخصی معرفت، حضوری معرفت ہے، وہ ایک کلی عنوان سے اس کو نہیں پہچانتا ہے

بلکہ اس نے اپنے خدا سے ایک قلبی رابطہ پیدا کر لیا ہے، اگر وہ لوگ جو مادی دنیا پر توجہ رکھتے ہیں اور اس دنیا کی مخلوقات سے تعلقات استوار کئے ہوئے ہیں، اس توجہ اور تعلقات کو قطع کر دیں یا کسی اضطراری صورت حال کے تحت خود بخود یہ توجہ منقطع ہو جائے تو اس وقت اپنے دل کی گہرائیوں میں اس رابطہ کو محسوس کر لیتے ہیں یعنی یہ رابطہ ہر ایک کے یہاں موجود ہے بس بات اتنی سی ہے کہ اس کی طرف توجہ نہیں ہے۔

ہماری توجہات خود اپنے وجود سے باہر، مادی اشیاء اور دنیوی زینت و آرائش کی طرف اس قدر جذب ہو چکی ہیں کہ ہم اپنے اس قلبی رابطے سے غافل ہو گئے ہیں، اگر ہم خود اور خدا سے ماوراء اشیاء کی طرف سے اپنی توجہ قطع کر سکیں اور اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کریں تو اس رابطہ سے باخبر ہو جائیں گے اور یہ وہ چیز ہے جس کی کلی طور پر عرفاء دعوت دیتے ہیں۔ عرفانی سیر اور قلبی و شہودی معرفت تک رسائی کی راہ اس بنیاد پر استوار ہے کہ انسان کی توجہ اپنے باطن پر مرکوز ہو جائے اور وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں میں خدا سے اپنا رابطہ تلاش کرلے۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے[1] کہ ایک شخص نے حضرتؑ سے عرض کیا مجھے خدا کی اس طرح پہچان کرائیں کہ گویا میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ حضرتؑ نے اس سے سوال کیا: آیا کبھی تم نے سمندر کا سفر کیا ہے؟ (گویا حضرت کو معلوم تھا کہ اس طرح کا واقعہ اس کے ساتھ رونما ہو چکا ہے)

اس نے کہا: جی ہاں۔

امام نے فرمایا: ایسا بھی ہوا ہے کہ تمہاری کشتی سمندر میں ٹوٹ گئی ہو؟

کہا: جی ہاں، اتفاق سے ایک سفر کے دوران اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہے۔

فرمایا: ایسی منزل بھی آئی کہ تمہاری امیدیں سب طرف سے قطع ہو گئی ہوں؟ اور تم نے خود کو موت کے سامنے کھڑا پایا ہو؟

کہا: جی ہاں، یہ بھی ہوا ہے۔

فرمایا: کیا اس وقت نجات کی کوئی امید باقی تھی؟

کہا: جی ہاں۔

[1] توحید صدوق مطبوعہ تہران ناشر مکتبہ صدوق ۱۳۸۷ھ ص ۲۳۱ - معمولی سے فرق کے ساتھ۔

فرمایا: اس وقت جبکہ کوئی ذریعہ تمہاری نجات کا نہ تھا، تمہاری امیدیں کس سے وابستہ تھیں؟ وہ شخص متوجہ ہوگیا کہ اس عالم میں گویا اس کے دل کا کسی ذات سے اس حد تک رابطہ قائم تھا کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے، یہ وہی کیفیت ہے جس کے لئے ہم نے عرض کیا کہ کبھی کبھی اضطراری طور پر انسان کی توجہ دنیا و مافیہا سے قطع ہو جاتی ہے اور انسان پر وہ حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ خدا سے اپنے قلبی رابطہ کو محسوس کرتا ہے۔ انسان یہ کام اپنے اختیار کے ساتھ بھی انجام دے سکتا ہے اور یہ امر اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی وہ سیر و سلوک جو ادیان حق میں قبولیت کا درجہ رکھتا ہے اسی بنیاد پر استوار ہے کہ انسان تدریجی طور پر غیر خدا سے اپنے تعلقات قطع کرلے اور کسی طرح کی لگاوٹ اور دل بستگی باقی نہ رکھے (لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر چیز سے کنارہ کشی اختیار کرکے کسی غار میں جاکر رہنے لگے بلکہ چیزوں سے اپنی قلبی وابستگی کو قطع کرلے۔ معاشرے میں ہی رہے، دوسروں کی مانند زندگی گزارے لیکن اس کا قلب صرف خدا سے وابستہ رہے)، اگر انسان خود کو اس صورت حال کا عادی بنالے تو اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جس کے لئے امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے:-

ماکنت اعبد ربا لم اره (اصول کافی جلد اول ص۹۸)

"میں اس خدا کی عبادت نہیں کرتا جس کو دیکھا نہیں ہے"

وہ وقت عبادت خدا سے اپنے قلبی رابطے کو درک کرنا ہے اور ایسے شخص کے لئے خدا کا وجود مسئلہ نہیں رہتا وہ خدا کے وجود کی دلیل طلب نہیں کرتا، آیا کوئی ہے جو خود اپنے وجود کے لئے دلیل تلاش کرتا پھرے؟ ایک شخص جو فکر کرتا ہے، عقل سے کام لیتا ہے اور دوسری چیزوں کے بارے میں تحقیق کرتا ہے علمی و فلسفی مسائل کے بارے میں دلیل قائم کرتا ہے، کیا وہ خود اپنے وجود کے لئے بھی کسی دلیل کا محتاج ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ خود کو علم حضوری کے ذریعہ پہچانتا ہے، اسی طرح جو شخص خدا کو پالے، خدا سے اپنے وجودی رابطے کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرلے، اب اس کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ آیا خدا ہے یا نہیں ہے بلکہ دوسری تمام چیزوں کو نور خدا کے پرتو میں موجود پاتا ہے، یہی وہ منزل ہے جہاں ایسے افراد کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:-

"بِكَ عَرَفْتُكَ"

"میں نے تجھ کو تیری ذات سے ہی پہچانا ہے۔"

دعائے ابوحمزہ ثمالی میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت سید سجاد سلام اللہ علیہ بارگاہ ربوبیت میں عرض کرتے ہیں :۔

"... بک عرفتک وانت دللتنی علیک"[1]

میں نے تجھ کو خود تجھ سے پہچانا اور تو نے ہی تجھ تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔

آفتاب کو خود آفتاب کے ذریعہ دیکھتے ہیں، نور کو خود نور کے وسیلے سے دیکھتے ہیں لیکن دوسری چیزوں کو نور کے پرتو میں دیکھتے ہیں۔ دعائے عرفہ کے آخر میں حضرت سیدالشہداء سلام اللہ علیہ عرض کرتے ہیں :۔

"ایکون لغیرک من الظھور مالیس لک"[2]

"آیا تیرے سوا کوئی ایسا جلوہ ہے جو تجھ میں نہیں ہے کہ اس کے جلوے میں تیرا نظارہ کیا جائے ؟ یعنی آیا کوئی شئی تجھ سے بھی زیادہ روشن پائی جاتی ہے کہ اس کے پرتو میں تجھ کو دیکھا جائے ؟

تو تمام چیزوں سے زیادہ روشن ہے اور دوسری چیزوں کو تیرے پرتو میں دیکھا جانا چاہئے یہی چیز ہے کہ اولیائے خدا خلق خدا کو خدا کے وسیلہ سے اور خدا کو خود خدا کے ذریعہ پہچانتے ہیں۔

بہرحال ہماری بحث چونکہ قرآن سے ہے اس لئے دیکھتے ہیں آیا قرآن میں اس طرح کی فطری شہودی معرفت کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے یا نہیں ؟ آیا قرآنی آیات سے اس طرح کی چیز کا پتہ چلتا ہے، یا نہیں ؟ یقیناً اس بارے میں کہ انسان اس مقام تک پہنچ سکتا ہے کہ اپنے خدا کا نظارہ کرے اور مومنین قیامت کے دن اس مقام پر فائز ہوں گے یعنی ان کے اعمال کی جزا یہ ہوگی کہ وہ "رؤیت الہیٰ" "نظر الی اللہ" اور "لقاء اللہ" کا شرف حاصل کریں گے، بہت سی آیتیں قرآن میں موجود ہیں :۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ (قیامۃ/۲۲-۲۳)

"اس دن بہت سے بشاش چہرے اپنے پروردگار کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔"

---

[1] مفاتیح الجنان، ماہ رمضان المبارک کے سحر کی دعاؤں کے ذیل میں۔ دعائے ابوحمزہ ثمالی کے ابتدائی حصہ میں ص۱۸۶

[2] ایضاً مطبوعہ کتاب فروشی اسلامیہ ص۲۷۲

اس کے مثل قرآنی آیتیں، روایتیں، دعائیں اور مناجاتیں کثرت سے موجود ہیں لیکن ہماری بحث اس سے ہے کہ یہ رویت فطری طور پر تمام انسانوں کے لئے وجود رکھتی ہو (علم حضوری و شہودی کا وہ مرتبہ جس تک اولیائے خدا فائز ہوتے ہیں اکتسابی ہے، جہاں وہ سیر و سلوک یا خدا کی اطاعت و عبادت کے ذریعہ پہنچتے ہیں) لیکن یہاں بحث یہ ہے کہ آیا ایک طرح کا فطری شہود "خود انسان کے اندر موجود ہے یا نہیں کہ ہر انسان اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہو؟ ہمارا جواب مثبت میں ہے اور ہم دکھا سکتے ہیں کہ خود قرآن کی روشنی میں یہ چیز ثابت ہے، اور کم از کم دو آیتیں اس دلیل میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایک سورۂ روم کی ۳۰ ویں آیت اور دوسری سورۂ اعراف کی ۱۷۲ ویں آیت ہے۔ اب ہم ان دونوں آیتوں پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

آیت فطرت

"فاقم وجهك للدين حنيفاً فطرت الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذالك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون" (روم/۳۰)

یہ آیت جس میں لفظ فطرت استعمال ہوا ہے اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ خداوند عالم پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

"فاقم وجهك للدين حنيفاً" اپنا رخ پوری طرح دین حنیف کی طرف کر لو ـــ یہ وہ تعبیر ہے جو عربی زبان میں بہت عام ہے اور جب کسی چیز کی طرف کسی کی توجہ مرکوز ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فلاں کی توجہ پوری طرح فلاں چیز پر متمرکز ہو گئی ہے تو کہتے ہیں: اقام وجهه اليه یا نحوہ یعنی اپنے چہرے کو بالکل اس کے سامنے کر لیا، یا اس کی طرف کر لیا۔ یہ کنایہ اس بات کی طرف ہے کہ اس کی توجہ مکمل طور پر اسی شئی کی طرف ہو گئی، چنانچہ آیت میں خداوند عالم نے پیغمبر اسلام ؐ سے اپنی پوری توجہ دین کی طرف متمرکز کرنے کو کہا ہے۔ اصل میں ہر زبان کا اپنا مخصوص لب و لہجہ اور تعبیریں ہوتی ہیں جس کا اگر لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جائے تو کبھی کبھی مضحکہ خیز بھی ثابت ہو سکتا ہے مثلاً اگر "فلانی زمین خورد" کا ترجمہ "فلاں کو ٹھوکر لگ گئی" کے بجائے "فلاں نے زمین کھائی" کیا جائے، یا عربی میں "سقط على الارض یا وقع على الارض" کے بجائے "اكل الارض" کہیں تو ہر ایک مترجم کی عقل پر ماتم کرے گا، بہرحال

آیت میں عربی زبان کی ایک ادبی تعبیر استعمال ہوئی ہے جس کا ترجمہ شاید یہی مناسب ہو کہ "اپنی توجہ پوری طرح دین کی طرف مرکوز کر لیجئے۔ اس کے بعد جملہ کو آگے بڑھاتا ہے: "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا" خدا کی سرشت (فطرت) یعنی الٰہی تخلیق کا طریقہ، وہ طریقۂ آفرینش جس پر خداوند عالم نے انسان کو بنایا اور پیدا کیا ہے۔ دوبارہ ایک عربی زبان کی رائج و مستعمل تعبیر استعمال ہوئی ہے، کلام کے درمیان بظاہر ایک نامکمل جملہ کا استعمال اگرچہ دوسری زبانوں کے ادبیات میں بھی ہوا ہے لیکن عربی عبارتوں میں یہ چیز کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ "فطرۃ اللہ" اغراء کی جانب منسوب ہے اور یہ وہ تعبیر ہے جو عربی ادبیات میں اور علم نحو میں استعمال ہوتی ہے۔ فارسی میں (اور اسی سے مشابہ اردو میں بھی) کبھی کبھی کہتے ہیں "خدارا خدارا" یعنی، ہوش و حواس خدا کی طرف رہے، "یہ فطرۃ اللہ" ادبی طور پر یہاں کچھ اسی نوعیت سے استعمال ہوا ہے اور دراصل یہ پہلے جملے کی ہی تفسیر و تحلیل کرتا ہے یعنی یہ جو میں نے کہا ہے کہ اپنی پوری توجہ دین کی طرف متمرکز کر لو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی امور انجام دو جس کا خود تمہاری فطرت تقاضا کرتی ہے، میں نے تم سے تمہاری فطرت یا فطری خواہش کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے، تمہاری پوری توجہ دین کی طرف رہے یعنی خود اپنی اس فطرت و سرشت پر توجہ رکھو جس پر خدا نے تم کو پیدا کیا ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے: "الزم فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا" یعنی اس فطرت الٰہیہ کو لازم جانو جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

دوسری تعبیریں بھی کی گئی ہیں جن کا ذکر کرکے ذہنوں کو زیادہ الجھانا شاید مناسب نہ ہو، ہم صرف اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ آیت میں اس جملہ کی حیثیت کیا ہے۔ "اپنی توجہ دین کی طرف رکھو" کے بعد الٰہی فطرت کا ذکر ہوتا ہے اور پھر آیت آگے بڑھتی ہے:۔

"لا تبدیل لخلق اللہ" یہ الٰہی فطرت اور نوع آفرینش ہے جس پر خداوند عالم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان دین سے خبردار رہے اور اس کی توجہ دین پر مرکوز رہے، اس کے بعد خدا مزید تاکید کی غرض سے کہتا ہے کہ یہ خیال نہ کرنا کہ یہ کچھ انسانوں کا ذکر ہے یا کسی ایک زمانے میں انسان کی فطرت ایسی رہی ہے بلکہ "لا تبدیل لخلق اللہ" الٰہی فطرت میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، خدا نے انسان کو پیدا ہی اس سرشت پر کیا ہے اور اس کی فطرت خود تقاضا کرتی ہے کہ انسان دین کی طرف متوجہ ہو۔

"ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون" "لیکن زیادہ تر لوگ اس کو نہیں سمجھتے ہیں"۔
یہ آیت کی تقریباً لفظی توضیح تھی جو میں نے عرض کی ہے۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لوگوں نے نتائج نکالنے چاہے ہیں ۔ بعض کہتے ہیں آیت سے اس بات کا استفادہ ہوتا ہے کہ دین کے احکام خصوصاً دین کے بنیادی و اصولی احکام انسانی فطرت کے مطابق ہیں، وہ کلیات جن کا دین سے تعلق ہے وہ چیزیں ہیں جن کا خود انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے یہ خلاف فطرت نہیں ہیں، پس آیت میں فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا سے مراد یہ ہے کہ دین کے احکام اور اس کے اصولی قواعد انسان کی نوع آفرینش و فطرت کے مطابق ہیں اگر دین میں خدا کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے تو یہ خدا کی پرستش کا حکم خلاف فطرت نہیں ہے، یہ خواہش خود انسان کے اندر موجود ہے جو اس کا مطالبہ کرتی ہے اگر دین میں کہا گیا ہے کہ دوسروں کی مدد کرو، انصاف کا پاس و لحاظ رکھو، ظلم نہ کرو، تو خود انسان کے اندر ایسے عامل پائے جاتے ہیں جو ان کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ فطرت کے خلاف نہیں ہیں، اسی طرح وہ چیزیں جو انسان کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، طیب اور پاکیزہ چیزوں کا جائز ہونا، نجس اور گندی چیزوں کا حرام ہونا وغیرہ وہ چیز ہے جس کا خود انسان کی فطرت مطالبہ کرتی ہے:۔

"احلّ لکم الطّیبات" تم پر طیبات "طاہر و پاکیزہ چیزیں" حلال کی گئی ہیں۔
(مائدہ/۵)

"یحرّم علیہم الخبائث" ان پر خبائث "پلید و نجس چیزیں" حرام کی گئی ہیں۔
(اعراف/۱۵۷)

یہ تمام احکام مطابق فطرت ہیں۔ شادی کا قانون مطابق فطرت ہے، اگر کوئی دین کلی طور پر شادی کے قانون کی ممانعت کرتا ہے تو خلاف فطرت قانون کا حامل ہے، لیکن اسلام کا کوئی قانون خلاف فطرت نہیں ہے۔

یہ اس آیت کی ایک تفسیر، اور اس تفسیر کی بنیاد پر، خدا کی عبادت، جو دین اسلام کے تمام احکام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ فطرت کے مطابق بتائی جاتی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق دین، احکام و قوانین کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ احکام و قوانین الٰہی فطرت کے مطابق ہیں، لہٰذا خدا کہتا ہے کہ احکام و قوانین کا خوب دقیق طور پر پاس و لحاظ رکھو، اور ان ہی احکام میں سے ایک خدا کی عبادت

و پرستش بھی ہے پس اس آیت سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا کی عبادت ایک ایسا امر ہے جو فطرت کے مطابق ہے
دوسری تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ مطابق فطرت دین سے خدا کے مقابل خود اسلام و تسلیم یعنی خود سپردگی
کی حالت مراد ہے:۔

"ان الدین عند اللہ الاسلام" (آل عمران/۱۹)

"دین خدا کے نزدیک اسلام ہے"

اسلام کا مطلب بھی، مطیع و منقاد اور تحت فرمان ہونا ہے۔" الاسلام ھو التسلیم" خدا کے مقابل اطاعت و فرمانبرداری کی حالت ایک فطری امر ہے ایسا نہیں ہے کہ آیت تمام احکام و قوانین کے جزئیات یا دوسری چیزوں کو مطابق فطرت بتانا چاہتی ہے۔

دین کا مطلب ہی خداوند عالم کا مطیع ہونا ہے:۔

ومن یسلم وجھہٗ الی اللہ (لقمان/۲۲)

جو شخص خدا کے سامنے سر تسلیم خم کردے (وہ مومن ہے)

اپنے آپ کو خدا کے حوالے کردے، معلوم ہوا کہ دین کی فطرت کے ساتھ موافقت و ہم آہنگی کا مفہوم یہ ہے کہ خود انسان کے وجود میں خدا کی عبادت و پرستش کا رجحان موجود ہے، جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں۔ ان دونوں تفسیروں کے مطابق آیت میں "فطری ہونے" سے مراد فطری رجحان ہے۔ یعنی دونوں سے خدا کی عبادت کا رجحان و میلان ثابت ہوتا ہے لیکن یہاں ہماری گفتگو کا محور فطری بصیرت ہے یعنی ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان خدا کی نسبت ایک فطری معرفت رکھتا ہے، اور وہ بھی شہودی معرفت کے عنوان سے، اس سلسلہ میں سوال یہ تھا کہ آیا یہ مفہوم اس آیت سے نکلتا ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ: جب انسان کی فطرت میں خدا کی پرستش کا میلان پایا جاتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ یہ میلان جس سے متعلق ہے خود اس کی نشاندہی نہ ہو؟ جب ہم کہتے ہیں کہ انسانی وجود میں خدا پرستی کی طرف میلان موجود ہے، تو کسی نہ کسی نوعیت کی معرفت بھی فطرت میں موجود ہونا چاہئے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں (اپنے عام معنیٰ میں کہ جس میں خواہشات بھی شامل ہے) شادی کا میلان موجود ہے، تو خود فطرت اپنے متعلق کو پہچانتی ہے، جب انسان کے اندر ہمسر کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگا وہ خود سمجھتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے، اسے کس وجود کے ساتھ تعلق قائم کرنا اور زندگی بسر کرنا ہے، خود فطرت نشاندہی کرتی

ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ ہم جنسی میلان کو ایک فطری امر کے طور پر قبول کریں لیکن اس کا متعلق نامعلوم ہو یعنی جس وقت ایک مرد کو زوجہ کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے ایسا نہیں ہے کہ وہ نہ جانتا ہو کہ آیا وہ درخت کے اوپر چڑھ جائے، چاند کی سطح پر پہنچ جائے یا یہ کہ اسے اپنی زندگی میں ایک عورت کی ضرورت ہے۔ جب یہ خواہش انسان میں پیدا ہوتی ہے تو وہ خود سمجھتا ہے کہ کیا چاہتا ہے، پس ایک قسم کی شناخت اس کے ساتھ ہوتی ہے، جب خدا کی معرفت کا فطری ہونا ثابت ہو گیا یعنی یہ طے ہو گیا کہ کسی کے سامنے عقیدت و فروتنی کا رجحان موجود ہے تو اس ذات کی معرفت ہونا چاہیئے یہ نہیں کہ کسی ایسی چیز کے سامنے سر جھکائیں جس کو جانتے ہی نہیں کہ کیا چیز ہے، خود یہ فطرت اس چیز کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ فروتنی کامل مطلق کے سامنے ہے، (فطرت اور خواہش کی تعبیر میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں متعدد اصطلاحات موجود ہیں ہم نے یہاں دونوں کو ہم معنی مانا ہے یعنی یہ دونوں تعبیریں ایک ہی چیز پر اطلاق کرتی ہیں)

جب ہم کہتے ہیں ایک فطری خواہش ہمارے اندر موجود ہے جو چاہتی ہے کہ خدا کے سامنے فروتنی و پرستش کرے، یہ اس معنی میں ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کی جستجو میں ہے جو کامل مطلق ہو، اور اگر دوسروں کے سامنے انسان فروتنی سے کام لیتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ اس کو اپنا مطلوب نہیں ملا ہے اور وہ اپنے گم شدہ کو پیدا نہیں کر سکا ہے اور کسی متبادل مطلوب کی تلاش میں ہے اپنے حقیقی معشوق تک نہیں پہنچ سکا لہٰذا اگر کوئی بہتر اور کامل تر معشوق مل گیا تو رفتہ رفتہ پہلے معشوق کو بھول جاتا ہے، اگر عشق کی بنیاد خوبصورتی رہی ہے تو جب زیادہ خوبصورت معشوق مل جائے اپنے پہلے معشوق کی نسبت رفتہ رفتہ انس و دلبستگی ختم ہو جائے گی اور دوسرے کی فکر پیدا ہو جائے گی اور جب اس سے بھی زیادہ خوبصورت کوئی مل جائے گا، تو یہی کیفیت پیدا ہو گی۔ معلوم ہوا کہ یہ حقیقی مطلوب نہیں ہیں بلکہ محض متبادل کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کی فطرت جس کی تلاش میں ہے وہ کامل مطلق ہے جو ہر عیب سے پاک ہے۔ اس کے یہاں کوئی کمی نہیں پائی جاتی، اس سے بالاتر کمال کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس سے بہتر جمال و خوبصورتی ممکن نہیں ہے، اگر اس کو پا لیا تو اب اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا وہ مطلوب حقیقی ہے، حقیقی تسکین۔ یہ چاہت صرف اللہ کی پرستش سے پوری ہوتی ہے، پس ہماری فطرت میں اس کی نسبت ایک معرفت پائی جاتی ہے اگرچہ ضعیف ہے اور ہم اس ضعف کے سبب

تطبیق کرنے میں غلطی کا شکار رہتے ہیں۔ البتہ، یہ لفظ "فطری" منطق و فلسفہ میں مختلف اصطلاحوں کے لئے استعمال ہوتا ہے فی الحال ہماری بحث سے تین اصطلاحیں مناسبت رکھتی ہیں:۔

۱۔ "خدا کی جستجو" انسان کی "فطری خواہشات" میں سے ایک ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بشریت کی طویل تاریخ میں تمام انسان اپنے نسلی، جغرافیائی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود ہمیشہ ایک خدا کی جستجو میں رہے ہیں اور ہمیشہ کسی نہ کسی نوعیت سے کائنات کے خالق کا عقیدہ اور دین انسانوں کے درمیان موجود رہا ہے۔

۲۔ "خدا کی معرفت" ایک "فطری معرفت" ہے اور اس سے دو طرح کی فطری معرفتیں مراد ہیں، حصولی و حضوری۔

(الف) حصولی معرفت کے فطری ہونے سے مراد یہ ہے کہ خدا کی تصدیق کے لئے یہاں عقل انسانی کو تگ و دو کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان آسانی کے ساتھ درک کرتا ہے کہ نہ صرف انسانی وجود بلکہ دنیا کی تمام مخلوقات محتاج ہیں بس ایک "بے نیاز خدا" موجود ہے جو ان کی ضروریات کو رفع کرتا ہے۔

(ب) حضوری معرفت کے فطری ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے سے ایک ایسا قلبی رابطہ رکھتا ہے کہ جس وقت وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں خود جھانک کر دیکھتا ہے اس رابطہ کو پالیتا ہے لیکن اکثر لوگ خصوصاً اپنی عادی زندگی میں جبکہ وہ دنیوی امور میں مشغول ہوتے ہیں اس قلبی رابطہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور محض اس وقت جب ان کی توجہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور ان کی امیدیں ہر طرف سے منقطع ہو جاتی ہیں، اس قلبی رابطہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۳۔ "خدا کی عبادت ایک فطری میلان" ہے اور انسان کی خود اپنی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرے اور اس کے تئیں خضوع و خشوع اور تسلیم و فروتنی سے کام لے۔

ظاہر ہے لفظ "فطری"، پہلے اور تیسرے مرحلے میں ایک طرح کے باطنی میلان و رجحان کے معنی میں ہے اور براہ راست معرفت سے اس کا تعلق نہیں ہے، لیکن دوسرے مرحلے میں ایک طرح کی معرفت کے معنی میں ہی ہے، چاہے حضوری و شہودی معرفت کے معنی میں ہو چاہے حصولی

وعقلی معرفت کے معنی میں ہو۔

لیکن جہاں تک عقلی معرفت کا سوال ہے حقیقت میں یہ دلیل و برہان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے البتہ چونکہ دلیل بہت ہی واضح ہے اس لئے اس کو فطری کا نام دے دیا جاتا ہے جبکہ فطری حضوری معرفت بالکل وہی معرفت ہے جو ہم یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

آیۂ فطرت کا تجزیہ کرتے وقت ہم عرض کر چکے ہیں کہ پہلے دین کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا حکم دیا گیا اور اس کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ کام فطرت اور انسانی سرشت کے بالکل مطابق ہے کہ جس پر خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور وہ ناقابل تغییر ہے خود اس کا یہی تقاضا ہے اور اس کے بعد کہا گیا کہ محکم و استوار دین اصل میں یہی ہے اور پھر آخر میں اس نکتہ کی طرف متوجہ کیا گیا کہ زیادہ تر افراد اس سے غافل و بے خبر ہیں، لیکن انھیں اس کا احساس نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ "فطری امر" ہے کیا؟ خدا کی معرفت؟ خدا کی پرستش؟ یا کوئی اور چیز؟ اگر اس "امر فطری" سے مراد وہی نادانستہ قلبی و حضوری معرفت کو لیا جائے تو اس سے بالکل ہی بات صادق آتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اور اس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں اس آیت کا مفہوم وہی بتایا گیا ہے جو آیۂ میثاق کا ہے جس کی وضاحت ہم آئندہ بحث میں بیان کریں گے۔ لیکن اگر اس سے مراد عقلی معرفت ہے تو اس بحث سے اس کا کوئی ربط پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ اس دوسرے احتمال کی تائید بھی کہیں سے نہیں ہوتی۔

آیۂ فطرت کے سلسلہ میں دو دوسری تفسیریں بھی ملتی ہیں:۔

۱۔ مراد یہ ہے کہ تمام اصولی عقائد اور بنیادی احکام مثلاً توحید، خدا کی پرستش، محروموں کی خبر گیری، معاشرہ میں عدل و انصاف کا قیام اور اسلام کے دیگر اساسی مسائل، آدمی کی فطرت کے مطابق اور انسانی خواہشات و میلانات اور نظریات در جہات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس تفسیر کی روشنی میں خدا کی معرفت اور خدا کی عبادت اس فطرت کا ایک جزو ہے جس کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ اسی سے ملتی جلتی دوسری تفسیر یہ ہے کہ دین کی حقیقت، خدا کے حضور تسلیم و فروتنی ہے جو الٰہی قوانین و دستورات کے تحت مختلف قسم کی عبادتوں اور طاعتوں کی شکل میں متجلی ہوتا

ہے، جیسا کہ خود لفظ "اسلام" اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے :۔

"انّ الدین عند اللہ الاسلام"

(آل عمران / ۱۹)

خدا کے نزدیک دین تو بس اسلام (یعنی الٰہی قوانین کے سامنے تسلیم ہو جانا) ہے۔

اور دین کے فطری ہونے سے مراد یہ ہے کہ خدا کی معرفت اور پروردگار کے سامنے فروتنی کا رجحان وہ رجحان ہے جن کی جڑیں انسانی فطرت میں موجود ہیں اور ہر انسان فطری طور پر کامل مطلق سے تعلق و تقرب کا خواہاں ہوتا ہے اور تمام شرک آمیز منحرف عبادتیں غلط تلقین و تربیت کا نتیجہ ہیں یا پھر خدا کی مطابقت میں غلطی و جہالت کی پیداوار ہوتی ہے :۔

"کلّ مولود یولد علی الفطرۃ"[۱]

ہر بچہ (دین) فطرت پر پیدا ہوتا ہے ....

اس تفسیر کے مطابق آیۂ کریمہ سے براہ راست "خدا کی معرفت" کا پتہ نہیں چلتا لیکن کہا جاسکتا ہے کہ "خدا کی عبادت" کے فطری ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ انسانی وجود میں خداوند متعال کے تئیں ایک طرح کی معرفت بہرحال پائی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ انسان خدا کو پہچانے اور پھر اس کی عبادت کرے۔ چنانچہ جب خداپرستی کا رجحان فطری ہوگا تو لامحالہ اس کی معرفت بھی فطری ہوگی۔

اصول کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے :۔

"فطرھم علی المعرفۃ بہ"[۲]

یعنی خدا نے انسان کو اپنی معرفت پر خلق کیا ہے۔ (دوسرے لفظوں میں خدا کی معرفت فطری و پیدائشی ہے۔

۱۔ کافی ج ۲، ص ۱۳ (مطبوعہ دار الکتب اسلامیہ) ۲۔ ایضاً

رحمتِ پروردگار

امام حسین علیہ السلام :

وقال (ع) :

"بکاء العیون
وخشیة القلوب
من رحمة اللہ"

آنکھوں کا رونا اور دلوں کا خشیت الٰہی سے خوفزدہ

ہونا رحمت پروردگار کی نشانیوں میں سے ہے۔

بلاغۃ الحسین ص۳۶۸

منازل و مقامات

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترجمہ، جناب سید ابوجواد

(٦)

عرفا، حقیقی عرفان تک پہنچنے کے لئے، کچھ مقامات و منازل کو طے کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان مقامات کو عملی طور پر طے کئے اور ان منزلوں سے گزرے بغیر حقیقی عرفان تک رسائی ناممکن ہے۔

"عرفان" اور "حکمت الٰہی" کچھ چیزوں میں شریک ہیں اور بعض چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وجہ اشتراک یہ ہے کہ دونوں ہی "اللہ کی معرفت" سے تعلق رکھتے ہیں اور وجہ اختلاف یہ ہے کہ "حکمت الٰہی" کا مقصد صرف اللہ کی معرفت نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد پورے نظام کائنات کو اسی طرح پہچاننا ہے جیسا وہ ہے۔ جو معرفت حکیم (فلسفی) حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ایک ایسا نظام تشکیل دیتی ہے جس کا اہم ترین رکن اللہ کی معرفت ہے لیکن عرفان کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی معرفت ہے۔ عرفانی نقطہ نظر سے اللہ کی معرفت، ہر چیز کی معرفت ہے۔ ہر چیز کو اللہ کی معرفت کے پرتو میں اور توحیدی نقطہ نظر سے پہچاننا چاہئے اور اس قسم کی معرفت، اللہ کی معرفت کی فرع ہے۔

ثانیاً حکیم (فلسفی) جس معرفت کا طالب ہے وہ ذہنی و فکری معرفت ہے۔ یہ معرفت ویسی ہی ہے جیسی ایک ریاضی داں، ریاضی مسائل میں غور و فکر کرکے حاصل کرتا ہے۔ لیکن عارف جس معرفت کا خواہاں ہے وہ حضوری و شہودی معرفت ہے۔ یہ ویسی ہی معرفت ہے جیسی لیبارٹری میں تجربہ کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ حکیم، علم الیقین کا طالب ہے اور عارف حق الیقین کا

خواہاں ہے۔

ثالثاً۔ حکیم (فلسفی) کا وسیلہ عقل، استدلال اور برہان ہے جبکہ عارف کا وسیلہ قلب، تصفیہ، تہذیب اور تکمیل نفس ہے۔ حکیم اپنے ذہن کی دوربین کے سہارے نظام کائنات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عارف اپنے پورے وجود سے، وجود ہستی کی حقیقت سمجھنا اور سمندر میں مل جانے والے قطرے کے مانند حقیقت میں ضم ہوجانا چاہتا ہے۔

حکیم کی نظر میں انسان کا متوقع اور فطری کمال "سمجھنا" ہے جبکہ عارف کی نگاہ میں انسان کا فطری اور متوقع کمال "پہنچنا" ہے۔ حکیم کی نظر میں ناقص انسان، جاہل انسان کے مساوی ہے۔ لیکن عارف کی نگاہ میں ناقص انسان، اپنی اصل سے دور اور جدا انسان کے مساوی ہے۔

عارف، جس کی نگاہ میں پہنچنا کمال ہے نہ کہ سمجھنا، وہ اپنے اصلی مقصد اور حقیقی عرفان تک رسائی کے لئے کچھ منزلوں، مرحلوں اور مقامات سے گزرنا ضروری و لازم سمجھتا ہے، اور اسے "سیر و سلوک" کا نام دیتا ہے۔

عرفانی کتابوں میں ان منازل و مقامات کے سلسلہ میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ یہاں اس مقالہ میں ان بحثوں کی تشریح ـــ حتی اختصار کے ساتھ بھی ـــ ممکن نہیں ہے لیکن ایک سرسری جائزہ اور اجمالی اشارہ کر دینے کے لئے، سب سے بہتر یہ ہے کہ بو علی سینا کی "اشارات" کی نویں نمط (فصل) سے استفادہ کیا جائے۔

بو علی سینا اگرچہ ایک فلسفی ہیں نہ کہ عارف۔ لیکن وہ فلسفیٔ خشک نہیں ہیں، خاص طور سے آخر عمر میں ان کے اندر عرفانی رجحانات بھی نمایاں ہوگئے تھے اور "اشارات" میں ـــ جو بظاہر ان کی آخری کتاب ہے ـــ انہوں نے ایک فصل عارفوں کے مقامات و منازل سے مختص کر دی ہے۔

میں یہاں پر عرفا کی کتابوں سے کچھ نقل کرنے کے بجائے اسی فصل کا خلاصہ و ترجمہ پیش کرنے کو ترجیح دوں گا جو غیر معمولی حد تک دلکش و اعلیٰ ہے۔

تعریف

المعرض عن متاع الدنیا وطیباتها یخص باسم الزاهد، والمواظب علی فعل

العبادات من القيام والصيام و نحو هما يخص باسم العابد؛ والمتصرف بفكره الى قدس الجبروت مستديما لشروق نور الحق في سره يخص باسم العارف وقد يتركب بعض هذه مع بعض.

دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے منہ موڑنے والے کو "زاہد" کہتے ہیں۔ نماز اور روزہ وغیرہ جیسی عبادتیں بجالانے والے کو "عابد" کہتے ہیں جو اپنے ضمیر کو نور حق سے منور کرنے کے لئے غیر حق سے روگرداں کرکے عالم قدس کی جانب متوجہ کر دے، اسے "عارف" کہتے ہیں۔ البتہ بعض اوقات ان میں سے دو عنوان یا تینوں عناوین ایک ہی شخص میں جمع ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ بوعلی سینا نے یہاں زاهد، عابد اور عارف کی تعریف بیان کی ہے۔ تاہم ضمنی طور پر زہد، عبادت اور عرفان کی تعریف بھی بیان کر دی ہے۔ کیونکہ زاهد بما هو زاهد، عابد بما هو عابد اور عارف بما هو عارف کی تعریف کا لازمہ زہد، عبادت اور عرفان کی تعریف ہے۔

پس اس عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ "زہد" دنیاوی خواہشات سے روگردانی کا نام ہے "عبادت" نماز، روزہ اور تلاوت قرآن وغیرہ جیسے کچھ مخصوص اعمال کی بجاآوری کا نام ہے اور اصطلاحی عرفان "قلب پر نور حق کی ضیاباری کی خاطر ذہن کو ماسوی اللہ سے موڑنے اور ذات حق کی طرف پورے طور سے متوجہ کرنے کا نام ہے۔

اس آخری جملہ میں ایک بڑے اہم نکتہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ کبھی کبھی ان میں سے بعض چیزیں بعض دوسری چیزوں کے ساتھ جمع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ ایک انسان ایک ہی وقت میں زاہد بھی ہو اور عابد بھی۔ یا عابد بھی ہو اور عارف بھی۔ یا عارف بھی ہو اور زاہد بھی یا زاہد بھی ہو اور عابد و عارف بھی۔ لیکن بوعلی سینا نے اس سلسلہ میں مزید توضیح نہیں دی ہے۔

البتہ ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک شخص زاہد یا عابد ہو اور عارف نہ ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص عارف ہو اور زاہد عابد نہ ہو۔

اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ۔ زاہد و عابد کے درمیان عموم وخصوص من وجہ کی نسبت

پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ایک شخص زاہد ہو اور عابد نہ ہو یا عابد ہو زاہد نہ ہو یا عابد بھی ہو اور زاہد بھی۔ یہ واضح سی بات ہے لیکن زاہد و عابد اور عارف کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے۔ یعنی ہر عارف، زاہد و عابد بھی ہے لیکن ہر زاہد یا عابد، عارف نہیں ہے۔

البتہ آگے چل کر یہ بحث آئے گی کہ عارف کے زہد اور غیر عارف کے زہد کا فلسفہ الگ الگ ہے۔ غیر عارف زاہد کے زھد کا فلسفہ کچھ ہے اور عارف زاہد کے زہد کا فلسفہ کچھ اور ہے جس طرح عارف کی عبادت کا فلسفہ الگ ہے اور غیر عارف کی عبادت کا فلسفہ جدا ہے، بلکہ عارف کے زہد و عبادت کی روح و ماہیت بھی غیر عارف کے زہد و عبادت کی روح و ماہیت سے مختلف ہے۔

الزهد عندغير العارف معاملة ماكانه يشتري بمتاع الدنيا متاع الاخرة وعندالعارف تنزه ما عما يشغل سره عن الحق وتكبر على كل شيء غيرالحق. والعبادة عند غير المعارف معاملة ماكانه يعمل في الدنيا لاجرة يأخذها في الاخرة هي الاجر والثواب وعندالعارف رياضة ما لهممه وقوى نفسه المتوهمة والمتخيلة ليجرها بالتعويد عن جناب الغرور الى جناب الحق...

غیر عارف کا زہد ایک طرح کی تجارت ہے۔ گویا وہ متاع دنیا دے کر متاع آخرت حاصل کرتا ہے لیکن عارف کا زہد، اپنے دل کو ان تمام چیزوں سے منزہ رکھنا ہے جو اسے یاد حق سے دور کر دیتی ہیں۔ غیر عارف کی عبادت بھی ایک قسم کی تجارت ہے گویا وہ دنیا میں مزدوری کرتا ہے تاکہ اس کی اجرت آخرت میں ثواب و اجر کی شکل میں وصول کرے جبکہ عارف کی عبادت اس عالم غرور سے رخ موڑنے اور حق تعالیٰ سے لو لگانے کے لئے ایک قسم کی روحانی مشق و ریاضت ہے تاکہ اس بار بار کی مشق و تمرین کے ذریعہ ذات حق کی طرف کھینچ لیا جائے۔

عارف کا مقصد

العارف يريدالحق الاول لالشيء غيره ولايؤثر شيئاً على عرفانه وتعبده له فقط لانه مستحق للعبادة ولانها نسبة شريفة اليه لالرغبة اورهبة.

عارف، حق (خدا) کو چاہتا ہے لیکن کسی غیر حق چیز کی خاطر نہیں۔ وہ کسی چیز کو معرفت حق پر ترجیح نہیں دیتا۔ وہ خدا کی عبادت صرف اس لئے کرتا ہے کہ وہ مستحق عبادت ہے اور چونکہ

عبادت خود اپنی ذات میں (خدا سے) ایک شریف رابطہ ہے۔ اس کی عبادت کا باعث، کسی چیز کی خواہش اور لالچ یا کسی چیز کا ڈر نہیں ہوتا۔

مراد یہ ہے کہ عارف مقصد کے لحاظ سے "موحد" ہے۔ وہ صرف خدا کو چاہتا ہے، لیکن وہ خدا کو دنیاوی یا اخروی نعمتوں کی خاطر نہیں چاہتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کا حقیقی اور بالذات مطلوب یہی نعمتیں ہوں گی اور خدا ان نعمتوں کے حصول کا مقدمہ و وسیلہ۔ پس حقیقی معبود و مطلوب یہی نعمتیں ہیں بلکہ حقیقت میں حقیقی معبود و مطلوب نفس ہے، کیونکہ وہ ان نعمتوں کو نفس کی تسکین کے لئے چاہتا ہے۔

عارف، جو کچھ چاہتا ہے، صرف خدا کے لئے چاہتا ہے، وہ اگر خدا کی نعمتوں کو چاہتا ہے تو اس کا باعث یہ ہے کہ وہ خدا کی نعمتیں اور اس کی عنایتیں ہیں۔ اس کا لطف و کرم ہے۔ مختصر یہ کہ غیر عارف خدا کو اس کی نعمتوں کے لئے چاہتا ہے اور عارف خدا کی نعمتوں کو خدا کی خاطر چاہتا ہے۔

یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر عارف، خدا کو کسی دوسری چیز کی خاطر نہیں چاہتا تو پھر وہ خدا کی عبادت کیوں کرتا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر عبادت کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے؟ بو علی سینا اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عبادت سے عارف کا مقصد ان دو چیزوں میں سے ایک ہے:۔

الف۔ عبادت کے لئے معبود کی ذاتی لیاقت، یعنی عارف خدا کی عبادت اس لئے کرتا ہے کہ وہ لائق عبادت ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ انسان کسی شخص یا چیز میں کوئی کمال دیکھ کر اس کے کمال کی مدح و ثنا کرتا ہے۔ اگر اس سے یہ پوچھ لیا جائے کہ تم یہ تعریفیں کیوں کر رہے ہو؟ اس مدح و ثنا سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ تو وہ جواب دے گا کہ میں نے کسی منفعت کی لالچ میں اس شخص یا اس چیز کی تعریف نہیں کی ہے۔ میں نے اس کی تعریف صرف اس لئے کی ہے کہ وہ مستحق تعریف ہے۔ ہر میدان کے سورماؤں کی تعریف اسی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے۔

ب۔ عبادت سے عارف کا ایک دوسرا مقصد، خود عبادت کی شائستگی و استحقاق اور اس کا ذاتی حسن و شرف ہے۔ عبادت، چونکہ خدا و بندہ کے درمیان ایک قسم کا ارتباط ہے لہذا وہ بجا لائے جانے کے لائق ہے۔ پس یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عبادت کسی خوف یا لالچ ہی کے تحت بجا لائی جائے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام سے ایک جملہ نقل ہوا ہے کہ : الٰہی ماعبدتک خوفاً من نارک ولا طمعاً فی جنتک بل وجدتک اھلا للعبادۃ فعبدتک یعنی، خداوندا! میں نے تیری عبادت تیرے جہنم کے خوف یا تیری جنت کی لالچ میں نہیں کی بلکہ میں نے تجھے عبادت کے لائق پایا اس لئے تیری عبادت کی۔

حضرت نے اس جملہ میں عبادت کا سبب معبود کی شائستگی و لیاقت کو قرار دیا ہے۔

عرفا اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اگر زندگی اور خاص طور سے عبادات میں انسان کا مقصود و مطلوب ذات حق کے سوا کوئی اور چیز ہو تو یہ ایک قسم کا شرک ہے۔ عرفان سو فیصد اس شرک کا مخالف ہے، عرفا نے اس ذیل میں بہت سی لطیف باتیں کہی ہیں۔ ہم یہاں پر سعدی کی اس لطیف و اعلیٰ تمثیل کے نقل پر اکتفا کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب "بوستان" میں محمود غزنوی اور ایاز کی داستان کے ضمن میں بیان کی ہے :۔

یکی خورده بر شاه غزنین گرفت

کہ حسنی ندارد ایاز ای شگفت

گلی را کہ نہ رنگ باشد نہ بو

دریغ است سودای بلبل بر او

بہ محمود گفت این حکایت کسی

بپیچید ز اندیشہ بر خود بسی

کہ عشق من ای خواجہ بر خوی اوست

نہ بر قد و بالای دلجوی اوست

شنیدم کہ در تنگنائی شتر

بیفتاد و بشکست صندوق در

بہ یغما ملک آستین برفشاند

وز آنجا بہ تعجیل مرکب براند

سواران پے در و مرجان شدند
ز سلطان بہ یغما پریشان شدند
نماند از وشاقان گردن فراز
کسی در قفای ملک جز ایاز
چو سلطان نظر کرد اورا بدید
ز دیدار او ہمچو گل بشکفید
بگفت کہ ای سنبلت پیچ پیچ
ز یغما چہ آوردہ ای ؟ گفت ہیچ
من اندر قفای تو می تاختم
ز "خدمت" بہ "نعمت" نپرداختم

سعدی اس داستان نقل کرنے کے بعد اپنا اصل مقصد یوں بیان کرتے ہیں ؎

گر از دوست چشمت بہ احسان اوست
تو در بند خویشی نہ در بند دوست
خلاف طریقت بود کا ولیا
تمنا کنند از خدا جز خدا

پہلی منزل

اوّل درجات حركات العارفين مايسمونه هم الارادة وهو مايعتري المستبصر باليقين البرهاني او الساكن النفس الى العقد الايماني من الرغبة فى اعتلاق العروة الوثقى فيتحرك سره الى القدس لينال من روح الاتصال.

عارفوں کے سیر و سلوک کی پہلی منزل وہی ہے جسے "ارادہ" کہا جاتا ہے ارادہ، ایک طرح کے شوق و رغبت کا نام ہے جو انسان میں دلائل و براہین یا تعبد وایمان کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے تاکہ وہ حقیقت کے مستحکم دستہ کو پکڑ سکے اس وقت انسان کو حقیقت سے ہمکنار کرنے کے لئے اس کی روح اور ضمیر حرکت میں آتے ہیں۔

سیر و سلوک کی پہلی منزل ۔ جس میں ایک لحاظ سے پورا عرفان موجود ہے ۔ بیان کرنے کے لئے ہم یہاں کچھ توضیح دینے پر مجبور ہیں ۔

اوّل یہ کہ عرفا ایک اصول کے قائل ہیں جسے وہ اس جملہ میں بیان کرتے ہیں : النہایات ھی الرجوع الی البدایات ۔ یعنی انجام آغاز کی طرف واپسی ہی کا نام ہے ۔

واضح سی بات ہے کہ اگر انجام کو عین آغاز مان لیا جائے تو یہاں دو صورتیں فرض کی جا سکتی ہیں ۔ ایک یہ کہ حرکت، خطِ مستقیم پر ہو اور متحرک چیز ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر جہت بدل دے اور جس راستہ سے آئی ہے اسی طرف پلٹ جائے ۔ فلسفہ میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس طرح کی جہت کی تبدیلی کا لازمہ "تخلل سکون" ہے ۔ چاہے وہ غیر محسوس ہی کیوں نہ ہو ۔ علاوہ بریں یہ دونوں حرکتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حرکت، ایک ایسے منحنی خط پر ہو جس کے تمام فاصلے ایک معین نقطہ کے برابر ہوں ۔ یعنی حرکت، قوس دائرہ پر ہو ۔

ظاہر ہے کہ اگر حرکت، دائرہ پر ہو گی تو فطری طور پر نقطۂ آغاز ہی نقطۂ انجام بھی ہوگا ۔ دائرہ پر حرکت کرنے والی چیز پہلے نقطۂ آغاز سے دور ہو کر ایک ایسے نقطہ پر پہنچ جائے گی جو نقطۂ آغاز سے دور ترین نقطہ ہے ۔ یہ وہی نقطہ ہے کہ اگر نقطۂ آغاز سے دائرہ میں ایک گولہ کھینچا جائے تو وہ اسی نقطہ پر پہنچے گا ۔ اس نقطہ پر پہنچتے ہی کسی قسم کا سکونی خلل پڑے بغیر نقطۂ آغاز کی طرف واپسی (معاد) شروع ہو جائے گی ۔

عرفا ، نقطۂ آغاز سے دور ترین نقطہ تک کی راہ حرکت کو "قوس نزول" اور دور ترین نقطہ سے نقطۂ آغاز تک کے راستہ کو "قوس صعود" کہتے ہیں ۔ نقطۂ آغاز سے دور ترین نقطہ تک اشیاء کی حرکت کا ایک فلسفہ ہے ۔ فلاسفہ اس فلسفہ کو "قانونِ علیت" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور عرفا اسے "قانون تجلی" کہتے ہیں ۔ بہر صورت قوس نزول میں اشیاء کی حالت ایسی ہی ہے جیسے اسے پیچھے سے ڈھکیلا جا رہا ہو ۔ لیکن دور ترین نقطہ سے نقطۂ آغاز تک اشیاء کی حرکت ایک دوسرا فلسفہ رکھتی ہے ۔ اور وہ فلسفہ ہر فرع کا اپنی اصل اور اپنے آغاز کی طرف واپسی سے عشق اور لگاؤ کا قانون ہے ۔ دوسرے لفظوں میں وطن سے دور اور جدا ہو جانے والی ہر چیز میں اپنے اصلی وطن کی طرف لوٹنے کا عشق پایا جاتا ہے ۔

عرفا کا خیال ہے کہ یہ رجحان کائنات کے ذرہ ذرہ ، منجملہ انسان میں موجود ہے لیکن انسان میں یہ رجحان بعض اوقات مخفی ہوتا ہے ۔ مشاغل ، اس احساس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں لیکن کچھ ٹھوکروں اور تنبیہات کے بعد یہ باطنی رجحان مکمل کر سامنے آجاتا ہے ۔ اور اسی ظہور کو "ارادہ" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ ارادہ ، درحقیقت ایک سوئے ہوئے شعور کی ایک طرح کی بیداری ہے ۔ عبدالرزاق کاشانی نے اپنے رسالہ" اصطلاحات" میں ـــــ جو شرح منازل السائرین کے حاشیہ پر چھپا ہے ـــــ ارادہ کی تعریف میں کہتے ہیں : جمرة من نار المحبة فی القلب المقتضیة لاجابة دواعی الحقیقة یعنی ارادہ ، آتش محبت کی ایک چنگاری ہے جو دل میں بھڑکتی ہے اور انسان کو ندائے حقیقت پر لبیک کہنے پر مجبور کرتی ہے ۔

خواجہ عبداللہ انصاری ، "منازل السائرین" میں ارادہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں : وهی الاجابة لدواعی الحقیقة طوعاً یعنی ارادہ ، حقیقت کے تقاضوں کا وہ عملی جواب ہے جو انسان پورے علم و اختیار کے ساتھ دیتا ہے ۔

اس نکتہ کی یاد دہانی ضروری ہے کہ ارادہ کو یہاں پہلی منزل بتایا گیا ہے ۔ مقصود کچھ دوسری منزلوں کے بعد ہاتھ آئے گا جنھیں "بدایات" "ابواب" "معاملات" اور "اخلاق" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ یعنی جسے عرفا کی اصطلاح میں اصول (یا قاعدہ) کہا گیا ہے اور جس سے حقیقی عرفانی حالت وجود میں آتی ہے اس کی پہلی منزل کا نام ارادہ ہے ۔

مولانا روم ، النهایات هی الرجوع الی البدایات کے قانون کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں :-

جنبہ ہا را رو بہ سوی کل است
بلبلان را عشق با روی گل است
آنچہ از دریا بہ دریا می رود
از ہمانجا کامد آنجا می رود

از سر گیسیہای تنند رد
وز تن ما جان عشق آمیز رد

مولانا روم مثنوی کے دیباچہ میں اپنی گفتگو کا آغاز بانسری کے نالہ و فریاد اور اس کے مصائب سخن کی دعوت سے کرتے ہیں جو نیستان سے جدائی اور اس کے فراق کی شکایت کر رہی ہے

مولانا روم اپنی مثنوی کے ابتدائی اشعار میں درحقیقت عرفا کی اصطلاح میں عارف کی پہلی منزل یعنی ارادہ کو بیان کر رہے ہیں جو اپنی اصل کی طرف واپسی کے اس شوق و رجحان سے عبارت ہے جو تنہائی و جدائی کے احساس کے ہمراہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

بشنو از نی چون حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کہ او مہجور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

گزشتہ عبارت میں بوعلی سینا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "ارادہ" وہ شوق و خواہش ہے جو انسان میں غربت، تنہائی اور بے پناہی کا احساس پیدا ہونے کے بعد اس حقیقت کا وصال حاصل کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان کو نہ غربت کا احساس ہوتا ہے اور نہ تنہائی و بے پناہی کا خیال آتا ہے۔

عشق و ریاضت

ثم انه لیحتاج الی الریاضة؛ والریاضة متوجهة الی ثلثة اغراض: الاول تنحیة مادون الحق عن مستن الایثار والثانی تطویع النفس الامارة للنفس المطمئنة...

والثالث تلطیف السر للتنبه.

ارادہ کے بعد عمل، مشق اور ریاضت کی باری آتی ہے۔ ریاضت کا تین ہدف ہوتا ہے: اوّل حق کے سوا ہر چیز کو راستہ سے ہٹانا دوم نفس مطمئنہ کے لئے نفس امارہ کو لگام لگانا۔ سوم علم و آگاہی کے لئے باطن کو لطیف و آمادہ بنانا۔

مرحلہ ارادہ جو پرواز کی ابتدا ہے۔ اس سے گزر جانے کے بعد مشق و تمرین اور آمادگی کا مرحلہ آتا ہے، اس آمادگی کو "ریاضت" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ہماری آج کی اصطلاح میں ریاضت کا معنی نفس کو تکلیف پہچانا سمجھا جاتا ہے، بعض (عرفانی) دبستانوں میں نفس کو تکلیف واذیت پہنچانا بنیادی واصولی اہمیت رکھتا ہے، اسی لئے وہ نفس کو تکلیف و اذیت دینے کے قائل ہیں۔ ہمیں اس کی مثال ہندوستان کے جوگیوں میں نظر آتی ہے۔ لیکن بوعلی کی اصطلاح میں لفظ ریاضت اپنے اصلی مفہوم کی حامل ہے۔

عربی زبان میں ریاضت کے معنے گھوڑے کے بچہ کو سواری کے لئے آمادہ کرنا اور اسے خوش روی کی تعلیم دینا نیز اسے مشق کرانا ہے۔ بعد میں یہ لفظ انسانوں کی جسمانی ورزشوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ آج بھی عربی زبان میں ورزش اور اسپورٹ کو ریاضت ہی کہتے ہیں۔ لیکن عرفا کی اصطلاح میں ریاضت سے مراد نور معرفت کے اشراق کے لئے روح کو آمادہ کرنا ہے۔

بہرصورت یہاں ریاضت سے مراد روح کو آمادہ کرنا اور اسے مشق کرانا ہے اور اس کے تین مقاصد ہیں، ان میں سے ایک مقصد کا تعلق خارجی امور سے ہے یعنی غفلت کے اسباب اور مشاغل کو برطرف کرنا۔ دوسرے کا تعلق داخلی قوتوں کی تنظیم اور روحی بے نظمیوں کو دور کرنے سے ہے، اسی کو نفس مطمئنہ کی خاطر نفس امارہ کو لگام لگانا کہتے ہیں۔ اور تیسرے مقصد کا تعلق روح کے اندر ایک قسم کی کیفی تبدیلی سے ہے جسے "تلطیف سر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

والاول یعین علیه الزهد الحقیقی، والثانی یعین علیه عدة اشیاء: العبادة المشفوعة بالفکرة ثم الالحان المستخدمة لقوی النفس الموقعه لما لحن به من الکلام موقع القبول من الاوهام؛ ثم نفس الکلام الواعظ من قائل زکی بعبارة بلیغة ونغمة

رخيمة وسمت رشيد؛ واما الغرض الثالث فيعين عليه الفكر اللطيف والعشق العفيف الذي يا مرفيه شمائل المعشوق ليس سلطان الشهوة.

ریاضت کے ان تین مقاصد میں سے زہد پہلے مقصد کی مدد کرتا ہے (یعنی زہد، غفلت کے اسباب اور موانع و مشاغل کے برطرف ہونے کا باعث بن جاتا ہے) دوسرے مقصد (یعنی نفس مطمئنہ کی خاطر نفس امارہ کے رام ہونے، درونی تنظیم کے رونما ہونے اور نفسیاتی الجھنوں کے برطرف ہونے) میں چند چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک عبادت ہے۔ بشرطیکہ حضور قلب اور تفکر و تدبر کے ساتھ ہو۔ دوسرے وہ مترنم آواز ہے، جو روحانی معانی سے مناسبت رکھتی ہو تاکہ ذہن میں یکسوئی پیدا کرے۔ اور وہ کلام جو آواز کے ساتھ ادا ہوتا ہے (مثلاً قرآن کی وہ آیت جس کی تلاوت کی جاتی ہے یا وہ دعا و مناجات جو پڑھی جاتی ہے یا وہ غزلی شعر جو زمزمہ کیا جاتا ہے) اسے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتارے۔ تیسرے وہ نصیحت آموز کلام ہے جو فصیح و بلیغ زبان نرم و پُراثر انداز اور ہدایت کے طور پر کسی پاک دل انسان سے سنا جائے۔

تیسرے مقصد (یعنی روح کو نرم، لطیف اور رقیق بنائے نیز اندرونی غلاظتوں اور خشونتوں کو باہر نکال پھینکنے) میں جو چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں ان میں سے ایک لطیف افکار ہیں (دقیق معانی اور لطیف و رقیق افکار کا تصور روح کی لطافت و رقت کا باعث ہوتا ہے) اور دوسرے عفت و پاکدامنی کے ہمراہ عشق ہے بشرطیکہ وہ عشق، روحانی عشق ہو نہ کہ جسمانی و شہوانی عشق۔ اس پر معشوق کے حسن اور اس کی شکل و شمائل کے توازن کی حکومت ہو نہ کہ شہوت کی فرمانروائی۔

(۷)

ثم انه اذا بلغت به الارادة والرياضة حداما؛ عنت له خلسات من اطلاع نور الحق عليه لذيذة كانها بروق تومض اليه ثم تخمد عنه وهو المسمى عندهم اوقاتاً ثم انه ليكثر عليه هذه الغواشي اذا أمعن في الارتياض.

پھر جب ارادہ اور ریاضت ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو کچھ اس طرح کے مناسب مواقع و حالات اس کے سامنے پیش آتے ہیں کہ ایک نور اس کے قلب کو منور کر دیتا ہے

درحالیکہ وہ بے حد تیز ہیں اور سریع الزوال ہوتا ہے، گویا بجلی کوندتی ہے اور پھر تاریکی پھیل جاتی ہے عرفا کی اصطلاح میں ان حالات کو "اوقات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر انسان ریاضت میں آگے بڑھتا جائے تو ان حالات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔"

«انه ليتوغل في ذلک حتى يغشاه في غير الارتياض. فكلما لمح شيئاً عاج منه الى جناب القدس يتذكر من امره امراً فغشيه غاش فيكاد يرى الحق في كل شيء».

"عارف اس میدان میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ کبھی کبھی یہ حالات اس وقت بھی پیش آتے ہیں جب وہ ریاضت کے عالم میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کسی چیز پر ایک اچٹتی سی نظر اس کی روح کو عالم قدس کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور ایک مخصوص حالت اس پر طاری ہو جاتی اور بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ نزدیک ہوتا ہے کہ اسے ہر چیز میں خدا نظر آنے لگے۔

ولعله الى هذا الحد يستعلي عليه غواشيه ويزول هو عن سكينته فيتنبه جليسه.

"عارف جب تک اس مرحلہ اور اس منزل میں ہوتا ہے تو جس وقت یہ حالات اس پر طاری ہوتے ہیں، اس پر غالب ہو جاتے ہیں اور اس کے سکون و اطمینان کو درہم برہم کر دیتے ہیں اور اگر کوئی شخص اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہو تو بخوبی اس کی حالت کی تبدیلی کو محسوس کر سکتا ہے۔"

ثم انه لتبلغ به الرياضة مبلغا ينقلب وقته سكينة فيصير المخطوف مالوفا والوميض شهابا بينا ويحصل له معارفة مستقرة كانها صحبة مستمرة ويستمتع فيها ببهجته: فاذا انقلب عنها انقلب حيران اسفا.

پھر مجاہدت و ریاضت اس مرحلہ پر پہنچ جاتی ہے کہ "وقت" "سکینہ" سے بدل جاتا ہے، یعنی جو چیز کبھی کبھی پیش آتی تھی اور اس کے سکون و اطمینان کو درہم برہم کر دیتی تھی بار بار کی تکرار و اعادہ کے باعث رفتہ رفتہ روح اس سے مانوس ہو جاتی ہے اور اسے سکون و آرام حاصل ہو جاتا ہے۔

اجنبی لگنے والی اور وقتی طور پر پیدا ہونے والی حالت ایک مانوس چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے، چنگاری بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے۔ ایک طرح کی دائمی انسیت برقرار ہو جاتی

ہے اور ایسا لگتا ہے گویا وہ ہمیشہ حق کا ہم نشین ہے ۔ خوشی و مسرت کے ساتھ اس سے بہرہ مند ہوتا ہے اور جب کبھی وہ حالت اس سے دور ہو جاتی ہے غم و اندوہ اسے گھیر لیتے ہیں ۔

ولعله الی هذا الحد یظهر علیه ما به فاذا تغلغل فی هذه المعارفة قل ظهوره علیه فکان وهو غائب ظاهراً وهو ظاعن مقیما.

اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد بھی شاید عارف پر اندرونی حالات (مسرت یا افسوس) ظاہر ہوں اور اگر کوئی اس کے پاس ہو تو علامتوں کے ذریعہ ان حالات کو محسوس کر لے ۔ اگر یہ معرفت بڑھتی جائے تو رفتہ رفتہ اس کے آثار ظاہر میں نمایاں نہ ہوں گے جب عارف کامل تر مرحلہ سر کر لے گا تو سارے مراتب اکٹھا ہو جائیں گے ۔ تو ایسی صورت میں جس وقت وہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب و پنہاں ہے (یعنی اس کی روح دوسرے عالم میں ہے) اسی وقت وہ ظاہر بھی ہے ۔ اور جس وقت وہ کوچ کر کے دوسری جگہ چلا گیا ہے اسی وقت لوگوں کے درمیان بھی موجود ہے ۔

* * *

یہ جملہ ہمیں مولائے متقیان کے اس کلام کی یاد دلاتا ہے جو آپ نے کمیل ابن زیاد کو مخاطب کر کے " اولیائے حق " کے سلسلہ میں فرمایا ہے جو ہر دور میں موجود ہیں حضرت فرماتے ہیں ؛

«هجم بهم العلم علی حقیقة البصیرة وباشروا روح الیقین واستلانوا ما استوعره المترفون وانسوا بما أستوحش منه الجاهلون وصحبوا الناس بابدان ارواحها معلقة بالمحل الاعلی. (نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۱۴۷)

علم نے انہیں ایک دم حقیقت و بصیرت کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے وہ یقین و اعتماد کی روح سے گھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنھیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا اپنے لئے سہل و آسان سمجھ لیا ہے اور جن چیزوں سے جاہل وحشت کرتے ہیں ان سے وہ جی لگائے ہوئے ہیں وہ ایسے جسموں کے ساتھ دنیا میں رہتے ہیں کہ جن کی روحیں ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہیں ۔

ولعله الى هذا الحد انما يتيسر له هذه المعارفة احيانا ثم يتدرج الى ان يكون له متى شاء

شاید عارف جب تک اس منزل میں رہے گا اس کے لئے اس حالت کا وجود میں آنا ایک غیر اختیاری امر ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتا جائے گا یہاں تک کہ یہ حالت اس کے اپنے اختیار اور کنٹرول میں آجائے گی۔

ثم انه ليتقدم هذه الرتبة: فلا يتوقف امره الى مشيئته بل كلما لاحظ شيئاً لاحظ غيره وان لم تكن ملاحظته للاعتبار فيسنح له تعريج من عالم الزور الى عالم الحق مستقر به ويحتف حوله الغافلون.

پھر وہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں دیدار حق اس کی چاہت پر موقوف نہیں ہوتا کیونکہ جس وقت جس چیز پر نظر ڈالتا ہے اسے اس کے پیچھے خدا ہی نظر آتا ہے چاہے وہ عبرت و تنبیہ کے خیال سے اشیاء پر نگاہ نہ بھی کرے۔ پس اس کے لئے ماسوی اللہ سے انصراف و علاحدگی اور ذات حق کی طرف بھرپور توجہ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے کو (خدا سے) قریب دیکھتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ اس کے ارد گرد ہیں اس کی اس حالت سے بالکل غافل ہیں۔

فاذا عبر الرياضة الى النيل صار سره مرآة مجلوة محاذيا بها شطر الحق ودرت عليه اللذات العلى وفرح بنفسه لما بها من اثر الحق وكان له نظر الى الحق ونظر الى نفسه وكان بعد مترددا.

یہاں تک سب کچھ ریاضت، مجاہدت اور سیر و سلوک کے مرحلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اب عارف مقصد تک پہنچ چکا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے ضمیر کو اس صاف و شفاف آئینہ کی مانند پاتا ہے جس میں حق نمایاں ہوا ہے۔ اس حال میں اس پر معنوی لذتوں کی ایسی بارش ہوتی ہے جسے لفظوں کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ خود پر نظر ڈالتا ہے اور اپنے وجود کو حقانی و ربانی پاتا ہے تو خوشی و مسرت میں غرق ہو جاتا ہے۔

اس مرحلہ میں وہ دو نظر کے درمیان مردد ہوتا ہے: ایک نظر حق پر اور ایک نظر خود

پر۔ اس شخص کے مانند جو آئینہ میں دیکھتا ہے، کبھی آئینہ میں ابھرنے والی تصویر پر غور کرتا ہے اور کبھی خود اس آئینہ کو دیکھتا ہے جس میں وہ تصویر ابھری ہے۔

ثمّ انّه لیغیب عن نفسه فلیحظ جناب القدس فقط، وان لحظ نفسه فمن حیث هی لاحظه لامن حیث هی بزینتها. وهناک یحق الوصول.

بعد کے مرحلہ میں عارف خود بھی اپنی نگاہوں سے پنہاں ہو جاتا ہے وہ صرف اور صرف خدا کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے کو دیکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ملاحظہ میں دیکھنے والا بھی کسی نہ کسی طرح دکھائی پڑتا ہے۔ بالکل آئینہ کے مانند، جبکہ پوری توجہ تصویر کی طرف ہے آئینہ پر کوئی دھیان نہیں ہے پھر بھی تصویر کو دیکھنے کا لازمہ آئینہ پر نگاہ پڑنا بھی ہے۔ اگرچہ اس کی طرف توجہ اور اس کے کمالات کا دیکھنا بھی لازم نہیں ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں عارف حق سے مل جاتا ہے اور خلق سے حق کی طرف عارف کا سفر اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ تھا اشارات کی نویں نمط (فصل) کے ایک حصہ کا خلاصہ۔ جس نکتہ کی وضاحت یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عرفا چار سیر کے قائل ہیں۔ سیر من الخلق الی الحق، سیر بالحق فی الحق، سیر من الحق الی الخلق بالحق، سیر فی الخلق بالحق

پہلا سفر، مخلوق سے خالق کی طرف ہے۔ دوسرا سفر خود خالق میں ہے، یعنی اس مرحلہ میں وہ اسماء وصفات الٰہی سے آشنا ہوتا ہے اور ان اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ تیسرے سفر میں حق سے جدا ہوئے بغیر دوبارہ خلق کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یعنی خدا کے ساتھ ہوتے ہوئے خلق کی ہدایت و رہنمائی کی خاطر ان کے پاس واپس آجاتا ہے۔ چوتھا سفر حق کے ساتھ خلق کے درمیان سفر ہے۔

اس سفر میں عارف لوگوں کے درمیان اور ان کے ہمراہ ہوتا ہے، انھیں حق کی طرف لے جانے کے لئے ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

بوعلی سینا کی کتاب اشارات سے جو کچھ نقل کیا ہے اس کا تعلق صرف پہلے سفر سے ہے۔ بوعلی نے دوسرے سفر کے متعلق بھی تھوڑی سی گفتگو کی ہے لیکن ہم اسے یہاں نقل کرنے کی

ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

جیسا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے شرح اشارات میں کہا ہے کہ بو علی سینا نے اس پہلے عرفانی سفر کو نو مرحلوں میں بیان کیا ہے تین مرحلے، آغاز سفر سے تعلق رکھتے ہیں۔ تین مرحلے آغاز سے انجام تک مجموعے سے مربوط ہیں اور تین مرحلے مقصد تک پہنچ جانے سے متعلق ہیں۔ بو علی کے بیانات میں غور و فکر کے بعد یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔

ریاضت جس کا ترجمہ ورزش ہے اس سے بو علی سینا کی مراد وہی مشق و مجاہدت ہے جو عارف انجام دیتا ہے۔ یہ مجاہدتیں بہت زیادہ ہیں اور اس مدت میں عارف کے لئے کچھ منزلیں طے کرنا ضروری ہیں۔ بو علی اس مسئلہ کو سرسری طور پر بیان کر کے گزر گئے ہیں لیکن عرفا اس سلسلہ میں بڑی تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ ان کی عرفانی کتابوں میں ان تفصیلات کو دیکھا جا سکتا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

میں کشتۂ گریہ ہوں

امام حسین علیہ السلام :

"وقال (ع) انا قتیل العبرة، لا
یذکرنی مومن الا بکی "

"میں آنسوؤں کا مقتول ہوں (یعنی مجھے
رلا رلا کر قتل کیا گیا) مومن میرا ذکر نہیں کرے گا
مگر یہ کہ وہ روئے ۔"

بلاغۃ الحسین ص ۳۲۵
نقل از کامل الزیارہ ص ۱۰۸
حدیث ۶

سید الشہداءؑ کا کامیاب جہاد

شہید ڈاکٹر بہشتی
ترجمہ : ابو فائز

جس دن سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے، کلک تقدیر نے اس کی زندگی جہاد و مبارزہ کے ہمراہ کر دی ہے۔ انسان کی فطرت میں متضاد عوامل ودیعت کئے گئے ہیں اور اسے مختلف میلانات عطا ہوئے ہیں۔ اس کی خواہشوں اور رجحانات میں تلوّن و تنوع پایا جاتا ہے، اس کی کچھ خواہشیں ہوئی و ہوس پر مبنی ہیں جنہیں حیوانی خواہشات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد کھانے پینے اور دیکھنے والی چیزوں نیز حیوانی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہے۔ ان خواہشات و میلانات کے مقابلہ میں کچھ دوسری طاقتور خواہشیں اور میلانات بھی اسے ودیعت ہوئے ہیں جو اسے حیوانی میدان سے دور کر کے ایک اعلیٰ و برتر علاقہ میں داخل کرتی ہیں اسے معنوی، عقلانی، نورانی اور انسانی زندگی کی طرف دعوت دیتی ہیں۔

انسان کی توانائیاں، قوتیں اور ارادے ان دو متضاد خواہشات و میلانات کے درمیان کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔ ایک انسان کو نظر میں رکھئے، وہ کوئی معمولی کام انجام دینا چاہتا ہے۔ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جنہیں بجالانے کا وہ عادی ہوتا ہے۔ چونکہ اس کام کو بجا لانے کی اسے عادت ہوتی ہے لہذا وہ پس و پیش کے بغیر اپنی عادت کے مطابق اسے انجام دیتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا کام ہو جو اس کی عادت میں شامل نہ ہو۔ کوئی نیا کام ہو تو کیا وہ کسی جھجک

سکے بغیر فوراً ہی اسے انجام دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے اندر مختلف قسم کے رجحانات سر اٹھاتے ہیں۔ یہ کام بعض خواہشوں کے مطابق ہے اور بعض کے خلاف۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کیا کروں؟ انجام دوں یا نہیں؟ کام اچھا ہے یا برا؟ نفس کہتا ہے کر ڈالو، عقل کہتی ہے ہرگز نہیں، یا عقل کہتی ہے بجا لاؤ لیکن نفس مانع ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کے باطن میں ان میلانات کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی ایک دوسرے پر غالب ہو جائے۔ جو عامل کامیاب ہوگا ارادہ اسی کے ساتھ ہو جائے گا۔ اور تمام طاقتیں اسی سمت میں صرف ہوں گی۔

انسان کے اندر ہوی و ہوس اور معنوی زندگی، مادہ پرستی اور روحانیت کے درمیان جنگ، ابتدائے تخلیق ہی سے جاری ہے اور اس کی زندگی کی بنیاد جہاد و مبارزہ ہی پر رکھی گئی ہے۔ یہ اندرونی جنگ جس سے ہم ہمیشہ دوچار رہتے ہیں اسے ایک طرف رکھئے۔ آیئے اب باہر کے ماحول پر نظر ڈالیں۔ ایک انسان کے مقاصد اور خواہشات کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں پائی جاتی ہیں، چونکہ ہم رکاوٹوں کے عادی ہو چکے ہیں لہٰذا عام طور سے ہمیں ان رکاوٹوں کا اچھی طرح احساس نہیں ہوتا ورنہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو ہماری روزمرہ کی زندگی میں روزانہ کئی بار یہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں جن سے ہمیں جنگ کرنا پڑتا ہے۔ باہر کی دنیا میں انسان کی زندگی جنگ و جدال اور جہاد و مبارزہ سے لبریز ہے۔ یہ تو ایک فرد کی بات تھی۔ آیئے قوموں، ملتوں اور معاشروں کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ ہر جگہ جنگ اور ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ یہ صنف اس صنف سے، یہ قوم اس قوم سے، یہ ملت اس ملت سے۔ یہ معاشرہ اس معاشرہ سے یہ طبقہ اس طبقہ سے برسرِ پیکار ہے۔

صنفی، قومی، طبقاتی اور بین الاقوامی جنگیں، حیاتِ انسانی کی تاریخ لکھتی ہیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں جہاد و مبارزہ سے فرار ممکن نہیں ہے۔

کہاں ہیں وہ افراد جو یہ کہتے ہیں کہ روئے زمین پر قدم رکھ کر پچاس، ستر یا سو سال یا اس سے بھی زیادہ ایک بہترین زندگی گزار سکتے ہیں۔ کھاتے سوتے آرام و آسائش سے لطف اٹھا سکتے ہیں ہر قسم کی جنگ و مبارزہ سے دور، صلح و سلامتی کے ماحول میں زندگی گزار سکتے ہیں؟ کیسا سہانا سپنا ہے!! اس خواب سے انھیں بیدار کیجئے۔ وہی شخص جو آپ کے خیال میں ۹، ۱۰ بجے صبح تک اپنے گھر میں آرام کرتا رہتا ہے اس کے بعد اگر دل میں آیا تو کام پر گیا اور

ہی نہ چاہا تو یوں ہی پڑا رہا ۔ اگر کام پر گیا بھی تو دوپہر میں بروقت گھر واپس آجاتا ہے۔ قیلولہ اپنے وقت پر کرتا ہے، رات کو بروقت سو جاتا ہے ۔ خود اس شخص کے اندر بھی ایک اندرونی جنگ برپا ہے۔ جسے ہم نہیں دیکھ پاتے ۔ اس کے چہرے کا اچھی طرح جائزہ لیجئے اس کے چہرہ پر ایک مجاہد و مبارز شخص کی بشاشت ہرگز نظر نہ آئے گی ۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش ہے ۔ کھاتی پیتی میت ہے مرجھایا ہوا سراپا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایک دائمی جنگ جاری ہے جس سے وہ مانوس اور عادی ہوگیا ہے بلکہ وہ خود بھی اس جنگ سے بے خبر ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ جنگ وجدال سے محفوظ ہے، لیکن وہ ہمیشہ خود اپنے آپ سے جنگ وجدال میں مشغول ہے کہ میں کیوں خاموش اور ساکت بیٹھا ہوا ہوں، دوسروں سے کیوں پیچھے رہ گیا ہوں، کیا وجہ ہے کہ میرا نام و نشان کہیں نظر نہیں آتا، اس بے ثمر زندگی کا کیا فائدہ، مجھ میں کام و کوشش کی حرارت کیوں نہیں پائی جاتی ؟ راحت و آرام کے یہ لمحات ان ہی سوالوں کی بھول بھلیاں میں کٹتے ہیں ۔ جہاد و مبارزہ کے بغیر زندگی ممکن ہی نہیں ۔ فرد اور معاشرہ کی زندگی میں، جہاد و مبارزہ کے اس تاگزیر، اس ضرورت اور خارجی جبر سے گریز ناممکن ہے ۔ وہ جبر جسے قلم تقدیر نے انسان کی پیشانی پر لکھا ہے، اس کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان ان مختلف قسم کی جنگوں میں سے اس جہاد کو انتخاب کر لے جو اس کے لئے زیادہ سودمند اور بہتر ہو ۔ جہاد و مبارزہ کو گلے سے لگائے ۔ لیکن شریف جنگ، کامیاب جہاد، مفید اور ہیجان انگیز مبارزہ ۔ زندہ نبرد اور اعلیٰ مقصد کی راہ میں استوار پیکار ۔

کامیاب جہاد کی کچھ شرطیں ہیں ان شرطوں اور اصولوں کو سمجھ کر زندگی کی پیکار میں ان پر کاربند ہونا ضروری ہے ۔

اول یہ کہ جہاد و مبارزہ کا ایک مقصد ہونا چاہیئے ، اور وہ بھی واضح ، مشخص ، صریح اور قطعی مقصد ۔ بے مقصد جہاد کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ ہر مبارزہ کا ایک مقصد ہوتا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی مقصد واضح نہیں ہوتا ۔ مبہم ہوتا ہے ۔ ممکن ہے آپ کو ایسے افراد بھی نظر آئیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی جہاد و مبارزہ میں کاٹ دی لیکن عمر کے خاتمہ پر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، کیوں ؟ اس لئے کہ وہ اپنے جہاد کے دوران کبھی سیدھی راہ پر چلے انھوں نے سعی و کوشش، محنت و مشقت ضرور کی لیکن ان کا کوئی واضح ، صریح اور مشخص مقصد نہ تھا ۔ ان کا رخ ، مبہم اور تاریک نقطہ کی

طرف تھا۔ اسی لئے ان کی تمام توانائیاں برباد ہوئیں اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں۔ قوموں کے مہمات کی تاریخ میں اس قسم کے مبارزے بہت نظر آتے ہیں۔ شاید خود آپ لوگوں نے اپنی اور اپنی قوم کی زندگی کی تاریخ میں بھی اس قسم کے نمونے دیکھے ہوں گے یا کتابوں میں پڑھے ہوں۔ مبارزہ کا مقصد واضح مشخص، ممتاز اور قابل شناخت ہونا چاہئے۔ جہاد کا مقصد بلند، اعلیٰ اور گراں قدر ہونا چاہئے۔ بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ مبارزہ کا مقصد واضح اور معین ہے۔ لیکن اس مقصد کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ اس کی خاطر وقت صرف کیا جا سکتا ہے اور بس۔ اگر پیسہ بھی خرچ کرنا پڑ جائے تو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بعض اوقات مقصد ذرا اس سے بھی قیمتی ہوتا ہے۔ انسان مال بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن اگر صحت و تندرستی قربان کرنے کی بات آ جائے تو جہاد سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات صحت و تندرستی بھی فدا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے لیکن جب زندگی نثار کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو منہ پھیر لیتا ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات جہاد کا مقصد اتنا بلند اور گراں قدر ہوتا ہے کہ انسان اس کی راہ میں اپنی اور اپنے عزیز ترین افراد کی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہی وہ قیمتی مقصد ہے جس کی طرف تمام انسانوں کو توجہ کرنی چاہئے۔ یہ اعلیٰ مقصد، خدا کی رضا ہے۔ یہ شرط اول ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مجاہد کو مرد عمل ہونا چاہئے۔ ثابت قدم و با استقلال ہونا چاہئے،

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون، نحن اولیائکم فی الحیوۃ الدنیا و فی الآخرۃ ولکم فیہا ما تشتہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون

جو لوگ کہتے ہیں ہمارا مالک و پروردگار۔ صرف اللہ ہے اور اپنی بات پر ڈٹے رہتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ڈرو نہیں غمزدہ مت ہو ہم تمہیں اس بہشت کی بشارت دیتے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم دنیا و آخرت میں تمہارے مونس و مددگار ہیں۔ اس بہشت میں تمہاری خواہش کی تمام چیزیں موجود ہیں، سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون۔ کبر مقتا عند اللہ

ان تقولوا مالا تفعلون ، ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص"

"اے ایمان لانے والو (اے پیغمبر کے پیچھے چلنے والو ، پیغمبر تیرہ سال تک مکہ میں نعرہ توحید بلند کرتے رہے لیکن چند افراد کے سوا کسی نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا، لیکن جب مدینہ آکر آپ نے اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی اسی وقت تمہارے دل اس مقصد کے پیچھے لگ گئے آگاہ رہو) ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن پر عمل نہیں کرتے۔؟"

مفسرین کہتے ہیں :کہ جب جنگ بدر کے بعد کچھ مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ شہدائے بدر خدا، پیغمبر اور مسلمانوں کی نظر میں حد درجہ احترام رکھتے ہیں اور ان کی بڑی قدر و منزلت ہے، دنیا و آخرت کی کتنی نعمتیں انھیں نصیب ہوئی ہیں۔ دنیا میں یہ عزت اور آخرت میں اتنا عظیم ثواب ملا ہے تو کہنے لگے' یا لیتنا کنا معکم فنفوز فوزاً عظیماً" "اے کاش ہم بھی جنگ بدر میں شریک ہو جہاد کرتے اور یہ عزت ہمیں بھی نصیب ہوتی۔ وہی جملہ جسے آج ہم شیعہ شہدائے کربلا کو خطاب کر کے دہراتے ہیں! یا لیتنا کنا معکم فنفوز فوزاً عظیماً"

اتفاقاً کچھ دنوں کے بعد جنگ احد چھڑ گئی جن لوگوں کی زبان پر ہر وقت یہ جملہ رہا کرتا تھا انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور نوبت یہ آگئی کہ شہادت کے یہ خواہشمند، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت خدا نے ان سے کہا، تمہاری آرزوئیں کیا ہوئیں؟ کہ پھر جنگ بدر پیش آئے اور ہمیں بھی شہادت کی سعادت نصیب ہو؟ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے؟ خدا ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے جو صرف زبانی جمع خرچی کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح کی قربانی و جاں نثاری کے لئے تیار ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ اس طرح کے افراد قوموں کا راستہ بدل دیتے ہیں۔ قائدوں کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ حقیقی مجاہدوں کو دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ مؤثر اور مفید جہاد کو ناکام و بے نتیجہ بنا دیتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو میدان جنگ میں، دشمن کے مقابل سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جو جہاد کو کلیتاً

بنا سکتے ہیں۔

تیسری شرط جو نہایت اہم ہے اور ہمارے یہاں بہت کم نظر آتی ہے وہ جہاد کا صحیح طریقہ اور راہ عمل ہے۔ جہاد کی ایک دو قسمیں نہیں ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں، فردی جہاد، اجتماعی جہاد، خفیہ جہاد، علنی جہاد، پرسکون جہاد، سخت اور خشن جہاد، بغیر اسلحہ کے جہاد، اسلحہ کے ہمراہ جہاد، ٹھنڈے اسلحے سے جہاد، گرم اسلحے سے جہاد، میدان سے دور عارضی جہاد، میدان کے اندر جہاد، ان میں سے ہر ایک کا اپنا خاص وقت مخصوص انداز اور یورپیوں کی اصطلاح میں ٹیکنک ہوتی ہے۔ عوام کو جہاد کے طریقہ کار سے واقف ہونا چاہئے خاص طور سے انہیں جہاد اور مقصد کے درمیان پائے جانے والے رابطہ پر غیر معمولی حد تک دھیان دینا چاہئے۔ ہمارے لئے نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد خلوص دل اور صمیم قلب سے کسی مقصد کی راہ میں اپنا وقت، مال، جان، عزت وآبرو قربان کرتے ہیں لیکن غلط راستہ پر چل نکلتے ہیں۔ اپنے خیال میں وہ مقصد کی راہ میں اپنا وقت مال اور جان نچھاور کر رہے ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا راستہ غلط راستہ ہوتا ہے۔ ان کے راستہ اور ان کے مقصد کے درمیان کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی

این رہ کہ تو می روی بترکستان است [1]

مقصد اور حکمت عملی کے درمیان ارتباط و مناسبت بہت [redacted] ہے، بہت سی تحریکیں صرف اس لئے ناکام ہوئی ہیں کہ ان کی روش صحیح نہیں تھی۔ یا [redacted] روش مقصد سے مناسبت ہی نہیں رکھتی تھی۔ ان کا جہاد انہیں مقصد سے نز[redacted]کے بجائے مقصد سے دور کر دیتا ہے۔

ان تین شرطوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سانحہ کربلا میں کیا ہوا ہے؟ معاویہ مر چکا ہے۔ اعلانیہ فسق و فجور کا رسیا یزید پلید [redacted] پناہ بادشاہ اور پیغمبر خدا

[1] اعرابی! مجھے خوف ہے کہ تو کعبہ تک نہ پہونچ سکے گا، کیونکہ جس راستہ پر [redacted] رہا ہے وہ ترکستان کی طرف جاتا ہے

کے جانشین کے عنوان سے مسلمان عوام پر حکومت کررہا ہے لیکن علانیہ شراب پیتا ہے کھلم کھلا جوا کھیلتا ہے، اسلام کے غیر طبقاتی معاشرہ میں اسلامی دستور کے خلاف نسلی، خاندانی اور طبقاتی امتیازات کو رواج دیتا ہے یہ ہے اس کی حکومت کا نچوڑ۔

اس طرح کا شرابی، بے عقل اور نالائق شخص مسلمانوں کے تخت سلطنت پر براجمان ہے کچھ جاں نثار مسلم اس فاسد حکومت کو تسلیم نہیں کرتے، وہ کوشش کرتے ہیں کہ کم از کم اس حکومت کے ساتھ تعاون سے گریز کریں لیکن یزید انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اپنے تمام گورنروں کو حکم دیتا ہے کہ تمام عوام خاص طور سے ان لوگوں سے جو معاشرہ میں مشہور ہیں اور عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں یزید کی بیعت یعنی اس سے تعاون کا عہد لیں۔ زادگاہ اسلام یعنی مدینہ میں کچھ مشہور و معروف شخصیتوں نے بیعت سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک حسین بن علی علیہما السلام ہیں۔

اسی دوران کوفہ میں کچھ افراد اکٹھا ہوتے ہیں۔ کوفہ کیا ہے؟ کوفہ ایک اچھا اور برا شہر ہے۔ برا اس لئے ہے کہ اس میں بہت سے مذبذب، دودل اور مردّد افراد کا ایک جم غفیر رہتا ہے۔ اچھا اس لئے کہ اس میں دبستان علیؑ کے تربیت یافتہ درخشاں ستارے رہتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے ان درخشاں ستاروں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کیا یزید کی بیعت کرنی چاہئے؟ اس کے بعد انھوں نے یہ سوال سب کے سامنے پیش کیا۔ جواب منفی تھا۔ نہیں ہرگز نہیں، یزید میں اس منصب کی قطعی صلاحیت نہیں۔ پھر کسے تلاش کریں؟ ادھر ادھر سے خبریں حاصل کیں، معلوم ہوا کہ سرزمین حجاز کی دو تین بلکہ کچھ زیادہ ہی شخصیتوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا ہے اور ان سب میں نمایاں ابو عبداللہ الحسینؑ بن علیؑ ہیں۔ امام کے نام دعوت نامہ بھیجنا شروع کر دیا کہ آقا! آپ یہاں اپنے والد بزرگوار کے شہر میں تشریف لائیے۔ یہاں آپ کے والد کا دارالخلافہ ہے۔ آئیے ہم آپ کی رکاب میں اس حکومت سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ جہاد کے لئے زمین ہموار ہے، امام کے پاس ایک خط آیا دو خط، تین خط، چار خط، دس خط، بیس خط، سو خط۔ کسی پر ایک شخص کی دستخط، کسی پر دو کی، پانچ کی، دس کی۔ مختلف شہروں کے لوگوں کے خطوط کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

یہ واقعہ تفصیل سے آپ حضرات سن چکے ہیں۔ حضرت مسلم امام حسینؑ کی طرف سے کوفہ آئے تاکہ وہاں کا جائزہ لیں، امام کی طرف سے لوگوں سے بیعت لیں اور امام حسینؑ کو نتیجہ سے آگاہ کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے۔ امام حسینؑ کا جہاد یوں شروع ہوتا ہے۔

لیکن امام حسینؑ کا مقصد کیا ہے؟ کیا حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا بادشاہ سلاطین خاص طور سے عراق و کوفہ پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ نہیں، آپ کا مقصد حکومت نہیں ہے۔ مقصد حق کا بول بالا ہے۔ حق و باطل کو پہچنوانا ہے۔ ایک واضح ترافق پر عوام کو حق و باطل سے آشنا کرانا ہے حکومت ملے یا نہ ملے۔ اگر حکومت ہاتھ آگئی تو کیا کہنا، حکومت کی طاقت اللہ کی پسندیدہ راہ میں صرف کریں گے۔ اگر حکومت نہ مل سکی پھر مقصد پیدا ہو جائے گا۔ کربلا میں ایسے ایسے مناظر پیش آئیں گے جنھیں تاریخ ہمیشہ کے لئے اپنے سینہ میں محفوظ کرے گی اور مسلمانوں کا جہاد قیامت تک کے لئے حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا بہترین نمونہ بن جائے گا۔ کیا کہنا، مقصد کتنا اعلیٰ و ارفع ہے اور وہ بھی واضح، معین اور قاطع۔ امامؑ اس جہاد کے لئے کن افراد کو چنیں؟ ثابت قدم افراد۔ جو لوگ کسی اجتماعی جہاد کی قیادت کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہئے کہ امام حسینؑ سے سبق لیں امام حسینؑ جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس جہاد میں دو قسم کے افراد کو حصہ لینا چاہئے۔ ایک تو وہ افراد جو اس جہاد کے بنیادی رکن ہیں یعنی وہ افراد جن سے جہاد کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے جہاد کی باگ ڈور جن کے ہاتھوں میں ہے۔ انھیں تجربہ کار، قابل اعتماد، مقصد کا پابند، ثابت قدم، قوی ارادہ کا مالک، اپنے فرائض سے باخبر اور قائد کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے اس کا ایک نمونہ مسلم بن عقیل اور دوسرا نمونہ قیس بن مسہر قاصد حسینؑ ہیں۔ امامؑ نے ان افراد کو پوری توجہ کے ساتھ انتخاب فرمایا۔

دوسرے وہ افراد ہیں جو تحریک کے حامی ہوتے ہیں جن سے بوقت ضرورت مدد لینی چاہئے۔ ان افراد کے انتخاب میں اتنی چھان بین نہیں کی جا سکتی۔ یہ لوگ بہرحال پیچھے پیچھے آنے والے ہیں۔ اس قسم کے کچھ افراد بھی امام حسینؑ کے کاروان کے ساتھ ہو لئے۔

مسلم کوفہ میں داخل ہوئے۔ کچھ حادثات رونما ہوئے۔ بہت سے افراد مسلم کے اردگرد اکٹھا ہو گئے۔ کوفہ میں یزید کا والی، نعمان بن بشیر معزول ہو گیا اور اس کی جگہ ابن زیاد کوفہ کا

والی بن گیا۔ وہ خونخوار، سفاک، بے ایمان، منحرف اور یزید کا فرماں بردار ہے۔ ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلم کو خبر ملتی ہے کہ آپ کے میزبان ھانی بن عروہ کو دھوکا دے کر ابن زیاد کے دارالامارہ لے جایا گیا ہے۔ وہاں ابن زیاد نے ان کی توہین کی ہے۔ ان کے سر اور چہرہ پر چھڑی سے ضربیں لگائی ہے۔ انھیں قید کر دیا ہے۔ مسلم نے اپنے ساتھیوں سے کہا عوام کو خبر دو مسجد کوفہ میں اکٹھا ہوں۔ مسجد اور اطراف کے بازار عوام سے چھلک رہے ہیں۔ سب کو مسلم کی تقریر کا انتظار ہے۔ دارالامارہ سے مسجد کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ ابن زیاد کی چند دنوں کی تگ و دو کے باوجود اس کے اردگرد تیس پولس اور ۲۰ اموی حامیوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ابن زیاد اور اس کے پچاس ساتھی، دارالامارہ سے مسجد کا منظر دیکھنے کے لئے اوپر آتے ہیں۔ عوام ابن زیاد اور اس کے حواریوں کو دیکھتے ہی ان کے خلاف نعرے لگانا ان پر پتھروں کی بارش کرنا اور یزید کی حکومت کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہے آٹھ ذی الحجہ کو کوفہ مسلم اور ابن زیاد کی حالت۔

ابن زیاد بغور حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ مکر و فریب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اپنے افراد کو بھیجتا ہے اور وہ مختلف بہانوں سے ایک ایک دو دو کرکے لوگوں کو مسجد سے باہر لے جاتے ہیں۔ ماں اپنے بچہ کو لے جاتی ہے۔ باپ اپنے بیٹے کو لے جاتا ہے، سسر داماد کو لے جاتا ہے۔ چچا، بھتیجے کو لے جاتا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی عنوان سے، کسی کو لالچ اور کسی کو دھمکی دے کر لے گئے۔ نماز مغرب کے وقت جب مسلم نے نماز پڑھنی چاہی تو صرف تیس افراد نے ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد جب مسلم نے مسجد سے باہر نکلنا چاہا تو دیکھا کہ ایک شخص بھی باقی نہیں رہا ہے۔ گھر کا پتہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں کوفہ کی گلیوں سے بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ غریب الوطنی اور یکہ و تنہا، کوئی نہیں جو راستہ بتائے۔ یہ وہی کوفہ کے مذبذب و بے قیمت افراد تھے۔ یہ لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ ان پر بھروسہ کرکے جہاد کیا جائے۔ یہ لوگ بے ثباتی کا نمونہ ہیں۔

امام حسینؑ مسلم کے خط کی روشنی میں مکہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ راستہ میں بہت سے لوگ کاروان کے ساتھ ہوگئے۔ چلتے چلتے عراق کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں آپؑ کو خبر ملی کہ کوفہ کے حالات

وہ نہیں جس کی اطلاع مسلم نے دی تھی، حالات بدل چکے ہیں مسلم شہید ہو چکے ہیں۔ ہانی بن عروہ درجہ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں۔ آپ کے نامہ رساں عبداللہ بن یقطر جام شہادت نوش کر چکے ہیں لیکن ان دہشتناک خبروں کے باوجود حسینی جہاد نہیں رکا۔ صرف روش اور حکمت عملی میں تبدیلی آئی۔ کیونکہ حالات بدل چکے تھے۔ حضرتؑ نے اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ مجمع میں آکر آپ نے ایک نوشتہ پڑھ کر سنایا اور پھر خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا؛ آگاہ ہو جاؤ کہ کوفہ سے وحشتناک خبریں آ رہی ہیں۔ مسلم، ہانی اور عبداللہ بن یقطر کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لوگوں نے ہم سے خیانت کی ہے۔ ہم اس جادہ پر چلتے رہیں گے یہاں تک کہ قتل کر دیئے جائیں۔ تم میں سے جو شخص۔ مال و منال کی امید، آرام دہ زندگی کی خواہش، مقام و منصب کی لالچ میں ہمارے ساتھ آیا ہے وہ واپس چلا جائے۔ کچھ لوگ چلے گئے اکثر وہ افراد جو راستہ میں کارواں کے ساتھ ہو گئے تھے چلے گئے۔

اب حسینؑ بن علیؑ رہ گئے، مدینہ سے آنے والے خدام اور راستہ میں ساتھ ہونے والے کچھ دوست۔ چونکہ جہاد کا منظر بدل گیا ہے لہٰذا مذبذب اور ڈھل مل یقین افراد حسینی خیمہ میں باقی نہ رہے۔ چونکہ جہاد کی روش بدل چکی ہے لہٰذا صرف پاک سیرت تجربہ کار افراد ہی کو آپ کے ساتھ رہنا چاہئے۔ صرف وہی پاک و منزہ افراد اس راہ میں قدم رکھیں جو جہاد کربلا کے مقصد پر بھرپور ایمان رکھتے ہوں۔ اور ایثار و جاں نثاری کے لئے آمادہ ہوں۔

ایک چیز جو جہاد میں بہت اہمیت رکھتی ہے وہ صحیح اور قابل اعتماد مواصلاتی ذریعہ ہے۔ اسے مومن، تجربہ کار اور بامقصد افراد سے تشکیل پانا چاہئے۔ قیس بن مسہر اس قیمتی مواصلاتی ٹیم کا ایک نمونہ ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ کا پیغام کوفہ کے عوام تک پہنچانا ان کا فریضہ ہے۔ خطرے مول لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ قادسیہ کے قریب، ابن زیاد کا کارندہ حصین بن نمیر انھیں قید کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ابن زیاد ان سے کہتا ہے اگر جان بچانا چاہتے ہو تو منبر پر جا کر حسینؑ بن علیؑ کو گالی دو۔ قیس منبر پر جا کر عوام سے خطاب کرتے ہیں: خدایا تیرا شکر، ایہا الناس! یہ حسینؑ بن علیؑ، مخلوقات خدا میں سب سے افضل ہیں وہ رسول خداؐ کی بیٹی فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ انھوں نے مجھے بھیجا ہے کہ یہ پیغام

تم لوگوں تک پہنچا دوں، راہ راست پر اٹھ کھڑے ہو۔ ان کی مدد کرو۔ اس کے بعد قیس نے علیؑ اور حسینؑ بن علیؑ کی ارواح طیبہ پر درود بھیجا اور معاویہ، یزید، ابن زیاد پر لعنت بھیجی اس طرح اپنا فرض منصبی پورا کیا۔ عبید اللہ نے قیس کو منبر سے نیچے لانے کا حکم دیا۔ انھیں منبر سے کھینچ کر دار الامارہ کی چھت سے نیچے پھینک دیا گیا۔ وہ شہید ہو گئے۔

حسینؑ بن علیؑ اس قسم کے افراد کے ہمراہ کوفہ کی طرف چلے تھے۔ راستہ میں حر سے ملاقات ہو گئی۔ راستہ بدلا گیا، ایک ایسی سمت روانہ ہوئے جو نہ مدینہ کی طرف جاتی ہو اور نہ کوفہ کی طرف۔ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک سفر میں جو واقعات پیش آئے انھیں آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ مقصد واضح اور مشخص ہے۔ خدا، مرضیٔ خدا، دین اور حق و حقیقت کا دفاع۔ روش و اسلوب بھی واضح ہے۔ حسینؑ بن علیؑ جانتے ہیں کہ انھیں اس راستہ پر چلنا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے اگر آپ راستہ میں، حتیٰ عاشور کے دن عوام اور ابن زیاد کے کارندوں کے سامنے یہ تجویز رکھتے ہیں کہ اگر کوفہ کے عوام اپنے شہر میں میرا آنا پسند نہیں کرتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں تو اس کی کچھ دوسری وجوہات تھیں، ورنہ اثناء سفر میں امام بار بار یہ فرما چکے تھے کہ ہم جس راستہ پر چل رہے ہیں اس سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ امام منزل قصر بنی مقاتل سے نکل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ابھی ابن زیاد کے نام حر کے خط کا جواب نہیں پہنچا ہے اور حالات واضح نہیں ہوئے ہیں۔ عقبہ بن سمعان کہتے ہیں: میں امام کے قریب تھا۔ کیا دیکھا کہ امام کو گھوڑے ہی پر نیند آ گئی اچانک آپ کی آنکھ کھلی اور فرمایا: انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون و الحمد للّٰہ ربّ العالمین آپ نے یہ جملہ تین بار دہرایا۔ آپ کے لخت جگر علی اکبرؑ نے جب یہ جملہ سنا، خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، بابا! یہ کیا، آپ کلمہ استرجاع پڑھ رہے ہیں؟ فرمایا: بیٹا ابھی آنکھ لگ گئی تھی۔ خواب میں ایک سوار کو یہ کہتے دیکھا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ لیسے ہیں علی اکبرؑ کو کیا کہنا چاہئے؟ عرض کی، بابا! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا، کیوں نہیں عرض کیا، پھر ہمیں موت کا کیا خوف! ہم زندگی کے آخری لمحہ تک حق سے منہ نہ موڑیں گے یہی نہیں بلکہ ہم موت کا استقبال کرتے ہیں۔ اسی قسم کے افراد حسینؑ کے ساتھ آئیں۔

حضرتؑ نے خاک کربلا پر قدم رکھنے سے پہلے بارہا یہ فرمایا تھا کہ ہم موت کو گلے لگانے جارہے ہیں۔ ضروری تھا کہ لوگوں کو سمجھا دیں کہ ہم کوفہ کی حکومت کے لئے نہیں آئے ہیں، کل لوگ یہ نہ کہیں کہ، کوفیوں نے آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ جب آپ نے یہ دیکھا کہ حکومت ہاتھ نہیں آسکتی تو آپ کی غیرت پر چوٹ لگی لہٰذا آپؑ نے موت کو زندگی پر ترجیح دی کیونکہ آپ حکومت سے محرومیت کی تلخی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی شبہ کو دور کرنے کی خاطر حضرتؑ بار بار یہ کہا کہ اگر تم نہیں چاہتے ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ میری غیرت کو ٹھیس پہنچی ہے اور چونکہ حکومت سے محروم رہ گیا ہوں لہٰذا اب مجھ میں زندہ رہنے کی تاب نہیں رہ گئی ہے اور خودکشی کے لئے یہاں آیا ہوں۔ آپ نے یہ بات بار بار کہی تاکہ کوئی شخص آپ کے بارے میں **ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ** کی آیت نہ پڑھے۔ تاریخ آپ کے اس مکرر جملہ کو اپنے دامن میں محفوظ کرلے تاکہ واقعۂ کربلا کی صحیح تفسیر ہوسکے۔ اس مدت میں عاشور تک پیش آنے والے تمام واقعات حتیٰ جزئی و معمولی ترین واقعات میں بھی یہ نکتہ بخوبی نمایاں ہے کہ امام چاہتے ہیں کہ سپاہ دشمن کے مؤرخوں کی تمام تحریفوں اور دست کاریوں کے باوجود واقعہ کربلا میں سے جو کچھ بچ رہے وہ آنے والی نسلوں کے لئے سبق آموز ہو۔ عاشور کے دن جب حضرت صف آرائی کر لیتے ہیں اور جنگ یقینی ہوجاتی ہے تو آپؑ خیموں کو یکجا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ خیموں کے پیچھے خندق میں لکڑی بھر دی جاتی ہے اسکے بعد حضرت اس میں آگ روشن کرنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کرسکے۔ اس کے بعد آپ نے بہتر افراد پر مشتمل اپنی فوج منظم فرمائی اور اس دور کے فوجی نظام کے مطابق میمنہ، میسرہ، قلب اور علمدار معین فرمایا۔

جس وقت امام حسینؑ اپنی فوج کو منظم فرمانے میں مشغول تھے، سپاہ دشمن کے کچھ سواروں نے لشکر حسینؑ پر پیچھے سے حملہ کا منصوبہ بنایا۔ ان میں سے ایک یا ان کا سرغنہ شمر تھا۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا کہ پیچھے ایک عجیب خندق موجود ہے۔ گویا ایک بڑی جنگ ہونے والی ہے جس کے لئے یہ خندق اور آگ فراہم کی گئی ہے۔ حسینؑ بن علیؑ کے کام میں اس دقیق نظم سے انھیں بڑا غصہ آیا۔ شمر نے چلا کر کہا: جو آگ قیامت کے دن تمہاری منتظر ہے اسے

تم نے دنیا ہی میں خود اپنے ہاتھوں اپنے لئے فراہم کر لیا ہے"۔ یہ جملہ زہر آگین تیر کی طرح حسینؑ کے شیدائیوں کے دل میں اترا۔ مسلم بن عوسجہ نے عرض کیا: آقا! اجازت دیجئے میں اس خبیث کو یہیں سے تیر مار کر ہلاک کئے دیتا ہوں۔

غور کیجئے، امام نے فرمایا نہیں، میں جنگ شروع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں تاکہ پوری دنیا جان لے کہ میں اسی پیغمبرؐ کے نقش قدم پر چل رہا ہوں جس کی تمام جنگیں اسلام سے دفاع کی شکل رکھتی تھیں۔ تاکہ کسی میں یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ پیغمبرؐ اور ان کے اہل بیتؑ تلوار کے زور پر اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ دنیا یہ جان لے کہ میں نے جنگ کا آغاز نہیں کیا ہے۔ امام نے فرمایا نہیں تم تیر نہ مارو۔ ان ہی کو جنگ شروع کرنے دو۔ امام نے اپنی سپاہ منظم کرنے کے بعد فرمایا میں ہر کام سے پہلے ان لوگوں سے گفتگو کر لوں، گھوڑے پر سوار ہو کر پوری شان و شوکت کے ساتھ دشمن کی فوج کے سامنے آئے۔ بلند آواز سے لوگوں کو خاموش رہنے اور بات سننے کی دعوت دی۔ سب خاموش ہو گئے۔ آپ نے اپنا خطبہ شروع کیا۔ آپ کے اس خطبہ کے دو تین جملے بہت عمدہ ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے فرمایا: اے لوگو! اگر مجھے نہیں پہچانتے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تمہارے درمیان موجود ہیں اور پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ سے واقف ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں پیغمبرؐ خدا کا فرزند ہوں؟ حسینؑ بن علیؑ روز عاشور میدان کربلا میں اپنے کو کیوں پہچنوا رہے تھے؟ تاکہ کل یہ خائن اور منافق عوام یہ نہ کہیں کہ ہمیں نہیں معلوم تھا، ابن زیاد نے ہمیں دھوکا دیا ہم سمجھتے تھے یہ کوئی اور شخص ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی حسینؑ بن علیؑ ہیں جنہیں ہم نے دعوت دی ہے تو ہم ہرگز ان سے جنگ نہ کرتے بلکہ ان کی مدد بھی کرتے۔ قارئین اس نکتہ پر تعجب نہ کریں، کیونکہ آپ بار بار دیکھ چکے ہیں کہ حقیقتوں کو کس طرح توڑ مروڑ کر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس دور میں جب روابط و تعلقات کم تھے۔ عوام کو حقائق سے باخبر کرنے کے وسائل بہت محدود تھے جن کے ہاتھوں میں حکومت ہوتی تھی سارے وسائل کے وہی مالک ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں حقائق کو اس حد تک مسخ کرنا بڑا آسان کام تھا۔ معاویہ نے شام میں حضرت علیؑ کی کیسی تصویر پیش کی تھی؟ پھر کونسی تعجب کی بات ہے کہ حسینؑ کو اس بات کی فکر ہو کہ کہیں

یہ لوگ کل یہ نہ کہیں کہ اگر حسینؑ اپنے کو پہچنواتے، اگر ہمیں پتہ چل جاتا کہ یہ مسافر حسین بن علی ہیں جنہیں ہم نے دعوت دی تھی تو ہم ان کی حمایت کرتے۔ لہٰذا آپ نے اپنا تعارف کرایا اس کے بعد فرمایا اے لوگو! جو یہاں آئے ہو کیا تم نے مجھے دعوت نہیں دی تھی وہ دعوت کیسی تھی اور یہ تمہارا آنا کیسا ہے؟ کیا تمہاری دعوت اور آمد کے دوران مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے جس سے میرا خون مباح ہو جائے؟ کیا میں نے تمہارے کسی عزیز کا خون کیا ہے؟ کیا میں نے تمہارا مال و منال لوٹا ہے؟ کیا کسی حلال کو حرام کیا ہے؟ کسی حرام کو حلال کیا ہے؟ تم کس لئے میرا خون مباح سمجھتے ہو اور مجھ سے جنگ کرنے آئے ہو؟ آپ نے یہ سب باتیں کہیں تا کہ کل کوئی کوفہ کے مذبذب عوام کے جرم کی توجیہ نہ کر سکے اور یہ نہ کہے کہ جو شخص بھی حکومت وقت کے خلاف قیام کرے وہ خارجی ہے اور اس کا خون مباح ہے۔

امام حسینؑ کے واقعہ میں، خود عوام نے امام کو دعوت دی تھی۔ حضرت یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ تم لوگوں نے خود ہی مجھے دعوت دی تھی اور میں نے تمہاری دعوت قبول کر لی۔ تم نے کہا تھا دین خدا پامال ہو رہا ہے، میں دین خدا کو بچانے کے لئے تمہاری سرزمین پر آیا ہوں۔ تم تاریخ کو کیا منہ دکھاؤ گے، کس طرح سر اٹھا کر کہہ سکتے ہو کہ ہم نے حسینؑ کو دعوت دی اور مل جل کر انہیں کربلا میں شہید کر دیا۔ یہ واقعۂ کربلا کے اہم سبق آموز اور قابل توجہ نکتے ہیں۔

واحسیناہ...

واعطشاہ...

منطق، غور و فکر کا سلیقہ

جناب شیخ جوادی آملی
ترجمہ: جناب احتشام عباس زیدی

گزشتہ بحثوں میں تعلیم کی کیفیت "ویعلمہم الکتاب والحکمۃ" کے سلسلہ میں کچھ مطالب بیان کئے گئے۔ گفتگو یہ تھی کہ دین نے غور و فکر کے سلسلہ میں فطری اور عقلا کی روش کو ہی صحیح قرار دیا ہے ساتھ ہی اس روش سے متعلق کچھ دلائل بھی پیش کئے گئے۔ ہدایت کی اس روش کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کے سامنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور اس کی ہدایت کرنا مقصود ہوتا ہے تو پہلے بدیہی اور واضح باتوں سے ابتدا کرتے ہیں پھر اس کے سامنے نظری مسائل پیش کرتے ہیں۔ بدیہی سے نظری کی طرف منتقل ہونے کا طریقہ بھی منطقی طریقہ ہے۔ چنانچہ اگر بدیہی سے نظری کی طرف منتقل ہونے کے سلسلہ میں کسی ایک منطقی اصول کی رعایت نہ کی جائے تو صحیح نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ بعض افراد نے اس منطقی روش پر اعتراضات کئے ہیں، ہمارے استاد مرحوم علامہ طباطبائی رضوان اللہ علیہ نے ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا جواب دیا ہے اب تک آٹھ اعتراض تفصیل کے ساتھ بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب نواں اعتراض اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

نواں اعتراض

نواں اعتراض یہ ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں انسانوں سے اس دنیا میں ناطح انداز

وروش اور عرف و عادات کے مطابق ہی گفتگو کی ہے، منطقی روش کے مطابق نہیں۔ لہٰذا ہمارا بھی فریضہ ہے کہ منطق و حکمت کے پیچیدہ مسائل کا احیا کرنے کے بجائے اسی روش کو زندہ کریں، کیونکہ منطقی و فلسفی قوانین غیر الٰہی ہیں جو دین قوموں اور غیر اسلامی ملکوں سے ہم تک پہنچے ہیں اور قرآن نے نہ صرف ہم سے منطقی و فلسفی انداز میں گفتگو نہیں کی ہے، بلکہ چونکہ یہ روش غیر اسلامی ممالک کی میراث ہے اور قرآن نے ہمیں غیر مسلموں سے دوستی و تعلقات پیدا کرنے سے منع کیا ہے لہٰذا ہمیں غیر کی ثقافت و تمدن سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے!!

نویں اعتراض کا جواب

جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، ان تمام گیارہوں اعتراضات کا ایک مشترک جواب (خود ان اعتراضات میں) موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی روش خود ہی منطقی روش ہے، یعنی اگر وہ اس نویں یا کسی بھی اعتراض کو بیان کرنا چاہیں تو مجبوراً اسے صغریٰ و کبریٰ میں ڈھال کر یوں کہتے ہیں: یہ روش جو یونان سے آئی ہے کفر کی ثقافت و تہذیب ہے اور جو علم و ثقافت بھی کفر سے متعلق ہے قرآن اس کی مذمت کرتا ہے لہٰذا یہ علم و ثقافت مذموم ہے!

آپ توجہ فرما رہے ہیں! یہ لوگ اپنے سوال کو بیان کرنے میں منطقی شرائط میں سے اگر ایک شرط کی رعایت نہ کریں تو اپنا اعتراض ہی پیش نہیں کر سکتے۔ بنابرایں ان سے کہنا چاہئے کہ تم نے اعتراض پیش کر کے اپنے آپ کو خود ہی زیر کر دیا (اپنا جواب خود ہی دے دیا) کیونکہ تم منطق کو منطقی روش سے ہی کاٹنا چاہتے ہو اور یہ ناممکن و محال ہے۔

غیر الٰہی علم و ثقافت

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ: جاہلیت کی میراث اور غیر الٰہی ثقافت و علم سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ: منطق، غور و فکر کا ایک سلیقہ ہے اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جو الٰہی یا غیر الٰہی ہو۔ یہ ادبیات کے مانند ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اندر زمانۂ جاہلیت میں رائج

فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ ترین روش کی بطور احسن رعایت کی گئی ہے لہٰذا آپ کو قرآن پر ہی اعتراض کرنا چاہئے کہ کیوں اس نے جاہلیت کی ثقافت سے کام لیا !!

کیا حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے کہ فصاحت و بلاغت سے کلام میں چاشنی اور مزہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے ذوق و سماعت کو لذت محسوس ہوتی ہے ؟ اور کیا ایسا نہیں کہ اگر کلام فصیح و رسا ہو تو دل پر بہتر طور سے اثر انداز ہوتا ہے ؟ بنا برایں اگرچہ فصاحت و بلاغت جاہلیت کی ثقافت و ادب کا حصہ تھی لیکن اسے آثار جاہلیت میں شمار نہیں کیا جاتا ! یہ سب آثار فطرت ہیں جو زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے پاس موجود تھے لیکن وہ اس فن کو بےجا اور بےسبب مدح و ہجو میں صرف کرتے تھے ، اور ان کا یہ طریقہ باطل تھا نہ کہ نبات خود فصاحت و بلاغت اور ادبی نکات خراب ہو سکے۔

جب رسول اکرم کے چچا جناب عباس سے سوال کیا گیا کہ " انت اکبرام رسول اللّٰہ " آپ بڑے ہیں یا رسول خداؐ ؟ تو آپ نے جواب دیا : " ھو اکبر و انا اسن " وہ (مجھ سے) بڑے ہیں اور میں سن میں ان سے زیادہ ہوں ۔ یہ جملہ کس قدر لطیف اور دلچسپ ہے ۔ یہ ادبی لطافت و ظرافت کا ایک نمونہ ہے۔

چنانچہ اگر غیر الٰہی ثقافت میں کچھ مذموم ہے تو وہ آثار و افکار ہیں، فکری روش اور طرز تفکر میں کوئی خرابی نہیں ہے بالکل یوں ہی جیسے عرب کے جاہلوں کا ادبی فنون کو ظالموں کی مدح ، شراب کی تعریف اور بےجا غزلوں میں استعمال کرنا قابل مذمت ہے ۔ خود فصاحت و بلاغت اور دوسرے ادبی فنون نہ صرف مذموم نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم نے قرآن میں اور پیغمبر اکرمؐ و ائمہ اطہارؑ نے اپنے اقوال میں ان سے بہترین استفادہ فرمایا ہے۔

کتاب و سنّت کے ظواہر سے استفادہ

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ہمیں قرآن مجید اور احادیث کے ظواہر سے استفادہ کرنا چاہئے ! تو کیا کتاب خدا اور احادیث صرف ظاہری الفاظ تک ہی محدود و محفوظ ہیں یا ان میں مجازات ، تشبیہات ، کنایوں اور استعاروں سے بھی کام لیا گیا ہے ؟ کیا یہ قرآن کریم نہیں جو فرماتا ہے کہ : ہم نے بہت سی باتوں کو مثل اور مثالوں کے ذریعہ بیان کیا ہے تاکہ تم سمجھو ؟ دوسری طرف

جب ہم اپنے صالح اسلاف کی روش کا جائزہ لیتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ہمارا ایک بزرگ ظاہر کے مطابق ایک حدیث اخذ کرتا ہے، اور دوسرا بزرگ فرماتا ہے کہ ظاہر سے استفادہ خطرناک ہے، اس کی مثال شیخ مفیدؒ اور شیخ صدوقؒ کے یہاں نظر آتی ہے جسے ہم گزشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں، یہاں مطلب کی وضاحت کے لئے ان ہی دونوں بزرگوں سے متعلق ایک اور مثال پیش کرتے ہیں :-

کتاب عقائد صدوق میں صراط سے متعلق یہ عبارت ملتی ہے :-

"قال ابوجعفر (شیخ صدوقؒ) اعتقادنا فی الصراط انہ حق وانہ جسر ادق من الشعر واحد من السیف"

شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں : صراط سے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بلاشبہ وہ حق ہے اور ایک پل ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔

شیخ مفید اس بات کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں : ایسا نہیں ہے کہ کوئی پل وغیرہ موجود ہو بلکہ صراط سے مراد دین ہے اور یہ دین چونکہ مستقیم اور ایک دم سیدھا ہے لہٰذا اس پر عمل سخت اور دشوار ہے، یہاں ظاہری معنی کے مطابق کوئی پل، اس کی باریکی اور تیزی نہیں مراد ہے! بلکہ کافر چونکہ دین کے اعمال کی طرف کوئی توجہ اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے لہٰذا قیامت میں دین ان کے لئے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا اور یہ ان سختیوں اور دشواریوں کی مثال دی گئی ہے جو کافر پر قیامت کے دن وارد ہوں گی۔

یہ ہمارے صالح اسلاف کی روش ہے جو بتلاتی ہے کہ ہمیں غور و فکر کا سلیقہ رکھنا چاہئے اور مسائل پر پوری آگاہی اور ان کے تمام مقدمات کے ساتھ غور کرنا چاہئے تفحص و تحقیق کرنا چاہئے اور صرف ظاہری معانی و مطالب پر اطمینان نہیں کرنا چاہئے۔

معصومینؑ کی روش

اگر ہم معصومین کی روش کا جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ وہ حضراتؑ بحث و گفتگو کے دوران اسی روش کو اپناتے تھے جس کی مثالیں پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ یہاں ہم دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیں :-

کتاب توحید صدوقؒ میں نقل ہے کہ کسی نے حضرت امیرؑ سے سوال کیا، "ھل رأیت ربّک حین عبدتہ؟" "کیا آپؑ نے عبادت کے وقت اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: ویلک ما کنت اعبد ربّا لم ارہ" افسوس ہے تجھ پر! میں اس خدا کی عبادت نہیں کرتا جسے نہ دیکھوں! اس نے دریافت کیا: فکیف رأیتہ؟ آپؑ نے اپنے خدا کو کیسے دیکھا؟ فرمایا: ویلک لا تدرکہ العیون فی مشاھدۃ الابصار ولکن رأتہ القلوب بحقائق الایمان" وائے ہو تجھ پر، خدا کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا لیکن دل حقیقت ایمان کے ساتھ خدا کا دیدار کرتے ہیں۔ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد شیخ صدوقؒ ایک دوسری روایت بھی نقل کرتے ہیں:۔

احمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ: میں نے امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا، اور ان سے خداوند عالم کی رؤیت کے سلسلہ میں سوال کیا اور اسی سوال کے ضمن میں میں نے اس سے متعلق عوام کے نظریہ کا بھی اظہار کر دیا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ رؤیت سے مراد کیا ہے؟ کیا رؤیت ظاہری نگاہوں سے بھی ممکن ہے؟ جیسا کہ اشاعرہ بعض آیات منجملہ "وجوہ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربّھا ناظرۃ" یعنی اس روز بعض چہرے فرط مسرت سے دمک رہے ہوں گے اور وہ جمال حق کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے" کے ظاہری معنی کو اختیار کرتے ہوئے اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگرچہ خداوند عالم دنیا میں دکھائی نہیں دیتا لیکن اس آیت اور دوسری آیتوں کے مطابق آخرت میں دکھائی دے گا!!

حضرتؑ نے جواب میں تحریر فرمایا: "لا یجوز الرؤیۃ ما لم یکن بین الرائی والمرئی ھواء ینفذہ البصر" کسی چیز کا دیکھا جانا ممکن نہیں جب تک دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی شے کے درمیان صاف و شفاف ہوا موجود نہ ہو اور اگر ان دونوں کے درمیان ہوا نہ ہوگی تو رؤیت محال ہو جائے گی، اور اگر نور یا روشنی نہ ہو تب بھی دیکھنا ممکن نہ ہوگا۔ فاذا انقطع الھواء وعدم الضیاء بین الرائی والمرئی لم تصح الرؤیۃ

"وکان فی ذالک الاشتباہ" اور دکھائی دینے کی صورت میں مشابہت پیدا ہو جائے گی یعنی خدا ہماری یا کسی شئے کی شبیہ ہو جائے گا۔" لانّ الرّائی متیٰ ساوی المرئی فی

السبب الموجب بینهما فی الرؤیة وجب الاشتباه " اگر کوئی خدا کو دیکھے تو اس سبب کے لیے اپنے مانند دیکھے گا۔ اور خدا بھی (معاذ اللہ) اس کے جیسا ہو جائے گا چنانچہ اس صورت میں شباہت لازم آئے گی۔ "لانّ الاسباب لابدّ من اتّصالها بالمسبّبات" کیوں کہ علت کا معلول سے اتصال ضروری ہے۔

جہاں سبب ہوگا مسبّب بھی وہیں ہوگا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ مسبب، سبب کا نتیجہ نہ ہو۔ یہ فلسفہ کے قانون علیت و معلولیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

قانون علیت

گویا حضرتؑ فرماتے ہیں: اگر سبب ہے تو مسبب بھی ہوگا۔ یعنی مسبب سبب سے الگ پایا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر یہ فکر کا مادہ اور میٹر ہے تو وہ فکر کی روش اور اس کا انداز ہے۔ وہاں حضرت مثال میں عکس نقیض سے استفادہ کرتے ہیں اور یہاں علیت کے قانون کلی کو بروئے کار لاتے ہیں بالکل اسی روایت کی طرح جو کتاب "کافی" میں ذکر ہوئی ہے: ابی الله ان یجری الامور الاّ باسبابها" خداوند عالم جو بھی کام انجام دینا چاہتا ہے اس کے لئے اسباب فراہم کر دیتا ہے یعنی نظام علیت کے مطابق کام انجام دیتا ہے۔ حضرت کا یہ طرز استدلال وہی فلسفی و عقلی استدلال ہے۔

اس بنا پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم اور احادیث کے صرف ظاہری معنی سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ منطق غور و فکر کا سلیقہ ہے اور فطری سلیقہ ہے جس کا الٰہی یا غیر الٰہی ثقافت و تمدن سے کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ طرز تفکر معصومینؑ کے اقوال میں بہت زیادہ نظر آتا ہے، اور اعتراض کرنے والوں کا اعتراض بھی جو ایک واضح منطقی روش پر استوار ہے اور اس میں بھی کبریٰ، صغریٰ اور نتیجہ پایا جاتا ہے، بالکل بیجا اور لغو ہے کیونکہ معترضین منطق کو منطقی روش سے ترک دینا چاہتے ہیں جو سراسر محال ہے۔

دوسری طرف اگر ہم اپنے اسلاف صالح کی روش کو غور و فکر اور بحث و تحقیق کے بغیر قبول کرلیں تو مختلف قسم کے طرز تفکر سے دوچار ہوتے ہیں جس کی مثال ہمیں شیخ صدوق اور شیخ مفید کے اختلافات میں نظر آئی۔ لہٰذا غور و فکر ضروری اور لازمی ہے۔ اگر ہم کتاب و سنت کے ظاہر

معانی پر عمل کرنا چاہیں تو ممکن ہے اسی طرح کی مشکل میں مبتلا ہوجائیں جس میں اشاعرہ، مُحدّثین کے مسئلہ میں گرفتار ہوئے، یا شیخ صدوق علیہ الرحمہ صراط وغیرہ سے متعلق عقائد کے سلسلہ میں ہوئے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ منطقی طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معصومین کے اقوال میں غور و فکر اور آیات و روایات میں تجسس و تحقیق کے ذریعہ اپنی جہالتوں کو دور کریں اور صحیح و مفید معلومات تک رسائی حاصل کریں۔ ومن اللہ التوفیق۔

ثابت موجودات اور تغیر پذیر موجودات

دسواں اعتراض: اعتراض کرنے والوں کا ایک اعتراض یہ ہے کہ حجت صرف کتاب اور سنت ہی ہیں اور اجماع بھی محض اس اعتبار سے حجت ہے کہ وہ سنت یا احادیث کا کاشف اور ظاہر کرنے والا ہو۔ پس عقل کی کوئی حیثیت نہیں ہے (وہ کہتے ہیں کہ) تم جو عقل کو حجت کہتے ہو اس کے لئے تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اگر تم عقل کی حجیت کو کتاب و سنت کے ذریعہ ثابت کرنا چاہتے ہو تو اصل کتاب و سنت قرار پائی، اور اگر عقل کی حجیت کو عقل کے ذریعہ ثابت کرنا چاہتے ہو تو دور لازم آتا ہے۔ بنابرایں اس کے علاوہ کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے کہ قول معصوم کی طرف رجوع کرو۔

اس اعتراض کا جواب

آپ نے خود اپنے بیان کے ذریعہ اپنی بات کو باطل کر دیا۔ آپ جو یہ کہتے ہیں کہ حجیت کے سلسلہ میں کتاب و سنت اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں تو یہ بات آپ کتاب و سنت کے ذریعہ کہہ رہے ہیں یا عقل کے ذریعہ؟ اگر آپ کتاب خدا یا سنت و احادیث کے ذریعہ کہہ رہے ہیں کہ کتاب و سنت حجت ہیں تو، ایسی صورت میں دور لازم آتا ہے، جو باطل ہے۔ اور اگر عقل کہتی ہے کہ کتاب اور سنت اس معنی میں حجت ہیں کہ جو کچھ کتاب و سنت میں ہے معصوم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اور جو کچھ معصوم کے ذریعہ ہم تک پہنچے حق ہے، لہٰذا کتاب و سنت حق ہے۔ اگر آپ یہ استدلال کرتے ہیں تو گویا دو دور کے درمیان سرگرداں ہیں، کیونکہ حجیت عقل کی اصل سے انکار کرتے ہیں، لہٰذا کسی بھی صورت میں آپ عقل سے استدلال نہیں کر سکتے۔

گیارھواں اعتراض

یہ اعتراض مادیوں نے کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ؛ منطقی روش (ارسطوئی منطق) صحیح روش نہیں ہے کیونکہ اس منطق کی شکلیں (اشکال اربعہ) دو مقدموں سے تشکیل پاتی ہیں کہ یا یہ دونوں مقدمے کلی ہوں یا کم از کم ان میں سے ایک کلی ہے ۔ چنانچہ کوئی قیاس ایسا تشکیل نہیں پاتا جس کے دونوں مقدمے جزئی ہوں ۔ یعنی ایک امر جو تمام موضوع افراد کے لئے محمول ثابت ہے، اور کچھ افراد سے یا کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے، قہری طور پر ثابت بھی ہے اور دائم بھی ۔

بنابراین چونکہ منطقی شکلوں کی بنیاد ایسی کلیات پر قائم ہے جنھیں دائم اور ثابت ہونا چاہیے جبکہ جدید ترقی یافتہ علوم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی بھی امر کلی، دائم اور ثابت نہیں ہے بلکہ تمام موجودات میں تغیر و تبدل پایا جاتا ہے ۔ لہٰذا منطقی روش کے ذریعہ کسی بھی بات کو ثابت یا کسی بھی بات سے انکار ممکن نہیں ہے !" یہ وہی ڈائلکٹک DIALECTIC (منطق کی استدلالی روش ہے ۔"

گیارھویں اعتراض کا جواب

آپ نے اپنے اسی اعتراض میں جان بوجھ کر یا بے خیالی میں ایک منطقی قیاس تشکیل دے دیا ہے اور دو کلی مقدمہ یا ایک جزئی اور ایک کلی مقدمہ سے نتیجہ اخذ کیا ہے ۔

آپ نے کہا کہ چونکہ تمام موجودات مادی ہیں اور کوئی غیر مادی وجود ہے ہی نہیں اور تمام مادی موجودات متغیر ہیں، پس تمام موجودات تغیر و تبدیلی کی حالت میں ہیں لہٰذا کوئی وجود کلی، ثابت اور دائم نہیں ہے ! اس طرح آپ نے دو کلی مقدموں سے ایک کلی نتیجہ برآمد کیا ہے ۔

اگر آپ اس بات کے معتقد ہوں کہ بعض امور کلی، ثابت اور دائم ہیں اور بعض متغیر و جزئی ہیں تو یہی اہل منطق بھی کہتے ہیں ۔ منطقی کہتے ہیں کہ : موجودات کی دو قسمیں ہیں، بعض ثابت و پائدار ہیں اور بعض متغیر بعض کلی ہیں اور بعض دائمی ہیں اور بعض وقتی ۔

لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تمام موجودات تغیر پذیر ہیں، اس وقت آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک منطقی قیاس تشکیل دیجئے اور دو کلی مقدموں کے ذریعہ یعنی "ہر موجود مادی ہے" اور "ہر مادی متغیر ہے" یہ نتیجہ نکالئے کہ "ہر موجود متغیر ہے" اور کوئی موجود ثابت و

کلی اور دائمی نہیں ہے۔ آپ اس منطقی روش سے الگ ہٹ کر ــــ جو ایک کلی صغریٰ اور ایک کلی کبریٰ کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے اور اس سے آپ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ موجودات متغیر ہیں ــــ صورت سے اور کبھی بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

اور مختصر لفظوں میں: اگر آپ نے کہا کہ بعض موجودات مادی ہیں اور پھر یہ کہا کہ بعض موجودات متغیر ہیں تو نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ بعض موجودات متغیر ہیں، اور یہ وہ بات ہے جو منطق پر کوئی شبہ نہیں وارد کرتی کیونکہ تمام اہل منطق اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں: بعض مجرد ہیں اور بعض مادی۔ جو مجرد ہیں وہ ثابت ہیں، لیکن جو مادی ہیں وہ متغیر ہیں۔

اور قیاس تشکیل دینے کی صورت میں اگر آپ دو جزئی مقدمہ سے استفادہ کریں گے تو کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا، اور نتیجہ حاصل بھی ہوگا تو جزئی ہوگا۔ اور اگر ایسا قیاس تشکیل دیں جس کا ایک مقدمہ جزئی اور دوسرا مقدمہ کلی ہے پھر بھی اس کا نتیجہ جزئی ہوگا۔ اور اس طرح منطق پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

مزید واضح عبارت میں: اگر آپ کہیں کہ بعض موجودات مادی ہیں، اور ہر مادی متغیر ہے ثابت نہیں ہے، تو اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ بعض موجودات متغیر ہیں ثابت نہیں ہیں اور یہ بات نہ منطق کی مخالف ہے اور نہ فلسفہ کے خلاف، کیونکہ فلسفہ و منطق دونوں اسے قبول کرتے ہیں البتہ ایک اسے مادہ کے ساتھ قبول کرتا ہے اور ایک صورت کے ساتھ۔ اور اگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تمام موجودات تغیر پذیر ہیں، تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ منطقی قیاس تشکیل دیجئے۔

یہ روش منطقی روش ہے۔ اس کے علاوہ جو نتیجہ آپ برآمد کر رہے ہیں وہ خود آپ کے دعوے کو توڑ رہا ہے۔ یعنی اگر تمام موجودات متغیر ہیں تو خود یہ اصل کلی بھی متغیر ہے اور آپ اسے ایک ثابت اصل کے عنوان سے تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر تمام موجودات مادی ہیں اور ہر مادی وجود زوال پذیر ہے تو یہ قانون بھی زوال پذیر ہے اور آپ کے پاس کوئی ثابت اور دائمی اصل نہیں ہے اور چونکہ آپ کے پاس کوئی ثابت و پائدار اصل نہیں ہے، لہٰذا آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمام موجودات مادی و متغیر ہیں، یوں ہی آپ کلی اور ثابت نتائج بھی نہیں رکھ سکتے۔

اور ان سب کے علاوہ یہ منطق ڈائلکٹک (Dialectic) وحی اور عقل صحیح سے ہم آہنگ

دسانہ گار نہیں ہے اور انشاء اللہ آئندہ بحثوں میں یہ بات واضح ہوگی کہ ایسا نہیں ہے کہ ہر موجود مادی ہو بلکہ بعض موجودات مادی و متغیر ہیں اور بعض مادی نہیں ہیں اور ثابت ہیں۔

قرآن کریم نے موجودات کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے موجودات کا ایک سلسلہ متغیر ہے اور ایک سلسلہ ثابت ہے۔ متغیر موجودات وہی مادی موجودات ہیں جو زوال پذیر ہیں اور جو ثابت ہیں وہ مادی نہیں ہیں۔

حیات ثابت اور حیات متغیر

اگر آپ قرآن کریم کی آیات کو ملاحظہ فرمائیں تو اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوں گے کہ قرآن حیات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، جب انسان اور اس کے مانند مخلوقات کی حیات سے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو فرماتا ہے: "کل من علیہا فان" (رحمان/۲۶) روئے زمین پر جو کچھ ہے سب فنا ہو جائے گا۔ یا فرماتا ہے: "وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد افان مت فھم الخالدون (انبیاء/۳۴)" اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کو ابدی زندگی نہیں عطا کی تو کیا تم مر جاؤ گے اور وہ سب زندہ رہیں گے۔" یا ارشاد ہوتا ہے: کل نفس ذائقۃ الموت (انبیاء/۳۵) "ہر ذی روح موت کا مزہ چکھنے والا ہے"۔ کہ اس حصہ میں حیات متغیر ہے اور موت پر جا کر تمام ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں وہ خداوند عالم کی حیات کو بیان کرتا ہے تو فرماتا ہے: "وتوکل علی الحیّ الّذی لایموت (فرقان/۵۸)" اور تم لیسے ابدی حیات والے خدا پر بھروسہ کرو جو کبھی نہیں مرتا۔ پس یہ وہ حیات ہے جو انسانوں اور ان کے مانند دیگر مخلوقات کی متغیر و محدود حیات کے مقابلہ میں ثابت اور دائم ہے۔

انسانوں سے متعلق دیگر موجودات اور اشیاء بھی فانی و متغیر ہیں، لیکن جو کچھ اس خدا حیّ (جو ہرگز مرنے والا نہیں) کے نزدیک ہے، زندہ اور ثابت ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ۹۶ میں ارشاد ہوتا ہے: ما عندکم ینفد وما عند اللہ باقٍ" "جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہو جانے والا ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے۔

بنابرایں، موجودات قرآن کی نظر میں دو طرح کے ہیں، کچھ موجودات زوال پذیر ہیں اور کچھ

ایسے موجودات ہیں جو "لاینفد" یعنی ناقابل زوال ہیں، اور اس ناقابل زوال اور غیر فانی وجود کو اصول ڈائلکٹک کے ذریعہ کسی بھی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ڈائلکٹک کا اصول کہتا ہے "کل موجود مادی وکلّ مادی متغیر فکلّ موجود متغیر فکلّ موجود ینفد ویزول" یعنی ہر موجود مادی ہے اور ہر مادی متغیر ہے پس ہر موجود متغیر ہے لہٰذا ہر موجود فنا ہو جائے گا اور زائل ہو جائے گا !!

ہم سورۂ رعد میں دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم موجودات کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتا ہے "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب" (رعد/۳۹) "خداوند عالم جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) ثابت و دائم کر دیتا ہے اور اصل کتاب مشیت اسی کے پاس ہے۔ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالم خلقت کی بعض مخلوقات محو بھی ہوتی ہیں اور ثابت بھی ہوتی ہیں اور ان کے مقابل ام الکتاب ہے جو اپنی جگہ ثابت و دائم ہے۔ یعنی ام الکتاب جو اصل کتاب ہے محو اور اثبات سے محفوظ ہے لہٰذا اسے "لوح محفوظ" یا "کتاب محفوظ" جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جو تغیر و تبدل سے محفوظ ہے۔

مذکورہ آیت میں ارشاد ہے "وعندہ ام الکتاب" یعنی اصل کتاب اللہ کے پاس ہے، اور سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے "وما عند اللہ باق" اور جو کچھ خدا کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے، پس ان دونوں سے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ "ام الکتاب" باقی ہے اور تغیر سے محفوظ ہے۔ اور بہر حال مخلوقات کے زوال اور فنا سے محفوظ اس حصہ کو ڈائلکٹک اصول کے ذریعہ ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس اصول و قانون کے تحت کوئی بھی موجود ثابت اور لازوال نہیں ہے۔

قرآن کریم اور ڈائلکٹک اصول

بعض افراد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کو ترقی یافتہ علوم اور ڈائلکٹک اصول کے ذریعہ سمجھنا اور حل کیا جانا چاہئے! ان کا جواب یہ ہے کہ قرآن کو ڈائلکٹک اصول سے ہرگز حل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس اصول میں کسی ثابت اور غیر متغیر شئے کا وجود ہی نہیں ہے اور یہ قرآن کی نص صریح کی خلاف ورزی ہے

جو موجودات کو مذکورہ بالا دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

حضرت علیؑ اپنے ایک خطبہ میں خداوند عالم سے متعلق فرماتے ہیں: "الفاعل لا بالحرکۃ" اس کے بعد استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وکیف یجری علیہ ماھو اجراہ؟ حرکت و سکون کا قانون خدا پر کیسے جاری ہو سکتا ہے جبکہ خداوند عالم خود حرکت و سکون کا خالق ہے، لہٰذا وہ کبھی خود حرکت کے تابع نہیں ہوگا۔

چنانچہ ہم ڈائلکٹک اصول کے ذریعہ اس اسلام کو کیسے پہچنوا سکتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ خدا حرکت سے منزہ اور بری ہے اور حرکت کا قانون حریم پروردگار میں راہ نہیں پا سکتا۔ خدا نہ صرف متحرک نہیں ہے بلکہ فاعل بالحرکۃ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کا عمل اس کے ارادہ سے متعلق ہے اور اس کا ارادہ خود اس کی ذات سے مربوط ہونے کی حیثیت سے حرکت سے منزہ و بری ہے۔ دوسری طرف قرآن کریم دو اصل "اصل کلیت اور اصل دوام" کے عنوان سے خود کو پہچنواتا ہے اور ان ہی دونوں بنیادوں پر نازل ہوا ہے۔

قرآن کریم اور کلیت و دوام کے اصول

بعثت پیغمبر اکرمؐ کے اوائل میں، سورۂ تبارک اور ان تمام سوروں کے اندر جو عتائق[1] شمار ہوتے ہیں ان دو اصولوں یعنی کلیت و دوام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وما ھو الا ذکر للعالمین (قلم/۵۲) یعنی یہ قرآن تمام زمانوں میں تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اور ایک جگہ فرماتا ہے: "ھدی للناس" (بقرہ/۱۸۵) یعنی ہر عہد اور ہر زمانہ کے تمام افراد قرآن کی ہدایت کے سایہ میں پناہ لے سکتے ہیں۔

پس اگر ہمارے پاس ایسی فکری روش نہ ہو جس میں "کلی" "دائم" اور "ثابت" کو قبول کیا گیا ہو تو ہم ان آیات سے کیسے استدلال کر سکتے ہیں۔ اور کیونکر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن روز قیامت تک تمام انسانوں کی ہدایت کرنے والا ہے؟!

اللہ کی جانب دعوت کے طریقے

اسی سورۂ نحل میں قرآن کریم لوگوں کو تین طریقوں سے دعوت دیتا نظر آتا ہے:۔

---

[1] عتائق: عتیقہ کی جمع ہے۔ یہاں سوروں کو کہتے ہیں جو اوائل بعثت میں مکہ میں نازل ہوئے ہیں۔

"ادع الیٰ سبیل ربّک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن، ان ربّک ھو اعلم بمن ضلّ عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین" (آیت/۱۲۵)

یعنی "اے میرے رسول! آپ لوگوں کو حکمت و برہان اور بہترین نصیحتوں کے ذریعہ اللہ کی راہ کی جانب دعوت دیجئے اور بہترین انداز میں ان سے جدال و مناظرہ فرمائیے۔ بلاشبہ آپ کا پروردگار اس کے انجام سے واقف ہے جس نے اس کی راہ سے دوری اختیار کی اور گمراہ ہوا اور ہدایت پانے والوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔"

اس تقابلی قرینہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن میں فرق اور امتیاز ضرور پایا جاتا ہے۔ "دعوت" کیا ہے؟ ایک طرف معرفت کائنات اور دوسرے نظری مسائل کا ایک سلسلہ ہے جس کی طرف انسانوں کو بلایا جاتا ہے۔ اور دوسری حکمت عملی سے متعلق مسائل، اخلاق اور احکام کا ایک سلسلہ ہے جن کی جانب لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے:-

۱۔ نظری مسائل میں "جہاں یقینی مقدمات لازم و ضروری ہیں، اسی طرح و بنیاد کو جس کے ذریعہ یقینی مقدمات نتیجہ خیز و ثمر بخش ہوں "حکمت" کہا جاتا ہے۔

۲۔ اور اگر تسلیم شدہ اور مشاہدہ شدہ مقدمات سے "یہ ہونا چاہئے اور یہ نہ ہونا چاہئے" جیسے امور میں مدد لی گئی ہو تو اس کا نام "جدال احسن" ہے۔

۳۔ اور اگر ظنی مقدمات کے ذریعہ خیر مظنون کی پیروی اور شر مظنون سے پرہیز میں مدد لی گئی ہو تو اسے "موعظہ" و نصیحت کہتے ہیں۔

منطقی مسائل قراردادی نہیں ہیں

بنابرایں تعلیم کے لئے اس فطری راہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہے اور کوئی منطقی اس لئے نہیں آیا ہے کہ انسان کے لئے قانون بنائے بلکہ اہل منطق نے آکر فطرت کو شگفتگی عطا کر دی ہے دوسرے لفظوں میں یہ منطقی مسائل قراردادی نہیں ہیں جو ماحول کے تابع ہوں، یا کسی قرارداد و قانون سے منسلک ہوں، یعنی کسی انسان نے یہ طے نہیں کیا ہے کہ لوگ اس طرح سوچیں اور یوں غور و فکر

کریں۔ جس طرح ریاضی کے مسائل ہرگز کسی قرارداد کے تحت طے نہیں ہوتے ہیں یوں ہی منطق کے مسائل بھی قرارداد کے پابند نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، ایسا نہیں ہے کہ ہر معلوم اور ہر مجہول کے درمیان رابطہ ہو، پس اگر نظام علیت کو تسلیم کر لیا گیا ہو تو یہ نظام خود افکار پر بھی حکومت کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر مقدمہ ہمیں اسی نتیجہ تک پہنچا دے جو ہم چاہتے ہیں۔ یا ہم جیسے بھی مقدمات ترتیب دے لیں جو بھی نتیجہ چاہیں گے برآمد کر لیں گے!

جس طرح خارجی دنیا میں ایک مادہ اور ایک صورت ہے، یوں ہی افکار و علم کی دنیا میں بھی ایک معین و مشخص مواد اور ایک خاص صورت پائی جاتی ہے کہ اگر وہ مواد اس صورت سے مل گیا تو صحیح فکر اور صحیح نتیجہ دے گا چنانچہ اگر ہم نظام علی (یا علیت) کو تسلیم کرنا چاہیں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ مادہ و صورت کے درمیان ایک آمیزش اور ملاپ ہو اور ہمیں ایک خاص نتیجہ عطا کرے۔ ورنہ ہم جس طرح بھی سوچیں یا فکر کریں اور کسی بھی مقدمہ سے کوئی بھی نتیجہ حاصل کریں، سوائے سفسطہ کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ سفسطہ میں نتیجہ اور مقدمات کے درمیان کوئی علمی رابطہ نہیں پایا جاتا۔[1]

انشاء اللہ آئندہ مقالہ میں ہم آیت "ھدی للناس" سے متعلق اور آیت "یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام (مائدہ/۱۶)" سے اس آیت کے ارتباط کے بارہ میں بحث کریں گے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ہدایت جو تمام زمانوں میں تمام لوگوں کے لئے ہے کیسی ہدایت ہے اور یہ کس طرح کی ہدایت ہے جس کے سلسلہ میں خداوند عالم فرماتا ہے کہ: خداوند عالم اس قرآن کے ذریعہ سلامتی کی راہ اسے دکھاتا ہے جو خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل کر لے۔؟

---

[1] قراردادی قانون سے مراد حقوقی قانون ہے جسے طرفین کی موافقت اور رضامندی سے بدلا جا سکتا ہے یہ ان ثابت اور دائمی اصل کے مانند نہیں جو معرفت عالم کے مسائل میں ہے مثلاً قانون علیت کہ یہ بہرحال کسی قرارداد کے تحت نہیں ہے اور ناقابل تغییر ہے لیکن قراردادی قوانین مثلاً بیع، تجارت وغیرہ ایسے حقوقی مسائل کا جزء ہیں جو طرفین کی موافقت سے مقرر ہوتے ہیں اور قابل تغییر و تبدیل ہیں۔

حکومت اور عوام کا رابطہ

جناب شیخ محمد تقی رہبر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

اسلامی سیاست کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ حکومت اور ملت کے درمیان رابطہ کس نوعیت کا ہے۔ دنیا کے استکباری اور جبر و آمریت کے نظاموں میں حکومت اور عوام کا رابطہ جنگلی حاکمیت کی طرح ظالم و مظلوم کے رابطہ کی نوعیت کا ہے۔ جس طرح طاقتور درندے کمزور جانوروں کا شکار کرتے ہیں یا ان کے منہ کا نوالہ چھین لیتے ہیں یوں ہی ظالم و جابر حکام غریب اور کمزور عوام کا خون چوستے رہتے ہیں اور یہ بیچارے غریب گروہ در گروہ ان حاکم طاقتوں کی بے جا خواہشات اور ہوا و ہوس کی بھینٹ چڑھتے رہتے ہیں۔ یہ غریب و کمزور افراد، خدا کو بھولے ہوئے ان کاخ نشینوں کی نگاہ میں نہ کوئی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور نہ کسی شمار میں آتے ہیں۔ ان محروم و مظلوم طبقوں کے تمام مادی و معنوی آثار اس حکمران طبقہ کے مظالم کا شکار ہو جاتے ہیں جو گنتی کے چند ہوس پرست اور خود غرض افراد پر مشتمل ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام اس روش حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے — جو تاریخ کے کفر صفت حکام کا ورثہ ہے اور امت اسلام جس میں نہ صرف مبتلا ہو گئی بلکہ صدیوں تک اسلامی حکومت کے نام پر ظالم و جابر حکام کے نتیجہ میں گرفتار رہی — اپنے ایک خطبہ میں موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وکان اهل ذالک الزمان ذئاباً وسلاطینه سباعاً

اوساطہ اکالاً وفقرائہ امواتاً وغار الصّدق وفاض الکذب واستعملت المودّۃ باللّسان وتشاجر النّاسُ بالقلوب وصار الفسوق نسباً والعفاف عجباً ولبس الاسلام لبس الفرو مقلوباً "

(خطبہ : ۱۰۸)

"اس زمانہ کے لوگ بھیڑیے ہوں گے اور ان کے حکام و سلاطین درندے۔ عام افراد یا درمیانی طبقہ کے لوگ بہت پُرخور اور پیٹو ہوں گے اور غریب و کمزور افراد مردوں کے مانند ہوں گے۔ سچائی دنیا سے اٹھ جائے گی اور جھوٹ رائج ہو جائے گا۔ لوگوں کی دوستی اور محبت صرف زبانی جمع خرچ ہو گی لیکن دل ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے ہوں گے۔ گناہ اور بدکاری شخصیت کا معیار بن جائیں گے اور عفت و پاکدامنی تعجب و حیرت کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اسلام الٹی پوستین کی طرح اوڑھ لیا جائے گا۔"

لیکن ایمانی حکومت اور الٰہی حاکمیت کی شان کچھ اور ہی ہے۔ یہاں حکومت اور ملت کا رابطہ محبت، خدمت، ایثار، احسان اور حسن سلوک کی بنیاد پر استوار ہے اور باپ بیٹے کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کی مانند ہے۔ امیرالمومنین علیؑ رعایا کے ساتھ اپنے تعلق وارتباط سے متعلق فرماتے ہیں :-

ولقد احسنت جوارکم واحطت بجهدی من ورائکم واعتقتکم من ربق الذّل وحلق الضّیم شکراً منّی للبرّ القلیل واطراقاً عمّا ادرکہ البصر وشھدہ البدن من المنکر الکثیر۔

(خطبہ ۱۵۹)

بلاشبہ میں نے تمہارے ساتھ نیکی کا برتاؤ کیا، ایک اچھے پڑوسی کا سا سلوک کیا۔ اور اپنی پوری طاقت و توانائی کے ساتھ تمہاری حمایت کی اور ذلت و رسوائی کی زنجیروں سے تمہیں آزاد کیا۔ اس طرح میں نے تمہاری تھوڑی سی نیکی کا شکریہ ادا کیا اور ان بہت سے ناروا سلوکوں سے چشم پوشی کر لی جنہیں میری آنکھوں نے دیکھا اور میرا جسم جن کا گواہ تھا۔

یہاں عوام کے ساتھ رابطہ کی نوعیت کے سلسلہ میں امام کے سیاسی اصول سے اجمالی طور پر چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں :-

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک، عوام کی مکمل حمایت، ہر طرح کی قید و بند سے انھیں آزادی دلانا۔ ان کی محنتوں کی قدر کرنا اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنا۔

حضرتؑ نے زکوٰۃ کی وصول یابی پر مقرر اپنے ایک عامل کو ایک خط تحریر کیا جس میں فرمایا :-

"وامرہ ان لا یجبہم ولا یعضہم ولا یرغب عنہم تفضلاً بالامارۃ علیہم فانہم الاخوان فی الدین والاعوان علی استخراج الحقوق"

(خط نمبر ۲۶)

"اور اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں کے ساتھ ناروا برتاؤ نہ کرے اور انھیں پریشان نہ کرے، ان کی تحقیر و توہین نہ کرے اور اپنے عہدہ کی بڑائی کا خیال کرتے ہوئے ان سے بے رخی نہ برتے کیونکہ وہ لوگ دینی بھائی ہیں اور ایسے مددگار ہیں جو حقوق کی ادائیگی میں مدد دیتے ہیں۔"

اور مالک اشتر کو تحریر کردہ اپنے سیاسی منشور میں فرماتے ہیں :-

"واشعر قلبک الرحمۃ للرعیۃ والمحبۃ لہم واللطف بہم، ولا تکوننّ علیہم سبعاً ضاریاً تغتنم اکلہم ..."

"رعایا کے ساتھ محبت اور لطف و کرم کو دل سے اپنا شعار بنا لو۔ ان کے لئے خونخوار درندہ نہ بن جاؤ کہ ان کے منہ کا نوالہ چھیننے لگو ....."

حکومت میں عوام کی مرکزیت

اس نظام میں خاص طور سے عوام کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اور جیسا کہ استکباری نظاموں میں ہوا کرتا ہے کہ بس چند گنے چنے خواص، ٹکڑوں پر پلنے والوں اور حاشیہ نشینوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور عوام کو کسی شمار و قطار میں نہیں لایا جاتا بلکہ اپنی خوشی و غم پر انھیں قربان کر دیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام کے سیاسی نظام میں عوام کو خواص اور اشراف کے طبقہ سے زیادہ وقعت دی گئی ہے۔ مالک اشتر کے نام تحریر امام کے سیاسی و اجتماعی منشور میں اس حساس نکتہ کی طرف پوری توجہ دی گئی ہے، جس کا متن یہ ہے :۔

"ولیکن احبّ الامور الیک اوسطها فی الحق واعمّها فی العدل، واجمعها لرضیٰ الرّعیّة فانّ سخط العامّة یجحف برضیٰ الخاصّة وانّ سخط الخاصّة یغتفر مع رضیٰ العامّة ولیس احد من الرّعیة اثقل علی الوالی مؤونة فی الرّخاء واقلّ معونة له فی البلاء واکره للانصاف واسأل بالالحاف واقلّ شکراً عند الاعطاء وابطأ عذراً عند المنع واضعف صبراً عند ملمّات الدّهر من اهل الخاصّة. وانّما عماد الدّین وجماع المسلمین والعدّة للاعداء العامّة من الامّة فلیکن صغوک لهم و میلک معهم"

"تمہاری نگاہ میں بہترین اور پسندیدہ طریقہ کار وہ ہونا چاہئے جو حق کی بنیاد پر بہترین ہو، انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کی خوشنودی کے مطابق ہو۔ کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر اور بے اعتبار بنا دیتی ہے، اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے سامنے نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ رعایا میں خواص سے زیادہ کوئی ایسا نہیں جو خوشحالی کے دور میں حکومت پر سب سے بڑا بوجھ اور مشکلات میں مدد سے کترانے والا، انصاف سے بے حد دور بھاگنے والا، اپنی ضروریات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ توقع رکھنے والا، بخشش و عطا پر بہت کم شکر گزار، محروم کئے جانے پر بہت کم عذر سننے والا اور زمانہ کی بلاؤں و مصیبتوں میں بہت کم صبر کرنے والا ہو۔ اور بلاشبہ دین کا مضبوط سہارا، مسلمانوں کی قوت اور دشمنوں کے مقابلہ میں سپر یہی عوام ہیں۔ لہٰذا تمہاری توجہ ان کی طرف اور تمہاری

محبت ان کے ساتھ ہونی چاہئے۔"

رعایا اور عوام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنا حکمت سے خالی نہیں ہے۔ اس بات کے دلائل امامؑ کے مذکورہ بالا مکتوب میں بڑی بلاغت اور جامعیت کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں، جن کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:—

(الف) خواص بہت زیادہ خرچ اور اسراف کرنے والے ہیں، جبکہ عوام قناعت پسند، کم خرچ اور کم توقع رکھنے والے ہوتے ہیں۔

(ب) خواص حکومت کے مشکلات میں کم ہی مددگار ثابت ہوتے ہیں جبکہ عوام سخت موقعوں پر حکومت کے یار و مددگار بن جاتے ہیں۔

(ج) خواص عدل و انصاف تحمل نہیں کر پاتے اور اس سے گریز کرتے ہیں جبکہ عوام عدل و انصاف کے پیاسے ہوتے ہیں۔

(د) خواص بہت زیادہ چاپلوس اور لالچی ہوتے ہیں جبکہ عوام میں اپنی درخواست پر اصرار، چاپلوسی یا رونے گڑگڑانے کا انداز نہیں پایا جاتا۔

(ھ) خواص کو جتنا بھی نوازا جائے کم شکرگزار ہوتے ہیں جبکہ عوام پر اگر تھوڑی سی عنایت و نوازش بھی کی جائے تو وہ شکرگزاری اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔

(و) خواص کے یہاں مشکلات میں صبر و تحمل نہیں پایا جاتا جبکہ عوام صابر، باتحمل اور مشکلات سے نبرد آزما رہتے ہیں۔

(ی) خواص کو اگر بخشش و عطا کے ذریعہ نہ نوازا جائے تو وہ کوئی بھی عذر قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے جبکہ عوام سہل انگاری اور درگذر سے کام لیتے ہیں اور عذر قبول کر لیتے ہیں۔

اور مزید یہ کہ عوام ہمیشہ دین کے پشت پناہ، امت اسلامیہ کے ناصر و یاور اور دشمنوں کے مقابلہ میں سپر بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے، انھیں ان کے بنیادی حقوق دلا کر نیز ان کی خبرگیری کے ذریعہ اس عوامی طاقت کو محفوظ رکھنا چاہئے کیونکہ ایک الٰہی اور عوامی حکومت کا معیار یہ ہے کہ اس کا ارتباط عوامی دائرہ سے رہے نہ کہ صرف بعض خواص اور امراء سے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت امراء و رؤساء سے کوئی خصومت و دشمنی رکھتی ہے۔

کیونکہ کسی طرح کی بھی دشمنی یا خصومت اگر بلاوجہ ہے تو غلط اور قابل مذمت ہے۔ بلکہ یہ تو امراء و رؤسا کے گروہ کی خصلت ہے جو اس طرح کے اجتماعی و سیاسی نقطہ پر نظر آتا ہے۔ اور حکومت مجبور ہوتی ہے کہ ہر طبقہ کے ساتھ اس کے مناسب حال طرز اختیار کرے۔

مختصر یہ کہ اسلامی حکومت کو امت اور قوم کی ہر فرد کی صلاح و فلاح کے حق میں قدم اٹھانا چاہئے اور چونکہ ہر حال میں تمام افراد اور تمام طبقوں کی خوشنودی حاصل ہونا ناممکن ہے اس لئے کہ جب بھی کوئی اصلاحی کام شروع ہوگا تو فطری طور پر بعض لوگ اس سے راضی نہ ہوں گے۔ ایسی صورت میں حاکم یا ذمہ دار شخص کے لئے ضروری ہے کہ اس رخ کو اپنائے جس میں عام انسانوں کی فلاح اور بھلائی پائی جاتی ہو اور ان خواص کی ہٹ دھرمی یا ناراضگی کی پرواہ نہ کرے جو گنے چنے اور اقلیت میں ہیں۔

حکومت کا عوام کے ساتھ براہ راست ربط

اس سلسلہ میں پوری تاکید کی گئی ہے کہ حکومت اور اس کے ذمہ دار افراد عوام سے دور اور الگ تھلگ رہیں اور اپنے گرد کوئی ایسا حصار نہ قائم کریں کہ عوام ان تک اپنی بات نہ پہنچا سکیں۔ حکام اور عوام کے براہ راست تعلق و ارتباط سے بڑے مفید اثرات اور نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اول: خود یہ ارتباط محبت و یگانگت اور باہمی تفاہم کا سبب ہوگا۔

دوسرے: عوام کو یہ احساس ہوگا کہ انہیں کچھ سمجھا جا رہا ہے اور وقعت دی جا رہی ہے۔ اس طرح وہ اپنی شخصیت کو محسوس کریں گے۔

تیسرے: عوام اپنا دکھ درد اور اپنی مشکلات حاکم یا ذمہ دار شخص کے کانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اور درمیانی واسطے حقائق و واقعات میں تحریف کر کے بات بدل نہیں سکتے۔

حضرت علیؑ نے اپنے خطبوں اور مکتوبات میں اس حساس ترین نکتہ کی طرف بڑی تاکید فرمائی ہے۔ منجملہ آپؑ مکہ میں اپنے گورنر "قثم ابن عباسؓ" کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

امّا بعد، فاقم للنّاس الحجّ وذکّرهم بایّام اللّٰه واجلس لهم العصرین فافت المستفتی وعلّم الجاهل وذاکر العالم۔ ولایکن لک الی النّاس سفیر الّا لسانک ولا

حاجب الّا وجھک. ولا تحجبنّ ذاحاجۃ عن لقائک بہا فانّہا ان ذیدت عن ابوابک فی اوّل وردھا لم تحمد فیما بعدعلیٰ قضائہا۔"

(خط نمبر ۶۷)

"حمد وثنائے پروردگار کے بعد تم لوگوں کے لئے حج کی ادائیگی کا سروسامان کرو اور انہیں اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ ظہر و عصر کی نماز کے بعد لوگوں کے ساتھ بیٹھو اور ان کے دینی مسائل کا جواب دو۔ بے علم افراد کو تعلیم دو اور صاحبان علم سے بحث و گفتگو کرو۔ دیکھو تمہارے اور عوام کے درمیان تمہاری زبان کے علاوہ نہ کوئی اور نمائندہ ہو اور نہ تمہارے چہرہ کے علاوہ کوئی اور دربان۔ اور کسی صاحب حاجت سے اپنا چہرہ نہ چھپاؤ کیونکہ اگر اہل حاجت پہلی مرتبہ تمہارے دروازہ سے محروم واپس ہوا تو بعد میں اسے پورا کرنے کے بعد بھی تمہاری کوئی تعریف نہ کی جائے گی۔"

حکام اور عوام کے درمیان جدائی کے اثرات

مالک اشتر کے نام تحریر کردہ عہد نامہ میں حاکم یا ذمہ دار شخص کی عوام سے دوری یا جدائی کے اثرات کچھ اس طرح بیان ہوئے ہیں:۔

اما بعد، فلا تطولنّ احتجابک عن رعیّتک، فانّ احتجاب الولاۃ عن الرّعیۃ شعبۃ من الضّیق وقلّۃ علم بالامور والاحتجاب منہم یقطع عنہم علم ما احتجبوا دونہ فیصغر عندھم الکبیر ویعظم الصغیر ویقبح الحسن و یحسن القبیح و یشاب الحق بالباطل و انّما الوالی بشر لا یعرف ما تواریٰ عنہ الناس بہ من الامور ولیست علی الحق سمات تعرف بہ ضروب الصّدق من الکذب و انّما انت احد رجلین: امّا امرؤ سخت نفسک بالبذل

فی الحق. فضیم احتجابك من واجب حق تعطیه او فعل کریم تسدیه! او مبتلی بالمنع، فما اسرع کف الناس عن مسألتک اذا أیسوا من بذلك مع ان اکثر حاجات الناس الیك مما لا مئونة فیه علیک من شکاة مظلمة او طلب انصاف فی معاملة"

"اس کے بعد ایسا نہ ہو کہ عوام سے تمہاری دوری اور روپوشی زیادہ طول کھینچے کیونکہ حکام کی رعایا سے دوری ایک طرح کی دشواری اور معاملات سے بے خبری کا سبب ہوتی ہے جو ان پر اطلاعات و معلومات کے دروازے بند کردیتی ہے۔ نتیجہ میں حکام معمولی مسائل کو اہم اور بڑے مسائل کو چھوٹے اور معمولی سمجھنے لگتے ہیں۔ اچھائی برائی میں تبدیل ہوتی ہے اور برائی اچھائی بن جاتی ہے۔ حق باطل کے ساتھ خلط ملط ہوجاتا ہے۔ بلاشبہ حاکم بھی انسان ہی ہے، اگر وہ لوگوں کے مشکلات و مسائل سے دور رہا تو ان سے بے خبر رہ جائے گا اور حق کی کوئی مخصوص پہچان تو ہے نہیں جس سے لوگوں کے جھوٹ سچ میں تمیز ہوجائے۔ اور تم دو ہی طرح کے آدمی ہوسکتے ہو۔ یا تم حق کی ادائیگی کے سلسلہ میں سخاوت سے کام لیتے ہو ایسی صورت میں تمہیں حقوق کے ادا کرنے اور نیک کام کی انجام دہی سے گریز کی کیا ضرورت ہے؟ اور یا پھر تم بخیل ہو، ایسی صورت میں جب لوگ تمہاری عطا سے مایوس ہوجائیں گے تو تم سے سوال کرنا ہی چھوڑ دیں گے! جبکہ تم سے لوگوں کی اکثر حاجتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کچھ خرچ نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی ظلم کی شکایت یا کسی معاملہ میں انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اصل میں حکومتوں کے حالات اور عوام و رعایا کے معاملات میں خرابی کا خاص سبب یہ ہوتا ہے کہ حکام اور مملکت کے ذمہ دار افراد حقائق و واقعیات سے یا تو خود واقف ہونا نہیں چاہتے یا ہو نہیں پاتے۔ گنتی کے چند حاشیہ نشین، درباری اور قریب رہنے والے افراد حکام کے گرد حلقہ جائے ریشم کے کیڑے کے مانند انھیں اپنے گھیرے میں لئے رہتے ہیں۔ ان کی خوشنودی کے لئے انھیں جھوٹے اطمینان دلاتے رہتے ہیں، یا ان کے نزدیک اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لئے ان کاموں کی بھی تعریفیں کرتے ہیں جو سرے

انجام ہی نہیں پائے۔ رعایا کی ناراضگی کو الٹے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ حکمرانوں کا ذکر ہی نہیں کرتے کہ کہیں حکام کے مزاج پر اس کا برا اثر نہ ہو یہ وہی تنگنا ہے جس کی طرف امامؑ نے مذکورہ بالا خط میں اشارہ فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حکام کو اپنے حصاروں سے بہرحال باہر نکلنا چاہیئے واسطوں ذریعوں اور پردوں کو درمیان سے ہٹا کر رعایا کے درمیان آنا چاہیئے اور حالات سے براہ راست آگاہی حاصل کرنی چاہیئے۔ کارگزاروں کے ذریعہ پیش کی جانے والی اطلاعات اور اعداد و شمار کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔
حاکم کا فرض ہے کہ حالات و واقعات کو رعایا کی زبان سے سنے، ان کی مشکلات و شکایات پر توجہ دے اور ان کا حل تلاش کرے اور اگر کسی مسئلہ کو حل کرنے یا مشکل کو سلجھانے سے معذور ہو تو کم از کم ان کا دکھ درد سننے سے گریز نہ کرے اس لئے کہ یہ طریقہ بذات خود مصیبت زدہ افراد کی ذہنی الجھنوں میں کمی کا باعث ہوسکتا ہے کیونکہ جب وہ احساس کریں گے کہ ایک ذمہ دار شخص ہماری باتیں اور ہمارا دکھ سن رہا ہے تو ان کے دلوں میں امید کی کرن ضرور پھوٹے گی۔

کلام امامؑ کے اس مذکورہ بالا حصہ میں حکام اور ذمہ دار افراد کے لئے بے حد قیمتی ہدایات موجود ہیں جن سے سادگی کے ساتھ گزرا نہیں جا سکتا۔

اقتدار کے سایہ میں امید کی کرن

ایک دوسری جگہ اسی منشور میں ارشاد ہے:-

واجعل لذوي الحاجات منك قسماً تفرّغ لهم فيه شخصك وتجلس لهم مجلساً عامّاً فتتواضع فيه لله الذي خلقك وتقعد عنهم جندك وأعوانك من أحراسك وشرطك حتّى يكلّمك متكلّمهم غير متتعتع، فإنّي سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلّم يقول في غير موطن: "لن تقدّس أمّة لا يؤخذ للضعيف فيها حقّه من القويّ غير متتعتع" ثمّ احتمل الخرق منهم والعيّ ونحّ عنهم الضيق والأنف يبسط الله عليك بذلك أكناف رحمته، ويوجب لك ثواب

طاعتہ . واعط ما اعطیت هنیئاً . وامنع فی اجمال واعذار

"ضرورت مندوں اور اہل حاجت کے لئے اپنے اوقات کا ایک حصہ مخصوص کر دو اور ان کے ساتھ مجمع عام میں بیٹھو اور اس خدا کے لئے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ان کے ساتھ خضوع و فروتنی سے پیش آؤ۔ اپنے سپاہیوں، ماموروں، محافظوں اور محافظوں کو ان کے مجمع سے دور کر دو تاکہ وہ بے کھٹک اور بے خوف ہو کر تم سے باتیں کر سکیں کیونکہ میں نے رسول خدا سے سنا ہے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے "وہ قوم ہرگز قابل ستائش نہیں ہے جس میں ضعیف و کمزور کا حق طاقت ور سے بلا کسی خوف و خطر اور روک ٹوک کے نہ دلایا جائے" پھر اگر وہ غصہ ہوں یا اپنی بات اچھے الفاظ میں نہ کہہ سکیں تو اسے برداشت کرو اور بے صبری و لاپرواہی کو اپنے پاس نہ آنے دو۔ اس کے عوض خداوند عالم اپنی رحمتوں کا دامن تم پر پھیلا دے گا اور تمہاری اطاعت و فرمانبرداری کی جزا ضرور عطا فرمائے گا۔ اگر کچھ انہیں دو تو خندہ پیشانی کے ساتھ بخشو اور اگر نہ دے سکو تو ان سے اچھے انداز میں معذرت کر لو۔"

گویا امام علیہ السلام اپنے اس بیان میں خبردار کرتے ہیں کہ: ایسا بہت ہوتا ہے کہ حاشیہ نشین، محافظ اور نگہبان وغیرہ فریادیوں اور ظلم کے ماروں کو ذمہ دار حاکم تک پہنچنے اور اپنی مشکلات بیان کرنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یا یہ بے چارے ان کی موجودگی میں اپنے حاکم سے بے دھڑک گفتگو کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لہٰذا حکام کو چاہئے کہ نگہبانوں، دربانوں، محافظوں اور منشیوں کی نگاہوں سے دور عوام کے ساتھ بیٹھیں تاکہ وہ بے خوف ہو کر اپنے حق کا دفاع کر سکیں اور ضروری باتیں بیان کر سکیں اور اگر کہیں حاکم کے حاشیہ نشینوں کے ذریعہ ان پر ظلم ہوا ہے تو اسے حاکم بالا کے گوش گزار کر سکیں کیونکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہی حاشیہ نشین عوام کے لئے اور اسی کے نتیجہ میں حکومت کے لئے مشکلیں کھڑی کر دیتے ہیں۔

ایک دوسری بات جس کی طرف امامؑ نے توجہ دلائی ہے یہ ہے کہ: کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضرورت مند، اہل حاجت اور حکام کی طرف رجوع کرنے والے افراد اپنی پریشانیوں، دل تنگیوں اور الجھنوں کی وجہ سے حاکم سے گفتگو کے دوران غصہ میں آجاتے ہیں یا اپنی بات اچھی طرح سے بیان نہیں کر پاتے اور ان کی گفتگو اکتا دینے والی ہوتی ہے لہٰذا حاکم کا فرض ہے کہ وہ ان کے غصہ اور زبان کی لکنت وغیرہ کو برداشت کرے اور عوام کو اپنے حق کا دفاع کرنے کا حوصلہ بخشے انھیں پوری آزادی

دے اور اس کام میں خدا کی رضا اور آخرت کی جزا کو پیش نظر رکھے۔

ظلم و استبداد کے بجائے مفاہمت کا رابطہ

حکومت اور عوام کے درمیان رابطے سے متعلق ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس رابطے کی روح باہمی مفاہمت اور حسن نیت ہے نہ کہ ظلم و استبداد۔ حکومت اور عوام کے روابط پر حاوی اس روح کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ حکومت عوام کی جانب سے پیدا ہونے والے غلط فہمی یا مغالطے کو دور کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی مسئلہ عوام کے لئے مبہم اور غیر واضح ہو جو خود حکام اور ذمہ دار افراد سے ان کی بدبینی کا باعث ہو۔ ایسی صورت میں حکام کو چاہئے کہ عوام کے درمیان آئیں اور اس مسئلہ کی ضروری وضاحت فرمائیں اور اگر حق عوام کے ساتھ ہو تو اسے تسلیم کرنے اور قبول کرنے سے منہ نہ موڑیں۔ اس سلسلہ میں امامؑ مالک اشتر کو یہ ہدایت فرماتے ہیں:۔

"وان ظنّت الرعيّة بك حيفاً فاصحر لهم بعذرك، واعدل عنك ظنونهم باصحارك فانّ فی ذٰلك رياضة منك لنفسك ورفقاً برعيّتك واعذاراً تبلغ به حاجتك من تقويمهم على الحق۔"

"اور اگر عوام یہ گمان کرنے لگیں کہ تم نے ان پر ظلم کیا ہے تو اپنا عذر ان کے سامنے واضح کرو اور بات صاف کرتے ہوئے ان کی بدگمانی دور کرو کیوں کہ حقیقتاً اس کام میں تمہارے نفس کے لئے ریاضت اور نرمی ہے اور عوام کی تسکین خاطر، کہ اس وسیلہ سے تم اپنا مقصود یعنی راہ حق میں عوام کی استقامت و پائداری کو حاصل کرو گے۔"

امامؑ اپنے اس ارشاد میں حکام پر یہ فریضہ عائد کرتے ہیں کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں اور اگر کوئی قابل قبول عذر ہو تو اسے عوام کے سامنے بیان کردیں کیونکہ عوام کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والی یہ گتھیاں ایک نہ ایک دن شورش و بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوں گی اور ملک و حکومت کو مشکلات سے دوچار کردیں گی۔ آمرانہ حکومتی نظاموں میں رائج اصولوں کے برخلاف جن میں عوام کو کچل دینے اور ان کی زبانوں پر تالے لگا دینے کا طریقہ رائج ہے اور عوام کے ساتھ مفاہمت ان کے

یہاں کوئی مفہوم نہیں رکھتی" اسلام کے سیاسی نظام میں حسن تفاہم، مسئلہ کی معقول توجیہ، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور حق کو تسلیم کر لینے کی عادت کو بنیادی اصل و اساس کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلامی حکومت کو اسی اساس پر استوار ہونا چاہیے۔ عوام کے سلسلہ میں امامؑ کی سیرت یہی تھی۔ آپ ایک خطبہ میں حاکم اور ملت کے ایک دوسرے پر عائد ہونے والے حقوق کا تذکرہ کرتے ہیں اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے یوں خبردار کرتے ہیں :۔

تحکم ظالموں کا شیوہ

"فلا تکلمونی بما تکلم به الجبابرة، ولا تتحفظوا منی بما یتحفظ به عند اهل البادرة ولا تخالطونی بالمصانعة ولا تظنوا بی استثقالاً فی حق قیل لی، ولا التماس اعظام لنفسی فانه من استثقل الحق ان یقال له او العدل ان یعرض علیه، کان العمل بهما أثقل علیه"

(خطبہ / ۲۱۶)

"مجھ سے یوں کلام نہ کرو جس طرح ظالم و جابر حکمرانوں سے گفتگو کی جاتی ہے اور نہ مجھ سے یوں احتیاط برتو جس طرح غصہ ور افراد سے محتاط رہا جاتا ہے۔ مجھ سے کبھی خوشامد و چاپلوسی کے ساتھ میل جول پیدا نہ کرو یہ گمان نہ کرنا کہ حق کا قبول کرنا میرے لئے دشوار ہے اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری تعظیم و تکریم کی جائے۔ کیونکہ جس شخص کے لئے حق کا بیان کرنا دشوار ہو یا وہ عدل سے منہ موڑتا ہو، حق پر عمل کرنا اس کے لئے کہیں زیادہ سخت و دشوار ہوگا۔

یہاں امامؑ کا ارشاد اس قدر فیصلہ کن، محکم، آگاہ کرنے والا اور سبق آموز ہے کہ اس پر بحث یا اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ عالمی سیاست کی پوری تاریخ میں بعض الٰہی حکومتوں کے علاوہ کہیں اور ایسی ایک مثال بھی نہیں مل سکتی جہاں حاکم یا ذمہ دار شخص عوام سے ... کہ ... حکام اور ذمہ دار افراد کا رعب و دبدبہ ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے جو ... حقائق

بیان کرنے میں رکاوٹ بنے اور حق کا قبول کرنا ان کے لئے دشوار ہو کیونکہ ایسی صورت میں انھیں ناقابل کنٹرول اور ہولناک نتائج کا منتظر رہنا چاہئے۔ تنقید قبول کرنا، حق پر جمے رہنا، انصاف پسندی اور غلط کاریوں سے پرہیز، درحقیقت ظلم و استبداد، باطل نوازی، ستم پروری، غلط کاروں کے ساتھ رعایت اور خود پسندی کے سخت اور تلخ نتائج سے کہیں زیادہ قابل تحمل ہے۔

امامؑ کے ایک دوسرے کلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ معاہت کی اصل و بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لوگوں کو مخاطب فرماتے ہیں کہ وہ اپنے امام کے طرز عمل کا گہرائی کے ساتھ بغور جائزہ لیں اور اگر اسے تعاون کے لئے شائستہ، اہل اور لائق پائیں تو اس کی نصرت و مدد کی کوشش کریں۔ حق انتخاب اور غور و فکر کے سلسلہ میں عوام کو پوری آزادی بخشنے نیز ظلم و استبداد اور کج فہمی و ناسمجھی کو مذموم قرار دینے کی راہ میں حضرتؑ کی ہدایت و رہنمائی کا یہ ایک اور بے مثل نمونہ ہے۔ امام اپنے ایک مفصل خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

" فاذا رأیتم خیراً فاعینوا علیہ، واذا رأیتم شراً فاذھبوا عنہ فان رسول اللہ — صلی اللہ علیہ وآلہ — کان یقول : یا ابن آدم اعمل الخیر ودع الشر فاذا انت جواد قاصد "

(خطبہ: ۱۷۶)

"پس اے لوگو! اگر نیکی اور بھلائی کو دیکھو تو اسے تقویت پہنچاؤ اور اس کی مدد کرو اور اگر برائی دیکھو تو اس سے دور ہٹ جاؤ کیونکہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے : اے فرزند آدم! نیکو کار بن اور برائی سے پرہیز کر، اگر تو نے ایسا کیا تو نیک اور راست کردار رہے گا۔"

آپ ایک دوسری جگہ حکام اور عہدہ دار افراد کو عوام کے ساتھ مہربانی، ملائمت اور خوش روئی کا برتاؤ کرنے کی تاکید فرماتے ہیں جسے خود حکومت اور عوام کے درمیان بہترین رابطہ کا ایک راز کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اپنی بات کہنے کے لئے عوام کا حوصلہ بڑھانا اور ان کی یاد دہانیوں، مفید مشوروں اور شکایتوں کے سلسلہ میں حاکم کی طرف سے دلچسپی کا اظہار بھی حکومت اور عوام کے درمیان بہتر رابطہ کی کنجی ہے۔

جب آپؑ نے "محمد ابن ابی بکر" کو مصر کا گورنر بنایا تو ایک عہد نامہ کے ذیل میں انھیں یوں ہدایت فرمائی :-

"فاخفض لهم جناحك والن لهم جانبك وابسط لهم وجهك وآس بينهم فى اللحظة والنظرة، حتى لايطمع العظماء فى حيفك لهم، ولا ييأس الضعفاء من عدلك عليهم فان الله تعالىٰ يسائلكم معشر عباده عن الصغيرة من اعمالكم والكبيرة والظاهرة والمستورة، فان يعذب فانتم اظلم وان يعف فهو اكرم"

(خط نمبر ۲۷)

"لوگوں کے ساتھ فروتنی و مہربانی سے پیش آؤ اور ان سے نرمی و ملائمت کا برتاؤ کرو۔ ان کے سامنے اپنے چہرہ کو خوش حال اور شگفتہ رکھو اور ان پر برابری و مساوات کی نگاہ ڈالو تاکہ امیروں و رئیسوں کو تم سے ناانصافی کی توقع نہ رہے اور غریب و کمزور افراد عدل و انصاف سے مایوس نہ ہونے پائیں کیونکہ خداوند عالم تم سب بندوں سے تمہارے ہر چھوٹے بڑے، ظاہر بظاہر یا چھپا کر کئے جانے والے عمل سے متعلق باز پرس کرے گا۔ پس اگر وہ عذاب کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ظلم کیا ہے۔ اور اگر وہ عفو و بخشش سے کام لے تو وہ بہت کریم ہے۔"

اور جب حضرتؑ نے "عبداللہ ابن عباس" کو بصرہ کا نظم سنبھالنے کے لئے گورنر بنا کر روانہ کیا تو انھیں ایک مختصر دستور العمل کے ذیل میں یہ ہدایت فرمائی :

سع النّاس بوجهك ومجلسك وحكمك واياك والغضب فانه طيرة من الشيطان واعلم ان ما قرّبك من الله يباعدك من النّار وما باعدك من الله يقرّبك من النار"

(خط نمبر ۷۶)

لوگوں کو خندہ پیشانی کے ذریعہ نیز ان کے قریب بیٹھ کر اور ان کے ساتھ مروت و مہربانی کا برتاؤ کر کے خود سے قریب کرو۔ اور دیکھو غصہ سے پرہیز کرو کیونکہ اس راہ سے شیطان نفوذ کر سکتا ہے اور یہ جان لو کہ جو عمل تمہیں خدا سے نزدیک کرے گا جہنم کی آگ سے دور کرے گا اور جو عمل تمہیں خدا سے دور کرے گا جہنم کی آگ سے نزدیک کر دے گا۔"

ایک جگہ حضرتؑ اس مفاہمت و دوستی کی وجہیں بیان کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ باہمی مفاہمت اچانک اور اپنے آپ وجود میں نہیں آتی بلکہ حکام کو عوام کا اعتماد و اعتبار اور حسن ظن حاصل کرنے کے لئے احسان، خیراندیشی اور اچھے اخلاق کے ذریعہ مفاہمت کی زمین ہموار کرنی چاہئے۔ اپنے مشہور سیاسی منشور میں حضرتؑ مالک اشتر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"واعلم انّہ لیس شئ بادعیٰ الی حسن ظنّ راعٍ برعیّتہ من احسانہ الیھم وتخفیفہ المئونات علیھم وترک استکراھہ ایّاھم علیٰ مالیس لہ قبلھم، فلیکن منک فی ذالک امر یجتمع لک بہ حسن الظنّ برعیتکَ فانّ حسن الظنّ یقطع عنکَ نصبًا طویلاً، وانّ احقّ من حسن ظنّکَ بہ لمن حسن بلائکَ عندہ، وانّ احقّ من ساء ظنّکَ بہ لمن ساء بلائکَ عندہ"

"یہ جان لو کہ احسان، حسن سلوک، ٹیکسوں کی ادائیگی میں رعایت سے کام لینے، بے جا دباؤ اور زور زبردستی سے پرہیز کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو حکومت اور رعایا کے درمیان حسن ظن پیدا کرنے کا باعث ہو۔ لہٰذا ایسا کام انجام دو جو حکومت اور رعایا کے درمیان مفاہمت اور حسن ظن کا سبب بنے، کیونکہ یہ مفاہمت اور حسن ظن تمہارے کندھے سے بڑا بوجھ ہلکا کر دے گا۔ بلاشبہ تم اس شخص پر زیادہ اعتماد و بھروسہ کر سکو گے جس کے ساتھ تم نے حسن سلوک کیا ہے، اور اس شخص سے زیادہ بدگمان رہو گے جس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔"

اگر حکام یہ جاننا چاہیں کہ رعایا کے نزدیک ان کی کیا منزلت و حیثیت ہے تو یہ دیکھیں کہ رعایا کی انکی نگاہ میں کیا حیثیت ہے کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور دنیا کا نظام علت و معلول کا نظام ہے۔

(یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) رعایا اس حکومت کی ہرگز وفادار نہیں ہوگی جسکے عمل و اقدام میں صداقت وحمایت کے آثار نہ پائے۔ اور یہ وہ تلخ حقیقت ہے جسے حکام کو بہر حال قبول کرنا چاہئے۔

حکومت اور رعایا کا اخلاقی رابطہ

حکومت اور عوام یا رعایا کے درمیان پائے جانے والے روابط میں اس رابطہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو اخلاق، انسانی ہمدردی اور ایمانی اصول کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے، اور سیاسی ہم آہنگی کو مزید استحکام بخشتا ہے۔ اصولی طور پر چونکہ ایمان و اخلاق کی دنیا میں اور ایمان سے سرشار نظام میں معنویت ایک بنیادی اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ظاہری تزک بھڑک اور تصنع وبناوٹ خاطر خواہ اثر نہیں رکھتے، دوسری طرف سیاست و مدیریت ہے جو دین کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اسے دین سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ڈپلومیسی کے اصول اور سیاسی امور بذات خود ایسے خشک و بےجان ہوتے ہیں جو حکومت اور رعایا کے درمیان مستحکم ہم آہنگی کا محور اور اس کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ لہٰذا ان اصولوں کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ کے کلام میں اخلاقی اصول اور حکومت و رعایا کے درمیان پائے جانے والے رابطہ پر پڑنے والے ان کے اثرات سے متعلق مذکورہ بالا ارشادات کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جن میں سے یہاں ہم چند نمونوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"املك حمية انفك، وسورة حدك، وسطوة يدك، وغرب لسانك، واحترس من كل ذالك بكفّ البادرة وتاخير السّطوة حتّى يسكن غضبك فتملك الاختيار ولن تحكمَ ذالك من نفسك حتىٰ تكثر همومك بذكر المعاد الىٰ ربّك"

(خط/۵۳)

"اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے، غرور و نخوت، غیظ و غضب، ہاتھوں کی جنبش اور زبان کی تیزی سے بچو ان چیزوں سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لو اور سزا دینے یا فیصلہ کرنے میں تاخیر کرو یہاں تک کہ تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور تم

اپنے آپ پر قابو پالو، اور اس کام میں تم اپنے نفس پر اس وقت تک قابو نہیں پاسکتے جب تک تمہاری ساری فکر بعد قیامت اور اپنے خدا کی جانب بازگشت کی طرف متوجہ نہ ہو۔"

امام علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق نفس پر قابو، جلد بازی اور جذبات نیز نفسانی خواہشات پر قابو پالینا ہی پسندیدہ اخلاق کا اصل منبع و سرچشمہ ہیں اور نفس پر تسلط کی اساس و بنیاد مبدأ یعنی خدا اور معاد یعنی قیامت پر ایمان ہے۔ ایسا اخلاقی نظام ہی محکم و پائیدار ہو سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر حکومت و رعایا کے سیاسی روابط کے سلسلہ میں انحصار کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ بات پھر وہیں پہنچتی ہے کہ معاشرہ کے نظم و ضبط کی باگ ڈور صالح و مومن انسانوں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے، کیونکہ غیر صالح اور بے ایمان افراد سے اس سیرت اور اس سیاست کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ حضرتؑ کے مذکورہ بالا منشور میں ہی ایک جگہ آیا ہے:۔

وایاک والمن علی رعیتک باحسانک اوالتزید فیما کان من فعلک، اوان تعدھم فتتبع موعدک بخلفک، فان المن یبطل الاحسان، والتزید یذھب بنور الحق، والخلف یوجب المقت عند اللہ والناس. قال اللہ تعالیٰ "کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون"

"جو نیک سلوک تم نے رعایا کے ساتھ کیا ہے اس کا احسان جتانے اور اسے بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے سے پرہیز کرو اور وعدہ خلافی نہ کرو کیونکہ احسان جتانا اس اچھے عمل کی وقعت گرا دیتا ہے اور اپنے سلوک کو بڑا بنا کر پیش کرنا حق کے نور کو زائل کر دیتا ہے نیز وعدہ خلافی خدا اور عوام کے غیظ و غضب کا سبب بنتی ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے، یہ خدا کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے کہ جو تم کہتے ہو اس پر عمل نہیں کرتے۔"

آج دنیا میں رائج سیاسی اصولوں کی بنیاد یہی ہے کہ اگر ملت یا رعایا کے لئے کوئی کام کرتے ہیں تو اس پر احسان رکھ کر بیان کرتے ہیں اور خوب بڑھا چڑھا کر اس کا ذکر کرتے ہیں یا جھوٹے وعدوں کے ذریعہ عوام کو سرگرم رکھا جاتا ہے۔ یہ طریقے عوام اور قوموں و ملتوں کی نظر میں حکومتوں کی بے اعتباری

کا سبب بنتے ہیں۔ یہ وہی باتیں ہیں جن سے امامؑ نے روکا اور منع فرمایا ہے۔ الٰہی سیاست کو اس بنیاد پر عمل کرنا چاہئے کہ عوام اور حکومت کا اعتماد ایک دوسرے کے اوپر محکم و پائدار ہو اور خدا و خلق خدا کی خوشنودی نظام کی بقا کی پشت پناہ قرار پائے۔

رعایا کے ساتھ روابط میں اخلاقی اصولوں کی رعایت اس حد تک ضروری ہے کہ حاکم یا ذمہ دار شخص کو ایک مسلم اخلاق کی حیثیت سے اپنے ہمنشینوں اور تمام رعایا کے لئے نمونہ عمل ہونا چاہئے۔ وہ حاکم جس کی سیرت یا طرز عمل لوگوں پر براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہے اسے لوگوں کے ساتھ ایسی معاشرت رکھنی چاہئے کہ لوگ اس کے عمل سے اخلاق کا سبق حاصل کریں۔ امامؑ اپنے منشور میں مالک اشتر کو ہدایت فرماتے ہیں:۔

"ولیکن ابعد رعیتک منک و اشنأهم عندک اطلبهم لمعایب الناس، فانّ فی الناس عیوباً، الوالی احقّ من سترها، فلاتکشفنّ عمّا غاب عنک منها، فانّما علیک تطهیر ما ظهر لک و اللّٰه یحکم علیٰ ما غاب عنک فاستر العورة ما استطعت یستر اللّٰه منک ما تحب ستره من رعیتک۔ اطلق عن الناس عقدة کل حقد و اقطع عنک سبب کلّ وتر و تغاب عن کلّ ما لا یضح لک ولا تعجلنّ الی تصدیق ساع، فانّ الساعی غاشّ و ان تشبّه بالناصحین"

تم سے سب سے زیادہ دور اور ناپسندیدہ وہ شخص ہونا چاہئے جو لوگوں کی عیب جوئی میں لگا رہتا ہو، کیونکہ لوگوں میں عیب ہوتے ہی ہیں اور حاکم و والی ان کی پردہ پوشی کا سب سے زیادہ سزاوار ہے۔ پس پوشیدہ عیوب کو برملا نہ کرو اور جو عیب ظاہر ہو گئے ہیں ان کی بھی صفائی اور توجیہ کر دو۔ جو عیب پوشیدہ اور چھپے ہوئے ہیں ان کا فیصلہ خدا کے حوالہ کر دو اور جہاں تک ہو سکے دوسروں کے اسرار کو پوشیدہ رکھو تاکہ تم اپنے جن اسرار کو چھپانا چاہتے ہو اللہ انھیں پوشیدہ رکھے۔ لوگوں سے بغض و کینہ کی ہر گرہ کو کھول ڈالو اور اپنے انتقام کی ہر رسی کو کاٹ دو اور جو چیز تمہاری نظر میں درست نہ ہو اس سے دوری اختیار کرو۔ چغل خور کی باتوں کی جلدی سے تصدیق نہ کیا کرو

کیونکہ چغل خور فریب کار ہوتا ہے چاہے وہ ناصحوں کی شکل میں کیوں نہ آئے۔"[۴]

عوام کے حالات، خاص طور سے معاشرہ کے ضعیف و کمزور افراد کی رعایت اس قدر اہم ہے کہ نہ صرف اجتماعی قوانین اور احکام کے طرز عمل میں ان کے حق اور عدل کی رعایت ضروری ہے بلکہ عبادی و طاقتی امور جن کا تعلق صرف اللہ اور بندہ سے ہے ان پر بھی حتی الامکان اس طرح عمل ہو کہ کمزور و ضعیف ترین افراد کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

امام علیہ السلام مالک اشتر کو اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

واذا قمت فی صلوتک للناس فلا تکونن منفراً و لا مضیعاً فان فی الناس من بہ العلۃ ولہ الحاجۃ وقد سألت رسول اللہ ـ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حین وجہنی الی الیمن، کیف اصلی بہم؟ فقال: "صل بہم کصلاۃ اضعفہم وکن بالمؤمنین رحیما"

جب لوگوں کے ساتھ نماز کے لئے کھڑے ہو تو نہ اتنی طولانی نماز پڑھاؤ کہ بیزاری کا سبب بن جاؤ اور نہ اتنی جلد بازی دکھاؤ کہ نماز ہی ضائع کر دو۔ اس لئے کہ لوگوں میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو یا بیمار ہوں یا انھیں کوئی ضرورت درپیش ہو جب آنحضرتؐ نے مجھے یمن کی طرف روانہ فرمایا تھا تو میں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا تھا کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح نماز ادا کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ایسی نماز ادا کرو کہ ان میں کا ضعیف اور کمزور ترین شخص بھی تحمل کر لے اور مومنین کے ساتھ مہربان رہو"

حضرتؑ اپنے ایک دوسرے خط میں بعض شہروں کے حکام کو پابندی وقت کے ساتھ نماز کی ادائیگی سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

وصلوا بہم صلوۃ اضعفہم ولا تکونوا فتانین

(خط نمبر ۵۲)

"لوگوں کے ساتھ اس طرح نماز ادا کرو کہ ان میں کا کمزور ترین شخص بھی ادا کر سکے اور تم فتنہ و فساد کا سبب نہ بنو۔"

اقلیتوں کے ساتھ حکومت کا رابطہ

حکومت اور عوام کے روابط کے سلسلہ میں ایک بحث اور سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ رابطہ کی نوعیت کیا ہے۔ اس موضوع سے مربوط فقہ کے ابواب میں اس پر کافی بحث کی گئی ہے اور تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے جسے یہاں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ہم صرف امام علیہ السلام کا ایک خط نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو آپ نے اپنے ایک گورنر کو تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط حضرتؑ نے اس وقت تحریر فرمایا جب چند مشرک اور بقول شارحین آتش پرست کاشتکاروں و زمین داروں نے آپ کی خدمت میں شکایت کی تھی :-

اما بعد، فان دهاقين اهل بلدك شكوا منك غلظة وقسوة واحتقاراً وجفوة، ونظرت فلم ارهم اهلاً لان يدنوا لشركهم ولا ان يقصوا ويجفوا لعهدهم، فالبس لهم جلباباً من اللين تشوبه بطرف من الشدة، وداول لهم بين القسوة والرأفة وامزج لهم بين التقريب والادناء والابعاد والاقصاء. ان شاء الله

(خط نمبر ۱۹)

"خدا کی حمد و ستائش کے بعد، تمہارے شہر کے کاشتکاروں نے تمہاری سختی، سنگدلی، حقارت آمیز برتاؤ اور ظلم و تشدد کے رویہ کی شکایت کی ہے۔ میں نے اس کی تحقیق کی تو ان کو ان کے شرک کی بنا پر اس لائق بھی نہیں سمجھا کہ انھیں نزدیک کر لیا جائے اور نہ ہی اس معاہدہ کے پیش نظر جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کر رکھا انھیں دھتکارا اور لائق ظلم و ستم قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ان کے ساتھ نرمی و ملائمت کے ساتھ ہی ایسا برتاؤ کرو جس میں سختی کی جھلک بھی پائی جاتی ہو۔ اور ان کے ساتھ ایسی روش اختیار کرو جو سختی و نرمی کی درمیانی راہ ہو اور نزدیکی اور دوری کو سمو کر انھیں حد اعتدال پر رکھو۔"

اس خط میں چند نکتے قابل ذکر ہیں :-

۱۔ امامؑ نے اس شکایت کا بھرپور اثر لیا اور اس سے لاتعلقی و بے اعتنائی کا اظہار نہیں فرمایا، اور یہ بات خود حکومت کے ذمہ دار افراد کے لئے راہ نما ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے شرکائے کار اور ماتحتوں پر اعتماد رکھنے کی وجہ سے لوگوں کی درخواستوں اور شکایتوں پر کان ہی نہ دھریں اور انھیں خاطر میں نہ لائیں، اس طرح وہ عوام کے جذبات و احساسات کی توہین نہ کریں۔ چاہے شکایت کرنے والے آتش پرست ہی کیوں نہ ہوں۔

۲۔ اس شکایت کے بعد امامؑ مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں اور تحقیقات فرماتے ہیں۔ اور ان تحقیقات و اطلاعات کی روشنی میں ضروری اقدام فرماتے ہیں۔

۳۔ امامؑ کی ہدایت کے بموجب شکایت کرنے والے چونکہ مشرک ہیں لہٰذا حاکم یا ذمہ دار شخص سے اتنا زیادہ قریب نہ ہونے پائیں کہ نظام حکومت کا اعتبار ہی خطرہ میں پڑ جائے، لیکن چونکہ "ذمی" بھی ہیں اور مسلمانوں سے ایک معاہدہ رکھتے ہیں لہٰذا اسلامی حکومت پر لازم ہے کہ ان کی حمایت کرے اور انھیں ان کے عمومی مشترک حقوق دلائے منجملہ ان کے کام کی آزادی اور اجتماعی و اخلاقی عزت و وقار کا تحفظ وغیرہ۔

۴۔ اس ہدایت کے مطابق، اسلامی نظام کے ذمہ دار افراد کو بہت ہی نپا تلا، معتدل اخلاقی رویہ اختیار کرنا چاہئے اور امامؑ کی فرمائش کے پیش نظر لوگوں کو نہ اتنی چھوٹ دے دیں کہ وہ حکومت اور اس کے محترم قوانین کے سلسلہ میں جسور اور لاپرواہ ہو جائیں اور نہ سب سے اس طرح قطع تعلق کر لیں کہ اس سے عوام تنگدل اور نا امید ہو جائیں اور ان کے دلوں میں حاکم کی طرف سے بغض و کینہ پیدا ہو جائے۔

اگرچہ اس خط میں امامؑ کی ہدایت اسلامی معاشرہ میں رہنے والی اقلیتوں سے مخصوص ہیں لیکن وہ حصہ جو اخلاق سیاست اور حسن انتظام سے مربوط ہے اور جس میں میانہ روی اور عادلانہ روش اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ بہت سے مواقع پر وسیع انداز میں بھی ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور دوسرے گروہوں کو بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح ۔ حاکم نظام کو چاہئے کہ وہ سختی و نرمی کا ملا جلا انداز اپنائے اور ہر ایک کو موقع و محل کے لحاظ سے اختیار کرے کیونکہ نہ ہر جگہ غضب اور سختی اچھی ہے اور نہ ہر جگہ محبت و نرمی۔ یعنی ؎

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامی دارد



تہمت

جناب ناصر باقری بید ہندی

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

تہمت کے معنی

تہمت کا مطلب کسی شخص کی جانب کسی ایسے عیب یا خیانت کی نسبت دینا جس سے وہ منزہ و پاک ہو مثلاً: کسی پاک دامن عورت کی طرف زنا کی نسبت دینا یا کسی دین دار جوان کو بے دین و لاآبالی قرار دینا.....

یا بالفرض اگر کسی شخص میں تکبر، حسد، چاپلوسی اور ریا وغیرہ جیسے بُرے صفات نہ ہوں.... اور وہ ہرگز اس طرح کے گناہوں کا مرتکب نہ ہوا ہو اگر کوئی ایسے شخص کو متکبر، حاسد چاپلوس اور ریا کار بتائے تو اس نے اس پر تہمت یا بہتان لگایا ہے[1]

اہل بیت عصمت و طہارت سے مروی روایات میں بہتان اور غیبت[2] اس کے فرق کو بیان کیا گیا ہے، یہاں ہم نمونہ کے طور پر چند روایتیں پیش کرتے ہیں۔

---

[1] علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں بہتان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: لفظ بہتان افتراء کے معنی میں ہے اور اس کو بہتان اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ مورد افتراء شخص کو مبہوت کر دیتا ہے۔ صاحب "مفردات" کہتے ہیں کہ بہتان[2] دوسرے کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا ہے جو اسے مبہوت و متحیر کر دیتی ہے۔ اور شیخ ابوالفتوح رازی اپنی تفسیر میں[3] کہتے ہیں، بہتان ایسا جھوٹ ہے کہ جس پر لگایا جائے اس کا سننے والا مبہوت و متحیر رہ جائے۔

۱۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: والبهتان ان تقول فيه [اى فى اخيك] ماليس فيه[1]۔
یعنی تہمت کا مطلب ہے اپنے دینی بھائی کو ان چیزوں یا ان باتوں سے منسوب کرنا جن سے اس کا دامن پاک ہو۔

۲۔ امام کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں: من ذكر رجلاً من خلفه بما هو فيه عرفه الناس لم يغتبه، ومن ذكر من خلفه بما هو فيه ممّا لايعرفه الناس فقد اغتابه ومن ذكره بماليس فيه فقد بهته[2]
یعنی کوئی شخص کسی کی عدم موجودگی میں اس کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت دے جو اس میں موجود ہو اور لوگ بھی اس سے واقف ہوں تو یہ عمل غیبت شمار نہیں ہوتا، لیکن اگر لوگ اس سے واقف نہ ہوں تو غیبت شمار ہوتا ہے اور اگر اس کی عدم موجودگی میں اس کی طرف ایسی چیز کی نسبت دی جائے جو اس میں نہ ہو تو یہ بہتان ہوتا ہے۔

۳۔ پیغمبر اکرمؐ سے یہ روایت نقل ہوئی ہے ...... "واذا ذكرته [اى اخاك] بماليس فيه فقد بهتّه[3]" "اور اگر تم نے اپنے بھائی کے لئے ایسی بات کہی جو اس میں نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔"

۴۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں "انّ البهتان ان تقول فى اخيك ماليس فيه[4]" اپنے دینی بھائی کے سلسلہ میں ایسی بات کہنا جو اس میں نہ پائی جائے بہتان ہے۔

جھوٹ، افتراء اور بہتان میں فرق:

جھوٹ اس خبر کو کہتے ہیں جس کا حقیقت سے کوئی میل نہ ہو، اور دوسرے کی طرف کسی ایسی چیز کی غلط نسبت کو افتراء کہتے ہیں جس سے وہ شخص راضی نہ ہو، جھوٹ کبھی خود بولنے والے پر بھی صادق آتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے فلاں کام انجام دے دیا اور حقیقتاً اس نے وہ کام

[1] وسائل الشیعہ، ج ۲، ص ۲۳۸، وافی، ج ۳، ص ۱۶۳
[2] وافی، ج ۳، ص ۱۶۲
[3] وسائل الشیعہ ج ۲، ص ۲۳۹
[4] تحف العقول ص ۲۹۸

انجام نہ دیا ہو تو کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے لیکن یہ نہیں کہتے کہ وہ افترا باندھ رہا ہے۔ یوں ہی کسی شخص کی ایسی خصوصیت و صفت کے ساتھ مدح و ثنا کرنا جو اس میں نہ ہو جھوٹ شمار ہوتا ہے لیکن اسے افترا نہیں کہتے۔ اس کے علاوہ اکثر اوقات جھوٹ جائز اور سزاوار بھی شمار ہوتا ہے۔ مثلاً جنگ میں جھوٹ سے کام لینا، دو افراد کے درمیان صلح و صفا پیدا کرنے کے لئے جھوٹ بولنا یا بیوی اور بچوں سے مصلحت آمیز جھوٹا وعدہ کرنا، اس کے برخلاف افتراء ہرگز جائز نہیں ہے، سوائے اس ایک موقع کے جب واجب اہم اور افتراء کی حرمت میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔

لیکن بہتان کا مطلب ہے کبر و نخوت یا لڑائی جھگڑے کی بنا پر کسی کی طرف ایسی چیز کی نسبت دینا جو اس میں نہ ہو، چاہے یہ نسبت متہم شخص کی عدم موجودگی میں اس کی طرف دی گئی ہو یا اس کے روبرو۔

تہمت اور بہتان قرآن میں

لفظ تہمت قرآن میں استعمال نہیں ہوا ہے لیکن بہتان کا لفظ ان چھ آیتوں میں جن کا ہم آگے ذکر کریں گے صراحت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ ان چھ آیتوں کے علاوہ دوسری آیتیں بھی موجود ہیں جن میں اگرچہ صراحت کے ساتھ اس لفظ کا ذکر نہیں ہے لیکن ان میں اس کا مفہوم موجود ہے۔ ان میں سے بعض آیتوں کی طرف ہم تہمت کے اقسام کی بحث میں اشارہ کریں گے۔

۱۔ مَّا یَکُونُ لَنَا اَن نَّتَکَلَّمَ بِهٰذَا سُبحَانَکَ هٰذَا بُهتَانٌ عَظِیمٌ" (نور/۱۶)

یعنی ..... ہمارے لئے ایسی بات منہ سے نکالنا سزاوار نہیں ہے اور یہ عظیم بہتان اور سراسر تہمت ہے۔

۲۔ .... وَلَا یَأتِینَ بِبُهتَانٍ یَفتَرِینَهُ بَینَ اَیدِیهِنَّ وَاَرجُلِهِنَّ (ممتحنہ/۱۲)

یعنی ..... وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان سے کوئی ایسا بہتان نہیں باندھیں۔

مطلب یہ ہے کہ کسی غیر حلالی بچہ کو اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان پال کر اسے اس کے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نسبت نہ دیں، یا کسی بچہ کو راستہ سے اٹھا کر لے آئیں اور اپنے شوہر سے نہ کہیں کہ یہ تمہارا بچہ ہے اور میرے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان سے پیدا ہوا ہے۔ اس آیت کے دوسرے احتمالات بھی دیئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں تفسیر تبیان ج ۹ ص ۵۸۶ اور تفسیر شبر ص ۵۱۴ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ فلا تاخذوا منه شيئا اتاخذونه بهتانا واثما مبينا (نساء/۲۰)

یعنی جن بیویوں کو تم طلاق دینا چاہتے ہو اور ان کے بجائے دوسری عورتوں سے ازدواج کرنا چاہتے ہو تو ان کے مہر میں سے کچھ کم نہ کرو۔ کیا تم ان پر تہمت لگا کر اور کھلے ہوئے گناہ کے ذریعہ ان کے مہروں سے کچھ کم کرنا چاہتے ہو؟

جاہلیت میں معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیکر دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا تو اپنی پہلی بیوی پر تہمت لگا کر اسے مہر کے کچھ حصے سے چشم پوشی پر مجبور کر کے طلاق وجدائی پر راضی کرتا تھا اور اسی پیسے سے دوسری بیوی کا خرچ پورا کرتا تھا خداوند عالم مذکورہ بالا آیت کے ذریعہ اس عمل کو منع کرتا ہے اور ایسا کام کرنے والے کی شدید توبیخ فرماتا ہے۔ انکاری ہمزۂ استفہام جو اس آیت میں ذکر ہوا ہے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔

۴۔ فقد احتمل بهتانا واثما مبينا (نساء/۱۱۲)

یعنی وہ [جو کسی کی طرف جھوٹے گناہ کی نسبت دے] بہتان اور آشکار گناہ کا مرتکب ہوا ہے

۵۔ وبكفرهم وقولهم على مريم بهتانا عظيما (نساء/۱۵۶)

یعنی اپنے کفر اور اس بڑی تہمت کے سبب جو انہوں نے جناب مریمؑ پر لگائی خداوند عالم ان کے دلوں پر کفر و عصیان کی مہر لگا دی کہ اب وہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے [1]

۶۔ والذين يؤذون المؤمنين والمؤمنات بغير ما اكتسبوا فقد احتملوا بهتانا واثما مبينا (احزاب/آیت ۵۸)

جو لوگ اہل ایمان مردوں اور عورتوں پر ایسے عمل کی تہمت لگا کر انہیں اذیت پہنچائیں جسے انہوں نے انجام نہ دیا ہو تو وہ بہتان اور بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

بقول مجاہد: یعنی ان پر بہتان لگائیں اور ایسے کام کا الزام لگائیں جو انہوں نے نہ کیا ہو [2]

تہمت اسلام میں گناہ کبیرہ

تہمت یا بہتان بذات خود ایک ترکیبی کیفیت رکھتا ہے۔ اس طرح کہ یہ خود دو بڑے گناہوں

---

[1] مذکورہ آیت کے ذیل میں تفسیر سید عبداللہ شبر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] روض الجنان وروح الجنان فی تفسیر القرآن ۱۶۵ ص۳۰ -

سے تشکیل پاتا ہے۔ ایک جھوٹ اور دوسرے لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلنا۔ لہٰذا اسلام نے اس عمل کے مرتکب کی شدید مذمت کی ہے اور اسے بہت عظیم اور کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔

شہید محراب آیت اللہ دستغیب شیرازی اپنی گراں قدر کتاب "گناہان کبیرہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"تمام گناہان کبیرہ میں سے ایک گناہ جس کا گناہ کبیرہ ہونا اولویت کی بنیاد پر قطعی ثابت ہے بہتان ہے۔ یعنی دوسرے پر کسی چیز یا کسی عیب کی نسبت دینا جو اس میں نہ ہو، کیونکہ جہاں غیبت کرنا یعنی دوسرے کے اس عیب کا ذکر جو اس میں موجود ہے، گناہ کبیرہ ہے وہاں بہتان یعنی اس عیب کا ذکر جو اس میں نہیں ہے بدرجۂ اولیٰ اور عقل کے قطعی حکم کے مطابق گناہ کبیرہ ہوگا، بلکہ بہتان دو گناہ کبیرہ پر مشتمل ہے: غیبت اور جھوٹ[1]"

تہمت شیعہ روایات میں

قرآن شریف کی آیات [چاہے وہ آیتیں جن میں لفظ بہتان صراحت کے ساتھ آیا ہے یا وہ آیتیں جن میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہے] تہمت کی صرف بعض جہتوں اور اور اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اس کے ان دیگر پہلوؤں کو جن کی طرف قرآنی آیات نے اشارہ نہیں کیا ہے، اہل بیت عصمت و طہارت سے وارد روایات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم ذیل میں شیعہ احادیث کے مجموعوں میں موجود تہمت سے متعلق روایات کا ایک بڑا حصہ نقل کرتے ہیں:۔

۱۔ من بهت مؤمنا او مؤمنة اوقال فيه ماليس فيه اقامه الله على تل من نار حتى يخرج مما قال فيه[2]

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: جو شخص کسی مومن مرد یا عورت پر تہمت لگائے یا اس کے بارے میں ایسی بات کہے جو اس میں نہیں ہے خداوند عالم اسے آگ کی چوٹی پر کھڑا کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے کہے کا انجام دیکھ لے۔

۲۔ اذا اتهم المؤمن اخاه انماث الایمان من قلبه کما ینماث الملح فی الماء[3]

---

[1] گناہان کبیرہ ج ۲ ص ۵۴۳ [2] جامع السعادات ج ۲ ص ۲۱۵، سفینۃ البحار ج ۱ ص ۱۱۱، بحار الانوار ج ۷۲ ص ۱۹۴، صحیفۃ الرضا ص ۴، کنز العمال ج ۳ ص ۵۳۶، وسائل ج ۸ ص ۶۰۳، میزان الحکمۃ ج ۱۲، ۱۹۹۱/۲ [3] اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۱ باب التہمۃ و سوء الظن، وسائل ج ۸ باب التہمۃ و سوء الظن کتاب العشرۃ ص ۶۱۳، ج ۲ ص ۶۱۲، میزان الحکمۃ ج ۱ ص ۵۴۰ حدیث ۲۱۰۵ نقل از کافی

امام صادقؑ نے فرمایا، جب ایک مومن اپنے دینی بھائی پر تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس طرح اس کے قلب سے مکمل کر ختم ہو جاتا ہے جیسے پانی میں نمک"

۳۔ من بھت مؤمنا او مومنة بمالیس فیه بعثه الله عز وجل فی طینة خبال حتیٰ یخرج مما قال، قال، قلت وما طینة خبال؟ قال صدید یخرج من فروج المؤمسات

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص کسی مومن یا مومنہ پر ایسا بہتان لگائے جو اس میں نہ ہو تو خداوند عالم اسے محشر میں طینت خبال کے اندر اٹھائے گا اور اسی حال پر باقی رکھے گا یہاں تک کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس سے عہدہ برآ ہو جائے۔ راوی نے کہا میں نے دریافت کیا کہ یہ طینت خبال کیا ہے؟ فرمایا: وہ مواد اور خون جو فاحشہ اور بدکار عورتوں کی شرمگاہوں سے نکلتا ہے۔

۴۔ من قال فی مؤمن ما لیس فیه حبسه الله فی طینة خبال حتیٰ یخرج مما قال فیه (وقال) انما الغیبة ان تقول فی اخیک ما هو فیه مما قد ستره الله عز وجل فاذا قلت فیه ما لیس فیه فذلک قول الله عز وجل فی کتابه: فقد احتمل بهتانا و اثما مبینا۔[2]"

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص کسی مومن کے بارے میں ایسی بات کہے جو اس میں نہیں ہے تو خداوند عالم اسے طینت خبال میں قید کر دے گا یہاں تک کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس سے خارج ہو جائے (اور فرمایا) غیبت یہ ہے کہ تم اپنے مومن بھائی کے بارے میں ایسی بات کہو جو اس میں ہو اور خداوند عالم نے اسے دوسروں سے پوشیدہ رکھا ہو۔ اور اگر ایسی بات کہو جو اس میں نہ ہو تو تم نے اس پر تہمت لگائی ہے کہ خداوند عالم اس سلسلہ میں قرآن مجید میں فرماتا ہے "پس اس نے بہتان کا ارتکاب کیا ہے اور بہت بڑا گناہ اپنے اوپر لاد لیا ہے۔

۵۔ البهتان علی البریٔ اثقل من جبال راسیات[3]"

امام صادقؑ ایک حکیم و فلسفی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک بے گناہ مومن پر تہمت لگانا عظیم اور پائدار پہاڑوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

---

[1] جامع السعادات ج ۲ ص ۳۱۵، وسائل ج ۲ ص ۲۳۸، اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۱، بحار الانوار ج ۱۶ ص ۱۷۰ [2] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۵
[3] سفینۃ البحار ج ۱ مادہ بھت، بحار الانوار ج ۱۶ ص ۱۷۰ یہی مطلب بحار الانوار ج ۸ ص ۲ اور "ارشاد القلوب" ص ۳۱۹ کی روایت میں اعظم من السماء مکان "اثقل من جبال راسیات" آیا ہے اور کنز العمال نیز کشف الاسرار ج ۶ ص ۵۰۵۔

۶۔ من قال فی مومن ما لا رأته عیناه ولا سمعته اذناه کان من الذین قال اللّٰه عزّ وجلّ: ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا لھم عذاب الیم[۱]

اگر کوئی شخص کسی مومن کے بارے میں ایسی بات کہے جسے اس کی آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور اس کے کانوں نے نہ سنا ہو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے: "جو لوگ برے اور ناپسند کاموں کو مومنین کے درمیان رائج کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔[۲]

۷۔ اتقوا مواضع الریب ولا یقفن احدکم مع امه فی الطریق فانه لیس کل احد یعرفها[۳]"

امام صادقؑ نے فرمایا: ایسی جگہوں سے پرہیز کرو جو دوسروں کی نگاہ میں تمہاری طرف سے سوءظن و بدگمانی کا سبب ہوں۔ اور تم میں سے کوئی بھی اپنی ماں کے ہمراہ راستہ میں کھڑا نہ ہو، کیونکہ ہر شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ تمہاری ماں ہے۔

۸۔ "ومن ذکر [ای الرجل] بما لیس فیه فقد بهته[۴]"

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا: اگر کسی شخص کے بارے میں ایسی بات بیان کی جائے جو اس میں نہ ہو تو اس عمل کو بہتمت کہتے ہیں۔

۹۔ من اتهم اخاه فی دینه فلا حرمة بینهما[۵]

امام صادقؑ نے فرمایا: جو شخص اپنے مومن بھائی پر اس کے دین میں اتہام لگائے پھر ان دونوں کے درمیان کوئی احترام باقی نہیں رہ جاتا۔

۱۰۔ لیس لك ان تتهم من قد ائتمنته[۶]

تمہیں حق نہیں ہے کہ جسے تم نے قابل اطمینان سمجھا ہو اس پر اتہام لگاؤ۔

۔۔۔ کی روایت میں "اثقل من السماوات" مکانہ ہے

استاد سید رضا صدر اپنی کتاب میں اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: امام کسی حکیم و فلسفی سے اگر کوئی کلام نقل کرتے ہیں اسے انبیاء الٰہی کی ایک فرد ہونا چاہیے۔ میزان الحکمہ ج ۱ ص ۱۹۶ نقل از بحار

[۱] نور الثقلین، ج ۳ ص ۵۸۳ نقل از تفسیر قمی [۲] بحار الانوار ج ۷۵ ص ۹۱

[۳] وافی ج ۳ ص ۱۲۳، وسائل، کتاب الحج [۴] اصول کافی ج ۲، باب التهمة [۶] بحار الانوار ج ۷۵ ص ۹۲

۱۱ــــ المومن لا یعیب اخاہ ولا یتہمہ[۱]

مومن اپنے دینی بھائی کے لئے کوئی عیب روا نہیں رکھتا اور اس پر تہمت نہیں لگاتا۔

۱۲ــــ اولی الناس بالتہمۃ من جالس اہل التہمۃ[۲]

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: تہمت کا سب سے زیادہ نشانہ وہ شخص ہے جو اہل تہمت کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو۔

۱۳ــــ سئل امیر المومنینؑ: کم بین الحق والباطل؟ فقال اربع اصابع ووضع یدہ علی اذنہ وعینیہ فقال: ما رأتہ عیناک فہو حق وما سمعتہ اذناک فاکثرہ باطل"[۳]

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ حق اور باطل کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چار انگل کا پھر اپنی چاروں انگلیوں کو کان اور آنکھ کے درمیان رکھا اور فرمایا: جو کچھ تم آنکھ سے دیکھتے ہو حق ہے اور جو کچھ اپنے کانوں سے سنتے ہو اس میں زیادہ تر باطل ہے۔

۱۴ــــ من دخل موضعاً من مواضع التہمۃ فاتہم فلا یلومن الا نفسہ[۴]

امام صادقؑ نے فرمایا: جو شخص تہمت کی جگہوں میں سے کسی جگہ داخل ہو اور وہ مورد تہمت قرار پایا اب وہ اپنے علاوہ کسی اور کو سرزنش نہ کرے

۱۵ــــ "من یصحب صاحب السوء لا یسلم ومن یدخل مداخل السوء یتہم ومن لا یملک لسانہ یندم۔"[۵] امام باقرؑ نے فرمایا: جو کسی برے کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے محفوظ نہیں رہتا اور جو برے مکانوں میں داخل ہوتا ہے تہمت کا نشانہ بنتا ہے اور جو اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا شرمندہ ہوتا ہے

۱۶ــــ ایاک ومواطن التہمۃ والمجلس المظنون بہ السوء فان جلیس السوء یغر جلیسہ[۶] " امیر المومنینؑ نے فرمایا: تہمت کے مقامات پر آنے جانے اور بدظنی پیدا کرنے والی نشستوں سے دور رہو، غلط ہم نشین ہمیشہ اپنے دوست کو فریب دیتا ہے

---

[۱] قصار الجمل ج ۱، حرف التاء، التہمۃ ص۸۱ [۲] قصار الجمل ج ۱ حرف التاء، التہمۃ ص۸۱

[۳] بحار الانوار ج ۵ ص ۱۵۹، قصار الجمل، ج ۱ ص۸۱

[۴] قصار الجمل ج ۱ ص۸۱، اس حدیث کا مضمون شعر اور لسعہ میں بیان ہوا ہے اور تہمت شعر کے قالب میں ذکر ہوئی ہے۔

[۵] قصار الجمل ج ۱ ص۸۱، بحار الانوار ج ۶۸ ص ۲۲۹ منقول از خصال ج ۱ ص۸۰ [۶] بحار الانوار ج ۷۵ ص۹۰

۱۷۔ من عرّض نفسه للتهمة فلا يلومنّ من اساء به الظنّ ومن كتم سرّه كانت الخيرة بيده[۱] امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: جس شخص نے خود اپنے آپ کو معرض تہمت میں ڈالا، وہ جس شخص سے بدگمان ہو اسے سرزنش نہ کرے اور جس شخص نے اپنا راز دوسروں سے پوشیدہ رکھا، وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔

۱۸۔ "ملعون، ملعون من اتّهم اخاه"[۲] امام رضاؑ نے فرمایا: ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جو اپنے بھائی پر تہمت لگائے۔

۱۹۔ من دخل مداخل السوء اتّهم[۳] حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا: جو شخص فحش اور فساد کی محفلوں میں داخل ہوا مورد الزام قرار پایا۔

۲۰۔ ملعون ملعون من رمیٰ مؤمنا بکفر ومن رمیٰ مومناً بکفر فهو کقتله[۴] امام صادقؑ نے فرمایا: ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جو اپنے مومن بھائی پر کفر کی تہمت لگائے اور جو اپنے مومن بھائی پر کفر کی تہمت لگائے وہ ایسا ہے جیسے اس نے اسے قتل کر دیا ہو۔

۲۱۔ لاخیر فی الکذّابین ولا فی العلماء الافّاکین[۵]۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جھوٹ بولنے والوں میں اور تہمت لگانے والے علماء میں کوئی خیر نہیں پایا جاتا۔

۲۲۔ "من رمی الناس بما فیهم رموه بما لیس فیه"[۶] امام زین العابدینؑ نے فرمایا: جو شخص لوگوں کے اندر پائے جانے والے عیوب کو بیان کرے تو لوگ اس پر ان چیزوں کی بھی تہمت لگا دیتے ہیں جو اس میں نہیں پائی جاتیں۔

۲۳۔ من قال فی امرء مسلم ما لیس فیه لیؤذیه حبسه الله فی ردغة الخبال یوم القیامة حتی یقضی بین الناس[۷]" پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کے سلسلے میں ایسی بات جو اس میں نہیں پائی جاتی اذیت پہنچانے کی نیت سے کہے خداوند عالم قیامت کے دن اسے ردغۃ الخبال (خون اور مواد کے کیچڑ) میں اتنی دیر تک قید رکھے گا کہ تمام لوگوں کا حساب و کتاب ہو جائے۔

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۸، ۵۰۱ حدیث ۱، قصار الجمل، بحار الانوار، ج ۵، ص ۵۹، نہج البلاغہ، کلمات قصار ۱۵۴

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۲، ص ۲۳۱ ۳۔ غرر الحکم، ج ۲، ص ۶۱۶، بحار الانوار ج ۵، ص ۹۱ ۴۔ سفینۃ البحار، مادہ کفر

۵۔ غرر الحکم، ج ۵، ص ۵۵۵ ۶۔ بحار الانوار، ج ۸، ص ۲۳ ۷۔ کنز العمال، نقل از میزان الحکمہ، ج ۱ حدیث ۱۹۹۳ ص ۵۰۳

۲۴۔ من وقف نفسہ موقف التہمۃ فلا یلومن من اساء بہ الظن[1]

حضرت امیر المؤمنینؑ نے فرمایا: جو شخص اپنے آپ کو معرضِ تہمت میں قرار دیتا ہے تو جس وہ بدظنی ہے اسے سرزنش نہ کرے۔

۲۵۔ "الا اخبرکم بشرار رجالکم؟ قلنا بلیٰ یا رسول اللہ، قال: انّ من شرار رجالکم البہات الجری الفاحش الاکل وحدہ والمانع رفدہ، والضارب عبدہ، والملجی عیالہ الی غیرہ[2]"

"رسول خداؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں تم میں سے بدترین افراد کے بارے میں خبر نہ دوں؟ ہم نے کہا یا رسول اللہؐ فرمائیے، فرمایا: تم میں بدترین شخص وہ ہے جو تہمت لگانے میں جسور اور دریدہ دہن ہے، جو تنہا کھانا کھاتا ہے جو دوسروں کی مدد میں روک لگاتا ہے، جو اپنے غلام کو اذیت و تکلیف پہنچاتا ہے اور جو اپنی بیوی کو دوسرے کے حوالہ کرتا ہے۔"

۲۶۔ "لایزال المسروق منہ فی تہمۃ من ھو بریٔ حتیٰ یکون اعظم جرماً من السارق[3]"

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: جس شخص کا مال چوری گیا ہو اکثر وہ چوری نہ کرنے والوں پر ایسی تہمت لگاتا ہے کہ اس کا جرم چور سے بھی زیادہ سنگین ہوجاتا ہے۔

۲۷۔ "اقبح شئی الافک[4]"

حضرت علیؑ نے فرمایا: دوسروں پر تہمت لگانا بدترین گناہوں میں سے ہے۔

میرا خیال ہے کہ جو افراد تہمت جیسے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ان کی ہدایت کے لئے اس قدر روایات کافی ہیں۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۸، ص ۱۶۰ [2] بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۱۱۵ نقل از کافی ج ۲، ص ۲۹۲ [3] درِ گہر، ص ۱۲۱

[4] از کلمات قصار حضرت امیرؑ ص ۹۵۔

ہے بہتان سے دور مرد خدا ⁂ صداقت ہے اس شخص کی رہنما
نہیں ہے کوئی اس سے عادت بری ⁂ کہ ہے یہ دلِ متہم پر چھری

رسول اسلام

روایات کی روشنی میں

(۵)

علامہ طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

خلوت کے آداب

شہید ثانیؒ نے شرح نفلیہ میں روایت کی ہے کسی نے حضورؐ کو رفع حاجت کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا[1]۔ اسی طرح جعفریات میں امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آبائے طاہرینؑ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی رفع حاجت کرنا چاہتے تھے اپنا سر کسی چیز سے ڈھانک لیتے تھے اور قضائے حاجت کے بعد مٹی میں چھپا دیتے تھے اسی طرح اپنا لعاب دہن بھی مٹی سے ڈھک دیا کرتے تھے اور جب کبھی استنجاء کے لئے جاتے اپنا سر ڈھانک لیتے تھے[2]

کافی میں حسین ابن خالد امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: میں نے روایت میں دیکھا ہے کہ استنجاء کرتے وقت بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں انگوٹھی ہوتی تھی اور امیر المومنین علیہ السلام بھی ایسا ہی کرتے تھے جبکہ رسول خدا صلعم

---

[1] شرح النفلیہ

[2] جعفریات ص ۳۰

کی انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" نقش تھا۔ آیا یہ روایت صحیح ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں، میں نے عرض کیا، کیا ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ حضرات داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے رہے ہیں اور تم بائیں ہاتھ میں.... تا آخر[1]

صبر و تحمل کا انداز

صاحب مکارم الاخلاق روایت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ جب کبھی اپنے اندر معمولی سا بھی جوش پیدا ہوتے دیکھتے خدا کی بارگاہ میں پناہ طلب کرتے ہوئے اس کے مقابل سکینی و حقارت کا اظہار کرتے اور خود کو اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ آپؐ کی خدمت میں لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ معمولی سا جوش و غصہ کوئی قابل اعتنا چیز نہیں ہے تو حضورؐ فرماتے تھے: ٹھیک ہے لیکن خدا اگر چھوٹے غم کو بڑا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے جس طرح کہ وہ اگر بڑے غم کو چھوٹا کرنا چاہے تو اس کی بھی قدرت رکھتا ہے۔[2]

تشییع جنازہ کا طریقہ

کافی میں جناب جابر امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: سنت ہے کہ تابوت کو چار طرف سے کاندھوں پر اٹھائیں اور دوسرے اطراف (اغل بغل) سے بھی اٹھانا چاہیں تو مستحب ہے۔[3]

قرب الاسناد میں حسین بن ظریف، حسین بن علوان سے اور وہ جعفر سے اور وہ اپنے پدر بزرگوار سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ایک روز امام حسن ابن علی علیہما السلام اپنے اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ناگاہ ایک جنازہ ادھر سے گزارا گیا، آپ کے کچھ اصحاب

---

1. کافی جلد ٦ ص ٤٧٤ حدیث ٨
2. مکارم الاخلاق جلد دوم ص ٤١٣
3. کافی جلد ٣ ص ١٦٩ حدیث ٢

اٹھ کھڑے ہوئے اور جنازے کی مشایعت میں شریک ہوگئے لیکن آپؑ جنازے جاتے وقت نہیں کھڑے ہوئے اس وقت بعض اصحاب نے آپؑ سے عرض کیا: خداوند عالم آپ کو عافیت عطا کرے، آپ کیوں نہیں کھڑے ہوئے؟ باوجود اس کے کہ رسول خدا صلعم جب کبھی بھی کوئی جنازہ گزرتا ہوا دیکھتے کھڑے ہوجاتے تھے، حسن ابن علی علیہما السلام نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف ایک مرتبہ جنازے کے لئے کھڑے ہوئے اور وہ بھی اس دن جب ایک یہودی کا جنازہ لے جایا جارہا تھا اور راستہ بھی بہت تنگ تھا اور آنحضرتؐ کے لئے جنازے کے راستہ سے کنارے ہٹ جانا ممکن نہ تھا مجبوراً آپ کو اٹھنا پڑا کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ وہ جنازہ آپ کے سر کے اوپر سے گزارا جائے۔[۱]

قطب راوندی کی کتاب "دعوات" میں ہے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس وقت کسی جنازہ کی مشایعت فرماتے تھے۔ آپ کے دل پر اندوہ طاری ہوجاتا تھا، زیادہ تر فکر (موت و آخرت) کیا کرتے تھے اور بہت کم کلام کرتے تھے۔[۲]

مٹی دینے کا طریقہ

جعفریات میں امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آبائے طاہرین علیہم السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: میت کی تدفین کے بعد پیغمبر اسلامؐ مٹی ڈالتے وقت صرف تین مشت خاک ڈالا کرتے تھے۔[۳]

کافی میں زرارہ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: رسول خداؐ بنی ہاشم کے مردوں کے سلسلہ میں کچھ ایسے مخصوص عمل انجام دیا کرتے تھے جو دوسرے تمام خاندانوں کے مردوں کے لئے نہیں کرتے تھے۔ منجملہ ان کے جب کسی بنی ہاشم کے جنازہ کی نماز پڑھاتے اور اس کی قبر پر پانی چھڑکا جاتا، آنحضرتؐ اس کی قبر پر اپنا ہاتھ اس طرح

---

[۱] قرب الاسناد ص ۴۲

[۲] مستدرک الوسائل جلد اول ص ۱۳۱ حدیث ۴

[۳] جعفریات ص ۲۰۳

رکھتے کہ انگلیاں مٹی میں دھنس جاتی تھیں اس انداز سے کہ اگر کوئی اجنبی یا اہل مدینہ سے کوئی مسافر شہر مدینہ میں داخل ہوتا اور قبرستان سے گزرتا وہ تازہ قبر اور اس پر انگلیوں کے نشان دیکھ کر یہ سمجھ جاتا تھا اس قبر میں سو والا بنی ہاشم کی کوئی فرد ہے۔ لہٰذا وہ سوال کرتا تھا کہ آل محمدؐ میں کس شخص نے ابھی تازہ رحلت کی ہے؟

تعزیت و تبریک

شہید ثانیؒ اپنی کتاب "مسکن الفواد" میں امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا: پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی مصیبت زدہ کی تسلیت و تعزیت کے لئے تشریف لے جاتے تو فرماتے: آجرکم اللہ و رحمکم خداوند عالم تم کو اجر عطا کرے اور تم پر رحم فرمائے۔ اور جب کسی کو تہنیت و مبارکباد دیتے تو فرماتے: "بارک اللہ لکم و بارک اللہ علیکم" خداوند عالم تم کو مبارک کرے اور اس کی برکتیں ہمیشہ تمہارے شامل حال رہیں۔[2]

وضو کے آداب

قطب آیات الاحکام، میں سلیمان بن بریدہ سے اور وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے یہاں تک کہ فتح مکہ کا سال آ پہنچا اس کے بعد آپ نے کئی نمازوں کے لئے ایک ہی وضو پر اکتفا کرنا شروع کر دیا عمر نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کو وہ کام کرتے دیکھ رہا ہوں جو آپ نے اب تک نہیں کیا تھا؟ فرمایا: میں متوجہ ہوں اور جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہوں۔[3]

کافی میں زرارہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: حضرت محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: آیا تم

---

1. کافی جلد ۲ ص ۲۰۰، حدیث ۴
2. مستدرک الوسائل جلد اول ص ۱۲۸ حدیث ۶
3. مستدرک الوسائل جلد اول ص ۴۲ حدیث ۳

نہیں چاہوگے کہ تم سے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کرنے کا طریقہ بیان کروں؟ میں نے کہا کیوں نہیں، اس وقت حضرتؑ نے ایک قدح نما پیالہ جس میں تھوڑا پانی تھا لانے کا حکم دیا، پھر اس کو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھا اور ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنا داہنا ہاتھ پانی میں ڈبویا اور اس کے بعد فرمایا، یہ اس صورت میں ہے جب ہاتھ طاہر ہو، تب آپؑ نے وہ ہاتھ پانی سے بھر کر پیشانی پر ڈالا اور کہا: بسم اللہ، اور وہ پانی داڑھی کے اطراف میں پھیل گیا اور اس کے بعد ایک مرتبہ اپنا ہاتھ پیشانی اور چہرے پر پھرایا، اس کے بعد بایاں ہاتھ پانی میں ڈبویا اور چلو بھر کر داہنے ہاتھ کی کہنیوں پر ڈالا اور بایاں ہاتھ داہنے ہاتھ پر اس طرح کھینچا کہ پانی انگلیوں کے سرے تک پہنچ جائے اس کے بعد داہنے ہاتھ کے چلو میں پانی لیا اور بائیں ہاتھ کی کہنیوں پر ڈالا اور اس کو داہنے ہاتھ کی ہتھیلی سے بائیں ہاتھ کے گٹے اور انگلیوں کے سروں تک تر کیا اور سر کے اگلے حصے نیز قدموں کے اوپری حصے کا بائیں ہاتھ کی تری اور دائیں ہاتھ کی بقیہ تری سے مسح کیا۔ زرارہ کہتے ہیں: ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: خدا ایک ہے اور ایک کو ہی پسند کرتا ہے، اس اعتبار سے وضو میں بھی صرف تین چلو پانی کافی ہے، ایک چہرہ دھونے کے لئے، دو دونوں کہنیوں پر ڈالنے کے لئے اور تم اپنے دائیں ہاتھ کی تری سے سر کے اگلے حصہ کا اور اس کے بقیہ سے دائیں قدم کے پشت پر مسح کرتے ہو اور بائیں ہاتھ کی تری سے بائیں قدم کی پشت کا مسح کرتے ہو۔ زرارہ اس کے بعد کہتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: ایک شخص نے امیر المؤمنین علیہ السلام سے پوچھا کہ رسول خداؐ کس طرح وضو فرماتے تھے؟ حضرتؑ نے یہی طریقہ جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیا ہے اس شخص کے سامنے بیان کیا تھا [1]

مفید الدین طوسی امالی میں ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بھی وضو کرتے تھے تو پورے وضو کے دوران پہلے دائیں اعضا دھویا کرتے تھے [2]

---

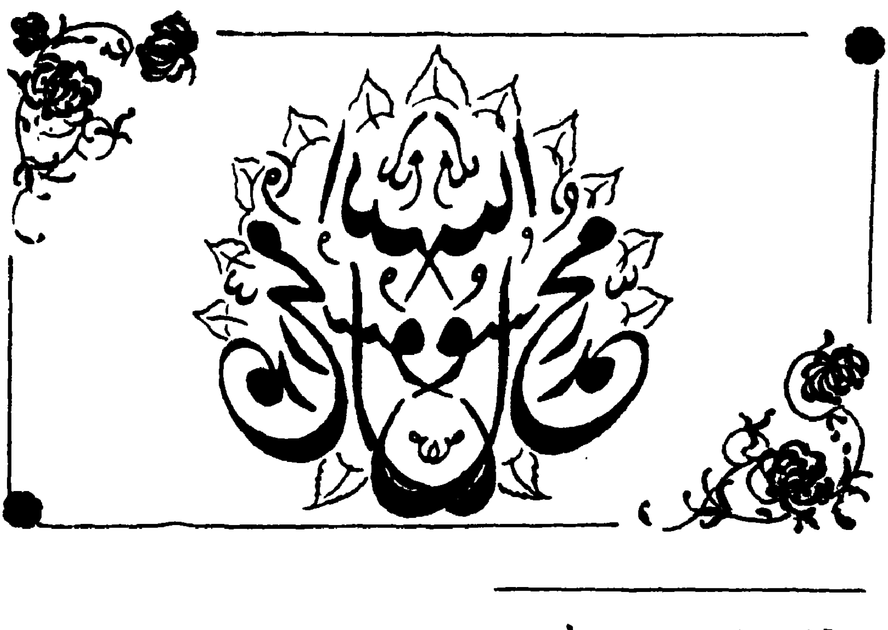
[1] کافی جلد ۳ ص ۲۵ حدیث ۴

[2] امالی شیخ طوسی جلد اول ص ۳۹۷

تہذیب میں ابو بصیرؒ روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے وضو کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک مد (یعنی تقریباً تین پاؤ) پانی سے وضو کرتے تھے اور ایک صاع (تقریباً تین کلو) پانی سے غسل فرماتے تھے [1]

عیون میں امام رضا علیہ السلام سے اور حضرت اپنے آباء کے طاہرین علیہم السلام سے ایک طویل حدیث کے ضمن میں نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ہم وہ اہل بیت ہیں جن پر صدقہ حلال نہیں ہے اور ہم کو حکم ہے کہ ہم کامل واکمل وضو انجام دیں... [2]

تہذیب میں عبد اللہ ابن سنان سے روایت ہے وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: مضمضہ (کلی کرنا) اور استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) ان چیزوں میں سے ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت قرار دی ہیں۔ [3]



[1] تہذیب جلد اول ص ۱۳۶ حدیث ۲۸

[2] عیون الاخبار جلد ۲ ص ۲۸

[3] تہذیب جلد ۱ ص ۷۹ حدیث ۵۲

طبری کی روش تاریخ نگاری

ایک تنقیدی جائزہ

جناب سید مرتضیٰ عسکری

ترجمہ: جناب سید علی الحسن عسکری

جیسا کہ مشہور ہے ظہور اسلام کے بعد کوئی بھی قوم تاریخ نگاری کے میدان میں مسلمانوں کی طرح آمادہ اور پیش پیش نہیں رہی ہے اگرچہ یہ بات محض تاریخ نگاروں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام علمی شعبوں میں وہ بے نظیر نظر آتے ہیں چنانچہ دوسری قوموں کو ان پر اس وقت سبقت حاصل ہوئی ہے جب ان کے انحطاط کا دور شروع ہو چکا ہے۔

بہرحال تاریخ کے میدان میں طبری کی شخصیت اتنی ممتاز ہے کہ بہت سے دانشمند اس کو اس طور سے نہیں پہچانتے جو اس کا اصل مقام ہے۔ دراصل خلفاء کے مکتب میں کوئی بھی عالم اب تک اس کے پایہ کا پروان نہیں چڑھا ہے۔ نہ صرف تاریخ میں بلکہ اس وقت رائج تمام علمی شعبوں میں، مثال کے طور پر علم لغت عرب میں (نحو و صرف کے اعتبار سے نہیں بلکہ پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے اصحاب کے دور میں لغت عرب کے دقیق نکات سے آگاہی کے لحاظ سے) شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ طبری کو اس شعبہ میں سب سے پہلا درجہ حاصل رہا ہے، اسی طرح علم تفسیر، علم قرأت (اگر کوئی اس کو علم تسلیم کرتا ہو) علم فقہ اور علم اصول ایسے علوم ہیں جن میں طبری کو پوری مہارت حاصل رہی ہے۔

طبری کے علمی آثار نیز جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا حافظہ نہایت ہی قوی تھا جس نے علمی و تاریخی مطالب کی جمع آوری میں اس کی بڑی مدد کی ہے۔

کسی بھی شخص کی علمی حیثیت کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے نیز دوسرے دانشمندوں کے آثار کا ایک تقابلی جائزہ لیا جائے مثلاً اگر ہم علم تفسیر میں طبری کے مقام و منزلت کو سمجھنا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ اس کی تفسیر کا اس سے قبل و بعد کی دوسری تفاسیر سے مقابلہ و موازنہ کریں۔

یہ بات جو ہم نے کہی ہے کہ خلفاء کے مکتب میں ایک فقہ و اصول کے میدان میں کوئی طبری
کا عالم پیدا نہ ہو سکا۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کا طریقہ بھی یہی "تقابلی مطالعہ" ہے یعنی پہلے
کے فقہی مکتب کو پیش کرنا چاہئے، اس کے بعد مکتب خلفاء کے چار بڑے فقہی مکاتب یا کم از کم
اربعہ کے ائمہ کے ساتھ موازنہ کرنا چاہئے۔

ائمۂ مذاہب اربعہ میں سب سے پہلی فرد مالک ابن انس کی ہے جن کی ۱۷۶ھ میں وفات
اس کے بعد امام ابو حنیفہ ہیں جو مالک کے معاصر تھے لیکن ۱۵۰ھ میں ہی وفات پا گئے، اگرچہ شہرت
اعتبار سے امام ابو حنیفہ زیادہ معروف ہیں، ان دونوں کے بعد محمد ابن ادریس شافعی ہیں جن کی
میں وفات ہوئی اور ان سب کے بعد احمد ابن حنبل ہیں جو ۲۴۱ھ میں فوت ہوئے ہیں، آج مکتب
کے فقہی مذاہب کی حیثیت سے یہی چند مذاہب شہرت رکھتے ہیں۔

جہاں تک مالک ابن انس کا سوال ہے ان کی فقہ کتاب "موطأ" میں سمٹی ہوئی ہے جس میں مکتب
سے روایت شدہ پیغمبر اسلام کی کچھ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور وہ فتوے جمع کئے گئے ہیں
اور تابعین نے وقتاً فوقتاً دیئے ہیں) مالک ابن انس کی کل فقہ اتنی ہی ہے۔

محمد ابن ادریس شافعی نے یہ کتاب "موطأ" خود مالک ابن انس سے پڑھی ہے اسی لئے ان
ابن انس کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ احمد ابن حنبل نے محمد ابن ادریس شافعی سے
حاصل کی ہے البتہ اس حد تک نہیں کہ جس طرح خود امام شافعی نے مالک ابن انس سے د
ہے، لیکن ابو حنیفہ کا مکتب فقہ اس مکتب فقہ کے بالمقابل ایک مکتب ہے۔

بنا بریں، کلی طور پر مالک ابن انس اور احمد ابن حنبل کا کوئی مستقل فقہی مکتب نہیں ہے، احمد ابن حنبل سے مناسک حج
بحث کے علاوہ کوئی کتاب فقہ میں ہماری نظر سے نہیں گزری ہے اور ان کی مناسک حج کا بھی اس عہد کی دوسری کتابوں سے
مقائسہ کریں تو اصولی طور پر حج کے بارے میں چند حدیثیں اس میں ذکر ہوئی ہیں اور بس۔

ان کی مشہور حدیث کی کتاب جو آج بھی ہماری دسترس میں ہے کتاب "مسند
ان کی ایک اور کتاب مناقب حضرت امیر میں ہے جو اس موضوع سے متعلق احادیث کا
ابو حنیفہ نے ان سب کے مقابل ایک دوسرے فقہی مکتب کی بنیاد رکھی، چنانچہ اس فقہی
بنیاد ان اجتہادات پر استوار ہے جو انہوں نے صحابہ کے یہاں دیکھا ہے جس کی تفصیل

معالم الدرستین ، کی دوسری جلد میں ذکر کی ہے خواہش مند حضرات اس کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ابوحنیفہ نے اپنے گزشتہ افراد کے اجتہادی نظریات و آراء سے استفادہ کیا اور ان کیلئے ایک قاعدہ مرتب کرکے ان کو "قیاس" ، "استحسان" اور مصالح مرسلہ کا نام دیا ہے۔ میں یہاں ان سب کی شرح و تفسیر پیش کرنا نہیں چاہتا لیکن یہ تمام اصول و ضوابط ایک کلی قانون کی طرف پلٹتے ہیں اور وہ ہے ایک مجتہد کی شخصی رائے اور نظریہ پر عمل کرنا۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر ان کی روش کو "مکتب رائے" کا نام دیتے ہوئے اس عقیدہ کے ماننے والوں کو "اہل رائے" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ یعنی ان کے فقہی مدارک میں سے ایک "رائے" بھی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اسی رائے کو "عقل" کا نام دے دیا گیا اور اس کو دلیل عقلی سے یاد کیا جانے لگا اور افسوس یہ ہے اس "زمزمہ" نے وہیں سے مکتب اہل بیت کے اصول فقہ میں بھی جگہ پیدا کرلی۔ شیخ طوسی کے زمانے تک یہ مسئلہ (مکتب اہل بیت میں) نہیں تھا بعد میں داخل ہوا۔

مکتب خلفاء میں علم اصول فقہ نہیں تھا، محمد بن ادریس شافعی وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے اس کی بنا رکھی ہے۔ وہ ایک دانشمند شخص تھے اور اس سلسلہ میں اپنے استاد مالک بن انس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، کیونکہ مالک ابن انس نے جو مسائل اٹھائے ہیں ان کو مسئلہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ انھوں نے صرف چند فتووں کو جمع کر دیا ہے۔

"کتاب الام شافعی" اگرچہ ۷ جلدوں پر مشتمل ہے پھر بھی وہ فقہی مسائل، وہ استنباط اور وہ مباحث علم اصول جو ان کے یہاں نظر آتے ہیں مکتب اہل بیت کے علم اصول کے مقابلہ میں بالکل آفتاب کے سامنے ایک ستارہ کی نوعیت رکھتے ہیں۔ کاش اس مقام پر میں مکتب اہل بیت کے فقہی اصول اور محمد بن ادریس شافعی کے بعد مکتب خلفاء میں ترقی حاصل کرنے والے فقہی اصول کے درمیان موازنہ کر سکتا تاکہ اس تقابلی موازنہ سے دونوں کے درمیان کتنا بعد ہے معلوم ہو سکتا۔

ہمارے ساتھیوں میں نجف اشرف کی ایک گمنام علمی شخصیت سید محمد تقی حکیم نے اس سلسلہ میں ایک کتاب "اصول الفقہ المقارن" تحریر فرمائی ہے جو ایک اچھی کتاب ہے لیکن جو میں کہنا چاہتا ہوں اس سے بھی زیادہ ہے۔ مکتب اہل بیت میں اصول فقہ خود پیغمبر اکرم اور ائمہ علیہم السلام کی ان روایات اور امور سے ماخوذ ہیں جو احکام کے استنباط میں ائمہ علیہم السلام نے تعلیم دیئے ہیں۔ مختصر یہ کہ علم اصول میں محمد بن جریر طبری کی مانند مکتب خلفاء میں تو کوئی دوسرا مجھے نظر نہیں

آتا۔ گزشتہ سال حجاز میں طبری کی ایک کتاب "تہذیب الآثار" کے نام سے کئی جلدوں میں چھپ کر منظر علم پر آئی ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے سے پہلے میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ مکتب خلفاء میں فقہی اصول پر مبنی تحقیق حدیث میں ایسی گہری فکر پائی جاتی ہوگی گویا کہ آیت اللہ بروجردی کی "جامع احادیث شیعہ" کو آیت اللہ حکیم کی "مستمسک" کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہو، طبری کی "تہذیب الآثار" ایک ایسی ہی روشنی پر لکھی گئی ہے۔ اس میں طبری نے احادیث کو ایک ایک باب کے تحت جمع بھی کیا ہے۔ رجال کی تحقیق و چھان بین بھی کی ہے اور دلالت الفاظ، تعارض ادلّہ اور ایک حدیث کی دوسری حدیث پر ترجیح کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

طبری کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دو افراد نے اس کتاب کا نام ذکر کیا ہے جس کا مجھے پہلے علم نہیں تھا۔ ان میں سے ایک صاحب "کشف الظنون" ہیں جو لکھتے ہیں :-

"کتاب تہذیب الآثار تفرد به فی بابه لا مشارك"

یعنی یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد اور بے مثل کتاب ہے۔

اس کے بعد ابن کثیر نے دو جگہ مذکورہ کتاب کا نام لیا ہے، وہ کہتا ہے :-

"من المصنفات النافعة فی الاصول والفروع، ....."

یعنی علم فقہ میں صرف ایک تالیف نہیں بلکہ اس کی کئی کتابیں موجود ہیں۔

لیکن اس کے بعد لکھتا ہے :-

واحسن من ذالك تهذيب الآثار ولو كمل لما احتيج معه الى شيئ ولكان فيه الكفايه لكنه لم يتم"

اور ان میں سب سے اچھی کتاب "تہذیب الآثار ہے" اگر طبری نے اس کتاب کو کامل کر دیا ہوتا تو اس کتاب کی موجودگی میں کسی دوسری کتاب کی فقہ میں ضرورت نہ ہوتی۔

ایک دوسری جگہ اسی بات کا پھر اعادہ کرتا ہے :-

"وكتاب سماه تهذيب الآثار لم ار سواه فی معناه الا انه لم يتم وله فی اصول الفقه و فی فروعه كتب كثيرة"

اور کتاب "تہذیب الآثار" جیسی میں نے کوئی اور کتاب اصول فقہ میں نہیں دیکھی،
البتہ وہ نامکمل ہے، اصول و فروع فقہ میں اس کی بہت سی کتابیں ہیں۔
یہ تو تھی ابن کثیر کی بات، خود میں نے جو کتابیں اصول فقہ میں طبری کی دیکھی ہیں درج ذیل ہیں:—

(۱) التفصیل فی الاصول
(۲) اختلاف الفقہا (اس کتاب میں طبری نے اپنے وقت تک مکتب خلفاء کے ان فقہا کی رایوں کو نقل کیا ہے جنھوں نے اصولی طور پر ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دی ہو اور اظہار نظر کیا ہو۔)
(۳) البسیط فی الفقہ (صاحب کشف الظنون کے مطابق یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور فقہی کتابوں کا ایک دورہ ہے)
(۴) کتاب الخفیف فی الفقہ اللطیف۔

یہ وہ کتابیں ہیں جو علم فقہ و اصول فقہ میں طبری نے چھوڑی ہیں کہ جن کا اگر ائمہ فقہ اہل سنت کی کتابوں سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فقہی و اصولی کتابوں میں اس کی کتابوں کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ دراصل ان کتابوں کا فقہ شیعہ کی استدلالی کتابوں کے ساتھ موازنہ کیا جانا چاہئے چنانچہ اگر ان کا شیعوں کی فقہی و اصولی کتابوں مثلاً "جواہر" "مستمسک" اور "مدارک" وغیرہ سے مقائسہ کریں تو ان کی حیثیت آخر شب ماہ کی مانند ہوگی، جو کبھی کبھی دن میں نظر آجاتا ہے، یعنی ایک ایسا چاند جس کی روشنی سورج کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ لیکن مکتب خلفاء میں بلاشبہ بے نظیر ہے

مؤرخ کی حیثیت سے طبری کی شہرت کے اسباب

اب سوال یہ ہے کہ ان تمام فقہی و اصولی مباحث کے باوجود طبری کو ایک فقیہ کی حیثیت سے کیوں نہیں پیش کیا گیا اور اس میدان میں ان کو کیوں شہرت نصیب نہ ہوئی؟ جبکہ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں اس سے علم فقہ پڑھنے والے ایسے شاگردوں کا نام لیا ہے جنھوں نے خود علم فقہ میں کتابیں تالیف کی ہیں، اس کا دعویٰ ہے، کہ ہمارے زمانے تک طبری کا فقہی مکتب

دیگر فقہی مذاہب کے بالمقابل موجود رہا ہے ! اور ابن ندیم نے ۳۸۰ھ میں وفات پائی ہے۔
پس کیا بات ہوئی کہ طبری کو دنیا والے اس کی تاریخ کے ذریعہ جانتے اور پہچانتے ہیں، فقیہ کے طور پر وہ نہیں جانا جاتا اور وہ بھی جبکہ اس کی تاریخ مندرجہ ذیل تین قسموں پر مشتمل ہے :-

۱۔ اسرائیلیات اور وہ جھوٹی روائتیں جو دشمنان اسلام کے ذریعہ گڑھی گئی ہیں۔

۲۔ افسانے اور داستانیں۔

۳۔ وہ روائتیں جو حدیث کی صورت میں نقل کی گئی ہیں۔

بہر حال، طبری کا تاریخی مقام جاننے کے لئے بھی ہمیں طبری کے تاریخی آثار کا دوسرے تاریخی آثار کے ساتھ موازنہ کرنا چاہئے تاکہ صحیح طور پر معلوم ہو سکے کہ علم تاریخ میں طبری کی کیا منزل ہے اور اس کے بعد دیکھیں کہ تاریخ نگاری کے میدان میں طبری کو کیوں اتنی شہرت حاصل ہوئی ہے۔

کتاب "عبداللہ ابن سبا" اور کتاب "ایک سو پچاس خود ساختہ صحابی" کی تالیف سے سیکڑوں سال قبل تک علماء و دانشمند اگر حقیقی و خالص اسلام کی تاریخ جاننا چاہتے تھے تو عموماً طبری کی تاریخ کی طرف مراجعہ کرتے تھے لیکن اس بات کو اس کے فقہی مقام کے نظر انداز کر دئے جانے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

طبری کے فقہی پہلو کے منظر عام پر نہ آنے کی ایک وجہ اپنے زمانے کے حکام سے اس کے ارتباط کی نوعیت کو قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ مکتب خلفاء میں علماء کی شہرت کا مدار زیادہ تر موجودہ دربار خلافت سے ان کی وابستگی پر رہا ہے اسی لئے ہم نے ان کو مکتب خلفاء کا نام دیا ہے اس لئے کہ دربار خلافت سے ہی امام جمعہ و جماعت اور قاضی القضات وغیرہ کا تقرر ہوتا تھا۔

لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد ایک عباسی خلیفہ نے اور پھر مصر میں ملک ظاہر بیبرس بندقداری نے (۶۶۵ھ) میں چار مذاہب کے علاوہ کسی بھی مکتب کی پیروی ممنوع قرار دے دی اور اعلان کر دیا کہ اہل علم میں جو شخص بھی ان چار مذاہب (مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی) میں سے کسی ایک کا گرویدہ و پیرو نہ ہو وہ امام جمعہ، قاضی یا امام جماعت نہیں ہو سکتا، حتی اسے مسجد کا مؤذن بھی نہیں بنایا جانا چاہئے بنابریں، یہی وہ چیز تھی جو ابن جریر طبری نیز دیگر فقہی مکاتب (مثلاً ظاہری مذہب) کے خاتمہ کا سبب بن گئی۔

تاریخ نگاری میں طبری کا مقام

مسعودی نے "مروج الذہب" کی ابتدا میں اسّی مؤلفین علم تاریخ کا نام ذکر کیا ہے جن میں سے ایک طبری بھی ہے یعنی وہ ان سب کو طبری کی صف میں شمار کرتا ہے یقیناً اس نے طبری کی تعریف کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسّی مؤلفین کا نام لیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا طبری کے ساتھ موازنہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی اکثر کتابیں آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں، پھر بھی کم از کم ہم تاریخ طبری کا بلاذری اور مسعودی کی تاریخ کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔ بلاذری کی دو کتابیں دستیاب ہیں جن میں سے ایک انساب الاشراف اور دوسری فتوح البلدان ہے۔

ان علماء مثلاً بلاذری، مسعودی اور صاحب معجم البلدان حموی وغیرہ کے بارے میں بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے خود حجاز کا سفر کیا اور وہاں کی موقعیت و صورت حال کا قریب سے مطالعہ کیا، ان لوگوں نے جب کسی غزوہ یا جنگ کے اوپر بحث کرنا چاہا ہے تو انھوں نے جاکر مثلاً غزوۂ احد کی جگہ یا غزوۂ بدر کی جگہ کا مطالعہ کیا ہے لیکن طبری چونکہ محدث تھا اس لئے اس نے ان کے بارے میں چند حدیثیں لکھ کر حدیث کی تحقیق و چھان بین پر زیادہ توجہ صرف کی ہے، اور علمائے علم اصول کی علمی زبان میں تعادل و تراجیح سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے جبکہ دوسروں کے یہاں یہ بات نظر نہیں آتی، مثلاً مسعودی پانچ زبانیں (ہندستانی فارسی، سریانی، عربی اور بظاہر یونانی) بخوبی جانتا تھا اور اس نے ان زبانوں میں لکھی جانے والی کتابوں میں موجود اطلاعات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

تاریخ طبری تاریخی تحقیقاتی خصوصیات سے عاری ہے

طبری نے جو کچھ تاریخ کے عنوان سے لکھا ہے درحقیقت علم تاریخ نہیں ہے، کیونکہ علم تاریخ میں کسی تاریخی واقعہ کا مربوط زمانے کے ساتھ موازنہ کیا جانا ضروری ہے اسی طرح ذکر شدہ واقعہ کا زمانے کے علاوہ مکان اور ماحول کے ساتھ موازنہ کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ آیا ایسی جگہ ایک ایسے واقعہ کا رونما ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ اور معاشرہ کے حالات اور زمانے کے ساتھ یہ واقعہ ہم آہنگی رکھتا ہے یا نہیں؟

مثال کے طور پر "داستان افک" سے متعلق حدیث کے ذیل میں وہ کہتا ہے کہ بریرہ نامی ایک کنیز تھی کہ جس کے ساتھ ایسا ایسا واقعہ رونما ہوا لیکن جب ہم عائشہ کے گھر میں بریرہ کی آمد کے بارہ میں تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ فتح مکہ کے بعد عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ ہی ساتھ (مکہ سے مدینہ) آئی ہے جبکہ واقعہ افک کے بارہ میں کہتے ہیں کہ اس سے قبل (تقریباً پانچویں ہجری میں) رونما ہوا ہے اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ میل نہیں کھاتیں۔

لہٰذا ایک تاریخی واقعہ کی تحقیق کے وقت زمان و مکان کا پاس و لحاظ رکھنا اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونے کی کیفیت کا خیال کرنا ضروری ہے تاکہ وہ علم کی صورت حاصل کر سکے اور اگر اس طرح کی تحقیق نہ کی جائے تو جو کچھ بھی تاریخ کے عنوان سے لکھا جائے گا۔ بالفرض واقعہ کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو "علم" نہیں کہا جا سکتا اور طبری نے عملی طور پر اس طرح کی تحقیق سے کام ہی نہیں لیا ہے۔ اس کے علاوہ جو باتیں مسعودی کی کتابوں میں ملتی ہیں معلومات کے اعتبار سے کافی وسیع اور کشادہ ہیں۔

مسعودی کی مشہور تاریخی کتاب "اخبار الزمان" ہے جس کی ایک جلد کے علاوہ بقیہ جلدیں موجود نہیں ہیں، دوسری کتاب "الاوسط" ہے تیسری "مروج الذہب" اور چوتھی "التنبیہ و الاشراف" ہے اور ہم اس وقت آخری دونوں کتابوں کی بنیاد پر گفتگو کر رہے ہیں۔

"مروج الذہب" میں عجیب و غریب معادن اور کارخانۂ عالم سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اور "التنبیہ والاشراف" میں جس وقت پیغمبر اسلامؐ کے غزوات کا ذکر کرتا ہے تو یہ بھی لکھتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کس کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر جاتے تھے، جس کی طرف طبری نے سرے سے کوئی توجہ نہیں دی ہے، مثلاً غزوۂ احد میں پیغمبر اسلامؐ نے کس شخص کو اپنی جگہ پر مدینہ میں چھوڑا تھا، رسول اسلامؐ کب مدینہ سے خارج ہوتے اور کب پلٹ کر واپس آتے تھے۔ یہ تمام خصوصیات مسعودی اپنی مختصر سی کتاب میں لکھ دیتا ہے، "مروج الذہب" علم کا ایک سمندر ہے لیکن طبری کی تاریخ ان تمام باتوں سے عاری ہے۔

"تاریخ طبری" نے دراصل اسلام کو ضرر پہنچایا ہے۔ اور یہی نقصان پہنچانا اور افسانہ بنانا وہ چیز ہے جس نے اس کو مشہور کر دیا ہے۔ اگر اس کا مقصد صحیح حدیث وارد کرنا ہوتا تو اس کی حدیث

میں نص و سند کی حیثیت ہوتی اور اس کے بعد آنے والے حدیث کی اس نص و سند کی بنیاد پر کام کرتے۔
میں نے اپنی کتاب "معالم المدرستین" کی جلد اول میں لکھا ہے، مکتب خلفاء میں حدیث نگاری کے میدان میں دس عنوان سے کتمان حق کیا گیا ہے اور اگر کوئی دقت نظر کے ساتھ تحقیق و چھان بین کرے تو اسے کتمان کی یہ تمام صورتیں طبری کے یہاں یکجا مل جائیں گی۔

کتمان حق کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حدیث کا ذکر کئے بغیر مجمل گوئی سے کام لیتے ہیں، طبری نے یہ کام حدیث "انذار یوم الدار" کے تحت اپنی تفسیر میں کیا ہے، اس مقام پر جہاں کہتے ہیں:۔

"دعیٰ بنی عبد المطلب وقال لهم ایکم یوازرنی علیٰ هٰذا الامر"

خاندان عبد المطلب کو دعوت دی اور ان سے کہا تم میں کون اس کام میں میری مدد کے لئے تیار ہے؟

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"ویکون کذا او کذا" اور اس طرح اس نے کلی طور پر حدیث کو حذف کر دیا ہے۔ یہی کام ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہے کیونکہ اس نے طبری سے ہی نقل کیا ہے۔

کاش صرف اتنا ہی ہوتا، کہیں کہیں تو اس نے اس اجمال گوئی سے بھی کام نہیں لیا ہے، مثال کے طور پر واقعۂ صفین میں ایک خط کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ محمد بن ابی بکر نے ایک خط معاویہ کو لکھا اور معاویہ نے اس کا جواب اس کو لکھا کہ:۔

"لایحتمل سماعها العامة" یعنی عوام اس کے سننے کی طاقت نہیں رکھتے۔

واقعہ صفین کے ذیل جو کچھ اس نے لکھا ہے نصر ابن مزاحم سے لیا ہے اور یہ خط اور اس کا جواب نصر بن مزاحم کی کتاب "وقعۃ صفین" میں موجود ہے مسعودی نے بھی اپنی کتاب "مروج الذهب" میں یہ خط نقل کیا ہے اور شاید ابن ابی الحدید نے بھی اس کو لکھا ہے۔

کاش تاریخ طبری کی مشکل صرف اتنی ہی ہوتی اس سے بھی بالاتر ہے۔ سنہ ۳۰ ہجری کے واقعات کے ذیل میں جناب ابوذر کی معاویہ کے ساتھ جھڑپ اور ان کی جلاوطنی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"وفی هذه السنة اعنی سنة ثلاثین کان ما ذکر من امر ابی ذر و معاویة و اشخاص معاویه ایاه من الشام الی المدینة وقد ذکر فی سبب اشخاصه ایاه منها علیها امور کثیرة کرهت ذکر اکثرها"

اور اس سال یعنی سنہ ۳۰ھ میں جو کچھ ابوذر اور معاویہ کے معاملے میں بیان کیا جاتا ہے اور شام سے مدینہ کی طرف معاویہ کے ہاتھوں ان کے بھیجے جانے کی بات کی جاتی ہے اس بارے میں روایات زیادہ ہیں اور میں ان میں سے زیادہ تر روایتوں کے نقل کرنے میں کراہیت محسوس کرتا ہوں۔

کاش اس نے نقل نہ کیا ہوتا اور کچھ بھی اس سلسلے میں نہ کہتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب معاویہ کے سلسلہ میں دفاع اور عذر تراشی کی منزل آتی ہے تو کہتا ہے :۔

"العاذرون معاویۃ فی ذالک فانّھم ذکروا فی ذالک قصۃ"....

ایک گروہ نے اس سلسلہ میں معاویہ کو معذور قرار دیا ہے اور ان لوگوں نے ایک قصہ (یا داستان) لکھی ہے ہم اس کو نقل کر رہے ہیں۔ (اور اس کے بعد ان لوگوں کی باتیں نقل کرتا ہے)

آخر یہ باتیں کس بات پر دلالت کرتی ہیں؟ آیا جو کچھ جناب ابوذر پر گزری تھی اس سے طبری کو اتنی تکلیف تھی کہ وہ اس کو بیان نہیں کر سکا! اگر ایسا ہے تو جو کچھ کعبہ پر گزری ہے اس کا بھی ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا، لشکر یزید کے ہاتھوں منجنیق کے ذریعہ خانہ کعبہ پر سنگ باری ہوئی، جلایا گیا اور کیا کچھ ہوا، یہ سب بیان کرتا ہے حاجیوں کے ذریعہ کعبہ پر سنگ باری، اس کا جلایا جانا، اس کا منہدم ہونا، قتل عثمان کا واقعہ قتل سید الشہداء، یہ تمام باتیں تفصیلات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ جناب ابوذر پر جو کچھ گزری اس کا بیان بار محسوس ہونا مصائب کی شدت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ ان تمام مظالم کا ذمہ دار معاویہ کو بتایا گیا ہے۔

بالکل یہی بات ابن اثیر نے بھی اس سال کے ذیل میں دہرائی ہے وہ لکھتا ہے :۔

وفیہ ھذہ سنۃ کان فاذکر من امر ابی ذر و اشخاص معاویہ ایاہ من شام الی المدینۃ وقد ذکر فی سبب ذلک امور کثیرۃ من سب معاویہ ایاہ وتھدیدہ بالقتل وحملہ الی المدینۃ من الشام بغیر وطاء ونفیہ من المدینۃ علی الوجہ الشنیع لا یصح النقل بہ"

"اور اس سال (۳۰ ہجری) جو کچھ ابوذر اور معاویہ کے درمیان اختلاف بیان کیا جاتا ہے ان کا شام سے مدینہ بھیجا جانا اور اس ذیل میں بہت ساری باتیں کہی جاتی ہیں، معاویہ کے مظالم، اس کا ابوذر کو قتل کی دھمکی دینا،

اور ان کی مرضی کے بغیر شام سے مدینہ کی طرف سوار کرا دیا اور مدینہ سے نہایت شقاوت کے ساتھ ان کا جلا وطن کیا جانا، ان باتوں کا نقل کیا جانا صحیح نہیں ہے۔"

ابن اثیر نے بھی طبری کی ہی پیروی کی ہے۔ خود ابن اثیر نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اس کا اظہار بھی کیا ہے وہ کہتا ہے، میں نے واقعات نقل کرنے میں جو کچھ امام ابوجعفر طبری نے لکھا ہے وہی نقل کیا ہے کیونکہ سبھی اس پر اعتماد کرتے ہیں اور اگر رائے میں اختلاف پایا جاتا ہو اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کہتا ہے، میں نے پہلے تاریخ طبری سے نقل کیا بعد میں دوسری مشہور تاریخی کتب سے اس میں ضمیمہ لگاتے ہوئے جو کچھ اس نے کہا ہے میں نے نقل کر دیا ہے اور جو چیز صحابہ پر سرزنش کا سبب ہو اگر وہ نہیں کہتا تو میں بھی اس کا ذکر نہیں کرتا جب کہ ہم جانتے ہیں جو کچھ لوگ کہتے ہیں صحیح ہے۔"

ابن کثیر صحابہ کی روایتیں نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

هذا ملخص ما ذكره ابوجعفر ابن جرير رحمه الله عن ائمة هذه الشأن وليس فى ما ذكره اهل الاهواء من الشيعة وغيرهم ..."

"مکتب خلفاء سے تعلق رکھنے والے ائمہ (حدیث) سے جو کچھ ابوجعفر ابن جریر نے ذکر کیا ہے یہ اس کا خلاصہ ہے یہ وہ نہیں ہے جو شیعہ اور دوسرے صاحبان ھویٰ و ہوس ذکر کرتے ہیں۔"

اسی طرح ابن خلدون بھی مذکورہ قسم کی گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

هذا آخر الكلام فى الخلافة الاسلامية وما كان فيها من الردة والفتوحات والحروب ثم الاتفاق والجماعة اوردتها ملخصة عيونها ومجامعها من كتب محمد بن جرير الطبرى وهو تاريخه الكبير فانه اوثق ما رأيناه فى ذالك وابعد عن المطاعن والشبه فى كبار الامة۔

"یہ خلافت اسلامیہ اور اس میں رونما ہونے والے (فتنہ) ارتداد، فتوحات اور جنگوں وغیرہ سے متعلق آخری بات ہے جو محمد بن جریر طبری کی کتابوں اور ان کی تاریخ کبیر سے مختصر طور پر ماخوذ ہے جہاں تک میں نے دیکھا ہے یہ موثق ہے اور امت کی بزرگ شخصیتوں سے متعلق مطاعن و شبہات سے خالی ہے۔"

طبری اور افسانوی روایتیں

اگر ایک ایسا دانشمند شخص تاریخ اسلام کے نام پر افسانوی روایتیں تاریخ میں شامل کرے تو مولفین کا حقدار ہے طبری نے یہ افسانے سیف بن عمر تمیمی نامی شخص سے لئے ہیں جس کی دو کتابیں ہیں ایک کا نام "الفتوح والردہ" (یعنی اسلامی فتوحات اور ارتدادی جنگیں) ہے اور دوسری کتاب "الجمل و مسیر علی و عائشہ" ہے۔

علماء علم رجال کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ شخص حدیث وضع و جعل کرنے کا مرتکب رہا ہے (ہم نے یہ بات اپنی کتاب عبداللہ ابن سبا کے شروع میں ذکر کی ہے) یہاں تک کہ اس کو زندیق کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ شخص ۱۷۰ھ تک زندہ رہا ہے لیکن بظاہر اس نے یہ حدیثیں بنو امیہ کے دور میں ۱۲۰ھ کے آس پاس وضع کی ہیں کیونکہ ان میں سے زیادہ تر بنو امیہ کی مدح میں ہیں اور بنو عباس کے دور میں ممکن نہیں کہ اس طرح سے کوئی بنو امیہ کی مدح و ثنا کرے۔ پس اس کی حیات کا زمانہ بنو عباس کے برسر اقتدار آنے سے قبل کا زمانہ ہونا چاہئے۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ یہ اوصاف جو ہم نے سیف بن عمر تمیمی کے بیان کئے ہیں اجماعی ہیں یعنی سبھی ان باتوں پر متفق ہیں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے اور ظاہر ہے یہ چیز طبری جیسی شخصیت پر پوشیدہ نہ رہی ہوگی۔

افسانوی روایتیں جو طبری نے اس سے نقل کی ہیں بہت زیادہ ہیں ان میں سے بعض افسانے اپنے قاری کو ایک بالکل ہی غلط طرز فکر عطا کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہی ہیں منجملہ ان افسانوں کے جو اس نے وضع کئے ہیں اور طبری نے بھی جس کو نقل کیا ہے "فتح دارین" کی داستان ہے جبکہ بنیادی طور پر اس طرح کی کوئی چیز تاریخ میں وجود ہی نہیں رکھتی۔

وہ کہتا ہے کہ: زمانہ ابوبکر میں ایک جنگ "فتح دارین" کے نام سے رونما ہوئی۔ لشکر اسلام کی راہ میں سمندر حائل تھا اور دارین تک کی مسافت کشتیوں سے ۲۴ گھنٹے میں طے کی جاتی تھی۔ حکم دیا گیا کہ پورا لشکر پانی میں اتر جائے اونٹ سوار اور گھوڑ سوار سب پانی کی سطح پر چلتے نظر آتے ہیں گھوڑوں کی سموں اور اونٹوں کے پاؤں کے نیچے اس طرح ریت اوپر آگئی کہ

گھوڑوں اور اونٹوں کے صرف تلے پانی میں بھیگ رہے تھے ! ...

جبکہ سرے سے نہ کسی دارین کا وجود پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس طرح کی کوئی جنگ واقع ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اس "داستان دارین" کو حموی نے بھی اپنی کتاب معجم البلدان میں نقل کیا ہے۔

ایک دوسری داستان عراق میں فتح امغیشیا " کے نام سے ہے اسے بھی طبری نے سیف بن عمر سے نقل کیا ہے کہ ابوبکر کے زمانہ میں واقع ہوئی، واقعۂ الیس رونما ہوا، خالد ابن ولید نے اس جنگ میں استقامت دکھائی اور قسم کھائی کہ اگر فتح یابی نصیب ہوئی تو دشمن کے لشکر کو اسیر کرنے کے بجائے ان سب کا سر قلم کرے گا۔ جب کامیابی ملی اس نے حکم دیا اسیروں کو پکڑ کر اس کے سامنے حاضر کریں۔ وہاں ایک نہر تھی جو بعد میں "نہر الدم" یعنی "خونیں نہر" کے نام سے موسوم ہوئی، خالد نے حکم دیا کہ نہر کا رخ پھیر دیں اور اس میں بھیڑ بکریوں کی مانند اسیروں کے سر قلم کریں تاکہ نہر ان کے خون سے جاری ہو جائے۔ دو شب و روز یہ کام جاری رہا۔ پانی کا رخ پھیر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے ان کے خون سے نہر جاری کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ طبری کہتا ہے کہ ستر ہزار افراد کو قتل کر کے ان کا سر قلم کیا گیا یہاں تک کہ قعقاع نامی صحابی نے خالد سے کہا کہ اگر تم اپنی قسم کو پورا کرنا چاہتے ہو پانی کا رخ دوبارہ نہر کی طرف کر دو پانی خون کے ساتھ مل کر جاری ہو جائے گا۔

وہ کہتا ہے کہ خالد کے حکم سے نہر کا دہانہ کھول دیا گیا اور خون کی ندی جاری ہو گئی، تین روز تک چکیاں اسی آب خون سے لشکر کے لئے گیہوں پیستی رہیں۔ لشکر کی کل تعداد ۱۸ ہزار تھی۔ اس کے بعد لکھتا ہے وہاں ایک شہر امغیشیا کے نام سے جو تقریباً حیرہ کے برابر تھا خالد کے حکم سے یہ شہر بھی خاک کا ڈھیر کر دیا گیا !!

آیا ہلاکو نے بھی اس طرح کا کام کیا ہے؟ اصلاً اس طرح کا کوئی شہر آج تک خداوند عالم نے پیدا ہی نہیں کیا ہے اسی طرح قعقاع ابن عمرو جس کا نام اس نے صحابی کے طور پر ذکر کیا ہے ابھی خداوند عالم نے خلق ہی نہیں کیا ہے۔

میں نے اپنی کتاب "عبد اللہ ابن سبا" کے دوسرے حصہ میں لکھا ہے کہ یہ بات جو یورپ میں مشہور ہے کہ "اسلام شمشیر کے ذریعہ پھیلا ہے" اس کی جڑ اسی سیف زندیق کی روایتیں ہیں، میں نے وہاں اس کی خود ساختہ گیارہ جنگوں کے نام اور ان کے اعداد و شمار ذکر کئے ہیں۔ دراصل ان ہی

افسانوی روایتوں نے مغربیوں کے درمیان اس تصور کو جنم دیا ہے کہ اسلام نے تلوار کے زور پر ترقی حاصل کی ہے۔

ان ہی ناقابل قبول افسانوں کی مانند اسود عنسی اسود متنبی کی داستان ہے کہ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اس کو "ذوالخمار" یا "ذوالحمار" کہا جاتا تھا۔ اس نے ایک چوپائے کو سکھا رکھا تھا کہ سجدہ کرے اور ایسی دوسری بہت سی معمولی چیزیں سکھا رکھی تھیں، سیف بن عمر نے بہت سارے معجزات اسود کے سلسلہ میں نقل کئے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ طبری نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔

ان افسانوں سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کے معجزات بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے اسود متنبی کی مانند ہیں اور یہ بات یورپ میں ماہرین اسلام کے درمیان رائج ہے، عوام کے درمیان یہ باتیں پائی جاتی ہیں، ہم جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے لیکن وہ تو نہیں جانتے!!

ایک دوسرے افسانے میں لکھتا ہے: جنگ قادسیہ میں سعد وقاص نے عاصم ابن عمرو اور اس کے بھائی قعقاع ابن عمرو کو جو پیغمبرؐ کا صحابی ہے (کہ ان میں سے کسی کو ابھی تک خداوند عالم نے خلق ہی نہیں کیا ہے!) گائیں اور بھیڑیں تلاش کرنے کے لئے روانہ کیا لیکن انہیں کوئی چیز نہ مل سکی کیونکہ چرواہوں نے اپنی گائیں ایک جھاڑی میں چھپا رکھی تھیں لیکن گایوں نے فصیح عربی زبان میں عاصم سے کہا: "کذب عدو اللہ" (خدا کا دشمن جھوٹا ہے)

اسی داستان میں آگے بڑھ کر لکھتا ہے: کسریٰ اپنی جماعت کے ساتھ مدائن میں تھا یہ لوگ دریا کے اس طرف تھے، دریا طغیانی پر تھا، سعد نے کہا: تم میں کون ہے جو پانی میں اترنے کو تیار ہو؟ اس وقت بھی یہی عاصم ابن عمرو خود کو پیش کر دیتا ہے۔

سیف نے کوشش کی ہے کہ تمام پہلوانوں اور بہادروں کو خود اپنے قبیلے یعنی قبیلہ تمیم کی طرف نسبت دے دے (میں نے اپنی کتاب "ایک سو پچاس خود ساختہ صحابی" کے پہلے حصہ میں، تمیمی صحابیوں کے نام ذکر کئے ہیں) عاصم نے کہا میں چھ سو افراد کے ساتھ پانی میں کود پڑا بعد میں لشکران کے پیچھے پیچھے گیا جہاں کہیں کوئی گھوڑا تھک جاتا تھا پانی کے اندر گھوڑے کے پاؤں کے نیچے کی زمین اونچی ہو جاتی تھی!!

میرے خیال میں یہ تمام افسانے "سیف" نامی کسی ایک شخص کے نہیں ہیں بلکہ یہ کچھ لوگوں کا کام ہے جسے ایک ہی شخص کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ اس قدر کام، اس قدر اشعار گڑھنا، اس قدر صحابی بنانا اصولاً ایک پورے گروہ کا کام لگتا ہے۔ لیکن سب سیف کے نام سے ہے اگرچہ ہم سیف کے علاوہ کسی اور کو نہیں جانتے۔ یہ زندیق یا دوسرے زندیق، اس بات کی طرف متوجہ تھے کہ خلافت کی مشینری قریش سے ہے۔

اس زمانے میں قحطانیوں اور عدنانیوں کے درمیان خاندانی و قبائلی عصبیت پائی جاتی تھی یعنی قبیلہ قریش نیز اس کے ہم پیمانوں اور یمنیوں یعنی سبائیوں اور قحطانیوں کے درمیان بہت شدید مقابلہ آرائی تھی، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بنی امیہ کی خلافت کا خاتمہ اور بنی عباس کی خلافت کا آغاز ہونے والا تھا دراصل بنی امیہ کے زوال کا ایک سبب قبائلی تعصب اور قبائلی جنگ بھی رہی ہے، اسی زمانے میں ان کی مدح میں افسانے گڑھے جاتے ہیں۔

سقیفہ کے بعد سے ہی یہ لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے انصار قحطانی و یمانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے گرد، دربار خلافت کی مخالفت کرنے والے زیادہ تر افراد اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے، قریش، جن کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی، قبائلی تعصب کا شکار تھے اور خود سیف بھی بنو تمیم سے تھا، جو نزاریوں اور عدنانیوں سے تعلق رکھتے تھے، یہ تو ایک وجہ ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے صحابہ کے دفاع کے نام پر صاحب اقتدار حکام کے دفاع کی کوشش کی ہے، عثمان سے قبل عمرو ابن عاص مصر کا گورنر تھا، ابوموسیٰ اشعری بصرہ میں، سعد وقاص کوفہ میں اور معاویہ شام میں گورنر تھا، اور یہ چار شہر مرکز کی حیثیت رکھتے تھے، عثمان نے عمرو عاص کی جگہ پر اپنے دودھ شریک بھائی عبداللہ ابن سعد ابی سرح کو روانہ کیا، سعد وقاص کی جگہ اپنے ایک دوسرے دودھ شریک بھائی ولید کو، نیز ابوموسیٰ اشعری کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ ابن عامر کو روانہ کیا جو ابھی صرف ۲۵ سال کا تھا، خود مدینہ میں بھی ان کا چچا زاد بھائی اور داماد مروان مسلط تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ان کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔

ولید کا ماضی تو سبھی جانتے ہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہ وہ شخص ہے جس کو پیغمبر اکرم ؐ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لیئے بنی مصطلق کی طرف روانہ کیا تھا جب وہ لوگ اس کے استقبال کے لئے باہر نکلے تو یہ ڈر گیا اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ اس پر حملہ کرنا چاہتے ہیں یہ پلٹ آیا اور نبیؐ سے کہا کہ وہ لوگ جنگ پر آمادہ تھے ... . اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی: "ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا" (اے گروہ مومنین! جب کوئی فاسق تم تک کوئی خبر لائے (اس پر یقین نہ کرنا) جب تک تحقیق نہ کرلینا) چنانچہ مسلمان اس کو فاسق کہتے تھے۔

عبد اللہ ابن سعد ابن ابی سرح ظاہراً اسلام لا چکا تھا چند روز اس نے پیغمبرؐ کی خدمت میں لکھنے کا کچھ کام بھی کیا تھا بعد میں مرتد ہو کر مکہ چلا گیا اور وہاں اس نے کہا پیغمبرؐ نے مجھ سے "عزیز حمید" لکھنے کو کہا اور میں نے کہا " حمید علیم " انہوں نے کہا جو بھی لکھنا ہو لکھو۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد پیغمبرؐ نے چند افراد کو " مہدور الدم " (یعنی واجب القتل) اعلان کر دیا کہ چاہے یہ لوگ غلاف کعبہ سے چپکے ہوئے کیوں نہ ہوں قتل کر دیئے جائیں۔ ان ہی میں ایک یہ عبد اللہ ابن سعد ابن ابی سرح بھی تھا عثمان نے اس کو اپنے یہاں پنہاں کر دیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد پیغمبرؐ کی خدمت میں لیکر آئے تاکہ اس کے لئے امان نامہ حاصل کریں۔ پیغمبر اسلامؐ کافی دیر تک خاموش رہے کوئی اس کی گردن مارنے کے لئے نہ اٹھا بعد میں رسول خدا صلعم نے عثمان کی درخواست قبول کرلی لیکن حاضرین سے سوال کیا تم لوگ اس کا سر اڑانے کے لئے کیوں نہیں اٹھے لوگوں نے عرض کی ہم منتظر تھے کہ آپ گوشہ چشم سے اشارہ فرمائیں پیغمبرؐ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ پیغمبرؐ خائنۃ الاعین (خائن چشم) نہیں ہے یہ رہا عبد اللہ ابن سرح کا ماضی، وہ ولید کا ماضی تھا مروان کا ماضی بھی معلوم ہے کہ اس کو اس کے باپ کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ نے طائف میں جلا وطن کر دیا تھا، یہ باتیں کسی تشریح کی طالب نہیں ہیں۔

ولید کوفہ میں ایک یہودی جادوگر کو لایا تھا وہ مسجد کوفہ میں جادو کے کرتب دکھا کر لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کرتا تھا، اونٹ کو بٹھاتا تھا اور کسی کو اس کے دہن کی طرف سے داخل کر کے اس کے پیچھے سے برآمد کر دیتا تھا۔ اسی طرح اس نے ایک نصرانی شاعر کو بھی مسجد کوفہ کے قریب جگہ دے رکھی تھی جو راتوں کو کچھ لوگوں کے ساتھ محفل طرب جماتا تھا، خوب شراب پی جاتی تھی اور مستی کی حالت میں مسجد کوفہ سے ہو کر گذرتے تھے، ایک شخص تھا جس کو لوگ "جندب الخیر" کہا کرتے تھے جب

اس نے اس شخص کو دیکھا کہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے جادو کے کرتب دکھا رہا ہے تو اپنی تلوار سے اس کو قتل کر دیا اور کہا اگر تو سچ کہتا ہے تو اپنے آپ کو زندہ کر لے، ولید نے اس کو گرفتار کر کے قیدخانے میں ڈال دیا۔

اسی ولید نے ایک روز شراب پی رکھی تھی اور مستی کے عالم میں صبح کی نماز پڑھائی اور کہا میں اس وقت نشاط میں ہوں اگر تم لوگ چاہو تو اور زیادہ پڑھا دوں، اور سجدہ میں شعر پڑھتا ہے ؎

علق القلب ربابا ⁂ بعد ان شابت وشابا

اور پھر مسجد میں ہی قے کر دی، کچھ لوگوں نے اس کی انگوٹھی اس کے ہاتھ سے اتار لی، وہ انگوٹھی جس میں گورنری کی مہر تھی، اور اس کو خلیفہ عثمان کے پاس لے گئے اور خلیفہ نے ان لوگوں کو مارا پیٹا۔ طلحہ، زبیر، حضرت ام المؤمنین، عائشہ ان سب نے عثمان کے خلاف آواز بلند کی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ ولید کو دربار میں جواب دہی کے لئے طلب کریں۔ اور گواہوں نے ان کے سامنے اس کے شراب پینے کی گواہی دی لیکن خلیفہ نے کہا تم نے میرے بھائی کو شراب پیتے ہوئے کہاں دیکھا ہے؟ .... وغیرہ مختصر یہ کہ اس کا شراب پینا ثابت ہو گیا لیکن کوئی ولید کو حد لگانے پر تیار نہ ہوا، خود حضرت علیؑ نے اس پر حد جاری کی۔

لیکن ان کے مقابلے میں کون لوگ تھے؟ عمار یاسر، ابوذر، زید ابن صوحان عبدی، حجر ابن عدی، بڑے بڑے صاحبان خیر و تقویٰ اصحاب جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے جبکہ بقیہ خاموش رہتے تھے۔

اب آپ ملاحظہ فرمائیں سیف ابن عمر کہتا ہے کہ ولید نے شراب نہیں پی تھی وہ سو رہا تھا یہ لوگ اس کے گھر میں داخل ہو کر اس کے تخت کے نیچے چھپ گئے تھے جس وقت ولید خواب میں تھا اس کی انگوٹھی اس کے سرہانے رکھی ہوئی تھی ان لوگوں نے اس کو وہاں سے اٹھا لیا۔

اسی طرح جناب ابوذر، عمار یاسر اور دوسرے افراد کی شخصیت بگاڑنے کے لئے ان لوگوں نے عبداللہ ابن سبا کا فرضی کردار بنا ڈالا۔ سیف بن عمر لکھتا ہے کہ: اہل یمن سے عبداللہ ابن سبا نامی ایک یہودی نے زمانہ عثمان میں اسلام کا اظہار کیا اور وصایت و رجعت کے عقیدہ بیان کئے ابوذر اور عمار اس کے گرویدہ ہو گئے یہ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس یہودی نے ان

لوگوں سے کہا کہ تم لوگ ان دونوں عقیدوں کو پھیلاؤ اور تمام شہروں میں خط لکھ کر اپنے حاکم و والی کی برائی کریں" اس کے بعد تفصیل کے ساتھ کچھ باتیں بیان کرتا ہے کہ جو سب کی سب جھوٹ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طبری، جو اپنے وقت کا علّامہ تھا، اس پایہ کا حدیث شناس ہونے کے باوجود کیا بات تھی کہ ان احادیث کو نقل کرتا ہے! وہ کیوں ان افسانوں کو بیان کرتا ہے، معاویہ کا دفاع کرتا ہے، مروان، خلیفہ عثمان، گورنر عبداللہ ابن سرح، ولید اور سعید کی صفائی پیش کرتا ہے؟ قابل غور یہ امر ہے۔

چونکہ طبری کو اپنے دور میں ایک بلند علمی مقام حاصل تھا لہٰذا اس کے بعد ابن اثیر، ابن کثیر ابن خلدون تک سبھی نے صحابہ کے واقعات صرف طبری سے لئے ہیں، اور صورت حال یہ ہے کہ طبری نے پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے حوادث سے لے کر جنگ جمل تک کے واقعات سیف ابن عمر سے نقل کرتے ہوئے خوبیوں کے حامل باکردار صحابہ کو بے کردار اور آلودہ و فاسد کردار والوں کو پاک و صاف بنا کر پیش کیا ہے۔

ستّر مدارک ہیں جن میں سیف بن عمر سے احادیث نقل کی گئی ہیں ان ستّر میں صرف پانچ مدارک طبری کے زمانے سے قبل موجود تھے لیکن یہ مدارک جو طبری سے قبل کے ہیں ان میں سے ایک کو میں نے دیکھا کہ اس میں سیف سے صرف ایک یا دو حدیث نقل کی گئی ہیں۔ لیکن طبری کے بعد، مثال کے طور پر ابن عبدالبر نے استیعاب میں اصول اصحاب کے تحت، ابن اثیر نے "اسدالغابہ فی احوال الصحابہ" میں ذہبی نے تجرید میں، ابن حجر نے "اصابہ" میں اسی طرح میں اب تک ۶۵ مدارک کا جائزہ لے چکا ہوں، جنھوں نے سیف سے استفادہ کیا ہے۔

اصل میں طبری نے اس علمی منزلت کے تحت جو اسے حاصل تھی، سیف کو مقام و عزت عطا کردی اور اس کے بعد جو دوسرے لوگ آئے انھوں نے اس کی تقلید اختیار کی، البتہ یہ کہ طبری نے ایسا کیوں کیا اس میں اس کا کیا مقصد تھا، ہم کو یہاں اس سے کوئی غرض نہیں ہے، وہ خود جانتا ہے اور اس کا خدا جانتا ہے، ہم تو اس کے کام کے اثرات کا جائزہ لے رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں تاریخ میں اس نے اپنا کتنا اثر چھوڑا ہے۔ حالانکہ خود طبری کے زمانے میں کچھ ایسی تاریخی کتابیں موجود تھیں جن کے اندر یہ خرابیاں نہیں تھیں لیکن وہ فراموشی کی نذر کردی گئیں۔ وجہ یہی ہے

جو ہم عرض کر چکے ہیں ۔ جیسا کہ سیرت ابن ہشام اصل میں سیرت ابن اسحاق ہے بس فرق اتنا ہے کہ جہاں کہیں ابن ہشام کو قابل اعتراض بات لگی اس نے ابن اسحاق کی عبارت حذف کر دی ہے اسی لئے اس کو سیرت ابن ہشام کہا جاتا ہے ۔ قصہ یہ ہے کہ قوت و اقتدار کے مالک افراد اور حکومتوں کا احترام باقی رہے چاہے اس کے عوض متقی و ابرار صحابہ کی ایسی تیسی کرنی پڑے ۔

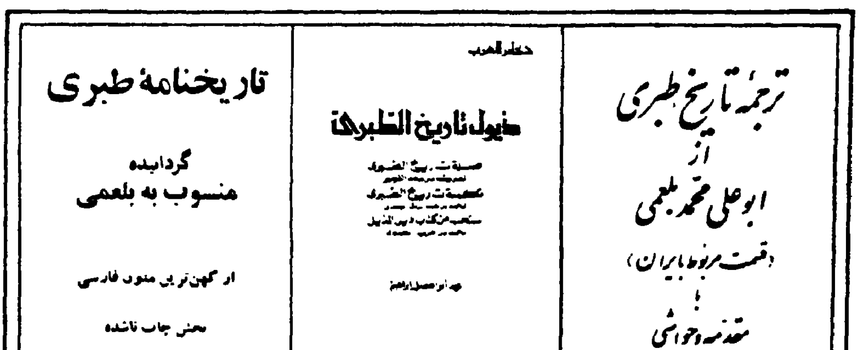
طبری اس شخص کا قول نقل کرتا ہے جس نے مالک اشتر کی شخصیت کو داغدار بنانے کی کوشش کی ہے جس نے حذیفہ کی شخصیت کو خراب کیا ہے جس نے محمد ابن ابی بکر کی شخصیت کو مجروح کیا ہے ، ہر وہ شخص جو حضرت امیرؑ سے قربت رکھتا تھا اس کی شخصیت کو خراب کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو بنی امیہ کا ہم نوا ہے اس کی مدح سرائی کرتا ہے ۔

اور یہ بات کہ طبری نے حدیث غدیر اور حدیث طیر نقل کی ہے ہماری گزشتہ باتوں کے خلاف نہیں ہے کیونکہ احمد ابن حنبل نے اور نسائی نے بھی امیر المومنین کے مناقب میں کتاب لکھی ہے ۔ ان کی نظر میں کوئی حرج نہیں ہے اگر دوسروں کے لئے ہزاروں جعلی مناقب و فضائل کے مقابل حضرت امیرؑ کی شان میں بھی فضائل و مناقب کے عنوان سے کچھ لکھ دیا جائے ۔ یہ ان فضائل کا نص کے عنوان سے ذکر نہیں کرتے ۔ ہم جس طرح وصایت پر نص کی بات کرتے ہیں وہ نہیں کرتے ، کیونکہ مشکل اسی حقیقت کا بیان کیا جاتا ہے جو دربار خلافت کو ہراساں کرتی ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہو وہ اس کے بیان میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے ! یہ لوگ حدیث غدیر کو اس عنوان سے معنی پہناتے ہیں کہ حکومت کے لئے کوئی مشکل پیدا نہ کرے ۔

"تاریخ اسلام کے واقعات کی حفاظت و صیانت میں مکتب خلفاء سے زیادہ شیعوں کا حصہ ہے ۔ اس سلسلہ میں نجاشی کی رجال اور شیخ طوسی کی "فہرست" کا مطالعہ کافی ہے ملاحظہ کیجئے ، اصحاب ائمہؑ نے کس قدر سیرت و تاریخ میں لکھا ہے ، یہ اور بات ہے کہ شیخ طوسی کے زمانے سے شیعوں کی اعلیٰ علمی درس گاہوں یعنی حوزہ علمیہ نے خود کو صرف ایک میدان تک محدود کر لیا ہے شیخ مفید نے "جمل" تحریر فرمائی ہے لیکن کیا آج ہمارے فقہا اور آیات عظام ایسے مطالب پر قلم اٹھانے کے سلسلہ میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں ؟ اور کیا ایسی کتابیں لکھنا پسند کرتے ہیں ؟

دھیرے دھیرے ہمارے علمی مراکز ایک رخ پر چل پڑے اور انھوں نے سیرت پر قلم اٹھانا ترک کردیا۔ نتیجہ میں صحیح سیرت سے متعلق روایتیں جو ائمہؑ کے اصحاب نے تحریر فرمائی تھیں، آج ہمارے پاس نہیں ہیں، فقہی حدیثوں کو شیخ صدوق کے زمانے سے کے بعد دیگرے متواتر جمع کیا گیا ان کی تحقیق و چھان بین کی گئی اور یہ سلسلہ آیت ا... بروجردی کے زمانے تک جاری رہا لیکن سیرت سے متعلق روایتیں چھوڑ دی گئیں جس کے نتیجہ میں ہم ان سے محروم ہو گئے۔ ہم حقائق سے ہاتھ دھو بیٹھے اور سیرت ابن ہشام کے مطالعہ پر مجبور ہو گئے جس نے کہ حقائق کا کتمان کیا ہے، اسی طرح ہم اسلام کی تاریخ "تاریخ طبری" سے حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے جس کی تاریخی حیثیت ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا تحریر علامہ مرتضیٰ عسکری کی ایک بالمشافہ گفتگو ہے جسے موضوع کی اہمیت اور گفتگو کی جامعیت کے پیش نظر قارئین کرام کی خدمت میں ھدیہ کیا گیا۔ (ادارہ)



جلد ۷، شمارہ ۶
ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
اکتوبر، نومبر ۱۹۹۰ء

اسلامی،
علمی،
فکری،
دوماہی رسالہ

توحید

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

- قرآن و سیرت و سنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپے
ہندوستان	۷۵ روپے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۷ ڈالر

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ ادارہ۔

خطاطی: قلیچ حسین رضوی کشمیری

توحید

جلد - شمارہ ٦

ترتیب

ربیع الاول — ربیع الثانی [illegible]ھ — اکتوبر — نومبر [illegible]ء

فکر و فلسفہ

تاریخ و سیرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔

○ مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شذرے

اب بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آیا!!

۲ اگست ۱۹۹۰ء کی رات کو عراق نے اپنے پڑوسی، اور ایران عراق جنگ میں اپنے ایک بہت بڑے حلیف و مددگار پر حملہ کر دیا۔ ایک روز کے اندر ۱۷ ہزار مربع کلومیٹر وسیع ملک پر قبضہ کرکے اس نے کویتی سلطنت کے قدم اکھاڑ دیئے اور ایک ہفتہ بعد یہ اعلان کر دیا کہ کویت عراق کا ایک حصہ ہے ساتھ ہی اس نے سعودی عرب کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دی۔ صدام کی ہوس کشور کشائی اور عرب دنیا کا ہیرو بننے کے جنون نے ایک بار پھر رنگ دکھایا۔ لیکن اس مرتبہ اس کے قریبی دوست اور مددگار اس کا نشانہ بنے۔ امام امت نے ایران عراق جنگ کے تیسرے سال ہی علاقہ کے خلیجی ممالک کو تنبیہ کرتے ہوئے صدام کی خصلت سے انھیں آگاہ فرمایا تھا:۔

"تمام ملکوں خصوصاً علاقہ کی حکومتوں کی خیر و صلاح اسی میں ہے کہ صدام کی بلند پرواز اور کینہ جو خواہشات کی تکمیل، نیز تسلط طلب اور منفعت پرست طاقتوں کی خاطر، جنھوں نے صدام کو تباہی کے جال میں گرفتار کر رکھا ہے، خود کو دنیوی ہلاکت اور اخروی عذاب الیم میں مبتلا نہ کریں . . . اور صدام عفلقی کی جنون آمیز حرکتوں اور اس کے بدترین انجام سے عبرت حاصل کریں اور یہ جان لیں کہ اگر خدانخواستہ طاقت، جاہ طلب صدام کے ہاتھ میں آ گئی تو وہ ان کے ساتھ اسرائیل سے بہتر سلوک نہ کرے گا اور اس وقت یہ حکومتیں پشیمان ہوں گی کہ وہ ایک دوسرے اسرائیل یا اس سے بھی بدتر کے پھندے میں گرفتار ہو گئی ہیں۔"

(یکم اپریل ۱۹۸۲ء)

اور ہوا بھی یہی، آج اس واقعہ نے دنیائے عرب میں کھلبلی مچا دی ہے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس زنگی مست پر کیسے قابو پایا جائے جس کے ہاتھ میں خود انہوں نے تلوار تھمائی تھی اور اب وہی اس کی زد میں ہیں۔ کل عرب ممالک کے رجعت پرست سربراہوں اور ان کے آقاؤں کے لئے یہ بات بڑی خوش آیند تھی کہ صدام ان کے حریف یعنی ایران اور اسلامی انقلاب سے جنگ کر رہا ہے۔ اسے سر سے پاؤں تک مسلح کیا اور اس کی جارحیت کو سراہتے رہے اور آج جب اس آگ نے ان کے گھروں کا رخ کیا ہے تو یہ سراسیمہ بے سروپا حرکتیں کرتے پھر رہے ہیں۔

صدام کی اس نئی جارحیت کی مخالفت علاقہ میں سب سے پہلے اسلامی ایران نے کی، اس نے اپنے اسلامی اصولوں اور بین الاقوامی قوانین کی رعایت کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کویت پر عراقی حملہ اور قبضہ کی مخالفت کی، حتیٰ صدام کی طرف سے ۱۹۷۵ء کی متنازعہ قرارداد کے تسلیم کئے جانے اور ایران کی حق آفریں فتح عظیم کے بعد بھی اس کے اصولوں میں کوئی لوچ نہیں آیا ہے۔

اقوام متحدہ نے بھی کویت پر عراقی حملہ کی سخت مذمت کی اور شاید دنیا نے پہلی بار دیکھا کہ اس حساس موقع پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے عراق کے خلاف دھڑا دھڑ قرارداد دیں پاس کیں اور اپنی مستعدی کا بھرپور ثبوت دیا، یہ یقیناً ایک لمحۂ فکریہ ہے، کیونکہ یہی صدام جب اسلامی ایران کے خلاف تمام بین الاقوامی قوانین کا مضحکہ اڑاتے ہوئے حتیٰ ایران کے بے گناہ عوام، اسکولوں اسپتالوں اور شہری آبادیوں کو بھی اپنے بموں میزائیلوں اور کیمیاوی گیسوں کا نشانہ بنا رہا تھا تو ایران کی مسلسل فریاد پر نہ اقوام متحدہ اور نہ سلامتی کونسل کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی!! اور اس کی وجہ بھی واضح ہے، کل صدام امریکہ اور عالم استکبار کے مفاد میں اسلامی انقلاب کو نابود کرنے پر کمربستہ تھا اور آج اس علاقہ میں خود امریکی مفادات خطرہ میں ہیں!!!

عرب سلاطین و حکام نے صدامی جارحیت سے محفوظ رہنے کے لئے دنیا کے سب سے بڑے جارح اور شیطان اکبر امریکہ کو دعوت دیکر اسے علاقہ میں لشکر کشی کرنے اور پیر جمانے کا سنہرا موقع فراہم کر دیا ہے، اور سب تو سب سعودی دربار کے سب سے بڑے ملا "بن باز" اور مصر کے شیخ الازہر "جاد الحق" بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، انہوں نے امریکی اور یورپی فوجوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کی حمایت میں فتوے بھی دے ڈالے۔ پتہ نہیں ان کے فتوؤں کے مقابل قرآن کریم کا یہ حکم

عالم اسلام میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔

"یاایھا الذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء"

اے ایمان والو ! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا مددگار نہ بناؤ ۔ (مائدہ/۵۱)

امریکہ نے بھی اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور لاکھوں کا عظیم لشکر ہزاروں ٹینک، توپیں، اور بمبار طیارے اور درجنوں دریائی جنگی جہاز سعودی عرب، خلیج فارس اور بحر احمر کے علاقوں میں تعینات کردیے، ساتھ ہی نیٹو کے ممبر تمام مغربی ممالک امریکہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی فوجیں اور جنگی جہاز لے کر علاقہ میں آدھمکے ہیں۔ مزید برآں کئی عرب اور مسلم ممالک نے بھی صدام کے خلاف اپنی فوجیں سعودی عرب روانہ کردی ہیں ۔ کل ملاکر دوسری جنگ عظیم کے بعد کسی ملک کے خلاف امریکہ اور مغرب کی یہ سب سے بڑی لشکر کشی ہے ۔ صورت حال دھماکہ خیز ہوتی جارہی ہے اور عصر حاضر کی سب سے بھیانک جنگ کے امکانات لمحہ بہ لمحہ بڑھتے جارہے ہیں ۔

عرب دنیا میں اس وقت زبردست خلفشار ہے ، عربیت کا نشہ ہرن ہوچکا ہے ، امریکی نوکروں کے چہرے یکے بعد دیگرے کھلتے جارہے ہیں ۔ امریکہ نے بھی خلیج فارس اور سعودی عرب میں جم کر رہنے اور دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخیروں پر اپنے پنجے گاڑ کر بیٹھنے کے عندیئے دینا شروع کردیے ہیں ۔ پورے مغرب کی لشکر کشی کا سرسام آور خرچ جس کا تخمینہ بھی اب مشکل ہوتا جارہا ہے ان ہی شیوخ نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے جو اپنے عوام کی تیل کی دولت خود اپنی حفاظت کے لئے دونوں ہاتھوں سے اپنے آقاؤں کے قدموں پر لٹا رہے ہیں جبکہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ امریکہ کو خود ان سے نہیں ، اپنے مفادات اور تیل سے محبت ہے ! اسلامی ایران کے صدر جمہوریہ جناب رفسنجانی کے بقول "اس وقت خلیج فارس اور علاقہ میں جو کچھ بھی ہورہا ہے یہ ایک خزانہ پر قبضہ کی جنگ ہے" لیکن عرب حکام کو جلد ہی اس کا احساس ہوجائے گا کہ انہوں نے چھوٹے جارح سے بچنے کے لئے بڑے جارح کو بلاکر کتنی بڑی بھول کی ہے ۔ کل انہوں نے صدام کی بے دریغ مدد کی جس کے نتیجہ میں آج علاقہ میں ایک آگ لگی ہوئی ہے اور اگر یہ بھڑک اٹھی تو یہ سب اس میں جل کر راکھ ہوجائیں گے ۔

●

اس بھیانک ڈرامہ کا ایک رخ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ایران کے قائم مقام وزیر خارجہ جناب علی محمد بشارتی کے بقول کئی ہفتوں سے یہ گمان کیا جارہا تھا کہ عراق کویت پر حملہ کرنے والا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ

امریکی صدر جارج بوش نے کویت پر عراقی حملہ کے بعد اپنے پہلے بیان میں کسی حیرت و تعجب کا اظہار نہیں کیا جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ عراق نے کویت پر حملہ امریکی ایماء پر یا اس کے بھڑکانے میں آکر کیا ہے اور اس کی چند دلیلیں بھی ہیں۔

۱۔ صدام کے غرور وانانیت کا سر کچلنے کے لئے، کیونکہ امریکہ، اسلامی ایران سے ٹکرانے والا صدام کو چاہتا ہے، اسے اپنے نوکروں کے دشمن صدام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لہٰذا یہ حملہ اس کے لئے ایک جال ثابت ہوتا کہ بین الاقوامی سطح پر اسے بری طرح ذلیل کرکے کویت سے نکلنے پر مجبور کیا جائے اور اس کا سارا غرور خاک میں مل جائے۔ (جو امریکہ چاہتا ہے)

۲۔ جب علاقہ کی حکومتوں نے دیکھ لیا کہ کویت پر عراق کا قبضہ ہوگیا اور نہ خلیج فارس کے ممالک کی باہمی تعاون کمیٹی اور نہ عرب اتحاد کسی سے کچھ نہ بنی تو انہوں نے اپنے تحفظ کے لئے علاقہ کے سارے کلیدی مراکز امریکہ کے حوالہ کردیئے اور خود کو امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ (جو امریکہ چاہتا تھا)

۳۔ اوپیک کی بڑھتی ہوئی طاقت اور تیل کے بازار پر اس کی گرفت کو دیکھتے ہوئے امریکہ اور یورپ سخت الجھن کا شکار تھے اور چونکہ خلیج فارس میں دنیا کے تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور مغرب بہرحال اس کا محتاج ہے لہٰذا اس حملہ سے اسے علاقہ میں تیل کے ذخیروں پر اپنے پنجے گاڑنے کا پورا موقع مل جائے۔ (جو امریکہ چاہتا ہے)

بہرحال ایک بات بالکل مسلّم ہے کہ خلیج فارس میں پیدا ہونے والے اس دھماکہ خیز بحران اور اس سے ہونے والی تباہیوں کا براہ راست اور سب سے زیادہ فائدہ امریکہ اور اسرائیل کو پہنچے گا اور سچ تو یہ ہے کہ موجودہ غبار آلود فضا کے اس پار ہمیں پورے عالم اسلام کا مستقبل تاریک اور اسرائیل کا دیرینہ خواب پورا ہوتا نظر آتا ہے۔

●

بحران خلیج فارس کے پس منظر میں تاریخ کا ایک اور عظیم واقعہ رونما ہوا یعنی صدام حسین نے اچانک ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کو تسلیم کرتے ہوئے قرارداد نمبر ۵۹۸ کی شرطوں کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کردیا اور اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ ۱۷؍ اگست ۱۹۹۰ء سے اس کی فوجیں ایرانی علاقہ خالی کررہی ہیں اور ۱۷؍ اگست سے ہی عراق کی جانب سے جنگی قیدیوں کی پہلی کھیپ رہا کی جا رہی ہے۔

یہ واقعہ عالمی سیاسی دنیا میں ایک زبردست دھماکہ تھا۔ ساری دنیا نے بین الاقوامی سطح پر سے عراق کی زبردست شکست اور اسلامی جمہوریہ ایران کی بے مثال فتح و کامیابی قرار دیا۔ یقیناً یہ ہماری فتح ہے ہمارے اقدار کی فتح ہے، ہمارے ایمان کی فتح ہمارے صبر و استقامت کی فتح ہے ہماری دلیریوں کی فتح ہے ملت ایران کی جاں بازیوں کی فتح ہے ہمارے جذبۂ شہادت کی فتح ہے اور ظلم و شقاوت کی شمشیروں پر ہمارے سیل خون کی فتح ہے۔ ہم کل بھی کامیاب تھے جب موت سے گلے مل رہے تھے اور آج بھی کامیاب ہیں جب اس عظیم فتح کے بعد اپنے آزاد شدہ عزیزوں کو گلے لگا رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ملت اسلام و قرآن کی عید ہے اور ہم عالم اسلام کو اسلام و قرآن کی اس عظیم فتح پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے رہبر امام خمینی قدس سرہ نے ایران عراق جنگ کے دوران ہی کامل یقین و اعتماد کے ساتھ ہمیں ہماری فتح کا مژدہ سنا دیا تھا "ما در جنگ پیروزیم و ہیچ شکی درآن نیست" یعنی ہم جنگ میں فاتح و کامیاب ہیں اور اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے"۔

اور دنیا نے دیکھا کہ ہم ہر جہت سے کامیاب سرخ رو ہوئے۔ آج سے دس سال قبل امریکہ کے ایماء پر صدام نے جن بنیادوں کو بہانہ بنا کر جنگ چھیڑی تھی، اسلامی سرزمین پر قبضہ کرنا چاہا تھا، اسلامی انقلاب کا دم اس کے گہوارہ میں گھونٹنا چاہا تھا اور اس مقصد کے لئے اس نے بین الاقوامی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور انسانی حقوق کو بے شرمی کے ساتھ قدموں تلے روندتے ہوئے ہزاروں لاکھوں بے گناہ انسانوں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو اپنے بموں، میزائیلوں اور کیمیکل گیسوں کا نشانہ بناڈالا تھا ..... اس کے مقابل ایران نے اپنے خداداد انقلابی اصولوں کی روشنی میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے موقف سے منہ نہ موڑا۔ آخر کار عراقی سفاک و جلاد حکومت نے اسلام اور اہل اسلام کی انقلابی قوت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، آج بحمد اللہ عراقی فوجیں اسلامی سرزمین سے واپس جا چکی ہیں اور دونوں طرف کے جنگی قیدیوں کا ایک بڑا حصہ اپنے اپنے وطن واپس ہو چکا ہے۔

ہماری یہ فتح و کامرانی قائد امت امام خمینیؒ کی پیغمبرانہ قیادت اور ان کے روحانی فرزند حضرت آیت اللہ خامنہ ای کی مدبرانہ رہبری کی رہین منت ہے اور یہی وجہ ہے کہ خوشی کی ان گھڑیوں

میں امام امتؒ کے فراق کا غم انگیز احساس اور بڑھ گیا ہے۔ کاش! آج امامؒ ہمارے درمیان موجود ہوتے... لیکن ہمیں یقین ہے کہ قائد امتؒ ہماری فتح و مسرت کے شاہد و ناظر ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ خداوند عالم نے اپنے لطف خاص سے ہم کو وہ بے مثال قائد و رہبر عطا فرمایا تھا جس کی پوری زندگی پیغمبر اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا آئینہ تھی، جس کی جنگوں میں صدر اسلام کی جنگوں کا جوش و جذبہ تھا اور جس کی صلح "فتح مبین" کا سرچشمہ بنی۔ کل صلح حدیبیہ کو شک و شبہ اور اسلام کے لئے ذلت کی نظر سے دیکھنے والی دنیا نے ٹھیک دو سال بعد فتح مکہ جیسی عظیم کامیابی کا مشاہدہ کیا تھا، اسی طرح قائد امتؒ کی طرف سے اقوام متحدہ کی قرارداد صلح ۵۹۸ تسلیم کئے جانے کو ایران و اسلام کی شکست و ذلت بتانے والوں نے آج دو ہی سال کے بعد حیرت و استعجاب سے اسلامی ایران کی فتح عظیم میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔

خدا ہمیں ان کی راہ پر گامزن رکھے۔ انہوں نے بارہا مختلف موقعوں پر فرمایا تھا کہ ملت اسلام ہمیشہ سربلند رہ سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ دنیاوی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خدا کی قدرت پر اعتماد کرے اور باہم متحد ہو۔

خلیج کے موجودہ بحران کا سب سے واضح حل بھی یہی ہے کہ تمام مسلمان عرب اور غیر عرب ممالک کے حکام قرآن کی روحانی آواز: "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا" پر لبیک کہیں اور اپنے علاقہ کے مسئلہ کو خود حل کرنے کے لئے قدم اٹھائیں۔ عراق اپنی فوجیں کویت سے واپس بلائے اور امریکہ مع اپنے لاؤ لشکر کے خلیج فارس سے چلا جائے تاکہ حرم الہٰی مکہ معظمہ اور حرم رحمۃ للعالمین مدینہ منورہ پر چھائے ہوئے کفر و الحاد کے یہ کالے بادل چھٹ جائیں اور یہ سب کچھ ناممکن بھی نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ اتحاد و یگانگت کی دعوت دینے والے پیغمبر اعظمؐ کی امت ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے۔

ماہ ربیع الاول میں حضور سرور کائناتؐ کی ولادت باسعادت کے مبارک ایام میں رہبر انقلاب اسلامی امام خمینی قدس سرہ نے "ہفتہ وحدت" کی داغ بیل ڈالی تھی اور پورے عالم اسلام کو کفر و الحاد کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ ہمارا فریضہ ہے کہ اس عظیم رہبر اسلام کی دعوت پر لبیک کہیں اور متحد ہو کر اپنے مسائل کا حل خود تلاش کریں۔ آج اسلام کے مقدس و متبرک مقامات، کفر و الحاد کے لشکروں کے نرغے میں ہیں۔ اب تک سعودی حکام کے زیر سایہ مسلمان جیسے تیسے حج جیسی عظیم عبادت میں شرکت کرتے رہے، مار دھاڑ اور قتل و غارت کے باوجود یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ اب بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آیا تو موجودہ صورت حال میں اس عبادت اور ان مقامات مقدسہ کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔

جناب سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضلؒ

تفسیر

سورہ نساء آیت نمبر ۴۰ — ۴۳

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً
يُضَٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٤٠﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا
مِن كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ
يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَعَصَوُا۟ ٱلرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ ٱلْأَرْضُ
وَلَا يَكْتُمُونَ ٱللَّهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾

ترجمہ:
بلاشبہ، اللہ عزّ اسمہ کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی نیکی کرے تو اللہ اسے دوگنا کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے (۴۰) (سوچو) اس وقت کیا حالت ہوگی، جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے محمدؐ) آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے (۴۱) اس دن ــ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور رسول کی نافرمانی کی، یہ چاہیں گے کہ وہ پیوندِ خاک ہو جاتے، وہ اللہ جلّ جلالہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے (۴۲)

تفسیر:

۴۰۔ ان اللہ لایظلم مثقال ذرۃ ....

راہ خدا میں مال خرچ کرنے، اور بھلائی کے کام کرنے والوں کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ اللہ عزاسمہ، رحیم و رحمٰن ہے وہ کسی کو اس کے عمل کا بدلہ کم نہیں دیتا، کسی پر ذرا سا ظلم روا نہیں رکھتا وہ ہر عمل خیر کا بدلہ بڑھا چڑھا کر دے گا۔ پھر اپنے حضور سے مزید بڑے بڑے ثواب مرحمت فرمائے گا

۴۱۔ فکیف اذا جئنا من کل امۃ ....

میدانِ حشر میں ساری مخلوق موجود ہوگی اس وقت کے لئے کچھ اعمالِ صالحہ جمع کر لینا چاہئے وہ سفر کی آخری منزل اور جزا و سزا کا طویل ترین لمحہ ہوگا، ہر ایک کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں اور رسول، نبی یا امام اپنی امت کے ساتھ حضورِ الٰہی میں لایا جائے گا۔ اور ان سب معصوم گواہوں پر حضرت خاتم الانبیا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطور گواہ کل سب کے آگے ہوں گے، ان کے پیچھے امتِ وسط کا ایک معصوم گروہ یعنی ائمۂ اطہار علیہم السلام، ان کے عقب میں مسلمان امت ان کے عقب میں انبیاء و مرسلین اپنے اپنے عہد کے لوگوں کو لئے ہوں گے۔

شفیع و شہید

سورۃ البقرہ، آیت ۱۴۳، النحل/۸۹، الحج/۷۸، النساء/۶۹ اور آل عمران کی آیت ۸۶ سے جو باتیں واضح ہوتی ہیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بارہ امام اعمال امت سے ہمہ وقت باخبر رہتے ہیں اور ان کے شہید ہونے کا مفہوم بھی یہی ہے اور اسی بنیاد پر انھیں حق شفاعت عطا ہوا ہے۔

حدیث

الکافی میں ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے "فکیف اذا جئنا من کل امۃ ....." کی تفسیر میں فرمایا: یہ آیت امتِ مسلمہ کے بارے میں اتری ہے، اس امت کے ہر دور میں ہم میں سے ایک امام ہوگا وہی امت کا شاہد ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ ہم پر گواہ ہوں گے۔

اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون" توبہ آیت/۱۰۵ کی

تفسیرِ واضح یہی ہے کہ خاص مومن یعنی ائمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی مسلم ہے۔

۴۲ ۔ یومئذ یود الذین کفروا .....

حشر کے دن گناہوں کی فہرست اور گواہوں کی صورت دیکھ کر، اللہ کے منکر اور پیغمبر کے نافرمان کہیں گے، زمین پھٹے اور وہ اس میں چلے جائیں، زمین انہیں یوں چھپالے کہ نشان قبر باقی نہ رہے تاکہ کھلی رسوائیوں سے بچ جائیں۔ مگر یہ خیالات ان کو مزید دکھ دیں گے، اب وہ کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔ نامۂ اعمال میں ان کے شرک و کفر و نافرمانی کا کچا چٹھا لکھا ہوگا، گواہ سامنے ہوں گے، عالم الغیب و الشہادۃ اللہ عزوجل محاسب ہوگا۔ مردِ مومن، ہمہ وقت ایسے لمحات کی یاد میں توبہ اور اللہ سے رجوع رکھتا ہے۔ یہی طریقِ تقویٰ اور راہِ نجات ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا
الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا
إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً
فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿۴۳﴾

ترجمہ:

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! نماز کے قریب نشے کی حالت میں نہ جاؤ تاکہ تم کو یہ معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور نہ جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ سفر کررہے ہو یہاں تک کہ غسل کرلو۔ اور اگر بیمار ہو یا مسافر یا بیت الخلا سے فارغ ہوکر آئے ہو۔ یا بیویوں سے مباشرت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے۔ تو پاک مٹی کا قصد کرو۔ اور مسح کرو۔ اپنے چہرے اور ہاتھوں کا۔ یقیناً اللہ معاف کرنے، بخشنے والا ہے ﴿۴۳﴾

تفسیر

لاتقربوا الصّلوٰۃ وانتم سکاریٰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نماز دین کا ستون ہے ، اس بنا پر اس فریضے کی انجام دہی میں اہتمام واجب ہے ۔ اس اہتمام میں ایک بات یہ ہے کہ نشے کی حالت میں نماز ادا نہ کی جائے ۔ نشہ ممنوع ہے کہ نماز میں اظہار بندگی ، اقرار توحید اور سراپا عاجزی کا بیان اگر زبان کے ساتھ عقل و فکر کی ہم آہنگی نہ ہو تو نماز کا مقصد حاصل نہیں ہوگا ۔ نماز میں جو کچھ کہنا اور پڑھنا ہے وہ بقائمی ہوش و حواس پڑھنا چاہیئے کہ تزکیہ نفس و حصول قرب کا مدعا حاصل ہو سکے ۔ یہ آیت حرمت شراب کیلئے سند ہے ۔ سورۃ البقرہ کی آیت دو سو انیس میں شراب کو مذمت میں جوے کا شریک کیا اور سورۃ المائدہ /۹۰ میں شراب سے اجتناب کو واجب اور حرمت شراب کو حتمی کر دیا ۔

حلبی نے امام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو امام نے " سُکر " کے معنی بتائے "سکرالنوم" مطلب یہ ہے کہ اونگھ اور نیند کی زیادتی تمہیں تکبیر و رکوع و سجود میں سمجھنے نہیں دیتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔ یہ خیال غلط ہے کہ مومن شراب میں مست ہو سکتے ہیں ۔ مومن تو نشہ آور چیز نہ پیتا ہے نہ وہ نشے میں رہتا ہے ۔ (تفسیر عیاشی)

الکافی میں ایک باب ہے " انّ الخمر لم تزل محرّمۃ " شراب ہمیشہ حرام رہی ہے اس ضمن میں کلینی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد احادیث نقل کیے ہیں ۔ اور ڈاکٹر فرانسس ویکفلڈ نے شواہد اسلامیہ و مسیحیہ و یہودیہ میں تورات و انجیل کے حوالے بھی دیئے ہیں ۔ شراب گزشتہ امتوں میں حرام تھی ۔ نیز دیکھئے کتاب " امثال سلیمان نبی ۔ کتاب " اشعیا نبی " اور " انجیل لوقا "

ـــ ولاجنباً الّا عابری سبیل ـــ اس سے فقہانے دو حکم معلوم کئے ہیں ۔

(الف) جنب کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے ، ایسے شخص پر نماز سے پہلے غسل کرنا واجب ہے ۔

(ب) جنابت کی حالت میں مسجد کے اندر داخلہ حرام ہے ۔ لا تقربوا ۔ یعنی ـ ولا تدخلوا جنباً فی الصّلوٰۃ الّا عابری سبیل ـــ اور صلوٰۃ سے مراد مسجد ہے اصلاً اور حقیقتاً یا مظروف سے ظرف یعنی نماز سے مکان نماز مراد ہے ۔ تفسیر کا یہ نکتہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے ۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ مسجد نبی میں کھلنے والے سب دروازے بند کرنے کا حکم آنحضرتؐ نے جاری فرما دیا صرف اپنا اور حضرت علیؑ کا دروازہ کھلا رہنے کی اجازت دی کہ اللہ عزّ وجل کی رضا یہی تھی۔

— حتّٰی تغتسلوا — جو شخص جُنُب ہو وہ سفر کی حالت میں بھی بلا غسلِ جنابت کئے نماز نہ پڑھے۔ یا مجنب افراد غسلِ جنابت کرنے کے بعد ہی مسجد سے گزر سکتے ہیں۔ دیکھئے المائدہ/۶ آیت میں — صلوٰۃ — ایک جملے میں دو معنوں میں استعمال ائمہ اہل بیتؑ اور دوسرے مفسرین کی توضیح و تعیین کی بنا پر جائز ٹھہرا ہے۔

— وان کنتم مرضیٰ او علیٰ سفرٍ — نماز پڑھنا ہو اور بیماری کی بنا پر پانی کا استعمال نقصان دہ ہو یا سفر میں پانی دستیاب نہ ہو ان صورتوں میں تیمم کی اجازت ہے۔

— او جاء احد منکم من الغائط ..... رفع حاجت کر کے آنا۔ نہایت اعلیٰ استعارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وضو یا غسل کی حالت تھی اور رفعِ حاجت کی ضرورت پڑی یا لمسِ نساء — مباشرت کرلی اس کے بعد نماز کا وقت آگیا اور نماز پڑھنا چاہی لیکن رفع حاجت کرنے والے کو وضو کے لئے اور مباشرت کرنے والے کو غسل کے لئے پانی میسّر نہ ہو تو ان دونوں کو تیمم کی اجازت ہے۔

تیمّم

— فتیمموا صعیداً طیبًا، فامسحوا بوجوھکم —

تیمم، لغت میں "قصد کرنا" اور اصطلاحِ شرع میں معیّن طریقے سے ہاتھ اور چہرے پر مٹی سے مسح کرنا ہے۔

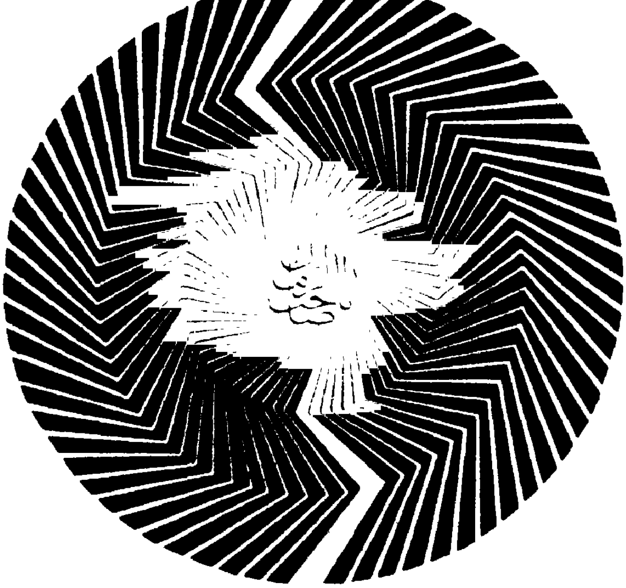
— صعید — خاک یا سطحِ زمین۔

"بوجوھکم" میں "ب" کچھ اور بعض کے معنوں میں ہے۔ یعنی چہرے اور ہاتھوں کے بعض حصّے۔ یہ بعض حصّے حدیث سے معیّن ہوتے ہیں۔ تیمم کے بارے میں پوری گفتگو سورۂ مائدہ کی چھٹی آیت میں ہوگی۔ یہاں، تیمم کے طریقے کا سادہ بیان درج ہے۔

نیت کے ساتھ، دونوں ہتھیلیوں کو انگلیاں ملاکر خاک پر مارنا، پھر خاک جھاڑ کر، بالوں کے اُگنے کی جگہ سے بھوؤں اور دونوں کنپٹیوں کے درمیان یوں پھیرنا کہ پوری پیشانی پر دونوں ہتھیلیوں کے آخری حصے مسح کریں، اس میں ناک کا بالائی حصہ بھی آجائے۔ پھر داھنے ہاتھ سے گٹے سے لے کر ناخنوں کے سرے تک پشت دست اور اس کے بعد سیدھی ہتھیلی سے الٹے ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت پر کلائی سے ناخنوں کے کنارے تک مسح کرے۔ مسح کے وقت پیشانی اور جس ہاتھ کا مسح کرنا ہے اسے ہلنا نہ چاہیئے۔

ـــ انّ اللہ کان عفوّاً ... ـــ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے وہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے، بندے کو اس کے عفو و غفران سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

غبار آلود، ہاتھ اور منہ عاجزی کا بہترین اظہار ہے۔ پیشانی پر خاک علامت ہے کہ بندہ حضور الٰہی میں رحمت طلبی کو حاضر ہے۔



حضرت عیسیٰ

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

عیسائیوں کے درمیان مشہور تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰ ۱۹۸۱ سال پہلے[1] فلسطین کے ایک شہر "بیت اللحم" میں پیدا ہوئے تھے۔ البتہ خود بعض عیسائیوں کی تحقیق کے مطابق یہ تاریخ قطعی نہیں ہے۔ اس میں اصل تاریخ سے پانچ سال یا اس سے بھی زیادہ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ نے فلسطین کی فضا میں آنکھ کھولی جو اس زمانہ میں سلطنت روم کے زیر تسلط تھا۔ اس سلطنت میں جنگ و جدال، طاقتوں کا ٹکراؤ، زور و زبردستی، گہرے طبقاتی اختلافات اور انواع و اقسام کی بت پرستیاں رائج تھیں اور اگرچہ دین یہود ان علاقوں میں پایا جاتا تھا، لیکن اسے قانونی اور حکومتی دین کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ مزید یہ کہ خود یہودی بھی بہت سی گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ دنیا پرستی، سود خوری، دھوکہ، چالبازی، کینہ و انتقام، خرافات پھیلانا، خود دینی پیشواؤں کا دین کو تحریف کرنا اور بے چارے عوام کا مال ہڑپ کرنا نیز پیغمبروں کو قتل کرنا۔ مختصر یہ کہ دنیا طلبی، ظلم و تعدی، کمزوروں کے حقوق کی پامالی اور جنگ و جدال اس زمانہ کی خصوصیات میں سے تھے۔ ایسے ماحول میں اخلاقی و معنوی دعوت کی سخت ضرورت تھی جو لوگوں کو شرافت اور صفا و محبت کی فضا سے روشناس کرے۔ چنانچہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ کو بھیجا۔ ذیل میں ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت کو قرآنی نقطۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں۔

---

[1] یہ مقالہ آج سے تقریباً ۱۰ سال قبل لکھا گیا ہے (مترجم)

عیسیٰ قرآن کی نظر میں

خود حضرت عیسیٰ کی ولادت گویا ایک معجزہ تھی۔ سورۂ مریم کی آیت ۱۵ کے بعد ارشاد ہے:۔

(اے رسولؐ) اس کتاب میں مریم کو یاد کرو۔ جب وہ اپنے عزیزوں کے پاس سے مشرق کی جانب ایک مقام پر گئیں اور لوگوں سے الگ ہو کر اپنے اور ان کے درمیان حجاب قائم کر لیا اور ہم نے اپنی روح کو ان کے پاس بھیجا جو ان کے سامنے ایک کامل اور آراستہ انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔ مریم نے کہا اگر تو پرہیزگار ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہارے پروردگار کا پیغامبر بن کر آیا ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ پسر عطا کروں۔ مریم نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں صاحب اولاد ہوجاؤں جب کہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہی ہوں۔ اس نے کہا ایسا ہی ہے۔ تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ بات میرے لئے آسان ہے تاکہ ہم اسے پیدا کرکے لوگوں کے لئے اپنی قدرت کی نشانی اور رحمت قرار دیں۔ اور یہ امر طے شدہ ہے۔ (غرض) مریم حاملہ ہوئیں اور لوگوں کی نگاہوں سے دور ایک الگ جگہ چلی گئیں۔ پھر درد زہ نے انہیں کھجور کے ایک سوکھے درخت کے تنے تک پہنچا دیا اور انہوں نے کہا اے کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور لوگ مجھے بھول جاتے....." تا آخر۔

بعد کی آیات میں حضرت عیسیٰ کی ولادت، جناب مریم کے عزیزوں کی ان کو شماتت و طعنہ زنی اور گہوارہ میں حضرت عیسیٰ کے کلام کرنے کا تذکرہ ہے۔ اس طرح بلاشبہ جناب مریم کا حمل بلا کسی آمیزش کے وجود میں آیا۔ اب ہم نہیں جانتے کہ اس واقعہ کو ایک کنواری (پاکیزہ) خاتون کا ماں بننا قرار دیں یا معجزہ کہیں۔ بہرحال قرآن نے جناب مریم کے دامن کو ان تمام اتہامات و الزامات سے پاک و بری قرار دیا ہے جو یہودی ان پر لگا رہے تھے کہ حتیٰ عیسائیوں کے بعض آثار و کتب میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔ اور یہ قرآن کی جانب سے خود جناب مریم اور عیسائی دنیا کی ایک بڑی خدمت ہے۔

حضرت مریم کی شخصیت: قرآن کریم جو حق کو بیان کرنے اور خرافات و تحریفات کو دور کرنے

کے لئے نازل ہوا ہے، اس نے انبیاء کرامؑ اور ان سے وابستہ دیگر شخصیتوں کا بہترین انداز میں ذکر کیا ہے۔ منجملہ ان کے مریمؑ کے بارہ میں یہ فرماتا ہے:۔

"وہ جس کا دامن آلودگیوں سے پاک رہا ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اسے اور اس کے فرزند کو دنیا والوں کے لئے نشانی قرار دیا" (انبیاء / ۹۲)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

"اور مادر عیسیٰ صدیقہ و راستگو تھیں" (مائدہ / ۷۸)

ایک اور جگہ قرآن فرماتا ہے:۔

"جس وقت فرشتوں نے کہا: اے مریم بلاشبہ خدا نے تم کو منتخب فرمایا، پاک و پاکیزہ قرار دیا، اور تمہیں تمام عالمین کی عورتوں میں انتخاب کیا ہے۔ اے مریم اپنے پروردگار کے حضور خالص عبادت و بندگی کرو سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ہمراہ رکوع بجا لاؤ" (آل عمران / ۴۲ - ۴۳)

مذکورہ بالا تینوں آیتوں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم پاکدامن، صدیقہ، پاک و پاکیزہ، منتخب پروردگار اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھیں۔ انھیں خدا کی جانب سے بندگی و عبادت کا حکم دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب عیسائیوں کے پیغمبر جناب عیسیٰ کی ماں اس عظیم مرتبہ پر فائز ہوں تو اس دین کی بنیاد کس قدر باعظمت و استوار ہی ہوگی اور یہ امر کس قدر مایۂ افتخار ہوگا۔

حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت

بہتر ہے کہ قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے:۔

"عیسیٰؑ ابن مریم اللہ کے رسول کے سوا کچھ نہیں ہیں ان سے پہلے کتنے انبیاء دنیا سے جا چکے ہیں ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔ دونوں غذائیں کھاتے تھے۔ دیکھو ہم ان کے لئے کس طرح اپنی نشانیاں بیان کرتے ہیں...." (مائدہ / ۷۸)

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

بلاشبہ عیسیٰؑ ابن مریم خدا کے رسول اور کلمۃ اللہ ہیں کہ خداوند عالم نے انھیں

مریم کی طرف بھیجا۔ وہ اللہ کی روح ہیں۔ یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ اپنی اس بات سے پھر جاؤ، یقیناً خدا ایک ہے۔ وہ اس سے منزہ ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے..... "

(نساء / ۱۷۰ - ۱۷۱)

ان آیات سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ ایک انسان اور جناب مریم کے فرزند ہیں۔ وہ اللہ کے فرزند اس کے شریک یا اس کے مانند نہیں ہیں۔ سہ گانہ پرستی یعنی تثلیث کا عقیدہ باطل ہے۔ عیسیٰؑ اللہ کے رسول، کلمۃ اللہ اور اس کی روح ہیں۔

نیز سورۂ مریم آیات ۳۰ - ۳۲ میں ارشاد ہے :۔

" عیسیٰؑ نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے کتاب عطا کی گئی ہے اور مجھے نبی قرار دیا گیا ہے۔ میں جہاں بھی ہوں باعث برکت ہوں۔ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے کہ جب تک زندہ ہوں انھیں بجا لاؤں اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کا سلوک کروں (خدا نے) مجھے ستمگر اور سخت دل قرار نہیں دیا ہے"

اس آیت سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ اللہ کے بندہ ہیں، نہ خود خدا ہیں اور نہ اس کے بیٹے، وہ پیغمبر ہیں، صاحب کتاب اور صاحب دین ہیں، وہ "مبارک" ہیں لہٰذا ان سے کسی کو کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ مجسم برکت و محبت ہیں (جبکہ اکثر مقامات پر انجیل میں اس کے خلاف ملتا ہے) نیز وہ "جبار و شقی" بھی نہیں تھے، بلکہ اس ماحول میں بھی جہاں خونخوار اور جباروں کی حکومت تھی یا جہاں یہودی پیشوا و علماء ہوس پرست اور دنیا طلب ہو گئے تھے اور دین کی آڑ میں لوگوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے، آپ رحم دل، مہربان اور صاحب برکت تھے۔

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۱۱۰ میں ارشاد ہے :۔

"جب خداوند عالم نے فرمایا: اے عیسیٰؑ بن مریم! ہم نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو نعمتیں نازل کیں انھیں یاد کرو کہ جب تم نے گہوارہ میں اور یوں ہی بڑے ہونے کے بعد لوگوں سے کلام کیا اور جب ہم نے تمہیں کتاب و حکمت اور توریت و انجیل

کی تعلیم دی، اور جب تم مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونکتے تھے تو وہ میرے حکم سے سچ مچ کا پرندہ بن جاتا تھا اور اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور مُردوں کو میرے حکم سے قبر سے اٹھا دیتے تھے (یعنی زندہ کر دیتے تھے) ......"

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے مرتبۂ نبوت اور ان کی علمی حیثیت و عظمت کا ذکر کیا گیا ہے ساتھ ہی جو معجزات انہوں نے انجام دیئے ہیں ان کا ذکر بھی ہوا ہے؛ خاص طور سے اس نکتہ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ یہ تمام معجزات خدا کے حکم سے انجام پائے ہیں۔ یعنی اگر انہوں نے انسانی قوت و توانائی سے بڑھ کر کوئی کام انجام دیا ہے تو یہ ان کا کام نہیں تھا بلکہ یہ قدرت پروردگار تھی۔

بنابرایں جناب عیسیٰؑ ایسے پاک و پاکیزہ و صاحب عظمت انسان اور پیغمبر ہیں جو صاحب کتاب، صاحب شریعت اور صاحب معجزہ ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن ان کی رفتار و کردار اور اخلاق و سیرت کا ذکر بھی فرماتا ہے ......

انجیل اور حضرت عیسیٰؑ کی ذمہ داری

سورۂ صف کی آیت ۶ میں ارشاد ہے:۔

"جب عیسیٰؑ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور یہ کتاب توریت جو میرے سامنے ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں نیز تمہیں ایک ایسے رسولؐ کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آنے والا ہے اور اس کا نام احمدؐ ہو گا۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ تا ۵۱ میں ارشاد ہے:۔

"عیسیٰؑ ابن مریم پیغمبر ہیں جو بنی اسرائیل کی جانب آئے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ میں تمہارے پروردگار کی جانب سے نشانیاں اور معجزے لے کر آیا ہوں ...... اور یہ توریت جو میرے سامنے ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ جو بعض چیزیں تم پر حرام کر دی گئی تھیں انھیں تم پر حلال کر دوں۔ میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر نشانیاں لایا ہوں، پس خدا سے ڈرو اور میری

پیروی کرو۔ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ پس اس کی پرستش و عبادت کرو، یہی راہ راست ہے۔"

نیز سورۂ مائدہ کی آیت ۴۶، کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :۔

"ہم انکے آثار کے بعد عیسیٰؑ ابن مریم کو لائے جو اپنے سامنے موجود توریت کی تصدیق کرتے تھے اور ہم نے انھیں انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور ہے اور ان کے سامنے موجود توریت کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اور صاحبان تقوا کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔"

مذکورہ بالا آیات سے ہمیں حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :۔

۱۔ عیسیٰؑ ابن مریم بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تشریف لائے اور قوم یہود کے درمیان رائج گمراہیوں کے خلاف جدوجہد ان کی رسالت کی بنیاد و اساس تھی (لیکن جیسا کہ ہم آئندہ پڑھیں گے پیغمبر اسلامؐ تمام عالمین کی ہدایت کے لئے تشریف لائے تھے۔)

۲۔ دین عیسائیت توریت اور انجیل میں نازل ہونے والے احکام کا مجموعہ ہے، یہ دیکھتے ہوئے کہ دین یہود میں جو بعض چیزیں حرام اور عقاب و سزا کی موجب تھیں اس دین میں ان کی حرمت کو برطرف کر دیا گیا۔ اس طرح جناب عیسیٰؑ کا دین دراصل دین یہود کے دائرہ میں ہی آتا ہے اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے۔

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کی رسالت ظہور اسلام کے ساتھ ہی تمام ہو جاتی ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ اور ان کا دین ہمیشہ کے لئے انسانیت کے رہبر نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ہمیں قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کی آیتوں میں پیغمبر اسلامؐ کے نام اور ان کی آمد کی خوشخبری کی بھی صراحت موجود تھی اور اگر موجودہ انجیلوں میں ہمیں یہ صراحت نظر نہیں آتی تو ہمیں اس واقعیت اور دوسرے حذف شدہ حقائق کو اصلی انجیلوں میں دیکھنا چاہئے۔

۴۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کی اساس توحید اور خدائے واحد کی اطاعت و بندگی رہی ہے۔ آپ خود کو خدا کا بندہ سمجھتے تھے اور خدا کی پرستش و عبادت کو ہی صراط مستقیم قرار دیتے تھے۔ (جبکہ کلیسائی مبلغین اس کے خلاف عقائد پیش کرتے ہیں)

۵ ـــ حضرت عیسیٰؑ صاحب اعجاز تھے اور یہ معجزے ان کی دعوت کو صحیح ثابت کرتے تھے ۔

۶ ـــ انجیل چند حسب ذیل مطالب پر مشتمل ہے :۔

ہدایت، نور، موعظ و نصیحت، تقویٰ کی دعوت، اطاعت پروردگار نیز بعض قید و بند اور اسارتوں سے رہائی و آزادی ۔

حضرت عیسیٰؑ کا صعود کرنا

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا انجام ہے ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ۳۰ برس سے ۳۲ برس کی عمر تک یعنی تین سال تک لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دی اور دعوت جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، دنیا پرستی اور ظلم و بربریت میں گرفتار ان یہودیوں کو نجات دلانے اور راہ راست پر لانے کے لئے تھی جنھوں نے دین موسیٰؑ میں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، دینی رہبروں اور راہبوں نے اپنی من مانی کے ذریعہ دین میں بہت سے خرافات کو جنم اور رواج دے رکھا تھا اور توریت کی تحریف ہو چکی تھی ۔ اس لئے حضرت عیسیٰؑ یہودیوں کو اجتماعی و اخلاقی فساد اور گمراہی نیز اعتقادی و مذہبی کج روی سے نجات دلانے کے لئے تشریف لائے تھے ۔ لیکن ان کی سب سے بڑی مخالف بھی یہی قوم تھی ۔ بہت تھوڑے سے لوگ آپ پر ایمان لائے اور اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کے بے شمار فیوض و برکات اور خدمات، آشکار معجزے اور دلنشین نصیحتیں معاشرہ کے محروم افراد پر بہت گہرا اثر ڈالتی تھیں، لیکن ہوا و ہوس کے پجاری نیز موقع پرست یہودی جو حضرت عیسیٰؑ کی مسالمت آمیز اور روح پرور دعوت کو اپنی دنیا پرستی اور ظلم و ستم کے منافی دیکھ رہے تھے ان کے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوئے ۔

آخر کار ان لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی سازش تیار کی، اور حضرت کی اس قدر برائی و بدگوئی کی کہ حاکم شہر انھیں مجرم قرار دیدے اور ان کے خلاف حکم صادر کر دے ..... عیسائیوں کے یہاں یہ مشہور ہے کہ عیسیٰؑ کو بڑی ذلت کے ساتھ گرفتار کیا گیا اور قتل کے مجرموں اور چوروں کے ہمراہ ان کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا ۔ یہودی اس قضیہ کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئے ......

اور یہ بات عیسائیوں کی پوری تاریخ میں مشہور ہو گئی کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی ذمہ داری یہودیوں کی گردن پر ہے (اگرچہ ادھر چند صدیوں سے سیاسی مصالح کے پیش نظر کلیسائی حکام کے درمیان یہ بات رائج کی گئی کہ عیسیٰؑ کے قتل کے ذمہ دار یہودی نہیں تھے، تاکہ اس دیرینہ دشمنی کو دور کیا جائے اور مسلمان مخالف معاشرہ میں ان کا اتحاد وسیع تر ہوتا جائے)......

لیکن قرآن حضرت عیسیٰؑ کی ظاہری زندگی کے آخری لمحات کے بارہ میں جو کچھ بیان کرتا ہے۔ اسے سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ - ۱۵۸ میں ملاحظہ فرمائیں :-

"اور یہودی یہ کہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰؑ نبی خدا کو قتل کر ڈالا جبکہ نہ انہوں نے انھیں قتل کیا ہے اور نہ انھیں سولی دی ہے بلکہ یہ امر ان کے لئے مشتبہ ہو گیا ہے۔ یقیناً جو لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں اختلاف کا شکار ہوئے۔ اس (عیسیٰؑ) کی نسبت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی علم یا کوئی خبر نہیں رکھتے۔ بس اٹکلیں لگاتے ہیں، یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا ہے۔ بلکہ خدا نے انھیں خود اپنی طرف اٹھا لیا ہے۔ خدا زبردست تدبیر والا ہے اور اس کے سارے کام حکمت والے ہیں۔"

مذکورہ آیات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہودی قتل عیسیٰؑ کے دعویدار ہیں اور وہ اس پر فخر بھی کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ واقعہ ہی سرے سے اشتباہ پر مبنی ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کو دشمنوں کے چنگل سے نجات عطا کی اور انھیں آسمان پر اٹھا لیا ہے۔

اسلامی مآخذ میں یہ مشہور ہے کہ "یہودا" جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے ایک تھا حضرت سے خیانت کر کے ان دشمنوں سے جا ملا، جو آپ کی سخت تلاش میں تھے اور اسی نے عیسیٰ کے ٹھکانے تک ان لوگوں کی رہنمائی کی لیکن اس سے پہلے کہ آپ کے دشمن وہاں پہنچ کر آپ کو گرفتار کریں حضرت عیسیٰؑ خداوند عالم کی نسبت سے آسمان کی جانب صعود کر گئے۔ جب دشمن وہاں پہنچے تو چونکہ وہ حضرت عیسیٰ کو بخوبی نہیں پہچانتے تھے لہٰذا وہاں موجود یہودا کو ہی عیسیٰ سمجھ کر گرفتار کر لیا اس نے لاکھ کہا کہ میں عیسیٰ نہیں ہوں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور اسے دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس طرح یہ تصور کر لیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی دے دی گئی۔

البتہ عیسائیوں کی روایات میں بھی یہ بات ملتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تین روز بعد قبر سے زندہ برآمد ہوئے اور آسمان کی جانب صعود کر گئے۔

یہ تھا ان باتوں کا خلاصہ جو ہمیں عیسیٰؑ اور عیسائیت کے بارے میں قرآن سے معلوم ہوتی ہیں۔

سزائیں اور تجسم اعمال

جناب شیخ حسین نوری
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

جیسا کہ ہم گزشتہ مقالہ میں عرض کر چکے ہیں، معاد سے متعلق مباحث کے ذیل میں جب یہ بات مسلم و ثابت ہے کہ قیامت کے دن انسانی اعمال کا جائزہ لیا جاتا ہے اچھے اعمال اچھی جزا اور برے اعمال برے نتائج و سزا سے روبرو ہوتے ہیں، بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ کیا قیامت میں اعمال کا بدلہ خود ان اعمال کے مجسم ہونے کی صورت میں ملتا ہے؟ اور یہ خود انسانی اعمال ہیں جو اس دنیا میں نیک و بد چہروں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور ہر انسان کو بعینہ خود اس کے اعمال واپس کر دیئے جاتے ہیں اچھے اعمال "بہشت" اور اس کی نعمتوں کی صورت میں اور برے اعمال "جہنم" اور اس کے عذاب کی شکل میں، یا یہ کہ خود اعمال، اعمال کی جزا نہیں ہیں بلکہ اعمال کی جزا ان کے آثار ہیں جو ان ہی کے پیدا کردہ اور ان ہی کے مرتب کردہ ہوتے ہیں؟

علماء کے ایک گروہ نے پہلی بات اور ایک گروہ نے دوسری بات کہی ہے، وہ گروہ جو بڑی ہی صراحت کے ساتھ پہلی بات کہتا ہے ان میں شیخ بہائی نے کتاب اربعین میں، علامہ طباطبائیؒ نے تفسیر "المیزان" میں اور شہید مطہریؒ نے کتاب "عدل الٰہی" میں اسی رخ پر زور دیا ہے، جن کا اقتباس ہم گزشتہ مقالہ میں پیش کر چکے ہیں، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ فقیہ و فلسفی شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے بھی اپنی کتاب "الفردوس الاعلیٰ" میں اسی راہ کو اپنایا ہے، یہ عالم بزرگ "معاد جسمانی" کی بحث میں یہ کہنے کے بعد کہ: "بعینہ یہی بدن میدان محشر میں واپس ہوتا ہے" مزید فرماتے ہیں کہ: "نہ صرف

یہ قابل محسوس صورتیں (انسانی بدن، واپس پلٹتی ہیں، بلکہ تمہارے ہر اچھے اور برے عمل میں مضمر حقیقتیں، صفات وملکات اور اعمال کے جوہر وہاں پلٹ کر ظاہر و مجسم ہوتے ہیں، یہ چغلخوری اور نمامی بچھو ہے جو تم کو ڈنک مارتا ہے، بڑوں کے سامنے ان کے چھوٹوں یا ماتحتوں کی برائی اور عیب چینی زہریلا سانپ ہے جو تم کو ڈس لیتا ہے، غیبت کرنا، مردہ کا گوشت ہے جو تم کھاتے ہو اسی طرح ہر وہ جرم و گناہ جو تمہارے اعضائے بدن ــ ہاتھ، پاؤں اور زبان ــ نے انجام دیا ہے، اپنی مناسب شکلوں کے ساتھ تمہاری طرف پلٹ آتا ہے اسی طرح ہر وہ اچھا کام جو تم نے انجام دیا ہے حسین و زیبا شکلوں میں تمہاری طرف پلٹ آتا ہے اور تم ان سے انس محسوس کرتے ہو۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: ووجدوا ما عملوا حاضرا ولا یظلم ربك احدا[۱] یعنی: جو کچھ انہوں نے کیا تھا اپنے سامنے حاضر پایا، اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ نیز فرماتا ہے: "وما ظلمنا هم ولکن کانوا انفسهم یظلمون[۲]" یعنی ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "انما تجزون ما کنتم تعلمون[۳]" یعنی تم نے جو کچھ انجام دیا ہے جزا کے طور پر تمہارے سامنے ہے، اور اس کے بعد شیخ اضافہ فرماتے ہیں:ــ

"جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ اس آیۂ کریمہ کے اندر کوئی شئے محذوف و مقدر ہے جس کے تحت انھوں نے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ: تم نے جو کچھ انجام دیا ہے اس کے بدلے میں تمہیں جزا دی جاتی ہے" صحیح نہیں ہے کلام میں کسی طرح کی حذف و تقدیر نہیں پائی جاتی، اور مقصود یہ ہے کہ تم کو بعینہ خود تمہارے عمل کے ذریعہ سزا ملتی ہے اور تمہاری سزا خود تمہارے اعمال ہیں۔

اور حدیث میں ہے کہ روز قیامت خداوند عالم اپنے بندوں سے فرماتا ہے:ــ

"اعمالکم ردّت الیکم" یعنی تمہارے اعمال بعینہ تم کو واپس کر دیئے گئے ہیں، البتہ یہ اعمال اپنے جوہر و حقیقت کے ساتھ یعنی اپنی اصل شکل میں واپس کئے گئے ہیں" بنابرایں جو کچھ بھی دنیا میں ہے مجاز ہے۔ حقیقت اس دوسری دنیا میں ظاہر و مجسم ہوتی ہے، بہرحال کہنے کا مطلب

---

۱ کہف / ۴۹
۲ طور / ۱۶
۳ نحل / ۱۱۸

یہ ہے کہ: قیامت میں انسانوں کے اعمال مجسم ہوتے ہیں"۔ یہاں تک کہ آخر کلام میں آپ فرماتے ہیں: "شیخ بہاء الدین نے اپنی کتاب "اربعین" میں بعض اہل معرفت سے نقل کیا ہے کہ (حسد، تکبر، بخل اور غرور کے مانند) مذموم صفات (واعمال) قیامت کے دن سانپوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں" جبکہ اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ ہم کہیں: مذموم صفات (بری عادتیں) اس وجود میں عیناً سانپ ہیں نہ یہ کہ سانپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ دنیا آخرت کا غلاف ہے یعنی دنیا کھال اور چھلکے کے مانند ہے اور آخرت مغز و حقیقت ہے اور آخرت اس وقت بھی دنیا کے باطن میں موجود ہے (البتہ ہم جب تک دنیا میں ہیں اس کو درک نہیں کرتے)

جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: یعلمون ظاھراً من الحیوٰۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون" (روم/۷)

یعنی: زیادہ تر لوگ دنیوی زندگی کی ظاہری صورت سے واقف ہیں اور آخرت سے غافل ہوتے ہیں۔ یستعجلونک بالعذاب وانّ جہنم لمحیطۃ بالکافرین (عنکبوت/۵۴)

یعنی: کفار تم سے آخرت کے عذاب میں جلدی کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ جہنم اس وقت بھی کفار کو گھیرے ہوئے ہے اس عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ آج بھی عذاب جہنم ان کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے (کیونکہ ان کے اعمال ہی یعنہ ان کے جہنم ہیں)"۔[۱]

نیز آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ منجملہ ان مقامات کے جہاں یہ بحث چھیڑی گئی ہے زبور آل محمدؐ یعنی صحیفۂ سجادیہ پر سید علی خاں کی شرح بھی ہے جو "ریاض السالکین" کے نام سے موسوم ہے۔ آپ نے ۱۲ سال کے عرصہ میں اپنی ۵۴ تقریروں کے درمیان صحیفۂ سجادیہ کی تمام ۵۴ دعاؤں کی بڑی ہی دقت کے ساتھ عالمانہ شرح کی ہے، اپنی اس شرح میں صحیفہ کی ۴۱ ویں دعا کے ذیل میں جس کا عنوان یہ ہے:۔

"ومن دعائہ (ع) فی طلب الستر والوقایۃ"

یعنی اعمال کی پردہ پوشی چاہتے ہوئے حضرت (امام زین العابدین علیہ السلام) کی دعا۔ دعا کے الفاظ یہ ہیں:۔

اللّٰھم صلّ علیٰ محمد وآلہ وافرشنی مھاد کرامتک و

[۱] الفردوس الاعلیٰ، ص ۱۷۳ - ۱۷۷۔

اوردنی مشارع رحمتك واحللنی بحبوحة جنتك ولاتسمنی بالرّد عنك ولاتحرمنی بالخیبة منك ولاتقاصنی بما اجترحت ولاتناقشنی بما اکتسبت ولاتبرز مکتومی ولاتکشف مستوری ولاتحمل علیٰ میزان الانصاف عملی ولاتعلن علیٰ عیون الملاء خبری اخف عنهم مایکون نشره علیّ عاراً واطوعنهم مایلحقنی عندك شناراً شرف درجتی برضوانك واکمل کرامتی بغفرانك وانظمنی فی اصحاب الیمین ووجّهنی فی مسالك الآمنین واجعلنی فی فوج الفائزین واعمربی مجالس الصالحین آمین ربّ العالمین“

یعنی بارالٰہا محمدؐ وآل محمدؐ پر رحمت نازل فرما اور میرے لئے اعزاز واکرام کے بستر بچھادے اور اپنی رحمتوں کے آب زلال سے مجھے سیراب فرما، مجھکو آغوش بہشت میں جگہ عطا کر اور اپنی بارگاہ مرحمت سے دور نہ کر اور ناامیدی کے ساتھ اپنی بارگاہ سے محروم نہ فرما، تیری بارگاہ میں اگر مجھ سے کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں تو ان کا مواخذہ نہ کر، میرے کردار ورفتار پر نکتہ نہ نکال، میرے راز کو ظاہر نہ کر اور میرے رموز کو فاش نہ فرما" میرے عمل کو عدالت کی ترازو پر نہ تول۔ اور میرے اسرار کو دوسروں کی نظروں میں برملانہ کر اور جس چیز کا دوسروں کے درمیان پھیلنا میرے لئے شکست کا سبب ہو اسے مخفی قرار دے اور وہ طومار جو نامۂ اعمال کی سیاہی وبربادی کی حکایت کے سوا کچھ نہیں ہے لپیٹ دے، مجھکو بلند وبالا مقام ملکوت میں جو نیری رضا اور رضوان کی منزل ہے جگہ عنایت فرما" اور اپنی اس عنایت سے میرے شرف میں اضافہ فرما اور میری انسانی کرامت کو اپنی بخشش ونوازش کے ذریعہ کامل بنا مجھے سلسلۂ اصحاب یمین میں قرار دے اور مجھکو امان یافتہ افراد کے زمرہ میں شمار فرما، مجھے گروہ فائزین میں قرار دے اور مجھ کو شائستہ وصالحین کی بزم میں

رونق کا وسیلہ بنا دے آمین رب العالمین۔"

اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے کہ: "لاتحمل علی میزان الانصاف عملی" "میرے عمل کو عدالت کی ترازو پر نہ تول" فرماتے ہیں:۔

"قرآن کریم کی آیتوں اور اہل بیت علیہم السلام کی روایتوں میں قیامت کے دن "وزن اعمال" اور "میزان اعمال" کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے:۔

"والوزن یومئذٍ الحق فمن ثقلت موازینه فاولٰئك هم المفلحون ومن خفت موازینه فاولٰئك الذین خسروا انفسهم بما كانوا بآیاتنا یظلمون" (اعراف/۸-۹)

"یعنی آج اعمال کا تولا جانا حق ہے پس جن کے (اعمال کے) پلے بھاری ہوں گے یقیناً فائز المرام ہوں گے اور جن کے (نیک اعمال کے) پلے ہلکے ہوں وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیات پر ظلم و نافرمانی کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

نیز خدا فرماتا ہے:۔

ونضع الموازین القسط لیوم القیٰمة فلا تظلم نفس شیئاً وان كان مثقال حبةٍ من خردلٍ اتینا بها وكفیٰ بنا حاسبین

(انبیاء/ ۴۷)

"ہم قیامت کے دن کے لئے عدل کی ترازوئیں نصب کرتے ہیں اور کسی ایک شخص پر بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا اس کا حساب ضرور کیا جائے گا اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔"

اور حضرت پیغمبر اسلامؐ ماہ رمضان کی آمد کی مناسبت سے اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جو شخص مجھ پر زیادہ درود بھیجتا ہے خداوند عالم روز قیامت اس کی ترازو (ئے اعمال خیر) کو زیادہ وزنی کر دے گا۔" نیز آنحضرتؐ فرماتے ہیں: "بندہ کو روز قیامت خداوند عالم کے سامنے حاضر کرتے ہیں اور اس کے حسنات و اعمال خیر کو ایک پلہ پر اور گناہوں کو دوسرے

پلہ پر رکھتے ہیں۔۔۔" یہی وہ منزل ہے جہاں علمائے اسلام قرآن مجید اور دینی احادیث میں مذکور وزن و میزان کی کیفیت کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں کہ آیا یہ تعبیرات الٰہی عدل و انصاف کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ روز قیامت انسانی اعمال کے سلسلہ میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے گا اور ان تعبیرات کا مطلب یہ ہے کہ انسانی اعمال کا جائزہ لینے کے بعد جزا یا سزا کا دیا جانا عدل الٰہی کی بنیاد پر ہوگا یا یہ کہ اس سے مراد واقعی طور پر اعمال کا تولا جانا ہے یعنی کیا عملی طور پر اچھے اور بُرے اعمال ترازو کے دو پلّوں پر تولے جائیں گے ؟

عالم اسلام کے بزرگ عالم دین شیخ مفید رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں : قیامت کے دن اعمال کے وزن کرنے سے مراد یہ ہے کہ اعمال اور اس کی جزا و سزا کے درمیان توازن کا رفرما ہے یعنی حساب کتاب عدالت کی بنیاد پر لیا جائے گا اور اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہاں دو پلّے والی ترازو نصب ہو اور اس میں اعمال تولے جائیں کیونکہ اس قسم کی باتیں جسم و جسمانیات سے مخصوص ہیں اور انسانی اعمال کا تمام اعراض[1] میں ہوتا ہے اور عرض کو تولا اور ناپا نہیں جا سکتا۔

اسی طرح بھاری ہونا اور ہلکا ہونا ثواب و طاعت میں کمی و زیادتی کی طرف اشارہ ہے اور ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرآن عربی زبان و لغت کے اعتبار سے نازل ہوا ہے اور عربی کلمات میں کنایہ و مجاز کثرت سے موجود ہے۔

لیکن ایک دوسرے بزرگ عالم دین شیخ بہائی نے فرمایا ہے کہ اس طرح کے تعبیرات (وزن، میزان، بھاری ہونا ہلکا ہونا) کو ہم ان کے اصل معنی پر حمل کرتے ہیں، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسانی نامۂ اعمال کو تولتے اور وزن کرتے ہیں، بلکہ چونکہ روز قیامت خود اعمال مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا بھاری ہونا یا ہلکا ہونا، جو اجسام کی خصوصیات میں سے ہے ان کے لئے بھی صادق آتا ہے۔

بنابرایں خود اعمال تولے اور وزن کئے جاتے ہیں اور یہ جو کہتے ہیں کہ اعمال عرض ہیں

---

[1] عرض فلسفہ کی اصطلاح میں ایسے وجود کو کہتے ہیں جو بالذات قائم نہیں ہوتا اس کے برخلاف جوہر وہ ہے جو قائم بالذات ہوتا ہے۔

اور عرض کو تولا اور وزن کیا نہیں جاسکتا، صحیح نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے ایک چیز دنیا میں عرض ہو اور عالم آخرت میں جوہر ہو۔ ایک نئی دنیا اور نئے وجود کے ساتھ اشیاء کے ظہور اور خصوصیات میں بھی تبدیلی عین ممکن ہے ناقابل قبول نہیں ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ایک چیز عالم بیداری میں ایک مخصوص خاصیت کی حامل ہوتی ہے اور وہی چیز عالم خواب میں دوسری خاصیت پیدا کر لیتی ہے[1]۔

یہ بھی عالم بزرگ سید علی خان کی عبارت جو انھوں نے صحیفۂ سجادیہ کی شرح میں تحریر فرمائی ہے۔ صاحب "بحار الانوار" علامہ مجلسی نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے وہ بہشت و جہنم، ثواب و عذاب اور بالآخر جزا و سزا کو انسانی اعمال سے جدا قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو اعمال کی بنیاد پر مرتب ہونے والے آثار و نتائج کا نام دیتے ہیں، چنانچہ شیخ بہاؤ الدین عاملی کی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد جس میں انھوں نے شدت کے ساتھ پہلے نظریہ کی طرفداری کی ہے، علامہ مجلسی کہتے ہیں: "شیخ بہائی کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس نظریے کے تحت عرض (انسانی اعمال) کا جوہر[2] میں تبدیل ہونا لازم آتا ہے اور عرض کا جوہر میں تبدیل ہونا یا بالعکس جوہر کا عرض میں تبدیل ہونا محال ہے۔

اور اس سلسلہ میں دنیا و آخرت کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا اور یہ کہ دنیا میں تو عرض کا جوہر میں تبدیل ہونا محال ہو اور عالم آخرت میں یہ تبدیلی ممکن ہو قابل قبول نہیں ہے یہ ایک طرح کے سفسطہ اور مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے، کیونکہ آخرت میں ملنے والا وجود دنیوی وجود کے ہی مانند ہے ان کے درمیان محض اتنا فرق ہے ایک موت سے قبل ہے اور ایک موت کے بعد ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں وجودوں کے درمیان موت کا واقع ہونا ایک امر محال کو ممکن نہیں بنا سکتا۔ اس کے بعد علامہ مجلسی لکھتے ہیں: آیات و روایات جو بظاہر اعمال کے مجسم ہونے پر دلالت کرتے ہیں قابل توجیہ ہیں اور ناگزیر طور پر مورد توجیہ قرار پاتے ہیں[3]۔

---

[1] ریاض السالکین - سید علی خان ص ۳۹۹

[2] علامہ مجلسی علیہ الرحمہ کا مقصود یہ ہے کہ انسانی اعمال (جن کا مقولۂ عرض سے تعلق ہے (فلسفیوں نے تمام موجودات کو دس مقولات میں تقسیم کیا ہے ان میں سے ایک مقولہ عرض ہے) اگر روز قیامت مجسم ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے یہ عرض سے جوہر میں تبدیل ہوں اور یہ ایک امر محال ہے۔

[3] بحار الانوار جلد ۷، ص ۲۲۰

اس سلسلہ میں علامہ مجلسی کی گفتگو سے متعلق یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اس دنیا اور عالم آخرت کے درمیان فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ " ایک موت سے قبل اور ایک موت کے بعد ہے " بلکہ ان کے درمیان اس سے کہیں زیادہ وسیع و عمیق فرق ہے، چنانچہ جیسا کہ قرآنی آیات و روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عالم آخرت میں بنیادی طور پر موجودات ایک دوسری ہی چہرے اور خد و خال میں دوبارہ ظاہر ہوں گے آخرت کی دنیا وہ دنیا ہے جہاں ہر چیز زندہ ہے، یہ وہ دنیا ہے جہاں زمین و زمان گفتگو کرتے ہیں، اور انسانی بدن کے اعضاء و جوارح اس کے اعمال کی گواہی دیتے ہیں مغرور و متکبر افراد چیونٹی، چغل خور بندر اور حرام خور سوّر کی شکل میں محشور ہوتے ہیں[1] اور وہ نار یائے جو ظالموں اور ستمگروں کے ہاتھوں میں رہے ہیں، سانپوں کی صورت میں محشور ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ عالم آخرت وہ دنیا ہے جہاں حقائق ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور تمام چیزیں اپنی اصلی و باطنی شکل میں آشکار ہو جاتی ہے ۔

عالم افسردہ است نام او جماد ؛ جامد افسردہ بود ای اوستاد

باش تا خورشید حشر آید عیان ؛ تا ببینی جنبش جسم جہان

مردہ اینسو یند و آنسو زندہ اند ؛ خامش اینجا و آنطرف گویندہ اند

اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ عرض کے جوہر میں تبدیل ہونے کی بحث اساسی طور پر قیامت کے دن اعمال کے مجسم ہونے سے مربوط نہیں ہے ۔ عالم آخرت میں نہ صرف انسانوں کے اعمال ایک دوسری شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے بلکہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو دنیا میں ایک مخصوص چہرہ رکھتی ہیں اور اس دنیا میں دوسرے چہرے اور شکل میں ظاہر ہوں گی اور یہ بات اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کی احادیث کو دیکھنے سے روشن ہو جاتی ہے، ہم نمونے کے طور پر ان میں سے کچھ چیزیں پیش کرتے ہیں ۔

۱۔ قرآن مجید

جیسا کہ معلوم ہے قرآن مجید اس دنیا میں ایک ایسی مقدس کتاب کی صورت میں ہے،

---

[1] بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۲۱۶

جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس میں انسانوں کے لئے ایک مہذب و مدون زندگی بسر کرنے کا اصول و قوانین پیش کئے گئے ہیں لیکن اسلامی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں یہی کتاب ایک دوسری صورت اور شکل میں ظاہر ہوگی۔"

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سعد خفاف نامی ایک شخص سے فرماتے ہیں: ۔

"اے سعد! قرآن کو یاد کرلو کیونکہ قرآن روز قیامت بہترین شکل و صورت میں ظاہر ہوگا اور اس وقت جبکہ میدان حشر میں لوگ ایک لاکھ ۲۰ ہزار صفوں میں کھڑے ہوں گے جن میں ۸۰ ہزار صفیں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتیوں کی ہوں گی اور ۴۰ ہزار صفیں دیگر پیغمبروں کی امتوں کی ہوں گی۔ (قرآن مجید) پہلے تو مسلمانوں کی صفوں کی طرف رخ کر کے انھیں سلام کرے گا اور وہ لوگ اس کا حسن وجمال اور عظمت و شوکت دیکھ کر حیرت زدہ ہو گے اور کہیں گے " لا الــہ الا اللہ الحلیم الکــریم " یہ شخص جو اس قدر جمال و نورانیت اور عظمت کا حامل ہے کون ہے؟

اس کے بعد وہ شہدائے راہ خدا کی طرف جائے گا وہ بھی اس کا حسن وجمال اور شکوہ و جلال دیکھ کر خیرہ ہوجائیں گے اور کہیں گے "لا الــہ الا اللہ الرب الرحیم" یہ شخص اس قدر شکوہ و عظمت اور روشنی و زیبائی کا حامل ہے گویا شہدائے دریا سے ہو یہی وجہ ہے کہ اس کو اس قدر عظمت و اہمیت اور جمال و شکوہ دیا گیا ہے!! (غالباً خشکی اور دریا میں شہید ہونے والے شہدائے راہ خدا کے درمیان فرق واضح کرنا مقصود ہے)

وہاں سے وہ شہدان دریا کی طرف بڑھے گا وہ بھی جس وقت اس کو دیکھیں گے اس کی عظمت و جلالت کو دیکھ کر متعجب ہوں گے اور کہیں گے" اس شکوہ و عظمت کا حامل یہ شخص شہیدان دریا سے ہے مگر شاید وہ جزیرہ اور وہ نقطہ جہاں اس کو شہادت نصیب ہوئی ہے اس جزیرے اور نقطے سے جہاں ہم شہید ہوئے ہیں زیادہ بلند و پر خطر مقام ہو۔

پھر وہ وہاں سے بھی گزر کر پیغمبران خدا کی شکل میں انبیا علیہم السلام کی صف کی طرف اس شان سے آئے گا کہ پیغمبران خدا اس کے شکوہ و عظمت کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے

اور کہیں گے : "لاالٰہ الّا اللہ الحلیم الکریم" یہ بھی گویا کوئی پیغمبر ہے لیکن بہت زیادہ عظمتوں کا حامل ہے ۔ اس کے بعد وہ سب کے سب جمع ہو کر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے : اے محمدؐ ! یہ شخص کون ہے ؟

پیغمبر اسلامؐ ان سے فرمائیں گے : کیا تم لوگ اس کو نہیں پہچانتے ؟

وہ کہیں گے ، نہیں ہم اس کو نہیں پہچانتے مگر اتنا جانتے ہیں کہ یہ رحمت الٰہی سے مالا مال ہے ۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ فرمائیں گے : یہ لوگوں پر خدا کی حجت ہے ۔ اس کے بعد وہ وہاں سے بھی آگے بڑھ کر فرشتوں کی طرف خدا کے ایک مقرب فرشتہ کی شکل میں آئے گا جب فرشتے اس کو اس عظمت و جمال کے ساتھ دیکھیں گے تعجب کریں گے اور کہیں گے : ہمارا پروردگار بزرگ و مقدس ہے !! گویا لگتا ہے کہ یہ شخص فرشتوں میں سے ہے اور اسی لئے اس کو اس قدر عظمت و اہمیت اور شکوہ و جلالت حاصل ہے ۔

اس کے بعد وہ وہاں سے بھی آگے بڑھ کر زیر عرش الٰہی ٹھہرے گا اور سجدہ میں گر جائے گا اس وقت خداوند عالم اس کو آواز دے گا : "اے روئے زمین پر میری حجت ! اے میرے صادق و ناطق کلام ! " اپنا سر اٹھا اور جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے طلب کر تجھکو دیا جائے گا اور شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی ۔

جب وہ سر کو بلند کرے گا ، خداوند عالم اس سے خطاب فرمائے گا ۔

تو نے میرے بندوں کو اپنے سلسلہ میں کیسا پایا ؟

وہ جواب میں کہے گا : "پروردگارا ! ایک گروہ نے میرے حق کا پاس و لحاظ رکھا اور میری تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے میرے راستے پر قدم بڑھایا لیکن ان میں سے ایک گروہ نے میری پروا نہ کی اور میرے حق کو سبک خیال کرتے ہوئے میری تعلیمات پر توجہ اور عمل نہ کیا اور باوجود اس کے کہ میں تمام لوگوں کے لئے حجت و دلیل ہوں انھوں نے میری تکذیب کی ۔"

اس وقت خداوند تبارک و تعالیٰ فرمائے گا : "مجھکو میری عزت و جلال و عظمت کی قسم آج ان لوگوں کو بہترین جزا ملے گی جو تیرے اندر درج اصول و قوانین پر عمل پیرا رہے ہیں ، اور ان لوگوں کے لئے شدید ترین و دردناک ترین عذاب ہے جنھوں نے تیری رہنمائیوں

سے روگردانی کرتے ہوئے ان پر عمل نہیں کیا ہے۔"

اس کے بعد قرآن لوگوں کی طرف رخ کرے گا اور جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے ان کے قریب آکر کہے گا:۔

"میں وہی ہوں جس کے انس میں تم راتوں کو بیدار رہا کرتے تھے، اور میری تعلیمات کو عملی شکل عطا کرنے کے لئے تم زحمتیں اور اذیتیں برداشت کیا کرتے تھے، آج کا دن وہ دن ہے کہ ہر شخص کو اس کی کارکردگی اور زحمتوں کا نتیجہ دیا جائے گا۔ میں آج تمہارا پشت پناہ ہوں اس کے بعد اپنا چہرہ پروردگار عالم کی طرف پھیر کر کہے گا: پروردگارا! تیرے بندے نے جس کے حال سے تو بہتر طور پر واقف ہے میری تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں خود کو زحمت میں مبتلا کیا اور اس نے ہمیشہ میرے حق کا پاس و لحاظ رکھا ہے۔ میرے لئے اس نے دوست بنائے اور میرے ہی لئے اس نے دشمن بنائے ہیں۔

اس وقت خدا فرمائے گا: میرے اس بندے کو اب بہشت میں لے جا کر بہشتی لباس میں ملبوس کرو اور اس کے سر پر بہشت کا تاج رکھ دو۔"

پھر خدا فرمائے گا میں اپنی عزت و جلالت کی قسم کھاتا ہوں آج اس طرح کے افراد کو میں پانچ باتوں سے نوازتا ہوں:۔

۱۔ یہ ہمیشہ جوان رہیں گے، ہرگز پیری ان کے قریب نہیں آئے گی۔
۲۔ ہمیشہ صحت مند و تندرست رہیں گے کبھی ان پر بیماری عارض نہ ہوگی۔
۳۔ ہمیشہ غنی و تونگر رہیں گے، فقر و تنگدستی کبھی ان پر سایہ فگن نہ ہوگی۔
۴۔ ہمیشہ شاد و خرم رہیں گے، کبھی ان پر حزن و اندوہ طاری نہ ہوگا۔
۵۔ ہمیشہ زندہ رہیں گے، موت کبھی ان کی تلاش میں نہ آئے گی۔

۲۔ ماہ رمضان المبارک

ہمیں معلوم ہے کہ "ماہ رمضان" سال کے ۱۲ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے، اور خصوصی عظمت و خصوصیت کا حامل ہے اسی مہینہ میں قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اسلام کی ایک نہایت ہی

اہم عبادت "روزہ" اس ماہ میں واجب قرار دیا گیا ہے لیکن یہی ماہ رمضان روز قیامت ایک دوسری ہی شکل میں محشور ہوتا ہے۔

تفسیر حضرت امام حسن عسکریؑ میں وارد ہوا ہے کہ روز قیامت خداوند عالم "ماہ رمضان" کو ایک نہایت ہی حسین و خوبصورت شکل میں محشور کرے گا، اور اس کو ایک بلند مقام پر جگہ عطا کرے گا تاکہ تمام اہل محشر اس کو دیکھ سکیں، اور بہشتی لباسوں میں سے بہت سارے لباس اور طرح طرح کی پوشاکیں اور زیورات اس کے اختیار میں دے دیئے جائیں گے۔

اس کے بعد ایک منادی عرش الٰہی سے آواز دے گا کہ اے لوگو! آیا اس باعظمت چہرے والے کو پہچانتے ہو، یہ کون ہے؟

لوگ جواب میں کہیں گے: پروردگارا! ہم اس باعظمت چہرے کو نہیں پہچانتے۔

الٰہی منادی آواز دے گا: یہ ماہ رمضان ہے، کتنے ایسے لوگ ہیں جو اس کے طفیل اہل سعادت بن گئے اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اس کے ذریعہ اہل شقاوت قرار پائے۔

اب یاد رکھو! ہر وہ مومن جس نے ماہ رمضان میں خدا کی عبادت کو عظیم سمجھا ہے اور اس ماہ میں اپنے فرائض ادا کئے ہیں، قریب آئے اور اپنی طاعت و عبادت کے مدارج کے اعتبار سے ان خلعتوں میں سے اپنا حق لے لے، اس کے بعد وہ مومن افراد جنھوں نے اس ماہ میں طاعت خدا کی راہ میں قدم بڑھایا ہے، اور اپنے فرائض پر عمل کیا ہے آگے بڑھیں گے اور ان خلعتوں میں سے اپنی اطاعت اور عمل کی سنجیدگی کے اعتبار سے لباس لے کر زیب تن کریں گے۔

لیکن وہ افراد جو ماہ رمضان کے احترام اور اس کی اہمیت کے قائل نہ تھے، اور جنھوں نے اس ماہ میں اپنے فرائض پر عمل نہیں کیا۔ انھیں آتشیں لباس پہنا دیئے جائیں گے۔[1]

اس طرح کے نمونوں سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ روز قیامت حقائق کے آشکار ہونے اور موجودات عالم کے باطنی و حقیقی چہروں کے نمایاں ہونے کا دن ہے، بنابریں: اعمال کا مجسم ہونا، اور اعمال کے ذریعہ ہی اعمال کا بدلہ ملنا، چونکہ ایک قرآنی و حدیثی حقیقت ہے، لہٰذا ایسا ہونا بعید نظر نہیں آتا۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷ ص ۱۹۰

خدا کی فطری معرفت

جناب استاد محمد تقی مصباح یزدی
ترجمہ، جناب سید ولی الحسن رضوی

آیۂ میثاق

سورۂ اعراف میں خدا ارشاد فرماتا ہے :۔

"واذ اخذ ربّك من بنی آدم من ظهورهم ذرّیتهم واشهدهم علیٰ انفسهم الست بربّکم قالوا بلیٰ شهدنا ان تقولوا یوم القیامة انّا کنّا عن هٰذا غافلین . او تقولوا انّما اشرك آباؤنا من قبل وکنّا ذرّیة من بعدهم افتهلکنا بما فعل المبطلون" (آیت /۱۷۲،۱۷۳)

"اور (اے رسولؐ یاد دلاؤ) وہ وقت جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدمؑ کی پشت سے ان کی اولاد کو باہر نکال کر خود ان ہی کو ان پر شاہد و گواہ قرار دیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں ؟ تو سب نے اقرار کیا کیوں نہیں، ہم گواہ ہیں (اور خدا نے یہ کام انجام دیا) تاکہ روز قیامت تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس بات سے غافل تھے، یا یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے ہی شرک اختیار کر رکھا تھا اور ہم ان کی اولاد تھے (اور ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے تھے) تو کیا تو ہم کو ان

باطل پرستوں کے غلط کام کی سزا میں تباہ کر دے گا؟"

یہ آیتیں تفسیر کے اعتبار سے قرآن کریم کی مشکل آیتوں میں سے ہیں، اور مختلف پہلوؤں سے تفصیلی بحث کی طالب ہیں لیکن اگر ہم ان تمام بحثوں کو یہاں چھیڑتے ہیں تو جو مقصد ہے ہم اس سے دور ہو جائیں گے مفسرین ان آیات کے ایک ایک جملہ کی توضیح اور ان کے درمیان باہمی ربط پیدا کرنے نیز ان کا اصل نچوڑ پیش کرنے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں کے ایک ایک جملوں کے سلسلہ میں بہت سارے سوالات ہیں یہاں تک کہ بعض نے کہہ دیا ہے کہ ہم ان آیتوں سے کچھ بھی سمجھ نہیں پاتے۔ یہ متشابہ آیتوں میں سے ہے اور اس کے علم کو اس کے اہل افراد کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگرچہ ان آیات کے دقیق نکتوں میں ابہامات پائے جاتے ہیں اور ان کا متشابہات سے ہونا بھی صحیح ہے پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ متشابہ آیات سے کسی طرح کا استفادہ نہیں کیا جا سکتا، اور کسی بھی عنوان سے ان سے شبہات کا دور کیا جانا ممکن نہیں ہے؟ دونوں آیتوں پر غور کرنے سے ایک بات تو پوری طرح روشن و واضح ہے، اگر مسئلہ ہے بھی تو یہ کہ اس بات کو قبول کرنے کی صورت کیا ہو؟ یعنی مسئلہ دراصل ہماری کوتاہی فہم کا ہے نہ یہ کہ آیت سے کوئی بات پتہ نہیں چلتی۔ آیت واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ خدا نے انسانوں کی ایک ایک فرد کو اپنے آمنے سامنے حاضر کر کے ان سے یہ سوال کیا ہے: کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ اور انھوں نے جواب دیا، کیوں نہیں تو ہی ہمارا خدا ہے اور یہ ایک ایک انسان سے خدا کا رو برو سوال کرنا اس لئے ہے کہ مشرکین کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم سرے سے اس توحید اور یکتا پرستی کی طرف سے غافل تھے یا یہ کہہ سکیں کہ ہم اپنے باپ دادا کی پیروی کی وجہ سے مشرک ہو گئے تھے۔ اس کا گناہ ہمارے بزرگوں کے سر ہے، ہم ذمہ دار نہیں ہیں، یہ کہ قرآن کی آیات ہم کو اس مطلب تک پہنچانا چاہتی ہیں اس بات میں کوئی شک نہیں ہے، ابہام اس میں ہے کہ ہم اپنے اندر کسی ایسی شئی کا وجود نہیں پاتے جو بتائے کہ ہم کبھی خدا کے روبرو حاضر ہو چکے ہیں اور خدا نے ہم سے پوچھا ہو کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ اور ہم نے جواب دیا ہو کہ کیوں نہیں، چونکہ اس طرح کی کوئی علامت ہم اپنے اندر نہیں پاتے اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ہم کو ملتا ہے اس لئے مشکل پیش آتی ہے کہ ان آیتوں سے اس بات کا کیسے استفادہ کریں؟ ورنہ

یہ کہ یہ آیتیں اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ البتہ یہاں چند سوالات کہ یہ (ہمارا اور خدا کا آمنا سامنا) کس عالم میں ہوا؟ کن حالات میں ہوا؟ اجتماعی تھا یا انفرادی؟ پیش آتے ہیں لیکن آیت کے اس مطلب اور اس بیان میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا کیا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ بلا استثناء ایک ایک فرد خدا سے روبرو ہوئی ہو اور اس کے اور خدا کے درمیان اس طرح کی گفتگو ہوئی ہو؟ اس مکالمہ اور خدا سے روبرو ہونے کے سلسلہ میں جو مفہوم بھی تصور کیا جائے بہرحال یہ طے ہے کہ یہ باتیں غائبانہ یا پس پردہ انجام نہیں پائی ہیں کہ کوئی کہیں سے آواز بلند کرے اور پوچھے آیا میں فلاں نہیں ہوں؟ اور آپ بھی جواب میں آواز دیں کیوں نہیں تو فلاں ذات ہے، یہ بات اہمیت نہیں رکھتی یہ کام اس انداز سے ہونا چاہئے کہ قابل خطا نہ ہو، قابل اشتباہ نہ ہو، ورنہ آپ کے لئے عذر کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے مثلاً اگر شیطان آواز دے کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ اور ایک شخص یہ خیال کرے کہ خدا کی آواز ہے اور جواب دے کہ کیوں نہیں، تو یہ چیز قابل خطا ہے یعنی اگر صرف آواز کانوں تک پہنچے تو اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ بولنے والی فلاں ذات ہے، گفتگو میں عذر اور تطبیق میں غلطی کی گنجائش اسی وقت باقی نہیں رہتی جبکہ آپ اپنے مقابل کو دیکھ اور پہچان رہے ہوں۔ پس مذکورہ آیات کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان اس طور پر گفتگو ہوئی ہے کہ تطبیق میں غلطی کا کسی طرح عذر باقی نہیں چھوڑا گیا ہے، کوئی بھی ایسا عذر جو قیامت کے دن بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کر سکے کہ میں اس وجہ سے تجھ کو نہ پہچان سکا اور تیری عبادت نہیں کی۔ قابل قبول نہیں ہے، آیات کا مدعا اور تقاضا یہی ہے کہ انسان، چاہے وہ کوئی بھی ہو، ایک بار خدا سے اس طرح روبرو ہوا ہے کہ اس کی بنیاد پر خدا کا بندے سے یہ کہنا درست ہو کہ کیا میں تیرا خدا نہیں ہوں؟ اور وہ بھی یہ کہے کہ ہاں ہاں، میں گواہی دیتا ہوں۔

اس آیۂ شریفہ سے جو بات واضح طور پر ہاتھ آتی ہے یہ ہے کہ ہر انسان کو ایک طرح کی معرفت خدائے یکتا کی حاصل ہے جس کے حصول کی کیفیت کو ہم اس صورت سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ خدا نے ان سے کہا: "**الست بربکم**" اور انھوں نے جواب دیا "**بلی شھدنا**" اور یہ گفتگو اس طور پر ہوئی ہے کہ اس نے تطبیق کی منزل میں کسی طرح کی خطا اور عذر و بہانے کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اور اس بنیاد پر، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں قیامت کے دن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم ربوبیت الٰہی سے آشنا نہیں تھے، یا اس ذیل میں اپنے بزرگوں اور باپ داداؤں کی پیروی کو شرک و کج روی

کا بہانہ نہیں بنا سکتا۔

چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کی دو بدو حضوری گفتگو، اور مقام تطبیق ہی غلطی اور عذر تراشی کے تمام امکانات کا سد باب علم حضوری اور شہود قلبی کے بغیر قابل تحصیل نہیں ہے اور اس کی مؤید وہ کثیر روایات ہیں جو "رویت" اور مشاہدہ جیسی تعبیرات پر مشتمل نظر آتی ہیں۔

ایسی متعدد روایات ہیں جو سب کی سب نفس مضمون کے اعتبار سے متشابہ اور سند کے لحاظ سے معتبر ہیں اور "اصول کافی" "تفسیر علی ابن ابراہیم" "تفسیر برہان" "تفسیر نور الثقلین" نیز دوسری معتبر کتابوں میں نقل ہوئی ہیں چنانچہ کافی کی ایک روایت میں جو آیہ فطرت کے ذیل میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے حضرت فرماتے ہیں:۔

فعرّفهم واراهم نفسه ولولا ذلك لم يعرف احد ربّه[1]

یعنی خدا نے ان کے سامنے اپنے آپ کو پہچنوایا اور ظاہر کیا اور اگر ایسا نہ ہوتا کوئی بھی اپنے پروردگار کو نہ پہچانتا۔

تفسیر علی ابن ابراہیم قمی میں "ابن مسکان" سے روایت ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا:۔

"معاینة کان هذا؟ قال نعم"[2]

"یعنی کیا آنکھوں سے عیناً خدا کا مشاہدہ کیا، حضرت نے فرمایا: ہاں"

محاسن برقی میں زرارہ امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا:۔

ولولا ذلك لم يدر احد من خالقه ورازقه[3]

یعنی اگر یہ منظر سامنے نہ آتا کوئی نہ جانتا کہ کون اس کا خالق ہے اور کون اس کا رازق ہے۔

ان عبارتوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ معرفت جس کی طرف آیہ شریفہ میں اشارہ کیا گیا ہے ایک قسم کی شخصی معرفت ہے کلی معرفت نہیں ہے جو مفاہیم انتزاعی (یعنی کل سے جزئی معرفت) اور عقلی دلیلوں سے حاصل ہوتی ہے، اور خداوند متعال سے متعلق شخصی معرفت حضوری و شہودی

---

[1] کافی جلد ۲ ص ۱۳ [2] تفسیر المیزان ج ۸ ص ۳۴۰ [3] تفسیر المیزان جلد ۸ ص ۳۴۵

علم کی راہ کے علاوہ کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں ہے۔ اور اگر اس معرفت سے مراد کلی اور عقلی استدلالات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی معرفت ہوتی تو حدیث کے الفاظ یوں ہونے چاہئے تھے کہ: "ولولا ذٰلک لم یعلم احد ان لہ خالقاً" یعنی کوئی شخص نہ جانتا کہ اس کا ایک خالق بھی ہے نہ یہ کہ "لم یدر احدٌ من خالقہ" کہ کون اس کا خالق ہے، ہم اس مطلب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے قارئین کرام سے مزید دقت نظر کے طالب ہیں:۔

اگر انسان کو علم شہودی حاصل نہ ہو تو محض کلی حقیقتوں کو ہی درک کر سکتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی ہے جس نے یہ مخصوص کام انجام دیا ہے اگر آپ نے کسی عمارت کے معمار کو نہ دیکھا ہو تو صرف اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بنانے والے نے یہ چیز بنائی ہے اور مصنوع کے خصوصیات و صفات دیکھ کر صانع کے خصوصیات و صفات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جس قدر مہارت و صناعی میں دقت نظر سے کام لیا گیا ہو صانع کی مہارت، صلاحیت اور فن کاری پر روشنی پڑتی ہے، اس حد تک آپ کہہ سکتے ہیں کہ بنانے والا اپنے فن میں بڑا ہی ماہر اور نہایت ہی باسلیقہ معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ کون ہے؟ ان استدلالات کے ذریعہ اس کو نہیں پہچان سکتے، اس کی شخصیت آپ کے سامنے واضح ہو کر نہیں آسکتی، عقلی استدلالات ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کی تخلیق کرنے والا ایک حکیم اور صاحب قدرت و صلاحیت خالق ہے، لیکن یہ بات کلی مفاہیم کی حیثیت رکھتی ہے، کوئی ہے جو ایک عالم و حکیم اور صاحب قدرت و اختیار خالق ہے، لیکن یہ خالق کون ہے؟ یہ چیز ہمیں عقلی استدلالات نہیں بتاتے، اگر ہمارے اور خدا کے درمیان ایک درونی و قلبی رابطہ نہ ہوتا تو خود خدا کو ہم نہیں پہچان سکتے تھے، یہ تو ہم سمجھ لیتے کہ اس دنیا کا کوئی خالق ہے مگر کون ہے یہ نہیں جان سکتے تھے، ذات خالق کی شناخت اسی وقت ممکن ہے جب ہم کو اس سے ایک طرح کی شہودی نسبت حاصل ہو چکی ہو، ورنہ محض ایک کلی معرفت ہوگی۔

مذکورہ حدیث کے جملے پر غور کرنے کا مطالبہ ہم نے اسی لئے کیا تھا کہ "لولا ذٰلک لم یعلم (یا "لم یدر" یا "لم یعرف" جیسا کہ روایات میں مختلف لفظیں آئی ہیں) احدٌ ان لہ خالقاً (یعنی اس کا کوئی خالق ہے) کہنے میں اور لم یعلم من خالقہ (یعنی کون اس کا خالق ہے) کہنے میں مفہوم کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ اور تمام روایات میں تعبیر یہی ملتی ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی نہ جانتا کہ اس کا خالق کون ہے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اگر یہ گفتگو نہ ہوتی

تو کوئی نہ جانتا کہ دنیا ایک خالق بھی رکھتی ہے، کیونکہ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تب بھی انسانی عقل درک کرسکتی تھی کہ دنیا کا کوئی نہ کوئی خالق ہے۔ حتی عقل اس کے صفات کو بھی سمجھ سکتی ہے۔ لیکن اس کی ذات کو سمجھ لے۔ یہ ممکن نہ ہوتا، چنانچہ یہ واقعہ (یوم الست) انسانی قلب اور خدا کے درمیان ایک طرح کا رابطہ برقرار ہونے کا سبب بنا ہے کہ انسان جب بھی دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھے "خود خدا" کو پالے نہ یہ کہ کوئی ایک پیدا کرنے والا ہے۔ اگر خدا توفیق دے اور بندہ پر وہ حالت طاری ہو کہ پوری توجہ کے ساتھ خدا سے دعا و مناجات کرے، اس کی توجہ ہر طرف سے منقطع ہو کر مکمل طور سے صرف خدا پر مرکوز ہو جائے تو اس پر وہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ خود خدا کو دیکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ گویا پس پردہ سے گفتگو ہو رہی ہو کہ اے وہ، جو آسمانوں اور زمین سے بالا ہے اور دنیا کو چلا رہا ہے، بلکہ وہ دعا و مناجات کرنے والے کے سامنے ہے گویا اس کی بات کو سن رہا ہے۔ امیر المومنین سلام اللہ علیہ، نہج البلاغہ میں آیہ شریفہ: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ[1] (وہ اشخاص جن کو (خدا کے ذکر اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے) نہ تجارت ہی غافل کر سکتی ہے نہ خرید و فروخت کا معاملہ) کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"وان للذکر لاھلا"[2] ذکر و یاد خدا کے وہی اہل و مستحق ہیں جو دنیا کی لذتوں کے بدلے یاد خدا کا انتخاب کرتے ہیں۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ذکر خدا کے اہل اور یاد خدا میں زندگی بسر کرنے والوں اور اسی کی یاد میں جینے والوں کے اوصاف ذکر فرمائے ہیں منجملہ ان کے فرماتے ہیں: "خدا ان کے باطن اور ان کے وجود میں ان سے راز و نیاز کرتا ہے۔" ذرا ان لفظوں پر غور فرمائیں، بجائے یہ کہنے کے کہ بندہ خدا سے مناجات کرتا ہے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں خدا بندے سے راز و نیاز کرتا ہے، ایسے لوگ ہیں جو پردہ میں خدا کے راز سنتے ہیں، ایک ایسی حالت انسان کے اندر پائی جاتی ہے، انسان اس عظمت کا مالک ہے اور ممکن ہے کہ وہ ایسے مقامات پر فائز ہو جائے، نہ صرف انبیاء و اولیا اور معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین بلکہ وہ افراد بھی جو خدا کے پیغمبروں اور معصوم پیشواؤں کے سچے پیرو ہیں ایسے مقامات پر پہنچ سکتے ہیں وہ آئے ہیں تا کہ دوسروں کے ہاتھ پکڑیں اور اپنی طرف کھینچ کر جس مقام تک خود پہنچ چکے ہیں ان کو بھی اس جگہ سے قریب کر لیں۔

---

[1] نور/۳۷

[2] نہج البلاغہ فیض الاسلام ص۶۹۵، ص۶۹۶

مختصر یہ کہ آیت یہ کہنا چاہتی ہے تمام انسانوں کے دل میں ذات خدا کی معرفت موجود ہے جب اس کے آثار مشاہدہ کرتا ہے وہ معرفت زندہ ہو جاتی ہے، یہ معرفت کسبی نہیں ہے بلکہ ایک فطری معرفت (اور فطری آشنائی) ہے۔ لیکن ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں، جس وقت متوجہ ہو جاتے ہیں وہ معرفت عود کر کے تازہ و زندہ ہو جاتی ہے اور وہ روایت جو ہم نے نقل کی ہے اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر ایک ایسا واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا تو کوئی نہ جانتا کہ کون اس کا خالق ہے یعنی یہ تو جان سکتا تھا کہ اس کا کوئی خالق ہے لیکن یہ نہ جانتا کہ خالق کون ہے، کیونکہ اس کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ اب چونکہ یہ شہودی معرفت حاصل ہو چکی ہے لہٰذا جب عقل رہنمائی کرتی ہے کہ دنیا کا کوئی خالق بھی ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ خالق کون ہے، کیونکہ پہلے اس سے آشنائی حاصل ہو چکی ہے۔

پس اس نظریہ کے تحت (جس کی بہت سی روایتیں تائید بھی کرتی ہیں اور ایک ذاتی یا شخصی رائے نہیں ہے) ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے اس کی تصدیق کی ہے کہ انسان کے اندر خداوند متعال کی حضوری و شہودی معرفت موجود ہے۔ یہیں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسی شہود سے اصل ذات خدا کی معرفت حاصل ہونے کے علاوہ، دوسری بہت سی چیزیں بھی انسان کو حاصل ہوتی ہیں، منجملہ ان کے صفات خدا کی معرفت ہے: مثلاً خدا کی ربوبیت کی معرفت یعنی یہ شہود اس انداز کا تھا کہ آدمی صرف یہی نہیں سمجھا کہ جو اس کا پیدا کرنے والا ہے وہ کون ہے بلکہ یہ بھی سمجھا ہے کہ وہی پالنے والا، صاحب اختیار و قدرت اور دنیا کا چلانے والا بھی ہے، اس آیت کے الفاظ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ " الست بربکم " سے سوال کیا گیا ہے الست بخالقکم " نہیں ہے یعنی خدا انسانوں سے سوال کرتا ہے کیا میں تمہارا پروردگار اور تمہارا رب نہیں ہوں (پروردگار، رب کا بھرپور مفہوم ادا نہیں کرتا) وہی جس کے اختیار میں تمہاری ہستی ہے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ کیا تمہاری ہستی میرے اختیار و قدرت میں نہیں ہے؟ اور وہ جواب دیتے ہیں: کیوں نہیں، پس معلوم ہوا کہ نہ صرف خدا کی خالقیت بلکہ ربوبیت کا بھی اثبات ہوتا ہے، علاوہ بر این توحید بھی ثابت ہوتی ہے کہ: اس کے سوا دوسرا کوئی خالق و رب بھی نہیں ہے۔ اور یہ بحث اس شہودی رابطہ یعنی حضوری معرفت کی وجہ سے ہے جو انسان اپنے خدا کی نسبت رکھتا ہے۔ یہ کوئی بکواس اور قاعدہ و حساب سے عاری چیز نہیں ہے۔ حضوری معرفت ایک قسم کی معرفت ہے جو انسان و خدا (اور فلسفیوں کی اصطلاح میں علت ہستی) کے درمیان موجود ہے

یعنی انسان ایک وجودی رابطہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ علم حضوری کا مطلب یہ ہے کہ وہ رابطہ جو میرے اور میرے خدا کے درمیان خلقت و تکوین کے اعتبار سے پایا جاتا ہے اس کا میں مشاہدہ کرتا ہوں، میرے یہاں اس طرح کا شہود کس ذات کے لئے ہے؟ ظاہر ہے ہر اس ذات سے جس کے ساتھ میرا یہ وجودی رابطہ ہو ایک تعلق و وابستگی پائی جاتی ہے جو مشاہدہ کی منزل میں آتی ہے اگر یہ وابستگی ہو تو دکھائی بھی دیتی ہے اور اگر وابستگی نہیں ہے تو کبھی یہ علم حضوری ایک معدوم شئے سے تعلق پیدا نہیں کرتا اور جس وقت وجود کے ساتھ وابستگی مشاہدہ میں آتی ہے تو جس سے بھی اس طرح کی وابستگی ہو مشاہدہ میں آتا ہے۔ انسانوں نے (وقت میثاق) مشاہدہ میں صرف اپنی وابستگی اللہ کے ساتھ مشاہدہ کی ہے اگر کسی دوسرے کے ساتھ بھی یہ وابستگی ہوتی تو اسے ضرور دیکھتے کیونکہ یہ شہود بلا کسی اصول و ضابطہ کے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ایک تکوینی رابطہ انسان اور خدا کے درمیان موجود ہے، مثلاً ایک بلب تار کے ذریعہ چھت سے لٹکایا اور وابستہ کیا گیا ہے، چھت اور بلب کے درمیان رابطہ وہی تار ہے جس کے ذریعہ بلب چھت سے لٹکا ہوا ہے، آنکھ رکھنے والا، اگر روشنی موجود ہو تو وہی سب کچھ دیکھتا ہے جو موجود ہے یعنی اگر صرف ایک تار چھت اور بلب کے درمیان وابستہ ہے تو ایک ہی تار کو دیکھتا ہے اور اگر دو ہوں تو دو اور اگر تین ہوں تو تین دیکھتا ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان حقیقی و تکوینی رابطہ ہے یعنی ہمارا وجود اس سے وابستہ ہے، ذہن کو قریب کرنے کے لئے میں پھر مثال دیتا ہوں۔ یہ وابستگی بالکل ویسے ہی ہے جیسے ہمارے انسانی افعال اور ہمارے انسانی کیفیات ہم سے وابستہ ہیں، آپ کسی چیز کی صورت اپنے ذہن میں مجسم کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ یہی صورت بعینہ کسی اور کے ذہن میں بھی ہو؟ فرض کریں آپ نے ذہن میں سیب کا ایک درخت تصور کیا، تو اب یہ سیب کا درخت جو آپ کے ذہن میں ہے آپ کے ذہن کے بغیر قابل تصور نہیں ہے، کیونکہ بنیادی طور پر اس کی حقیقت آپ کے ذہن سے وابستہ ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ کی پوری کائنات کے ساتھ اسی طرح کی نسبت ہے بلکہ کچھ اس سے بھی بالاتر رابطہ ہے، یہ مثال تو ہم نے مطلب کو ذہن سے قریب کرنے کے لئے دی ہے، ورنہ انسان اور خدا کے درمیان یا اس پوری کائنات اور خدا کے درمیان رابطہ کی حقیقت کیا ہے ہم درک نہیں کر سکتے۔

معلوم ہوا اگر ایک تکوینی رابطہ خدا اور انسان، خدا اور کائنات کے مابین موجود ہو تو دل

رابطہ مشاہدہ میں آتا ہے پس اگر انسان اور (العیاذ باللہ) دو خداؤں کے درمیان یہ رابطہ پایا جاتا یعنی ہمارے دو پیدا کرنے والے ہوتے تو منزل شہود میں اپنے وجودی رابطہ کا خدا خداؤں کے ساتھ مشاہدہ ضروری ہوتا؟ اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ مورد بحث رابطہ میں چونکہ ہم نے ایک رب کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا ہے یہی دلیل اس بات کی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رب نہیں ہے، پس یہ مشاہدہ جس طرح خدا کے وجود کو ثابت کرتا ہے خدا کی ربوبیت کو بھی ثابت کرتا ہے منزل شہود میں آدمی نے دیکھا ہے اور دیکھتا ہے، البتہ اگر مکمل طور سے متوجہ ہو، کیونکہ خدا سے اس کی نسبت ایک صورت ذہنی جیسی ہے وہ ذہن جو اس کا تصور پیدا کرتا ہے دراصل اس کی پوری توجہ اس سے وابستہ ہوتی ہے، اگر آپ کا ذہن اس سیب کے درخت کی طرف متوجہ ہو، تو درخت کی صورت ذہنی وجود پیدا کرے گی اور اگر توجہ ادھر سے منصرف ہو چکی ہو تو سرے سے ذہن میں وہ صورت نہیں آتی بلکہ نابود ہو جاتی ہے۔ ؎

اگر نازی کند از ہم فرو ریزند قالب ہا

انسان کو اس کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہیے کہ اس کا وجودی طور پر اپنے خدا سے ایک ربط و ارتباط ہے، اس کی ہستی دست قدرت الٰہی میں ہے چاہے تو ہے نہ چاہے تو نہیں ہے۔ اگر آدمی اس حالت کا مشاہدہ کرے تو گویا اس نے ربوبیت الٰہی کا مشاہدہ کر لیا ہے:۔

انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون (یٰسین/۸۲)

(جب وہ کسی شے کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو ادھر اس نے کہا کہ ہو جا، وہ ہو جاتی ہے) گویا کہ: کہہ دے ہو جا تو ہے اور اگر کہہ دے نہ ہو (یا نہ کہے کہ اس کے بعد بھی موجود رہ) تو نہیں ہے۔

کائنات کا وجود خداوند تبارک و تعالیٰ کی نسبت اسی کیفیت و حالت کا حامل ہے، جب ہم اس حالت کو پا لیں گے (یعنی وہی حالت جو ایک عالم میں، قرآن کے مطابق، ایک روز ہم کو نصیب ہو چکی ہے اور اس وقت اس کے محل وقوع کو ہم فراموش کر چکے ہیں، ایک بار پھر اگر اس کو سرحد کمال تک پہنچانے کی خدا توفیق دے دے، وہی معرفت جو اولیاء خدا کو حاصل ہے، ہمیں بھی حاصل ہو جائے اور وہ علم حضوری وجود پیدا کر لے)، تو ہم کو سمجھ میں آ جائے گا کہ ہماری ہستی خدا کی نسبت

اس طرح کی ہے ہماری کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے دوسرے لفظوں میں ماسوی اللہ جو کچھ بھی ہے اسی کے ارادہ کا عکس اور جلوہ ہے، یہ کائنات منشاء الٰہی کے تحت ہے اگر اس کا ارادہ و منشاء نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا، اس بات کو انسان علم حضوری کے ذریعہ مشاہدہ کر سکتا ہے: وہ علم حضوری جو اس کو ایک عالم میں حاصل ہو چکا ہے، وہ عالم جس کا نام علماء نے "عالم ذر" یا عالم میثاق رکھا ہے، جہاں خداوند عالم نے "الست بربکم" کہہ کر بندوں سے میثاق عبودیت باندھا تھا، لیکن اس کی کیفیت کیا تھی وہ کون سا عالم تھا، ہمیں ان عوالم کی معرفت نہیں ہے، ہم تو صرف عالم طبیعت سے واقف ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ دنیا کس طرح کی دنیا تھی، کیسے یہ گفتگو ہوتی تھی، اور کس طرح یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی سبب مختلف جہتوں سے ہمیں ان آیتوں میں ابہام نظر آتا ہے۔

اور اس کی علت بھی ہمارے فہم کا ناقص ہونا ہے جو ماوراء طبیعت سے آشنا نہیں ہے، پس اس مشاہدہ اور مکالمہ کی بنیاد پر ہمیں ذات اقدس الٰہی کی معرفت بھی حاصل ہو چکی ہے اور اس کی ربوبیت و وحدانیت سے بھی واقفیت پیدا کر چکے ہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ یہ آتیں توحید فطری پر دلالت کرتی ہیں:۔

"فطرھم علی التوحید"[1] کی تعبیر سورۂ روم کی آیۂ فطرت کے ذیل میں بھی آئی ہے اور اعراف کی آیۂ میثاق کے ذیل میں بھی وارد ہوئی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کی فطرت و سرشت میں یکتا پرستی و دیعت کی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ انسان ذات خدا کو بھی پہچانے، اس کی ربوبیت کو بھی سمجھے اور اس کی یکتائی اور قابل پرستش ہونے کو بھی درک کرے، اسی لئے ارشاد ہوتا ہے۔

"فطرھم علیٰ معرفتہ انہ ربھم"[2] (ان کی سرشت میں اس کی معرفت موجود ہے کہ بے شک وہی ان کا رب ہے) پس اس کی بنیاد پر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آتیں انسانی وجود میں شامل خدا کی فطری معرفت پر دلالت کرتی ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ فطری معرفت کے دو عنوانات ہیں ایک تو خدا کی عاقلانہ معرفت جو کلی مفاہیم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور دوسرے خدا کی

---

[1] کافی ج ۲ ص ۱۱، ۱۲، و بحار الانوار ج ۳ ص ۲۷۶ — ۲۷۹

[2] بحار الانوار ج ۳ ص ۲۷۹

حضوری وشہودی معرفت جو قلبی مشاہدہ اور رویت دل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور اس طرح کی قلبی، حضوری اور شہودی معرفت انسان کے اندر، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، موجود رہی ہے اور اس کا اثر اب بھی ہم میں باقی ہے چنانچہ جب ہم خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ معرفت تمام عذر برطرف کر دیتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی جب کسی ایسے ماہر معمار کے تعمیری آثار دیکھتا ہے جس کو خود بھی وہ پہلے دیکھ چکا ہے، فوری طور پر اس معمار کی شخصیت اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اب اس کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ عمارت کسی اور معمار کی بنائی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ بت پرست، بھی کہ جس کو غفلت وگمرہی، مادی دنیا سے لگاؤ اور مادی اسباب کی لگن نے اگرچہ اس فطری معرفت کے سلسلہ میں کمزور وضعیف کر دیا ہے، لیکن جس وقت بھی وہ عبادت وپرستش کی طرف مائل ہوا اور عقلی وسیلوں کے ذریعہ یا انبیاء کے انذار وتبلیغ کے ذریعہ، اس کی فطرت اس پر منکشف ہوگئی تو اب اس کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ میں نے سوچا تھا زمین وآسمان کا خالق پتھر سے تراشا ہوا ایک بت ہے، جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ایسے کی عبادت کرنا چاہئے جو کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور جس کی ذات سے یہ دنیا قائم ہے اور اس کو پہلے دیکھ بھی چکے ہیں، پہچانتے بھی ہیں تو اب اس کو کسی اور پر تطبیق کرنے کا حق نہیں رہ جاتا، یہی چیز ہے جو اب ہر طرح کے عذر کو ختم کر دیتی ہے اگر مشرک کہتا ہے:۔

"انما اشرک اٰبائنا من قبل وکنا ذریۃ من بعدھم"

ہمارے باپ دادا مشرک تھے ہم ان کی اولاد تھے ان ہی کی پیروی کرنے لگے (اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟) (اعراف/ ۱۷۳)

تو ان سے کہتے ہیں کہ: تم عقل وشعور رکھتے ہو، پہلے خدا کو پہچان چکے تھے، تمہارا دل اس سے آشنا تھا، تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ بت جو خرمہ، کشک (یا کسی بھی مادہ) سے بنایا گیا ہو، قابل پرستش ہے۔ اس لئے کہ وہ ذات جو عبادت کی مستحق ہے، اس کو تم پہچان چکے ہو، تمہارا دل اس سے آشنا ہے، یہی وہ چیز ہے جو ہر طرح کے عذر اور بہانے کا سد باب کرتی ہے۔

بنا برایں، ان آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم — کی نسبت علم حضوری وشہودی کے معنی میں خدا کی فطری معرفت ہر انسان کے اندر موجود ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ معرفت نیم آگاہی

جیسی ہے اور عوام الناس اپنی عادی زندگی میں، اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، البتہ جس وقت مادی چیزوں سے انسان قطع تعلق کر لیتا ہے اور اپنے دل میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہی نیم آگاہی، آگاہی کی سرحدیں پہنچ جاتی ہے، اور اولیاء اللہ کی ذات میں اس منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ آواز دیتے ہیں:۔

"ایکون لغیرک من الظھور مالیس لک..."[1] "

(آیا کوئی اور چیز تجھ سے زیادہ روشن و آشکار ہو سکتی ہے)

"ماکنت اعبد ربا لم اراہ"[2] (میں اس کی عبادت نہیں کرتا جسے نہ دیکھا ہو)

اور شاید بہت سی قرآنی آیات کا مقصد بھی اسی فطری معرفت سے آگاہ و آشنا بنانا ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب اپنے خدا سے قریب ہو سکیں: مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۹۵ میں حیات و موت کو وجود عطا کرنے والے کی طرف توجہ دلانے کے بعد خدا فرماتا ہے:۔

" ذٰلکم اللہ فانّٰی تؤفکون "

(وہی تمہارا خدا ہے تم کدھر بہکے جا رہے ہو)

گویا زندہ موجودات کے بارے میں غور و فکر خود دل کو دعوت دیتی ہے کہ انسان کارخانہ طبیعت میں دست قدرت کی کارستانی کا مشاہدہ کرے اور اس میں خدا کے حضور کو پالے اسی طرح سورۂ انعام کی ہی آیت ۱۰۲ میں بعض الٰہی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد خدا فرماتا ہے:۔

" ذٰلکم اللہ ربکم لا الٰہ الّا ھو"

(لوگو! وہی اللہ تمہارا رب اور پروردگار ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے)

فطری توحید کا خلاصہ

معرفت خدا کے فطری ہونے کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے دراصل ہستی عطا کرنے والے خالق کے ساتھ انسان کے وجودی رابطہ کی حکایت کرتا ہے اور اس طرح کی معرفت کہ مخلوق میں اسکی

---

[1] مفاتیح الجنان، دعائے عرفہ امام حسین علیہ السلام

[2] اصول کافی ج ۱ ص ۹۸ (مطبوعہ: دار الکتب الاسلامیہ)

ادراک کی صلاحیت موجود ہو، اس سے جدا ہونے والی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو لفظ فطری سے تعبیر کرنا مکمل طور پہ درست ہے۔ یہ علم شہودی صرف خالق کے "وجود" سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کے تمام پہلوؤں منجملہ ان کے اس کی ربوبیت سے بھی تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ آیۂ میثاق میں لفظ "رب" کا استعمال خود اس بات پر شاہد ہے یعنی اس "مشاہدہ" کے ذریعہ خدا کا وجود اور اس کی ربوبیت دونوں ثابت ہوتے ہیں اور اگر اس طرح کا وجودی رابطہ انسان اور کسی دوسرے وجود کے ساتھ پایا جاتا ہوتا تو ضرور مشاہدہ میں آتا پس معلوم ہوا کہ یہ معرفت خدا کی وحدت و یکتائی سے بھی تعلق رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس مشاہدہ نے شرک کے لئے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے:۔ "او تقولوا انما اشرک..." (اعراف/۱۷۳)

اور چونکہ الوہیت و معبودیت صرف خالق و رب کے لئے زیب دیتی ہے اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ اس اللہ کے سوا، جس کا فطرت مشاہدہ کرتی ہے، کوئی بھی عبادت و پرستش کا مستحق نہیں ہے، اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خالقیت و ربوبیت اور الوہیت و معبودیت میں توحید ایک فطری امر ہے۔

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول چند روایتوں کے مطابق حضرت آیۂ فطرت کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

"فطرھم علی التوحید"

(لوگوں کی فطرت توحید پر استوار ہے)

اور شاید سورۂ یٰسین کی ۶۰ ویں آیت میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

الم اعھد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین وان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم

اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ ہرگز شیطان کی پرستش نہ کرنا، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور یہ کہ صرف میری عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے۔

اور انسانی ذہن کو قریب کرنے والی بات یہ ہے کہ راہ راست وہی ہے جس کی خود انسانی فطرت نشان دہی کرتی ہے اور وہ خدائے یکتا کی پرستش و عبادت ہے دوسرے کسی بھی معبود کی پرستش گمراہی اور فطرت کے سیدھے راستہ سے انحراف کے مترادف ہے۔

ولی امر مسلمین

حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ

نے فرمایا

"عالمی استعماری طاقتوں نے، جو آج عراق کے خلاف کھڑی نظر آتی ہیں، علی الاعلان اعتراف کیا ہے کہ زمانہ گزشتہ میں ان کی طرف سے عراق کی مدد کا اصل مقصد اسلام اور ایران کے اسلامی انقلاب کو نابود کرنے نیز عوامی اسلامی تحریک سے خوف و دشمنی کے تحت تھا۔"

"عالمی استکبار پر اسلامی انقلاب سے اس لئے خوف و ہراس طاری ہے کہ مسلمان قومیں تین براعظم — ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اتصالی نقطوں اور دنیا کے اہم ترین قدرتی ذخیروں پر اختیار رکھتی ہیں .... اسلامی معاشروں کی بیداری نے ان کے دو قطبی تسلط اور زبردستی کی سیاست کو خطرے میں ڈال دیا ہے لہٰذا امریکہ کی اسلامی انقلاب سے گہری دشمنی کی بنیاد بھی یہی چیز ہے اور یہ دشمنی ختم ہونے والی نہیں ہے...."

"ہم خلیج فارس میں امریکہ کی روز افزوں لالچ اور شرم انگیز سیاست کے شدید مخالف ہیں، .... پہلی منزل میں، علاقہ کی سلامتی اور امنیت خود علاقہ کی قوموں کی ذمہ داری ہے، ہم پہلے کی طرح آج بھی خلیجی ممالک کے ساتھ امن و امان برقرار کرنے، اور دوسروں کے حقوق پر حملہ آور ہونے والے ہاتھوں کو قلم کرنے کا اعلان کرتے ہیں .... مسلمان ملتیں اس علاقہ میں امریکی دفاعی امنیتی نظام کی تشکیل کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتیں، زیادہ تر لالچوں، سازشوں اور خلیج فارس سے امریکہ کو نکال باہر کرنے کی راہ میں ہر طرح کا مقابلہ اور جنگ جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان رکھتی ہے اور جو بھی اس راہ میں مارا جائے شہید ہے۔"

اقتباس از:

"ایرانی آزاد مجاہدین سے خطاب"
۱۲ ستمبر ۱۹۹۰ء

افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں
سیرت طیبہؐ کے چند نقوش

جناب سید اعتشام عباس زیدی

قرن حاضر کے بے مثل رہنما امام خمینیؒ گو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی پیغمبرانہ سیرت اور مرسلانہ کردار عہد حاضر میں اسلام و قرآن کی تجدید حیات کا سبب بنا ہے بلاشبہ آپ کی ذات نے اسلام کے نیم جان پیکر میں حیات کی نئی روح پھونک کر اسلام اور اہل اسلام کو ایک بلند و باوقار زندگی عطا کر دی۔ آج انہوں نے سرزمین ایران پر پرچم توحید کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ کفر و نفاق کے نجس ہاتھ اس تک پہنچنے سے قاصر ہیں اور اسلامی جمہوریہ کی شکل میں ایک ایسا مستحکم نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے کہ اس کے سامنے دنیا کے تمام خود ساختہ مکاتب فکر کے دم گھٹتے نظر آتے ہیں

آخر ایک نحیف الجثہ انسان کے اندر اتنی طاقت و ہیبت، عزم و حوصلہ، وقار و سکینہ، رعب و داب، شجاعت و شہامت، پامردی و ثابت قدمی، عاجزی و انکساری، بے نیازی و سربلندی، غیرت و حمیت، دیانت اور للٰہیت کہاں سے آئی۔ راز یہ ہے کہ خود امام خمینیؒ نے سیرت طیبۂ رسول اکرمؐ کو اپنی سیرت و کردار حتی اپنی رگ و پے میں اس طرح سمو لیا تھا کہ آج جب ہم ان کی حیات، ان کی تبلیغی زندگی، ان کے کامیاب نصب العین نیز ان کی جنگ و صلح اور اس کے درخشاں نتائج پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سیرت طیبۂ پیغمبر اسلامؐ اور امام خمینیؒ کی زندگی میں ایسی خوشگوار اور حیرت انگیز مماثلتیں نظر آتی ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جائے گویا غلام نے اپنے آقا کی سیرت کو اپنی روح میں اتار لینے کے لئے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کو اپنا آئینہ بنا لیا تھا۔

جو لوگ اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کو سمجھنے میں اب بھی تردد کا شکار ہیں دراصل انہوں نے مرسل اعظمؐ کی حقیقی سیرت طیبہ کو سمجھنے میں کوتاہی سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جس دن سیرت رسول اکرمؐ کے واقعی نقوش اہل عالم کے سامنے اجاگر ہو جائیں گے، اس دن نہ صرف یہ انقلاب سمجھ میں آ جائے گا بلکہ اس دن ساری دنیا میں صرف اسلام اور قرآن کا بول بالا ہوگا۔

بلاشبہ یہ دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ نہ صرف دنیا سے بلکہ خود مسلمانوں سے بھی اسلام کے حقیقی نقوش مخفی رکھے گئے اور اس کا واقعی چہرہ ارباب ظلم و جور کے ذریعہ ہمیشہ چھپایا گیا تاکہ دنیا حقائق سے آشنا نہ ہو سکے۔ چنانچہ امام خمینی فرماتے ہیں:۔

"انہوں نے برسوں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اسلام کو مخفی رکھیں، اسلام اپنی اصل شکل میں سامنے آنے نہ پائے، اگر اسلام اپنی واقعی شکل میں پیش کیا گیا تو دوسرے مکاتب پیچھے رہ جائیں گے۔ دوسرے مکاتب شکست سے دوچار ہو جائیں گے ..... انہوں نے ایک طویل عرصہ تک منصوبے بنائے اور اسلام جیسا کہ یہ اصل میں تھا لوگوں سے چھپا دیا حتیٰ خود مسلمانوں سے بھی ...." صحیفۂ نور، ج ۵، ص۲۸۱

چشم و ابرو، کاکل و گیسو، رخ و رخسار سے الگ ہٹ کر رسول اعظم کا صدق گفتار اور حسن کردار بھی ہے جو انسان ساز بھی ہے اور حیات بخش بھی پیغمبر اکرمؐ ظلم و جور کا شکار حالات کے مارے توہمات میں گرفتار ان الوقتوں کے اسیر انسانوں کو نجات عطا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے قرآن نے اس کی حکایت یوں فرمائی ہے: "ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم" (اعراف/۱۵۷)

وہ کفر و ضلالت کے اندھیروں میں گم انسانوں کو نور کی دنیا میں لانے ان کے سامنے خدا کی نشانیاں پیش کرنے ان کے نفوس کو پاک کرنے اور انھیں علم و حکمت کی دولت سے مالا مال کرنے تشریف لائے تھے لقد منّ الله علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا من انفسهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آل عمران/۱۶۴)

وہ انسانوں کو الٰہی اخلاق سے آراستہ کرنے کے لئے انّك لعلیٰ خلق عظیم (القلم/۴) کا لباس زیب تن کر کے آئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ حیات طیبۂ پیغمبر اکرمؐ کا گوشہ گوشہ جہان آرا و بشر ساز ہے لہٰذا لازم ہے کہ ہم ان تمام گوشوں کو حقیقی عینکوں سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

یوں تو موضوع اپنے دامن میں بڑی وسعت رکھتا ہے لیکن ہم اختصار کے ساتھ حیات پیغمبر اسلامؐ کے صرف چند اہم گوشوں کی طرف امام خمینیؒ کے افکار کی روشنی میں ایک اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس سے حیات پیغمبر اعظمؐ کے ان گوشوں پر ایک نئے عنوان سے روشنی پڑتی ہے۔

ولادت پیغمبر شکست ظلم و شرک کی بنیاد: کائنات میں لاکھوں افراد روزانہ پیدا ہوتے رہتے ہیں

اور یہ ایک عام و فطری سی بات ہے لیکن بعض ولادتیں نہ صرف ایک محدود معاشرہ و ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتیں، بلکہ ان کا اثر وسیع پیمانہ پر محسوس کیا گیا ہے۔ حبیب خدا پیغمبر اکرمؐ کی ولادت باسعادت کی شان سب سے جدا اور منفرد ہے ایک طرف آپ کی ولادت خیرات و برکات کا سرچشمہ نظر آتی ہے اور دوسری طرف ظلم و شرک کی نابودی کا مظہر بھی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی ولادت کا عہد وہ عہد ہے جب ظلم و شرک جیسی دو بڑی قوتیں کائنات میں موجود تھیں۔ آپ کی ولادت چونکہ عدل و توحید کا سرچشمہ تھی لہٰذا ان دونوں قوتوں پر پوری طرح اثر انداز ہوئی چنانچہ امام خمینیؒ فرماتے ہیں:۔

"ولادتیں مختلف ہوتی ہیں ایک ولادت خیرات و برکات کا مبدأ ہے ظلم کو نابود کرنے کا سرچشمہ ہے، بت کدوں کو ڈھانے اور آتش کدوں کے خاموش ہونے کی بنیاد ہے جیسے رسول اکرمؐ کی ولادت باسعادت کہ جس کے لئے بیان کیا گیا ہے کہ اس کے سبب فارس کا آتش کدہ گل ہو گیا اور طاق کسریٰ کے کنگرے گر پڑے (یہ تو تاریخ کا بیان ہے) لیکن مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں دو قوتیں تھیں ایک ظالم حکومت اور دوسرے آتش پرست روحانی طاقتیں پیغمبر اسلامؐ کی آمد اور ان کی ولادت ان دونوں قوتوں کی شکست کا سرچشمہ بنی.... اور یہ دو اصلیں یعنی توحید و عدل پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ عالم میں رائج ہو سکیں اور ان شاء اللہ ہو رہی ہیں۔" (صحیفہ نور، ج ۲، ص ۲۱۴)

بعثت پیغمبر اکرمؐ: سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ انبیاءؑ الٰہی کن بنیادوں پر مبعوث کئے گئے اور کس لئے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں یہ ہماری کوتاہ فکری رہی ہے یا پھر ہمارے دشمنوں کی دشمنی و عیاری کہ ہم کما حقہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کے مقاصد سے آشنا نہ ہو سکے اور نامکمل طور پر دستیاب صرف چند تاریخی واقعات اور ضمنی اخلاقی کردار و سیرت کو ان کی نبوت و رسالت کا مقصد سمجھتے رہے جبکہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ انبیاء کرامؑ کی بعثت و رسالت کا مقصد لوگوں کو علم و آگاہی کی روشنی بخشنا، ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنا اور عدل و انصاف قائم کرنا بیان کیا ہے: لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید ۲۵) (یعنی ہم نے انبیاء کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور حق و باطل کی میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں)۔ امام خمینی قدس سرہ کے افکار میں بھی بعثت انبیاءؑ کی یہی تجلیاں نظر آتی ہیں آپ نے مختلف مقامات پر فرمایا کہ انبیاءؑ ظلم سے ٹکرانے اس کا سر کچلنے اور دیانت و عدالت قائم کرنے کے لئے تشریف لائے اور ہر نبی کا یہ فریضہ تھا کہ اپنے عہد میں ظلم کے خلاف آواز اٹھائے مظلوموں کو نجات بخشے اور

استعماری طاقتوں کا قلع قمع کرے، امام خمینیؒ کے الفاظ میں :۔

"آپ جناب ابراہیمؑ کو ملاحظہ فرمائیے انہوں نے اپنا تیشہ اٹھایا اور ان تمام بتوں کو جو امیروں اور بڑے لوگوں کے تھے توڑ ڈالا اور اپنے زمانہ کے قوی لوگوں سے عوام کی بھلائی کے لئے ٹکرا گئے تاکہ یہ لوگ عام انسانوں پر ظلم نہ کرنے پائیں.... جب یہ حضرات دیکھتے تھے کہ معاشرہ پر ظلم ہو رہا ہے تو وہ ظالموں سے ٹکرانے اور جس طرح بھی ممکن ہوا ان سے جنگ کرنے کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔" (صحیفہ نور، ج ۲، ص ۱۶۵)

"حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا اٹھایا اور فرعون سلطان مصر سے ٹکرا گئے، بادشاہ مصر کی طرف سے خود عوام کو خواب خرگوش میں سلایا نہیں بلکہ اپنا اسی عصا اور اپنی تبلیغات کے ذریعہ اپنے عہد کے ظالم بادشاہ کے خلاف عوام کو لا کھڑا کیا۔"

(صحیفہ نور ج ۲، ص ۱۶۵)

پیغمبر اسلامؐ بھی انبیاء ماسلف کی مانند اسی مقصد کے تحت مبعوث ہوئے چنانچہ آپؐ کی پوری زندگی جہاد و کارزار کی زندگی ہے مکہ میں بعثت سے ہجرت تک اور مدینہ میں زندگی کے آخری لمحات تک اسی مقصد کو پیش نظر رکھا کہ ظلم کے خلاف قیام کریں اور دیانت و عدالت کو رواج بخشیں۔ چنانچہ امام خمینیؒ فرماتے ہیں :۔

"جب پیغمبر اکرمؐ حجاز میں تھے تو ابتدا میں انھیں جن طاقتور افراد سے سابقہ تھا ان میں سے ایک گروہ مکہ میں تھا جو بہت مضبوط اور قوی تاجروں کا تھا، ایک گروہ طائف میں تھا یہ اس علاقہ کے دولت مند اور طاقتور افراد تھے۔ ابوسفیان اور ان کے جیسے یہ سب حکام و سلاطین کے مانند تھے اور ان کے پاس سب کچھ تھا پیغمبر اسلامؐ ان سے ٹکرا گئے جب مدینہ تشریف لائے تو بھی فقراء کے ساتھ رہے۔ ...... اور انہوں نے ان ہی غریب انسانوں کو ان امیروں کے خلاف صف آرا کر دیا جو عوام کا مال کھاتے تھے اور عوام پر ظلم کرتے تھے۔" (صحیفہ نور ج ۲، ص ۱۶۵)

اور یہی وہ سیاست الٰہیہ تھی جو تمام انبیاءؑ اور خود پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد رہی ہے۔ آج مسلمان اسی مقصد کو فراموش کر چکا ہے، مقصد رسالت کو بھول گیا ہے۔ اسلام مخالف طاقتوں نے ہمیں اسلام و قرآن سے اس قدر دور کر دیا ہے کہ اب خود مسلمان اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گیا اور اس بات کی طرف ملتفت نہیں ہے کہ اسلام مخالف افکار مثلاً اسلام کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے! وہ زندگی کے موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکتا!! اسے سیاست سے کیا کام وہ تو صرف ایک عبادی مذہب ہے!! دراصل یہ باتیں اسلام کے خلاف اعلان جنگ ہیں۔

ہجرت پیغمبرؐ کے تاریخ : پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت بھی اپنے آپ میں ایک انوکھی فکری جاذبیت رکھتی ہے۔ دراصل یہ تاریخ اسلام کا وہ اہم باب ہے جس نے اسلام کو صبح قیامت تک کے لئے آفاقی دین بنا دیا۔ جب ہم ہجرت سے

پہلے کی اسلامی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مکہ کی محدود فضا میں اسلام اتنا تنہا اور بے یار و مددگار تھا کہ ذلت و اہانت نقد و فاقہ، غربت و تنگدستی، ظلم و بربریت طوق و زنجیر، تازیانوں، اذیتوں اور شہادتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور کسے معلوم تھا کہ مظلوموں کی سسکیاں اور آہیں ایک دن گلشن اسلام میں عالمی پیمانہ پر عدل و انصاف اور اخوت و محبت کے معطر پھول کھلائیں گی۔ مکہ کی زندگی کا اسلام اخلاقی فضاؤں میں محدود صرف ایک عبادی اسلام نظر آتا ہے جبکہ مدینہ کا اسلام پورے انسانی معاشرہ پر محیط طاقت و قوت اور فتح و ظفر اور بخشش و درگزر کا اسلام ہے۔ امام خمینی فرماتے ہیں: ۔

"رسول اکرمؐ مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے جب آپ مکہ میں زندگی بسر کرتے تھے تو آپ کا کام صرف خدا کی طرف دعوت دینا، ذات اقدس پروردگار کی معرفت کرانا اور اسلام کو پہچنوانا تھا۔ آپ کے پاس ناصر و مددگار نہیں تھے جن کی مدد سے آپ مشرکین سے جنگ کرتے اور اسلام کو وسعت بخشتے۔ اور جیسا کہ آپ قرآن میں ملاحظہ فرماتے ہیں جو سورے مکہ میں نازل ہوئے ہیں ان میں صرف موعظہ و نصیحت اور اسلام کے تعارف کا پہلو پایا جاتا ہے اور جہاد و جدال کی کوئی بات سامنے نہیں آتی نیز احکام بھی ان میں کم ہی ذکر ہوئے ہیں۔ عام انسان جو سطحی فکر رکھتے ہیں یہ پیشین گوئی کر ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ ہجرت کتنی مصلحتیں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے لیکن جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ آپ کی ہجرت سے کیسے نتائج برآمد ہونے والے تھے اور آپ نے کس طرح اسلام کو مدینہ میں وسعت بخشی کام آنے والے جاں نثار پیدا کئے اور آخر کار فتح و ظفر کے ساتھ مکہ واپس ہوئے اور وہی قریش کے طاقتور افراد ان کے سامنے جھکے اور آپ نے انھیں آزاد کر دیا۔" (صحیفہ نور ج ۱ ص ۱۹۲)

وحدت کلمہ: بانی اسلام پیغمبر اکرمؐ کی سب سے بڑی آرزو اتحاد اور وحدت کلمہ رہی ہے اصل میں توحید کی روح بھی یہی ہے اور پیغمبرؐ اسی روح کو پورے عالم میں پھونکنا چاہتے تھے مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کی دعوت دینا آپ کا سب سے اہم اقدام تھا اور آپ اس نکتہ پر بھرپور زور دیتے تھے۔ اسی مقصد کے تحت آپ نے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد جو پہلا اہم اقدام فرمایا تھا وہ مسلمانوں کے درمیان اور انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی بھائی کا رشتہ قائم کرنا تھا۔ اپنے اس عملی اقدام کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ کی متعدد وحدت آفریں حدیثیں بھی اتحاد کی دعوت دیتی ہیں "کل مسلم اخوۃ" یعنی تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں" اسلام کا سب سے زیادہ زندہ اور جیتا جاگتا نعرہ ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری اسی اصل پر سب سے زیادہ ضرب لگائی گئی۔ پیغمبر اسلامؐ پوری کائنات میں وحدت کلمہ کی روح پھونکنا چاہتے تھے تاکہ گلستان آدم میں اختلاف کے خلا پیدا ہی نہ ہو سکیں لیکن زمانہ کی ابن الوقت طاقتوں نے ایسا نہ ہونے دیا اور عالم اسلام کو اپنی ہوسناکیوں کا نشانہ بنا کر وحدت کلمہ کی راہ کے پتھر بنے رہے۔ امام خمینیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"پیغمبر اسلامؐ چاہتے تھے کہ تمام دنیا میں اتحاد و یگانگت قائم کریں، آپ چاہتے تھے کہ دنیا کے تمام ممالک اور تمام ربع مسکون

کو کلمۂ توحید کے زیرِ سایہ قرار دیں لیکن اس وقت کے ظالم سلاطین اور خود غرض یہود و نصاریٰ سدِ راہ ہو گئے۔" (صحیفۂ نور ج ۱ص [۱۲۰])

آج اگر ہم چاہتے ہیں کہ عالم اسلام کو اس آشفتگی اور زبوں حالی سے نجات دلائیں تو ہمیں چاہیئے کہ اسلام کی اس روح کی طرف خاص توجہ دیں۔ یہ وحدت کلمہ ہی ہے جو ہمیں سربلند کر سکتی ہے ہمارے دیرینہ دشمنوں سے ہمیں نجات عطا کر سکتی ہے یہ وحدت کلمہ ہی ہے جو ہمارے لئے سعادت دنیا و آخرت کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔

مسجد اسلامی سیاست کا مرکز: حیات طیبۂ پیغمبر اسلامؐ کا یہ وہ گوشہ اور عالم اسلام کا وہ حیاتی پہلو ہے جسے اسلام دشمنوں نے سب سے زیادہ مسخ کیا ہے۔ اسلام کو سیاست سے علیحدہ کر کے انہوں نے نہ صرف دین کو محدود اور ناقص بنا کر پیش کیا ہے بلکہ ہمارے ذہنوں سے ہمارے دینی مراکز کا حقیقی وقار بھی محو کر کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی مندر اور گرجہ گھر کی مانند آج مسجد بھی صرف ایک محترم عبادت خانہ بن کر رہ گئی جہاں بندہ انفرادی طور سے اپنے خدا سے ارتباط پیدا کرے اور دنیا و ما فیہا سے غافل رہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلا اور اہم اقدام یہ فرمایا کہ ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو اپنے تمام دینی، اجتماعی، سیاسی، نظامی و معاشی مسائل کے حل کے لئے مسجد میں آنے کی دعوت دی اور اسے صرف عبادت کا مرکز بنانے کے بجائے اسلامی سیاست کا مرکز قرار دیا۔ جب تک مسلمان رسول اسلامؐ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں مسجد کے اس بنیادی پہلو سے استفادہ نہ کریں گے، دشمن ان پر غالب رہے گا۔ امام خمینیؒ نے عالم عیسائیت کو مخاطب کرتے ہوئے اسلام میں مسجد کی اہمیت کو یوں واضح فرمایا:

"عیسائی یہ خیال نہ کریں کہ مسجد بھی کلیسا کی مانند ہے۔ مسجد میں اگر نماز قائم ہوتی تھی تو اس میں لوگوں کے فرائض بھی معین کئے جاتے تھے، وہیں جنگوں کے منصوبے طے کئے جاتے تھے، ممالک کے انتظام کا بنیادی ڈھانچہ مسجد ہی میں تیار ہوتا تھا۔ مسجد کلیسا جیسی نہیں ہے۔ کلیسا (ان کے خیال میں) افراد اور خداوند عالم کے درمیان ایک فردی رابطہ ہے لیکن پیغمبر اسلامؐ اور ان کے خلفاء..... کے زمانہ میں مسجد اسلامی سیاست کا مرکز رہی ہے۔ جمعہ کے دن نماز جمعہ کے خطبوں میں سیاسی مسائل، جنگ سے مربوط مطالب اور سیاست مدن جیسے تمام مسائل مسجد میں ہی طے ہوا کرتے تھے۔" (صحیفۂ نور ج ۱ص [۱۱۹])

اگرچہ ان تمام موضوعات پر لکھنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں لیکن اختصار اور کوتاہ قلمی کے پیش نظر ان پر محض ایک ہلکا سا اشارہ ہی کیا جا سکا ہے امید ہے کہ قارئین کرام اس قطرہ میں سمندر کی توانائی کا احساس کرتے ہوئے اس کے آب زلال سے اپنی روح کو خنکی و طراوت بخشیں گے۔

خداوند عالم ہمیں زیادہ سے زیادہ سیرت طیبۂ پیغمبر اکرمؐ پر چلنے اور ان کے فرزند امام خمینیؒ کے روحانی افکار سے فائدہ اٹھانے کی توفیق کرامت فرمائے۔

[redacted]

فرعونی آمریت کے خلاف

اسلامی اصولوں کی فتح

از جناب سید ولی الحسن رضوی

حکومت عراق کی جانب سے الجزائر کے معاہدہ ۱۹۷۵ء کی قبولیت، جنگی قیدیوں کی رہائی سے موافقت اور ۲ ہزار ۴ سو کلومیٹر ایرانی سرزمین سے عراقی افواج کی مراجعت اگر سچ پوچھئے تو صرف اسلامی جمہوریۂ ایران کی فتح نہیں ہے بلکہ جبر و استبداد پر مبنی تمام شیطانی قوتوں اور ان کی فرعونی آمریت کے خلاف حق و عدالت، استقلال و حریت، جہاد و شہادت اور صبر و استقامت جیسے عظیم اسلامی اصول و اقدار کی فتح ہے، آٹھ سال کی مسلسل جنگ اور دو سال "نہ صلح نہ جنگ" جیسی غیر یقینی کیفیت کے بعد خود عراقی صدر صدام حسین کی طرف سے اسلامی جمہوریۂ ایران کی فتحیابی کا اعلان ۔ حق و عدالت کی راہ پر گامزن تمام انقلابی مسلمانوں کی جانب سے کبر و نخوت میں چور فرعونی کھوپڑیوں پر پڑنے والی وہ کاری ضرب ہے جو عالمی شیطانی قوتوں اور ان کے صدام صفت آلہ کاروں کے حواس بجا کرنے کے لئے کافی۔

ہم، حق و عدالت کی راہ میں حکومت ایران کے اسلامی و اصولی موقف کی وضاحت اور عراق کی باطل حکومت کے اعتراف شکست کو ایک تاریخی دستاویز کی شکل میں باقی رکھنے کے لئے صدر جمہوریۂ ایران حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ہاشمی رفسنجانی دام ظلہ کا خط صدام کے نام اور صدر جمہوریۂ عراق صدام حسین کا جوابی خط ایرانی صدر کے نام من و عن ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں، آخر میں ہم بین الاقوامی سطح پر اسلامی جمہوریۂ ایران کی فتح کے اعترافات کا مختصر خاکہ بھی پیش کریں گے۔

صدر اسلامی جمہوریہ ایران کا خط صدام کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمد نبیہ وآلہ الاطہار

جناب آغائے صدام حسین صدر جمہوریہ محترم!

مورخہ ۶۹/۵/۱۲ (۳، اگست ۱۹۹۰ء) کا روانہ کردہ آپ کا خط موصول ہوا، باوجود اس کے کہ بظاہر خط کا اصل مقصد صلح سے متعلق گفت و شنید کو آگے بڑھانا ہے پھر بھی اس میں بعض افسوسناک باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ حق و عدل پر مبنی ایک پائدار صلح برقرار ہونے کے سلسلہ میں جمہوری اسلامی ایران کے مطالبہ اور ارادہ کا تاکید کے ساتھ اعادہ کردوں، امید ہے آپ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہوں گے، ہم نے (اقوام متحدہ کی) قرارداد ۵۹۸ قبول کرنے کے بعد سے ہی صلح اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والے مسائل کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں کامل آگاہی کے ساتھ صدق دل سے کوششیں شروع کردیں، اور بنا اس بات پر رکھی کہ سوائے ان چیزوں کے جو ملت ایران کے جائز اور ناقابل تغییر حقوق سے مربوط ہیں کوئی بھی چیز صلح کی راہ میں ہماری اس پیش قدمی کو محدود نہ کرنے پائے اور ہم نے کیا بھی یہی، اس عرصہ میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی نگرانی میں انجام پانے والی گفتگوؤں کے دوران نیز آپ کے خطوط کے جوابات میں اور جنیوا میں ہمارے اور آپ کے نمائندوں کے درمیان جو گفتگو جاری ہے، اس میں بھی ہمارے انداز اور رویئے نے اس مسئلہ کو آپ پر روشن و واضح کردیا ہوگا۔

جنیوا میں، دونوں ممالک کے نمائندوں کے درمیان بات چیت کے ابتدائی مرحلہ میں ہی ہم نے طولانی بات چیت اور خطوط بازی کے بجائے صلح کی برقراری میں سرعت عمل اور قرارداد ۵۹۸ کو بروئے کار لانے کے اقدامات کی ضرورت پر سختی سے تاکید کی تھی اور ہم اب بھی اسی نظریہ کے قائل ہیں کہ گفتگو کی شکل تبدیل کرنے کے بجائے گفتگو کے مطالب موضوعات کو آگے بڑھانا چاہئے وہ مسائل، جو صلح

کے سلسلہ میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں، ان کے بارے میں اپنی صورت حال کی وضاحت ہم کو اپنے ھدف ومقصد سے قریب کرے گی، وہ ھدف، جو موجودہ صورت حال کو درہم وبرہم کر دینے والی بنیادوں یا دشمنان اسلام کی ساختہ وپرداختہ مصنوعی فضا جو اس وقت دنیا اور اس علاقہ کے مخصوص حالات کے تحت پیدا کی جا سکتی ہے ان سب کا سدباب کر دے گا۔

اس صورت میں صلح دونوں ملکوں کی دسترس میں ہو گی ، اور ایک دوسرے کے خلاف مصروف فوجیں دونوں ملتوں کے حیات بخش ضروریات کی تکمیل کر سکتی ہیں اور ان کی اصل ذمہ داری تعمیری رخ اختیار کرکے، علاقہ میں صلح وامنیت قائم کر سکتی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے پیش نظر ۱۳۶۹/۵/۱۲ (۳، اگست ۱۹۹۰ء) کے خط، مؤرخہ ۱۳۶۹/۵/۸ (۳۰، جولائی ۱۹۹۰ء) کے بلا دستخط خط اور مؤرخہ ۱۳۶۹/۴/۲۵ (۱۶، جولائی ۱۹۹۰ء) کے خط میں درج مطالب کے متعلق آپ کو درج ذیل نکتوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ اس وقت جینوا میں جاری گفتگو سے اعلیٰ سطح پر گفتگو، اسی وقت قبول کی جا سکتی ہے جب کہ جینوا میں جاری گفتگو سے ہم کسی ایسے خاص تاریخ تک پہنچ چکے ہوں جو آئندہ مراحل کے لئے بنیاد بن سکیں لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جینوا میں سوائے ایک دوسرے کے موقف سے ذرا بہتر آشنائی کے ہم کسی قابل ذکر مرحلہ تک بات آگے نہیں بڑھا سکے ہیں، جب کہ ہمارے اور آپکے نمائندوں کی ذمہ داری یہ تھی کہ بامعنی مسائل پر گفتگو انجام دیں، ان ہی وجوہات کی روشنی میں، نیز جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، دونوں ممالک کے صدر کے درمیان ملاقات اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ اہم اور کلیدی مسائل واضح اور حل ہو چکے ہوں، ورنہ دوسری صورت میں دونوں صدروں کے درمیان گفتگو کی ناکامی، ممکن ہے صلح کی برقراری میں نقصان دہ ثابت ہو اور اس کو دونوں ملکوں کی دسترس سے مزید دور کر دے۔

۲۔ مؤرخہ ۱۳۶۹/۵/۸ (۳۰، جولائی ۱۹۹۰ء) کے خط میں آپ کی طرف سے دریائے اروند کے بارے میں کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں، جن میں اگرچہ گزشتہ بیانات میں کئے جانے والے دعووں سے نیچے اتر کر بات کی گئی ہے لیکن آپ پر بھی یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے، صلح کی گفتگو کے لئے ہماری طرف سے اٹل و مشخص تجویز ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کا بنیاد قرار پانا ہے، کیونکہ گزشتہ معاہدوں کی پابندی کئے بغیر، خاص طور پر وہ معاہدہ جس پر خود آپکے دستخط موجود

ہیں، یہ امید نہیں رکھنا چاہئے کہ جو بات آج کہی جا رہی ہے اس پر اعتماد کر لیا جائے۔

۳۔ ایران کے مقبوضہ علاقوں سے (عراقی فوج کی) واپسی کے لئے دو ماہ کی مدت تجویز کی گئی ہے جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ یہ وہ کام ہے کہ اگر حسن نیت کے ساتھ انجام دیا جائے تو ایک دو روز کے اندر انجام پا سکتا ہے جبکہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے اپنی تجویز میں قیدیوں کی آزادی کے لئے تین ماہ کی مدت کے مقابل اس کام کے لئے دو ہفتہ کی مدت لازم قرار دی تھی۔

۴۔ تعجب کی بات ہے کہ سرزمین کویت پر عراقی فوج کے قبضہ کے خلاف ہماری حق پر مبنی پالیسی سے متعلق اپنی عربیت کی دہائی دیتے ہوئے تنقید سے کام لیا گیا ہے، حالانکہ بدیہی ترین مسائل منجملہ ان کے علاقہ میں وسیع پیمانے پر بیرونی افواج کے وجود کے لئے زمین ہموار کرنا، علاقہ میں بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا پیدا کر کے مسلمان عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنا، اسلامی بنیاد پر قائم ضمانت اور خبرگیری، ہمسائیگی اور علاقائی ثبات و امن کی پامالی، ملکی سرحدوں کی صورت حال میں تبدیلی اور بین الاقوامی معاہدے، یہ تمام مسائل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

بھلا اس بات کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے کہ جس خط کا خداوند تبارک و تعالیٰ کے نام سے آغاز اور الہام آفریں نعرے "اللہ اکبر" پر اختتام ہوا ہو، اس میں اسلام و قرآن کے صحیح اور سچے تعلیمات کے خلاف، نسلی و قومی بنیادوں کو اسلامی و ایمانی بنیاد پر مقدم قرار دیا جائے!

قرآن کی یہ محکم آیتیں... انما المومنون اخوۃ[1]، ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ...[2]، انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[3]،

ہر مسلمان کے لئے کافی ہیں کہ وہ اپنی پالیسیوں میں قومی، جغرافیائی اور لسانی دوستی کو اسلامی اصول کے تحت الشعاع قرار دے دے، جنگ کے دوران حکومت کویت کی سیاستیں اور ایران کے اسلامی انقلاب کے تئیں اس کی ظالمانہ روش کی حدیں دوسروں سے زیادہ آپ پر روشن ہیں لیکن ہمارا فیصلہ افراد سے تعلقات کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہمارے اصول پر استوار ہے۔

---

[1] حجرات/۱۰ (یقیناً تمام مومنین بھائی بھائی ہیں) [2] انبیاء/۹۲ (بے شک یہ تمہاری امت ایک واحد امت ہے اور...)
[3] حجرات/۱۳ (ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو (مختلف) قبیلوں اور برادریوں میں قرار دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو، اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محترم و باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے)

۵۔ یقیناً، جس وقت دو ملکوں کے درمیان صلح کی بات چیت چل رہی ہو، ایک پڑوسی ملک پر بغیر کسی قسم کی معمولی سی بھی اطلاع اور ہماہنگی کے ناقابل تصور حملہ، اور وہ بھی جب کہ اس سے ہمارے روابط میں غیر معمولی آثار و نتائج مرتب ہوسکتے ہیں، ہمارے اعتماد کو کمزور کرسکتا ہے اور ادھر چند ماہ سے جاری مذاکرات کے مقاصد میں سنجیدہ طور پر شکوک و شبہات پیدا کرسکتا ہے خصوصاً جب کہ اس عرصہ میں ہم نے حسن نیت ظاہر کرنے والے کسی اقدام کا مشاہدہ بھی نہ کیا ہو بلکہ پہلے ہی کی طرح ہماری سرزمین پر قبضہ باقی رکھنے کا اصرار، حتیٰ تیل کے کنووں میں لگی آگ کو بجھانے جیسے معمولی مسئلہ میں آپ کی مخالفت کا ہم نے ضرور مشاہدہ کیا ہے جس سے وطن اسلامی کا سرمایہ تلف ہونے کے سوا آپ کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔

۶۔ آپ کے خط کے آخری حصہ کا لب و لہجہ، گفتگو کو جاری رکھنے کے لئے مناسب انداز کا نہیں ہے، اس میں وہ لہجہ اور زبان استعمال کی گئی ہے جس کا، ایک انقلابی مسلمان ملت کے سلسلہ میں فائدہ مند ثابت نہ ہونا زمانۂ گزشتہ میں آزمایا جا چکا ہے، اور ہمیں قانع کرنے کے لئے خود اپنے گزشتہ دوستوں اور حامیوں کی جدید پالیسیوں کے بارہ میں تجزیہ و تحلیل سے استفادہ کیا گیا ہے جو مناسب نہیں ہے، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہم عملی طور پر ان تمام مراحل کو آزما چکے ہیں اور ان سے گزر چکے ہیں اور ثابت کردیا ہے کہ ہم تمام چیزوں سے زیادہ ایمان و استقامت اور عوام کی حمایت کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور دوسروں کے قہر و لطف کو اتنی اہمیت کے قابل نہیں سمجھتے کہ زندگی کے منصوبوں، پالیسیوں اور اہم فیصلوں میں ان کو بنیاد قرار دیں، ہم موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں بھی نہیں ہیں اور سوائے اپنے جائز اور قانونی حقوق کے کچھ اور نہیں چاہتے، وہی چیزیں جن پر گفتگو کے تمام مراحل میں ہم تاکید کرتے رہے ہیں۔

۷۔ صلح کی راہ میں سرعت عمل سے متعلق آپ کے خط میں جس نکتہ کی طرف تاکید کی گئی ہے ہم اسے کامل طور پر قبول کرتے ہیں لیکن محض زبانی تجویزیں پیش کرنے اور اصل گفتگو کے مطالب میں کوئی نتیجہ حاصل ہوئے بغیر مذاکرات کی سطح کو بلند کرنے سے، صلح میں تیزی پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیں چاہئے کہ دونوں ملکوں کے ان معاہدوں کی پابندی کریں جنھیں بین الاقوامی نظر میں قانونی حیثیت حاصل ہے اور اپنے جائز حق سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ جو چیز آٹھ سال کی جنگ سے حاصل نہ ہوسکی

مذاکرات کے ذریعہ اس کا حاصل ہونا قابل تصور نہیں ہے، اگر ہم اس بات کو قبول کر لیں، تو زمینی و دریائی سرحدیں معین کرنے کے سلسلہ میں ۱۹۷۵ء کے معاہدے کے بجائے کسی اور چیز کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر قبول نہ کرتے ہوں تو بہتر ہے کہ معاہدے کو عمل میں لانے کا کام اقوام متحدہ اور "امن کمیٹی" پر چھوڑ دیں، اور ضمنی طور پر مشترک مسائل میں نظریات کے ردوبدل کے لئے جنیوا میں قائم نقطۂ ارتباط کو باقی رکھیں۔ والسلام علیکم

اکبر ہاشمی رفسنجانی

۱۶ محرم ۱۴۱۱ ہجری قمری مطابق ۶۹/۵/۱۷ ہجری شمسی

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ہاشمی رفسنجانی مدظلہ کے حق پر مبنی اس صاف اور دو ٹوک خط کے جواب میں عراق کے صدر صدام حسین نے ۱۹۷۵ء کے الجزائر معاہدہ کو تسلیم کر لیا۔ اور جناب ہاشمی رفسنجانی کے نام صدام کا مندرجہ ذیل خط ۲۳ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۹۹۰ء کو بغداد ریڈیو سے نشر کیا گیا۔

صدام کا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت صدر جمہوریہ علی اکبر ہاشمی رفسنجانی! صدر جمہوریہ اسلامی ایران۔

خداوند عظیم پر توکل کے بعد، تمام مسلمانوں خاص طور پر پڑوسی ملک ایران کے مسلمان بھائیوں کے ساتھ برادرانہ روابط کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو برطرف کرنے کی نیت سے نیز تمام مومنین کو، ان تخریب پسندوں کے مقابل کہ جو مسلمانوں اور عرب قوموں کو ضرب لگانا چاہتے ہیں، سنجیدگی کے ساتھ فعال اور ہم آہنگ کرنے کے لئے اور اسی طرح ایران و عراق کو بین الاقوامی شر پسند طاقتوں اور ان کے علاقائی آلہ کاروں کے کھلواڑ اور شاطرانہ حرکتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اور ۱۲ اگست ۱۹۹۰ء کو علاقہ میں ہمہ جہت دائمی صلح برقرار کرنے کے لئے ہم نے جو اعلان کیا ہے اس کی بنیادی روح سے ہم آہنگی ظاہر کرنے کے لئے جیسا کہ اس خط میں ہم نے علاقہ میں ایک ہمہ جہت دائمی صلح کی خواہش کی تھی اور اس لئے بھی کہ آپسی تعاون میں رکاوٹ اور غلط فہمی کا موجب بننے والے ہر طرح کے بہانے دور ہو جائیں، نیز عراقی

وسائل ملیم مقابلہ آرائی کے میدان سے دور معطل نہ پڑے رہیں، اور ان کو ان مقاصد کی راہ میں استعمال کیا جا سکے جن پر تمام مسلمان اور شریف حق پسند عرب متفق ہیں نیز ایسی محاذ آرائیوں، کینوں اور دشمنیوں سے دوری کے لئے اور اس لئے بھی کہ خیر خواہ افراد عادی روابط دوبارہ برقرار ہو جانے کی صورت میں اپنی راہ پالیں گے اور ہمارے ۲۱/۴/۱۹۹۰ء کے خط سے لے کر آپکے ۸ اگست ۱۹۹۰ء کے آخری خط تک ہونے والے مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر آخری حل اور وضاحت کے عنوان سے ہم نے مندرجہ ذیل فیصلے کئے ہیں تاکہ کہیں کوئی بات مبہم نہ رہ جائے۔

۱۔ جنیوا میں ہمارے نمائندہ جناب برزان ابراھیم تکریتی کو آپکے نمائندہ جناب سیرکس نامی کے ذریعہ موصول ہونے والے مؤرخہ ۸ اگست ۱۹۹۰ء کے جوابی خط میں آپ کی تجویز، ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کو ایک اٹل حقیقت کے طور پر بنیاد قرار دینے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ۳۰ جولائی ۱۹۹۰ء کے خط میں، خاص طور پر قیدیوں کے تبادلے اور قرارداد نمبر ۵۹۸ کی شق ۶ اور ۷ سے متعلق جو کچھ ذکر ہوا ہے ہم اس سے موافقت کرتے ہیں۔

۲۔ اس تحریر کی بنیاد پر، جو اس خط کی پہلی شق میں اور جو کچھ مؤرخہ ۳۰ جولائی ۱۹۹۰ء کے خط میں ذکر ہے، ہم ایک وفد تہران بھیجنے کو تیار ہیں یا یہ کہ ایک وفد آپ کی طرف سے بغداد روانہ کیا جائے تاکہ موافقت ناموں کو دستخط کے لئے تیار کرے۔

۳۔ حسن نیت میں پہل کے طور پر، ہم روز جمعہ، ۱۷ اگست ۱۹۹۰ء (۶۹/۵/۲۶) سے اپنی افواج کو آپ کی تمام سرحدوں سے واپس بلا رہے ہیں، اور صرف علامتی فوجوں کو سرحدی محافظ اور پولیس کے عنوان سے باقی چھوڑ رہے ہیں تاکہ طبیعی صورت حال میں وہ اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں پر عمل کریں۔

۴۔ جنگی قیدیوں کو، تمام زیر حراست افراد کے ساتھ ہم فوری طور پر، زمینی سرحدوں منجملہ خانقین قصر شیریں اور جو علاقے بھی دونوں طرف سے مورد اتفاق قرار پاتے ہیں، آزاد کریں گے، اور اس سلسلہ میں روز جمعہ، ۱۷ اگست کو سب سے پہلا قدم اٹھا دیں گے۔

برادر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی! ہمارے اس فیصلے سے، تمام چیزیں روشن و واضح اور وہ تمام مطالبات اور مسائل جن کو آپنے بنیاد قرار دیا تھا، پورے ہو جاتے ہیں اور اب سوائے اس کے کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے کہ مصالحت نامہ تیار ہو اور دستخط ہو جائے، تاکہ ہم میں سے ہر ایک کے سامنے

ایک نئی اور باعزت زندگی میں قدم رکھنے کی راہ واضح اور آشکار ہے۔

ہمارا باہمی تعاون اسلامی اصول، برابری کے احترام اور ان دشمنوں کو نکال بھگانے کے لئے موجود علاقہ میں خلفشار برپا کرنا چاہتے ہیں، جو ٹمیلے پانی سے مچھلی نکالنے" کا قصد رکھتے ہیں، دوسری زندگی ساز مسائل کے علاوہ اگر ہو سکے تو ہم خلیج کے مسئلہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تاکہ خلیج صلح و امن کا سمندر بن جائے اور ہماری بدخواہ غیر ملکی فوجوں اور جنگی بیڑوں سے خالی ہو جائے۔

واللہ اکبر والحمد للہ

صدام حسین — صدر جمہوریہ عراق

۲۳ر محرم ۱۴۱۱ھ (۱۵ر اگست ۱۹۹۰ء)

(لائق ذکر یہ ہے کہ صدام حسین نے اپنا یہ خط اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کے نام بھی روانہ کردیا تھا جس کو بعینہ تاریخی سند کے طور پر فائل کرلیا گیا ہے۔ بعد میں ایران کی حکومت نے بھی صدر جمہوریہ ایران کا مذکورہ خط اقوام متحدہ کے دفتر میں سند کے طور پر روانہ کردیا جس کو وہاں سے فائل کرلیا گیا)

حکومت ایران کا ردعمل

بغداد ریڈیو سے صدام کا خط نشر ہونے کے فوراً بعد ایران کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ولایتی نے فرمایا:-

"یہ اپنی تاریخ میں اسلامی جمہوریہ ایران کی عظیم ترین فتح ہے یعنی جو کچھ ہوا ہے درحقیقت ہمارے عوام کے حق پر مبنی حقوق کی جیت ہے، جنھوں نے انصاف یہ ہے کہ آٹھ سال جنگ میں بھرپور پائیداری کا ثبوت دیا ہے۔" ڈاکٹر ولایتی نے فرمایا: بحمد اللہ آج ایران کے خلاف عراقی حملہ کے دس سال بعد عوام اپنے اس صبر و استقامت اور پائیداری کا پھل دیکھ رہے ہیں، یہ خدا کی مدد سے ملک کی ہمہ جہت تعمیر اور اسلامی جمہوریۂ ایران کے حقوق حقہ کے اثبات کے لئے بہت ہی اچھا سویرا ثابت ہوگا۔"

عالمی ردعمل

عالمی ذرائع ابلاغ خصوصاً دنیائے عرب کے اخبارات نے صدام حسین کی جانب سے الجزائر کے معاہدہ ۱۹۷۵ء کی قبولیت کو اپنے پہلے صفحات پر جلی حرفوں میں شائع کرتے ہوئے اس کو اسلامی جمہوریہ

ایران کی عظیم فتح قرار دیا ہے۔ متحدہ عرب امارات کے اخبارات نے صدام کے پیغام پر سخت لب ولہجہ میں تنقید کرتے ہوئے آٹھ سالہ جنگ کو مورد سوال قرار دیا ہے۔

"الاتحاد" کے مطابق "صدام حسین نے خود ہی ۱۹۸۰ء میں ایران سے جنگ شروع ہونے کے بعد الجزائر کے معاہدہ کو پارہ پارہ کرتے ہوئے اس کو کالعدم قرار دیا تھا اور آج خود ہی اس کو قانونی معاہدہ کے طور پر قبول کر کے درحقیقت ایرانی مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔"

شارجہ کے اخبار "الخلیج" کے مطابق "صدام حسین نے ناگہانی طور پر ایرانی مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور طویل جنگ میں سپر انداختہ ہوگیا۔" اس نے عراق کی جانب سے الجزائر کا معاہدہ قبول کئے جانے کو عراق اور کویت کے واقعات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مصری حکومت کو اس واقعہ نے چراغ پا کر دیا اور صدام کے اس عمل کو قاہرہ نے شدت کے ساتھ تنقید کا نشانہ بنایا۔ دبئی سے شائع ہونے والا اخبار "البیان" اس سلسلہ میں لکھتا ہے: قاہرہ ریڈیو نے صدام کے پیغام پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "صدام کا پیغام اپنے ذاتی مفادات کے لئے اسلامی ملکوں کو اپنی طرف جذب کرنے کی غرض سے ایک نیا حیلہ ہے۔"

"البیان" کے ہی مطابق: فرانس کے سابق وزیر خارجہ "کلود شسون" نے صدام کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "اگرچہ ایک لمحہ کے لئے بھی صدام کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن صدام نے الجزائر کا معاہدہ قبول کر کے ثابت کر دیا کہ اس نے کویت پر فوجی قبضہ کر کے ایک زبردست بین الاقوامی غلطی کی ہے۔"

اسی طرح کویت اور سعودی عرب کے اخبارات نے اپنے تبصروں پر اعلان کیا کہ "صدام کی جانب سے ایران کے شرائط کا قبول کیا جانا سرزمین ایران پر عراقی حکومت کے حملہ آور ہونے کی دلیل ہے۔" ان ممالک کے ریڈیو نے عراقی فوج سے درخواست کی کہ ایران کے خلاف آٹھ سالہ جنگ سے عبرت حاصل کریں اور خود کو ایک دوسری جنگ میں گرفتار نہ کریں۔ اسی ضمن میں صدام پر تنقید کرتے ہوئے "الاخبار" لکھتا ہے: "صدام نے الجزائر کے معاہدہ کو لغو قرار دیکر اپنے ملک کو ایران کے ساتھ ایک تباہ کن جنگ میں الجھا دیا اور اس دوران ایک لاکھ ۲۵ ہزار عراقی فوجیوں کو قربان کر دیا اور آخر میں بلا کسی قید و شرط کے ایران کے سامنے سپر انداختہ ہو گیا۔"

لبنانی امل پارٹی کے صدر حسین موسوی (ابو ہشام) نے کہا: "موت کے خطرے سے دوچار

ہو جانے نے صدام کو مجبور کر دیا کہ وہ اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ ۱۹۷۵ء کے الجزائر معاہدہ کو قبول کر لے۔"

"توحید اسلامی تحریک" کے سربراہ شیخ سعید شعبان نے صدام کی طرف سے الجزائر معاہدہ قبول کئے جانے پر ایرانی عوام اور حکومت کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ایران و عراق کی مسلمان قوموں کے درمیان عالمی استکبار اور عالمی صہیونزم سے مقابلہ کے لئے آپسی معاہدہ ہونا چاہئے۔ ترکی کے اخبار "حریت" نے "صدام نے مشرقی محاذ پر ہتھیار ڈال دیئے" عنوان کے تحت لکھا ہے کہ "فوجی قبضہ کے تحت جس زمین کے لئے عراق نے ایران سے آٹھ سال جنگ لڑی تھی ایک بیان جاری کر کے غیر متوقع طور پر اسے ایران کے سپرد کر دیا۔"

روزنامہ "گون ایڈین" نے اس کو ایران کے حق میں ایک عظیم امتیاز اور کارنامہ قرار دیا، روزنامہ "ملیت" کے مطابق "صدام کے اس اقدام سے علاقائی قوت و طاقت کا توازن الٹ پلٹ ہو کے رہ گیا روزنامہ "لوگون" نے لکھا ہے کہ "اس طرح صدام نے ایک دوسرے پر فوجی حملہ نہ کرنے کے سلسلہ میں شام اور ترکی سے کئے جانے والے معاہدوں کے بعد ایران کے ساتھ بھی برابر کی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا ہے۔"

مغربی جرمنی کے ریڈیو نے پہلی بار اپنے سیاسی تبصرے میں اعلان کیا: "صدام حسین نے ۱۹۸۰ء میں ۱۹۷۵ء کے الجزائر معاہدہ کو نظر انداز کر کے ایران کے خلاف جنگ شروع کی تھی۔" اور اسی خبر کے مطابق "بدھ کے دن صدام حسین کی طرف سے ایران کے ساتھ صلح کی قبولیت کو سن کر عراقی عوام نے شادمانی کے انداز میں ہوائی فائر کر کے جشن منایا۔"

اٹلی کے وزیر خارجہ نے نامہ نگاروں کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: "ایران و عراق کے درمیان صلح کی تجویز ایسی لگتی ہے کہ موجودہ حالات میں ایک نمائش ہے۔"

روس کی حکومت نے اعلان کیا، "اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے فیصلہ کا نافذ ہونا اور ایران عراق کے درمیان روابط برقرار ہونا خلیج فارس کے بحران کے حل میں مؤثر ثابت ہوگا۔"

صدر جمہوریۂ امریکہ نے نامہ نگاروں سے انٹرویو کے دوران کہا: "عراق کا ایران کی تمام شرائط قبول کر لینا میرے لئے تعجب خیز ہے" انہوں نے مزید کہا: میرے لئے موجودہ حالات میں عراق کی

اس موافقت سے علاقہ میں کیا اثرات مرتب ہوں گے کچھ پیشین گوئی کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ایران بھی کویت پر عراقی حملہ سے ناراض ہے۔ ایک سوال کے جواب میں مسٹر بوتی نے کہا: "کویت پر عراقی حملہ سے متعلق ایرانی پالیسی میں کسی طرح کا تغیر میں نے مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا دونوں ممالک کسی مکمل اور آخری مصالحت پر پہنچ گئے ہوں۔"

بوتس نے ایک دوسرے موقع پر اعتراف کیا ہے کہ: "یہ صدام تھا جس نے ایران پر حملہ کیا تھا اور اب کویت کو غارت کر رہا ہے۔"

اسرائیلی وزیر تعمیرات آریل شارون نے کہا: ایران کے تئیں عراقی پالیسی میں یکبارگی تبدیلی نے اسرائیل کے لئے حالات زیادہ خطرناک بنا دیئے ہیں اور موجودہ خطرے سے اسرائیل کی رہائی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ صدام کو شکست کی منزل تک پہنچانا ہے۔

خلیج فارس باہمی تعاون کمیٹی کے رکن ملکوں کے وزرائے خارجہ نے ایک اجتماعی بیان میں صدام کی طرف سے ایران کو صلح کی پیشکش کرنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے، کمیٹی کے سیکریٹری جنرل عبد اللہ بشارت نے کہا کہ: عراق کی طرف سے الجزائر کے معاہدے ۱۹۷۵ء کا قبول کرلیا جانا آٹھ سالہ جنگ اور ان تمام مادی طاقتوں اور ذخیروں کو کھونے کے بعد ایک بڑی سیاسی، روحی اور ثقافتی شکست ہے۔"

کویت کے وزیر خارجہ شیخ صباح نے صدر جمہوریہ ایران سے ملاقات کے دوران کہا: "ہم ایران کی حکومت اور عوام کو اپنے حقوق حقہ کے حصول اور الجزائر کے معاہدہ ۱۹۷۵ء کے مطابق بیان شدہ مسلم زمینوں کی واپسی اور جنگی قیدیوں کی آزادی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں، انہوں نے کہا: جو کچھ آپ کو نصیب ہوا ہے جائز حقوق اور اصول و اخلاق کی پابندی کی یقینی کامیابی کو ثابت کرتا ہے، شیخ صباح نے ایرانی وزیر خارجہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "ہم ایران کے خلاف عراق کی تھوپی ہوئی جنگ کے دوران اپنی حکومت کے رویہ پر اظہار افسوس کرتے ہیں، ہمیں اعتراف ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا ایک عظیم غلطی تھی، انہوں نے آخر کلام میں کہا: "میرے ایران آنے سے پہلے ہی بین الاقوامی قوانین کے تحت ایران نے جو بنیادی پالیسی اپنا رکھی ہے ہم اس سے زیادہ ایران سے کچھ اور نہیں چاہتے تھے۔"

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے صدر صدام کے اقدام کو ایک مثبت اقدام سے تعبیر کیا ہے البتہ اقوام متحدہ کے دیگر سیاست مداروں کی نظر میں "ایرانی سرحدوں سے عراقی افواج کی واپسی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صدام حسین بین الاقوامی طور پر تنہا ہو جانے کے باوجود کویت کا عراق میں انضمام باقی رکھنا چاہتا ہے۔"

برطانوی مبصرین نے صدام کی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ایران سے اپنی فوجیں واپس بلانے کے سلسلہ میں صدام کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ وہ اس طرح دنیا کے انتہا پسند مسلمانوں کی حمایت حاصل کرے گا اس کے علاوہ اس کی ایک طرف سے سرحد محفوظ ہو جائے گی۔"

ان کے خیال میں: "اس طرح امریکہ خلیج فارس کے بحران میں ایران عراق دشمنی سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔"

مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات کے ماہر کرنل "اندریو دنکان" کا کہنا ہے کہ: "جمعہ کے دن سے خلیج فارس کا بحران ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے اور یہ اس وقت سے شروع ہوا جب عراق نے دنیا کے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ سعودی عرب کے اماکن مقدسہ کی حفاظت کریں۔ ایران سے مصالحت کی پہل میں بھی صدام کا یہی مقصد ہے کہ عرب دنیا خاص طور پر ایران کے انتہا پسند مسلمانوں کو مطمئن کیا جائے اور مغرب کے خلاف جنگ میں ان کی حمایت حاصل کی جائے۔"

ماخوذ از "اطلاعات" روز پنجشنبہ، ۲۴ محرم ۱۴۱۱ھ

و

روزنامہ "جمہوری اسلامی" پنجشنبہ، ۲۴، محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

عرفانی اصطلاحیں

(۸)

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جناب سید ابو جواد

اس سبق میں ہم بعض عرفانی اصطلاحوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں عرفا کی خود اپنی بہت سی اصطلاحیں ہیں۔ ان کی اصطلاحیں سمجھے بغیر ان کے مقاصد کو سمجھنا صرف نا ممکن ہی نہیں بلکہ ہوسکتا ہے ان کے مقصد کے خلاف مفہوم سمجھ میں آئے۔ اور یہ عرفان کے خصوصیات میں سے ہے۔

یوں تو ہر علم کی کچھ اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں جن سے واقفیت ناگزیر ہے۔ عرف عام کے مفاہیم علمی مقاصد کی وضاحت کے لئے ناکافی ہیں۔ چنانچہ ہر علم میں کچھ مخصوص الفاظ مخصوص معانی کے لئے اہل فن کے درمیان رائج ہوجاتے ہیں اور عرفان بھی اسی سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن عرفان کی مخصوص اصطلاحوں کا سبب صرف مذکورہ دلیل ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ عرفا اپنے مقاصد، طریقت سے ناآشنا افراد سے چھپانا چاہتے ہیں، کیونکہ عرفانی معانی و مفاہیم غیر عارف کے لئے ــــ کم از کم عارفوں کے خیال میں ــــ قابل فہم ہی نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ عرفا دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے برخلاف اپنے مقاصد کو چھپانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اسی لئے عرفا کی اصطلاحیں، اصطلاحی پہلو کے ساتھ ہی ساتھ کسی حد تک معمائی پہلو کی بھی حامل ہیں لہٰذا اس معمہ کا "راز" معلوم کرنا ضروری ہے۔

ان دو وجوہات کے علاوہ ممکن ہے ایک تیسری وجہ بھی کارفرما ہو جو کام کو زیادہ

پیچیدہ بنا دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض عرفا ۔ کم از کم وہ عرفا جو "ملامتیہ" نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔ سیر و سلوک کے مراحل میں "تعینات" (تشخصات) کو ختم کرنے اور عوام میں فخر و مباہات اور "نام" و نمود پیدا کرنے کے بجائے "ننگ" و عار حاصل کرنے کی خاطر اپنی باتوں میں "ریائے معکوس" کے اظہار کی کوشش کرتے تھے ۔ یعنی ان ریاکاروں کے برعکس جو برے ہیں لیکن اپنے کو اچھا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو کو گیہوں بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ عرفا چاہتے ہیں کہ ان کی اچھائیاں صرف ان کے اور خدا کے درمیان ہی محدود رہیں اور عوام انھیں برا سمجھتے رہیں ۔ وہ اپنے گیہوں کو جو بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے نفس پر خود نمائی و خود پرستی کی تمام راہیں مسدود کر دیں کہا جاتا ہے کہ خراسان کے اکثر عرفا "ملامتی" تھے، بعضوں کا خیال ہے کہ حافظ بھی ملامتی ہیں "رندی" "لاپرواہی" "قلندری" اور "قلاشی" جیسے مفاہیم کا مقصد صرف خلق سے بے اعتنائی برتنا ہے نہ کہ خالق سے بے توجہی ۔

حافظ نے باطن کے اچھے ہونے اور بدنامی کے اسباب ظاہر کرنے کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں :۔

گر مرید راہ عشقی فکر بدنامی مکن

شیخ صنعان خرقہ، رھن خانہ خمار داشت

یہ شیخ صنعان کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

★★★

گر من از سرزنش مدعیان اندیشم

شیوہ مستی و رندی نرود از پیشم

زھد رندان نو آموختہ راھی بہ دھی است

من کہ رسوائے جہانم چہ صلاح اندیشم

★★★

بری پرستی از آن نقش خود بر آب زدم

کہ تا خراب کنم نقش خود پرستیدن

وقت آن شیرین قلندر خوش کہ در اطوار سیر
ذکر تسبیح ملک در حلقۂ زنار داشت

لیکن حافظ نے ایک دوسرے مقام پر تقدس کی نمائش (ریاکاری) کی طرح فسق کی نمائش (ملامتی پسندی) کی بھی مذمت کی ہے:-

ولا دلالت خیرت کنم بہ راہ نجات
مکن بہ فسق مباہات و زہد ہم مفروش

مولانا روم ملامتیوں کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

چون زبد نامان نباید ننگ داشت
ہوش بر اسرارشان باید گماشت
ای بسا زر کہ سیہ تابش کنند
تا شود ایمن ز تاراج و گزند

جن چیزوں کے عرفا قائل اور فقہا مخالف ہیں ان میں ایک یہی مسئلہ ہے اسلامی فقہ جس طرح سے ریا کی مذمت کرتی ہے اور اسے ایک قسم کا شرک سمجھتی ہے اسی طرح ملامتی پسندی کو بھی ناپسند کرتی ہے، اس کی نظر میں کسی بھی مومن کو اپنی سماجی عزت و آبرو کا دامن داغدار بنانے کا حق نہیں ہے۔ خود بہت سے عرفا نے بھی "ملامتی پسندی" کی مذمت کی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ملامتی پسندی کا شیوہ — جو بعض عرفا کے یہاں معمول رہا ہے — سبب بنا کہ وہ عمداً اور جان بوجھ کر اپنے افکار اور اہداف و مقاصد کو الٹ کر پیش کرنے لگے اور یہ طریقہ کار ان کے مقاصد سمجھنے کو بہت مشکل بنا دیتا ہے۔

اہل عرفان کے ایک پیشوا ابو القاسم قشیری، رسالہ قشیریہ میں صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ عرفا عمداً مبہم گوئی سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ناسمجھ افراد ان کے اطوار، حالات اور مقاصد سے باخبر ہوں، کیونکہ یہ چیزیں ناسمجھوں کے فہم و ادراک سے باہر ہیں[1]

---

[1] رسالہ قشیریہ ص ۳۳

عرفا کی اصطلاحیں بہت زیادہ ہیں۔ کچھ اصطلاحیں، نظری عرفان یعنی عرفانی تصور کائنات اور اس تعبیر و تفسیر سے تعلق رکھتی ہیں جو عرفان کائنات کے متعلق پیش کرتا ہے۔

یہ اصطلاحیں فلسفیوں کی اصطلاحات جیسی اور وضع کی ہوئی ہیں اور ان کا سمجھنا بھی بہت مشکل ہے جیسے: فیض اقدس، فیض مقدس، وجود منبسط، حق مخلوق بہ، حضرات خمس، مقام احدیت، مقام واحدیت اور مقام غیب الغیوب وغیرہ۔

کچھ اصطلاحیں عملی عرفان یعنی عرفانی سیر و سلوک کے مراحل سے مربوط ہیں چنانچہ فطری طور پر یہ اصطلاحیں انسان سے مربوط اور نفسیاتی یا اخلاقی مفاہیم کے مانند ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا نفسیاتی علم ہے اور وہ بھی تجرباتی علم النفس۔ عرفا کے خیال میں فلاسفہ یا نفسیات کے ماہروں یا دینی علماء یا عمرانیات کے ماہروں کو جنہوں نے عملی طور پر اس وادی میں قدم نہیں رکھا ہے اور نفس کے ان حالات و اطوار کا نزدیک سے مشاہدہ و مطالعہ نہیں کیا ہے انھیں بھی ان مسائل میں اظہار رائے کا حق نہیں ہے۔ پھر دوسرے طبقے کس شمار میں آتے ہیں۔

نظری عرفان کی اصطلاحوں کے برخلاف یہ اصطلاحیں قدیمی ہیں۔ کم از کم تیسری صدی یعنی "ذوالنون"، "بایزید" اور "جنید" کے زمانہ سے موجود ہیں۔

اب ہم یہاں قشیری اور دیگر عرفا کی بیان کردہ بعض اصطلاحیں پیش کر رہے ہیں:۔

۱۔ وقت

ہم گزشتہ سبق میں بوعلی سینا کی زبانی یہ اصطلاح نقل کر چکے ہیں۔ اب ہم خود عرفا کا بیان پیش کر رہے ہیں۔ قشیری کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ "وقت" کا مفہوم نسبی و اضافی ہے۔ عارف پر جب کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ ایک خاص عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ خاص حالت اس نقطہ نظر سے کہ ایک مخصوص عمل کا تقاضا کرتی ہے اسے اس عارف کے "وقت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ اس حالت میں ایک دوسرا عارف، کوئی دوسرا "وقت" رکھتا ہو یا خود یہی عارف کچھ دوسرے حالات میں دوسرے "وقت" کا مالک ہوگا اور دوسرا وقت دوسرے اعمال و فرائض کا متقاضی ہوگا۔

عارف کو "وقت شناس" ہونا چاہئے۔ یعنی جو حالت غیب سے اس پر طاری ہوئی ہے اور اس حالت میں جو فریضہ اس پر عائد ہوتا ہے اسے پہچانے۔ اسی طرح عارف کو وقت کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے کہا گیا ہے: "عارف ابن الوقت" ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق

نیست فردا گفتن از شرط طریق

یہ اصطلاحی وقت وہی ہے جسے فارسی کے عرفانی اشعار میں "دم" یا "عیش نقد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خاص طور سے حافظ نے "نقد عیش" اور "دم کو غنیمت جاننے" کے بارے میں بہت سے شعر کہے ہیں۔

نا آشنا یا بدخواہ افراد نے جو حافظ کے کلام سے اپنے فسق و فجور کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں یہ خیال کیا ہے یا یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حافظ کا مقصد مادی لذت پرستی اور خدا، مستقبل نیز عاقبت کو فراموش کرنے کی دعوت دینا ہے۔ یعنی وہی چیز جسے اہل یورپ "ایکوریازم"[1] کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

"دم کو غنیمت جاننا" یا "عیش نقد" حافظ کے اشعار کی ایک تکیہ گاہ ہے۔ شاید تیس بار یا اس سے بھی زائد اس مفہوم پر تکیہ کیا گیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے چونکہ حافظ کے اشعار میں، رمزیہ گفتگو یا دوسرے لفظوں میں "اسرار" اور سمبولک انداز میں بات کہنے کی عرفانی روش کی بہت زیادہ رعایت ہوئی ہے لہٰذا ان کے بہت سے اشعار سے بظاہر ان ہی فاسد معانی و مفاہیم کا وہم ہوتا ہے لیکن ہم یہاں ان کی چند بیتیں پیش کر رہے ہیں جو ان کے تمام اشعار کے لئے قرینہ بن سکتی ہیں:-

من اگر بادہ خورم ورنہ چہ کارم باکس

حافظ راز خود و عارف "وقت" خویشم

★★★

خیز تا خرقۂ صوفی بہ خرابات بریم

شطح و طامات بہ بازار خرافات بریم

---

[1] "EPICURISM" یونانی فلسفی اپیکور کا اخلاقی فلسفہ ہے۔ وہ لذت پرستی کو انسان کا اصلی مقصد اور خیر مطلق سمجھتا تھا۔

شرمان باد ز پشمینہ آلودہ خویش
گر بدین فضل و هنر نام کرامات بریم
قدر "وقت" ار نشناسد دل و کاری نکند
بس خجالت کہ ازاین حاصل اوقات بریم

★★★

سحر گہ رہروی در سرزمینی
ہمی گفت این معما با قرینی
کہ ای صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینی[1]
خدا زآن خرقہ بیزار است صد بار
کہ صد بت باشدش در آستینی
نمی بینم نشاط "عیش" در کس
نہ درمان دلی نہ درد دینی
درونہا تیرہ شد باشد کہ از غیب
چراغی برکند خلوت نشینی
نہ حافظ را حضور درس خلوت
نہ دانشمند را علم الیقینی

اس سلسلہ میں حافظ کے ذومعنی اشعار بے شمار ہیں منجملہ یہ شعر:-

در عیش نقد کوش کہ چون آبخور نماند
آدم بہشت روضہ دار السلام را

---

[1] من اخلص للہ اربعین صباحاً جرت ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ - حدیث نبوی
جو شخص چالیس دن اپنے دل کو خدا کے لئے خالص بنا لے خدا اس کی زبان پر اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کر دے گا۔

قشیری کہتے ہیں : یہ جو کہا جاتا ہے "صوفی ابن الوقت ہے" یعنی وہ ہمیشہ وہی کام انجام دیتا ہے جو اس کے لئے اس وقت یا اس حال میں اولویت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے" الوقت سیف قاطع " یعنی وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وقت کا حکم قاطع ہے اس کی مخالفت قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔

۲۔۳ حال و مقام

عرفا کی مشہور اصطلاحوں میں سے ایک حال و مقام کی اصطلاح ہے۔ عارف کے دل پر بے اختیار جو چیز وارد ہو جائے اسے "حال" کہتے ہیں۔ اور جو چیز حاصل کی جاتی ہے اسے "مقام" کہتے ہیں۔ حال سریع الزوال ہوتا ہے لیکن مقام باقی و پائیدار ہوتا ہے، کہا گیا ہے کہ احوال بجلی کے کوندے کے مانند ہیں جو جلد ہی مٹ جاتی ہے۔

حافظ کہتے ہیں :۔

برقی از منزل لیلیٰ بدرخشید سحر
وہ کہ با خرمن مجنون دل افکار چہ کرد

سعدی کہتے ہیں :۔

یکی پرسید از آن گمگشتہ فرزند
کہ ای روشن روان پیر خرد مند
ز مصرش بوی پیراہن شنیدی
چرا در چاہ کنعانش ندیدی
بگفتا "حال" ما "برق" جہان است
دمی پیدا و دیگر دم نہان است
گہی بر طارم اعلیٰ نشینم
گہی تا پشت پای خود نبینم
اگر درویش در "حالی" بماندی
سر دست از دو عالم برفشاندی

گزشتہ درسوں میں ہم نے نہج البلاغہ کے یہ جملے نقل کئے تھے: -

قد احیی عقلہ و امات نفسہ، حتی دقّ جلیلہ و لطف غلیظہ و برق لہ لامع کثیر البرق.... خطبہ / ۲۲۰

مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغر اور تن و توش ہلکا ہوگیا۔ اس کے لئے بھرپور درخشندگیوں والا نور ہدایت چمکا۔

عرفا اس کوندنے والی بجلی کو "لوائح" "لوامع" اور "طوالع" سے تعبیر کرتے ہیں البتہ اس فرق و اختلاف کے پیش نظر جو اس کی چمک کے باقی رہنے کی مدت اور اس کی شدت نیز درجات و مراتب میں پایا جاتا ہے۔

۴، ۵۔ قبض اور بسط

عرفا کی نگاہ میں یہ دو کلمے بھی ایک خاص معنی و مفہوم رکھتے ہیں۔ قبض یعنی وہ حالت جب عارف کی روح پژمردہ ہوتی ہے اور بسط یعنی وہ حالت جب روح شگفتہ ہوتی ہے۔ عرفا نے قبض و بسط اور اس کے اسباب و علل کے سلسلہ میں اچھی خاصی بحث کی ہے۔

۶، ۷۔ جمع اور فرق

یہ دو اصطلاحیں بھی عرفا کی عبارتوں میں بہت استعمال ہوتی ہیں قشیری کہتے ہیں، جو چیز بندہ سے تعلق رکھتی ہے، بندہ نے اسے حاصل کیا ہے اور مقام بندگی کے لائق ہے اسے "فرق" کہتے ہیں اور جو چیز خدا کی طرف سے ہے اور جسے خدا نے نازل و القاء کیا ہے اسے "جمع" کہتے ہیں۔ جسے خدا اطاعتوں اور عبادتوں سے آگاہ کر دیتا ہے وہ مقام فرق میں ہوتا ہے اور جس پر خدا اپنی عنایتیں نازل کرتا ہے وہ مقام جمع پر فائز ہوتا ہے۔ حافظ کہتے ہیں: -

به گوش هوش نیوش از من و به عشرت کوش

که این سخن سحر از هاتفم به گوش آمد

ز فکر "تفرقه" باز آی تا شوی "مجموع"

به حکم آنکه چو شد اهرمن، سروش آمد

۸۔۹ غیبت و حضور

غیبت یعنی خلق سے بے خبری کی حالت جو کبھی کبھی عارف پر طاری ہوتی ہے۔ اس حال میں عارف خود اپنے اور اپنے اطراف سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ عارف چونکہ اس وقت خدا کے حضور میں ہوتا ہے لہٰذا وہ خود اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اس کی زبان حال یہ ہوتی ہے:۔

نہ آن چنان بہ تو مشغولم ای بہشتی روی
کہ یاد خویشتنم در ضمیر می آید

ممکن ہے اس حالت میں ــ یعنی جس وقت وہ پروردگار کے حضور میں ہوتا ہے اور خود اپنے اور اپنے اطراف سے بے خبر و غائب ہوتا ہے ــ بہت سے حوادث اس کے سامنے رونما ہوں اور وہ ان سے باخبر نہ ہو سکے۔

عرفا اس سلسلہ میں بہت سے افسانوی قصے نقل کرتے ہیں۔ قشیری لکھتے ہیں، ابو حفص حداد نیشا پوری کا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ انھوں نے لوہاری کا پیشہ ہی چھوڑ دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ اپنی دکان میں بیٹھے کام میں مشغول تھے کہ ایک شخص نے قرآن مجید کی کسی آیت کی تلاوت کر دی، اس سے ان کے دل پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ وہ اپنے احساس سے "بے خبر" ہو گئے اور اسی بے توجہی کے عالم میں بھٹی میں ہاتھ ڈال کر آگ سے سرخ لوہا نکال لیا یہ دیکھ کر ان کا شاگرد چیخ پڑا کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ چیخ سن کر ابو حفص کو ہوش آیا اور اس کے بعد انہوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا۔

قشیری ہی لکھتے ہیں، شبلی جب جنید کے پاس آئے تو جنید کی بیوی ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جنید کی بیوی نے وہاں سے ہٹ جانا چاہا۔ لیکن جنید نے کہا شبلی اس وقت اس حال میں ہیں کہ انھیں تمہاری خبر بھی نہیں ہے، یہیں بیٹھی رہو۔ وہ وہیں بیٹھ گئیں۔ جنید نے تھوڑی دیر شبلی سے گفتگو کی یہاں تک کہ شبلی نے رفتہ رفتہ رونا شروع کر دیا اس وقت جنید نے اپنی بیوی سے کہا اب تم پردہ کر لو کیونکہ شبلی اب ہوش میں آ رہے ہیں۔

حافظ کہتے ہیں:۔

چو ہر "خبر" کہ شنیدم رہی بہ حیرت داشت
از این سپس من و ساقی و وضع "بے خبری"

حافظ ہی کہتے ہیں:۔

حضوری گرہمی خواہی از او غایب مشو حافظ

متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

اولیاء اللہ پر حالتِ نماز میں طاری ہونے والی حالت کہ وہ اپنے آپ اور اپنے اطراف سے مکمل طور پر غافل ہو جاتے تھے، عرفا اس کی بھی اس "غیبت" کے عنوان سے تفسیر کرتے ہیں۔ لیکن ہم بعد میں یہ بتائیں گے کہ ایک چیز ایسی بھی ہے جو "غیبت" سے بالاتر ہے اور اولیاء اللہ میں جو چیز پائی جاتی تھی وہ وہی چیز ہے۔

۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوق، شرب، ری، سکر

ذوق یعنی "چکھنا" عرفا کا خیال ہے کہ کسی چیز سے علمی واقفیت جاذبیت وکشش نہیں رکھتی۔ شوق وانجذاب، چکھنے کی فرع ہے۔ بوعلی سینا، اشارات کی آٹھویں نمط (فصل) میں کسی مناسبت سے اسی بات کو بیان کرتے ہیں اور اس کے لئے عنین (نامرد) کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں چونکہ "عنین" جنسی میلان سے محروم ہوتا ہے۔ اس نے اس کا مزہ نہیں چکھا ہے لہٰذا آپ جتنا بھی اس کے سامنے اس کی لذت کا تذکرہ کریں اس میں شوق پیدا نہ ہوگا۔

پس ذوق، لذت کا چکھنا ہے۔ عرفانی ذوق سے مراد تجلیات و مکاشفات سے حاصل ہونے والی لذتوں کا حضوری ادراک ہے۔ شروع شروع کا چکھنا "ذوق" ہے اور اس کا جاری رہنا "شرب ۔ پینا" ہے اور مست ہو جانا "سکر" ہے، اس سے لبریز ہو جانا "ری یعنی سیراب ہو جانا" ہے۔

عرفا کا کہنا ہے کہ ذوق سے جو چیز حاصل ہوتی ہے تسا کر ہے نہ کہ سکر۔ جو چیز شرب سے حاصل ہوتی ہے اسے سکر کہتے ہیں۔ لیکن لبریز ہو جانے سے جو حالت طاری ہوتی ہے وہ آپے میں آنا یعنی (صحو) ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عرفا کے کلام میں مے اور شراب کا بہت زیادہ تذکرہ ہوا ہے۔

۱۴، ۱۵، ۱۶ محو، محق، صحو

عرفا کے یہاں محو اور صحو کا تذکرہ بھی بہت ہوا ہے۔ محو سے

ان کی مراد یہ ہے کہ عارف اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اپنی ذات کو فنا کر کے ذات حق میں محو ہو جاتا ہے ۔یعنی اس کی انانیت اور"میں" محو ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کو دوسروں کی طرح "میں" تصور نہیں کرتا اگر یہ محویت اس حد تک پہنچ جائے کہ "میں" کے آثار بھی مٹ جائیں تو پھر اسے "محق" کہتے ہیں۔ محو اور محق دونوں کا درجہ "غیبت" سے بالاتر ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ۔محو و محق فنا و نابودی ہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ عارف حالت فنا سے حالتِ بقا کی طرف لوٹ آئے لیکن اس کا مطلب پہلی حالت کی طرف تنزل نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے ذریعہ بقاء حاصل کرے گا (بقاء باللہ) - یہ حالت جو "محو" کی حالت سے مافوق ہے اسے "صحو" کہتے ہیں -

۱۷- خواطر

عرفا، عارف کے دل پر ہونے والے القاآت و الہامات کو "واردات" کہتے ہیں، یہ واردات کبھی قبض و بسط یا سرور و حزن کی صورت میں ہوتے ہیں اور کبھی کلام و خطاب کی شکل میں - یعنی وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی ان کے اندر سے ان سے بات کر رہا ہے اس صورت میں ان واردات کو "خواطر" کہا جاتا ہے۔

عرفا نے خواطر کے متعلق خاص گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں، خواطر کبھی رحمانی ہوتے ہیں، کبھی شیطانی اور کبھی نفسانی۔ خطرہ کی ایک جگہ یہی خاطرات ہیں۔ ممکن ہے انحراف اور لغزش کے نتیجہ میں شیطان انسان پر مسلط ہو جائے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے -

وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم (انعام/۱۲۱)

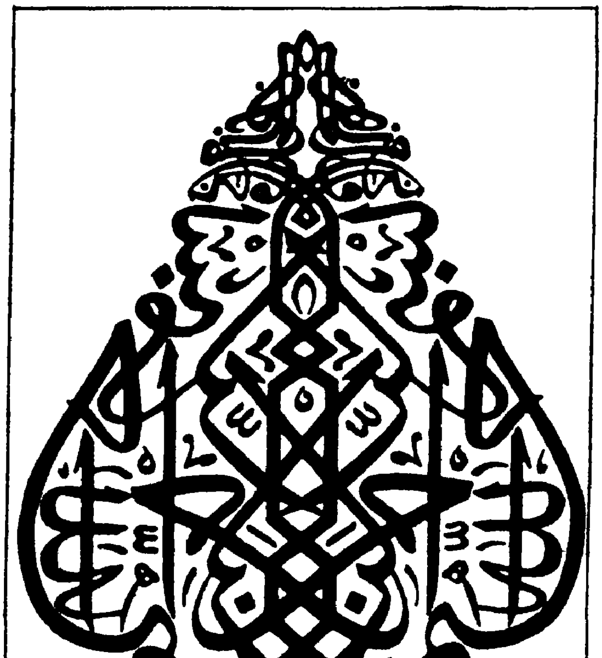
بے شک شیاطین اپنے مددگاروں کو وحی کرتے ہیں -

عرفا کہتے ہیں، فرد اکمل کو ہمیشہ یہ تشخیص دینا چاہئے کہ یہ خاطرہ، رحمانی ہے یا شیطانی بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ، دیکھیں وہ خاطرہ کس چیز کا حکم دیتا ہے اور کس چیز سے روکتا ہے۔ اگر اس کا امر و نہی شریعت کے اوامر و نواہی کے خلاف ہو تو وہ یقیناً شیطانی ہے۔

ھل انبئکم علی من تنزل الشیاطین ، تنزل علی کل افاک اثیم شعراء/۲۲۲

۱۸، ۱۹، ۲۰۔ قلب، روح، سر

عرفا، انسان کی روح کو کبھی "نفس" سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی "قلب" سے کبھی روح سے اور کبھی سر سے۔ جب تک انسان کی روح شہوتوں کی غلام بنی رہتی ہے اسے "نفس" کہتے ہیں، اور جب الٰہی معارف کی منزل بن جاتی ہے تو اسے "قلب" کہتے ہیں۔ جب اس میں محبت الٰہی نمودار ہوتی ہے تو اسے "روح" کہتے ہیں اور جب شہود کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اسے "سر" کہتے ہیں۔ البتہ عرفا "سر" سے بھی بلند درجے کے قائل ہیں جسے "خفی" و "اخفی" کہتے ہیں۔



[redacted]

اسلامی تفکر میں فلسفہ کا کردار

جناب شیخ جوادی آملی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

ہماری بحث قرآن کریم کی ہدایت کے سلسلہ میں تھی کہ خداوند عالم نے اسے تمام انسانوں کے لئے ہدایت قرار دیا ہے اور اس منزل میں دو موضوع سامنے آتے ہیں۔ ایک تعلیمی ہدایت، دوسرے تزکیہ نفس کے ذریعہ ہدایت۔

تعلیمی ہدایت میں بھی یہ بحث درپیش تھی کہ: قرآن جس راہ و روش کی ہدایت کرتا ہے آیا وہ کوئی مخصوص راہ و روش ہے یا اس نے عقلا کی فطرت کو ہی درست قرار دیا ہے؟ اور عقلا کی فطرت بھی یہ ہے کہ وہ بدیہیات کو ایک خاص نظم کے تحت ـــ جسے منطقی نظم کہتے ہیں ـــ ترتیب دیتے ہیں اور نظری نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ گزشتہ بحث و گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم اس منطقی طرز تفکر کی تائید کرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں منطقی روش پر جو گیارہ اعتراضات کئے گئے تھے ان کے جوابات دیئے جا چکے۔ اب بارھواں اعتراض اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

بارھواں اعتراض

یہ ہے کہ اگر منطقی روش کافی ہے تو قرآن کریم ہدایت کو صاحبان تقویٰ میں ہی منحصر کیوں جانتا ہے۔! "ھدی للمتقین"؟ (بقرہ/۲) اور چونکہ منطقی روش میں عادل و ظالم

مومن وکافر، باتقویٰ اور بے تقویٰ سب برابر ہیں اور تمام افراد تمام علوم میں اس روش سے استفادہ کرسکتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن کی روش منطقی روش نہیں ہے !! اور واضح عبارت میں یوں کہا جائے کہ : قرآن کریم کی بہت سی آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ دینی معارف سے فائدہ اٹھانے والے صرف اہل تقویٰ ہی ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیتیں :۔

۱۔ وما یتذکر الا من ینیب (غافر/۱۳)

"جو شخص اہل انابت یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے وہی اللہ کو یاد رکھنے والا ہے"

جبکہ منطقی طرز تفکر میں جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتے ہیں دونوں یکساں ہیں !

۲۔ "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" (طلاق/۲)

"وہی شخص شبہات ومشکلات کے تنگنا سے نکل سکتا ہے جو اہل تقویٰ ہو جبکہ منطقی استدلالات میں متقی اور غیر متقی افراد میں کوئی فرق نہیں ہے !

۳۔ فاعرض عن من تولی عن ذکرنا ولم یرد الا الحیوۃ الدنیا ذلک مبلغھم من العلم (نجم/۳۰)

ان (دنیا پرست، خدا سے روگرداں افراد) کا علم اسی قدر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھیں اور اسی میں لگے رہیں، اس سے زیادہ ان کے بس میں نہیں ہے جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ منطقی روش میں جس شخص نے بھی بدیہیات کو ایک خاص اسلوب سے ترتیب دیا نظری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے چاہے وہ دنیا پرست ہو یا اہل آخرت : پس جن لوگوں نے یاد خدا سے دوری اختیار کی اور دنیا کے طالب ہوئے قرآن ان کے عمل کو قاصر کیوں جانتا ہے ؟

بارھویں اعتراض کا جواب

اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اور چونکہ تفصیلی جواب ہماری بحث کے دوسرے حصہ یعنی "تزکیہ" سے مربوط ہے۔ لہٰذا ہم اسے اس حصہ کے لئے

چھوڑتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ اس کا جائزہ لیں گے۔

اجمالی جواب

اگر قرآن کی ہدایت صرف تقویٰ کے محور پر استوار ہے یعنی اگر قرآن کا سمجھنا اور اسے درک کرنا صرف تقوے پر منحصر ہے اور کافر و غیر متقی اس کی ہدایت کو نہیں سمجھتا تو کفار سے انبیاء کے تمام دلائل و احتجاجات کو بے اثر ہونا چاہیئے؟ اور اس کلیہ کی بنیاد پر کہ ہدایت کے لئے تقویٰ شرط ہے، کسی دلیل و احتجاج کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ بے تقویٰ افراد کی ہدایت کرنا محال ہو جائے گا اور جس کی ہدایت ہی ممکن نہیں ہے اس کے لئے دلیلیں و حجتیں قائم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا!

اگر یہ کلیہ درست ہو تو قرآن کی ان آیات کے کیا معنی کئے جائیں گے:۔

"قل فللہ الحجۃ البالغۃ" (انعام / ۱۴۹)

یعنی اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تک پہنچنے کی دلیل اسی کے لئے خاص ہے

"وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علیٰ قومہ" (انعام / ۸۳)

اور یہ ہماری دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراہیمؑ کو اپنی قوم پر غالب آنے کے لئے عطا کی ہیں۔

"قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین" (بقرہ / ۱۱۱)

اے رسولؐ آپ کہہ دیں کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔

"فقولا لہ قولاً لیناً لعلہ یتذکر او یخشیٰ" (طہ / ۴۴)

تم دونوں جا کر اس سے نرمی سے باتیں کرو، شاید وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

اور اس کے علاوہ بھی بہت سی دوسری آیتیں۔

آخر اس کا مطلب کیا ہے کہ خداوند عالم ایک آیت میں یہ فرماتا ہے کہ اللہ نے انسانوں پر اپنی حجت تمام کر دی ہے اور دوسری آیت میں ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی دلیل لاؤ؟ پس معلوم ہوا کہ تقویٰ اس معنی میں ادراک و فہم کے لئے شرط نہیں ہے۔

ایمان کی شرط عمل ہے نہ کہ علم

یہ بات ان لوگوں کے لئے تشخص ہونی چاہیئے کہ: "عمل شرط ایمان ہے علم نہیں" علم کے

مسئلہ میں تقویٰ کبھی شرط نہیں ہے، لہٰذا ممکن ہے کوئی دانشور ہو لیکن صاحب تقویٰ نہ ہو لیکن اگر متأثر ہونا چاہتا ہے یعنی ایمان لانا چاہتا ہے تو اسے حقیقت کو سمجھنا ہوگا اور جب سمجھ گیا تو اسے قبول کرلے گا اور یہ قبول کرنا اور تسلیم کرلینا ہی ایمان ہے۔

البتہ فہم، انسان کے اختیار سے خارج ہے، یعنی انسان جب کسی بدیہی بات تک پہنچتا ہے تو اسے لامحالہ سمجھے گا، اب یہاں وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نہیں سمجھا، لیکن جو چیز انسان کے اختیار میں ہے وہ ہے اسے ماننا اور تسلیم کرنا۔ یعنی چاہے وہ اسے مانے اور مطیع ہوجائے یا نہ مانے اور انکار کردے۔ جیسا کہ قرآن میں بھی بیان ہوا ہے:۔

"وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلماً وعلوّاً" (نمل/۱۴)

انہوں نے اس (معجزۂ الٰہی) کا یقین کرنے کے باوجود ستم گری اور کبر و غرور کی بنا پر اس سے انکار کردیا اور نہیں مانا۔

جس دن ایمان لانا کوئی فائدہ نہ دے گا

البتہ وہ دن بھی آئے گا جب تمام مسائل روشن و آشکار ہوجائیں گے لیکن اس دن لوگ ایمان نہیں لاسکیں گے اور وہ قیامت کا دن ہے۔ قیامت کے روز تمام انسان خدا کی معرفت حاصل کرلیں گے اور اس کی حقانیت کو تسلیم کرلیں گے لیکن ایمان لانے کی گنجائش باقی نہ رہے گی:۔

"يومئذ يوفّيهم الله دينهم الحق ويعلمون انّ الله هو الحقّ المبين" (نور/۲۵)

کافر کا سارا ہمّ و غم قیامت کے دن یہی ہے کہ حق اس کے اوپر روشن و واضح ہوگیا لیکن اب وہ اسے قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اب وہ روز تسلیم کرنے اور ایمان لانے کا نہیں ہے۔

یہ روایت حضرت رسولؐ خدا اور حضرت علیؑ دونوں سے منقول ہے کہ: "اليوم عمل بلاحساب وغداً حساب بلاعمل" یعنی آج روز عمل ہے اور حساب و کتاب نہیں ہے اور کل روز حساب ہے اور کوئی عمل قبول نہیں کیا جائے گا۔ قیامت کے دن انسان کی مثال اس شخص کے جیسی ہے جسے رہبروں نے صراط مستقیم کی نشان دہی کردی کہ غلط راہ

اختیار نہ کرے اور گمراہ نہ ہو اور وہ اپنے باطل خیال کے تحت داہنی یا بائیں طرف چلا جاتا ہے اور اچانک ایک عجیب و غریب درّہ میں گر پڑتا ہے اس کے تمام اعضاو جوارح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، جب وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اسے دوسری راہ سے جانا چاہئے تھا، لیکن اب دیر ہو چکی ہے اور نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اسی لئے کافر قیامت کے دن اپنے پروردگار سے درخواست کریں گے کہ انھیں دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ نیک اعمال بجا لائیں لیکن اب انھیں واپسی کی کوئی راہ نہ ملے گی، کیونکہ ایمان عمل سے اور قیامت میں عمل کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ البتہ کمزور طبقے کے افراد جن تک دین کے احکام اور الٰہی حکم نہیں پہنچا ہے قاصر ہونے کی صورت میں اللہ کی رحمت ان کے بھی شامل حال ہوگی، مقصر ہونے کی صورت میں نہیں۔

بنابراین وہ آیات و روایات جو تقویٰ کو ہدایت کا محور جانتی ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تقویٰ نہ ہو تو علم نہیں ہے بلکہ اگر تقوی نہ ہوگا تو علم سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا جاسکے گا۔ پس یہاں "یعلمھم" کی منزل تو ہے لیکن "یزکیھم" کا وجود نہیں۔ ان شاء اللہ ہم تزکیہ کی بحث میں اس مطلب کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

ایک اور اعتراض

تیسرے اعتراض میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ منطقی روش اور فلسفی طرز تفکر اس لئے ہے کہ لوگوں کو کتاب و سنت کی پیروی سے دور کر دے! اور آٹھویں اعتراض میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے صالح اسلاف نے اسی کتاب و سنت کی راہ کو اپنایا ہے اور درست نہیں ہے کہ ہم منطقی روش سے استفادہ کریں اور سرے سے منطق و فلسفہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔ یہ فلسفی طرز تفکر تو خلفا کے زمانہ میں یونان سے لایا گیا اور ان کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا گیا نتیجتاً یہ مسائل پیش آئے!!

جواب: یہ ہے کہ کیا فلسفہ اور عقلی علوم کو اسلامی طرز تفکر میں کوئی دخل تھا، اور آیا فلسفہ اسلامی فکر کو روشنی میں مددگار ثابت ہوتا تھا یا اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا تھا؟

اور جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کیا فلسفہ نے اس مقصد کے لئے اسلام میں اپنے لئے کوئی راہ بھی بنائی یا نہیں ۔؟

تفسیر المیزان کی پانچویں جلد کے ص۲۹۳ پر تاریخی بحث کے عنوان سے ایک تفصیلی بحث درج کی گئی ہے ۔ اس میں تحریر ہے کہ: ہمیں اس وقت ان افکار و عقائد کی صحت یا سقم سے کوئی سروکار نہیں ہے ۔ ہم یہاں تاریخ کے اجمالی جائزہ کی روشنی میں یہ بحث کر رہے ہیں کہ یہ افکار کہاں سے آئے اور کہاں جاکر تمام ہوئے ہیں ۔

قرآن، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں دخیل ہوا ہے اور اسی اعتبار سے اس نے انسان کے فرائض معین کئے ہیں وہ انفرادی زندگی گزارے یا اجتماعی، شہری ہو یا دیہاتی، صنعت و تجارت سے سروکار رکھنے والا ہو یا اتفاقی مسائل سے مختصر یہ کہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے انسان انجام دے اور قرآن نے اس پر نفی یا اثبات کی شکل میں اپنا نظریہ پیش نہ کیا ہو ۔

الٰہی میزان

مزید یہ کہ جتنی راہیں اور جتنے بھی مکاتب فکر تھے، ہیں اور ہوں گے، اگر وہ باطل ہیں تو قرآن نے انھیں صریحاً رد کیا ہے اور اگر حق ہیں تو قرآن نے ان کی تصدیق کی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن وہ الٰہی میزان ہے جس پر تمام افکار و نظریات کو تولا جانا چاہئے ۔

اسی وجہ سے ہمارے عظیم پیشواؤں نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ جتنی روایات اور حدیثیں نقل ہوئی ہیں، ان کی صحت و سقم کو کتاب خدا کے ذریعہ پرکھیں ۔ جو قرآن کے موافق ہو اسے قبول کر لیا جائے اور جو موافق نہ ہو یعنی قرآن کے مخالف ہو وہ باطل ہے اسے الگ کر دینا چاہئے ۔

ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شیئ (نحل/۸۹)

اے پیغمبر ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی جو ہر شے کو بیان کرنے والی ہے ۔ قرآن ان تمام معارف و حقائق کو بیان کرنے والا ہے جو انسان کی سعادت و خوش بختی میں کسی بھی عنوان سے دخیل ہیں۔ پس کوئی بھی مکتب فکر جو کسی بھی زمانہ اور کسی بھی سرزمین سے متعلق ہو اس الٰہی میزان پر تولا اور پرکھا جانا چاہئے ۔ نیز ہر طرح کی نقل شدہ روایت کی جانچ پرکھ قرآن کے ذریعہ

[redacted]

ہونی چاہئے۔

قرآن اور مسلمانوں کا طرز فکر

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ صدر اسلام میں قرآن کریم صرف قرأت و تلاوت کی حد تک ہی محدود رہا اور قرآن کے حقائق بیان کرنے والوں یعنی اہل بیت عصمت و طہارت سے جو فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے تھا، نہ اٹھایا گیا۔ اور صرف قرأت کی حد تک ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

صاحب جواہرؒ اپنی کتاب میں "صلوٰۃ" (نماز) کی بحث کے تحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"صدر اسلام میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے مسلمانوں کا سلوک اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ ان سے فقط ایک قاری کے عنوان سے قرأت نقل کی جاتی تھی (و فی قرائۃ علی بن ابی طالب کذا ....) صدر اسلام کے مسلمان قرآن کی تفسیر کو ان کے حقیقی مفسرین سے حاصل کرنے کے بجائے حدیثیں لکھنے اور روایت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں تھے یا پھر مسئلہ خلافت میں الجھے رہتے تھے یا کبھی فتوحات میں مشغول تھے۔ لہٰذا قرآنی طرز تفکر گم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہی بات جو قرآن کریم رسول اکرمؐ کی زبان سے نقل کرتا ہے اس زمانہ میں صادق آتی تھی" یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً (فرقان/۳۰) اے میرے پروردگار میری قوم نے قرآن سے کنارہ گیری اختیار کرلی۔

قرآن سے مسلمانوں کی دوری

جی ہاں! کبھی حضرت رسول اکرمؐ سے یہ سوال نہیں کیا گیا کہ خدا نے آسمان و زمین کو چھ روز میں خلق کیا، اس کا مطلب کیا ہے؟ کبھی آنحضرتؐ سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ خدا فرماتا ہے: وجعلناھا رجوماً للشیاطین" (سورۂ ملک/۵) اور ہم نے ان ستاروں کو تیر قرار دیا تاکہ وہ شیطانوں کو رجم کریں۔" اس سے کیا مراد ہے؟ اسی طرح کے ہزاروں دوسرے مشکل مطالب جو قرآن میں پائے جاتے تھے، اور وہ لوگ جو عرب تھے، انھیں دیکھ کر سہل انگاری کے ساتھ گزر جاتے تھے اور کبھی ان سے متعلق سوال نہیں کرتے تھے

جس چیز پر اس زمانہ میں زیادہ زور دیا جاتا تھا، وہ قرآن کی قرأت اور اسے حفظ کرنا تھا نہ کہ اسے سمجھنا اور درک کرنا۔ کبھی ثواب قرأت کا مسئلہ اٹھایا جاتا تھا اور قرآن کا بازار گرم کرنے کے لئے تلاوت کے ثواب کی حدیثیں گڑھی جاتی تھیں، گویا قرآن اس کا محتاج ہے کہ اس کے لئے ثواب جعل کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ: اگر کوئی فلاں سورہ پڑھے تو اس کا اتنا ثواب ہے!!

سیوطی نے اس سلسلہ میں اپنی کتاب "الاتقان" میں لکھا ہے: "کچھ لوگوں نے قرآن کے بازار کو رونق بخشنے کے لئے قرأت کے ثواب گڑھنے شروع کر دیئے، انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن نور ہے، نور کو گڑھے جانے کی ضرورت نہیں ہے اگر یہ لوگ قرآن کی حقیقت و واقعیت کا ایک گوشہ بھی سمجھ لئے ہوتے اور دوسروں کو سمجھاتے اور وضاحت کرتے تو اس بات کی ضرورت ہی نہ تھی کہ کہا جائے: اگر کسی نے یہ سورہ پڑھا تو یہ اولین و آخرین کا ثواب رکھتا ہے!!"

البتہ تلاوت قرآن کے ثواب کو بیان کرنے والی معتبر اور صحیح روایتیں کافی تعداد میں موجود ہیں اور اس طرح کی روایتوں کو جعل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن افسوس کہ صدر اسلام میں مسلمانوں کے قرآن سمجھنے کی سطح ہی اس حد کو پہنچ چکی تھی۔

کتاب "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" جو قرآن کریم کی روائی تفسیر ہے اگرچہ اس میں سترہ ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان ہوئی ہیں لیکن شاید اس میں حضرت علیؑ سے مروی ایک سو سے سے زیادہ حدیثیں نہ ہوں۔ اور مجموعی طور پر تمام اہل بیت عصمتؑ سے روایت شدہ کل دو سو سے زیادہ حدیثیں موجود نہیں ہیں!

شیخ صدوق ابن بابویہ اپنی کتاب "توحید" میں نقل کرتے ہیں کہ ایک علمی محفل میں نافع بن ازرق، حجت خدا حضرت حسین بن علیؑ کی موجودگی میں ابن عباس سے کوئی بات دریافت کرتا ہے۔ ابن عباس اسے امام حسینؑ کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں، اسے حضرت حسین ابن علیؑ سے دریافت کرو۔!

قرآن کریم کے بارے میں مسلمانوں کا یہ طرز تفکر تھا جو قرأت و تلاوت یا آیات کے حفظ کرنے تک ہی محدود تھا، ورنہ آپ یہ معاملہ نہیں کر سکتے کہ آخر کیوں کبھی ایسا نہ ہوا کہ اصحاب نے

پیغمبر اکرمؐ سے پوچھا ہو کہ آیت : انّا عرضنا الامانۃ علی السّموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان .... (احزاب/ ۷۲) کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ امانت کیا ہے جسے آسمان ، زمین ، پہاڑ اٹھانے سے معذور رہیں اور انسان نے اس کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھالیا ؟!

قرآن، پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں

بہر حال پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں قرآن سے استفادہ کی بحث صرف یتلوا علیہم (یعنی پیغمبرؐ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتے ہیں) تک محدود تھی ، اور بہت تھوڑے لوگ تھے جو تلاوت سے تعلیم و تربیت کی طرف بڑھتے اور مائل ہوتے تھے ۔ اور اگر کبھی مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کلامی مجادلوں و مناظروں کی نوبت آتی تھی تو بحث زیادہ طول نہیں کھینچتی تھی ، کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے مباہلہ کی دعوت دے دی جاتی تھی اور وہ لوگ بھی پیچھے ہٹ جاتے تھے ۔

اور اگرچہ قرآن نے شاعری کی کوئی مدح نہیں کی اور سنن و احادیث میں بھی اس کی کوئی خاص تعریف نہیں ہوئی ہے ، اس کے باوجود اشعار کا بازار گرم تھا ، جاہلی رسوم رائج تھے اور اشعار خوب یاد کئے جاتے تھے ۔

پیغمبر اکرمؐ کی کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ اوقات خیال بافی و خیال آفرینی میں صرف نہ ہوں ، لہٰذا کہیں بھی اور کسی وقت بھی جہاں لوگ جمع ہوتے تھے ، آپؐ انھیں شعر پڑھنے سے منع فرماتے تھے ، چاہے کراہت ہی کی حد تک ہو مثلاً فرماتے تھے کہ : جمعہ کے روز شعر نہ پڑھو ، اور جب مسجد میں اکٹھا ہوتے ہو تو اشعار لحن سے پڑھنا اور انکی تکرار کرنا مکروہ ہے وغیرہ ، اور دوسری طرف قرآن کی ہی لفظوں میں فرماتے تھے ، جہاں تک ہو سکے قرآن پڑھو" فاقرؤا ما تیسّر من القرآن" (مزمّل/ ۲۰) لیکن افسوس ان سے جہاں تک ہو سکا انہوں نے شعر پڑھا اور قرآن کو اپنی زندگی سے الگ کر دیا ۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اپنے اشعار کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ انھیں سند کے ساتھ نقل کرتے تھے ۔ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی بیس جلدی کتاب" آغانی" میں شعرائے جاہلی کے

حتیٰ ہجویہ اشعار اور ان کے راویوں کو پوری اسناد کے ساتھ یوں ہی نقل کیا ہے جیسے شیخ کلینی رح نے کتاب کافی میں روایات کو ان کی اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یہ لغو اشعار اور خیال بندیوں سے لوگوں کا گھرا لگاؤ اور اندھا عشق تھا جس کی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ ان کو خاص طور سے جب لوگ مقدس مقامات اور محترم ایام میں جمع ہوتے تھے ایسے اشعار پڑھنے منع فرماتے تھے، ورنہ حکمت آمیز اشعار پر آنحضرتؐ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خود پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: "وانّ من الشعر لحکما"[1] لیکن ظاہر سی بات ہے کہ ایسا شعر عمومی معاشروں میں جاذبیت نہیں رکھتا، جو شعر خیال بندی کا مرقع ہے مدح و قدح کا نمونہ ہے اور اس میں تشبیہ و تشبیب اور استعارہ و کنایہ وغیرہ کا امتزاج پایا جاتا ہے لوگ بالعموم اس کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں سے یہ چاہتے تھے کہ اجتماع میں یا کسی موقع پر اکٹھا ہونے کے وقت قرآن کی تلاوت کریں۔

اس طرح آنحضرتؐ لوگوں کے پراگندہ خیالات و جذبات پر روک لگا کر عقل کی راہ باز کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں کو قرآن پڑھنے اور قرآن سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے کوئی حد بھی معین نہیں کی ہے۔ "جس قدر تم سے ہو سکے قرآن پڑھو"۔

جس زمانہ میں آنحضرت مدینہ میں تشریف رکھتے تھے۔ جب اسلام کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا، سب کو محاذ جنگ پر جانے کا حکم دیتے تھے لیکن علمی میدانوں میں آمادگی کے سلسلہ میں لوگوں سے یہ چاہتے تھے کہ اپنے کاموں کو تقسیم کرلیں۔

"فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین (برائت/۱۲۲)

(ہر گروہ سے کچھ لوگ رسول خداؐ کی خدمت میں علم دین حاصل کرنے کے لئے کیوں نہیں جاتے) اور جس وقت خطرہ بہت نزدیک ہوتا تھا تو فرماتے تھے: انفروا جمیعًا (نساء/۷) یعنی سب لوگ (محاذ جنگ کی طرف) جاؤ، لیکن جب خطرہ زیادہ محسوس نہیں ہوتا تو فرماتے: کیا اچھا ہوتا اگر تم میں سے ایک گروہ تفقہ اور دین حاصل کرنے کے لئے نکلے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۹، ص۲۹۰

قرآن، رحلت پیغمبرؐ کے بعد

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد چونکہ حدیث کا بازار گرم تھا لہٰذا پیغمبرؐ کی صحابیت ایک خاص تقدس کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مثال کے طور پر اگر صرف اتنا معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص چند روز پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں رہا ہے تو اس سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کے لئے اسی کو کافی سمجھا جاتا تھا، اور اگر اس شخص کا ایمان قوی نہ ہوتا اور وہ خود ایک شخصیت بننے کے لئے میدان ہموار دیکھتا تو حدیث جعل کرنا اور گڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور وہ جو کچھ بھی کہتا، سیدھے سادے لوگ اسے تسلیم کر لیتے تھے اور پھر اس حدیث کو کتاب خدا کی میزان پر پرکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تمام فکریں اور عقلیں حدیثیں یاد کرنے میں لگ گئی تھیں، تفقہ اور دین کی شناخت کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

رفتہ رفتہ بازار حدیث میں اس قدر گرمی آگئی کہ اب کتاب خدا سے صرف پڑھنے اور یاد کرنے کی حد تک استفادہ ہوتا تھا اور کبھی حدیث کو قرآن سے نہیں پرکھتے تھے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں آیت: "یارب ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجوراً" (فرقان/۳۰) (پالنے والے میری امت نے قرآن کو تنہا چھوڑ دیا) رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے ایک روشن حقیقت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان حدیث گڑھنے والوں کے سلسلہ میں پیشین گوئی کر دی تھی اور لوگوں کو ان کی پیروی کرنے اور ان کی باتوں پر کان دھرنے سے منع فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ آپ فرماتے ہیں: "من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار"¹ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی حدیث کی نسبت دے گا اس کی نشست گاہ آتش جہنم سے پر ہوگی۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی کسی حدیث کو ہماری طرف نسبت دے تو اسے قرآن کے اوپر پرکھو اگر قرآن کے مطابق نکلے تو قبول کر لو اور اگر مخالف ہو تو اسے دیوار پر دے مارو، کیونکہ قرآن، الٰہی میزان ہے، اور یہ میزان تحریف سے محفوظ ہے۔

---

¹ سفینۃ البحار جلد ۲ ص۴۷۳

قرآن، جعل نہیں کیا جا سکتا

یہ جو قرآن، میزان قرار پایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف وہ تحریف نہیں ہوا ہے بلکہ وہ اصلاً گڑھا نہیں جا سکتا اور تحریف نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "ما کان حدیثا یفتریٰ" (یوسف/۱۱۱) (یہ قرآن ایسا کلام نہیں ہے جسے گڑھ لیا جائے) اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "وما کان ھٰذا القرآن ان یفتریٰ من دون اللہ (یونس/۳۷) (اور یہ قرآن ایسی کتاب نہیں ہے جسے اللہ کے علاوہ کسی اور نے گڑھ لیا ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہرگز افترا اور جعل نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ دوسروں نے اس میں تحریف کرنا نہیں چاہا اور اس کو محترم شمار کرتے تھے، بلکہ دراصل یہ کام دشمنان اسلام کے بس کا ہی نہیں ہے، اور یہ آیت مذکورہ بالا آیت سے الگ ہے جس میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "ہم غیب سے قرآن کی حفاظت کرتے ہیں اور اسے تحریف سے محفوظ رکھتے ہیں: لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (فصلت/۴۲) (قرآن کے اندر باطل نہ سامنے سے نفوذ کر سکتا ہے اور نہ پس پشت سے) انا نحن نزّلنا الذکر وانّا لہ لحافظون (حجر/۹) (بلاشبہ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں)

قرآن و اہل بیتؑ

لیکن حدیث کے سلسلہ میں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا لوگوں نے جہاں تک چاہا احادیث پیغمبر اکرمؐ کو اپنی مرضی کے مطابق گڑھا اور اسرائیلیات کو اس میں داخل کیا۔ ایسے حالات میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لوگ قرآن ناطق یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام کی خدمت میں آ کر احادیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے متعلق دریافت کرتے لیکن افسوس کہ اس کے بجائے انہوں نے حسبنا کتاب اللہ (یعنی ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے!) کہا جب کہ اس کتاب کے لئے شارح و مفسر ضروری ہے۔ لیکن انہوں نے حقیقی مفسرین کو چھوڑ دیا نتیجہ میں قرآن سے بھی دور ہو گئے۔

اور بعض وہ لوگ بھی جو در اہل بیتؑ پر تو آئے لیکن انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے بھی غلط راہ اختیار کی کیونکہ قرآن و اہل بیتؑ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ پیغمبر اکرمؐ ایک روایت میں جسے عامہ و خاصہ دونوں نقل کرتے ہیں ارشاد فرماتے ہیں: "انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله وعترتى اهل بيتى، ما ان تمسكتم بهما لن تضلوا بعدى ابداً" "میں تمہارے درمیان دو سنگین و گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، کتاب خدا اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔ اگر ان دونوں سے متمسک ہوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

لہٰذا دونوں کو باہم معیار و میزان ہونا چاہئے، نہ یہ کہ کوئی شخص قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے اور اہل بیتؑ سے کوئی سوال نہ کرے۔ اور نہ یہ کہ معصومؑ کی کوئی روایت چاہے کہیں سے بھی ہو حاصل کرے اور اسے کتاب خدا پر نہ پرکھے جس کا دعویٰ ہے کہ "اس میں کوئی باطل سامنے سے یا پس پشت سے نفوذ نہیں کر سکتا"۔ البتہ اگر کسی روایت کی سند صحیح تھی اور ہم نے اسے قرآن سے مطابقت کرکے بھی دیکھ لیا کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا تو بلاشبہ ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے، کیونکہ جو کچھ معصومؑ کہتا ہے حق ہے، اس لئے کہ معصومؑ قرآن ناطق ہے۔

بہرحال قرآن کریم، پیغمبر اکرمؐ کے بعد مہجور ہوگیا۔ مسلمان یا فتوحات میں لگ گئے یا بعض لوگ راوی کے عنوان سے خود کو پیش کرنے لگے مختصر یہ کہ قرآن کی اہمیت صرف اتنی رہ گئی تھی کہ حفظ و تلاوت کے علاوہ اس سے کوئی استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔

قرآن بنی امیہ کے زمانہ میں

جس وقت معاویہ تخت حکومت پر آیا، خلافت، سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔ معاویہ نے بھی، جو اسلام کا دیرینہ دشمن تھا، طے کیا کہ عہد جاہلیت کا تمدن رائج کرکے لوگوں کو رفتہ رفتہ قرآن سے دور کر دے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ کی غم انگیز صلح کے بعد ایک روز معاویہ دربار سے سلام لینے کے لئے دربار میں بیٹھا تھا کہ عمرو عاص وارد ہوا اور اس نے کہا: السلام عليك ايها الملك! (اے بادشاہ آپ پر سلام ہو) اس نے بھی مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور اپنے اس تبسم سے یہ

ظاہر کردیا کہ خلافت و امامت، سلطنت میں تبدیل ہو چکی ہے۔

اس کے بعد قومیت کا مسئلہ پیش آیا۔ معاویہ نے عرب اور غیر عرب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور لوگوں کو عہد جاہلیت کے امتیازات و افتخارات کی طرف مائل کرنے لگا۔ اس کی سیرت روم کے قیصروں کی سیرت بن گئی تھی۔ لوگوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے اس کے پاس یہی ایک راہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت کی رسموں کو زیادہ سے زیادہ رواج دے۔

جو شخص بھی شعر کہتا تھا، بڑے بڑے انعامات پاتا تھا اور جسے شعر گوئی کا سلیقہ نہیں ہوتا تھا، کم از کم عہد جاہلیت کے اشعار پڑھ کر ہی خود کو بارگاہ سلطنت سے نزدیک کرتا تھا! یہی وجہ تھی کہ یزید کے شراب سے متعلق اشعار سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ زیاد کا خطبۂ تبراء" لوگوں کی زبانوں پر رہا کرتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ قرآنی آیات فراموشی کا شکار ہوتی چلی گئیں۔

جی ہاں! اگر اولین دور کے مسلمان خمریات یاد کرنے اور جاہلیت کی رسمیں اپنانے کے بجائے اسلام کے دقیق و عمیق مسائل کو علیؑ و آل علیؑ کی درسگاہ سے دریافت کرتے تو پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد ارتداد کی نوبت ہرگز نہ آتی کہ امام صادقؑ جیسی شخصیت کو کہنا پڑا: "ارتدّ النّاس بعد رسول اللہؐ الّا ثلاث او اربع" (پیغمبر اسلامؐ کے بعد تین یا چار افراد کے علاوہ اکثر لوگ مرتد ہو گئے) ان لوگوں نے نہ صرف قرآن سے دوری اختیار کر لی بلکہ قرآن ناطق (علی علیہ السلام) سے بھی دور ہو گئے۔

قرآنِ ناطق

امیرالمومنین علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ / ۱۵۸ (اردو ترجمہ خطبہ / ۱۵۶) میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"....فجاءهم بتصديق الّذى بين يديه والنّور المقتدىٰ به ذالك القرآن فاستنطقوه ولن ينطق ولكن اخبركم عنه: الا انّ فيه علم ما ياتى والحديث عن الماضى ودواء دائكم ونظم ما بينكم" (نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۵۸ ص ۲۲۳)

یہ قرآن ہے، جس نے گزشتہ انبیاءؑ کی کتابوں کی تصدیق کی ہے۔ یہ وہ نور ہے جس سے زندگی کی تاریک راہوں میں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ پس تمہیں چاہئے کہ اس سے ہم کلام ہونے کی فرمائش کرو لیکن وہ تم سے ہرگز کلام نہیں کرے گا بلکہ میں اس سے متعلق تمہیں خبر دیتا ہوں اور تمہیں بتاتا ہوں کہ ماضی و مستقبل کے حالات و واقعات، تمہارے دکھوں کی دوا، اور تمہارے امور حیات کے نظم و ضبط کا نسخہ قرآن میں موجود ہے۔

یہ قرآن ہے جو انسان کو جہالت کے مرض سے نجات دیتا ہے۔ یہ قرآن ہے جو اخلاقی زوال اور گمراہیوں کا مداوا کرتا ہے۔ یہ قرآن ہے جو معاشرہ کی زندگی کو نظم و ضبط عطا کر کے اسے ہرج و مرج سے نجات عطا کرتا ہے۔ لیکن جو شخص قرآن کو تکلم عطا کرتا ہے علیؑ اور ائمہ معصومینؑ ہیں کہ ان کی حیات علم کی حیات ہے اور در اصل علم ان کے وجود کے پرتو میں زندہ ہے: "انا لامراء الکلام فینا تنشبت عروقه وعلینا تهدلت غصونه" ہم کلام کے فرمانروا ہیں۔ اس کی جڑیں ہم سے ہیں اور اس کی شاخیں ہماری طرف جھکی ہوئی ہیں پس ہماری طرف رجوع کرو۔

دینی درس گاہوں میں قرآن کی تدریس

بہرحال قرآن و اہل بیتؑ سے باہم اور ایک ساتھ استفادہ کرنا چاہئے، نہ صرف قرآن کا پڑھنا ہمیں فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ تنہا روایت ہی قرآن کی میزان پر پرکھے بغیر قابل قبول ہے۔

لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں کہ دینی درسگاہوں کے نظام تعلیم پر نظرثانی کی جائے۔ یعنی تفسیر قرآن کو دینی مدارس کے اصولی و اساسی نصاب میں شامل ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس وقت حوزہ میں صرف فقہ و اصول کی تعلیم دی جاتی ہے اور حدیث سے استفادہ کیا جاتا ہے لیکن قرآن بہت کم سامنے آتا ہے۔ ادبی و مقدماتی کتابیں جو دینی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں (نحو، صرف، بدیع، بیان، عروض وغیرہ) قرآن سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں۔ جہاں بھی مثالیں پیش کی جاتی ہیں اشعار جاہلی سے استفادہ کیا جاتا ہے! البتہ بحمد اللہ ادھر کچھ کوششیں ہوئی ہیں کہ اشعار جاہلی سے استفادہ کے بجائے قرآن اور نہج البلاغہ سے استفادہ کیا گیا ہے خدا کرے یہ روش عام ہو جائے۔

منطق کا نہج ایسا نہیں ہے جو قرآن کی آیات سے مثال پیش کرے، بلکہ وہ طرز تفکر کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ اصول میں کوئی مسئلہ قرآن سے ربط نہیں رکھتا، اور اگر دو ایک جگہ قرآن سے

استفادہ ہوا بھی ہے تو زیادہ تر اس لئے ہے کہ مثال کے طور پر خبر واحد کی حجیت کی نفی کرے! اس کے علاوہ پورا علم اصول عقلی بنیادوں اور الفاظ کی بحثوں پر انحصار کرتا ہے۔

اب رہی ہماری فقہ تو اس کا دارومدار روایت پر ہے اور کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے لئے کہا جائے کہ یہ مسئلہ روایت میں موجود نہیں ہے اور صرف قرآن میں ذکر ہوا! چنانچہ اگر کوئی شخص حوزہ میں قرآن پڑھتا ہے اور یقیناً لوگ پڑھتے ہیں۔ تو صرف ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ خود حوزہ کا منہج قرآنی نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس الٰہی میزان سے معصومین کی روایات کے ساتھ ساتھ استفادہ کیا جائے تاکہ خدانخواستہ کہیں ہم بھی پیغمبر اسلامؐ کے اس شکوہ میں شامل نہ کر لئے جائیں: یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً" (اے میرے پروردگار میری امت نے قرآن کو تنہا چھوڑ دیا)

نتیجہ

مختصر یہ کہ ایک طرف تو قرآن زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک میزان کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس سے متعلق قرآن نفی یا اثبات کی شکل میں اپنا نظریہ پیش نہیں کرتا، دوسری طرف صدر اسلام کے مسلمان مشکلات یا فکری جمود میں مبتلا تھے، یا فتوحات میں سرگرم تھے یا مسئلہ خلافت میں سرگرداں نظر آتے تھے اور یا پھر حدیثیں حفظ کرنے اور انھیں روایت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مشغول تھے۔ اور افسوس جب حدیث کے سلسلہ میں باہمی تفاخر اور تسخیوں کا بازار گرم تھا تو نومسلم یہودیوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حدیث میں اسرائیلیات داخل کر دیئے اور ہر طرح کی خرافات کو اسلام سے منسوب کر ڈالا۔ شاید وہ بنیادی طور پر اسی لئے اسلام لائے تھے کہ ان خرافات اور انبیاء کرامؑ سے متعلق جھوٹی باتوں کو اسلام میں داخل کر دیں۔

اور جب بنی امیہ برسر کار آئے تو چونکہ وہ قرآن سے دیرینہ دشمنی رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے زمانۂ جاہلیت کی رسموں کو دوبارہ رواج دے کر مسلمانوں سے قرآن کو بالکل دور کر دیا۔ بنی عباس نے بھی اس غرض سے کہ قرآن پہچانا نہ جائے اور لوگ اس کے حقائق سے واقف نہ ہونے پائیں معصومینؑ کے گھر کے دروازوں کو لوگوں کے لئے بند کر دیا، کیونکہ یہ حضرات خود قرآن ناطق تھے۔

آج جبکہ خداوند عالم کے لطف و کرم سے وہ دیواریں گر چکی ہیں اور وہ پردے اٹھ چکے ہیں اور نورانیت و حقانیت ظاہر ہونے لگی ہے، ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اس لازوالی الٰہی سرچشمہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اس اسلامی انقلاب کی برکت سے جہاں تک ہو سکے قرآن سے ارتباط رکھیں اور قرآن اور اقوال معصومینؑ کو زندہ کرتے ہوئے (جو بذات خود زندہ و پائندہ ہیں) جہالت کے پردوں کو چاک کریں اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے جائیں۔ ان شاء اللہ

ایسی صورت میں فلسفہ اسلام میں کب داخل ہوا؟ اور اس طرز تفکر نے اسلامی فکر کو نقصان پہنچایا یا نہیں ہے اسے انشاء اللہ آئندہ واضح کریں گے۔

نہج البلاغۃ کے سیاسی تعلیمات

حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر حقوق

جناب شیخ محمد تقی رہبر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

اگرچہ حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر عائد ہونے والے حقوق کو ایک مختصر سی بحث میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لئے تفصیلی بحث اور کافی وقت درکار ہے، لیکن اس بحث میں اپنے شیوہ کے پیش نظر ہم اس موضوع سے متعلق علی علیہ السلام کے کلام کے کچھ اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہ یاددہانی بھی ضروری ہے کہ اس کے قبل اور بعد کی بحثوں میں بھی ان باہمی حقوق سے متعلق بہت سی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جو دوسرے عناوین و موضوعات کے ذیل میں ذکر ہوئی ہیں۔ اب امام علیہ السلام کے بیانات کے کچھ حصے ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ امام نے ایک نسبتاً طویل خطبہ صفین میں ارشاد فرمایا، اس میں حکام اور عوام کے باہمی حقوق کے ذیل میں اس حق شناسی کے آثار اور ان کی قانونی و سیاسی پابندی کے سلسلہ میں کچھ باتیں بیان فرمائیں، جس کا ایک حصہ یوں ہے:۔

«ثُمَّ جَعَلَ ـ سُبحانَه ـ مِنْ حُقُوقِهِ حُقوقاً اَفتَرَضَها لِبَعْضِ النّاسِ عَلیٰ بَعْضٍ، فَجَعَلَها تَتَکافَأُ فی وُجُوهِها، و یُوجِبُ بَعضُها بَعضاً، ولایُستَوجَبُ بَعضُها اِلّا بِبَعْضٍ. واَعْظَمُ ما اَفتَرَضَ ـ سُبحانَه ـ مِن تِلْکَ الحُقُوقِ حَقُّ الوالِی عَلَی الرَّعِیَّةِ، وحَقُّ الرَّعِیَّةِ عَلی الوالِی، وفَرِیضَةٌ فَرَضَها اللّٰهُ ـ سُبحانَه ـ لِکُلٍّ عَلی کُلٍّ،

فَجَعَلَها نِظاماً لِأُلْفَتِهِمْ وعِزّاً لِدِينِهِم، فَلَيْسَتْ تَصْلُحُ الرَّعِيَّةُ إِلّا بِصَلاحِ الوُلاةِ، ولا تَصْلُحُ الوُلاةُ إِلّا بِاسْتِقامَةِ الرَّعِيَّةِ، فَإِذا أَدَّتِ الرَّعِيَّةُ إِلَى الوالِي حَقَّهُ، وأَدَّى الوالِي إِلَيْها حَقَّها عَزَّ الحَقُّ بَيْنَهُم، وقامَتْ مَناهِجُ الدِّينِ، واعْتَدَلَتْ مَعالِمُ العَدْلِ، وجَرَتْ على أَذْلالِها السُّنَنُ فَصَلَحَ بِذلِكَ الزَّمانُ، وطُمِعَ فِي بَقاءِ الدَّوْلَةِ، ويَئِسَتْ مَطامِعُ الأَعْداءِ. وإِذا غَلَبَتِ الرَّعِيَّةُ والِيَها، أَوْ أَجْحَفَ الوالِي بِرَعِيَّتِهِ، اخْتَلَفَتْ هُنالِكَ الكَلِمَةُ، وظَهَرَتْ مَعالِمُ الجَوْرِ، وكَثُرَ الإِدْغالُ فِي الدِّينِ، وتُرِكَتْ مَحاجُّ السُّنَنِ فَعُمِلَ بِالهَوى، وعُطِّلَتِ الأَحْكامُ، وكَثُرَتْ عِلَلُ النُّفُوسِ، فَلا يُسْتَوْحَشُ لِعَظِيمِ حَقٍّ عُطِّلَ، ولا لِعَظِيمِ باطِلٍ فُعِلَ فَهُنالِكَ تَذِلُّ الأَبْرارُ وتَعِزُّ الأَشْرارُ وتَعْظُمُ تَبِعاتُ اللهِ ـ سُبْحانَهُ ـ عِنْدَ العِبادِ.»

"... پھر خداوند عالم نے اپنے ہی حقوق میں سے ان حقوق کو بھی قرار دیا جو بعض افراد بعض پر رکھتے ہیں، پھر ان حقوق کو برابر قرار دیا کہ ہر ایک حق دوسرے حق کا باعث ہوتا ہے۔ یہ حقوق یک طرفہ طور پر واجب نہیں ہوتے۔ ان حقوق میں سے خداوند عالم نے جو سب سے عظیم حق واجب کیا ہے وہ حاکم و والی کا حق عوام پر اور عوام کا حق حاکم و والی پر ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے خداوند عالم نے والی و رعایا میں سے ہر ایک فرد پر مقرر فرمایا ہے اور اسے ان کے لئے مایۂ اتحاد و یک جہتی اور دین کی عزت و سرفرازی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ رعایا اسی وقت نیک و صالح رہ سکتی ہیں جب حکام بھی صالح ہوں، اور حکام بھی اس وقت تک صلاح و نیکی سے آراستہ نہ ہوں گے جب تک عوام و رعایا صالح و درست کار نہ ہو۔ پس جب رعایا حاکم کا حق ادا کریں اور حاکم رعایا کے حق کا لحاظ کرے تو حق و عدالت ان کے درمیان محترم و باوقار ہوگی۔ دیانت کے راستے استوار ہو جائیں گے۔ عدل و انصاف کی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی، پیغمبر کی سنتیں اپنی راہ پر چل نکلیں گی نتیجہ میں زمانہ سازگار ہو جائے گا، حکومت کی بقا کی امیدیں پیدا ہو جائیں گی اور دشمنوں کی حرص و طمع، یاس و نا امیدی میں بدل جائے گی۔

اور جب بھی رعایا، حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہو یا حاکم، رعایا پر ظلم و ستم کرنے

لگے تو اتحاد و یکجہتی اختلافات میں بدل جائے گی، ظلم وستم کی نشانیاں ظاہر ہونے لگیں گی، دین میں مفسدے اور الٹ پھیر بڑھ جائیں گے، سنت و شریعت کی شاہراہیں متروک ہو جائیں گی، آخر کار نفسانی خواہشات عمل کا محور قرار پائیں گی، احکام تعطیل کا شکار ہو جائیں گے اور نفسانی بیماریاں شدت سے بڑھ جائیں گی۔ اس وقت بڑے بڑے (امور) حق کے انجام نہ پانے اور بڑے بڑے باطل (امور) کے دھڑلے کے ساتھ انجام پانے سے کوئی وحشت زدہ نہ ہوگا۔ اور جب ایسا ہوگا تو نیکوکار اور صالح افراد ذلیل اور شریر و اوباش عزت دار بن جائیں گے اور اللہ کی عقوبتیں لوگوں کے حق میں بڑھ جائیں گی۔ (خطبہ نمبر ۲۱۴)

اگر حضرت کے اس عمیق، پرمغز اور حکیمانہ کلام پر غور کیا جائے تو ہمیں اس میں حکومت و رعایا کے باہمی حقوق کے سلسلہ میں بہت سے ہدایات اور نکات نظر آتے ہیں جنہیں ہم یہاں اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں۔

الف) اجتماعی اور سیاسی حقوق الٰہی حقوق کا ہی ایک حصہ ہیں، جن کا ضائع کرنا خدا کے حق کو ضائع کرنا ہے اس بنا پر ایک صالح سیاسی، قانونی اور شرعی نظام میں اس نظام کے دستور و قوانین کی پابندی خدا کی اطاعت کے ہم معنی اور اس کی خلاف ورزی الٰہی احکام کی خلاف ورزی ہے۔ اور دیندار سیاسی نظام اور دین مخالف سیاسی نظام کے درمیان یہ بھی ایک امتیازی فرق ہے۔

(ب) حکومت اور رعایا دونوں ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں ان میں سے اگر ایک ان حقوق کی انجام دہی میں کوتاہی کرے تو دوسرے پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس حکومت کا احترام اور اس کی قدر ضروری ہے جو رعایا سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں کوتاہ رہے، یوں ہی وفادار رعایا بھی حکومت کے لئے قابل احترام ہے۔

(ج) حکومت و رعایا کے باہمی حقوق دراصل حقوق کی اہم ترین بنیادیں ہیں، کیونکہ معاشرہ کے بہت سے حقوق اور حدود ان ہی سے وابستہ ہیں۔ رعایا کی فلاح و رفاہ اور حکومت کا استحکام ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت پر منحصر ہے دین اور مسلمانوں کی عزت و سربلندی، سنن و شریعت کی بقا، اور معاشرہ میں عدل و انصاف کی برقراری کی ضمانت مذکورہ حقوق کے سایہ میں ہی دی جاسکتی ہے جبکہ ملکی سیاست میں حقوق کے تال میل اور اس نظم وضبط کے درہم و برہم ہونے کا نتیجہ فساد، ظلم بدعت، خیانت، اختلاف، نفس پرستی، حق کی پامالی، باطل کے رواج، مومنین کی ذلت، گمراہوں کی جرأت

وجبارت اور عقوبت الٰہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ اور اپنے ایک اجتماعی و سیاسی خطبہ میں حضرتؑ ان لوگوں کو سرزنش کرتے ہیں جنھوں نے اپنے امام کی اطاعت اس کی منزلت و مقام کے مطابق نہیں کی اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے سیاسی اجتماعی جمود کے حالات پیدا کر دیئے اور اپنے امام کو شدید طور سے غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ آپ رعایا کے ان حقوق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

«أيها النّاسُ! إنّ لِي عَلَيْكُمْ حَقّاً وَلَكُمْ عَلَيَّ حَقٌّ، فَأَمّا حَقُّكُمْ عَلَيَّ فَالنّصِيحَةُ لَكُمْ وَتَوْفِيرُ فَيْئِكُمْ عَلَيْكُمْ وَتَعْلِيمُكُمْ كَيْلا تَجْهَلُوا وَتَأْدِيبُكُمْ كَيْما تَعْلَمُوا. وَأَمّا حَقّي عَلَيْكُمْ فَالْوَفاءُ بِالْبَيْعَةِ وَالنَّصِيحَةُ فِي الْمَشْهَدِ وَالْمَغِيبِ وَالإجابَةُ حِينَ أَدْعُوكُمْ وَالإطاعَةُ حِينَ آمُرُكُمْ»

"اے لوگو! میرا تم پر حق ہے اور تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تمہارا حق مجھ پر یہ ہے کہ تمہیں نصیحت کروں اور بیت المال سے سب کو برابر اور پورا پورا حصہ دوں، تمہیں جہالت سے دور کرنے کے لئے تعلیم دوں اور ادب سکھاؤں تاکہ تم مہذب و خردمند بنو، اور میرا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ بیعت پر وفادار رہو۔ سامنے اور پیٹھ پیچھے ہمیشہ میرے خیر خواہ رہو جب بھی میں تمہیں بلاؤں تو میری آواز پر لبیک کہو اور جب حکم دوں تو اطاعت کرو۔" (خطبہ/۳۴)

۳۔ اپنے ایک عامل کو جسے آپؑ نے زکوٰۃ و صدقات سے متعلق امور پر مامور کیا تھا، ایک خط کے ذیل میں تحریر فرمایا :۔

«وإنّ أَعْظَمَ الْخِيانَةِ خِيانَةُ الأُمَّةِ وَأَفْظَعَ الْغِشِّ غِشُّ الأَئِمَّةِ»

"بلاشبہ سب سے بڑی خیانت اپنی قوم کے ساتھ خیانت ہے اور بدترین دھوکہ بازی اپنے رہبروں کے ساتھ دھوکہ ہے۔" (خط/۲۶)

۴۔ اپنے لشکر کے بعض سپہ سالاروں کو تحریر کردہ ایک خط میں ان حقوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

«أَمّا بَعْدُ فَإنَّ حَقّاً عَلَى الْوالِي أَلاّ يُغَيِّرَهُ عَلى رَعِيَّتِهِ فَضْلٌ نالَهُ

ولا طَولٌ خُصَّ بِهِ، وأنْ يَزيدَهُ ما قَسَمَ اللّهُ لَهُ مِنْ نِعَمِهِ دُنُوّاً مِنْ
عِبادِهِ وعَطفاً على إخوانِهِ»

"بے شک حاکم کا فرض یہ ہے کہ وہ فضل و شرف سے ہمکنار ہونے اور نعمت سے بہرہ ور ہونے کی صورت میں رعایا کے ساتھ اس کے رویہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو اللہ نے جو نعمتیں اسے عطا کی ہیں انھیں اس کے بندوں سے اس کی نزدیکی اور اپنے بھائیوں سے مہربانی و ہمدردی میں اضافہ کا سبب بنانا چاہئے۔" خط / ۵۰

«ألا وإنَّ لَكُمْ عِنْدي ألّا أحْتَجِزَ دُونَكُم سِرّاً إلّا في حَرْبٍ،
ولا أطْوِيَ دُونَكُم أمراً إلّا في حُكْمٍ ولا أؤَخِّرَ لَكُمْ حَقّاً عَنْ
مَحَلِّهِ ولا أقِفَ بِهِ دُونَ مَقْطَعِهِ. وأنْ تَكُونُوا عِنْدي في الحَقِّ
سَواءً فإذا فَعَلْتُ ذٰلِكَ وَجَبَتْ لِيَ عَلَيْكُمُ النِّعْمَةُ وَلِيَ عَلَيْكُم
الطّاعَةُ وألّا تَنْكُصُوا عَنْ دَعْوَةٍ ولا تُفَرِّطُوا في صَلاحٍ وأنْ تَخُوضُوا
الغَمَراتِ إلى الحَقِّ»

"آگاہ رہو! کہ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ اسرار جنگ کے علاوہ کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہ رکھوں، شرعی حکم کے علاوہ کسی اور امر میں تمہارے مشورہ سے پہلو تہی نہ کروں تمہارے کسی بھی حق کو پورا کرنے میں تاخیر و کوتاہی نہ کروں اور اسے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہ لوں۔ نیز میری نگاہ میں تم سب کا حق برابر ہو، پس اگر میں نے ان تمام چیزوں کو جامۂ عمل پہنا دیا تو تم پر خداوند عالم کی نعمت کا شکر واجب اور میری اطاعت لازم ہے، میری دعوت پر اپنے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور نیک کاموں میں کوتاہی نہ کرو۔ اور حق تک رسائی کے لئے سختیوں اور دشواریوں سے ٹکرا جاؤ۔"

«فإنْ أنتُمْ لَمْ تَسْتَقيمُوا لي على ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ أحَدٌ أهْوَنَ عَلَيَّ
مِمَّنْ اعْوَجَّ مِنْكُم، ثُمَّ أُعْظِمُ لَهُ العُقُوبَةَ ولا يَجِدُ فيها رُخْصَةً،
فَخُذُوا هٰذا مِنْ أُمَرائِكُمْ وأعْطُوهُمْ مِنْ أنْفُسِكُمْ ما يُصْلِحُ اللّهُ بِهِ
امرَكُم. والسلام.

پس اگر تم ان باتوں کے پابند نہ رہے تو تم میں میرے نزدیک کوئی اس شخص سے زیادہ ذلیل و حقیر نہیں ہوگا جو ٹیڑھی راہ اختیار کرے۔ پھر میں اسے سخت سزا دوں گا اور

اس کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہ کروں گا۔ یہ (عہد و پیمان) تم اپنے (ماتحت) سرداروں سے لے لو اور انھیں اپنی طرف سے اس طرح کی سہولتیں فراہم کرو کہ خداوند عالم ان کے ذریعہ تمہارے کام کو آسان کردے۔ والسلام" (خط/۵۰)

اس بحث کے آخر میں دو خاص مطالب کا ذکر ضروری ہے۔ اول: تاجروں اور پیشہ وروں سے متعلق حکومت کی ذمہ داریاں! دوسرے: معاشرہ کے محروم طبقہ سے متعلق حکومت کی ذمہ داریاں!

تاجروں اور پیشہ وروں سے متعلق حکومت کی ذمہ داریاں

مالک اشتر کو لکھے گئے امام علیہ السلام کے سیاسی منشور میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ امامؑ فرماتے ہیں:۔

«ثُمَّ اسْتَوْصِ بِالتُّجارِ وَذَوِي الصِّناعاتِ وأَوْصِ بِهِمْ خَيْراً، المُقيمِ مِنْهُمْ وَالمُضْطَرِبِ بِمالِهِ وَالمُتَرَفِّقِ بِبَدَنِهِ، فَإنَّهُمْ مَوادُّ المَنافِعِ وَأَسْبابُ المَرافِقِ وجُلاّبُها مِنَ المَباعِدِ وَالمَطارِحِ...»

"پھر تم کو تاجروں اور صنعت گروں کے بارے میں توجہ کی ہدایت دی جاتی ہے اسے سنو اور ان کے بارے میں نیکی کی ہدایت دو۔ یہ لوگ جو یا شہر میں مقیم ہیں یا اس کے اطراف میں اپنے مال کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں یا اپنی قوت بازو سے کسب و کار کرتے ہیں، پیداوار کا سرچشمہ اور درآمد کا وسیلہ ہیں اور عالم غربت میں دور دراز کے علاقوں سے نفع و سرمایہ فراہم کرنے والے ہیں..."

اس کے بعد اس طبقہ کو دامن گیر ہونے والی کمزوریوں اور گمراہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

«... وَاعْلَمْ ـ مَعَ ذٰلِكَ ـ أنَّ في كَثيرٍ مِنْهُم ضِيقاً فاحِشاً وَشُحّاً قَبيحاً وَاحْتِكاراً لِلْمَنافِعِ وَتَحَكُّماً فِي البِياعاتِ وَذٰلِكَ بابُ مَضَرَّةٍ لِلْعامَّةِ وَ عَيْبٌ عَلَى الوُلاةِ. فَامْنَعْ مِنَ الاِحْتِكارِ فَإنَّ رَسُولَ اللهِ ـ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وسَلَّم ـ مَنَعَ مِنْهُ. وَلْيَكُنِ البَيْعُ بَيْعاً سَمْحاً بِمَوازينِ عَدْلٍ وَأَسْعارٍ لا تُجْحِفُ بِالفَريقَيْنِ مِنَ البائِعِ

والمبتاع، فمن قارف حكرة بعد نهيك اياه فنكّل به وعاقبه في غير اسراف»

"..... ان سب کے باوجود یہ جان لو کہ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنی ذلیل حرکتوں اور سختیوں اور بے شرمانہ ظلم و سرکشی، لوگوں کی ضرورت کے سامانوں کی ذخیرہ اندوزی کر کے چیزوں کے من مانے اور سخت دام لگاتے ہیں حالانکہ یہ اعمال عوام کے لئے نقصان دہ اور حکام کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ لہذا لوگوں کو احتکار و ذخیرہ اندوزی سے روکو، کیونکہ پیغمبر خدا نے احتکار سے منع فرمایا ہے۔ خرید و فروخت سہل و آسان اور عادلانہ معیاروں کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ قیمتیں طرفین کے لئے انصاف کے ساتھ معین ہوں۔ اب اگر کوئی شخص احتکار سے روکے جانے کے باوجود اس طرح کا اقدام کرتا ہے، اس کی تنبیہ کرو اور اسے حد کے مطابق سزا دو" خط / ۵۳

صنعت گروں اور مصرف کرنے والوں کی حمایت

بازار، تاجر پیشہ افراد اور صنعت کاروں سے متعلق حکومت کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں چند بنیادی باتیں حسب ذیل ذکر کی جاتی ہیں:۔

۱۔ اہل بازار، تاجر، پیشہ ور افراد اور صنعت کار جو حکومت کے لئے نفع و سرمایہ پیدا کرنے کی اصل قوت اور عوام کی ضرورتیں پوری کرنے کا ذریعہ ہیں، حکومت کو ان کی حمایت کرنی چاہئے اور ان کے کاروبار کو جاری رکھنے کے لئے انھیں ضروری سہولتیں فراہم کرنی چاہئے۔

۲۔ حکومت کو اسی طبقہ کے افراد کے پیدا کردہ مالی الٹ پھیر، غلط فوائد، احتکار اور کالا بازاری وغیرہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے اور انھیں اس بات کی مہلت نہ دینی چاہئے کہ عوام کے کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری ضرورتیں ان ظالموں کے ہاتھوں تباہ ہوں۔ اور اگر ضروری ہو تو ایسے غلط افراد کو ظلم و زیادتی کے بغیر مناسب سزائیں دے اور ان پر جرمانے عائد کرے۔

۳۔ تمام چیزوں کی عادلانہ اور طے شدہ قیمتیں حکومت کو معین کرنا چاہئے جس سے ہر شخص اپنی

مرضی سے من مانی قیمتیں معین نہ کرے جس سے بازار اور ملکی اقتصاد میں ہرج و مرج کی صورت پیدا ہو۔

۲۔ معاشرہ کے غریبوں سے متعلق حکومت کی ذمہ داری

معاشرہ کے غریب محروم اور نادار طبقہ کے سلسلہ میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

«ثُمَّ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِیْ اَلطَّبَقَةِ السُّفْلٰی مِنَ الَّذِیْنَ لَاحِیْلَةَ لَهُمْ، مِنَ الْمَسَاکِیْنِ وَالْمُحْتَاجِیْنَ وَاَهْلِ اَلْبُؤْسٰی وَاَلزَّمْنٰی. فَاِنَّ فِیْ هٰذِهِ اَلطَّبَقَةِ قَانِعاً وَمُعْتَرّاً وَاحْفَظْ لِلّٰهِ مَا اَسْتَحْفَظَکَ مِنْ حَقِّهِ فِیْهِمْ وَاجْعَلْ لَهُمْ قِسْماً مِنْ بَیْتِ مَالِکَ، وَقِسْماً مِنْ غَلَّاتِ صَوَافِی الْاِسْلَامِ فِیْ کُلِّ بَلَدٍ، فَاِنَّ لِلْاَقْصٰی مِنْهُمْ مِثْلَ الَّذِیْ لِلْاَدْنٰی. وَکُلٌّ قَدِ اَسْتُرْعِیْتَ حَقَّهُ، فَلَا یَشْغَلَنَّکَ عَنْهُمْ بَطَرٌ، فَاِنَّکَ لَا تُعْذَرُ بِتَضْیِیْعِکَ التَّافِهَ لِاِحْکَامِکَ الْکَثِیْرَ الْمُهِمَّ فَلَا تُشْخِصْ هَمَّکَ عَنْهُمْ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لَهُمْ وَتَفَقَّدْ اُمُوْرَ مَنْ لَایَصِلُ اِلَیْکَ مِنْهُمْ مِمَّنْ تَقْتَحِمُهُ الْعُیُوْنُ وَتَحْقِرُهُ الرِّجَالُ، فَفَرِّغْ لِاُولٰئِکَ ثِقَتَکَ مِنْ اَهْلِ الْخَشْیَةِ وَاَلتَّوَاضُعِ، فَلْیَرْفَعْ اِلَیْکَ اُمُوْرَهُمْ. ثُمَّ اَعْمَلْ فِیْهِمْ بِالْاِعْذَارِ اِلَی اللّٰهِ یَوْمَ تَلْقَاهُ. فَاِنَّ هٰؤُلَاءِ مِنْ بَیْنِ اَلرَّعِیَّةِ اَحْوَجُ اِلَی اَلْاِنْصَافِ مِنْ غَیْرِهِمْ. وَکُلٌّ فَاَعْذِرْ اِلَی اللّٰهِ فِیْ تَاْدِیَةِ حَقِّهِ اِلَیْهِ.»

"پھر خدارا! خدارا! معاشرہ کے نچلے طبقہ یعنی ان لوگوں کا خیال رکھنا جو فقیر و محتاج، گرفتار بلا، درد کے مارے اور معذور افراد ہیں۔ اس طبقہ میں عزت دار اور محتاج افراد بھی ہیں۔ خداوند عالم نے ان لوگوں سے متعلق تم پر جو حق معین کیا ہے اسے ادا کرو۔ ان کے لئے بیت المال اور اسلام و مسلمانوں سے متعلق شہروں سے حاصل ہونے والے اموال میں سے ایک حصہ معین کرو کیونکہ دور رہنے والے افراد بھی نزدیک رہنے والوں کی مانند حقدار ہیں اور تم ان سب کے حق کے ذمہ دار ہو۔ دیکھو غرور و نخوت تمہیں اس فریضہ کی ادائیگی سے روکنے نہ پائے کیونکہ اس صورت میں تم زیادہ اہم امور کی انجام دہی کے لئے معمولی اور چھوٹے چھوٹے حقوق کو ضائع کر کے قابل معافی قرار نہ پاؤ گے۔ ان کے حالات سے غافل نہ ہو، ان کی طرف سے نخوت سے منہ نہ پھیرو۔ ان میں سے ایسے اشخاص

کے حالات و کوائف کی تحقیق و چھان بین کرو جنھیں لوگ حقارت و بے توجہی کی بنا پر تم تک نہیں پہنچاتے اور ان کے مشکلات کے حل نیز ان کے کاموں کی انجام دہی کے لئے قابل اطمینان خداترس اور متواضع افراد سے کام لو۔ کوشش کرو کہ ان محروم افراد کے حالات و کیفیات تم تک پہنچائے جائیں۔ اور تم جس طرح قیامت میں خدا کے سامنے عفو کی امید رکھتے ہو یوں ہی ان کے ساتھ پیش آؤ کیونکہ ملت میں یہ لوگ عدل و انصاف کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، لہٰذا سب کا حق خدا کے حکم کے مطابق ادا کرو۔"

یہ نچلا طبقہ جو محروم اور فراموش شدہ افراد کا طبقہ ہے، دنیا کے تمام اجتماعی و سیاسی نظاموں میں کسی معاشرہ کے اندر کبھی بھی کسی شمار میں نہیں لایا جاتا۔ یہ لوگ ہمیشہ ظالموں اور جابروں کے زیر ستم اپنے بنیادی اور ابتدائی قسم کے اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی حقوق سے بھی محروم رہے ہیں، جب کہ صورت حال یہ ہے کہ اسی گروہ کی اولاد اور خود یہ لوگ حکومتوں کی سب سے زیادہ خدمت کرتے آئے ہیں؛ فوجوں کے سپاہی، درباروں کے محافظ نیز حکام کی خوشیوں اور غموں میں قربانیوں کا بکرا بننے والے زیادہ تر اسی طبقہ کے افراد ہیں، ان کی تقدیریں گویا بدترین تقدیریں ہیں۔

صدیوں اور زمانوں کے طول و عرض پر محیط حاکم دنیوی سیاست کے برخلاف تنہا وہ سیاست جس نے الٰہی معارف اور آسمانی تعلیمات سے الہام حاصل کرتے ہوئے اس کمزور طبقہ پر عنایتیں کی ہیں اور ان کے اقدار کو زندہ کرنے کی راہ میں قدم اٹھایا ہے، وہ دین اور الٰہی مکتب فکر سے نشأة پانے والا سیاسی نظام ہی ہے۔ اصولی طور پر انبیائے الٰہی اسی لئے مبعوث ہوئے تھے کہ قوموں و ملتوں اور انسانی معاشرہ کے محروم و ستم دیدہ افراد کو ظالم و جابر اور خونخوار حکام کے چنگل سے نجات دلائیں اور دنیا میں رائج ان حاکم معیاروں کو بدل ڈالیں جو معاشرہ میں طبقات کی تعیین و تقسیم کا محور بنے ہوئے تھے۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ، جنھوں نے اپنی اجتماعی سیاست کی بنیاد عملی طور پر محروموں کی حمایت اور انھیں اہمیت دیئے جانے کی اساس پر قائم کی تھی اپنے اجتماعی — سیاسی منشور میں مالک اشتر سے ان محروم طبقوں کے ضائع شدہ حق کے سلسلہ میں تاکید فرمائی ہے۔

یہاں ہم اس سلسلہ میں امامؑ کی مذکورہ فرمائشات کے چند اساسی نکتوں پر ایک سرسری نگاہ

ڈالتے ہیں :-

(۱) ان کی مادی ضرورتیں اور زندگی کا خرچ بیت المال سے دیا جانا چاہئے نیز ہر شہر اور علاقہ کی آمدنی اس علاقہ کے غریب و محروم افراد کی ضرورتوں پر صرف ہونی چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ وہ آمدنیاں مرکزی شہروں کو بھیج دی جائیں اور ان کے اصلی مالک و حقدار اس سے محروم رہیں۔

(۲) حکومت کے ذمہ داروں پر واجب ہے کہ ملک کے اہم مشاغل میں معروف ہونے کی بنا پر ان لوگوں کی ناگفتہ بہ صورت حال سے غافل نہ رہیں، کیونکہ پھر وہ خدا کے حضور اس کا کچھ جواب نہ دے پائیں گے۔

(۳) حکومت کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ اس تحقیر شدہ طبقہ کے افراد سے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کریں اور ان کی روح میں پڑی ہوئی حقارت و بے مائیگی کی گرہیں کھولیں۔

(۴) حکام پر لازم ہے کہ صالح، خدا ترس اور متواضع افراد کو اس طبقہ کے حالات کا نگراں اور ذمہ دار بنائیں تاکہ وہ پوری دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ ان کے کام کو انجام دیں اور حاکم کو اس کے نتائج سے آگاہ کریں۔

بے سہارا بچے اور بوڑھے

معاشرہ کے محروم طبقات میں ایسے بے سہارا افراد بھی ہیں جن کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے۔ یتیم و بے سرپرست بچے اور ضعیف و ناتواں بوڑھے ہیں کہ امامؑ نے اپنے ہدایات میں الگ سے ان کا ذکر فرمایا ہے:-

«وتَعَهَّدْ أهْلَ ٱلْيُتْمِ وذَوِي ٱلرِّقَّةِ فِيْ ٱلسِّنِّ مِمَّنْ لاحِيلَةَ لَهُ،
ولاينْصِبُ لِلْمَسْأَلَةِ نَفْسَهُ وذٰلِكَ عَلَىٰ ٱلْوُلَاةِ ثَقِيلٌ، وَالْحَقُّ
كُلُّهُ ثَقِيلٌ وقَدْ يُخَفِّفُهُ اللّٰهُ عَلىٰ أقْوامٍ طَلَبُوا العاقِبَةَ فَصَبَّرُوا
أنْفُسَهُمْ، وَوَثِقُوا بِصِدْقِ مَوْعُودِ اللّٰهِ لَهُمْ.»

"یتیم بچوں اور سال خوردہ بوڑھوں کی سرپرستی کرو جن کا نہ کوئی سہارا ہے اور نہ وہ سوال کے لئے اٹھتے یا ہاتھ پھیلاتے ہیں، یہ امر حکام کے لئے اگرچہ سخت اور گراں ہے اور یقیناً حق کل کا کل سخت اور سنگین ہے لیکن بلاشبہ خداوند عالم ان لوگوں کے لئے جو عاقبت کی بھلائی کے خواہاں، صابر اور وعدہ اللہ کے وعدہ پر مطمئن ہوں ــــ اس سنگین ذمہ داری کو قابل تحمل بنا دیتا ہے۔"

تہمت کے اقسام

جناب ناصر باقری بید ھندی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

مجموعی طور سے تہمت کو آٹھ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱. خدا پر تہمت

خداوند عالم کی ذات اقدس پر بہتان لگانا یعنی وہ ذات جس کا دامن کبریائی ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے، اس کی طرف کسی چیز کی ناروا نسبت دینا۔ سورۂ صف آیت ۷ میں ہے:۔

"ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللّٰہ الکذب"

"جو شخص ذات اقدس پروردگار پر تہمت لگائے اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوگا۔"

اور سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ویلکم لاتفتروا علی اللّٰہ کذباً فیسحتکم بعذاب" (آیت/٦١)

وائے ہو تم پر خدا پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ کہ وہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔[1]

[1] اس کے علاوہ اس موضوع سے متعلق سورۂ عنکبوت کی ۶۸ ویں، سورۂ انعام کی ۲۱ ویں اور ۹۳ ویں، سورۂ ھود کی ۱۸ ویں، سورۂ انعام کی ۱۴۴ ویں سورۂ اعراف کی ۳۷ ویں، سورۂ یونس کی ۱۷ ویں، سورۂ کہف کی ۱۵ ویں، اور سورۂ زمر کی ۳۲ ویں آیتیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

خداوند عالم کی ذات اقدس پر تہمت کا جائزہ چند اقسام کے ذیل میں لیا جاسکتا ہے :-

الف : بعض مشرکین نے خدا کی طرف صاحب اولاد ہونے کی نسبت دی ہے اور بعض انبیاء کرام منجملہ حضرت عیسیٰؑ اور عزیرؑ نیز کچھ فرشتوں کو خداوند عالم کی اولاد قرار دیتے ہیں کہ خداوند عالم نے مندرجہ ذیل آیت میں مشرکین کے اس گروہ کی توبیخ و تنبیہ فرمائی ہے :-

وینذر الذین قالوا اتخذ اللّٰہ ولداً مالھم بہ من علم ولا لاٰبائھم کبرت کلمۃً تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا" (کہف / ۵)

یعنی : جو لوگ خدا کے لئے فرزند قرار دیتے ہیں انھیں اللہ کے دردناک عذاب سے ڈرایئے وہ اور ان کے آباؤ اجداد اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ کیسی بڑی اور کتنی سخت بات زبان پر لا رہے ہیں اور جھوٹ کے علاوہ کوئی اور بات ان کی زبانوں پر نہیں آتی ۔

ب : مسیلمہ کذاب ، اسود عنسی ، محمد بن نصیر نمیری اور ادھر گزشتہ صدیوں میں سید علی محمد باب ، میرزا حسین علی بہا ، مرزا غلام احمد قادیانی اور احمد کسروی جیسے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور بزعم خود الٰہی رسالت کے حامل رہے ہیں ۔ ڈاکٹر یحییٰ ادچ لوک نے اپنی کتاب " تاریخ پیامبران دروغین در صدر اسلام " میں ، جسے ڈاکٹر وہاب ولی نے فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے ان میں سے صدر اسلام میں موجود چار افراد کی سیاسی و اعتقادی زندگی پر بحث و تحقیق کی ہے اور ان کے ظاہر ہونے کے اسباب و علل بھی بیان کئے ہیں ۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیھدیھم سبیل الھالکین

اگر کوا کسی قوم کی رہبری اختیار کرلے تو انھیں سوائے ہلاکت و گمراہی کے کسی اور طرف نہ لے جائے گا۔[1]

---

[1] ۱۲۶۰ھ میں سید کاظم رشتی کی وفات کے بعد سید علی محمد باب نے شروع میں ذکریت کا دعویٰ کیا تاکہ خود کو آیت شریفہ " انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون " اور آیت " فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون " میں خود کو ذکر کے مصداق کی حیثیت سے پیش کرے اس کے بعد ←

اور اسی سلسلہ کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :۔

ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذباً او قال اوحی الیّ ولم یوح الیہ شیء ومن قال سانزل مثل ما انزل اللہ

اس نے بابیت (یعنی الٰہی معارف کا باب اور امام مہدیؑ سے اتصال کا راستہ) کا دعویٰ کیا، پھر مہدیت کا دعویٰ کیا پھر رفتہ رفتہ نبوت، شارعیت اور اس دعوے کے ساتھ ہی کہ خدا کی جانب سے اس کے پاس وحی آتی ہے اس نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی اور آخر کار اس نے ان پے در پے دعوؤں سے بھی آگے بڑھتے ہوئے الوہیت اور اپنے آپ میں خدا کے حلول کا دعویٰ بھی کر ڈالا۔ اور سرانجام پہلی بار فارس کے حاکم حسین علی خان کے حکم سے شیراز میں اور دوسری بار ناصر الدین شاہ کے حکم سے تبریز میں جو اس وقت ولی عہد کی حیثیت سے تھا، اس کے اور بزرگ علماء کے درمیان جو بحث اور مناظروں کے جلسے منعقد ہوئے، علماء نے اس کے پوچ اور فاسد عقائد و نظریات کو سن کر اس کے کفر کا فتویٰ دیتے ہوئے اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا، بالآخر ناصر الدین شاہ قاچار اور امیر کبیر کی موافقت سے اس حکم قتل پر عمل درآمد ہوا اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ سید باب نے اپنے شاگردوں اور مریدوں میں سے مرزا یحییٰ نامی ایک جوان کو جسے اس نے "صبح ازل" کا لقب دیا تھا اپنا جانشین قرار دیا لیکن اس کے سوتیلے بھائی مرزا حسین علی نے جو اس سے بڑا بھی تھا اسے دھوکا دے کر اسے نظر بند کر دیا اور خود پہلے (من یظہرہ اللّٰہی یعنی مظہر الوہیت پھر مہدیت کا دعویٰ کیا اس کے بعد رجعت حسینی اور رجعت مسیح کا ادعا کیا اور پھر تبدریج رسالت و شارعیت اور اپنے وجود میں خدا کے حلول اور اپنی شکل میں خدا کے تجسد و تجسم کا دعویٰ بھی کر ڈالا اور بہت سے مسلمانوں کو گمراہ کیا اور سرانجام ۲ ذیقعدہ ۱۳۰۹ھ کو عکا میں جلا وطنی کی زندگی بسر کرتے ہوئے واصل جہنم ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔

شیعہ علماء میں سے بہت سے بزرگوں نے اس موضوع سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور باب و بہا کے عقائد کی حقیقت کھولی ہے جن میں سے چند کتابوں اور مصنفوں کے نام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ "مفتاح الابواب" (باب و بہا کی صحیح تاریخ) تالیف مرزا مہدی خان زعیم الدولہ تبریزی، ترجمہ حسن فرید گلپائگانی، طبع کتاب خانہ شمس تہران (عربی)

۲۔ "محاکمہ و بررسی در تاریخ و عقائد و احکام باب و بہا"، ڈاکٹر ح۔ م۔ ت، طبع کتاب فروشی مصطفوی (فارسی)

ولو تریٰ اذ الظالمون فی غمرات الموت والملٰئکۃ باسطوا
ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون
بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن آیاتہ
تستکبرون (سورۂ انعام / ۹۳)

یعنی: اس شخص سے بڑا ظالم اور ستمگر کون ہے جس نے خدا پر تہمت لگائی اور اس کا دعویٰ کیا کہ ہمارے پاس وحی آتی جب کہ خدا کی طرف سے اس پر کچھ بھی وحی نہیں ہوئی،

۳۔ "خاتمیت پیامبر اسلام و ابطال تحلیلی بابیگری و بہائیگری و قادیانی گری" ۔ یحییٰ نوری، طبع مجمع مطالعات وتحقیقات اسلامی و مجمع معارف اسلامی (فارسی)

۴۔ "بہائی چہ میگوید؟" ۔ جواد تہرانی، طبع دار الکتب الاسلامیہ (فارسی)

۵۔ "بی بہائی باب و بہاء" ۔ محمد علی خادمی (فارسی)

۶۔ "جمال الٰہی" ۔ سید عبد الکریم موسوی اردبیلی (فارسی)

۷۔ "نصایح الہدیٰ" ۔ محمد جواد بلاغی، طبع بغداد، ترجمہ علامہ فانی، طبع دار التبلیغ اصفہان (عربی)

۸۔ "بہائیت دین نیست" ۔ ابو تراب صدائی، خراسانی پبلیکیشن (فارسی)

۹۔ "بہائیت یا خیابت عجیب" ۔ سید مہدی رضوی (فارسی)

۱۰۔ البہائیۃ تاریخہا وعقیدتہا وصلتہا بالباطنیۃ والصہیونیۃ ۔ عبد الرحمٰن الوکیل (عربی)

۱۱۔ "سیری در کتب بہائیان" ۔ رضا سلطان نژاد

۱۲۔ "مزدوران استعمار در لباس مذہب" ۔ سید ضیاء الدین روحانی

۱۳۔ "خاتمیت" ۔ علی امیر پور

۱۴۔ "چہار شب جمعہ" ۔ جلال درخشی

۱۵۔ "پنجۂ خونین استعمار در آستین باب" ۔ احمد رحیمی کاشانی

۱۶۔ "فلسفۂ نیکو" مرزا حسن نیکو مبلغ سابق بہائیت

یوں ہی وہ شخص جو کہتا ہے کہ جو کچھ خدا نے پیغمبرؐ پر نازل کیا ہے میں بھی اسی کے جیسا (کلام) نازل کروں گا؟ (اور اے رسولؐ) کاش آپ دیکھتے کہ یہ ظالم سکرات موت کی سختیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور ملائکہ اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے ان سے کہہ رہے ہیں کہ اپنی جانیں نکالو کہ آج تم کو اس جھوٹ کے بدلہ میں جو تم نے خدا پر ناحق باندھا ہے اور اس کی نشانیوں سے منہ موڑا ہے، دردناک عذاب دیا جائے گا"

۱۷ــ "کشف الحیل" عبدالحسین آوارہ مشہور بہ آیتی (سابق بہائی مبلغ)

۱۸ــ البہائیۃ ــ محمد حسین کاشف الغطاء

۱۹ــ گفتار خوش یارعلی

۲۰ــ کینیاز دالگورکی

۲۱ــ "انتظار قائم آل محمدؐ" بجواب ظہور قائم آل محمدؐ ۲ جلد از علامہ ظفر الحسن ھندی مطبوعہ الجواد بک ڈپو (اردو)

۲۲ــ "بہائیوں کا کلام اللہ" از مولانا سعید اختر گوپالپوری ھندی مطبوعہ الجواد بک ڈپو۔ بنارس - (اردو)

● یہاں ہم قادیانیوں کے جواب میں لکھی جانے والی چند کتابوں کا ذکر بھی کئے دیتے ہیں!-

۱ــ الرد علی الاحمدیۃ والقادیانیۃ، از طاہر بن خالد آماسی (مفتی شہر حمص متوفی ۱۳۵۹ھ) مطبوعہ

۲ــ کتاب الابرار، از ابوالحسن ابن حسام السلطنۃ بن فتح علی شاہ قاچار (معروف بہ حاج شیخ الرئیس) ماخوذ از کتاب ریحانۃ الادب ج ۲ ص

۳ــ صعقۃ الامۃ علی رأس الحمامۃ از ابوالمحسن میرزا ابن حسام السلطنۃ ... یہ کتاب خود غلام احمد قادیانی کی کتاب حمامۃ البشریٰ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

۴ــ طرد الخلافۃ در جواب ستر الخلافہ انقادیانی، یہ کتاب بھی اسی مصنف کی ہے۔

۵ــ المصابیح فی نقض مفتریات القادیانیین، از علامہ شیخ محمد جواد بلاغی۔ ماخوذ از کتاب علماء معاصر و ریحانۃ الادب، ج ۱/ ۲۷۹

۶ــ مذہب قادیانی از ابوالحسن ندوی ۷ــ مسئلہ قادیانی گری ابوالاعلیٰ مودودی ۸ــ گروہ قادیانی ــ از محمد خضر الحسنی

مذکورہ بالا تینوں کتابیں انتشارات رابطہ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ سے شائع ہو چکی ہیں۔

۹ــ "البہائیہ والقادیانیہ" از الدکتور محمد حسن اعظمی شائع شدہ از مؤسسہ الاعلمی بیروت

ج ۔ خداوند قدوس کی جانب ایک دوسری قسم کی تہمت اپنے خود ساختہ احکام کو خدا کی طرف منسوب کر دینا ہے[1] کہ اس طرح کی تہمتیں لگانے والوں کی قرآن میں یوں مذمت اور تکذیب کی گئی ہے:۔

ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام ولکن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب واکثرھم لا یعقلون (سورۂ مائدہ/۱۰۳)

یعنی: خداوند عالم نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام[2] کے لئے کوئی حکم مقرر نہیں فرمایا ہے بلکہ کافروں نے ان احکام کو اپنے پاس سے گڑھ لیا ہے اور انھیں خدا سے منسوب کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر (بیشتر) اپنی عقلوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

قل ارأیتم ما انزل اللہ لکم من رزق فجعلتم منہ حراماً وحلالاً قل آللہ اذن لکم ام علی اللہ تفترون (یونس/۵۹)

یعنی: اے پیغمبر اکرمؐ آپ مشرکوں سے کہئے کہ آیا جو رزق خداوند عالم نے تم پر نازل فرمایا ہے (اور حلال قرار دیا ہے) ان میں سے تم اپنی طرف سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے ہو کیا ایسا تم خدا کے حکم سے کرتے ہو یا اس کی ذات اقدس پر تہمت لگاتے ہو...

---

[1] "باب" کے جعلی اور من گھڑت احکام اس کی کتاب "بیان" اور اس کے بعض حصے "مفتاح باب الابواب" ص ۱۶۸ کے آغاز سے.... نیز محاکمہ و بررسی باب و بہاء، ج ۱۲، ص ۴۱ اور "راہ راست" ج ۱، ص ۶۵-۶۶ مصنفہ مسیح اللہ رحمانی (محفل بہائیان کے سابق رئیس) میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

[2] بحیرہ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو پانچ بچے جنے اور پانچواں نر ہو کہ اس پر سواری کرنے اور اسے قتل کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور اسے پانی کے کنارے یا چراگاہ سے نہیں ہنکاتے تھے اور بقولے جب اونٹنی کا پانچواں بچہ نر ہوتا تھا تو اسے ذبح کر دیتے تھے اور اس کا گوشت سب پر مباح ہوتا تھا اور اگر مادہ جنتی تھی تو اس کے کان چیر ڈالتے اور اس کے ذبح کے وقت خدا کا نام نہ لیتے تھے نیز عورتوں کا اس کے گوشت میں کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔

سائبہ: وہ جانور جسے تبرکاً وقف کر دیتے تھے یا بقولے وہ اونٹنی جو دو مرتبہ پے در پے مادہ جنے۔

د ۔ یہودی علماء نے توریت میں بیان شدہ پیغمبر اکرمؐ کے اوصاف میں تحریف کی اور اسے خدا کی طرف منسوب کردیا اور یہ ظاہر کیا کہ پیغمبر اسلامؐ کے اوصاف توریت میں دوسری طرح سے بیان ہوئے ہیں۔ خدا ان لوگوں کی قرآن مجید میں یوں توبیخ فرماتا ہے :۔

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثمّ یقولون ھٰذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً فویل لھم ممّا کتبت ایدیھم و ویلٌ لھم ممّا یکسبون (بقرہ/۷۹)

یعنی : وائے ہو ان لوگوں (یہودیوں) پر جو اپنے ہاتھوں سے کچھ چیزیں لکھ کر اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ انھیں دنیا کی حقیر دولت کے عوض فروخت کریں لعنت ہو ان پر، ان کی تحریروں پر اور لعنت ہو اس چیز پر جو وہ حاصل کرتے ہیں۔

ھ ۔ یہودی اپنی ان تمام ترخیانتوں کے باوجود جن میں سے ایک سامری کے گوسالہ کی پرستش تھی اس بات کے مدعی تھے کہ بارگاہ عدل الٰہی میں چند دنوں سے زیادہ خدا کی آتش غضب کا شکار نہ ہوں گے اور خدا ان کے لئے علاحدہ حساب و کتاب رکھے گا کہ قرآن کریم اس بے بنیاد تہمت کی رد کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :۔

وقالوا لن تمسّنا النّار الّا ایاماً معدودۃ قل اتّخذتم عند اللہ عھداً فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون

(بقرہ/۸۰)

ان (یہودیوں) نے کہا کہ ہم چند دنوں سے زیادہ عذاب الٰہی کی آگ میں گرفتار نہ ہوں گے اے پیغمبرؐ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم جو یہ کہہ رہے ہو اس کا خدا سے تم نے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ ہرگز اپنے وعدے سے نہیں پھرتا؟ یا تم بزعم خود بے سمجھے بوجھے کسی چیز کو

وصیلہ : وہ گوسفند یا بکری جو ایک ہی مرتبہ میں نر و مادہ دو بچے جنتی اس کا دودھ اور بال صرف مردوں کے لئے مباح تھا اور عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا
لقوسے وہ گوسفند جو پانچ مرتبہ میں دس مادہ پے در پے جنتی تھی
حام : وہ نر شتر جس کی صلب سے دس بچے پیدا ہوتے تھے اسے خود اپنا پشت پناہ کہا جاتا تھا اور اس پر بار نہیں لادا جاتا تھا

خدا کی طرف منسوب کرتے ہو۔
آخر میں اس بحث کو ہم اس آیۂ کریمہ کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں :۔
"قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون"
(یونس/٦٩)
یعنی: اے رسولؐ کہہ دیجئے: جو لوگ خدا پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔

٢۔ انبیاءؑ، ائمہؑ اور قرآن پر تہمت

وہ تہمتیں جنھیں قرآن نے مشرکوں کی زبان سے مخصوص پیغمبر اسلامؐ کے سلسلہ میں نقل کیا ہے حسب ذیل ہیں :۔

١۔ ساحر

وعجبوا ان جاءھم منذر منھم وقال الکافرون ھذا ساحر کذاب (ص/۴)
اور ان لوگوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان ہی میں کا ایک ڈرانے والا پیغمبر ان کے پاس آیا، اور کافروں نے کہا کہ یہ (شخص) جادوگر اور بہت جھوٹا ہے۔

٢۔ کاہن

"ولا بقول کاھن قلیلاً ما تذکرون" (حاقہ/۴٢)
..... اور نہ کسی کاہن کی (خیالی) بات اور تم لوگ تو بہت کم غور کرتے ہو۔

٣۔ مجنون

وقالوا یا ایھا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون (حجر/٦)
اور (کفار نے) کہا: اے وہ! جس پر وحی وکتاب نازل کی گئی ہے بلا شبہ تو مجنون و دیوانہ ہے!

۴۔ مسحور

وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراً (فرقان/٨)
اور ظالموں نے کہا کہ تم لوگ تو ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔

۵۔ معلَّم (تعلیم دیا ہوا، پڑھایا ہوا)

وقد جاءھم رسول مبین . ثم تولوا عنه وقالوا معلّم مجنون (دخان/۱۴)

اور جب ان کے پاس صاف صاف بیان کر دینے والا پیغمبر آیا تو ان لوگوں نے اس سے منھ پھیر لیا اور کہا کہ یہ تو پڑھایا ہوا دیوانہ ہے۔

۶۔ مفتری

قالوا انّما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون (نحل/۱۰۱)

ان لوگوں نے کہا تم بلا شبہ تہمت و الزام لگانے والے ہو بلکہ ان میں سے بہتیرے نہیں جانتے

۷۔ کذاب

وعجبوا ان جاءھم .... الخ آیت نمبر ایک ملاحظہ فرمائیں

۸۔ شاعر

ام یقولون شاعر نتربّص به ریب المنون (طور/۳۰)

کیا یہ لوگ (تم کو) شاعر کہتے ہیں، ہم تو اس بارے میں زمانہ کے حادثات کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ تہمتیں صرف پیغمبر اسلامؐ کی شان اقدس کو نہیں لگائی گئی ہیں بلکہ کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جسے لوگوں نے جادوگر یا دیوانہ نہ کہا ہو:۔

کذالك ما اتی الذین من قبلھم من رسول الّا قالوا ساحر و مجنون (الذاریات/۵۲)

"اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو بھی پیغمبر آتا تھا وہ اس کو جادوگر اور دیوانہ کہتے تھے"

اب ہم یہاں مذکورہ بالا موضوع کے تحت چند قرآنی آیتیں بطور مثال پیش کرتے ہیں:۔

الف: ومن اظلم ممّن افتری علی الله کذبًا اوکذّب بالحقّ لمّا جاءہٗ الیس فی جھنّم مثوًی للکافرین" (عنکبوت/۶۸)

"اور جو شخص اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا جب اس کے پاس کوئی سچی بات آئے تو جھٹلائے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا اور کیا ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے؟"

"ب" دشمنان رسول خدا نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ آپ کس مذہب کی پیروی کرتے ہیں؟ فرمایا: اپنے پدر

ابراہیمؑ کے مذہب کی۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ ابراہیمؑ گوشت اور اونٹنی کے دودھ کو حرام جانتے تھے اور اور آپ اسے کھاتے ہیں، کیا آپ ان کے مذہب کے خلاف عمل کرتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم ابراہیمؑ پر تہمت لگاتے ہو اور ان کی طرف اس طرح کی جھوٹی نسبت دیتے ہو۔ وہ لوگ اپنی بات پر اڑے رہے یہاں تک کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ پر آیت نازل فرما کر اس کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ کے عمل کی تائید و تصدیق فرمائی اور تہمت لگانے والوں کی سرزنش کی:۔

فمن افتریٰ علی الله الکذب من بعد ذالک فاولئک هم الظالمون (آل عمران/۹۴)

"جو لوگ اس کے بعد خدا پر جھوٹی تہمت لگائیں تو وہ ظالم و ستمگر ہیں"

ج۔ اسلام اور قرآن کے دشمن وحی الٰہی کی تحقیر کرنے کے لئے اس کی طرف شعر، جادو، اساطیر (قصے بے بنیاد افسانے) اور اضغاث و احلام (آشفتہ و بے معنی افکار و خیالات) کی نسبت دیتے تھے تاکہ بزعم خود اسے مبتذل قرار دے کر اس عالی اور جامع اسلامی تہذیب کے رواج میں رکاوٹ پیدا کریں۔ نمونہ کے طور پر سورۂ فرقان کی چوتھی آیت میں ارشاد ہے:۔

"وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک افتراہ واعانہ علیہ قوم آخرون"

کافروں نے کہا: یہ قرآن تو نرا جھوٹ ہے جسے اس (رسولؐ) نے اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے اور کچھ اہل کتاب نے اسے گڑھنے میں اس کی مدد بھی کی ہے اور اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے:۔

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملیٰ علیه بکرة واصیلا (فرقان/۵)[1]

اور کہنے لگے کہ یہ (قرآن) پرانے لوگوں کے افسانے ہیں جنہیں وہ شب و روز (رسولؐ) کو املاء کیا کرتے تھے۔[2]

---

۱ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں سورۂ انفال/۳۰، سورۂ انعام/۲۵، سورۂ نحل/۲۴، سورۂ قلم/۱۵، سورۂ مطففین/۱۳، سورۂ سبا/۴۳، سورۂ زخرف/۳۰، سورۂ مدثر/۲۵ و ۳۰، سورۂ الحاقہ/۴۱ اور سورۂ یٰس/۶۹ آیتیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

۲ مبارزۂ طاغوتیان با قرآن، از استاد علی کریمی جہرمی، ص۵۵ اور اس کے بعد۔

ایک اور تہمت جو قرآن سے منسوب کی گئی اس کی طرف تحریف کی نسبت ہے، اس سلسلہ میں ہمارے ایک استاد محترم فرماتے ہیں :-

اس نظریہ کے وجود اور اس کی پیدائش کو اگرچہ ہم ــــ اس حکم کے تحت کہ یہ کام ان دو تین بزرگ علماء کا تھا جن کا پاکیزہ دامن دین سے خود غرضی کے الزام سے آلودہ نہیں ہوتا بلکہ وہ چند ضعیف روایات پر اعتماد کر کے اس نظریہ کی طرف مائل ہوئے ہیں ــــ دشمن اسلام و قرآن کی راہ کی حیثیت سے توجیہ و تفسیر نہ کریں لیکن بلاشبہ اس کی ترویج و اشاعت، خاص طور سے اس نظریہ کے تحت دیئے جانے والے قاطع اور کافی جوابوں کو دیکھتے ہوئے بذات خود استعمار سے مربوط ہے۔[1] کیونکہ اس نظریہ کے رواج کا سب سے بڑا نتیجہ دشمنوں یہ ہے کہ یہ نظریہ اسلامی معاشروں سے قرآن پر اعتماد کو سلب کرتا ہے جب لوگ قرآن یعنی عظیم ترین علمی، تہذیبی، دینی اور قانونی سرچشمہ کو تحریف شدہ اور متغیر خیال کریں گے پھر اس کی کس آیت، قانون اور دستور پر بھروسہ و اعتماد کر سکتے ہیں اور کس طرح اسلامی اصول اور دینی اعتقاد کے پابند رہ سکتے ہیں، ساتھ ہی ایک مسلمان مختلف معاشروں میں کس طرح اپنے وجود کا اظہار کر سکتا ہے اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دے سکتا ہے اور لوگ اسلام کی طرف بلانے والوں کی دعوت کو کیونکر قبول کریں گے۔

جی ہاں! یہ بھی عیسائیوں کے جرائم میں سے ہے کہ اپنے شیطانی مقاصد اور گھناؤنے اغراض یعنی اسلام و قرآن کو رسوا اور گمنام کرنے کے لئے کسی بھی طرح کی تہمت و بدگوئی جھوٹے پروپیگنڈوں اور حیل و فریب میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے پیغمبر اسلامؐ جیسی اعلیٰ و باعظمت شخصیت پر دسیوں بزدلانہ تہمتیں نہیں لگائیں۔ یہ بھی ان کے جھوٹ کی پوٹ اور منحوس جعلیات میں سے ہے کہ قرآن کو ان کی معاشروں

---

[1] مرحوم علامہ شہید قاضی تبریزی کتاب "الانوار النعمانیۃ" ج ۲ ص ۳۶۴ کے حاشیہ پر تحریف قرآن کے موضوع پر محدث نوری کی کتاب "فصل الخطاب" کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں: "کہا جاتا ہے کہ بعض دین و مذہب کے دشمنوں نے ان کو اس کتاب کی تالیف پر ابھارا اور خود ان کے باطل ارادوں کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: اس کتاب کے سلسلہ میں شیخ الشریعہ اصفہانی کا ردعمل ہمارے خیال کی مکمل تائید کرتا ہے۔ شیخ الشریعہ کے بعض شاگردوں نے کہا ہے کہ: جب بھی اس عظیم محقق کی نگاہ کتاب "فصل الخطاب" پر پڑتی تھی فرماتے تھے: کاش اس کے مؤلف کا قلم ٹوٹ جاتا اور یہ کتاب تالیف نہ ہو پاتی۔"

کی نگاہ سے گرانے اور مسلمانوں کے دلوں نیز ان کے خیالات کو قرآن سے پھیرنے نیز قرآن اور مسلمانوں کے درمیان شگاف پیدا کرنے کے لئے اس طرح کی تہمتوں اور ناروا الزامات کا سہارا لیتے ہیں۔

استعماری عوامل نے اسلام کو نابود کرنے کے لئے جعل و فریب، جھوٹ اور تہمت سے اس قدر کام لیا ہے اور اس پر اس طرح حملہ آور ہوئے ہیں کہ کسی دین کے مخالف اس دین پر یوں حملہ آور نہیں ہوئے وہ روشن و تابناک کتاب جو حضرت محمد صلی اللہ و آلہ کا دائمی و ابدی معجزہ ہے، اسے تغیر یافتہ اور محو بتش شدہ ظاہر کرتے ہیں تاکہ اس طرح حضرت محمدؐ کی شخصیت، ان کے مکتب فکر، اسلام اور آنحضرتؐ کی امت کو نابود کر دیں، ورنہ بذات خود یہ نظریہ کوئی قابل توجہ مآخذ نہیں رکھتا، اور چند ضعیف روایتوں کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی تائید نہیں کرتی اور مزید یہ کہ خود ان روایات میں بھی بحث ہے کہ کہاں سے وجود میں آئیں اور کوئی ٹھیک نہیں ہے کہ یہی روایتیں استعمار اور عیسائیوں کے ذریعہ جعل ہوئی ہوں جیسا کہ عالم عارف آقا شیخ عباس تہرانی قدس سرہ نے فرمایا ہے:۔

بپورے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی روایتیں یہود و نصاریٰ کی ساختہ و پرداختہ ہیں کہ انہوں نے اسلام کی خیرہ کرنے والی عظمت اور مسلمانوں کی علمی قوت و طاقت کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسلام سے ٹکر لینے کی اس سے بہتر کوئی اور راہ نہ پائی کہ ظاہری طور پر مسلمان ہو جائیں اور اس راہ سے اپنے اسلام مخالف مقاصد پر عمل کریں ایک اہم کام جو انہوں نے اختلاف و تفرقہ پیدا کرنے کے لئے انجام دیا وہ یہی تھا کہ مختلف موضوعات خاص طور سے قرآن کریم ــ جو اسلام کا منبع اور مسلمانوں کا مرکز حیات ہے ــ کی تحریف کے سلسلہ میں روایتیں گڑھیں اور مسلمانوں کے درمیان شائع کر دیں ان زہریلے مواد کو اسلام کے جسم میں داخل کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا اور اب بھی ہے کہ جس طرح ان کی توریت و انجیل تحریف کا شکار ہو کر ناقابل اعتبار ہو گئی ہیں یوں ہی قرآن پر بھی تحریف کی تہمت لگائیں تاکہ اپنے خیال میں اسے بھی ناقابل اعتبار بنا دیں۔[1] بہت سے علماء اور صاحبان قلم نے اس مسئلہ کا جواب دیا ہے جنھیں ہم حسب ذیل ذکر کرتے ہیں:۔

"تفسیر تبیان" از شیخ طوسی، "تفسیر مجمع البیان" از امین الاسلام طبرسی، ج ۱ ص ۱۵، اعتقادات شیخ صدوق، "تفسیر صافی" ج ۱/ ص ۱۵، "برہان روشن" از میرزا مہدی بروجردی "آلاء الرحمٰن فی الرد

[1] دین و وجدان، ص ۳۲۵

علی التحریف" از عبدالرحیم تبریزی، "النقد اللطیف فی نفی التحریف" از شیخ آقا بزرگ تہرانی ،
سعد السعود ص۱۲۲ - ۱۲۵، ۱۹۲ - ۱۹۳ ، مبارزہ طاغوتیان با قرآن از ص۶ اور اس کے بعد، اکذوبۃ
تحریف القرآن از رسول جعفریان (قارئین مجلہ توحید کے گذشتہ شماروں میں اس کا ترجمہ ملاحظ فرمائیں) ،
الغدیر ۳/ص۱۰۱، شناخت قرآن از جناب نجمی و جناب ہرسی از ص۱۱۴ تا ۲۲۳ ، مقدمہ تفسیر البیان ،
از آقای خوئی (اس کا ترجمہ شناخت تحریف از جناب تقی الحیدری ہندوستان میں چھپ چکا ہے)، الاشارات
فی عدم تحریف الکتاب از محمد ابراہیم اصفہانی معروف بہ کلباسی ، افسانہ تحریف از مہدوی، تنزیہ التنزیل
از سید ہبۃ الدین شہرستانی (اس کا فارسی ترجمہ بھی موجود ہے) ، رسالۃ شریفہ فی حفظ الکتاب
الشریف عن شبہۃ القول بالتحریف از میرزا محمد حسین شہرستانی حائری متوفی ۱۳۱۵ھ
کشف الارتیاب عن تحریف کتاب رب الارباب از شیخ محمود معروف بہ معرب
(مذکورہ بالا دونوں کتابیں کتاب "فصل الخطاب" کے جواب میں لکھی گئی ہیں)
التحقیق فی نفی التحریف عن القرآن الشریف از سید علی میلانی دار القرآن الکریم - قم
صیانۃ القرآن من التحریف از محمد ہادی دار القرآن الکریم - قم

محمد محمد المدنی مشہور مصری دانشور اور الازہر یونیورسٹی کے شریعت کالج کے انچارج اور مجلہ "رسالۃ الاسلام" کے مدیر اعلیٰ مذکورہ مجلہ کے گیارھویں سال کے چالیسویں شمارہ میں جامعہ الازہر کے سربراہ شیخ محمد شلتوت کے شیعہ امامیہ مذہب کی پیروی سے متعلق تاریخی فتوے کی روشنی میں "ایک اسلامی مذہب" کے عنوان سے مقالہ تحریر کرتے ہیں اور اس میں شیعہ امامیہ عقائد کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اب رہی شیعہ امامیہ کی طرف تحریفِ قرآن کی نسبت تو یہ کہنا پڑے گا کہ امامیہ نقص و تحریف قرآن کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ ہاں اس بارے میں ان کی کتابوں میں روایتیں ملتی ہیں بالکل یوں ہی جیسے ہماری کتابوں میں بھی اس طرح کی روایتیں موجود ہیں۔

لیکن شیعہ و سنی محقق علماء نے ان روایات کے باطل ہونے کو واضح کیا ہے۔ شیعہ امامیہ اور زیدیہ میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ان روایات پر اعتقاد رکھتا ہو جس طرح سے سنیوں کے درمیان بھی کوئی اس موضوع کا معتقد نہیں ہے۔ جو شخص اہل سنت کی کتابوں میں

اس طرح کی روایات کے بارے میں جاننا چاہتا ہے وہ کتاب "اتقان سیوطی" کی طرف رجوع کرے۔[1]

ایک مصری نے ۱۹۴۸ء میں "فرقان" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے اور اس نے تحریف قرآن کے موضوع پر سنّی مدارک سے بہت سی روایتیں اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ یہ روایتیں ضعیف ہیں اور اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ پھر کیا ہم اہل سنت اگر یہ دیکھیں کہ ایک سنی نے تحریف قرآن کے موضوع پر کتاب تالیف کی یا روایت نقل کی ہے تو کیا ہم مجموعی طور سے تمام سنیوں کی طرف یہ نسبت دے سکتے ہیں کہ سنی نقص و تحریف قرآن کے قائل ہیں؟ ہرگز نہیں! علامۂ بزرگوار فضل بن حسن طبرسی جو چھٹی صدی ہجری کے عظیم الشیعہ علماء میں سے ہیں، اپنی کتاب "مجمع البیان" میں تحریف قرآن سے متعلق روایات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ہمارے بعض افراد اور کثیر سنیوں کی ایک جماعت نے یہ گمان کیا ہے کہ قرآن میں نقص و تحریف ہوئی ہے لیکن ہمارے علماء کا یہ نظریہ ہرگز نہیں ہے، چنانچہ سید مرتضیٰ نے اس سلسلہ میں تفصیل سے تحقیق کی ہے ....[2]"

"د" - عزیز مصر کی زوجہ زلیخا نے حضرت یوسفؑ سے اپنے عشق کی دردناک شکست کے بعد ان پر دست درازی کا الزام لگایا فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ سات طرح کے لوگوں نے جناب یوسفؑ پر وارد ہونے والی اس تہمت سے ان کے بری ہونے کی گواہی دی ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ خود حضرت یوسفؑ جو فرماتے ہیں: هي راودتني عن نفسي (یوسف/۲۶) اس نے خود مجھ سے میری آرزو کی تھی۔ اور پھر فرماتے ہیں: رب السّجن احبّ اليّ ممّا تدعونني اليه' (آیت/۳۳)۔ "میرے پالنے والے! یہ عورتیں مجھے جس بات کی خواہش کر رہی ہیں اس سے مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے۔"

۲۔ عزیز مصر کی زوجہ (راعیل، معروف بہ زلیخا) جس نے کہا: "و لقد راودتّه من نفسه فاستعصم" "قالت... الآن حصحص الحقّ انا راودتّه عن نفسه" (آیت/۳۲ و ۵۱) ملّا شبہ

---

[1] نیز اس کتاب کے جزء دوم کا ص۲۰ بھی ملاحظہ فرمائیں۔
[2] مجلہ مکتب اسلام شمارہ ۶، سال دوم ص۲، مفاخر اسلام ج ۳ / ۲۳ - ۳۳۰

میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا لیکن "وہ بچا رہا اور پھر اس نے کہا اب حق بات سب پر کھل گئی ہے، میں نے خود اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا تھا۔

۳۔ مصر کی عورتیں، جن کی گواہی قرآن میں یوں ذکر ہوئی ہے: امرأۃ العزیز تراود فتٰها عن نفسہ قد شغفها حبا انا لنرٰها فی ضلٰل مبین (آیت/۳۰) عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ غلام نے اسے الفت میں لبھا لیا ہے یقیناً ہم لوگ اسے کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

۴۔ عزیز مصر، کہ قرآن اس کی زبانی فرماتا ہے: انہ من کیدکن ان کیدکن عظیم (آیت/۲۸) یقیناً یہ تم لوگوں کا مکر ہے اور بلاشبہ تم لوگوں کا مکر بہت غضب کا ہوتا ہے۔

۵۔ عزیز مصر کے دربار کے گواہ، قرآن کی زبانی: وشہد شاہد من اہلہا (آیت/۲۶) زلیخا کے خاندان والوں میں سے ایک نے گواہی دی۔

۶۔ پروردگار عالم کی گواہی کہ ارشاد ہوتا ہے: کذٰلک لنصرف عنہ السوء والفحشاء انہ من عبادنا المخلصین" (آیت/۲۴) (ہم نے اس کو یوں بچایا) تاکہ اس سے برائی اور بدکاری کو دور رکھیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

۷۔ خداوند عالم کے مخلص بندوں کو گمراہ کرنے سے شیطان کا عاجزانہ اقرار، قرآن کریم اس کی زبانی ارشاد فرماتا ہے: فبعزتک لاغوینهم اجمعین الا عبادک منهم المخلصین" تیری عزت کی قسم میں تمام لوگوں کو گمراہ کروں گا، سوائے ان افراد کے جو تیرے مخلص بندے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مذکورہ بالا آیت میں خداوند عالم نے حضرت یوسفؑ کی" انہ من عبادنا المخلصین" کے عنوان سے تعریف کی ہے۔

لیکن ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ ج ا ص۲۲۹ سے ۲۳۷ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں ایسی خرافات اور بیہودہ باتیں کہی ہیں جن کی رکاکت کے سبب ہم ان کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں۔

۸۔ "قارون نے جناب موسیٰ کو رسوا اور بدنام کرنے کے لئے ایک فاحشہ و بدکار عورت کی خدمات حاصل کیں اور اسے آمادہ کیا کہ جب موسیٰؑ لوگوں کی نصیحت و ہدایت میں مشغول ہوں اس وقت لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر ان پر بدکاری کا الزام لگائے۔ قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے:۔

"یا ایہا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرّاہ اللہ مما قالوا و کان عند اللہ وجیہاً" (احزاب/۶۹)

اے ایمان والو دیکھو، تم بھی ان لوگوں میں نہ ہوجانا جنھوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی تو خدا نے ان کی تہمتوں سے موسیٰؑ کو بری کر دیا اور وہ خدا کے نزدیک وجیہ پیغمبر تھے۔

قارون کے علاوہ بنی اسرائیل بھی جناب موسیٰؑ پر مختلف تہمتیں لگانے میں پیچھے نہ رہے۔ وہ آپ کو کبھی عنین کبھی نامرد کی تہمت لگاتے تھے اور چونکہ جناب موسیٰؑ لوگوں کے سامنے غسل نہیں فرماتے تھے لہذا انھیں جسمانی امراض سے متہم کرتے تھے اور کبھی انھیں اپنے بھائی ہارون کا قاتل کہتے تھے، یہاں تک کہ خداوند عالم نے غسل کے وقت ان کے جسم کو ظاہر کر دیا اور ہارونؑ کو موت کے بعد زندہ کیا انہوں نے اپنی طبیعی موت کا اقرار کیا۔ اس طرح خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو ان تہمتوں سے نجات عطا فرمائی۔[1]

س: یہودی اور عیسائی دونوں توحید کے عظیم علمبردار جناب ابراہیم کو اپنے دین کے تابع سمجھتے۔ اور ان پر یہودی یا عیسائی ہونے کی تہمت لگاتے تھے۔ خدا نے ان دونوں کے جھوٹے دعوؤں پر تکذیب کی مہر لگادی اور فرمایا:-

ماکان ابراھیم یھودیاً ولا نصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً (آل عمران/۶۷)

ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ سیدھے راستہ پر چلنے والے مسلم (فرمانبردار) بندہ تھے۔

اہل سنت کے مشہور مؤرخ طبری نے بھی ابوالانبیاء جناب ابراہیمؑ پر جھوٹ بولنے کی تہمت روا رکھی ہے اور اپنی تاریخ ج ۱، ص ۱۴۳ پر لکھتا ہے: "ابراہیمؑ تین مقام پر جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں"!

ص: شیخ الانبیاء حضرت نوحؑ جنھوں نے نو سو پچاس سال تک اپنی قوم میں ہدایت کا فریضہ انجام دیا، انھیں دیوانہ کہا گیا، خداوند عالم نے ایک آیت کے ذریعہ اس تہمت کو جناب نوحؑ کے دامن سے پاک کیا اور فرمایا:-

کذبت قبلھم قوم نوح فکذبوا عبدنا وقالوا مجنون وازدجر (القمر/۹)

ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی جھٹلایا تھا پس انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے اور انھیں جھڑکیاں بھی دی گئیں۔

---

[1] روان جاویدہ ج ۸ ص ۳۴۳، کشف الاسرار وعدۃ الابرار ج ۸، ص ۶۲-۶۱

جناب نوحؑ کی قوم کے اشراف اور بڑے لوگوں نے ان کی آسمانی دعوت کو جھٹلایا اور ان پہ گمراہی کا الزام لگایا :-

قال الملاء من قومہ انا لنراك فی ضلال مبین (اعراف/ ۶۰)

بلاشبہ اپنی قوم کے درمیان جناب نوحؑ کی ہدایت و دعوت کی راہ میں اس قدر سستی کہ سالہا سال کے بعد گنتی کے چند لوگ آپ کے دین پر ایمان لائے ، اس کا سبب ان کے خلاف یہی ماحول اور ناروا تہمتیں تھیں جو قوم کے سرکردہ افراد کی طرف سے ان پر لگائی جاتی تھیں ۔

ط ۔ اسی طرح جناب ہودؑ کی قوم کے رؤسا اور اونچے طبقہ کے لوگ جو ان کی رسالت کے منکر تھے ان پر بے عقلی اور جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے تھے :-

قال الملاء الذین کفروا من قومہ انا لنریك فی سفاهة وانا لنظنك من الکاذبین (اعراف/ ۶۶)

ع ۔ خدا کی طرف سے معین شدہ مصائب و ابتلاء کے مقابل جناب ایوبؑ کا صبر و تحمل تاریخ میں مشہور ہے لیکن ان کے بعض ماننے والوں نے ان پر خدا کی نافرمانی اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کا الزام لگایا خداوند عالم نے انھیں اس تہمت سے نجات عطا فرمائی اور اپنی نعمتیں دوبارہ ان پر نازل فرمائیں ۔

علامۂ جلیل سید مرتضیٰ علم الھدیٰ نے کتاب " تنزیہ الانبیاء " میں دشمنان خدا کی طرف انبیاء پر وارد ہونے والی ناروا تہمتوں کو رد کیا ہے اور جناب ایوبؑ کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں : بعض مفسرین کی طرف سے ان کے بارہ میں جو روایت کی گئی ہے اس پر کان نہیں دھرنا چاہئے کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ خدا اور ان کے پیغمبروں پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے ہیں اور ہر خطا ان کے لئے ثابت کرتے ہیں ۔ انہوں نے جناب ایوبؑ کے بارہ میں ایسی باتیں روایت کی ہیں کہ اک ذرا سی توجہ سے ان کا جعلی ہونا واضح ہو جاتا ہے ۔

یہ ہیں وہ تہمتیں جو مخالفین انبیاء نے جنھیں قرآن : مترف ، ملاء ، جبّار وغیرہ جیسے عنوانات سے یاد کرتا ہے ، انبیاء پر وارد کی ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور سحر و جنون یعنی جادوگر اور دیوانہ کی تہمت ہے ۔ اکثر و بیشتر انبیاء اس کانٹ نہ بنے ہیں چنانچہ قرآن کریم اس

میں فرماتا ہے :-

كذالك ما اتى الذين من قبلهم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون (الذاریات / ۵۲)

یعنی : اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں کے پاس جب بھی کوئی رسول آتا تو وہ اسے یا جادوگر کہتے یا دیوانہ ۔

انبیاء کرام کی پاکیزہ و مقدس ذات پر اس طرح کے اتہامات لگانے سے مخالفین کا مقصد لوگوں کے دلوں میں ان کے گہرے اثر و رسوخ کو روکنا تھا کہ معمولاً صحیح و پائدار باتوں اور جھنجوڑنے والے معجزات کے مقابل انھیں تہمت لگانے کے علاوہ کوئی اور راہ نظر نہ آتی تھی ۔

ف ۔ یہاں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد اطہار علیہم السلام سے متعلق ایک تاریخی نمونہ ملاحظہ فرمائیں[1] :-

روایت ہے کہ معاویہ شام کے چھوٹے بچوں کو بکری کے بچے ہدیہ کرتا تھا اور جب وہ بچے بکری کے ان بچوں سے پوری طرح ہل مل جاتے تو انھیں چرا لینے کا حکم دیتا تھا۔ جب لڑکے بکری کے بچوں کو نہ پاتے تو پورے غم و اضطراب کے ساتھ اپنے ماں باپ اور دوسروں سے پوچھتے تھے میرا بکری کا بچہ کیا ہوا ؟ اس وقت ان سے کہا جاتا تھا، علیؑ نے (معاذ اللہ) انھیں چرا لیا ہے ۔ اس دردناک تہمت کے ذریعہ حضرتؑ کی دشمنی و عداوت کا بیج شام کے نونہالوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا ۔

اور خوارج نے جو سادہ لوح، فریب خوردہ اور مقدس نما جاہلوں کا گروہ تھا اور جن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی تعداد بھی موجود تھی، تاریخ اسلام کے سب سے پہلے مسلمان[2] حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب اور ان کے طرفداروں اور شیعوں پر کفر کی تہمت لگائی[3] ۔

---

[1] اس طرح تہمت کی دوسری مثالیں مثلاً حضرت علی علیہ السلام کا حضرت فاطمہ علیہا السلام کی حیات میں ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنا اور پیغمبر کا مخالفت کرنا نقل کرتے ہیں کہ کتاب "سکینہ" دختر امام حسینؑ از علی محمد علی دخیل ص ۱۸-۱۹ پر ان کا جواب بھی مذکور ہے ۔

[2] رک ، الغدیر ، ج ۳ ص ۲۶۰ اور اس کے بعد

[3] خوارج ، نہج البلاغہ کی روشنی میں ، ج ۱ ، ص ۱۳۴ [redacted]

یہ خیانت آمیز کوششیں اگرچہ ایک خاص زمانہ تک کارگر رہیں لیکن آخر کار آفتاب امامت کی کرنوں کو روک نہ پائیں اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی حقانیت نیز ان کی فکری روش یعنی صراط مستقیم اور لعلہ اللہ کو ہمیشہ کے لئے تہمت و خیانت کے بادلوں میں چھپا نہ پائیں۔

ل۔ شیعوں کے دوسرے امام اور فرزند رسول خدا حضرت حسن بن علی علیہما السلام پر بھی کثرت ازدواج اور طلاق کے سلسلہ میں اتہام لگائے گئے کہ علماء و صاحبان قلم نے ان کے بھرپور جواب دیئے ہیں منجملہ ان کے مشہور اہل قلم باقر شریف القرشی نے اپنی قابل قدر کتاب "حیات الحسن" و معروف الحسنی در "سیرۃ الائمۃ الاثنی عشر" میں اس تہمت کے دندان شکن جوابات دیئے ہیں۔

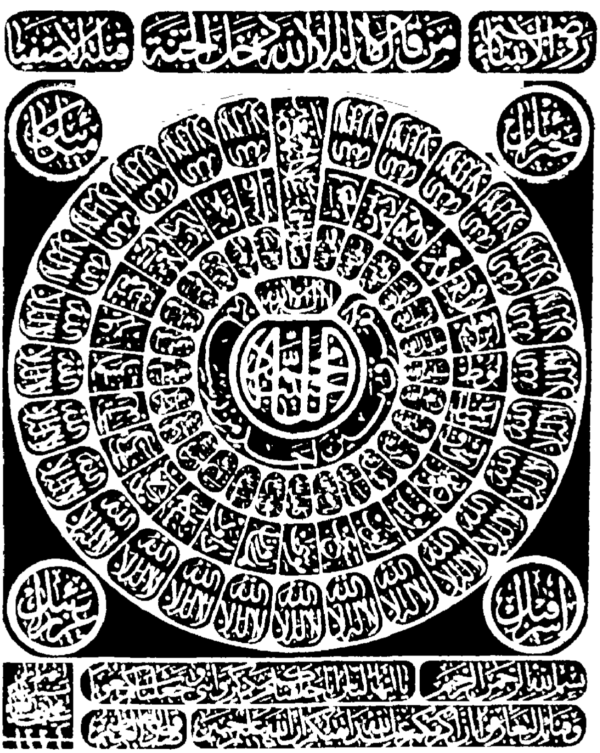
ھشام بن ابراہیم عباسی جو فضل بن سہل کی طرف سے امام رضا علیہ السلام کی نگرانی پر مامور تھا، اس نے لوگوں میں یہ افواہ پھیلا رکھی تھی کہ حضرتؑ غناء کو حلال جانتے ہیں۔ جب خود امامؑ سے اس سلسلہ میں سوال کیا گیا تو حضرتؑ نے فرمایا: "یہ کافر جھوٹ بولتا ہے" یہ افواہ مامون کے حکم سے امام رضاؑ کو (معاذ اللہ) ذلیل کرنے کے لئے لوگوں میں پھیلائی جاتی تھی۔

محمد بن نصیر نمیری ایک فاسد و منحرف شخص تھا اس نے پیغمبری کا دعویٰ کر رکھا تھا اور خود کو امام علی نقیؑ کی طرف سے جن کو اس نے خدا مشہور کر رکھا تھا، مبعوث جانتا تھا۔ "سبحانك هذا بهتان عظيم" (نور/۱۶) "سبحان اللہ! یہ بہت عظیم بہتان ہے"۔

امام علی نقیؑ کے ایک دشمن نے متوکل کی خوشنودی کے لئے حضرت پر تہمت لگائی، حضرت جو کئی مرتبہ متوکل کے حکم سے اس کے یہاں لائے گئے تھے، جب نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو اس شخص نے آپ پر ریاکاری کی تہمت لگائی۔ امامؑ نے نماز تمام کرنے کے بعد اس کی طرف رخ کر کے فرمایا: یہ تہمت جو تو نے مجھ پر لگائی ہے اگر جھوٹ ہے تو خدا تجھے ہلاک کر دے اور وہ فوراً اسی جگہ ہلاک ہو گیا۔

بعض مفسد، گمراہ اور شہرت طلب افراد کا گروہ منجملہ ان کے ابو محمد حسن شریعی، محمد بن نصیر نمیری احمد بن ہلال کرخی، محمد بن علی بن بلال، حسین بن منصور حلاج، ابن ابی العزاقر (محمد بن علی شلمغانی) اور میرزا مہر علی محمد شیرازی ان گمراہ لوگوں میں سے تھے جنھوں نے عوام کی سادگی اور عدم تشخیص سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے بابیت اور امام زمانہؑ کی نیابت کا دعویٰ کیا ان میں سے ہر ایک نے اپنی

کوششوں اور حالات کے مطابق اپنے پیرو بھی اکٹھا کر لئے تھے۔ علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی ۱۳ ویں جلد میں ان میں سے بعض کے نام ذکر کئے ہیں۔ نیز اس کے ترجمہ (مہدی موعود) ص۵۱ تا ص۵۳۹ و مفتاح باب الابواب، باب نہم میں زیر عنوان "وہ مسلمان جنھوں نے مہدویت اور عیسویت کا دعویٰ کیا" ان کا ذکر کیا ہے جن کی تعداد پچاس نفر تک پہنچتی ہے اور ص۲۶ سے ص۴۷ تک ان میں سے بعض کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ "محاکمہ در بری باب و بہاء ج ۱ ص۳۱ و ص۳۲ اور "الامام المہدیؑ من المہد الی الظہور" در فصل ۱۷ میں زیر عنوان "الذین ادّعوا المہدویۃ کذباً و زوراً او نسبت الیہم" انھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے ص۲۲۵ تا ص۲۶۲۔ نیز کتاب "طبقات المضلین" اور کتاب "مہدی انقلابی بزرگ" میں ص۲۲۵ سے "مدعیان دروغین" کے عنوان کے تحت نیز کتاب کشف الستر وجہ الغیبۃ" ص۹۵ اور "ادیان و مہدویت" ملاحظہ فرمائیں۔



رسول اسلام

روایات کے آئینہ میں

علامہ طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

غسل کے آداب

تہذیب الاحکام میں معاویہ ابن عمار سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صاع (تقریباً تین کلو) پانی سے غسل فرماتے تھے، اور اگر ان کے ساتھ ان کی ازواج میں سے کوئی ہوتا تو ایک صاع اور ایک مد (تقریباً تین پاؤ) پانی سے وہ دونوں غسل کر لیتے تھے۔[1]

اس بات کو جناب کلینی نے بھی اپنی اسناد کے ساتھ محمد ابن مسلم کے ذریعہ امام صادقؑ سے نقل کیا ہے کلینی کی روایت میں بس اتنا فرق ہے کہ دونوں ایک ہی ظرف سے غسل کرتے تھے۔[2] اسی طرح شیخ نے بھی دوسرے سلسلوں سے یہ روایت نقل کی ہے۔

جعفریات میں اپنی سند کے ساتھ امام جعفر ابن محمد باقر علیہما السلام نے اپنے پدر بزرگوار سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: حسن ابن محمد نے جابر ابن عبد اللہ سے رسول اسلامؐ کے غسل کے طریقے سے متعلق سوال کیا تو جابر نے فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلو سے تین مرتبہ اپنے سر

---

[1] تہذیب ج ۱ ص ۱۳۷، حدیث ۷۴

[2] کافی ج ۳ ص ۲۲ حدیث ۵

پانی ڈالتے تھے، حسن ابن محمد نے سوال کیا: میرا بال جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو زیادہ اور گھنا ہے (کیا اسی طرح رسول اسلامؐ کا بھی تھا) جابر نے کہا: اے عقلمند! ایسی بات نہ کہو اس لئے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بال تیرے بال سے زیادہ لمبے اور پاکیزہ تھے[1]۔

شیخ صدوق نے اپنی کتاب "ہدایہ" میں لکھا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کا غسل وہ سنت ہے جو مرد وعورت پر گھر میں یا سفر میں ضروری ہے، یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں کہ امام صادقؑ نے یہ بھی فرمایا کہ: جمعہ کا غسل بدن کی صفائی کا ذریعہ بھی ہے اور دو جمعوں کے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، اس کے بعد فرمایا: غسل جمعہ کی علت یہ تھی کہ انصار ہفتہ کے ایام میں اونٹوں کی نگہبانی نیز اپنے تمام اموال کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے جب جمعہ کا دن آتا تھا تو اسی کثیف جسم کے ساتھ مسجد میں چلے آتے تھے اور رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے زیر بغل سے اٹھنے والی بدبو سے تکلیف ہوتی تھی اسی وجہ سے آپؐ نے حکم دیا کہ جمعہ کے دن سب غسل کریں اور یہ بات خود باعث بنی کہ غسل جمعہ سنت ہو[2]۔

روایت کے مطابق آداب غسل میں رسول اسلامؐ کی سنتوں میں سے غسل عید فطر اور تمام عیدوں کے غسل بھی ہیں اور دوسرے بھی بہت سے غسل ہیں کہ اگر ممکن ہوا تو ہم ان میں سے بعض کی طرف آئندہ اشارہ کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سنن وآداب نماز

کافی میں کلینی نے اپنی اسناد کے ساتھ فضیل ابن یسار، عبد الملک اور بکیر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، آپؑ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مستحبی نمازیں اور مستحبی روزے واجبی نماز اور واجبی روزہ کی طرح انجام دیتے تھے اس بات کو شیخ نے بھی نقل کیا ہے[3]۔

کافی میں حنان سے روایت ہے کہ اس نے کہا: عمرو ابن حریث نے امام صادق علیہ السلام

---

[1] جعفریات ص ۲۲

[2] علل الشرائع ج ۱ ص ۲۸۰ ۔ ماخوذ از حاشیہ سنن النبی والھدایہ صدوق ص ۲۳

[3] کافی ج ۳ ص ۴۴۳ حدیث ۳

ے جب میں بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا، سوال کیا: آپ پر قربان جاؤں مجھکو رسولؐ خدا کی نماز کے بارے میں خبر دیں۔ حضرتؑ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ۸ رکعت نافلۂ ظہر اور ۴ رکعت ظہر، ۸ رکعت نافلۂ عصر اور ۴ رکعت عصر، ۳ رکعت نماز مغرب اور ۴ رکعت نافلۂ مغرب ۴ رکعت نماز عشاء، ۸ رکعت نافلۂ شب اور ۳ رکعت وتر، دو رکعت نافلۂ فجر اور ۲ رکعت نماز فجر پڑھتے تھے میں نے عرض کیا: قربان جاؤں اگر میں اس سے زیادہ نماز پڑھ سکوں تو کیا خداوند عالم مجھ پر زیادہ نماز پڑھنے کے سلسلہ میں عذاب کرے گا؟ فرمایا: نہیں لیکن تم پر رسول اللہ کا طریقہ وسنت ترک کرنے کے سلسلہ میں عذاب کرے گا۔ [1]

تہذیب میں اپنی اسناد کے ساتھ زرارہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو کہتے ہوئے سنا کہ: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وقت نہار سے زوال شمس تک کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ پس جب زوال ہوجاتا اور سایہ نصف انگشت کے برابر ہوجاتا ۸ رکعت نماز پڑھتے تھے، اور جب سایہ ایک ہاتھ کے برابر ہوجاتا تھا نماز ظہر پڑھتے تھے، نماز ظہر کے بعد دو رکعت اور نماز عصر سے قبل دو رکعت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ سایہ دو ہاتھ کے برابر ہوجاتا اس وقت نماز عصر پڑھتے تھے، سورج غروب ہونے کے بعد مغرب اور شفق کی سرخی غائب ہونے کے بعد نماز عشا پڑھتے تھے.... عشا کا آخری وقت شب کے تہائی حصہ تک رہتا ہے۔ عشاء کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے یہاں تک کہ نصف شب آجاتی تھی۔ اس وقت اٹھ کر ۱۳ رکعت نماز پڑھتے تھے، جس میں ایک رکعت نماز وتر اور دو رکعت نافلہ فجر ہوتی تھی، اور جب فجر طلوع ہوتی تھی اور ہوا روشن ہوجاتی تھی نماز صبح پڑھتے تھے۔ [2]

تہذیب میں ہی اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ ابن وہب سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے سنا امام جعفر صادق علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے: آنحضرتؐ (وقت خواب) پانی کا برتن ڈھانک دیتے تھے اور اپنی مسواک اپنے بستر کے نیچے رکھ کے جب تک خدا چاہتا تھا، سوتے تھے، اور جب خواب سے بیدار ہوتے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے پھر آسمان کی طرف نگاہ کرتے تھے اور سورۂ آل عمران کی یہ آیت تلاوت فرماتے

---

[1] کافی جلد ۳ ص ۴۴۳ حدیث ۵

[2] تہذیب ج ۲ ص ۲۶۲ حدیث ۸۲

تھے: "انّ فی خلق السمٰوات والارض و اختلاف اللیل والنھار... " (آیت/۱۶۴)
اس کے بعد دانتوں میں مسواک کرتے، طہارت کرتے اور مسجد میں چلے جاتے تھے اور چار رکعت نماز پڑھتے تھے کہ جس کی ہر رکعت کا رکوع اس کی قرأت کے برابر اور سجدے رکوع کے قدر اتنے طویل ہوتے تھے کہ لوگ کہتے تھے دیکھیں کب رکوع سے سر اٹھاتے ہیں اور سجدہ میں جاتے ہیں؟ اسی طرح سجدہ اتنا طولانی ہوتا تھا کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ دیکھیں کب سجدے سے سر اٹھاتا ہے؟ اس کے بعد اپنے بستر پر واپس آجاتے تھے اور جب تک خدا چاہتا سوتے تھے، پھر بیدار ہوکر بیٹھ جاتے تھے اور سورۂ آل عمران کی ان ہی آیات کی تلاوت فرماتے تھے، اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے تھے، پھر مسواک کرتے، طہارت کرتے اور مسجد میں چلے جاتے تھے، اور پہلی مرتبہ کی طرح اس دفعہ بھی ۴ رکعت نماز پڑھتے تھے اور اپنے بستر پر پلٹ آتے تھے اور جب تک خدا چاہتا آرام فرماتے تھے، پھر بیدار ہوتے، اٹھتے آسمان کی طرف نگاہ کرتے سورۂ آل عمران کی آیت تلاوت فرماتے، مسواک کرتے طہارت فرماتے اور مسجد میں چلے جاتے تھے، اور ایک رکعت نماز وتر اور دو رکعت دوسری نماز پڑھتے تھے اور پھر نماز صبح کے لئے برآمد ہوتے تھے۔[1]

روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نافلۂ صبح اول فجر کے وقت مختصر انداز میں پڑھتے اور پھر نماز صبح کے لئے برآمد ہوتے تھے۔

محاسن میں اپنی اسناد کے ساتھ عمر ابن یزید امام جعفر صادق علیہ السلام روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص نماز وتر میں ستّر مرتبہ استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ کہے اور اس عمل کو ایک سال تک متواتر پوری احتیاط کے ساتھ انجام دے خداوند عالم اس کا نام ان لوگوں کے زمرہ میں شامل کر دیتا ہے جو سحر کے وقت طلب مغفرت کرتے رہے ہیں، رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز وتر میں ستّر مرتبہ استغفار کرتے تھے اور سات مرتبہ کہتے تھے: "ھٰذا مقام العائذ بک من النار" (یہ اس شخص کا مقام ہے جو آتش دوزخ سے تیری پناہ میں آگیا ہے) تا آخر۔[2]

"من لا یحضرہ الفقیہ" میں ہے: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز وتر کے قنوت میں فرماتے تھے: اللّٰھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت و تولنی فیمن تولیت

[1] تہذیب ج ۲ ص ۳۳۷ حدیث ۲۳۳ [2] محاسن برقی ص ۵۳ باب ۶۲ حدیث ۸۰

وبارک لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت انک تقضی ولا یقضی علیک سبحانک رب البیت، استغفرک واتوب الیک واومن بک واتوکل علیک ولا حول ولا قوۃ الا بک یا رحیم۔

پروردگارا! ہدایت کر ان کے ساتھ جن کی تونے ہدایت کی ہے ہدایت فرما اور جن کو عافیت بخشی ہے ان کے ساتھ عافیت عطا کر، اور جن کے امور تونے خود اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں ان کے ساتھ ہمارے امور بھی اپنے ہاتھ میں لے لے، جو کچھ مجھکو دیا ہے اس میں برکت پیدا کر دے۔ مجھ کو اس قضا و قدر کے شر سے جو مقرر کئے ہیں محفوظ رکھ، کیونکہ تو ہی ہے جس کے ہاتھ میں فیصلے ہیں اور تو ہی حکم کرنے والا ہے اور کوئی تیرے خلاف حکم کرنے والا نہیں ہے۔ اے رب البیت تیری ذات ہر عیب سے منزہ ہے تجھ سے طلب مغفرت کرتا ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں، تجھ پر ایمان لاتا ہوں اور تجھ پر ہی توکل کرتا ہوں، اور کوئی طاقت و قوت نہیں ہے مگر اے خدائے مہربان جو کچھ ہے تیری ہی طرف سے ہے۔[1]

کتاب تہذیب میں اپنی اسناد کے ساتھ ابی خدیجہ سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بھی رمضان آتا تھا اپنی نمازوں میں اضافہ کر دیتے تھے، میں بھی اس میں اضافہ کرتا ہوں تم بھی اس ماہ میں نمازیں زیادہ پڑھا کرو۔[2] نمازیں اضافہ سے مقصد ماہ رمضان سے مخصوص ایک ہزار رکعت نافلہ کی نمازیں ہیں جو روز و شب کے نوافل کی پچاس رکعت نمازوں سے الگ ہیں، اس ہزار رکعت نماز کو رمضان المبارک کی تمام شبوں میں تقسیم کرنے کے طریقے سے متعلق بہت سی روایتیں وارد ہیں۔ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے وسیلہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم یہ نمازیں جماعت کے بغیر پڑھتے تھے بلکہ یہ نماز جماعت سے ادا کرنے کو آپ نے منع فرمایا تھا آپ فرماتے تھے کہ نافلہ میں جماعت نہیں ہے، آنحضرتؐ کے لئے دوسری بھی مخصوص نمازیں ملتی ہیں جو دعا کی کتابوں میں آنحضرتؐ سے منقول ہیں، اور چونکہ ہمارے موضوع بیان سے خارج ہیں اس لئے ہم نے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔ اسی طرح آپ کی نمازوں میں مستحبات، دعائیں اور اوراد بھی ہیں جن سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے متعلقہ کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۲۰۸ حدیث ۱

[2] تہذیب جلد ۳ ص ۶۰ حدیث ۷

کافی میں اپنی اسناد کے ساتھ یزید ابن خلیفہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی، عمر ابن حنظلہ اوقات نماز کے بارے میں ہمارے لئے آپ کی طرف سے کچھ مطالب نقل کرتے ہیں، حضرت نے فرمایا: جو کچھ وہ کہتے ہیں (صحیح) وہ ہم پر جھوٹ نہیں باندھتے، میں نے عرض کی، وہ کہتے ہیں: مغرب کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب سورج چھپ جائے، یاد رہے کہ رسول خدا صلعم مسافرت کے دوران جب تیزی کے ساتھ راہ طے کر رہے ہوتے تھے نماز مغرب میں تاخیر کر دیتے تھے اور اس کو نماز عشا کے ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔ امامؑ نے فرمایا: عمر ابن حنظلہ نے درست کہا ہے۔[1]

تہذیب میں اپنی اسناد کے ساتھ طلحہ ابن زید امام جعفر صادق سے اور وہ اپنے پدر بزرگوار سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن شبوں میں پانی برستا تھا نماز مغرب کو مختصر کر دیتے تھے اور عشا کے پڑھنے میں بھی عجلت سے کام لیتے تھے، اور اسے فضیلت کے وقت سے پہلے ہی مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے: جو شخص عوام پر رحم نہ کرے اس کے حق میں رحم نہیں کیا جاتا۔[2]

تہذیب میں ہی اپنی اسناد کے ساتھ ابن ابی عمیر سے اور وہ حماد سے اور وہ حلبی سے اور وہ امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) جس وقت سفر میں ہوتے یا اسی طرح جب کوئی فوری کام ہوتا تو ظہر و عصر کو باہم ملا کر پڑھتے تھے، اور اسی طرح مغرب و عشا کے درمیان فاصلہ قرار نہیں دیتے تھے تا آخر۔[3]

"من لا یحضرہ الفقیہ" میں اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ ابن وھب سے اور وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ ظہر کے لئے دوپہر کی گرمی میں مؤذن پیغمبر اسلامؐ کے پیچھے آتا تھا حضرت فرماتے تھے "ابرد، ابرد" جلدی کرو جلدی کرو۔[4]

کتاب احیاء العلوم میں ہے: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نماز کے دوران کبھی یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی شخص آپ کے پاس آیا ہو یا مصلے کے کنارے بیٹھا ہو اور آپ نے اس کی خاطر نماز مختصر کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو کر نہ فرمایا ہو کہ: آیا کوئی حاجت رکھتے ہو؟ اور پھر اس کی حاجت کو رفع کرنے کے بعد آپ دوبارہ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔[5]

جعفر بن احمد قمی کی تالیف کردہ کتاب "زھد النبیؐ" میں ہے کہ رسول خدا (ص) جس وقت نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے خوف خدا سے آپ کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا تھا اور آپ کے قلب و سینہ سے ایک خائف و وحشت زدہ انسان کی مانند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔[6]

---

[1] کافی جلد ۳ ص ۲۷۹ حدیث ۶ [2] تہذیب ج ۲ ص ۳۲ ح ۴۷ [3] تہذیب ج ۳ ص ۲۲۳ ح ۱۱۸

[4] من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ ص ۱۴۴ ح ۳۶ [5] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۱۳ [6] مستدرک الوسائل ج ۱ ص ۲۶۳ ح ۴

نیز صاحب احیاء العلوم فرماتے ہیں: ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول خدا (ص) جس وقت نماز پڑھتے تھے تو ایک گوشہ میں پڑے ہوئے کسی کپڑے کی مانند ہو جاتے تھے۔[۱]

بحار میں ہے کہ عائشہ کہتی ہیں: رسول خدا (ص) ہم سے اور ہم ان سے محو گفتگو ہوتے تھے لیکن جیسے ہی نماز کا وقت آتا تھا ایسی حالت ان پر طاری ہوتی تھی کہ گویا نہ وہ ہم کو پہچانتے تھے اور نہ ہم ان کو پہچانتے تھے۔[۲]

مفید الدین طوسی کتاب مجالس میں اپنی اسناد کے ساتھ جو حضرت علی (ع) پر جا کر منتہی ہوتی ہے، روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے جس وقت محمد ابن ابی بکر کو مصر کا والی (گورنر) مقرر کیا ہے ان کو ایک دستور العمل مرحمت فرمایا تھا جس کے ضمن میں تحریر فرمایا تھا: اپنے رکوع و سجود کی طرف سے خبردار رہنا، کیونکہ رسول خدا (ص) کی نماز تمام لوگوں سے زیادہ کامل ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی نماز کے اعمال (وارکان) سب سے زیادہ سبک و مختصر ہوتے تھے۔[۳]" (یعنی طولانی نماز نہیں پڑھاتے تھے)

جعفریات میں اپنی اسناد کے ساتھ امام جعفر ابن محمد علیہما السلام اپنے آبائے طاہرین سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جس وقت بھی رسول خدا صلعم کو جماہی آتی تھی آپ اپنا داہنا ہاتھ دہن مبارک پر رکھ لیتے تھے۔[۴] کتاب دعائم میں بھی اسی قسم کی روایت نقل ہوئی ہے۔

علل الشرائع میں اپنی اسناد کے ساتھ ہشام ابن حکم سے اور انہوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ایک حدیث نقل کی ہے جس کے ضمن میں ہشام کہتے ہیں: میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کی، اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم رکوع میں "سبحان ربی العظیم وبحمدہ" لیکن سجدے میں "سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ" کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اے ہشام! جس وقت رسول خدا صلعم کو معراج کی منزلوں میں لے جایا گیا اور آپ نے وہاں نماز پڑھی اور ذکر کرنا شروع کیا، اور عظمت خداوندی کا مشاہدہ فرمایا، تو ان چیزوں کو دیکھ کر آپ کے جسم مبارک کے بند بند کانپنے لگے اور آپ بے اختیار رکوع میں جھک گئے اور اس وقت آپ کی زبان پر "سبحان ربی العظیم وبحمدہ" جاری ہوا، جب یہ کیفیت ختم ہوئی اور رکوع سے بلند ہوئے تو آپ کی نظروں نے خدائے عظیم کے اس مقام عظمت و بلندی کا مشاہدہ کیا جس سے بلند تر مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو بے اختیار آپ نے اپنی پیشانی خاک پر رکھ دی اور کہا "سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ" اور اسی طرح اس ورد کی تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ جب سات مرتبہ یہ ذکر دہرا چکے تو آپ کے دل پر جو رعب طاری تھا اس میں کچھ کمی ہوئی اسی وجہ سے آپکی امت پر بھی یہ دونوں ذکر سنت قرار دیئے گئے۔[۵]

۱؎ مستدرک ج ۱ ص ۳۶۲ اور حاشیہ سنن النبی کتاب زہد النبی ص ۱۶۱ ۔ ۲؎ مستدرک ج ۱ ص ۲۶۴ حدیث ۱۸ ۳؎ امالی مفید ص ۱۵۶

۴؎ کتاب جعفریات ص ۳۶ ۵؎ علل الشرائع جلد ۲ ص ۳۳۲ حدیث ۴

شیخ ورام ابن ابی فراس کی کتاب "تنبیہ الخواطر" میں نعمان سے روایت ہے وہ کہتے ہیں، رسول خدا ص ہمیشہ ہماری نماز کی صفیں اسی طرح منظم و مرتب کرتے تھے کہ اگر درمیان سے تیر رہا کیا جاتا تو اس کا فاصلہ یہاں سے وہاں تک یکساں ہوتا بعد میں رفتہ رفتہ سب اس کے عادی ہو گئے اتفاقاً ایک روز حضور صلعم مسجد میں تشریف لائے اور نماز کے لئے کھڑے ہوئے تکبیرۃ الاحرام کہنا ہی چاہتے تھے کہ متوجہ ہوئے ایک شخص کا سینہ تمام لوگوں سے آگے نکلا ہوا ہے، آپ نے فرمایا بندگانِ خدا کے بندو! اپنی صفیں مرتب کرو ورنہ تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے گا[1]

نیز اسی کتاب میں ابن مسعود سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: رسول خدا (ص) ہمارے شانوں پر ہاتھ رکھتے اور ہم کو آگے پیچھے کر کے برابر کرتے تھے اور فرماتے تھے: منظم انداز میں کھڑے ہو ورنہ اگر کھڑے ہونے میں اختلاف ہو گا تو تمہارے دلوں میں بھی اختلاف پیدا ہو جائے گا تا آخر۔[2]

من لایحضرہ الفقیہ میں اپنی اسناد کے ساتھ داؤد ابن حصین، ابی العباس سے اور وہ امام جعفر صادق ؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ؑ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) ماہ رمضان کی پہلی دہائی میں معتکف ہوتے اگلے سال رمضان المبارک کی دوسری دہائی میں اعتکاف کیا لیکن اس کے بعد ہمیشہ رمضان کی آخری دہائی میں معتکف ہوا کرتے تھے۔[3]

اسی من لایحضرہ الفقیہ میں امام صادق ؑ سے ہی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جنگ بدر ماہ رمضان المبارک میں واقع ہوئی اس سال رسول خدا صلعم نے اعتکاف نہ کیا جب اگلے سال رمضان آیا تو آنحضور ؐ نے دو دہائیوں میں اعتکاف کیا ایک اعتکاف اسی سال کے لئے اور ایک گزشتہ سال کی قضا کے طور پر۔[4]

کلینی نے بھی یہ روایت کافی میں نقل فرمائی ہے[5]

نیز کافی میں اپنی اسناد کے ساتھ حلبی نے ابی عبداللہ امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ وآلہ) جس وقت (ماہ رمضان المبارک کی) آخری دہائی آتی تھی مسجد میں اعتکاف کرتے تھے، آپ کے لئے بال سے تیار کردہ ایک خیمہ نصب کر دیا جاتا تھا اور ان ایام میں بستر اور لحاف لپیٹ دیا جاتا تھا آپ کے بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ حضور اپنی ازواج سے بھی کنارہ گیری اختیار کر لیتے تھے لیکن امام صادق ؑ نے فرمایا: یہ بات صحیح نہیں ہے آپ ازواج سے کنارہ گیری نہیں فرماتے تھے۔[6]

---

[1] تنبیہ الخواطر ج ۲ ص ۹۱۴ [2] ایضاً ج ۲ ص ۴۹۰ [3] من لایحضرہ الفقیہ ج ۲ ص ۱۲۳ حدیث ۲۰
[4] ایضاً ص ۱۲۰ حدیث ۳ [5] کافی ج ۴ ص ۱۷۵ حدیث ۲ [6] ایضاً ص ۱۷۵ حدیث ۱

تاریخ طبری میں اسرائیلیات

جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

مکہ مکرمہ میں پیغمبر اسلامؐ کی بعثت، اسلام کے ظہور اور عوام کے درمیان تیزی کے ساتھ اس کے نفوذ اور مقبولیت نے ان لوگوں کے لئے جو ظہور اسلام سے قبل اپنے سلسلہ میں جھوٹے امتیازات کے قائل تھے، بڑی ہی تلخ یادیں چھوڑیں۔ کیونکہ اسلام کے ظہور اور وسعت نے ان سے ان کے خود ساختہ امتیازات سلب کر لئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کے وجود میں کینہ و حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس آگ نے ان کو اسلام کے خلاف سازش اور حیلہ گری پر آمادہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی پوری قوت و طاقت اسلام کی جڑیں کھودنے، اس کی تعلیمات میں تحریف کرنے اور اس کے احکام و مفاہیم کو مسخ کرنے پر صرف کر دی اور اپنی طرف سے خیانت کی کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی۔

تبلیغات پر پابندی

وہ مسائل، جنھوں نے مخالفین اسلام کی کینہ توزی اور دشمنان اسلام کی دسیسہ کاری کے لئے راہیں ہموار کیں ان میں سے ایک وہ طریقہ تھا جو پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد اسلامی تبلیغات کی روک تھام اور کنٹرول کے لئے اپنایا گیا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد حکومت کی سیاست نے تبلیغات پر کنٹرول اور نظارت کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی تاکہ موجودہ سیاست اور سیاستمداروں کی صلاح کی خلاف حدیثیں نشر کرنے کی ہمت و جرأت ہی پیدا نہ ہو، یا یہ کہ جب کبھی صاحبان سیاست کسی فقہی یا غیر فقہی مسئلہ میں

اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کریں تو انہیں اعتراض کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور کوئی ان سے نہ کہے کہ یہ نظریہ رسول خداؐ کے فلاں قول وعمل یا فلاں دستور کے خلاف ہے۔

اسی بنا پر احادیث کی کتابت پر پابندی لگادی گئی اور جتنی حدیثیں اصحاب رسول خدا صلعم نے خود حضورؐ کے زمانۂ حیات میں لکھیں تھیں جلا دی گئیں، کسی بھی روایت کو نقل کرنے کی اسی وقت اجازت تھی جب اس کے دو گواہ موجود ہوں اور جو بھی اس کے خلاف عمل کرتا اسے سزا دی جاتی تھی۔

جی ہاں مسلمانوں پر حاکم سیاست نے اس مسئلہ پر بڑی شدت کے ساتھ عمل کیا اور مختلف شہروں میں مقیم حکومت سے وابستہ اپنے تمام افراد کو حکم دے دیا کہ خبردار رسول خداؐ کی کوئی حدیث ظاہر و افشاء نہ ہونے پائے[1] اور اس کے بعد بڑے بڑے صحابہ اور علماء مدینہ میں قید کر لیے گئے[2]

صرف حکام فتویٰ صادر کرنے کا حق رکھتے تھے ان کے علاوہ کسی کو بھی فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی[3]۔ البتہ یہ حق انھیں بھی حاصل تھا جو حکام اور فرمانرواؤں کے ہم رکاب تھے اور ان کی حکومت وسیاست کی تعریف کرتے تھے اور ان کے احکام کو بروئے کار لاتے تھے[4]

---

[1] اس طرح کے خاصے مصادر ہم نے اپنی کتاب الحیاۃ السیاسیۃ للامام الحسنؑ ص ۸۷، ۹۰ پر درج کئے ہیں، محققین اس موضوع کے ذیل میں کتاب "الصحیح من سیرۃ النبیؐ" جلد اول ص ۲۶ کا بھی مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

[2] ملاحظہ فرمائیں تاریخ الامم والملوک ۳۵ھ ہجری کے واقعات، مروج الذہب جلد ۲ ص ۳۲۰، ۳۲۲ مستدرک الحاکم جلد ۳ ص ۱۲۰ اور جلد ۱ ص ۱۱۰، کنز العمال جلد ۱۰ ص ۱۸۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷ شرح نہج البلاغہ المعتزلی الحنفی جلد ۱۲ ص ۲۰۔ شرف اصحاب الحدیث ص ۸۷، مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۴۹، الطبقات الکبریٰ ابن سعد، طالیدن، جلد ۴، ص ۱۳۵ و جلد ۲، قسم ۲ ص ۱۰۰ و ص ۱۱۲، حیاۃ الصحابہ جلد ۳ ص ۲۷۲، ۲۷۳ وغیرہ

[3] ملاحظہ فرمائیں جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۷۵ و ۲۰۳، ۱۹۴ و ۱۷۴، منتخب کنز العمال بحاشیہ مسند احمد جلد ۴ ص ۶۲، سنن الدارمی جلد ۱ ص ۶۱، التراتیب الاداریہ ج ۲ ص ۳۶۷، ۳۶۸، طبقات ابن سعد طبع لیدن جلد ۶ ص ۱۷۹، کنز العمال جلد ۱۰ ص ۱۸۵ (ابن عساکر دینوری فی المجالسہ وغیرہ سے) تہذیب تاریخ دمشق جلد ۱ ص ۵۴۔ المصنف صنعانی جلد ۸ ص ۳۰۱ اور اس کے حاشیہ میں اخبار القضاۃ، وکیع سے جلد ۱ ص ۸۳

[4] ملاحظہ فرمائیں: الصحیح فی سیرۃ النبیؐ جلد ۱ ص ۲۶

ایک دوسرا غلط کام سیاست مداروں نے یہ کیا کہ اس زمانے میں قرآن کی تفسیر اور آیات الٰہی کے معانی و مفاہیم کے استفسار کو ممنوع قرار دے دیا۔[1]

چنانچہ ابھی کچھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ اسلام سوائے نام کے اور دین سوائے ظاہری شکل کے کچھ اور نہ رہ گیا۔ جیسا کہ اس سے ملتا جلتا بیان امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے۔[2]

ابھی کچھ عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ صحابہ، جو کچھ رسول خدا صلعم کے عہد مبارک میں تھا، سوائے قبلہ اور نماز کے سب کچھ فراموش کر چکے تھے، جیسا کہ بعض نصوص میں ذکر ہوا ہے۔[3]

اہل کتاب کے علم کے مقابل عرب کی فریفتگی

تبلیغات پر پابندی کے ساتھ ہی ایک دوسرا مسئلہ جس نے دشمنوں کو اسلام کا چہرہ مسخ کرنے کا موقع فراہم کیا، صدر اول میں اہل کتاب کے علم سے عرب کا مرعوب ہو کر اس پر شیفتہ و فریفتہ ہو جانا تھا۔ کیونکہ عرب جاہلیت کے زمانہ میں علم و معرفت سے بے بہرہ و ناآشنا تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ یہودی احبار اور عیسائی راہبوں کو معرفت اور علم و دانش کا منبع و سرچشمہ خیال کرتے تھے، اور ایک شاگرد جس نظر سے استاد کو دیکھتا ہے یوں ہی عرب اہل کتاب علماء کی طرف دیکھتے تھے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے ظہور اسلام کے بعد بھی جب کہ رسول خدا صلعم ان کو کتاب و حکمت اور آیات الٰہی کی بار بار تعلیم دیتے رہتے تھے، اہل کتاب سے تحصیل کا سلسلہ ترک نہیں کیا تھا اور ان کے مدرسہ میں حاضری دیا کرتے تھے۔[4]

---

[1] الغدیر جلد ۶ ص ۲۹۰، ۲۹۳، حیاۃ الصحابہ جلد ۳ ص ۲۵۸، ۲۵۹

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ و حکمت ۳۶۹

[3] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۲۴۴، ۲۴۵، الموطأ مطبوعہ با تنویر الحوالک جلد ۱ ص ۹۳، شرح الموطأ - الزرقانی جلد ۱ ص ۲۲۱، تنویر الحوالک جلد ۱ ص ۹۳ و ص ۹۳ از الباجی، الام الشافعی جلد ۱ ص ۲۰۸، الغدیر جلد ۸ ص ۱۶۶، الزھد والرقائق ص ۶۱، کشف القناع من حجیۃ الاجماع ص ۶۴

[4] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۲۳، ص ۱۲۴ اور ملاحظہ فرمائیں، درمنثور جلد ۱ ص ۹۰ (ابن جریر نے قتادہ اور اسدی سے اور سفیان ابن عیینہ سے بھی یہ بات نقل کی ہے۔ البتہ ان کے مدارک کے نام دوسرے مصادر میں بھی ذکر ہوئے ہیں۔)

یہی ہوتا کہ ان میں سے بعض توریت کا ترجمہ کرتے اور رسول اسلامؐ کے سامنے اس کی تلاوت کرتے، اور ان کے اس عمل سے پیغمبر اسلامؐ کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا اور آپ ان سے فرماتے تھے، کیا تم کو بالکل احمق بنا دیا گیا ہے جبکہ میں تمہارے لئے "فقیۃ بیضاء" (ایک پاکیزہ و درخشندہ کتاب) لایا ہوں، خدا کی قسم اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری اطاعت کے سوا ان کے سامنے کوئی اور راہ نہ تھی"![1]

نومسلم اہل کتاب کی علمی انجمن

بہرحال یہودی اور عیسائی علماء کے ایک گروہ نے مسلمان حکمرانوں کے دربار میں خاصی اہمیت حاصل کرلی تھی اور ان کے تئیں خصوصی اہتمام برتا جاتا تھا، چنانچہ معاویہ کے زمانے میں انھوں نے اور انکے شاگردوں نے شام میں ایک علمی جماعت تشکیل دے رکھی تھی کہ منجملہ ان کے کعب الاحبار، ابوالدرداء، عبداللہ ابن عمرو ابن العاص اور ابوہریرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اس جماعت کے افراد کا کام ہی مذکورہ بالا اشخاص کے افکار و نظریات اور اسرائیلیات کی ترویج و اشاعت تھا، اور یہ لوگ یہ کام کھلی ہوئی آزادی اور اطمینان کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

خاص طور پر جب رسولؐ خدا کی حدیث نقل کرنا ممنوع تھا لیکن بنی اسرائیل سے اس طرح کی تعبیر نقل کرنا بالکل عام سی بات تھی کہ: حدثوا عن بنی اسرائیل ولاحرج ..![2] بنی اسرائیل سے روایت میں کوئی حرج نہیں ہے . . . !

---

[1] یہ حدیث مختلف مصادر میں مختلف عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے نمونہ کے طور پر ملاحظہ فرمائیں: مسند احمد جلد ۳ ص ۳۸۷، ۴۷۰، ۴۷۱ / بحار جلد ۲، ص ۳۴۷ / غریب الحدیث جلد ۴ ص ۴۸ و ۴۹ / میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۶۶۱

[2] المصنف صنعانی۔ جلد ۱۱ ص ۲۶۱ / صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب ۵۰ / مسلم الزھد ص ۷۲ / الترمذی، العلم ص ۱۳ / ابن ماجہ (مقدمہ) ص ۵ / مسند احمد جلد ۳ / وہ روایات جو اسرائیلیات کے نام سے موسوم ہیں اور جو قصہ گویوں اور داستان سراؤں کی تقویت کی طرف اشارہ کرتی ہیں ان کے لئے ملاحظہ فرمائیں: التراتیب الاداریہ جلد ۲ ص ۲۲۴، ۲۲۷، ۲۳۸، ۳۸ ۳، ۳۴۵، ۳۲۵ - ۳۲۷ / اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۱۲۴ - ۱۲۶، ۱۴۵ - ۱۹۲ / شرف اصحاب الحدیث ص ۱۴ - ۱۷ / فجر الاسلام ص ۱۵۸ - ۱۶۲ / بحوث

کچھ ہی عرصہ میں، یہودی اور عیسائی علماء، خلفا اور حکمرانوں کے مشیر و معاون بن گئے اور اس طرح وہ اپنے عقائد و آراء، سیاست، عقائد، تاریخ نیز دیگر دینی میدانوں میں نافذ کرنے اور پھیلانے میں کامیاب ہو گئے۔

چنانچہ کینہ صفت اہل کتاب جنہوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا، اور ہوس پرست پیشہ ور داستان گو افراد ــــ حتی صحابہ کے زمانہ میں ہی ــــ دینی علوم کو نابود کرنے، اسلامی حقائق میں تحریف کرنے اور اس کی تعلیمات و مفاہیم کو خراب اور بد نما ظاہر کرنے پر کمر بستہ ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت دینی حقائق و معارف کے نام پر ان مہملات اور باطل نظریات کے سوا کچھ بھی نہ جانتی تھی جن کے تانے بانے بن کر ان لوگوں نے مسلمانوں کے کان بھر دیئے تھے اور عوام کے افکار و خیالات پر قبضہ جمالیا تھا۔

صدیوں بعد حدیث کی تدوین

ایک عرصۂ دراز کے بعد کہ جس میں لوگوں کو محض کچھ مخصوص قسم کی احادیث نقل کرنے کی ہی اجازت حاصل تھی، اس ــــ دور کا خاتمہ ہوا لیکن یہ وہ وقت تھا جب تحریف پسند عناصر اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں کامیابی حاصل کر چکے تھے [1]

سیاست مداروں نے جب اپنے آپ کو آرام و آسائش میں محسوس کیا اور انھوں نے دیکھا کہ ان کے مورد نظر افکار معاشرہ میں اپنی پوری جگہ بنا چکے ہیں اور وہ مفاہیم اور طرز فکر جو ان افکار کی

← فی تاریخ السنۃ المشرفۃ ص۳۴ ــ ۳۷/ الزھد والرقائق ص۱۷، ۵۰۸/ تقیید العلم ــ ۳۲/ جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۵۰ و ۳/ مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۸۹/ المصنف صنعانی جلد ۶ ص۱۰۹، ۱۱۰ اور اس کے حاشیے/ مشکل الآثار جلد ۱ ص ۴۰، ۴۱/ البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۶ و جلد ۲ ص ۱۳۲ و ۱۳۴/ کشف الاستار جلد ۱ ص ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۰۸ و ۱۰۹/ حیاۃ الصحابہ جلد ۳ ص ۲۸۶/ مسند احمد جلد ۳ ص ۱۲، ۱۳ و ۵۶/ حق التنبیہ

[1] طبقات ابن سعد طبع صادر جلد ۲ ص ۲۳۶

حفاظت کے لئے ضروری ہیں مسلمانوں کے قلب و دماغ میں بیٹھ چکے ہیں تو انھوں نے تدوین حدیث پر عائد پابندی اٹھالی تشیع جانے کے لئے موقع مناسب جانا، یہی وجہ تھی اموی خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے میں تدوین حدیث آزاد کردی گئی [1] اور محدثین و مؤرخین حدیثیں نقل و محفوظ کرنے میں مشغول ہوگئے، اور پھر جو کچھ بھی ہاتھ آیا حق و باطل، اہم و غیر اہم کی تمیز کئے بغیر حدیث و تاریخ کے عنوان سے محفوظ کر لیا گیا۔

حفاظت اسلام میں اہل بیتؑ کا کردار

ایسے ماحول اور حالات میں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ عین اسی زمانہ میں جب اسلام کے خلاف ان تمام سازشوں، تحریفوں اور فتنہ سامانیوں کا بازار گرم تھا اسلام کی ایک حقیقی و واقعی ضمانت بھی موجود تھی جس نے دین و احکام اور اس کے بنیادی و اصولی امتیازات و خصوصیات کی حفاظت و نگہبانی کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی یہ ضمانت ائمہ اطہار علیہم السلام کی ذوات مقدسہ میں مجسم ہوئی تھی، انھیں جہاں کہیں بھی موقع ہاتھ آتا اور حالات اجازت دیتے، وہ حق کو آشکار کرتے ہوئے اسلام میں وارد ہوجانے والے (کعب الاحبار، ابن سلام اور ان کے شاگردوں جیسے) مسلمان نما اہل کتاب کے پست، ذلیل اور مردود افکار و نظریات کا پردہ چاک کرتے رہتے تھے [2]

ائمہ اطہار علیہم السلام ایسا کیوں نہ کرتے جب ان کی مثال کشتی نوحؑ کی تھی، کہ جو ان کی کشتی پر سوار ہوا اس کو نجات حاصل ہوئی اور جس نے ان سے روگردانی اختیار کی (طوفان ضلالت میں) غرق ہوگیا۔ اور پیغمبر اسلامؐ کے اعلان کے مطابق قرآن کریم اور اہل بیت ہی وہ دو ثقل ہیں کہ جس نے ان دونوں سے تمسک اختیار کیا ہرگز گمراہ نہیں ہوسکتا۔

اسرائیلی تفکر سے شیعوں کی جنگ

شیعوں نے بھی ان معصوم پیشواؤں کی پیروی کرتے ہوئے گمراہ کن اسرائیلی طرز تفکر،

---

[1] السنۃ قبل التدوین ص۳۶۴ / جامع بیان العلم و فضلہ جلد ۱ ص۷۶

[2] بحارالانوار جلد ۲۶ ص۳۵۴

اور ان کے مظاہر و آثار سے جنگ میں کھلا کردار ادا کیا ہے، اور بہ نہاد حکومت و حاکمیت کی پشت پناہی کے باوجود جس سے یہ کینہ صفت فائدہ اٹھا رہے تھے، شیعوں نے ہمیشہ اپنے کاندھوں پر ان کی مخالفت کا علم بلند رکھا۔

اس میدان میں کعب الاحبار کے خلاف جناب ابوذر کی استقامت کا ہم ذکر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے خلیفہ ثالث (عثمان) کے دربار میں کعب کو عصا مارتے ہوئے کہا تھا: "یابن الیہودیہ! تعلمنا دیننا؟"[1] اے یہودی کی اولاد! ہم کو ہمارا دین تعلیم دیتا ہے!! البتہ اس جلیل القدر صحابی کو عثمان سے اس کا بدلہ جلا وطنی اور اپنے دیار سے دربدری کے سوا کچھ نہ ملا؛ یہاں تک کہ آپ کو بے پناہ مشکلات اور بلاؤں کا سامنا کرنا پڑا اور جلا وطنی کے عالم میں اپنے وطن سے دور سرزمین "ربذہ" پر تنہائی کے عالم میں مظلومیت کے ساتھ جان دینی پڑی۔[2]

علوم حدیث ـ انحرافات کی بقا کے لئے نہ کہ ان سے بچنے کے لئے

اسلام کے سچے پیروؤں کی کوششیں اور جہاد اگرچہ اسلام کی حفاظت و نگہبانی میں مؤثر ثابت ہوئے لیکن یہ کوششیں زیادہ تر اسی گروہ تک محدود رہیں جس کی رہبری ائمہ معصومین علیہم السلام، ان کے شیعہ اور اس مکتب میں تربیت پانے والے افراد کے کاندھوں پر تھی۔ دوسرے لوگ حکام کی سیاست کی پیروی کرتے رہے اور اہل کتاب کے بہت سے دسیسہ آمیز اور تحریف شدہ مطالب ان سے حاصل کرکے اپنی کتابوں اور حدیثی و غیر حدیثی مجموعوں میں، ان سے متعلق کوئی تحقیق و جستجو اور راہ حل تلاش کئے بغیر، من و عن منتقل کرتے رہے۔ اور اگر غور و فکر سے کام لیا بھی تو بہت ہی محدود میدانوں میں، جو سطحی امور سے مربوط ہیں، اس کے علاوہ ان کی تحقیقات ایسے اصولوں اور معیاروں پر انجام پائی تھیں کہ ان سے انحرافات کو بڑھاوا ملنے اور اس کی جڑوں کو مزید تقویت پہنچنے کے علاوہ کچھ بھی

۱ـ تاریخ الامم والملوک جلد ۴ ص ۲۸۴ / مروج الذہب جلد ۲ ص ۳۴۰ / انساب الاشراف جلد ۵ ص ۵۲ / شرح نہج البلاغہ المعتزلی جلد ۳ ص ۵۴ / و جلد ۸ ص ۲۵۶

۲ـ دراسات و بحوث فی التاریخ والاسلام جلد ۱ ص ۱۱۱ - ۱۴۱

حاصل نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ اصول وضوابط ان مہملات و اباطیل کی حفاظت کی غرض سے ان ہی کے متون سے اخذ کئے گئے تھے۔

جو معیارات اور اصول وضوابط واقعی طور سے ان اباطیل کی بیخ کنی کر سکتے تھے، ان سے قطعی طور پر احتراز اور پرہیز برتا گیا یہاں تک کہ وہ احادیث جو روایات کو کتاب خدا کی روشنی میں پرکھنا اور تولنا لازم قرار دیتی تھیں دیوار پر مار دی جاتی تھیں اور ان کو زنادقہ کے ہاتھوں وضع کی جانے والی جعلی حدیثیں قرار دے دیا جاتا تھا،[1] کہا جاتا تھا کہ حدیث کتاب (خدا) کے بارہ میں فیصلہ کرتی ہے نہ کہ کتاب حدیث کے بارہ میں[2] نیز کہا جاتا تھا "کل من روی له البخاری فقد جاز القنطرة" (جو کچھ بخاری نے روایت کیا ہے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے) اور "کل فی الصحیحین فهو صحیح" (جو کچھ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے صحیح ہے) وغیرہ۔

ایک طرف تو اس قسم کے کھوکلے اصول وضوابط تھے اور دوسری جانب عقائد کی غلط بنیادیں تھیں جو ان اصول وضوابط کو جہت عطا کرنے میں مؤید و مددگار ثابت ہوتی تھیں مثال کے طور پر "حسن و قبح عقلی سے انکار، حکام کے سامنے تسلیم کورنش کا لازمی جاننا، نبوت کے بعد اجماع کی نبوت کا قائل ہونا،[3] جبر کا عقیدہ، قرآن کے قدیم ہونے کا عقیدہ وغیرہ وغیرہ۔

---

1. جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۲۳۳ / ارشاد الفحول ص ۳۳ / بحوث مع اهل السنة السلفیه ص ۶۷، ۶۸۔

2. تاویل مختلف الحدیث ص ۱۹۹ / سنن الدارمی جلد ۱ ص ۱۴۵ / مقالات الاسلامیین جلد ۲ ص ۲۲۴ تا ص ۲۵۱، جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۲۳۳ و ۲۳۴ / عون المعبود جلد ۱۲ ص ۳۵۶ اور ملاحظہ فرمائیں الکفایة فی علم الروایه۔ الخطیب۔ ص ۱۴ / لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۹۴ / میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۰۷ / دلائل النبوة۔ بیہقی۔ جلد ۱ ص ۲۶ / الجامع لاحکام القرآن جلد ۱ ص ۳۸ و ۳۹

3. "المنتظم"۔ ابن الجوزی۔ جلد ۹ ص ۲۱۰ الالمام ج ۶ ص ۱۲۶ / الاحکام فی اصول الاحکام۔ الآمدی ج ۱ ص ۲۴۷ و ۲۰۵ / بحوث مع اهل السنه والسلفیه ص ۲۷ المنتظم اور ابی الوفا سے، ابن عقیل بزرگان حنابلہ سے ہیں اس سلسلہ میں کہ جب کبھی اجماع قائم ہو جائے۔ جہاں اور جس زمانہ میں بھی ہو حجت ہے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف مراجعہ فرمائیں: الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۱ ص ۲۰۸ / تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۰۴ / النشر فی القرآت ←

تاریخ طبری اور اسرائیلیات

محمد بن جریر طبری کی تحریر کردہ کتاب "تاریخ الامم والملوک" اس طرح کی کتابوں کا ایک بہترین نمونہ ہے کہ جو اسرائیلیات اور ان مہملات و اباطیل سے بھری پڑی ہے جو اہل کتاب ہوا پرستوں اور داستان گویوں نے اختراع کئے تھے۔

تاریخ طبری کی محض پہلی جلد کا دقیق نظروں سے مطالعہ اس تلخ واقعیت کو اجاگر کرنے اور ہمارے دعوے کو قطعی شکل میں ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر ہم تفصیل کے ساتھ وارد بحث ہونا چاہتے اور صرف تاریخ طبری سے تمام مثالیں پیش کرتے تو اگر ہزاروں نہیں تو کم از کم سیکڑوں صفحات میں خود کو گھرا ہوا پاتے لہٰذا ہم نے محض چند مثالیں بیان کرنے پر اکتفا کی ہے کہ جو بات ہم نے کہی ہے اس کے واضح نمونے آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمالیں۔

ذبیح کون؟ حضرت اسمٰعیلؑ یا حضرت اسحاقؑ

طبری کہتا ہے:

"ہر دو قول پیغمبر اسلامؐ سے روایت ہوئے ہیں اور اگر ان دونوں قولوں میں سے ایک صحیح ہوتا تو ہم اس سے آگے نہ بڑھتے اور دوسرا قول نقل نہ کرتے، جی ہاں یہ نکتہ کی بات ہے کہ اسحاق کے ذبیح ہونے کی روایت کے صحیح ہونے پر قرآنی دلیل دوسری روایت کے مقابل زیادہ روشن طور پر دلالت کرتی ہے[۱]"

اس کے بعد طبری نے وہ روایتیں نقل کی ہیں جن میں جناب اسمٰعیلؑ کو ذبیح بتایا گیا ہے یہ روایتیں ابن عمر، الشعبی، یونس ابن مہران، مجاہد، الحسن، محمد ابن کعب القرظی، ابن عباس

← العشو جلد ۱ ص ۷، ۳۳۰، ۳۱۱ / نیز اصول فقہ کی دوسری کتابیں جن میں اہل سنت کے نقطۂ نظر سے اجماع کی حجیت پر بحث کی گئی ہے۔

[۱] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۲۶۳

اور معاویہ سے نقل کی گئی ہیں۔ اور جن لوگوں نے ابن عباس سے جناب اسمٰعیل کا ذبیح ہونا نقل کیا ہے ان کے نام یہ ہیں ـــ سعید ابن جبیر، الشعبی، یونس ابن مہران، ابو الطفیل، مجاہد اور عطاء ابن ابی رباح۔
اس کے بعد طبری نے وہ روایتیں نقل کی ہیں جن میں جناب اسحٰق کا ذبیح ہونا ذکر ہے، اور ان روایتوں کے ناقل عباس ابن عبد المطلب، ابن مسعود، عبید ابن عمیر، ابن سابط، ابن ابی الهذیل، ابی میسرہ، مسروق، ابن عباس اور کعب الاحبار، ابن عباس سے یہ روایت نقل کرنے والے عکرمہ، ابو مالک اور ابو صالح ہیں۔[۲]

اس کے بعد طبری کہتا ہے: "لیکن جو چیز قرآن میں اسحٰق سے متعلق روایت کے زیادہ صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ آیت ہے جس میں قوم والوں سے جدا ہو کر اپنی بیوی سارہ کے ساتھ شام کی طرف ہجرت اختیار کرتے وقت خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا ذکر ہے کہ:۔

انی ذاهب الی ربی سیهدین رب هب لی من الصالحین

(صافات / ۹۹-۱۰۰)

جناب ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو یقیناً میری ہدایت کرے گا۔ بار الٰہا مجھے ایک فرزند جو صالحین میں سے ہو، عطا فرما۔"

"یہ دعا اس وقت سے مربوط ہے جب کہ ابھی ابراہیمؑ ہاجرہ کو نہیں جانتے اور ہاجرہ ابھی اسمٰعیلؑ کی ماں بھی نہیں بنی ہیں لیکن خداوند عالم ابراہیمؑ کی دعا کے بعد دعا قبول ہونے کی خبر دیتے ہوئے انہیں ایک حلیم و بردبار بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور اسی کے بعد جناب ابراہیمؑ کے خواب کا ذکر کرتا ہے کہ وہ خواب میں اس بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں"

طبری کہتا ہے: "نہیں سنا گیا ہے کہ کسی کتاب میں ہو کہ (قرآن مجید میں) ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ کے علاوہ کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی ہو قرآن کہتا ہے:۔

وامرأته قائمة فضحكت فبشرناها باسحق ومن وراء اسحق يعقوب (هود/۷۱)

---

[۱] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۲۷۹، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۷ و ۲۷۱

[۲] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۲۶۳ و ۲۶۷

"ابراہیمؑ کی بیوی (سارہ) کھڑی تھی کہ اس کو ہنسی آگئی پس ہم نے اس عورت کو فرزند اسحٰق کی اور پھر اسحٰق کے بعد (ان کے فرزند) یعقوب کی بشارت دی۔"

نیز خدا فرماتا ہے:۔

فاوجس منهم خيفة قالوا لاتخف وبشروه بغلام عليم فاقبلت امرأته فی صرة فصکت وجهها وقالت عجوز عقيم (ذاریات/۲۹)

"اس وقت ان سے سخت بیم وفکر میں مبتلا ہو گئے (ان فرشتوں نے جب ابراہیمؑ کو ہراساں پایا) تو کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے اور ان کو ایک عالم ودانا پسر کی بشارت دی، اس وقت زوجۂ ابراہیمؑ (سارا) نے خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے ان کی طرف رخ کیا اور (انتہائی تعجب میں) چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا میں ایک بوڑھی عورت ہوں اور بچہ پیدا کرنے کے لائق نہیں ہوں۔"

ان موارد کے علاوہ بھی جہاں کہیں خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو فرزند کی خوشخبری دی ہے ان کی زوجہ جناب سارہ کے سلسلہ میں ہی ہے۔"

اس اعتبار سے (سورۂ صافات) کی آیت/۱۰۱ میں "فبشرناه بغلام حليم (ہم نے ان کو ایک حلیم وبردبار فرزند کی خوشخبری دی) سے بھی دیگر تمام سوروں کی آیتوں کی طرح سارہ سے متولد ہونے والے فرزند کی بشارت کو ہی مراد لینا چاہیے۔"

لیکن جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ (خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کے ذبح کرنے پر مامور نہیں کیا تھا کیونکہ خداوند عالم کی طرف سے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ولادت سے قبل بشارت دی گئی تھی) ان کا اعتراض وارد نہیں ہے کیونکہ خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا کہ اسحاقؑ کو سعی و کوشش کے مراحل طے کر لینے کے بعد ذبح کریں، اور کوئی مانع نہیں ہے کہ ابراہیم کو جس وقت فرزند اسحاقؑ کے ذبح کا حکم دیا گیا ہو اس سے قبل ان کے یہاں یعقوبؑ پیدا نہ ہو چکے ہوں۔" [۱]

ہماری بات

پس طبری نے اپنے اس بیان کے ذریعہ اسحاقؑ کا ذبیح ہونا قبول کیا ہے جیسا کہ آپ نے اس سلسلہ میں طبری کا استدلال ملاحظہ فرمایا، حالانکہ اس نظریہ اور استدلال کا غلط ہونا واضح ہے؛ کیونکہ:۔

---

[۱] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۲۷۰ و ۲۷۱

اوّل: یہ کہ رسولِ خدا سے جو روایت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: "انا ابن الذبیحین" (میں دو ذبیحوں۔ اسمٰعیل اور عبداللہ۔ کا فرزند ہوں) اور یہ واضح ہے کہ نبی اکرمؐ اسمٰعیلؑ کی نسل سے ہیں نہ کہ اسحٰق کی نسل سے۔[1]

دوم: یہ کہ خداوند متعال سورۃ الصافات میں ذبح کا قصہ ذکر کرنے کے بعد اسحاقؑ سے متعلق بشارت دینے کا ذکر کرتا ہے:-

وبشرناه باسحاق نبیاً من الصالحین (آیت/۱۱۲)

اور ہم نے اس (ابراہیمؑ) کو ان کے فرزند اسحٰق کی بشارت دی کہ جو صالحین میں ایک نبی ہے

اور یہ بشارت ولادت (اسحاقؑ) کی بشارت ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ولادت کی بشارت ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:-

"فبشرناها باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب" (هود/۷۱)

اور ہم نے اس عورت (سارہ) کو اسحاق اور پھر ان سے یعقوب کی (ولادت کی) بشارت دی

پس ابراہیمؑ کو جس وقت اسحاق کی ولادت کی بشارت دی گئی ان کو یہ بشارت بھی ملی کہ اسحاق بڑے ہوں گے اور ان سے یعقوب پیدا ہوں گے پس کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم نے خود اسحاق کے ذبح کا حکم بھی دیا ہو!

روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اسی بات سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے استدلال فرمایا ہے۔ اور محمد بن کعب القرظی نے بھی یہی طریقہ استدلال اپنایا ہے۔[2]

اور جناب ابراہیمؑ کا انداز کلام بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے آپ فرماتے ہیں:-

الحمد للّٰه الذی وهب لی علی الکبر اسماعیل واسحاق (ابراہیم/۳۹)

اس خدا کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپا آنے کے بعد اسمٰعیل و اسحاق (جیسے

---

[1] تاریخ الامم والملوک ص ۲۶۴

[2] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۲۶۹ و ۲۷۰ / نیز ملاحظہ فرمائیں المیزان ج ۱۷ ص ۱۵۵ / البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۶۱ اور ۱۵۹

دو فرزند) عطا کئے۔

اپنے اس کلام میں جناب ابراہیمؑ نے اسمٰعیل کو اسحاق پر مقدم کیا ہے جیسا کہ چھ دوسری آیتوں میں بھی اسمٰعیل کا اسحاق سے پہلے ذکر ہوا ہے۔

سوم: کلام اللہ میں جہاں ارشاد ہوتا ہے: "وبشرناہ باسحاق نبیاً من الصالحین" چونکہ خداوند عالم نے ایک ایسے فرزند کی خوشخبری سنائی ہے جو بزرگ ہو کر ایک صالح نبی ہونے والا ہے، اس کی شادی ہوگی صاحب اولاد ہوگا (کیونکہ اسحاق کے ساتھ ہی یعقوب کی بھی بشارت دی گئی ہے ۔ ہود/۷۱) لہٰذا یہ بات معقول نہیں ہے کہ خداوند عالم ان امور کی انجام دہی سے قبل اس کے ذبح کا حکم دے اس لئے کہ اگر اس طرح کا حکم ان بشارتوں کے بعد دیا جائے تو بے شک ایک واقعی و حقیقی حکم نہیں کہا جائے گا بلکہ صرف دکھلاوے کا ایک غیر سنجیدہ حکم ہو کر رہ جائے گا اور ذبح و امتحان کی اہمیت بھی مفقود ہو جائے گی۔

پس خداوند عالم کے اس فرمان: "وبشرناہ باسحاق نبیاً..." اور "وامرأته قائمة فضحكت فبشرناها باسحاق ومن وراء اسحاق يعقوب" پر بھی توجہ رکھنا ضروری ہے۔

چہارم: ابن کثیر نے کہا ہے کہ قوموں کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسمٰعیل ابراہیمؑ کے سب سے بڑے اور سب سے پہلے فرزند ہیں[1]۔ اور طبری نے بھی اس بات کی وضاحت کی ہے جیسا کہ آپ جلد ہی ملاحظہ فرمائیں گے۔

پنجم: طبری نے جس چیز کو سند بنایا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ جناب سارہ کو پیری کے عالم میں اسحاق کی بشارت دیا جانا اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ جناب ہاجرہ اس بشارت سے قبل ایک ۱۴ سالہ فرزند اسمٰعیل کی ماں نہیں تھیں کیونکہ جناب سارہ کا پیری کی وجہ سے بانجھ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جناب ہاجرہ بھی ولادت کے قابل نہ تھیں خاص طور پر جب تقریباً ۱۵ سال سے دونوں کے درمیان دوری رہی ہے اور طبری نے خود اپنی کتاب میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے کہ جناب سارہ کے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ج ۱ ص ۱۵۷

یہاں فرزند (اسحاق) کی ولادت سے قبل، جناب ہاجرہ کے یہاں اسمٰعیل پیدا ہو چکے تھے، اسی وجہ سے اپنے یہاں اولاد نہ ہونے کے سلسلہ میں جناب سارہ سخت ملول تھیں۔[1]

اسی طرح "بلوغ السعی" سے مراد یہ ہے کہ رفت و آمد پر اختیار و قدرت حاصل ہو جائے نہ یہ کہ مرد ہو نے والا ہو گیا ہو پس طبری کی بات اس کے اس قول کو درست نہیں ٹھہرا سکتی کہ "ممکن ہے اسحاق کے ذبح کا حکم ان کی شادی اور جناب یعقوب کی ولادت کے بعد دیا گیا[2]۔ ورنہ زمانۂ آئندہ میں "بلوغ السعی" سے تعبیر کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ خداوند عالم کا اتنا فرما دینا کافی تھا کہ: ابراہیم کو جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کے فرزند کے ذبح کا حکم دیا گیا جو کامل مرد ہو چکا تھا۔

کعب الاحبار اور ذبح کا مسئلہ

اب ہم کعب الاحبار پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس نے باوجود اس کے کہ اس کا نظریہ قرآن کے مخالف ہے جناب اسحاق کے ذبیح ہونے کی روایت بیان کی ہے۔ کعب ہی وہ شخص ہے جس نے جناب اسحاق کے ذبیح ہونے کی روایت گڑھی ہے اور اپنی بات ان لوگوں کے دلوں میں اتاری ہے جو اس کو قبول کرنے پر آمادہ تھے وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ذریعہ اپنے باطل نظریات کو رواج دے سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں طبری نے روایت یوں نقل کی ہے:۔

"حدثنی یونس، قال: اخبرنا ابن وهب، قال: اخبرنی یونس عن ابن شهاب: ان عمرو بن ابی سفیان بن اسید بن جاریه الثقفی اخبره ان کعب قال لابی هریرة: الا اخبرك عن اسحاق بن ابراهیم النبی؛ قال ابوهریرة: بلی ...."

"کعب الاحبار نے ابوہریرہ سے کہا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسحاق کے بارے میں، جو خدا کے نبی ابراہیم کے فرزند تھے خبر دوں؟ ابوہریرہ نے کہا: ہاں ....."

---

[1] تاریخ الامم والملوک، ج ا ص ۲۲۷، ۲۵۳

[2] تاریخ الامم والملوک، ج ا ص ۲۷۱

کعب نے کہا: ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند اسحاقؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ شیطان نے کہا خدا کی قسم! اگر آل ابراہیم کو اس مسئلہ میں فریب نہ دوں تو اس کے بعد ان میں سے کسی ایک کو فریب نہیں دے سکتا یہی وجہ ہے کہ شیطان نے ایک شناسا شخص کی شکل اختیار کی کہ جس سے آل ابراہیمؑ واقف تھی، اس کے بعد جب ابراہیمؑ اسحاق کو ذبح کرنے کے ارادہ سے نکلے تو شیطان، اس شناسا کی شکل میں ابراہیمؑ کی زوجہ سارہ کے پاس آیا اور ان سے کہا: ابراہیمؑ اس وقت اسحاقؑ کو کہاں لے گئے ہیں؟ سارہ نے کہا: کسی ضروری کام سے اپنے ساتھ لے گئے ہیں، شیطان نے کہا: نہیں خدا کی قسم! وہ اس لئے نہیں لے گئے ہیں، سارہ نے پوچھا: پھر کیوں ان کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں؟

شیطان نے جواب دیا: ان کو ذبح کرنے کے لئے ساتھ لے گئے ہیں۔

سارہ نے کہا: یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے، ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو قتل نہیں کریں گے۔

شیطان نے کہا: لیکن خدا کی قسم یہی صحیح ہے جو میں نے کہا ہے۔

سارہ نے پوچھا: اسحاق کو قتل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

شیطان نے کہا: ابراہیمؑ کو گمان ہے کہ ان کے پروردگار نے انھیں بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

سارہ نے کہا: اگر ایسا ہے، تو اسی میں بھلائی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے حکم کی اطاعت کریں۔

طبری اس کے بعد روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نقل کرتا ہے کہ شیطان اسحاق کے پاس گیا اور اسی قسم کی گفتگو ان سے بھی کی، اور ان سے بھی اس کو وہی جواب ملا، اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"پس شیطان نے اسحاق کو بھی چھوڑا اور جناب ابراہیم کی طرف بڑھا اور ان سے کہا: یہ صبح صبح اپنے بیٹے کو کہاں لے جا رہے ہو؟

ابراہیمؑ نے کہا: ایک ضروری کام کے لئے۔

شیطان نے کہا: خدا کی قسم! تم اپنے فرزند کو قتل کرنے کے لئے لے جا رہے ہو!

ابراہیمؑ نے کہا: میں کیوں اس کو قتل کروں گا؟

شیطان نے کہا: کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہارے خدا نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔

ابراہیمؑ نے کہا: پس خدا کی قسم اگر میرے پروردگار نے مجھ کو حکم دیا ہوگا، تو میں ایسا ہی کروں گا۔

کعب الاحبار کہتا ہے: پس جس وقت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند کے ذبح کا اقدام کیا اور اسحاق نے

ان کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو خداوند عالم نے ان کو بخش دیا اور ایک "ذبح عظیم" کو ان پر نثار کر دیا . . . "[1]

ابوہریرہ نے دو دوسری روایتوں میں بھی کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ "ذبیح" جناب اسحاق تھے، اور ان دونوں روایتوں کو بھی طبری نے نقل کیا ہے جو اس کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔[2]

ذبیح کے بارے میں توریت کا نظریہ

توریت میں ہے: خذ ابنك، وحيدك الذی تحبه اسحاق واذهب الى ارض المريا واصعده هناك محرقة على . . . [3]

اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے اسحاق کو . . . . ہماری بارگاہ میں فدیہ کر دو۔

بنابریں: ایسا لگتا ہے کہ اسحاق کے ذبیح ہونے کے قائل افراد نے یہ نظریہ توریت سے اخذ کیا ہے، ابن کثیر کہتا ہے:-

انما اخذوه — والله اعلم — من كعب الاحبار، او من صحف اهل الكتاب وليس فى ذالك حديث صحيح من المعصوم، حتى نترك من اجله ظاهر الكتاب"[4]

بے شک ان لوگوں نے یہ نظریہ — واللہ اعلم — کعب الاحبار سے یا پھر اہل کتاب کے صحیفوں سے اخذ کیا ہے، اور اس ضمن میں کوئی صحیح حدیث معصوم سے نہیں ہے کہ ہم ظاہر کتاب کے روشن بیان کو ترک کر دیں۔

اور خود طبری نے ایک روایت ابن عباس سے نقل کی ہے جس میں اس ضمن میں یہودیوں کے اتہام کی بات کہی ہے:-

عن یونس بن عبد الاعلیٰ قال: حدثنا ابن وهب، قال اخبرنی عمر بن قیس عن عطاء بن ابی رباح، عن عبد الله بن عباس، انه قال: المفدی

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ا ص ۲۶۵، ۲۶۶

[2] تاریخ الامم والملوک جلد ا ص ۲۶۵

[3] عہد قدیم — سفر تکوین، اصحاح ۲۲ فقرہ ۱—۳ نیز ملاحظہ فرمائیں اصحاح آخر تک

[4] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۶۱، ۱۵۹

اسمٰعيل وزعمت اليهود انه اسحاق، وكذبت اليهود[1]

یونس ابن عبد الاعلیٰ سے روایت ہے وہ کہتا ہے: ہمیں ابن وہب نے بیان کیا، کہا کہ مجھ کو عمر ابن قیس نے عطاء ابن ابی رباح سے روایت کرتے ہوئے خبر دی اور اس سے عبداللہ ابن عباس نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: اسمٰعیل نے قربانی پیش کی ہے، یہودی خیال کرتے ہیں کہ وہ اسحاق ہیں ـــــ اور یہ یہودیوں کا جھوٹ اور افتراء ہے۔

اموی خلیفہ کے اطمینان قلب کے لئے

جس وقت اموی خلیفہ عمر ابن عبد العزیز نے کعب قرظی سے سنا کہ اسمٰعیلؑ ذبیح ہیں اور قرآن مجید سے اس کا استدلال سنا، تو اس کا قلب مطمئن نہ ہوا، یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کرنے والے ایک یہودی سے اس سلسلہ میں استفسار کیا:

اس واقعہ کو طبری یوں نقل کرتا ہے:۔

حدثنا ابن حميد، قال: حدثنا سلمة، قال: حدثنا محمد بن اسحاق، عن بريدة بن سفيان بن فروة الاسلمي، عن محمد بن كعب القرظي انه حدثهم: انه ذكر ان الذبيح هو اسمٰعيل، مستدلاً على ذلك بالآيات القرآنية (حسبما تقدم ذكره) لعمر بن عبد العزيز وهو خليفة، اذ كان معه بالشام فقال له عمر ان هٰذا الشئ ما كنت انظر فيه وانى لاراه كما قلت ثم ارسل الى رجل كان عنده بالشام، كان يهوديا فاسلم، فحسن اسلامه وكان يرى انه من علماء اليهود، فسأله عمر بن عبد العزيز عن ذالك"

محمد بن کعب قرظی کہتا ہے میں عمر ابن عبد العزیز کے پاس تھا کہ اس نے اسلام لانے والے

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ا ص ۲٦۸

ایک یہودی سے کہا ابراہیمؑ کے دونوں فرزندوں میں سے کس کے لئے ذبح کا حکم وارد ہوا ہے؟

اس شخص نے جواب دیا: اسمٰعیلؑ، امیرالمومنین! خدا کی قسم یہودیوں کو یہ معلوم ہے لیکن چونکہ انہوں نے عربوں سے حسد جلن کی اور نہیں چاہا ان کے باپ کو ذبیح کے طور پر جانا جائے، اس واقعیت کا انکار کر دیا اور اسحاق کو ذبیح قرار دیا اس لئے وہ ان کے باپ ہیں۔" [1]

۲۔ خدا کی جسمیت اور صورت و ہیکل سے متعلق روایات

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذات خدا کی جسمیت کا قائل ہونا، اور اسی طرح مختلف ادوار میں بتوں کی پرستش کرنا یہودیوں اور پھر نصرانیوں کے عقائد میں سے رہا ہے کیونکہ موجودہ تحریف شدہ توریت و انجیل میں مختلف موارد کے تحت متعدد مقامات پر اس قدر تصریح موجود ہے کہ اس سلسلے میں توریت و انجیل سے موارد پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس عقیدہ نے مسلمان ہونے والے اہل کتاب کے ذریعہ اسلامی ثقافت میں راہ بنائی ہے اور ان روایات کی صورت میں، جو خداوند عالم کے لئے ہاتھ، انگشت، قدم، پنڈلی اور چہرے وغیرہ کا وجود ثابت کرتی ہیں، ظاہر ہوا ہے۔ حدیث و تاریخ نیز بعض دیگر کتابوں میں یہ عجیب و غریب روایتیں، اس قدر گھل مل گئی ہیں یہاں تک کہ امام الائمہ ابن خزیمہ نے (جنھوں نے تیسری صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی ہے) چار سو صفحات پر مشتمل ایک مستقل کتاب "التوحید و اثبات صفات الرب" کے عنوان سے لکھی اور اس میں اس طرح کی حدیثیں جمع کی ہیں۔

ہم یہاں طبری کی کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں مذکور ایسے تمام موارد کا احصاء کرنا نہیں چاہتے بلکہ محض ایک روایت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، طبری لکھتا ہے:۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۲۷۰

حدثنی محمد بن سھل بن عسکر، حدثنا اسماعیل بن عبد الکریم قال حدثنی عبد الصمد: انہ سمع وھباً یقول وذکر من عظمتہ فقال ان السمٰوات والارض والبحار لفی الھیکل . . . ۔"

یعنی تمام آسمان، زمین اور دریا ایک ڈھانچے اور ہیکل میں پائے جاتے ہیں اور ہیکل کرسی میں مستقر ہے اور خداوند عزوجل کے دو پاؤں کرسی پر ہیں اور وہ کرسی کو اٹھائے رہتا ہے اور کرسی اس کے پاؤں میں ایک جوتی کے مانند ہے، وہب سے سوال کیا گیا کہ ہیکل کسے کہتے ہیں؟

اس نے کہا، آسمانوں کے گرد اگرد ایک چیز ہے جو زمینوں اور دریاؤں کو ہر طرف سے خیمہ کی طناب کی مانند احاطہ کئے ہوئے ہے۔

وہب سے سوال ہوا کہ زمینیں کس طرح کی ہیں؟

اس نے کہا: سات زمینیں ہیں، جن میں سے ہر ایک کسی جزیرہ کی مانند وسیع و آمادہ ہے تمام زمینوں کے درمیان ایک دریا ہے اور دریا ان سب کو گھیرے ہوئے ہے اور ہیکل دریا سے الگ چیز ہے۔[۱]

ہیکل سے متعلق اس طرح کی باتیں موجودہ تحریف شدہ توریت اور انجیل میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں، جن کا آپ خود مطالعہ فرما سکتے ہیں۔[۲]

۳۔ جبر سے متعلق حدیثیں

خداوند عالم سے متعلق جبر کا عقیدہ بھی ان ہی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمان ہونے والے اہل کتاب کے ذریعہ اسلامی ثقافت میں نفوذ پیدا کیا ہے، ان لوگوں کا عقیدہ ہے:۔

لقد جف القلم بما ھو کائن من السعادۃ والشقاوۃ الی الابد فلامجال للتغیر

۱۔ تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۴۱

۲۔ ملاحظہ فرمائیں قاموس الکتاب المقدس، مادہ ھیکل نیز ان موارد کو جن کا صاحب قاموس نے ذکر کیا ہے۔

ولا للتبدیل، وانما یعمل الناس الیوم فیما قد فرغ منه۔"

مطلب یہ ہے کہ انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے اس کے لئے نادانستہ طور پر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہی کام انجام دے جو قلم تقدیر نے اس کے لئے لکھ دیا ہے اور چونکہ قلم کی روشنائی سوکھ چکی ہے اور اس نے لکھنا بند کر دیا ہے، لہٰذا انسان کے لئے کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قسمت کے فیصلا میں کسی طرح کی رد و بدل کر سکے۔

جیسا کہ خود خداوند متعال بھی کسی چیز کو تبدیلی و تغیر نہیں دے سکتا پس یہ صحیح نہیں ہے کہ:۔

"یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت" { اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے } (رعد/۳۹)

بلکہ یہودیوں کی بات درست ہے کہ:۔

وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ، غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء" (مائدہ/۶۴)

اور یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، ان ہی کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں ان کے اس قول پر خدا کی جانب سے لعنت ہو، بلکہ اس (خدا) کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہتا ہے انفاق کرتا ہے۔"

مشرکین بھی اسی گمان میں تھے کہ وہ اپنے کردار و اعمال میں مجبور ہیں اور ان کے اعمال میں اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ خداوند عالم ان کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وقال الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیٔ نحن ولا آباؤنا" ولا حرمنا من دونہ من شیٔ ... (نحل/۳۵)

اور مشرکین کہتے ہیں اگر خدا چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی اور چیز کی پرستش کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔ اور نہ ہی ہم بغیر اس کی مرضی کے کسی چیز کو حرام کر بیٹھتے۔

طبری کے یہاں آفرینش قلم کی روایتیں

طبری کے یہاں ایسی بہت سی روایتیں "خلق قلم" کے موضوع پر موجود ہیں کہ ان سب میں انسان کے

مجبور بے اختیار ہونے پر زور دیا گیا ہے، لوگ نادانستہ و ناگزیر طور پر کاموں کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں، ہم یہاں قلم کی پیدائش سے متعلق محض دو روایتیں اشارتاً نقل کر رہے ہیں قارئین کرام مزید تحقیق کے لئے "تاریخ الامم والملوک" کے شروع میں "القول فی ابتداء الخلق ما کان اولہ" کے عنوان سے کی جانے والی بحث کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

طبری نے خود اپنی سند کے تحت عبادہ ابن صامت سے نقل کیا ہے کہ عبادہ نے اپنے فرزند کہا:

سمعت رسول اللہؐ یقول: ان اول ماخلق اللہ القلم، فقال: اکتب فجری فی تلک الساعۃ بما ھو کائن" [1]

"میں نے رسول خداؐ سے سنا کہ آپ نے فرمایا: سب سے پہلے خدا نے قلم کو پیدا کیا، پس اس سے کہا لکھ، پس اسی وقت سب کچھ لکھ گیا جو کچھ کہ ہونے والا تھا۔

نیز طبری لکھتا ہے: حدثنی محمد بن معاویہ الانماطی، حدثنا عباد بن العوام، حدثنا عبد الواحد بن سلیم، قال سمعت عطا...

میں نے ولید ابن عبادہ ابن صامت سے پوچھا تیرے باپ نے مرتے وقت تجھ سے کیا وصیت کی؟ ولید نے کہا: میرے باپ نے مجھے بلایا اور کہا: اے فرزند خدا سے ڈرو اور یاد رکھو تم تقوائے الٰہی نہیں حاصل کر سکتے مگر جب تک کہ خدائے یکتا اور اس کے (خیر ہو یا شر) مقدرات پر ایمان نہ لے آؤ، بے شک میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان اوّل ماخلق اللہ عزّ وجل القلم فقال لہ: اکتب قال: یا رب وما اکتب قال: اکتب القدر قال: فجری القلم فی تلک الساعۃ بما کان وبما ھو کائن الی الابد [2]۔"

خداوند عزوجل نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پس اس سے کہا لکھ: اس نے کہا کیا لکھوں، کہا تقدیر لکھو، (رسولؐ نے) کہا: پس قلم نے اسی وقت جو کچھ ابد الآباد تک ہونا تھا قلمبند کر دیا۔

اس سلسلہ میں دوسری روایات بھی ہیں کہ جن کا طبری نے ذکر کیا ہے، قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ [3]

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۲

[2] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۲ و ۳۳

[3] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۴ اور اس کے بعد نیز ص ۵ و ۵۲

طبری نے ابن عباس یا ابن عمر سے بھی روایت کی ہے :۔

"ان اول ماخلق اللہ القلم، فقال لہ اجر فجری بما ھو کائن وانما یعمل الناس الیوم فیما قد فرغ منہ "[1]

بے شک خدا نے سب سے پہلے قلم کو خلق کیا پس اس سے کہا چل، پس وہ چلا اور سب کچھ لکھ دیا اور آج لوگ بس وہی عمل انجام دیتے ہیں جو کچھ یہ قلم لکھ چکا ہے۔

آفرینش کے ایام اور خدا کا آرام کرنا

توریت میں ہے : پروردگار نے چھ روز میں آسمان، زمین، دریا اور جو کچھ ان میں ہے سب پیدا کیا اور ساتویں دن کو آرام و استراحت کا دن قرار دیا، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے روز شنبہ کو مبارک اور مقدس دن شمار کیا ہے۔[2]

طبری نے بھی اپنی تاریخ میں اسی مضمون کی بہت سی روایتیں نقل کی ہیں جن میں خداوند عالم کا یکشنبہ کے دن عالم کی آفرینش شروع کرنا، جمعہ کے دن اس کی تکمیل کرنا اور اس کے بعد شنبہ کے دن خداوند عالم کا تخلیقی امور سے فراغت پاجانا تاکید کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ ہم اس مضمون کے ذیل میں محض وہ روایات پاتے ہیں جو طبری نے اہل کتاب سے نقل کی ہیں، طبری کہتا ہے :۔

عن المثنیٰ بن ابراہیم قال : حدثنا عبد اللہ بن صالح حدثنی ابو معشر، عن سعید بن ابی سعید، عن عبد اللہ بن سلام، انہ قال : ان اللہ بدأ الخلق یوم الاحد، فخلق الارضین فی الاحد والاثنین وخلق الاقوات والرواسی فی الثلاثاء والاربعاء وخلق السموات فی الخمیس والجمعۃ وفرغ فی آخر ساعۃ من یوم الجمعۃ، فخلق فیھا آدم علی عجل، فتلک الساعۃ التی تقوم فیھا الساعۃ[3]

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد۱ ص ۳۴ و ۳۵

[2] عہد قدیم، سفر خروج اصحاح بستم فقرہ ۱۱

[3] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۴۷

"مثنی ابن ابراہیم نے (اپنی اسناد کے ساتھ) عبداللہ ابن سلام سے روایت کی ہے، اس نے کہا: اللہ نے اتوار کے دن تخلیق کا آغاز کیا پس اتوار اور دوشنبہ کو زمینیں خلق کیں، منگل اور بدھ کو سامان خوراک (سبزہ و میوہ جات) اور پہاڑ وغیرہ خلق کئے۔ جمعرات اور جمعہ کو آسمانوں کی تخلیق کی، اور جمعہ کے دن آخری اوقات میں وہ ان امور (تخلیق) سے فارغ ہوا پس جلدی سے اسی دن اس نے آدم کو خلق کیا، پس یہی وہ گھڑی ہے جس سے زمانے کا آغاز ہوا ہے۔"

ایک دوسری روایت بھی اسی مضمون کی طبری نے عبداللہ ابن سلام سے ہی روایت کی ہے۔[1]

لیکن ایک اور روایت میں طبری کہتا ہے:-

"حدثنا ابن حمید قال، حدثنا جریر عن الاعمش، عن ابی صالح، عن کعب قال: بدأ اللہ خلق السموات والارض یوم الاحد والاثنین والثلاثاء والاربعاء والخمیس وفرغ منہا یوم الجمعۃ، قال: فجعل مکان کل یوم الف سنۃ"[2]

"..... خداوند عالم نے زمین اور آسمانوں کی تخلیق اتوار کو شروع کی اور دوشنبہ، منگل، بدھ، جمعرات یہاں تک کہ جمعہ کو اس سے فارغ ہوا۔ (کعب نے) کہا: پس ہر دن کو ایک ہزار سال کے برابر قرار دیا۔"

اس ضمن میں طبری نے جو روایتیں نقل کی ہیں ان کی تعداد بہت ہے یہاں ان سب کا ذکر ممکن نہیں۔

۵۔ انبیاءؑ کی خطائیں:

توریت میں متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ انبیاء کی جانب گناہان کبیرہ تک کی نسبت دی گئی ہے (جبکہ یقیناً انبیاء علیہم السلام کا مقام و رتبہ اس طرح کی ناروا نسبتوں سے پاک و منزہ ہے)

ہم یہاں اس طرح کی روایت کا صرف ایک نمونہ اللہ کے نبیوں میں ایک نبی جناب داؤد علیہ السلام کے سلسلہ میں پیش کرتے ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ طبری نے اسی قصہ کو اپنی تاریخ میں بھی، البتہ اس کے بعض حصوں کو حذف کرتے ہوئے، ثبت کر دیا ہے۔

---

[1] تاریخ الامم جلد ا ص ۵۵ و ۵۶

[2] تاریخ الامم جلد ا ص ۵۹

توریت (سموئیل دوم کے گیارہویں باب) میں ہے (معاذاللہ):۔

عصر کا وقت تھا کہ داؤد اپنے تخت سے اٹھے اور اپنے قصر حکومت کی چھت پر پہنچ گئے ناگاہ اس بلندی سے ایک عورت کو دیکھا کہ غسل کر رہی تھی، عورت واقعی خوبصورت تھی، پس داؤد نے کسی کو اس عورت کا حال معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا، ایک شخص نے کہا: آیا یہ عورت "بتشیع" بعام کی بیٹی اور "اوریا حتی" کی بیوی نہیں ہے؟"

"پس داؤد نے کچھ لوگوں کو بھیجا وہ اس عورت کو پکڑ لائے، داؤد اس عورت سے ہم بستر ہوئے، اس وقت وہ عورت خون حیض سے پاک تھی، عورت گھر واپس ہوئی، وہ حاملہ ہو چکی تھی اس نے داؤد کے پاس آدمی بھیج کر حاملگی کی اطلاع دی، داؤد نے (عورت کے شوہر) اوریا کے پاس آدمی بھیجا اور اس کو جنگ (کے میدان) سے واپس بلایا اور حکم دیا کہ وہ گھر جائے (داؤد کا مقصد یہ تھا کہ "اوریا" اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہو جائے اور بیوی کا حمل اس پر مشتبہ ہو جائے) لیکن "اوریا" اپنے دوستوں کی مدد کی غرض سے کہ جو فی سبیل اللہ جنگ کر رہے تھے اور تابوت کے ہمراہ جدوجہد میں مشغول تھے چلا گیا اور گھر نہ گیا۔ چونکہ "اوریا" جنگ پر چلا گیا۔ داؤد نے اپنے سپہ سالار کو لکھا کہ اوریا کو محاذ جنگ پر آگے بھیج دے اور لوگ اس کو چھوڑ کر پلٹ آئیں تاکہ وہ مارا جائے، پس انہوں نے ایسا ہی کیا اوریا قتل کر دیا گیا۔ انہوں نے اس کی موت کی خبر داؤد کو دے دی، داؤد نے اس عورت کے پاس آدمی بھیجا اور اس کو اپنے گھر بلوا لیا۔ اور اس عورت نے زنا کے ذریعہ ان کے لئے ایک فرزند پیدا کیا (۲ سموئیل ۱۱: ۲ - ۲۷)

پس خداوند عالم نے ناتان نبی کو داؤد کے پاس بھیجا اور ان سے کہا: "قد کان فی مدینة رجلان واحد فقیر لہ نعجة واحدة عزیزة علیہ واخر لہ غنم وبقر کثیرة جداً فاخذ الغنی نعجة الفقیر . . . . ."

شہر میں دو افراد تھے ایک فقیر تھا، اس کے پاس ایک بھیڑ تھی جو اسے بہت عزیز تھی اور دوسرے کے پاس واقعاً بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں پس دولتمند نے فقیر کی بھیڑ لے لی . . . ."

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طبری نے اپنی تاریخ میں توریت کی اس پوری روایت کو، عورت کے ساتھ گھر پہ بلا کر، داؤد کے زنا کرنے اور عورت کے حمل کو مشتبہ بنانے کی غرض سے اس کے شوہر کو میدان جنگ

سے واپس بلانے کی داستان کے علاوہ، بعینہ نقل کر دیا ہے۔[1]

جی ہاں! طبری اس من گھڑت جھوٹی و شرم آور داستان کو نقل کرتا ہے اور بڑی بے باکی سے خدا کے نبیوں میں سے ایک نبی پر ایک مومن شخص کے قتل تک کا اتہام لگاتا ہے جب کہ ایک مومن کا قتل عظیم گناہان کبیرہ، اور زشت ترین فواحش میں سے ہے اور پیغمبران الٰہی کی ذوات مقدسہ ایسے امور سے بالکل پاک ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کی ان تہمتوں سے مقابلہ آرائی

دوسری جانب اہل بیت علیہم السلام ان دروغ بافیوں کے مقابل ان کی تکذیب و بیخ کنی میں مشغول تھے۔ امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

من حدثکم بحدیث داؤد علی ما یرویہ القصاص جلدتہ مأۃ و ستین. وھی حد الفریۃ علی الانبیاء"[2]

یعنی جو شخص بھی تمہارے سامنے داستان سرایوں کے انداز پر داؤد کا واقعہ دہرائے اس کو ایک سو ساٹھ تازیانے لگائے جائیں گے اور یہ انبیاء پر جھوٹی تہمت باندھنے کی حد (سزا) ہے۔"

حضرت علیؑ نے اس بیان میں ایسے مطالب نقل کرنے والے کو داستان سراؤں کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ وہی اسلام قبول کرنے والے اہل کتاب اور ان کے مرید و شاگرد ہیں جنھوں نے تاریخ میں خرافاتی روایتیں نقل کی ہیں، اور "تمیم داری" وہ پہلا شخص ہے جس نے مسجد میں قصہ گوئی کا در باز کیا ہے۔

راوندی نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے دو روایتیں نقل کی ہیں جن میں حضرت داؤد پیغمبرؑ کو اس ذلیل جھوٹ سے مبرا بتایا گیا ہے۔[3]

۱؎ تاریخ الامم جلد ۱ ص ۴۸۰ تا ۴۸۴

۲؎ الھدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۰۷

۳؎ الھدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۰۷

جنت میں آدمؑ کے فریب کھانے کی داستان

طبری نے جنت سے حضرت آدم کے نکالے جانے کے سلسلہ میں "وھب ابن منبہ" سے ایک روایت نقل کی ہے وہ کہتا ہے :-

"شیطان ایک ایسے سانپ کے پیٹ میں داخل ہو گیا جو پاؤں رکھتا تھا ، اور تنومند اونٹ کی مانند بہشت کی طرف بڑھ رہا تھا ۔"

طبری اضافہ کرتا ہے : شیطان حوا کے قریب آیا اور ان سے کہا : اس درخت کی طرف دیکھو کہ کتنا خوشبودار ، خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہے ، پس حوا نے اس درخت کو پکڑا اور (اس کا پھل) کھا لیا ۔
اس کے بعد حوا آدمؑ کے پاس گئیں اور ان سے کہا : اس درخت کی طرف دیکھو یہ ....
پس آدمؑ نے اس درخت سے کھا لیا "فبدت لهما سوءاتهما" یعنی اس درخت سے کھانے کے بعد ان دونوں کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں ، آدم اس درخت میں داخل ہو گئے تو ان کے پروردگار نے آواز دی ، اے آدم! کہاں ہو؟ آدم نے کہا : پروردگار! میں یہاں ہوں - خدا نے کہا : کیا باہر نہیں آؤ گے ؟ آدم نے کہا : مجھے تجھ سے شرم آتی ہے - خداوند نے کہا : میری رحمت سے وہ زمین دور ہو جائے جس سے میں نے تم کو پیدا کیا ہے ، یہاں تک کہ اس کے تمام میوے خار میں تبدیل ہو جائیں !
کہا : اور بہشت میں کیلے اور بیر سے اچھا کوئی درخت نہ تھا ، اس کے بعد خداوند عالم نے حوا سے کہا : تم نے میرے بندے کو دھوکا دیا پس تم کوئی بچہ پیٹ میں پرورش نہ دے سکو گی مگر سخت دشواریوں کے ساتھ ، اور جب تم زمین پر اپنا کوئی فرزند پیدا کرنا چاہو گی تو تمہیں بار بار موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا ۔

اور خداوند نے سانپ سے کہا : تو وہی ہے جس کے پیٹ میں وہ ملعون — شیطان — داخل ہو گیا تا کہ میرے بندے کو دھوکا دے ۔ تو میری رحمت سے دور ہو جا ، یہاں تک کہ تیرا پاؤں تیرے بدن میں پنہاں ہو جائے اور خاک کے علاوہ تجھ کو کچھ کھانے کو نہ ملے تو آدم کے فرزند کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہیں ، جہاں کہیں ان کو دیکھے گا ان کا پیچھا کرے گا

اور وہ بھی جہاں کہیں تجھے پائیں گے تیرا سر کچل دیں گے[1]

توریت میں آدمؑ کے فریب کی داستان

توریت میں حضرت آدمؑ کو اس درخت سے جو "خیر و شر کی شناخت" کا درخت تھا، کھانے کو منع کئے جانے کا ذکر کرنے کے بعد آیا ہے :-

"... سانپ خشکی کا مکار ترین جانور تھا کہ پروردگار عالم نے اس کو پیدا کیا۔ پس اس سانپ نے عورت (حوا) سے کہا : کیا واقعی خداوند نے کہا ہے کہ بہشت کے کسی درخت سے نہ کھانا؟ اس عورت نے سانپ سے کہا : ہم بہشت کے درختوں سے پھل کھاتے ہیں لیکن وسط بہشت میں جو درخت ہے، اس کے لئے خداوند نے فرمایا ہے کہ نہ اس کا پھل کھائیں نہ اس کو ہاتھ لگائیں تاکہ موت سے ہمکنار نہ ہوں۔ سانپ نے اس عورت سے کہا : تم ہرگز نہیں مروگی، بلکہ خداوند عالم جانتا ہے جس دن تم نے اس کا پھل کھایا تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور خدا کی طرح تم بھی خیر و شر سے آگاہ ہو جاؤگی۔ عورت نے گمان کیا کہ اس درخت سے کھانا اچھا ہے اور آنکھوں کی شادمانی اور لذت کا سبب ہے، چنانچہ اس درخت کا پھل لیا اور کھا لیا، اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور مرد نے بھی اس پھل میں سے کھا لیا، اس وقت ان کی آنکھیں کھل گئیں اور خود کو برہنہ پایا اور درخت انجیر کے پتوں سے اپنی ستر پوشی کی۔ انہیں اس عالم میں صدائے پروردگار سنائی دی جو نسیم کے جھونکے چلتے وقت روزانہ ہی بہشت میں چہل قدمی کرتا تھا۔ پس آدم اور ان کی بیوی نے درخت بہشت کے درمیان آکر خود کو اپنے پروردگار سے مخفی کر لیا۔ پروردگار عالم نے آدم کو صدا دی اور ان سے کہا تم کہاں ہو؟ آدم نے کہا، میں نے تیری آواز بہشت میں سنی اور چونکہ عریاں تھا ڈر کے چھپ گیا۔ خدا نے کہا : کس نے تم کو سمجھا دیا کہ تم عریاں ہو؟ آیا اس درخت سے تم نے کھا لیا ہے جس سے میں نے منع کیا تھا؟ آدم نے کہا : وہ عورت جو تو نے میرے ساتھ کر دی ہے اس نے مجھے اس درخت کا (پھل) دیا اور میں نے کھا لیا۔ پس پروردگار عالم نے اس عورت سے کہا : یہ تو نے کیا کیا؟ عورت نے جواب دیا، سانپ نے مجھ کو دھوکا دیا اور میں نے اس درخت سے کھا لیا۔ پروردگار عالم نے سانپ سے کہا : تو تمام چارپایوں اور

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۱۰۸

خشکی میں رہنے والے وحشی جانوروں کے درمیان رحمت سے محروم ہوگیا، تو پیٹ کے بل رینگے گا اور زندگی بھر خاک پھانکے گا میں تیرے اور اس عورت کی نسل کے درمیان دشمنی برقرار کرتا ہوں وہ تجھ کو ماریں گے اور تو ان کو ڈسے گا۔ اور اس عورت سے کہا: تیری حاملگی کی تکلیف میں اضافہ کروں گا بڑے درد کے ساتھ بچے جنے گی... اور آدم سے کہا: زمین تیرے لئے ملعون ہے (کیونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مان لی، اور اس درخت سے تو نے کھالیا جس سے میں نے کھانے کو منع کیا تھا) تو اپنی پوری زندگی میں سختی کے ساتھ زمین سے روزی حاصل کرے گا تیرے لئے خس وخاشاک روئیدہ ہوں گے اور تو محنت کر کے اپنی زراعت کا ثمرہ کھائے گا، ماتھے کے پسینے سے روٹی حاصل کرے گا یہاں تک کہ اسی زمین میں جس سے تو اٹھایا گیا ہے واپس پلٹ جائے گا کیونکہ تو مٹی سے ہے اور مٹی میں ہی بدل جائے گا۔"[1]

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، طبری نے جو کچھ وہب سے روایت کیا ہے بالکل وہی چیز ہے جو توریت میں لکھی گئی ہے بس فرق یہ ہے طبری نے ذرا اچھے اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے حتی خصوصیات وجزئیات کو بھی طبری نے محفوظ رکھا ہے!

وہب ابن منبہ بھی کعب الاحبار، عبداللہ ابن سلام اور تمیم الداری وغیرہ کی مانند اسلام قبول کر لینے والے اہل کتاب کے زمرہ میں آتا ہے۔

آخری نمونہ

قبل اس کے کہ ہم مقالہ کو آخری منزل تک پہنچائیں، ایک نکتہ کی جانب اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ خود طبری نے بھی اپنی کتاب میں، کعب الاحبار کی تکذیب اور اس پر اسلام میں اسرائیلیات وارد کرنے کا الزام، ابن عباس کی زبانی نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: "ایک روز ابن عباس بیٹھے ہوئے تھے، کہ ایک شخص پہنچا اور ان سے کہا: اے ابن عباس میں نے سورج اور چاند کے بارے میں کعب الاحبار سے عجیب وغریب بات سنی!

ابن عباس اس وقت ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے یہ بات سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھا وہ بات کیا تھی؟ اس شخص نے کہا: کعب کا خیال ہے کہ روز قیامت خورشید وماہ دو پے تنے[2] گایوں

[1] عہد قدیم سفر تکوین اصحاح سوم فقرات ۱ــ ۱۹

کی صورت میں لاکر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے: عکرمہ کہتا ہے: ابن عباس یہ سن کر بھڑک اٹھے اور غصہ کے ساتھ کہا: کعب جھوٹ بولتا ہے، کعب جھوٹ بولتا ہے، کعب جھوٹ بولتا ہے، وہ ایک یہودی شخص ہے جو ان مطالب کو اسلام میں داخل کرنا چاہتا ہے...![1]

کعب کے بارہ میں خلیفہ دوم کی مخالفت

طبری نے نقل کیا ہے کہ جب عمر بن الخطاب "جابیہ" سے "ایلیا" کی طرف پلٹے اور در مسجد کے نزدیک پہنچے، کہا: کعب سے ہوشیار رہو!

اس کے بعد روایت نقل کرتا ہے: دوسرے دن، جب عمر لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ چکے تو پلٹے اور کہا: کعب کو میرے سامنے لاؤ، لوگ کعب کو ان کے پاس لے آئے، عمر نے اس سے کہا: تیری نظر میں ہم مصلا کہاں قرار دیں؟ کعب نے کہا: (یہودیوں کے قبلہ) صخرہ کی طرف۔

عمر نے کہا: اے کعب! خدا کی قسم تو یہودیت سے میل و شباہت رکھتا ہے، جس وقت تو نے اپنا جوتا اتارا ہے میں نے دیکھا ہے (یعنی اب بھی تیرے دل میں یہودیوں کے عقائد کا احترام باقی ہے)

کعب نے کہا: میں چاہتا تھا کہ اس پر اپنے قدم رکھوں۔

عمر نے کہا: ہاں میں نے تجھ کو دیکھ لیا، لیکن ہم صدر مسجد کو قبلہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ رسول خدا نے ہماری مسجدوں کا قبلہ صدر مسجد کو قرار دیا ہے، پلٹ آ، کیونکہ ہم کو صخرہ کا حکم نہیں دیا گیا ہے، کعبہ کے لئے حکم ملا ہے، پس عمر نے مسجد کا قبلہ صدر مسجد کو قرار دیا.... اس کے بعد عمر مصلیٰ سے اٹھے اور ایک ویرانہ کی طرف گئے جہاں رومیوں نے بیت المقدس کو دفن کر دیا تھا، اور جس زمانے میں بنی اسرائیل کا وہاں تسلط ہوا انھوں نے اس کا کچھ حصہ باہر نکالا تھا اور بقیہ کو یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔

عمر نے کہا: اے لوگو! جو کچھ میں انجام دوں، تم بھی انجام دو، عمر دو زانو ہو کر (یا دونوں پنجوں پر بل دے کر) اس جگہ کے بیچ میں بیٹھ گئے اس طور پر کہ خس و خاشاک ان کے

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۶۵

لباس پہن کر جمع کیا تھا۔

اسی عالم میں عمر نے پشت سے تکبیر کی آواز سنی (اور چونکہ وہ ہمیشہ دوسروں کے غلط ارادوں سے بیمناک رہتے تھے) سوال کیا، یہ کیسی تکبیر ہے؟ ان سے کہا گیا کہ کعب نے تکبیر کہی ہے اور لوگوں نے بھی اس کی تاسی میں تکبیر کہی ہے۔ عمر نے کہا: کعب کو میرے پاس لاؤ جب کعب کو حاضر کیا گیا تو اس نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کام جو آپ نے آج انجام دیا ہے، وہی کام ہے جس کی پانچ سو سال قبل ایک نبی نے خبر دی ہے[1]...

اس مقالہ میں ہم نے "اسرائیلیات" کے بارے محض چند نمونے پیش کئے ہیں، جو تاریخ طبری کے اوراق میں چھپے ہوئے ہیں ویسے ہی جیسے اس طرح کے اسرائیلیات حدیث تاریخ اور رجال کی دوسری تمام کتابوں میں کثرت سے چھپے پڑے ہیں:

چنانچہ ہم یہاں موقع کو غنیمت جانتے ہوئے تمام محققین و ماہرین سے خواہش کرتے ہیں کہ اسلامی و ثقافتی میراث پر پہلے سے زیادہ توجہ صرف کرتے ہوئے ان غلط اور بے بنیاد مسائل کے تصفیہ کے بارے میں غور و فکر کریں۔ منجملہ ان کے طبری کی تاریخ الامم والملوک" بھی ہے، جس کے بہت سارے صفحات حقیقت سے دور تحریف شدہ مطالب پر ہیں! بنا برایں، اس کتاب میں نیز اس کے جیسی دیگر کتابوں میں مذکورہ اسناد و نصوص پر تحقیق و تنقید اور چھان بین کی ضرورت ہے، ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد و اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۳ ص ۶۱۱

فہرست جلد ہفتم مجلۂ توحید